تفسیر

سورۃ الانعام

تحقیق و ترتیب

محمد طاہر ہاشمی

ایم اے علوم اسلامیہ

ایم اے تاریخ

دروس قرآن — تفسیر سورۃ الانعام

اشاعت — 2024

ای بک — پی۔ڈی۔ایف

نظم وترتیب — محمد طاہر ہاشمی ایم اے علوم اسلامیہ وہسٹری

ٹائیٹل معاونت — پروفیسر محمد حسان ہاشمی

تکنیکی تعاون — محمد انس ہاشمی

ہدیہ — دعائے خیر

بار — اول

hashmipk786@gmail .com

برائے ایصال ثواب

والد گرامی ووالدہ محترمہ

مولایَ صلِّ وَسَلِّم دائماً ابداً

علیٰ حَبِیْبِکَ خَیرِ الخَلقِ کُلّھِم

انتساب

ان نفوس قدسیہ کے نام جن کے دم قدم

سے اس گلستان میں علوم کی نیرنگیاں ہیں

اِعُتذِار

ایک مسلمان دینی کتابوں میں دانستہ غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ غلطیوں کی تصحیح واصلاح کے لئے ہمہ وقت تیار۔ اگرچہ کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پوری توجہ سے کی جاتی ہے تاہم انسان غلطی کا پتلا ہے۔ غلطی رہ جانے کا امکان موجود ہے۔ لہٰذا احباب سے گذارش ہے کہ جو غلطی نظر آئے تو مطلع فرمائیں تاکہ اسے درست کیا جاسکے۔ نیکی کے کام میں آپکا تعاون یقیناً صدقہ جاریہ ہوگا۔

رابطہ: hashmipk786@gmail.com

فہرست

FLOW CHART

ترتیبی نقشۂ ربط

نظمِ جلی

MACRO-STRUCTURE

سُورَۃُ الاَنعَامِ

آیات : 165 ...... مَکِّیَّۃ ...... پیراگراف :7

مشرکینِ مکہ سے مناظرہ و مجادلہ

پہلا پیراگراف
آیات:1 تا 73

حضرت ابراہیمؑ دیگر انبیاء اور محمدؐ سب کی دعوت توحید ہے

دوسرا پیراگراف
آیات:74 تا 94

دعوتِ توحید اور تردید

تیسرا پیراگراف
آیات:95 تا 113

چوتھا پیراگراف

پانچواں پیراگراف
آیات:122 تا 135

مجرم و مفرور قیادت کا

بدعاتِ قریش اور توحیدِ تشریع کی وضاحت

چھٹا پیراگراف
آیات:155 تا 165

خلاصہ دعوتِ توحید و ردِّ شرک

ساتواں پیراگراف
آیات:155 تا 165

مرکزی مضمون :

بنی اسمٰعیل میں ملتِ ابراہیمی اور عقیدۂ توحید کے سچے وارث ، قریش (مشرکینِ مکہ) نہیں ، بلکہ محمد ﷺ ہیں۔ بنی اسمٰعیل (مشرکینِ مکہ) سے مباحثہ و مجادلہ کرتے ہوئے ، شرک کی مختلف قسموں پر تنقید کے بعد ، توحید کی قسمیں اور توحید کے تقاضے بھی بیان کردیئے گئے ہیں۔

تعارف سورۃ الانعام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس سورۃ پاک کا نام الانعام ہے۔اس کی آیتوں کی تعداد ایک سو پینسٹھ اور رکوعوں کی تعداد بیس ہے۔
کیونکہ اس میں انعام (مویشیوں) کی حلت و حرمت کے متعلق کفار کے خیالات فاسدہ کی تردید کی گئی ہے۔اس لیے سورۃ کا نام الانعام رکھا گیا۔
اس کے کلمات کی تعداد تین ہزار ایک سو اور حروف بارہ ہزار نو سو پینتیس ہیں۔
حضرت ابن عباس (رض) اور دیگر صحابہ سے بسند صحیح ثابت ہے کہ یہ سورۃ باستثنا چند آیات بیک وقت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔
اس کے سال نزول کا تعین مشکل ہے۔ لیکن مختلف قرائن اور شواہد کے پیش نظر بعض محققین کا یہ خیال ہے کہ حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مکہ زندگی کے آخری حصہ میں ہجرت سے کچھ عرصہ پہلے یہ سورت نازل ہوئی۔
مدینہ طیبہ میں اسلام کو یہودیت اور عیسائیت سے واسطہ پڑا تھا۔اس لیے مدنی سورتوں میں ان کے عقائد کی تردید، ان کے اطوار کا محاسبہ اور ان کی اصلاح پر زیادہ توجہ دی گئی لیکن مکہ کا ماحول بالکل انوکھا تھا۔ یہاں کے لوگ نظریاتی اور اعتقادی لحاظ سے یکسر جدا تھے۔ یہاں کی زندگی کی مشکلات اور مسائل نرالی قسم کے تھے۔ان حالات میں اللہ تعالی کی طرف سے اپنے نبی پر جو وحی نازل ہوئی اس میں انھیں مشکلات کا حل اور انھیں مسائل کا جواب پیش کیا گیا ہے۔اس لیے اس سورۃ کریمہ کے مطالعہ سے پہلے اس سورۃ کریمہ کی مندرجہ ذیل خصوصیات کا ذہن نشین کر لینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

سورۃ کی خصوصیات

(1) مکہ کی تقریبا تمام تر آبادی مشرک اور بت پرست تھی۔ان پتھر کے بتوں اور مٹی کی مورتیوں کے متعلق ان کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ بھی الہ (خدا) ہیں۔اس بے سروپا بات کے اظہار میں انھیں ذرا تامل نہ تھا۔ بلکہ جب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انھیں بتایا کہ یہ بے جان اور بے زبان مجسمے خدا نہیں۔خدا تو وہ ذات والا صفات ہے جو زمین و آسمان کا خالق ہے۔ہر چیز پر قادر ہے اور اس کے علم سے کائنات کا کوئی ذرہ
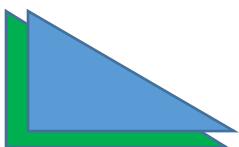
بھی مخفی نہیں۔ تاریک غار میں اندھیری رات میں ننھی سی چیونٹی کے رینگنے کی آواز کو بھی سنتا ہے۔ تو یہ سن کر وہ حیران و ششدر ہو گئے اور مارے حیرت کے کہہ اٹھے اجعل الالهة الها واحدا ان هذا الشيء عجاب۔ یہ تو بڑی عجیب و غریب بات ہے۔ جب وہ ان کو خدا مانتے تھے تو ان کی عبادت بھی کیا کرتے تھے۔ خدا سمجھتے ہوئے اپنی مشکلات اور تکالیف میں انھیں کی طرف رجوع بھی کیا کرتے۔ اپنی ضروریات اور حاجات کے لیے انھیں کے سامنے دست سوال بھی دراز کیا کرتے۔ وہی ان کے مینہ برسانے والے، وہی ان کو صحت دینے والے، وہی ان کو دشمنوں پر غالب کرنے والے تھے۔ اس سورۃ پاک میں ان کے اس مشرکانہ عقیدہ کی تردید کی گئی ہے انھیں بتایا گیا کہ پتھر کے یہ بت جو شکل و صورت میں کسی سنگ تراش کے مرہون منت ہیں وہ خدا کیسے ہو سکتے ہیں۔ خدا تو وہ ذات ہے جس نے کن (ہو جا) تو یہ عالم رنگ و بو اپنی تمام دلآویزیوں اور عظمتوں کے ساتھ موجود ہو گیا۔ جس کا علم اتنا ہمہ گیر ہے کہ ظاہر و باطن سب اس پر عیاں ہے۔ جس کے اختیارات غیر محدود ہیں۔ وہ جو چاہے، جتنا چاہے، جسے چاہے عطا فرمادے کوئی اعتراض نہیں کر سکتا۔ اور جو چاہے جس وقت چاہے جس سے چاہے چھین لے کوئی دم نہیں مار سکتا۔ ساری کائنات نوری و ناری، آبی اور خاکی سب کی سب بلا استثنا اپنے وجود، اپنی بقا، اپنی نشو و نما، اپنے تمام شوون حیات میں ہر لحظہ، ہر لمحہ اس کی نظر رحمت کی محتاج ہے اور اسے کسی کی حاجت نہیں۔ اس طرح اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کی صفت کمال کا ذکر کر کے ان کے مشرکانہ عقیدہ کی بے سرو پائی کو طشت از بام کر دیا اور اس کی بنیادوں کو اس طرح لرزا دیا کہ اگر بے جا ضد، بانی اسلام سے بلاوجہ حسد اور عناد کے جذبات اس عمارت کو کچھ وقت تک سہارا نہ دیتے رہتے تو وہ اسی وقت پیوند خاک ہو جاتی۔

(2) دلائل توحید۔ قرآن اپنے پڑھنے اور سننے والے کو فلسفہ کی بھول بھلیوں میں حواس باختہ اور اس کی ثقیل اور غیر مانوس اصطلاحوں سے مرعوب نہیں کرتا۔ بلکہ کائنات کی اس کھلی ہوئی کتاب میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ یہ سورج، یہ چاند کس کی کبریائی کے شاہکار ہیں۔ زمین کی سطح پر لہلہاتے ہوئے شاداب کھیت، رنگارنگ پھول، قسم قسم کے پھل کس کی قدرت کی شہادت دے رہے ہیں۔ یہ گھنگھور گھٹائیں اور ان سے ٹپکنے والے حیات بخش قطرے کس کی رحمت کا مظہر ہیں؟ صرف اللہ وحدہ لا شریک کے۔ کون انکار کر سکتا ہے ان حقائق کا۔ یہی وہ نور تاباں تھا جس کی تجلّیوں کے سامنے کفر و شرک کی ظلمتوں کو کہیں پناہ نہ ملی۔

(3) مشرکین کا رویہ۔ اسلام، قرآن اور صاحب قرآن (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے مشرکین کی مخالفت کسی سنجیدگی اور متانت پر مبنی نہ تھی اور نہ قرآنی دلائل کے جواب میں ان کے پاس کوئی ایسی قوی دلیل تھی جس سے وہ اپنے باطل عقائد کی حفاظت کر سکتے۔ ان کا سارا سرمایہ مذاق، تمسخر اور طرح طرح کی حجت بازیاں تھیں۔ فرشتہ جو وحی لاتا ہے وہ ہمیں نظر کیوں نہیں آتا۔ قرآن ایک مرتب کتاب کی صورت میں کیوں نازل نہیں ہوا۔ اس یتیم اور بے یار و مددگار کو رسالت و نبوت کے لیے کیوں منتخب کیا گیا۔ لو اور سنو موت کے بعد نئی زندگی کا پرچار ہو رہا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی ماننے کی بات ہے۔ بس اس قسم کے ان کے اعتراضات تھے جنہیں وہ بڑی شد و مد سے پیش کیا کرتے۔ اس سورۃ میں ان کا رد کیا گیا ہے۔

(4) تسلی و اطمینان۔ ایک طرف انتہائی خلوص، للّٰہیت اور خیر اندیشی کے جذبات کے ساتھ نور حق کی طرف رہنمائی کی جارہی ہے۔ دوسری طرف سے ضد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ اس سے ہادی برحق کا دل رحیم بہت رنجیدہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بار بار تسلی دیتے ہیں کہ آپ رنجیدہ نہ ہوں۔ آپ سے پہلے بھی انبیاء آئے۔ انھیں ستایا گیا۔ اذیتیں پہنچائی گئیں۔ لیکن انھوں نے صبر کیا۔ یہی سنت الٰہی ہے۔ آپ کو بھی صبر سے اس سرد مہری اور دل آزاری کا سامنا کرنا ہوگا۔ حق و باطل کی آویزش، نور و ظلمت کی کشمکش کا

سلسلہ جاری رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں کہ وہ چشم زدن میں سب کو اسلام لانے پر مجبور کر دے لیکن یہ اس کی حکمت کے خلاف ہے۔ ورنہ ابراہیم (علیہ السلام) اور نمرود کی پہچان کیسے ہو۔ حسین (رض) ویزید کا امتیاز کیونکر ہو۔

(5) مشرکانہ رسوم۔ سورۃ کے آخری حصہ میں مشرکین کی ان جاہلانہ رسموں کی تردید کی گئ ہے جو انھوں نے جانوروں کی حلت وحرمت وغیرہ کے متعلق مقرر کر رکھی تھیں۔ اور واضح طور پر بتادیا کہ یہ تمہاری من گھڑت باتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم نہیں۔

(6) رکوع 15 میں مکارم اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے اور اخلاق رذیلہ سے اپنے حکیمانہ انداز میں منع کیا گیا ہے۔

(7) اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کے آخری رکوع میں اپنے محبوب کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم فرمایا ہے کہ قل ان صلوتی تا وانا اول المسلمین کا اعلان کریں۔ ان دونوں آیتوں کا ترجمہ آپ بار بار پڑھیں اور غور کریں۔ آپ کا دل پکار اٹھے گا کہ بخدا یہی حاصل اسلام ہے، یہی روح توحید ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

ترتیب نزول کے اعتبار سے قرآن کریم کی 38 ویں سورت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے مروی سورتوں کی ترتیب کے مطابق یہ صورت سورۃ الجن سے قبل اور سورۃ ص کے بعد نازل ہوئی جبکہ ترتیب تلاوت میں یہ چھٹی صورت ہے۔ سورۃ فاتحہ کے بعد ترتیب تلاوت میں یہ پہلی مکی سورت ہے۔ اس سے قبل بقرہ سے مائدہ تک سب مدنی سورتیں ہیں۔ اس صورت میں بیس رکوعات 165 آیات 3100 کلمات اور 12923 حروف ہیں۔ سورۃ انعام مکی دور میں کس سن میں نازل ہوئی اس بارے میں کچھ تعین نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ یہ مروی ہے کہ یہ سورت اکٹھی ایک بار نازل ہوئی۔ حضور سرور کونین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اونٹنی پر سوار تھے قریب تھا کہ وحی کے بوجھ سے اونٹنی کی ٹانگیں ٹوٹ جائیں۔ طبرانی عن اسماء بنت یزید (رض)۔ (درمنثور جلد ۳ صفحہ ۲ مطبوعہ دار المعرفہ بیروت)

مضامین

اس کے مضامین یہ ہیں: اللہ وحدہٗ لاشریک کی ذات و صفات، حقیقت انسان، پچھلی منکر قوموں کے عذابات، صداقت قرآن، جانوروں کے متعلق مشرکین عرب کے غلط نظریات کا رد یعنی ان کا جانوروں کو اپنے بتوں کے نام منسوب کرکے انھیں حرام قرار دینا۔ اسی لئے اس کا نام ہی سورۃ الانعام رکھا گیا۔ انعام کا معنٰی جانور ہے۔

فضیلت

حضرت علی المرتضٰی (رض) فرماتے ہیں۔ سورۃ الانعام کے ساتھ ہر آسمان سے ستر ہزار فرشتے نازل ہوئے۔ یہ جس بیمار پر پڑھی جائے اسے شفا ملتی ہے۔ (بیہقی فی شعب الایمان)

ابن ضریس نے حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ اس کے ساتھ اتنے فرشتے اترے کہ آسمان و زمین کا خلا بھر گیا۔ ان کی تسبیح سے زمین دہل اٹھی اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سجدے میں گر گئے۔ اور طبرانی اور ابن مردویہ نے ایسی ہی روایت حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے بھی روایت کی ہے۔

طبرانی اور ابن مردویہ نے اسماء بنت یزید (رض) سے روایت کیا ہے، کہتی ہیں: سورۃ الانعام رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر یکبار گی نازل ہوئی۔ میں نے آپ کی اونٹنی کی مہار پکڑ رکھی تھی، ان کادت من ثقلها لتکسر عظام الناقة۔ قریب تھا کہ اس صورت کے بوجھ سے اونٹنی کی ٹانگیں ٹوٹ جائیں (در منثور جلد 3 صفحہ 243)

دیلمی نے سند ضعیف کے ذریعہ حضرت انس (رض) سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

ینادی مناد: یاقارء سورة الانعام هلم الی الجنة بحبك ایاها و تلاوتها۔ "ایک ندا کرنے والا ندا کرتا ہے کہ اے سورۃ الانعام کے پڑھنے والے! آؤجنت کی طرف اس لیے کہ تم اس صورت سے محبت رکھتے اور اسے پڑھتے تھے" (در منثور جلد 3 صفحہ 244)

دیلمی نے حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:

من صلی الفجر فی جماعة و قعد فی مصلاه و قرأ ثلاث آیات من اول سورة الانعام و کل الله به سبعین ملکا یسبحون الله ویستغفرون له الی یوم القیامة۔

"جو شخص نماز فجر باجماعت پڑھے، پھر اپنی جائے نماز پر بیٹھے ہوئے سورۃ انعام کی پہلی تین آیتیں تلاوت کرے اللہ تعالیٰ اس کے لئے ستر فرشتے مقرر کردیتا ہے جو اللہ کی تسبیح کہتے اور قیامت تک اس کے لئے استغفار کرتے ہیں" (در منثور جلد 3 صفحہ 246)

ابوالشیخ نے حبیب بن ابی محمد سے روایت کیا، کہتے ہیں: جس نے سورۃ انعام کی پہلی تین آیات تَكۡسِبُوۡنَ تک پڑھیں اللہ تعالیٰ اس کے لیے ستر فرشتے مقرر کردیتا ہے جو روزے قیامت تک اس کے لئے دعا کرتے ہیں اور اس شخص کو ان کے اعمال کے برابر اجر ملتا ہے جو روز قیامت وہ آئے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کرے گا اور اسے جام سلسبیل سے پھیلائے گا اور حوض کوثر سے اسے غسل دے گا اور اسے فرمائے گا: میں تمہارا سچا رب ہوں اور تم میرے سچے بندے ہو۔

ابن ضریس نے بھی ابو محمد فارسی سے ایسا ہی روایت کیا ہے۔ (برے منثور جلد 3 صفحہ 245)

(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

یہ سورت مکی ہے کیونکہ یہ ہجرت سے پہلے نازل ہوئی۔ مشرکین مکہ نے اپنی جاہلانہ رسوم کے پیش نظر بعض مویشیوں کو حلال اور بعض کو حرام کرلیا تھا۔ اس سورت میں ان فاسد خیالات کی تردید کی گئی ہے جن کی بنیاد پر وہ بعض مویشیوں کو حلال اور بعض کو حرام قرار دیتے تھے۔ اس لیے اس کا نام انعام (مویشی) رکھا گیا ہے۔

سورۃ اَنعام کی فضیلت

حضرت انس بن مالک (رض) سے روایت ہے، رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "سورۃ اَنعام نازل ہوئی اور اس کے ساتھ بلند آواز سے تسبیح کرتی ہوئی فرشتوں کی ایک جماعت تھی جس سے زمین وآسمان کے کنارے بھر گئے، زمین ان فرشتوں کی وجہ سے ہلنے لگی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تین مرتبہ "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ" کہا۔ (2)
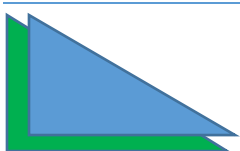
سورۃ اَنعام کے مضامین

سورۃ اَنعام قرآن مجید میں مذکور سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے پہلی مکی سورت ہے اور اس کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ اس میں اسلام کے بنیادی عقائد، جیسے اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت، اس کی صفات اور اس کی قدرت کو انسان کی اندرونی اور بیرونی شہادتوں سے ثابت کیا گیا ہے۔ وحی اور رسالت کے ثبوت اور مشرکین کے شبہات کے رد پر عقلی اور حسی دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے، قیامت کے دن اعمال کا حساب ہونے اور اعمال کی جزاء ملنے کو دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس سورت میں یہ مضامین بیان کئے گئے ہیں۔

(1)۔۔ زمین میں گھوم پھر کر سابقہ لوگوں کی اجڑی بستیاں، ویران گھر اور ان پر کئے ہوئے اللہ تعالیٰ کے عذاب کے آثار دیکھ کر ان کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

(2)۔۔ جانور ذبح کرنے اور ذبح شدہ جانور کا گوشت کھانے کے احکام بیان کئے گئے اور اپنی طرف سے حلال جانوروں کو حرام قرار دینے کا رد کیا گیا ہے۔

(3)۔۔ والدین کے ساتھ احسان کرنے، ظاہری اور باطنی بے حیائیوں سے بچنے، تنگدستی کی وجہ سے اولاد کو قتل نہ کرنے اور کسی کو ناحق قتل نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(4)۔۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کی قوم کا واقعہ بیان کیا گیا اور آخر میں قرآن اور دین اسلام کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

سورۃ مائدہ کے ساتھ مناسبت

سورۃ اَنعام کی اپنے سے ماقبل سورت "مائدہ" کے ساتھ مناسبت یہ ہے کہ سورۃ مائدہ کی آیت نمبر 87 میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا تھا کہ "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا"

اے ایمان والو! ان پاکیزہ چیزوں کو حرام نہ قرار دو جنہیں اللہ نے تمہارے لیے حلال فرمایا ہے اور حد سے نہ بڑھو۔

اور سورۃ اَنعام میں یہ خبر دی گئی کہ مشرکین نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ چند (حلال) چیزوں کو (اپنی طرف سے) حرام قرار دے دیا اور یہ کہہ دیا کہ اسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے، اور یہ خبر دینے سے مقصود مسلمانوں کو اس بات سے ڈرانا ہے کہ اگر انھوں نے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو (اپنی طرف سے) حرام قرار دے دیا تو وہ کفار کے مشابہ ہو جائیں گے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

ہجرت سے پہلے مکہ میں نہ تو اسلامی حکومت تھی اور نہ ہی وہاں پر یہود اور عیسائی آباد تھے بلکہ سارے لوگ مشرک اور بت پرست تھے۔ اس لیے اس سورت میں اسلام کے بنیادی عقائد یعنی توحید، رسالت اور آخرت کو آسان اور عام فہم انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سورت کی ابتداء ہی اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے بیان سے ہو رہی ہے یعنی خدا وہ ہے جس نے زمین و آسمان کو تخلیق کیا۔ تاریکی اور روشنی کو بنایا اور لوگوں کو مٹی سے پیدا کیا، مگر مشرکین مکہ بت پرستی اور ایسا اندھا عقیدہ رکھتے تھے کہ توحید کی بات سننے کو تیار نہیں تھے بلکہ اسلامی عقائد کا مذاق اڑاتے اور عجیب و غریب قسم کی حجت بازیاں کرتے یعنی اللہ تعالیٰ لکھی ہوئی کتاب نازل کیوں نہیں کرتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر لکھی ہوئی

کتاب ان کی آنکھوں کے سامنے آسمان سے نازل ہو اور یہ اسے اپنے ہاتھوں پے چھو کر دیکھ لیں پھر بھی اس کو جادو کا کرشمہ کہہ کر انکار کر دیں گے۔

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دی کہ پہلے انبیائے کرام (علیہم السلام) کے ساتھ بھی اقوام نے معاندانہ رویہ اختیار کیا، لہٰذا آپ ان کے تعصب اور عناد سے کبیدہ خاطر نہ ہوں اور اپنی تبلیغ پوری استقامت سے جاری رکھیں کیونکہ آپ کی نماز و قربانی اور زندگی و موت سب اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے وقف ہیں اور یہی کامیابی کا اصل راز ہے۔ جو بندہ مومن اس راز حیات سے آگاہ ہو جاتا ہے اور اپنی عبادت اور زندگی و موت اللہ تعالیٰ کے لیے وقف کر دیتا ہے وہ مقصد تخلیق کی معراج پالیتا ہے۔ یارب العالمین! تیرے اس عاجز و خطاکار بندہ نے بھی بزعم خویش اپنی زندگی، موت اور توانائیاں آپ کے سچے دین کے لیے وقف کر رکھی ہیں تو اس میں برکت، صداقت اور استقامت عطا فرما۔ آمین۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

ربط و تعارف

سورہ انعام ان طویل مکی سورتوں میں سے ہے جن کا موضوع، عقیدہ اور اصول ایمان ہے۔ تاہم مدنی سورتوں جیسے بقرہ، آل عمران، نساء اور مائدہ جن کی تفسیر ہو چکی ہے، ان سے قدرے مختلف سورۃ انعام کے اہداف و مقاصد ہیں۔ اس سورت میں تنظیمی احکام جیسے روزہ، حج، حدود، تعزیرات، احکام قید و بند، محاربہ وغیرھا کو بیان نہیں کیا گیا جیسے اہل کتاب یہود، نصاریٰ و منافقین کے بارے میں کوئی تذکرہ نہیں۔ اس میں بڑے بڑے اساسی مسائل جو عقیدہ و ایمان کے اصول قرار پاتے ہیں، بیان کیے گئے ہیں۔ ان اساسی مسائل کو مختصراً تین عناوین میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

1)۔۔۔ مسئلہ الوہیت

2)۔۔۔ مسئلہ وحی رسالت

3)۔۔۔ مسئلہ بعث بعد الموت اور رجزا

سورت میں دعوت اسلام کے لیے ان اساسی اصول کی جامعیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور ان اصول کو براہین قاطعہ اور دلائل باہرہ کے ساتھ مدلل کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے اور اس وقت اس سورت کے اولین مخاطب مشرکین تھے۔ تھوڑا غور کرنے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اس سورت میں دعوت و تبلیغ کے دو اسلوب اختیار کیے گئے ہیں جبکہ بقیہ سورتوں میں یہ اسالیب اتنی کثرت سے اختیار کیے گئے۔ یہ اسالیب مندرجہ ذیل ہیں:

(1)۔۔۔ اسلوب تقریر (2)۔۔۔ اسلوب تلقین

اول: اسلوب تقریر:۔۔۔ قرآن مجید میں توحید باری تعالیٰ پر دلائل قائم کیے گئے ہیں جو رب تعالیٰ کی قدرت، غلبہ، سلطنت اور سطوت پر دال ہیں۔ اس اسلوب کے بیان کے لیے عموماً واحد غائب کی ضمیر مرفوع متصل استعمال کی گئی ہے جس کا مرجع فوراً قلب سلیم میں اتر جاتا ہے اور یہ امر کسی ذی شعور پر مخفی نہیں رہتا کہ اللہ تعالیٰ ہی کائنات کو وجود بخشنے والا ہے۔ وہی صاحب فضل ہے، وہی انعام و احسان کرنے والا ہے۔ چنانچہ "ھو" کی ضمیر لائی گئی ہے جو خالق کائنات پر دلالت کرتی ہے۔ جیسے: ھو الذی خلقکم من طین وھو اللہ فی السموت الارض، وھو الذی یتوفکم بالیل، وھو القاھر فوق عبادہ وھو الذی خلق السموت والارض بالحق الخ، وو القاھر فوق عبادہ۔

دوم: اسلوب تلقین:۔۔۔رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعلیم سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حجت و دلیل کی تلقین فرماتے تاکہ مدمقابل کا ماتھا ٹھنک جائے اور وہ حجت و دلیل پر توجہ دے اور دلیل اس کے دل میں اتر جائے اور گھر کرلے پھر وہ اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتا اور نہ ہی ادھر ادھر ہو سکتا ہے۔ یہ اسلوب عموماً سوال و جواب کی صورت میں اختیار کیا گیا ہے۔ پہلے سوال کیا جاتا ہے پھر ساتھ ہی اس کا جواب دیا جاتا ہے۔ جیسے مندرجہ ذیل آیات سے واضح ہے:

قل لمن مافی السموت والارض، قل لله، کتب علی نفسه الرحمة، قل ای شیء اکبر شهادة، قل الله، شهيد بيني وبينكم، قل ارءيتم ان اخذ الله سمعكم وابصاركم وختم على قلوبكم من اله غير الله يأتيكم به، وقالوا لولا نزل عليه اية من ربه، قل ان الله قادر على ان ينزل اية ولكن اكثرهم لا يعلمون۔

اس اسلوب کو اختیار کرکے مشرکین کے ساتھ مناقشہ کیا گیا ہے اور دلائل و حجج اور براہین سے انہیں لاجواب کیا گیا ہے۔ اس لیے دعوت اسلام کے پیش نظر سورۃ انعام کو مکی سورتوں میں امتیاز حاصل ہے۔ اسلام کے حقائق واضح کیے ہیں اور اس کے اساس کو مضبوط کیا ہے۔ معارضین کے شبہات ختم ہو جاتے ہیں۔ سورت میں توحید کا ذکر ہے کہ اللہ خلق و ایجاد میں منفرد ہے۔ تشریع و عبادت میں واحد ہے۔ پیغمبروں کو جھٹلانے والوں کا موقف ذکر کیا گیا اور امثال سابقہ کے قصص بیان کرکے ان سے عبرت حاصل کرنے کی توجہ دلائی گئی ہے۔ ان مکذبین نے رسالت اور وحی کے متعلق جو شبہات ظاہر کیے، ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعث بعد الموت اور جزاوسزا کا ذکر بھی ہے۔ یہ سب امور دلائل انفسی اور دلائل آفاقی سے مدلل کیے گئے ہیں۔ انبیاکے باپ ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کے بیٹوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورت میں رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی راہنمائی کی گئی ہے کہ مشکلات میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ حشر کے دن مکذبین کے حالت کی تصویر کشی کی گئی ہے پھر جاہلیت میں کفار کے جاہلی تصرفاتی عقائد کا بھی بیان ہے اور ان کی خود ساختہ تحلیل و تحریم کا بھی ذکر ہے اور اس پر نفاذ و ابطال کا حکم بھی لگایا گیا ہے۔ سورت کے آخر میں دس وصیتیں ذکر کی گئی ہیں جو ہر آسمانی کاتب میں ذکر کی گئی ہیں اور انبیا سابقین اپنی امتوں کو ان کی دعوت دیتے رہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

قل تعالوا اتل ما حرم ربكم عليكم الا تشركوا به شيئا وبالوالدين احسانا، ولا تقتلوا اولادكم من املاق، نحن نرزقكم واياهم، ولا تقربوا الفواحش ما ظهر منها وما بطن، ولا تقتلوا النفس التي حرم الله الا بالحق، ذلكم وصكم به لعلكم تعقلون

سورت کے اختتام میں انسانی منصب پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے اور انسان کو اللہ نے کائنات سپرد کی ہے جو نسل انسانی ایک کے بعد دوسرا اس مقام پر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی مراتب میں تفاوت رکھی ہے جو اس کی عظیم الشان حکمت کی مظہر ہے۔ اس کی حکمت ابتلا و اختیار میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: **وهو الذي جعلكم خلئف الارض الارض ورفع بعضكم فوق بعض درجت ليبلو كم في ما اتكم، ان ربك سريع العقاب، وانه لغفور رحيم (صفوة)**

شیخ محمود عبدالوہاب محمود مصری قدس سرہ (مبعوث الازہر) نے ایک کلمہ میں اس سورت کی خصوصیت بیان کی ہے، فرمایا: "**الانعام في الغدير**" مویشی تالاب میں! بھینس جب تالاب میں گھستی ہے تو نکلتی نہیں، اس سورت میں بھی اگر متشابہ لگ جائے یا حصر واقع ہو جائے تو جب تک لقمہ نہ ملے حافظ آگے نہیں چل سکتا، اسی طرح اس کی ہر آیت میں نیا مضمون ہوتا ہے، پس ربط بھی غور سے سمجھ میں آئے گا۔

"اس سورت کا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اس میں ایمانیات اور عقائد پر خصوصی توجہ دی گئی ہے، اللہ کے وجود اور اللہ کی توحید وصفات پر ان نشانیوں سے استدلال کیا گیا ہے، جو انسان کے وجود میں چھپی ہوئی اور کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں، نبوت اور وحی کے نظام کو عقل اور محسوسات سے ثابت کیا گیا ہے اور مشرکین کے شبہات کا رد کیا گیا ہے، اسی طرح آخرت پر بھی عقلی دلیلیں پیش کی گئی ہیں، اس سورت میں ایک بنیادی بات یہ کہی گئی ہے کہ دین حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک ایک ہی رہا ہے، یعنی اسلام، "وحدت دین" کا قائل ہے، نہ کہ "وحدت ادیان" کا غرض کہ یہ سورۃ ایمانیات اور ان کے دلائل وبراہین کے اعتبار سے امتیازی شان رکھتی ہے" (آسان تفسیر)۔ (ہدایت)

اس سے پہلے سورۃ فاتحہ کے بعد چار سورتیں گزری ہیں اور وہ چاروں مدنی سورتیں ہیں۔ یہ پہلی مکی سورۃ ہے۔ مکی سورۃ سے مراد یہ ہے کہ یہ سورۃ ہجرتِ مدینہ سے پہلے نازل ہوئی۔ اس سے پہلے کہ ہم اس کے مندرجات کا ذکر کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جن حالات میں اس کا نزول ہوا ہے انھیں ذکر کردیں تاکہ اس کے مندرجات اور تعلیمات کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تیرہ سالہ مکی زندگی کو ہم چار ادوار میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ پہلا دور تین سال پر محیط ہے۔ یہ وہ دور ہے 'جب خاموش تبلیغ کا حکم دیا گیا اور لوگوں کو اعلانیہ اسلام کی دعوت دینے کی ابھی اجازت نہیں تھی۔ اس دوران آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صرف ان لوگوں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی 'جن سے آپ کے قریبی تعلقات تھے یا جو لوگ قرابت داروں میں اعتماد کے لائق تھے۔ چونکہ اس دور میں دعوت کے لیے سب سے بڑا ذریعہ باہمی تعلق تھا 'اس لحاظ سے حضرت صدیق اکبر (رض) نے اپنے تعلقات کے حوالے سے دعوت کے پھیلانے میں سب سے موثر کام کیا کیونکہ آپ مکہ معظّمہ کی ایک بااثر شخصیت تھے۔ آپ ایک معزز تاجر سمجھے جاتے تھے اور اپنی سیرت وکردار کے حوالے سے نہایت نیک نام تھے۔ ایک کاروباری آدمی کے تعلقات چونکہ نسبتاً زیادہ وسیع ہوتے ہیں 'اس لیے حضرت صدیق اکبر (رض) نے اپنے تعلقات کی وسعت اور اپنی شخصیت کی نیک نامی کو اسلام کے لیے استعمال کیا 'جس کے نتیجے میں اس دور میں جتنے بڑے بڑے لوگ مسلمان ہوئے 'وہ حضرت صدیق اکبر (رض) ہی سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے اور آپ ہی کی کاوشوں کے نتیجے میں دائرہ اسلام میں آئے۔

دوسرا دور 'چوتھے اور پانچویں سن نبوی پر محیط ہے۔ ان دو سالوں میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کھل کر تبلیغ ودعوت کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے اپنے خاندان کو جمع کرکے 'ان کے سامنے اسلام کی دعوت رکھی اور پھر صفا پہاڑی پر چڑھ کر آپ نے تمام اہل مکہ کو اللہ کے دین کی طرف بلایا۔ نتیجتاً مکہ کے شرپسند آپ کی مخالفت پر تل گئے اور آپ کی دعوت کے راستے میں امکانی مشکلات اٹھانے کے لیے کوشاں رہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان میں سب سے پیش پیش خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اپنا پڑوسی 'ابولہب تھا۔ ان دو سالوں میں اگرچہ مخالفت خوب ہوئی 'لیکن اس مخالفت میں اذیت رسانی کا عمل نسبتاً حد سے بڑھنے نہیں پایا اور اگر اس کا ہدف کوئی بنا بھی تو وہ غریب لوگ تھے 'جن بے چاروں کا پشت پناہ کوئی نہیں تھا۔ لیکن چھٹے سن نبوی سے لے کر دس سن نبوی تک 'یہ وہ تیسرا دور ہے 'جب مخالفت نے باقاعدہ مزاحمت کی شکل اختیار کرلی اور اہل مکہ کے باوقار اور سنجیدہ لوگوں نے بھی اپنے نظام جاہلیت اور اس پر مبنی اپنے اقتدار کے لیے اس دعوت کو ایک خطرہ سمجھنا شروع کردیا اور یہ محسوس کرنے لگے کہ اگر اس دعوت کو نفوذ عام کا موقع مل گیا تو ہمارا تمام تر وقار خاک میں مل جائے گا اور ہماری یہ مصنوعی چودھراہٹیں ختم ہو کر رہ جائیں گی۔ اس لیے اب ان کی مخالفت بلکہ ان کی تذلیل اور اذیت رسانی کا ہدف صرف غریب لوگ نہ رہے بلکہ خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات گرامی اور باقی تمام مسلمان بھی ان سے محفوظ نہیں تھے۔ اس صورتحال کو دیکھ کر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحابہ کو مشورہ دیا کہ تم حبشہ کی طرف ہجرت کر جاؤ 'میں نے سنا ہے کہ وہاں کا بادشاہ نہ خود کسی پر ظلم کرتا ہے اور نہ کسی پر ظلم ہونے دیتا ہے۔ چنانچہ

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ مسلمانوں کی بیشتر تعداد حبشہ ہجرت کر گئی۔ وہاں کے بادشاہ نجاشی نے ان کو اپنے ملک میں نہ صرف عزت سے رہنے کی اجازت دی بلکہ جب قریش کے بھیجے ہوئے سفیر اس کے پاس تحائف لے کر پہنچے اور مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کو ہمارے حوالے کر دیا جائے کیونکہ یہ ہمارے ملک سے بے دین ہو کر بھاگے ہوئے لوگ ہیں ' تو نجاشی نے صورتحال معلوم کرنے کے بعد مسلمانوں کو ان کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔

مکی زندگی کا چوتھا دور، دس سن نبوی کے بعد آخری تین سالوں پر محیط ہے۔ ان سالوں میں حضرت خدیجہ الکبریٰ (رض) وفات پا گئیں ' ابوطالب دنیا سے اٹھ گئے۔ یہی دو شخصیتیں تھیں ' جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پشت پناہی کر رہی تھیں اور ان کے اثر ورسوخ کے باعث قریش کسی خطرناک اقدام سے پس و پیش کر رہے تھے کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ ابوطالب بنو ہاشم کے سردار ہیں اور وہ پوری طرح آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنی پناہ میں لے چکے ہیں۔ اگر حضور کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو یقیناً بنو ہاشم ' اس کے قصاص کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے اور عرب اس سے خوب واقف تھے کہ کسی ایک قبیلے کا قصاص کے لیے اٹھ کھڑا ہونا قبائلی زندگی میں کیا معنی رکھتا ہے۔ بعض دفعہ اس کے نتیجے میں ایسی لڑائیاں چھڑ جاتی ہیں ' جو حرب بسوس کی طرح بیسیوں سال چلتی ہیں۔ وہ اس سے پہلے جنگوں کے تھکائے ہوئے لوگ تھے ' اس لیے وہ مزید کسی جنگ میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ لیکن جناب ابوطالب کے اٹھ جانے کے بعد ' اب بنو ہاشم کی سربراہی ابولہب کے پاس آئی تو اس بدبخت نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قبیلے کا تحفظ فراہم کرنے سے انکار کر دیا۔ اب قریش ایک طرح سے آزاد تھے کہ وہ جب چاہتے کسی بھی خطرناک اقدام کا فیصلہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان آخری تین سالوں میں ' آپ بے پناہ مشکلات سے دوچار ہوئے اور آپ کے ساتھی بھی بری طرح ادھیڑے کھدیڑے گئے۔ انہی سالوں میں معلوم ہوتا ہے کسی وقت اس سورۃ کا نزول ہوا ہے کیونکہ اس کی تائید میں ہمیں حضرت عبداللہ ابن عباس (رض) کی روایت ملتی ہے کہ حضرت اسماء بنت یزید (رض) جو حضرت معاذ بن جبل کی چچازاد بہن ہیں ' وہ کہتی ہیں کہ جب یہ سورۃ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل ہو رہی تھی ' اس وقت آپ اونٹنی پر سوار تھے۔ میں اس کی نکیل پکڑے ہوئے تھی اور بوجھ کے مارے اونٹنی کا یہ حال ہو رہا تھا ' معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ہڈیاں اب ٹوٹ جائیں گی۔ حضرت اسماء بنت یزید (رض) چونکہ ایک انصاریہ خاتون تھیں اور ہجرت کے بعد ایمان لائی تھیں ' اگر قبول اسلام سے پہلے محض بربنائے عقیدت وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں مکہ حاضر ہوئی ہوں گی تو یقینا یہ حاضری آپ کی مکی زندگی کے آخری سال ہی میں ہوئی ہوگی ' اس سے پہلے اہل یثرب کے ساتھ آپ کے تعلقات اتنے بڑھے ہی نہ تھے کہ وہاں سے کسی عورت کا آپ کی خدمت میں حاضر ہونا ممکن ہوتا۔

حضرت اسماء بنت یزید (رض) کا اسلام لانے سے پہلے مکہ معظّمہ میں آنحضرت کی خدمت میں آنے سے تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ مدینہ طیبہ میں حضرت مصعب بن عمیر (رض) کی کوششوں سے تیزی سے اسلام پھیل رہا تھا اور اوس وخزرج کا کوئی خاندان ایسا نہ تھا ' جس میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات گرامی کے بارے میں اکثر باتیں نہ ہوتی ہوں۔ انسانی فطرت یہ ہے کہ جب آدمی کسی بڑی شخصیت کے بارے میں ایسی باتیں سنتا ہے ' جس سے اس کی محبوبیت عظمت اور غیر معمولی پن کا احساس ہوتا ہو تو دل میں یہ خیال مچلنے لگتا ہے کہ کاش ! میں ایسی عظیم شخصیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں۔ ابھی چونکہ یہ بات معلوم نہ تھی کہ حضور مدینہ تشریف لاتے بھی ہیں یا نہیں اور اگر تشریف آوری کا ارادہ بھی ہو تو کب تک ایسا ہو سکے گا ' معلوم ہوتا ہے حضرت اسماء بنت یزید کی محبت و عقیدت نے جوش مارا اور آپ اسلام قبول کرنے سے پہلے آنحضرت کی زیارت کے لیے مکہ معظّمہ چلی آئیں۔ عقیدت و محبت میں آپ کی اونٹنی کی مہار تھامے کھڑی تھیں ' جب اتفاق سے اس سورۃ کا نزول ہوا۔ (روح القرآن تعلیقاً۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی القرآن)

ہماری ان گذارشات سے ایک تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ سورۃ مکی زندگی کے آخری دور میں نازل ہوئی ہے اور ساتھ ہی ' ہم نے مکی زندگی کے آخری دونوں ادوار کے حوالے سے مشرکین مکہ اور مسلمانوں کے درمیان جس کشمکش کا ذکر کیا ہے ' اس سے یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہتا کہ ایسی نازک صورتحال میں جبکہ مسلمانوں کی واضح اکثریت ہجرت کر کے حبشہ جا چکی تھی اور کچھ لوگ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ جا چکے تھے ' ایک محدود تعداد مکہ معظّمہ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ تھی اور مخالفت کی چکی کی تیزی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور صاف معلوم ہو رہا تھا کہ مشرکین مکہ کسی آخری اقدام کے لیے پر تول رہے ہیں۔ ایسی صورتحال میں مسلمانوں کو اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ مصائب کو برداشت کرنے اور حالات کا سامنا کرنے کے لیے ' انھیں ایسے مضبوط بنیادی احساسات سے بہرہ ور کیا جائے ' جس سے ان طوفانوں کا سامنا کرنا ' ان کے لیے آسان ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ انھیں ایسے مضبوط عقائد سے مسلح کر دیا جائے ' جس کے نتیجے میں اللہ کی ذات کا استحضار ' اس کی ذات سے گہری محبت ' مصائب میں اس پر بے پناہ اعتماد ' اس کی قدرتوں کا غیر متزلزل یقین اور اس کی راہنمائی کی امید ' ہر وقت ان کے دل و دماغ میں موجزن رہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی ان کے دل و دماغ میں اتار دی جائے کہ یہ دنیا چند روزہ ہے ' اللہ کے راستے میں اگر یہاں قربانی بھی دینی پڑتی ہے تو یہ کوئی نقصان کا سودا نہیں بلکہ اس کے بدلے میں ہمیشہ رہنے والی دنیا میں وہ ابدی راحتیں اور خوشیاں نصیب ہوں گی جن کا تصور بھی آج مشکل ہے اور مزید یہ کہ اس صورتحال میں جس میں مسلمان گھر گئے تھے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات تو نمونے کے طور پر موجود تھی ہی ' ساتھ ساتھ ایک ایسی ذات کی زندگی کو بھی ایسی ہی کشمکش سے گزرتے ہوئے دکھانے کا بھی انتظام کیا جائے ' جس کے ساتھ قریش کو اپنے نسبی تعلق کا دعویٰ ہے اور وہ سمجھتے یہ ہیں کہ ہم ان کے طریقے پر چل رہے ہیں۔ یعنی حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا مضبوط یقین ' اللہ کے راستے میں ان کی قربانیاں اور اللہ کے ساتھ ان کے راست تعلق کو واضح کیا جائے تاکہ مسلمانوں کو اس کشمکش سے گزرنا آسان ہو جائے۔ چنانچہ یہی وہ بنیادی مضامین ہیں ' جو ان کے ضمنی مباحث کے ساتھ سورۃ الانعام میں بیان کیے گئے۔ لیکن ان میں اہم تر موضوع چونکہ مکہ معظّمہ میں ایک مضبوط سیرت و کردار کے حوالے سے افراد سازی کا ہے۔ اس لیے زیادہ تر زور اس سورۃ میں اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ وجہ اس کی ظاہر ہے ' جو لوگ مکی زندگی میں قبول اسلام میں سبقت کر رہے ہیں آئندہ یہی اسلامی زندگی اور امت اسلامیہ کی تعمیر و تشکیل میں ہر اول دستے کے طور پر اپنا رول ادا کریں گے۔ یہی لوگ آنے والی امت کا نمونہ بنیں گے اور انہی کے جرأت مندانہ اقدامات ' انہی کی قربانیاں اور انہی کی وفا شعاریاں اس امت کی آئندہ تاریخ کا وہ عظیم سرمایہ ہوں گی ' جو قیامت تک امت اسلامیہ کو روشنی مہیا کرتا رہے گا۔ اس لیے انتہائی ضروری تھا کہ سب سے پہلے ان کی سیرت و کردار کی تشکیل کے لیے ' ان بنیادی چیزوں پر زور دیا جائے ' جو افراد سازی کے لیے انتہائی ضروری ہیں اور افراد میں دل و دماغ کی تیاری ' فکری راست روی اور عملی اصابت اور پختگی کے لیے راہنمائی کا کام دے سکتی ہیں۔ چنانچہ جب ہم اس پہلو کے حوالے سے انسانی فطرت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ انسان کی تمام عملی قوتیں بلکہ اس کے شعوری فیصلے بھی ' ان تصورات اور خیالات کے زیر اثر وجود میں آتے ہیں ' جو شعوری اور غیر شعوری طور پر انمٹ نقوش کی صورت میں اس کے دل و دماغ میں پیوست ہو چکے ہوتے ہیں۔ یہی وہ تصورات ہیں ' جو اس کی پوری زندگی پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اس کی بے عملی کو قوت محرکہ بن کر حرکت میں تبدیل کرتے اور اچھائی اور برائی کے لحاظ سے ' اس کی ایک جہت مقرر کرتے ہیں۔ جب بھی کسی فرد یا کسی قوم میں تشکیل کردار کا مرحلہ درپیش ہو تو اس میں اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہوتا کہ اس قوم کے خیالات و احساسات کو صحیح رخ پر ڈالنے کی کوشش کی جائے اور اگر اس میں کامیابی ہو جائے تو پھر اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اعمال خود بخود سلامتی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اگر خدانخواستہ ان خیالات و احساسات میں کوئی کجی پیدا ہو جائے تو پھر اعمال کی اصلاح کی کوئی صورت ممکن نہیں رہتی۔ دنیا میں ہم افراد اور قوموں میں اچھے اور برے کی جو تقسیم دیکھتے ہیں '

وہ بظاہر ان کے اعمال کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے ' لیکن حقیقت میں اس کا سر رشتہ خیالات کی اصلاح یا بگاڑ کے ساتھ بندھا ہوتا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک مثال پر غور فرمایئے کہ ایک آدمی زخمی حالت میں سڑک پر کراہ رہا ہے۔ اسے دیکھنے والوں میں تین قسم کے لوگ دکھائی دیں گے۔ ایک شخص اسے دیکھتا ہے اور بے نیازی کی نظر ڈال کر اپنی راہ لیتا ہے ' جیسے کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں۔ دوسرا شخص ' اپنی سواری سے اترتا ہے۔ بجائے اس کی نبض دیکھنے کے ' اس کی گھڑی اتارتا ہے ' دل کی دھڑکن سننے کی بجائے ' اس کی جیب خالی کرتا ہے اور رفوچکر ہو جاتا ہے اور تیسرا آدمی ' بے تابی اور بے قراری کی تصویر بنے ' اس کی نبض ٹٹولتا ہے ' اس کے بعد دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اسے اس میں زندگی کی رمق دکھائی دیتی ہے تو فوراً اس کی زندگی بچانے کے لیے اپنی امکانی مساعی سے دریغ نہیں کرتا۔ غور فرمایئے ! یہاں عمل کا محرک ایک ہے ' یعنی زخمی کا سڑک پر تڑپنا۔ لیکن اس کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہونے والے اعمال تین طرح کے ہیں۔ ایک کا عمل انسانیت سے بے نیازی کا۔ دوسرے کا سراسر دشمنی کا اور تیسرے کا ہمدردی اور خیر خواہی کا ہے۔ آخر اعمال میں یہ اختلاف کیوں ہے ؟

اگر آپ گہری نظر سے دیکھیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ اعمال کا اختلاف دراصل اندر کے خیالات اور تصورات کے اختلاف کا نتیجہ ہے۔ جس کے دل میں انسانیت کی طرف سے بے نیازی اور لاپرواہی پائی جاتی ہے ' اس کے عمل میں بھی وہی لاپرواہی اور بے نیازی کارفرما ہے اور جس کے قلبی خیالات میں انسانیت کے لیے دشمنی اور سنگدلی پنہاں ہے ' اس کا عمل بھی اسی سنگدلی کی تصویر ہے اور جس آدمی کے دل میں انسان کے لیے خیر خواہی اور ہمدردی کا جذبہ موجزن ہے ' اس کا عمل بھی اسی جذبے کا پرتو اور عکس ہے۔ اسی مثال پر قیاس کرتے ہوئے آپ اس حقیت کو بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ انسانی عمل کا برا یا اچھا ہونا ' اس کا تمام تر دارومدار دل کے تصورات ' احساسات اور خیالات کے اچھے اور برے ہونے پر ہے۔ آپ جس قسم کے خیالات دل میں بسا لیں گے اسی قسم کے اعمال ظہور پذیر ہوں گے۔

ہماری قریبی تاریخ میں حصول علم کے لیے باہر جانے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ مگر ان میں دو نام ایسے ہیں یعنی "علامہ اقبال " اور " محمد علی جوہر " کہ جب وہ ولایت سے پڑھ کر لوٹے تو بجائے ان سے متاثر ہونے کے ' وہ ان کی فکر اور تہذیب کے باغی بن کر آئے۔ اقبال خود کہتے ہیں کہ

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

یہ خاک مدینہ و نجف اصل میں تعبیر ہے ' ان قلبی خیالات و احساسات کی جو ان کی والدہ کی تربیت نے ان کے اندر ودیعت کر دیئے تھے ' جس کی وجہ سے ان کے اندر ایک ایسی قوت پیدا ہو گئی ' جو ہر طرح کے خیالات کا مقابلہ کرنے میں ' ان کی معاون اور مددگار ثابت ہوئی۔ وہ خود کہتے ہیں کہ

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

یہی چیز ہم امت مسلمہ کے مختلف ادوار میں دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرام۔ ' جن کی اکثریت عرب جیسی جاہل ' اجڈ ' اخلاق کے نام سے ناآشنا ' ایک دوسرے کے خون کی پیاسی اور اس چندروزہ زندگی کو اپنی منزل سمجھنے والی قوم سے تعلق رکھتی تھی مگر جب ان کے خیالات تبدیل کر دیئے گئے تو وہ قوم جو بت پرستی کی وجہ سے زندگی کا محدود تصور رکھتی تھی ' اس نے زندگی کے بارے میں ایسے حیرت انگیز تصورات انسانیت اور تاریخ کو دیئے کہ جس کے بارے میں اقبال کہتا ہے :

طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ راز اس نے پایا انھیں کے جگر میں

وہ جو اس زندگی کو اپنی حقیقی منزل اور اس زندگی کے شب و روز کو اپنی تگ و دو کا حاصل اور انسانیت کا آخری افق گردانتی تھی۔ جب اس نے اس افق کے پار ' ایک دوسری دنیا کو اپنے قلب و نظر میں اتار لیا تو پھر اس زندگی اور اسباب زندگی کے لیے پریشان ہونا اور اندیشہ ہائے سود و زیاں میں مبتلا رہنا ' ان کے لیے ایک عیب بن گیا۔ اب وہ زندگی زندہ رہنے کو نہیں بلکہ اس زندگی کو اس عظیم مقصد کے لیے قربان کرنے کو سمجھنے لگے جس کا تصور انھیں اسلام نے دیا تھا۔ کبھی وہ دوسرے کی زندگی چھین کر کامیابی سے ہمکنار ہوتے تھے۔ لیکن اب اس عظیم مقصد کے راستے میں زندگی ہار کر ' وہ کامیابی کا تصور کرتے تھے۔

حضرت علی ' حضرت زید بن حارثہ ' حضرت جعفر طیار ' حضرت عبداللہ ابن رواحہؓ زخم کھا کر گرتے ہیں تو ان کی زبان سے نکلتا ہے **فزت و رب الکعبہ** " رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا "۔ اقبال اس سے متاثر ہو کر کہتا ہے :
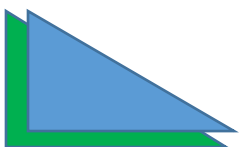
برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

یہ زندگیوں میں حیرت انگیز انقلاب کس بات کا نتیجہ تھا۔ صرف اس بات کا کہ ان کے دل و دماغ میں صالح خیالات پاکیزہ احساسات اور بلند تصورات پیدا کر دیئے گئے تھے۔

یہی احساسات اور تصورات ان کے لیے ' وہ قوی محرک ثابت ہوئے ' جس نے ان کی زندگی کو بدل ڈالا اور ان کے خیالات کے مطابق ' ان سے اعمال کا ظہور ہونے لگا۔ پاکیزہ احساسات نے زندگی کو پاکیزہ بنایا ' بلند خیالات نے زندگی میں اولوالعزمی پیدا کی اور آخرت کی طلب نے دنیا اور دولت دنیا سے محبت کے بحران کو سرد کیا۔ اقدارِ حیات کے صحیح تصور کے پیدا ہو جانے سے مقاصد زندگی میں بلندی اور وسعت پیدا ہوئی۔ جواب دہی کے احساس نے وقت کی قدر و قیمت اور اخوت و انسانیت کی نزاکت کا احساس پیدا کیا۔ الغرض ان کی زندگی میں اندر کی دنیا کی تبدیلی نے باہر کی ہر چیز اور ہر تصور کو بدل کر رکھ دیا۔ قبیلے کی تنگنائے میں رہنے والے لوگ آفاق گیری کا تصور لے کر اٹھے۔ امیدوں اور آرزوؤں میں زندگی گزارنے والے لوگ ' مقاصد جلیلہ کی بہار بن کر چھا گئے اور تاریخ پر یہ بات واضح کر دی کہ

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو انداز آفاقی

مختصر یہ کہ انسانی اعمال کا تمام تر دارومدار اس کے ان خیالات اور تصورات پر ہے ' جو اس کے دل و دماغ میں پیوست ہو چکے ہیں۔ مکی زندگی میں چونکہ پیش نظر صرف یہ بات تھی کہ ایسے افراد تیار کیے جائیں جو آئندہ چل کر اسلامی زندگی کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا سکیں ' اس لیے تمام مکی سورتوں میں صرف دو باتوں پر زور دیا گیا۔ ایک بنیادی تصورات پر جنھیں عقائد کا نام دیا جاتا ہے اور دوسرے اسلامی اخلاق پر۔ چنانچہ پورے تیرہ سالہ دور میں سوائے چند ابتدائی احکام کے ' کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔ تمام تر زور انہی دونوں باتوں پر رہا تا کہ ایک ایسا انسانی گروہ تیار ہو جائے جو اللہ کی عبودیت اور اطاعت میں پوری امت کے لیے نمونہ بن سکے۔ وہ تین تصورات جن کا ابھی میں نے ذکر کیا ' وہ ہیں توحید ' رسالت اور آخرت۔ ان سے مقصود یہ ہے کہ اس کائنات کا خالق و مالک اور حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے ' جس طرح کائنات کو تخلیق کرنے کے لیے کوئی اس کا شریک نہیں ' اسی طرح اس کے حاکم حقیقی ہونے میں بھی ' کوئی اس کا ہمسر نہیں۔ وہ تمام کائنات پر اس طرح بھی حکومت کر رہا ہے کہ اس نے اسباب پید

اکر دیئے ہیں اور اسباب کے مطابق زندگی گزارنے کا ہر ایک کو پابند کر دیا گیا ہے اور یہ اس کی وہ اطاعت ہے ' جسے غیر اختیاری اطاعت کہا جاتا ہے۔ جس میں کوئی مخلوق اپنی مرضی کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتی۔ لیکن ایک دوسری اس کی حاکمیت ہے ' جسے تشریعی حاکمیت کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس اللہ نے تمہیں تخلیق کیا ہے 'جو تمہیں رزق دیتا ہے 'جس نے تمہارے لیے زندگی کے امکانات پیدا فرمائے ہیں 'جس کی پیدا کردہ زمین پر تم رہتے ہو اور جس کے آسمان کی چھت کے نیچے تم زندگی گزار رہے ہو 'جس کے کارکنان قضا و قدر اور جس کے پیدا کردہ عناصر کائنات 'ہر وقت زندگی کی آسانیاں مہیا کرنے کے لیے تمہاری خدمت میں لگے ہوئے ہیں 'اسی کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ تم پر حکمرانی کرے اور اس کی حکومت مطلقہ کی موجودگی میں تمہیں اس کی مخلوق ہوتے ہوئے اور اس کا رزق کھاتے ہوئے اور اس کی نعمتوں سے متمتع ہوتے ہوئے ہرگز اس بات کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم کسی اور کے سامنے سر جھکاؤ 'کسی اور سے عبادت اور عبودیت کا تعلق پیدا کرو اور کسی کی غیر مشروط اطاعت کرو۔ اسی طرح وہی ذات اس لائق ہے کہ تم ہمیشہ اس پر توکل کرو 'نازک سے نازک حالات میں اسی سے مدد چاہو 'اپنی تنہائیوں کو اسی کے ذکر سے آباد کرو اور ہر وقت اسے اپنا نگران اور نگہبان سمجھو اور اس بات کو ذہن نشین کر لو کہ اسی کی اطاعت کے نتیجے میں تمہیں اس دنیا کی کامیابی اور آخرت میں سرخروئی نصیب ہوگی۔ یہ وہ عقیدہ ہے جسے عقیدہ توحید کہتے ہیں۔ اس عقیدہ توحید کو قبول کر لینے کے بعد خود بخود ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اطاعت اسی کی کرنی ہے اور حاکمیت اسی کو زیب دیتی ہے اور رضا صرف اسی کی حاصل کرنی ہے تو پھر معلوم تو ہونا چاہیے کہ وہ کن باتوں میں راضی ہے ؟ اس کا قانون کیا ہے ؟ اس کے احکام کیا ہیں ؟ اس کی بندگی کا طریقہ کیا ہے ؟ جس واسطے سے ہمیں ان سوالوں کا جواب ملتا ہے اس کو رسالت کہتے ہیں۔ چنانچہ اللہ کے رسول ہماری اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے تشریف لاتے رہے اور انھوں نے اللہ کی طرف سے ہمیں قانون کی کتابیں دیں اور اللہ کی اطاعت و عبادت کے حوالے سے ہماری ایک ایک ضرورت کو پورا کیا۔ لیکن پھر ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اگر ہم اللہ کے احکام کے مطابق 'اس کی رضا کے حصول کے لیے زندگی گزارتے ہیں تو اس کی جزاء کیا ہوگی اور اگر کوئی اس کے مخالف زندگی گزارتا ہے تو اس کا انجام کیا ہوگا ؟ کیا یہ دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد ہم میں سے ہر شخص ختم ہو جائے گا اور اس کے بعد کوئی نئی زندگی نہیں ہوگی 'جس میں جزاء اور سزا کا تحقق ہو سکے۔ ان باتوں کا تفصیلی جواب اللہ کی طرف سے اس کے رسولوں نے دیا ہے کہ یہ زندگی مستقل ختم ہونے والی نہیں ہے۔ یہ دارالعمل ہے 'دارالجزاء کے طور پر ایک اور دنیا ہے 'جس میں سب کو زندہ کر کے وہاں کھڑا کیا جائے گا 'اللہ کی عدالت ہوگی 'ایک ایک عمل کا حساب ہوگا 'اطاعت گزار لوگ جزاء سے نوازے جائیں گے اور نافرمان جہنم کی آگ میں جلیں گے۔ اس عقیدہ کو عقیدہ آخرت کہا جاتا ہے۔ مکی زندگی کے یہ تین بنیادی عقیدے ہیں 'جس پر تیرہ سال تک زور دیا جاتا رہا اور اس کے نتیجے میں وہ کردار وجود میں آیا 'جس کا اس سے پہلے تذکرہ ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اخلاقی تطہیر کے لیے اخلاقیات کی تعلیم بھی جاری رہی اور دونوں کو دل و دماغ میں راسخ کرنے کے لیے تربیت کا عمل بھی جاری رہا۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہر موقع پر صحابہ کرام (رض) میں ان تصورات کو راسخ کرنے کی کوشش فرمائی۔ جس کی مثالوں سے حدیث کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ صرف ایک مثال عرض کرتا ہوں کہ دو دن کے فاقے کے بعد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت صدیق اکبر اور حضرت عمر فاروق (رض) کو ساتھ لیے 'ایک انصاری صحابی کے باغ میں داخل ہوئے۔ انھوں نے جیسے ہی آنحضرت اور آپ کے ساتھیوں کو دیکھا 'خوشی سے بے قابو ہو گئے۔ آگے بڑھ کر کھجوروں اور انگوروں کے کچھ خوشے توڑ کر آپ کی خدمت میں پیش کیے اور گھر میں کھانا تیار کرنے کا حکم دیا۔ شدید بھوک کے باعث 'حضرت عمر فاروق (رض) نے جلدی سے چند دانے انگوروں کے توڑ کر کھانے کا ارادہ کیا تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : عمر ٹھہر جاؤ ! یہ تم جو چند دانے انگوروں کے کھانے لگے ہو 'قیامت کے دن ان کا بھی حساب ہوگا۔ حضرت عمر (
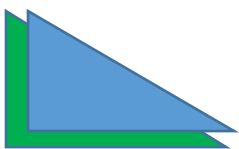
رض) نے سراسیمگی کے عالم میں عرض کیا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دو دن کے فاقے کے بعد 'ان چند دانوں کا بھی حساب دینا ہوگا؟ فرمایا : مجھے قسم ہے 'اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے 'تم سے وہاں ایک ایک نعمت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

جن لوگوں کی تربیت آنحضرت نے اس طرح فرمائی 'وہ اگر مستقبل کے صدیق و فاروق نہ بنتے تو اور کیا ہوتے ؟ اس تربیت کے نتیجے میں انھیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ ایک ایک بات کا حساب دینا ہے۔ اللہ نے ان کو دنیا کی سب سے بڑی حکومت عطا فرمائی 'لیکن اس احساس کی گراں باری کے باعث وہ ہمیشہ پیوند زدہ کپڑے پہنتے 'فاقے کرتے اور ایک ایسی زندگی گزار کے گئے کہ جس سے زیادہ پاکیزہ زندگی کا شاید تصور بھی ممکن نہ ہو۔ ان کی اس تمام پاکیزہ سیرت و کردار کا سر رشتہ 'جب ہم تلاش کرتے ہیں تو وہ کہیں اور نہیں صرف انہی عقائد کے ساتھ بندھا ہوا ہے 'جو پوری تیرہ سالہ مکی زندگی میں ان کے دل و دماغ میں اتارے گئے اور یہی وہ تصورات ہیں 'جو کسی بھی زندگی کی پاکیزگی کی ضمانت ہیں۔ اسی سے وہ مضبوط کردار جنم لیتا ہے کہ آپ اس پر کیسی بھی ذمہ داری کا بوجھ ڈال دیں وہ کبھی بھی کمزوری کا شکار نہیں ہوگا۔ حکومت جیسی نازک ذمہ داری بھی ان پر ڈال دی جائے تو وہ تخت حکومت پر بیٹھ کر بھی فقیری کر کے دکھائیں گے۔ ظفر علی خاں نے ٹھیک کہا

بادشاہی میں فقیری کا چلن رکھتے ہیں

دوش پر بار امانت کا اٹھانے والے

آج بھی ضرورت اسی بات کی ہے کہ اگر ہم ایک صالح معاشرہ تیار کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی انہی بنیادوں پر افراد سازی کا کام کرنا ہوگا۔ ان صالح افراد سے جو معاشرہ بنے گا 'اس کا ایک ایک فرد 'ہر سطح پر متمکن ہو کر اپنی اندرونی خوبیوں کا جب اظہار کرے گا تو پورا ملک اور پورا معاشرہ مکارم اخلاق کے پھولوں سے مہک اٹھے گا۔ اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے ٹھیک کہا

تو خاک میں مل اور آگ میں جل 'جب خشت بنے تب کام چلے

ان خام دلوں کے عنصر پر 'بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس سورۃ کی پہلی آیت کا آغاز ہی عقیدہ توحید سے ہو رہا ہے۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

آیت مبارکہ :

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوۡرَ ۬ؕ ثُمَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّہِمۡ یَعۡدِلُوۡنَ ﴿1﴾

لغۃ القرآن : [اَلْحَمْدُ : تمام تعریفیں][لِلّٰهِ : اللہ کے لیے][الَّذِيْ خَلَقَ : جس نے پیدا کیا][السَّمٰوٰتِ : آسمانوں][وَالْاَرْضَ : اور زمین][وَجَعَلَ : اور بنایا اس نے][الظُّلُمٰتِ : اندھیرے][وَالنُّوْرَ : اور روشنی][ثُمَّ : پھر][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][كَفَرُوْا : انھوں نے انکار کیا][بِرَبِّهِمْ : اپنے رب کے ساتھ][يَعْدِلُوْنَ : وہ برابری کرتے ہیں]

ترجمہ : تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور تاریکیوں اور روشنی کو بنایا، پھر بھی کافر لوگ (معبودان باطلہ کو) اپنے رب کے برابر ٹھہراتے ہیں

تشریح :

قرآن مجید نے اس حقیقت کو بار بار واضح فرمایا ہے کہ زمین کا ذرہ ذرہ اور آسمانوں کا چپہ چپہ۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش میں رطب اللّسان ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کائنات کا خالق و مالک ہے۔ اسی بنا پر اس سورۃ کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ اپنی حمد کا استحقاق بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اللہ وہ ہے جس نے زمین و آسمانوں کو پیدا فرمایا اور اسی نے ظلمات اور نور بنایا لیکن کافر اتنے ناعاقبت اندیش ہیں کہ وہ اس عظیم الشان ہستی کا نہ صرف انکار کرتے ہیں بلکہ وہ دوسروں کو اس کے برابر گردانتے ہیں حالانکہ وہ ایسی ہستی ہے جس نے نہ صرف سب کو پیدا فرمایا ہے بلکہ ہر کسی کی ضرورت کے مطابق اس کی پرورش کا انتظام فرمایا ہے۔ یہاں زمین و آسمانوں کے لیے تخلیق کا لفظ استعمال فرمایا۔ اندھیروں اور روشنی کے لیے "جَعَلَ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ شاید اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو جو موجودہ سائنس دانوں نے ہمارے سامنے پیش کی ہے۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے جس طرح زمین ایک کرّہ ہے اسی طرح سورج چاند اور بیشمار کرّہ جات ہیں۔ جس طرح سورج کے عکس سے چاند روشن ہوتا ہے

اسی طرح بلندی پر جا کر دیکھیں تو زمین چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور ہر کرّہ ایک دوسرے کو روشن کیے ہوئے ہے۔ پھر اندھیرے کے لیے جمع کا لفظ استعمال کیا اور روشنی کو واحد قرار دیا۔ اس لیے اکثر مفسرین نے واضح فرمایا کہ اندھیرے کئی قسم کے ہیں اور روشنی ایک ہی ہوتی ہے۔
ظلمات سے مراد مختلف قسم کی گمراہیاں ہیں اور نور کا مفہوم ہدایت لیا گیا ہے کیونکہ ہدایت ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اور گمراہی ہر دور میں اپنا روپ بدلتی رہتی ہے۔ لفظ ظلمات کو پہلے اس لیے لایا گیا یہ کائنات پہلے دھواں کی شکل میں تھی جیسا کہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ اور موجودہ سائنس بھی اس کی تائید کر رہی ہے۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیل القرآن)

شان نزول

حضرت سیدنا عبداللہ بن عباس علیہم رضوان فرماتے ہیں کہ یہ پوری سورت مکہ معظّمہ میں ایک ہی شب میں نازل ہوئی باستثناء چند آیات۔ اس کے ساتھ ستر ہزار فرشتے تسبیح کرتے آئے جن سے آسمانوں کے کنارے بھر گئے۔ حضور پر نور سید یوم النشور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سبحان ربی العظیم کہتے ہوئے سجدہ میں گئے۔ حضرت کعب احبار فرماتے ہیں کہ توراۃ میں سب سے پہلی آیت وہی ہے جو سورۃ انعام کی پہلی آیت ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ جو صبح کے وقت اس سورت کی تین آیات تکسبون تک تلاوت کرے تو اللہ تعالیٰ ستر ہزار فرشتہ اس کی حفاظت کے لیے مقرر فرمادیتا ہے۔ خازن۔ روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی البیان۔ اس سورت مبارکہ میں دلائل توحید، عدل، نبوت، معاش، معاد اور ملحدین کی تردید بیان کی گئی ہے۔
قرآن کریم میں پانچ سورتوں کے اول الحمد للہ ہے۔ سورۃ فاتحہ، سورۃ کہف، سورۃ سبا، سورۃ فاطر اور سورۃ انعام۔ بارگاہ الٰہی عزوجل میں وہ حمد مقبول ہے جو حضور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعلیم سے ہو اللہ تعالیٰ کی کامل حمد ہی وہ ہے جو حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کی۔ الذی خلق۔ میں کمال الٰہیہ کا ذکر ہے جس میں اشارۃ حمد الٰہی عزوجل کا حکم دیا گیا ہے۔ سماوات سے مراد آسمانوں کی تمام چیزیں ہیں جیسے چاند، سورج، ستارے وغیرہ۔ زمین کی تمام مخلوق جیسے دریا، پہاڑ، درخت دیگر مخلوق وغیرہ۔ آسمانی چیزیں غیب ہیں ان آنکھوں سے تو آسمان بھی نظر نہیں آتا۔ حتیٰ کہ آج سائنس دانوں نے آسمان کے وجود سے ہی انکار کر دیا لیکن مخبر صادق طبیب حاذق نور مجسم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مفصل بیان فرمایا۔ جن پر ایمان لانا لازمی ہے۔
زمین کی مخلوق کی روزی ہی آسمانوں سے ہے جیسا کہ ارشاد ہے **وفی السمآء رزقکم وما توعدون**
تمام خوبیاں اللہ عزوجل کو ہیں۔ اس آیت مبارکہ میں شان استغناء کو برقرار رکھتے ہوئے حمد کی تعلیم دی گئی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے حمد ہے اگرچہ تم اس کی حمد نہ کرو۔ وہ اللہ جس نے آسمان اور زمین پیدا کئے اور آسمانوں کو جمع کے لفظ سے بیان کیا کیونکہ وہ ایک دوسرے کے اوپر نیچے ہیں اور جمہور کے نزدیک زمینیں بھی سات ہیں لیکن وہ ایک دوسرے کے اوپر نیچے نہیں ہیں بلکہ ایک دوسری کے ساتھ ملی ہوئی ہیں اور جعل جب احدث اور انشاء کے معنی میں ہو تو ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے اور اندھیرے اور نور بنایا۔ ظلمات کو جمع بیان کیا اور نور کو جنس کے ارادہ سے واحد رکھا۔ اور اس لیے بھی کہ مختلف اشیاء کی ظلمت مختلف ہوتی ہے جیسے رات کا اندھیرا۔ سمندر کے پانی کا اندھیرا اور اندھیری جگہ کا اندھیرا۔ یہ سب اندھیرے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور نور کی ایک ہی قسم ہے وہ اندھیروں کی طرح مختلف نہیں ہے۔

اور ظلمات کو نور پر اس لیے مقدم کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اندھیرے میں پیدا کیا پھر ان پر نور کی شعائیں ڈالیں جس کو وہ نور پہنچا اس نے ہدایت پائی اور جس پر وہ نور نہ پڑا وہ گمراہی میں رہا۔ (تفسیر ال تفسیر الحسنات۔ علامہ ابو الحسنات سید محمد احمد قادری)

ہر طرف گمراہی کا بھیانک اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ انسان کا رشتہ اپنے خالق و پروردگار سے بالکل کٹ چکا تھا۔ کوئی سورج کا پجاری، کوئی ستاروں کا پرستار، کوئی پہاڑوں کی بلند چوٹیوں، بڑے بڑے دریاؤں اور اونچے اونچے درختوں کا عبادت گزار تھا۔ ہندوستان میں تینتیس کروڑ خداؤں کی خدائی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ایران کے لالہ زاروں میں آتش کدے روشن تھے۔ رستم و سہراب کی سرزمین کے بہادر اور نڈر فرزند آگ کے شعلوں کی جناب میں سجدہ ریز تھے۔ مسیحی دنیا میں ایک خدائے برتر و دانا کی جگہ باپ، بیٹا اور روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی القدس تین خداؤں کی پرستش ہو رہی تھی۔ اور جزیرہ نمائے عرب کی تو حالت ہی نہ پوچھیے۔ راہ چلتے کوئی پتھر پسند آگیا۔ اس کی تراش خراش کی اور اسے اپنی محراب عبادت کی زینت بنا دیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اعلان کیا کہ آسمان (عالم علوی) اور زمین (عالم سفلی) اندھیرا اور نور یہ سب مخلوق ہیں۔ اور اپنے وجود، اپنی حیات، اپنی نشو و نما اور اپنی بقا میں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں۔ اے شرف انسانیت کے پاسبانو! اے بحر علم و دانش کے غواصو! تم خود ہی بتاؤ کیا تمہیں یہ زیب دیتا ہے کہ اپنے خالق سے منہ موڑ کر مخلوق کے بندے بن جاؤ۔ غنی اور صمد کی جگہ محتاج اور بے بس کی عبادت کرنے لگو۔ یہ ہر چیز حسین و جمیل سہی، پر ہیبت و پر جلال سہی، مفید اور نفع بخش سہی۔ لیکن یہ حسن و جمال، یہ ہیبت و جلال، یہ افادیت اور نفع رسانی ان میں آئی کہاں سے؟ یہ اسی ذات برتر و اعلیٰ کے فضل و کرم کی جلوہ طرازی ہے جس نے انھیں نیست سے ہست کیا۔ عدم سے موجود کیا تو حمد و ستائش اسی کی ہونی چاہیے۔ ہر تعریف و توصیف کا وہی مستحق ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر اس سورۃ پاک کا آغاز اس آیت کریمہ سے فرمایا گیا۔ ذرا غور کیجئے انداز بیان کتنا ناصحانہ اور مشفقانہ ہے کسی کی کج روی کا ذکر کئے بغیر۔ کسی کا نام تک لیے بغیر۔ اس مختصر سے جملے سے شرک کی لاتعداد قسموں کا بطلان کر کے رکھ دیا جو مختلف اقوام میں رائج تھا۔

"ثم "حرف عطف ہے لیکن کوئی دوسرا حرف عطف اس کے قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ معنی عطف پر دلالت کرنے کے ساتھ ساتھ کفار کی نادانی اور ان کے عقیدہ کی قباحت کو بھی عیاں کر رہا ہے۔ "ثم "**دالة علی قبح فعل الکافرین** (قرطبی) مقصد یہ ہے کہ یہ جاننے کے باوجود کہ کائنات کی ہر بڑی اور چھوٹی چیز اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہے۔ پھر بھی یہ مخلوق اور محتاج چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر سمجھ رہے ہیں۔ کتنے نادان اور کتنے زیاں کار ہیں یہ لوگ۔

اس کا معنی ہے ای **یجعلون له عدیلا** (مفردات) یعنی اپنے معبودان باطل کو خداوند تعالیٰ کا ہمسر اور اس کے برابر بنائے ہوئے ہیں۔ وہ کس طرح انھیں برابر ہمسر بناتے تھے۔ اس کی وضاحت امام ابن جریر (رح) نے ان الفاظ میں کی ہے۔ **یعدلون: یجعلون له شریکا فی عبادتهم ایاہ فیعبدون معه الالهة والانداد**۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ اپنے باطل خداؤں کی بھی عبادت کیا کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی غیر اللہ کی عبادت کرنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے برابر اور ہمسر یقین کیا جا رہا ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ القرآن)
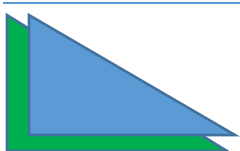
اس آیت میں بندوں کو اللہ تعالیٰ کی حمد کی تعلیم فرمائی گئی کہ وہ جب حمد کرنے لگیں تو "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ " کہیں، اور آسمان و زمین کی پیدائش کا ذکر اس لیے ہے کہ ان میں دیکھنے والوں کے لیے اللہ عَزَّوَجَلَّ کی حکمت و قدرت کے بہت سے عجائبات، عبرتیں اور منافع ہیں۔ حضرت کعب احبار (رض) نے فرمایا کہ توریت میں سب سے پہلی یہی آیت ہے۔

{ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ : اور اندھیروں اور نور کو پیدا کیا۔ } یعنی ہر اندھیرا اللہ عَزَّوَجَلَّ ہی نے پیدا فرمایا ہے خواہ وہ اندھیرا رات کا ہو، کفر کا ہو، جہالت کا ہو یا جہنم کا ہو۔ یونہی ہر ایک روشنی اسی نے پیدا فرمائی خواہ وہ روشنی دن کی ہو، ایمان و ہدایت کی ہو، علم کی ہو یا جنت کی ہو۔

برا کام کرکے اللہ تعالیٰ کی مشیت کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیے :

یہاں ایک بات ذہن نشین رکھیں کہ اگرچہ ہر اچھی بری چیز کو پیدا فرمانے والا رب تعالیٰ ہے لیکن برا کام کرکے تقدیر کی طرف نسبت کرنا اور مشیت الٰہی کے حوالے کرنا بری بات ہے، بلکہ حکم یہ ہے کہ جو اچھا کام کرے اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے کہے اور جو برائی سرزد ہو اسے اپنے نفس کی شامت تصور کرے۔

نیز اس آیت میں ظُلُمات یعنی تاریکیوں کو جمع اور نور کو واحد کے صیغہ سے ذکر فرمانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ باطل کی راہیں بہت زیادہ ہیں اور راہ حق صرف ایک دین اسلام ہے۔

{ ثُمَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّہِمۡ یَعۡدِلُوۡنَ : پھر (بھی) کافر لوگ اپنے رب کے برابر ٹھہراتے ہیں۔ } قدرتِ الٰہی کے ان دلائل کے بعد فرمایا کہ ایسے دلائل پر مطلع ہونے اور قدرت کی ایسی نشانیاں دیکھنے کے باوجود کفار اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسروں کو حتّٰی کہ پتھروں کو پوجتے ہیں حالانکہ کفار اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ یہاں کفار کے شرک کا ذکر ہوا اس مناسبت سے شرک کی تعریف درج ذیل ہے۔

شرک کی تعریف

شرک کی تعریف یہ ہے کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے سوا کسی غیر کو واجب الوجود یا لائق عبادت سمجھا جائے۔ حضرت علامہ سعد الدین تفتازانی (رح) شرک کی حقیقت ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں : "اَلْاِشْتِرَاکُ ھُوَ اِثْبَاتُ الشَّرِیْکِ فِی الْاُلُوْھِیَّۃِ بِمَعْنٰی وُجُوْبِ الْوُجُوْدِ کَمَا لِلْمَجُوْسِ اَوْ بِمَعْنٰی اِسْتِحْقَاقِ الْعِبَادَۃِ کَمَا لِعَبَدَۃِ الْاَصْنَامِ "یعنی "شرک یہ ہے کہ خدا کی الوہیت (یعنی معبود ہونے) میں کسی کو شریک کرنا اس طرح کہ کسی کو واجب الوجود مان لینا جیسا کہ مجوسیوں کا عقیدہ ہے یا خدا کے سوا کسی کو عبادت کا حقدار مان لینا جیسا کہ بت پرستوں کا خیال ہے۔

اعلیٰ حضرت امام اہلسنّت امام احمد رضا خان (رح) ارشاد فرماتے ہیں : "آدمی حقیقۃً کسی بات سے مشرک نہیں ہوتا جب تک غیر خدا کو معبود یا مستقل بالذّات و واجبُ الوجود نہ جانے۔

صدرُ الشریعہ بدر الطریقہ مولانا مفتی امجد علی اعظمی (رح) فرماتے ہیں "شرک کے معنی غیر خدا کو واجب الوجود یا مستحق عبادت جاننا یعنی الوہیت میں دوسرے کو شریک کرنا اور یہ کفر کی سب سے بدتر قسم ہے اس کے سوا کوئی بات کیسی ہی شدید کفر ہو حقیقۃً شرک نہیں۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری الجنان)

ارض و سما، ظلمت و نور اور انسان کی تخلیق

[1] ہر چیز میں جو خوبی ہے وہ اس کی ذاتی نہیں بلکہ اللہ کی پیدا کردہ ہے۔ لہٰذا جس چیز کی تعریف کی جائے وہ درحقیقت اس میں خوبی پیدا کرنے والے خدا کی تعریف ہے لہٰذا نعت مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی حقیقت میں حمد خدا ہے۔ یعنی اللہ کی حمد ہے جس نے آپ کو یہ عظمتیں دیں۔ اسی لیے امام احمد رضا فاضل بریلوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں :ـ

وہی رب ہے جس نے تجھ کو ہمہ تن کرم بنایا
ہمیں بھیک مانگنے کو تیرا آستاں بتایا
تجھے حمد ہے خدایا

یاد رہے کہ پانچ سورتیں الحمد للہ سے شروع ہوتی ہیں فاتحہ، انعام، کہف، سبا اور فاطر۔ ان میں سورۃ الفاتحہ کی حمد سب سے اکمل ہے کہ اس میں ربوبیت کائنات کا حوالہ ہے : الحمد للہ رب العالمین۔ اس کے بعد سورۃ کہف کی حمد اکمل ہے کیونکہ کہف میں نزول قرآن کا حوالہ ہے۔ الحمد للہ الذی انزل علی عبدہ الکتب۔ اور یہ ربوبیت کائنات سے کمتر بات ہے۔ باقی میں تخلیقِ ارض و سماء کا حوالہ ہے جیسے : **الحمد للہ الذی خلق السموت والارض (الانعام) الحمد للہ فاطر السموات والارض (فاطر) الحمد للہ الذی لہ ما فی السموت وما فیا لارض۔** (سبا)۔

آسمانوں کے لیے صیغہ جمع اور زمین کے لیے صیغہ واحد کا استعمال بتاتا ہے کہ زمین ایک ہی ہے اور جہاں حدیث میں الارضین (زمینوں) کا ذکر آیا ہے وہاں زمین کے ساتھ طبقات یا سات براعظم مراد ہیں۔

[2]۔ تاریکیاں خواہ مادی ہوں یا معنوی بہرحال وہ کئی ہیں مگر روشنی ایک ہے۔ مادی تاریکیاں مثلاً یہ ہیں ٗسمندر کی تہہ کی تاریکی، شکم مادر کی تاریکی، قبر کی تاریکی، رات کی تاریکی وغیرہ مگر ان سب کے مقابلے میں روشنی کا تصور ایک ہی ہے۔ یوں ہی معنوی تاریکیاں یعنی گمراہیوں کے تاریک راستے بھی کئی ہیں۔ جیسے یہودیت، نصرانیت، بت پرستی، انکار وجود باری تعالیٰ، انکار ختم نبوت، انکار عدالت صحابہ اور انکار شان رسالت وغیرہ مگر ان سب کے مقابلہ میں روشنی کا تصور ایک ہی ہے یعنی اتباع قرآن و سنت کا نور، اس لیے **وجعل الظلمت والنور** فرمایا گیا۔ یعنی ظلمات کئی ہیں اور نور صرف ایک ہے۔

[3]۔ ارض و سماء اور ظلمت و نور کا خالق اللہ ہی ہے اس کے باوجود مشرکین اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو برابر لا کھڑا کرتے ہیں کیونکہ انھوں نے ہر کام کے لیے الگ خدا بنا رکھا ہے مثلا کوئی بارش برسانے والا خدا، کوئی اناج اگانے والا خدا، کوئی اولاد دینے والا اور کوئی شفا دینے

والا وغیرہ۔ اسی لئے کفار مکہ نے کہا: **اجعل الالهة الهاً واحدا ۔ ان هذا لشيئ عجاب۔** "کیا اس نے (حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے) کئی خداؤں کی جگہ ایک خدا بنالیا ہے یہ تو بہت عجیب بات ہے" (ص،۵)

یہاں سے دو فوائد حاصل ہوئے :

1۔ رد لامذہبیت

معلوم ہوا کہ یہ کائنات ارضی و سماوی اور یہ ظلمت و نور سب اللہ نے بنایا ہے یہ از خود نہیں بن گیا۔ یہ لامذہبیت، دہریت اور سیکولرازم کا رد ہے۔ اور جو لوگ ایسے نظریات رکھتے ہیں مسلمانوں کو ان کے چنگل میں نہیں پھنسنا چاہیے، نہ ہی ان کی صحبت میں بیٹھنا چاہیے۔ افسوس کہ انگریزی تہذیب اور تعلیم کے اثرات بعض مسلم نوجوانوں پر بہت برے پڑتے ہیں ان کا مذہب پہ ایمان متزلزل ہو جاتا ہے اور وہ لامذہبیت کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں ایسے لوگوں کو چاہیے کہ کثرت سے قرآن کریم کا مطالعہ کریں جیسے جیسے وہ قرآن کریم کا مطالعہ کریں گے ان کے دل و دماغ سے لامذہبیت اور شکوک و شبہات کی گرد اترتی جائے گی۔ اصل میں یہ لوگ قرآن کو نہیں پڑھتے صرف جدید افکار و نظریات ہیں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔

2۔ حقیقت شرک

بر بھم یعدلون۔ سے معلوم ہوا شرط یہ ہے کہ کسی غیر خدا ہستی کو اللہ کے ساتھ برابر کھڑا کیا جائے۔ یعنی اس کے لئے اللہ جیسی ذات و صفات مانی جائیں کیسے ہندو دو خدا مانتے ہیں ایک خالق خیر اور ایک خالق شر۔ یا جیسے مشرکین مکہ نے ہر کام کے لیے الگ الگ خدا بنا رکھے تھے۔ رہا یہ کہ اللہ تعالیٰ انبیاء و اولیاء کو بعض روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقیانی تصرفات دیتا ہے تو یہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ اگر اس کی بنیاد پر انھیں مدد کے لیے پکارا جائے تو اس کو شرک کہنا مسلمانوں میں فتنہ پیدا کرنے کے مترادف ہے، اس چیز کی تحقیق ہم پیچھے بارہا کر چکے ہیں۔ (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

آیت مبارکہ :

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰٓى اَجَلًا ۭ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝2

لغۃ القرآن: [هُوَ الَّذِيْ : وہ جس نے][خَلَقَكُمْ : تم کو پیدا کیا][مِّنْ : سے][طِيْنٍ : مٹی][ثُمَّ قَضٰٓى: پھر مقرر کیا اس نے][اَجَلًا : ایک وقت][وَاَجَلٌ : اور ایک وقت][مُّسَمًّى: مقرر][عِنْدَهٗ : اسکے پاس][ثُمَّ اَنْتُمْ : پھر ہو تم][تَمْتَرُوْنَ : شک کرتے]

ترجمہ : (االلہ) وہی ہے جس نے تمہیں مٹی کے گارے سے پیدافرمایا (یعنی کرّہ ارضی پر حیات انسانی کی کیمیائی ابتداء اس سے کی)۔ پھر اس نے (تمہاری موت کی) میعاد مقرر فرمادی، اور (انعقاد قیامت کا) معیّنہ وقت اسی کے پاس (مقرر) ہے پھر (بھی) تم شک کرتے ہو

تشریح:

سورۃ کا آغاز اس مضمون سے ہوتا ہے کہ مشرکین جو اللہ کے ساتھ الہ ٹھہراتے ہیں ان کا موقف نہایت ہی بودا ہے حالانکہ توحید کے دلائل ان کے سامنے ہیں 'ہر طرف سے انھیں گھیرے ہوئے ہیں اور وہ اپنے نفوس میں آفاق میں انھیں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ سورۃ ہمارا استقبال ایک واضح حقیقت الوہیت کے ساتھ کرتی ہے اور چند جھلکیوں کے ذریعے اس پوری کائنات کے اوراق الٹ دیتی ہے۔ صرف تین جھلکیوں میں ہم اس پوری کائنات کی تہ تک اتر جاتے ہیں اور اس کی وسعت کو اپنے دائرے میں لے لیتے ہیں۔

یہ تین جھلکیاں ہیں۔ ایک جھلکی میں اس پوری کائنات کی تخلیق دکھائی جاتی ہے 'دوسری میں پوری انسانیت کی تخلیق دکھائی جاتی ہے اور تیسری میں ان دونوں وجودوں کو ذات باری گھیرے ہوئے ہے۔ کیا اعجاز ہے یہ ! کلام کی شوکت اور زور کو تو دیکھئے کس قدر جامع اور مانع بات ہے ! (ظلال)

عالم صغیر کی تخلیق سے اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت پر استدلال

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین یعنی عالم کبیر کو پیدا کرنے سے اپنی خالقیت اور وحدانیت پر استدلال کیا تھا اور اس آیت میں انسان یعنی عالم صغیر کو پیدا کرنے سے اپنی خالقیت اور وحدانیت پر استدلال فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا فرمایا ہے۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

اللہ تعالیٰ نے تم کو یعنی انسانوں کو مٹی سے پیدا فرمایا "اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ انسان اول حضرت آدم (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا فرمایا اور تم انہی آدم کی اولاد ہو، لہٰذا تمہاری اصل بھی مٹی ہے۔ اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ تم غذا کی صورت میں جو پھل اور سبزیاں کھاتے ہو وہ زمین سے پیدا ہوتی ہیں اور جن حیوانوں کا تم گوشت کھاتے ہو وہ بھی زمینی پیداوار سے پرورش پاتے ہیں اور انہی غذاؤں سے نطفہ بنتا ہے جو رحم مادر میں جا کر انسان کی پیدائش کا سبب بنتا ہے، لہٰذا تمہاری اصل بھی مٹی ہے۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)
اسی پر قیاس کر سکتے ہو کہ عالم کبیر کی فنا کا بھی ایک وقت مقرر ہے جسے قیامت کُبریٰ کہتے ہیں۔ قیامت صغریٰ یعنی شخصی موتیں چونکہ ہمیں پیش آتی رہتی ہیں ان کا علم بھی لوگوں کو ہوتا رہتا ہے لیکن قیامت کبریٰ کی ٹھیک مدت کا علم صرف اللہ ہی کے پاس ہے۔ تعجب ہے کہ عالم صغیر یعنی انسانوں میں زندگی اور فنا کا سلسلہ دیکھتے ہوئے بھی عالم کبیر کی فنا میں کوئی آدمی تردُّد کرتا ہے۔ تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی

بہر حال انسان اول کو اللہ تعالیٰ نے براہ راست مٹی سے پیدا فرمایا اور اولاد آدم کو بالواسطہ مٹی سے پیدا فرمایا۔ دونوں صورتوں میں ہر انسان کی اصل مٹی ہے، لہٰذا اسے اپنی اصل کو یاد رکھتے ہوئے تکبر سے باز رہنا چاہیے، اور تمام انسانوں کا باپ ایک ہے، لہٰذا اسے دوسروں کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ ایک ہی باپ اور ایک ہی خمیر کے ناطے سب انسانوں کو آپس میں پیار، امن اور اتفاق سے رہنا چاہیے اور دوسرے لوگوں کے لیے وہی پسند کرنا چاہیے جو ہم اپنے لیے پسند کرتے ہیں، جیسا کہ حدیث پاک میں ہے: حضرت معاذ بن جبل فرماتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سب سے افضل ایمان کے بارے میں دریافت کیا، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: افضل ایمان یہ ہی کہ لوگوں سے دوستی کرو تو اللہ تعالیٰ کے لیے، دشمنی رکھو تو اللہ تعالیٰ کے لیے اور اپنی زبان کو اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رکھو۔ عرض کیا: یارسول اللہ! اس کے بعد کیا کروں؟ تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: دوسرے لوگوں کے لیے وہی پسند کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو اور ان کے لیے وہی ناپسند کرو جو تم اپنے لیے ناپسند کرتے ہو اور بھلائی کی بات کرو یا خاموش رہو۔
(مسند احمد: حدیث نمبر 22483: جلد 5: ص 247) (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)
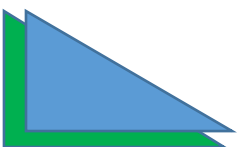
اس آیت کا دوسرا معنی یہ ہے کہ تم کو بلاواسطہ مٹی سے پیدا کیا ہے۔ اس کی وضاحت اس حدیث سے ہوتی ہے

حافظ ابو نعیم نے اپنی کتاب حضرت ابن مسعود (رض) سے روایت کیا ہے کہ جو فرشتہ رحم پر مقرر کیا گیا ہے 'وہ نطفہ کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر یہ کہتا ہے 'اے رب! اس کی تخلیق کی جائے گی یا نہیں کی جائے گی؟ اگر اللہ فرمائے کہ اس کی تخلیق کی جائے گی تو پھر کہتا ہے 'اے رب! اس کا رزق کتنا ہے؟ اس کا نشان کیسا ہے؟ اور اس کی موت کب ہوگی؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم لوح محفوظ دیکھو۔ وہ لوح محفوظ میں دیکھتا ہے تو اس میں اس کا رزق 'اس کا نشان 'اس کی موت اور اس کا عمل لکھا ہوا ہوتا ہے۔ جس جگہ اس کو دفن کیا جائے گا 'وہ وہاں سے مٹی لیتا ہے اور اس کو اس کے نطفہ میں ملا کر گوندھتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مصداق ہے:

(آیت) "منها خلقنا کم وفیها نعیدن کم ومنها نخرجکم تارۃ اخری"۔ (طہ : ۵۵)

ترجمہ : ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا اور اسی میں تم کو لوٹا دیں گے اور اسی سے تمہیں دوبارہ نکالیں گے۔ (الجامع لاحکام القرآن 'جز ٦ 'ص ٣٠٠ 'مطبوعہ بیروت)
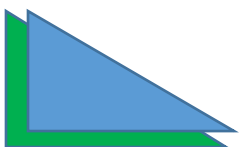
امام عبد بن حمید اور امام ابن المنذر نے عطاخراسانی سے روایت کیا ہے جس جگہ انسان کو دفن کیا جائے گا 'وہاں کی مٹی کو فرشتہ نطفہ پر چھڑکتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مصداق ہے "منها خلقنا کم"۔ (الدر المنثور 'ج ٤ 'ص ٣٠٢ 'مطبوعہ ایران)

حافظ ابو نعیم اصبہانی متوفی ٤٣٠ ھ اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہر مولود کے اوپر اس کی قبر کی مٹی چھڑکی جاتی ہے۔ (حلیۃ الاولیاء ج ٢ 'ص ٢٨٠ 'مطبوعہ دار الکتاب العربی 'بیروت '١٤٠٧ھ)

علامہ علی متقی برھان پوری متوفی ٩٧٥ ھ خطیب کے حوالے سے لکھتے ہیں 'حضرت ابن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہر مولود کی ناف میں وہ مٹی ہوتی ہے جس سے وہ پیدا کیا جاتا ہے۔ جب وہ ارذل عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے تو اس مٹی کی طرف لوٹایا جاتا ہے جس سے وہ پیدا کیا گیا تھا اور میں اور ابوبکر اور عمر ایک مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں اور اسی مٹی میں دفن کیے جائیں گے۔ (کنز العمال 'ج ١١ 'رقم الحدیث : ٣٣٦٧٣)

ان احادیث سے واضح ہوگیا کہ ہر انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ احادیث کے علاوہ اس موقف پر عقل سے بھی استدلال کیا گیا ہے 'کیونکہ انسان کو منی اور حیض کے خون سے پیدا کیا گیا ہے اور یہ دونوں چیزیں خون سے بنتی ہیں اور خون غذا سے بنتا ہے اور غذا گوشت اور زمینی پیداوار (سبزیوں اور پھلوں) پر مشتمل ہوتی ہے اور حیوان کا گوشت بھی زمینی پیداوار سے بنتا ہے تو مال زمینی پیداوار ہے اور زمینی پیداوار مٹی سے حاصل ہوتی ہے۔ سو خلاصہ یہ ہے کہ انسان مٹی سے پیدا کیا گیا ہے 'پھر اس طریقہ سے مٹی سے نطفہ بنتا ہے اور نطفہ سے متعدد اعضاء بنتے ہیں جو رنگ روپ اور صورت شکل میں مختلف ہوتے ہیں۔ مثلا قلب دماغ 'پھیپھڑے 'جگر اور دیگر بڑی بڑی ہڈیاں 'باریک شریانیں اور پٹھے وغیرہ اور ایک مادہ یعنی مٹی سے مختلف صورت و شکل اور مختلف طبائع اور حقائق کے اعضاء پیدا کرنا اور ایک مٹی سے دنیا کے متعدد اور مختلف رنگ و نسل کے انسان پیدا کرنا 'صرف اسی کی تخلیق سے عمل میں آسکتا ہے جو حکیم اور مدبر اور قادر اور قیوم ہو؛۔ پھر ان مختلف انسانوں کی پیدائش ہزارہا سال سے ایک ہی نظم اور ایک ہی طرز پر ہو رہی ہے اور انسان کی تخلیق کے اس سلسلہ کا نظم واحد پر ہونا پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس کا ناظم بھی واحد ہے اور وہ اللہ الواحد القہار ہے۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعید یالقرآن)

سدی نے کہا کہ اللہ نے جبرائیل (علیہ السلام) کو زمین پر کچھ مٹی لانے کے لیے بھیجا۔ زمین نے جبرائیل (علیہ السلام) سے کہا میں اللہ کی پناہ چاہتی ہوں اس بات سے کہ تو میرا کچھ حصہ کم کردے (یعنی میرے بدن کا کچھ حصہ مجھ سے جدا کرلے) جبرائیل (علیہ السلام) نے یہ سن کر کچھ نہیں لیا اور لوٹ کر عرض کیا اے مالک زمین نے مجھ سے تیری پناہ مانگی (تھی اس لیے میں خالی لوٹ آیا) پھر اللہ نے میکائیل کو بھیجا زمین نے ان سے بھی اللہ کی پناہ مانگی۔ میکائیل بھی لوٹ گئے آخر اللہ نے ملک الموت کو بھیجا۔ زمین نے ان سے بھی اللہ کی پناہ مانگی۔ ملک الموت نے کہا میں اللہ کی نافرمانی کرنے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ غرض ملک الموت نے (کُل) روئے زمین سے مٹی (تھوڑی تھوڑی) لی۔ سرخ سیاہ سفید ہر طرح کی مٹی مخلوط کی۔ اسی وجہ سے آدمیوں کے رنگ جدا جدا ہوئے پھر اس مٹی کو میٹھے نمکین اور تلخ پانی سے گوندھا اسی وجہ سے

انسانوں کے اخلاق مختلف ہوگئے پھر اللہ نے فرمایا جبرائیل (علیہ السلام) اور میکائیل (علیہ السلام) نے زمین پر رحم کیا ایسا نہیں کیا للذا جو مخلوق میں اسی مٹی سے بناؤں گا اس کی روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقییں تیرے ہی ہاتھ میں دوں گا۔ (تفسیر مظہری اردو جلد 4)

حضرت ابوہریرہ (رض) کا بیان ہے کہ اللہ نے آدم کی تخلیق خاک سے اس طرح کی کہ خاک کا گارا بنایا پھر (کچھ مدت) اسے چھوڑے رکھا یہاں تک کہ گارا سڑ کر لیس دار کیچڑ بن گیا پھر اس کا پتلا بنایا اور پتلے کی صورت بنائی پھر اتنی مدت اسے چھوڑے رکھا کہ وہ ٹھیکرے کی طرح (خشک ہو کر) کھن کھن بولنے لگا پھر اس میں اپنی طرف سے روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی پھونکی۔ کذا قال البغوی۔

حضرت ابو موسیٰ (رض): کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا آپ فرمارہے تھے کہ اللہ نے تمام زمین سے ایک مٹھی (مٹی) لے کر آدم (علیہ السلام) کی تخلیق کی اسی لیے زمین کے مطابق آدمی سرخ سفید سیاہ اور مخلوط رنگ کے اور نرم خو۔ درشت مزاج 'بدخصائل اور پاکیزہ اخلاق والے ہوگئے۔ رواہ احمد والترمذی وابوداؤد۔

جنت کے پانی سے گوندھا

حضرت ابوہریرہ (رض) کی مرفوع روایت ہے کہ اللہ نے آدم کو جابیہ کی مٹی سے بنایا اور جنت کے پانی سے اس کو گوندھا (معلوم نہیں جابیہ سے کیا مراد ہے ممکن ہے نشیبی گڑھے مراد ہوں جہاں پانی جمع ہو جاتا ہے اور دلدل بن جاتی ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ دلدل اور سڑی ہوئی لیسدار مٹی سے جنت کے پانی سے گوندھ کر آدم کا پتلا بنایا) رواہ الحکیم وابن عدی بسند حسن۔

ثم قضی اجلا پھر ایک وقت معین کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جب جسمانی ساخت کی تکمیل ہو جاتی ہے تو فرشتہ

ایک وقت مقرر کرنے کا مطلب

اس کی میعادِ زندگی لکھتا ہے لفظ ثُمَّ اور جملہ فعلیہ اسی پر دلالت کر رہا ہے۔ حضرت ابن مسعود (رض): کا بیان ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہم سے فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک کا مادہ تخلیق ماں کے پیٹ میں چالیس روز تک بصورت نطفہ جمع رکھا جاتا ہے پھر اتنی ہی مدت پھٹکی کی صورت میں رہتا ہے پھر اتنی ہی مدت بوٹی کی شکل میں رہتا ہے پھر اللہ اس کے پاس چار باتوں کا حکم دے کر فرشتہ کو بھیجتا ہے فرشتہ اس کے (اچھے۔برے) عمل 'میعاد زندگی 'رزق اور بدبخت نیک بخت ہونا لکھتا ہے پھر اس میں روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی پھونکی جاتی ہے پس قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ تم میں سے کچھ لوگ (ساری عمر) جنت والوں کے سے کام کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے اور جنت کے درمیان صرف آدھے گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ کتاب کا لکھا آگے آتا ہے اور وہ دوزخیوں جیسا عمل کرتے ہیں اور دوزخ میں چلے جاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ (ساری عمر) دوزخیوں کے سے کام کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ (اللہ کی) تحریر سامنے آتی ہے اور وہ جنت والوں جیسے عمل کرتے ہیں اور جنت میں چلے جاتے ہیں۔ متفق علیہ۔ تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی

دو اجلوں کی تفسیریں

اللہ تعالیٰ نے فرمایا پھر اس نے اجل (موت) مقرر فرمادی اور اجل مسمّٰی (مدت مقررہ) اس پاس ہے۔ اجل کے معنی موت ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو موتوں ذکر فرمایا ہے۔ ان موتوں کی کئی تفسیریں ہیں۔ ایک تفسیر یہ ہے کہ پہلی اجل سے مراد موت ہے اور دوسری اجل سے مراد قیامت ہے 'کیونکہ آخرت میں ان کی حیات کی مدت کی کوئی انتہا نہیں ہے اور نہ وہ کبھی ختم ہو گی اور اس کی مدت اور اس کی کیفیت کا حال اللہ کے سوا اور کسی کو معلوم نہیں ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ پہلی اجل سے مراد انسان کی پیدائش سے لے کر اس کی موت تک کی مدت ہے۔ اور دوسری اجل سے مراد موت کے بعد سے لے کر اس کے دوبارہ پیدا ہو کر اٹھنے تک کی مدت ہے اور اس مدت کو برزخ کہتے ہیں۔

تیسری تفسیر یہ ہے کہ پہلی اجل سے مراد نیند ہے اور دوسری اجل سے مراد موت ہے۔ چوتھی تفسیر یہ ہے کہ پہلی اجل سے مراد طبعی موت ہے اور دوسری اجل سے مراد حادثاتی موت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے 'وہ اس کے پاس مقرر ہے۔ اس کا معنی ہے وہ اس کو معلوم ہے اور لوح محفوظ میں مذکور ہے 'پھر اللہ تعالیٰ فرمایا ہے کہ اللہ کہ اللہ کی خالقیت اور اس کی وحدانیت کے اس قدر واضح دلائل ہونے کے باوجود تم اس کی وحدانیت میں شک کرتے ہو۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

بعض ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہمارا باپ اور خمیر ایک ہے تو پھر ہمارے رنگ اور اطوار کیوں مختلف ہیں؟ ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ مٹی کے رنگ مختلف ہیں اور اس کی سختی اور نرمی میں بھی فرق ہے، تو چونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی مٹی کے اجزاء اکٹھے کرکے حضرت آدم کی تخلیق کی، اس لیے مٹی کے مختلف رنگوں اور کیفیات کی مناسبت سے انسانوں کے رنگوں اور مزاج میں فرق ہے، جیسا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو ایک مٹھی بھر (مٹی) سے پیدا فرمایا جس میں ساری زمین کے اجزاء شامل کئے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اولاد آدم (علیہ السلام) زمین (کے رنگ و مزاج) کے مطابق سرخ، سفید، سیاہ اور مخلوط رنگ کے اور نرم خو، سخت مزاج، بدخصائل اور پاکیزہ اخلاق والے ہو گئے۔ " (ترمذی: تفسیر القرآن: سورۃ بقرہ: حدیث نمبر 1)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد اس کی موت کا ایک وقت مقرر کیا۔ اس سے مراد پیدائش سے لے کر موت تک انسان کی عمر ہے۔ اور قیامت کا معین وقت اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ اس سے مراد انسان کی موت سے لے کر وقوع قیامت تک دنیا کی کل عمر ہے جس کے بعد یہ دنیا فنا ہو جائے گی اور ایک نئی دنیا یعنی آخرت کی زندگی کا آغاز ہو گا۔

بعض دفعہ انسان کو بیماری یا کسی خاص علامت کی وجہ سے اپنی موت کے وقت کا علم ہو سکتا ہے، لیکن قیامت کا یقینی علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ کوئی دوسرا اس کے بتائے بغیر اپنی عقل و فراست سے یا قیاس آرائیوں سے اس کا ادراک نہیں کر سکتا۔

کفار مشرکین، قیامت یعنی دوبارہ زندہ ہونے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ جب ہم مر کر مٹی میں مل جائیں گے تو کس طرح ہمیں دوبارہ زندہ کیا جاسکے گا؟ اس آیت میں ان کے شک کو دور کرنے کے لیے ایک عام تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیل دلیل دی جارہی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے پہلی مرتبہ تمہیں مٹی اور نطفہ سے پیدا کر لیا تو دوبارہ مٹی سے پیدا کرنے میں کیا مشکل ہے؟ تمہیں تو پھر بھی مادہ یعنی مٹی سے پیدا کیا لیکن اللہ تعالیٰ تو اتنی بڑی طاقت والا ہے کہ اس نے زمین و آسمان جیسی عظیم کائنات کو بغیر کسی مادہ

کے صرف حکم دے کر پیدا کر دیا جو بہر صورت انسان کے پیدا کرنے سے بہت بڑا کام ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "بیشک آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کے پیدا کرنے سے بہت بڑا کام ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس (حقیقت) کو نہیں جانتے۔"
(قرآن: 57:40)

اللہ تعالیٰ جب زمین و آسمان کو بغیر مادہ کے پیدا کر سکتا ہے تو انسان کے چند بکھرے ہوئے ذرات کو اکٹھا کرنا اس کے لیے کیا مشکل ہے؟ اس کی مزید تشریح کے لیے ایک حدیث پاک ملاحظہ کریں: "ایک شخص نے مرتے وقت وصیت کی کہ مرنے کے بعد اسے جلا کر اس کی آدھی راکھ خشکی میں اور آدھی راکھ سمندر میں بکھیر دینا۔۔ اللہ تعالیٰ نے سمندر کو حکم دیا تو سمندر نے اپنے اندر موجود ساری راکھ جمع کر دی اور خشکی کو حکم دیا تو اس نے بکھری ہوئی ساری راکھ اکٹھی کر کے پیش کر دی تو اللہ تعالیٰ نے اس راکھ کو زندہ فرمایا اور اس سے پوچھا: تو نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے جواب دیا: تیرے خوف سے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا۔"
(بخاری: کتاب التوحید: باب 35) (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

جیسا کہ حدیث شریف کے حوالے سے پہلی آیت میں بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان میں سب سے پہلے مٹی کو پیدا فرمایا۔ اب ارشاد ہوا کہ اے انسان ہم نے اسی مٹی سے تمہیں پیدا کیا ہے۔ تخلیق انسانیت کے پہلے مرحلہ کا ذکر کرنے کے بعد اجل کا ذکر کیا ہے۔ اجل کا معنی وہ مدت ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان اور ہر چیز کی مقرر کر رکھی ہے۔ جسے دو حصوں میں بیان کیا گیا ہے۔ پہلی اجل سے مراد انسان اور ہر چیز کی ابتدا اور موت ہے دوسری اجل کا مفہوم قیامت لیا گیا ہے دونوں قسم کی اجل کا ایک وقت مقرر ہے جس میں ایک لمحہ کی تاخیر نہیں ہو سکتی اور دنیا کا کوئی سائنس دان اس اجل کی مدت کو نہیں پا سکتا۔ یہاں انسان کو اس کی تخلیق کے ساتھ اس کی اصلیت بتائی گئی ہے کہ اے انسان! تو جو کچھ بھی ہو جائے تیری اصلیت مٹی ہے۔ اور بالآخر تجھے اسی میں جانا ہے دوسرے لفظوں میں انسان کی تخلیق سے لے کر اس کی موت اور پھر قیامت کے دن اٹھنے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہونے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا لیکن صد حیف ہے ایسے انسان پر جو نہ صرف اپنی ابتدا اور انجام کو بھول چکا ہے بلکہ وہ خالق حقیقی کے بارے میں بھی شک کرتا ہے۔

(عَنْ أَبِیْ مُوسَی الْأَشْعَرِیِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) إِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدَمَ مِنْ قَبْضَۃٍ قَبَضَھَا مِنْ جَمِیعِ الْأَرْضِ فَجَاءَ بَنُو آدَمَ عَلٰی قَدْرِ الْأَرْضِ جَاءَ مِنْھُمُ الْأَحْمَرُ وَالْأَبْیَضُ وَالْأَسْوَدُ وَبَیْنَ ذٰلِکَ وَالسَّھْلُ وَالْحَزْنُ وَالْخَبِیثُ وَالطَّیِّبُ) [رواہ ابوداؤد: کتاب السنہ، باب فی القدر]

"حضرت ابو موسیٰ اشعری (رض) بیان کرتے ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو ایک مٹھی سے پیدا کیا۔ جو اس نے ساری زمین سے لی تھی تو آدم کی اولاد زمین کے مطابق ہوئی۔ ان میں سرخ، سفید، سیاہ اور ان کی درمیانی رنگت کے لوگ ہیں ان میں کچھ سخت اور کچھ نرم طبیعت کے لوگ ہیں اسی طرح کچھ نیک اور کچھ بد ہیں۔"

(عَنِ ابْنِ عُمَرَ (رض) أَنَّ رَسُولَ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خَطَبَ النَّاسَ یَوْمَ فَتْحِ مَکَّۃَ فَقَالَ النَّاسُ بَنُو آدَمَ وَخَلَقَ اللّٰہُ آدَمَ مِنْ تُرَابٍ) [رواہ الترمذی: کتاب التفسیر، باب و من سورۃ الحجرات]

"حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں بلاشبہ رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فتح مکہ کے موقع پر لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا فرمایا۔"

(خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ)[سورۃ الرحمٰن : ۱۴]

"اس نے انسان کو ٹھیکری کی طرح بجنے والی مٹی سے پیدا کیا"

(وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ)[سورۃ الحجر : ۲۶]

"اور ہم نے انسان کو گلے سڑے گارے، کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا"

(وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ)[سورۃ المؤمنون : ۱۲]

"اور ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔"

(عَنْ عَبْدِاللّٰہِ (رض) قَالَ خَطَّ النَّبِیُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خَطًّا مُرَبَّعًا، وَخَطَّ خَطًّا فِی الْوَسَطِ خَارِجًا مِنْہُ، وَخَطَّ خُطُطًا صِغَارًا إِلَی ہَذَا الَّذِی فِی الْوَسَطِ، مِنْ جَانِبِہِ الَّذِی فِی الْوَسَطِ وَقَالَ ہَذَا الإِنْسَانُ، وَہَذَا أَجَلُہُ مُحِیطٌ بِہِ أَوْ قَدْ أَحَاطَ بِہِ وَہَذَا الَّذِی ہُوَ خَارِجٌ أَمَلُہُ، وَہَذِہِ الْخُطُطُ الصِّغَارُ الأَعْرَاضُ، فَإِنْ أَخْطَأَہُ ہَذَا نَہَشَہُ ہَذَا، وَإِنْ أَخْطَأَہُ ہَذَا نَہَشَہُ ہَذَا)[رواہ البخاری : باب فِی الأمَلِ وَطُولِہِ]

"حضرت عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے چوکور خط کھینچا اور ایک خط اس کے درمیان میں سے کھینچا جو چوکور خط سے باہر نکل رہا تھا اور اس کے ارد گرد چھوٹے چھوٹے اور خط کھینچے آپ نے فرمایا درمیان والا خط انسان ہے اور چاروں طرف سے اس کی اجل اسے گھیرے ہوئے ہے اور یہ جو خط باہر نکل رہا ہے یہ اس کی حرص ہے اور چھوٹے چھوٹے جو خطوط ہیں یہ اس کی خواہشات ہیں اگر ایک سے بچے تو دوسری خواہش دامن تھام لیتی ہے۔" (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیل القرآن)

ہر شخص کی دو میعادیں ہیں

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا ہر شخص کی دو اجلیں ہیں۔ ایک پیدائش سے موت تک۔ دوسری موت سے حشر تک۔ اگر آدمی نیک پرہیزگار اور کنبہ پرور ہوتا ہے تو برزخی اجل کا کچھ حصہ لے کر میعاد عمر میں بڑھا دیا جاتا ہے اور اگر بدکار رشتہ کو منقطع کرنے والا ہوتا ہے تو مدت زندگی کا کچھ حصہ لے کر اجل برزخی میں بڑھا دیا جاتا ہے۔

چھ اشخاص جن پر لعنت کی گئی ہے

دیکھنا ہوگا وہ کون اشخاص ہیں؛

حضرت عائشہ (رض) کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا چھ شخص ہیں جن پر میں نے اور اللہ نے اور ہر مستجاب الدعوات پیغمبر نے لعنت کی ہے (۱) اللہ کی کتاب میں (لفظی یا معنوی) زیادتی کرنے والا (۲) تقدیر خداوندی کی تکذیب کرنے والا (۳)

زبردستی تسلط جمانے والا تاکہ جس کو اللہ نے ذلیل قرار دیا ہے اس کو عزت دار بنائے اور جس کو اللہ نے عزت دار بنایا ہے اس کی ذلت کرے (۴) اللہ کی حرام کی ہوئی چیز کو حلال سمجھنے والا۔ (۵) اللہ کی حلال قرار دی ہوئی چیز کو حرام بنانے والا۔ (۶) اور میرے طریقے کو ترک کرنے والا۔ رواہ البیہقی فی المدخل ورزین فی کتابہ۔ (تفسیر گلدستہ)

آیت مبارکہ:

وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ۭ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ۝3

لغۃ القرآن: [وَهُوَ اللّٰهُ : اور وہ اللہ][فِي : میں][السَّمٰوٰتِ : آسمانوں][وَفِي : اور میں][الْاَرْضِ : زمین][يَعْلَمُ : وہ جانتا ہے][سِرَّكُمْ : تمہارا پوشیدہ][وَجَهْرَكُمْ : اور تمہاراظاہر][وَيَعْلَمُ : اور وہ جانتا ہے][مَا تَكْسِبُوْنَ : جو تم کماتے ہو]

ترجمہ: اور آسمانوں میں اور زمین میں وہی اللہ ہی (معبود برحق) ہے، جو تمہاری پوشیدہ اور تمہاری ظاہر (سب باتوں) کو جانتا ہے اور جو کچھ تم کما رہے ہو وہ (اسے بھی) جانتا ہے

تشریح:

ہر شے کا عالم

یہاں بتلانا یہ مقصود ہے کہ زمین وآسمان کی ہر چیز کا خالق، مالک، زندہ کرنے والا، مارنے والا، رزق دینے والا، تمام شؤن حیات اور امور کائنات کی تدبیر کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اگر کوئی ایک صفت ذکر کی جاتی تو دوسری صفات نگاہوں سے اوجھل رہتیں۔ اس لیے کسی اسم صفت کے ذکر کی بجائے اللہ جو علم ذاتی ہے اور تمام صفات کمالیہ کا جامع ہے ذکر کیا تاکہ قاری جب یہ آیت پڑھے تو لفظ اللہ جب اس کی زبان سے نکلے تو تمام صفات الٰہیہ اس کی آنکھوں کے سامنے آجائیں۔ اور ہر صفت کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ فی السموات والارض کہے۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا علم (اللہ) ظرف اور مجرور کا متعلق بن سکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ علم جن معانی کو متضمن ہے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ متعلق بن سکتا ہے۔ وان کان لفظ اللہ علما لان الظرف والمجرور قد یعمل فیھما العلم بما تضمنه من المعنی (بحر)

ابن عطیہ نے اس توجیہ کو بہت پسند کیا ہے۔ **قال ابن عطیہ وھذا عندی افضل الاقوال وا کثرھا احرازا الفصاحۃ اللفظ وجزالۃ المعنی** (بحر) یعنی ابن عطیہ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ بہترین قول ہے۔ لفظ کی فصاحت اور معنی کی عمدگی دونوں کا جامع ہے۔

پہلی دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا بیان تھا۔ اس آیت میں اس کے علم محیط کا ذکر ہو رہا ہے یعنی وہ اتنا ہمہ دان اور ہمی بین ہے کہ کوئی چیز اس کے علم سے پنہاں نہیں۔ ہمارے دلوں کے پوشیدہ احساسات ہماری زبانوں سے نکلے ہوئے کلمات اور ہمارے سب چھوٹے بڑے نیک وبد عمل اس کے احاطہ علم میں ہیں۔ مشرک اقوام کو بتایا جارہا ہے کہ اللہ تو وہ ہے جس کی قدرت بے پایاں اور جس کا علم محیط ہو۔ تمہارے معبود نہ تو قادر و توانا ہیں نہ علیم ودانا۔ تو اے عقل کے دشمنو! وہ معبود اور خدا کیونکر ہو سکتے ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ القرآن)

امام غزالی (رح) فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ تمام معلومات کا عالم ہے، زمین کی تہ سے لے کر آسمانوں کی بلندی تک جو کچھ جاری ہے سب کا احاطہ فرمانے والا ہے، وہ ایسا عالم ہے کہ اس کے علم سے زمین وآسمان کا کوئی ذرہ باہر نہیں جاسکتا بلکہ وہ سخت اندھیری رات میں صاف چٹان پر چلنے والی سیاہ چیونٹی کے چلنے کی آواز کو بھی جانتا ہے، وہ فضا میں ایک ذرے کی حرکت بھی جانتا ہے، وہ پوشیدہ امور سے واقف اور دلوں کے وسوسوں، خیالات اور پوشیدہ باتوں کا علم رکھتا ہے، اس کا علم قدیم، ازلی ہے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اس علم کے ساتھ موصوف رہا ہے، اس کا علم جدید نہیں اور نہ ہی وہ اس کی ذات میں آنے کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری الجنان)

اللہ تعالیٰ کے کمال علم پر دلیل

اس سورت کی پہلی آیت میں فرمایا تھا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو اور تاریکیوں اور نور کو پیدا فرمایا 'دوسری آیت میں فرمایا جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا اور یہ دونوں آیتیں اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت پر دلالت کرتی ہیں اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ تمہاری خلوت اور جلوت کو جانتا ہے اور تمہارے کاموں سے واقف ہے اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کمال علم پر دلیل ہے اور کمال علم اور کمال قدرت یہ ایسی دو صفتیں ہیں جن پر الوہیت مدار ہے اور ان دونوں آیتوں کے مجموعہ سے اللہ تعالیٰ کی الوہیت پر دلیل مکمل ہو گئ۔

اس آیت کا بظاہر معنی یہ ہے یہ کہ وہی اللہ آسمانوں اور زمینوں میں ہے اس سے یہ لازم آیا کہ آسمان اور زمین اللہ کے لیے ظرف ہیں اور اللہ تعالیٰ مظروف ہے اور مظروف محدود ہوتا ہے اور محدود ہونا الوہیت کے منافی ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کا معنی ہے اللہ آسمانوں اور زمینوں میں معظم ہے 'یا معبود ہے 'یا مستحق عبادت ہے 'یا اس کا معنی ہے اللہ آسمانوں اور زمینوں کی تدبیر میں منفرد ہے 'یا اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ تمہاری خلوت اور جلوت کو آسمانوں اور زمینوں میں جانتا ہے 'اور اس سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔

اس آیت میں فرمایا ہے اللہ جانتا ہے جو تم کسب کرتے ہو 'کسب کا معنی ہے حصول نفع یا دفع ضرر کے لیے کوئی کام کرنا 'اسی لیے اللہ تعالیٰ کے افعال کو کسب نہیں کہا جاتا۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی القرآن)

یہ سورۃ الانعام کی پہلی تین آیات ہیں ان کی فضیلت بیشمار ہے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "نماز فجر کے بعد جو شخص یہ تین آیات پڑھے اللہ تعالیٰ اس کے لیے 70 فرشتے مقرر کر دیتا ہے جو اس کے لیے تا قیامت استغفار کرتے رہتے ہیں" (دیلمی عن ابن مسعود) (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب القرآن)

توحید کے دلائل کا تذکرہ جاری ہے

اس سے پہلی آیت میں انسان کی تخلیق اس کی موت وحیات کا ذکر تھا۔ اب اللہ تعالیٰ یہ بتلانا چاہتا ہے کہ اے انسان تجھے ہوش کے ناخن لینے اور اس حقیقت کا ادراک کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ زمین وآسمان کو پیدا کرنے کے بعد الگ تھلگ ہو کر گوشہ نشین نہیں ہوا۔ بلکہ جس طرح وہ زمین وآسمان کے چپہ چپہ اور ذرہ ذرہ سے واقف اور ان کے نظام کو سنبھالے ہوئے ہے اسی طرح وہ انسان کی جلوت وخلوت اور ہر قسم کی نقل و حرکت سے واقف ہے۔ کسب کا لفظ استعمال فرما کر انسان کے کردار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اسے اپنے فکر و عمل کا محاسبہ کرنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کے کردار سے پوری طرح واقف ہے۔ تخلیق کائنات کا پہلے ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اے انسان ! اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ذات کبریا ہے جو لامحدود وسعتوں کی حامل زمین جو تہ در تہ سات طبقات پر مشتمل ہے اور آسمان جو اپنی وسعت وکشادگی اور رفعت وبلندی کے اعتبار سے انسانی تخیلات سے ماوراء ہے جب ان کے ایک ایک ذرے پر اللہ تعالیٰ کنٹرول کیے ہوئے ہے تو تجھے بھی غور کرنا چاہیے کہ تیری جلوت و خلوت، اچھی اور بری حرکت۔ اللہ تعالیٰ کے اختیار سے باہر نہیں ہو سکتی یہ تو اس کی حکمت بالغہ اور ابدی فیصلے کا نتیجہ ہے کہ اس نے انسان کو ایک مدت معینہ تک ڈھیل دے رکھی ہے لیکن انسان کی کوتاہ بینی کا عالم یہ ہے کہ وہ چار سو پھیلی ہوئی اس کی قدرت کی نشانیوں سے اعراض اور انحراف کرتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جب بھی انسان کے سامنے انبیاء (علیہ السلام) نے حق پیش کیا تو انسانوں کی غالب اکثریت نے اس کی تکذیب کی۔ اس تکذیب کا نتیجہ عنقریب ان کے سامنے آجائے گا جو اللہ تعالیٰ کی پکڑ کی صورت میں ہوگا۔

”حضرت ابوہریرہ (رض) نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کرتے ہیں آپ نے فرمایا جب اللہ نے موسیٰ (علیہ السلام) کے لیے تجلی فرمائی اس وقت وہ اندھیری رات میں پتھر پر چلنے والی چیونٹی کو دیکھ رہا تھا دس فرسخ کے فاصلے سے۔“ [(الشفا) بحوالہ ابن کثیر] (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیل)

آیت مبارکہ :

وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ۝40

لغۃ القرآن : [وَمَا : اور نہیں][تَاْتِيْهِمْ : آتی انکے پاس][مِّنْ : سے][اٰيَةٍ : نشانی][مِّنْ : سے][اٰيٰتِ : نشانیاں][رَبِّهِمْ : انکا رب][اِلَّا كَانُوْا : مگر وہ تھے][عَنْهَا : اس سے][مُعْرِضِيْنَ : منہ پھیرنے والے]

ترجمہ : اور ان کے رب کی نشانیوں میں سے ان کے پاس کوئی نشانی نہیں آتی مگر (یہ کہ) وہ اس سے روگردانی کرتے ہیں

تشریح : اس سے پہلی آیات میں مشرکین کے اس کفر کو بیان کیا گیا جو وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرتے تھے اور اس آیت سے مشرکین کے اس کفر کو بیان کیا گیا ہے جو وہ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ کرتے تھے، چنانچہ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ کفار مکہ کا کفر و سرکشی میں حال یہ ہے کہ ان کے پاس جب بھی قرآن مجید کی آیات آتی ہیں یا وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزات دیکھتے ہیں تو وہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری الجنان)

ہر قسم کے حسی اور معنوی معجزات جو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اسلام کی صداقت کے لیے ظاہر فرماتے ان میں وہ غور و فکر نہیں کیا کرتے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان معجزات کی اثر آفریں قوت سے ہراساں تھے۔ انھیں یہ پسند نہ تھا کہ جس تاریکی سے ان کی آنکھیں مانوس ہو چکی ہیں وہ اجالے سے بدل جائے۔ ان میں یہ سکت بھی نہ تھی کہ ان دلائل کا جواب پیش کر سکیں اب ان کے پاس باطل سے چمٹے رہنے کا اس کے بغیر اور کوئی ذریعہ نہ تھا کہ وہ غور و تامل سے پہلو تہی کیا کریں۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ القرآن)

کفر باللہ پر ملامت کے بعد کفر بالرسول کی مذمت

اس سے پہلی تین آیات تعلق آیات کا تعلق توحید کے ساتھ تھا اور ان آیتوں کا تعلق رسالت کے ساتھ ہے۔ سابقہ آیتوں میں مشرکین کے اس کفر کو بیان فرمایا تھا جو وہ اللہ کے ساتھ کرتے تھے اور ان آیتوں میں ان کے اس کفر کو بیان فرمایا ہے جو وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ کرتے تھے اور ان آیات میں وجہ ارتباط یہ ہے کہ مشرکین مکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا انکار بھی اس لیے کرتے تھے کہ آپ اللہ عزوجل کی توحید کی دعوت دیتے تھے اور خدائے واحد کی عبادت کا حکم دیتے تھے۔ اس وجہ سے وہ آپ کی تکذیب کرتے تھے اور جب بھی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی رسالت کے صدق پر اللہ کی طرف سے کوئی نشانی اور معجزہ پیش کرتے تو وہ اس سے منہ موڑ لیتے تھے۔ سب سے بڑی نشانی یہ تھی کہ آپ ﷺ نے قرآن مجید پیش کیا اور یہ دعوی کیا کہ کوئی انسان اس کی چھوٹی سے چھوٹی آیت کی بھی نظیر نہیں لا سکتا ' سو کوئی اس کی نظیر نہیں لا سکا۔ پھر آپ ﷺ نے چاند کو دو ٹکڑے کرکے ، کنکروں نے کلمہ پڑھا، درختوں کو چلایا اور خود قرآن کی ہر آیت ایک معجزہ ہے جس کی مثال لانے سے قاصر رہے۔ پھر بھی انھوں نے انکار ہی کیا۔ اور کئی معجزات پیش کیے 'لیکن انھوں نے ان معجزات کا نہ صرف انکار کیا بلکہ ان کا مذاق اڑایا۔

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کے انکار اور کفر کے تین احوال بیان فرمائے ہیں۔ پہلا حال یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کی نشانیوں سے اعراض کیا اور منہ موڑا۔ دوسرا حال یہ ہے کہ انھوں نے ان نشانیوں کی تکذیب کی اور ان کو جھٹلایا اور تیسرا حال یہ ہے کہ انھوں نے ان نشانیوں کا مذاق اڑایا اور یہ ان کے کفر اور انکار کی انتہاء ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا عنقریب ان کے پاس اس چیز کی خبریں آئیں گی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ اس وعید میں دو احتمال ہیں 'اس سے مراد دنیا کا عذاب بھی ہو سکتا ہے ' جیسا کہ جنگ بدر میں مشرکین مکہ کو شکست فاش

ہوئی اور ان کو اپنی عددی برتری اور طاقت کا جو گھمنڈ تھا ' وہ خاک میں مل گیا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد آخرت کا عذاب ہو۔
(تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

حق مبین " حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن پاک

توحید و قیامت پر اس قدر ٹھوس دلائل اور ان کے تمام اعتراضات کا جواب مل جانے کے بعد ' ان باتوں کی تکذیب کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ لیکن حیرت ہے کہ یہ لوگ پھر بھی اللہ کی آیات سے اعراض کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے تعصّبات میں اس قدر پختہ ہو چکے ہیں کہ حق کی کوئی بات اور حق کی تائید میں کوئی دلیل ' ان کے دل و دماغ پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ وہ اپنے آباؤاجداد کے روپے کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کو تیار نہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کے بعد ایک سے ایک بڑا معجزہ ' انھوں نے دیکھا اور ایک سے ایک بڑھ کر نشانی ' ان کے سامنے آئی۔ مگر ان کے اعراض میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ان کا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اسلام کے بارے میں جو رویہ سالہاسال پہلے تھا ' وہ آج بھی اسی پر قائم ہیں اور حق سے اعراض کی ان کی انتہاء یہ ہے کہ کھلا اور واضح حق ان کے سامنے آیا تو اس کو ماننے سے انھوں نے انکار کر دیا، اس سے مراد قرآن کریم ہے۔ اسے حق سے تعبیر اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ اس کے من جانب اللہ ہونے میں اہل مکہ کو کم از کم کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس کے بارے میں چند ایسے واضح دلائل ہیں کہ جن کا انکار کرنا اہل مکہ کے لیے ممکن نہیں۔ مثلاً سب سے پہلی یہ بات کہ یہ قرآن کریم ' جس ذات عزیز پر نازل ہوا ' وہ کہیں باہر سے تشریف نہیں لائے بلکہ مکہ میں انہی میں سے ایک معزز خاندان قریش اور بنو ہاشم میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان سے مکہ والے واقف تھے ' پھر ان کا بچپن اور لڑکپن ان کے سامنے گزرا۔ ایک بے عیب جوانی جس کی نظیر شاید دنیائے عرب میں ممکن نہ ہو ' اس کے ایک ایک لمحے سے اہل مکہ واقف تھے۔ جب وہ عملی زندگی میں داخل ہوئے تو ان کی شب و روز کامیابیاں ' حتیٰ کہ ان کے بڑھتے ہوئے تجارتی تعلقات اور معاملات ' اس کا کوئی حصہ ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں۔ ایک معزز خاندان میں ان کی شادی ہوئی۔ اس کے بعد ایک عائلی زندگی ' انہی کی ہمسائیگی میں انھوں نے گزاری۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ عرب کی زندگی سے مختلف زندگی سے وہ کبھی واقف نہیں رہے۔ انھوں نے دینیات کے حوالے سے کبھی کسی سے کچھ نہیں سیکھا۔ تجارت کے سلسلے میں باہر کے چند سفر ان کو ضرور پیش آئے ' اس کے علاوہ انھوں نے کبھی کسی ملک میں جا کر نہیں دیکھا۔ وہ نبی الامی، ایسا پاکیزہ شخص ' جس کی زندگی میں کوئی تصنع نہیں ' جو انہی کی طرح علمی زندگی سے بالکل سادہ اور علمی تجربات سے یکسر مختلف ' اسی حالت میں ان کے سامنے انہوں نے چالیس سالہ زندگی گزاری۔ یہ اسے ہمیشہ صادق اور امین کہہ کر پکارتے رہے۔ ان چالیس سالوں میں کبھی ایک دفعہ بھی جھوٹ بولنا ان سے ثابت نہیں بلکہ جب انہوں نے پوری قوم سے پوچھا کہ بتاؤ تمہیں کبھی مجھ سے جھوٹ کا تجربہ ہوا ہے تو سب نے بیک زبان کہا کہ تو ہماری نگاہوں میں صادق اور امین ہے۔ چالیس سالہ زندگی گزارنے کے بعد اچانک وہ پاکیزہ شخص غار حرا سے اتر کر آتا ہے اور اس کی زبان مبارک سے ایک ایسے کلام پاک کا چشمہ ابلنے لگتا ہے کہ جس کی فصاحت و بلاغت ' جس کی علمی سنجیدگی ' جس کے خیالات کی بلندی ' جس کے پیش کردہ نظام کی ہم آہنگی ' یکایک اپنے سننے والوں کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ وہ ایک ایسا کلام لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے ' جس کے اسلوب پر مشتمل کلام چالیس سالوں میں کبھی کسی نے اس سے نہیں سنا۔ وہ قوموں کے بارے میں اور سابقہ مذاہب کے حوالے

سے ' وہ باتیں کہتا ہے 'جس سے قوم واقف نہ تھی۔ وہ معرفت حق سے لے کر کائنات اور انسان کے عرفان کے حوالے سے ایسی ایسی باتیں کہتا ہے 'جس کا تصور بھی اس معاشرے اور اس ماحول میں ممکن نہیں اور پھر وہ بار بار اپنی قوم سے کہتا ہے کہ لوگو! جس نے زندگی بھر کبھی جھوٹ نہ بولا ہو 'کیا وہ اللہ پر کبھی جھوٹ باندھنے کی جرأت کرسکتا ہے؟ اور پھر جو کلام میں تمہارے سامنے اللہ کے حوالے سے پیش کررہا ہوں 'تم اگر اسے میرا کلام سمجھتے ہو تو میں تمہاری ہی طرح ایک عرب ہوں 'تم اہل زبان ہو 'تم اس جیسا کلام تیار کرکے دکھا دو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس جیسی پوری کتاب لے آؤ میں تو کہتا ہوں 'اس جیسی دس سورتیں بلکہ ایک ہی سورۃ بنا کر دکھا دو۔ اتنا واضح اور حتمی چیلنج جو اس کتاب میں آج بھی موجود ہے 'شاید ہی کسی صاحب کتاب نے اپنے مخاطبوں کے سامنے پیش کیا ہو۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس کی قوم نے اسے اذیتیں پہنچائیں 'دکھ دیئے 'اس پر ایمان لانے والوں کے لیے زندگی اجیرن کردی 'حتیٰ کہ وہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے۔ پھر بھی انھوں نے انھیں آرام سے بیٹھنے نہ دیا۔ مسلسل لڑائیوں تک نوبت پہنچی 'اہل مکہ نے بار بار شکست کے زخم اٹھائے 'مسلمانوں کو شہید کیا تو خود بھی اس راستے میں مرتے رہے اور اپنے بچوں کو قربان کراتے رہے 'بالآخر اسی کشمکش میں مکہ سرنگوں ہوگیا۔ ان کی طاقت ٹوٹ گئی 'اللہ نے بیشتر کو ایمان کی دولت سے نوازا 'لیکن قرآن کا چیلنج اپنی جگہ باقی رہا۔

یہ دو بالکل سامنے کی دلیلیں ہیں 'ایک ذات رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شخصیت اور دوسرا قرآن کریم کا معجز ہونا۔ ان دونوں حوالوں سے پروردگار ارشاد فرما رہے ہیں کہ اتنا واضح حق ان کے سامنے آیا 'لیکن انھوں نے اتنے واضح حق سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ یہ برابر اس کا تمسخر اڑاتے رہے۔ جب اللہ کے پیغمبر 'ان سے یہ کہتے کہ تم حق کے انکار کرنے سے باز آجاؤ ورنہ ہوسکتا ہے پہلی قوموں کی طرح تم پر بھی عذاب کا کوڑا برسے 'تو یہ لوگ بجائے ڈر کر راہ راست اختیار کرنے کے 'اس کا مذاق اڑاتے بلکہ بار بار مطالبہ کرتے کہ جس عذاب سے ہمیں ڈرا رہے ہو 'اسے لے کیوں نہیں آتے؟ جب کبھی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) انھیں اسلام کے غلبہ عمومی کے بارے میں آگاہ فرماتے کہ وہ وقت دور نہیں جب خود اس مکہ پر اسلام کا غلبہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ زمین کے بڑے حصے پر مسلمانوں کو خلافت عطا فرمائے گا۔ اسی زندگی میں ان کو ایسی عزت و سرفرازی اور خوشحالی سے نوازا جائے گا 'جس کا آج تم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اس پر وہ مسلمانوں کی غربت کا مذاق اڑاتے کہ ماشاء اللہ یہ ہیں وہ لوگ جنھیں کل کو تمام دنیا کی امامت و قیادت ملنے والی ہے 'آج ان کے پاس کھانے کو روٹی ہے 'نہ پہننے کو کپڑا اور خواب یہ دیکھ رہے ہیں قیصر و کسریٰ پر حکومت کرنے کے۔ انہی دنوں میں بعض دفعہ ایسے واقعات بھی پیش آئے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ذاتی حیثیت میں بعض باتوں کی نشاندہی فرمائی 'لیکن مشرکین عرب کسی بات کا اثر قبول کرنا تو دور کی بات ہے 'اس کو سنجیدگی سے لینے کو بھی تیار نہ تھے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آپ نے کعبۃ اللہ کے کلید بردار عثمان بن طلحہ سے کعبۃ اللہ کا دروازہ کھولنے کو کہا۔ اس نے نہایت بدتمیزی سے انکار کردیا۔ آپ ﷺ نے اصرار فرمایا تو اس نے جھڑک دیا۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا کہ عثمان وہ کیسا وقت ہوگا 'جب اللہ کے گھر کی چابی میرے پاس ہوگی 'میں جسے چاہوں گا دوں گا؟ تو اس نے حیران ہو کر کہا کہ کیا اس وقت قریش ذلیل ہوگئے ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں اس وقت قریش کی عزت میں اضافہ ہوگا۔ یہی وہ کامیابی کی خبریں ہیں 'جو ہجرت کے بعد اسلام کے غلبہ عمومی کی شکل میں تمام دنیا کے سامنے آنے والی تھیں اور اس آیت کریمہ کے آخری حصے میں اسی کا تذکرہ کیا جارہا ہے کہ آج تم جن کامیابیوں کو محض فرضی دعوے سمجھ کر تمسخر کا نشانہ بنا رہے ہو 'وہ وقت دور نہیں جب وہ حقیقت بن کر تمہارے سامنے آئیں گے اور اسی طرح جس عذاب کو تم استہزاء میں اڑا رہے ہو 'وہ اگرچہ اجتماعی شکل میں تو نہیں آئے گا لیکن جزوی شکل میں ضرور اس کا اظہار ہوگا۔
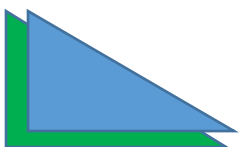
چنانچہ جنگ بدر اللہ کی طرف سے ان پر عذاب ہی کی ایک جزوی شکل تھی جس طرح تین سو تیرہ نہتے مسلمانوں سے ایک ہزار مکہ کے جنگجو سپاہیوں کو نہ صرف شکست سے دوچار ہونا پڑا بلکہ ان کی قیادت کی پہلی صف پوری کی پوری قتل ہو گئی اور دوسری صف تقریباً گرفتار ہو گئی اور پیچھے صرف وہ لوگ رہ گئے 'جو صرف اپنے مقتولوں اور اپنے گرفتار شدگان کا مرثیہ کہہ سکتے تھے۔ پھر ان لوگوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ حیران کن طریقے سے ان کی گرفتاریاں ہوئیں اور ان کی آنکھوں کے سامنے سر کٹ کے گرتے رہے جبکہ بعض مسلمانوں کے ہاتھوں میں تلواریں تک بھی نہ تھیں۔ خود بعض گرفتار ہونے والوں نے بعد میں بتایا کہ ہمیں جس نے گرفتار کیا 'وہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی نہیں تھا اور بعض لوگ جو قتل ہوئے ان کی لاشوں پر سیاہ نشان پڑے ہوئے تھے 'جو اس بات کی علامت تھے کہ یہ کسی مسلمان کی ضرب سے قتل نہیں ہوئے بلکہ ان کے قاتل انسانوں کے علاوہ کوئی اور ہیں۔ بعد میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ بعض فرشتوں نے ان کو گرفتار کیا اور بعض فرشتوں نے ان کی گردنوں پر ضربیں لگائیں۔ ظاہر ہے کہ جس جنگ میں فرشتے اپنا کردار ادا کریں 'وہ ایک طرف اگر مسلمانوں کی اللہ کی طرف سے کھلی کھلی نصرت اور تائید ہے تو دوسری طرف غیر مسلموں کے لیے 'وہ اللہ کا عذاب ہے۔ پھر یہ سلسلہ رکا نہیں 'فتح مکہ تک یہ لوگ مسلسل اس طرح کے عذابوں اور سزاؤں سے دوچار ہوتے رہے۔ بعض دفعہ ان پر قحط کی صورت میں ایسا شدید عذاب آیا کہ تمام اہل مکہ بلبلا اٹھے اور ابوسفیان نے کافر ہوتے ہوئے بھی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پیغام بھیجا کہ آپ کی قوم بھوکی مر رہی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ان کی مدد کے لیے مدینہ منورہ سے غلے کے اونٹ لاد کے بھیجے اور عذاب ٹلنے کی دعا بھی فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی رسول اپنی امت کی عداوت سے ہجرت کر جاتا ہے تو عموماً اس قوم کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملتا بلکہ اسے عذاب کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن مشرکین مکہ جزوی عذابوں کا شکار تو ہوئے 'اجتماعی عذاب سے اس لیے بچ گئے کہ مکہ کے رہنے والوں نے مجموعی طور پر اللہ کے دین کا انکار نہیں کیا بلکہ مختلف اوقات میں ان میں اسلام کا سلسلہ جاری رہا اور اسلام لانے والے چھپ چھپ کر مدینہ طیبہ پہنچتے رہے اور معاہدہ حدیبیہ کے بعد ساحل سمندر کو انھوں نے اپنا ٹھکانا بنایا۔

جہاں تک اسلام کے غلبہ عمومی کا تعلق ہے 'جس کا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مختلف وقتوں میں مشرکین مکہ کے سامنے تذکرہ فرماتے تھے اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا 'وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے 'لیکن ہجرت کے فوراً بعد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بیان کردہ ایک ایک خبر صداقت کے قالب میں ڈھلنے لگی۔ کوئی دن نہیں گزرتا تھا 'جب اسلام اور مسلمانوں کی کامرانیوں کا سفر آگے نہیں بڑھتا تھا۔ دوسرے ہی سال جنگ بدر میں مسلمانوں کی فتح نے سیاسی 'نفسیاتی اور جنگی نکتہ نگاہ سے پورے جزیرہ عرب میں ایک بہت بڑی تبدیلی کا راستہ کھول دیا۔ پھر چند سالوں میں مدینہ طیبہ کے اندر یہود کی قوت تباہ ہو گئی اور بیرون مدینہ سینکڑوں میل تک پھیلا ہوا علاقہ 'بڑی تیزی سے اسلام کی قلمرو میں شامل ہو گیا۔ جنگ خندق میں کفر نے اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے اسلامی قوت کو مٹانا چاہا 'لیکن ناکامیوں کی رسوائی کے سوا انھیں کچھ حاصل نہ ہوا۔ تین ہی سال بعد آخر مکہ سرنگوں ہو گیا اور اس طرح کفر کی قوت اسلام کے سامنے ڈھیر ہو گئی۔

یہ مختصر سی ان کامیابیوں کی تاریخ ہے 'جس کے بارے میں اس آیت کریمہ کے آخر میں فرمایا کہ عنقریب تم ان خبروں کو اپنی آنکھوں سے وقوع پذیر ہوتا دیکھو گے 'جن کا آج تم تمسخر اڑا رہے ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اہل مکہ نے جو دیکھا سو دیکھا 'ان کے سردار ابوسفیان نے تو اپنی آنکھوں سے ایک ایسا منظر دیکھا 'جس نے یقیناً ان کی پوری شخصیت کو ہلا کے رکھ دیا ہوگا 'مسلمانوں کی فوجیں جب فتح مکہ کے لیے اہل مکہ کے سر پر جا پہنچیں اور انھوں نے رات کو دور دور تک اپنے چولہے جلائے تو مکہ والے یہ آگ دیکھ کر حیران اور سراسیمہ ہو کر مکہ سے باہر نکل آئے۔ ابو

سفیان ان میں سب سے آگے تھا۔ حضرت عباس (رض) نے ان کو دیکھ لیا۔ پکڑ کے لے گئے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ان کے لیے امان حاصل کی ' پھر ایک بلند چوٹی پر کھڑا کر کے کہا 'میں تمہیں مسلمانوں کی قوت کا نظارہ کرانا چاہتا ہوں ' چنانچہ جب مسلمان فوج حرکت میں آئی اور ایک ایک قبیلہ اپنی مخصوص وردی میں ' اپنے مخصوص ہتھیاروں کے ساتھ دریا کی موجوں کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہوا آگے بڑھا تو ابوسفیان سراسیمہ ہو کے رہ گیا۔ بالآخر حیرانی کے عالم میں اس نے حضرت عباس (رض) سے کہا کہ عباس تمہارا بھتیجا تو بہت بڑا بادشاہ ہو گیا۔ حضرت عباس (رض) نے فرمایا: ابوسفیان اب بھی آنکھیں کھولو 'معلوم ہوتا ہے تمہاری آنکھوں کا پردہ اب بھی دور نہیں ہوا۔ یہ بادشاہت نہیں 'نبوت ہے۔

اندازہ فرمایئے! ابوسفیان جب حضرت عباس (رض) سے یہ باتیں کر رہے تھے تو کیا ان کے کان میں کوئی کہہ نہیں رہا ہو گا کہ ابوسفیان 'یہ اسلامی غلبے کا وہی منظر ہے 'جس کے بارے میں تمہیں مکی زندگی میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خبریں دیا کرتے تھے اور تم مذاق اڑایا کرتے تھے۔ آج دیکھو! وہ حقیقت بن کر تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔
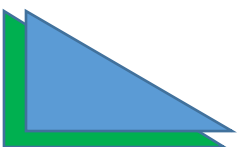
قرآن کریم 'ذات رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور پیش آنے والے حالات سے استدلال کرنے کے بعد 'اب اگلی آیت میں مشرکینِ مکہ کے سامنے ایک تاریخی شہادت پیش کر رہا ہے کہ اگر وہ اپنے تعصّبات میں اس قدر اندھے ہو گئے ہیں کہ نہ انھیں آنحضرت کی ذات میں حق کی کوئی نشانی دکھائی دیتی ہے اور نہ قرآن کریم میں تو کم از کم تاریخ کے آئینہ کو تو غور سے دیکھیں۔ اس سے تو انھیں کوئی کد نہیں ہونی چاہیے۔ (روح القرآن۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

آیت مبارکہ :

فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۭ فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰۗؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝5

لغۃ القرآن: [فَقَدْ : پس تحقیق][كَذَّبُوْا : انہوں نے جھٹلایا][بِالْحَقِّ : حق کو][لَمَّا جَآءَهُمْ: جب آیا انکے پاس][فَسَوْفَ : تو عنقریب][يَاْتِيْهِمْ : آئیں گی انکے پاس][اَنْۢبٰۗؤُا : خبریں][مَا كَانُوْا : جو وہ تھے][بِهٖ : اسکے ساتھ][يَسْتَهْزِءُوْنَ : وہ مذاق کرتے]

ترجمہ : پھر بیشک انھوں نے (اسی طرح) حق (یعنی قرآن) کو (بھی) جھٹلا دیا جب وہ ان کے پاس (اُلوہی نشانی کے طور پر) آیا، پس عنقریب ان کے پاس اس کی خبریں آیا چاہتی ہیں جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے

تشریح : پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کو توحید اور اس کے دلائل اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں سے اعراض، ان کی تکذیب کرنے اور ان کا مذاق اڑانے سے منع فرمایا تھا۔ اب افتراء اور استہزاء پر ان کو عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔
اس آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ کفار اور مکذّبین کو عذاب کی وعید سنانا اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ کیا ان کو معلوم نہیں کہ ان سے پہلے عاد، ثمود، قوم فرعون اور قوم لوط کو ہلاک کر دیا گیا۔ جنھوں نے اس گھمنڈ کے ساتھ تکذیب کی کہ ہم بہت طاقتور، اور مالدار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جرائم کی وجہ سے ان کی پکڑ کی اور ان کو ختم کرکے ان کی جگہ دوسری قوم کھڑی کر دی۔
یہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے جو قوم اپنے رسول کی تکذیب اور اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتی ہے۔ اللہ اسے ملیا میٹ کر دیتا ہے۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیل القرآن)

یاد رہے یہاں حق سے یا قرآن مجید کی آیات مراد ہیں یا تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزات کہ جب بھی قرآن کی آیتیں یا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزات کفار مکہ کے سامنے آتے یا حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) انھیں کچھ سمجھاتے تو وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جھٹلاتے۔ اس پر فرمایا کہ عنقریب ان کے پاس خبریں آنے والی ہیں اس چیز کی جس کا یہ مذاق اڑاتے تھے اور انھیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیسی عظیم الشان خبر ہے اور اس کی ہنسی بنانے کا انجام کیسا خوفناک ہے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)
گویا انھوں نے جان بوجھ کر حق کی تکذیب کی تو انتظار کریں جس چیز (عذاب) کا وہ مذاق اڑاتے رہے اس کی خبریں آنے والی ہیں۔ چنانچہ میدان بدر میں ان کی ذلت و ہزیمت کی خبریں مکہ میں یوں پہنچیں کہ نہ صرف مکہ بلکہ پورے حجاز اور جزیرہ عرب میں کفار کے ہوش اڑ گئے پھر اسلامی فتوحات کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا اور ہر آنے والا دن عزیٰ و ھبل کے پجاریوں کے لیے ذلت کی نئی خبر لایا۔
پھر یہ ہوا کہ چند ہی برسوں میں پورے عرب سے کفر و شرک کا بوریا بستر گول ہو گیا۔ ہجری 8 میں ماہ رمضان المبارک میں عرب کے دل مکہ مکرمہ پہ اسلام کا پرچم لہرانے لگا جس کی دھاک پورے عرب پہ یوں بیٹھی کے تمام اطراف عرب سے قبائل کے وفود در وفود نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس مسلسل پہنچنے لگے اور دین حق میں داخل ہو کر اپنی عاقبت کو سنوارنے لگے اور جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دنیا سے پردہ پوش ہوئے تو پورے عرب پہ بلکہ عرب سے باہر بھی اسلام کا جھنڈا لہرا رہا تھا ایسی عظیم الشان فتح و نصرت اللہ نے اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عطا فرمائی۔ (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب القرآن)
جناب قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں:
حق سے مراد ہے قرآن یا رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک۔ فَقَدۡ میں فاء تفریع (نتیجہ نکالنے) کے لیے ہے یعنی جب انھوں نے تمام معجزات کا انکار کر دیا تو قرآن کا بھی انکار کر دیا۔ یہ بھی ایک معجزہ ہی ہے۔ یا فاء سببی ہے یعنی جب انھوں نے قرآن کی تکذیب کی جو لفظاً اور معناً ہر زمانہ
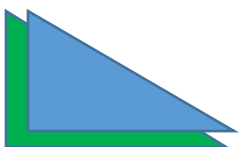
میں واضح ترین معجزہ ہے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : کی تکذیب کی جن کا وجود بجائے خود معجزہ ہے ایک شخص جو انہی میں پیدا ہوا اور اس نے نہ کسی سے کچھ پڑھا نہ لکھا پھر ایسے شخص سے علم کے چشمے اور حکمت کے دریا بہ نکلے جس کی تائید سابق آسمانی کتابوں سے ہو رہی ہے اور اس کی نبوت کا اقرار بڑے بڑے یہودی اور عیسائی علماء و مشائخ کر چکے ہیں لیکن انھوں نے اس کی نبوت کا بھی اقرار نہیں کیا تو پھر دوسرے متفرق معجزات سے روگردانی کیوں نہیں کریں گے۔

فسوف یاتیھم انبوء ما کانوا بہ یستھزون سو آئندہ ان کو اس چیز کی خبریں مل جائیں گی جس کا یہ مذاق اڑاتے تھے۔ یعنی قیامت کے دن یا اسلام کے ظہور و عروج کے زمانہ میں۔ مطلب یہ کہ اپنے عمل کی برائی اس وقت ان پر ظاہر ہو جائے گی ' جب قیامت کے دن یا دنیا میں ہی ان پر عذاب آ جائے گا۔ (تفسیر مظہری)

نور حق سے محرومی سب سے بڑی محرومی۔ وَالْعِیَاذ باللّٰہِ الْعَظِیْمِ

سو اس سے واضح فرما دیا گیا تکذیب حق اور نور حق سے اعراض و روگردانی خساروں کا خسارہ اور سب سے بڑی محرومی ہے۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ اور اسی بنا پر انھوں نے جھٹلایا اس حق کو جو ان کے پاس آ چکا قرآن حکیم کے نزول اور نبی آخر الزمان کی بعثت و تشریف آوری کی صورت میں۔ اور اپنی کامل، مکمل اور آخری شکل میں۔ اور قیام قیامت تک تمام زمانوں اور جملہ انسانوں کے لئے۔ تو اس کو جھٹلا کر یہ لوگ دارین کے خسارہ و نقصان میں مبتلا ہو گئے اور نور حق و ہدایت سے بہرہ ور و سرفراز ہونے کی بجائے کفر و باطل کے دبیز اور گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوب گئے۔ سو حق سے اعراض و روگردانی سب سے بڑا خسارہ اور محرومی ہے۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ اور ایسے لوگ اپنے اس ہولناک انجام کو پہنچ کر رہیں گے جس کے یہ اپنے جرم تکذیب و انکار کی بنا پر مستحق ہیں۔ تب ان کے سامنے وہ تمام حقائق اپنی اصل اور حقیقی شکل میں سامنے آ جائیں گے جن کو یہ زندگی بھر جھٹلاتے رہے تھے۔ (تفسیر مدنی کبیر)

یوں تو آسمان اور زمین اور ان کے اندر جو حادثے ہوتے رہتے ہیں ان پر اور کرنے سے عقلمند ضرور اللہ کو مان لے گا لیکن ممکن ہے کہ غفلت کی وجہ سے ان پر غور کرنے کا موقعہ نہ ملے یا ملے تو کھیل کود میں مشغول ہونے کی وجہ سے حقیقت کے پتہ لگانے کا ارادہ ہی نہ کرے لیکن ایک نشانی تو ان کے پاس ایسی زبردست آ چکی ہے کہ اس کے اندر شبہ کی گنجائش ہی نہیں کیونکہ اس کے ساتھ اس کو سمجھانے والا بھی موجود ہے اور اس کا کام ہی یہ ہے کہ تمام لوگوں کو اس کی طرف توجہ دلائی اور وہ نشانی انھیں صحیح طور پر سمجھا دے یہ نشانی قرآن مجید ہے اور اس کے لانے والے رسول اکرم محمد عربی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔ قرآن مجید کی ایک ایک آیت اللہ کے برحق ہونے پر گواہ ہے اور سچائی اور حقیقت کو واضح کرتی ہے اور پھر رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سمجھانے کے لیے موجود ہیں۔ اس کے بعد اس سب سے بڑی نشانی یعنی قرآن مجید سے منہ موڑنے کے لئے کوئی عذر ہی نہیں رہتا اور اگر کوئی منہ موڑتا ہے تو اس کی وجہ اس کی ہٹ دھرمی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد اس کے نہ ماننے والوں کو سزا سے ڈرایا گیا ہے ارشاد ہے کہ ان لوگوں نے تو ہٹ دھرمی سے ایک سچی کتاب کو جھٹلایا لیکن انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ وہ دن دور نہیں کیا ان پر اس کا بال پڑے گا اس کتاب کی ایک ایک بات پوری ہو کر رہے گی اور جن باتوں کی یہ آج ہنسی اڑا رہے ہیں کلیہ باتیں ان کو رلا کر رہے گی اور وہ اس گستاخی کا مزہ چکھیں گے۔

قرآن مجید میں اس کے نا ماننے والوں کے لیے دو قسم کی سزاؤں کی پیشگوئی کی گئی ہے۔ دنیا کی سزا اور آخرت کی سزا۔ دونوں سزاؤں کے یقینی ہونے کا اس قدر صاف اعلان کر دیا گیا تھا کہ سمجھ داروں کے لیے اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ تھی۔ لیکن کافروں نے نہ مانا وہ آگے چل کر دنیا میں ان کا وہی حال ہوا جس سے انھیں ڈرایا گیا تھا اس سے سمجھ لینا چاہیے کہ آخرت کی سزا بھی ایسی ہی یقینی ہے۔ (درس آسٹریلیا)
نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ابتدائے عمر سے آخر تک انھیں قبائل عرب کے درمیان رہے۔ بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپا انہی کی آنکھوں کے سامنے آیا۔ ان پر یہ بھی پوری طرح واضح تھا کہ نبی اعظم وآخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کسی انسان سے مطلقاً کوئی تعلیم حاصل نہیں کی، یہاں تک کہ اپنا نام بھی نبوت سے پہلے خود نہ لکھ سکتے تھے۔ لیکن نبوت کیا ملی کہ یہ سب کچھ لکھنا آگیا۔ اس سے پہلے کچھ نہ پڑھ سکتے تھے لکن بعد از نبوت سب کچھ پڑھنا آگیا اور نبوت آنے تک کا سارا زمانہ ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ چالیس سال کی عمر اسی حال میں ان کے درمیان گذری کہ نہ کبھی شعر وشاعری سے دلچسپی ہوئی اور نہ ہی کبھی علم حاصل کرنے کی طرف میلان ہوا پھر چالیس سال پورے ہوتے ہیں دفعتاً آپ کی زبان اقدس سے وہ حقائق و معارف اور علوم وفنون جاری ہوگئے کہ دنیا کے بڑے بڑے ماہر فلاسفر بھی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے عاجز نظر آئے۔ عرب کے تمام فضلاء وبلغاء کو اپنے لائے ہوئے کلام کا مقابلہ کرنے کے لیے چیلنج دیا۔ یہ لوگ جو نبی اعظم وآخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو شکست دینے کے لیے اپنی جان ومال، عزت وآبرو، اولاد، خاندان سب کچھ قربان کرنے کے لیے ہر وقت تلے رہتے تھے ان میں سے کسی ایک کی یہ جرأت نہ ہوئی کہ اس چیلنج کو قبول کرکے قرآن کریم کی ایک آیت کی مثال پیش کر دے۔ اس طرح نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہاتھوں ایسے ایسے عقدے حل ہوئے کہ جن کا انکار کوئی صاحب عقل اور صحیح الحواس نہیں کر سکتا مگر ان لوگوں نے ان ساری نشانیوں کو یکسر جھٹلا دیا اور اس جھٹلانے کا ذکر اس طرح بیان فرمایا کہ "جب بھی کوئی سچائی ان کے پاس آئی تو انھوں نے اس کو جھٹلانے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی۔"

جس کی انھوں نے ہنسی اڑائی وہی ان کے زوال کا باعث ہوگئی

نبی رحمت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ایک طرح کی تسلی دی جارہی ہے کہ یہ لوگ جس بات کی ہنسی اڑاتے رہے ہیں عنقریب اس کی حقیقت انھیں معلوم ہوجائے گی اور وہ اپنے کئے کی پاداش میں جکڑ کر رکھ دیئے جائیں گے۔ اس جگہ کفار کے تین مدارج کا ذکر کیا گیا یعنی جب آیات ان کے سامنے پیش کی گئیں تو انھوں نے اول اول ان سے منہ پھیرا، اعراض کیا اور ان کو قابل توجہ نہ جانا۔ دوسرا مرحلہ آیا تو انھوں نے آیات الٰہی کو جھٹلانا شروع کر دیا کبھی ان کو سچ ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے اور پھر تیسرے مرحلہ میں ان کا مذاق اڑانے لگ گئے اور اس آخری مرحلہ میں پہنچ کر انھوں نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مخالفت کے لیے کمر ہمت باندھ لی۔
نبی اعظم وآخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت کا اثر جب پھیلنے لگا تو مکہ کے سرداروں نے آپس میں مشورہ کرکے یہ طے کیا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مقابلے میں پروپیگنڈہ کی ایک مہم شروع کی جائے اور ہر اس شخص کو جو مکہ میں زیارت کے لیے آئے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف پہلے ہی سے اتنا بدگمان کر دیا جائے کہ وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بات سے سننے کے لیے آمادہ ہی نہ ہو۔ یہ مہم ویسے تو بارہ مہینے ہی جاری رہتی تھی مگر خاص طور پر حج کے زمانے میں کثرت سے آدمی پھیلا دیئے جاتے تھے جو تمام بیرونی زائرین کے خیموں

میں پہنچ کر ان کو خبر دار کرتے پھرتے تھے کہ یہاں ایسا ایسا ایک آدمی ہے اس لیے ہوشیار رہنا۔ پھر ان گفتگوؤں میں طرح طرح کی باتیں بنائی جاتی تھیں۔ کبھی کہا جاتا کہ یہ شخص جادو گر ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ ایک کلام اس نے خود گھڑ لیا ہے اور کہتا ہے کہ خدا کا کلام ہے کبھی کہا جاتا کہ اجی وہ کلام کیا ہے کہ دیوانوں کی بڑ اور پراگندہ خیالات کا پلندا ہے کبھی کہا جاتا کہ شاعرانہ تخیلات اور تک بندیاں ہیں جن کا نام اس نے کلام الٰہی رکھ دیا ہے اور ان ساری باتوں کا مقصد بہر حال ایک ہی تھا کہ کسی نہ کسی طرح لوگوں کو بہکایا جائے تاکہ وہ نبی اعظم وآخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مجلسوں میں نہ بیٹھیں اور اس کی باتوں پر کان نہ دھریں اور سنی ان سنی کر دیں لیکن چونکہ ان کے پاس کوئی جچا تلا سوال نہ تھا جو اس جگہ اٹھا دیتے اور سب کی زبانیں اس کو دہراتیں اس لیے اس جھوٹے پروپیگنڈے کا حاصل جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ انھوں نے اس طرح نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا آپ کی جتنی شہرت مسلمانوں کی کوششوں سے سالہا سال میں بھی نہ ہو سکتی تھی وہ کفار کی اسی مخالفانہ مہم سے تھوڑی مدت ہی میں چار سو پھیل گئی۔ اس طرح ہر دل میں ایک سوال پیدا ہو گیا کہ آخر معلوم تو ہو کہ کون ایسا آدمی ہے جس کے خلاف یہ طوفان بپا ہے اور بہت سے سوچنے والوں نے سوچا کہ اس شخص کی بات سنی تو جائے۔ آخر وہ کہتا کیا ہے؟ اس طرح جس چیز کو انھوں نے ہنسی بنایا وہی ان کے زوال کا اصل باعث ہو گئی۔

طفیل بن عمرو دوسی کا واقعہ

ابن اسحٰق نے طفیل بن عمرو دوسی کا قصہ خود ان کی زبان سے نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں قبیلہ دوسی کا ایک شاعر تھا۔ کسی کام سے مکہ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی قریش کے چند لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور نبی اعظم وآخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف خوب میرے کان بھرے یہاں تک کہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سخت بدگمان ہو گیا اور میں نے طے کر لیا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بچ کر ہی رہوں گا۔ دوسرے روز میں نے حرم میں حاضری دی تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ میرے کانوں میں چند جملے جو پڑے تو میں نے محسوس کیا کہ یہ تو کوئی بڑا ہی اچھا کلام ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں ایک شاعر ہوں۔ جوان مرد ہوں، کوئی بچہ نہیں۔ عقل رکھتا ہوں اور پھر صحیح اور غلط میں تمیز نہ کر سکوں، آخر کیوں؟ میں نے ارادہ کر لیا کہ میں اس شخص سے ضرور ملاقات کروں گا اور یہ معلوم کروں گا کہ یہ کیا کہتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب نماز سے فارغ ہو کر واپس چلے تو میں آپ کے پیچھے پیچھے ہو لیا اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مکان پر پہنچ کر میں نے عرض کیا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قوم نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق مجھ سے کہا تھا اور میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس حد تک بدگمان ہو گیا تھا کہ میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی تاکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آواز میرے کانوں میں نہ پڑے لیکن ابھی چند کلمے ہی میں نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبان سے سنے ہیں ن۔ وہ مجھے کچھ اچھے معلوم ہوئے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ذرا مجھے تفصیل سے بتایئے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا کہتے ہیں؟ اس کے جواب میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے قرآن کریم کا کچھ حصہ سنایا اور میں اس سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسی وقت ایمان لے آیا اور پھر واپس جا کر میں نے اپنے باپ اور بیوی کو مسلمان کیا اور ازیں بعد اپنے قبیلے میں مسلسل اشاعت اسلام کرتا رہا یہاں تک کہ غزوہ خندق کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے میرے قبیلے کے سّتر، اسّی گھرانے مسلمان ہو گئے۔ (ابن ہشام ج ۲ ص ۲۲، ۲۴)

یہ نتیجہ تھا قرآن کریم کو سمجھنے کا لیکن افسوس کہ آج قوم مسلم نے قرآن کریم نہ سمجھ کر پڑھنے کی قسم کھالی ہے اور علماء اسلام کی اکثریت نے عوام کالانعام کو قرآن کریم سے صرف برکت حاصل کرنے اور مردوں کو بخشوانے کے لیے باور کرادیا ہے کہ قرآن کریم اللہ کی کتاب اس لیے ہے کہ اس کی تلاوت کرکے مرنے والوں کے گناہوں کا ازالہ کرایا جائے اس کے لیے یہ نسخہ اکسیر ہے۔اس طرح انھوں نے قرآن کریم کا مذاق اڑانے کا یہ ایک نیا طریقہ ایجاد کرلیا ہے اور وہ پہلے مذاق اڑانے والوں کا انجام بالکل بھول چکے ہیں حالانکہ ان کا بھی وہی حشر ہونے والا ہے جو پہلوں کا ہوا۔ (عروۃ الوثقی)

آیت مبارکہ:

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ۠ وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿6﴾

لغۃ القرآن: [اَلَمْ : کیا نہیں][يَرَوْا : انہوں نے دیکھا][كَمْ اَهْلَكْنَا : کتنی ہم نے ہلاک کیں][مِنْ : سے][قَبْلِهِمْ : پہلے ان][مِّنْ : سے][قَرْنٍ : امتیں][مَّكَّنّٰهُمْ : ہم نے انکو طاقت دی][فِي : میں][الْاَرْضِ : زمین][مَا لَمْ : جو نہیں][نُمَكِّنْ : ہم نے طاقت دی][لَّكُمْ : تمہیں][وَاَرْسَلْنَا : اور ہم نے بھیجی][السَّمَآءَ : آسمان (جمع)][عَلَيْهِمْ : ان پر][مِّدْرَارًا : موسلادھار بارش][وَّجَعَلْنَا : اور ہم نے بنائی][الْاَنْهٰرَ : نہریں][تَجْرِيْ : چلتی ہیں][مِنْ : سے][تَحْتِهِمْ : ان کے نیچے][فَاَهْلَكْنٰهُمْ : توہم نے انکو ہلاک کیا][بِذُنُوْبِهِمْ : انکے گناہوں کی وجہ][وَاَنْشَاْنَا : اور ہم نے پیدا کیں][مِنْۢ : سے][بَعْدِهِمْ : انکے بعد][قَرْنًا : امتیں][اٰخَرِيْنَ : دوسری]

ترجمہ : کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر دیا جنہیں ہم نے زمین میں (ایسا مستحکم) اقتدار دیا تھا کہ ایسا اقتدار (اور جماؤ) تمہیں بھی نہیں دیا اور ہم نے ان پر لگاتار برسنے والی بارش بھیجی اور ہم نے ان (کے مکانات و محلّات) کے نیچے سے نہریں بہائیں پھر (اتنی پر عشرت زندگی دینے کے باوجود) ہم نے ان کے گناہوں کے باعث انھیں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد ہم نے دوسری امتوں کو پیدا کیا

تشریح : اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کو اللہ تعالیٰ کی نشانوں سے اعراض کرنے ،ان کی تکذیب کرنے اور ان کا مذاق اڑانے سے منع فرمایا تھا اور ان کے اس انکار اور استہزاء پر ان کو عذاب کی وعید سنائی تھی۔اس آیت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ کفار اور مکذبین کو عذاب کی وعید سنانا اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے۔ کیا ان مکذبین کو لوگوں سے خبریں سن کر یہ معلوم نہیں ہوا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی سابقہ امتوں کو مثلاً قوم عاد و ثمود ،قوم فرعون اور قوم لوط کو ہلاک کر دیا۔ جنہوں نے اپنے اپنے زمانوں میں اس گھمنڈ سے اپنے رسولوں کی تکذیب کی تھی کہ وہ بہت مالدار اور طاقتور ہیں۔ وہ قریش مکہ سے اس بات میں ممتاز تھے کہ ان پر بکثرت موسلادھار بارشیں نازل ہوتی تھیں، جس سے ان کی زرعی زمینیں بہت زرخیز ہوتی تھیں اور ان کے مکانوں کے کنارے پر دریا بہتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے رسولوں کی تکذیب کی اور اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو ہم نے ان کو ہلاک کر دیا اور ان کے بعد ایک اور قوم پیدا کی جو اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتی تھی اور یہ بھی اللہ کی سنت جاریہ ہے کہ جو قوم اپنے رسول کی تکذیب کرتی ہے اور اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتی ہے ،اللہ تعالیٰ اس قوم کو ملیا میٹ کر دیتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے :

(آیت) "وكم اهلكنا من قرية بطرت معيشتها فتلك مساكنهم لم نسكن من بعدهم الا قليلا و كنا نحن الورثين، وما كان ربك مهلك القرى حتى يبعث فى امها رسولا تتلوا عليهم ايتنا وما كنا مهلكى القرى الا واهلها ظالمون"۔ (القصص : ۵۹۔۵۸)

ترجمہ : ہم نے کتنی ہی بستیوں کو ہلاک کر دیا (جن کے رہنے والے) اپنی خوشحالی پر اترانے لگے تھے۔ سو یہ ہیں ان کے مکان ،جن میں ان کے بعد بہت کم رہائش کی گئی ہے اور (بالاخر) ہم ہی وارث ہیں، اور آپ کا رب اس وقت تک بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہیں ہے جب تک کہ ان بستیوں کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دے ،جو ان پر ہماری آیتوں کی تلاوت کرے اور ہم اس وقت ہی بستیوں کو ہلاک کرتے ہیں جب اس کے رہنے والے ظلم کرنے والے ہوں۔

اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ کفار مکہ کو نصیحت کی جائے اور انھیں اس بات سے ڈرایا جائے کہ کہیں ان پر بھی وہ عذاب نہ آجائے جو پچھلی امتوں کے ان کے ان جیسے کافروں پر آیا تھا ،جب کہ وہ لوگ دنیاوی شان و شوکت اور قوت و طاقت اور عددی حیثیت سے اہل مکہ کی بہ نسبت کہیں زیادہ اور برتر تھے۔ (تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی القرآن)

مکہ کے باشندے تجارت پیشہ تھے۔ ان کے تجارتی کارواں دور دراز ملکوں میں جایا کرتے تھے۔ راستہ میں ان کا گزر کئی اجڑی ہوئی بستیوں، ویران کھنڈروں اور غیر آباد کنوؤں اور نہروں پر ہوتا تھا۔ جب انھوں نے دلائل توحید میں غور و فکر کرنے کے بجائے ان کا مذاق اڑانا شروع کر دیا تو پہلی گمراہ قوموں کے ہولناک انجام کا ذکر کرکے انھیں متنبہ کیا جا رہا ہے کہ یہ عاد و ثمود کی ویران بستیاں جن کو تم بارہا دیکھ چکے ہو یہاں

کے بسنے والے تم سے زیادہ خوشحال تھے۔ مال و دولت کی فراوانی تھی۔ وسیع و عریض خطہ زمین ان کے زیر نگیں تھا۔ ان کے ملک میں ٹھنڈے اور میٹھے پانی کی نہروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ان کے کھیت سونا اگل رہے تھے اور ان کے گھر رشک ارم بنے ہوئے تھے۔ لیکن جب انھوں نے بے راہ روی اختیار کیا اور اللہ تعالیٰ کی حدوں کو توڑنا شروع کر دیا تو قانون مکافات حرکت میں آیا اور وہ اپنے گناہوں کی پاداش میں ایسے عذاب میں مبتلا کر دیئے گئے جس نے ان کو نیست و نابود کر دیا۔
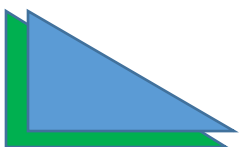
لیکن ان کی تباہی و بربادی سے بزم کائنات کی رونق میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ ان کا جانشین ہم نے دوسری قوم کو بنا دیا جس نے اپنی راست بازی اور محنت و خلوص سے بازار ہستی کی رونق میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ اس میں ہمارے لیے بھی درس عبرت ہے۔ جب تک ہم احکام الٰہیہ کے پابند رہیں گے۔ جب تک ہماری تعمیری صلاحیتیں خدمت خلق میں مصروف رہیں گی۔ عزت واقتدار کی مسند کے ہم مالک ہوں گے اور جب ہم بھی طاؤس ورباب کے دلدادہ بن گئے تو پژمردہ پھولوں کی طرح ہمیں بھی باغ سے باہر پھینک دیا جائے گا۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ القرآن)

عاد و ثمود ہلاک ہو گئے تم کیا چیز ہو؟

یعنی عاد و ثمود وغیرہ جن کو تم سے بڑھ کر طاقت اور ساز و سامان دیا گیا تھا۔ بارشوں اور نہروں کی وجہ سے ان کے باغ اور کھیت شاداب تھے، عیش و خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ جب انھوں نے بغاوت اور تکذیب پر کمر باندھی اور نشانہائے قدرت کی ہنسی اڑانے لگے۔ تو ہم نے ان کے جرموں کی پاداش میں ایسا پکڑا کہ نام و نشان بھی باقی نہ چھوڑا۔ پھر ان کے بعد دوسری امتیں پیدا کیں اور منکرین ومکذِبین کے ساتھ یہی سلسلہ جاری رہا کیا۔ مجرمین تباہ ہوتے رہے اور دنیا کی آبادی میں کچھ خلل نہیں پڑا۔

قرن کی تحقیق

اس آیت میں فرمایا ہے کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنے قرن تباہ کر دیئے اس آیت میں قرن کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ: نے قرن کا یہ معنی لکھا ہے قرن ان لوگوں کو کہتے ہیں جو ایک زمانہ میں مقترن ہوں اس کی جمع قرون ہے (المفردات، ص ۴۰۱) علامہ ابن اثیر جزری متوفی ۶۰۶ھ نے لکھا ہے، ہر زمانہ کے لوگوں کو قرن کہتے ہیں اور یہ ہر زمانہ میں متوسط عمروں کی مقدار پر مشتمل لوگ ہیں۔ یہ لفظ اقتران سے ماخوذ ہے، یعنی جتنے زمانہ میں اس زمانہ کے لوگ اپنی عمروں اور اپنے احوال سے متقرن ہوں۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ زمانہ چالیس سال کا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ اسی سال کا زمانہ ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ سو سال کا زمانہ ہے اور ایک قول یہ ہے کہ مطلق زمانہ ہے۔ (النہایہ، ج ۴، ص ۵۱) امام رازی متوفی ۶۰۶ھ نے لکھا ہے کہ واحدی نے کہا ہے کہ زمانہ کی جس مدت میں ایک قوم مقترن ہو وہ قرن ہے، یعنی جس مدت میں ایک قوم مقترن ہو، پھر موت سے وہ دوسری قوم سے متفرق ہو جائے تو وہ قوم ایک قرن ہے۔ کیونکہ جو لوگ اس کے بعد آئیں گے وہ ایک دوسری قوم ہوں گے اور وہ آپس میں مقترن ہوں گے، تو یہ دوسری قرن ہے۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تمام قرنوں میں بہترین میرا قرن ہے۔ اور جبکہ عموماً لوگوں کی عمریں ساٹھ، ستر
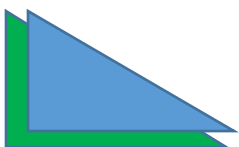
'اور اسی سال کے لگ بھگ ہوتی ہیں اس وجہ سے بعض لوگوں نے کہا قرن ساٹھ سال کا زمانہ ہے۔ بعض نے کہا ستر سال کا اور بعض نے کہا اسی سال کا زمانہ ہے۔ اور تحقیق یہ ہے کہ اس میں زمانہ کی کوئی ایسی معین مقدار نہیں ہے جس پر زیادتی یا اس سے کمی نہ ہو سکے 'بلکہ اس سے مراد ہے ہر زمانہ کے لوگ اور جب اس زمانہ کے اکثر لوگ ختم ہو جائیں گے تو کہا جائے گا کہ وہ قرن ختم ہو گئی۔ (تفسیر کبیر 'ج ۴ ص ۱۱ 'طبع قدیم)

امام رازی نے جس حدیث کا ذکر کیا ہے 'وہ یہ ہے۔

حضرت عمران بن حصین (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم سب میں بہترین میرا قرن ہے۔ پھر وہ لوگ جو ان کے قریب ہیں 'پھر وہ لوگ جو ان کے قریب ہیں۔ (الحدیث) (صحیح البخاری 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۲۶۵۱ 'صحیح مسلم 'فضائل صحابہ ' ۲۱۴ '(۲۴۳۵) ۶۲۵۵ 'سنن ابوداؤد 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۴۶۵۷ 'سنن ترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث : ۲۲۲۹ 'سنن نسائی ' ۳۸۱۸ ' صحیح ابن حبان 'ج ۱۶ 'رقم الحدیث : ۷۲۲۹ 'مصنف ابن ابی شیبہ 'ج ۱۲ 'ص ۱۷۶ 'المعجم الکبیر 'ج ۱۸ 'رقم الحدیث : ۵۸۵ 'مسند احمد 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۷۲۰۸ 'طبع دارالفکر 'مسند احمد 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۳۵۹۴ 'طبع قاہرہ 'مسند احمد ج ۱ 'ص ۲۷۹ 'طبع قدیم)

اکثر محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ قرن سو سال کا زمانہ ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عبداللہ بن بسر (رض) سے فرمایا تھا کہ تم ایک قرن تک زندہ رہو گے تو وہ سو سال زندہ رہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۶ ص ۳۰۳ 'مطبوعہ دارالفکر ' بیروت ۱۴۱۵ ھ) (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

صحیح ترین قول یہ ہے کہ قرن صدی کو کہتے ہیں کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عبداللہ بن بشر مازنی سے فرمایا تھا تم ایک قرن جیوگے چنانچہ ان کی عمر سو برس ہوئی۔ ذکرہ البغوی نہایہ الجوزی میں ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیر کر فرمایا تو ایک قرن جیتا رہے چنانچہ اس کی عمر سو برس ہوئی ہوئی۔

تاریخ عالم عبرت کی کتاب ہے

بلاشبہ تاریخ عالم عبرتوں کی ایک کتاب ہے، جس کو اگر چشم بصیرت سے دیکھا جائے تو وہ ہزاروں وعظوں سے زیادہ موثر وعظ ہے۔ ایک حکیم کا یہ جملہ بہت ہی پسندیدہ ہے کہ: دنیا ایک بہترین کتاب ہے، اور زمانہ بہترین معلم۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کا ایک بہت بڑا عنصر قصص اور تاریخ ہے، لیکن عام طور پر غفلت شعار انسان نے دنیا کی تاریخ کو بھی ایک تفریحی مشغلہ کی حیثیت سے زیادہ وقعت نہیں دی، بلکہ اس وعظ و حکمت کی بہترین کتاب کو بھی اپنی غفلت و معصیت کا ایک ذریعہ بنا لیا۔

قدرت الٰہی کے کرشمے

آخر آیت میں ارشاد فرمایا: وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ یعنی اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ کا صرف یہی تصرف نہیں تھا کہ بڑی بڑی جاہ وجلال اور حکومت و سلطنت کی مالک اور ڈیل ڈول و قوت و طاقت والی قوموں کو چشم زدن میں ہلاک و برباد کر دیا، بلکہ ان کو ہلاک کرتے ہی ان کی جگہ دوسری قومیں پیدا کر کے ایسی طرح بسا دیا کہ دیکھنے والوں کو یہ بھی محسوس نہ ہوسکا کہ یہاں سے کوئی انسان کم بھی ہوا ہے۔
اور حق جل شانہ کی اس قدرت و حکمت کا مشاہدہ تو ویسے بھی ہر زمانہ ہر وقت میں ہوتا رہتا ہے کہ روزانہ ہزاروں لاکھوں انسان ہلاک ہوتے رہتے ہیں، مگر کہیں خلا نظر نہیں آتا کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہاں کے آدمی ہلاک ہو گئے تو اس میں بسنے والے نہ رہے (تفسیر گلدستہ)

"مکہ" پورے جزیرہ عرب کا تجارتی مرکز تھا

مکہ والوں کو ہدایت قبول کرنے میں جن چیزوں نے روکا 'ان میں سے ایک چیز ان کا یہ پندار تھا کہ ہم پورے جزیرہ عرب میں سب سے زیادہ مالدار 'خوشحال اور طاقتور قوم ہیں۔ اپنی اس خوشحالی پر اس قدر نازاں تھے کہ اس کے مقابلے میں کوئی بھی نصیحت قبول کرنے کو تیار نہیں تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ اپنے انجام کے بارے میں سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں تھے۔ ممکن ہے 'آپ کو یہ خیال آئے کہ وہ تو نہایت پسماندہ علاقے کے رہنے والے لوگ تھے 'جہاں خوشحالی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ سال بہ سال حاجی وہاں زیارت کعبہ کے لیے جاتے تو حج کے دنوں میں کوئی تجارت ہو جاتی 'اس پر ان کے سال بھر کی گزر بسر کا دارومدار تھا۔ ان کے پاس ایسی کون سی خوشحالی تھی 'جس کی وجہ سے وہ اپنے انجام سے بے فکر ہو گئے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ مکہ اور اہل مکہ کی تاریخ کے حوالے سے ہمارے یہاں بہت سی غلط تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیلیاں ہیں۔ یہ موقع نہیں کہ ان کی تفصیل بیان کی جائے 'بس اتنا جان لیجئے کہ مکہ پورے جزیرہ عرب میں مرکز اجتماع بھی تھا اور مرکز اعصاب بھی۔ پوری قبائلی زندگی کی قوت کا سرچشمہ اسی شہر کو کہا جاسکتا ہے۔ اس کا فیصلہ پورے جزیرہ عرب میں تسلیم کیا جاتا تھا۔
جہاں تک خوشحالی کا تعلق ہے 'یہ لوگ اتنے بڑے تاجر تھے کہ ایک طرف ان کے قافلہ ہائے تجارت اگر یمن کی طرف جاتے تھے تو دوسری طرف عراق 'شام 'مصر اور چین تک 'ان کی تجارت پھیلی ہوئی تھی۔ چمڑے کی صنعت خود مکہ معظّمہ میں بڑی ترقی پر تھی اور بھی بعض چیزیں خود مکہ میں تیار ہوتی تھیں۔ وہ ایسا پسماندہ شہر نہیں تھا 'جیسا تصور ہماری تاریخوں نے دے رکھا ہے۔ مزید یہ کہ خانہ کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے پورے جزیرہ عرب میں آزادی سے تجارتی کارواں لے کر صرف قریش ہی کو آنے جانے کی سہولت حاصل تھی کیونکہ ان کے احترام کے باعث کوئی قبیلہ بھی کبھی ان پر دست درازی کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ ان تجارتی سفروں کے نتیجے میں غیر ملکی اشیاء نہ صرف یہ کہ ان کے زیر استعمال تھیں بلکہ ان کے بازاروں میں ان کی بھرمار تھی۔ مکہ کے بازار بہت پر رونق بازار تھے۔ مزید جس چیز نے ان کا دماغ خراب کر رکھا تھا 'وہ ان کی زمینیں اور وہ باغات تھے 'جو طائف سے لے کر نجران تک ایک بڑے وسیع علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ ایسی صورتحال میں اگر انھیں اپنی دولت و امارت پر غرہ نہ ہوتا اور اس کے نتیجے میں ان میں نخوت پیدا نہ ہوتی تو یہ تعجب کی بات ہوتی۔ لیکن قرآن کریم ان کی دو طرح سے غلط تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیلی دور کرنا چاہتا ہے۔ ایک یہ کہ تم ہزار دولت مند 'ہزار قوت و سطوت
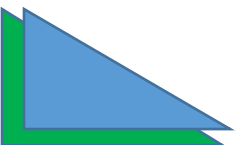
کے مالک سہی ‘لیکن تمہاری خوشحالی اور دولتمندی اور تمہاری قوت وسطوت اس کا عشر عشیر بھی نہیں ‘جیسی قوت اور خوشحالی ہم نے ان قوموں کو دے رکھی تھی ‘جنھیں تم قوم عاد اور قوم ثمود یا قوم شعیب اور قوم لوط کے نام سے جانتے ہو۔انھیں جو اقتدار اور اثر ورسوخ میسر تھا ‘تم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے اور انھوں نے اپنے پیچھے جو تہذیبی ‘تمدنی اور ثقافتی آثار چھوڑے ہیں ‘وہ ان کی عظمت کے منہ بولتے ثبوت ہیں۔تم آخر کون سی دولتمندی اور امارت ہے ‘جس پر ناز کر رہے ہو؟

قوموں کی تباہی کا اصل سبب شریعت کی نافرمانی ہے

دوسری یہ بات کہ اگر خوشحالی اور قوت بقاء کی ضمانت ہوتیں تو یہ قومیں آج تاریخ میں عبرت نہ بن چکی ہوتیں۔جب ان جیسی قومیں باقی نہ رہیں تو کیا تم محض اپنی دولت اور قوت کے باعث باقی رہ جاؤ گے؟ حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کی زندگی اور اس کی بقاء صرف اس بات سے وابستہ ہے کہ اس کا اپنے رب اور اس کے بندوں سے کیسا رشتہ ہے؟ کیا وہ اپنی حدود بندگی کو پہچانتی ہے یا نہیں؟ کیا اسے احساس ہے کہ اس کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ اور اس حوالے سے اس پر کیا ذمہ داریاں ہیں؟ جس نے ان اخلاقیات کو پیدا کرلیا ‘اسے ایک عمر دراز میسر آئی اور وہ دوسری قوموں میں نیک نامی کے ساتھ یاد رکھی گئی ‘لیکن جس نے ان حقیقتوں سے سرتابی کی ‘وہ مذکورہ قوموں کی طرح تباہی اور بربادی کی علامت بن گئی۔اس لیے تم اگر اس انجام سے بچنا چاہتے ہو تو اپنی طاقت وامارت کو نہ دیکھو بلکہ یہ دیکھو کہ کہیں تم بھی تو وہی غلطی نہیں کر رہے ‘جو تم سے سابقہ قوموں نے کی اور تباہ ہوگئیں۔اس لیے تمہیں اپنے اندر عرفان ذات اور حقیقت کا شعور پیدا کرنا چاہیے کیونکہ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ کا قانون ایک قطعی اور انمٹ قانون ہے ‘اس میں کوئی لچک نہیں۔وہ تمام قوموں کے ساتھ یکساں سلوک کرتا ہے اور وہ قانون وہ ہے ‘جس کا اس آیت میں ذکر فرمایا گیا ہے کہ دیکھو! ہم نے ان قوموں کو کس قدر ترقی دی تھی۔اس زمین میں ان کو کیسا تمکن اور کیسی خوشحالی عطا کی تھی کہ ان کے گھروں کے نیچے سے نہریں بہتی تھیں اور موسلادھار بارشوں نے ان کی سرزمینوں کو سرسبز بنا رکھا تھا اور وہ اپنے پاس ایسے لہلہاتے باغ رکھتے تھے کہ صنعائے یمن کی طرح ان کے باغوں کے نیچے سے کوئی آدمی سر پر ٹوکری رکھ کر گزر جاتا تھا تو باغ سے باہر نکلتے نکلتے اس کی ٹوکری پھلوں سے اٹ جاتی تھی۔یعنی قدرت نے انھیں ایسی سرسبز وشاداب زمین عطا کی تھی ‘جس میں ایسے رسیلے پھلوں کے باغات تھے اور ایسے محلات سے انھیں نوازا تھا کہ جن کے دائیں بائیں سے نہریں رواں تھیں۔لیکن جب انھوں نے اللہ کے قانون کو توڑا یعنی بجائے اللہ کی اطاعت کرنے کے ‘انھوں نے اللہ کی نافرمانی کی تو ہمارا قانون حرکت میں آیا۔اسی کا ذکر یہاں فرمایا جارہا ہے:

فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ

(ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کردیا)

یعنی ہم کسی قوم کو بلاوجہ نہیں پکڑتے بلکہ جب بھی ہم کسی کو پکڑتے ہیں تو اس کے گناہ کی پاداش میں پکڑتے ہیں۔قرآن کریم نے ایک اور جگہ بھی اس اصول کو بیان فرمایا:

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ (العنکبوت: ۴۰)

(ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ کی پاداش میں پکڑا)

اور اس کے بعد کئی قوموں پر آنے والے عذاب کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ کسی پر تیز آندھی آئی ' کسی کو ایک تیز چیخ نے آ پکڑا ' کسی کو زمین میں دھنسا دیا گیا ' کسی کو پانی میں غرق کر دیا گیا۔ لیکن ان تمام عذابوں کا سبب صرف ایک تھا۔ وہ تھا قوموں کا گناہوں کا ارتکاب کرنا۔ گناہ کیا ہے ؟ اللہ کی شریعت کی نافرمانی۔ اللہ تعالیٰ جن باتوں کے کرنے کا حکم دیتا ہے ' اسے نہ کرنا اور جن باتوں سے رکنے کا حکم دیتا ہے ' اس کے ارتکاب پر اصرار کرنا۔ یہ وہ گناہ ہے ' جس پر ہمیشہ اللہ کے عذاب کا کوڑا برستا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جب تک ان گناہوں کا ارتکاب افراد کی حد تک رہتا ہے تو قدرت اغماض سے کام لیتی ہے۔ لیکن جب گناہوں کا ارتکاب وبائی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اجتماعی ادارے اس کا شکار ہونے لگتے ہیں اور اقتدار اس کا پشت پناہ بن جاتا ہے تو پھر بالعموم اللہ کا عذاب آ جاتا ہے۔ لیکن عذاب آنے سے پہلے پہلے افراد کو بھی اور اداروں کو بھی اور بعض دفعہ حکومتوں کو بھی مختلف جھٹکے دیئے جاتے ہیں ' مختلف مصائب کا شکار کیا جاتا ہے ' مختلف حوادث سے انھیں دوچار کیا جاتا ہے ' تاکہ وہ اللہ کی طرف لوٹ آئیں۔ ایسی صورتحال میں جب کچھ لوگوں کے ہاتھ اللہ کے سامنے پھیلتے ہیں اور وہ اپنی مصیبتوں کا شکوہ کرتے ہیں تو وہاں سے بقول اکبر ایک ہی جواب ملتا ہے

جب میں کہتا ہوں کہ یا اللہ میرا حال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامہ اعمال دیکھ

اللہ کے جس قانون اور اس کی جس سنت کا یہاں تذکرہ ہوا ہے کہ وہ ہمیشہ گناہوں کی پاداش میں پکڑا کرتا ہے ' کیا ہمارے لیے ضروری نہیں کہ اس آئینہ میں ہم بھی اپنی قسمت تلاش کرنے کی کوشش کریں اور اپنی اصل صورت کی شناخت کریں ؟ اپنی پوری تاریخ کو غور سے دیکھیں کہ کیا ہم نے انفرادی گناہوں کے ساتھ ساتھ کہیں اجتماعی گناہوں کا ارتکاب تو نہیں کیا ؟ ہم میں سے ہر شخص واقف ہے کہ یہ ملک ہم نے اسلام کے نام پر اللہ سے مانگا تھا اور بار بار اس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ تو ہمیں ہندو کی غلامی سے نجات دے دے اور ایک قطعہ زمین عطا فرما ' جس پر ہم اپنی مرضی کی زندگی گزار سکیں۔ ہم تجھ سے وعدہ کرتے ہیں کہ وہاں ہم تیرے قانون کو نافذ کریں گے اور تیرے رسول کی سنت کا وہاں چلن ہوگا۔ لیکن اس طویل تاریخ میں ہم نے یہ وعدہ کہاں تک ایفا کیا ہے ' اس کا جواب صرف اپنے آپ سے ہی پوچھا جانا چاہیے۔

کیا ہم شریعت کے پاسدار ہیں ؟

اس ملک کے حاصل کرنے کے بعد جس طرح ہمارے امراء ' جاگیرداروں اور سیاستدانوں نے ' اس ملک کے وسائل کی لوٹ مار کی ہے اور یہاں کے بسنے والوں کے لیے ' جس طرح زندگی عذاب بنائی ہے۔ اگر یہ بھی کوئی گناہ ہے تو اس کا ارتکاب ہم نے اس وسعت کے ساتھ کیا ہے کہ دنیا بھی ہماری کرپشن پر بلبلا اٹھی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ ہمیں اپنی تباہی صاف نظر آ رہی ہے ' ہم عالمی استعمار کے ہدف بن کر رہ گئے ہیں ' ہماری سرحدیں بری طرح غیر محفوظ ہیں ' اندرون ملک لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ درپیش ہے۔ بایں ہمہ ! ہمارے اندر اس احساس کی شاید شدید کمی ہے کہ جب بھی ہمیں کبھی اپنی قیادت کے انتخاب کا موقع ملتا ہے تو ہم انہی لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں ' جنھوں نے اس سے پہلے برس ہا برس تک ہمیں زخم لگائے۔ اے کاش ! ہم اس آیت کریمہ سے سبق سیکھیں اور اللہ کے عذاب کے نازل ہونے سے پہلے اپنی عاقبت کے لیے کچھ کر لیں۔

اس آیت کریمہ کے آخر میں فرمایا گیا: وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ "ان کے بعد ہم نے دوسری قومیں اٹھ کھڑی کیں"۔
اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کو بیان کیا جارہا ہے کہ مشرکین مکہ اپنے آپ کو نجانے کیا سمجھتے ہیں۔ اللہ کی قدرت کے سامنے وہ بڑی بڑی قومیں نہ ٹھہر سکیں کہ آج ان کے ناموں کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اگر ان پر خدا کا عذاب آیا تو آخر یہ کس طرح باقی رہ سکیں گے ؟ لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ یہ نہ سمجھنا کہ زمین کی آبادی تمہارے دم قدم سے ہے۔ اللہ کی قدرت کاملہ کا تو عجیب حال ہے کہ وہ ایک طرف اگر بڑی بڑی قوموں کو تباہ کرتا ہے تو ساتھ ہی دوسری قوموں کو اس طرح بسا بھی دیتا ہے کہ دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ زمین سے کوئی قوم اٹھالی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس قدرت و حکمت کا کیا کہنا کہ روزانہ لاکھوں انسان ہلاک ہوتے رہتے ہیں 'مگر کہیں خلاء نظر نہیں آتا۔ ٹھیک کہا کسی نے

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی

ایک مرتبہ میدان عرفات میں جہاں تقریباً بیس لاکھ انسانوں کا مجمع تھا یہ خیال آیا کہ آج سے تقریباً ستر اسی سال پہلے 'اس سارے مجمع میں سے کسی انسان کا وجود نہ تھا اور اس جگہ پر تقریباً اتنے ہی انسان دوسرے موجود تھے 'جن کا آج نام و نشان نہیں ہے۔ اس طرح انسانوں کے ہر اجتماع اور لوگوں کے ہر جھرمٹ کو 'جب اس کے ماضی اور مستقبل کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو یہ ایک بہت ہی موثر واعظ نظر آتا ہے۔ اس لیے ایک صاحب بصیرت آدمی کے لیے اس میں کس قدر بصیرت اور عبرت کا سامان ہے کہ لوگ آتے اور جاتے ہیں 'اس کائنات کا خالق اس مخلوق کو اپنے قانون کے مطابق بقاء بھی دیتا ہے اور ہلاک بھی کرتا ہے۔ اس لیے ہم اگر یہاں بقاء حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس آیت کریمہ کے دیئے ہوئے اصول سے فائدہ اٹھا کر اپنی بقاء کا سامان کرنا چاہیے۔
مشرکین مکہ نے اپنی دین دشمنی اور اندھے تعصب کے باعث جس طرح قرآن کریم اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات کو ماننے سے انکار کیا 'اس کا ذکر ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ اب اگلی آیات میں یہ بتایا جارہا ہے کہ صرف یہی نہیں کہ وہ قرآن کریم کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے بلکہ اس کے لیے انھوں نے کچھ ایسے اعتراضات تیار کر رکھے تھے 'جن کی وجہ سے وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہمارا قرآن کریم جیسے واضح حق کو تسلیم نہ کرنا چنداں قابل تعجب نہیں ہے کیونکہ جب تک ہمارے اعتراضات دور نہیں ہوتے 'ہم قرآن کریم کو ایسے کیسے قبول کر سکتے ہیں ؟
(روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی القرآن)

فوائد

1: یہاں یا تو دیکھنے سے جاننا مراد ہے یا ان قوموں کی اجڑی بستیاں، ویران مکانات کا دیکھنا مراد ہے کیونکہ یہ واقعات ان لوگوں سے پہلے ہو چکے تھے مگر یہ لوگ اپنے سفروں میں ان کی بستیوں سے گزرتے تھے۔
۲: یعنی بدنی قوت، مالی طاقت، ظاہری ساز و سامان انھیں تم سے زیادہ عطا فرمائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی طاقت رب کے عذاب کو دفع نہیں کر سکتی۔

۳: اور یہ تاریخی واقعات اہل مکہ کو معلوم ہیں اس سے معلوم ہوا کہ علم تاریخ مبارک ہے۔ اور تاریخی واقعات اگر نصوص کے خلاف نہ ہوں تو معتبر ہیں۔

۴: اس طرح کہ انھیں ہلاک کردیا۔ دوسری قوموں کو ان بستیوں میں بسادیا۔ جیسے فرعون اور فرعونی لوگ بعض جگہ ایسا بھی ہوا کہ وہ بستیاں پھر کبھی آباد ہوتی ہی نہیں۔ جیسے قوم عاد و ثمود کی بستیاں۔ اس آیت میں قانون کلی کا ذکر نہیں۔

بعض سوالوں کے جوابات

اس آیت پر ایک یہ اعتراض ہے کہ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ مکذبین کو اللہ تعالیٰ نے ہلاک کردیا۔ اس میں زجر و توبیخ کی کون سی بات ہے؟ کیونکہ موت تو ہر شخص کو آنی ہے۔ خواہ مومن ہو یا کافر۔ اس کا جواب یہ ہے کہ زجر و توبیخ کی وجہ یہ ہے کہ ان کو عذاب شدید سے موت آئی۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ کیا انھوں نے گزشتہ امتوں کی ہلاکت کو نہیں دیکھا؟ حالانکہ کفار مکہ نے گزشتہ امتوں کے احوال کا مشاہدہ نہیں کیا تھا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خبر دینے کے وہ مصدق نہیں تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کا معنی ہے کیا ان کو ان امتوں کے احوال نہیں معلوم اور ان امتوں کی ہلاکت کے احوال تواتر سے نقل ہو رہے تھے اور لوگوں کے درمیان مشہور تھے۔ ایک اور سوال یہ ہے کہ اس بات کے ذکر کی کیا ضرورت ہے کہ اللہ ان کی جگہ ایک اور قوم کو لے آئے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ ان کو ہلاک کرنا اللہ پر دشوار نہیں ہے 'وہ اس پر قادر ہے کہ ان کو ہلاک کرکے ان کی جگہ دوسری قوم کو لے آئے۔
(تفسیر تبیان القران۔ غلام

رسول سعیدی القرآن)

آیت مبارکہ:

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝7

لغۃ القرآن: [وَلَوْ : اور اگر][نَزَّلْنَا : ہم اتارتے][عَلَيْكَ : آپ پر][كِتٰبًا : کتاب][فِيْ : میں][قِرْطَاسٍ : کاغذ][فَلَمَسُوْهُ : پھر وہ اس کو چھوتے][بِاَيْدِيْهِمْ : انکے ہاتھ][

لَقَالَ : البتہ کہا][الَّذِیْنَ : وہ لوگ][کَفَرُوْٓا : جنہوں نے انکار کیا][اِنْ ھٰذَآ : نہیں یہ][اِلَّا سِحْرٌ : مگر جادو][مُّبِیْنٌ : واضح]

ترجمہ : اور ہم اگر آپ پر کاغذ پہ لکھی ہوئی کتاب نازل فرمادیتے پھر یہ لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیتے تب (بھی) کافرلوگ (یہی) کہتے کہ یہ صریح جادو کے سوا (کچھ) نہیں

تشریح : اہل کفر انبیاء (علیہ السلام) سے ایسے مطالبات کرتے تھے جن کا دعویٰ کسی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نہیں کیا تھا اس کے باوجود اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہنے والے لوگوں نے موسیٰ (علیہ السلام) سے یہ مطالبہ کیا کہ ہم اس وقت تک تیری تائید نہیں کر سکتے۔ جب تک تختیوں کی شکل میں ہمارے پاس تورات نہ لے آئے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) پر تختیوں کی شکل میں آسمان سے تورات نازل فرمائی۔ مطالبہ پورا ہونے کے باوجود بنی اسرائیل کی اکثریت نے تورات پر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ یہی حال اہل مکہ کا تھا۔ وہ آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم تب ایمان لائیں گے کہ جب ہم پر قرطاس یعنی اوراق کی شکل میں کتاب نازل کی جائے اور ہم اس کو اپنے ہاتھوں سے اچھی طرح ٹٹول کر یقین کر لیں۔ تب جا کر ہم آپ پر ایمان لائیں گے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اہل کفر کا شروع سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ جب ان کا مطالبہ پورا ہو جاتا تو وہ اسے جادو قرار دیتے تھے۔ یہی اہل مکہ نے کردار پیش کیا۔ جب نبی محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے چاند کو دو ٹکڑے کرنے کا مطالبہ کیا۔ آپ کے اشارہ کرنے پر اللہ کے حکم سے چاند دو ٹکڑے ہوا تو کہنے لگے یہ شخص تو بہت بڑا جادو گر ہے۔ ایسا ہی ان کا ردِ عمل آپ پر نازل کیے گئے دوسرے معجزات کے بارے میں سامنے آیا۔ اس کے بعد انھوں نے یہ مطالبہ کر ڈالا کہ اس نبی کے ساتھ ایک فرشتے کی ڈیوٹی کیوں نہیں لگائی گئی جو جگہ جگہ اس کی تائید کرتا اور اس کا انکار کرنے والوں کو موقع پر سزا دیتا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اگر ہم فرشتے کو نازل کرتے تو پھر مہلت دیے بغیر موقع پر ہی مجرموں کو سزا دے دی جاتی۔ جس طرح کہ قوم لوط کے پاس فرشتے آئے اور انھوں نے لوط (علیہ السلام) اور ان کے متبعین کو بستی سے نکل جانے کا موقع فراہم کرنے کے بعد منکروں کو تہس نہس کر دیا۔

(قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ لَنْ یَّصِلُوْٓا اِلَیْکَ فَاَسْرِ بِاَھْلِکَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ وَلَا یَلْتَفِتْ مِنْکُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَکَ اِنَّہٗ مُصِیْبُھَا مَآ اَصَابَھُمْ اِنَّ مَوْعِدَھُمُ الصُّبْحُ اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِیَھَا سَافِلَھَا وَاَمْطَرْنَا عَلَیْھَا حِجَارَۃً مِّنْ سِجِّیْلٍ مَّنْضُوْدٍ مُسَوَّمَۃً عِنْدَ رَبِّکَ وَمَا ھِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ) [ہود: ۸۱ تا ۸۳]

”کہنے لگے : اے لوط ! ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں یہ لوگ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے تم رات کا کچھ حصہ باقی ہو تو اپنے گھر والوں کو لے کر بستی سے نکل جاؤ اور تم میں سے کوئی بھی مڑ کر نہ دیکھے البتہ تمہاری بیوی پر وہی کچھ گزرنا ہے جو ان پر گزرے گا۔ ان پر عذاب کے لیے صبح کا وقت مقرر ہے۔ کیا اب صبح قریب ہی نہیں ؟ پھر جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے اس بستی کا اوپر کا حصہ نچلا حصہ بنا دیا پھر ان پر کھنگر قسم کے تہ بہ تہ پتھر برسائے۔ جو تیرے رب کے ہاں سے نشان زدہ تھے اور یہ خطہ ان ظالموں سے کچھ دور بھی نہیں۔“ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیل القرآن)

شان نزول

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت توحید اور پیغام اسلام کو مسترد کرنے والے دو قسم کے لوگ تھے۔ایک وہ جو اپنے عیش وآرام میں مست تھے اور ان کو اپنی قوت وحشمت پر گھمنڈ تھا۔ان کا ذکر اس سے پہلی آیتوں میں آچکا ہے۔دوسری قسم کے وہ لوگ تھے جو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیش کیے ہوئے معجزات کو کھلا ہوا جادو قرار دیتے تھے۔ان کا ذکر اس آیت میں ہے۔
امام عبدالرحمٰن بن علی محمد جوزی متوفی ۵۹۷ھ نے بیان کیا ہے کہ مشرکین مکہ نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم آپ پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ آپ ہمارے پاس اللہ کے پاس سے کتاب نہ لائیں اور اس کتاب کے ساتھ چار فرشتے ہوں جو یہ گواہی دیں کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور آپ اللہ کے رسول ہیں۔تب یہ آیت نازل ہوئی۔(زادالمیسر ج ۳ ص ۷ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ۱۴۰۷ھ)

کفار کے انکار کا حقیقی سبب

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ مشرکین کس سبب سے دین اسلام کو قبول کرنے سے انکار کرتے تھے۔ان کا انکار چند ضعیف شبہات پر مبنی تھا۔ان کا مطالبہ تھا کہ ایک لکھی ہوئی کتاب نازل ہو اور اس کے ساتھ ایک فرشتہ ہو جو آپ کی نبوت کی تصدیق کرے لیکن حقیقت میں ان کے انکار اور تکذیب کی وجہ یہ تھی کہ وہ اللہ کی نشانیوں سے اعراض کرتے تھے اور ان میں غور وفکر نہیں کرتے تھے۔سو اگر اللہ ایک لکھی ہوئی کتاب نازل کر دیتا اور وہ اس کو چھو کر دیکھ لیتے پھر بھی کہتے کہ یہ کھلا جادو ہے اور ایمان نہ لاتے۔ہاتھ سے چھونے کا اس لیے ذکر فرمایا کہ کبھی دیکھی ہوئی چیز کی بہ نسبت ہاتھوں سے چھوئی ہوئی چیز زیادہ یقینی ہوتی ہے کیونکہ مشاہدہ میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ نظر نے دھوکا کھایا ہو یا نظر بندی کی گئی ہو۔لیکن ہاتھ سے چھونے کے بعد یہ احتمالات ختم ہو جاتے ہیں لیکن یہ ایسے ضدی اور ہٹ دھرم لوگ ہیں کہ یہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔اس کی نظیر یہ آیات ہیں:

"ولو فتحنا علیهم بابا من السمآء فظلوا فیه یعرجون،لقالوا انما سکرت ابصارنا بل نحن قوم مسحورون۔

(الحجر: ۱۵۔۱۴)

ترجمہ: اور اگر ہم ان کے لیے آسمان سے کوئی دروازہ کھول دیں اور یہ اس میں (دن بھر) چڑھتے رہیں (تو پھر بھی) یہ لوگ یقیناً یہی کہیں گے کہ محض ہماری نظر بندی کی گئی ہے بلکہ ہم لوگوں پر جادو کیا ہوا ہے۔(تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی القرآن)
جو کتابیں لکھی ہوئی نازل ہوئیں ان کا نزول لوگوں کی نگاہوں کے سامنے نہیں ہوا؟۔مثلاً اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو لکھی ہوئی توراۃ عطا فرمائی تو کسی نے توراۃ کو آسمان سے اترتے ہوئے نہیں دیکھا۔کوہ طور پر تنہا حضرت موسیٰ تھے جب انھیں توراۃ عطا کی گئی۔اور جو لوگ توراۃ پر ایمان لائے انھوں نے حضرت موسیٰ کی زبان پر ہی اعتماد کیا لیکن حجت بازوں نے نیا مطالبہ کر دیا کہ اے موسیٰ! ہم تو اس وقت ایمان لائیں گے جب ہمیں خدا سامنے نظر آئے گا۔

اس لیے پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ کفار مکہ کی ہٹ دھرمی سے پریشان نہ ہوں۔ یہ آپ سے لکھی ہوئی کتاب کا مطالبہ اس لیے نہیں کرتے کہ انھیں آپ کی نبوت یا صداقت پر کوئی شبہ ہے۔ دراصل یہ آپ کی زبان پر کامل اعتماد رکھتے ہیں کیونکہ انھوں نے آپ کی زبان سے کبھی کوئی جھوٹی بات نہیں سنی لیکن انھوں نے اپنے ذہن و ضمیر پر گہرے پردے ڈال رکھے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ جس انسان کو تعصب نے گھیر رکھا ہوا اس پر کسی دلیل یا نصیحت کا اثر نہیں ہوتا۔ اس لیے پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! اگر قرآن مجید کو ان کی آنکھوں کے سامنے کاغذ پر لکھا ہوا آسمان سے اتارا جائے اور وہ اس کتاب کو اپنے ہاتھوں سے ٹٹول کر پوری طرح اطمینان بھی کر لیں جب بھی یہ اس کی تصدیق نہیں کریں گے بلکہ یہ کہہ کر انکار کر دیں گے کہ یہ تو صریح جادو ہے کیونکہ انھوں نے آپ پر ایمان نہ لانے کا پیشگی فیصلہ کر رکھا ہے صرف حجت بازی کے لیے عجیب و غریب سوال کرتے ہیں۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ الکرم)

تفسیر نسفی میں ہے (ترجمہ) اور اگر نازل کر دیتے آپ پر کتاب لکھی ہوئی کاغذ کے ورق پر اور کفار اسے اپنے ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھ بھی لیتے اور یہ کہنے کی گنجائش بھی انھیں ہوتی کہ ہماری نظر باندھ دی گئی اور وہ اندھے ہونے کا بھی احتجاج نہ کر سکتے تب بھی وہ کافر کہتے کہ یہ نہیں مگر جادو ہے انھیں عناد قبول حق کی طرف مائل ہونے سے مانع ہوتا۔

اور کافروں نے کہا کیوں نہ نازل ہوا نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر کوئی ایسا فرشتہ جو ہم سے کہتا کہ یہ نبی ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر فرشتہ نازل ہوتا ہلاکت میں آجاتے اور طرفۃ العین کے لیے بھی مہلت نہ دی جاتی اس لیے کہ جب وہ ملک کو صورت ملکی میں دیکھتے تو مہابت سے ان کی روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی پرواز کر جاتی اور اگر ہم فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے جیسا کہ یہ کفار کہتے ہیں لولا انزل علی محمد ملک کبھی کہتے ہیں کہ یہ تو بشر ہیں ہمارے جیسے اگر اللہ چاہتا تو ان کی بجائے ہم پر فرشتہ نازل کر دیتا۔ تو فرشتہ بھی انسانی صورت میں ہی نازل کیا جاتا۔

جیسے کہ حضرت جبرائیل امین (علیہ السلام) عام طور پر بصورت دحیہ کلبی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حضور حاضر آتے تھے اور لیے کہ رؤیت ملائکہ ان کی صورت میں کرنے کی حالت میں یہ باقی نہیں رہ سکتے اپنی صورت میں نہیں ہو سکتی اور اگر ہو تو فرط انوار سے انسان ہلاک ہو جائے۔

وللبسنا علیھم مایلبسون۔ یعنی مخلوط حالت میں رہ گئے اور ان پر مشکل ہو گیا اس حقیقت کو سمجھنا۔ جبکہ ہونے والا آپ جیسے اے محبوب تو وہ فرشتہ کو صورت انسان میں بھی دیکھتے اور جب ایک انسان کے شبیہ میں دیکھتے تو مخبوط الحواس ہو کر کہتے یہ تو انسان ہی ہے اسے فرشتہ نہیں کہہ سکتے آگے للبسنا کا محاورہ بیان فرمایا۔

لیست المر علی والبستہ اذا شتبہ واشکلنا علیھم۔ معاملہ مجھ پر مشتبہ ہو گیا اور میں نے اس کو مشتبہ کر دیا اور ہم نے ان پر مشکل کر دیا۔ پھر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تسلی کے لیے فرمایا کہ استہزاء کرنا ان مسخروں کی جبلت میں ہے اور اس کا بدلہ انھیں منجانب اللہ عزوجل ملے گا۔ (تفسیر ال تفسیر الحسنات۔ علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)

المختصر۔۔ جو ازلی محروم ہوتا ہے اور وہ اگر غائبانہ حق کی تکذیب کرتا ہے، تو آنکھوں سے مشاہدہ اور تجربہ کے بعد بھی انکار سے نہیں چوکتا۔ حق واضح ہو جانے کے بعد بھی کٹ حجتی کرنے والے ضدی لوگ از راہ عناد و سرکشی ایسا ہی کرنے کے خوگر ہوتے ہیں۔ ذرا ان کٹ حجتی کرنے والوں کو دیکھو، کہ او (رح) لا نبی کی نبوت کی اشارتا تکذیب کی، اور اب صراحتا نبوت پر جرو قدح کرنے پر اتر آئے۔ (تفسیر تفسیر اشرفی۔ علامہ محمد مدنی اشرفی جیلانی)

آیت مبارکہ :

وَقَالُوا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۭ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ 8○

لغۃ القرآن : [وَقَالُوْا : اور انہوں نے کہا][لَوْلَآ : کیوں نہیں][اُنْزِلَ : نازل کیا گیا][عَلَيْهِ مَلَكٌ: اس پر فرشتہ][وَلَوْ اَنْزَلْنَا : اور اگر ہم نازل کرتے][مَلَكًا : فرشتہ][لَّقُضِيَ : تو فیصلہ کردیاجاتا][الْاَمْرُ : معاملہ][ثُمَّ لَا : پھر نہ وہ][يُنْظَرُوْنَ : مہلت دیے جاتے]

ترجمہ : اور وہ (کفّار) کہتے ہیں کہ اس (رسول مکرّم) پر کوئی فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا (جسے ہم ظاہراً دیکھ سکتے اور وہ ان کی تصدیق کر دیتا)، اور ہم اگر فرشتہ اتار دیتے تو (ان کا) کام ہی تمام ہو چکا ہوتا پھر انھیں (ذرا بھی) مہلت نہ دی جاتی

تشریح:

سورۃ یونس آیت ۲ میں بیان ہوا ہے کہ لوگوں نے ہمیشہ اس بات پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے انبیاء کو کیوں مبعوث کیا ہے؟ سورۃ الفرقان کی آیت ۷ میں کفار کے اس تعجب کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ یہ کیسا رسول ہے جو ہماری طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ایک فرشتہ نازل کرتا جو ہر مقام پر اس کی تائید کرتا۔ یہاں بھی کفار کے اسی مطالبہ کا اعادہ کیا گیا ہے۔ جس کے دو جواب دیے گئے ہیں کہ اگر ہم اپنے رسول کی تائید میں فرشتہ نازل کرتے اور اس کے مقابلہ میں لوگ انکار کرتے تو ان کو کبھی مہلت نہ دی جاتی۔

دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر فرشتہ کو رسول بنایا جاتا تو وہ بھی انسان کی شکل میں ہی رسول ہوتا اگر ہم ایسا کرتے تو یہ لوگ یہی یاوا گوئی کرتے کہ ہم انسان ہیں اور ہمارے لیے ہمارے جیسا انسان ہی رسول ہونا چاہیے تھا۔

انسانوں میں رسول بنانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ انسانوں کی طرح اپنی حاجات کو پورا کرتے ہوئے لوگوں کے سامنے بہترین نمونہ ثابت ہوں، تاکہ لوگ یہ بہانہ نہ بنا سکیں کہ تم تو فرشتے ہو جبکہ ہم حاجات میں پھنسے ہوئے انسان ہیں لہٰذا ہم شریعت پر کس طرح عمل پیرا ہو سکتے

ہیں ؟اس بہانے کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جتنے انبیاء (علیہ السلام) مبعوث فرمائے وہ سارے بنی نوع انسان میں سے تھے تاکہ لوگوں کے لیے کوئی حجت باقی نہ رہے۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیل القرآن)

کفار کا ایک مطالبہ یہ تھا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر فرشتہ اپنی اصل شکل میں نازل ہو، جو آپ کی صداقت کی گواہی دے اور وہ فرشتہ کفار کو نظر بھی آئے، حالانکہ فرشتے تو ہر انسان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ بھی فرشتے موجود ہوتے تھے اور وحی لانے کے لیے بھی فرشتہ (یعنی جبرائیل امین) مقرر تھا لیکن انسانی آنکھ فرشتے اور جن کو اصلی شکل میں نہیں دیکھ سکتی حتیٰ کہ انبیائے کرام علیہم السلام، حضرت مریم (رض) اور حضرات صحابہ کرام نے بھی فرشتوں کو انسانی شکل میں دیکھا۔ یہ شرف صرف حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حاصل ہے کہ انھوں نے جبرائیل امین کو دوبارہ اپنی اصلی شکل میں دیکھا۔
اس آیت میں نزول فرشتہ کے متعلق کفار کے مطالبہ کا جواب دیا گیا ہے کہ اگر انھیں فرشتہ اس کی اصل شکل میں دکھا دیا جاتا تو یہ اس کی ہیبت وسطوت کی تاب نہ لا سکتے اور فوراً فنا ہو جاتے (تفسیر قرطبیؒ) اور انھیں اتنی بھی مہلت نہ ملتی کہ وہ فرشتے کی بات سنتے اور اس میں غور کر سکتے۔ البتہ دو مواقع ہیں جہاں فرشتے اپنی اصل شکل میں نظر آ سکتے ہیں: ایک موت کا وقت اور دوسرا قیامت کا دن۔ (تفسیر ابن کثیر: سورت نمبر 25 آیت نمبر 22) لیکن ان دونوں مواقع پر کسی مہلت یا رخصت کی گنجائش نہیں ہوگی یعنی نہ تو موت کا وقت موخر ہوگا اور نہ ہی قیامت کے دن کفار کے عذاب میں تخفیف ہوگی۔ ان دونوں مواقع پر کفار پریشان ہوں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن مجرموں کے لیے کوئی خوشی کی بات نہ ہوگی۔" (قرآن: 22:25) (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ الکرم)

کفار کے مطالبہ کے باوجود نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ فرشتے کو نہ بھیجنے کی حکمت

امام ابن المنذر اور امام ابن ابی حاتم نے امام محمد بن اسحاق سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دی اور ان کو مسلمان کرنے کی انتہائی کوشش کی تو زمعہ بن الاسود ' نضر بن حارث ' عبدہ بن عبد یغوث ' ابی بن خلف اور عاص بن وائل نے کہا کہ آپ پر فرشتہ کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ تب یہ آیت نازل ہوئی کہ ہم فرشتہ نازل کرتے تو ان کا کام پورا ہو چکا ہوتا۔ (الدر المنثور ' ج ۳ ' ص ۵ ' مطبوعہ ایران)
کفار مکہ کا منشا یہ تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ مخلوق میں سے کسی کو رسول بنا کر بھیجتا تو کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتا۔ کیونکہ فرشتوں کے علوم انسانوں سے زیادہ ہوتے ہیں اور ان کی قدرت اور ان کی ہیبت بھی انسانوں سے زیادہ ہوتی ہے اور وہ مکمل طور دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ سو ان کی نبوت اور رسالت میں کسی کو شک وشبہ نہیں ہوگا ' تو اس وجہ سے اگر اللہ کسی کو اپنا رسول بنا کر بھیجتا تو فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس شبہ کا جو جواب دیا ہے ' اس کی تفصیل یہ ہے کہ کفار مکہ فرشتے کو اسی وقت دیکھ سکتے تھے جب وہ کسی جسم کثیف میں متمثل ہوتا ' اور ہر شخص اپنی جنس سے مانوس ہوتا ہے اور دوسری جنس سے غیر مانوس ہوتا ہے۔ تو اگر اللہ تعالیٰ فرشتہ کو ان کے پاس رسول بنا کر بھیجتا تو

اگر وہ اپنی اصل صورت میں ان کے پاس آتا تو وہ اس کو دیکھ سکتے 'نہ اس کا کلام سن سکتے اور نہ اس کی عبادات اور معمولات ان کے لیے نمونہ اور حجت ہوتے۔ کیونکہ دونوں کی جنس الگ الگ ہوتی اور اگر وہ ان کے سامنے انسانی پیکر میں متمثل ہو کر آتا 'تو وہ اس سے کہتے کہ تم فرشتہ نہیں ہو 'تم تو ہماری طرح انسان ہو اور پھر ان کا وہی شبہ لوٹ آتا۔ انبیاء (علیہم السلام) کے پاس بھی فرشتے بعض اوقات انسانی پیکر میں آتے تھے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور حضرت لوط (علیہ السلام) کے پاس فرشتے انسانی صورتوں میں آئے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس حضرت جبرائیل (علیہ السلام) اعرابی اور دحیہ کلبی کی شکل میں آئے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دو مرتبہ حضرت جبرائیل کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا اور یہ آپ کی خصوصیت ہے۔

علامہ قرطبی متوفی ٦٦٨ نے لکھا ہے کہ اگر کفار فرشتہ کو اس کی اصل صورت میں دیکھ لیتے تو اسی وقت مر جاتے 'کیونکہ وہ اس کی صورت دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ مجاہد اور عکرمہ نے کہا کہ قیامت آجاتی۔ حسن اور قتادہ نے کہا ان پر عذاب آکر ان کو ملیامیٹ اور تہس نہس کر دیتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی نشانی کا مطالبہ کرتی ہے اور اس کے مطالبہ پر وہ نشانی بھیج دی جاتی ہے اور پھر وہ ایمان نہیں لاتی تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو فی الفور ہلاک کر دیتا ہے اور چونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کے بعد آسمانی عذاب نہیں آنا تھا ' اس لیے ان کا یہ مطالبہ پورا نہیں کیا گیا۔ الجامع لاحکام القرآن جز ٦ ص ٣٠٥ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت ١٤١٥ھ) (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی القرآن)

نشانیاں پوری ہونے کے باوجود کفار مکہ پر عذاب نازل کیوں نہ ہوا؟

یاد رہے کہ کافروں نے ایسے فرشتے کے اترنے کا مطالبہ کیا تھا جو ان کافروں کو بھی نظر آئے اور اسی کا رد کیا گیا تھا ورنہ حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایک کیا بہت سے فرشتے نازل ہوتے تھے اور بسا اوقات انسانی شکل میں حاضر ہوتے تھے جنہیں صحابہ (رض) بھی دیکھتے تھے۔ ان کفار کا مطالبہ یہ تھا کہ فرشتہ اپنی اصلی صورت میں آئے اور ہم اسے اسی صورت میں دیکھیں۔ یہاں ایک سوال ہے کہ کفار نے بہت سی نشانیاں طلب کیں جو پوری بھی ہوئیں جیسے چاند کے دو ٹکڑے ہونا وغیرہ اور اس کے بعد وہ ایمان بھی نہیں لائے تو ایسی صورت میں آیت میں بیان کردہ حکم کے مطابق تو سب کو ہلاک کر دیا جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا تو آیت کا مطلب کیا ہے یا پھر ان معجزات کے دکھائے جانے کا مطلب کیا ہوا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ نبوت پر دلالت کرنے والی نشانی دو طرح کی ہے (1) عام نشانی۔ (2) خاص نشانی۔ عام نشانی وہ ہے کہ جس کا تمام لوگ مطالبہ کریں یا سب مطالبہ تو نہ کریں لیکن اس کا مشاہدہ سب کر لیں۔ خاص نشانی وہ ہے کہ جس کا مطالبہ مخصوص لوگ کریں اور تمام افراد اس کا مشاہدہ نہ کر سکیں۔ گزشتہ امتوں میں نشانی دیکھ لینے کے بعد ایمان نہ لانے کی صورت میں عذاب نازل کرنے میں اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ رہا کہ عام نشانی یعنی جس میں سب عام و خاص شریک ہو جائیں اسے پورا کرنے کے بعد ایمان نہ لانے کی صورت میں عذاب نازل فرماتا جبکہ خاص نشانی کے پورا ہونے کے بعد ایمان نہ لانے کی صورت میں عذاب نازل نہیں فرماتا۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا مطالبہ مخصوص لوگوں نے کیا جو پورا ہوا لیکن یہ عام نشانی نہ تھی بلکہ خاص تھی کہ جب چاند دو ٹکڑے ہوا اس

وقت اکثر لوگ سو رہے تھے، اور کئی مقامات پر اختلاف مطالع یا بادل حائل ہونے کی وجہ سے چاند دو ٹکڑے ہوتا نظر نہ آیا، اس لیے مطالبہ کرنے والوں پر عذاب نازل نہ ہوا۔

مرقاۃ المفاتیح میں یہی عبارت شرح السنہ سے منقول ہے۔ اس کی روشنی میں ابو جہل یا دیگر کفار کے مطالبات کو دیکھا جائے تو وہ خاص مطالبے خاص فرد کے لیے پورے ہوئے تھے اس لیے اس پر عذاب نازل نہ ہوا۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری الجنان)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر طعن اور استہزاء کرنے والوں کی سزا

بعض کفار مکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے استہزاء یہ مطالبہ کرتے تھے کہ آپ کے ساتھ کوئی فرشتہ آنا چاہیے جو آپ کی رسالت کی گواہی دے تو اللہ نے آپ کی تائید اور نصرت کے لیے یہ آیت نازل کی اور بیشک آپ سے پہلے رسولوں کا بھی مذاق اڑایا گیا 'تو ان مذاق اڑانے والوں کو اسی عذاب نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔

اس سے پہلے دیگر کافر قوموں نے بھی اپنے رسولوں کا مذاق اڑایا تھا

(آیت) "ولقد ارسلنا من قبلك فی شیع الاولین، وما یاتیهم من رسول الا کانوا به یستهزؤن"۔ (الحجر: ۱۱۔ ۱۰)
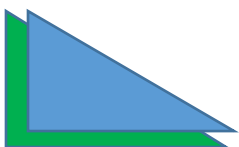
ترجمہ: اور بیشک ہم نے آپ سے پہلے اگلے گروہوں میں رسول بھیجے اور ان کے پاس جو بھی رسول آیا وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(آیت) "فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین، انا کفینك المستهزئین"۔ (الحجر: ۹۵۔ ۹۴)

ترجمہ: آپ کو جس بات کا حکم دیا گیا ہے اس کو علانیہ ذکر فرمائیں اور مشرکین سے اعراض کریں اور بیشک ان مذاق اڑانے والوں کو سزا دینے کے لیے ہم کافی ہیں۔

اور مکہ کے جو صنادید رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مذاق اڑاتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان سے آپ کا بدلہ لے لیا۔

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔

عروہ بن زبیر بیان کرتے ہیں کہ مکہ کے سردار نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ایذا پہنچاتے تھے اور آپ کا مذاق اڑاتے تھے۔ ان لوگوں میں اسد بن عبدالعزی سے اسود بن المطلب تھا 'رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ خبر پہنچی کہ وہ آپ کا مذاق اڑاتا ہے 'آپ نے اس کے خلاف دعا کی: اے اس کو اندھا کر دے اور اس کے بچوں کو گم کر دے اور بنو زہرہ میں سے اسود بن عبد یغوث تھا اور بنو مخزوم میں سے ولید بن مغیرہ تھا۔ اور بنو سہم میں سے عاص بن وائل تھا اور خزاعہ میں سے حارث بن طلاطلہ تھا۔ جب ان کی سرکشی بہت بڑھ گئی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ لوگ بہت مذاق اڑانے لگے 'تو سورۃ حجر کی یہ آیات (۹۵۔ ۹۴) نازل ہوئیں اور جس وقت یہ لوگ بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے 'اس وقت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس حضرت جبرائیل (علیہ السلام) آئے اور رسول اللہ (صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت جبرائیل (علیہ السلام) کے پاس کھڑے ہوگئے۔ اسود بن المطلب حضرت جبرائیل (علیہ السلام) کے پاس سے گزرا ' حضرت جبرائیل (علیہ السلام) نے اس کے منہ پر سبز پتامارا جس سے وہ اندھا ہوگیا اور اسود بن عبد یغوث گزرا ' جبرائیل (علیہ السلام) نے اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا تو اس کو استسقاء (پیاس) کی بیماری لگ گئی ' پانی پی پی کر اس کا پیٹ پھول گیا اور وہ اسی حال میں مر گیا۔ اور ولید بن مغیرہ گزرا ' دو سال پہلے اس کے پیر کی ایڑی کے نیچے ایک زخم آیا تھا ' کیونکہ وہ بنو خزاعہ کے ایک شخص کے پاس سے گزرا تو اس کا تیر اس کے تہبند میں گھس گیا جس سے اس کا پیر زخمی ہوگیا۔ حضرت جبرائیل (علیہ السلام) نے اس زخم کی طرف اشارہ کیا وہ تازہ ہوگیا اور وہ اس کی تکلیف میں مر گیا۔ اور عاص بن وائل سہمی گزرا حضرت جبرائیل (علیہ السلام) نے اس کے پیر کے تلوے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ طائف جانے کے لیے اپنے گدھے پر سوار ہوا تو اپنے گدھے سے گرا اور اس کے تلوے میں کانٹا چبھ گیا اور اس سے زخم ہوگیا اور اسی تکلیف میں وہ مر گیا۔ اور حارث بن طلاطلہ گزرا ' حضرت جبرائیل نے اس کے سر کی طرف اشارہ کیا تو اس کے سر سے پیپ نکلنے لگی اور وہ اسی بیماری میں مر گیا۔ (جامع البیان ' جز ۱۴ ص ۹۵۔ ۹۳ ' مطبوعہ دار الفکر ' بیروت ۱۴۱۵ ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ جو نامی گرامی کافر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر طعن کرتے تھے اور آپ کا مذاق اڑاتے تھے ' وہ سب عذاب الہی میں گرفتار ہو کر مر گئے۔ (تفسیر تبیان القرآن۔ غلام رسول سعیدی القرآن)

آیت مبارکہ :

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝۹

لغۃ القرآن: [وَلَوْ : اور اگر][جَعَلْنٰهُ : ہم اسکو بناتے][مَلَكًا : فرشتہ][لَّجَعَلْنٰهُ : البتہ ہم اسکو بناتے][رَجُلًا : آدمی][وَّلَلَبَسْنَا : اور البتہ ہم شبہ ڈالتے][عَلَيْهِمْ : ان پر][مَّا يَلْبِسُوْنَ : جو وہ شک کررہے ہیں]

ترجمہ : اور اگر ہم رسول کو فرشتہ بناتے تو اسے بھی آدمی ہی (کی صورت) بناتے اور ہم ان پر (تب بھی) وہی شبہ وارد کردیتے جو شبہ (و التباس) وہ (اب) کر رہے ہیں (یعنی اس کی بھی ظاہری صورت دیکھ کر کہتے کہ یہ ہماری مثل بشر ہے)

تشریح : منکرین حق کی نگاہیں فقط حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بشریت تک ہی محدود تھیں۔ وہ نبوت کے اس آفتاب کو دیکھنے سے قاصر تھے جو دل انور کے مطلع پر ضو فشاں تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنے جیسا بشر سمجھ کر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کو تسلیم

کرنے سے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر فرشتہ کو نبی بنا کر تمہاری ہدایت کے لیے بھیجا جاتا تو اس کی دو صورتیں تھیں۔ یا تو وہ اپنی ملکی شکل میں مبعوث ہوتا یا انسانی لباس میں۔ پہلی صورت میں اس کی ہیبت و جلال کی وجہ سے اس سے استفادہ ناممکن ہوتا۔ دوسری صورت میں پھر وہ انھیں شبہات میں مبتلا ہو جاتے جن میں اب مبتلا ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ القرآن)

یہ ان کفار کا جواب ہے جو نبی (علیہ السلام) کو کہا کرتے تھے، "یہ ہماری طرح بشر ہیں" اور اسی پاگل پن میں وہ ایمان سے محروم رہتے تھے۔ انھیں انسانوں میں سے رسول مبعوث فرمانے کی حکمت بتائی جارہی ہے کہ ان سے نفع حاصل کرنے اور تعلیم نبی سے فیض اٹھانے کی یہی صورت ہے کہ نبی صورت بشری میں جلوہ گر ہو کیونکہ فرشتے کو اس کی اصلی صورت میں دیکھنے کی تو یہ لوگ تاب نہ لا سکتے، دیکھتے ہی ہیبت سے بے ہوش ہو جاتے یا مر جاتے اس لیے اگر بالفرض رسول فرشتہ ہی بنایا جاتا تو بھی اسے مرد ہی بنایا جاتا اور صورت انسانی ہی میں بھیجا جاتا تاکہ یہ لوگ اس کو دیکھ سکیں اور اس کا کلام سن سکیں اور اس سے دین کے احکام معلوم کر سکیں لیکن اگر فرشتہ صورت بشری میں آتا تو انھیں پھر وہی کہنے کا موقع رہتا کہ یہ بشر ہے تو فرشتہ کو نبی بنانے کا کیا فائدہ ہوتا؟ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری الجنان)

فرشتوں کو اصل شکل میں انبیاء دیکھ سکتے ہیں

بات یہ ہے کہ فرشتوں کو ان کی اصل شکل میں دیکھنا عام بشری قوت سے باہر ہے البتہ بعض مخصوص انبیاء نے قوت قدسیہ کا حامل ہونے کی وجہ سے ملائکہ کو اصلی صورت میں کبھی دیکھا تھا ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پیغمبر خالق و مخلوق کے درمیان ایک برزخی حیثیت رکھتا ہے اس لیے اس میں طرفین سے مناسبت ہوتی ہے خالق کے ساتھ ارتباط رکھنے کی وجہ سے وہ ان تمام فیوض کو قبول کرتا ہے جو عالم بالا سے جاری ہوتے ہیں اور مخلوق کے ساتھ مناسبت رکھنے کی وجہ سے وہ باری تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ فیوض سے مخلوق کو سرفراز کرتا ہے اگر طرفین کے ساتھ مناسبت نہ ہو تو فیضان روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقیانی کو حاصل کرنا اور مخلوق کو اس سے بہرہ اندوز کرنا ممکن نہیں انبیاء ہوں یا ملائکہ دونوں کا باطنی لگاؤ خالق سے ہوتا ہے۔

نبوت اور ملکیت کو ایک آئینہ کہا جاسکتا ہے جس کا رخ پورے مقابلہ کے ساتھ نہیں بلکہ کچھ ترچھے طور پر آفتاب الوہیت کی طرف ہوتا ہے اور بغیر کسی وساطت کے آفتاب الوہیت کی کوئی شعاع جلالی یا جمالی اس آئینہ پر پڑتی ہے مبداء تعین ہونے کا یہی معنی ہے۔ پھر آئینہ کا رخ چونکہ ترچھا ہوتا ہے اس لیے آئینہ نبوت ورسالت پر پڑنے والی کوئی شعاع پلٹ کر اس جگہ چمکنے لگتی ہے جہاں براہ راست وشعاع کسی آڑ میں ہونے کی وجہ سے نہیں پہنچ سکتی۔ (تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی)

گویا آفتاب الوہیت کی شعاع براہ راست آئینہ پر پڑتی ہے اور آئینہ کو روشن کر دیتی ہے پھر آئینہ سے الٹ کر دالان کمرہ یا کسی اور مسقف جگہ پر پہنچتی ہے اور آئینہ نبوت پر پڑنے والی شعاع کے عکس سے وہ اندرونی جگہ بھی چمکنے لگتی ہے یہی معنی ہیں اس قول کے کہ باقی مخلوق کا مبداء تعین صفت کا سایہ ہے۔ (مؤلف)] اس لیے ضروری ہے کہ رسول کو مخلوق سے شکلی (نوعی اور مادی) مناسبت بھی ہو (پس اگر ملائکہ کو انسانوں کے پاس پیام پہنچانے کے لیے بھیجا جاتا تو کم سے کم ان رسولوں کا آدمی کی شکل پر ہونا ضروری تھا اور ایسی حالت میں ان کی شناخت ناممکن تھی

معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ واقع میں وہ ملائکہ انسانی نسل کی پیداوار ہیں اور انسانوں سے نوعی اشتراک رکھتے ہیں یا ملائکہ بشکل بشری ہیں اور انسانوں کے بھیس میں آئے ہوئے ہیں)۔

پیغمبر فرشتوں کو انسانی شکل میں بھیجنا اس لیے بھی ضروری ہوتا کہ انسان ایمان بالغیب کا مکلّف ہے اس ماموریت کا تقاضا ہے کہ فرشتوں کو (پیغمبر بنا کر بھیجنے کے باوجود) مشتبہ اور پردہ کے اندر رکھا جائے (تاکہ غیبی حقیقت غائب ہی رہے) اسی لیے آگے فرمایا ہے۔

وللبسنا علیھم ما یلبسون اور ہمارے اس فعل سے ان کے لیے وہی اشکال پیدا ہوتا جو اشکال اب کر رہے ہیں یعنی فرشتوں کی حالت کو ہم اشتباہ میں ہی رکھتے لوگوں کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ یہ فرشتے ہیں بلکہ وہ یہی کہتے کہ یہ بھی دوسروں کی طرح انسان ہیں جس طرح اب انبیاء کے کھلے معجزات دیکھنے کے بعد بھی رسالت و نبوت میں اشتباہی کیفیت انھوں نے خود اپنے اوپر طاری کر رکھی ہے کافر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے استہزاء کرتے تھے جس سے آپ کو دکھ پہنچتا تھا آئندہ آیت آپ کی تسلی کے لیے نازل ہوئی۔ (تفسیر مظہری)

حضرت داؤد (علیہ السلام) اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس جو فرشتے آئے تھے وہ انسان ہی کے شکل میں آئے تھے۔ (تفسیر جلالین)

فرشتہ کو اس کی صورت اصلی پر دیکھنے کی ان میں صلاحیت نہیں کیونکہ وہ نور مجرد ہے اور یہ آنکھیں عالم ناسوت دیکھنے کو بنائی گئی ہیں۔ (تفسیر حقانی)

ایک مرتبہ جبرائیل امین (علیہ السلام) آئے تھے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس تو کوئی بھی نہیں پہچان سکا تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سب سے پوچھا۔ حیران سب ہو رہے تھے۔ کہ یہ شخص نہ جانا پہچانا ہے۔ نہ مسافر لگتا ہے۔ اس کے کپڑے بھی صاف ستھرے ہیں۔ کون ہے یہ۔ تو جب یہ چلے گئے تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پوچھا کہ پتہ ہے یہ کون تھا۔ کوئی پہچان نہ سکا تھا۔ تو فرمایا کہ یہ جبرائیل تھے تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔ تو یہاں بھی یہی فرمایا۔ کہ اسی طرح انھیں یہاں شعبے میں مبتلا کر دیتے۔ جس میں یہ اب مبتلا ہیں۔ فرشتہ انسان کی شکل میں آتا تو یہ اسی شک میں پڑے رہتے۔ پھر یقین کے قابل کوئی چیز نہ تھی۔ اچھا جو شخص دین کی تبلیغ کرے اس کو بھی لوگ فرشتہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہیں نہ۔ عادات کے اعتبار سے اور ہر اعتبار سے۔ معلوم نہیں کیوں ان کے ذہن میں یہ نہیں ہے۔ کہ پیغمبر بھی ایک انسان ہے اور ہر تبلیغ کرنے والا بھی ایک انسان ہوتا ہے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتے کیوں نہیں بھیجے کیا اس کے لیے مشکل تھا۔ کہ انسان کو نبی ماننا تو مشکل کام ہے فرشتہ بھیجو۔ اس لیے نہیں بھیجا کہ فرشتے اور انسان اپنی origin کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ فرشتے اپنی زبان بولتے ہیں۔ اور انسان اپنی زبان بولتے ہیں۔ وہ انسانی زبان میں گفتگو نہ کر پاتے۔ پھر ہمیں سمجھ میں کیا آتا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ انسانی زبان میں گفتگو کرتے تو پھر وہی شک پڑ جاتا کہ ایک انسان ہے۔ اس کے علاوہ انسانی جذبات سے عاری ہوتے۔ کیونکہ فرشتوں کے تو جذبات ہی نہیں ہوتے ان کا تو گناہ اور ثواب کا چکر ہی نہیں ہے۔ وہ انسان کے جذبات حالات اور ضرویات کو سمجھ ہی نہ پاتے۔ مثلاً کب دیکھیں کہ مرد حضرات جب دین کی تعلیم خواتین کو دیتے ہیں۔ بسا اوقات کیا مشکل پیش آتی ہے کہ ان کی کچھ باتیں accept کرنے کو نہیں دل چاہتا۔ سخت سخت لگتیں ہیں۔ اس لیے لگتی ہیں کہ وہ عورتوں کی فطرت حالت جذبات اور احساسات کو feel نہیں کرتے۔ لہٰذا وہ ایک فرق پڑ جاتا ہے۔ اسی طرح ہر شخص کسی دوسرے کلچر کے آئے ہوئے شخص کے ساتھ اس کی communication مشکل ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک مختلف ماحول اور مختلف کلچر سے تعلق رکھتے ہیں ایک شہری اور ایک دیہاتی انسان جب مل کر بیٹھتے ہیں تو communication مشکل ہوتی ہے۔ تو پھر اتنا بڑا فرق کہ ایک فرشتہ اور ایک انسان ایک دوسرے کے جذبات سمجھ ہی نہ پاتے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا

احسان ہے کہ اس نے اللہ کے رسول کو من انفسھم یعنی انسانوں میں سے بھیجا۔ لقد من اللہ علی المومنین ۔۔۔ من انفسھم اللہ کا بہت بڑا احسان ہے کہ رسول انسانوں کے اندر سے بھیجا۔ اور پھر آپ دیکھیں کہ فرشتوں سے نامانوس ہونے کی وجہ سے انسان ان سے خوف کھاتا۔ دور بھاگتا۔ کوئی انس پیدا نہ ہوتا۔ آپ دیکھیں کہ سیکھنے اور سکھانے کے لیے استاد اور شاگرد کے درمیان ایک انس کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر خوف کا عنصر غالب رہے تو انسان کچھ بھی نہیں سیکھ سکتا۔ اس لیے انسان اور فرشتے کے تعلق میں ایک خوف کا عنصر رہتا تو کیا ہوتا فرشتوں سے انسان کچھ بھی نہ سیکھ سکتے۔ گھبراہٹ سے ان کے ہوش و حواس ہی اڑے رہتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس لیے فرشتوں کو پیغمبر بنا کر نہیں بھیجا اور اس لیے جو یہ بار بار ناروا قسم کا مطالبہ کرتے ہیں وہ بالکل ان کے حق میں نہیں۔ (تفسیر تنویر)
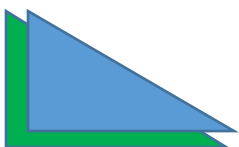
عورت کا نبی یا امام یا حاکم بننا جائز نہیں

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا (اگر ہم کسی فرشتہ کو نبی بناتے تو اسے مرد بنا کر ہی بھیجتے) سے معلوم ہوا کہ نبی صرف رجُل (مرد) ہی ہو سکتا ہے اسی لئے فرمایا گیا **وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى**۔ "اور ہم نے آپ سے قبل صرف مرد ہی بھیجے جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے" (یوسف: 109) اور یہ اس لیے ہے کہ اگر عورت کو نبی بنایا جاتا تو وہ تبلیغ کے لیے لوگوں کے درمیان آ کر کھڑی ہوتی اور ان کی نظروں کا مرکز اور شمع محفل بنتی مگر اللہ کو یہ بات پسند نہیں کہ ایک عورت مردوں کے سامنے کھڑی ہو اور ان کی نظروں کا مرکز بنے اور وہ اسے نظریں جما کر دیکھیں، یہ چیز اللہ کے ہاں حیا کے خلاف ہے۔ اسی لئے اسلام میں عورت کا سربراہ مملکت بننا جائز نہیں۔ کیونکہ جب وہ سربراہ مملکت بنے گی تو اسے ہر وقت مردوں کے جھرمٹ میں رہنا پڑے گا اور یہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں اگر یہ اللہ کو پسند ہوتا تو وہ عورت کو نبوت جیسے عظیم منصب سے محروم کیوں رکھتا؟

بلکہ اسلام میں عورت کے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ مسجد میں یا مسجد کے علاوہ کسی جگہ مردوں کو نماز پڑھائے۔ اس کا سبب بھی وہی ہے جو عورت کو نبوت کے نہ دیئے جانے کا ہے۔ کہ اسلام میں یہ ہرگز جائز نہیں کہ عورت پر مردوں کی نظریں جمیں۔ خواہ وہ نماز جیسا مقدس ماحول ہی کیوں نہ ہو، بلکہ اسلام نے تو عورت کو اذان کہنے کی بھی اجازت نہیں دی، کیونکہ اس کی آواز بھی مردوں کے لیے باعث فتنہ ہے اسلام فتنہ کا ہر دروازہ بند کرتا ہے۔

عورتوں کے فلموں ڈراموں اور پلے ٹیموں میں کام کرنے کی ممانعت

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورتوں کا فلموں ڈراموں میں کام کرنا اور اپنے حسن و جمال سے مردوں کا دل بہلانا سب حرام اور شیطانی کام ہیں۔ اسی طرح عورتوں کی کرکٹ ٹیم، ہاکی ٹیم، فٹ بال ٹیم اور دیگر ٹیمیں بنانا اور ان کا مردوں کے سامنے کھیلنا اور مردوں کا انھیں نظریں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا یہ سب بے حیائی کے کام ہیں۔ ہاں عورتیں عورتوں میں رہ کر دعوت و تبلیغ تعلم و تعلیم بلکہ جسمانی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے کھیل کود

اور ورزش وغیرہ بھی کر سکتی ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ اگر اللہ کے ہاں یہ جائز ہوتا کہ عورت مردوں کی نظروں کا مرکز بنے تو عورت کو نبوت امامت اور اذان دینے جیسے مقدس مناسب سے کیوں دور رکھا جاتا۔

نور لباس بشر میں آسکتا ہے

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا۔ سے یہ بھی اشارہ ملا کے فرشتہ اگر نبی بنتا تو لباس بشر میں آتا۔ یہ اسی طرح ہے جیسے جبرائیل علیہ السلام لباس بشر میں انبیاء کے پاس آتے تھے۔ اس سے یہ عقدہ حل ہوا کہ حدیث صحیح کے مطابق حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نور سب جہاں سے قبل پیدا کیا گیا پھر اس نور سے تمام جہان کو بنایا گیا۔ (مصنف عبدالرزاق جلد اول کتاب الایمان حدیث 18 صفحہ 63)
پیچھے قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِیْنٌ (مائدہ: 15) کے تحت اس کی مفصل بحث گزر چکی ہے پھر اسی نور محمدی کو لباس بشری میں حضرت سیدہ آمنہ (رض) کے گھر پیدا کیا گیا اور وہ فخر آدم و بنی آدم بند کر دنیا میں جلوہ گر ہوئے۔
قرآن میں حضرت جبرائیل (علیہ السلام) کا مکمل بشر بن کر دنیا میں آنا بھی مذکور ہے۔
فَاَرْسَلْنَآ اِلَیْهَا روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقینا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِیًّا۔ "یعنی ہم نے مریم (رض) کے پاس اپنے فرشتہ روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی الامین کو بھیجا تو وہ ان کے پاس مکمل بشر بن کر گیا" (مریم: 17)
اگر جبرائیل (علیہ السلام) نور ہونے کے باوجود لباسے بشری میں آسکتے ھیں تو واقعہ جبریل (علیہ السلام) جناب محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نور حقیقی ہونے کے باوجود لباس بشریت میں کیوں نہیں آسکتے؟ (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب القرآن)

آیت مبارکہ:

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِیْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ 10

لغۃ القرآن: [وَلَقَدِ : اور البتہ تحقیق][اسْتُهْزِئَ : مذاق کیا گیا][بِرُسُلٍ : رسولوں سے][مِّنْ : سے][قَبْلِكَ : پہلے آپ][فَحَاقَ : سوگھیر لیا][بِالَّذِیْنَ : ان لوگوں کو][سَخِرُوْا : انہوں نے تمسخر کیا][مِنْهُمْ : ان سے][مَّا كَانُوْا : جو وہ تھے][بِهٖ : اسکے ساتھ][یَسْتَهْزِءُوْنَ : مذاق کرتے]

ترجمہ : اور بیشک آپ سے پہلے (بھی) رسولوں کے ساتھ مذاق کیا جاتا رہا، پھر ان میں سے مسخرہ پن کرنے والوں کو (حق کے) اسی (عذاب) نے آ گھیرا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے

تشریح :

اہل کفر انبیاء کرام (علیہ السلام) سے صرف اوٹ پٹانگ مطالبات ہی نہیں کیا کرتے تھے بلکہ انھیں ہر طرح زچ اور پریشان کرنے کے ہتھکنڈے بھی استعمال کرتے تھے۔ ان ہتھکنڈوں اور کٹ حجتوں میں ایک بات یہ بھی تھی کہ ان کی شخصیات کو تضحیک کا نشانہ بنانے کے ساتھ ساتھ ان کی نبوت کو مذاق اور ان کے کام کو کھیل تماشا سمجھتے تھے۔ جس طرح ابراہیم (علیہ السلام) کی قوم ان سے کہنے لگی کہ کیا تو ہمارے پاس کوئی حق اور سچ کی بات لایا ہے یا کہ محض کھیل تماشا کر رہا ہے۔ اس کے جواب میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے توحید کے دلائل دیتے ہوئے فرمایا کہ تمہارے رب کی ہی بات کہہ رہا ہوں وہ رب جس نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا اور میں تم پر شہادت قائم کر رہا ہوں۔ (الانبیاء : ۵۶، ۵۵) حضرت نوح (علیہ السلام) کی قوم نے ساڑھے نو سو سال آپ کو ستایا چند لوگوں کے سوا باقی لوگ ان کی مخالفت اور کفر پر ڈٹے رہے۔ حضرت نوح (علیہ السلام) نے ان الفاظ میں بد دعا کی اے میرے رب اب ایسا عذاب نازل فرما کہ کفار کا ایک فرد بھی نہ بچے۔ اس کے جواب میں حضرت نوح (علیہ السلام) کو حکم ہوا آپ ہماری نگرانی اور وحی کے مطابق ایک کشتی تیار کریں۔ جب نوح (علیہ السلام) کشتی تیار کر رہے تھے تو ان کی قوم کے بڑے لوگ دیکھ کر انھیں مذاق کرتے تھے۔ جس کے جواب میں جناب نوح (علیہ السلام) فرماتے کہ وقت آنے والا ہے۔ جس طرح ہمیں مذاق کرتے ہو ہم بھی تمہیں اسی طرح مذاق کریں گے۔ پہلی اقوام کی طرح کافر اور منافق بھی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مذاق کرتے تھے۔ منافقوں کے بارے میں تو یہاں تک موجود ہے جب آپ پر کسی نئی سورت کا نزول ہوتا تو منافق آپ کو استہزاء کا نشانہ بناتے۔ جب آپ انھیں سمجھاتے تو وہ کہتے ہم تو محض شغل اور دل لگی کے لیے ایسی بات کر رہے ہیں۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ کیا تم اللہ کی ذات اور اس کے ارشادات اور اس کے معزز رسول سے مذاق کرتے ہو ؟ (التوبۃ : ۶۴ تا ۶۵)

یہاں ایسے لوگوں کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اے رسول ! اپنا عزم اور حوصلہ بلند رکھیے آپ سے مذاق ہونا کوئی عجب کی بات نہیں آپ سے پہلے انبیاء کا تمسخر اڑایا جاتا رہا ہے جس طرح پہلے لوگوں کو ان کے کردار کی سزا ملی اسی طرح آپ کو مذاق کرنے والے بھی اپنے انجام سے دوچار ہوں گے۔ لہٰذا آپ فرما دیجیے کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو۔ کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانے اور انبیاء کو مذاق کرنے والوں کا کیا انجام ہوا۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیل القرآن)

شان نزول

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حرم کعبہ میں تشریف فرما تھے اور آپ کے ارد گرد حضرات بلال حبشیؓ۔ صہب رومیؓ۔ عمار بن یاسرؓ وغیرہ تھے۔ ادھر سے ولید بن مغیرہ۔ ابو جہل۔ امیہ بن خلف گزرے انھوں نے ان حضرات کو دیکھ کر مذاق کیا اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے۔ یہ

وہ لوگ ہیں جنہیں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جنت کا بادشاہ کہتے ہیں۔ ذرا ان بادشاہوں کی شان و شوکت تو دیکھو اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی البیان)

اس آیت کریمہ میں حضور سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی و تسکین خاطر کی گئی کہ آپ ملول نہ ہوں کفار کا پہلے انبیاء کے ساتھ بھی یہی رویہ رہا ہے اور ان کا وبال انھیں اٹھانا پڑے گا۔ حاق بالذین کے یہی معنی ہیں جو ترجمہ یہاں بیان ہو چکے ہیں۔ ازہری نے کہا ابو اسحاق نے حاق کا معنی احاط کیا ہے یعنی گھیر لیا اس کا مادہ حوق بالضم بیان کیا ہے اور حوق وہ چیز ہے جو گھیر اڈالے قاموس میں بھی ایسا ہی ہے اور حوق بالفتح کا ایک معنی احاطہ بھی ہے اور یہ باب حاق یحیق حیقا و حیوقاً و حیقۃ بفتح یاء سے ہے۔ قراء نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ ان کے وبال انھیں پر آپڑا اور طبرسی نے اس میں اختلاف کیا ہے وہ اس کا ترجمہ نزل (اترا) کرتے ہیں اور یہ معنی بھی سابقہ معنی کے قریب ہے اور اس کا معنی ہے پورا احاطہ کرنا۔ (تفسیر ال تفسیر الحسنات۔ علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)

کفار نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مذاق اڑاتے جس سے حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رنجیدہ ہوتے۔ اس پر سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے فرمایا گیا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلے رسولوں کا بھی مذاق اڑایا گیا تو جو مذاق اڑاتے تھے ان کا نہایت بھیانک انجام ہوا اور وہ مبتلائے عذاب ہوئے۔

اس میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تسلی و تسکینِ خاطر ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رنجیدہ و مَلُول نہ ہوں، کفار کا پہلے انبیاء (علیہ السلام) کے ساتھ بھی یہی دستور رہا ہے اور اس کا وبال ان کفار کو اٹھانا پڑا ہے۔ نیز اس میں مشرکین کو بھی تنبیہ ہے کہ وہ پچھلی امتوں کے حال سے عبرت حاصل کریں اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ ادب کا طریقہ ملحوظ رکھیں تاکہ پہلوں کی طرح مبتلائے عذاب نہ ہوں۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مذاق اڑانے والوں کا انجام

کفار قریش کے پانچ سردار (1) عاص بن وائل سہمی (2) اسود بن مُطَّلِب (3) اسود بن عبد یغوث (4) حارث بن قیس اور ان سب کا افسر (5) ولید بن مغیرہ مخزومی، یہ لوگ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بہت ایذاء دیتے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مذاق اڑایا کرتے تھے، اسود بن مُطَّلِب کے خلاف حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دعا کی تھی کہ یارب! عَزَّوَجَلَّ، اس کو اندھا کر دے۔ ایک روز تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسجدِ حرام میں تشریف فرما تھے کہ یہ پانچوں آئے اور انھوں نے حسب دستور طعن اور مذاق کے کلمات کہے اور طواف میں مشغول ہو گئے۔ اسی حال میں حضرت جبرائیلِ امین عَلَیْہِ السَّلَام حضور انور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں پہنچے اور انھوں نے ولید بن مغیرہ کی پنڈلی کی طرف اور عاص کے قدموں کی طرف اور اسود بن مطلب کی آنکھوں کی طرف اور اسود بن عبد یغوث کے پیٹ کی طرف اور حارث بن قیس کے سر کی طرف اشارہ کیا اور کہا میں ان کا شر دفع کروں گا۔ چنانچہ تھوڑے عرصہ میں یہ ہلاک ہو گئے، ولید بن مغیرہ تیر فروش کی دوکان کے پاس سے گزرا تو اس کے تہہ بند میں ایک تیر کی نوک چبھ گئی، لیکن اس نے تکبر کی وجہ سے اس

کو نکالنے کے لیے سر نیچا نہ کیا، اس سے اس کی پنڈلی میں زخم آیا اور اسی میں مر گیا۔ عاص بن وائل کے پاؤں میں کانٹا لگا اور نظر نہ آیا، اس سے پاؤں ورم کر گیا اور یہ شخص بھی مر گیا۔ اسود بن مطلب کی آنکھوں میں ایسا درد ہوا کہ دیوار میں سر مارتا تھا اسی میں مر گیا اور یہ کہتا مرا کہ مجھ کو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قتل کیا، اور اسود بن عبد یغوث کو ایک بیماری اِسْتِسْقَاء لگ گئی، کلبی کی روایت میں ہے کہ اس کو لو لگی اور اس کا منہ اس قدر کالا ہو گیا کہ گھر والوں نے نہ پہنچانا اور نکال دیا اسی حال میں یہ کہتا مر گیا کہ مجھ کو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے رب عَزَّوَجَلَّ نے قتل کیا اور حارث بن قیس کی ناک سے خون اور پیپ جاری ہوا، وہ اسی میں ہلاک ہو گیا۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری الجنان)

آیت مبارکہ:

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ

11○

لغۃ القرآن: [قُلْ : فرما دیجیے][سِیْرُوْا : چلو تم][فِي : میں][الْاَرْضِ : زمین][ثُمَّ انْظُرُوْا : پھر تم دیکھو][كَيْفَ : کیسا [كَانَ : ہوا][عَاقِبَةُ : انجام][الْمُكَذِّبِيْنَ : جھٹلانے والے]

ترجمہ: فرما دیجئے کہ تم زمین پر چلو پھرو، پھر (نگاہ عبرت سے) دیکھو کہ (حق کو) جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا

تشریح:

اس آیت کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے فرمایا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان مذاق اڑانے والوں اور جھٹلانے والوں سے کہئے کہ تم زمین میں سفر کرو اور تفتیش کرو اور تم سے پہلے کافروں پر تکذیب کی وجہ سے جو عذاب آیا تھا اس کے آثار اور نشانات دیکھو اور اس کے متعلق لوگوں سے خبریں معلوم کرو۔ اس آیت میں تکذیب کرنے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ اس کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور دین اسلام کی تکذیب کرتے ہیں۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی القرآن)

قرآن حکیم نے بارہا زمین میں سیر و سیاحت کا حکم دیا ہے لیکن صرف تفریح طبع کے لیے نہیں بلکہ عبرت پذیری کے لئے۔ لہو و لعب کے لیے نہیں بلکہ علمی مقاصد اور تاریخی نتائج اخذ کرنے کے لیے تاکہ گزری ہوئی قوموں کے مسمار شدہ محلات، باغات، قلعوں اور شہروں کو دیکھ کر ہم
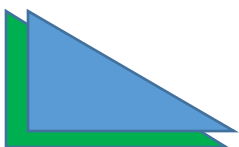
اپنی اصلاح کریں اور ہمیں وہ روز بد نہ دیکھنا پڑے جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی سزا میں انھیں دیکھنا پڑا تھا۔ اس نیت سے سیر و سیاحت کرنا باعث ثواب اور موجب رضا الٰہی ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبیؒ نے صراحت کی ہے کہ ایسا سفر مستحب ہے جو گزری ہوئی امتوں اور اجڑے ہوئے شہروں کے آثار اور کھنڈرات دیکھ کر عبرت حاصل کرنے کے لیے کیا جائے۔ **ھذا السفر مندوب الیہ اذا کان علی سبیل الاعتبار باثار من خلا من الامم واھل الدیار** (القرطبیؒ) یہاں بھی کفار کو حکم دیا جارہا ہے کہ تم حق کو قبول کرنے سے انکار کر رہے ہو اور روشن دلائل کے باوجود تم باطل سے چمٹے رہنے پر مصر ہو ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ ان قوموں کا کتنا دردناک انجام ہوا جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے رسولوں کو جھٹلایا۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ القرآن)

سیروا۔ بنا سیر سے جس کے معنی مطلقاً چلنے کے ہیں خواہ وہ سفر دن کا ہو یا رات کا۔ ارض سے مراد زمین ہے۔ خالق کائنات عزوجل نے زمین میں سیر وسیاحت کا حکم دیا تاکہ عبرت حاصل ہو ان قوموں کے مسمار شدہ محلات و مقامات سے جنھوں نے اللہ کے احکام اور انبیاء (علیہم السلام) کی نافرمانی کی دیکھو ان قوموں کا کتنا دردناک انجام ہوا۔ **ثم انظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین۔ فانظروا اور ثم انظروا** میں فرق صرف یہ ہے کہ نظر مسبّب سیر ہے اور فانظروا سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ گویا حکم الٰہی عزوجل سیر کے لیے صرف انجام مکذبین دیکھنے کے لیے ہے اور بلا نظر سیر کی ممانعت ہے اور وہ سیر سیر غافلین ہوگی اور سیروا فی الارض ثم انظروا فرمانے سے یہ مستفاد ہوتا ہے۔ سیروا فی الارض کا جواز بغرض تجارت وغیرہ بھی ہے اور ہلاک شدہ لوگوں کا انجام دیکھنا اور ان سے عبرت حاصل کرنا واجب ہوا۔ اس طرز بیان سے واجب و مباح کے دونوں حکم حاصل ہوئے۔

علامہ آلوسی صاحب روح المعانی فرماتے ہیں (ترجمہ) یہ خطاب ہے سید المخاطبین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ام ماضیہ کے حالات پیش کرکے قوم کو ڈرانے اور نصیحت کرنے کے متعلق کہ ان کے برے افعال نے ان کو کیسے گھیر لیا اور اب جو یہ ویسے ہی اعمال کر رہے ہیں ان کو ان کے انجام سے ڈرنا چاہیے اور اس میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے تسلی بھی ہے اور تکمیل بھی۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی المعانی)

آگے فرماتے ہیں۔ کہا گیا کہ سیروا اور فانظروا میں بہت فرق ہے اگرچہ دونوں امر واجب ہیں کیونکہ پہلا امر دوسرے کے مطلوب ہے جیسے تم کہو وضو کر پھر نماز پڑھ۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان مکذبین اور تمسخر کرنے والوں کے لیے حکم ہے کہ انھیں فرما دیجیے کہ دنیا میں پھر کر انجام مستہزئین دیکھو انھوں نے کفر و تکذیب کا کیا ثمرہ پایا۔ **قل لمن ما فی السموت والارض**۔ فرما دیجیے کس کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ (تفسیر الحسنات۔ علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)

اس آیت کریمہ میں اگرچہ دونوں جملے آپس میں پوری طرح پیوست اور نہایت مربوط ہیں' لیکن حقیقت میں دو الگ الگ باتیں ہیں' جو اپنی انتہاء میں تو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں' لیکن اپنی ابتداء میں دونوں جدا جدا ہیں۔ پہلا یہ حکم دیا جارہا ہے کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ کوئی سیر سپاٹے کا حکم ہے اور یہ کہا جارہا ہے کہ تباہ شدہ قوموں کے آثار شاید انسانوں کے لیے دلچسپی اور خوشی کا باعث ہوتے ہیں۔ اس لیے جاکر ایسی تباہ شدہ قوموں کے کھنڈرات اور ان کے آثار کو دیکھ کر خوشی حاصل کرو اور وقت گزاری کا اچھا سامان پیدا کرو۔ لیکن دوسرے جملے میں واضح طور پر اس حکم کی وجہ بیان کی جارہی ہے کہ ان علاقوں میں جاکر سیر کرنا مقصود نہیں' نہ وہاں سے کلچر یا تاریخ نکالنا مقصود ہے۔ بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ اصلاً یہ تباہ شدہ بستیاں ان قوموں کی ہیں' جنھوں نے اللہ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور

پیغمبروں کی تکذیب کی تھی۔ اس لیے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ آخر یہ قومیں اس انجام کو کیوں پہنچیں؟ جب تم اس نیت اور اس ارادے سے وہاں جاؤ گے تو تم جیسے جیسے ان کے اعمال سے واقف ہوتے جاؤ گے ' تمہیں ویسے ویسے وہاں سے عبرت اور نصیحت کا خزانہ ہاتھ آئے گا۔ تم اپنے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاؤ گے کہ کہیں ہم اس رویے کو اختیار تو نہیں کر چکے ' جس رویے کے نتیجے میں ان قوموں کو یہ انجام دیکھنا پڑا۔ اس سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسلام ہمیں یہ بات بتانا چاہتا ہے کہ جب کبھی تم ایسی بستیوں سے گزرو ' جو کبھی اللہ کے عذاب کا شکار ہوئیں اور اچانک انھیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا تو وہاں کسی اور چیز کو تلاش مت کرو ' بلکہ وہاں سے عبرت حاصل کرو۔

معذب مقامات کے متعلق حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا طرز عمل

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب جنگ تبوک کے لیے تشریف لے جا رہے تھے تو راستے میں قوم صالح کے کھنڈرات سے گزرے۔ لیکن وہاں رکے نہیں۔ اگرچہ آپ نے حضرت صالح (علیہ السلام) کی طرف منسوب بعض چیزوں کی نشاندہی بھی فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ دیکھو! یہ وہ کنواں ہے ' جس سے حضرت صالح (علیہ السلام) کی اونٹنی پانی پیا کرتی تھی۔ لیکن مسلمانوں کو حکم دیا کہ جلدی سے یہاں سے گزرنے کی کوشش کرو کیونکہ یہ ایک منحوس جگہ ہے۔ یہاں اللہ کا عذاب نازل ہو چکا ہے۔ یہاں سے جلدی نکلو اور ساتھ ہی اللہ سے پناہ مانگو کہ یا اللہ! ہمیں ایسی صورتحال میں کبھی مبتلا نہ کرنا کہ ہم دنیا کے لیے عبرت بن کر رہ جائیں۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ منیٰ کے پہلو میں وہ جگہ ہے ' جہاں ابرہہ پر پرندوں کے ذریعے اللہ نے سنگ باری کروائی تھی اور جس کے نتیجے میں اس کی ہزاروں افراد پر مشتمل فوج تباہ ہو کر رہ گئی اور خود ابرہہ بھی اس حال میں جہنم رسید ہوا کہ اس کا گوشت گل گل کر گرتا جا رہا تھا ' حتیٰ کہ راستے ہی میں اسے موت آ گئی۔ وہاں بھی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حجاج کو ٹھہرنے سے منع فرمایا ہے کہ یہ جگہ جائے عبرت ہے ' جائے قیام نہیں۔ اس سے معذب قوموں کی تباہ شدہ بستیوں کے بارے میں اسلامی رویہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم نے آج باقی دنیا کی طرح ایسی بستیوں کو یہ سمجھ رکھا ہے کہ یہ ہمارے اہل علم کی تحقیق اور ریسرچ کی جگہ ہے۔ موہنجوداڑو اور ہڑپہ جیسی جگہیں ہمارے لیے سیر گاہیں اور دلچسپی کی جگہ بن کے رہ گئی ہیں۔ ہمارے اہل علم وہاں سے کلچر نکالنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اگرچہ بجائے خود یہ تصور کہ کلچر تباہ شدہ کھنڈرات سے نکلتا ہے اور یہ نظریات سے جنم نہیں لیتا بہت محل نظر ہے۔ تاہم میں اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ آپ یہ کام بھی جاری رکھیئے ' لیکن ایسے کھنڈرات اور تباہ شدہ بستیوں سے صرف کلچر ہی نہیں ' عبرت حاصل کرنے کی بھی کوشش کی جائے کیونکہ اصل مقصود تو یہی ہے۔ لیکن یہاں تو حال یہ ہے ' جیسے مقصود انور نے نوحے کے انداز میں کہا تھا۔

عبرت کی ایک چھٹانک برآمد نہ ہو سکی
کلچر نکل پڑا ہے منوں کے حساب سے

مکذب قوم کسے کہتے ہیں؟

اس آیت کا ایک اور پہلو بھی نہایت قابل توجہ ہے۔ وہ یہ کہ اس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اس سرزمین ' یعنی زمین عرب میں گھوم پھر کے دیکھو کہ مکذب قوموں کا انجام کیا ہوا۔ سوال یہ ہے کہ جن کو مکذبین کہا گیا ہے ' انھوں نے کس بات کی تکذیب کی؟ اور اصل وہ موضوع بحث کیا تھا '

جس میں وہ اللہ کے رسولوں سے الجھتے تھے ؟ موضوع بحث یہ تھا کہ اللہ کے رسول انھیں یہ دعوت دیتے تھے کہ اس پوری کائنات اور خود تمہارا خالق اللہ ہے۔ اسی نے تمہیں پیدا کیا ہے ' اسی نے تمہیں زندگی دی ہے ' اسی نے تمہارے لیے زندگی کے امکانات پیدا کیے ہیں ' وہی تمہیں رزق دیتا ہے ' اس کی بیشمار نعمتیں ہیں ' جن سے تم لذت اندوز ہوتے ہو۔ تمہاری ساری صلاحیتیں ' توانائیاں ' احساسات ' انفعالات ' آرزوئیں اور امنگیں ' سب اس کی عطا کردہ ہیں۔ تم از اول تا آخر اس کے زیر احسان ہو اور اسی کی قدرت کی گرفت میں بھی ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ جب تم اسی کی دی ہوئی زندگی گزار رہے ہو ' اسی کا دیا ہوا رزق کھاتے ہو ' اسی کی زمین پر رہتے ہو ' اسی کی عطا کی ہوئی قوتوں سے متمتع ہو رہے ہو ' تو کیا تمہاری زندگی ' تمہارے احساسات ' تمہاری صلاحیتوں ' تمہاری عقل و دانش اور تمہارے گھروں سے لے کر تمہارے اجتماعی اداروں تک ' صرف اسی کی حکومت اور اسی کی مرضی کا تسلط نہیں ہونا چاہیے ؟ جب اسی نے تمہیں وجود دیا اور تمہیں زندگی بخشی ہے تو کیا اس کا یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس وجود اور زندگی پر حکمرانی کرے ؟ جب اس نے تمہیں شعور اور عقل سے نوازا ہے تو کیا اس شعور اور عقل کی حدود مقرر کرنا اور فکری رہنمائی مہیا کرنا اسی کا حق نہیں ہے ؟ اگر تم ان باتوں کو مانتے ہو تو پھر تم اس کے سوا کسی اور کے سامنے کیسے جھکتے ہو ؟ تم اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی بجائے اپنی مرضی کی زندگی کیوں گزارتے ہو ؟ لیکن ان قوموں نے بجائے ان باتوں کو سمجھنے اور قبول کرنے کے اس سے انکار کا رویہ اختیار کیا اور انھوں نے صاف کہا کہ ہم قانون خداوندی کو نہیں مانتے۔ ہم تو قانون نفس پر چلتے ہیں۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ ہمیں سب کچھ ہمارے پروردگار نے عطا کیا ہے ' لیکن ہم اس پر کوئی پابندی قبول کرنے کو تیار نہیں۔ ممکن ہے یہ باتیں آپ کو عجیب لگتی ہوں کہ ان باتوں میں بڑی دانش اور بڑی اپیل ہے تو آخر وہ اس دعوت کو قبول کیوں نہیں کرتے تھے۔ لیکن اگر ہم خود اپنا جائزہ لے کر دیکھیں کہ ہم اپنی انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک ' کس کی راہنمائی میں زندگی گزارتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا رویہ معذب قوموں سے مختلف نہیں کیا ہم اپنی ذات میں شریعت اسلامی کی پابندیوں کو قبول کرتے ہیں اور کیا ہمارے اجتماعی ادارے ' اللہ کے بھیجے ہوئے قانون کی پیروی کرنے کے لیے تیار ہیں ؟ باوجود اس کے کہ ہم اللہ کی حاکمیت کے قائل ہیں ' لیکن کیا ہم اپنا تخت اقتدار اللہ کی شریعت کے لیے خالی کرنے کی زحمت گوارا کر سکتے ہیں ؟ پورا عالم اسلام ' ان تمام باتوں کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن عملی زندگی میں ان تمام باتوں کا انکار کرتا ہے۔ یہی رویہ ان کا بھی تھا۔ بالآخر اسی کی پاداش میں اللہ کے عذاب کا شکار ہوئے۔

یہاں معلوم ہوتا ہے پروردگار اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ لوگو ! اگر تمہیں انبیاء کی دعوت ویسے سمجھ نہیں آتی اور تم اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو یہ بات سمجھنے کی کوشش کرو کہ تمہاری طرح ان قوموں نے بھی اسی طرح کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کیا تھا تو آج ان کا انجام تمہارے سامنے ہے۔ کیا ان کی تباہی اور بربادی کی داستانیں اور ان کے کھنڈرات تمہیں سمجھانے کے لیے کافی نہیں ہیں ؟ کاش ! کوئی ان کھنڈرات پر کھڑا ہو کر اسی طرح ان کی تباہی کے اسباب پوچھ سکتا اور اللہ کے نبیوں کی دعوت کی صداقت و حقانیت کے متعلق بھی ان سے سوال کر سکتا ' جیسے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غزوہ بدر کے بعد مقتولین بدر سے کیا تھا۔ آپ نے ان تمام بڑے بڑے قریش کے سرداروں سے ' جن کی لاشیں آپ نے ایک بند کنویں میں پھنکوا دیں تھیں ' کنویں کے منڈیر پر کھڑے ہو کر پوچھا تھا کہ اے ابوجہل ! اے عتبہ ! اے شیبہ اور اے فلاں اے فلاں تمہیں اب تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں تمہیں جو کچھ کہتا تھا ' وہ سچ تھا اور تمہارا رویہ غلط تھا۔ حضرت عمر فاروق (رض) نے عرض کیا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ لوگ تو مر چکے ہیں۔ یہ تو اب کچھ بھی سن نہیں سکتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا : یہ سنتے ہیں ' لیکن جواب نہیں دے سکتے۔ یہاں مکذبین کے انجام کی طرف توجہ دلا کر مشرکین مکہ سے بھی وہی سوال کیا جا رہا ہے جو ان قوموں اور ان کے رسولوں کے درمیان موضوع بحث اور کشمکش کا عنوان بنا رہا۔ (روح القرآن۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی القرآن)

یعنی جب پہلی قوموں نے انبیاء کی تضحیک کی تو انھیں عذاب سے ڈرایا گیا مگر وہ عذاب کا بھی مذاق اڑانے لگے تب انھیں اسی عذاب نے آ گھیرا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ تو کفار مکہ کو چل پھر کر دیکھنا چاہیے کہ منکر قوموں کا کیا انجام ہوا۔ کفار مکہ شام اور یمن کے تجارتی سفروں میں عاد و ثمود کے علاقوں سے گزرتے اور ان کے تباہ شدہ کھنڈرات دیکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان سے عبرت پکڑو۔
اس میں دور حاضر کی اسلام دشمن قوتوں کے لیے بھی درس عبرت ہے۔ آج امریکہ بظاہر یہی کہتا ہے کہ وہ اسلام کے خلاف نہیں مگر یہ اس کا جھوٹ ہے۔ اگر وہ اسلام کے خلاف نہیں تو وہ اپنی ساری طاقت صرف مسلمانوں ہی کے خلاف کیوں استعمال کر رہا ہے۔ ان کا کیا قصور ہے ؟ صرف یہی کہ ان کے سینے میں نور اسلام ہے ؟ دراصل رشین بلاک کی شکست و ریخت کے بعد امریکہ کا ہدف صرف اسلام ہی رہ گیا ہے کیوں کہ کیمونزم ختم ہو گیا ہے مگر اس کا انجام وہی ہوگا جو شروع سے اسلام دشمن قوموں کا ہوتا آیا ہے پردہ غیب سے پھر کوئی ثانی عمر بن خطاب نمودار ہونے والا ہے کوئی دوسرا صلاح الدین ایوبی آنے والا ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمد سے اجالا کر دے
چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعت شان رفعنا لک ذکرک دے

(برہان القرآن
القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس محبت پیدا کرنے کا ذریعہ

اس سے معلوم ہوا کہ خوف الٰہی پیدا کرنے کے لیے عذاب والی جگہ جا کر دیکھنا بہتر ہے کیونکہ خبر کے مقابلے میں مشاہداتی چیز کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ نیز جیسے عذاب کی جگہ دیکھنے سے خوف پیدا ہوتا ہے اسی طرح رحمت کی جگہ دیکھنے سے عبادت کی رغبت اور اللہ عَزَّوَجَلَّ کی محبت پیدا ہوتی ہے، لہٰذا اللہ عَزَّوَجَلَّ کی رحمت دیکھنے کے لیے بزرگوں کے آستانے جہاں اللہ تعالیٰ کی رحمتیں برستی ہیں، جا کر سفر کرکے دیکھنا بھی بہتر ہے تاکہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کی اطاعت کا شوق پیدا ہو۔

سفر کر کے مزارات اولیاء پر جانا جائز ہے

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمانی قوت حاصل کرنے کے لیے سفر کرنا باعث رحمت ہے اور اس آیت سے ان لوگوں کا بھی رد ہوتا ہے جو صرف تین مسجدوں کے علاوہ کسی اور طرف سفر کو مطلقاً ناجائز کہتے ہیں اور اس کی دلیل کے طور پر یہ حدیث پیش کرتے ہیں، حضرت ابو سعید خدری (رض) سے مروی ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "ان تین مسجدوں کے سوا کسی کی طرف کجاوے نہ باندھے جائیں (1) مسجدِ حرام۔ (2) رسولُ اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مسجد۔ (3) مسجدِ اقصی۔ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ ان مسجدوں کے علاوہ کسی اور مسجد کی طرف اس لیے سفر کر کے جانا کہ وہاں نماز کا ثواب زیادہ ہے ممنوع ہے کیونکہ ان کے علاوہ سب مسجدوں میں نماز پڑھنے کا ثواب برابر ہے۔ اگر اس حدیث کے یہ معنی کئے جائیں کہ ان تین مسجدوں کے علاوہ کسی اور مسجد کی طرف سفر کرنا حرام ہے یا ان تین مسجدوں کے علاوہ کہیں اور سفر کرنا جائز نہیں تو یہ حدیث قرآن مجید کی اس آیت اور دیگر احادیث کے بھی خلاف ہوگی، نیز اس معنی کے حساب سے کہیں کا کوئی سفر کسی مقصد کے لیے جائز نہ ہوگا مثلاً جہاد، طلب علم، تبلیغ دین، تجارت، سیاحت وغیرہ کسی کام کے لیے سفر جائز نہ ہوگا اور یہ امت کے اجماع کے خلاف ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ سفر کر کے اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کے مزارات پر جانا ممنوع و حرام نہیں بلکہ جائز اور مستحسن ہے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری الجنان)

فوائد

ا: یہاں زمین سے مراد وہ زمین ہے جہاں پچھلی قوموں پر عذاب آیا۔ اور اب تک وہاں اجڑی بستیوں کے آثار موجود ہیں اور یہ امر ترغیب کے لیے ہے نہ کہ وجوب کے لیے۔

۲: اس سے معلوم ہوا کہ خوف الٰہی پیدا کرنے کے لیے عذاب والی جگہ جا کر (سفر کر کے) دیکھنا بہتر رہے۔ للذا رب کی رحمت دیکھنے کے لیے بزرگوں کے آستانے جہاں رب کی رحمتیں برستی ہیں، جا کر سفر کر کے دیکھنا بھی بہتر ہے کہ رب کی اطاعت کا شوق پیدا ہو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمانی قوت حاصل کرنے کے لیے سفر کرنا باعث رحمت ہے۔ (نور

آیت مبارکہ :

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلْ لِّلّٰهِ ۭ كَتَبَ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○12

لغۃ القرآن: [قُلْ : فرما دیجیے][لِّمَنْ مَّا : کس لیے ہے جو][فِي : میں][السَّمٰوٰتِ : آسمانوں][وَالْاَرْضِ: اور زمین][قُلْ : فرما دیجیے][لِّلّٰهِ: اللہ کیلئے][كَتَبَ : اس نے لکھا][عَلٰي : پر][نَفْسِهِ : اپنے نفس][الرَّحْمَةَ : رحمت][لَيَجْمَعَنَّكُمْ : یقیناً وہ تمہیں جمع کریگا][اِلٰى: طرف][يَوْمِ : دن][الْقِيٰمَةِ : قیامت][لَا رَيْبَ : نہیں شک][فِيْهِ : اس میں][اَلَّذِيْنَ : وہ لوگ][خَسِرُوْٓا : انہوں خسارے میں ڈالا][اَنْفُسَهُمْ : ان کے نفس][فَهُمْ : پھر وہ][لَا يُؤْمِنُوْنَ : نہیں وہ ایمان لاتے]

ترجمہ : [قُلْ : فرما دیجیے][لِّمَنْ مَّا : کس لیے ہے جو][فِي : میں][السَّمٰوٰتِ : آسمانوں][وَالْاَرْضِ: اور زمین][قُلْ : فرما دیجیے][لِّلّٰهِ: اللہ کیلئے][كَتَبَ : اس نے لکھا][عَلٰي : پر][نَفْسِهِ : اپنے نفس][الرَّحْمَةَ : رحمت][لَيَجْمَعَنَّكُمْ : یقیناً وہ تمہیں جمع کریگا][اِلٰى: طرف][يَوْمِ : دن][الْقِيٰمَةِ : قیامت][لَا رَيْبَ : نہیں شک][فِيْهِ : اس میں][اَلَّذِيْنَ : وہ لوگ][خَسِرُوْٓا : انہوں خسارے میں ڈالا][اَنْفُسَهُمْ : ان کے نفس][فَهُمْ : پھر وہ][لَا يُؤْمِنُوْنَ : نہیں وہ ایمان لاتے]

تشریح:

قاعدہ یہ ہے کہ جب سوال کا جواب ایک ہی ہو اور جس سے سوال کیا جارہا ہے اس کو بھی اس سے انکار نہ ہو تو سائل خود ہی جواب دے دیا کرتا ہے۔ اس سوال کے جواب میں کفار کو بھی اختلاف نہ تھا اس لیے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبان مبارک سے جواب دلادیا گیا۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ القرآن)

مزید فرمایا کہ اے حبیب! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ ان سے پوچھیں کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اس کا مالک کون ہے؟ اولاً تو وہ خود ہی کہیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا ہے کیونکہ وہ اس کے معتقد ہیں اور اگر وہ یہ نہ کہیں تو تم خود یہ جواب دو کہ سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے کیونکہ اس کے سوا اور کوئی جواب ہو ہی نہیں سکتا اور وہ اس جواب کی مخالفت کر ہی نہیں سکتے کیونکہ بت جن کو یہ مشرکین پوجتے ہیں وہ بے جان ہیں، کسی چیز کے مالک ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے، خود دوسروں کے مملوک ہیں جبکہ آسمان و زمین کا وہی مالک ہو سکتا ہے جو حَیّ و قَیُّوم، ازلی واَبدی، قادرِ مطلق، ہر شے پر مُتَصَرِّف اور حکمران ہو، تمام چیزیں اس کے پیدا کرنے سے وجود میں آئی ہوں، ایسا سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں، اس لیے تمام آسمانی و زمینی کائنات کا مالک اس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔

{ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ : اس نے اپنے ذمہ کرم پر رحمت لکھ لی ہے۔ } یعنی اس نے رحمت کا وعدہ فرمالیا ہے اور اللہ عَزَّوَجَلَّ کا وعدہ خلافی کرنا اور معاذاللہ جھوٹ بولنا محال ہے۔ اس نے رحمت کا وعدہ فرمالیا اور رحمت عام ہے دینی ہو یا دُنیوی، اپنی معرفت اور توحید اور علم کی طرف ہدایت فرمانا بھی اسی رحمت فرمانے میں داخل ہے، یونہی کفار کو مہلت دینا اور سزا دینے میں جلدی نہ فرمانا بھی رحمت میں داخل ہے کیونکہ اس سے انھیں توبہ اور رجوع کا موقع ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت دیکھ کر گناہوں پر بے باک نہیں ہونا چاہیے

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ رحیم اور سب سے بڑھ کر کریم ہے، اس کے رحم و کرم کے خزانوں کی کوئی انتہاء نہیں، وہ چاہے تو عمر بھر کے گناہ گار کو پل بھر میں بخش دے اور اس کی ساری خطائیں معاف فرمادے لیکن اس کی وسیع رحمت کو دیکھ کر ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ بندہ گناہوں پر بے باک ہو جائے اور اس کی نافرمانی کی پروانہ کرے۔ امام غزالی (رح) فرماتے ہیں، جس کا خلاصہ ہے کہ "گناہ گار مومن اس طرح دھوکے میں مبتلا ہیں کہ وہ یہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کریم ہے اور مجھے اس کے عفو و در گزر کی امید ہے، پھر اس بات پر بھروسہ کر کے اعمال سے غافل ہو جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت وسیع اور رحمت و کرم عام ہے، اس کی رحمت کے سمندر کے مقابلے میں بندوں کے گناہوں کی کیا حیثیت ہے، ہم توحید کو ماننے والے اور مومن ہیں اور ایمان کے وسیلے سے اس کی رحمت کے امید وار ہیں۔ بعض اوقات ان کے پاس اس امید کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ ہمارے باپ دادا نیک لوگ تھے اور ان کا درجہ بلند تھا جیسے کئی لوگ اپنے نسب کی وجہ سے دھوکے کا شکار ہیں حالانکہ وہ خوف خدا، تقویٰ اور پرہیزگاری وغیرہ کے سلسلے میں اپنے آباؤاَجداد کی سیرت کے خلاف چلتے ہیں تو گویا ان کا گمان یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے باپ دادا سے بھی زیادہ معزز ہیں کیونکہ وہ باپ دادا تو انتہائی درجہ کے تقویٰ کے باوجود خوف زدہ رہتے تھے اور یہ لوگ انتہائی درجہ کے فسق وفجور کے باوجود بے خوف ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بہت بڑا دھوکہ ہے، اسی طرح شیطان اعلیٰ نسب والوں کے دلوں میں یہ بات ڈالتا ہے کہ جو کسی انسان سے محبت کرتا ہے وہ اس کی اولاد سے بھی محبت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے چونکہ

تمہارے آباؤاجداد سے محبت کی ہے لہٰذا وہ تم سے بھی محبت کرتا ہے، اس لیے تمہیں عبادت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ذات پر دھوکا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اطاعت گزار کو پسند فرماتا اور گناہ گار کو ناپسند فرماتا ہے تو جس طرح گناہ گار بیٹے کو برا جاننے کی وجہ سے اس کے فرمان بردار باپ کو برا نہیں جانتا اسی طرح فرمان بردار باپ کی اطاعت گزاری کی وجہ سے اس کے گناہ گار بیٹے سے محبت بھی نہیں کرتا، اگر محبت باپ سے بیٹے کی طرف چلی جاتی تو قریب تھا کہ نفرت بھی سرایت کرتی جبکہ حق بات یہ ہے کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا اور جس شخص کا یہ خیال ہو کہ وہ اپنے باپ کی پرہیزگاری کی وجہ سے نجات پائے گا تو وہ اس آدمی کی طرح ہے جو یہ گمان کرتا ہو کہ باپ کے کھانے سے وہ بھی سیر ہو جائے گا، باپ پیے تو بیٹا بھی سیراب ہو جائے گا، باپ کے سیکھنے سے بیٹا بھی عالم ہو جائے گا اور باپ کعبہ شریف میں پہنچ جائے تو اس کے وہاں پہنچنے سے یہ بھی وہاں پہنچ جائے گا اور کعبہ شریف کو دیکھ لے گا۔ (یاد رکھیں کہ) تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرنا ہر ایک پر لازم ہے، اس میں والد اپنے بیٹے کی طرف سے کفایت نہیں کرتا اور اس کے برعکس بھی یہی حکم ہے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری الجنان)

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ ایسے نابکار لوگوں کو زندہ کیوں رہنے دیا جاتا ہے انھیں فوراً نیست و نابود کیوں نہیں کر دیا جاتا۔ اس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مجبوری یا کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اپنے فضل و کرم سے رحمت کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ لوگ کتنی ہی نافرنیاں کریں۔ اس کے ساتھ شریک ٹھہرائیں، اس کی ہستی کا ہی انکار کر دیں اس کی رحمت کا وسیع دامن ان پر سایہ فگن رہتا ہے اور ان کی زندگی کی جو میعاد مقرر کی گئی ہے اس وقت تک انھیں زندہ رہنے کے وسائل بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ سورج، بارش، ہوا وغیرہ مومن و کافر، متقی و فاسق سب کے لیے ایک ہی حیات آفرین تاثیر رکھتے ہیں۔ ان الفاظ سے کفار کو ایمان لانے کی ترغیب دلانا مقصود ہے یعنی اپنی سابقہ بداعمالیوں کی وجہ سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ اگر اب بھی تم سچے دل سے توبہ کر لو تو تمہیں دامن رحمت میں پناہ مل جائے گی۔
یہاں خسارہ سے مراد اس قیمتی استعداد کو ضائع کرنا ہے جو حق اور باطل میں فرق کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو عطا فرماتا ہے۔ کفار جاننے بوجھنے کے باوجود حق کو قبول کرنے سے گریزاں تھے جس سے ان کی وہ استعداد ضائع ہو گئی۔ اس کے بعد ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایمان لے آئیں گے۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ القرآن)

الوہیت 'رسالت اور قیامت پر دلیل

اس آیت سے مقصود یہ ثابت کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا خالق اور مستحق عبادت ہے اور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے رسول برحق ہیں اور قیامت کے دن مخلوق سے اس کے اعمال کا حساب لیا جائے گا اور دلیل کی تقریر یہ ہے کہ کفار اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ تمام آسمان اور زمینیں اور ان میں تمام رہنے والے سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں اور ساری مخلوق اللہ کی مملوک ہے اور مملوک پر اپنے مالک کی اطاعت کرنا لازم ہے۔ سو تمام انسانوں پر لازم ہے کہ صرف اس ایک رب کی عبادت کریں 'اور اسی کو عبادت کا مستحق مانیں اور عبادت کا طریقہ بتلانے اور اللہ کے احکام پہنچانے کے لیے ایک رسول کا ہونا ضروری ہے 'جو دلیل اور معجزہ سے اپنی رسالت کو ثابت کرے اور سیدنا محمد

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بکثرت دلائل اور معجزات سے اپنی نبوت ورسالت کو ثابت کیا ہے۔ پھر جو لوگ اللہ کی اطاعت کریں 'ان کو اجر دینے کے لیے اور جو نافرمانی کریں ان کو سزا دینے کے لیے ایک دن ہونا چاہیے اور وہ روز قیامت اور روز جزا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کے متعلق احادیث اور ان کی تشریح

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اس نے (محض اپنے کرم سے) اپنے اوپر رحمت لازم کر لی ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا تو اپنی اس کتاب میں لکھ دیا جو اس کے پاس عرش کے اوپر تھی کہ بیشک میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ (صحیح مسلم 'التوبہ '۱۴ (۲۷۵۱) ۶۸۳۶ 'صحیح البخاری 'رقم الحدیث: ۳۱۹۴ 'سنن کبری للنسائی 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ۷۷۵۰ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث: ۴۲۹۵ 'مسند احمد 'ج ۲ 'ص ۲۶۰۔ ۲۵۸۔ ۲۴۲ 'طبع قدیم)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کرلیا تو اپنی اس کتاب میں لکھا جو اس کے پاس رکھی ہوئی تھی کہ بیشک میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ (صحیح مسلم 'التوبہ '۱۶ '(۲۷۵۱) ۶۸۳۸ 'مسند احمد 'ج ۳ 'رقم الحدیث: ۷۵۰۳ 'طبع دارالفکر 'بیروت)

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا معنی یہ ہے کہ وہ نیکی کرنے والے مسلمان کو ثواب عطا فرمانے اور اپنے بندہ کو نفع پہنچانے کا ارادہ کرے اور اللہ کے غضب کا معنی یہ ہے کہ وہ فاسقوں اور نافرمانوں کو عذاب میں مبتلا کرنے اور مصیبت میں ڈالنے کا ارادہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارادہ کرنا اس کی صفت قدیمہ ہے 'جس سے وہ تمام مرادات کا ارادہ فرماتا ہے اور رحمت کی سبقت اور اس کے غلبہ سے مراد یہ ہے کہ رحمت بہت زیادہ اور بہت کثیر افراد کو شامل ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ کی ایک سو رحمتیں ہیں۔ جنات 'انسانوں 'جانوروں اور حشرات الارض میں اس نے (صرف) ایک رحمت رکھی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر شفقت اور رحم کرتے ہیں۔ اس رحمت کی وجہ سے وحشی جانور اپنے بچوں پر رحم کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ننانوے رحمتیں موخر کر رکھی ہیں۔ ان کے ساتھ قیامت کے دن اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا۔ (صحیح مسلم 'التوبہ '۱۹ '(۲۷۵۲) ۶۸۴۲ 'سنن ابن ماجہ 'رقم الحدیث: ۴۲۹۳)

یہ دنیا دار البلاء اور دار التکلیف ہے اور اس دنیا میں بھی اللہ کی ایک رحمت سے مسلمانوں کو 'اسلام 'قرآن اور نماز کی رحمت حاصل ہوئی 'بلکہ تمام شریعت اللہ کی رحمت ہے اور مسلمانوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے رحمت رکھی جس سے وہ نیکی 'صلہ رحمی اور غریب پروری کرتے ہیں تو ان ننانوے رحمتوں کی وسعت اور گیرائی کے متعلق کوئی شخص کیا تصور کرسکتا ہے جو دار آخرت میں حاصل ہوں گی 'جو دار القرار اور دار الجزاء ہے۔

حضرت عمر بن خطاب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں قیدی پیش کیے گئے قیدیوں میں سے ایک عورت کسی کو تلاش کر رہی تھی۔ اچانک اس نے قیدیوں میں اپنے بچہ کو دیکھا 'اس نے بچے کو اپنے پیٹ سے چمٹا لیا اور اس کو دودھ پلایا۔ پھر
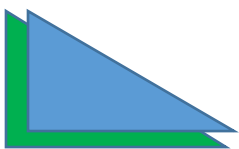
رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہم سے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا یہ عورت اپنے بچہ کو آگ میں ڈال دے گی؟ ہم نے کہا نہیں ' خدا کی قسم اگر آگ میں ڈالنا اس کے لیے مقدور ہوا تو یہ اپنے بچہ کو کبھی آگ میں نہیں ڈالے گی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہ اپنے بچہ پر جس قدر رحم کرنے والی ہے 'اللہ اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ رحم فرمانے والا ہے۔ مسلم 'التوبہ '۲۲' (۲۷۵۴) ۶۸۴۵ ' صحیح البخاری 'رقم الحدیث : ۵۹۹۹)

اس جگہ پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جب ماں اپنے بچہ کو آگ میں ڈالنا گوارہ نہیں کرتی تو اللہ اپنے بندوں کو آگ میں ڈالنا کیسے گوارا کرے گا ' جبکہ اللہ ماں سے کہیں زیادہ رحیم ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ اپنے بندوں کو آگ میں نہیں ڈالے گا اور جن کو آگ میں ڈالے گا ' وہ اپنے آپ کو اللہ کا بندہ نہیں کہتے۔ کوئی خود کو بتوں کا بندہ کہتا ہے 'کوئی اپنے آپ کو سورج 'آگ پیپل اور کوئی گائے کا بندہ کہتا ہے اور کوئی خود کو عیسیٰ (علیہ السلام) اور عزیر (علیہ السلام) کا بندہ کہتا ہے اور کوئی اپنے آپ کو اللہ کا بندہ کہتا ہے مگر بندگی اپنی خواہشات کی کرتا ہے :

(آیت) "ارء یت من اتخذ الھہ ھوہ افانت تکون علیہ وکیلا"۔ (الفرقان : ۴۳)

ترجمہ : کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا معبود بنالیا تو کیا آپ اس کی وکالت کریں گے۔

ہاں جو لوگ خود کو اللہ کا بندہ کہلانے میں عار نہیں سمجھتے اور اپنی نفسانی خواہشوں کے برخلاف اللہ تعالیٰ کی اطاعت خوشی سے کرتے ہیں ' وہ ان کو آگ میں نہیں ڈالے گا اور ایسے لوگوں سے اگر کبھی انسانی تقاضے سے کوئی لغزش یا اطاعت میں کمی ہو گئی اور انھوں نے پھر توبہ کرکے اللہ کی طرف رجوع کرلیا تو اللہ انھیں معاف فرما دے گا اور ان میں سے اگر کوئی بغیر توبہ کے مر گیا تو اس کے لیے بھی اللہ کی رحمت اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت سے عفو ودرگزر کی گنجائش ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : ایک شخص کی موت کا وقت جب قریب آیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو یہ وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا دینا 'پھر میرے جسم کو پیسنا اور میری راکھ کو سمندر میں ہوا کے اندر اڑا دینا۔ پس بخدا اگر میرا رب مجھ پر قادر ہوا تو مجھے ایسا عذاب دے گا کہ کسی کو ایسا عذاب نہ دیا ہوگا؟ اس کے بیٹوں نے ایسا ہی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا تمہارے اس فعل کا محرک کیا تھا؟ اس نے کہا اے میرے رب ! تیرا خوف۔ سو اللہ نے اس وجہ سے اس کو بخش دیا۔ (صحیح مسلم ' التوبہ '۲۵' (۲۷۵۶) ۶۸۴۸ ' صحیح البخاری 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۳۴۸۱ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۴۴۵۵ 'سنن النسائی 'ج ۲ رقم الحدیث : ۲۰۷۹)

اس حدیث میں ہے کہ اگر بخدا میرا رب قادر ہوا تو مجھے ایسا عذاب دے گا۔ (الحدیث) اس پر اعتراض یہ ہے کہ اس شخص کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اللہ کی قدرت پر شک تھا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت پر شک کرنا کفر ہے۔ اس اعتراض کے متعدد جواب ہیں۔

(۱) اس شخص کے قول میں "قدر "قدرت سے ماخوذ نہیں ہے 'بلکہ قضاء قدر کے معنی میں ہے۔ یعنی اگر میرے رب نے میرے لیے عذاب مقرر کردیا تو وہ مجھے ایسا عذاب دے گا کہ کسی کو ایسا عذاب نہ دیا ہوگا ؛۔

(۲) "قدر "اس قول میں تنگی کرنے کے معنی میں ہے۔ یعنی اگر میرے رب نے مجھ پر تنگی کی تو مجھے ایسا عذاب دے گا۔

قرآن مجید میں ہے :

(آیت) "فقدر علیہ رزقہ"۔ (الفجر : ۱۶)

ترجمہ : سواس پر اس کا رزق تنگ کر دیا۔

(آیت) "فظن ان لن نقدر علیه"۔ (الانبیاء : ۸۷)

ترجمہ : یونس نے گمان کیا کہ ہم ان پر تنگی نہیں کریں گے۔

(۳) "قدر "قدرت ہی کے معنی میں ہے۔ لیکن اس شخص نے سوچ سمجھ کر یہ لفظ نہیں کہا اور اس نے جو یہ کہا اگر اللہ عذاب دینے پر قادر ہوا تو اس کو ایسا عذاب دے گا اس کلام سے اس کا یہ قصد اور ارادہ نہیں تھا کہ اس کو اللہ کی قدرت پر شک ہے۔ بلکہ اس نے خوف ' دہشت اور سخت گھبراہٹ کیفیت میں بغیر تدبر اور تفکر کے یہ الفاظ کہے۔ جیسے کوئی شخص غفلت اور نسیان سے کلمہ کفر کہہ دے تو اس کی تکفیر نہیں کی جاتی ' جیسے ایک شخص کو اپنی گم شدہ اونٹنی مل گئی تو اس نے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے شدت فرح اور خوشی کے جذبات سے بے قابو ہو کر کہا تھا تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں اسی طرح اس نے غلبہ خوف اور دہشت خوف اور دہشت کی وجہ سے سہوا یہ الفاظ کہے اور اس سے اس کی تکفیر نہیں ہوتی۔

(۴) عربوں کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ وہ یقینی امر کو شک کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے :

(آیت) "قل من یرزقکم من السموت والارض قل اللہ وانا او ایاکم لعلی ھدی او فی ضلال مبین"۔ (سبا : ۲۴)

ترجمہ : آپ کہئے تمہیں آسمانوں اور زمینوں سے رزق کون دیتا ہے ؟۔آپ کہئے اللہ ! اور بیشک ہم یا تم ہدایت پر ہیں یا کھلی گمراہی میں۔

اسی طرح اس شخص کو اللہ کی قدرت پر یقین تھا لیکن اس امر کو شک کی صورت میں بیان کیا۔

(۵) وہ شخص اللہ تعالیٰ کی صفات سے جاہل تھا اور جو شخص اللہ کی کسی صفت سے جاہل ہو اس کی تکفیر متفق علیہ نہیں ہے۔ امام ابن جریر طبری اس کی تکفیر کرتے ہیں ' دیگر ائمہ نے کہا کہ اللہ کی صفت سے جہل کفر نہیں ہے 'اس کی صفت کا انکار کفر ہے۔ امام ابوالحسن اشعری نے بھی اسی قول کی طرف رجوع کیا ہے۔

(٦) وہ شخص زمانہ فترت میں تھا اور اس کے لیے صرف توحید کو ماننا کافی تھا 'اور صحیح مذہب یہ ہے کہ شریعت نازل ہونے سے پہلے کوئی شخص کسی حکم کا مکلّف نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا "۔ (الاسراء : ۱۵)

ترجمہ : ہم اس وقت تک عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک رسول نہ بھیج دیں۔

(۷) اس شخص نے خود کو حقیر اور مستحق عذاب قرار دینے کے لیے اور اللہ کی رحمت پر امید رکھتے ہوئے یہ کہا تھا 'اس کو اللہ کی قدرت پر شک نہیں تھا۔

حضرت حذیفہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ تم سے پہلی امتوں کے ایک شخص کی روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی سے فرشتوں کی ملاقات ہوئی۔ فرشتوں نے پوچھا تم نے کوئی نیکی کی ہے ؟اس نے کہا نہیں ! فرشتوں نے کہا یاد کرو۔ اس نے کہا میں لوگوں کو قرض دیتا تھا اور میں نے اپنے نوکروں کو حکم دیا تھا کہ جو تنگ دست ہو اس کو مہلت دینا اور خوش حال پر سختی نہ کرنا۔ اللہ عزوجل نے فرمایا اس سے در گزر کرو۔ حضرت حذیفہ کی ایک اور روایت میں ہے 'اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس چیز کا میں تم سے زیادہ حقدار ہوں

میرے بندے سے در گزر کرو۔ (صحیح مسلم 'المساقاہ '۲۶ '(۱۵۶۰) ۳۹۱۷ 'صحیح البخاری 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۲۰۷۷ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۲۴۲۰)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : ایک شخص راستہ میں چل رہا تھا۔ اس نے راستہ میں کانٹوں کی ایک ٹہنی دیکھی 'اس نے اس کو راستہ سے ایک طرف کردیا 'اللہ نے اس کے اس فعل کو مشکور کیا اور اس کو بخش دیا۔ امام مسلم کی دوسری روایت میں ہے اس شخص نے کہا بخدا میں اس شاخ کو مسلمانوں کے راستہ سے ہٹاؤں گا 'تاکہ ان کو ایذاء نہ پہنچے۔ تو وہ شخص جنت میں داخل کردیا گیا۔ (صحیح مسلم 'البر والصلہ '۱۲۸ '۱۲۷ '(۱۹۱۴) ۶۵۴۷ '۶۵۴۶ 'صحیح البخاری 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۲۴۷ 'سنن ترمذی 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۱۹۶۵ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۳۶۸۴ 'صحیح ابن حبان 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۵۳۶ 'مسند الحمیدی 'رقم الحدیث : ۱۱۳۴ 'الموطاء 'رقم الحدیث : ۲۹۵ 'مسند احمد 'ج ۲ 'ص ۵۲۱ 'طبع قدیم)

راستہ سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا ایمان کی گھاٹیوں میں سے ہے 'خواہ وہ کانٹوں کی ٹہنی ہو 'شیشہ کا ٹکڑا ہو 'کیلے یا آم کا چھلکا ہو 'کوئی گندی چیز ہو یا مردار ہو۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : ایک شخص راستہ میں جارہا تھا اس کو بہت سخت پیاس لگی 'اس نے ایک کنواں دیکھا 'اس میں اتر کر پانی پیا۔ پھر وہ باہر آیا تو اس نے دیکھا ایک کتا پیاس کی شدت سے کیچڑ چاٹ رہا تھا۔ اس شخص نے کہا اس کتے کو بھی اتنی ہی پیاس لگی ہوئی ہے جتنی مجھے لگی تھی 'وہ کنوئیں میں اترا اور اس نے اپنے موزہ میں پانی بھرا 'پھر موزہ کے منہ کو بندہ کرکے کنوئیں سے باہر آیا اور کتے کو پانی پلایا۔ اللہ نے اس کے اس فعل کو مشکور کیا اور اس کو بخش دیا۔ صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا جانوروں کے ساتھ نیکی کرنے سے بھی ہمیں اجر ملے گا ؟ آپ نے فرمایا ہر زندہ جگر میں اجر ہے۔ (صحیح مسلم 'سلام '۱۵۳ '(۲۲۴۴) ۵۷۵۱ 'صحیح البخاری 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۲۳۶۳ 'سنن ابوداؤد 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۲۵۵۰)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : ایک زانیہ عورت نے ایک سخت گرم دن میں ایک کتے کو کنوئیں کے گرد چکر لگاتے ہوئے دیکھا جس نے پیاس کی وجہ سے زبان باہر نکالی ہوئی تھی 'اس عورت نے اپنے موزہ میں اس کے لیے پانی بھرا 'تو اس عورت کو بخش دیا گیا۔ (صحیح مسلم 'سلام '۱۵۴ '(۲۲۴۵) ۵۷۵۲)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک بلی کی وجہ سے ایک عورت دوزخ میں داخل ہوگئی 'اس نے اس بلی کو باندھ کر رکھا 'اس کو خود کھلایا نہ اس کو آزاد کیا 'تاکہ وہ زمین سے کچھ اٹھا کر کھالیتی۔ حتی کہ وہ بھوک سے مرگئی۔ (صحیح مسلم 'التوبہ '۲۶ '(۲۷۵۶) ۶۸۵۰ 'صحیح البخاری 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۲۳۶۵ 'سنن النسائی 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۱۴۸۱ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۴۲۵۶ 'سنن دارمی 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۲۸۱۴ 'سنن کبری للبیہقی ج ۸ 'ص ۱۴ 'مسند احمد 'ج ۲ 'ص ۲۶۱ '۲۶۱ '۱۸۱ '۱۵۹ 'طبع قدیم)

آثار رحمت کی احادیث ذکر کرنے کے بعد ہم نے آخر میں آثار غضب کی بھی ایک حدیث درج کردی ہے 'تاکہ کوئی شخص صرف رحمت پر نظر کرتے ہوئے گناہوں پر بےباک نہ ہوجائے 'کیونکہ اگر وہ ایک کتے کو پانی پلانے پر عمر بھر کے گناہ معاف کرکے جنت عطا فرماتا ہے تو ایک بلی کو بھوکا رکھ کر مار دینے پر غضب میں آکر دوزخ میں بھی ڈال دیتا ہے۔ اس لیے اس کی دونوں صفتوں پر نظر رہے اور ایمان 'عذاب کے خوف اور ثواب کی امید کی درمیانی کیفیت ہے۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی القرآن)

پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! کفار کو بتا دیجئے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور وہی ہر چیز کا مالک اور حاکم ہے، اور یہ اس کا محض فضل و کرم ہے کہ اس نے مخلوق پر رحم کرنا اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ایک مظہر یہ بھی کہ اس نے انسانوں کو ہدایت کے لیے انبیائے کرام (علیہم السلام) بھیجے۔ اگر انبیائے کرام (علیہم السلام) تشریف نہ لاتے تو انسان جانوروں کی طرح زندگی گزارتے۔ آج پوری دنیا میں جو بھی اچھے اصول موجود ہیں یہ کسی نہ کسی نبی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بتائے ہیں۔ اسی لیے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "دانائی کی ہر بات اہل ایمان کی گمشدہ چیز ہے۔ وہ جہاں بھی ہو اس کا حاصل کرنا اہل ایمان کا حق ہے۔" (ترمذی: ابواب العلم: باب 19) کیونکہ ابتداء میں ہر دانائی کی بات کسی نہ کسی نبی (علیہ السلام) کے ذریعے اہل ایمان کو دی گئی، بعد میں اگر وہ اسے ضائع کر بیٹھا ہے تو دراصل اس کا مالک تو اہل ایمان ہی ہے۔ نیز کفار کو مہلت دینا اور ان کو کوتاہیوں پر فوری گرفت نہ کرنا بھی اس کی رحمت کا مظاہرہ ہے تاکہ کفار کو سوچنے اور توبہ کرنے کا موقع مل سکے۔ الغرض جب تک یہ زمین و آسمان قائم ہیں اس وقت تک ان میں بسنے والی مخلوق پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا وسیع دامن سایہ فگن رہتا ہے۔ سورج، بارش، ہوا وغیرہ کی صورت میں اس کی رحمت ہر ایک کے لیے عام ہے۔ کوئی اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے یا نہ لائے سب اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت سے استفادہ کر رہے ہیں، مگر جب یہ زمین و آسمان فنا ہو جائیں گے اور قیامت کا دن قائم ہوگا، اس میں سارے لوگ جمع کئے جائیں گے۔ وہ جزا و سزا کا دن ہوگا، وہاں صرف وہی لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مستحق ہوں گے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا احساس کیا اور اس پر ایمان لائے اور جن لوگوں نے جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ناقدری کی تو انھوں نے کفر اختیار کرکے اپنے آپ کو نقصان میں ڈال دیا، لہٰذا وہ اپنی ہٹ دھرمی اور حق ناشناسی کی وجہ سے ہمیشہ عذاب جہنم میں مبتلا رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کے متعلق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا

1۔ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو اپنی اس کتاب میں لکھ دیا جو اس کے پاس عرش کے اوپر تھی کہ بیشک میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ (بخاری: بدء الخلق: باب 1)

2۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سو حصے ہیں۔ ان میں سے ننانوے 99 حصے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھ لیے جن کے ذریعہ وہ قیامت کے دن اپنے بندوں پر رحم کرے گا اور صرف ایک حصہ دنیا کے انسانوں، حیوانوں اور پرندوں میں تقسیم کیا۔ اسی سے والدین اپنی اولاد پر اور جانور اپنے بچوں پر رحم کرتے ہیں۔ (مسلم: کتاب التوبۃ: باب 4)

3۔ ایک شخص سفر کر رہا تھا، اس کو پیاس لگی، وہ ایک کنویں میں اترا اور اس نے پانی پیا۔ جب وہ باہر آیا تو اس نے دیکھا کہ ایک کتا ہانپ رہا ہے اور پیاس کی شدت سے تر مٹی کو چاٹ رہا ہے۔ اس شخص نے خیال کیا کہ اس کتے کو بھی اتنی ہی پیاس لگی ہوئی ہے جتنی مجھے لگی تھی (لہٰذا وہ دوبارہ کنویں میں اترا)، اس نے اپنے موزہ میں پانی بھرا، پھر موزہ کو اپنے منہ سے پکڑ کر کنویں سے باہر آیا اور کتے کو پانی پلایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ عمل قبول فرمایا اور اس کو بخش دیا۔ صحابہ کرام نے پوچھا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! کیا جانوروں کے ساتھ نیکی کرنے سے بھی ہمیں اجر ملے گا؟ آپ نے فرمایا: ہر تر جگر والی چیز (ہر جاندار پر رحم کرنے) میں ثواب ہے۔
(بخاری: کتاب الشرب: باب 9)

4۔ بنی اسرائیل سے ایک بدکار عورت نے ایک گرم دن میں ایک کتے کو کنویں کے گرد چکر لگاتے ہوئے دیکھا جس نے پیاس کی وجہ سے زبان باہر نکالی ہوئی تھی۔ اس عورت نے اپنے موزہ میں پانی بھر کر اس کتے کو پلایا تو اس نیک کام کی وجہ سے اس عورت کو بخش دیا گیا۔
(مسلم: کتاب السلام: باب 41)

5۔ حضرت عبداللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں: ہم ایک سفر میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ تھے، آپ رفع حاجت کے لیے تشریف لے گئے۔ بعد میں ہم نے ایک چھوٹی سی چڑیا کے دو بچے پکڑ لئے۔ چڑیا ہمارے سروں پر منڈلانے لگی۔ جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لائے تو فرمایا: تم میں سے کس نے اس کے بچے پکڑ کر اس کو ستایا ہے اس کے بچے اس کو واپس کر دو۔
(ابوداؤد: حدیث نمبر 2675: کتاب الجہاد: باب 122)

6۔ 8ھ میں جب اہل مکہ نے صلح نامہ حدیبیہ کو توڑ دیا تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ پر حملہ کرنے کے لیے دس ہزار کا لشکر لے کر مدینہ سے روانہ ہوئے، راستہ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک کتیا دیکھی جس نے ابھی ابھی چند بچے جنے تھے اور وہ اپنی ماں کا دودھ پی رہے تھے۔ اس خیال سے کہ فوج کا کوئی سپاہی انھیں اذیت نہ پہنچائے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے ایک صحابی جمیل بن سراقہ (رض) کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ اس کتیا اور اس کے بچوں کی حفاظت کے لیے اس کے پاس کھڑا رہے تاکہ لشکر اسلام کا کوئی مجاہد اس کتیا اور اس کے بچوں کو اذیت نہ پہنچائے۔ (سبل الھدیٰ والرشاد: جلد 5: ص 322) اندازہ کریں جو مذہب ایک کتیا کی تکلیف برداشت نہیں کرسکتا وہ انسانوں کے خلاف دہشت گردی کیسے برداشت کرسکتا ہے۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اس تعلیم اور تربیت کا اثر تھا کہ فاتح مصر حضرت عمرو بن عاص (رض) نے جب قاہرہ سے اسکندریہ جانے کا فیصلہ کیا تو آپ نے فوج کو اپنا خیمہ (فسطاط) اکھاڑنے کا حکم دیا مگر جب آپ نے دیکھا کہ آپ کے خیمے کے اوپر والے حصہ میں ایک کبوتری نے انڈے دے دیئے ہیں تو آپ نے کہا: اس کبوتری نے ہمارے پڑوس میں پناہ لی ہے، لہٰذا جب تک اس کے بچے بڑے ہو کر اڑ نہ جائیں اس وقت تک اس خیمہ کو نہ اکھاڑا جائے۔ بعد میں اس جگہ شہر آباد ہوگیا اور اس کا نام اس خیمہ کی وجہ سے فسطاط رکھا گیا۔
(المنتظم فی تواریخ الملوک والامم لابن جوزی: جلد ثالث: ص 194)

7۔ ایک عورت کو ایک بلی کی وجہ سے عذاب دیا گیا اور اس کو جہنم میں داخل کرنے کا فیصلہ دیا گیا کیونکہ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا اور وہ بلی بھوک سے مر گئی۔ (بخاری: کتاب الشرب: باب 9) جو مذہب ایک بلی کا قتل برداشت نہیں کرسکتا وہ انسان کا قتل کیسے برداشت کرسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ بہت ہی مہربان ہے۔ بعض دفعہ اہل ایمان کی معمولی سی نیکی اور اللہ تعالیٰ اس قدر مہربان ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی بھر کی کوتاہیوں کو معاف کر دیتا ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جائے تو انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اس کا قہر وغضب حرکت میں آجاتا ہے۔ اسی لیے رحمت کی احادیث کے آخر میں غضب کی ایک حدیث بھی لکھ دی ہے تاکہ کوئی شخص صرف رحمت پر نظر رکھتے ہوئے گناہوں پر بے باک نہ ہو جائے۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ الکرم)

دنیوی اور اخروی رحمت کا ظہور

اللہ کی دنیوی رحمت دنیوی نعمتوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے (جیسے جسمانی صحت و حسن 'مال و دولت کی کثرت اولاد کی فراوانی عیش و راحت ' حکومت و عزت۔ اس میں مسلم و کافر سب شریک ہیں) اور رحمت اخروی سے نعمتِ آخرت وابستہ ہے جیسے پیغمبروں کی بعثت آسمانی کتابوں کا نزول (باطنی و ظاہری انفسی و آفاقی) دلائل توحید کا قیام اور موت اور مرنے کے بعد دوبارہ زندگی جس کے نتیجہ میں جنت اور اللہ کا دیدار حاصل ہوگا۔ یہ سب آخرت سے تعلق رکھنے والی رحمت ہے (جو مسلمانوں کے لیے مخصوص ہے) اور یہی اصل مقصود ہے احادیث مندرجہ بالا اسی پر دلالت کر رہی ہے اور آئندہ آیت بھی یہی بتا رہی ہے۔

کافروں کی محرومی کا سبب

حضرت ابوامامہ (رض) کی روایت کردہ حدیث بھی اس امر پر دلالت کر رہی ہے کہ اللہ کی رحمت عام ہے اور کافروں کی محرومی کا سبب ان کا خسران ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا تم میں سے ہر ایک جنت میں جائے گا۔ سوائے اس شخص کے جو اللہ سے ایسا بھاگے جیسے وحشی اونٹ اپنے گھر والوں سے بھاگتا ہے۔ (رواہ الطبرانی والحاکم بسند صحیح) (تفسیر گلدستہ)

آیت مبارکہ :

وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○13

لغۃ القرآن : [وَلَهٗ : اور اسی کا][مَا سَكَنَ : جو سکون کرتا][فِي : میں][الَّيْلِ : رات][وَالنَّهَارِ: اور دن][وَهُوَ : اور وہ][السَّمِيْعُ : خوب سننے والا][الْعَلِيْمُ : جاننے والا]

ترجمہ : اور وہ (ساری مخلوق) جو رات میں اور دن میں آرام کرتی ہے، اسی کی ہے، اور وہ خوب سننے والا جاننے والا ہے

تشریح:

زمین اور آسمان ظرف مکان ہیں اور رات اور دن ظرف زمان۔ پہلے بتایا کہ بلندی اور پستی میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اب بتایا کہ زمانے کے پیمانے میں جو کچھ ہے وہ بھی اسی کی ملکیت ہے۔ تو جب سب زمانیات اور مکانیات اسی کی پیدا کردہ ہیں اور اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں تو پھر ان میں سے کوئی انسان، کوئی پتھر یا کوئی اور چیز کیونکر معبود بن سکتی ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ القرآن)

امام قرطبیؒ کے بقول یہ آیت کب نازل ہوئی جب کفار مکہ نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا ہم جانتے ہیں آپ نے یہ تحریک مالی مفاد کے لیے شروع کی ہے۔ آپ کو جس قدر مال چاہیے ہم جمع کر دیتے ہیں مگر آپ یہ تبلیغ بند کر دیں۔ آپ ﷺ نے ان کی یہ پیشکش پائے حقارت سے ٹھکرا دی۔ تب یہ آیت مبارکہ اتری: وَلَہٗ مَا سَکَنَ فِی الَّیْلِ وَالنَّہَارِ۔ یعنی ہر وہ چیز جو سلسلہ شب و روز کے تحت ہے وہ اللہ ہی کے لیے ہے لہٰذا اللہ کے رسول کو اللہ کے سوا کسی سے کچھ لینے کی ضرورت ہی نہیں۔ (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب القرآن)

کچھ مفسرین کے خیال کے مطابق یہ اسی پیشکش کا جواب ہے کہ تم لوگ توحید باری تعالیٰ کے بدلے میں جو پیشکشیں کرتے ہو۔ ذرا سوچو تو سہی یہ زمین و آسمان، رات اور دن ان میں رہنے اور بسنے والی ہر چیز کس کی ملکیت ہے؟ اس میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے تسلی ہے کہ جس طرح رات کے بعد دن کا آنا یقینی ہے ایسے ہی مشکلات کے بعد آسانیوں اور کامیابیوں کا حاصل ہونا بھی یقینی ہے۔ جیسے رات کی تاریکی اور دن کی روشنی لازم و ملزوم ہیں ایسے ہی حق و باطل کی کشمکش بھی لازم و ملزوم ہے لہٰذا آپ حوصلہ پست کرنے کے بجائے اپنا کام جاری رکھیں۔ جس اللہ نے آپ کو اپنا پیغام رساں بنایا ہے۔ وہ اللہ آپ کے اخلاص اور آپ کی محنت شاقہ جاننے کے ساتھ آپ کے مخالفوں کی ہر بات کو سننے والا اور ہر حرکت کو جاننے والا ہے۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیل القرآن)

اللہ تعالیٰ کی حکومت ہر جگہ اور ہر وقت ہے

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں مکان کی تعمیم تھی **وَلَہٗ مَا سَکَنَ فِی الَّیْلِ وَالنَّہَارِ** میں زمانہ کے اعتبار سے تعمیم ہے یعنی ہر جگہ اور ہر وقت اسی کی حکومت اور قبضہ و اقتدار ہے۔ ہر وہ چیز جو رات میں یا دن میں آرام سے زندگی بسر کرتی اور کتنے معلوم و نامعلوم دشمنوں سے مامون و محفوظ رہتی ہے۔ یہ اسی کی رحمت کاملہ کے آثار میں سے ہے **قُلْ مَنْ یَّکْلَؤُکُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّہَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ** وہی ہے جو دن کے شور و غل اور رات کے اندھیرے اور سناٹے میں ہر ایک کی پکار سنتا ہے اور سب کی حوائج و ضروریات کو بخوبی جانتا ہے۔ پھر تم ہی بتاؤ کہ ایسے پروردگار کو چھوڑ کر کسی اور سے مدد طلب کرنا کہاں تک موزوں ہوگا۔

یا لفظ سکن سکون سے ماخوذ ہے مراد یہ ہے کہ اللہ ہی کا ہے جو دن رات کے چکر میں ساکن رہتا ہے یا حرکت کرتا ہے متحرک کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ متحرک کی ضد یعنی ساکن کا ذکر کر دیا (ایک ضد کے ذکر پر اکتفا کر لیا جاتا ہے مگر مراد دونوں ہوتے ہیں) جیسے **سرابیل تقیکم الحر** یعنی کرتے جو تم کو گرمی سردی سے محفوظ رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہی کھلاتے پلاتے ہیں

کھلانا اشارہ ہے سامان بقاء کی طرف یعنی ایجاد و بقاء دونوں میں اسی کے سب محتاج ہیں۔ اس کو کسی ادنی سے ادنی چیز میں بھی ہماری احتیاج نہیں پھر اس سے علیحدہ ہو کر کسی کو مددگار بنانا انتہائی حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ اہل قبا کے ایک انصاری نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت کی۔ ہم سب بھی گئے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب کھانے سے فارغ ہو چکے تو فرمایا کہ خدا کا شکر جو کھلاتا ہے اور خود کچھ نہیں کھاتا، ہم پر احسان فرماتا ہے ہمیں کھانا کھلایا پانی پلایا، ہمارے برہنہ جسم پر لباس پہنایا، ہم خدا کو نہیں چھوڑ سکتے، کفران نعمت نہیں کر سکتے نہ اس سے بے نیاز بن سکتے ہیں، اس نے گمراہی سے بچایا۔ دل کے اندھے پن سے دور رکھا، ساری مخلوقات پر ہمیں فضیلت عطا فرمائی۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے خطاب ہے اور حکم دوسروں کو ہے

ایسے پروردگار کے احکام کے سامنے جس کی صفات اوپر مذکور ہوئیں پہلے اس اکمل ترین بندہ کو انتہائی انقیاد و تسلیم کا حکم ہے جو تمام دنیا کے لیے نمونہ طاعت و عبودیت بنا کر بھیجا گیا تھا۔ ((صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم))

ولا تکونن من المشرکین: یہ آپ پر رکھ کر اوروں کو سنایا گیا ہے یعنی بفرض محال اگر خدا کے معصوم و برگزیدہ ترین بندے سے بھی کسی طرح کا عصیان سرزد ہو تو عذاب الٰہی کا اندیشہ ہوتا ہے پھر کسی دوسرے کو کب لائق ہے کہ باوجود شرک و کفر اور تکذیب انبیاء وغیرہ ہزاروں طرح کے جرائم میں مبتلاء ہونے کے عذاب الٰہی سے بے فکر اور مامون ہو کر بیٹھ رہیں۔ (تفسیر گلدستہ)

حدیث میں اس کی تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ وہ اس چیونٹی کے پاؤں کی آواز بھی سنتا ہے جو کسی گڑھے میں نہایت ہی چکنے پتھر پر ہولے ہولے رینگ رہی ہو اور اس کے علم کا یہ حال ہے کہ اسے سمندروں کے سارے پانی کی ناپ، تمام پہاڑوں کے پتھروں کا وزن، بارش کے قطروں کا شمار اور درختوں کے پتوں کی گنتی سب کچھ پورے طور پر معلوم ہے۔ یہ سب بتا کر رسول اللہ ﷺ کو ارشاد ہے کہ ان سے پوچھو تو کہ کیا میں ایسے مالک کل سب کی سننے اور سب کے جاننے والے کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا مددگار بنا سکتا ہوں۔ جس نے آسمانوں کو اور زمین کو بنایا اور جو سب کو کھانا یعنی زندگی کی ضرورت کی چیزیں دیتا ہے اور خود کسی چیز کا محتاج نہیں اور نہ کوئی اسے کچھ دیتا ہے اور نہ دے سکتا ہے۔

اللہ کی اطاعت

اللہ زمین و آسمان اور ہر چیز کا مالک اور خبر گیری کرنے والا ہے۔ ہر چیز اس کی محتاج ہے وہی سب کی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ اس نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ سب پر رحمت کرے اور جو کوئی کچھ مانگے اس کو اس کی استعداد کے مطابق دے۔ حقیقت میں ہر چیز ہر جگہ اور ہر لمحے اپنی استعداد اور قابلیت اس کے سامنے پیش کرتی رہتی ہے اور وہ ہر ایک کی اس خفیہ التجا کو سنتا ہے اور جانتا ہے کہ کون کس چیز کا مستحق ہے۔

یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہر چیز ہر لمحے دعا میں مصروف مگر یہ دعا زبانی نہیں بلکہ حالی ہے یعنی ہر لحہ اس کا حال ایک نئی چیز طلب کرتا ہے۔ بعض دفعہ خود چیز اپنی حالت کو نہیں جانتی لیکن اللہ جانتا ہے کہ اس وقت اس کی حالت کیا چیز طلب کر رہی ہے۔ زبان حال کی یہ دعا ہر لحہ مقبول ہے لیکن زبان سے دعا کرنے والا چونکہ اپنی حالت کو خود پوری طرح نہیں سمجھتا۔ اس لیے بعض وقت وہ ایسی چیز مانگ بیٹھتا ہے جو اس کی حالت تقاضا نہیں کرتی یہی وجہ ہے کہ بہت دفعہ زبانی دعا مقبول نہیں ہوتی۔ اسی لیے اللہ کو سمیع و علیم کہا گیا کیا ایسے اللہ کو چھوڑ کر کہ جو سب کی حاجتیں پوری کرتا ہے اور خود کوئی حاجت نہیں رکھتا۔ کسی اور کو مددگار سمجھا جا سکتا ہے۔ اس آیت میں ارشاد ہے کہ میری تو عقل بھی یہی کہہ رہی ہے اور اللہ کا بھی یہی حکم ہے کہ ہر چیز کو اسی کے سامنے جھکنا چاہیے چنانچہ اس کے حکم کے مطابق سب سے پہلے میں اس کے آگے جھکتا ہوں۔ اللہ نے مجھ سے کہہ دیا ہے کہ تو سب چیزوں کو چھوڑ کر اللہ کے سامنے جھک اور کبھی اس کا شریک کسی کو نہ مان تاکہ تجھے دیکھ کر اور لوگ بھی جھکنے لگیں۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کرتا ہوں تو ضرور مجھے ایک ہول ناک دن کا سخت عذاب آ پکڑے گا۔ مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔ (درس آسٹریلیا)

آیت مبارکہ :

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۗ قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○14

لغۃ القرآن: [قُلْ : فرما دیجیے][اَغَيْرَ اللّٰهِ : کیا علاوہ اللہ][اَتَّخِذُ : میں بناؤں][وَلِيًّا : ولی (دوست)][فَاطِرِ : پیدا کرنے والا][السَّمٰوٰتِ : آسمانوں][وَالْاَرْضِ : اور زمین][وَهُوَ يُطْعِمُ : اور وہ کھلاتا ہے][وَلَا يُطْعَمُ: اور نہیں اس کو کھلایا جاتا][قُلْ : فرما دیجیے][اِنِّیْٓ: بیشک میں][اُمِرْتُ : حکم دیا گیا][اَنْ : یہ کہ][اَكُوْنَ : میں ہوجاؤں][اَوَّلَ : پہلا][مَنْ اَسْلَمَ : جو اسلام لایا][وَلَا تَكُوْنَنَّ : اور نہ آپ ہوجائیں][مِنَ : سے][الْمُشْرِكِيْنَ : شرک کرنے والے]

ترجمہ : فرما دیجئے : کیا میں کسی دوسرے کو (عبادت کے لیے اپنا) دوست بنالوں (اس) اللہ کے سوا جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ (سب کو) کھلاتا ہے اور (خود اسے) کھلایا نہیں جاتا۔ فرمادیں : مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں (اس کے حضور) سب سے پہلا (سر جھکانے والا) مسلمان ہو جاؤں اور (یہ بھی فرمادیا گیا ہے کہ) تم مشرکوں میں سے ہرگز نہ ہو جانا

تشریح:

کفار نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اسلام سے دست بردار ہونے کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کیا۔ دنیاوی لالچ دیا، سوشل بائیکاٹ کیا اور شہید کرنے کی سازشیں کیں مگر آپ نے واضح اعلان کر دیا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی اور کی عبادت کروں۔ کیونکہ زمین و آسمان کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ ساری دنیا کو رزق دیتا ہے اور خود کھانے سے پاک اور بے نیاز ہے۔ جس کی یہ شان ہو وہی اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔ نہ کوئی اور عبادت کے لائق ہے اور نہ ہی میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی عبادت کروں گا۔

دراصل کفار حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ ہیں نادار اور تنگ دست۔ مال و دولت جمع کرنے کے لیے آپ نے نبوت کا سلسلہ چلا رکھا ہے جس سے ہر گھر میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔ اس لیے آپ جتنی دولت مانگیں ہم آپ کے قدموں میں ڈھیر کرنے کے لیے تیار ہیں۔ آپ اپنے نئے دین کی تبلیغ بند کر دیجئے۔ اور جس طرح ہمارے اسلاف ان بتوں کی پوجا کرتے چلے آئے ہیں آپ بھی انھیں کی پرستش کیا کریں تو یہ آیت نازل ہوئی۔ لغت عرب میں "ولی" کے بیشمار معنی ہیں۔ یہاں اس سے مراد معبود ہے۔ **والمراد بالولی المعبود** (بیضاوی) ولی سے مراد یہاں معبود ہے۔ جس کی عبادت کی جائے۔ **والمراد بالولی المعبود لانہ ردلمن دعاہ** (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی المعانی)

یعنی معبود تو وہ ہو سکتا ہے جو کسی کا محتاج نہ ہو اور ہر چیز اس کی محتاج ہو۔ تمہارے یہ بنائے ہوئے معبود اور خدا تو سراپا احتیاج ہی احتیاج ہیں۔ ہاں میرا معبود جو زمین و آسمان کا خالق ہے وہی وہ معبود برحق ہے جو ہر محتاج کی حاجت روائی فرماتا ہے ہر چیز کو رزق پہنچاتا ہے۔ اور خود کسی چیز کا محتاج نہیں۔ نہ کھانے کا نہ پینے کا۔ نہ کسی اور چیز کا۔ اب تم خود انصاف کرو کہ معبود حقیقی کون ہے ؟

اے کفار ! تم مجھے کیا لالچ دینے آئے ہو۔ مجھے تو اپنے رب کا یہ حکم ہے کہ میں سب سے پہلے اس کی الوہیت، اس کی کبریائی اور اس عظمت و جلال کے سامنے سرِ تسلیم خم کروں اور شرک کی آلودگیوں سے اپنا دامن بچانے کی مجھے تاکید کی گئی ہے۔ اس لیے میں اپنے رب کے حکم سے سر تابی کرکے کیونکر تمہارے کہنے سے ان باطل خداؤں کی پرستش شروع کر سکتا ہوں۔

جس دین کی دعوت دینے کے لیے حضور مبعوث ہوئے تھے اس کو سب سے پہلے قبول کرنے والے بھی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی تھے۔ اس لیے فرمایا کہ تمام امت سے پہلے مجھے اپنے رب کی وحدانیت اور الوہیت پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہاں صاحب روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی المعانی کا ایک روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی پرور اور ایمان افروز اقتباس بمعنی ترجمہ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں :۔

فاول روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی رکضت فی میدان الخضوی والنقیادوالمحبۃ روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی نبینا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وقد اسلم نفسہ لمولاہ بلاواسطۃ وکل اخوانہ الانبیاء علیہم

الصلوۃ والسلام فی عالم الارواح انما اسلموا انفوسھم بواسطتہ (علیہ الصلوۃ والسلام) فھو (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) المرسل الی الانبیاء والمرسلین (علیہ السلام) فی عالم الارواح وکلھم امتہ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی المعانی)

ترجمہ :۔ عاجزی، فرمان برداری اور محبت کے میدان میں سب سے پہلے جو روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی سجدہ ریز ہوئی وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی مبارک تھی۔ اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بلاواسطہ اپنے مولائے کریم کے سامنے سر عبودیت جھکایا۔ اور تمام نبیوں اور رسولوں نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے واسطہ سے۔ پس حضور کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام انبیاء ورسل کے بھی رسول ہیں اور سب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے امتی ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ القرآن)

اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم دیا کہ آپ سب سے پہلے ایمان لائیں، اس لیے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سب سے پہلے مسلمان ہیں۔ اس کی تفسیر یہ ہے کہ آپ اپنی امت میں سب سے پہلے مسلمان ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کیونکہ ہر نبی اپنی امت میں سب سے پہلا مسلمان ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ نبی کے واسطہ سے بعد میں مسلمان بنتے ہیں۔ اس کی دوسری تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سب مخلوق سے پہلے مسلمان ہیں۔ (البحر المحیط) اس تفسیر کی تائید میں درج ذیل احادیث ملاحظہ کریں جن میں

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا

1۔ میں خلق کے اعتبار سے تمام نبیوں میں اول ہوں اور بعثت کے اعتبار سے سب نبیوں کے آخر میں ہوں۔ (کنزالعمال : جلد 11 : حدیث نمبر 32126)

2۔ میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی اور جسم کے درمیان تھے۔

(ترمذی : ابواب المناقب : باب 1، کنزالعمال : جلد 11 : حدیث نمبر 31917)

3۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرے نور کو پیدا فرمایا۔

(تفسیر روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی المعانی : سورت انعام : زیر آیت 163)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نور سب سے پہلے پیدا کیا گیا اور آپ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے حتیٰ کو جبرائیل ومیکائیل ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے تھے جب حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی مبارک اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز تھی۔ اس نکتہ کو علامہ آلوسی نے بڑے حسین انداز میں بیان فرمایا ہے :

" عاجزی، فرمان برداری اور محبت کے میدان میں سب سے پہلے جو روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی سجدہ ریز ہوئی وہ ہمارے پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی تھی اور حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بلاواسطہ اپنے مولائے کریم پر ایمان لائے اور تمام انبیائے کرام (علیہم السلام) حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے واسطے سے ایمان لائے، پس حضور اکرم (صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم) عالم ارواح میں تمام انبیاء ورسل کے رسول ہیں اور وہ سب حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے امتی ہیں۔" (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ الکرم)
(تفسیر روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی المعانی : سورۃ انعام : زیر آیت 35)

آیت مبارکہ :

قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝15

لغۃ القرآن : [قُلْ : فرما دیجیے][اِنِّيْٓ : بیشک میں][اَخَافُ : ڈرتا ہوں][اِنْ عَصَيْتُ : اگر میں نافرمانی کروں][رَبِّيْ : میرا رب][عَذَابَ : عذاب][يَوْمٍ : دن][عَظِيْمٍ : بہت بڑا]

ترجمہ : فرمادیجئے کہ بیشک میں (تو) بڑے عذاب کے دن سے ڈرتا ہوں، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں (سو یہ کیسے ممکن ہے؟)

تشریح :

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) گناہوں سے معصوم ہیں اس لیے آپ سے نافرمانی کا صادر ہونا ممکن نہیں اور نہ ہی قیامت کے دن آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عذاب ہوگا بلکہ آپ کی شفاعت سے بیشمار گنہگاروں کا عذاب دور ہوگا، لیکن اس آیت میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ذکر کرکے مسلمانوں کو یہ بتانا مقصود ہے کہ میں انبیائے کرام (علیہم السلام) کا سردار ہونے کے باوجود اگر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی کروں تو عذاب الٰہی کا خطرہ ہے، تو عام مسلمانوں کا کیا حال ہوگا؟ لہٰذا کسی مسلمان کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جرات نہیں کرنی چاہیے ورنہ اللہ تعالیٰ کا عذاب بہت سخت ہے۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ الکرم)
حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے احکام کے بارے میں جس قدر حساس تھے یہ اس کی بہترین تصویر کشی ہے۔ نظر آتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عذاب الہی سے بہت ہی ڈرتے تھے۔ اللہ کا عذاب اس قدر خوفناک ہوتا ہے کہ اگر وہ کسی سے ٹل جائے تو اس کا محض ٹلنا ہی فوز عظیم تصور ہوتا ہے۔ اس تصویری احساس کے علاوہ اس میں اہل شرک کے لیے دلوں کو ہلا دینے والی ایک تنبیہ بھی ہے۔ اس دور کے مشرکین کے لیے بھی اور بعد کے ادوار کے مشرکین کے لیے بھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا عذاب کس قدر ہولناک ہوگا۔ یہ عذاب اپنے شکار کو بسہولت تلاش کرلے گا۔ اسے گھیر لے گا اور اس کو جھپٹ کر اپنے قبضے میں لے لے گا۔ صرف قادر مطلق ہی اسے بچا

سکتا ہے۔ چونکہ عذاب الہی کی باگیں اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہیں ' اسے صرف وہی پھیر سکتا ہے۔ انسان جب اس تصویر کشی پر غور کرتا ہے تو اس کی سانس رکنے لگتی ہے۔ یہ آخری گھڑی کس قدر ہوش ربا ہے۔ (فی ظلال القرآن)

عقیدہ توحید کو ایک جامع اور کامل شکل دی جارہی ہے۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ بار بار اس کا واسطہ ذات رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بنایا جارہا ہے حالانکہ اللہ کے یہاں ان کا جو مقام و مرتبہ ہے 'اس کی گہرائی اور گیرائی کو سمجھنا بندوں کے لیے تو ویسے ہی ممکن نہیں۔ پوری کائنات ان کے پاؤں کی دھول کے بھی برابر نہیں ہو سکتی۔ بایں ہمہ ! بار بار انہی کو خطاب کیا جارہا ہے اور انہی سے ان باتوں کا اظہار کرایا جارہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاید ہمیں یہ سمجھانا مقصود ہے کہ تم توحید کی عظمتوں کو دل میں اتارنے کی کوشش کرو اور شرک کی شناعت کو پوری طرح سمجھنے اور اس کی گندگی سے بچنے کا پوری طرح اپنے اندر عزم پیدا کرو کیونکہ اگر اس میں ذرا بھی کمزوری قابل برداشت ہوتی تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ان باتوں کا اظہار نہ کرایا جاتا۔ وہی ایک ذات والا صفات ایسی ہو سکتی ہے 'جنھیں شاید شریعت کی پابندیوں سے استثناء مل سکتا۔ لیکن اگر وہ بھی اللہ کی نافرمانی یا توحید میں کسی کمی بیشی کی صورت میں 'اللہ کے عذاب سے خوفزدہ ہیں تو پھر اور کون ہے 'جو اس سے مستثنیٰ ہو سکتا ہے ؟

ہمارے بزرگان دین میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (رح) بڑے عظیم مقام و مرتبہ کے مالک ہیں۔ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ وہ جوانی میں کسی جنگل سے گزر رہے تھے کہ اچانک ان کے سامنے ایک روشنی نمودار ہوئی۔ سر اٹھا کے دیکھا تو ایک شہزادہ سا نظر آیا 'پھر آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ لیکن اس کی آواز آئی کہ عبدالقادر ! جانتے ہو میں کون ہوں ؟ میں تمہارا خدا ہوں۔ میں تمہیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے میری بہت عبادت کی 'میں تم سے بہت خوش ہوں 'چنانچہ اس خوشی میں میں تمہیں اپنی عبادت سے رخصت دے رہا ہوں 'آج کے بعد تم پر کوئی پابندی نہیں۔ شیخ کہتے ہیں کہ مجھے معاً خیال آیا کہ عبادت سے رخصت تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھی نہ ملی 'آپ شدید بیماری میں بھی نماز کی پابندی فرماتے رہے اور زندگی میں کوئی نماز کبھی آپ کی قضا نہ ہو سکی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جس کی پابندی سے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مستثنیٰ نہ ہوئے 'مجھے اس سے مستثنیٰ کیا جارہا ہے ؟ اللہ نے میری مدد فرمائی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ شیطان ہے 'جو مجھے ورغلانا چاہتا ہے۔ میں نے فوراً کہا لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ شیطان چیختا ہوا بھاگا۔ لیکن جاتے ہوئے اس نے پھر کمند پھینکی۔ کہنے لگا کہ عبدالقادر ! تمہیں تمہارے علم نے بچالیا 'ورنہ نجانے اب تک میں کتنے زاہدوں کو برباد کرچکا ہوں۔ حضرت شیخ کہتے ہیں کہ میں نے سوچا کہ یہ ظالم اب بھی باز نہیں آیا 'چنانچہ میں نے کہا کہ مجھے میرے علم نے نہیں بچایا بلکہ میرے اللہ نے مجھے بچایا ہے۔ ان آیات میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خطاب اور آپ کے واسطے سے ان توحیدی کلمات کو کہلوانا شاید اس کا یہ مطلب ہے کہ لوگ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ یہ وہ بنیادی عقیدہ ہے 'جس میں کسی کو بھی استثنیٰ حاصل نہیں۔ اس لیے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بڑھ کر تو دنیا میں کوئی ذات نہیں اور اگر آپ بھی اس کے پابند ہیں تو اور کوئی کس شمار قطار میں ہے۔

اسلام کا نظریہ توحید

اسلام نے مسلمانوں کو جس عقیدہ توحید کی تعلیم دی ہے۔ وہ محض ایک نظریاتی بحث اور علم کلام کا کوئی مسئلہ نہیں کہ جس کا تعلق صرف کتابی زندگی سے ہو اور عملی زندگی میں اس سے کوئی واسطہ نہ پڑے۔ حقیقت یہ ہے کہ عقیدہ توحید مسلمانوں کی زندگی میں ایک ایسی زندہ قوت کا نام ہے ' جس کی موجودگی سے مسلمان زندہ ہیں اور جس کے نکل جانے سے مسلمانوں کی اسلامی زندگی موت کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے جب ہم عقیدہ توحید پر غور کرتے ہیں تو اس کی بنیاد ' سب سے پہلے اس تصور پر اٹھائی گئی ہے کہ زمین و آسمان اور خود حضرت انسان کا خالق و مالک اور حاکم حقیقی ' صرف خداوند ذوالجلال ہے۔ اسی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اسے زندگی گزارنے کا ایک نظام دے اور اس نظام کے حوالے سے قیامت کے دن اس سے بازپرس کرے۔ اس بنیاد کو اگر سمجھ لیا جائے تو پھر یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہتا کہ ان بنیادی تصورات میں آخرت میں جواب دہی کا احساس اور اپنی بداعمالی کے نتیجے میں جہنم کے عذاب کے خوف کو اگر دل و دماغ میں راسخ نہ کیا جائے تو یہ بنیادی تصورات ' مذہبی ضرورت کو تو پورا کر سکتے ہیں ' لیکن اگر مذہب کا مقصد انسانی زندگی کی اصلاح ' شائستگی ' تطہیرِ فکر اور تہذیب نفس ہے تو یہ اس وقت تک انسانی زندگی میں پیدا نہیں کیے جا سکتے ' جب تک آدمی قیامت کے دن اپنی بداعمالی کے نتیجے سے فکر مند نہیں ہو گا اور اللہ کے عذاب سے لرزاں و ترساں نہیں ہو گا۔

مسلمانوں کی پوری تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ جب تک ان میں قیامت کے عذاب کا خوف باقی رہا اور اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس زندہ رہا ' ان کی زندگیاں بے عملی اور بد عملی کے اثرات سے محفوظ رہیں۔ وہ اگر تخت حکومت پر بھی بیٹھتے تھے تو اس یوم عظیم کا ڈر انھیں ظلم کرنے سے روکتا تھا اور معمولی سے معمولی آدمی بھی ' جب ان سے انصاف مانگنے آتا تھا تو وہ یہ سوچ کر سہم جاتے تھے کہ آج میں نے اگر اسے انصاف نہ دیا تو کل جب میں اللہ کی عدالت میں کھڑا ہوں گا تو میرے ساتھ کیا گزرے گی اور جب انھیں اپنوں کی خواہشیں یا حالات کا دباؤ راہ راست سے ہٹانے کی کوشش کرتا تو ہمیشہ یہی فکر انھیں راہ راست پر رکھتی تھی۔ تاریخ کی نہایت ممتاز شخصیت حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں تاریخ گواہی دیتی ہے کہ جب انھوں نے ظلم سے حاصل کی ہوئی تمام دولت اور تمام جائیداد خاندان سے چھین کر بیت المال کو واپس کر دی اور خود خلفاء کی اولاد ہوتے ہوئے بھی اپنے پاس بھی کچھ نہ رہنے دیا تو گھر میں غربت نے بسیرا کر لیا۔ ایک دن گھر تشریف لائے تو بیٹیوں نے آگے بڑھ کر آپ کا اس طرح استقبال کیا کہ انھوں نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ آپ نے یہ حالت دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا تو آپ کی پھوپھی صاحبہ نے بتایا کہ گھر میں سوائے مسور کی دال اور پیاز کے اور کچھ نہ تھا ' بچیوں نے دونوں چیزیں ابال کر اپنا پیٹ بھرا ہے ' آپ کو چونکہ پیاز کی بو سے بہت نفرت ہے ' ان کا گمان ہے کہ شاید ان کے منہ سے بو آتی ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ پر رکھے ہوئے ہیں۔ آپ نے آبدیدہ ہو کر کہا کہ بیٹیو ! تم میں سے ایک ایک مجھے اپنی جان سے زیادہ پیاری ہے۔ میرے پاس جو کچھ ہے ' وہ سب تمہارے لیے ہے۔ لیکن اس سے زیادہ بیت المال سے لے کر اگر تمہاری نذر کر دوں تو یقیناً گھر کی حالت بدل سکتی ہے۔ مگر کل کو مجھے اس کی جواب دہی کرنا ہو گی۔ پھر تمہارے باپ کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہو گا۔ اس لیے میں یہ تو برداشت کر سکتا ہوں کہ ہم گھر میں فاقوں سے گزارا کر لیں ' لیکن میں قیامت کے عذاب کا سامنا نہیں کر سکتا اور اس کے بعد انھوں نے یہی آیت پڑھی کہ میں اس بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا

ہوں۔ چنانچہ اسی زندہ توحید کو مسلمانوں کے دل و دماغ میں اتارنے کے لیے جہاں بنیادی تصورات پر زور دیا گیا ' وہیں اس عذاب عظیم کا احساس بھی دلایا گیا 'جس سے فی الواقع انسانی اعمال میں تبدیلی آتی ہے اور انسانی خواہشوں پر غلبہ پانے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔

انسان کے اعمال اس کے مقصد حیات کے پر تو ہوتے ہیں

ایک اور حقیقت بھی قابل توجہ ہے کہ ان تمام تصورات اور بنیادی احساسات میں یقیناً اتنی قوت ہے کہ ان کے قبول کر لینے کے بعد یہ ممکن نہیں ہے کہ زندگی میں تبدیلی نہ آئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ یہ تصورات کبھی دل و دماغ میں اترنے نہیں پاتے ' جب تک آدمی ایک اور بات کا فیصلہ نہ کرے۔ وہ بات یہ ہے کہ آخر زندگی گزارنے والا اپنے سامنے زندگی کی کامیابی اور اس کی کامرانی کسے قرار دیتا ہے اور اس کے سامنے وہ کون سی منزل اور کونسا ہدف ہے 'جس کو حاصل کر لینا 'اس کے نزدیک زندگی کی کامیابی ہے؟ یہ وہ بات ہے ' جس کے فیصلے پر باقی تمام فیصلوں کا دار و مدار ہے۔ ایک آدمی اگر حصول اقتدار کو اپنی کامیابی کی منزل قرار دیتا ہے تو اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہو سکتی کہ اس کے اپنے اخلاق اور اللہ سے اس کا تعلق اور بنیادی اقدار سے اس کی وابستگی کا عالم کیا ہے۔ اسے تو اقتدار چاہیے ' چاہے اس کے لیے اسے بڑے سے بڑا ظلم اور بڑے سے بڑے گناہ کا ارتکاب ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اسی طرح اگر ایک آدمی 'کامیابی دولت مندی کو سمجھتا ہے تو اس کے لیے یہ بات بے معنی ہے کہ جائز ناجائز اور حلال اور حرام کی کیا اہمیت ہے۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی القرآن)

خیال رہے کہ یہاں ناممکن کو ناممکن پر معلق فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ حضور کا رب کی نافرمانی کرنا غیر ممکن ہے اور حضور کو قیامت میں عذاب ہونا بھی محال بالذات ہے۔ ان کی طفیل تو اوروں کے عذاب دور ہوں گے۔ اس کی مثال یہ آیت ہے لوکان للرحمٰن ولد فانا اول العابدین۔
(نور العرفان)

آیت مبارکہ :

مَنۡ يُّصۡرَفۡ عَنۡهُ يَوۡمَئِذٍ فَقَدۡ رَحِمَهٗ ؕ وَذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡمُبِيۡنُ ○160

لغۃ القرآن : [مَنْ : جو][يُّصْرَفْ : بچا لیا گیا][عَنْهُ : اس سے][يَوْمَئِذٍ : اس دن][فَقَدْ : پس تحقیق][رَحِمَهٗ: اس نے اس پر رحم کیا][وَذٰلِكَ : اور وہ][الْفَوْزُ : کامیابی][الْمُبِيْنُ : واضح]

ترجمہ : اس دن جس شخص سے وہ (عذاب) پھیر دیا گیا تو بیشک (اللہ نے) اس پر رحم فرمایا، اور یہی (اُخروی بخشش) کھلی کامیابی ہے

تشریح:

قیامت کے دن کا عذاب انتہائی سخت اور خوفناک ہے۔ جس شخص سے یہ عذاب ٹل گیا تو یقیناً اس پر اللہ تعالیٰ کا بہت کرم ہو گا اور یہ کھلی کامیابی ہے، لہٰذا اس زندگی میں ایسے اعمال کرنے میں بھرپور کوشش کرنی چاہیے جو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم کا سبب بنیں اور اس کے غضب سے بچا کر جنت میں لے جائیں۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ الکرم)

یعنی مجھے دولت کی آرزو نہیں اور نہ دولت و عزت میرے نزدیک کامیابی کا کوئی معیار ہے۔ کامیاب و کامران تو وہ ہے جس کو قیامت کے دن عذاب الٰہی سے نجات مل گئی۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت کو بھی یہ حقیقت ہر لمحہ پیش نظر رکھنی چاہیے اور قیامت کی کامیابی کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ القرآن)

حضرت انس (رض) سے مروی ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جس شخص کو جہنم میں سب سے ہلکا عذاب ہو گا اسے اللہ فرمائے گا اگر تجھے اس زمین کی ساری نعمتیں دے دی جائیں تو کیا ان کے بدلے تو اس عذاب سے نکلنے کی خواہش رکھتا ہے؟ وہ کہے گا یا اللہ کیوں نہیں؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے تجھ سے اس سے کہیں آسان تر چیز مانگی تھی کہ میرے ساتھ شرک نہ کرو۔" (بخاری کتاب الانبیاء)

(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب القرآن)

عذاب سے بچ جانا بہت بڑی بات ہے

جنّت اور رضائے الٰہی کے اعلیٰ مدارج کا حاصل کرنا تو بہت اونچا مقام ہے۔ اگر آدمی سے قیامت کے دن کا عذاب ٹل جائے تو یہی بہت بڑی کامیابی سمجھو۔ عذاب دور ہونے کے لیے جنت میں داخل ہونا لازم ہے (درمیان میں کوئی اور درجہ نہیں کہ عذاب بھی دور کر دیا جائے اور پھر جنت میں بھی داخلہ نہ ہوں) اس سے معتزلہ کے قول کی غلطی ظاہر ہو رہی ہے جو عذاب اور جنت کے درمیان تیسرے درجہ کے قائل ہیں۔

(تفسیر گلدستہ)

اللہ کی نظر میں انسان کی اصل کامیابی

قرآن کریم نے اور بھی کئی جگہ انسان کی اس کامیابی کی خبر دی ہے کہ اقتدار کا حصول ' عزت و شہرت یا دولت مندی در حقیقت یہ کامیابیاں نہیں ہیں۔ یہ تو زندگی کی ضرورتوں کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ حقیقی کامیابی تو یہ ہے کہ ایک مسلمان زندگی اس طرح گزارے جس کے نتیجے میں وہ عذاب جہنم سے بچ جائے اور اللہ کی رضا حاصل کرنے میں کامیاب ہو اور اللہ خوش ہو کر جنت کی نعمتوں کا اسے حقدار بنا دے۔ یہی وہ کھلی کامیابی ہے 'جس کے علاوہ اور کسی کامیابی کا تصور بھی صحیح نہیں۔ ظاہر ہے ' یہ کامیابی اسی خوش نصیب کو مل سکتی ہے 'جس نے اپنی پوری

زندگی احکام شریعت کی تعمیل اور اللہ کی رضا کی طلب میں نہایت اخلاص اور دردمندی سے گزاری ہو۔ جس نے نہ کبھی حقوق اللہ کو پامال کیا ہو اور نہ حقوق العباد تلف کیے ہوں 'اس کے نتیجے میں اسے وہ ابدی زندگی نصیب ہو سکتی ہے 'جس کو یہاں الفوز المبین قرار دیا گیا ہے۔

انسانی زندگی چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی۔ اس کی سمت سفر اور منزل کے صحیح تعین میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں 'ان میں ایک بہت بڑی دشواری یہ ہے کہ آدمی یہ نہ سمجھ سکے کہ میرے نفع وضرر کا مالک کون ہے۔ جیسے جیسے آدمی اس میں الجھتا جاتا ہے 'ویسے ویسے اس کی ترجیحات بدلتی رہتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں اس کی زندگی شکست وریخت کا شکار ہوتی ہے۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی القرآن بمع تعلیقات)

محاسبہ کے دن بڑی کامیابی

مَنۡ يُّصۡرَفۡ عَنۡهُ يَوۡمَٮِٕذٍ فَقَدۡ رَحِمَهٗ‌ؕ وَذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡمُبِيۡنُ:

محاسبہ کے دن جس سے عذاب ٹل گیا تو اس پر اللہ نے رحم کر دیا تو ایسے شخص نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی تو عذاب الہی سے بچنے سے بڑھ کر اور کیا کامیابی ہو سکتی ہے؟

حَاسِبُو قَبۡلَ أَن تُحَاسِبُوا:

صوفیائے کرام فرماتے ہیں حَاسِبُو قَبۡلَ أَنۡ تُحَاسِبُوا اپنا محاسبہ کر لو! قبل اس کے کہ تم سے حساب لیا جائے "اِنَّهٗ كَانَ فَرِيۡقٌ مِّنۡ عِبَادِىۡ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغۡفِرۡ لَنَا وَارۡحَمۡنَا وَاَنۡتَ خَيۡرُ الرّٰحِمِيۡنَ (109) "(المومنون : ۱۰۹)

میرے بندوں میں سے ایک گروہ تھا جو کہتے تھے اے ہمارے رب ہم ایمان لائے تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو بہت بڑا رحم کرنے والا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو دل سے مانتے ہیں اور فاغفر لنا اپنے گناہوں کو سامنے رکھ کر ہی کہہ رہے ہیں، اس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ پہلے انہوں نے اپنے اعمال کا محاسبہ کیا اور اس کے بعد اپنے گناہوں کی معافی کے لئے درخواست کی۔

اللہ والوں پر جب تکلیف آتی ہے تو اسے اپنے گناہوں کی پاداش سمجھتے ہیں

اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے انبیاء علیہم السلام کی معیت میں جہاد کیلئے جاتے ہیں یہ مجاہدین فی سبیل اللہ ہیں میدان جہاد میں پہنچے ہوئے ہیں، جب فتح میں دیر اور جہاد میں رکاوٹ پیدا ہو گئی تو بارگاہ الہی میں عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ ہم سے غلطی ہو گئی ہے، جس کی وجہ سے فتح نہیں ہو رہی، اس غلطی کو معاف فرما دے اور ہمیں ثابت قدم رکھیں، یعنی ہمارے دل ڈگمگانے نہ پائیں، معلوم ہوتا ہے کہ اپنا محاسبہ کئے ہوئے ہیں۔ اللہ والوں پر جب تکلیف آتی ہے تو اسے اپنے گناہوں کی پاداش سمجھتے ہیں اِقۡرَاۡ كِتٰبَكَ‌ؕ كَفٰى بِنَفۡسِكَ الۡيَوۡمَ عَلَيۡكَ حَسِيۡبًا اپنا نامہ اعمال پڑھ لے، آج اپنا حساب لینے کیلئے تو ہی کافی ہے۔ یہ قیامت کے دن محاسبہ نہ کرنے والوں سے ارشاد ہے اگر یہاں محاسبہ کیا ہوتا تو قیامت کے دن ذلت نہ ہوتی اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنا محاسبہ کرنے کی استعداد اور قابلیت رکھی ہے۔

روح القران۔ڈاکٹر محمد اسلم صدیقیانیت میں بھی حساب کتاب کی ضرورت

روح القران۔ڈاکٹر محمد اسلم صدیقیانیت میں بھی حساب کتاب کی ضرورت ہے ادھر بھی حساب کتاب کی ضرورت ہے۔ادھر بھی جانچا کیجئے کہ جب بیعت نہیں کی تھی تو کتنا وقت اپنی روح القران۔ڈاکٹر محمد اسلم صدیقیانی اصلاح کے لئے صرف کرتے تھے۔اب بیعت کے بعد کتنا وقت دیتے ہیں، کچھ حاصل ہوا یا پہلے کی طرح باطن کے لحاظ سے اندھے ہی رہے؟اسی طرح درس میں آنے سے پہلے اور بعد کی حالت کو جانچا کیجئے قرآن میں انقلابی طاقت ہے تو جس نے قرآن مجید پڑھا اور اس پر لَآ إِلَٰهَ إِلَّا اللهُ کا رنگ چڑھا، پہلے کچھ اور تھے اب کچھ اور ہیں۔پہلے دل بیوی، اولاد اور ساز وسامان وغیرہ کے ساتھ وابستہ تھا۔خدا راضی رہے یا نہ رہے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت رہے یا نہ رہے بیوی اور اولاد راضی ہو جائے کسی کا دل بیوی اور کسی کا اولاد میں اٹکا ہوا تھا یہ کنڈی شیطان نے پھنسار کھی تھی، بعض کو جائداد اور بعض کو روپیہ پیارا ہوتا ہے ان بیماریوں کے مریض موجود ہیں، اب خدا کے سوا کوئی مطلوب محبوب اور مقصود نہیں رہا، نباہ سب کے ساتھ کرتے ہیں مگر دل صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ ہے جیسے کسی نے کہا ہے۔

دلا تو رسم تعلق زمرغ آبی جو

گرچہ غرق بدریاست خشک پر برخاست

اللہ تعالیٰ کے پاک نام میں بے شمار برکتیں

اللہ کے پاک نام میں بے شمار برکتیں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہوتا جاتا ہے اور ماسوا اللہ سے کٹ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا نام لینے سے یہ درجہ نصیب ہوتا ہے حَاسِبُوا قَبْلَ أَنْ تُحَاسِبُوا حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر انسان اللہ تعالیٰ کی طرف بالشت بڑھتا ہے تو وہ اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے اگر یہ ہاتھ بڑھائے تو اللہ تعالیٰ ذراع بڑھاتا ہے اگر یہ چل کر آئے تو اللہ تعالیٰ دوڑ کر آتا ہے۔انسان ادھر کا رخ تو کرے اگر رخ ہی نہ کرے تو پھر اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے اگر کوئی رخ تو کرے دہلی کا اور دعا کرے کہ اے اللہ ! تو مجھ کو پشاور پہنچا دے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

اسکولوں اور کالجوں میں یہ سبق نہیں پڑھایا جاتا، وہاں تو اس کی تلاش ایسی ہے جیسے کوئی کیکر کے درخت پر چڑھ کر بیر کی تلاش کرے، مدارس عربیہ میں بھی یہ سبق نہیں پڑھایا جاتا، یہ صوفیائے کرام کے ہاں ملتا ہے، اس وقت دنیا میں قرآن مجید ہی ایک ایسی کتاب ہے جو مندرجہ ذیل چار عنوانات پر بولتی ہے۔(۱) قرآن ذوی الحقوق کی فہرست بتلاتا ہے۔(۲) ان کے نمبر بتلاتا ہے۔(۳) حقوق کے ادا کرنے کا سلیقہ سکھلاتا ہے۔(۴) اگر تعلقات بگڑ جائیں تو ان کو درست کرنے کا طریقہ بتلاتا ہے۔ذوی الحقوق میں نمبر اول اللہ تعالیٰ کا ہے اس کے بعد والدین کا نمبر آتا ہے مگر آج کل کتنے ہیں جو والدین کے فرماں بردار ہیں اکثریت ان کی ہے جن کو بیوی پیاری ہے اور ماں سے نفرت ہے۔(لاہوری)

آیت مبارکہ :

وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ إِلَّا هُوَ ۖ وَإِنْ يَمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝17

لغۃ القرآن: [وَاِنْ : اور اگر][يَّمْسَسْكَ : پہنچائے آپ کو][اللّٰهُ : اللہ][بِضُرٍّ : تکلیف][فَلَا : پھر نہیں][كَاشِفَ : کوئی دور کرنے والا][لَهٗٓ : اس کو][اِلَّا : مگر][هُوَ: وہ][وَاِنْ : اور اگر][يَّمْسَسْكَ : وہ پہنچائے آپ کو][بِخَيْرٍ : بھلائی][فَهُوَ : پھر وہ][عَلٰي : پر][كُلِّ شَيْءٍ : ہر چیز][قَدِيْرٌ : قدرت والا]

ترجمہ: اور اگر اللہ تجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اسے کوئی دور کرنے والا نہیں، اور اگر وہ تجھے کوئی بھلائی پہنچائے تو وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے

تشریح:

تکلیف اور راحت، بیماری اور صحت، ناکامی اور کامیابی، ذلت اور عزت سب اللہ تعالیٰ وحدہ کے دست قدرت میں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو فقر، مرض یا قرض میں مبتلا کر دے تو کسی کے بس میں نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور مرضی کے بغیر ان مصائب سے اسے نجات دے دے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کسی پر اپنا فضل و کرم فرمائے اور اسے اپنے انعامات سے سرفراز فرما دے تو کسی کی طاقت نہیں کہ اس سے چھین لے۔ وہی مالک حقیقی ہے۔ وہی قادر مطلق ہے۔ اس کے اذن کے بغیر کوئی پتہ، کوئی ذرہ اور کوئی قطرہ اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر سکتا۔ مشرک قوموں نے نیکی، بدی، بارش، فتح، دولت اور علم وغیرہ کے لیے الگ الگ خدا بنائے ہوئے تھے ان سب کے خیالات فاسدہ کی تردید فرما دی۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہالقرآن)

اور جہاں تک نیک اعمال اور بزرگوں کی دعا سے عذاب اٹھ جانے کا تعلق ہے تو اسے بھی رب کریم عَزَّوَجَلَّ ہی اپنے فضل و کرم سے، اِن اسباب کے وسیلہ سے اٹھاتا ہے اور جیسے برائی کا پہنچنا اور دور ہونا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، ایسے ہی بھلائی جیسے صحت و دولت وغیرہ کا پہنچنا بھی اسی خداوندِ کریم کی قدرت سے ہے کیونکہ وہ ہر شے پر قادر ہے، کوئی اس کی مَشِیَّت کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تو اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق کیسے ہو سکتا ہے؟ کیونکہ معبود وہ ہے جو قدرتِ کاملہ رکھتا ہو اور کسی کا حاجت مند نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ ایسا کوئی نہیں، لہٰذا صرف اسی کو رب مانو اسی کی عبادت کرو۔ یہ ردِ شرک کی دل میں اثر کرنے والی دلیل ہے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری الجنان)

اکثر انسان دوستوں کی مدد سے مصائب پر قابو پالیتا ہے۔ ڈاکٹر کی دوا سے تندرست ہو جاتا ہے اور اللہ والوں کی دعا سے مشکلات آسان ہو جاتی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کی دعائیں رد نہیں کرتا جیسا کہ حدیث قدس میں اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا: "میرا بندہ جب نفلی

عبادات کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرلیتا ہے تو میں اس کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں اور اس کے سوال کو رد نہیں کرتا، جو کچھ وہ مانگے عطا کر دیتا ہوں۔ " (بخاری: کتاب الرقاق: باب 38)

اسی طرح حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دو گناہگاروں کی قبر پر شاخ کے دو ٹکڑے نصب کئے تاکہ ان سے برزخ کا عذاب دور ہو جائے۔ (بخاری: کتاب الوضوئ: باب 55) اور حضرت علی کی آنکھوں کو شفا دے دی۔ (بخاری: کتاب فضائل اصحاب: باب 9)

اب اس آیت کے حکم اور ہمارے مشاہدات میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذاتی قدرت سے اپنے بندوں کی مشکلات آسان کرتا ہے اور بندے جب ایک دوسرے کی مشکلات میں مدد کرتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی طاقت سے کرتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ ان میں مدد کی صلاحیت پیدا نہ کرتا تو وہ مدد نہ کر سکتے، لہٰذا حقیقی مشکل کشا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے اسباب اس کی قدرت کے مظاہر ہیں۔ ان کا مدد کرنا ان سے مدد لینا در اصل اللہ تعالیٰ ہی کی مدد ہے۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ الکرم)

اس آیت میں مومنوں کے لیے بھی درس عبرت ہے کہ وہ ہر کام میں اللہ ہی پہ بھروسہ رکھیں، ہر وقت اسی سے ڈرتے رہیں، وہ آن واحد میں بادشاہوں کو گدا اور گداؤں کو بادشاہ بنا دیتا ہے، سب عزت و ذلت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ فرماتا ہے:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۔ (اے اللہ) تو جسے چاہے بادشاہی دیتا اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لیتا ہے اور تو جسے چاہے عزت دیتا اور جسے چاہے ذلت دیتا ہے، سب بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے، بیشک تو ہر چیز پہ قادر ہے۔ "آل عمران، 26)

اسی طرح ہر خوشی و غمی و زندگی و موت بھی اللہ رب العزت ہی کے ہاتھ میں ہے، وہ فرماتا ہے:

وَأَنَّ إِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ۔ وَأَنَّ إِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ۔ وَأَنَّهُ هُوَ أَمَاتَ وَأَحْيَا ۔ "اور تیرے رب ہی کی طرف ہر کام کی انتہا ہے اور وہی ہنساتا اور رلاتا ہے اور وہی مارتا اور جلاتا ہے۔ " (نجم، 44)

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اللہ کی بارگاہ میں یوں اپنی بندگی اور وفاداری و اطاعت پیش کرتے ہیں۔

الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ ﴿78﴾ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ ﴿79﴾ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ﴿80﴾ وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ ﴿81﴾۔ "(اللہ) وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا تو وہی مجھے راہ دیتا ہے، وہی مجھے کھلاتا و پلاتا ہے، اور جب میں بیمار پڑ جاؤں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے، وہی مجھے مارے گا اور دوبارہ زندہ کرے گا۔ " (شعراء، 81)۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اذا سألت فسأل اللہ واذا استعنت فاستعن باللہ۔ جب تم مانگو تو اللہ سے مانگو اور مدد چاہو تو اللہ سے چاہو۔ مزید فرمایا: جان لو! اگر ساری امت جمع ہو کر تجھے کوئی نفع دینا چاہے تو وہی نفع دے سکتی ہے جو اللہ نے تیرے لئے لکھا ہوا ہے اور اگر وہ سب جمع ہو کر تجھے کوئی نقصان دینا چاہیں تو وہی نقصان دے سکتے ہیں جو اللہ نے تیرے لئے لکھا ہوا ہے قلمے لکھ چکی ہیں اور ورقے خشک ہو چکے ہیں۔ (ترمذی کتاب صفۃ القیامۃ باب 59 حدیث 2516)

جب اللہ ہی مشکل کشا ہے تو انبیاء و اولیاء سے مدد کیوں مانگی جاتی ہے؟ اس سوال کا جواب

یاد رہے اللہ ہی ہر تکلیف دور فرماتا ہے مگر اس کے سارے کام اسباب کے ساتھ چلتے ہیں۔ بیماری آئے تو حکیم و طبیب کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کوئی جھگڑا یا مقدمہ بن جائے تو پولیس، وکیل، عدالت اور سرکاری افسران کا وسیلہ پکڑنا پڑتا ہے۔ یونہی بزرگوں سے دعا کروائی جاتی ہے۔ مگر یہ سب وسیلے ہیں اور اسباب ہیں، ان سب کے ذریعے مدد کرنے اور مشکل حل کرنے والا اللہ ہے۔ اس طرح حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وصال کے بعد صحابہ کرام (رض) قحط وغیرہ میں آپ کے مزار مبارک پر حاضر ہو کر آپ کا وسیلہ پکڑتے اور آپ سے التجا کرتے تھے۔ امام ابن کثیر نے (جو وہابی مذہب کے بانی ابن تیمیہ کے چہیتے شاگرد ہیں) حافظ بیہقی کے حوالے سے روایت کیا کہ زمانہ عمر فاروق (رض) میں شدید قحط پڑا ایک آدمی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مزار پر حاضر ہوا۔ اس نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! استسق لامتك فانهم هلكوا، اپنی امت کے لیے بارش طلب کریں وہ ہلاک ہو رہے ہیں۔ اس کے خواب میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لائے اور فرمایا:

ایت عمر فاقرأه منی السلام واخبرهم انهم مسقون۔ وقل له علیك بالكیس الكیس۔

جاؤ عمر (رض) کو میرا سلام کہو اور بتاؤ کہ بارش آنے والی ہے اور اسے کہو کہ کچھ نرمی برتے، اس شخص نے حضرت فاروق (رض) سے آکر ماجرا کہا۔ وہ کہنے لگے اے اللہ! میں اپنی طاقت کے مطابق تو تیری اطاعت میں کوئی کمی نہیں کرتا۔ امام ابن کثیر نے کہا:

وھذا اسنادٌ صحیحٌ۔ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (البدایہ والنہایہ جلد 7 صفحہ 94 مطبوعہ دار الریان قاہرہ مصر)

اس جگہ پر امام ابن کثیر نے ایک اور روایت ذکر کی ہے جس کے مطابق وہ شخص جس نے قبر رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر یہ فریاد کی تھی وہ صحابی رسول حضرت بلال بن حارث (رض) تھے۔

یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ آج نجدی علماء اس بات پر بہت زور لگاتے ہیں کہ مردوں سے مانگنا شرک ہے، کفر ہے، مردے کچھ نہیں دے سکتے۔ ہم کہتے ہیں کہ کفر کیا ہے اور ایمان کیا ہے؟ اسی طرح توحید کیا ہے اور شرک کیا؟ ان باتوں کو تم بہتر جانتے ہو یا سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابہ بہتر جانتے ہیں جن کے بارہ میں اللہ رب العزت فرماتا ہے:

وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ أُولَئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ ﴿7﴾ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً۔

"لیکن اللہ نے (اے صحابہ) تمہارے لیے ایمان کو محبوب کر دیا اور اسے تمہارے دلوں میں آراستہ فرما دیا اور کفر، نافرمانی اور معصیت سے تم کو متنفر کر دیا، یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں اللہ کے فضل اور اس کی نعمت سے۔" (حجرات، 7)

جب صحابہ کرام (رض) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وصال کے بعد آپ ﷺ کی قبر انور پہ حاضر ہو کر آپ سے مانگ رہے ہیں اور آپ ﷺ عطا فرما رہے ہیں تو اب تم شرک کا فتویٰ کس پہ لگاؤ گے؟ مانگنے والے صحابہ پر یا دینے والے رسول ﷺ پر؟

یونہی طبرانی صغیر میں صحیح سند کے ساتھ حدیث ہے کہ حضرت عثمان غنی (رض) کے زمانہ میں صحابی رسول حضرت عثمان بن حنیف (رض) نے ایک مصیبت زدہ شخص کو دعا سکھائی جس کے آخر میں یہ تھا:
یا محمد انی اتوجہ بك الی ربك فیقضی لی حاجتی۔ "اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میں آپ کے وسیلہ سے آپ کے رب کی طرف توجہ کرتا ہوں تاکہ وہ میری حاجت پوری کردے "چنانچہ اس شخص کی مصیبت دور ہوگئی۔ امام طبرانی نے آخر میں کہا: والحدیث صحیح۔ "یہ صحیح حدیث ہے۔ " (طبرانی صغیر جلد اول صفحہ 184 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)
معلوم ہوا مصیبت میں کسی اللہ والے کے مزار پر حاضر ہو کر اس سے دعا کی التجاء حقیقت میں اللہ ہی سے مدد مانگنا ہے اور یہی صحابہ کا عقیدہ ہے اور یہ وَاِنۡ یَّمۡسَسۡكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ کے منافی نہیں ہے۔ (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب القرآن)

حقیقی حاجت روا کارساز اور مستعان صرف اللہ تعالیٰ ہے

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا آپ کہیے کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو کارساز بنالوں جو آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے ' اور وہ سب کو کھلاتا ہے اور اس کو کھلایا نہیں جاتا۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حقیقی حاجت روا نہیں ہے اور اسی مطلوب پر یہ آیت دلیل ہے کہ اگر اللہ تمہیں ضرر پہنچائے تو اس کے سوا اور کوئی اس ضرر کو دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تمہیں نفع پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے اور اسی مضمون کی یہ آیت ہے:
(آیت) "ما یفتح اللہ للناس من رحمۃ فلا ممسك لھا وما یمسك فلا مرسل لہ من بعدہ وھو العزیز الحکیم "۔ (فاطر: ۲)
ترجمہ: اللہ رحمت سے لوگوں کے لیے جو چیز کھولے اسے کوئی روکنے والا نہیں ہے اور جس چیز کو وہ روکے لے تو اس کے روکنے کے بعد اسے کوئی چھوڑنے والا نہیں ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔
یہ معنی حدیث صحیح میں بھی ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نماز کے بعد جو ذکر کرتے تھے ' اس میں یہ جملہ ہے۔
حضرت مغیرہ بن شعبہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نماز کے بعد ذکر کرتے تھے۔ اے اللہ! جو چیز تو عطا فرمائے اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہے اور جس چیز کو تو روک لے اس کو ' کوئی دینے والا نہیں ہے اور کوئی طاقت سے تیرے مقابلہ میں نفع نہیں پہنچا سکتا۔ (صحیح مسلم ' المساجد ' ۱۳۷ ' (۵۹۳) ۱۳۱۴ ' صحیح البخاری ' ج ۵ ' رقم الحدیث: ' ٦٦١٥ ' سنن ابوداؤد ' ج ۱ ' رقم الحدیث: ' ۱۵۰۵ ' سنن النسائی ' ج ۳ ' رقم الحدیث: ' ۱۳۴۱)
حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں سواری پر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے بیٹے! میں تم کو چند باتوں کی تعلیم دیتا ہوں۔ تم اللہ کو یاد رکھو ' اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرے گا۔ تم اللہ کو یاد رکھو ' تم اللہ کو اپنے سامنے پاؤ گے۔ جب تم سوال کرو تو اللہ تعالیٰ سوال کرو اور جب تم مدد طلب کرو تو اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرو۔ اور جان لو کہ اگر تمام امت کو نفع پہنچانے کے لیے جمع ہو جائے تو وہ تم کو صرف اسی چیز کو نفع پہنچا سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے تمہارے لیے لکھ دیا ہے۔ اگر تمام لوگ

تم کو نقصان پہنچانے کے لیے جمع ہو جائیں تو وہ تم کو صرف اسی چیز کا نقصان پہنچا سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے۔ قلم اٹھا لیے گئے ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (سنن ترمذی 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۲۵۲۴ 'مسند احمد 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۲۸۰۴ ' ۲۷۶۳ ' ۲۶۹ 'طبع قاہرہ 'مسند احمد 'ج ۱ 'رقم الحدیث : ۲۸۰۴ ' ۲۷۶۳ ' ۲۶۶۹ 'طبع جدید 'دارالفکر 'مسند احمد ج ۱ 'ص ۳۰۷ ' ۳۰۳ ' ۲۹۳ 'طبع قدیم 'دارالفکر 'مسند ابویعلی 'ج ۴ 'رقم الحدیث : ۲۵۵۶ 'المعجم الکبیر اللطبرانی 'ج ۱۱ 'رقم الحدیث : ۱۱۵۶۰ ' ۱۱۴۱۶ ' ۱۱۲۴۳ ' کتاب الدعا للطبرانی 'رقم الحدیث : ۴۱ 'مسند الثاب ' ۷۴۵ 'المستدرک 'ج ۳ 'ص ۵۴۱ 'مصابیح السنہ 'ج ۳ 'ص ۴۴۷ 'عمل الیوم والیلہ لابن السنی 'رقم الحدیث : ۴۲۷ 'مطبوعہ کراچی 'مشکوۃ المصابیح 'ص ۴۵۳ 'طبع کراچی)

قرآن مجید کی ان آیات اور احادیث سے یہ معلوم ہوا کہ انسان کو فقر 'مرض 'غم اور ذلت کی وجہ سے جو مصیبت اور تکلیف پہنچتی ہے 'اللہ تعالیٰ کے سوا ان مصائب اور شدائد کو کوئی دور کرنے والا نہیں ہے اور رنج والم کو اس کے سوا کوئی زائل کرنے والا نہیں ہے 'کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز پر قادر ہے 'اسی کا غلبہ اور اسی کی کبریائی ہے 'بڑے بڑے بادشاہوں اور جابر حکمرانوں کی گردنیں اسی کے سامنے جھکتی ہیں 'تمام انبیاء رسل اور فرشتے اسی کی عبادت کرتے ہیں اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں 'سب اسی سے سوال اور دعا کرتے ہیں۔ وہی سب کا داتا ہے اور سب کی حاجتیں پوری کرتا ہے 'وہی کارساز مطلق ہے اور وہی حقیقی حاجت روا ہے۔ اس لیے اسی کے سامنے دست دراز کیا جائے اور اسی سے مدد طلب کی جائے۔

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم میں (ہر) ایک شخص کو چاہیے کہ اپنی تمام حاجات میں اپنے رب سے سوال کرے 'حتیٰ کہ نمک کا بھی اس سے سوال کرے اور جب جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے تو اس کا بھی اس سے سوال کرے۔ (سنن ترمذی 'ج ۵ 'رقم الحدیث : ۳۶۲۴ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت)

اگر کسی شخص کی دعا فورا قبول نہ ہو تو اس کو مایوس ہو کر دعا ترک نہیں کرنی چاہیے بلکہ مسلسل دعا کرتے رہنا چاہیے

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص بھی اس قدر ہاتھ بلند کرکے اللہ سے سوال کرتا ہے کہ اس کی بغلیں ظاہر ہو جائیں اللہ اس کا سوال پورا کر دیتا ہے جب تک کہ وہ جلدی نہ کرے۔ صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ ! جلدی کا کیا معنی ہے ؟ آپ نے فرمایا وہ یہ کہے کہ میں نے سوال کیا اور میں نے سوال کیا اور مجھے کچھ نہیں دیا گیا۔ اور حضرت ابوہریرہ (رض) نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کیا ہے کہ تم میں سے کسی شخص کی دعا اس وقت تک قبول کی جاتی ہے جب تک کہ وہ جلدی نہ کرے۔ وہ کہتا ہے میں نے دعا کی اور میری دعا قبول نہیں ہوئی۔ (سنن ترمذی 'ج ۵ 'رقم الحدیث : ۳۶۱۹ 'کنزالعمال 'رقم الحدیث : ۳۲۴۱)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص بھی اللہ سے کوئی دعا کرتا ہے اس کی دعا قبول کی جاتی ہے۔ یا تو اس کا مطلوب اسے فورا دنیا میں دے دیا جاتا ہے یا اس کے لیے آخرت میں اس کا اجر ذخیرہ کیا جاتا ہے یا اس دعا کے بہ مقدار اس کے گناہوں کو مٹا دیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ گناہ کی یا قطع رحم کی دعا نہ کرے اور عجلت نہ کرے۔ صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ، عجلت کیسے کرے گا؟ آپ نے فرمایا وہ کہے میں نے اپنے رب سے دعا کی 'اس نے میری دعا قبول نہیں کی۔ (سنن ترمذی 'ج ۵ 'رقم الحدیث : ۳۶۱۸ 'صحیح البخاری 'ج ٦ 'رقم الحدیث : ۶۳۴۰ 'صحیح مسلم '(۲۷۳۵) سنن ابو داؤد 'رقم الحدیث : ۱۴۸۴ 'موطا امام مالک 'رقم الحدیث : ۴۹۵ 'مسند احمد 'ج ۴ 'رقم الحدیث : ۱۳۰۰۷ 'طبع جدید 'دارالفکر 'بیروت)

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم میں سے جس شخص کے لیے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا ہے 'اس کے لیے رحمت کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ سوال یہ ہے کہ اس سے عافیت کا سوال کیا جائے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو مصائب نازل ہو چکے ہیں اور جو نازل نہیں ہوئے ان سب میں دعا سے نفع ہوتا ہے۔ اے اللہ کے بندو! دعا کیا کرو۔ امام ترمذی نے کہا اس حدیث کی سند غریب ہے۔ (سنن ترمذی 'ج ۵ 'رقم الحدیث : ۳۵۵۹ مطبوعہ دارالفکر ' بیروت)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص اس بات سے خوش ہو کہ مصیبتوں کے وقت اس کی دعا قبول کی جائے 'اس کو چاہیے کہ راحت کے وقت بہ کثرت دعا کرے۔ (سنن ترمذی 'ج ۵ 'رقم الحدیث : ۳۳۹۳ ' المستدرک 'رقم الحدیث : ۱۹۹۷)

حضرت سلمان فارسی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ حیادار کریم ہے۔ وہ اس سے حیا فرماتا ہے کہ کوئی شخص اس کی طرف ہاتھ اٹھائے اور وہ ان ہاتھوں کو نامراد اور خالی لوٹا دے۔ (سنن ترمذی 'ج ۵ 'رقم الحدیث ج : ۳۵٦۷ ' سنن ابو داؤد 'ج ۱ 'رقم الحدیث : ۱۴۸۸ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۳۸٦۵)

انبیاء کرام (علیہم السلام) اور اولیاء کرام اللہ کی دی ہوئی طاقت اور اس کے اذن سے تصرف کرتے ہیں

اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی مصیبت اور ضرر کو دور نہیں کر سکتا 'حالانکہ انسان کبھی خود اپنی کوشش سے مصیبت کو دور کر لیتا ہے 'کبھی اس کے دوست اور رشتہ دار اس مصیبت کو دور کر دیتے ہیں 'انسان بیمار پڑ جاتا ہے تو ڈاکٹر دوا کے ذریعہ اس کی بیماری اور تکلیف کو دور کر دیتا ہے 'قیامت کے دن انبیاء (علیہم السلام) عموماً اور ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خصوصاً گناہ گاروں کی شفاعت فرما کر ان سے عذاب کی مصیبت کو دور کریں گے 'بلکہ آپ ﷺ نے دو گنہگاروں کی قبر پر شاخ کے دو ٹکڑے نصب کر کے ان سے برزخ کا عذاب دور کر دیا۔ (صحیح بخاری '۲۱٦) حضرت علی (رض) کی دکھتی ہوئی آنکھ میں 'حضرت سلمہ بن اکوع کی ٹوٹی ہوئی پنڈلی میں اور حضرت

زید بن معاذ کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ میں لعاب دہن لگایا اور ان سے دنیا کی تکلیف کو دور کر دیا اور وہ شفایاب ہو گئے۔ (شفاء ' ج ۱ ' ص ۲۱۳) امام بخاری نے بھی حضرت علی (رض) کی آنکھوں کی شفا کی حدیث روایت کی ہے۔ (صحیح البخاری ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ۳۰۷۱) نیز امام بخاری نے حضرت سلمہ بن اکوع کی ٹوٹی ہوئی پنڈلی کی حدیث بھی روایت کی ہے۔ (ج ۵ ' رقم الحدیث : ۴۲۰۶) اور امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ ابو رافع یہودی کو قتل کرنے کے لیے حضرت عبداللہ بن عتیک گئے اور اس مہم میں ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس پر ہاتھ پھیرا تو وہ اس طرح درست ہو گئی کہ کبھی ٹوٹی ہی نہ تھی۔ (صحیح البخاری ' ج ۵ ' رقم الحدیث : ۴۰۳۹)

ایسے بکثرت واقعات ہیں ' اسی طرح اولیاء اللہ کی کرامتوں سے بھی لوگوں کی بیماریاں اور ان کے مصائب دور ہو جاتے ہیں اور یہ تمام امور اس آیت کے مخالف ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذاتی قدرت سے اپنے بندوں کے مصائب اور تکلیفوں کو دور کرتا ہے ' اس کے برخلاف لوگ جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور ان کی مشکلات میں کام کرتے ہیں اور ان کے مصائب کو دور کرتے ہیں ' وہ اللہ کی توفیق اور اس کی دی ہوئی طاقت سے کرتے ہیں اور دواؤں میں شفا کی تاثیر اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے۔ وہ محض سبب ہیں شفا دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ چاہے تو بغیر دوا کے شفا دے دے اور اگر وہ نہ چاہے تو کسی دوا سے شفا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح انبیاء (علیہم السلام) اور اولیاء کرام ' اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت اور اس کے اذن سے تصرف کرتے ہیں۔ بیماروں کو شفا دیتے ہیں اور گنہگاروں کی شفاعت کرتے ہیں اور تنگ دستوں کو غنی کرتے ہیں اور ان افعال کی ان کی طرف نسبت کرنا جائز ہے۔ قرآن مجید میں ہے :

(آیت) " وما نقموا الا ان اغنهم الله ورسوله من فضله "۔ (التوبہ : ۷۴)

ترجمہ : اور ان کی صرف یہ برا لگا کہ اللہ اور اس کے رسول نے انھیں اپنے فضل سے غنی کر دیا۔

دیکھئے حقیقت میں غنی کرنے والا صرف اللہ ہے ' لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا اللہ اور اس کے رسول نے انھیں اپنے فضل سے غنی کر دیا " سو معلوم ہوا ایسا کہنا جائز ہے۔ البتہ یہ اعتقاد ضروری ہے کہ اللہ نے اپنی ذاتی قدرت سے غنی کیا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت اور اس کے اذن سے غنی کیا۔ اسی طرح قرآن مجید میں ہے :

(آیت) " واذ تقول للذی انعم الله علیه وانعمت علیه "۔ (الاحزاب : ۳۷)

ترجمہ : اور جب آپ اس شخص سے کہتے تھے جس پر اللہ نے انعام فرمایا اور آپ نے (بھی) انعام فرمایا۔

ظاہر ہے کہ اللہ منعم حقیقی ہے اور آپ نے اللہ کی دی ہوئی قدرت اور اس کے اذن سے انعام فرمایا ' مگر اللہ تعالیٰ نے انعام کرنے کی نسبت دونوں کی طرف کی ہے اور حضرت جبرائیل (علیہ السلام) نے حضرت مریم سے کہا :

(آیت) " قال انما انا رسول ربك لاهب لك غلاما زكيا "۔ (مریم : ۱۹)

ترجمہ : (جبرائیل نے) کہا میں نے صرف آپ کے رب کا فرستادہ ہوں ' تاکہ میں آپ کو پاک بیٹا دوں۔

حقیقت میں بیٹا دینے والا اللہ تعالیٰ ہے ' لیکن اللہ تعالیٰ نے بیٹا دینے کی نسبت حضرت جبرائیل (علیہ السلام) کی طرف کی ہے ' کیونکہ اللہ نے حضرت جبرائیل (علیہ السلام) کو اس کا سبب اور ذریعہ بنایا تھا۔ انبیاء (علیہم السلام) کی دعاؤں سے بھی بیٹا ہو جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی دعا سے ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پیدا ہوئے۔ خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں۔ (مسند احمد ج ۴ ' ص ۱۲۸ ' ۱۲۷ ' المعجم الکبیر ' ج ۱۸ ' ص ۲۵۲ ' مسند البزاز ' ج ۳ ' ص ۱۱۳ ' موارد الظمان ' ص

۵۱۵ 'المستدرک 'ج ۲ 'ص ۶۰۰ 'حلیہ الاولیاء 'ج ۶ 'ص ۸۹ 'دلائل النبوۃ 'ج ۲ 'ص ۱۳۰ 'شرح السنہ 'رقم الحدیث : ۳۶۲۶ 'مصابیح السنہ 'ج ۴ 'ص ۳۸)

اور قرآن مجید میں مذکور ہے کہ حضرت یحیٰی (علیہ السلام) حضرت زکریا (علیہ السلام) کی دعا سے پیدا ہوئے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ اولیاء کرام کی دعا منظور فرمالے تو ان کی دعا سے بھی اولاد ہو سکتی ہے 'لیکن صحیح طریقہ یہ ہے کہ اولیاء کرام سے دعا کی درخواست کی جائے 'کہ آپ اللہ تعالیٰ سے ہمارے لیے دعا کریں کہ ہمارا فلاں مطلوب پورا ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اولیاء کرام کی ایسی عزت 'وجاہت اور مقبولیت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کرم اور فضل سے ان کی دعا قبول فرمالیتا ہے اور رد نہیں فرماتا۔اس نے خود فرمایا ہے کہ میں اپنے مقرب بندہ کو جب اپنا محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس سے سوال کو رد نہیں کرتا۔(صحیح البخاری 'ج ۷ 'رقم الحدیث : ۲۴۳ 'محصلا)

حدیث میں بھی غنی کرنے کا اسناد اللہ اور رسول اللہ دونوں کی طرف کیا گیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صدقہ وصول کرنے کا حکم دیا 'آپ کو بتایا گیا کہ ابن جمیل 'حضرت خالد بن ولید اور حضرت ابن عبدالمطلب (رض) نے صدقہ دینے سے منع کیا ہے۔نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ابن جمیل کو تو یہ صرف یہ بات ناگوار ہوئی ہے کہ وہ فقیر تھا تو اللہ اور اس کے رسول نے اس کو غنی کردیا اور رہا خالد تو تم اس پر ظلم کرتے ہو 'اس نے اپنی زرہ محفوظ رکھی ہے اور اس کو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے وقف کیا ہوا ہے 'اور رہے حضرت عباس بن عبدالمطلب (رض) تو وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عم (محترم) ہیں۔جتنا صدقہ ان پر واجب ہے ان سے اتنا وصول کیا جائے (یعنی ان کے بلند رتبہ کی وجہ سے ان سے دگنی زکوۃ وصول کی جائے۔سعیدی غفرلہ)

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ حقیقتاً بلاواسطہ اور بالذات مصائب کو دور کرنے والا اور نعمتیں عطا فرمانے والا اللہ تعالیٰ ہے 'تاہم اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت اور اس کے اذن سے مقربان حضرت رب العزت 'خصوصا ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی عذاب اور مصائب کو دور کرتے ہیں اور دنیا اور آخرت میں غنی اور شاد کام کرتے ہیں۔(تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی القرآن)

آیت مبارکہ :

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝18

لغۃالقرآن : [وَهُوَ : اور وہ][الْقَاهِرُ : غالب][فَوْقَ : اوپر][عِبَادِهٖ : اپنے بندوں]] وَهُوَ : اور وہ][الْحَكِيْمُ : خوب حکمت والا][الْخَبِيْرُ : جاننے والا ہے]

ترجمہ : اور وہی اپنے بندوں پر غالب ہے، اور وہ بڑی حکمت والا خبردار ہے

تشریح: اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب ہے۔ بڑے بڑے جابر لوگ اس کے سامنے بے بس ہیں۔ تاریخ میں نمرود اور فرعون کی مثالیں موجود ہیں جو اپنے آپ کو خدا کہتے تھے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے انھیں پکڑا تو مچھر اور پانی کے سامنے بے بس ہو کر زندگی کی بازی ہار بیٹھے۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ الکرم)

اللہ تعالیٰ ہی اپنے سب بندوں پر غالب و قادر ہے۔ سب اس کے قبضہ اختیار اور اس کے کنٹرول میں ہے 'سب اس کی قدرت کے تحت اور محتاج ہیں یہی وجہ ہے کہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا انسان خواہ اللہ کا رسول ہو اور خواہ وہ دنیا کا شہنشاہ اعظم ہو 'اپنے ہر ارادہ میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا اور اس کی ہر مراد کبھی پوری نہیں ہوتی۔

آیت میں قاھر کا لفظ استعمال ہوا ہے اس کو سمجھ لینا چاہیے۔ قہر کا لفظ عربی میں اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا جس معنی میں اردو میں استعمال ہوتا ہے بلکہ اس کے معنی اختیار قابو حکومت اور تسلط میں رکھنے کے آتے ہیں۔ انگریزی لفظ (Control) کا جو مفہوم ہے وہی مفہوم عربی میں اس لفظ کا ہے اسی سے لفظ قہار مبالغہ کا صیغہ ہے جو اسمائے حسنیٰ میں سے ہے جس کے معنی کنٹرولر کے ہیں یعنی تمام جہان اور اس کے تمام بندے ہر آن اس کی مٹھی اور اس کے قابو میں ہیں وہ ان کو قابو میں رکھنے کے لیے نہ کسی مددگار کا محتاج ہے اور نہ اس امر کا اندیشہ ہے کہ جب وہ ان کو پکڑنا یا اکٹھا کرنا چاہے تو کوئی اس کی گرفت سے نکل سکتا ہے۔ آخر میں فرمایا کہ وہ حکیم بھی ہے اور خبیر بھی۔ حکیم اس لیے ہے کہ اس کے تمام افعال عین حکمت ہیں اور خبیر اس لیے کہ وہ ہر چیز کو جانے والا ہے۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی القرآن)

قھر کا معنی ہے مغلوب کیا گیا۔ فوق عبادہ غلبہ کے ساتھ فوقیت مراد ہے، یعنی تمام بندے اس کے حکم کے تحت مسخر ہیں۔ فوقیت سے مراد فوقیت مکانی مراد نہیں ہے، جیسے تو کہتا ہے: السلطان فوق رعیتہ یعنی سلطان منزل و رفعت کے اعتبار سے رعیت سے بلند ہے۔ قہر میں ایک زائد معنی ہے جو قدرت میں نہیں ہے وہ ہے کسی کو مراد حاصل کرنے سے روک دینا۔ وھوا لحکیم وہ اپنے امر میں حکیم ہے۔ الخبیر اپنے بندوں کے اعمال سے باخبر ہے یعنی جو ان صفات سے متصف ہو واجب ہے کہ اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ (قرطبیؒ)

ابن عباس سے روایت ہے کہ وہ سواری پر رسول اللہ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے آپ ﷺ نے فرمایا "چند باتیں یاد رکھو"۔ (۱) تو اللہ کے احکامات کی حفاظت کر اللہ تیری حفاظت کرے گا۔ (۲) تو اللہ کے حقوق کا خیال رکھ اللہ کو سامنے پائے گا۔ (۳) سوال کرے تو اللہ سے کر۔ مدد چاہے تو اللہ سے مانگ۔ (۴) اگر ساری مخلوق جمع ہو کر تجھے نفع پہنچانا چاہے تو کچھ نہیں کر سکتی سوائے اس کے جو اللہ نے تیرے لیے لکھدیا ہے اور اگر ساری مخلوق تجھے نقصان پہنچانا چاہے تو کچھ نہیں کر سکتی سوائے اس کے جو اللہ نے تیرے لیے لکھ دیا ہے قلم اٹھا لیے گئے صحیفے خشک ہو گئے۔ "(ترمذی: ۲۵۱۶، مسند احمد: ۱/۲۹۳، ح: ۲۶۶۹)

اللہ تعالیٰ سب سے زبردست ہیں

اس سورۃ کا مقصد ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اور اس کی صفتوں کو کھول کر بیان کیا جائے یعنی اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کا کوئی نہ شریک ہے نہ ساتھی، تمام مخلوق جانور، درندے، چرندے، جن، انسان وغیرہ سب اس کے بندے ہیں، اس کے حکم کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ کے سوا

کسی کی عبادت نہ کرو، کسی سے مدد طلب نہ کرو، اس لحاظ سے یہ، سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص کی تفسیر ہے، جو کچھ ان دونوں صورتوں میں مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے اس سورۃ میں اس کو کھول کر واضح کا دیا گیا ہے، اس کے ہر ہر جملے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ ایک ہے، ساری قدرت اور سارا اختیار اسی کا ہے اور سب چیزیں خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہوں اس کی عظمت اور بڑائی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، شروع سے یہی مضمون چلا آرہا ہے اور سورۃ کے ختم تک یہی مضمون چلے گا، اس آیت میں بھی جو کچھ کہا گیا ہے اسی کے بارے میں کہا گیا ہے، ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر زبردست اور غالب ہیں اور اسی کو سب پر برتری حاصل ہے، انسان خواہ کتنا ہی مرتبے والا ہو بہر حال اس کا بندہ ہے اور اس کے آگے بے بس ہے، حکم چلانا اسی کا کام ہے اور بندوں کا کام صرف یہ ہے کہ اس کا حکم بجالائیں، " سورۃ نساء " کے آخری رکوع میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو، فرشتوں کو اور ساری مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کا اقرار ہے، وہ سب اسی میں اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ (تفسیر ربانی)

آیت مبارکہ :

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۭ قُلِ اللّٰهُ ڗ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۣ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۭ اَىِٕنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰي ۭ قُلْ لَّآ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۘ 19۝

لغۃ القرآن: [قُلْ : فرما دیجیے][اَيُّ : کون سی][شَيْءٍ : چیز][اَكْبَرُ : زیادہ بڑی][شَهَادَةً : گواہی][قُلِ : فرما دیجیے][اللّٰهُ : اللہ][شَهِيْدٌۢ: گواہ][بَيْنِيْ : میرے درمیان][وَبَيْنَكُمْ : اور تمہارے درمیان][ۣوَاُوْحِيَ : اور وحی کیا گیا][اِلَيَّ : میری طرف][هٰذَا الْقُرْاٰنُ : یہ قرآن][لِاُنْذِرَكُمْ : تاکہ میں ڈراؤں تم کو][بِهٖ : اس سے][وَمَنْۢ بَلَغَ : اور جیسے پہنچے][اَىِٕنَّكُمْ : کیا تم][لَتَشْهَدُوْنَ : یقینا شہادت دیتے ہو][اَنَّ : بیشک][مَعَ : ساتھ ہے][اللّٰهِ : اللہ][اٰلِهَةً : معبود][اُخْرٰي : دوسرا][قُلْ : فرما دیجیے][لَّآ

اَشْهَدُ : نہیں میں گواہی دیتا][قُلْ : فرما دیجیے][اِنَّمَا هُوَ : صرف وہ][اِلٰهٌ: معبود][وَّاحِدٌ: ایک][وَّاِنَّنِيْ : اور بیشک میں][بَرِيْٓءٌ : بری][مِّمَّا : اس سے جو تم][تُشْرِكُوْنَ : شرک کرتے ہو]

ترجمہ : آپ (ان سے دریافت) فرمایئے کہ گواہی دینے میں سب سے بڑھ کر کون ہے ؟آپ (ہی) فرمادیجئے کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے، اور میری طرف یہ قرآن اس لیے وحی کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے تمہیں اور ہراس شخص کو جس تک (یہ قرآن) پہنچے ڈر سناؤں۔ کیا تم واقعی اس بات کی گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے معبود (بھی) ہیں ؟آپ فرمادیں : میں (تو اس غلط بات کی) گواہی نہیں دیتا، فرما دیجئے : بس معبود تو وہی ایک ہی ہے اور میں ان (سب) چیزوں سے بیزار ہوں جنہیں تم (االلہ کا) شریک ٹھہراتے ہو

تشریح:

سابقہ آیات میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت پر کفار کے اعتراضات کا جواب، اس کے دلائل اور اللہ تعالی نے اپنی توحید اور قوت وسطوت ثابت کرنے کے آفاقی اور طبعی دلائل دیے ہیں۔ جو شہادت کا درجہ رکھتے ہیں یاد رہے اللہ تعالیٰ کی شہادت سے بڑھ کر کسی کی شہادت نہیں ہوسکتی۔ توحید کی گواہی سب سے پہلی اور سب سے بڑی گواہی ہے۔

اب ان دلائل پر شہادت قائم کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اللہ تعالی کی شہادت سے بڑھ کر کوئی شہادت نہیں ہوسکتی۔ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ وہی اس کی ابتدا اور انتہا کو جانتا ہے۔ وہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور اس پر اقتدار اور اختیار رکھتا ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اس کی شہادت سے بڑھ کر کسی اور کی شہادت ٹھوس اور بڑی نہیں ہوسکتی۔ یاد رہے

شہادت کی دو بڑی اقسام ہیں

عینی اور یقینی شہادت :

عینی شہادت کا معنی ہے کہ واقعہ شہادت دینے والے کے سامنے پیش ہوا ہو اور یقینی شہادت کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے اتنے ٹھوس دلائل ہوں کہ کوئی اس کی تردید نہ کرسکے۔ اللہ تعالیٰ کی شہادت ان دونوں اصولوں کی بنیاد پر کامل اور اکمل حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی شہادت کو شہادت اکبر کا درجہ حاصل ہے۔ لہٰذا نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم ہوا کہ آپ اپنے اور ان کے درمیان اللہ تعالیٰ کو شاہد کے طور پر پیش فرمائیں کہ اسی نے آپ پر یہ قرآن وحی فرمایا تاکہ آپ ہر اس شخص کو اس کے برے اعمال کے انجام سے ڈرائیں جس تک قرآن کا پیغام پہنچ جائے۔ پھر فرمایا کہ ان سے پوچھیے کیا تم ان دلائل کے باوجود شہادت دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور بھی معبود ہوسکتا ہے ؟اس سوال کے بعد آپ کو حکم ہوا کہ میں یہ کہنے اور شہادت دینے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور بھی معبود ہوسکتا ہے۔ بلکہ آپ یہ اعلان فرمائیں کہ وہ ایک ہی الٰہ ہے اور میں تمہارے شرک سے برات کا اعلان کرتا ہوں۔ اس آیت میں توحید کے اثبات کے

ساتھ یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ امت مسلمہ کو اللہ تعالیٰ کا پیغام یعنی قرآن مجید لوگوں تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے تاکہ غیر مسلموں پر توحید و رسالت کی شہادت قائم ہو سکے۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیل القرآن)

شان نزول

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ اہل مکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہنے لگے کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمیں کوئی ایسا دکھایئے جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت کی گواہی دیتا ہو۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس میں فرمایا گیا کہ ’’اللہ عَزَّوَجَلَّ میرا گواہ ہے اور سب سے بڑا گواہ وہی ہے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری الجنان)

کفار مکہ نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا کہ آپ اپنی نبوت پر گواہ پیش کریں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی یعنی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کفار کو بتادیں کہ میری نبوت کا گواہ اللہ تعالیٰ ہے اور وہ سب سے زیادہ سچا اور معتبر گواہ ہے اور اس کی گواہی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اس نے مجھ پر قرآن مجید نازل فرمایا جو کہ زندہ جاوید معجزہ ہے۔ اگر میں نبی نہ ہوتا تو مجھ پر قرآن مجید نازل نہ ہوتا۔ نیز اس نے مجھ پر قرآن مجید اس لیے نازل فرمایا تاکہ میں اس قرآن کے ذریعے تمہیں اور قیامت تک آنے والے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید کا پیغام پہنچاؤں اور اس کے عذاب سے ڈراؤں۔ اس کے باوجود اگر تم میری دعوت کو تسلیم نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے خداؤں کو مانتے ہو تو میرا اعلان سن لو کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور صرف ایک ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا عبادت کے لائق نہیں ہے، لہٰذا ان میں ان بتوں کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا جن کو تم اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیتے ہو۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ الکرم)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی گواہی دینا سنت خدا ہے

اللہ تعالیٰ نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی گواہی کئی طرح دی: ایک یہ کہ اپنے خاص بندوں سے گواہی دلوادی۔ دوسرے یہ کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جو کلام اتارا، اس میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا اعلان فرمایا۔ تیسرے یہ کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بہت سے معجزات عطا فرمائے۔ یہ سب رب تعالیٰ کی گواہیاں ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کی گواہی دینا سنت رسول اللہ ہے اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی گواہی دینا سنت خدا ہے، ہمارے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا گواہ خود ربُّ العالمین عَزَّوَجَلَّ ہے اور کلمہ شہادت میں دونوں گواہیاں جمع فرمادی گئیں، سُبْحَانَ اللہ۔

{وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ: اور میری طرف اس قرآن کی وحی ہوئی ہے۔} یعنی اللہ تعالیٰ میری نبوت کی گواہی دیتا ہے اس لیے کہ اس نے میری طرف اس قرآن کی وحی فرمائی اور یہ ایسا عظیم معجزہ ہے کہ تم فصیح و بلیغ اور صاحب زبان ہونے کے باوجود اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز رہے، اس سے ثابت ہوا کہ قرآن پاک عاجز کرنے والا ہے اور جب یہ عاجز کرنے والا ہے تو اس کتاب کا مجھ پر نازل ہونا اللہ تعالیٰ کی طرف سے
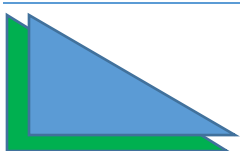
میرے رسول ہونے کی یقینی شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان ''لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ ''سے یہی مراد ہے یعنی میری طرف اس قرآن کی وحی فرمائی گئی تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کرنے سے ڈراؤں۔

{ وَمَنْۢ بَلَغَ : اور جن تک یہ پہنچے۔ } یعنی میرے بعد قیامت تک آنے والے جن افراد تک یہ قرآن پاک پہنچے خواہ وہ انسان ہوں یا جن ان سب کو میں حکم الٰہی کی مخالفت سے ڈراؤں۔ حدیث شریف میں ہے کہ جس شخص کو قرآن پاک پہنچا یہاں تک کہ اس نے قرآن سمجھ لیا تو گویا کہ اس نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھا اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کلام مبارک سنا۔

حضرت انس بن مالک (رض) نے فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کسریٰ اور قیصر وغیرہ سلاطین کو دعوت اسلام کے مکتوب بھیجے۔

اس کی تفسیر میں ایک قول یہ بھی ہے کہ "مَنْۢ بَلَغَ " بھی فاعل کے معنیٰ میں ہے اور معنی یہ ہیں کہ اس قرآن سے میں تمہیں ڈراؤں اور وہ ڈرائیں جنہیں یہ قرآن پہنچے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری الجنان)

جناب محمد برائے الٰہی۔۔۔ جناب الٰہی برائے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔

یعنی آپ فرمادیں اے کفار! مجھ پر قرآن اتارا گیا ہے یہ میری رسالت کی گواہی ہے کیونکہ تم اس کی ایک آیت کی مثل لانے سے بھی عاجز ہو اور یہ اس لیے اتارا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعے تمہیں عذاب آخرت سے ڈراؤں اور قیامت تک جس بھی انسان کے پاس یہ قرآن پہنچے اسے بھی ڈراؤں۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شان ختم نبوت

لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ۔ سے معلوم ہوا کہ حضور خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام نسل انسانیت کے لیے رسول ہیں۔ آپ کی نبوت تا قیامت ہے اور ساری انسانیت کو محیط ہے۔ اسی لیے آپ کے بعد کسی نئے نبی کی ضرورت نہیں۔ اسی لیے فرمایا گیا:

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا۔ "آپ فرمادیں اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔" (اعراف،158)

یعنی تا قیامت جو بھی انسان پیدا ہوگا، آپ ہی کی نبوت و رسالت کے سائے میں پیدا ہوگا، اسے آپ کے سایۂ کرم کی موجودگی میں کسی دوسرے سایہ کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ آفتاب نبوت ہیں، آفتاب کے طلوع کرانے کے بعد اب کسی ستارے کی ضرورت نہیں رہی، جو حقیقی ستارے تھے وہ بھی مدنی آفتاب کی شعاع میں گم ہوگئے۔

البتہ آخر زمانہ میں عیسیٰ (علیہ السلام) دوبارہ آئیں گے مگر اپنی نبوت کے منوانے کے لیے نہیں، بلکہ نبوت مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ڈنکا بجانے کے لیے آئیں گے۔

یعنی اے مشرکو! اگر تم یہ گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے تو یہ جہالت تمہی سنبھالو۔ ہم ایسی گواہی نہیں دے سکتے۔ ہم ایسے شرک سے بیزار ہیں۔ (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب القرآن)

ہجرت کے بعد حضرت عمر (رض) نے اس آیت کے بارے میں حضرت عبداللہ بن سلام (رض) سے پوچھا کہ تم حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کیسے پہچانتے تھے تو انھوں نے جواب دیا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اوصاف و کمالات اتنی وضاحت سے ہماری کتابوں میں تحریر تھے کہ ہم نے جب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھا تو یوں پہچان لیا جیسے ہم اپنے بچوں کو پہچان لیتے ہیں آخر میں فرمایا کہ بخدا میں تو اپنے بچے سے زیادہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پہچانتا ہوں کیونکہ اپنے بچوں کی ماں پر اتنا اعتماد نہیں جتنا اللہ کی بتائی ہوئی نشانیوں پر ہے۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی المعانی، تفسیر ال تفسیر الحسنات۔ علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)

ترمذی کی حدیث میں ہے کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ تر و تازہ کرے اس کو جس نے ہمارا کلام سنا اور جیسا سنا ویسا پہنچایا، بہت سے لوگ جنہیں کلام پہنچایا جائے وہ سننے والے سے زیادہ اہل ہوتے ہیں۔

اور ایک روایت میں ہے "سننے والے سے زیادہ افقہ ہوتے ہیں۔

اس سے فقہا کی قدر و منزلت معلوم ہوتی ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت اور قرآن کی ہدایت کسی زمان و مکان اور کسی قوم کے ساتھ خاص نہیں۔

{ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ: کیا تم گواہی دیتے ہو؟} یہاں مشرکوں سے خطاب ہے یعنی اے حبیب! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، آپ ان کافروں سے فرمائیں کہ اے مشرکو! کیا تم یہ گواہی دیتے ہو کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے ساتھ دوسرے معبود بھی ہیں؟ اے حبیب اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! تم فرماؤ کہ میں یہ گواہی نہیں دیتا بلکہ تم فرماؤ کہ وہ تو ایک ہی معبود ہے اور میں ان جھوٹے خداؤں سے بیزار ہوں جنہیں تم اللہ عَزَّوَجَلَّ کا شریک ٹھہراتے ہو۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری الجنان)

ان لوگوں کی تفصیل جن کو قرآن اور حدیث کی تبلیغ کی گئ

حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میری طرف سے تبلیغ کرو ' خواہ ایک آیت ہو۔ اور بنو اسرائیل سے احادیث بیان کرو ' کوئی حرج نہیں ہے اور جس نے مجھ پر عمدا جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے۔ (صحیح البخاری ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ' ۳۴۶۱ ' سنن ترمذی ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ' ۲۶۷۸ ' مسند احمد ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ' ۶۴۹۶ ' صحیح ابن حبان ' رقم الحدیث : ' ۶۲۵۶)

جن لوگوں کو قرآن اور حدیث کی تبلیغ کی گئی ' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں۔

حضرت ابو موسیٰ (رض) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ نے جس ہدایت اور علم کو دے کر مجھے بھیجا ہے ' اس کی مثال اس بارش کی طرح ہے جو کسی زمین پر برسی ' ان میں سے بعض زمینیں زرخیز تھیں۔ انھوں نے پانی کو قبول کرلیا اور تر اور خشک گھاس کو اگایا اور بعض غیر زرعی زمینیں تھیں ' ان میں پانی جمع ہوگیا ' اللہ نے ان سے لوگوں کو فائدہ پہنچایا۔ انھوں نے پانی پیا ' اپنے مویشیوں کو پلایا اور کھیتوں کو پانی دیا اور ایک اور زمین کی قسم پر بارش ہوئی جو بنجر تھی ' اس نے پانی جمع کیا ' نہ کچھ اگایا۔ یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے دین میں سمجھ حاصل کی اور اللہ نے جو دین دے کر مجھے بھیجا ہے ' اس سے نفع پایا۔ اس نے علم حاصل کیا اور لوگوں کو تعلیم دی اور یہ

مثال ہے اس شخص کی جس نے اس دین کی طرف بالکل توجہ نہیں کی اور اللہ کی اس ہدایت کو قبول نہیں کیا جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا ہے۔
(صحیح البخاری ' ج ا رقم الحدیث : ۷۹ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ ' بیروت)

پہلی مثال کے مصداق ائمہ مجتہدین ہیں ' دوسری مثال کے مصداق محدثین ہیں اور تیسری مثال کے مصداق کفار اور منافقین ہیں۔

بعض روایات میں مذکور ہے جس شخص کے پاس کتاب اللہ کی ایک آیت پہنچ گئی اس کے پاس اللہ کا حکم پہنچ گیا ' خواہ وہ اس پر عمل کرے یا نہ کرے۔ مقاتل نے کہا جن اور انس میں سے جس کے پاس قرآن پہنچ گیا ' وہ اس کو ڈرانے والا ہے۔ اور قرطبی نے کہا جس کے پاس قرآن پہنچ گیا گویا کہ اس نے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھا اور آپ ﷺ سے سنا۔ (الجامع لاحکام القرآن ' جز ٦ ' ص ٣١٠ ' مطبوعہ دار الفکر ' بیروت ' ١٤١٥ھ)

علامہ سید محمود آلوسی متوفی ١٢٧٠ھ لکھتے ہیں :

امام ابو نعیم وغیرہ نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص کے پاس قرآن پہنچ گیا ' گویا اس نے مجھ سے بالمشافہ سنا۔ اس آیت میں یہ فرمایا ہے آپ ﷺ کہئے کہ مجھ پر اس قرآن کی وحی کی گئی ہے ' تاکہ میں تم کو اس قرآن سے ڈراؤں اور ان لوگوں کو جن تک یہ قرآن پہنچے۔ اس آیت سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ جن لوگوں تک احکام شرعیہ نہیں پہنچے ' ان سے احکام شرعیہ پر عمل نہ کرنے کیوجہ سے مواخذہ نہیں کیا جائے گا اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے۔ امام ابو الشیخ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابی بن کعب (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس کچھ قیدی لائے گئے۔ آپ نے پوچھا تم نے ان کو اسلام کی دعوت دی ہے ؟ صحابہ نے فرمایا نہیں ! آپ ﷺ نے فرمایا ان کو چھوڑ دو۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی اور میری طرف اس قرآن کی وحی کی گئی ہے تاکہ میں تم کو اس قرآن سے ڈراؤں اور جس تک یہ پہنچے نیز یہ آیت بھی اس مطلوب پر دلیل ہے :
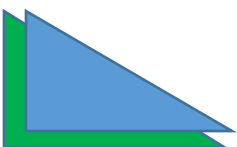
(آیت) " وماکنا معذبین حتی نبعث رسولا "۔ (الاسراء : ١٥)

ترجمہ : ہم اس وقت تک عذاب دینے والے نہیں ہیں ' جب تک کہ رسول نہ بھیج دیں۔

اس آیت میں فرمایا ہے آپ کہئے کہ وہ صرف ایک مستحق عبادت ہے اور بیشک میں ان (سب) سے بری ہوں جن کو تم اللہ کا شریک قرار دیتے ہو اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ اسلام قبول کرنے کے لیے صرف کلمہ طیبہ یا کلمہ شہادت پڑھ لینا کافی نہیں ہے ' بلکہ یہ ضروری ہے کہ اپنے پچھلے دین کے باطل ہونے کا اعتراف اور اقرار کرے اور اس سے برات اور بیزاری کا اظہار کرے۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی القرآن)

اسلام قبول کرنے والے کو کیا کرنا چاہیے ؟

اس آیت سے ثابت ہوا کہ جو شخص اسلام لائے اس کو چاہیے کہ توحید و رسالت کی شہادت کے ساتھ اسلام کے ہر مخالف عقیدہ و دین سے بیزاری کا اظہار کرے بلکہ تمام بے دینوں سے دور رہے اور کفر و شرک وگناہ سے بیزار رہے بلکہ مومن کو چاہیے کہ اپنی صورت ، سیرت ، رفتار وگفتار سے اپنے ایمان کا اعلان کرے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری الجنان)

آیت مبارکہ :

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝20

لغۃالقرآن : [اَلَّذِيْنَ : وہ لوگ][اٰتَيْنٰهُمُ : ہم نے دی انکو][الْكِتٰبَ : کتاب][يَعْرِفُوْنَهٗ : وہ اسکو پہچانتے ہیں][كَمَا : جیسے][يَعْرِفُوْنَ : وہ پہچانتے ہیں][اَبْنَآءَهُمْ : اپنے بیٹے][اَلَّذِيْنَ : وہ لوگ][خَسِرُوْٓا : انہوں نے خسارے میں ڈالا][اَنْفُسَهُمْ : اپنے نفسوں کو][فَهُمْ لَا : پس وہ نہیں][يُؤْمِنُوْنَ : وہ ایمان لاتے]

ترجمہ : وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی تھی اس (نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ویسے ہی پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، جنہوں نے اپنی جانوں کو (دائمی) خسارے میں ڈال دیا ہے سو وہ ایمان نہیں لائیں گے

تشریح:

توراۃاورانجیل میں حضوراکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت اور صفات کاتذکرہ بہت واضح اور نمایاں تھا۔اسی لیے یہودی اور عیسائی علماء حضوراکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کوآپ کی صفات کے آئینہ میں بطور نبی اس طرح پہنچانتے تھے جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے تھے۔ ۔(امدادالکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ الکرم)

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام (رض) نے حضرت عمر فاروق (رض) سے کہا: جب میں نے پہلی بار رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھا توآپ کو یوں پہچان لیا جیسے میں اپنے بیٹے پہچانتا ہوں اور جان لیا کہ یہ اللہ کے سچے رسول ہیں، کیونکہ اللہ نے ان کا حلیہ ہماری کتاب میں بیان فرمایا تھااور ہم نہیں جانتے کہ ہماری عورتوں نے کیا کیا۔(در منثور بروایت ثعلبی جلد اول صفحہ 357 مطبوعہ دارالفکر بیروت) (برہان القرآن القران۔علامہ قاری محمد طیب صاحب القرآن)

چنانچہ۔۔حضرت فاروق اعظم] نے جب حضرت عبداللہ بن سلام] سے پوچھا کہ جو تم پہچانتے ہو اور حق تعالیٰ اس سے خبر دیتا ہے، کہ وہ پہچان اپنے بیٹوں کی پہچان کے مثل ہے، یہ کس طور پر ہو سکتی ہے؟ حضرت عبداللہ سلام نے کہا کہ اپنے بیٹے کی صحت نسب سے زیادہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت پر یقین رکھتا ہوں، اس واسطے کہ حضرت کی رسالت توراۃ سے مجھے معلوم ہوئی، اور اپنے بیٹے کے نسب کی

صحت میں کیا جانوں کہ عورتوں نے کیا کیا ہے؟ حضرت عمر] نے فرمایا، خدا توفیق کو تیری رفیق کرے اے عبداللہ، تو پکی سمجھ والا اور سچا ہے۔ (تفسیر تفسیر اشرفی۔علامہ محمد مدنی اشرفی جیلانی)

یہاں عیسائی علماء اور راہبوں کی گواہی ملاحظہ کریں

1۔ ورقہ بن نوفل: پہلی وحی کے بعد ام المومنین حضرت خدیجہ (رض) آپ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ نوفل کے پاس لے گئیں، جس نے زمانہ جاہلیت میں عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ وہ انجیل کو عبرانی زبان میں لکھا کرتا تھا۔ وہ عمر رسیدہ اور نابینا ہو چکا تھا۔ ورقہ نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا: آپ نے کیا دیکھا ہے، تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سارا واقعہ سنا دیا۔ ورقہ نے کہا: یہ وہ راز دان ہے جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوا تھا۔ کاش کہ میں جوان ہوتا اور جب آپ کو آپ کی قوم مکہ سے نکالے گی کاش میں اس وقت زندہ ہوتا۔ اس پر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کیا یہ لوگ مجھے مکہ سے نکالیں گے؟ ورقہ نے کہا: جی ہاں! جو بھی یہ بھلائی کا پیغام لاتا ہے اس کے ساتھ دشمنی کی جاتی ہے۔ اگر میں اس وقت زندہ ہوا تو آپ کی زبردست مدد کروں گا۔ اس کے بعد جلد ہی ورقہ فوت ہو گیا۔ (بخاری: کتاب بدء الخلق: حدیث نمبر 3)

2۔ بحیریٰ راہب: حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عمر جب بارہ سال کے قریب پہنچی تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جناب ابوطالب کے ساتھ شام کا سفر کیا۔ جب یہ قافلہ بصریٰ میں داخل ہوا تو بحیریٰ کے نام سے مشہور ایک عیسائی راہب نے اپنی خانقاہ سے دیکھا کہ اس عربی قافلہ میں ایک بچہ ہے جس پر بادل کا ایک ٹکڑا سایہ فگن ہے۔ وہ بچہ جدھر جاتا ہے بادل کا ٹکڑا ساتھ ساتھ جاتا ہے۔ بحیریٰ اس دور میں عیسائیوں کا سب سے بڑا عالم تھا۔ اس نے جب اپنی خانقاہ کے دریچہ سے یہ منظر دیکھا تو اسے خیال آیا کہ جس صادق وامین نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہم منتظر ہیں اور جس کی علامات ہماری کتابوں میں مرقوم ہیں کہیں یہ بچہ وہی تو نہیں۔ اسے قریب سے دیکھنا چاہیے تاکہ اس کی نشانیوں کے بارے میں پورا وثوق ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنی خانقاہ سے نکل کر قافلہ والوں کے پاس آیا اور کہا کہ آپ کے قافلہ کے تمام افراد کو میں دعوت دیتا ہوں کہ آج کھانا میرے ہاں تناول فرمائیں، جب قافلے والے کھانے سے فارغ ہوئے تو اس نے سب کو رخصت کر دیا لیکن حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور جناب ابوطالب کو روک لیا اور حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ان کی نیند اور بیداری کی کیفیات کے بارے میں دریافت کیا۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو حالت اسے بتاتے اس سے ان صفات کی تصدیق ہوتی جاتی تھی جو نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں اس کے پاس تھی۔ آخر میں اس نے کمر مبارک سے کپڑا اٹھایا اور اس نے مہر نبوت کو بعینہٖ اس صورت میں دیکھا جو اس کے پاس تھی اور بے ساختہ جھک کر مہر نبوت کو چوم لیا۔

اس کے بعد بحیریٰ نے جناب ابوطالب سے پوچھا: اس بچے سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟ آپ نے کہا: یہ میرا بیٹا ہے۔ بحیریٰ نے کہا: یہ آپ کا بیٹا نہیں ہے اور نہ اس کا باپ زندہ موجود ہو سکتا ہے۔ تب جناب ابوطالب نے کہا: یہ میرا بھتیجا ہے۔ تو بحیریٰ نے کہا: آپ اپنے بھتیجے کو لے کر وطن واپس لوٹ جائیں اور یہودیوں سے ہر وقت ہوشیار رہیں۔ اگر انھوں نے دیکھ لیا اور ان کو ان حالات کا علم ہوا گیا جن کا مجھے علم ہوا ہے تو وہ ان کو نقصان پہنچانے سے باز نہیں آئیں گے۔ آپ کے بھتیجے کی بڑی شان ہو گی۔ یہ سارے جہانوں کا سردار ہے، یہ رب العالمین کا رسول ہے۔

ان کو اللہ تعالیٰ سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر مبعوث فرمائے گا۔ چنانچہ جناب ابوطالب قافلے کے ساتھ شام گئے اور جلدی جلدی کاروبار سے فراغت پا کر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو لے کر واپس مکہ لوٹ آئے۔ یہ واقعہ تھوڑے بہت الفاظ کے اختلاف کے ساتھ درج ذیل کتابوں میں موجود ہے: (السیرۃ النبویہ لابن ہشام: جلد اول ص 166۔ تاریخ اسلام: شمس الدین الذہبی: جلد اول ص 55۔ البدایہ والنہایہ لابن کثیر: جلد اول ص 283۔ سبل الہدیٰ والرشاد للامام محمد الشامی: جلد دوم ص 189۔ تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ النبی: پیر محمد کرم شاہ الازہری: جلد دوم ص 107)

3۔ حبشہ کے عیسائی بادشاہ نجاشی نے حضرت جعفر بن ابی طالب (رض) کی زبان سے قرآن مجید سن کر کہا کہ عیسیٰ اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعلیمات میں ذرہ برابر فرق نہیں ہے، یہ ایک ہی سورج کی کرنیں ہیں اور جب حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہجرت کرکے مدینہ تشریف لائے تو حبشہ کے نجاشی نے ستر عیسائی علماء اور راہبوں کا ایک فود مدینہ بھیجا تاکہ وہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ملاقات کرکے مزید معلومات حاصل کریں۔ چنانچہ اس وفد نے جب حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبان مبارک سے سورۃ یاسین کی تلاوت سنی تو ان ستر علماء اور راہبوں کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور وہ حق کو پہچان کر مسلمان ہوگئے۔ یہ واقعہ سورۃ مائدہ کی آیت نمبر 83 کی تفسیر میں تفصیل سے لکھا جاچکا ہے، وہاں ملاحظہ کریں۔

المختصر یہودی اور عیسائی علماء کو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آمد کا یقین تھا اور وہ اپنی مشکلات میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نام کے وسیلے سے دعائیں مانگا کرتے تھے۔ (قرآن: 2:89) اور جب حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس دنیا میں تشریف فرما ہوئے تو کئی یہودی اور عیسائی علماء آپ پر ایمان لے آئے لیکن اکثر نے آپ کو پہچاننے کے باوجود آپ کا انکار کر دیا بلکہ عوام سے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صفات کو چھپانا شروع کر دیا۔ اس طرح انھوں نے حق کا انکار کرکے اپنے آپ کو نقصان میں ڈال دیا، للذا وہ اپنے تعصب کی وجہ سے ایمان نہیں لائیں گے۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ الکرم)

حضرت صفیہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ میرے والد حیی بن اخطب اور چچا ابو یاسر صبح کے وقت رسول محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں پہنچ کر اسلام کے بارے میں مذاکرات کرتے ہیں۔ انھیں یقین ہوگیا کہ حقیقتاً آپ نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔ جب آپ سے گفتگو کے بعد مغرب کے وقت واپس آئے تو نہایت تھکے ماندے دکھائی دے رہے تھے۔

چچا ابو یاسر میرے والد سے پوچھتے ہیں: أَهُوَ هُوَ؟ "کیا یہی وہ نبی ہے جس کا تذکرہ توراۃ وانجیل میں پایا جاتا ہے؟"

والد: کیوں نہیں یہ وہی رسول ہے۔

ابو یاسر: أَتَعْرِفُهُ وَتُثْبِتُهُ؟ "کیا واقعی تو اسے پہچانتا ہے؟"

والد: ہاں میں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔

ابو یاسر: فَمَا فِيْ نَفْسِكَ مِنْهُ؟ "پھر آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

والد: عَدَاوَتُهُ وَاللّٰهِ مَا بَقِيْتُ "کہ اللہ کی قسم! جب تک زندہ ہوں عداوت کا اظہار کرتا رہوں گا"۔

[ابن ہشام: شہادۃ عن صفیۃ]

امام رازی نے اس ضمن میں عجب واقعہ ذکر کیا ہے لکھتے ہیں کہ جنگ بدر کے موقع پر اخنس بن شریق نے ابو جہل کو لوگوں سے الگ کر کے پوچھا کہ اے ابوالحکم ! یہ بتائیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے یا سچا؟ ابو جہل نے کہا کہ ابن شریق تجھ پر نہایت ہی افسوس کہ اس میں کیا شک ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) واقعی اللہ کا سچا رسول ہے۔ اس لیے کہ اس نے آج تک کسی فرد کے ساتھ جھوٹ نہیں بولا۔ لیکن ہماری مخالفت کی وجہ یہ ہے کہ پہلے ہی بڑے بڑے مناصب اور اعزاز۔ ان کے خاندان کے پاس ہیں۔ جنگ کے موقع پر پرچم اٹھانا، کعبہ کی دربانی اور نگہبانی، لوگوں کو زم زم پلانا اور یہ سب اعزازات ان کے پاس ہیں۔ اگر ہم نے اس کی نبوت کو تسلیم کر لیا تو ہمارے پاس کیا رہ جائے گا۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیل القرآن)

اہل کتاب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں مگر حاسد ہیں

یعنی اس کے علاوہ کہ میری صداقت کا خدا گواہ ہے اور قرآن کریم اس کی ناطق اور ناقابل تردید شہادت دے رہا ہے۔ وہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) بھی جن کی طرف کتب سماویہ کا عالم سمجھ کر تم میرے معاملہ میں رجوع کرتے ہو، اپنے دلوں میں پورا یقین رکھتے ہیں کہ بلاشبہ میں ہی وہ نبی آخر الزماں ہوں جس کی بشارت انبیائے سابقین دیتے چلے آئے ہیں۔ ان کو جس طرح بہت سے بچوں میں سے اپنی اولاد کے شناخت کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، ایسے ہی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن کریم کی صداقت کے معلوم کرنے میں بھی کوئی شبہ اور دھوکا نہیں ہے۔ البتہ حسد، کبر، تقلید آباء، اور حب جاہ و مال وغیرہ اجازت نہیں دیتے کہ مشرف بایمان ہو کر اپنی جانوں کو نقصان دائمی اور ہلاکت ابدی سے بچائیں۔

حضرت زید کا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پہچاننا

حضرت زید بن سعنہ جو اہل کتاب میں سے ہیں انھوں نے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو توراۃ وانجیل کے بیان کردہ اوصاف ہی کے ذریعہ پہچانا تھا، صرف ایک وصف ایسا تھا جس کی ان کو پہلے تصدیق نہیں ہو سکی تھی، امتحان کے بعد تصدیق ہوئی، وہ یہ کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حلم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے غصہ پر غالب ہوگا، پھر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں پہنچ کر تجربہ کیا تو یہ صفت بھی پوری طرح آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں پائی اسی وقت مسلمان ہو گئے۔ (تفسیر گلدستہ)

واقعہ یہ ہے کہ بعض اہل کتاب نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو صرف ظاہری علامتوں سے پہچاننے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جو علامتیں آپ کے اخلاق کے حوالے سے ان کی کتابوں میں بیان کی گئی تھیں 'جب تک اس کی تصدیق نہیں کر لی 'اس وقت تک وہ ایمان نہیں لائے۔ اہل کتاب میں سے ایک شخص جن کا نام زید بن سعنہ ہے 'ان سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک دفعہ قرض لیا۔ واپسی کی کوئی

تاریخ طے ہو گئی۔ لیکن وہ واپسی کی تاریخ سے کئی روز پہلے مطالبہ کرنے کے لیے آپہنچے۔ آپ نے صرف یہ فرمایا کہ بھئی ابھی تو واپسی کا وقت نہیں آیا۔ لیکن انھوں نے بجائے اپنی غلطی کو سمجھنے کے 'سخت رویہ اختیار کیا۔ بڑھتے بڑھتے یہ تک کہہ ڈالا کہ تم جو آل عبدالمطلب ہو تم تو ہمیشہ کے نادہند ہو۔ تم قرض لیتے ہو 'لیکن تمھیں واپسی کی فکر نہیں ہوتی۔ جب وہ بدزبانی میں یہاں تک پہنچ گیا تو صحابہ کرام جو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ادب کی وجہ سے خاموش بیٹھے سب کچھ دیکھ رہے تھے 'ان میں اشتعال پیدا ہوا اور حضرت عمر فاروق (رض) نے اٹھ کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور اسے ڈانٹا۔ تب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سختی سے حضرت عمر فاروق سے فرمایا: اسے چھوڑ دو۔ آپ نے فرمایا: تم نے اسے ڈانٹ کر اچھا نہیں کیا۔ انھوں نے عرض کی کہ حضور آپ دیکھ نہیں رہے 'وہ کیسے بدزبانی کر رہا ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تمھیں دونوں کو سمجھانا چاہیے تھا۔ مجھے کہتے کہ قرض لیا تھا تو واپسی کی فکر بھی کرنی چاہیے تھی۔ اسے کہتے کہ تقاضہ کرتے ہوئے شائستگی کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اب جبکہ تم نے اس کے ساتھ سختی کی ہے، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اسی وقت اس کا قرض ادا کرو اور سختی کے بدلے میں اصل قرض سے زائد ادا کرو۔ اس شخص نے اپنا قرض وصول کیا اور وہاں سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد غسل کر کے واپس آیا اور آکر عرض کی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھے مسلمان کیجیے۔ مسلمان ہونے کے بعد اس نے بتایا کہ میں پہلی آسمانی کتابوں کا عالم ہوں۔ میں نے حضور کی ایک ایک علامت دیکھ لی تھی 'لیکن ایک علامت دیکھنا باقی تھا۔ ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ نبی آخر الزمان اس قدر حلیم اور بردبار ہوں گے کہ لوگوں کی سختی اور بدتمیزی ان کی بردباری کو شکست نہیں دے سکے گی۔ کہا آج میں صرف اس علامت کو دیکھنے اور آزمائش کرنے آیا تھا۔ جب یہ علامت بھی پوری ہو گئی تو اب اسلام لانے میں دیر نہیں کی جا سکتی۔

ایسے اور اہل کتاب کے بہت سے واقعات ہیں 'جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فی الواقع آنحضرت کو پوری طرح پہچانتے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ واقعی اسی طرح پہچانتے تھے تو پھر وہ ایمان کیوں نہیں لاتے تھے؟ اس کے بارے میں اس آیت کریمہ کے دوسرے حصے میں فرمایا گیا کہ جن لوگوں نے اپنی جانوں کو گھاٹے میں ڈالا 'وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ مقصد یہ ہے کہ دنیا میں ہر بیماری کا علاج ممکن ہے 'لیکن خودکشی کا کوئی علاج نہیں۔ آپ کسی بھی خودکشی کرنے والے کو کسی ایک جگہ سے روک لیں گے 'دو جگہ سے روک لیں گے 'لیکن اگر وہ فیصلہ کر چکا ہے کہ اس نے خودکشی ضرور کرنی ہے تو آپ کہاں کہاں اسے روکیں گے۔ یہ لوگ بھی ایمانی خودکشی کا فیصلہ کر چکے تھے اور حسد اور بغض نے ان کو اس حد تک اندھا کر دیا تھا کہ آخرت کو جانتے ہوئے بھی 'آخرت کو بھول چکے تھے۔

بگڑی ہوئی قوموں میں بگاڑ کی کوئی ایک شکل وصورت نہیں ہوتی۔ بگڑے ہوئے لوگ بھی سب یکساں نہیں ہوتے۔ اہل کتاب میں بھی ایک تو ایمان نہ لانے والوں میں یہ لوگ تھے 'جن کو حسد اور بغض نے ایمان لانے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ لیکن ان کے علاوہ ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جن کو بے فکروں کا گروہ کہنا چاہیے۔ انھیں اس بات سے کوئی غرض ہی نہیں تھی کہ نبی آخر الزماں تشریف لا چکے ہیں۔ وہ ہمیں کسی بات کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ ہمیں ہمارے برے انجام سے بچانا چاہتے ہیں۔ وہ دنیا کے اللے تللوں اور عیش و عشرت کی مستیوں میں اس حد تک ڈوب چکے تھے کہ انھیں سوائے اپنے شغل بے کار کے اور کسی بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی مثال دیکھنا چاہیں تو ہمارے گرد و پیش میں بہت ساری مثالیں موجود ہیں۔ ایسے لوگ جنھوں نے حرام ذرائع سے دنوں میں دولت پیدا کی ہے۔ جنھوں نے عہدہ و منصب سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے دنیا کا مال جمع کر لیا اور بری صحبتوں میں پڑ کر ناؤنوش کی زندگی اختیار کر چکے ہیں۔ یہ لوگ جب کبھی کسی تقریب میں اکٹھے ہو کر معصیت کا کاروبار کر رہے ہوتے ہیں یا ہر سال کے آغاز میں سال کا پہلا دن منا رہے ہوتے ہیں یا کسی

بھی حوالے سے عیش و عشرت کی کوئی تقریب پیدا کر لیتے ہیں تو آپ ان لوگوں سے کبھی بات کر کے دیکھیے۔ انھیں ان کی موت یاد دلایئے ' شرافت اور شائستگی کی بات چھیڑ کر دیکھیے 'شرم و حیا کا تذکرہ کر کے دیکھ لیجئے 'ملک کے بگڑے ہوئے حالات کا واسطہ دیجئے 'کوئی سی بھی سنجیدہ بات نہ صرف کہ ان کے قریب سے بھی ہو کر نہیں گزرتی 'بلکہ وہ انھیں قابل نفرت معلوم ہوتی ہے۔ دنیا کی کوئی بات ہو 'آپ ان کی معلومات پر حیران رہ جائیں گے۔ لیکن دین اور آخرت کی بات 'ایسا معلوم ہوگا کہ وہ شاید پہلی دفعہ سن رہے ہیں۔ یہی وہ طبقہ ہے 'جن کے بارے میں قرآن کریم نے کہا:

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ (الروم: ۷)

(یہ لوگ دنیا کے ظاہر کو اچھی طرح جانتے ہیں 'لیکن آخرت سے بالکل غافل ہیں)

اہل کتاب میں بھی اس طرح کے لوگ بہت بڑی تعداد میں موجود تھے۔ انھیں ان موضوعات سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ان کے بارے میں قرآن کریم کہہ رہا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا ہے۔ یعنی وہ دنیا کی سرمستیوں میں ڈوب کر آخرت کی فلاح کو بھول چکے ہیں۔ اس لیے وہ ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ ایمان ان کی سوچ سے اب میل نہیں کھاتا۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے انسانوں کا طبقہ صرف دولتمندوں اور صاحب منصب لوگوں میں ہوتا ہے چونکہ ان کے یہاں دولت کی ریل پیل ہوتی ہے اور وہ مسائل کی پریشانیوں سے دور ہوتے ہیں۔ اس لیے ایمان و عمل کی باتیں ان کے لیے اجنبی ہو جاتی ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس طرح کے لوگ آپ کو غربا میں بھی ملیں گے۔ وہ مزدور 'جو دن بھر کی مزدوری سے رات کو روٹی کھانے کے قابل ہوتا ہے۔ ان میں بھی آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے 'جنھیں دین کی باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔ وجہ اس کی ظاہر ہے کہ پہلے طبقے کو مسائل سے لاتعلّقی گمراہ کرتی ہے اور دوسرے طبقے کو مسائل کا ہجوم کسی اور طرف دیکھنے کا موقع نہیں دیتا۔ یہ دونوں ہی اپنی جانوں کے دشمن اور اپنے انجام سے بے خبر لوگ ہیں۔ جب تک گہری منصوبہ بندی اور نہایت دلسوزی کے ساتھ ان لوگوں میں کام کا راستہ نہیں نکالا جائے گا 'اس وقت تک ان کی سوچ میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی القرآن)

آیت مبارکہ:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ 21○

لغۃ القرآن: [وَمَنْ : اور کون][اَظْلَمُ : زیادہ ظالم][مِمَّنِ : اس سے][افْتَرٰي : جھوٹ باندھے][عَلَي اللّٰهِ : اللہ پر][كَذِبًا : جھوٹ][اَوْ : یا][كَذَّبَ : جھٹلایا اس نے

][بِاٰیٰتِهٖ : اس کی آیات][اِنَّهٗ : یقیناً وہ][لَا یُفْلِحُ : نہیں فلاح پائے گا][الظّٰلِمُوْنَ : ظالم]

ترجمہ :

اور اس سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے جس نے اللہ پر جھوٹا بہتان باندھا یا اس نے اس کی آیتوں کو جھٹلایا؟ بیشک ظالم لوگ فلاح نہیں پائیں گے

تشریح :

منکرین حق کا نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا انکار کرنا، اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ شریک ٹھہرانا اور اپنے باطل نظریات کی تائید کے لیے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولنا ظلم ہے۔

شریعت کی نظر میں جھوٹ بولنا انتہائی قبیح گناہ ہے۔ اس جرم کی سنگینی میں اس وقت بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے جب کوئی شخص اپنے باطل نظریات کو اللہ تعالیٰ کے ذمہ لگا کر اسے حق ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ ایسا شخص نہ صرف پرلے درجے کا کذّاب شمار ہوتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین ظالم سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ ذات حق پر جھوٹ بول کر لوگوں کو گمراہی کا راستہ دکھانا انتہائی سنگین جرم ہے۔ ایسے ظالم آخرت میں ہر قسم کی مدد سے محروم ہوں گے اکثر اوقات دنیا میں بھی ناکامی کا منہ دیکھیں گے۔ منکرین حق اللہ تعالیٰ پر درج ذیل جھوٹ بولا کرتے ہیں۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیل القرآن)

اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان لگانے کا مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں کا اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں دیا ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے منسوب کیا جائے۔ یہ بہت بڑا ظلم ہے، جیسے کفار مکہ یہ کہتے تھے کہ یہ بت اللہ تعالیٰ کے شریک ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انھیں ان کی عبادت کرنے اور ان کے ذریعے اپنا قرب حاصل کرنے کا حکم دیا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو شرک کرنے والے پر جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم قرار دیا ہے۔ (قرآن : 72:5) پھر وہ خود شرک کا حکم کیسے دے سکتا ہے؟ نیز قرآن مجید میں شرک کو ظلم عظیم قرار دیا گیا ہے۔ (قرآن : 12:31) اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلانے کا مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں کو ماننے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے ان کا انکار کر دینا۔ یہ بھی بہت بڑا ظلم ہے۔ جیسے کفار مکہ قرآن پاک کی صداقت اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا صرف تعصب کی وجہ سے انکار کرتے تھے۔

بہر حال جو شخص اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان لگائے یا اس کی آیتوں کا انکار کرے دونوں صورتوں میں وہ ظالم ہے۔ اور ظالم آخرت میں تو یقیناً ناکام ہوگا ہی، تاہم اس دنیا میں بھی ظلم کا انجام برا ہوتا ہے، لہٰذا کسی بھی شخص کو ظلم میں ملوث ہونے سے پہلے اس کے انجام پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹ منسوب کرنا ظلم عظیم ہے اسی طرح نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف جھوٹ منسوب کرنا بھی آخرت کا خسارہ اور جہنم کا راستہ ہے۔ جیسا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

"جو شخص دانستہ مجھ پر جھوٹ بولے یعنی جو بات میں نے نہیں کہی وہ میری طرف منسوب کرے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔" (بخاری : کتاب العلم : باب 38) (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ الکرم)

کفار مکہ کہتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور انھوں نے بحیرہ 'سائبہ 'حامی اور وصلہ سے نفع حاصل کرنے کو حرام قرار دیا تھا 'اور وہ اس حرمت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ یہود و نصاری بھی اللہ تعالیٰ پر بہتان لگاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ان کی شریعتیں غیر منسوخ ہیں اور ان کے نبیوں کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور خصوصا یہود یہ کہتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں اور دوزخ کی آگ ہمیں صرف چند دن جلائے گی اور ان میں سے بعض جہلاء یہ کہتے تھے کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں 'اور خصوصا نصاری یہ کہتے تھے کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے اور اللہ تو مسیح ابن مریم ہی ہے اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ کے بیٹے ہیں 'اور یہود و نصاری ان دونوں میں سے ہر ایک اس بات کا دعوی دار تھا کہ ان کے سوا اور کوئی جنت میں نہیں جائے گا اور یہ تمام باتیں اللہ تعالیٰ پر افتراء اور بہتان ہیں 'اللہ تعالیٰ ان سے پاک ہے۔

ان کا دوسرا ظلم اللہ کی آیتوں کو جھٹلانا ہے۔ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کے ثبوت پر اللہ تعالیٰ نے جو معجزات ظاہر فرمائے یہود و نصاری اور مشرکین نے ان کو جھٹلا دیا اور قرآن مجید جو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت پر سب سے بڑا معجزہ ہے 'باوجود اس کے کہ وہ اس کی نظیر لانے کے چیلنج کو پورا نہیں کرسکے 'انھوں نے اس کو کھلا جادو کہا 'کبھی شعر و شاعری کہا اور کبھی گزرے ہوئے لوگوں کی داستان کہا اور کبھی کہا یہ محض ان کے تخیلات ہیں۔ انھوں نے اس کے کلام الہی ہونے کا انکار کیا اور آپ کی نبوت پر ایمان نہیں لائے۔

(تفسیر تبیان القران۔

غلام رسول سعیدی القرآن)

حضرت عکرمہ نے روایت کیا کہ کفار مکہ میں سے نظرہ بن حارث نے کہا روز قیامت لات و عزی میری شفاعت کریں گے اس کے رد میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری : وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی : یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ پر افتراء یا اس کی آیات کی تکذیب کرنے والے سے بڑا ظالم کون ہے اور یہ کہنا کہ فلاں شخص یا فلاں چیز کو اللہ نے اپنے ہاں شفاعت کا مرتبہ دیا ہے۔ جیسے نضر بن حارث نے اپنے بتوں کے متعلق تصور کیا جبکہ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ مرتبہ نہ دیا ہو، یہ اللہ پر افتراء ہے۔ یونہی کفار آیات قرآنیہ کی تکذیب کرتے تھے تو فرمایا گیا کہ اس سے بڑا ظلم بھی کوئی نہیں۔ کیونکہ جو رب ہمیں ہر نعمت دیتا ہے اس پر افتراء یا اس کی باتوں کی تکذیب اس کی ایذا ہے اور اللہ کی ایذا سے بڑا ظلم واقعتاً کوئی نہیں۔

یہاں سے دو فوائد حاصل ہوئے :

1 ۔ جھوٹے دعویداران نبوت کی سزا اور برائی :

جب اللہ پر افتراء سب سے بڑا ظلم ہے تو خود کو اللہ کا نبی کہنے کا جھوٹا دعویٰ کرنا اللہ پر افتراء کی بدترین مثال ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) سے مروی ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : لا تقوم الساعۃ حتی یکون فی امتی ثلاثون کذابون دجالون کلھم یدعی انہ نبی وانا خاتم النبیین لا نبی بعدی۔ قیامت نہ آئے گی جب تک کہ میری امت میں تیس دجال کذاب نہ آئیں ان میں سے ہر کوئی کہے گا کہ وہ نبی ہے مگر میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں (ترمذی کتاب الفتن)

یہ حدیث بتارہی ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد دعوائے نبوت کرنے والا بقولی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کذاب اور دجال ہے خواہ وہ کسی قسم کی نبوت کا دعویٰ کرے کہ آپ آخری نبی ہیں آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور جو شخص اس لفظ کا معنیٰ کوئی اور کرے وہ واقعی کذاب و دجال ہے۔

2۔ جھوٹی حدیثیں گھڑنے والوں کی سزا:

جھوٹی حدیثیں گھڑنا بھی اللہ پر افتراء ہے کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد بھی حقیقت میں قول خدا ہے اور ایسے شخص کے جہنمی ہونے میں کوئی شک نہیں جو آپ ﷺ کی طرف جھوٹی حدیث منسوب کرکے بالواسطہ اللہ پر افتراء کرے۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار۔ "جس نے جان بوجھ کر میری طرف جھوٹی بات منسوب کی وہ سمجھ لے کہ جہنم میں اس کی جگہ تیار ہے"۔ (بخاری کتاب العلم باب 58۔ مسلم کتاب الایمان حدیث 112)

اسلام پر یہ ظلم عظیم بھی ہوا کہ جھوٹی حدیثیں گھڑنے والے جھوٹے وضاع راوی پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے جھوٹے مذاہب کو سچا ثابت کرنے کے لئے سینکڑوں حدیثیں گھڑیں اور لوگوں کے ان کے عقائد مختل کر دیئے۔ اگر قرآن کریم اور ہزاروں احادیث صحیحہ کا ذخیرہ نہ ہوتا تو سارا دین مشتبہ ہو جاتا مگر اللہ رب العزت اس دین کا محافظ ہے۔ (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب القرآن)

آیت مبارکہ:

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ شُرَكَاۗؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ○22

لغۃ القرآن: [وَيَوْمَ : اور دن][نَحْشُرُهُمْ : ہم اکٹھا کریں گے انکو][جَمِيْعًا : سب][ثُمَّ : پھر][نَقُوْلُ : ہم کہیں گے][لِلَّذِيْنَ : ان لوگوں کیلئے][اَشْرَكُوْٓا : شریک ٹھہرائے انہوں نے][اَيْنَ شُرَكَاۗؤُكُمُ : کہاں تمہارے شریک][الَّذِيْنَ كُنْتُمْ : وہ لوگ تھے تم][تَزْعُمُوْنَ : تم گمان کرتے]

ترجمہ: اور جس دن ہم سب کو جمع کریں گے پھر ہم ان لوگوں سے کہیں گے جو شرک کرتے تھے: تمہارے وہ شریک کہاں ہیں جنہیں تم (معبود) خیال کرتے تھے

تشریح:

یوم نحشرھم جمیعاً ۔ نحشر۔ حشر سے بنا اس کے معنی ہیں جمع کرنا۔ جمیعاً فرما کر یہ بتلایا کہ تمام کفار کو جمع کیا جائے گا۔ یعنی اے محبوب انھیں یاد دلاؤ کہ اے لوگو وہ دن یاد کرو جب ہم سارے کفار کو جمع کریں گے یہ دن کفار اور مومنین کو علیحدہ کرنے کا دن ہوگا اسی لیے اس کو یوم الفصیل کہتے ہیں۔ ثم نقول للذین اشرکوآ۔ یہ صرف بت پرست مشرکین ہیں۔

این شرکآء کم الذین کنتم تزعمون این۔ کہاں۔ استفہام یعنی پوچھ گچھ کے لیے آتا ہے۔ شرک آؤکم۔ سے مراد بت یا پوپ پادری ہیں جنہیں ان کفار نے شریک رب مانا تھا۔ تزعمون۔ زعم سے ہے۔ اس کے معنی گمان جو غلط ہو۔ یہاں جھوٹا گمان غلط خیال مراد ہیں اس آیت سے واضح ہو گیا کہ ان کے خود ساختہ معبود ان کے ساتھ ہوں گے مگر بے بس و مجبور ہوں گے تب یہ ارشاد ہوگا کہ آج تمہارے بتوں کی مدد کہاں ہے۔

ثم لم تکن فتنتھم فتنہ کے لغوی معنی پرکھنا اور آزمائش کرنا وہے۔ حضرت قتادہ (رح) نے کہا کہ یہاں فتنہ سے مراد عذر اور بہانہ ہے اور جب ان کو مالک و خالق کے دربار میں میدان محشر میں لایا جائے گا اور وہ غضب الٰہی عزوجل کا مشاہدہ کریں گے تو ان کو کوئی جواب نہ بن پڑے گا اس وقت وہ جھوٹ کا سہارا لیں گے اور صاف کہہ دیں گے کہ اے ہمارے رب ہم نے تو شرک کیا ہی نہیں الا ان قالوا واللہ ربنا ما کنا مشرکین۔

ویوم نحشرھم جمیعاً اور جس دن ہم سب کو اٹھائیں گے پھر فرمائیں گے انھیں جو شرک کرنے والے ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر خدا کو شریک کر رہے ہیں کہ وہ شریک جن کا تمھیں گمان باطل تھا کہاں ہیں تو پھر نہ رہے گا ان کا شرک جو کفر کا فتنہ تھا مگر یہ کہ کہنا پڑ گیا قسم بخدا جو ہمارا رب ہے ہم تو مشرکوں میں سے نہ تھے یعنی ایسے باطل گمان والوں کا انجام جنھوں نے اپنی زندگی میں اس شرک کو لازم کر لیا تھا اور اس پر مقاتلہ کرتے تھے یہ ہوگا کہ صاف انکار کریں گے اور کہیں گے قسم خدا کی جو ہمارا رب ہے ہم تو شرک سے بیزار تھے اسی بناء پر **ثم لم تکن فتنتھم** فرمایا اس لیے کہ وہ گمان ان کا کذب محض تھا تو بروز قیامت قسم کھا کھا کر ما کنا مشرکین کہیں گے۔ (تفسیر ال تفسیر الحسنات۔ علامہ ابو الحسنات سید محمد احمد قادری)

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مشرکوں کو جمع کرکے پوچھے گا: کہاں ہیں وہ تمہارے بت جن کو تم اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا کرتے تھے۔ آج ان کو بلاؤ تاکہ وہ تمہیں قیامت کے عذاب سے بچائیں، لیکن بت تو خود بے بس ہیں، وہ اس دن مشرکوں سے بیزاری کا اعلان کریں گے۔ (قرآن: 166:2) اب مشرکین کی ذلت و رسوائی کی کوئی حد نہیں رہے گی کیونکہ جن بتوں کو وہ اپنا سہارا سمجھتے تھے وہ ساتھ چھوڑ گئے اور ان سے لگائی ہوئی امیدیں بھی غائب اور باطل ہو گئیں تو گھبرا کر جھوٹ کا سہارا لیں گے یعنی جن بتوں کی دنیا میں وہ پوجا کرتے تھے ان سے لا تعلّقی کا اعلان کر دیں گے اور جھوٹی قسمیں کھا کر کہیں گے کہ وہ شرک نہیں کرتے تھے۔ اس واضح غلط بیانی پر ان کی زبانوں کو سیل کر دیا جائے گا یعنی ان کی زبانوں سے بولنے کی قوت سلب کرکے ان کے ہاتھ پاؤں کو دے دی جائے گی اور وہ حقیقت حال صاف صاف بیان کر دیں گے۔ (تفسیر ابن

کثیر) کہ ان کی زبانوں نے جھوٹ بولا یہ واقعی دنیا میں شرک کرتے تھے۔اس کی مثال اس چور کی سی ہے کہ جب وہ چوری کررہا تھا تو سیکورٹی کیمرہ اس کی نقل وحرکت کو محفوظ کررہا تھا اور عدالت میں چور نے جب اپنی چوری سے انکار کیا تو سیکورٹی کیمرہ کی فلم نے اس کے جھوٹ کو ظاہر کردیا۔اسی طرح میدان حشر میں جو جھوٹ بولنے کی کوشش کرے گا اس کے ہاتھ پاؤں اس کے جھوٹ کو ظاہر کردیں گے۔
ان آیات میں شرک کرنے والوں کے لیے درس عبرت ہے تاکہ وہ آج شرک سے توبہ کرکے اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کرلیں ورنہ قیامت کے دن پشیمان ہوئے تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ الکرم)

روز قیامت مشرکین کی ناکامی اور نامرادی

اس آیت میں ذکر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرکین کو ملامت کرنے اور ان کی مذمت کرنے کے لیے ان سے سوال فرمائے گا تمہارے وہ شرکاء اور جھوٹے معبود اور پتھر کی مورتیاں کہاں ہیں جن کے متعلق تم دنیا میں یہ زعم کرتے تھے کہ یہ تمہارے کارساز ہیں اور مددگار ہیں اور وہ تمہیں اللہ کے قریب کردیں گے اور اللہ تعالیٰ سے تمہاری شفاعت کرکے تمہیں عذاب سے چھڑالیں گے 'اب وہ کہاں ہیں۔ وہ تمہارے ساتھ کیوں دکھائی نہیں دیتے ؟اس کی نظیر یہ آیتیں ہیں :
(آیت) "ویوم ینادیھم فیقول این شرکآءی الذین کنتم تزعمون"۔ (القصص : ٦٢)
ترجمہ : اور جس دن اللہ ان کو ندا کرکے فرمائے گا 'میرے وہ شرکاء کہاں جن کو تم (میرا شریک) زعم کرتے تھے۔
(آیت) "ومانری معکم شفعآء کم الذین زعمتم انھم فیکم شرکآء لقد تقطع بینکم وضل عنکم ما کنتم تزعمون"۔ (الانعام : ٩٤)
ترجمہ : ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارش کرنے والوں کو نہیں دیکھ رہے جن کے متعلق تم یہ زعم کرتے تھے کہ وہ تمہارے کاموں میں (ہمارے) شریک ہیں 'بیشک تمہارا (خودساختہ) ربط ٹوٹ گیا اور تم دنیا میں جو زعم کرتے تھے وہ ٹوٹ گیا۔
حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا قرآن مجید میں جہاں بھی زعم کا لفظ آیا ہے اس کا معنی ہے جھوٹا قول۔
جب اللہ تعالیٰ ان کو رسوا کرنے کے لیے یہ سوال فرمائے گا تو وہ اس کے جواب میں حیران اور پریشان ہوں گے اور کوئی صحیح اور معقول جواب ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا اور اس کے سوا نہیں کوئی بات نہیں سوجھے گی کہ وہ دنیا میں اپنے کیے ہوئے شرک کا انکار کردیں یا اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کی مغفرت اور بخشش ہو رہی ہے تو وہ کہیں گے کہ ہم بھی مشرک نہیں تھے۔ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے گناہوں کو بخش دے گا اور اس کے نزدیک ان کا کوئی گناہ بھاری نہیں ہوگا۔ جب مشرکین یہ ماجرا دیکھیں گے تو کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کو بخش رہا ہے اور شرک کو نہیں بخش رہا 'آؤ ہم بھی یہ کہیں کہ ہم گناہ گار ہیں 'مشرک نہیں ہیں۔ جب وہ اپنے شرک کو چھپائیں گے تو ان کے مونہوں پر مہر لگ جائے گی اور ان کے ہاتھ اور پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے 'اس وقت مشرکین یہ جان لیں گے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپا نہیں سکتے 'جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :
(آیت) "یومئذ یود الذین کفروا وعصوا الرسول لو تسوی بھم الارض ولا یکتمون اللہ حدیثا"۔ (النساء : ٤٢)

ترجمہ : جن لوگوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی 'اس دن وہ تمنا کریں گے 'کاش ان پر زمین ہموار کر دی جائے اور وہ اللہ سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے۔

بعض مفسرین نے کہا یہ آیت منافقین کے متعلق ہے اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے۔

امام مسلم بن حجاج قشیری ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ صحابہ کرام نے عرض کیا 'یارسول اللہ ! کیا ہم قیامت کے دن اپنے رب کو دیکھیں گے ؟ آپ نے فرمایا کیا دوپہر کے وقت جب بادل نہ ہوں تو سورج کو دیکھنے میں تمہیں کوئی تکلیف ہوتی ہے ؟ صحابہ نے کہاں نہیں ! آپ نے فرمایا چودھویں رات کو جب بادل نہ ہوں تو کیا چاند کو دیکھنے سے تمہیں کوئی تکلیف ہوتی ہے ؟ صحابہ نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے ! تمہیں اپنے رب کو دیکھنے میں صرف اتنی تکلیف ہوگی جتنی تکلیف تم کو سورج یا چاند کو دیکھنے سے ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا پھر اللہ تعالیٰ بندہ سے ملاقات کرے گا اور اس سے فرمائے گا 'اے فلاں ! کیا میں نے تجھ کو دیکھنے سے ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا پھر اللہ تعالیٰ بندہ سے ملاقات کرے گا اور اس سے فرمائے گا 'اے فلاں کیا میں نے تجھ کو عزت اور سرداری نہیں دی ؟ کیا میں نے تجھ زوجہ نہیں دی اور کیا میں نے تیرے لیے گھوڑے اور اونٹ مسخر نہیں کیے اور کیا میں نے تجھ کو ریاست اور آرام کی حالت میں نہیں چھوڑا وہ بندہ کہے گا 'کیوں نہیں ! اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تو یہ گماں کرتا تھا کہ تو مجھ سے ملنے والا ہے ؟ وہ کہے گا نہیں اللہ تعالیٰ فرمائے گا 'میں نے بھی تجھ کو اسی طرح بھلا دیا ہے جس طرح تو نے مجھے بھلا دیا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ دوسرے بندہ سے ملاقات کرے گا اور فرمائے گا 'کیا میں نے تجھ کو عزت اور سیادت نہیں دی ؟ کیا میں نے تجھ کو زوجہ نہیں دی ؟ کیا میں نے تیرے لیے گھوڑے اور اونٹ مسخر نہیں کیے ؟ اور کیا میں نے تجھ کو ریاست اور آرام کی حالت میں نہیں چھوڑا ؟ وہ شخص کہے گا کیوں نہیں اے میرے رب ! اللہ تعالیٰ فرمائے گا 'کیا تو یہ گمان کرتا تھا کہ تو مجھ سے ملنے والا ہے ؟ وہ کہے گا نہیں اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے بھی تجھ کو اسی طرح بھلا دیا جس طرح تو نے مجھے بھلا دیا تھا 'پھر اللہ تعالیٰ تیسرا بندہ کو بلا کر اس سے اسی طرح فرمائے گا۔ وہ کہے گا اے میرے رب ! میں تجھ پر 'تیری کتاب پر اور تیرے رسولوں پر ایمان لایا 'میں نے نماز پڑھی 'روزہ رکھا اور صدقہ دیا اور وہ اپنی استطاعت کے مطابق اپنی نیکیاں بیان کرے گا 'اللہ تعالیٰ فرمائے گا ابھی پتا چل جائے گا 'پھر اس سے، کہا جائے گا ہم ابھی تیرے خلاف اپنے گواہ بھیجتے ہیں 'وہ بندہ اپنے دل میں سوچے گا 'میرے خلاف کون گواہی دے گا ؟ پھر اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی اور اس کی ران 'اس کے گوشت اور اس کی ہڈیوں سے کہا جائے گا 'تم بولو ! پھر اس کی ران 'اس کا گوشت اور اس کی ہڈیاں اس کے اعمال بیان کریں گی اور یہ اس لیے کیا جائے گا کہ خود اس کی ذات میں اس کے خلاف حجت قائم ہو۔ یہ وہ منافق ہوگا جس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوگا۔ (صحیح مسلم 'الزہد '۱۶ '(۲۹۶۸) ۷۳۰۴ 'سنن ابوداؤد 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۴۷۳۰) (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی القرآن)

"قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا ہوگا۔ " (المعارج، آیت : ۴) اس میں مختلف مراحل ہوں گے اور ہر مرحلہ ہزاروں سال پر محیط ہوگا۔ ان مراحل میں ایک مرحلہ ایسا بھی آئے گا کہ معبودان باطل اور ان کے عابدوں کو ایک دوسرے کے سامنے کھڑا کیا جائے گا تاکہ دنیا میں ایک دوسرے سے امیدیں رکھنے والے لوگوں کے عقیدہ کی قلعی کھل جائے۔ البقرہ آیت ۱۶۵ تا ۱۶۷ میں بیان ہوا ہے کہ جب یہ لوگ جہنم کا عذاب دیکھیں گے تو انھیں یقین ہو جائے گا کہ ہر قسم کی قوت وسطوت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اس یقین کے بعد طالب اپنے مطلوب، تابع اپنے متبوع، مقتدیٰ اپنے مقتدی اپنے لیڈروں سے نفرت کا اظہار کریں گے، ایک دوسرے پر لعنت کرتے ہوئے مطالبہ کریں گے کہ اے خدا ہمارے

سرداروں کو دوگنا عذاب دیجیے۔ (الاحزاب: ٦٧۔ ٦٨) جھوٹے رہنماؤں کے پیچھے لگنے والے اس خواہش کا بھی اظہار کریں گے کہ کاش ہمیں دنیا میں واپس جانے کی اجازت مل جائے تو ہم ان لوگوں سے اسی طرح بیزاری اور نفرت کا اظہار کریں جیسے آج یہ ہم سے بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں۔ (البقرہ: ١٦٧) جب ان کی یہ حسرت پوری نہیں ہوسکے گی تو پھر وہ اپنے گناہوں اور شرک کا انکار کرتے ہوئے قسمیں اٹھائیں گے۔ اے اللہ! تیری ذات کی قسم! ہم نے کبھی شرک نہیں کیا۔ ان کے انکار کی دو وجوہات ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ کی ہیبت وجلالت اور گرفت۔ دنیا میں جھوٹی قسمیں کھانے کی عادت کی وجہ سے وہ رب کی بارگاہ میں جھوٹی قسمیں اٹھائیں گے کہ شاید دنیا کی طرح آج بھی ہم بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائیں۔ یہ ضرور جھوٹ بولیں گے اس لیے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ دیکھیے! یہ ظالم کس طرح اللہ کے حضور جھوٹی قسمیں کھانے کے ساتھ اپنے آپ پر جھوٹ بولیں گے اور وہ سب کچھ بھول جائیں گے جو دنیا میں مکر وفریب اور افتراء پر دازی کیا کرتے تھے۔

(عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ (رض) قَالَ أَمَّا قَوْلُهُ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ فَإِنَّهُمْ رَأَوْا أَنَّهُ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا أَهْلُ الصَّلَاةِ. فَقَالُوا تَعَالَوْا فَلْنَجْحَدْ. فَيَجْحَدُونَ. فَيَخْتِمُ اللّٰهُ عَلَى أَفْوَاهِهِمْ. وَتَشْهَدُ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ وَلَا يَكْتُمُونَ اللّٰهَ حَدِيثًا) [ابن کثیر]

”مفسرِ قرآن حضرت عبداللہ بن عباس (رض) اس کی یوں تفسیر کیا کرتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ توحید والوں کے گناہ بخش دے گا اور اس کے لیے کسی کے گناہ معاف کرنا مشکل نہیں۔ مشرکین یہ صورت حال دیکھ کر کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے شرک کے علاوہ باقی گناہ بخش رہا ہے آؤ ہم بھی یہ کہیں کہ ہم گناہ گار تو ہیں لیکن مشرک نہیں۔ جب اپنے شرک کو چھپائیں گے تو ان کے منہ پر مہر لگ جائے گی اور ان کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ اس وقت مشرکین یہ جان لیں گے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کچھ بھی نہیں چھپا سکتے۔“ (ابن کثیر)

اس کے بعد ان کی زبانوں پر مہریں لگا دی جائیں گی:

(اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَى أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ) [یٰسٓ: ٦٥]

”آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے۔“ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیل تلیقا)

میدان قیامت کی ہولناکی

ایک حدیث میں رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب کہ اللہ تعالیٰ تم کو میدان حشر میں ایسی طرح جمع کر دیں گے جیسے تیروں کو ترکش میں جمع کر دیا جاتا ہے، اور پچاس ہزار سال اسی طرح رہو گے، اور ایک روایت میں ہے کہ قیامت کے روز ایک ہزار سال سب اندھیرے میں رہیں گے۔ آپس میں بات چیت بھی نہ کر سکیں گے (یہ روایت حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے ذکر کی ہے)

اس سب سے بڑی امتحان گاہ میں اول تو ایک عرصہ دراز ایسا گزرے گا کہ امتحان شروع ہی نہ ہوگا، یہاں تک کہ یہ لوگ تمنا کرنے لگیں گے کہ کسی طرح امتحان اور حساب جلد ہو جائے، انجام کچھ بھی ہو، یہ تردّد اور تذبذب کی تکلیف تو جائے،

گو یا یوں فرمایا کہ جس روز ہم سب کو جمع کریں گے اس روز سب پر ایسی دہشت طاری ہو جائے گی کہ نا قابل بیان ہے الفاظ کی حدود کے اندر نہیں آسکتی سورج قریب آ جائے گا۔ پسینہ کی لگام لگ جائے گی یعنی منہ تک لوگ پسینہ میں غرق ہوں گے پسینہ بہ کر ستر ہاتھ زمین میں گھس جائے گا وغیرہ وغیرہ جیسا کہ صحیح احادیث میں آیا ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس وقت کیا حال ہوگا جب تم کو اللہ پچاس ہزار برس تک جمع کر رکھے گا جیسے تیر دان کے اندر تیر اکٹھے کئے جاتے ہیں (اس مدت میں) تمہاری طرف نظر بھی نہیں کرے گا۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور بیہقی نے حضرت ابن عمر (رض) کی روایت سے بیان کیا ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ بھی فرمایا قیامت کے دن تاریکی میں ہزار برس تک تم کو روک رکھا جائے گا کہ بات بھی نہ کر سکو گے۔ رواہ البیہقی عن ابن عمر (رض)۔

تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی

آیت مبارکہ :

ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ

23○

لغۃالقرآن: [ثُمَّ لَمْ : پھر نہیں][تَكُنْ : ہوگی][فِتْنَتُهُمْ : انکی معذرت][اِلَّآ اَنْ : مگر یہ کہ][قَالُوْا : وہ کہیں گے][وَاللّٰهِ : قسم اللہ کی][رَبِّنَا : ہمارے رب][مَا كُنَّا : نہیں تھے][مُشْرِكِيْنَ : ہم شرک کرنے والے]

ترجمہ : پھر ان کی (کوئی) معذرت نہ رہے گی بجز اس کے کہ وہ کہیں (گے) : ہمیں اپنے رب اللہ کی قسم ہے ! ہم مشرک نہ تھے

تشریح:

آخر کار انکار ہی کرنا پڑے گا

یعنی بجز انکار واقعات کے کچھ کرتے دھرتے نہ بن پڑے گی۔ باطل معبودین کی جس عقیدت و محبت میں مفتون ہو رہے تھے، اس کی حقیقت صرف اتنی رہ جائے گی کہ ساری عمر کے عقیدے اور تعلق سے بھی انکار کر بیٹھیں گے۔ (تفسیر گلدستہ)

حلفیہ جھوٹا بیان دینے کے سوا انھیں کوئی مکر کی راہ نظر نہ آئی۔ یہ مکار لوگ قیامت کے دن جب ایمان والے موحدین کی بزرگیاں اور ان کے بلند مراتب دیکھیں گے، تو آپس میں کہیں گے، آؤ شرک سے انکار کر دیں، تاکہ ہم بھی نجات پا جائیں، تو سب خدا کی قسم کھا کر کہیں گے، کہ " ہم لوگ مشرک نہ تھے "۔

اس وقت اللہ تعالیٰ ان کے مونہوں پر مہر کر دیگا، پھر ان کے ہاتھ پاؤں گواہی دینگے، پھر حکم الٰہی ہوگا کہ لیجاؤ جہنم میں۔ ظاہر ہے کہ مشرکین کا جواب کذب صریح تھا، جسے انھوں نے عمداً پیش کیا، حالانکہ وہ بخوبی جانتے تھے کہ وہ دنیا میں کفر و شرک میں منہمک رہے۔ یہ بھی ممکن ہے انھوں نے یہ جواب حیرت و مدہوشی کے عالم میں دیا ہو۔ پھر بھی کذب تو کذب ہی ہے، خواہ کوئی ہوش میں رہ کر بولے۔۔ یا۔۔ مدہوش ہو کر۔۔ الحاصل۔۔ ہر حال میں ان کا یہ جواب ان کا فتنہ اور ان کی شرارت ہے۔ (تفسیر تفسیر اشرفی۔ علامہ محمد مدنی اشرفی جیلانی)

خفیہ پولیس کی گواہی

محشر میں جب یہ قسمیں کھا کر اپنے شرک و کفر سے انکاری ہو جائیں گے تو اس وقت قادر مطلق ان کے مونہوں پر مہر سکوت لگا دیں گے اور ان کے اعضاء و جوارح ہاتھ پاؤں کو حکم دیں گے کہ تم شہادت دو کہ یہ لوگ کیا کیا کرتے تھے، اس وقت ثابت ہوگا کہ ہمارے ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان یہ سب کے سب خدا تعالیٰ کی خفیہ پولیس تھی، وہ تمام اعمال و افعال کو ایک ایک کرکے سامنے رکھ دیں گے۔

عبداللہ بن عباس (رض) نے یہی بتلایا کہ پہلے پہلے تو خوب جھوٹ بولیں گے اور جھوٹی قسمیں کھائیں گے، لیکن جب خود ان کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے تو اس وقت کوئی غلط بات کہنے کی جرات نہ رہے گی۔

ان دونوں آیتوں میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ یاد رکھنے کی ہے کہ اللہ جل شانہ، نے مشرکین کو حشر کے ہولناک میدان میں جو یہ اختیار دیا کہ وہ آزادانہ جو چاہیں کہہ سکیں یہاں تک کہ جھوٹی قسم کھا کر انھوں نے شرک سے انکار کر دیا۔

جھوٹ بولنے کی بری عادت

اس میں شاید اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جھوٹ بولنے کی عادت ایک ایسی خبیث عادت ہے جو چھوٹتی نہیں، یہاں تک کہ یہ لوگ جو دنیا میں مسلمانوں کے سامنے جھوٹی قسمیں کھالیا کرتے تھے یہاں بھی باز نہ آئے اور پوری خلق خدا کے سامنے ان کی رسوائی ہوئی، اسی لیے قرآن و حدیث میں جھوٹ بولنے پر شدید وعید اور مذمت فرمائی گئی ہے، قرآن میں جابجا کاذب پر لعنت کے الفاظ آئے ہیں، اور رسول کریم (صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جھوٹ سے بچو، کیونکہ جھوٹ فجور کا ساتھی ہے، اور جھوٹ اور فجور دونوں جہنم میں جائیں گے (ابن حبان فی صحیحہ)

اور رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دریافت کیا گیا کہ وہ عمل کیا ہے جس سے آدمی دوزخ میں جائے۔آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ وہ عمل جھوٹ ہے (مسند احمد)

جھوٹ بولنے والوں کو عذاب

شب معراج میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کی دونوں باچھیں چیر دی جاتی ہیں۔ وہ پھر درست ہو جاتی ہیں، پھر چیر دی جاتی ہیں، اسی طرح یہ عمل اس کے ساتھ قیامت تک ہوتا رہے گا۔آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جبرائیل امین سے دریافت کیا کہ یہ کون ہے ؟ تو انھوں نے فرمایا کہ یہ جھوٹ بولنے والا ہے۔

کافروں کا حیلہ اور ناکامی

قیامت کے دن جب کفار دیکھیں گے کہ اللہ مسلمانوں کے گناہ تو معاف فرمارہا ہے اور شرک کو معاف نہیں فرماتا تو وہ مشرک ہونے سے انکار کردیں گے اور کہیں گے واللہ ہم مشرک نہیں تھے اس وقت اللہ ان کے منہ پر مہر لگادے گا اور ان کے ہاتھ پاؤں ان کے اعمال کی شہادت دیں گے ایسی حالت میں ان کو تمنا ہو گی کاش ہم زمین کا پیوند ہو جاتے خاک کے ساتھ خاک بن جاتے اس وقت وہ اللہ سے کوئی بات نہیں چھپا سکیں گے (حضرت ابن عباس (رض) کی توضیح کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتدائی حالت میں وہ شرک کا انکار کریں گے اور جب دست و پا کی شہادت کے بعد حقیقت کھل جائے گی تو پھر کوئی بات چھپا نہ سکیں گے) (تفسیر گلدستہ)

(ف ت ن) الفتن

دراصل فتن کے معنی سونے کو آگ میں گلانے کے ہیں تاکہ اس کا کھرا کھوٹا ہونا ہو جائے اس لحاظ سے کسی انسان کو آگ میں ڈالنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے قرآن میں ہے : ۔یَوۡمَ ہُمۡ عَلَی النَّارِ یُفۡتَنُوۡنَ [الذاریات/13] جب ان کو آگ میں عذاب دیا جائے گا۔ (مفردات)
فتنہ سے مراد کفر ہے یعنی انجام کفر یہ ہو گا کہ طویل تامل وندامت کے بعد وہ کہیں گے۔ حضرت ابن عباس (رض) اور قتادہ (رض) نے فتنہ کا ترجمہ عذر کیا ہے ان کا عذر ان کے لیے فتنہ ہو گا کیونکہ وہ معذرت کو رہائی اور بچاؤ کا ذریعہ سمجھ رہے ہوں گے حالانکہ اس جواب سے ان کو رہائی نہ ہو سکے گی۔فتنت الذہب میں نے سونے کو میل کچیل سے الگ کردیا۔ عربی کا محاورہ ہے۔ یا فتنۃ سے مراد ہے جواب۔ جواب چونکہ جھوٹا ہو گا اس لیے اس کو فتنہ فرمایا۔ بعض علماء نے فتنہ کا ترجمہ تجربہ کیا ہے چونکہ سوال ان کے اندرونی خیال کو ظاہر کرانے کا ایک تجربہ ہو گا اس لیے جواب کو تجربہ فرمایا۔ (تفسیر مظہری)

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ کی حدیث ہے فرمایا: "اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے ملاقات کرے گا اور فرمائے گا: اے فلاں! کیا میں نے تجھے عزت نہیں دی تھی اور تجھے سردار نہیں بنایا تھا اور میں نے تیرا نکاح نہیں کیا تھا اور میں نے تیرے لیے گھوڑے اور اونٹ کو مسخر نہیں کیا تھا، میں نے تجھے رائیس نہیں بنایا تھا کہ راحت سے رہتا تھا؟ وہ کہے گا: کیوں نہیں اے میرے رب! پھر فرمائے گا: کیا تو گمان رکھتا تھا کہ تو مجھ سے ملاقات کرنے والا ہے؟ وہ کہے گا نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں نے تجھے فراموش کر دیا جس طرح تو نے مجھے فراموش کیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ دوسرے بندے سے ملے گا تو اسے فرمائے گا: وہ بھی اسی طرح کہے گا، پھر تیسرے سے ملے گا اسے یہ فرمائے گا تو وہ کہے گا: یارب! میں تجھ پر، تیری کتاب پر، اور تیرے رسولوں پر ایمان لایا اور میں نے نماز پڑھی اور میں نے روزہ رکھا اور میں نے صدقہ کیا، جتنی اسے طاقت ہوگی وہ تعریف کرے گا۔ فرمایا: اسے کہا جائے گا: یہاں ٹھہر، پھر اسے کہا جائے گا: ابھی ہم تجھ پر گواہ پیش کریں گے، وہ دل میں سوچے گا کون ہے جو مجھ پر گواہی دے گا؟ پھر اس کے منہ پر مہر لگادی جائے گی اور اس کی ران، گوشت اور ہڈیاں اس کے عمل کے متعلق بولیں گی، وہ اپنے نفس سے بہانہ بنائے گا: یہ منافق ہے، اس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوگا (ا) (صحیح مسلم، کتاب الزہد، جلد ۲۔ صفحہ ۴۰۹) (تفسیر قرطبیؒ)

ایک لطیف معنی

زجاج نے کہا یہ لفظ اس جگہ ایک لطیف معنی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ بعض محب محبوب پر شیفتہ فریفتہ ہوتے ہیں۔ لیکن جب اس شیفتگی اور عشق میں ان پر مصائب آتے ہیں تو وہ محبوب سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ان سے کہا جاتا ہے تمہارا عشق بس یہ ہوا (کہ دکھ پڑا تو عشق کو بھول گئے) قیامت کے دن بتوں کی محبت سے بھی کافر اسی طرح بیزار ہو جائیں گے۔ میں کہتا ہوں بتوں کی محبت ہی کیا بڑوں سے بھی اظہار نفرت کریں گے۔ تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی

آیت مبارکہ:

اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ

24○

لغۃ القرآن: [اُنْظُرْ : آپ دیکھیں][كَيْفَ : کس طرح][كَذَبُوْا : انہوں نے جھوٹ بولا][عَلٰٓي : پر][اَنْفُسِهِمْ : ان کی جانیں][وَضَلَّ : اور گم ہوگیا][عَنْهُمْ : ان سے][مَّا كَانُوْا : جو وہ تھے][يَفْتَرُوْنَ : وہ جھوٹ بناتے]

ترجمہ : دیکھئے انھوں نے خود اپنے اوپر کیسا جھوٹ بولا اور جو بہتان وہ (دنیامیں) تراشا کرتے تھے وہ ان سے غائب ہو گیا

تشریح:

اے میرے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! ملاحظہ ہو ان کی بے بسی کا عالم ! ساری عمر جن کو پوجتے رہے، جن کی جے بولتے رہے۔ جن کی وجہ سے آپ کو ستایا۔ اذیتیں پہنچائیں آج ان سے دست بردار ہو رہے ہیں۔ ان کی خدائی کا انکار کر رہے ہیں۔ قیامت میں پیش آنے والے واقعات اور ان کے حسرتناک انجام کے ذکر سے مطلوب یہ ہے کہ کفار آج ہی ان کمینہ حرکات سے باز آجائیں۔ آج ہی شرک سے تائب ہو کر اللہ تعالیٰ کی توحید کا دل وجان سے اعتراف کرلیں۔ ورنہ قیامت کے دن پشیمان ہوئے تو اس کا کیا فائدہ ہوگا۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ القرآن)

روز حشر مشرکین کی بری حالت کا بیان

روز قیامت اللہ رب العزت مشرکوں پر اتمام حجت کرنے کے لیے ان سے فرمائے گا کہ بتاوہ تمہارے جھوٹے خدا کہاں ہیں جنہیں تم سمجھتے تھے کہ وہ اللہ کی خدائی میں شریک ہیں اس وقت مشرکین کوئی اور جھوٹ نہ گھڑ سکیں گے سوااس کے کہ کہیں گے ہمیں اپنے رب اللہ کی قسم ! ہم نے دنیامیں کوئی شرک نہ کیا تھا، اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے پیارے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دیکھئے یہ لوگ کس طرح اپنے اوپر جھوٹ کا وبال ڈال رہے ہیں یعنی اللہ کے سامنے حاضر ہو کر بھی جھوٹ بولنے سے باز نہیں آرہے۔

اگر کہا جائے کہ قرآن کہتا ہے لایکتمون اللہ حدیثا۔ کفار اللہ سے کچھ چھپا نہ سکیں گے۔ پھر کفار کا اللہ کے حضور جھوٹ بولنا کیسے متصور ہے تو اس کا جواب حضرت عبداللہ بن عباس (رض) نے یہ دیا کہ ابتدا میں کہیں گے ہم نے کوئی شرک نہ کیا تھا تب ان کے منہ پر مہر لگادی جائے گی اور ان کے ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء ان کے خلاف ان کے گناہوں کی گواہی دیں گے تب وہ اللہ سے کچھ چھپا نہ سکیں گے' (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب القرآن)

ان کا وہ افترا جو وہ بتوں کے بارے میں عقیدہ رکھتے تھے، کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں، قیامت میں یکسر غلط ہو جائے گا۔

اس مقام پر یہ ذہن نشین رہے ان کا سفارشی بنانے کا عقیدہ اس لحاظ سے غلط نہیں تھا، کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سفارشی بنانا حرام ہے، بلکہ اس معنی میں غلط تھا کہ انھوں نے ایسی اشیاء کو خدا تعالیٰ کے ہاں سفارشی بنایا، جو سفارشی ہونے کے اہل نہیں، بلکہ مغضوب ومعتوب تھے اور ایسوں کا سفارشی نہ ہوسکنا کلام الٰہی میں منصوص ہے۔ ان مشرکین کے عوام تو عوام ہی تھے، یہ جنہیں بہت بڑا دانشور سمجھتے تھے ۔۔ مثلا: ابوسفیان، ولید، نضر، عتبہ، شیبہ، ابو جہل اور ان جیسے دوسرے لیڈر، ان سب کی بھی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ناکارہ ہو چکی تھی۔ (تفسیر تفسیر اشرفی۔ علامہ محمد مدنی اشرفی جیلانی)

۔۔ چنانچہ ۔۔ کلبی نے بیان کیا ایک بار ابوسفیان بن حرب ' ابو جہل بن ہشام ' ولید بن مغیرہ ' نضر بن حارث ' عتبہ بن ربیعہ ' شیبہ بن ربیعہ ' امیہ بن خلف ' ابی بن خلف اور حارث بن عامر جمع ہو کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے قرآن سننے لگے۔ ساتھیوں نے نضر سے کہا ابو قتیلہ محمد کیا کہہ رہا ہے۔ نضر نے کہا مجھے تو معلوم نہیں کیا کہہ رہا ہے۔ زبان ہلا رہا ہے اور پرانے لوگوں کی کچھ داستانیں اسی طرح کہہ رہا ہے

جس طرح گزشتہ اقوام کے قصے میں تم سے بیان کرتا ہوں۔ نضر اقوام پارینہ کے قصے اور افسانے بہت زیادہ بیان کیا کرتا تھا۔ ابو سفیان بولا میرے خیال میں تو بعض باتیں سچ کہتا ہے ابو جہل بولا ہر گز نہیں ،تم ایسا اقرار نہ کرو بعض روایات میں آیا ہے کہ ابو جہل نے کہا اس سے تو ہمارے لیے موت آسان ہے اس لیے اللہ نے آیات ذیل نازل فرمائیں۔ (تفسیر مظہری)

مجاہد (رح) فرماتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ مخلوق کو جمع کرے گا اور مشرکین اللہ تعالیٰ کی وسعت رحمت ملاحظہ کریں گے اور مسلمانوں کے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت اور اسی طرح مومنین کی دوسرے مومنوں کے متعلق شفاعت دیکھیں گے تو وہ ایک دوسرے کو کہیں گے۔ آؤ شرک چھپائیں شاید کہ ہم بھی اہل توحید کے ساتھ نجات پا جائیں۔ پس اس وقت ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نداء دی جائے گی۔ اَیۡنَ شُرَکَآؤُکُمُ الَّذِیۡنَ کُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ (انعام : ۲۲) تمہارے وہ شریک کہاں ہیں جن کو تم شریک گمان کرتے تھے۔ مشرک اس وقت کہیں گے : وَاللّٰہِ رَبِّنَا مَا کُنَّا مُشۡرِکِیۡنَ (انعام : ۲۳) کہ اے اللہ ہمیں آپ کی ربوبیت کی قسم ہم تو مشرک ہی نہ تھے۔ پس اس وقت اللہ تعالیٰ ان کے منہ پر مہر لگا دے گا۔ اور ان کے جوارح ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ وَضَلَّ عَنۡہُمۡ اور ان سے غائب ہو جائیں گے۔ مَّا کَانُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ جن کی الوہیت اور شفاعت کو جھوٹ باندھتے تھے۔ (تفسیر مدارک)

اس تعلق سے ارشاد ربانی ہے کہ اے محبوب ! دیکھئے انھوں نے خود اپنے اوپر کیسا جھوٹ بولا اور جو بہتان وہ (دنیا میں) تراشا کرتے تھے وہ ان سے غائب ہو گیا۔

مسلمان جھوٹ نہیں بولتا

اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ آدمی پورا مومن اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک جھوٹ کو بالکل نہ چھوڑ دے یہاں تک کہ مزاح و مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولے۔

نیز بیہقی وغیرہ میں بسند صحیح وارد ہے کہ مسلمان کی طبیعت میں اور بری خصلتیں تو ہو سکتی ہیں، مگر خیانت اور جھوٹ نہیں ہو سکتا، اور ایک حدیث میں ہے کہ جھوٹ انسان کے رزق کو گھٹا دیتا ہے۔ (تفسیر گلدستہ)

آیت مبارکہ :

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ 25○

لغۃ القرآن: [وَمِنْهُمْ : اور بعض ان سے][مَّنْ : جو][يَّسْتَمِعُ : کان لگاتے][اِلَيْكَ : آپ کی طرف][وَجَعَلْنَا : اور ہم نے کردیا][عَلٰي : پر][قُلُوْبِهِمْ : ان کے دلوں][اَكِنَّةً : پردہ][اَنْ يَّفْقَهُوْهُ : یہ کہ وہ سمجھیں اسکو][وَفِيْٓ: اور میں][اٰذَانِهِمْ : ان کے کان][وَقْرًا: ڈاٹ][وَاِنْ يَّرَوْا : اور اگر وہ دیکھیں][كُلَّ اٰيَةٍ : ہر نشانی][لَّا يُؤْمِنُوْا : نہیں وہ ایمان لائیں][بِهَا : اس کے ساتھ][؟: یہاں تک کہ][اِذَا : جب][جَاۗءُوْكَ : آپ کے پاس آتے ہیں][يُجَادِلُوْنَكَ : وہ جھگڑا کرتے ہیں آپ سے][يَقُوْلُ : وہ کہتے][الَّذِيْنَ : وہ لوگ][كَفَرُوْٓا : جنہوں نے انکار کیا][اِنْ هٰذَآ : نہیں یہ][اِلَّآ : مگر][اَسَاطِيْرُ : قصے کہانیاں][الْاَوَّلِيْنَ : پہلے لوگوں کی]

ترجمہ : اور ان میں کچھ وہ (بھی) ہیں جو آپ کی طرف کان لگائے رہتے ہیں اور ہم نے ان کے دلوں پر (ان کی اپنی بدنیتی کے باعث) پردے ڈال دیئے ہیں (سو اب ان کے لیے ممکن نہیں) کہ وہ اس (قرآن) کو سمجھ سکیں اور (ہم نے) ان کے کانوں میں ڈاٹ دے دی ہے، اور اگر وہ تمام نشانیوں کو (کھلا بھی) دیکھ لیں تو (بھی) اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ حتیٰ کہ جب آپ کے پاس آتے ہیں، آپ سے جھگڑا کرتے ہیں (اس وقت) کافر لوگ کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) پہلے لوگوں کی جھوٹی کہانیوں کے سوا (کچھ) نہیں

تشریح:

قرآن مجید نے ہدایت پانے اور اس کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے یہ اصول بیان کیا ہے کہ سننے والا پوری توجہ دل کی حاضری اور ہدایت پانے کے لیے بات سنے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اسے ہدایت سے بہرہ مند کرتا ہے۔

(إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ)[قٓ: ٣٧]

"اس میں اس شخص کے لیے عبرت ہے جو دل رکھتا ہو اور حضور قلب کے ساتھ متوجہ ہو کر بات سنے۔"

لیکن منکرین حق کی شروع سے ہی یہ عادت خبیثہ ہے کہ وہ سچی بات قبول کرنا تو در کنار اس کا سننا ہی ان کے لیے گرانی کا باعث ہوا کرتا ہے۔ حضرت نوح (علیہ السلام) کے ساتھ کفار نے یہاں تک معاندانہ رویہ اختیار کیا کہ جب حضرت نوح (علیہ السلام) توحید کی دعوت دیتے تو کفار اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال کر اپنے چہرے چھپاتے ہوئے ان سے دور بھاگ جاتے۔

کفار کے دلوں پر مہریں ثبت ہونا

(صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیل لَا يَرْجِعُونَ)[البقرۃ: ١٨]

"ایسے لوگ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں یہ لوٹنے والے نہیں۔"

(قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا۔ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَاءِي إِلَّا فِرَارًا۔ وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا۔)

[نوح: ۵ تا ۷]

"نوح نے عرض کیا اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کو دن رات دعوت دی۔ مگر میری دعوت سے ان کے فرار میں اضافہ ہوا۔ میں نے جب بھی انھیں بلایا تاکہ تو انھیں معاف کر دے تو انھوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں۔ اور اپنے کپڑے اپنے منہ پر ڈال لیے اور اپنی روش پر اڑ گئے اور تکبر کی انتہا کر دی۔"

یہی رویہ منکرین حق نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ اختیار کیا جب انھیں غور کے ساتھ قرآن سننے کی طرف توجہ دلائی جاتی تو وہ بظاہر غور کے ساتھ سنتے لیکن حقیقت میں عدم توجہ اختیار کیے رکھتے اور آخر میں کہتے یہ باتیں ہمارے تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیل وادراک سے باہر اور ہماری قوت سماعت پر بوجھ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس طرح جو حکم بھی ان کے پاس آتا وہ اس کا مسلسل انکار کیے رکھتے۔ جس کی بنا پر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بتلایا گیا کہ ان کے سامنے ایک سے ایک بڑھ کر نشانی پیش کی جائے یہ لوگ ایمان لانے کی بجائے آپ کے ساتھ بحث و تکرار میں آگے ہی بڑھتے جائیں گے کیونکہ یہ غور و فکر کرنے کے بجائے کہتے ہیں کہ یہ تو پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جنھیں زیب داستاں کے لیے بیان کیا جاتا ہے۔

یہ لوگ نہ صرف ہدایت سے دور ہیں بلکہ دوسروں کی ہدایت کے لیے بھی رکاوٹ بن چکے ہیں یہی ان کی ہلاکت کا پیش خیمہ ہے۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔)

شان نزول

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ ابوسفیان بن حرب ' ولید بن مغیرہ ' نضر بن الحارث ' عتبہ شیبہ بن ربیعہ کے دونوں بیٹے ' امیہ اور ابی بن خلف۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی باتیں کان لگا کر سن رہے تھے تو انھوں نے نضر سے کہا اے ابوقتیلہ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا کہتے ہیں؟ اس نے کہا اس ذات کی قسم جس نے میرے اور ان کے کلام سننے کے درمیان کوئی چیز حائل کردی ہے ' میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ کہ وہ کیا کہتے ہیں؟ میں صرف ان کے ہونٹ ہلتے ہوئے دیکھ رہا ہوں کہ وہ کچھ کہہ رہے ہیں اور وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں ' وہ پچھلے لوگوں کی داستانیں ہیں جیسا کہ میں تمہیں گزرے ہوئے لوگوں کی داستانیں سناتا ہوں اور نضر پچھلے لوگوں کے قصے بہت زیادہ بیان کرتا تھا۔ وہ قریش کو واقعات بیان کرتا تھا اور وہ اس کی باتیں غور سے سنتے تھے ' تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (اسباب النزول ' ۲۱۷ ' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ ' بیروت) (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی القرآن)

بعض کافر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی باتیں بڑے غور سے سنتے مگر چونکہ ان کا ارادہ ہدایت حاصل کرنا نہیں بلکہ اسلام پر نکتہ چینی اور عیب جوئی تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی بدنیتی کی سزا کے طور پر ان کے دلوں اور کانوں پر گمراہی کے ایسے پردے ڈال دیئے کہ وہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزات دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائے اور جب قرآن کے بارے میں بحث کرتے تو صاف کہہ دیتے کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی کتاب نہیں بلکہ پہلے لوگوں کی جھوٹی کہانیاں ہیں۔

دراصل یہ ان کافروں کی بات ہے جو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سچا سمجھتے تھے مگر کسی تعصب کی وجہ سے انکار کرتے تھے تو اس قسم کے کفار معجزات دیکھ کر بھی ایمان لانیوالے نہیں تھے۔ اس ضمن میں اسلام کے سخت ترین دشمن ابو جہل کا ایک قول غور طلب ہے۔

ایک کافر اخنس نے ایک دن تنہائی میں ابو جہل سے ملاقات کی اور اس سے پوچھا: کیا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تیرے خیال میں جھوٹے ہیں؟ اس پر ابو جہل نے کہا: "محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ پر کیسے جھوٹ باندھ سکتے ہیں حالانکہ ہم خود انھیں صادق وامین کہا کرتے تھے۔ انھوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا لیکن بات یہ ہے کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خاندان کے پاس پہلے ہی حاجیوں کی میزبانی اور مشورہ کے اہم اور اعلیٰ مناصب ہیں۔ اب اگر نبوت بھی ان میں آ جائے تو ہمارے لیے کیا باقی رہے گا۔ " (امتاع الاسماع: تقی الدین المقریزی: جلد اول ص 91)

اس آیت کے ضمن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہی کفار کے دلوں پر پردے ڈال دیئے اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کردی تو پھر وہ کیسے ایمان لا سکتے تھے؟

دراصل کفار خود حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا کرتے تھے: "جس (دین) کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو، ہمارے دلوں پر اس کے لیے پردے ہیں اور ہمارے کانوں میں گرانی ہے اور ہمارے اور آپ کے درمیان ایک حجاب ہے۔ " (قرآن: 5:41) اس سے معلوم

ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے دلوں پر زبردستی پردے نہیں ڈالے بلکہ یہ کفار کا اپنا سوچا سمجھا فیصلہ تھا۔ وہ جان بوجھ کر سنی ان سنی کر دیتے اور تعصب کی وجہ سے اس میں غور وفکر نہ کرتے اس لیے وہ خود اس سزا کے ذمہ دار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو ان کی اس بیماری کا صرف اعلان کیا ہے اور اس کی نسبت اپنی طرف اس لیے کر دی کیونکہ ہر چیز کا اصل خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

مذکورہ لوگوں میں سے ابو سفیان بن حرب کو اللہ نے بعد میں توفیق ایمان عطا فرمائی اور وہ صحابی رسول کہلائے وہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سسر بھی بنے ان کی بیٹی ام المومنین سیدہ ام حبیبہ (رض) حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زوجہ مطہرہ ہیں اور شاید انھیں توفیق ایمان ملنا اسی لئے تھا کہ وہ پہلے بھی مکمل انکار کرنے والے نہ تھے۔ اسی لیے انھوں نے اس وقت بھی کہا تھا کہ قرآن کی بعض باتیں تو سچی لگتی ہیں۔ گویا اگر انسان کے دل میں قبول حق کا ادنی جذبہ بھی ہو تو وہ کسی وقت وجہ سعادت بن ہی جاتا ہے۔

قرآن کو جس نیت سے سنا جائے وہی تاثیر دل میں پیدا ہوتی ہے

معلوم ہوا قرآن مجید کو جس نیت سے سنا یا پڑھا جائے اب ایسی ہی تاثیر دل میں پیدا ہوتی ہے قرآن مثل بارش ہے جو باغ میں پھول کھلاتی اور گندگی کی بدبو پھیلاتی ہے۔ قصور بارش کا نہیں اپنا اپنا نصیب ہے۔ **یضل به کثیرا و یهدی به کثیرا**۔ ابو جہل و نضر بن حارث وغیرہ نے محض عیب جوئی کے لیے قرآن سنا (**ومنهم من يستمع اليك**) تو وہ گمراہی میں پڑ گئے۔ ابو سفیان بن حرب نے کچھ جذبہ قبول حق کے ساتھ سنا تو انھیں بعد میں مقرر وقت پر ایمان مل گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ مومن جب قرآن کریم کو اللہ کی سچی کتاب سمجھ کر غور سے سنتا اور پڑھتا ہے تو اس کی تاثیر کا کیا عالم ہوتا ہے، یقیناً اس کی تاثیر ہی نرالی ہوتی ہے۔ (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

مشرکینِ مکہ کا مجموعی طرز عمل اور اس کے اسباب

آیت کی وضاحت سے پہلے ہم اس کے چند الفاظ کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں "اَكِنَّةً" کِن اور کنان کی جمع ہے۔ اس کے معنی پردہ اور ڈھکنے کے ہیں اور "**وَقْرًا**" بوجھ 'ثقل' گرانی اور بہرہ پن کو کہتے ہیں۔ یہاں اس پردے اور گرانی سے معنوی اور (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی) انی پردہ اور گرانی مراد ہے 'جو دلوں اور کانوں کو سننے اور سمجھنے سے محروم کر دے۔ اس آیت کریمہ میں قلوب کی نسبت سے **اَنۡ يَّفۡقَهُوۡهُ** کو ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے تاکہ وہ بات کو سمجھ نہ سکیں۔ لیکن "اذان "یعنی کانوں کی نسبت سے فعل ذکر نہیں کیا گیا۔ یہ قرآن کریم کا ایک خاص اسلوب ہے کہ جو فعل خود بخود سمجھ آ رہا ہو 'اسے عام طور پر حذف کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں "**اَنۡ يَّسۡمَعُوۡهُ**" محذوف ہے کہ ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی گئی ہے 'تاکہ وہ سن نہ سکیں۔ اب اس آیت کی وضاحت ملاحظہ فرمائیے اس آیت کریمہ میں مختلف باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں جسے ہم ایک ترتیب سے ذکر کرتے ہیں۔
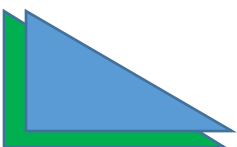
حق کو تسلیم نہ کرنے والوں کا رویہ

1 مشرکینِ مکہ میں سے بعض لوگ آپ کے پاس آتے ہیں تو نہایت کان لگا کر آپ کی بات سنتے ہیں کیونکہ سماع صرف سننے کو اور استماع بہت غور سے سننے کو کہتے ہیں۔ ان کا یہ کان لگا کر سننا بظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ سمجھنے اور قبول کرنے کے ارادے سے آئے ہیں۔ لیکن اس آیت کے آخری حصے میں اس بات کو کھول دیا گیا ہے کہ یہ لوگ آپ کے پاس بات سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے نہیں آتے بلکہ صرف اس لیے آتے ہیں کہ بات کو الجھائیں اور آپ سے کسی نہ کسی بات میں جھگڑا پیدا کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بات کے سننے کے نتیجے میں دو رویے انسان میں پیدا ہوتے ہیں۔ اگر اس کے اندر خیر کا غلبہ غالب ہے تو وہ بات کو سن کر سمجھنے اور اس کے بعد قبول کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن جو آدمی خیر سے محروم ہو جاتا ہے ' وہ اس بات کا اظہار تو نہیں ہونے دیتا کہ میں بات کو سننا نہیں چاہتا ' بلکہ وہ اپنی بدنیتی کو چھپانے کے لیے کٹ حجتی اور فضول بحث سے کام لیتا ہے۔ سمجھانے والا یہ سمجھتا ہے کہ شاید اسے بات سمجھ نہیں آرہی ' اس لیے وہ اپنی پوری توانائی صرف کر ڈالتا ہے۔ لیکن اس کی نیت میں چونکہ فتور ہوتا ہے ' اس لیے وہ بجائے سمجھنے کے نئی نئی باتیں نکالتا اور بالآخر ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی کبھی کوئی مخاطب یا سامع یہ رویہ اختیار کرے تو ایک مبلغ کو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ شخص محض وقت ضائع کرنا چاہتا ہے یا دوسرے لوگوں کے لیے غلط پیدا کر کے انھیں حق سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ یہ جو کچھ کہا گیا ہے ' یہ محض مفروضہ نہیں ' بلکہ جس آدمی کو بھی کبھی تبلیغ و دعوت کا مرحلہ پیش آیا ہے ' اسے ایسی صورت حال سے ضرور واسطہ پڑتا ہے۔

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

دھیان دینے سے اللہ کسی کی سمجھنے کی طاقت کو سلب نہیں کرتا

2 دوسری بات اس آیت کریمہ میں یہ فرمائی جارہی ہے کہ یہ لوگ بظاہر جو آپ کی طرف کان لگا کر سن رہے ہیں ' ممکن ہے آپ کو یہ خیال ہو کہ یہ شاید آپ کی بات کو سمجھ کر قبول کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقت میں ایسا نہیں۔ اس لیے کہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اور ان کے کانوں میں بہرہ پن پیدا کر دیا ہے ' جس کے نتیجے میں نہ یہ بات سن سکتے ہیں ' نہ سمجھ سکتے ' ہیں اس لیے قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں ایک نہایت توجہ طلب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دلوں پر پردہ ڈالنے اور کانوں میں گرانی پیدا کرنے کی نسبت اپنی طرف فرمائی۔ اس سے خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ان کو ان بنیادی صلاحیتوں سے محروم کر کے قبولیت حق کے قابل نہیں رہنے دیا تو پھر ان کا اس میں قصور کیا ہے ؟ آدمی جب تک کسی بات کو سنتا اور سمجھتا نہیں ' ظاہر ہے اسے قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور یہ لوگ اگر اس سے محروم کر دیئے گئے ہیں تو پھر ان کے ایمان نہ لانے اور ہدایت کو اختیار نہ کرنے پر انھیں مجرم کیوں ٹھہرایا جارہا ہے ؟ اس لیے سب سے پہلے اس بات کا سمجھنا بہت ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ اللہ کا ایک قانون ہے جسے قرآن کریم میں ایک سے زیادہ مرتبہ ذکر کیا گیا ہے اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی آسان تعبیرات کے ذریعے اسے مزید سمجھایا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو متعدد صلاحیتیں دے کر پیدا فرمایا اور انسان کو اس سے کام لینے کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ وہ قوتیں اور وہ صلاحیتیں اس وقت تک کام کرتی

ہیں 'جب تک آدمی ان قوتوں سے کام لیتا ہے۔ لیکن اگر وہ ان سے کام لینا چھوڑ دے یا ان سے غلط کام لینا شروع کر دے تو وہ قوتیں مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر آدمی کے بازو میں پکڑنے 'مارنے 'مدافعت کرنے اور بوجھ اٹھانے جیسی قوتیں پیدا کی ہیں۔ یہ جب تک اپنے ہاتھ کو ایسے ہی کسی کام کے لیے استعمال میں لاتا رہتا ہے تو نہ صرف یہ کہ یہ ہاتھ ٹھیک کام کرتا ہے بلکہ اس کی قوت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے 'لیکن اگر وہ اسے عضو معطل بنا دے 'یعنی اسے کسی طرح باندھ کے رکھ دے کہ وہ حرکت نہ کر سکے تو چند روز کے بعد آپ دیکھیں گے کہ وہ ہاتھ مفلوج ہو جائے گا۔ بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دل کو حق کو سمجھنے اور کانوں کو ہدایت کی بات سننے کی صلاحیت سے بہرہ ور فرمایا ہے۔ جب تک آدمی ان دونوں قوتوں سے سننے اور سمجھنے کا کام لیتا ہے اور صحیح کام لیتا ہے تو یہ دونوں قوتیں اپنا کام کرتی رہتی ہیں 'لیکن جب ان دونوں سے اس کا اصل کام نہیں لیتا یا سرے سے کام ہی نہیں لیتا تو اللہ کا وہ فطری قانون حرکت میں آتا ہے 'وہ ان دونوں قوتوں کو مفلوج کر دیتا ہے۔ اس کے بعد بظاہر آدمی سنتا ہے 'لیکن وہ حقیقت میں نہیں سنتا۔ بظاہر آدمی کا دل حرکت کرتا ہے 'لیکن حقیقت میں وہ سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں قرآن کریم نے متعدد جگہ ارشاد فرمایا کہ ان کے دل ہیں 'لیکن وہ سمجھتے نہیں 'ان کے کان ہیں 'لیکن وہ سنتے نہیں یہ لوگ ڈنگروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سننے اور سمجھنے کی صلاحیت سے بالکل محروم ہو جاتے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو باتیں اصل میں سمجھنے کی اور سننے کی ہیں یعنی جن باتوں کا تعلق اللہ کی ہدایت سے ہے یہ لوگ ان باتوں کو سننے اور سمجھنے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے 'جسے قرآن کریم نے مہر لگانے سے تعبیر کیا ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسے آسان کر کے سمجھایا۔ ارشاد فرمایا: کہ انسان کا دل ایک آئینہ کی مانند ہے 'جس میں نور اور آب و تاب ہے اور یہی وہ آب و تاب ہے 'جس سے وہ اللہ کی ہدایت کو سنتا اور سمجھتا ہے اور اسی کو قبولیت حق کی استعداد کہتے ہیں۔ جب ایک آدمی گناہ کرتا ہے تو اس کے آئینہ دل پر ایک داغ پڑ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو یہ داغ مٹ جاتا ہے اور اگر وہ مسلسل گناہ کرتا رہتا ہے تو مسلسل داغ پڑنے کے باعث ایک دن ایسا آتا ہے کہ یہ آئینہ قلب بالکل بے نور ہو کے رہ جاتا ہے۔ جس طرح آئینہ اگر اپنی آب و تاب کھو دے اور زنگ آلود ہو جائے تو اس میں شکل دیکھی نہیں جا سکتی 'اسی طرح یہ آئینہ قلب جب داغ دار ہو کر بے نور ہو جاتا ہے تو اب اس میں کوئی حق کی بات داخل نہیں ہو سکتی اور یہ تبدیلی چونکہ اللہ کے قانون کے مطابق آتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ اسے اپنی طرف منسوب فرماتے ہیں۔

3 تیسری بات اس آیت کریمہ میں یہ فرمائی جا رہی ہے کہ یہ لوگ بار بار آپ سے معجزات 'یعنی نشانیاں دکھانے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس سے پہلے ہم اسی سورۃ میں ان مطالبات میں سے چند ایک کا تذکرہ پڑھ بھی چکے ہیں۔ مثلاً ان کے مطالبات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اللہ کی طرف سے قرآن کریم ایک مطبوع اور مجلد شکل میں نازل ہونا چاہیے 'جسے ہم اپنے ہاتھوں سے چھو سکیں اور اپنی آنکھوں سے پڑھ سکیں۔ بلکہ نام بنام ہمیں مخاطب کیا جانا چاہیے کہ اس قرآن کریم کو قبول کرو۔ اسی طرح یہ بھی کہا گیا کہ آپ پر ایک فرشتہ اترنا چاہیے 'جو آپ کی حفاظت کرے۔ جب آپ باہر نکلیں تو ہٹو بچو کہتا ہوا آپ کا راستہ صاف کرے۔ اپنی خاص شکل و صورت میں لوگوں کو بتائے کہ یہ اللہ کے نبی ہیں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ اللہ کا نبی عام انسانوں میں سے اٹھا دیا جائے اور وہ اللہ کا نمائندہ ہونے کے باوجود لوگوں کی گالیاں سنتا پھرے اور ان کی اذیتیں برداشت کرے۔ اسی طرح کے ان کے مطالبات تھے 'جس کا وہ وقتاً فوقتاً اظہار کرتے رہتے تھے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) چونکہ ان کے ایمان کے شدید خواہش مند رہتے تھے 'اس لیے طبعی طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ یہ نشانیاں اگر انھیں دکھا دی جائیں تو شاید

یہ مسلمان ہو جائیں۔ اس لیے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر انھیں دنیا جہان کی نشانیاں بھی دکھا دی جائیں تو بھی یہ کبھی مسلمان نہیں ہوں گے۔ اس لیے کہ اگر ان کا ایمان نشانیوں سے معلق ہے تو اس کائنات میں نشانیوں کی کیا کمی ہے؟ یہ سورج کا چمکنا ' چاند کا دمکنا ' ستاروں کا جھلملانا ' کلیوں کا چٹکنا ' پانی کا بہنا ' آبشاروں کا گرنا ' بادلوں کا گرجنا ' زمین کا قوت روئیدگی سے مالا مال ہونا اور زمین پر مخملی فرش کا بچھ جانا اور گندم کا نقرئی لباس پہننا اور ایک بیج کا بڑھتے بڑھتے قد آور درخت بن جانا اور پھل دار درختوں کا شہد سے بھرے ہوئے پھلوں سے لد جانا ' ان میں سے کون سی چیز ہے ' جو اللہ کی نشانی نہیں؟ اگر آدمی نشانی ہی سے اللہ اور اس کی ہدایت تک پہنچنا چاہتا ہے تو ان میں سے ایک ایک نشانی اس کے لیے کافی ہے۔ جو آدمی ان نشانیوں میں سے کسی سے فائدہ نہیں اٹھاتا ' اسے دنیا بھر کی نشانیاں بھی دکھا دی جائیں تو وہ کبھی راہ راست پر نہیں آئے گا۔

ذات باری تعالیٰ کی پہچان کے لیے کسی معجزے کی ضرورت نہیں

اس لیے اے پیغمبر! آپ ان کے بارے میں پریشان نہ ہوں کہ یہ شاید اس لیے ہدایت پر نہیں آرہے کہ ان کی مطلوبہ نشانیاں ان کو نہیں دکھائی جارہیں ' بلکہ ان کا ہدایت کی طرف نہ آنا ' اس کا سبب ان کا رویہ ہے ' جس کے سبب سے یہ قبولیت حق کی استعداد سے محروم ہو چکے ہیں۔ اگر یہ اپنا رویہ درست کرلیں اور اپنی آنکھوں پر سے تعصب کی پٹیاں اتار دیں اور دل و دماغ پر پڑے ہوئے پردے جھٹک دیں تو معمولی سے معمولی نشانی بھی ان کے لیے ہدایت کا سبب بن سکتی ہے۔

جیسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت آپ نے اللہ کو کیسے پہچانا؟ آپ نے فرمایا شہتوت کے پتے سے۔ سائل نے حیران ہو کر پوچھا وہ کیسے؟ آپ نے کہا:- میں نے دیکھا کہ بکری شہتوت کا پتہ کھاتی ہے تو مینگنیاں کرتی ہے۔ ریشم کا کیڑا شہتوت کھاتا ہے تو ریشم بنتا ہے اور ختن کا ہرن شہتوت سے غذا حاصل کرتا ہے تو اس کی ناف سے کستوری نکلتی ہے۔ اگر شہتوت کا پتہ موثر بالذات ہوتا تو ہر جگہ اس کا نتیجہ بھی ایک ہی ہوتا یا مینگنی بنتا یا ریشم یا کستوری۔ لیکن یہ جو ہم تین مختلف نتائج دیکھتے ہیں ' جبکہ تینوں کی غذا ایک ہے۔ اس سے مجھے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اصلاً یہ شہتوت کا کمال نہیں ' بلکہ کوئی اور ہاتھ ہے ' جو یہاں کار فرما ہے جو کبھی کستوری بناتا ہے اور کبھی ریشم بناتا ہے۔ وہ ہاتھ میرے اللہ کا ہاتھ ہے۔

اندازہ فرمایئے! چونکہ ہدایت حاصل کرنے والے کا دماغ بالکل صاف اور صحیح رخ پر کام کر رہا ہے ' اس لیے صرف ایک شہتوت کے پتے نے اسے معرفت حق تک پہنچا دیا۔ اس سے بھی آسان مثال دیکھیے کہ کسی بدوی نے کسی سے پوچھا کہ تم یہ کیسے جانتے ہو کہ اس کائنات کا کوئی خالق بھی ہے؟ اس نے کہا کہ میں جب صحرا میں سفر کرتے ہوئے کہیں اونٹ کی لید دیکھتا ہوں تو مجھے وہاں سے قافلے کے گزرنے کا یقین ہو جاتا ہے ' وہ اس طرح کہ صحرا میں بدامنی کے باعث کوئی اکیلا وکیلا آدمی سفر نہیں کرسکتا۔ میں لید کو دیکھ کر یہ خیال کرتا ہوں کہ یقینا یہاں سے کوئی اونٹ پر سوار مسافر گزرا ہے اور پھر یہ سوچ کر کہ مسافر چونکہ تنہا سفر نہیں کرسکتا ' اس لیے مجھے اس بات کا یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہاں سے کوئی قافلہ گزرا ہے۔ یہ تمثیل سنا کر اس بدوی نے کہا کہ اگر میں اونٹ کی لید دیکھ کر ایک قافلے کا یقین کرلیتا ہوں تو اس کائنات کو محو سفر دیکھ کر اس کائنات کے خالق و مالک کا یقین کیسے نہ کروں۔ حقیقت یہ ہے کہ دل و دماغ اگر باطل اثرات کی کہر میں لپٹے ہوئے نہ ہوں تو پھر اس کائنات کی ایک ایک نشانی ہر پڑھے لکھے اور ان پڑھ کو اللہ کی معرفت دینے کے لیے کافی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک سائنسدان اپنی لیبارٹری میں کام کر رہا تھا کہ اس کی پوتی کھیلتے کھیلتے وہاں پہنچ گئی۔ اچانک اس سائنسدان کا دھیان اس پوتی کی طرف ہوا تو نظر اس کے کان پر جا پڑی لپکتا ہوا اس بچی کے پاس آیا اور اس کا کان پکڑ کر کہنے لگا کہ سماعت کا یہ چھوٹا سا پرزہ ایک ایسی حیرت انگیز چیز ہے ' اگر یہ ناکارہ ہو جائے یا کٹ جائے تو

ساری دنیا کے سائنسدان ملکر یہ کان نہیں بنا سکتے۔ پھر تھوڑے سے تامل کے بعد کہنے لگا کہ جس ذات عزیز نے ایسا حیرت انگیز پرزہ بنایا ہے کہ وہ سنتا ہے تو کیا وہ خود نہیں سنتا ہوگا۔ اس مثالوں سے یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے کہ اگر وہ اپنا رویہ درست کر لیں تو پھر اللہ کے دین کو سمجھنا اور قبول کرنا اور اپنے خالق ومالک کو جان لینا 'ان کے لیے کوئی مشکل بات نہیں ہے۔
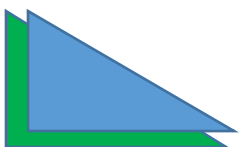
-4 چوتھی بات یہ ارشاد فرمائی جارہی ہے کہ جن طبیعتوں پر نصیحت اور دلیل کا اثر نہ ہوتا ہو 'وہ بعض دفعہ مشاہداتی چیزوں سے اثر قبول کرتی ہیں۔ اس لیے ان سے آخری بات یہ کہی جارہی ہے کہ دیکھو ! تم اپنے تجارتی اسفار میں ان قوموں کی تباہ شدہ بستیوں سے گزرتے ہو 'جن کی طرف کبھی ہدایت کے لیے اللہ کے نبی آئے تھے اور انھوں نے بجائے ہدایت قبول کرنے کے 'تمہاری طرح رویہ اختیار کیا 'بالآخر اللہ کے عذاب سے یہ قومیں تباہ ہو گئیں۔ ان کے کھنڈرات اور ان کی تباہ شدہ بستیاں اور ان کے ہاتھوں سے تراشے ہوئے محلات آج بھی ان کی عبرت کی داستان سنانے کے لیے تمہارے راستوں میں موجود ہیں۔ تم اگر ہر طرح کی دلیل قبول کرنے سے محروم ہو چکے ہو 'تو ان مشاہداتی دلائل کو دیکھو اور ان سے عبرت حاصل کرو۔ اس آیت کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب ان کے سامنے پہلی قوموں کی تاریخ ان کی طرف آنے والے انبیاء کے واقعات ان قوموں کا رویہ اور اس کے نتیجے میں ان کے عبرت ناک انجام کی تفصیل بیان کی جاتی ہے تو یہ بجائے اس سے عبرت حاصل کرنے کے یہ کہتے ہیں کہ آپ ہمیں کیا کہانیاں سناتے رہتے ہیں اور آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن کریم اللہ کی کتاب ہے حالانکہ اس میں سوائے پہلے لوگوں کی بے سروپا کہانیوں کے اور کیا رکھا ہے۔ آپ کے پاس چونکہ کوئی نئی بات کہنے کے لیے نہیں 'اس لیے آپ ہمیں پرانی باتیں سناتے رہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نادان لوگوں کا عموماً یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص انھیں حق کی طرف دعوت دیتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ تم نے نئی بات کیا کہی 'یہ تو سب وہی پرانی باتیں ہیں 'جو ہم پہلے سے سنتے چلے آرہے ہیں۔ گویا ان احمقوں کا نظریہ یہ ہے کہ کسی بات کے حق ہونے کے لیے اس کا نیا ہونا بھی ضروری ہے اور جو بات پرانی ہے 'وہ حق نہیں ہے حالانکہ حق ہر زمانے میں ایک ہی رہا ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہے گا۔ اللہ کے دیئے ہوئے علم کی بنا پر جو لوگ انسانوں کی رہنمائی کے لیے آگے بڑھے ہیں 'وہ سب قدیم ترین زمانہ سے ایک ہی امر حق کو پیش کرتے آئے ہیں اور آئندہ بھی جو اس منبع علم سے فائدہ اٹھا کر کچھ پیش کرے گا 'وہ اسی پرانی بات کو دہرائے گا۔ البتہ ! نئی بات صرف وہی لوگ نکال سکتے ہیں جو اللہ کی روشنی سے محروم ہو کر ازلی وابدی حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے اور اپنے ذہن سے کچھ نظریات گھڑ کر انھیں حق کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ بلاشبہ ایسے نادرہ کار ہو سکتے ہیں کہ وہ بات کہیں 'جو ان سے پہلے کبھی دنیا میں کسی نے نہ کہی ہو۔

مغرب زدہ افراد کی طرف سے عام طور پر کیا جانے والا سوال اور اس کا جواب

-5 پانچویں بات جو اس آیت کریمہ میں ہمیں اپنی طرف متوجہ کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ وہ پہلی معذب قوموں کی تاریخ کا نہ صرف مذاق اڑاتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ یہ صرف پہلی قوموں کی بے سروپا داستانیں ہیں 'جو آپ ہم سے بیان کرتے رہتے ہیں بلکہ اس آیت میں ایک لفظ کا

استعمال ہوا ہے "یُجَادِلُوْنَكَ" کہ وہ آپ سے آکر جھگڑتے ہیں یعنی برہمی کا اظہار کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انھیں برہمی آخر کس بات سے ہوتی تھی۔ وہ بات اصل یہ تھی کہ قرآن کریم جب ان قوموں کی تاریخ بیان کرتا ہے تو صرف ان کے واقعات کو بیان نہیں کرتا بلکہ درحقیقت وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ قوموں کا ابھرنا اور فنا ہونا اتفاقی واقعات کے طور پر ظہور میں نہیں آتا ' بلکہ اس میں اصل دخل اخلاقی عوامل کو ہوتا ہے۔ جب کوئی قوم زندگی کے اخلاقی عناصر سے خالی ہو جاتی ہے تو قدرت کا قانون اس کو فنا کر دیتا ہے اور کوئی دوسری قوم اس کی جگہ اٹھا کھڑی کرتا ہے ' جو کردار و اخلاق میں اس سے بہتر ہوتی ہے۔ یہ عاد ' ثمود ' مدین ' سبا ' قوم لوط اور قوم فرعون وغیرہ یونہی اتفاقی طور پر فنا نہیں ہوئیں بلکہ یہ عروج و زوال کے اسی خدائی ضابطہ کا نشانہ بنیں۔ یہ قومیں چونکہ اخلاقی اور روحانی بیماریوں میں مبتلا ہو گئی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح اور ان کے علاج کے لیے روحانی و اخلاقی طبیب یعنی انبیاء بھیجے۔ ان انبیاء نے سر توڑ کوشش کی کہ اپنی قوم کی بیماریاں دور کریں ' لیکن ان کی قوموں نے ان کی باتوں پر کان نہ دھرا ' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو فنا کر دیا۔ یہ تاریخ سنا کر قرآن نے عربوں کو متنبہ کیا کہ اس وقت تمہارے سامنے بھی زندگی اور موت کا یہی مرحلہ ہے۔ تمہارے اندر بھی خدا کا رسول آگیا ہے۔ اگر تم نے اس کی بات نہ سنی تو تم بھی اسی طرح فنا کر دیئے جاؤ گے۔ یہ وہ بات تھی ' جس بات سے اہل عرب کے پندار پر سخت چوٹ پڑتی تھی۔ وہ اس بات پر برہم ہو جاتے تھے کہ وہ کسی اخلاقی اور روحانی بیماری میں مبتلا ہیں ' جس کے نتیجے میں ان پر عذاب الٰہی آسکتا ہے۔ مزید یہ بات بھی ان کو بعید از عقل معلوم ہوتی تھی کہ قومی عروج و زوال میں اخلاقی عوامل کو بھی دخل ہوتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ قومیں بھی اسی طرح جیتی اور مرتی ہیں ' جس طرح ایک فرد یا ایک درخت پیدا ہوتا ہے ' جوان ہوتا ' بوڑھا ہوتا ہے پھر مر جاتا یا سوکھ جاتا ہے۔ اسی طرح قومیں بھی پیدا ہوتیں ' جوان ہوتیں اور فنا ہو جاتی ہیں۔ اس کا کردار و ایمان سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے کہ قومیں اخلاق و ایمان کی بناء پر تباہ ہوتی ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ سب گردش روزگار کے کرشمے ہیں۔ واضح ہے کہ جب ان کا نظریہ یہ تھا تو قرآن کے اس تاریخی نقطہ نظر پر ان کا بھڑک اٹھنا اور لڑنے کے لیے تیار ہو جانا ناقابل فہم نہیں ہے۔

یہ چند نکات جو ہم نے آپ کے سامنے پیش کیے ہیں ' یہ مشرکین مکہ کے مجموعی طرز عمل اور اس کے اسباب کو پوری طرح ہمارے سامنے اجاگر کر دیتے ہیں۔ اس طرز عمل کا نتیجہ یقیناً اس سے مختلف نہیں ہو سکتا ' جس کا ذکر اگلی آیت میں کیا جا رہا ہے۔

(روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

کفار کے کانوں پر ڈاٹ لگانے پر اعتراضات کے جوابات

اس آیت میں فرمایا ہے اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ وہ آپ کے بات سمجھ نہ سکیں اور ہم نے ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی ہے اس آیت پر ایک اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اگر ان کے کانوں میں ڈاٹ (گرانی) تھی اور ان کے دلوں پر پردے تھے تو چاہیے تھا کہ وہ کوئی بات نہ سنتے اور کسی بات کو نہ سمجھتے۔ حالانکہ وہ لوگوں کی باتیں سنتے بھی تھے اور سمجھتے بھی تھے۔ اگر اس کا یہ جواب دیا جائے کہ وہ نبی کریم کی باتوں کو نہیں سنتے تھے اور نہ سمجھتے تھے تو اس کے معارض اس آیت کا آخری حصہ ہے جس میں فرمایا ہے جب وہ آپ کے پاس بحث کرتے ہوئے آئیں گے تو

کہیں گے کہ یہ قرآن تو محض پہلے لوگوں کا قصہ کہانی ہے اس سے معلوم ہوا کہ وہ آپ کے کلام کو سنتے بھی تھے اور سمجھتے بھی تھے 'البتہ مانتے نہیں تھے۔

اس اعتراض کا صحیح جواب یہ ہے کہ سننے سے مقصود یہ تھا کہ وہ سن کر اس سے نفع حاصل کرتے اور اس پر ایمان لاتے اور سمجھنے سے مقصود یہ تھا کہ وہ اس میں غور وفکر کرکے صحیح نتیجہ نکالتے اور یہ اعتراف کر لیتے کہ واقعی یہ اللہ کا کلام ہے اور کوئی انسان اس کی نظیر نہیں لا سکتا اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کو مان لیتے اور جب انھوں نے سننے اور سمجھنے کے مقصود کو پورا نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں 'تاکہ وہ آپ کی بات سمجھ نہ سکیں اور ہم نے ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی ہے 'پھر اس آیت پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یہ آیت کفار کی مذمت میں وارد ہوئی ہے اور جب ان کے کانوں میں اللہ نے گرانی رکھی ہے اور ان کے دلوں میں اللہ نے پردے ڈال دیئے ہیں تو وہ ایمان نہ لانے میں معذور ہوئے 'پھر ان کی مذمت کی کیا وجہ ہے؟ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ جب ان کے کانوں میں اللہ نے ڈاٹ لگا دی اور ان لگا دی اور ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے تو اب ان کا ایمان لانا ممکن نہیں رہا 'پھر ان کو ایمان لانے کا مکلّف کرنا کس طرح درست ہوگا؟ جب کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے:

(آیت) "لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا"۔ (البقرہ: ۲۸۶)

ترجمہ: اللہ ہر شخص کو اس کی طاقت کے مطابق ہی مکلّف کرتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ان کافروں نے اپنے عناد اور بغض کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی جناب میں یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شان میں ایسی شدید گستاخی کی 'جس کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے حق کو سننے کے لیے ان کے کانوں میں ڈاٹ لگا دی اور حق کو سمجھنے کے لیے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے 'جیسا کہ ان آیات سے واضح ہے:

(آیت) "بل طبع اللہ علیھا بکفرھم"۔ (النساء: ۱۵۵)

ترجمہ: بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی۔

(آیت) "ذلك بانھم امنوا ثم کفروا فطبع علی قلوبھم فھم لا یفقھون"۔ (المنافقون: ۳)

ترجمہ: یہ اس لیے کہ وہ ایمان لائے پھر انھوں نے کفر کیا 'سو ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی سو وہ کچھ نہیں سمجھتے۔

ان کے کانوں میں ڈاٹ لگانے اور دلوں پر پردے ڈالنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ حسی طور پر ان کے کانوں میں ڈاٹ لگا دی تھی اور ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے تھے 'بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ کفار کفر اور معصیت کو اچھا جاننے اور ایمان اور اطاعت کو برا جاننے کے خوگر اور عادی ہو گئے تھے 'کیونکہ اپنے باپ دادا کی اندھی تقلید کرنے اور دلائل میں صحیح طریقہ سے غور وفکر کرنے سے مسلسل اعراض کرنے کی وجہ سے ان میں گمراہی اس قدر راسخ ہو چکی تھی کہ ان پر کوئی بات اثر نہیں کرتی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں انکار کی ایسی حالت پیدا کر دی جس کی وجہ سے ان میں حق نافذ نہیں ہو سکتا تھا اور ان کے کانوں میں ایسی کیفیت پیدا کر دی کہ حق بات کو سننا انھیں بہت ناگوار تھا اور ان کے دلوں اور کانوں میں اس کیفیت کا پیدا کرنا ان کو کفر اور گمراہی پر مجبور کرنا نہیں تھا 'بلکہ انھیں نے اپنے اختیار سے دلائل میں غور وفکر کرنے کی بجائے اپنے باپ دادا کی اندھی تقلید کو جو اختیار کیا تھا 'یہ اس کی سزا اور تعزیر تھی 'تو چونکہ ہر ممکن اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے وجود میں آتا ہے اور ہر چیز کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے 'اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اور ہم نے ان کے کانوں میں گرانی رکھی ہے اور چونکہ اس کو

پیدا کرنے کا سبب ان کافروں کا اپنا ارادہ ' اختیار اور کسب تھا ' اس وجہ سے ان کی مذمت فرمائی اور آیت سے قطع نظر کرکے فی نفسہ ان کا ایمان لانا ممکن ہے ' اس لیے ان کو ایمان کا مکلّف کرنا بھی صحیح ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان کا ایمان لانا ممکن بال ذات اور ممتنع بالغیر ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ کفار از راہ تکبر خود کہتے تھے ہم آپ کی بات نہیں سنتے۔ آپ کی باتیں سننے کے لیے ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگی ہوئی ہے اور آپ کے اور ہمارے درمیان مضبوط پردہ حائل ہے۔

(آیت) "بشیرا ونذیرا فاعرض اکثرھم فھم لا یسمعون، وقالوا قلوبنا فی اکنۃ مما تدعانا الیہ وفی اذاننا وقر و من بیننا و وبینک حجاب فاعمل اننا عملون"۔ (حم السجدہ: ۵۔۴)

ترجمہ: بشارت دیتا ہوا اور ڈراتا ہوا ' سو اکثر کافروں نے منہ پھیر لیا پس وہ نہیں سنتے، اور انھوں نے کہا جس چیز کی طرف تم دعوت دیتے ہو ' ہمارے دلوں میں اس کے لیے پردے ہیں اور ہمارے کانوں میں گرانی ہے اور ہمارے اور آپ کے درمیان مضبوط حجاب ہے تو آپ اپنا کام کریں ' بیشک ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔

کفار یہ ظاہر کرتے تھے کہ رسول کا کلام ان کے سننے کے قابل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر فرمایا نہیں بلکہ تم اس قابل نہیں ہو کہ تم کو ہمارے رسول کا کلام سنایا جائے ' تو جس طور سے انھوں نے کہا تھا ' کہ ہمارے کانوں میں ڈاٹ ہے اور ہمارے دلوں پر پردے ہیں ' اسی طور سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمہارے کانوں میں ڈاٹ ہم نے لگائی ہے اور تمہارے دلوں پر پردے ہم نے ڈالے ہیں۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ جب کافروں نے حق کو سننے اور اس کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے دلائل میں غور وفکر کرنے سے مسلسل اعراض کیا اور اپنے باپ دادا کی اندھی تقلید پر اصرار کیا ' تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس انکار اور اعراض کی حالت کو اس شخص کے حال سے تشبیہ دی جس کے دل پر پردے ہوں اور اس کے کانوں میں گرانی ہو ' سو اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حقیقتاً ان کے دلوں پر اللہ نے پردے ڈال دیئے اور ان کے کانوں میں ڈاٹ لگا دی ' بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حق سے ان کی مسلسل روگردانی ایسی ہے جیسے ان کے دلوں پر پردے ہوں اور ان کے کانوں میں گرانی ہو ' جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے۔

(آیت) "واذا تتلی علیہ ایتنا ولی مستکبرا کان لم یسمعھا کان فی اذنیہ وقرا"۔ (لقمان: ۷)

ترجمہ: اور جب اس پر ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو اس نے تکبر کرتے ہوئے پیٹھ پھیر لی ' گویا اس نے سنا ہی نہیں جیسے اس کے کانوں میں گرانی ہے۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَإِن يُهْلِكُونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ○26

لغۃالقرآن: [وَھُمْ : اور وہ][يَنْهَوْنَ : روکتے ہیں][عَنْهُ : اس سے][وَيَنْـَٔوْنَ : اور دور رہتے ہیں][عَنْهُ : اس سے][وَاِنْ : اور نہیں][يُّهْلِكُوْنَ : وہ ہلاک کرتے][اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ : مگر اپنے آپ کو][وَمَا : اور نہیں][يَشْعُرُوْنَ : وہ شعور رکھتے]

ترجمہ : اور وہ (دوسروں کو) اس (نبی کی اتباع اور قرآن) سے روکتے ہیں اور (خود بھی) اس سے دور بھاگتے ہیں، اور وہ محض اپنی ہی جانوں کو ہلاک کر رہے ہیں اور وہ (اس ہلاکت کا) شعور (بھی) نہیں رکھتے

تشریح:

بعض کافر اس قدر متعصب تھے کہ وہ خود بھی حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دور رہتے اور لوگوں کو بھی منع کرتے کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قریب نہ جائیں اور الزام یہ عائد کرتے کہ (خدا کی پناہ) وہ جادو گر ہے۔ اس نے ایک نیا دین بنالیا ہے اور جو بھی اس کے قریب جاتا ہے وہ اپنے خاندان کا مذہب چھوڑ کر اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے، لیکن حق سے روگردانی کرنے والے بالآخر ناکام ہوئے اور وہ حق کو پھیلنے سے روک نہ سکے۔ اس سلسلہ میں

طفیل بن عمرو الدوسی کا واقعہ ملاحظہ فرمائیں

طفیل قبیلہ دوس کا سردار اور قادر الکلام شاعر تھا۔ ایک دفعہ وہ مکہ آیا تو قریش کے سرداروں نے اسے کہا: "اے طفیل! تم ہمارے شہر میں تشریف لائے ہو۔ ہمارے ہاں ایک شخص ہے جس نے ہمیں بڑی مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہمارے اتحاد کو اس نے پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اس کی گفتگو میں جادو کا اثر ہے۔ اس نے بیٹے اور باپ کو، بھائی اور بھائی کو، خاوند اور بیوی کو جدا جدا کر دیا ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں تم اور تمہاری قوم بھی اس مصیبت میں مبتلا نہ ہو جائے جس کا ہم شکار ہیں اس لیے ہماری مخلصانہ گزارش ہے کہ اس کے ساتھ گفتگو نہ کرنا اور ہرگز اس کی کوئی بات نہ سننا۔" (سیرت ابن ہشام : جلد دوم : ص 22) چنانچہ طفیل جب مسجد حرام میں جانے لگتا تو اپنے کانوں میں روئی ٹھونس

لیتا تاکہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آواز اس کے کانوں میں نہ پڑے۔ طفیل خود بیان کرتا ہے کہ: "ایک دن حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے اور میری مرضی کے بغیر ان کی آواز میرے کانوں تک پہنچ گئی تو میں نے اپنے آپ سے کہا: میں ایک عقل مند آدمی ہوں، شاعر بھی ہوں اور کلام کے حسن وقبح کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ اس شخص کی بات سننے سے مجھے روکنے والا کون ہے۔ اگر اس نے اچھی بات کہی تو قبول کرلوں گا اور اگر کوئی قبیح بات کہی تو اسے مسترد کردوں گا۔ چنانچہ جب طفیل نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبان سے قرآن مجید کی تلاوت سنی تو قرآن مجید کی حقانیت کو جان کر فوراً مسلمان ہوگیا۔"

(سیرت ابن ہشام: جلد دوم: ص 22) (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

قوموں کے عروج وزوال میں اخلاقی عوامل کا بڑا کردار ہے

بجائے اس کے کہ وہ قرآن کریم کی نصیحت 'اس کے طرز استدلال اور معذب قوموں کے انجام سے کوئی سبق سیکھتے 'ان کا حال یہ ہے کہ وہ خود بھی اسلام کی طرف آنے سے اعراض کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے بدگمان کرکے یا بالجبر روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لیے جو بھی ان سے بن پڑتا ہے 'وہ کر گزرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ مکی زندگی کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ انھوں نے آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت سے جس طرح اعراض کیا اور جو لوگ اس دعوت کو قبول کرلیتے تھے 'جس طرح ان کو اذیتوں کا نشانہ بنایا 'وہ ایک دلخراش داستان ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت اور قرآن کریم کا مذاق اڑانا اور اگر حضور قرآن پڑھیں تو اوباش لوگوں کا قریب کھڑے ہو کر شور مچانا اور دوسروں کو سننے نہ دینا اور اگر کوئی غریب مسلمان ان کے قابو آجاتے تو اسے مار مار کر ادھ موا کردینا 'حتیٰ کہ بعض دفعہ غیر انسانی رویہ اختیار کرنا 'یہ سب ان کا روز کا معمول تھا۔ اس کا حوالہ دے کر ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ یہ لوگ بظاہر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم شاید اس طرح قرآنی دعوت کو پھیلنے سے روک دیں گے اور رفتہ رفتہ یہ تحریک ختم ہوجائے گی۔ لیکن یہ ان کی خام خیالی ہے۔ وہ حقیقت میں اس تحریک کو روکنے میں تو کامیاب نہیں ہوسکتے اور نہ اس کے اثرات کو پھیلنے سے روک سکتے ہیں کیونکہ اللہ کے دین کی دعوت تو ہوا اور روشنی کی مانند ہے جس کا راستہ روکنا کسی کے بس میں نہیں ہوتا البتہ ان کا یہ رویہ خود ان کی ہلاکت کا باعث ضرور ہوگا کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت ان کے لیے ایک زندگی بخش پیغام ہے۔ اس کا انکار کرنا یا اس کو روکنے کی کوشش کرنا 'یہ درحقیقت زندگی سے دشمنی ہے۔ اگر یہ لوگ اس سے باز نہیں آئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ خود اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔ لیکن انھیں اس کا شعور نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ یہ بات کہ اللہ کے دین سے اعراض اور معاشرے میں اس کے نفوذ کی کوششوں کو ناکام کرنا 'یہ درحقیقت زندگی کا راستہ روکنا ہے اور یہ معاشرے کی ہلاکت کا باعث ہے۔

اس کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں سب سے پہلی بات تو یہ کہ اللہ کے رسول کی دعوت کو اگر مکمل طور پر پھیلنے سے روک دیا جائے اور اس کے راستے میں ایسے موانع حائل کردیئے جائیں 'جس سے وہ یکسر رک کر رہ جائے تو اس کے نتیجے میں بالعموم اللہ کا عذاب آیا کرتا ہے۔ مشرکینِ مکہ کو حقیقت میں یہ بتایا جارہا ہے کہ تم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت کو روک کر فی الحقیقت عذاب کو دعوت دے رہے ہو 'اندازہ کروا اگر اللہ کا عذاب آیا تو تمہارا انجام کیا ہوگا اور دوسری بات یہ کہ جس معاشرے میں اللہ کی ہدایت کے اثرات ختم ہوجائیں وہ معاشرہ ہلاکت

سے کبھی نہیں بچتا۔ بعض بالکل سامنے کی باتیں ہیں 'لیکن نجانے ہم ان باتوں پر کیوں غور نہیں کرتے۔ آخر ہمیں یہ بات سمجھ کیوں نہیں آتی کہ معاشرہ خوبصورت مکانوں کا نام نہیں 'بلکہ آسودہ مکینوں کا نام ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو کبھی گھروں میں جھانک کر دیکھ لیجئے کہ جس گھر میں بیوی عفت مآب نہیں اور شوہر غیرت مند نہیں، وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے قابل اعتماد نہیں۔ مزید یہ کہ حقوق و فرائض کے حوالے سے وہ دونوں اگر ایک دوسرے کے لیے امین نہیں تو کیا یہ گھر تباہی سے بچ سکتا ہے۔ اگر ان لوگوں نے حیوانی زندگی اختیار نہیں کی اور انسانی اقدار کی کچھ رمق ان میں باقی ہے تو ان دونوں کے بگاڑ کے بعد ان کی یکجائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر ان کو اللہ نے اولاد دی ہے اور یہ ونوں یا ان میں سے کوئی ایک بنیادی اخلاق اور شرم و حیا سے عاری ہو جاتا ہے اور ان کے تعلقات کے بگاڑ کے نتیجے میں ہر وقت گھر میں چخ چخ رہتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس گھر کو دو طرح کے نتیجوں سے نہیں بچا سکتی۔ ایک تو یہ کہ ان کی بداخلاقی کے نتیجے میں ان کے بچے بھی بداخلاق ہوں گے اور یہ گھر گھر نہیں رہے گا بلکہ قحبہ خانہ بن جائے گا اور دوسری یہ بات کہ ان کی نااتفاقی کی صورت میں بچے ان کے نافرمان ہوں گے۔ اس لیے جیسے ہی بچوں کو خود فیصلہ کرنے کا موقع ملے گا اور ان کے والدین کہولت اور ضعیفی کی عمر کو پہنچ جائیں گے تو اس گھر میں ظلم کا وہ تماشہ مچے گا 'جس سے لوگ عبرت پکڑیں گے۔

اللہ کے دین سے اعراض 'درحقیقت زندگی سے انکار ہے

جس معاشرے میں ایسے گھروں کی فراوانی ہو گی اور ایسی ہی اولاد پروان چڑھے گی تو یہ پیشگوئی کرنے کے لیے کسی بڑی عقل کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ معاشرہ ہلاکت و تباہی سے نہیں بچ سکتا۔ اس صورت حال میں والدین مظلومیت کی تصویر بنے اولڈ ہومز میں پہنچ جائیں گے یا ہسپتالوں میں سسک سسک کر جان دے دیں گے اور اولاد بینک لوٹے گی 'عزتیں پامال کرے گی 'لا اینڈ آرڈر کے مسئلے کو اور گہرا کر دے گی ' نتیجتاً یہ قوم ایسے تباہی کے راستے پر چل نکلے گی 'جن کے مقدر میں تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہو گا یہی وہ بات ہے جو یہاں فرمائی جارہی ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں 'لیکن انھیں اس کا شعور نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ کسی بھی قوم کے لیے سب سے بڑا حادثہ یہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی بڑے حادثے کا شکار ہو جائے 'بلکہ بڑا حادثہ یہ ہے کہ اس قوم کو حادثے کا احساس نہ ہو۔ سچ کہا کسی نے ۔

حادثے سے بڑا حادثہ یہ ہوا
لوگ ٹھہرے نہیں حادثہ دیکھ کر

(روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

آیت مبارکہ :

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○27

لغۃالقرآن: [وَلَوْ تَرٰٓي : اور اگر آپ دیکھیں][اِذْ وُقِفُوْا : جب وہ کھڑے کیے جائیں][عَلَي : پر][النَّارِ : آگ][فَقَالُوْا : کہیں گے][يٰلَيْتَنَا : کاش ہم][نُرَدُّ : ہم لوٹادیے جائیں][وَلَا نُكَذِّبَ : اور نہ ہم جھٹلائیں][بِاٰيٰتِ : آیات][رَبِّنَا : اپنے رب][وَنَكُوْنَ : اور ہم ہوں گے][مِنَ : سے][الْمُؤْمِنِيْنَ : ایمان لانے والے]

ترجمہ: اگر آپ (انہیں اس وقت) دیکھیں جب وہ آگ (کے کنارے) پر کھڑے کئے جائیں گے تو کہیں گے: اے کاش! ہم (دنیا میں) پلٹا دیئے جائیں تو (اب) ہم اپنے رب کی آیتوں کو (کبھی) نہیں جھٹلائیں گے اور ایمان والوں میں سے ہو جائیں گے

تشریح:

جو لوگ دنیا میں قرآن مجید کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ یہ ہمارے کانوں کے لیے بوجھ ہے وہ جہنم کے کنارے کھڑے ہو کر آیات ربانی کی حقیقت کا اعتراف اور دنیا میں حق کی شہادت نہ دینے کے جرم کا اعتراف کریں گے۔"

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا کہ قیامت کا دن پچاس ہزار سال پر محیط ہو گا اور اس میں مختلف مراحل ہوں گے۔ جو ہزاروں سال پر مشتمل ہوں گے۔ قیامت کا ہر مرحلہ مجرموں کے لیے سخت سے سخت تر ہو گا۔ پہلے مرحلہ پر مجرم شرک اور اپنے جرائم کا انکار کریں گے اس کے بعد ان کی زبانوں پر مہر ثبت کر دی جائے گی تو ان کے اعضاء بول بول کر ان کے بارے میں گواہی دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی جہنم کو ستر ہزار فرشتے بھاری بھر کم زنجیروں کے ساتھ کھینچ کر لوگوں کے سامنے لائیں گے۔ ہر زنجیر کے ساتھ ستر ستر ہزار فرشتے ہوں گے۔ جب مجرموں کو جہنم کے قریب کھڑا کیا جائے گا تو وہ آہ و بکا کرتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کریں گے کہ کاش ہمیں دنیا میں لوٹنے کا موقعہ نصیب ہو جائے اور ہم دنیا میں جا کر اپنے رب کے احکام کی تکذیب کرنے کے بجائے اس کے ایک ایک حکم پر ایمان لائیں گے۔ ان کا یہ اقرار حقیقت پر مبنی یا دائمی ہونے کے بجائے عارضی اور دفع الوقتی کے لیے ہو گا۔ کیونکہ بفرض محال انھیں واپس لوٹا بھی دیا جائے تو وہ پہلے کی طرح اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار کرتے ہوئے کفر و شرک میں ملوث ہوں گے۔ کیونکہ وہ عادی مجرم تھے لہٰذا اب بھی کذب بیانی سے کام لیں گے۔ یہ اس لیے ہو گا کہ ان کا نظریہ تھا دنیا کی زندگی ہی مستقل زندگی ہے حالانکہ دنیا کی ہر چیز اپنی ناپائیداری کے بارے میں پکار پکار کر ثبوت دے رہی ہے کہ ہمیں قرار اور سکون نہیں ہے۔ انسان کے سایہ سے لے کر فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیاں اس بات پر گواہ ہیں کہ قرار اور دوام صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو حاصل ہے۔ ان کا یہ بھی نظریہ تھا کہ مٹی میں دفن ہونے کے بعد ہمیں ہرگز نہیں اٹھایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ اگر انھیں دنیا میں دوبارہ بھیج دیا جائے تو وہ

وہی کچھ کریں گے جس سے انھیں منع کیا گیا تھا یہ اس لیے کہ انھوں نے دین پر دنیا کو مقدم سمجھا اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر دنیا کی زندگی کو ترجیح دی اگر انھیں دنیا میں لوٹا دیا جائے تب بھی وہ باز نہیں آئیں گے۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور (اے مخاطب) کاش تو دیکھتا جب ان (کافروں) کو دوزخ پر کھڑا کیا جائے گا 'اس وقت وہ کہیں گے کہ کاش ہمیں دنیا میں لوٹا دیا جائے اور ہم اپنے رب کی نشانیوں کی تکذیب نہ کریں اور مومنوں میں سے ہو جائیں۔ (الانعام: ۲۷)

قیامت کے دن کافروں کے عذاب کی کیفیت

قرآن مجید میں وقوف کا لفظ ہے 'یعنی ان کافروں کو جب دوزخ پر واقف کیا جائے گا۔ اس کا معنی قیام بھی ہے اور جاننا بھی 'اس صورت میں اس کے کئی معنی ہیں۔

(۱) وہ دوزخ کے پاس کھڑے ہوں اور دوزخ کا مشاہدہ کر رہے ہوں۔

(۲) دوزخ کے اوپر جو پل تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری ہے 'وہ اس کے اوپر کھڑے ہوئے دوزخ کو دیکھ رہے ہوں۔

(۳) وہ دوزخ کے عذاب پر واقف اور مطلع ہوں۔

(۴) ان کو دوزخ میں ڈال دیا گیا ہو اور وہ اس حال میں دوزخ میں کھڑے ہوئے ہوں کہ وہ ہر طرف سے دوزخ میں کھڑے ہوئے ہوں کہ وہ ہر طرف سے دوزخ کے شعلوں کی لپیٹ میں ہوں۔

اس آیت میں جزا محذوف ہے اور حاصل معنی یہ ہے کہ اے مخاطب! جب تو یہ دیکھے گا کہ فرشتے کافروں کو دوزخ کے پاس کھڑا کر دیں گے تو ان کو اس قدر خوف اور دہشت میں دیکھے گا جس کو منضبط کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس وقت یہ کافر نادم ہوں گے اور یہ تمنا کریں گے کہ کاش انھیں پھر دنیا میں لوٹا دیا جائے اور پھر ہم اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور مومنوں میں سے ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کی ان نشانیوں اور دلیلوں کی تکذیب نہ کریں جو اس کی وحدانیت اور اس کے رسولوں کی تصدیق پر دلالت کرتی ہیں اور اللہ تعالیٰ اور قیامت پر 'فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں پر ایمان لائیں اور گناہوں سے توبہ کریں اور نیک عمل کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کا رد فرماتا ہے۔

(تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

منکرین جب قیامت میں اپنی آنکھوں سے واقع ہونے والے امور کا معائنہ کر لیں گے تو اس کے بعد پھر دنیا میں لوٹائے جانے پر ان سے کفر اور تکذیب کا احتمال کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ تکذیب تو زبان کا فعل ہے اور خود کفر ہے اور دل میں یقین ہونے کے باوجود زبان سے تکذیب ہونا ممکن ہے جیسے بعض ضدی قسم کے لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ دل میں جانتے ہیں مگر مانتے نہیں۔ مثلاً قرآن پاک میں ہے وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا (سورۃ نمل: 14) یعنی فرعون اور آل فرعون نشانیاں دیکھ کر دل میں یقین کر چکے تھے کہ یہ خدائی نشانیاں ہیں مگر محض بے انصافی اور تکبر کی وجہ سے جان بوجھ کر اپنے ضمیر کے خلاف حق کی تکذیب کی اور سچائی کا انکار کیا۔

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔)

ارشاد ہے کہ اے محمد! اگر آپ وہ ہولناک منظر دیکھیں کہ قیامت کے دن دوزخ پر ان کو کھڑا کیا جائے گا اور خوف کے مارے ان کا دم نکلنے کے قریب ہوگا تو پھر آپ کو تعجب ہوگا کہ یہ وہی لوگ ہیں کہ جو دنیا میں فرعون، ہامان، قارون اور شداد بنے پھرتے تھے، آج جب قرآن شریف کی ساری باتیں سامنے آگئیں تو سٹ پٹا گئے اور بولے کاش! ہم دنیا میں پھر بھیج دیئے جاتے تو پورے فرمانبردار بن کر دکھاتے۔
قرآن مجید نے نافرمانوں کو دوزخ سے ڈرایا ہے اور بتایا ہے کہ وہ آگ کا ایک ڈھیر ہے جس کے اندر وہ لوگ جو دنیا میں قرآن مجید اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بار کو کچھ اہمیت نہیں دیتے تھے بلکہ اس میں میں میخ نکالتے تھے اور اپنی من مانی کرتے تھے جھونک دیے جائیں گے۔

اسلام کے تین بنیادی اصول ہیں

(1)۔ توحید (2)۔ رسالت (3)۔ عقیدہ آخرت
سارے عقیدے انہی تین عقیدوں کے تحت آئے ہیں اور یہ وہ عقیدے ہیں جو انسان کو اس کی اپنی حقیقت اور زندگی کا مقصد سمجھا کرکے اس کی زندگی میں انقلاب پیدا کرتے ہیں اور اس کو ایک سیدھی اور صاف راہ پر کھڑا کر دیتے ہیں، ان میں بھی عملی طور پر آخرت کا عقیدہ اور اس میں جزاء اور سزا کے حساب کا عقیدہ ایک ایسا انقلابی عقیدہ ہے جو انسان کے ہر عمل کا رخ ایک خاص طرف پھیر دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے تمام مضامین انہی تین میں داخل ہیں۔ (تفسیر ربانی)
انسان کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اس دنیا میں جو کچھ اچھا یا برا کر رہا ہے اسے مکافات عمل سے غافل نہیں ہونا چاہیے اس کو اس کے عمل کا نتیجہ ہر حال میں مل کر رہے گا جس طرح انسان کو اپنے وجود اور ہستی پر یقین ہے اسی طرح اسے جزائے عمل پر بھی یقین ہونا چاہیے کہ جس خالق کائنات سبحانہ نے انسان کو اس دنیا میں اپنے احکام دے کر بھیجا ہے اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ سبحانہ اسے اگلے جہاں میں بھی اپنے حضور کھڑا کرے گا اور اس کے اعمال کی بازپرس ہوگی چنانچہ ارشاد ہے "وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ "روز محشر کا جو منظر ہوگا وہ اس طرح ہوگا کہ اگر آپ ان نافرمانوں کا وہ حال دیکھیں جب وہ دوزخ پر کھڑے کئے جائیں گے تو لرایت امراً عظیماً یہ جواب شرط محذوف ہے وہ منظر قابل دید اور نہایت تباہ کن ہوگا جب کفار اس تباہ کن منظر کا مشاہدہ کریں گے اور انھیں یقین ہو جائے گا کہ ہم دوزخ میں ہمیشہ گرنے والے ہیں تو حسرت و افسوس کے ساتھ کہیں گے کہ کاش ہم دنیا میں واپس کیے جاتے اور اب کی بار وہاں جاکر اپنے رب کی آیتوں کو نہ جھٹلاتے اور خوب اچھے اعمال انجام دیتے آپ جب یہ دیکھیں گے تو عجیب منظر ہوگا۔
اللہ تعالیٰ جل شانہ کا ارشاد ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ وہ ایمان کی رغبت اور محبت کی وجہ سے دنیا میں واپس جانے کی آرزو کر رہے ہیں بلکہ بات یہ ہے کہ جو کچھ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے تھے یعنی کفر اب اس کا نتیجہ سامنے آگیا وہ دنیا میں واپس جانے کی آرزو اس لیے کر رہے ہیں کہ عذاب جہنم سے خلاصی ہو جائے اس وقت ان سے یہ کہا جائے گا کہ اس وقت تمہارا تمنا کرنا کوئی مفید نہیں ہے اب تم اپنے گناہوں اور کفر و شرک کی سزا کے لئے تیار رہو تمہارے دنیوی زندگی عمل و ایمان کی زندگی تھی اس وقت کا ایمان اور عمل تمہیں آج کام آسکتا تھا اب تمہاری

خواہش پوری نہیں ہو سکتی چنانچہ انہیں جہنم میں پھینک دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ دنیا کی زندگی اور لمبی عمر ایک ہی دفعہ ہم نے دی تھی وہ دور ختم ہو چکا اب دوبارہ واپسی کا کوئی قانون نہیں للذا اپنے کیے کی سزا بھگتو۔

"**ولو ردو لعادو لما نہوا عنہ** الخ۔ اگر بالفرض انہیں دنیا میں دوبارہ بھیج دیا جائے تو پھر وہی کریں گے جس سے انہیں منع کیا گیا ہے اور یہ لوگ اپنی اس بات میں جھوٹے ہیں کہ ہم ایمان لائیں گے اور آیات کی تکذیب نہ کریں گے۔

وَقَالُوٓا اِنۡ هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنۡيَا۔ اور یہ لوگ یہ کہتے تھے کہ ہمارے لئے صرف اسی دنیا کی زندگی ہے اس کے بعد کچھ نہ ہوگا مرنے اور گلنے سڑنے کے بعد ہمیں کون زندہ کرے گا اور کون حساب کتاب کرے گا آج تک ہم نے ایک مرد کو زندہ ہوتے نہیں دیکھا تو اس پورے جہاں کے اگلے پچھلوں کو کون اور کیسے کوئی یکبارگی زندہ کرے گا یہ سب دھوکہ اور ڈھکوسلے ہیں کہ قیامت برپا ہوگی اور سب مردے زندہ ہو جائیں گے یہ ہوگا وہ ہوگا۔

ولو تری اذ وقفوا علی ربھم۔ جب تو دیکھے اس حالت کو جب انہیں اپنے رب کے حضور کھڑا کرکے اللہ تعالیٰ ہر شخص سے براہ راست باز پرس فرمائے گا درمیان میں کوئی ترجمان بھی نہیں ہوگا اور کوئی بھی شخص کسی کا وکیل نہ ہوگا اور ہر سوال کا جواب خود ہی دینا پڑے گا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے۔

"**یوم تاتی کل نفس تجادل عن نفسھا**۔ ہر جان کو اپنی طرف سے خود ہی جوابدہی کرنا ہوگی اس دنیا کی طرح کسی وکیل یا بیرسٹر صاحب کی خدمات حاصل نہیں ہوں گی جو مجرموں کی طرف سے جواب دعویٰ داخل کرے گا۔

قال الیس ھذا بالحق۔ پس اللہ تعالیٰ مشرکین اور کفار سے پوچھیں گے کیا یہ حق نہیں ہے؟ کیا معاد اور بعث بعد الموت جس کے تم منکر تھے واقع نہیں ہوا؟ اب جب کہ تم اپنے رب کے روبرو کھڑے ہو اب بتاؤ میرے پیغمبروں نے جو تمہیں بتایا تھا کیا وہ سچے نہ تھے؟ اس وقت جھٹلانے والے کہیں گے۔ قالوا بلی وربنا۔ ہمارے پروردگار کی قسم یہ تو بالکل برحق ہے ہم نے غلطی کی اور ہم دھوکے میں رہے بدنصیب ہوئے ارشاد ہوگا کہ اب اپنے کفر کا مزہ چکھو۔ (منازل العرفان)

آیت مبارکہ :

بَلۡ بَدَا لَهُمۡ مَّا كَانُوۡا يُخۡفُوۡنَ مِنۡ قَبۡلُ‌ؕ وَلَوۡ رُدُّوۡا لَعَادُوۡا لِمَا نُهُوۡا عَنۡهُ وَاِنَّهُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ ○28

لغۃ القرآن: [بَلْ : بلکہ][بَدَا : وہ ظاہر ہوجائے گا][لَهُمْ : انکے لیے][مَّا كَانُوْا : جو وہ تھے][يُخْفُوْنَ : چھپاتے][مِنْ قَبْلُ : سے پہلے][وَلَوْ : اور اگر][رُدُّوْا : وہ لوٹائے

جائیں][لَعَادُوْا : البتہ وہ کریں][لِمَا : جس سے][نُھُوْا : وہ منع کیے گئے][عَنْهُ : اس سے][وَاِنَّهُمْ : اور بیشک وہ][لَكٰذِبُوْنَ : البتہ جھوٹ بولنے والے]

ترجمہ : (اس اقرار میں کوئی سچائی نہیں) بلکہ ان پر وہ (سب کچھ) ظاہر ہو گیا ہے جو وہ پہلے چھپایا کرتے تھے، اور اگر وہ (دنیا میں) لوٹا (بھی) دیئے جائیں تو (پھر) وہی دہرائیں گے جس سے وہ روکے گئے تھے اور بیشک وہ (پکے) جھوٹے ہیں

تشریح:

پہلی آیت میں بتایا کہ کفار کو جب جہنم کے کنارے کھڑا کیا جائے گا اور اس کے دہکتے ہوئے انگاروں اور لپکتے ہوئے شعلوں پر ان کی نظر پڑے گی تو اوسان خطا ہو جائیں گے اور ساری نخوت اور غرور کافور ہو جائے گا تو انتہائی حسرت سے یہ آرزو کریں گے کہ کاش! انھیں دنیا میں جانے کا ایک بار موقع ملے تو پھر اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ہر گز تکذیب نہ کریں بلکہ سچے دل سے اس پر ایمان لے آئیں۔اس آیت میں دلوں کے اسرار نہاں جاننے والا خدا فرماتا ہے کہ یہ سب جھوٹ اور فریب کاری کی باتیں ہیں۔ان کی فطرت ایسی مسخ ہو چکی ہے کہ اگر انھیں بفرض محال پھر دنیا میں بھیجا جائے تب بھی وہی کرتوت کریں گے جو وہ پہلے کرتے رہے۔اب یہ جو اتنے بھلے مانس بنے ہوئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اب ان کے راز افشا کر دیئے گئے۔ان کی جھوٹی قسموں کی حقیقت بھی کھل گئی اب اس کے علاوہ انھیں کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

درحقیقت وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔بفرض محال اگر انھیں دنیا میں واپس بھیج دیا جائے تو پھر بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے اور کفر کا راستہ ہی اختیار کریں گے اور یہاں وقتی طور پر جھوٹ اس لیے بول رہے ہیں کہ جن حقائق کو وہ دنیا میں چھپایا کرتے تھے اب وہ ان کے سامنے ظاہر ہو گئے ہیں اور ان کی سزا یعنی جہنم کی آگ بھی سامنے دکھائی دے رہی ہے، لہٰذا اس آگ سے بچنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لے رہے ہیں ویسے انھیں ایمان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ میدان حشر میں کفار جب جہنم کی آگ اور اپنے کفر کی سزا کا مشاہدہ کر چکے ہوں گے تو یہ کیسے ممکن ہوگا کہ دنیا میں آ کر وہ پھر احکام خداوندی کا انکار کر دیں گے اور اپنے آپ کو جہنم کا مستحق بنا دیں؟

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ کسی حقیقت کا انکار صرف لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے نہیں کیا جاتا بلکہ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو ایک حقیقت کا اچھی طرح علم ہوتا ہے مگر تکبر، تعصب، بغض، عناد، لالچ یا نفس پرستی کی وجہ سے انکار کر دیتا ہے۔کیونکہ یہ ایسی مہلک بیماریاں ہیں جو انسان کو انجام سے غافل کر دیتی ہیں، مثال کے طور پر:

1۔اہل کتاب حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس طرح پہچانتے تھے جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے تھے۔(قرآن: 20:6) مگر تعصب کی وجہ سے انکار کر دیا۔

2۔حضرت موسیٰ کے معجزات دیکھ کر فرعونیوں کے دل یقین کر چکے تھے مگر تکبر اور ظلم کی وجہ سے انکار کر دیا۔(قرآن: 14:27)

اس کا ایک اور جواب یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مسلسل نافرمانی کرنے سے کفر ان کی فطرت ثانیہ بن چکا ہے اور وہ اسے چھوڑ نا چاہیں بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ ان عادی مجرموں کی طرح ہیں جو کئی بار سزا بھگتنے کے بعد بھی جرائم سے باز نہیں آتے۔ جب انھیں سزا ملتی ہے تو گھبرا کر کہتے ہیں کہ آئندہ یہ جرم نہیں کریں گے مگر جونہی سزا بھگت کر جیل سے باہر آتے ہیں تو پھر انہی جرائم کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔

(امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)
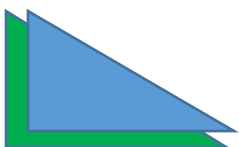
یہاں کفار کا رد کیا جارہا ہے۔ بل ایک چیز کی نفی اور دوسری چیز کے ثبوت کے لیے آتا ہے۔ ان کفار کا دنیا میں جانے کی تمنا کرنا ایمان کے قبول کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس عذاب سے بچنے کے لیے ہے جس کو وہ دیکھ رہے تھے۔ ایمان وہی قابل قبول ہے جو خلوص نیت کے ساتھ رضائے الٰہی کے لیے ہو۔ (تفسیر کبیر)

اور یہ وعدہ بے کار کر رہے ہوں گے بلکہ ان پر کھل گیا جو چھپاتے تھے لوگوں سے پہلی زندگی دنیا میں اپنے ذلیل و قبیح خیالات۔

ایک قول یہ ہے کہ یہ کیفیت منافقوں کی ہو گی اور اس وقت ان کا نفاق کھل گیا ہو گا۔ ایک قول میں ہے کہ یہ حال اہل کتاب کا ہو گا یعنی یہود و نصاریٰ کا جو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نعت وصفت توراۃ وانجیل میں تھی اسے چھپاتے تھے۔ آگے ارشاد ہے جس میں ان کی جبلت کا اظہار ہے۔ **ولو ردوا لعادوا لما نهوا عنه وانهم لكذبون** اور اگر واپس بھیج جائیں تو پھر وہی کریں جس سے منع کئے گئے تھے اور بیشک وہ جھوٹے ہیں۔

یعنی اگر وہ واپس بھیجے جائیں دنیا میں بعد اس کے کہ جہنم میں ڈال دیئے جائیں تو یقیناً پھر وہی کریں گے جس سے منع کئے گئے یعنی کفر اور وہ یقیناً جھوٹے ہیں اپنے اس وعدے میں جو اپنی جانوں سے کریں گے کبھی وہ وعدہ پورا نہ کریں گے۔ اب ان کے اس عقیدے کاسدہ باطلہ کا حال ظاہر کیا جاتا ہے جس کے ساتھ وہ انبیاء (علیہم السلام) کی تعلیم کے مقابلہ میں ڈٹے ہوئے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اور کہا انھوں نے نہیں ہے وہ مگر ہماری زندگی دنیاوی اور نہیں ہیں ہم اٹھائے جانے والے قبروں سے اور اگر دیکھیں آپ جبکہ ٹھہرائے جائیں گے وہ اپنے رب کے حضور میں اور فرمائے گا کیا یہ قبروں سے اٹھنا حق نہیں کہیں گے بیشک حق ہے ہمارے رب کی قسم اللہ فرمائے گا تو اب چکھو عذاب اس وجہ سے کہ تم کفر کرتے تھے۔ کفارہ کا عقیدہ تھا کہ یہی دنیوی زندگی ہے اس کے بعد اور کوئی زندگی نہیں ان کی بد عقیدگی کا یہ عالم تھا کہ ان کا قیامت۔ جزا سزا۔ جنت۔ دوزخ پر ایمان نہ تھا اس لیے وہ دنیا میں منہمک ہو کر اپنی گمراہیوں میں مصروف تھے۔ باوجود دلائل قاطعہ کے وہ حقیقت سے انکار کرتے رہے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ اے محبوب وہ منظر کس قدر ہول ناک ہو گا جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کئے جائیں گے اور جناب باری تعالیٰ اسمہ ان سے ارشاد فرمائے گا کہ اب بتاؤ کہ میرے رسولوں نے جو خبریں تم کو دی تھیں وہ حق ہیں یا نہیں؟ اس وقت وہ کہیں گے کہ رسولوں کے ارشادات اور بشارتیں سچ تھیں لیکن اس وقت ان کا تسلیم کرنا کچھ مفید نہ ہو گا اور اس وقت ان کا کوئی عذر بھی قبول نہ ہو گا اور وہ جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے۔ تفسیر نسفی میں ہے اور کہتے ہیں نہیں یہ مگر صرف دنیا کی زندگی۔ یعنی قیامت کے دن کا معائنہ کرنے سے پہلے ان کا یہ عقیدہ باطلہ فاسدہ کاسدہ تھا کہ ہمیں مرن کے بعد اٹھنا نہیں۔ یعنی وہ عقیدہ بعث و نشر نہیں مانتے تھے۔ اور جب تم دیکھو جبکہ وہ اپنے رب کے حضور کھڑے کئے جائیں۔ یہ کھڑا ہونا ایسا ہے جیسے قصور وار کا اپنے سردار کے سامنے پیش ہونا کہ اسے سزا دی جائے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا اب بتاؤ کیا یہ بعثت

حق نہیں۔ تو وہ مشرک جاحد عرض کریں گے کیوں نہیں ہمیں اپنے رب کی قسم گویا اقرار بھی کریں گے اور قسم کے ساتھ اس کو موکد بھی کریں گے تو جناب باری تعالیٰ کا ارشاد ہوگا کہ اب تم عذاب چکھو اپنے کفر کے بدلے میں۔

تحقیق لفظ عذاب (از مفردات راغب)

ھذا عذب فرات۔ ماء عذب طیب بارد۔ تو عذب بمعنی طیب و بارد آیا۔ والعذاب ھو الایجاع الشدید۔ سخت بھوک میں مبتلا ہونا۔ وقد عذب تعذیبا اکثر حبسہ فی العذاب۔ زیادہ بند رکھنے کے معنی۔

نظائر قرآن

بھوکا رکھنے اور سونے نہ دینے کو عذاب کہتے ہیں یعنی اس نے کھانا اور سونا چھوڑ دیا۔ اصلہ من العذب فعذبتہ ازلت عذب حیاتہ علی بناء المرض۔ کسی مرض کی وجہ سے ذائقہ حیات جاتا رہنا۔ اصل التعذیب اکثار الضرب باذیۃ السوط واللسان۔ کوڑوں سے مارنا۔ زبان سے سب و شتم کرنا۔ ماء عذب اذا کان فیہ قذی و کذر کقولک کدرت عیشہ۔ حیات انسان کا مکدر کردینا۔ (تفسیر الحسنات۔ علامہ ابو الحسنات سید محمد احمد قادری)

کافروں کو دوزخ میں بھیجنے کے تین عذر

طبرانی نے الاوسط میں لکھا ہے کہ حضرت ابوہریرہ (رض) نے بیان کیا میں نے سنا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرمارہے تھے (کافروں کو دوزخ میں بھیجنے کے) تین عذر قیامت کے دن اللہ آدم کے سامنے بیان فرمائے گا۔ ارشاد فرمائے گا آدم میں کافروں کو رحمت سے دور کر چکا ہوں اور اس کا وعدہ کرچکا ہوں اور جھوٹ بولنے اور وعدہ خلافی کرنے سے مجھے نفرت ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو آج تیری تمام اولاد پر میں رحمت کردیتا (کسی کو دوزخ میں نہ بھیجتا) مگر میری یہ بات پوری ہو کر رہے گی کہ اگر میرے پیغمبروں کی تکذیب کی گئی اور میری نافرمانی کی گئی تو جہنم کو جنات اور انسانوں سے سب سے بھر دوں گا۔ اے آدم میں کسی کو دوزخ میں داخل نہیں کروں گا۔ نہ کسی کو عذاب دوں گا سوائے ان لوگوں کے جن کے متعلق مجھے اپنے علم سے معلوم ہے کہ اگر ان کو دنیا میں دوبارہ بھیج دیا گیا تب بھی یہ اسی شر کی طرف رجوع کریں گے جو ان کے اندر ہے شر سے نہیں لوٹیں گے اے آدم میں اپنے اور تیری اولاد کے درمیان تجھے ہی فیصلہ کن (پنچ) بناتا ہوں اعمال کی وزن کشی کے وقت میزان کے پاس جا کر تو خود کھڑا ہو جا جس کا خیر کا پلڑا شر کے پلڑے سے ذرہ برابر بھی جھکتا ہوا ہو اس کے لیے جنت ہے (میں نے یہ باتیں تجھ سے اس لیے کہیں ہیں) تاکہ تجھے معلوم ہو جائے کہ میں صرف ظالم کو دوزخ میں داخل کروں گا۔ تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی

آیت مبارکہ :

وَقَالُوٓا اِنۡ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا وَمَا نَحۡنُ بِمَبۡعُوۡثِیۡنَ ○29

لغۃ القرآن: [وَقَالُوْٓا : اور کہا انہوں نے][اِنْ هِیَ : نہیں یہ][اِلَّا : مگر][حَیَاتُنَا : زندگی ہماری][الدُّنْیَا : دنیا کی][وَمَا : اور نہیں][نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ : ہم اٹھائے جانے والے]

ترجمہ : اور وہ (یہی) کہتے رہیں گے (جیسے انھوں نے پہلے کہا تھا) کہ ہماری اس دنیوی زندگی کے سوا (اور) کوئی (زندگی) نہیں اور ہم (مرنے کے بعد) نہیں اٹھائے جائیں گے

تشریح : ان کی کجروی اور غلط کاری کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ انھیں قیامت، جزا، وسزا اور جنت و دوزخ پر ایمان نہ تھا۔ ان کا یہی عقیدہ تھا کہ زندگی بس یہی دنیوی زندگی ہے۔ اس کے بعد اور کوئی زندگی نہیں جس میں اپنے اعمال کے نتائج سے دوچار ہونا پڑے اس لیے وہ بالکل بے فکر ہو کر اپنی گمراہیوں میں منہمک تھے۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

یہ ان کافروں کا مقولہ ہے جو قیامت کے منکر ہیں اور اس کا واقعہ یہ تھا کہ جب سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کفار کو قیامت کے احوال اور آخرت کی زندگی، ایمانداروں اور فرمان بر داروں کے ثواب، کافروں اور نافرمانوں پر عذاب کا ذکر فرمایا تو کافر کہنے لگے کہ زندگی تو بس دنیا ہی کی ہے اور جب ہم مرنے کے بعد اس دنیا سے چلے جائیں گے تو ہمیں دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا۔ (1) کافروں کا تو عقیدہ ہی یہ تھا کہ زندگی تو صرف دنیا کی زندگی ہے اور مرنے کے بعد کوئی اٹھایا نہیں جائے گا اور اسی اعتقاد کی بنا پر ان کی زندگی غفلت کا شکار تھی لیکن مسلمانوں پر بھی افسوس ہے کہ ان کا تو قطعی عقیدہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد لوگوں کو اٹھایا جائے گا، اعمال کا جواب دینا پڑے گا لیکن اس کے باوجود وہ غفلت میں پڑے ہیں، یہ بڑی افسوس ناک صورت ہے چنانچہ اسی مفہوم میں بزرگوں نے بہت سی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ حضرت ابو جعفر (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "اس شخص پر بڑی حیرت ہے جو ہمیشگی کے گھر (جنت) کی تصدیق تو کرتا ہے لیکن کوشش دھوکے کے گھر (دنیا کو پانے اور اسے سنوارنے) کے لیے کرتا ہے۔

امام غزالی (رح) فرماتے ہیں: ایک بزرگ (رح) نے فرمایا کہ "اس شخص پر تعجب ہے جو احسان کرنے والے کی معرفت کے بعد اس کی نافرمانی کرتا ہے اور شیطان لعین کی سرکشی کو جاننے کے بعد اس کی اطاعت کرتا ہے۔ حضرت فضیل (رح) فرماتے ہیں "مجھے اس شخص پر تعجب نہیں ہوتا جو عمارت بنا کر چھوڑ جاتا ہے بلکہ اس پر تعجب ہوتا ہے جو اس عمارت کو دیکھ کر عبرت حاصل نہیں کرتا۔

حضرت وہیب مکی (رح) فرماتے ہیں "کسی شخص کے لیے یہ بات کیسے مناسب ہے کہ وہ دنیا میں ہنسے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے سامنے قیامت کے دن کی فریادیں، گردشیں اور خوفناک مناظر ہیں، قریب ہے کہ سخت رعب اور خوف سے اس کے جسم کے جوڑ کٹ جائیں۔

(تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری)

ہندوستان کے موجودہ مشرکین جو آواگون کے قائل ہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ سزا جزا تو ہوگی مگر اسی دنیا میں ہوگی کہ مجرم کتا، بلا وغیرہ بن کر آویں گے اور اسی دنیا میں رہ کر جزا و سزا پائیں گے۔ دوسری دنیا اور قیامت کے منکر ہیں۔ مگر یہ عقلًا بھی غلط ہے۔ اس لیے کہ جب کتا، بلی بننے کے بعد کوئی تکلیف ہی محسوس نہ ہو تو پھر وہ سزا کیا ہوئی۔ نیز دنیا کی کوئی زندگی آرام و تکلیف سے خالی نہیں۔ رب کی سزا آرام سے اور جزا تکلیف سے خالی چاہیے۔ (تفسیر نور العرفان)

سچ کا اقرار

ارشاد ہے کہ دنیا میں ان کی نگاہ دنیا کی بے حقیقت مادی چیزوں سے اونچی نہیں اٹھتی اس لیے وہ انھیں کی ادھیڑ بن میں بنتے رہتے ہیں اس کے وہ قائل نہیں کہ مر جانے کے بعد وہ دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور ایک نئی زندگی شروع ہوگی جس کے بعد موت کبھی نہ آئے گی یہ ان کے خیال میں بھی کبھی نہیں گزر سکتا کہ دنیا کے فائدے مزے اور آرام کو اس لئے چھوڑ دیں کہ مرنے کے بعد اس سے کہیں زیادہ آرام فائدے اور مزے ملیں گے۔ ان لوگوں کی آنکھیں تب کھلے گی جب اپنے بنانے والے اور پالنے والے کے سامنے لا کر کھڑے کئے جائیں گے۔ اور ان سے پوچھا جائے گا کہ کہو آج تمہیں کچھ حقیقت معلوم ہوئی اس وقت ان کی زبان سے بے ساختہ نکلے گا یہ تو اپنے رب کی قسم بالکل سچ ہے۔ حکم ہوگا کہ دنیا میں تم سے نہ ہو سکا کے میری بات کو سچ مانتے اور میرے رسول کی فرمان بر داری کرتے اچھا اس کے بدلے آج عذاب چکھو اس آیت میں یہی کہا گیا ہے۔

ارشاد ہے کہ ان کے نزدیک جو کچھ ہے بس اسی دنیا کی زندگی ہے یہ اس بات کے قائل بلکہ دل سے ماننے والے ہیں کہ ہم مرنے کے بعد پھر زندہ نہیں ہو سکتے ان کا حال اس وقت دیکھنے کے قابل ہوگا جب یہ اپنے رب کے سامنے لا کھڑے کئے جائیں گے اور وہ خود ان سے پوچھے گا کہ بولو جو کچھ تم سے کہا گیا تھا وہ سچ ہے یا نہیں وہ کہیں گے کہ ہمیں اپنے رب کی قسم کے سب بالکل سچ ہے اس کے بعد وہ حکم سنائے گا کہ دنیا میں مر کر دوبارہ جینے کو ایک فضول گھڑی ہوئی بات سمجھتے تھے حالانکہ تم سے ہمارے رسول نے صاف کہہ دیا تھا کہ دیکھو اگر مرنے کے بعد پھر جی کر اٹھ کھڑے ہونے کو آج نہ مانا تو کل تمہاری بر گھت بنے گی اور اب جب آنکھوں سے دیکھ لیا تو کہتے ہوں کہ ہاں سچ ہے۔ دنیا میں جو نافرمانی کی تھی اب اس کی سزا بھگتو۔

سوچنے کا مقام

پچھلے سبق کی دونوں آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی خرافات میں پھنس کر آخرت کو نہ بھولو اور قیامت اور دوزخ کو بے دیکھے مان لو ورنہ دیکھ کر ماننا کچھ کام نہ آئے گا اور دنیا میں کفر اور انکار کرنے کے بدلے آخرت میں سخت سزا دی جائے گی یہ وہ اصل قاعدہ ہے کہ جس کے مطابق

اسلام انسان کو اس دنیا میں زندگی بسر کرنا سکھانا چاہتا ہے اس کو اچھی طرح سمجھے بغیر ممکن نہیں کہ دنیا کی زندگی اچھی طرح بسر ہو سکے اس کو جتنا صاف اور واضح کیا جائے گا اور دل میں بٹھایا جائے گا اتنا ہی انسان اصلی ترقی کر سکے گا ورنہ اس کا کامیاب زندگی بسر کرنا محال ہے۔ انسان کا دل چاہتا ہے کہ میں بے روک ٹوک اپنی ساری خواہشیں پوری کروں اور کوئی میرے راستے میں رکاوٹ پیش نہ آئے لیکن اگر وہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی چیزوں کی مدد سے وہ اپنی دلی خواہش پوری کر سکے گا تو اس کی خام خیالی ہے کیونکہ اس کی 1 خواہش تو اس دنیا میں ہر گز پوری نہیں ہو سکتی اور وہ ہمیشہ کی زندگی ہے۔ دنیا میں کوئی شخص ہمیشہ زندہ نہیں رہا اور نہ رہ سکتا ہے اس سے یہ نتیجہ صاف طور پر نکلتا ہے کہ یہ سب دنیا کی چیزیں، مال و دولت اور عزت ہنسی دل لگی عیش و عشرت سب کچھ لکھا رہ جائے گا اور انسان ایک دن ان سب چیزوں کو یہیں چھوڑ کر چل دے گا اس کے بعد کیا ہوگا۔ (درس آسٹریلیا)

قرآن شریف بتاتا ہے کہ انسان کی یہ دلی مراد کہ میں جو چاہوں ہو جائے پوری ہو جائے گی لیکن مرنے کے بعد اور وہ بھی اس شرط پر کہ وہ دنیا میں اپنی خواہشوں کا غلام نہ بنے بلکہ اللہ کے حکم کے مطابق چلے اور دل میں یقین رکھے کہ دنیا میں خواہشوں کو اللہ کے حکم کے ماتحت کرنے سے مرنے کے بعد جنت میں میری ہر خواہش پوری کی جائے گی اور ایسی زندگی ملے گی جس کے بعد کبھی مرنا ہے ہی نہیں۔

اسی کو قرآن شریف میں جابجا سمجھایا گیا ہے۔ پچھلے سبق کی آیتوں میں ایسے آدمیوں کی مذمت کی گئی ہے جو دنیا ہی کی زندگی میں اپنی خواہشیں پوری کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس میں اتنا کہا گیا ہے کہ یہ خیال تباہی کی جڑ ہے اور ویسے بھی عقل کے خلاف ہے کیونکہ جب انسان کے دل میں فطرتاً یہ خواہش ہے کہ میرے دل کی ساری مرادیں پوری ہوں اور وہ اس دنیا میں ہو نہیں سکتیں تو ضرور اسے اس کی فطری خواہش کے پورا ہونے کا موقع ملنا چاہیے ورنہ اس کی انسانیت کی تکمیل نہ ہوگی۔

اسلام سکھاتا ہے کہ مرنے کے بعد اس کی یہ خواہش پوری ہوگی لیکن ہر ایک کی نہیں بلکہ فقط اس کی جو اپنی ساری خواہشیں یہاں پوری کرنا نہیں چاہتا اور وہی کرتا ہے جو قرآن شریف نے سکھایا اور ان چیزوں سے جن سے قرآن شریف نے روکا رک جاتا ہے ایسا آدمی مرنے کے بعد ہمیشہ کی زندگی پائے گا اور اس کی ہر خواہش بلا محنت و مشقت پوری ہوگی اور اسی کے مجموعہ کا نام جنت ہے یعنی ہمیشہ کی زندگی اور ہر خواہش کا پورا ہونا۔

آیت مبارکہ :

وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۠﴿30﴾

لغۃ القرآن: [وَلَوْ تَرٰي : اور اگر آپ دیکھیں][اِذْ : جب][وُقِفُوْا : کھڑے کیے جائیں گے][عَلٰي : پر][رَبِّهِمْ : اپنے رب][قَالَ : کہا][اَلَيْسَ : کیا نہیں][هٰذَا : یہ][

بِالْحَقِّ: حق][قَالُوْا : انہوں نے کہا][بَلٰى: ہاں][وَرَبِّنَا : ہمارے رب کی قسم][قَالَ : فرمایا][فَذُوْقُوا : پس چکھوتم][الْعَذَابَ : عذاب][بِمَا : سبب اس کے][كُنْتُمْ : تم تھے][تَكْفُرُوْنَ : کفر کرتے]

ترجمہ : اور اگر آپ (انہیں اس وقت) دیکھیں جب وہ اپنے رب کے حضور کھڑے کئے جائیں گے، (اور انہیں) اللہ فرمائے گا: کیا یہ (زندگی) حق نہیں ہے؟ (تو) کہیں گے : کیوں نہیں ! ہمارے رب کی قسم (یہ حق ہے، پھر) اللہ فرمائے گا: پس (اب) تم عذاب کا مزہ چکھو اس وجہ سے کہ تم کفر کیا کرتے تھے

تشریح:

آج تو بیشمار دلائل سننے اور سمجھنے کے باوجود یہ کافر قیامت کا انکار کر رہے ہیں۔ غور کیجئے وہ منظر ان کے لیے کتنا ہولناک ہوگا جب وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کئے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے دریافت فرمائے گا کہ اب بتاؤ قیامت کے برپا ہونے کی جو خبر میرے رسولوں نے تمہیں دی تھی سچی تھی یا نہیں۔ اس وقت تسلیم کریں گے لیکن اس روز کا تسلیم کرنا کچھ مفید نہ ہوگا۔ اس وقت ان کا کوئی عذر قبول نہیں کیا جائے گا اور جہنم میں پھینک دیئے جائیں گے۔

کفار اس دنیا کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں اور دوبارہ زندہ ہونے یعنی آخرت پر ایمان نہیں رکھتے لیکن میدان حشر میں جب انھیں عملاً دوبارہ زندہ کر دیا جائے گا تو ان سے پوچھا جائے گا: کیا آخرت سچ نہیں ہے؟ تو وہ قسمیں کھا کر کہیں گے کہ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے اور وہ ایک ایسی حقیقت کا انکار کر بھی کیسے سکیں گے جسے وہ کھلی آنکھوں، عملی صورت میں اپنی ذات پر وارد ہوتا دیکھ رہے ہیں لیکن اس رز کا اقرار نہیں کوئی فائدہ نہیں دے گا کیونکہ توبہ کا وقت اب ختم ہو چکا ہے، لہٰذا انھیں کفر کی سزا کے طور پر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

مجرموں کی اللہ کے حضور پیشی اور اس کی بارگاہ میں سوال وجواب

قرآن مجید بار بار انسان پر یہ حقیقت عیاں کرتا ہے کہ اسے مرنے کے بعد اپنے کیے کا جواب دینا ہے۔ جس کی ابتدا قبر کی کوٹھڑی سے ہوگی۔ جب میت کو دفنایا جاتا ہے ابھی اس کے اعزاء واقرباء قبر پر مٹی ڈال کر رخصت ہی ہوتے ہیں کہ منکر نکیر مرنے والے سے تین سوال کرتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں کیا جانتا ہے؟ اور تیرا دین کونسا ہے؟

قبر سے اٹھنے کے بعد محشر کے میدان میں جب لوگ اپنے رب کی بارگاہ میں پیش ہوں گے تو ان سے سوال کیا جائے گا کہ کیا مرنے کے بعد اٹھ کر حشر کے میدان میں رب کی بارگاہ میں حاضر ہونا حق ہے یا نہیں؟ تو انسان بے ساختہ پکار اٹھیں گے کیوں نہیں ہم نے قدم قدم پر اپنے رب کا وعدہ سچا پایا۔ جہاں تک مجرموں کا تعلق ہے وہ دہائی دیں گے اے ہمارے رب ! آج ہمیں یقین ہوگیا کہ آپ کا فرمان سچا اور آپ کی ملاقات برحق تھی لیکن ان کا اعتراف اور معذرت کسی کام نہیں آئے گی۔ حکم ہوگا کہ اب عذاب کی سختیاں اور جہنم کی اذیتیں چکھتے رہو کیونکہ بار بار

سمجھانے کے باوجود تم کفر ہی کرتے رہے تھے۔ تم نے اپنے رب کی ملاقات کو جھٹلائے رکھا یہاں تک کہ قیامت برپا ہو گئی۔ کافر، منافق، مشرک اور عادی مجرم حسرت و یاس کا اظہار کرتے ہوئے گناہوں کا بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوں گے۔ نہایت ہی بدترین بوجھ ہو گا جو انھیں اٹھانا پڑے گا۔ تیسرا موقع سوال و جواب کا اس وقت ہو گا جب مجرم اپنا اپنا بوجھ اٹھائے ذلت و رسوائی کی صورت میں جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے جب یہ لوگ جہنم کے کنارے پہنچیں گے تو ان کے لیے جہنم کے دروازے کھول دیے جائیں گے داخلے کے وقت جہنم کے فرشتے ان سے سوال کریں گے کیا تم میں رسول مبعوث نہیں کیے گئے جو تمہارے سامنے تمہارے رب کے احکام پڑھتے اور تمہیں آج کے دن کی ہولناکیوں سے ڈراتے؟ جہنمی پکار پکار کر کہیں گے کیوں نہیں! انبیاء کرام (علیہ السلام) نے اللہ تعالیٰ کے احکام سے ہمیں آگاہ کیا اور اس دن سے ہمیں بار بار ڈرایا لیکن ہم نے کفر و استکبار کا رویہ اختیار کیا جس وجہ سے آج ہمیں یہ رسوائی کا دن دیکھنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ کا عذاب برحق ثابت ہوا یہ سنتے ہی ملائکہ ان پر لعنت کی بوچھاڑ کریں گے۔ (الزمر: ۷۱ تا ۷۲) (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

روز قیامت اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حاضری کی صورت

سلیمان بن عبدالملک ایک دفعہ مدینہ منورہ حاضر ہوا اور حضرت ابو حازم (رح) سے پوچھا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حاضر ہونے کی کیا صورت ہو گی؟ ابو حازم نے جواب دیا: نیک آدمی اس صورت میں حاضر ہو گا جیسے کوئی آدمی تجارت کی غرض سے دور دراز سفر پر گیا اور کافی عرصہ کے بعد بہت منافع لے کر گھر واپس آیا تو اہل خانہ اس کو دیکھ کر خوش ہیں اور وہ اہل خانہ کو دیکھ کر خوش ہے یعنی دونوں ایک دوسرے کی ملاقات اور کامیاب تجارت پر خوش ہیں۔ اسی طرح قیامت کے دن نیک آدمی اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کو دیکھ کر اور اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی نیکیوں پر خوش ہو گا۔ ایسا خوش نصیب جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو گا، اور برا آدمی اس صورت میں حاضر ہو گا جیسے کوئی غلام اپنے مالک کی چوری کر کے بھاگ گیا ہو اور مالک نے اس کی گرفتاری کے لیے پیادے روانہ کیے ہوں اور وہ اس چور غلام کو پکڑ کر لے آئیں۔ اب غلام اپنی حماقت پر شرمندہ ہے اور مالک اس کی نمک حرامی پر غضب ناک ہے۔ اسی طرح قیامت کے دن برا آدمی اپنی حماقتوں پر شرمندہ ہو گا اور اللہ تعالیٰ اس کی نمک حرامی پر غضب ناک ہو گا۔ ایسا بیوقوف جہنم کے عذاب میں مبتلا ہو گا۔ اس دوران سلیمان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کہنے لگا: کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں اپنا حال جان لیتا کہ ان دونوں صورتوں میں سے کس صورت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے میری پیشی ہو گی؟ ابو حازم نے کہا: یہ معلوم کرنا بالکل آسان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "بیشک نیک لوگ (جنت کی) نعمتوں میں ہوں گے اور برے لوگ دوزخ (کے عذاب) میں ہوں گے۔" (قرآن: 13-14:14) اب تم خود ہی اپنے اعمال کا جائزہ لے لو کہ آیا تم نیک لوگوں میں سے ہو یا برے لوگوں میں سے؟ سلیمان نے کہا: اگر انجام کار اعمال پر منحصر ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت کس لیے ہے؟ اس پر ابو حازم نے فرمایا: اس سوال کا جواب بھی قرآن سے پوچھ لو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت نیک لوگوں کے قریب ہے۔" (قرآن: 56:7) یعنی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مستحق بنانے کے لیے بھی نیک کاموں اور نیک لوگوں کی صحبت کا وسیلہ ضروری ہے۔

(حلیۃ الاولیاء: جلد 3: ص 271) (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

فوائد

۱: مگر رب سے حجاب میں رہ کر۔ کیونکہ رب تعالیٰ کا دیدار اہل جنت کے لیے ہی خاص ہے۔ رب فرماتا ہے کلا انہم عن ربھم یومئذ لمحجوبون۔
۲: سوال اقرار کرانے کے لیے نہ کہ پوچھنے والے کی بے علمی کی وجہ سے۔
۳: خیال رہے کہ یہ کلام یا تو فرشتوں کا ہوگا جسے رب کی طرف منسوب فرمایا گیا کیونکہ رب کے خاص بندوں کا کام اور کلام رب تعالیٰ کا کام و کلام قرار پاتا ہے۔ یا براہ راست رب تعالیٰ ہی ان نابکاروں سے کلام فرماوے گا۔ جس آیت میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کفار سے کلام نہ کرے گا اس سے رحمت کا کلام مراد ہے اور یہ غضب کا کلام ہے۔ لہٰذا آیات میں تعارض نہیں۔

آیت مبارکہ :

قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِیْهَا ۙ وَ هُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ ○31

لغۃ القرآن : [قَدْ : تحقیق][خَسِرَ : خسارے میں رہے][الَّذِیْنَ : وہ لوگ][كَذَّبُوْا : انہوں نے جھٹلایا][بِلِقَآءِ اللّٰهِ: ملاقات اللہ کی][حَتّٰى: یہاں تک کہ][اِذَا جَآءَتْهُمُ : جب آئے گی انکے پاس][السَّاعَةُ : قیامت][بَغْتَةً : اچانک][قَالُوْا : انہوں نے کہا][یٰحَسْرَتَنَا : ہائے افسوس][عَلٰي : پر][مَا فَرَّطْنَا : جو ہم نے کوتاہی کی][فِیْهَا : اس میں][وَهُمْ : اور وہ][یَحْمِلُوْنَ : اٹھائے ہوں گے][اَوْزَارَهُمْ : اپنے بوجھ][عَلٰي : پر][ظُهُوْرِهِمْ : اپنی پشتوں][اَلَا : خبردار][سَآءَ : برا][مَا : جو][یَزِرُوْنَ : وہ بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں]

ترجمہ : پس ایسے لوگ نقصان میں رہے جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلا دیا یہاں تک کہ جب ان کے پاس اچانک قیامت آ پہنچے گی (تو) کہیں گے : ہائے افسوس ! ہم پر جو ہم نے اس (قیامت پر ایمان لانے) کے بارے میں (تقصیر) کی، اور وہ اپنی پیٹھوں پر اپنے (گناہوں کے) بوجھ لادے ہوئے ہوں گے، سن لو ! وہ بہت برا بوجھ ہے جو یہ اٹھا رہے ہیں

تشریح:

روز قیامت پر ایمان لانا اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک دن ضرور آئے گا جب یہ ساری کائنات فنا ہو جائے گی اور پھر سارے لوگ دوبارہ زندہ ہو کر اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حاضر ہوں گے۔ اس روز اعمال کا حساب وکتاب اور جزاوسزا کا فیصلہ ہوگا۔ یہ عقیدہ انسان کو ہر وقت متنبہ کرتا رہتا ہے کہ اس کی ہر حرکت نوٹ ہو رہی ہے اور قیامت کے دن اس کے متعلق باز پرس ہو گی، لہٰذا احساس جواب دہی اسے برے کاموں سے باز رکھتا ہے۔ اس آیت میں عقیدہ قیامت کو اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ اس روز ہر انسان کو اللہ تعالیٰ کے قانون عدل وانصاف کا سامنا کرنا پڑے گا، لیکن جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اس ملاقات یعنی روز قیامت اور اس میں ہونے والے حساب وکتاب کا انکار کرتے ہیں وہ یقیناً خسارے میں ہیں کیونکہ قیامت کا آنا یقینی ہے اور جب قیامت اچانک آ پہنچے گی تو کف افسوس ملیں گے کہ کاش وہ قیامت کا انکار نہ کرتے لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

نیز قیامت کے دن منکرین قیامت کے گناہ جب ظاہر ہو جائیں گے تو فرط ندامت سے ان کی حالت یہ ہو گی جیسے کوئی بھاری بھر کم بوجھ ان پر لاد دیا گیا ہو اور وہ اس کی گرانی کے نیچے دبے چلے جا رہے ہیں۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو وارننگ دی ہے کہ قیامت کے دن گناہوں کا بوجھ بہت برا ہے، لہٰذا آج حق کو تسلیم کرنا اور گناہوں سے بچنا ہی عقل مندی ہے۔ کل کا پچھتاوا بے سود ہوگا۔

(امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

منکرین قیامت کے خسارہ کا بیان

اس آیت میں بھی ان کافروں کے احوال بیان فرمائے ہیں جنہوں نے قیامت کا اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کا انکار کیا ' ان کا ایک حال یہ بیان فرمایا کہ انھوں نے نقصان اٹھایا اور دوسرا حال یہ بیان فرمایا کہ وہ اپنی پیٹھوں پر اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں گے۔

اس نقصان کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اعضاء جسمانیہ اور عقل وفکر کے ساتھ بھیجا ' تاکہ انسان اپنی قوت عملیہ اور قوت عقلیہ سے نفع حاصل کرے اور وہ نفع ہے اخروی نعمتوں کا اور غیر فانی اجر وثواب کے حصول کا ' اور یہ نفع اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانے اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن جب کافر اللہ اور اس کے رسول پر اور قیامت پر ایمان نہیں لاتے تو ان کو اخروی نعمتوں کا نفع حاصل نہیں ہوا ' اور کفر اور معصیت کی وجہ سے ثواب کے بجائے عذاب کے مستحق ہوئے۔ ان کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ وہ اپنی پیٹھوں پر گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اس نقصان کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کی سعادت کا کمال یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے اور اس کی عبادت میں مشغول رہے اور دنیا کی دلفریبیوں اور عیاشیوں سے خود کو بے تعلق رکھے اور ہر قسم کے گناہوں سے اپنے آپ کو باز رکھے اور جو شخص قیامت کا اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کا منکر ہوگا ' وہ اخروی زندگی کے لیے کسی زاد راہ کو تیار نہیں کرے گا۔ اس کے برعکس وہ شہوت اور غضب کے تقاضوں میں ڈوب کر اپنے گناہوں کے بوجھ میں اضافہ کرتا رہے گا۔ حتیٰ کہ جب اس کے پاس

قیامت آ پہنچے گی تو وہ کہے گا 'ہائے افسوس ! میری اس تقصیر پر جو قیامت کے متعلق مجھ سے ہوئی 'درآنحالیکہ وہ اپنی پیٹھ پر گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوگا اور وہ کیسا برا بوجھ ہے۔

روز قیامت کو ساعت اور اللہ سے ملاقات کا دن فرمانے کی توجیہ

اس آیت میں قیامت کو ساعت سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ قیامت ایک ساعت میں واقع ہوگی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ حساب و کتاب بھی ایک ساعت میں ہوگا گویا قیامت ایک ساعت حساب ہے۔

اس آیت میں قیامت کے دن کو اللہ سے ملاقات کا دن فرمایا ہے 'کیونکہ یہی وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے غضب کے آثار کا ظہور ہوگا۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ بندوں کو مہلت اور ڈھیل دیتا ہے اور ان کے گناہوں اور سرکشی پر فورا گرفت نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ :

(آیت) "**ولو یعجل اللہ للناس الشر استعجالھم بالخیر لقضی الیھم اجلھم فنذر الذین لا یرجون لقآءنا فی طغیانھم یعمھون**"۔ (یونس : ١١)

ترجمہ : اور اگر اللہ لوگوں کو سزا دینے میں بھی اتنی ہی جلدی کرتا جتنی جلدی وہ بھلائی کی طلب میں کرتے ہیں 'توان کی مدت عمل ختم کی جا چکی ہوتی (مگر یہ اللہ کا طریقہ نہیں ہے) لہٰذا جو لوگ ہم سے ملاقات کی امید نہیں رکھتے 'وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو دنیا میں مہلت اور ڈھیل دی 'تاکہ لوگ اللہ سے ملاقات کرنے کو یاد کریں کہ جب وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کریں گے اور اس کے سامنے پیش ہوں گے تو وہ اپنے گناہوں اور سرکشی کے متعلق کیا عذر پیش کریں گے۔ اس لیے انھیں زندگی میں مہلت دی گئی کہ کسی بھی لمحہ وہ اس ملاقات کے دن کو یاد کرکے اپنی معصیت اور سرکشی سے باز آجائیں اور توبہ کرلیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(آیت) "**واتقوا اللہ واعلموا انکم ملقوہ**"۔ (البقرہ : ٢٢٣)

ترجمہ : اور اللہ سے ڈرو اور یقین رکھو کہ تم ضرور اس سے ملاقات کرنے والے ہو۔

(آیت) "**وقیل الیوم ننسکم کما نسیتم لقاء یومکم ھذا وماوکم النار ومالکم من نصرین**"۔ (الجاثیہ : ٣٤)

ترجمہ : اور ان سے کہہ دیا جائے گا آج کے دن ہم تم پر رحم نہیں کریں گے جس طرح تم نے اس دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا اور تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے دن کو یاد رکھنے کا معنی یہ ہے کہ بندہ اللہ سے ملاقات کے شوق میں نیک عمل کرے 'تاکہ اس دن اللہ تعالیٰ اس پر نظر رحمت فرمائے اور محبت کے ساتھ اس سے کلام کرے اور اس کو اپنے دیدار سے نوازے۔

حضرت عبادہ بن الصامت (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص اللہ سے ملاقات کو محبوب رکھتا ہے 'اللہ (بھی) اس سے ملاقات کو محبوب رکھتا ہے اور جو شخص اللہ سے ملاقات کو ناپسند کرتا ہے 'اللہ (بھی) اس سے ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔ حضرت عائشہ (رض) یا آپ کی کسی اور زوجہ نے کہا ہم تو موت کو ناپسند کرتے ہیں آپ نے فرمایا یہ بات نہیں ہے۔ البتہ جب مومن پر موت کا وقت آتا ہے تو اس کو اللہ عزوجل کے راضی ہونے اور اس کے کرم کرنے کی بشارت دی جاتی ہے۔ تو اس وقت اس کو آخرت کے سفر میں آگے جانے سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہیں ہوتی۔ سو وہ اللہ سے ملاقات کو محبوب رکھتا ہے اور اللہ بھی اس سے ملاقات کو محبوب رکھتا ہے 'اور کافر پر جب موت کا

وقت آتا ہے تو اسے اللہ کے عذاب اور اس کی سزا کی بشارت دی جاتی ہے۔ لہٰذا اس کو آخرت کے اگلے سفر سے زیادہ کوئی چیز ناپسند نہیں ہوتی سو وہ اللہ سے ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اور اللہ اس سے ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔ (صحیح البخاری 'ج ۷ 'رقم الحدیث : '۶۵۰۷ 'صحیح مسلم الدعا الذکر ' ۱۷(۲۶۸۵) ۶۷۰۰ 'سنن ترمذی 'ج ا 'رقم الحدیث : '۱۰۶۸ 'سنن النسائی 'ج ۴ 'رقم الحدیث : '۱۸۳۴ 'سنن دارمی 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ' ۲۷۵۶)

صحیح مسلم کی روایت میں ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو تمہارا خیال ہے وہ بات نہیں ہے لیکن جب پتلیاں اوپر کی طرف چڑھ جائیں اور جب سانس سینہ میں اکھڑنے لگے اور جسم پر لرزہ طاری ہو اور انگلیوں میں تشنج ہو جائے 'اس وقت جو اللہ سے ملاقات کو محبوب رکھے تو اللہ بھی اس سے ملاقات کو محبوب رکھتا ہے اور جو اس وقت اللہ سے ملاقات کو ناپسند کرے تو اللہ بھی اس سے ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اور اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی خوشی اور ناخوشی نزع روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی کے وقت معتبر ہوتی ہے۔ اس وقت ہر انسان کو یہ خبر دے دی جاتی ہے کہ اس کا کیا انجام ہے؟ اور آخرت میں اسے کے لیے کیا تیار کیا گیا ہے؟ اور اس کا اخروی ٹھکانا اس کے لیے منکشف کر دیا جاتا ہے۔ نیک لوگ موت کو اور اللہ سے ملنے کو پسند کرتے ہیں 'تاکہ ان انعامات کی طرف منتقل ہو جائیں جو ان کے لیے تیار کیے گئے ہیں اور اللہ بھی ان کو پسند کرتا ہے تاکہ ان پر اپنا انعام اور اکرام فرمائے اور بدکار لوگ اللہ سے ملاقات کو ناپسند کرتے ہیں کیونکہ ان کو پتا چل جاتا ہے کہ ان کو عذاب کی طرف دھکیلا جائے گا اور اللہ بھی ان سے ملنے کو ناپسند کرتا ہے اور ان کو اپنی رحمت اور اپنے عفو و کرم سے دور رکھتا ہے۔

امام ابن جریر متوفی ۳۱۰ھ نے اس آیت کی تفسیر میں عمرو بن قیس سے روایت کیا ہے کہ مومن جب اپنی قبر سے نکلے گا تو اس کا نیک عمل حسین صورت اور نفیس خوشبو میں اس کا استقبال کرے گا اور اس سے کہے گا کیا تم مجھ کو پہچانتے ہو؟ وہ کہے گا نہیں 'البتہ! تمہاری خوشبو بہت نفیس ہے اور تمہاری صورت بہت حسین ہے۔ وہ کہے گا 'تم بھی دنیا میں اسی طرح تھے 'میں تمہارا نیک عمل ہوں 'میں دنیا میں بہت عرصہ تم پر سوار رہا 'آج کے دن تم مجھ پر سواری کرو اور یہ آیت پڑھے گا جس دن ہم متقین کو رحمٰن کی طرف بطور وفد جمع کریں گے۔ (مریم: ۸۵) اور کافر کا عمل نہایت بری صورت اور بدبو کے ساتھ اس کا استقبال کرے گا 'اور اس سے کہے گا تو دنیا میں اسی طرح تھا 'میں تیرا برا عمل ہوں۔ تو دنیا میں بہت عرصہ مجھ پر سوار رہا 'آج میں تجھ پر سواری کروں گا۔ پھر وہ آیت پڑھے گا اور وہ اپنی پیٹھوں پر (اپنے گناہوں کا) بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ سنو وہ کیسا برا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ (الانعام: ۳۱) (جامع البیان 'جزء ۷ ص ۲۳۶ 'مطبوعہ دار الفکر 'بیروت ۱۴۱۵ھ و تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

روز قیامت گناہوں کا بوجھ اٹھا کر آنا کافروں کی پہچان ہو گی مومنوں کی نہیں

اگر کہا جائے کہ حدیث میں ہے مومن بھی اپنے گناہ کا بوجھ اپنے کاندھے پر اٹھا کر لائے گا۔ حضرت ابوہریرہ (رض) روایت کرتے ہیں کہ حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا "جو کسی کا اونٹ چرائے روز قیامت اس کے کندھوں پر اونٹ سوار ہو گا اور بلبلاتا پھرے گا اور بکری چوری کرنے والے کے کندھے پر بکری ممناتی ہو گی۔" (بخاری مسلم)

اور ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ (رض) سے مروی ہے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس نے کسی انسان کی ایک بالشت بھر زمین چھین لی روزے قیامت اور زمین کا ٹکڑا نیچے سات زمینوں (زمین کی سات تہوں) تک کاٹ کر اس کی گردن پر رکھ دیا جائے گا (بخاری کتاب المظالم باب 13۔ مسلم کتاب المساقاۃ حدیث نمبر 139) تو پھر صرف کفار کے لئے کیوں کہا گیا کہ وہ اپنے بوجھ اٹھائے ہوں گے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اپنے اوپر گناہ کا بوجھ اٹھانا روز قیامت صرف کفار ہیں کی علامت ہوگی کیونکہ کفار کے پاس صرف گناہ ہی ہوں گے ان کی کوئی نیکی مقبول نہیں اور نہ ہی دنیا بھی مصائب کے ذریعے اور نیکیوں کے سبب ان کے گناہ جھڑتے ہیں جبکہ مومن کے گناہ اس کی بعض نیکیوں اور دنیوی مصائب کے ذریعے جھڑتے رہتے ہیں اور اکثر مومنین روزے قیامت صرف نیکیاں لے کر اٹھیں گے ان کے گناہ مٹ چکے ہوں گے مگر ہر کافر اپنے کفر اور دوسرے گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوگا۔ اس لئے کفار کے بارے میں فرمایا گیا: **وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ** ۔ لہٰذا یہ کفار کی پہچان ہوگی مومنوں کی نہیں۔ (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

سب سے بڑی بد بختی

انسان کی بڑی شقاوت اور بد بختی یہ ہے کہ لقاء اللہ سے انکار کرے اور زندگی کے اس بلند ترین مقصد کو جھوٹ سمجھے۔ یہاں تک کہ جب موت یا قیامت سر پر آ کھڑی ہو تب بے فائدہ کف افسوس ملتارہ جائے کہ ہائے میں نے اپنی دنیاوی زندگی میں یا یوم قیامت کے لیے تیاری کرنے میں کیسی ناقابل تلافی کوتاہی کی اس وقت اس افسوس و حسرت سے کچھ نہ ہوگا۔ جرموں اور شرارتوں کے بار گراں کو جس سے اس کی پشت خمیدہ ہوگی، یہ ناوقت کا تاسف و تحسر ذرا بھی ہلکا نہ کر سکے گا۔

قبر میں برے عمل بری شکل میں آئیں گے

روایت ہے کہ جب کوئی گناہ گار قبر میں داخل ہوتا ہے تو اس کے پاس ایک نہ آیت بد شکل صورت سامنے آتی ہے۔ کالا رنگ، بدبودار، میلے کپڑے، اس کے ساتھ قبر میں سکونت پذیر ہو جاتا ہے۔ وہ اس کو دیکھ کر کہتا ہے کہ کیا ہی برا ہے تیرا چہرہ وہ تو وہ کہے گا کہ تیرے اعمال قبیحہ کا میں عکس ہوں، ایسے ہی تھے تیرے اعمال اور ایسے ہی بدبودار تھے تیرے تمام کام۔ وہ کہے گا تو ہے کون؟ تو کہے گا میں تیرا عمل ہوں۔ پھر وہ قیامت تک اس کے ساتھ قبر میں رہے گا۔ قیامت میں وہ اس سے کہے گا کہ لذات و شہوات کی شکل میں تجھ کو میں دنیا میں اٹھائے ہوئے تھا، آج کے روز تو مجھے اٹھائے گا۔ چنانچہ اس کے اعمال کا مجسمہ اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر اس کو دوزخ کی طرف لے جائے گا۔

معتزلہ کی محرومی:

طبرانی اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ واثلہ کی روایت سے ابراہیم صائغ کا قول نقل کیا ہے ابراہیم نے کہا دیدار الٰہی کے عوض اگر مجھے آدھی جنت مل جائے تو مجھے پسند نہیں پھر ابراہیم نے آیاتِ ذیل تلاوت کیں { **کلا انهم عن ربهم يومئذٍ لمحجوبون ثم انهم لصالوا الجحيم ثم يقال هذا الذی کنتم به تکذبون** } پھر فرمایا (ہذا سے اشارہ دیدار کی طرف ہے) بہ او بالرویہ۔

مال غنیمت میں چوری کا مال قیامت کے دن گردن پر ہو گا

حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (خطبہ دینے) کھڑے ہوئے اور مال غنیمت میں چوری کرنے کو بڑا جرم بتایا پھر (مویشی اور سونے چاندی کی زکوٰۃ نہ دینے والوں کو ڈرانے کے لئے) فرمایا خوب سن لو میں ایسی حالت میں (تم کو) نہ پاؤں کہ تم میں سے بعض لوگ بلبلاتے اونٹ کو اپنی گردن پر اٹھائے میرے سامنے آئیں اور کہیں یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دہائی ہے اور میں جواب دوں آج اللہ کے سامنے میرا کچھ قابو نہیں میں تجھے (دنیا میں) پیام پہنچا چکا۔ یہ ایک طویل حدیث ہے جس کے اندر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہنہناتے گھوڑے اور منمناتی بکری اور سونے چاندی کے گردن پر سوار ہونے کا بھی ذکر فرمایا تھا۔ متفق علیہ۔ ابو یعلی اور بزار نے بھی اسی طرح کی حدیث حضرت عمر بن خطاب (رض) کی روایت سے نقل کی ہے۔

ضرورت سے زائد مکان

طبرانی نے حضرت ابن مسعود (رض) کی روایت سے مرفوع حدیث بیان کی ہے کہ جس نے اپنی ضرورت سے زائد کوئی مکان بنایا (یعنی جائیداد بنائی) قیامت کے دن اس کو مجبور کیا جائے گا کہ اس مکان کو اپنے کندھے پر اٹھائے۔ ص

کسی کی زمین غصب کرنا

صحیحین میں حضرت عائشہ (رض) کی مرفوع روایت ہے جس نے بالشت بھر زمین بغیر حق کے لی قیامت کے دن اللہ اس کو سات زمینوں کا طوق پہنائے گا۔ اس مبحث کی احادیث طبرانی نے حضرت حکم بن حارث اور حضرت انس (رض) کی روایت سے بھی بیان کی ہیں اور طبرانی نیز امام احمد نے حضرت یعلی (رض) بن مرہ اور حضرت ابو مالک (رض) اشعری کی روایت سے اس باب کی احادیث نقل کی ہیں۔ تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی

فوائد

۱: قیامت سے پہلے علامات بہت ہوں گی۔ مگر خود قیامت کا آنا بے خبری میں اچانک ہوگا۔

۲: اس طرح کہ قیامت کا انکار کی اور اس کی تیاری نہ کی۔ غرضیکہ یہاں تقصیر سے عقیدے کی کوتاہی مراد ہے۔

۳: اس سے معلوم ہوا کہ کافر پر اس کے برے اعمال سوار ہوں گے اور مومن اپنے بعض نیک اعمال پر سوار ہوگا۔ قربانی سواری بنے گی۔ کافر کی نیکیاں ہلکی اور گناہ بھاری ہوں گے۔ مومن کی نیکی وزنی اور گناہ ہلکے ہوں گے۔ معدہ خراب ہو تو کھانا بوجھ ہو کر ہم پر سوار ہوتا ہے۔ معدہ اچھا ہو تو کھانا ہلکا ہو کر خود سواری بن جاتا ہے۔ لہٰذا عقلی طور پر بھی یہ درست ہے۔

۴: اس سے معلوم ہوا کہ قیامت میں اعمال جسمانی شکل میں ہوں گے۔ ان میں بوجھ بھی ہوگا۔ اس لیے ان کا وزن بھی کیا جائے گا۔ خیال رہے کہ گناہوں میں گردن پر تو بہت بوجھ ہوگا اور کافروں کی گردن اتنی لمبی کردی جائے گی جس پر سارے اعمال آ جاویں اور سارا مال وزر لاد دیا جاوے۔ مگر میزان میں مومن کے گناہ ہلکے اور کافر کے بھاری ہوں گے۔

آیت مبارکہ :

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○32

لغۃ القرآن: [وَمَا : اور نہیں][الْحَيٰوةُ : زندگی][الدُّنْيَآ : دنیا کی][اِلَّا لَعِبٌ: مگر کھیل][وَّلَهْوٌ: اور تماشا][وَلَلدَّارُ : اور البتہ گھر][الْاٰخِرَةُ : آخرت کا][خَيْرٌ : بہتر][لِّلَّذِيْنَ : ان لوگوں کیلئے][يَتَّقُوْنَ : جو ڈرتے ہیں][اَفَلَا : کیا پھر نہیں][تَعْقِلُوْنَ : تم عقل کرتے]

ترجمہ : اور دنیوی زندگی (کی عیش و عشرت) کھیل اور تماشے کے سوا کچھ نہیں، اور یقیناً آخرت کا گھر ہی ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، کیا تم (یہ حقیقت) نہیں سمجھتے

تشریح:

ارشاد فرمایا کہ دنیا کی زندگی صرف کھیل کود ہے جسے بقا نہیں، بہت جلد گزر جاتی ہے جبکہ نیکیاں اور طاعتیں اگرچہ مومنین سے دنیا ہی میں واقع ہوں لیکن وہ امور آخرت میں سے ہیں۔
مفتی احمد یار خاں نعیمی (رح) نے بڑی پیاری بات ارشاد فرمائی، چنانچہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "دنیا کی زندگی وہ ہے جو نفس کی خواہشات میں گزر جائے اور جو زندگی آخرت کے لیے توشہ جمع کرنے میں صرف ہو، وہ دنیا میں زندگی تو ہے مگر دنیا کی زندگی نہیں لہٰذا انبیاء و صالحین کی زندگی دنیا کی نہیں بلکہ دین کی ہے۔ غرضیکہ غافل اور عاقل کی زندگیوں میں بڑا فرق ہے۔ (2)

آخرت کو بھلا دینے والے دنیاداروں کی مثال

امام غزالی (رح) نے اس بات کو بڑے پیارے انداز میں سمجھایا ہے چنانچہ کیمیائے سعادت میں ارشاد فرماتے ہیں: دنیاداروں کا دنیوی کاروبار میں مشغول ہو کر آخرت کو بھلا دینے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی گروہ کشتی میں سوار ہوا اور وہ کشتی کسی جزیرے پر جا کر رُکی، لوگوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ضروری حاجات سے فارغ ہونے کے لیے جزیرے پر اتر گئے۔ ملاح نے اعلان کیا: یہاں زیادہ دیر نہیں رکیں گے لہٰذا وقت ضائع کئے بغیر صرف طہارت وغیرہ سے فارغ ہو کر جلدی واپس پلٹیں۔ جزیرے میں اترنے کے بعد لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے:

(1)-- کچھ لوگ جزیرے میں سیر و سیاحت اور اس کے عجائبات دیکھنے میں ایسے مشغول ہوئے کہ انھیں کشتی میں واپس آنا یاد نہ رہا حتّٰی کے وہیں بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے اور درندوں کی غذا بنے۔

(2)-- عقلمند لوگ اپنی حاجات سے جلدی فارغ ہو کر کشتی میں اپنی من پسند جگہ پر آ کر بیٹھ گئے۔

(3)-- کچھ لوگ جزیرے کے انوار اور عجیب و غریب قسم کے پھولوں، غنچوں، شگوفوں، وہاں کے پرندوں کے اچھے نغمات سنتے اور وہاں کے قیمتی پتھروں کو دیکھتے رہ گئے اور ان میں سے بعض ایسے بھی تھے کہ جنہوں نے صرف دیکھنے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ وہاں سے بہت سی چیزیں اپنے ساتھ اٹھالائے۔ اب کشتی میں مزید جگہ تنگ ہوئی تو اپنے ساتھ لانے والی اشیاء کو کشتی میں رکھنے کی جگہ نہ پا سکے تو مجبوراً انھیں سروں پر اٹھانا پڑا۔ ابھی دو دن ہی گزرے تھے کہ ان اشیاء کی رنگت میں تبدیلی شروع ہو گئی اور خوشبو کی بجائے اب بدبو آنے لگی، اب انھیں کہیں پھینکنے کی جگہ بھی نہ تھی نادم و پشیمان اسی طرح اپنے سروں پر اٹھانے پر مجبور تھے۔

پہلے گروہ کی مثال کفار و مشرکین اور بد عقیدہ لوگوں کی ہے جنہوں نے اپنے آپ کو کلی طور پر دنیا کے سپرد کر دیا اور اسی کے ہو کر رہ گئے، اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کو فراموش کر دیا، انھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں محبوب رکھا۔

دوسرا گروہ ان عقلمندوں کا تھا جسے مومنین سے تعبیر کیا گیا، وہ طہارت سے فارغ ہوتے ہی کشتی میں سوار ہوئے اور عمدہ سیٹوں کو پا لیا (یعنی جنت کے مستحق ہوئے۔)

تیسرے گروہ کی مثال خطاکاروں کی ہے کہ انھوں نے ایمان کو تو محفوظ رکھا مگر دنیا میں ملوث ہونے سے بچ نہ سکے۔

(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

اس آیت میں دنیا کی زندگی سے مراد کافر کی زندگی ہے کیونکہ کافر اس فانی زندگی کو ہی سب کچھ سمجھتا ہے اور وہ آخرت اور اعمال کی جواب دہی پر ایمان نہیں رکھتا اس لیے اس کی زندگی کی لہو و لعب اور نفسانی خواہشات کے گرد گھومتی ہے۔ اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: "یہ کافر کی زندگی ہے کیونکہ کافر اپنی زندگی غرور اور باطل میں ضائع کر دیتا ہے لیکن مومن کی زندگی اعمال صالحہ سے لبریز ہوتی ہے اس لیے وہ لہو و لعب نہیں ہے۔"

(تفسیر قرطبیؒ)

قرآن وحدیث میں جہاں بھی اس دنیا کی زندگی اور اس کے مال ومتاع کی مذمت کی گئی ہے وہ ان لوگوں کی زندگی ہے جو اس دنیا کو نفسانی خواہشات کے لیے استعمال کرتے ہیں اور بالآخر نار جہنم کے سزاوار قرار پاتے ہیں، لیکن جن لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے وہ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے استعمال کرتے ہیں اور بالآخر جنت کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ ان کے لیے یہ دنیا نعمت ہے اور اسی لیے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) درج ذیل دعا کو کثرت سے پڑھا کرتے تھے: "اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں اچھائی عطا فرما اور آخرت میں بھی اچھائی عطا فرما اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔" (قرآن: 2:201)

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں سب کچھ برا نہیں ہے۔ اگر ہم حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس دنیا کو خدا کے حکم کے مطابق استعمال کریں تو اس دنیا سے اچھائی بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

لہو کہتے ہیں میل عن الجد الی الھزل کو (یعنی حقیقت کو چھوڑ کر مذاق کی طرف مائل ہونا۔) اور لہو ولعب کی تعریف میں تفصیل سے اس جگہ نقل کی ہے جو ہماری نقل کردہ تعریف کی موید ہے۔ اور ایک حدیث میں قتادہ (رح) وغیرہ سے ہے کہ اخنس بن شریق اور ابوجہل کی ملاقات ہوئی اخنس نے ابوجہل سے کہا اے ابوالحکم مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق بتاؤ کہ وہ سچا ہے یا جھوٹا۔ میرے علاوہ یہاں دوسرا کوئی آدمی نہیں جو تمہاری بات سن لے تو ابوجہل نے کہا اللہ کی قسم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سچا ہے اور اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ لیکن جب قصی کی اولاد کے پاس جھنڈا۔ اور حاجیوں کو پانی پلانے کا عہدہ۔ اور غلاف کعبہ اور دار الندوہ (اسمبلی ہال) کی سرداری پہلے ہی سے ہے اور اب نبوت بھی ہم انھیں کی مان لیں تو دوسرے قریش کے لیے کیا چیز باقی رہ گئی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ دوسری حدیث میں ہے جسے واحدی نے مقاتل رحمھم اللہ سے نقل کیا کہ حارث بن عامر بن نوفل بن عبد مناف بن قصی بن کلاب مجالس میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تکذیب کیا کرتا لیکن جب اپنے گھر والوں میں ہوتا تو کہتا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جھوٹا نہیں ہے میں اسے سچا سمجھتا ہوں اس پر یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ حیات دنیا کے لیے جو عمل ہوں وہ لہو ولعب ہیں اس لیے کہ ان کے عقب میں منفعت نہیں۔ اعمال آخرت میں منافع عظیمہ وللدار الاخرۃ اور بیشک دار آخرت بھلا ہے ان کے لیے جو ڈرتے ہیں۔ خیر للذین یتقون۔ اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ ماسوائے اعمال متیقن سب لعب و لہو ہے۔ افلا تعقلون۔ تو کیا تمہیں عقل نہیں۔ تعقلون ت سے قرأت حفص میں ہے۔

(تفسیر الحسنات۔ علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)

عرفاء کہتے ہیں کہ دنیا صفر ہے جس کی کوئی قیمت نہیں اور آخرت عادت ہے جس کی قیمت ہے اگر صفر کے ساتھ عدد لگ جائے تو صفر کی بھی قیمت بن جاتی ہے بلکہ جتنا بڑا عدد لگے اتنی بڑی قیمت بن جاتی ہے۔ یہی حال دنیا کا ہے اس کی کوئی قیمت نہیں لیکن اگر اس کے ساتھ آخرت لگ جائے گا نئی دنیا میں رہ کر آخرت کے لیے کوشش کی جائے تو دنیا بھی قیمت بن جاتی ہے بلکہ آخرت کے لئے جتنی زیادہ کوشش کی جائے دنیا اتنی ہی زیادہ قیمتی ہے اور اگر دنیا میں آخرت شامل نہ ہو تو دنیا صفر ہے بلکہ نری سقر ہے۔ اسی لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: الدنیا ومافیہا ملعونہ الا ماکان للہ یعنی "دنیا اور جو کچھ اس میں ہے سب ملعون ہے، سوا اس کے جو اللہ کے لیے ہو"

(ترمذی کتاب الزہد، برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

دراصل اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو زمین پر نازل کرنے کے وقت یہ حقیقت آشکار کردی تھی کہ اے آدم! تم زمین پر اتر جاؤ لیکن یاد رکھنا زمین تیرے اور تیری اولاد کے لیے عارضی قیام گاہ ہے۔ وہاں تمہارا ایک مقررہ مدت تک ہی ٹھہرنا ہوگا۔ یہاں دنیا کی حقیقت بتلائی گئی

ہے یہ دنیا کھیل تماشا کے سوا کچھ نہیں جس طرح کھیل اور تفریح زندگی کا مستقل حصہ نہیں کھیل مصروف کار رہنے کے بعد آدمی کے لیے دل بہلاوا اور عارضی راحت کا سبب ہوتا ہے۔ کافر کے لیے دنیا فقط اسی چیز کا نام ہے کہ وہ اس کے لہو و لعب میں مصروف ہو کر رہ جائے اس کے مقابلہ میں مومن دنیا کی نعمتوں سے مستفید ہوتے ہوئے کھلاڑی کے وقفہ آرام کی طرح آخرت کی تیاری کے لیے تازہ دم ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا ایمان ہے دنیا عارضی اور آخرت دائمی ہے یہاں کی ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے، آخرت کی زندگی اور نعمتوں کو دوام حاصل ہے۔ اس سوچ کے پیش نظر وہ اللہ تعالیٰ سے ڈر کر زندگی بسر کرتا ہے اور یہی انسان کے عقل مند ہونے کی دلیل ہے۔ سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا۔

(عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ اضْطَجَعَ النَّبِیُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عَلٰی حَصِیرٍ فَأَثَّرَ فِی جِلْدِہِ فَقُلْتُ بِأَبِی وَأُمِّی یَا رَسُول اللّٰہِ لَوْ کُنْتَ اٰذَنْتَنَا فَفَرَشْنَا لَکَ عَلَیْہِ شَیْءًا یَقِیکَ مِنْہُ فَقَالَ رَسُول اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَا أَنَا وَالدُّنْیَا إِنَّمَا أَنَا وَالدُّنْیَا کَرَاکِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَۃٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَہَا) [رواہ ابن ماجۃ: کتاب الزہد، باب مثل الدنیا]

"حضرت عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) چٹائی پر لیٹے۔ اس کے نشان آپ کے جسم اطہر پر پڑ گئے میں نے آپ کو دیکھ کر عرض کی میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ حکم دیتے تو ہم آپ کے لیے بستر بچھا دیتے جس سے آپ کا جسم اطہر تکلیف سے بچ جاتا۔ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میری اور دنیا کی مثال اس طرح ہے جیسے کوئی سوار سایہ دار شجر کے نیچے استراحت کے لیے رکے اور پھر اس کو چھوڑ دے۔"

(عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ (رض) قَالَ أَخَذَ رَسُول اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بِمَنْکِبِی فَقَالَ کُنْ فِی الدُّنْیَا کَأَنَّکَ غَرِیبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِیلٍ) [رواہ البخاری: کتاب الرقاق]

"حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے میرے کندھے سے پکڑتے ہوئے فرمایا دنیا میں اس طرح رہو جیسے اجنبی یا مسافر رہتے ہیں۔"

عقل مند کون؟

(عَنْ أَبِی یَعْلٰی شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ (رض) قَالَ قَالَ رَسُول اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَہُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْعَاجِزُ مَنْ أَتْبَعَ نَفْسَہُ ہَوَاہَا ثُمَّ تَمَنّٰی عَلَی اللّٰہِ) [رواہ ابن ماجۃ: کتاب الزہد، باب ذکر الموت والاستعداد لہ]

"حضرت ابو یعلی شداد بن اوس (رض) بیان کرتے ہیں رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا عقلمند وہ ہے جو اپنے آپ کو پہچانتا ہے اور مرنے کے بعد فائدہ دینے والے اعمال سرانجام دیتا ہے اور نادان وہ ہے جس نے اپنے آپ کو اپنے نفس کے پیچھے لگایا اس کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ سے تمنا کرے۔" (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

دنیا کی زندگی کو لہو و لعب قرار دینے کی حسب ذیل وجوہات ہیں

(۱) لہو و لعب کی مدت کم ہوتی ہے اور بہت جلد ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دنیا کی زندگی بھی کم ہوتی ہے اور جلد ختم ہو جاتی ہے۔

(۲) لہو ولعب عموماً کسی فریب پر مبنی ہوتا ہے ' اسی طرح انسان دنیا کی زندگی کو بھی کسی فریب کے سہارے گزارتا ہے۔
(۳) عموماً بچے اور نادان اور غافل لوگ لہو ولعب میں اشتغال کرتے ہیں اور سنجیدہ اور تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیلیدہ لوگ لہو ولعب میں زیادہ مشغول نہیں ہوتے۔ اسی طرح دنیا کی لذتوں اور دلفریبیوں میں بھی جاہل اور غافل لوگ مشغول رہتے ہیں اور جو عقل منداور زیرک لوگ ہوتے ہیں ' وہ جانتے ہیں کہ یہ دنیا اور اس کی لذتیں فانی ہیں۔ لہٰذا وہ فانی کی بہ نسبت باقی رہنے والی نعمتوں کے حصول کی جدوجہد میں مشغول رہتے ہیں۔

دنیا کے بے وقعت ہونے کے متعلق احادیث

حافظ ابوبکر عبداللہ بن محمد بن عبید بن سفیان بن ابی الدنیا متوف ۲۸۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں :
حضرت مستورد بن شداد (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ سواروں کی ایک جماعت میں جارہا تھا ' اچانک آپ ایک جگہ سے گزرے جہاں بکری کا (مردہ) بچہ پڑا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے کہ جب اس کے مالکوں نے اس کو پھینکا ہوگا تو یہ ان کے نزدیک بے وقعت ہوگا۔ صحابہ نے کہا اس کے بے وقعت ہونے کی وجہ سے ہی انھوں نے اس کو پھینک دیا ہے۔ آپ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے۔ جس قدر یہ بکری کا مردہ بچہ اپنے مالکوں کے نزدیک بے وقعت ہے ' اللہ عزوجل کے نزدیک دنیا اس سے بھی زیادہ بے وقعت ہے۔ (موسوعہ رسائل ابن ابی الدنیا ' ج ۲ ' ذم ' رقم الحدیث : ۲ ' سنن ترمذی ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ۲۳۲۸ ' سنن دارمی ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۲۷۳۷ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۴۱۱۱ ' مسند احمد ' ج ۶ ' رقم الحدیث : ۱۸۰۳۵ ' دارالفکر ' طبع جدید ' مسند احمد ' ج ۲ ' ص ۳۸۸ ' ج ۴ ' ص ۲۲۹ ' ۲۳۰ ' ۲۲۶ ' دارالفکر ' طبع قدیم)
حضرت سلمان فارسی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دنیا مومن کا قید خانہ ہے اور کافر کی جنت ہے۔ (ذم الدنیا ' رقم الحدیث : ۴ ' صحیح مسلم ' الزھدا (۲۹۵٦) ۷۲۸۳ ' سنن ترمذی ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ۲۳۳۱ ' صحیح ابن حبان ' رقم الحدیث : ٦۸۷ ' سنن ابن ماجہ ج ۲ ' رقم الحدیث : ۴۱۱۳ ' مسند احمد ' ج ۲ ' ص ۱۹۷ ' ۳۲۳ ' ۳۸۹ ' ۴۸۵ ' طبع قدیم ' کتاب الزھد لاحمد ' ص ۳۷)
محمد بن منکدر اپنے والد (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دنیا ملعونہ ہے ' اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی ملعون ہے ماسوا اس کے جو اللہ کے لیے ہو۔ امام ترمذی اور امام ابن ماجہ کی روایت میں ہے ' ماسوا اللہ کے ذکر کے اور ذکر کرنے والوں کے اور ماسوا عالم یا متعلّم کے۔ (ذم الدنیا ' رقم الحدیث : ۷ ' سنن ترمذی ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ۲۳۲۹ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۴۱۱۲ ' حلیۃ الاولیاء ' ج ۳ ' ص ۱۵۷)
حضرت ابوموسیٰ اشعری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص اپنی دنیا سے محبت کرے گا وہ اپنی آخرت کو نقصان پہنچائے گا اور جو شخص اپنی آخرت سے محبت کرے گا ' وہ اپنی دنیا کو نقصان پہنچائے گا۔ سو تم باقی رہنے والی چیز کو فانی ہونے والی چیز پر ترجیح دو۔ (ذم الدنیا ' رقم الحدیث : ۸ ' مسند احمد ج ۴ ' ص ۴۱۲ ' طبع قدیم ' المستدرک ' ج ۴ ' ص ۳۰۸)

حسن بصری بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دنیا کی محبت ہر گناہ کی اصل ہے۔ (ذم الدنیا ' ۹ کتاب الزھد لاحمد)

مالک بن دینار بیان کرتے ہیں کہ لوگوں نے حضرت علی بن ابی طالب (رض) سے کہا اے ابوالحسن! ہمارے لیے دنیا کی حقیقت بیان کریں۔ آپ نے فرمایا دنیا کی جو چیزیں حلال ہوں گی ان کا حساب لیا جائے گا اور جو چیزیں حرام ہوں گی ان پر دوزخ کا عذاب ہوگا۔ (ذم الدنیا ' ۱۷ ' مطبوعہ موسستہ الکتب الثقافیہ ' بیروت ' ۱۴۱۳ھ)

حضرت عمرو بن عوف (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بخدا مجھے تم پر فقر کا خوف نہیں ہے ' لیکن مجھے تم پر یہ خوف ہے کہ تم پر دنیا اس طرح کشادہ کردی جائے گی جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر کشادہ کردی گئی تھی ' سو تم دنیا میں اس طرح رغبت کروگے جس طرح انھوں نے رغبت کی اور تم اسی طرح ہلاک ہو جاؤگے جس طرح وہ ہلاک ہوگئے تھے۔ (صحیح البخاری ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ۳۱۵۸ ' صحیح مسلم ' الزھد ' ٦ (۲۹٦۱) ۷۲۹۱ ' سنن ترمذی ج ۴ ' رقم الحدیث : ۲۴۷۰ ' سنن ابن ماجہ ج ۲ ' رقم الحدیث : ' ۳۹۹۷ ' مسند احمد ' ج ۴ ' ص ۱۳۷)

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے ' جس کے نشان آپ کی جلد پر نقش ہوگئے تھے۔ میں نے عرض کیا ' یارسول اللہ ! آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں ' اگر آپ ہم کو اجازت دیں تو ہم چٹائی کے اوپر کوئی چیز بچھا دیں جس سے آپ کی جلد محفوظ رہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مجھے دنیا سے کیا مطلب ہے ؟ میری اور دنیا کی مثال یہ ہے جیسے کوئی سوار کسی درخت کے سائے میں بیٹھے ' پھر سائے کو ترک کرکے سفر شروع کردے۔ (سنن ترمذی ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ۲۳۸۴ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۴۱۰۹ ' مسند احمد ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۳۷۰۹)

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ سے اس طرح حیا کرو جس طرح حیا کرنے کا حق ہے۔ ہم نے کہا یارسول اللہ ! الحمد للہ ہم حیا کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ بات نہیں ہے لیکن اللہ سے حیاء کرنے کا حق یہ ہے کہ تم سر اور اس کے نچلے حصہ کی حفاظت کرو اور پیٹ اور اس کے نچلے حصہ کی حفاظت کرو اور موت اور جسم کے بوسیدہ ہونے کو یاد رکھو اور جو شخص آخرت کا ارادہ کرتا ہے ' وہ دنیا کی زینت کو ترک کردیتا ہے اور جس نے ایسا کیا اس نے اللہ سے اس طرح حیاء کی جو حیاء کرنے کا حق ہے۔ (سنن ترمذی ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ۲۴٦٦ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۴۲۵۹)

حضرت زید بن ثابت (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص کا مقصود دنیا ہو ' اللہ اس کے حالات دگرگوں کردیتا ہے اور اس کی آنکھوں کے سامنے فقر کردیتا ہے اور دنیا سے اس کو وہی چیز ملتی ہے جو اس کے لیے مقدر ہوتی ہے اور جس شخص کی نیت آخرت ہوتی ہے ' اللہ تعالیٰ اس کے حالات مجتمع کردیتا ہے اور اس کا دل مستغنی کردیتا ہے اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے۔ (سنن ابن ماجہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۴۱۰۵ ' اس حدیث کی سند صحیح ہے اور اس کے روای ثقہ ہیں)

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ تمہارے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے تمام تفکرات کو صرف آخرت کا حصہ بنادیا ' اللہ اس کو دنیا کے افکار سے کافی ہوگا اور جس شخص کے تمام افکار دنیا کے حالات کے متعلق ہوں ' اللہ کو اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ وہ کس وادی میں ہلاک ہوتا ہے۔ (سنن ابن ماجہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۴۱۰٦)

حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دنیا میں اس طرح رہو جیسے مسافر ہو یا راستہ پار کرنے والے ہو اور اپنے آپ کو اہل قبور میں سے شمار کرو۔ (سنن ترمذی ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ' ۲۳۴۰ ' صحیح البخاری ' رقم الحدیث : ' ۶۴۱۶ ' سنن ابن ماجہ ' رقم الحدیث : ' ۴۱۱۴ ' صحیح ابن حبان ' رقم الحدیث : ' ۶۹۸ ' سنن کبری للبیہقی ' ج ۳ ' ص ۳۶۹)

حضرت سہل بن سعد (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اگر اللہ کے نزدیک دنیا کی وقعت مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو اللہ کافر کو اس سے ایک گھونٹ بھی نہ پلاتا۔ (سنن ترمذی ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ' ۲۳۲۷ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ' ۴۱۱۰ ' حلیۃ الاولیاء ' ج ۳ ' س ۳۰۴ ' ج ۸ ' ص ۲۹۰)

حضرت سہل بن سعد الساعدی (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے جس کو میں کروں تو اللہ بھی مجھ سے محبت کرے اور لوگ بھی مجھ سے محبت کریں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم دنیا میں بے رغبتی کرو ' اللہ تم سے محبت کرے گا اور لوگوں کے پاس جو چیزیں ہیں ' ان سے بے رغبتی کرو ' تو لوگ تم سے محبت کریں گے۔ (سنن ابن ماجہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۴۱۰۲ ' مطبوعہ دار الفکر ' بیروت ' ۱۴۱۵ ھ)

حضرت علی (رض) نے فرمایا دنیا جانے والی ہے اور آخرت آنے والی ہے اور ان میں سے ہر ایک کے فرزند ہیں۔ سو تم آخرت کے فرزند بنو ' دنیا کے فرزند نہ بنو۔ آج عمل ہے اور حساب نہیں ہے اور کل حساب ہوگا اور عمل نہیں ہوگا۔ (صحیح البخاری ' کتاب الرقاق ' باب فی الامل وطولہ)

حضرت ابو سعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ہم کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عصر کی نماز پڑھائی ' پھر آپ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور قیامت تک واقع ہونے والی کسی چیز کو نہیں چھوڑا ' مگر اس کی ہم کو خبر دی ' اس کو یاد رکھا جس نے یاد رکھا اور اس کو بھلا دیا جس نے بھلا دیا اور آپ کے ارشادات میں یہ بھی تھا کہ دنیا سر سبز اور میٹھی ہے اور اللہ تم کو دنیا میں خلیفہ بنانے والا ہے ' پھر وہ دیکھنے والا ہے کہ تم کیا کرتے ہو ! سنو تم دنیا سے پرہیز کرو اور عورتوں سے پیز کرو (مسلم کی روایت میں ہے) کیونکہ بنو اسرائیل کا پہلا فتنہ عورتوں میں برپا ہوا تھا ' اور آپ کے ارشادات میں یہ بھی تھا کہ جس شخص کو حق کو علم ہو جائے تو لوگوں کا دباؤ اس کو حق بیان کرنے سے باز نہ رکھے۔ حضرت ابو سعید رونے لگے اور کہا ہم نے کئی چیزوں کو دیکھا اور ہم دباؤ میں آگئے۔ (الحدیث) (سنن ترمذی ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ' ۲۱۹۸ ' صحیح مسلم ' الذکر والدعاء ۹۹ ' (۲۷۴۲) ۶۸۱۴ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ' ۴۰۰۰ ' صحیح ابن حبان ' ج ۸ ' رقم الحدیث : ' ۳۲۲۱ ' مسند احمد ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ' ۱۱۱۶۹)

حضرت قتادہ بن النعمان بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب اللہ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو اس کو دنیا سے بچاتا ہے جیسے تم میں سے کوئی شخص استسقاء کے مریض کو پانی سے بچاتا ہے۔ (سنن ترمذی ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ' ۲۰۴۴ ' سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : ' ۳۸۵۶ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ' ۳۴۴۲)

دنیا کے مال کو انسان اگر عیش و عشرت اور ناجائز خواہشات کو پورا کرنے میں صرف کرے تو پھر دنیا اور دنیا کا مال مذموم ہے اور ان احادیث کا یہی محمل ہے اور اگر دنیا کے مال و دولت کو دین کی سربلندی ' تبلیغ دین ' اسلام کی نشر و اشاعت اور ضرورت مندوں کی مدد پر صرف کرے اور

حج اور عمرہ کرے ' قربانی ' زکوۃ اور صدقات ادا کرے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرے اور نیکی اور خیر کے راستوں میں مال کو خرچ کرے ' تو پھر دنیا کا مال و دولت بہت مبارک اور مستحسن ہے۔

نیکی کی راہ میں صرف کرنے کی نیت سے مال دنیا کا استحسان

امام مسلم بن حجاج قشیری ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا صرف دو شخصوں پر حسد (رشک) کرنا مستحسن ہے۔ ایک وہ شخص جس کو اللہ نے قرآن دیا ہو اور وہ دن رات قرآن کے ساتھ قیام کرتا ہو اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ نے مال دیا ہو اور وہ دن رات اس مال کو (نیکی میں) خرچ کرتا ہو۔ (صحیح مسلم ' مسافرین ' ۲۶۶ ' (۸۱۵) ۱۸۶۳ ' صحیح البخاری ' ج ۸ ' رقم الحدیث : ' ۷۵۲۹ ' سنن ترمذی ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ' ۱۹۴۳ ' سنن کبری للنسائی ' ج ۵ ' رقم الحدیث : ' ۸۰۷۲ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ' ۴۲۰۹ ' مسند احمد ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ' ۶۴۱۲ ' دارالفکر ' طبع جدید ' مسند احمد ' ج ۱ ' ص ۳۸۵ ' دارالفکر ' طبع قدیم)

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ صرف دو شخصوں پر حسد (رشک) کرنا مستحسن ہے۔ ایک وہ شخص جس کو اللہ نے مال دیا ہو اور وہ اس کو حق کے راستوں پر خرچ کرتا ہو اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ نے حکمت (علم دین) عطا کی ہو ' اور وہ اس کے مطابق فیصلے کرتا ہو، اور تعلیم دیتا ہو۔ (صحیح مسلم ' مسافرین ' ۲۶۸ ' (۸۱۷) ۱۸۶۶ ' صحیح البخاری ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ' ۷۳ ' سنن کبری للنسائی ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ' ۵۸۴۰ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ' ۴۲۰۸ ' مسند احمد ' ج ۱ ' ص ۴۳۲ ' ج ۲ ' ص ۱۳۳ ' ۸۸ ' ۳۶ ' ۹ ' ج ۴ ' ص ۱۰۵ ' طبع قدیم)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ فقراء مہاجرین نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اصحاب ثروت اور دولت مند لوگ بلند درجات اور دائمی نعمتوں کو لے گئے۔ آپ نے فرمایا وہ کس وجہ سے ؟ انھوں نے کہا وہ نماز پڑھتے ہیں جس طرح ہم نماز پڑھتے ہیں ' اور روزے رکھتے ہیں جس طرح ہم روزے رکھتے ہیں ' اور وہ صدقہ و خیرات کرتے ہیں اور ہم صدقہ نہیں کر سکتے۔ اور وہ غلام آزاد کرتے ہیں اور ہم غلام آزاد ہیں کر سکتے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کیا میں تم کو ایسی چیز کی تعلیم نہ دوں جس کی وجہ سے تم ان کے درجات کو پالو ' جنہوں نے تم پر سبقت کی ہے اور اس کی وجہ سے تم اپنے بعد والوں پر بھی سبقت کرو گے اور تم سے کوئی شخص افضل نہیں ہوگا ' ماسوا اس کے جو تمہاری طرح اس کام کو کرے۔ انھوں نے کہا کیوں نہیں ' یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ نے فرمایا تم ہر چیز نماز کے بعد تینتیس تینتیس مرتبہ سبحان اللہ ' اللہ اکبر اور الحمد للہ " پڑھو۔ فقراء مہاجرین پھر دوبارہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ' ہمارے مال دار بھائیوں کو بھی ان تسبیحات کا پتا چل گیا ؟ اور وہ بھی ہماری طرح یہ تسبیحات پڑھنے لگے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہ اللہ کا فضل ہے وہ جس کو چاہے عطا فرمائے۔ (صحیح مسلم ' مسافرین ' ۱۴۲ ' (۵۹۵) ۱۳۲۲)

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مال و دولت کو اللہ کا فضل قرار دیا اور اس کی تائید اس آیت کریمہ میں بھی ہے:

(آیت) "فاذا قضیت الصلوۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ"۔ (الجمعہ: ١٠)

ترجمہ: پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ حضرت طلحہ (رض) مدینہ کے انصار میں سب سے زیادہ مالدار تھے۔ اور ان کا سب سے زیادہ پسندیدہ مال مسجد کے بالمقابل بیر حا تھا (یہ مسجد کے سامنے بنو جدیلہ کا محلّہ تھا) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہاں تشریف لے جاتے تھے اور وہاں خوش ذائقہ پانی پیتے تھے۔ حضرت انس (رض) کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تم ہرگز نیکی حاصل نہیں کر سکتے ' جب تک کہ اپنی پسندیدہ چیز کو خرچ نہ کرو۔ (آل عمران: ٩٢) تو حضرت ابو طلحہ (رض) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم ہرگز نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ اپنی پسندیدہ چیز خرچ نہ کرو ' اور میرے نزدیک میرا سب سے زیادہ پسندیدہ مال بیر حا ہے اور یہ اللہ کی راہ میں صدقہ ہے۔ میں اللہ کے پاس اس کی نیکی اور ذخیرہ کی امید رکھتا ہوں۔ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ اس کو جہاں چاہیں صرف کریں۔ آپ نے فرمایا چھوڑو یہ مال نفع آور ہے ' یہ مال نفع آور ہے۔ تم نے اس کے متعلق جو کہا وہ میں نے سن لیا ' اور میری رائے یہ ہے کہ تم یہ مال اپنے رشتہ داروں کو دے دو۔ پھر حضرت ابو طلحہ نے بیر حا کو اپنے رشتہ داروں اور عم زاد میں تقسیم کر دیا۔ (صحیح مسلم ' زکوۃ ٤٢ ' (٩٩٨) ٢٢٧٨ ' صحیح البخاری ' ج ٢ ' رقم الحدیث: ' ١٤٦١ ' سنن کبری للنسائی ' ج ٦ ' رقم الحدیث: ' ١١٠٦٦)

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ حضرت ام سلیم نے عرض کیا ' یارسول اللہ! انس آپ کا خادم ہے۔ آپ اس کے حق میں اللہ سے دعا کیجئے ' آپ نے دعا کی۔ اے اللہ! اس کے مال اور اولاد کو زیادہ کر اور اس کو جو کچھ عطا فرمائے ' اس میں برکت دے۔ (صحیح مسلم ' فضائل صحابہ ' ١٤١ ' (٢٤٨٠) ٦٢٥٥ ' صحیح البخاری ' ج ٧ ' رقم الحدیث: ' ٦٣٣٨ ' سنن ترمذی ' ج ٥ ' رقم الحدیث: ' ٣٨٥٣)

حضرت عمر بن خطاب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھے عطا فرما رہے تھے ' میں نے عرض کیا مجھ سے زیادہ ضرورت مند کو دیجئے۔ آپ نے فرمایا اس کو لے لو ' جب تمہارے پاس مال آئے درآنحالیکہ تم اس پر حریص ہو ' نہ اس کا سوال کر رہے ہو تو اس مال کو لے لو اور جو مال اس طرح نہ ہو اس کے درپے نہ ہو۔ (صحیح مسلم ' زکوۃ ' ١١٠ ' (١٠٤٥) ٢٣٦٧ ' صحیح البخاری ' ج ٢ ' رقم الحدیث: ' ١٤٧٣ ' سنن النسائی ' ج ٥ ' رقم الحدیث: ' ٢٦٠٨)

حضرت حکیم بن حزام (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا۔ آپ نے مجھے عطا فرمایا میں نے پھر سوال کیا ' آپ نے مجھے عطا فرمایا ' میں نے پھر سوال کیا آپ نے مجھے پھر عطا فرمایا پھر آپ نے فرمایا یہ مال سرسبز اور میٹھا ہے۔ جو شخص اس مال کو استغناء نفس سے لے گا ' اس کو اس مال میں برکت دی جائے گی اور جو شخص حریص ہو کر اس مال کو لے گا ' اس کو برکت نہیں دی جائے گی اور وہ اس شخص کی طرح ہو گا جو کھاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا اور اوپر والا ہاتھ نچلے سے بہتر ہے۔ (صحیح مسلم ' الزکوۃ ' ٩٦ ' (١٠٣٥) ٢٣٤٩ ' صحیح البخاری ' ج ٢ ' رقم الحدیث: ' ١٤٧٢ ' سنن ترمذی ' ج ٤ ' رقم الحدیث: ' ٢٤٧١ ' سنن النسائی ' ج ٥ ' رقم الحدیث: ' ٢٥٣١ '

سنن کبری للنسائی ' رقم الحدیث : ۲۳۱۰ ' مسند احمد ' ج ۵ ' رقم الحدیث : ۱۵۱۲۷ ' صحیح ابن حبان ' ج ۸ ' رقم الحدیث : ۳۲۲۰ ' المعجم الکبیر ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ۳۰۸۰ ' مصنف عبدالرزاق ' رقم الحدیث : ۲۰۰۴۱ ' سنن کبری للبیہقی ج ۴ ' ص ۱۹۶)

دنیا کی محبت مطلقاً مذموم نہیں ہے

ان احادیث سے واضح ہو گیا کہ مطلّقاً مال دنیا مذموم نہیں ہے۔ البتہ اگر مال دنیا کو ناجائز خواہشات کے پورا کرنے میں خرچ کیا جائے تو یہ لائق ملامت اور مستوجب عذاب ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ دنیا اور دنیا کی چیزوں سے محبت کرنا اور اس نے دل لگانا بھی مطلّقاً ممنوع نہیں ہے۔

امام ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دنیا کی چیزوں سے عورتوں اور خوشبو کی محبت میرے دل میں ڈالی گئی ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ (سنن النسائی ' ج ۷ ' رقم الحدیث : ۳۹۴۹ ' مسند احمد ' ج ۳ ' ص ۲۸۵ ' ۱۹۹ ' ۱۲۸ ' طبع قدیم)

بلکہ ممنوع اور مذموم یہ ہے کہ انسان دنیا کے حصول کو ہی مقصد حیات سمجھ لے ' جبکہ مقصود آخرت ہے اور دنیا اس کے حصول کا وسیلہ اور اس تک پہنچنے کا زینہ ہے یا بندہ دنیا کی رنگینیوں اور دل فریبیوں میں ڈوب کر اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی عبادت سے غافل ہو جائے۔ انسان اپنے لیے ' اپنے ماں باپ اور اپنے اہل و عیال کے لیے رزق حلال کی جستجو کرتا ہے اور اپنے رشتہ داروں اور دیگر انسانوں کے ساتھ جو الفت اور محبت کے ساتھ پیش آتا ہے اور ملک و قوم کی فلاح کے لیے اور انسانیت کی خدمت کے لیے جو دنیا میں تگ و دو کرتا ہے ' اور کارنامے انجام دیتا ہے ان تمام کاموں میں حسن نیت کی بناء پر اسے اللہ اور اس کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بشارتوں کے مطابق اجر و ثواب ملے گا اور یہ تمام کام اطاعات اور عبادات میں شامل ہیں اور جس وجہ سے دنیا کی مذمت کی گئی ہے ' یہ کام اس میں داخل نہیں ہیں۔

لہو ولعب کے معنی کی تحقیق

اس آیت میں فرمایا ہے اور دنیا کی زندگی تو صرف لہو ولعب ہے۔ اس لیے ہم لہو ولعب کی تشریح کرنا چاہتے ہیں۔

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں :

جس چیز میں مشغولت کی وجہ سے انسان اپنے مقصود سے غافل ہو جائے ' اس کو لہو کہتے ہیں۔ دنیا کی زیب وزینت مثلا عورتوں اور بچوں کو بھی لہو ولعب کہا جاتا ہے کیونکہ ان میں مشغولیت کی وجہ سے انسان اپنے مقصود سے غافل ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید میں ہے :

(آیت) " الھکم التکاثر، حتی زرتم المقابر "۔ (التکاثر : ۲۔۱)

ترجمہ : مال جمع کرنے کی حرص نے تمہیں اس قدر غافل کر دیا کہ تم قبروں میں پہنچ گئے۔

(آیت) "یایھا الذین امنوا لا تلھکم اموالکم ولا اولادکم عن ذکر اللہ"۔ (المنافقون: ۹)
ترجمہ: اے ایمان والو! تمہارے مال اور اولاد کی مشغولیت تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کردے۔
(آیت) "رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ واقام الصلوۃ وایتاء الزکوۃ یخافون یوما تتقلب فیہ القلوب والابصار"۔ (النور: ۳۷)
ترجمہ: وہ مرد جنہیں تجارت اور خرید وفروخت کی مشغولیت 'اللہ کی یاد 'نماز قائم کرنے اور زکوۃ دینے سے غافل نہیں کرتی 'وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں الٹ پلٹ جائیں گے۔
اس آیات میں اولاد 'مال و دولت اور تجارت میں مشغول ہونے سے مطلقا منع نہیں فرمایا 'بلکہ اس حد تک اشتغال سے منع فرمایا ہے 'کہ انسان نماز اور دیگر عبادات سے غافل ہوجائے 'کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دیگر آیات میں تجارت اور مال جمع کرنے کی اجازت دی ہے۔
(آیت) "لیشھدوا منافع لھم"۔ (الحج: ۲۸)
ترجمہ: (وہ حج کے لیے آئیں گے) تاکہ اپنے فائدے کے مقامات پر حاضر ہوں۔
(آیت) "لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم"۔ (البقرہ: ۱۹۸)
ترجمہ: (حج کے دوران) اپنے رب کا فضل (روزی) تلاش کرنے میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ (المفردات 'ص ۴۵۵ 'مطبوعہ المکتبہ المرتضویہ 'ایران '۱۳۶۲ھ)

لعب کا معنی بیان کرتے ہوئے علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں

لعب اصل میں لعاب ہے 'یہ لفظ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب منہ سے لعاب بہنے لگے اور جب کسی شخص کا فعل بغیر قصد کے واقع ہو تو اس کو لعب کہتے ہیں۔ (المفردات 'ص ۴۵۰ 'مطبوعہ ایران)
علامہ ابن الاثیر الجزری المتوفی ۶۰۶ ھ لکھتے ہیں:
لعب کا معنی ہے مذاق میں کوئی کام کرنا۔ حدیث میں ہے تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کا سامان بطور مذاق سنجیدگی سے نہ لے 'یعنی وہ اس کا سامان اس کو تنگ کرنے کے لیے لیتا ہے اور چوری کا ارادہ کرتا 'لیکن اس کو اذیت پہنچانے کا سنجیدگی سے ارادہ کرتا ہے۔ سوا ایسا نہ کرے اور جو شخص لغو اور بے فائدہ کام کرے 'اس کو بھی لعب کہتے ہیں۔ حدیث میں ہے ہم سمندر میں سفر کر رہے تھے 'جب موجیں جوش سے اٹھ رہی تھیں اور ایک ماہ تک موجیں ہمارے ساتھ لعب کرتی رہیں 'یعنی موجوں نے ان کو اس طرف نہیں جانے دیا جس طرف وہ جانا چاہتے تھے۔ (النہایہ 'ج ۴ 'ص ۲۵۳۔ ۲۵۲ 'مطبوعہ ایران '۱۳۶۷ھ)
اردو میں لہو ولعب کا ترجمہ کھیل تماشے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ہم نے لہو کا جو معنی بیان کیا ہے 'اس کا خلاصہ ہے غافل کرنا اور لعب کا خلاصہ ہے بے مقصد اور بے فائدہ کام 'اور کھیل اور تماشہ عموماً لغو اور بے فائدہ ہوتا ہے اور اس میں مشغول ہونے کی وجہ سے انسان عبادات اور کئی اہم کاموں سے غافل ہوجاتا ہے 'اس لیے کھیل اور تماشے کو لہو ولعب کہتے ہیں۔

کھیل اور ورزش کے متعلق اسلام کے احکام

ہر کھیل تماشا مطلقاً ممنوع اور حرام نہیں ہے ' بلکہ جو کھیل تماشا کسی غیر شرعی امر پر مشتمل ہو ' مثلاً غیر محرم مردوں اور عورتوں کا اختلاط ہو یا اجنبی مرد عورتوں کے سامنے یا اجنبی عورتیں مردوں کے سامنے مثلاً کرکٹ کھیلیں یا ٹینس کھیلیں یا رقص کریں یا کسی کھیل میں کھیلنے والوں کا ستر کھلا رہے تو ایسے کھیل ممنوع ہیں یا جس کھیل میں جانبین سے شرط لگائی جائے کہ جو فریق بھی کھیل میں کھیلنے والوں کا ستر کھلا رہے تو ایسے کھیل ممنوع ہیں یا جس کھیل میں جانبین سے شرط لگائی جائے کہ جو فریق بھی کھیل میں ہار گیا ' وہ جیتنے والے کو اتنی رقم دے گا ' یا فلاں چیز دے گا یا فلاں چیز کھلائے گا۔

یا کسی کھیل میں اس قدر اشتغال کیا جائے جس سے فرائض اور واجبات ترک ہو جائیں تو وہ کھیل جائز نہیں ہیں۔

امام ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت عقبہ بن عامر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا لہو صرف تین چیزوں میں ہے۔ کسی شخص کا اپنے گھوڑے کو سدھانا ' کسی شخص کا اپنی بیوی سے دل لگی کرنا اور کسی شخص کا تیر اندازی کرنا۔ (سنن النسائی ' ج ٦ ' رقم الحدیث : ' ۳۵۸۰ ' سنن ابو داؤد ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ' ۲۵۱۳ ' مسند احمد ' ج ۴ ' ص ۱۴٦)

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵٦ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ جس وقت حبشی ' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس مسجد میں کھیل رہے تھے ' حضرت عمر داخل ہوئے اور انھوں نے ایک کنکری اٹھا کر انھیں ماری۔ آپ نے فرمایا اے عمر ! ان کو چھوڑ دو۔ (صحیح البخاری ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ۲۹۰۱)

امام مسلم بن حجاج قشیری ۲٦۱ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرے حجرہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے تھے اور حبشی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مسجد میں ہتھیاروں سے کھیل رہے تھے۔ آپ مجھے اپنی چادر میں چھپا رہے تھے ' لیکن میں ان کے کھیل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر آپ میری وجہ سے کھڑے رہے ' حتی کہ میں خود واپس مڑی۔ سو تم اندازہ کرو کہ ایک کم عمر کھیل کی شوقین لڑکی نے کتنی دیر کھیل دیکھا ہوگا۔ (صحیح مسلم ' عیدین ' ۱۸ ' ۱۷ ' (۸۹۲) ۲۰۳۰ ' ۲۰۲۹ ' صحیح البخاری ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ' ۹۵۰ ' السنن الکبری ' للنسائی ' رقم الحدیث : ' ۱۷۹٦)

حدیث میں ہے کہ عید کے دن حبشی مسجد میں آکر رقص کر رہے تھے۔ علامہ نووی نے لکھا ہے کہ علماء نے اس حدیث کو اس پر محمول کیا ہے کہ حبشی اپنے ہتھیاروں کے ساتھ اچھل کود رہے تھے ' اور اپنے جنگی آلات کے ساتھ کھیل رہے تھے ' اور ان کا یہ کھیل رقص کے مشابہ تھا ' کیونکہ اکثر روایات میں ہتھیاروں کے ساتھ کھیلنے کا ذکر ہے۔ اس لیے اس حدیث کی ایسی تاویل کی جائے گی جو باقی احادیث کے موافق ہو۔

امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت علی (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں ' حضرت جعفر اور حضرت زید (رض) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے حضرت زید سے فرمایا تم میرے مولی (آزاد کردہ غلام) ہو تو وہ ایک ٹانگ پر رقص کرنے لگے اور حضرت جعفر سے فرمایا تم

میری صورت اور سیرت کے مشابہ ہو تو وہ حضرت زید کے پیچھے ایک ٹانگ پر رقص کرنے لگے۔ پھر مجھ سے فرمایا تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں تو میں حضرت جعفر کے پیچھے ایک ٹانگ پر رقص کرنے لگا۔ (مسند احمد ' ج ا 'ص ۱۰۸ 'مطبوعہ دارالفکر 'طبع قدیم 'مسند احمد ' ج ا ' رقم الحدیث : ۸۵۷ 'طبع دارالحدیث ' قاہرہ ' ۱۴۱۶ھ)

علامہ احمد شاکر نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (مسند احمد ' ج ا 'ص ۵۳۷ 'طبع قاہرہ)

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۵ھ لکھتے ہیں :

یہ حدیث حضرت علی (رض) کی روایت سے مسند احمد میں ہے۔ اسی طرح الباقر کی مرسل روایت میں ہے کہ حضرت جعفر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گرد چکر لگانے لگے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہ کیا کر رہے ہو ؟ انھوں نے کہا میں نے حبشیوں کو دیکھا ہے 'وہ اپنے بادشاہوں کے سامنے اس طرح کرتے ہیں اور حضرت ابن عباس (رض) کی حدیث میں ہے کہ نجاشی جب اپنے اصحاب میں سے کسی سے خوش ہوتا تو اس کے گرد کھڑے ہو کر ایک ٹانگ پر رقص کرنے لگتا۔ حدیث میں حجل کا لفظ ہے۔ اس کا معنی ہے ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر ہئیت مخصوصہ کے ساتھ رقص کرنا اور حضرت علی (رض) کی حدیث میں مذکور ہے کہ تینوں نے اس طرح رقص کیا۔ (فتح الباری ج ٦ 'ص ۵۱۶۲ مطبوعہ 'لاہور ۱۴۰۱ھ)

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵٦ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ انھوں نے ایک عورت کو ایک انصار کے مرد سے زفاف (شادی) کے لیے تیار کیا۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اے عائشہ ! کیا تمہارے پاس کوئی لہو (کھیل) ہے ؟ کیونکہ انصار کو لہو اچھا لگتا ہے۔ (صحیح البخاری ' ج ٦ ' رقم الحدیث : ۵۱٦۲ 'مطبوعہ بیروت)

امام احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ھ روایت کرتے ہیں :

عامر بن سعد بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت قریظہ بن کعب اور حضرت ابو مسعود انصاری (رض) کے ساتھ ایک شادی میں گیا۔ وہاں بچیاں گا رہی تھیں۔ میں نے کہا آپ دونوں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بدری صحابی ہیں اور آپ کے سامنے یہ ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا اگر تم چاہو تو ہمارے ساتھ بیٹھ کر گانا سنو اور چاہو تو چلے جاؤ 'ہمیں شادی کے موقع پر لہو کی اجازت دی گئی ہے۔ (سنن النسائی ' ج ٦ ' رقم الحدیث : ۳۳۸۳ 'مطبوعہ دارالمعرفہ ' بیروت ' ۱۴۱۲ھ)

امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ روایت کرتے ہیں :

ابو لہب کی بیٹی کے خاوند بیان کرتے ہیں کہ جب ابو لہب کی بیٹی کی شادی ہوئی تو ہمارے پاس رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لائے اور فرمایا کیا کوئی لہو (کھیل) ہے ؟ (مسند احمد ج ۴ 'ص ٦۷ 'طبع قدیم 'مسند احمد ' رقم الحدیث : ۱٦۵۷۹ 'طبع قاہرہ ' المعجم الکبیر ' ج ۲۴ ' رقم الحدیث : ٦۵۹ 'ص ۲۵۸ ' مجمع الزوائد ' ج ۴ 'ص ۲۸۹)

علامہ احمد شاکر نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے اور علامہ ابن حجر نے التعجیل میں اس کی تصویب کی ہے۔ (مسند احمد ' ج ۱۳ 'ص ۹٦ ' مطبوعہ قاہرہ ' ۱۴۱٦ھ)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے گھوڑے سواری کا مقابلہ کرایا ' پیدل دوڑ کا مقابلہ کرایا 'آپ نے خود بہ نفس نفیس دوڑ کے مقابلہ میں حصہ لیا 'اسی طرح آپ نے رکانہ سے کشتی بھی کی۔ان تمام حدیثوں کو ہم نے صحاح اور سنن کے حوالہ سے (شرح صحیح مسلم 'ج ٦ 'ص ٦٤١۔ ٦٣٩ میں) بیان کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ لہو ولعب مطلقاً ممنوع نہیں ہے اور جب کوئی کھیل کسی غیر شرعی امر پر مبنی نہ ہو 'نہ اس میں شرط لگائی جائے 'نہ اس سے کوئی عبادت ضائع ہو تو غرض صحیح سے مناسب حد تک اس کا کھیلنا جائز ہے اور جب کسی کھیل میں زیادہ دلچسپی لینے کی وجہ سے انسان عبادات سے غافل ہو جائے تو وہ ممنوع اور مذموم ہے۔

انسان کی صحت اور جسم کو چاق وچوبند رکھنے کے لیے مناسب حد تک کھیل اور ورزش مستحسن ہیں۔ بعض لوگ کرسی پر بیٹھ کر دن رات پڑھنے لکھنے کا کام کرتے ہیں 'ان کو اپنے کام کی وجہ سے زیادہ چلنے پھرنے اور جسمانی مشقت کا موقع نہیں ملتا 'جس سے ان کی توند نکل آتی ہے اور خون میں کلسٹرول کی مقدار زیادہ ہو جاتی ہے اور یہ لوگ ذیابیطس 'ہائی بلڈ پریشر 'دل کی بیماریوں مثلا انجائنا 'معدہ کا ضعف 'گیس اور السر وغیرہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ان بیماریوں سے محفوظ رہنے یا بیماری لاحق ہونے کے بعد ان کا مقابلہ کرنے کے لیے مختلف قسم کے جائز کھیلوں اور ورزشوں میں مشغول رہنا حفظان صحت کے لیے نہایت ضروری ہے 'ہم اس سے پہلے باحوالہ بیان کرچکے ہیں کہ اعلی حضرت امام احمد رضا قدس سرہ العزیز نے مسلمانوں کی کرکٹ ٹیم کی کامیابی کے لیے وظیفہ بتایا تھا۔ دیکھئے شمع شبستان رضا 'حصہ سوم 'ص ٥٠۔ ٤٨)

(تفسیر تبیان القرآن۔غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

قَدۡ نَعۡلَمُ اِنَّهٗ لَيَحۡزُنُكَ الَّذِىۡ يَقُوۡلُوۡنَ فَاِنَّهُمۡ لَا يُكَذِّبُوۡنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجۡحَدُوۡنَ ○33

لغۃ القرآن: [قَدْ : تحقیق][نَعْلَمُ : ہم جانتے ہیں][اِنَّهٗ : بیشک وہ][لَيَحْزُنُكَ : ضرور غم گین کرتا ہے آپ کو][الَّذِيْ : وہ جو][يَقُوْلُوْنَ : وہ کہتے ہیں][فَاِنَّهُمْ : پس بیشک وہ][لَا يُكَذِّبُوْنَكَ : نہیں وہ جھٹلاتے آپ کو][وَلٰكِنَّ : اور لیکن][الظّٰلِمِيْنَ : ظالم (جمع)][بِاٰيٰتِ : ساتھ آیات][اللّٰهِ : اللہ][يَجْحَدُوْنَ : وہ انکار کرتے ہیں]

ترجمہ : (اے حبیب !) بیشک ہم جانتے ہیں کہ وہ (بات) یقیناً آپ کو رنجیدہ کر رہی ہے کہ جو یہ لوگ کہتے ہیں، پس یہ آپ کو نہیں جھٹلا رہے لیکن (حقیقت یہ ہے کہ) ظالم لوگ اللہ کی آیتوں سے ہی انکار کر رہے ہیں

تشریح:

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی

خلائق کے حال پر شفقت و ہمدردی سارے جہان سے زیادہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دل میں ڈالی گئی تھی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان بد بختوں کی تکذیب و اعراض، مستقبل کی تباہی اور مشرکانہ و ملحدانہ کلمات سے سخت رنج اور صدمہ محسوس فرماتے تھے۔ ان آیات میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی اور ان اشقیاء کو دھمکی دی گئی ہے کہ آپ ان کے اعراض و تکذیب سے اس قدر دلگیر اور بے چین نہ ہوں، یہ لوگ جو تکذیب کر رہے ہیں فی الحقیقت آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نہیں جھٹلاتے کیونکہ آپ کو تو پہلے سے بالاتفاق صادق وامین سمجھتے تھے، بلکہ خدا کی آیات و نشانات کا جو پیغمبر (علیہ السلام) کی تصدیق و تبلیغ کے لیے بھیجی گئی ہیں، جان بوجھ کر از راہ ظلم و عناد انکار کر رہے ہیں تو آپ بھی ان ظالموں کا معاملہ خدا کے سپرد کر کے مطمئن ہو جایئے۔ وہ خود ان کے ظلم اور آپ کے صبر کا پھل دینے والا ہے۔ انبیاء سابقین کے ساتھ بھی جن کے کچھ حالات آپ کو سنائے جا چکے ہیں ان کی قوموں نے تکذیب و ایذاء رسانی کا برتاؤ کیا جس پر خدا کے معصوم پیغمبر نہ آیت اولوالعزمی سے صبر کرتے رہے حتی کہ حسب وعدہ خدا کی مدد پہنچی اور بڑے زبردست متکبرین کے مقابلہ میں ان کو مظفر و منصور کیا گیا۔ آپ سے جو نصر و ظفر کے وعدے کیے گئے ہیں ایک ایک کر کے پورے ہوں گے۔ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں مگر خدا کا وعدہ نہیں ٹل سکتا۔ کس کی طاقت جو خدا کی باتوں کو بدل ڈالے یعنی جو اس نے کہا ہے اسے واقع نہ ہونے دے۔ مکذبین کو یاد رکھنا چاہیے کہ ان کی جنگ حقیقۃً محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات سے نہیں بلکہ رب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ہے جس نے ان کو اپنا سفیر اعظم اور معتمد بنا کر کھلے نشانات کے ساتھ بھیجا ہے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تکذیب ان خدائی نشانات کی تکذیب ہے۔

ابو جہل کو بھی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سچائی کا دل سے اعتراف تھا

تفسیر مظہری میں بروآیت سُدّی یہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ کفار قریش کے دو سردار اخنس بن شریق اور ابو جہل کی ملاقات ہوئی تو اخنس نے ابو جہل سے پوچھا کہ اے ابو الحکم (عرب میں ابو جہل ابو الحکم کے نام سے پکارا جاتا تھا اسلام میں اس کے کفر و عناد کے سبب ابو جہل کا لقب دیا گیا) یہ تنہائی کا موقع ہے میرے اور تمہارے کلام کو کوئی تیسرا نہیں سن رہا ہے، مجھے محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق اپنا خیال صحیح صحیح بتلاؤ کہ ان کو سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا۔

ابو جہل نے اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ بلاشبہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سچے ہیں۔ انھوں نے عمر بھر میں کبھی جھوٹ نہیں بولا، لیکن بات یہ ہے کہ قبیلہ قریش کی ایک شاخ بنو قصی میں ساری خوبیاں اور کمالات جمع ہو جائیں باقی قریش خالی رہ جائیں اس کو ہم کیسے برداشت کریں؟ جھنڈا بنی قصی کے ہاتھ میں ہے حرم میں حجاج کو پانی پلانے کی اہم خدمت ان کے ہاتھ میں ہے۔ بیت اللہ کی دربانی اور اس کی کنجی ان کے ہاتھ میں ہے، اب اگر نبوت بھی ہم انہی کے اندر تسلیم کرلیں تو باقی قریش کے پاس کیا رہ جائے گا۔

انجام کار غلبہ و فتح آپ کی ہو گی

قوم کی تکذیب اور ان سے اذیت بلیغ پہنچنے کے بعد وعدہ کیا گیا کہ عاقبت تمہاری ہے چنانچہ دنیا میں بھی ان کے لیے خدا کی طرف سے نصرت آ گئی جیسے کہ آخرت کی نصرت حاصل ہو ہی چکی ہے اسی لیے فرمایا کہ اللہ کی بات نہیں بدلتی اور نصرت کا جو وعدہ کیا گیا ہے وہ ضرور پورا کیا جائے گا

ایک دوسری روایت ناجیہ ابن کعب سے منقول ہے کہ ابو جہل نے ایک مرتبہ خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا کہ ہمیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جھوٹ کا کوئی گمان نہیں، اور نہ ہم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تکذیب کرتے ہیں، ہاں ہم اس کتاب یا دین کی تکذیب کرتے ہیں جس کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لائے ہیں۔

جانوروں کو بھی انصاف ملے گا

ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت سے نقل کیا ہے کہ قیامت کے روز تمام جانور، بہائم اور پرندے بھی دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ کا انصاف اس حد تک ہے کہ اگر کسی سینگ والے جانور نے بے سینگ کے جانور کو دنیا میں مارا تھا تو آج اس کا انتقام اس سے لیا جائے گا۔ (تفسیر گلدستہ)

دراصل اس کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں۔ حضور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بذات خود کچھ نہیں کہا کرتے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کے رسول اور نبی ہونے کی حیثیت سے ہی ان کو تبلیغ کرتے تھے۔ اس لیے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت کا انکار اور تکذیب گویا آیات الٰہی کا انکار اور تکذیب ہی تھی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تو صادق اور راست گفتار یقین کرتے تھے۔ جیسے ابو جہل نے ایک دفعہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا کہ ہم آپ کو تو نہیں جھٹلاتے کیونکہ آپ کی صداقت ہمارے نزدیک مسلم ہے لیکن یہ پیغام جو لے کر آپ آئے ہیں ہم اسے سچا تسلیم نہیں کرتے۔ وکان ابو جہل یقول : مانکذبک لانک عندنا صادق وانما نکذب ماجئتنا بہ (کشاف) (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

شان نزول اور مناسبت

جنگ بدر کے دن اخنس بن شریق اور ابو جہل کی ملاقات ہوئی ' اخنس ابو جہل کو اس جگہ لے گیا جہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے ابو جہل سے کہا اے ابو الحکم ' مجھے یہ بتاؤ کہ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صادق ہیں یا کاذب؟ کیونکہ یہاں پر میرے اور تمہارے سوا قریش کا اور کوئی فرد نہیں ہے جو ہماری باتیں سن رہا ہو۔ ابو جہل نے کہا تم پر افسوس ہے ' بخدا (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) البتہ ضرور صادق ہیں اور (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کبھی جھوٹ نہیں بولا ' لیکن جھنڈا ' کعبہ کی دربانی اور زمزم کی سبیل پہلے ہی بنو قصی کے پاس ہیں۔ اگر نبوت بھی وہ لے گئے تو قریش کے پاس کیا باقی بچے گا ' تب یہ آیت نازل ہوئی۔ دراصل یہ آپ کی تکذیب نہیں کرتے ' یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔ (جامع البیان ' جزء ۷ ص ۲۴۰ ' مطبوعہ دار الفکر ' بیروت ۱۴۱۵ھ اسباب النزول ' ص ۲۱۹ ' ۲۱۸)

مقاتل نے بیان کیا کہ یہ آیت حارث بن عامر کے متعلق نازل ہوئی ہے جو لوگوں کے سامنے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تکذیب کرتا تھا اور جب گھر والوں کے ساتھ تنہا ہوتا تو کہتا (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جھوٹوں میں سے نہیں ہیں اور میرے نزدیک وہ صرف سچے شخص ہیں۔ (اسباب النزول ' ص ۲۱۹ ' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ ' بیروت)

اس سے پہلی آیتوں میں کفار کا رد کیا جا رہا تھا اور اس آیت میں بھی ان کا رد ہے۔ پہلے ان کفار قریش کا رد کیا جو توحید ' نبوت اور قیامت کا انکار کرتے تھے۔ پھر ان کافروں کا رد کیا جو سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت کا اس لیے انکار کرتے تھے کہ آپ بشر تھے اور فرشتہ نہ تھے۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ اگر ہم فرشتہ کو رسول بناتے ' تب بھی ہم اس کو انسان کی صورت میں ہی بھیجتے اور تم پر پھر اشتباہ ہو جاتا اور اس آیت میں ان کافروں کا رد فرمایا ہے جو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنی باتوں سے ایذاء پہنچاتے تھے۔ بعض آپ کو جھوٹا کہتے تھے۔ بعض آپ کو جادوگر کہتے تھے اور بعض شاعر یا کاہن یا مجنون کہتے تھے۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

سیدنا حضرت علی (رض) سے مروی ہے کہ ابو جہل نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا۔ ہم آپ کو نہیں جھٹلاتے ہم تو اس کلام کو جھٹلاتے ہیں جو آپ لے کر آئے ہیں (یعنی، ہم آپ کے ذاتی طور پر دشمن نہیں ہیں، ہمیں آپ کے حسن کردار سے کوئی انکار نہیں، ہمیں آپ پر نازل ہونے والی کتاب سے دشمنی ہے۔ مطلب یہ کہ اگر آپ دعویٰ نبوت چھوڑ دیں تو ہماری دشمنی ختم) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس کی بات سے شدید رنج پہنچا۔ تب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی:

فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ۔ (ترمذی کتاب التفسیر سورۃ انعام)

ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے کہ ایک بار ابو جہل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بڑے پیار کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اس کے کچھ دوستوں نے دیکھا تو کہا تم ان کے ساتھ پیار سے باتیں کر رہے ہو؟ وہ کہنے لگا میں جانتا ہوں کہ وہ سچے مگر ہم بنی عبد مناف کے تابع نہیں رہ سکتے (یعنی اگر ہم ان کو رسول مان لیں تو ہمارا قبیلہ گویا ان کے قبیلہ کے) تابع ہو جائے گا۔ (در منثور جلد 3 صفحہ 264)

شان محبوبیت مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ سے معلوم ہوا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے ایسے محبوب ہیں کہ جب بھی آپ کفار کی باتوں سے محزون و مغموم ہوتے تو اللہ تعالیٰ قرآن مجید اتار کر آپ کو تسلی عطا فرماتا اور قرآن کا ایک بڑا حصہ اللہ نے اپنے محبوب کو خوش کرنے کے لئے نازل فرمایا کہیں فرمایا گیا: ولا یحزنک الذین یسارعون فی الکفر۔ کہیں فرمایا: **فلعلك باخع نفسك علی آثارھم**۔ کہیں فرمایا: **ولا یحزنك قولھم۔ ان العزۃ للّٰہ جمیعا**۔

حسن سیرت مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ سے معلوم ہوا کفار نے آپ سے اس وقت دشمنی شروع کی جب آپ نے انھیں کلام الٰہی سنایا جو ان کے بت پرستانہ عقائد کے خلاف تھا، ورنہ وہ آپ کے حسن سیرت کے معترف تھے اور آپ کو صادق و امین کہتے تھے ابو جہل نے کہا ہم آپ کو نہیں بلکہ آپ کے لائے ہوئے کلام کو جھٹلاتے ہیں۔ (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

المختصر۔۔اے محبوب! درحقیقت وہ تیری نہیں، بلکہ میری تکذیب کر رہے ہیں۔ یعنی وہ آپ کو کچھ نہیں کہتے۔ اگر بظاہر کچھ کہتے ہیں، تو درحقیقت مجھے کہتے ہیں، اس لیے کہ آپ فانی فی اللہ ہیں۔ اب میں ہی ان سے سخت تر انتقام لونگا۔

پھر حق تعالیٰ آپ کی تسکین کے واسطے فرماتا ہے، کہ اے محبوب! صرف آپ ہی کی تکذیب نہیں کی گئی بلکہ۔۔

(تفسیر اشرفی۔ علامہ محمد مدنی اشرفی جیلانی)

اللہ کا انکار اس لیے کیا کہ اسے کسی نے دیکھا نہیں۔ حضور کا انکار کیسے کرے گا انھیں اور ان کے معجزات کو آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ سبحان اللہ! رب نے کس انداز سے اپنے حبیب کو تسکین دی کہ یہ تو مجھے اور میری آیتوں کو جھٹلا رہے ہیں تمہیں تو نہیں جھٹلاتے۔ (تفسیر نور العرفان)
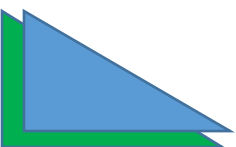
آیت مبارکہ :

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ○34

لغۃ القرآن : [وَلَقَدْ : اور البتہ تحقیق][كُذِّبَتْ : جھٹلائے گئے][رُسُلٌ: رسول (جمع)][مِّنْ قَبْلِكَ : آپ سے پہلے][فَصَبَرُوْا : تو انہوں نے صبر کیا][عَلٰي مَا : پر جو][كُذِّبُوْا : وہ جھٹلائے گئے][وَاُوْذُوْا : اور تکلیف دیے گئے][حَتّٰى : یہاں تک][اَتٰىهُمْ : آئی انکے پاس][نَصْرُنَا : ہماری مدد][وَلَا : اور نہیں][مُبَدِّلَ : تبدیل کرنے والا][لِكَلِمٰتِ : کلمات کو][اللّٰهِ : اللہ][وَلَقَدْ : اور تحقیق][جَآءَكَ : آئی آپ کے پاس][مِنْ : سے][نَّبَاِى : خبریں][الْمُرْسَلِيْنَ : رسولوں کی]

ترجمہ : اور بیشک آپ سے قبل (بھی بہت سے) رسول جھٹلائے گئے مگر انھوں نے جھٹلائے جانے اور اذیت پہنچائے جانے پر صبر کیا حتیٰ کہ انھیں ہماری مدد آ پہنچی، اور اللہ کی باتوں (یعنی وعدوں کو) کوئی بدلنے والا نہیں، اور بیشک آپ کے پاس (تسکین قلب کے لیے) رسولوں کی خبریں آچکی ہیں

تشریح :

سنت الٰہی یہی ہے کہ حق و باطل کی کشمکش جاری رہے۔ مصائب کے پہاڑ حق کے علمبرداروں پر ٹوٹتے رہیں۔ اور وہ صبر واولوالعزمی سے ان کو برداشت کرتے رہیں۔ حوادثات کے طوفانوں میں بھی شمع توحید کو ہر قیمت پر وہ روشن رکھیں۔ حضور کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو کفار کے کفر و عناد سے بڑی تکلیف ہوتی تھی اور آپ کے رحیم و شفیق دل کو گوارا نہ تھا کہ کوئی بھی کفر و گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکتا پھرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ سے پہلے بھی انبیاء مبعوث کئے گئے۔ کفار نے ان کو بھی ستایا اور انھوں نے صبر و تحمل سے کام لیا۔ آپ بھی کفار کی اذیت رسانیوں پر صبر و تحمل سے کام لیا کریں۔

جب انبیاء کرام نے تبلیغ اور صبر کا حق ادا کردیا اور کفار کی اذیت رسانیوں اور تعصب کی حد ہو گئی تو اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت آئی جس نے باطل کو سرنگوں اور ذلیل کردیا اور حق کا بول بالا ہوگیا۔ اور کفر کا سارا تنزک و احتشام خدا کی نصرت کے وعدہ کو پورا ہونے سے نہ روک سکا۔ اسی طرح اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میں نے آپ سے اسلام کو سربلند کرنے کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

چنانچہ ہجرت کے بعد فتوحات کے دروازے کھل گئے۔

اگر کہا جائے کہ بعض انبیاء کو شہید بھی کیا گیا تو ان کو اللہ کی مدد کیوں نہ ملی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں رسولوں کی بات کی گئی ہے (**وَلَقَدۡ كُذِّبَتۡ رُسُلٌ مِّن قَبۡلِكَ**) جن کا درجہ انبیاء کرام میں بلند تر ہے یعنی وہ انبیاء جن کو نئی کتاب یہ شریعت دی گئی وہ رسول ہیں، وہ اپنی کتاب یا شریعت کو دنیا میں نافذ کرکے گئے اور ان میں سے کوئی شہید نہ ہوا جیسے ابراہیم، موسیٰ، داؤد اور عیسیٰ علیہم السلام۔ اس لیے دوسری جگہ ارشاد ہوا **كَتَبَ اللهُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِي**۔ اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب آتے ہیں۔ یہاں بھی وَرُسُلِیُ فرمایا گیا ہے۔ وانبیائی نہیں فرمایا گیا اور جہاں قتل کا ذکر ہے وہ محض انبیاء ہیں رسول نہیں۔ اسی لیے ویقتلون النبیین فرمایا ویقتلون الرسل نہیں فرمایا گیا۔ علاوہ ازیں کوئی نبی میدان جہاد میں شہید نہیں ہوا بلکہ انبیاء کو دشمنوں پر غلبہ ہی دیا گیا۔ یعنی جو انبیاء شہید کئے گئے وہ حالت جہاد میں نہیں تھے۔ (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

ان آیات میں خطاب اگرچہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ہے 'لیکن روئے سخن قریش کے ان ہٹ دھرم اور ضدی لوگوں کی طرف ہے جو کسی طرح بھی راہ راست اختیار کرنے کو تیار نہیں تھے۔ البتہ وقتاً فوقتاً نئے سے نئے معجزات کا مطالبہ کرتے رہتے تھے اور بظاہر تاثر یہ دیتے تھے کہ اگر یہ نشانی اور یہ معجزہ ہمیں دکھا دیا جائے تو ہم ایمان لانے کو تیار ہیں اور اس کے ساتھ ہی رویہ ان کا یہ تھا کہ ان کی مخالفت میں روز بروز شدت پیدا ہوتی جارہی تھی اور اذیت رسانی کا عمل اپنی انتہا کو چھو رہا تھا 'جس کا برداشت کرنا بعض دفعہ مسلمانوں کے لیے مشکل ہو رہا تھا اس سلسلے میں جو اصولی باتیں فرمائی گئی ہیں اور جن کی حیثیت سنت اللہ اور قانون خداوندی کی ہے۔ ان کا ذکر کرنے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک اور بات کی وضاحت کردوں تاکہ اللہ کی اس سنت کو سمجھنے میں سہولت پیدا ہو جائے۔ بات یہ ہے کہ جب آدمی قرآن کریم میں تسلی کے اس مضمون کی تکرار دیکھتا ہے کہ بار بار آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مخالفین کی مخالفت پر تسلی دی جارہی ہے اور آپ کا حوصلہ بڑھایا جارہا ہے تو ذہن میں دو سوال ابھرتے ہیں۔

1 اللہ کے تمام رسول نہایت بلند ہمت اور بلند حوصلہ رہے ہیں 'انھوں نے بگڑے ہوئے حالات کے طوفانوں کا مقابلہ کیا ہے اور کبھی سراسیمہ نہیں ہوئے اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو سید الرسل اور خاتم الرسل ہیں آپ یقیناً ان تمام اولوالعزم رسولوں سے بڑھ کر صاحب عزیمت اور حوصلہ مند ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ بار بار آپ کو تسلی دینے کی ضرورت پیش آگئی ہے؟

2 قرآن کریم عربی فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے جس کی مثال لانا انسانی صلاحیت سے بالاتر بات ہے۔ لیکن جب ہم اس میں اس مضمون کا تکرار دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ایک ہی بات بار بار کیوں کہی جارہی ہے اس لیے کہ اعلیٰ پائے کی کتابوں میں کسی بھی بات کو دھرا کر کہنا ایک عیب سمجھا جاتا ہے۔ تو قرآن کریم تو ایسے ہر عیب سے پاک ہے تو پھر اس مضمون کے بار بار لائے جانے کا آخر کیا مطلب ہے؟

یہ دونوں سوال اصل میں قرآن کریم کی حیثیت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہیں ہم نے اس کتاب کو بھی باقی کتابوں جیسی ایک کتاب سمجھا ہے۔ دنیا بھر میں تمام شعبہ ہائے علم پر لکھی جانے والی تمام کتابوں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہ علم کے جس گوشے پر بحث کرتی ہیں ' اس کی اساسی باتیں ' اس کے ضمنی مباحث ' اس سے پیدا ہونے والے نتائج کے بارے میں ضروری اصلاحات اور ہدایات کو ابواب اور فصول باندھ کر ایک ترتیب سے ذکر کر دیا جاتا ہے اور پھر اس کو دھرایا نہیں جاتا اور یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ جس آدمی کو جس شعبہ علم سے استفادہ کرنا ہے وہ اس کی متعلقہ فصل نکال کر ان ضروری باتوں کو ایک دفعہ دیکھ لے گا اور ان سے فائدہ اٹھالے گا۔ اس لیے کسی بھی بات پر بحث کرتے ہوئے کسی ایک بات کو تکرار کے ساتھ ذکر کرنا ایسی کتابوں کے لیے باعث عیب سمجھا جاتا ہے ' لیکن جب ہم قرآن کریم کو بھی اسی طرح ایک خالصتاً علمی کتاب سمجھ کر پڑھتے ہیں اور اس میں کسی ایک بات کے تذکرے کو کسی ایک ہی جگہ کافی نہ سمجھ کر بار بار ذکر کرتا ہوا دیکھتے ہیں تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کتاب کے قاری پر یا تو عدم اعتماد کیا جارہا ہے اور یا لکھنے والا لکھنے کا سلیقہ نہیں جانتا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم اللہ کی وہ واحد کتاب ہے کہ جس کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے اور دنیا کی کوئی کتاب اس لحاظ سے اس کی نقل کرنے سے عاجز ہے کیونکہ یہ کتاب صرف تھیوراٹیکل بک نہیں ہے بلکہ حقیقت میں ایک ایسی گائیڈ بک اور راہنما کتاب ہے جو اپنے پیغمبر کے ساتھ نازل ہوتی اور چلتی ہے۔ اس کی دعوت جن حالات سے گزرتی ہے اور خود اسے اور اس کے ساتھیوں کو جن جن مراحل سے جیسے جیسے گزرنا پڑتا ہے یہ کتاب برابر ان کو ہدایات دیتی ہے اور ان کے دل و دماغ میں پیدا ہونے والے سوالات کا جواب دیتی ہے خدشات کو اطمینان سے بدلتی ہے اور اشتعال اور ہر اس کی صورت میں کبھی شہد کی طرح مٹھاس بن کر اور کبھی شبنم کی طرح ٹھنڈک بن کر ان کے حوصلے کا سامان کرتی ہے۔ ذرا تصور کیجئے کہ اگر یہ حکم ایک دفعہ دے دیا جاتا کہ لوگو! دین کی راہ میں تمہیں مشکلات پیش آئیں گی ' تمہیں ان پر صبر کرنا ہے اور اس کے بعد مسلسل تیرہ سال مکی زندگی میں اور کئی سال تک مدنی زندگی میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات گرامی اور صحابہ کرام مسلسل اس کٹھالی میں ڈال کر بے پناہ مصائب سے آزمائے جاتے تو کیا یہ ایک جملے پر مشتمل تسلی اس پورے سفر میں کافی ہو سکتی تھی۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب مکہ کی سڑکوں پر گزرتے ہوئے دیکھتے کہ حضرت خباب (رض) کو دھونکنی دی جارہی ہے اور کبھی انھیں دہکتے انگاروں کی سیج پر لٹایا جارہا ہے اور کبھی حضرت بلال (رض) کو دیکھتے کہ ان کا بدبخت آقا آگ کی طرح تپتی ہوئی ریت پر انھیں گھسیٹ رہا ہے اور کبھی ان کے گلے میں رسی ڈال کر اوباشوں کے سپرد کر رہا ہے کہ انھیں پورے مکہ میں گھسیٹتے پھرو۔ ایسے ایک ایک واقعہ پر تکلیف اٹھانے والوں کا جو حشر ہوتا تھا اور خود حضور کا دل جیسے خون ہو ہو جاتا تھا اور جسم و جان کی صلاحیتیں دم توڑنے لگتی تھیں اور آئے دن کی اذیتیں حوصلوں کو شکستہ کرنے لگتی تھیں تو کیا ضرورت نہیں تھی کہ آسمان سے بار بار تسلی اور اطمینان کی شبنم برسے ' بار بار جبرائیل آئیں اور حوصلہ دیں اور بار بار اللہ تعالیٰ ظالموں کو وعید سنائیں اور ان مظلوموں کو انعامات کی نوید دیں۔ اگر اس پر غور کیا جائے تو یقیناً آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ کوئی بھی تحریک جو جان و تن کے جانگسل مراحل سے گزرتی ہے اس کے لیے سب سے بڑی قوت کا سامان یہ حوصلہ دینے کا عمل ہی ہوتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس سے ایک آدمی حوصلہ پاتا اور آخری دم تک لڑنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ یہ وہ سبب ہے جس کی وجہ سے قرآن کریم بار بار آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے ساتھیوں کو تسلی دیتا ہے۔ چنانچہ پیش نظر آیت کریمہ میں یہی تسلی کا مضمون ہے ' لیکن اس کے ساتھ ہی اللہ نے اپنی سنت کو بھی بیان کر دیا ہے تاکہ امت مسلمہ اچھی طرح اس بات کو سمجھ لے۔ ارشاد ہوتا ہے

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰهُمْ نَصْرُنَا ج وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ج وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ۔ (الانعام : ۳۴)

(اور تم سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا تو انھوں نے جھٹلائے جانے اور ایذا دیئے جانے پر صبر کیا یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد آ گئی ' اللہ کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں اور پیغمبروں کی کچھ سرگزشتیں تو تمہیں پہلے ہی پہنچ چکی ہیں) (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

تبلیغِ دین میں صبر اور استقامت ضروری ہے

اس آیت کریمہ میں چند باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔

ہر رسول کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بے سہارا نہیں چھوڑیں گے 'جب ہماری بے بسی اور مصیبت انتہاء کو پہنچے گی تو یقینا اس کی نصرت نازل ہو کر ہمیں سہارا دے گی۔ لیکن قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ اس یقین کے باوجود مخالفتیں اور اذیتیں اس حد تک پہنچ گئیں کہ بار بار ان کا پیمانہ صبر لبریز ہوتا رہا 'چنانچہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ بتایا گیا کہ ابھی آپ اور آپ کے ساتھیوں پر تو وہ وقت نہیں آیا 'جو پہلے رسولوں اور ان کی امتوں پر گزر چکا ہے۔ ارشاد فرمایا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ

(کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تم یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے 'حالانکہ تم پر ابھی وہ وقت نہیں آیا جو تم سے پہلی امتوں پر گزر چکا انھیں جسمانی اور مالی مصیبتیں پہنچیں اور وہ مصائب سے جھنجھوڑ ڈالے گئے یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھی پکار اٹھے کب آئے گی اللہ کی مدد) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعض صحابہ بھی بعض دفعہ ایسے ہی احساس سے مغلوب ہوئے تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دینا پڑی۔ حضرت خباب (رض) فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ مشرکین نے مجھے بے حد اذیتیں پہنچائیں جب میرے لیے ان کا برداشت کرنا بے حد مشکل ہو گیا تو میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تلاش کے لیے نکلا 'میں نے دیکھا کہ آپ کعبۃ اللہ کے سائے میں بیٹھے تھے۔ میں حضور کے پاس پہنچتے ہی بے ساختہ رو پڑا اور عرض کی کہ حضور اب یہ مصیبتیں برداشت نہیں ہوتیں 'ظالموں نے دکھ پہنچانے میں انتہا کر دی 'آپ ان کے لیے اللہ سے بددعا کیوں نہیں فرماتے؟ کہ اللہ ان پر اپنا عذاب نازل فرمائے۔ حضرت خباب کہتے ہیں کہ یہ سنتے ہی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا چہرہ مبارک غصہ سے تمتمانے لگا اور مجھ سے فرمایا کہ خباب تم سے پہلی امتوں پر ایسا وقت گزر چکا ہے کہ لوہے کی کنگھیوں سے زندہ حالت میں ان کا گوشت نوچ ڈالا گیا ' کتنے لوگ تھے جن کو دیواروں میں چن دیا گیا لیکن انھوں نے اپنے اللہ سے شکایت نہیں کی۔ آخر اللہ کی نصرت آن پہنچی۔ مزید فرمایا کہ خباب تم جلدی کر رہے ہو 'وہ وقت دور نہیں 'جب اللہ تعالیٰ اس دین کو غلبہ عطا فرمائے گا اور اس کی برکت سے حالات اس حد تک تبدیل ہوں گے کہ آج جبکہ تمہیں یہ یقین نہیں ہوتا کہ کل کو تمہیں روٹی کھانے کو بھی ملے گی یا نہیں 'اس وقت تم زکوۃ کا مال جھولیوں میں ڈال کر زکوۃ لینے والوں کو تلاش کرو گے اور تمہیں زکوۃ لینے والے نہیں ملیں گے۔ مختصر یہ

کہ آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ فرمایا جارہا ہے کہ آپ کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اہل دنیا نے ہمیشہ اللہ کے رسولوں اور حق کے علمبرداروں کے ساتھ یہی کچھ کیا ہے۔

2 دوسری بات یہ فرمائی کہ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اس صورت حال سے دل برداشتہ ہونے کی بجائے یا بار بار مشرکین کے کہنے پر اللہ سے ان کے منہ مانگے معجزات طلب کرنے کی بجائے اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے اور ان کے مصائب پر صبر کرنا چاہیے اور یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ صبر کا معنی بے بسی کی تصویر بن جانا نہیں بلکہ صبر کا مفہوم یہ ہے کہ آپ ہمت اور حوصلے سے حالات کا مقابلہ کریں 'اس راستے کی تکلیفوں کو برداشت کریں اور ہر ممکن طریقے سے دعوت الی اللہ کے کام کو جاری رکھیں۔ مصائب کی وجہ سے حوصلہ ہار کر کام کو روک دینا اور دعوت الی اللہ کو ملتوی کر دینا یا دینی ذمہ داریوں کو معطل کر دینا 'اس کی تو کبھی بھی اجازت نہیں البتہ ! اس بات کی گنجائش ضرور ہے کہ آپ حالات کو دیکھتے ہوئے دعوت الی اللہ کے طریقے کو بدلیں حالات کے تیوروں کو پہچانتے ہوئے حکمت عملی میں تبدیلی پیدا کریں۔

جس طرح پانی کا سفر اور اس کی روانی کا عمل کبھی نہیں رکتا 'اگر درمیان میں کوئی چٹان حائل ہو جائے تو بجائے اس سے سر پٹخنے کے 'پانی دائیں بائیں سے اپنا راستہ نکال لیتا ہے۔ اسی طرح دعوت الی اللہ کے کام کرنے والوں کو یہ بتایا جارہا ہے کہ تمہیں بھی اگر ناگفتہ بہ حالات کا سامنا کرنا پڑے تو اپنے فرض سے سبکدوش ہو جانے کا کوئی سوال نہیں 'البتہ اپنے طریقے اور حکمت عملی میں تبدیلی کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ یہی صبر کا مفہوم ہے اور آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اسی بات کا حکم دیا جارہا ہے۔

3 تیسری بات یہ فرمائی جارہی ہے کہ تمہیں اپنا کام کرنا ہے 'جس کی ذمہ داری تم پر ڈالی گئی ہے 'اس سے رک جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا چاہے حالات کیسے بھی منہ زور کیوں نہ ہوں اور مخالفین کو اپنا کام کرنا ہے ان کا کام ہے کہ آپ کا راستہ روکنے کے لیے ہر طرح کے موانع پیدا کریں 'بدگمانیاں پھیلائیں 'تہمتیں دھریں 'سراسیمہ کرنے کے لیے جسمانی اذیتیں پہنچائیں 'وہ جو کچھ بھی کریں انھیں کرنا چاہیے کیونکہ مخالفین کی سنت یہی ہے لیکن آپ اس کے مقابلے میں اپنی دعوت کے عمل کو جاری رکھیں 'ان دونوں طریقوں کے پہلو بہ پہلو چلنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ اس کٹھالی سے کندن بن کر نکلیں گے۔ مسلسل صبر سے آپ کے اندر اللہ پر بے پناہ اعتماد 'اپنے مقصد سے بے پناہ لگاؤ 'مشکل حالات میں زندگی گزارنے کا ہنر 'جذبات پر قابو پا لینے کا طریقہ اللہ کے سامنے رات کی تاریکی اور تنہائی میں تضرع اور عاجزی کا اظہار اور اللہ سے بے پناہ تعلق کے نتیجے میں گناہ سے بچنے کی صلاحیت اور خیر کی طرف لپکنے کا جذبہ ایسی صفات پیدا ہوں گی اور اس کے نتیجے میں جو خوبصورت سیرت و کردار وجود میں آئے گا دشمن اس کا دیر تک مقابلہ نہیں کر سکے گا اور دوسری طرف مخالفین اپنے طرز عمل کے نتیجے میں بعض رزائل کا شکار ہوں گے۔ ان کے اندر سنگدلی پیدا ہو گی 'حق سے نفور اور بڑھے گا 'دین بیزاری کا جذبہ گہرا ہو جائے گا 'دنیا کی محبت ان کو اور اپنا گرویدہ بنا لے گی۔ یہ تو ان لوگوں کا حال ہوگا جو مخالفین کے سرغنہ ہوں گے۔ البتہ انہی میں اس کشمکش کے نتیجے میں ایسے بھی نکلیں گے جو مسلمانوں کے صبر 'پامردی اور ان کے خوبصورت سیرت و کردار سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہیں گے۔ اس طرح سے یہ قافلہ خود بخود مضبوط ہوتا جائے گا ورنہ اس کشمکش کا یہ نتیجہ تو بہر صورت نکل کر رہے گا کہ اللہ کی مدد آئے گی 'اس کی دو صورتیں ممکن ہیں 'ایک تو یہ کہ اللہ دین کو غلبہ دے گا اور مسلمانوں کی جماعت کو غالب کر دے گا۔ جیسے بالآخر اللہ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سرزمین عرب میں غلبہ دیا اور یا پھر یہ ہوگا کہ اللہ کا عذاب آجائے گا اللہ کے رسول اور اس کے ساتھیوں کو وہاں سے نکال لیا جائے گا اور کافر تباہ کر دیئے جائیں گے۔

یہ ہے وہ اللہ کی سنت جس کا یہاں ذکر فرمانے کے بعد فرمایا: کہ اللہ کے کلمات کو بدلنے والا کوئی نہیں یعنی دعوت الی اللہ کی کشمکش میں یہ وہ ناگزیر راستے ہیں جن سے رسولوں کو بھی گزرنا پڑتا ہے اور ان پر ایمان لانے والوں کو بھی۔ اگر ان طریقوں کو کسی کے لیے بدلنا ہوتا تو یقینا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے بدلا جاتا کیونکہ آپ سید الرسل اور اس کائنات کے گل سر سبد ہیں لیکن آپ ہی سے فرمایا جارہا ہے کہ اللہ کی یہ سنت کبھی نہیں بدلتی اور پھر مثال دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ پہلے رسولوں کی سرگزشتیں تو آپ کے پاس آچکیں۔ ان میں سے ایک ایک سرگزشت آپ کو یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ دین کی دعوت دینے والوں کے ساتھ کیا گزرتی ہے اور بالآخر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کامیاب وکامران فرماتا ہے اور کافروں کو تباہ کردیتا ہے۔ کتنی قومیں ہیں۔ جن کے کھنڈرات سے مشرکین مکہ ہمیشہ گزرتے تھے انھیں ان کی طرف اشارہ کرکے بتایا جارہا ہے کہ ان معذب قوموں کے انجام پر غور کرو کہ یہ کیسی عظیم قومیں تھیں لیکن جب انھوں نے رسولوں کی دعوت ماننے سے انکار کردیا اور اپنے کفر پر قائم رہنے پر اصرار کیا تو بالآخر ان کا انجام کیا ہوا۔ قوم ثمود کو دیکھو ' قوم عاد کو دیکھو ' اہل مدین کو دیکھو ' قوم لوط کو دیکھو ان میں سے ایک ایک کا انجام عبرت حاصل کرنے کے لیے کافی ہے اس لیے تم ان سے عبرت حاصل کرو۔

(روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

اس آیت میں ہمارے لیے سبق یہ ہے کہ تبلیغ حق کے راستہ میں مشکلات آتی ہیں جیسا کہ انبیائے کرام (علیہم السلام) کو بھی آئیں مگر جو ان مشکلات پر صبر کرتے ہیں اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے مشن پر رواں دواں رہتے ہیں وہ ایک دن اللہ تعالیٰ کی مدد کو پا لیتے ہیں۔

(امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

آیت مبارکہ :

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ○35

لغۃ القرآن: [وَاِنْ : اور اگر][كَانَ : ہو][كَبُرَ : مشکل][عَلَيْكَ : آپ پر][اِعْرَاضُهُمْ : ان کا اعراض کرنا][فَاِنِ : پھر اگر][اسْتَطَعْتَ : آپ استطاعت رکھتے ہیں][اَنْ : یہ کہ][تَبْتَغِيَ : آپ تلاش کریں][نَفَقًا : کوئی سرنگ][فِي الْاَرْضِ : میں زمین][اَوْ سُلَّمًا : یا سیڑھی][فِي السَّمَآءِ : میں آسمان][فَتَاْتِيَهُمْ : آپ لائیں انکے پاس][بِاٰيَةٍ :

کوئی نشانی][وَلَوْ : اور اگر][شَاۗءَ اللّٰهُ : چاہے اللہ][لَجَمَعَهُمْ : البتہ جمع کرے انکو][عَلَي : پر][الْهُدٰي : ہدایت][فَلَا : پھر نہ][تَكُوْنَنَّ : آپ ہوں][مِنَ : سے][الْجٰهِلِيْنَ : نادان (جمع)]

ترجمہ : اور اگر آپ پر ان کی روگردانی شاق گزر رہی ہے (اور آپ بہر صورت ان کے ایمان لانے کے خواہش مند ہیں) تو اگر آپ سے (یہ) ہوسکے کہ زمین میں (اترنے والی) کوئی سرنگ یا آسمان میں (چڑھنے والی) کوئی سیڑھی تلاش کرلیں پھر (انہیں دکھانے کے لیے) ان کے پاس کوئی (خاص) نشانی لے آئیں (وہ تب بھی ایمان نہیں لائیں گے) ، اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو ہدایت پر ضرور جمع فرما دیتا پس آپ (اپنی رحمت و شفقت کے بے پایاں جوش کے باعث ان کی بدبختی سے) بے خبر نہ ہوجائیں

تشریح :

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بہت خواہش تھی کہ سب لوگ مسلمان ہوجائیں، لہٰذا جب کفار لایعنی قسم کے معجزات کا مطالبہ کرتے اور دعوت حق سے روگردانی کرتے تو ان کی روگردانی حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر گراں گزرتی اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پیارے نبی ! اگر آپ زمین کی تہ میں سرنگ کھود کر یا آسمان کی بلندیوں میں سیڑھی لگا کر ان کے فرمائشی معجزات ظاہر کرسکیں تو بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ وہ پہلے کئی معجزات (جیسے شق قمر، درختوں اور پتھروں کی گواہی وغیرہ) دیکھ چکے ہیں اور صرف تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے انکار کرتے ہیں اور تعصب اور ہٹ دھرمی لاعلاج بیماریاں ہیں۔ جس شخص کو یہ لگ جائیں اسے کسی عقلی یا علمی دلیل سے رام نہیں کیا جاسکتا۔ نیز اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اگر وہ چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کردیتا اور کوئی بھی کافر نہ ہوتا مگر اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ کسی کو مجبور نہ کیا جائے تاکہ لوگوں کی آزمائش ہوجائے کہ کون اپنے اختیار سے حق کو قبول کرتا ہے اور کون جان بوجھ کر اس سے روگردانی کرتا ہے، تاہم جو ہدایت قبول نہیں کرتا آپ کو اس کے بارے میں غمگین ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسے اپنی نادانی کی سزا ملنی چاہیے، لہٰذا ہر انسان کو عقل سے کام لینا چاہیے اور نادانوں سے دور رہنا چاہیے۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

اس آیت میں دو اہم باتوں کا ذکر ہے۔ ایک تو یہ کہ میرا محبوب ان گم کردہ راہوں کے ہدایت پانے پر اتنا حریص ہے کہ وہ ہر کوشش کے لیے تیار ہے۔ یہاں تک کہ اگر اس کا بس چلے تو جس معجزہ کا وہ مطالبہ کریں وہ پیش کردے۔ خواہ اس کے لیے زمین میں سرنگ لگانی پڑے یا آسمان پر زینہ لگا کر چڑھنا پڑے۔ والمراد بیان حرصه علی اسلام قومه وانه لو استطاع ان یاتی بایة من تحت الارض او من فوق السماء لاتی بها رجاء ایمانهم (نیشاپوری کشاف وغیرہ)

دوسری بات یہ بتائی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا یہ تقاضا نہیں کہ کسی کو اتنا مجبور و مقہور کردیا جائے کہ اسلام کو تسلیم کئے بغیر اس کے لیے کوئی چارہ کار نہ رہے۔ کیونکہ دین صرف چند رسوم کی ادائیگی اور چند کلمات کے تلفظ کا نام بلکہ یہ وہ ہمہ گیر انقلاب ہے جو روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی، قلب اور شعور و احساس کی پرانی دنیا کو زیروزبر کرکے نئی دنیا تعمیر کرتا ہے اور یہ انقلاب فقط اسی وقت رونپذیر ہوسکتا ہے جب کہ کوئی شخص اپنی مرضی سے خوب سوچ سمجھ کر اس نظریہ حیات کو قبول کرے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کو کوئی خاص

دین اختیار کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فرماتے ہیں کہ ہماری قدرت تو اتنی وسیع ہے کہ اگر ہم چاہیں تو سب بوذر (رض) و بلال (رض) بن جائیں لیکن ایسا کیا نہیں جاتا۔

بعض کے نزدیک اس آیت کے مخاطب حضور کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔ لیکن نہی کا مدعی یہ نہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایسا کر رہے تھے اور آپ کو منع کر دیا گیا۔ بلکہ کسی چیز سے اجتناب اور پرہیز کی تاکید کے لیے یہ اسلوب کلام اختیار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ نظام الدین نیشاپوری رقم طراز ہیں۔ فھذا النھی لایقتضی اقدامہ علی مثل ھذہ الحالۃ لکنہ یفید التغلیظ (نیشاپوری) اور بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہاں خطاب امت کے ہر فرد کو ہے اور علامہ ابو حیان نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ فرماتے ہیں :۔ والذی اختارہ ان ھذا الخطاب لیس للرسول فانما ذلك للسامع فالخطاب والنھی فی فلا تکونن للسامع دون الرسول (بحر محیط) یعنی میرے نزدیک پسندیدہ قول یہ ہے کہ یہاں خطاب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نہیں بلکہ ہر سننے والا مخاطب ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

شان نزول

بعض آثار میں ہے کہ حارث بن عامر بن نوفل بن عبد مناف قریش کی ایک جماعت کے ساتھ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس گیا اور کہا اے محمد ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے پاس اللہ کے پاس سے کوئی نشانی لائیے جیسا کہ انبیاء سابقین (علیہم السلام) نشانیاں لاتے تھے۔ پھر ہم آپ کی تصدیق کریں گے ' اللہ تعالیٰ نے ان کی مطلوبہ نشانیاں عطا فرمانے سے انکار فرمایا۔ تو انھوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے منہ پھیر لیا ' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ان کا اعراض کرنا بہت دشوار ہوا ' کیونکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی قوم کے ایمان لانے پر بہت حریص تھے ' اور وہ جب بھی کسی نشانی کا مطالبہ کرتے تو ان کے ایمان لانے کی طمع میں آپ کی یہ شدید خواہش ہوتی کہ وہ نشانی (معجزہ) نازل کر دی جائے ' اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی المعانی ج ۷ ص ' ۱۳۸ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی ' بیروت)

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دعوی نبوت کے صدق پر بطور برھان اور معجزہ قرآن مجید نازل فرمایا اور یہ چیلنج کیا کہ اس میں ردوبدل ہو سکتا ہے ' نہ اس کی کوئی نظیر لا سکتا ہے اور جب تمام دنیا اس چیلنج سے عاجز ہو گئی اور قرآن مجید کا معجزہ ہونا خوب ظاہر ہو گیا اور کفار کے لیے کسی عذر کی کوئی گنجائش نہیں رہی ' تو وہ لوگوں کو مغالطہ دینے کے لیے طرح طرح کی نشانیاں طلب کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ کہلوایا کہ آپ کہئے کہ میں صرف بشر (کامل) اور رسول ہوں۔ یعنی میرا کام اللہ کا پیغام پہنچا دینا ہے۔ وہ میں نے پہنچا دیا اور میری نبوت پر کسی شخص کے اطمینان اور یقین کے لیے جس قدر معجزات اور نشانیاں ضروری ہو سکتی تھیں ' وہ سب میرے رب نے ظاہر فرما دی ہیں۔ اب یہ کافر حیل و حجت اور ہٹ دھرمی کے لیے عجیب و غریب معجزات طلب کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے مطلوبہ معجزات اس لیے عطا نہیں فرمائے کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسی نشانی نہیں نازل فرماتا جس کے بعد عقل کی آزمائش کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جب کافروں کی پوری قوم کسی معجزہ کی طلب پر اصرار کرے اور اس معجزہ کے ظہور کے بعد بھی

ایمان نہ لائے تو اللہ تعالیٰ اس قوم پر عذاب نازل فرماتا ہے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمادیا تھا کہ اب ان پر عذاب نازل نہیں ہوگا' چنانچہ فرمایا:

(آیت) "وما کان اللہ لیعذبھم وانت فیھم "۔ (الانفال: ۳۳)

ترجمہ: اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ ان کو عذاب دے درآنحالیکہ آپ ان میں موجود ہیں۔

معجزہ نبی کے اختیار میں ہے یا نہیں؟

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے مقابلہ میں کسی نشان اور معجزہ کو ظاہر کرنا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اختیار میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو وہ کسی نشانی اور معجزہ کو ظاہر فردیتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی کوشش سے کسی معجزہ کو ظاہر نہیں کرسکتے اور یہ بالکل برحق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قدرت دی ہے اور اختیار عطا فرمایا ہے' لیکن اس قدرت اور اختیار کا یہ معنی نہیں ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں قادر و مختار ہیں' حتی کہ جس کام کو اللہ نہ کرنا چاہے آپ اس کو کرسکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں نہ یہ کہنا مطلقا درست ہے کہ کوئی معجزہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اختیار میں نہیں ہے اور نہ یہ کہنا درست ہے کہ تمام معجزات نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اختیار میں ہیں۔ قرآن مجید نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا معجزہ ہے' لیکن اس کا نزول آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے قرآن مجید کی آیات نازل فرماتا ہے۔ اسی غیب کی خبریں دینا آپ کا معجزہ ہے' لیکن یہ آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو غیب پر مطلع فرماتا ہے تو آپ غیب کی خبریں دیتے ہیں اور بعض معجزات آپ کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام غزالی سے نقل کیا ہے کہ بعض خصائص کی وجہ سے نبی عام انسانوں سے ممتاز ہوتا ہے اور ان خصائص میں سے یہ ہے کہ جس طرح عام انسانوں کے اختیار میں افعال عادیہ ہوتے ہیں' اسی طرح نبی کے اختیار میں افعال غیر عادیہ (معجزات و تصرفات) ہوتے ہیں۔ (فتح الباری' ج ۱۲' ص ۶۷' طبع لاہور احیاء العلوم ج ۵' ص ۵۳' طبع بیروت)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے لعاب دہن سے کئی بیماروں کو شفا عطا فرمائی۔ (الشفاء' ج ۱' ص ۲۱۴۔ ۲۱۲) آپ نے پانی کے برتن میں اپنا ہاتھ رکھا تو آپ کی انگلیوں سے فوارے کی طرح پانی جاری ہوگیا۔ (صحیح البخاری' ج ۱' رقم الحدیث ۱۶۹) معرکہ بدر میں جب جنگ کی شدت ہوئی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کنکریوں کی ایک مٹھی بھر کر کفار کی طرف پھینکی اور تین مرتبہ شاھت الوجوہ' فرمایا۔ اللہ کی قدرت سے کنکریوں کے ریزے ہر کافر کی آنکھ میں پہنچے اور وہ سب آنکھیں ملنے لگے۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی المعانی' ج ۹' ص ۱۸۵) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ملک الموت کے ایک تھپڑ مارا اور ان کی آنکھ نکل گئی۔ (صحیح البخاری' ج ۲' رقم ۱۳۳۹) (تفسیر تبیان القرآن۔ غلام رسول سعیدی)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک شخص کے متعلق فرمایا ابوخیثمہ ہوجا وہ شخص جو کوئی بھی تھا' وہ ابوخیثمہ ہوگیا۔ (صحیح مسلم التوبہ' ۵۳' (۲۶۹) ۲۸۸۳) اس قسم کے معجزات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان معجزات کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قدرت اور اختیار میں دے دیا تھا۔" انہیں تصرفات بھی کہا جاتا ہے۔ تصرف اور معجزہ میں فرق ہے۔ تصرف روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقیانی

توجہ وارتکاز سے تاثیر واثر پیدا کرنا یہ غیر نبی میں بھی ہو سکتا ہے۔ جبکہ معجزہ **معجزہ** "کا مطلب عاجز کر دینا یعنی مجبور کر دینا سے ہے، عقل کو حیران کر دینا، کسی کام کی کوئی سائنسی توجیہ سمجھ میں نہ آنا، اسباب کے بغیر کسی کام کا ہو جانا، وغیرہ معجزہ کہلاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں "خرق عادت" کام کو معجزہ کہتے ہیں۔ بعض خلاف عادت باتیں اللہ پاک اپنے رسولوں اور نبیوں کے ہاتھ سے ظاہر کرا دیتا ہے، جن کے کرنے سے دنیا کے لوگ عاجز ہوتے ہیں، تاکہ لوگ ان باتوں کو دیکھ کر اس نبی کی نبوت کو سمجھ لیں، نبیوں اور رسولوں کی ایسی خلاف عادت باتوں کو معجزہ کہتے ہیں"

اس آیت سے بعض لوگوں نے استدلال کیا کہ معجزہ نبی کے اختیار میں نہیں ہوتا، بس جب اللہ چاہتا ہے تو نبی کے ہاتھ پہ معجزہ یوں ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس میں نبی کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ نبی کا بس یہ اختیار ہوتا ہے کہ اللہ سے دعا کرے کہ وہ معجزہ ظاہر کرے۔ دیکھو یہ آیت بتا رہی ہے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کفار کو کوئی معجزہ دکھا کر ایمان میں لانا چاہتے تھے مگر اللہ ایسا نہیں چاہتا تھا، اس لیے اس نے آپ سے فرمایا کہ اگر آپ آسمان پہ سیڑھی لگا کر یا زمین میں سرنگ کرکے کوئی معجزہ لانا چاہتے ہیں تو لے آئیں۔ معلوم ہوا کہ نبی کے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔

مگر یہ استدلال بالکل غلط ہے۔ ہاں اس آیت سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر اللہ نہ چاہے تو اس کا نبی اس کی مرضی اور حکم کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا، مگر یہ کہنا غلط ہے کہ نبی کے اختیار کے بغیر اس سے معجزہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ دیکھیں عیسیٰ (علیہ السلام) کہتے ہیں: **وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ** "میں مادر زاد اندھوں اور برص زدہ لوگوں کو درست کر دیتا ہوں اور اللہ کے حکم سے مردے زندہ کر دیتا ہوں۔" (آل عمران۔ 49) یہ دعویٰ وہی شخص کر سکتا ہے جسے ان چیزوں کے اظہار کی ہمہ وقت قدرت واختیار ہو۔ جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی عظمت یہ ہے تو محبوب رب العالمین سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عظمت کا کیا کہنا۔

اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سیرت مبارکہ میں یہ ملتا ہے کہ کسی شخص نے آپ سے کوئی نشانی مانگی آپ نے فوراً فرمایا: مالذی ترید؟ بتاؤ تم کیا نشانی چاہتے ہو؟ اس نے کہا: **ادع تلك الشجرة** اس درخت کو اپنے پاس بلائیں۔ آپ نے فرمایا: **اذهب فادعها**، جاؤ اس درخت کو بلا لاؤ، جب اس طرف سے کہا گیا کہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم ہی بلاتے ہیں تو فورا درخت زمین سے باہر نکلا اور دربار رسالت میں حاضر ہو گیا (دلائل النبوہ لابی نعیم جلد اول صفحہ 205 فصل 19۔ مجمع الزوائد بروایۃ بزار جلد 10 صفحہ 9)

اس حدیث میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمانا: **مالذی تریں**؛ تم کیا نشانی دیکھنا چاہتے ہو؟ بتاتا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اللہ رب العزت نے اختیار دیا ہے کہ جو نشانی آپ سے مانگی جائے آپ دکھا دیں۔ ایسے واقعات حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سیرت میں جا بجا ملتے ہیں۔ جو آپ کے اختیار و قدرت اظہار معجزہ پر دلالت کرتے ہیں۔ تاہم جہاں اللہ رب العزت کی مرضی معجزہ نہ دکھانے کی ہو وہاں آپ اس کی مرضی کے پابند ہیں، آپ اس کے بندے اور مطیع ہیں۔

بلکہ نبی کی شان یہ ہے کہ وہ مرضی خدا کے بغیر بولتا ہی نہیں وہ تو حکم خدا سے بولتا ہے **وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى. اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى**۔ (النجم: 3، 4) (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

جبراً ہدایت نہ دینے کی حکمت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا یعنی اگر اللہ تعالیٰ ان کو جبراً مومن بنانا چاہتا تو ان سب کو مومن بنا دیتا 'لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے اور اس کے طریقہ کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ ہے کہ اس نے دنیا میں خیر اور شر دونوں چیزوں کو پیدا کر دیا ہے اور شر کی ترغیب کے لیے شیطان کو پیدا کیا اور خیر کی تحریص کے لیے انبیاء (علیہم السلام) کو پیدا کیا اور انسان کے اندر بھی خیر اور شر کے دو محرک پیدا کیے۔ پھر انسان کو عقل سلیم عطا کی 'اب وہ خارجی اور داخلی تحریکات میں سے جس سے بھی متاثر ہو کر جو راستہ بھی اختیار کرتا ہے 'خیر اور شر میں سے جس راہ پر چلنے کا فیصلہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس میں وہی فصل پیدا کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ از خود اس پر کوئی راستہ مسلط نہیں کرتا اور چونکہ خیر یا شر بندہ میں اسی کے اختیار میں پیدا کی جاتی ہے 'اس لیے اس اختیار کی وجہ سے اس کو جزاء یا سزا دی جاتی ہے۔

اس آیت میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ بتایا گیا ہے کہ کفار مکہ کو ہدایت پر لانے کے لیے تمام دلائل کھول کھول کر بیان کیے جا چکے ہیں اور بہت سے معجزات اور نشانیاں دی جا چکی ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنی گمراہی پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ اب ان کو ہدایت پر لانے کی صرف یہی صورت رہ گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان میں جبراً ہدایت پیدا کر دے 'لیکن یہ اللہ عزوجل کا طریقہ نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا کرنا ہوتا تو اللہ تعالیٰ از خود تمام انسانوں کو ہدایت یافتہ بنا دیتا۔ پھر کسی نبی اور رسول کو بھیجنے کی ضرورت ہوتی نہ کتاب اور صحائف نازل کرنے کی اور نہ معجزات اور نشانیاں پیش کرنے کی حاجت ہوتی اور رشد و ہدایت کا یہ حکمت پر مبنی نظام اور مربوط سلسلہ عبث اور بیکار ہو جاتا۔

(تفسیر تبیان القرآن۔ غلام رسول سعیدی)

تو اے محبوب! اپنے امتیوں کی ذہنی تربیت فرماؤ اور ان کو سمجھا دو، کہ وہ کسی کے ایمان واسلام کیلئے کتنا بھی حریص کیوں نہ ہوں، مگر وہ آپ کی سنت کے مطابق صرف تبلیغ پر مامور ہیں، اس کے لیے انھیں کوئی دوسری مشقت جھیلنے کی ضرورت نہیں اور اس سے کچھ فائدہ بھی نہیں، (حالانکہ) یعنی جب صورت حال یہ ہو کہ (اگر اللہ تعالیٰ) (چاہتا، تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا)، لیکن وہ انھیں ہدایت دینا ہی نہیں چاہتا، اس لیے کہ اپنے اختیار ہدایت سے روگرداں ہوگئے ہیں، باوجودیکہ انھیں ہدایت پانے کی قدرت ہے اور بہت بڑے دلائل براہین کا اپنی کھلی آنکھوں سے مشاہدہ و معائنہ بھی کر رہے ہیں، لیکن اپنے دل میں ایمان قبول کرنے کا خیال بھی نہیں لاتے۔

تو اے محبوب! آپ ان کی ہدایت کیلئے ایسی جدوجہد نہ فرمائیں، جس کی آپ کو تکلیف نہیں دی گئی ہے اور اپنے ماننے والوں سے بھی فرما دیجئے کہ تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری مستقیم دکھا دینے ہی کے وہ مکلّف ہیں، منزل تک پہنچا دینا یہ ان کی ذمہ داری نہیں۔ (تو) اے دامن محبوب سے وابستہ رہنے والو! (تم جاہلوں کے ساتھ مت رہو) اور جاہلانہ فکر و عمل اپنے کو بچاتے رہو اور اچھی طرح سے یاد رکھو کہ کفر و ایمان میرے خذلان اور توفیق سے متعلق ہے۔۔ (تفسیر اشرفی۔ علامہ محمد مدنی اشرفی جیلانی)

فوائد

ا۔ حضور چاہتے تھے کہ سارے ہی کافر ایمان لے آویں۔ اس پر یہ آیت آئی۔ آپ کی یہ خواہش اس بنا پر نہ تھی کہ آپ کو ان کے کفر پر مرنے کی خبر نہ تھی بلکہ رحمت عالم کی رحمت کا تقاضا بے اختیاری ہوتا ہے جیسے مہربان طبیب آخر دم تک علاج کرتا ہے۔ اگرچہ جانتا ہے کہ یہ مریض اب بچے گا نہیں مگر اس کی رحمت و کرم کا یہ تقاضا ہے۔ ایسے ہی یہاں ہے۔ یہ آیت تسکین کی ہے۔

۲: یہ عبارت انتہائی محبوبیت بتا رہی ہے۔ جیسے کوئی استاد نہایت محنتی شاگرد پر اس لیے ناراض ہو کہ وہ محنت زیادہ کیوں کرتا ہے۔ یہ ناراضگی، شاگرد کی سعادت مندی اور استاد کی انتہائی مہربانی کی دلیل ہو گی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ حضور سے کوئی خطا سرزد نہ ہوئی تھی۔ ہدایت کی خواہش اچھی ہے۔

۳: اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ سب ایمان لے آویں۔ مگر ارادہ یہ نہیں، ارادہ اور محبت میں فرق ہے۔ حضور کو بھی پسند یہی ہے کہ سب مومن ہو جاویں اور کوشش بھی اسی کی ہے۔ مگر ارادہ نہیں۔ رب فرماتا ہے انک لا تھدی من احببت و لکن اللہ یھدی من یشا۔ پہلے احببت فرمایا اور بعد میں من یشاء ارشاد ہوا۔

۴: یہ خطاب اور توبیخ حضور کے لیے نہیں ہو سکتی کیونکہ حضور مخلوق کی ہدایت پر بہت حریص تھے اور رب نے دوسرے مقام پر اس حرص کی تعریف فرمائی۔ حریص علیکم یہ حرص تو بہت محمود ہے اور عتاب محمود نہیں ہوا کرتا للذا آیت کا مقصد یہ ہے کہ اے مسلمان! اللہ پر اعتراض نہ کر کہ اس نے سب کو ہدایت کیوں نہ دے دی۔

آیت مبارکہ:

اِنَّمَا يَسۡتَجِيۡبُ الَّذِيۡنَ يَسۡمَعُوۡنَ ؕ وَالۡمَوۡتٰى يَبۡعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيۡهِ يُرۡجَعُوۡنَ 36۝

لغۃ القرآن: [اِنَّمَا : بیشک جو][یَسْتَجِیْبُ : قبول کرتے ہیں][الَّذِیْنَ : وہ لوگ][یَسْمَعُوْنَ : وہ سنتے ہیں][وَالْمَوْتٰی : اور مردے][یَبْعَثُهُمُ : اٹھائے گا انکو][اللّٰهُ : اللہ][ثُمَّ : پھر][اِلَیْهِ : اسکی طرف][یُرْجَعُوْنَ : وہ لوٹائے جائیں گے]

ترجمہ: بات یہ ہے کہ (دعوت حق) صرف وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو (اسے سچے دل سے) سنتے ہیں، اور مردوں (یعنی حق کے منکروں) کو اللہ (حالت کفر میں ہی قبروں سے) اٹھائے گا پھر وہ اسی (رب) کی طرف (جس کا انکار کرتے تھے) لوٹائے جائیں گے

تشریح:

یہ آیت اس قانون فطرت کی تشریح ہے جس کی طرف پچھلی آیت میں اشارہ کیا گیا تھا یعنی تمام لوگوں کو زبردستی منوانا مقصود نہیں ہے اگر ایسا کرنا ہوتا تو انسان کی طبیعت یہی الگ الگ نہ بنائی جاتی بلکہ سب کو اس ڈھنگ سے بنایا جاتا کہ سیدھا راستہ کے سوا اور کسی راستہ پر چل ہی نہ سکیں کسی کو اختیار دیا ہی نہ جاتا۔ ظاہر ہے کہ جس کا دل دنیا کی خواہشوں کی طرف جھک جاتا ہے سنتا ہی نہیں وہ اپنی غرض کا بندہ ہے اسی کے لئے جیتا ہے۔ ایسے مردہ لوگوں کے کان قیامت ہی کے دن کھلیں گے مگر اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ فائدہ تو اس میں ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو اللہ کا پیغام دنیا میں سنایا ہے اس کو اس دنیا ہی میں مان لیں اگر دنیا میں نہ مانا تو مرنے کے بعد تو انھیں زندہ کرکے اللہ کے سامنے لا کھڑا کیا ہی جائے گا اس دن پر ہر چیز واضح ہو جائے گی لیکن اس وقت کا ماننا کچھ کام نہ آئے گا دنیا میں جو نافرمانیاں کیں تھیں ان کی سزا یقیناً بھگتنی پڑے گی۔ اس کو خیال میں رکھ کر آیت کے مضمون کی طرف توجہ کیجئے۔ ارشاد ہے کہ سب لوگوں سے یہ امید نہ رکھو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے کیونکہ مانیں گے فقط وہی لوگ جن کے کان خواہشوں نے بند نہیں کردیے ہیں جن لوگوں نے حق بات سننے سے کان بند کر لیے آنکھیں موند لیں وہ اس زندگی میں بالکل گئے گزرے ہوئے اس چیز کے سوا جس میں ان کا دل لگا ہوا ہے اور باتوں کی طرف سے گویا وہ مر گئے اور یہ اپنی ناپاک دنیا کی خواہشیں دل میں لے کر اس دنیا سے رخصت ہوں گے اور پھر دوبارہ زندہ کرکے اٹھائے جائیں گے اور اللہ کے آگے لا کھڑے کئے جائیں گے اس وقت ان کے کان خوب اچھی طرح کھل جائیں گے۔ ان آیتوں میں کافروں کے اس بہانے کا جواب ہے کہ رسول کے ساتھ ایسی صاف صاف نشانیاں ہونی چاہیے کہ کسی سے ان کا انکار بن نہ آئے۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان لانا ہے تو انہی نشانیوں کو دیکھ کر لاؤ جو تمہارے سامنے موجود ہیں۔ ان میں سے قرآن مجید کی آیتیں سب سے روشن اور صاف نشانیاں ہیں اور انھیں میں ان تمام آیتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو تمام عالم میں پھیلی ہوئی ہیں اس سے زیادہ صاف آیتیں چاہتے ہو تو ان کے بعد ایمان لازمی ہو جائے گا اور دنیا دار الامتحان نہ رہے گی۔ قرآن بورڈ آسٹریلیا)

پیارے نبی! جو لوگ آپ کی بات غور سے سنتے ہیں وہ تو ہدایت قبول کر لیتے ہیں لیکن جو روگردانی کرتے ہیں آپ ان کے بارے میں غمگین نہ ہوں وہ دراصل مردوں کی طرح ہیں۔ انھوں نے اپنی غور و فکر کی صلاحیتیں مردہ کر دی ہیں اور انھیں اپنی اس کوتاہی کا احساس اس وقت ہوگا جب انھیں قبروں سے اٹھا کر اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا، مگر اس وقت کا احساس بے سود ہوگا کاش ہم آج پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیاری باتوں پر میں غور و فکر کریں۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

(م و ت) الموت یہ حیات کی ضد ہے

لہٰذا حیات کی طرح موت کی بھی کئی قسمیں ہیں

۔اول قوت نامیہ

(جو کہ انسان حیوانات اور نباتات (سب میں پائی جاتی ہے) کے زوال کو موت کہتے ہیں جیسے فرمایا: ۔يُحۡيِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا [الروم/19] زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔وَأَحْيَيْنا بِهِ بَلْدَةً مَيْتاً [ق/11] اور اس پانی سے ہم نے شہر مردہ یعنی زمین افتادہ کو زندہ کیا۔

دوم حس و شعور کے زائل ہو جانے کو موت کہتے ہیں

۔ چنانچہ فرمایا۔ يالَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هذا [مریم/23] کاش میں اس سے پہلے مر چکتی۔أَإِذا ما مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا [مریم/66] کہ جب میں مر جاؤں گا تو کیا زندہ کرکے نکالا جاؤں گا۔

سوم۔ قوت عاقلہ کا زائل ہو جانا اور اسی کا نام جہالت ہے

چنانچہ فرمایا: ۔أَوَمَنْ كانَ مَيْتاً فَأَحْيَيْناهُ [الأنعام/122] بھلا جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا۔اور آیت کریمہ: ۔ إِنَّكَ لا تُسْمِعُ الْمَوْتى [النمل/80] کچھ شک نہیں کہ تم مردوں کو بات نہیں سنا سکتے۔

چہارم۔ غم جو زندگی کے چشمہ صافی کو مکدر کر دیتا ہے

چنانچہ آیت کریمہ: ۔وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكانٍ وَما هُوَ بِمَيِّتٍ [إبراهيم/17] اور ہر طرف سے اسے موت آرہی ہو گی۔ مگر وہ مرنے میں نہیں آئے گا۔ میں موت سے یہی مینو مراد ہیں۔

پنجم۔ موت بمعنی نیند ہوتا ہے

اسی لیے کسی نے کہا ہے کہ النوم موت خفیف والموت نوم ثقیل کہ نیند کا نام ہے اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو توفی سے تعبیر فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہے: ۔وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ بِاللَّيْلِ [الأنعام/60] اور وہی تو ہے جو رات کو تمہاری روح میں قبض کر لیتا ہے

چھٹے زوال قوت حیوانیہ کے معنی میں کل نفس ذائقۃ الموت۔ وابانۃ عن الجسد۔

ساتویں بمعنی تحلل انك میت والتنبیه وانهم میتون۔ ابانة الروح عن الجسد۔ ساتویں بمعنی سیل سائل۔سقنه لبلد میت۔ بلدة میتاً

آٹھویں ازاله روح بلا تزکیه۔ میته حرمت علیکم المیتة

نویں موت بمعنی جنون۔ موت علم و عقل۔

دسویں موت قلب۔ (المفردات)

کفار کو مردہ فرمانے کی توجیہ

جو لوگ آپ کی دعوت اور تبلیغ سے منہ موڑ رہے ہیں اور اللہ کی توحید اور آپ کی نبوت پر ایمان نہیں لا رہے 'ان کے ایمان نہ لانے اور عراض کرنے سے آپ دل برداشتہ اور مغموم نہ ہوں 'کیونکہ آپ کے پیغام کو وہی لوگ توجہ سے سنیں گے جن کے کانوں کو اللہ عزوجل نے غور سے سننے کے لیے کھول دیا ہے اور ان کے لیے آپ کی اتباع کو آسان کر دیا ہے اور وہ لوگ کے پیغام کو توجہ سے نہیں سنیں گے 'جن کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان کے کانوں پر مہر لگادی ہے۔ سو جب آپ انھیں اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف بلائیں گے تو ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا 'جس طرح

مویشی اپنے چرواہوں کی آوازوں کو سنتے ہیں اور ان کے مفہوم کو نہیں سمجھتے 'سو یہی ان کا حال ہے جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

(آیت) "ومثل الذین کفروا کمثل الذی ینعق بما لا یسمع الا دعآء وندآء صم بکم عمی فھم لا یعقلون"۔ (البقرہ: ۱۷۱)

ترجمہ: اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کی مثال اس طرح ہے کہ کوئی شخص ایسے کو پکارے جو چیخ و پکار کے سوا کچھ نہ سنے 'بہرے گونگے 'اندھے ہیں 'سو وہ کچھ نہیں سمجھتے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو موتی (مردہ) فرمایا ہے 'کیونکہ جس طرح مردے کوئی آواز سنتے ہیں نہ کسی پکار کا معنی سمجھتے ہیں 'اسی طرح یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی توحید کے دلائل میں غور و فکر نہیں کرتے اور نہ اس کی نشانیوں سے عبرت اور نصیحت حاصل کرتے ہیں 'تا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تکذیب اور مخالفت سے باز آجائیں۔ قرآن مجید کی اور آیتوں میں بھی ان کو مردہ فرمایا ہے:

(آیت) "انك لا تسمع الموتی ولا تسمع الصم الدعآء اذا ولوا مدبرین، وما انت بھدی العمی عن ضللتھم ان تسمع الا من یؤمن بایتنا فھم مسلمون، (النمل: ۸۱۔۸۰)

ترجمہ: بیشک آپ مردوں کو نہیں سناتے اور نہ بہروں کو سناتے ہیں 'جب وہ پیٹھ پھیر کر جارہے ہوں اور نہ آپ اندھوں کو ان کی گمراہی سے راہ راست پر لانے والے ہیں 'آپ صرف ان ہی کو سناتے ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لانے والے ہیں 'سو وہی مسلمان ہیں۔

(آیت) "ان اللہ یسمع من یشآء وما انت بمسمع من فی القبور"۔ (فاطر: ۲۲)

ترجمہ: بیشک اللہ سناتا ہے جسے چاہے اور آپ قبر والوں کو سنانے والے نہیں ہیں۔

ان کافروں کی آنکھیں تھیں لیکن ان کو اندھا فرمایا 'ان کے کان تھے پھر بھی ان کو بہرہ فرمایا اور ان کی زبان تھی 'اس کے باوجود ان کو گونگا فرمایا اور یہ زندہ تھے 'پھر بھی ان کو مردہ فرمایا۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک آنکھیں اس کی ہیں جو محبت سے آپ کا جلوہ دیکھے 'کان اس کے ہیں جو عقیدت سے آپ کی باتیں سنے 'زبان اس کی ہے جو آپ کا کلمہ پڑھے اور زندہ وہ ہے جو آپ کی غلامی میں زندہ رہے۔ جو آپ کی محبت سے جہاد میں مارا جائے 'جو آپ کی خاطر سر کٹائے تو اللہ کے نزدیک وہ مردہ نہیں ہے 'جو آپ کی غلامی میں رہے وہ زمین کے اوپر ہو 'پھر بھی زندہ ہے اور زمین کے نیچے ہو پھر بھی زندہ ہے اور جو آپ سے منحرف ہو اور آپ کا منکر ہو وہ زمین کے اوپر ہو 'پھر بھی مردہ ہے اور زمین کے نیچے ہو پھر بھی مردہ ہے۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

امام طبریؒ فرماتے ہیں مجھے محمد بن عمرو نے مجاہد سے (إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ) کا مطلب یہ ذکر کیا کہ اس سے مراد مومن ہیں جو نصیحت پکڑتے ہیں۔ (الموتی) سے مراد کفار ہیں جب ان کو مردوں کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

مجھے مثنی نے مجاہد سے اسی طرح کی بات نقل کی ہے۔

ہمیں بشر نے قتادہ سے (إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ) کا مطلب یہ بیان کیا کہ یہ مومن کی حالت ذکر کی گئی ہے جو کتاب اللہ کو سن کر اس سے فائدہ اٹھانا اور اسے سمجھتا اور اختیار کرتا ہے وہ لوگ جو ہماری آیات کو جھٹلانے والے ہیں وہ گونگے بہرے ہیں کافر کی مثال بہرے گونگے سے دی ہے جو ہدایت کو نہ دیکھتا ہے اور نہ اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

ہمیں ابن وکیع نے الحسن سے نقل کیا (إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ) مراد مومن اور الموتی سے مراد کفار ہیں۔ (طبری)

المختصر جب کوئی رسول دعوت حق لے کر لوگوں کے پاس آتا ہے تو اس دعوت کے مقابلے میں لوگ دو گروہ بن جاتے ہیں۔ ایک فریق تو زندہ اور بیدار لوگوں کا ہوتا ہے 'جن کے اندر قبولیت حق کی استعداد ہوتی ہے 'یہ استعداد کام کر رہی ہوتی ہے اور ان لوگوں کے دل کے دریچے کھلے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ ہدایت قبول کر لیتے ہیں اس لیے کہ ہدایت اور سچائی کے اندر ذاتی قوت 'نکھار اور فطرت کے ساتھ ہم آہنگی ہوتی ہے اور ایسے لوگ اسے پاتے ہی قبول کر لیتے ہیں۔ (آیت) "انما یستجیب الذین یسمعون "۔ (٦ : ٣٦) "یعنی جن لوگوں کی قوت شنوائی کام کر رہی ہوتی ہے وہ حق کو قبول کر لیتے ہیں۔ ایک دوسرا فریق وہ ہوتا ہے جو دراصل مردہ ہوتا ہے۔ اس کی فطرت معطل ہو جاتی ہے۔ وہ نہ سنتا ہے اور نہ قبول کرتا ہے۔ وہ نہ متاثر ہوتا ہے اور نہ ہی لبیک کہتا ہے۔ یہ بات نہیں ہوتی کہ اس سچائی کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہوتی سچائی تو خود دلیل ہوتی ہے "آفتاب آمد ولیل آفتاب 'اور جب بصیرت رکھنے والی فطرت اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو وہ اس کے اندر سچائی دیکھ لیتی ہے۔ فوراوہ آخری فیصلہ کرکے تسلیم کر لیتی ہے۔ دوسری قسم کے لوگوں کے اندر جو کمی ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان کی فطرت مر چکی ہوتی ہے اور ان کی استعداد قبولیت حق جاتی رہتی ہے لہٰذا ان کے اندر محض دعوت سنتے ہی قبولیت حق کی استعداد پیدا نہیں ہوتی۔ ان پر کوئی دلیل کارگر نہیں ہوتی۔ ان کا معاملہ اللہ کی مشیت کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ اگر اللہ چاہے تو ایسے لوگوں کو زندہ کر دیتا ہے اور اگر نہ چاہے تو یہ لوگ زندہ ہوں یا مردہ قیامت تک مردہ رہیں گے۔ اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انھیں اٹھائے گا۔

(آیت) "والموتی یبعثهم الله ثم الیه یرجعون "(٦ : ٣٦) "مردوں کو تو اللہ قبروں ہی سے اٹھائے گا اور وہ اس کی عدالت میں پیش ہوں گے۔ یہ ہے کہانی قبولیت حق اور محرومیت کی۔ اس سے ہدایت وضلالت کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ رسول کے فرائض متعین ہو جاتے ہیں اور تمام امور کا آخری فیصلہ اللہ کے سپرد ہوتا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اس حقیقت کو آشکارا کرنے کے بعد 'اب روئے سخن اہل کفار اور مشرکین کے اس غلط مطالبے کی طرف پھر جاتا ہے جس میں وہ خوارق و معجزات کے مطالبے کرتے تھے۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کا یہ مطالبہ جہالت پر مبنی ہے اور یہ لوگ اس معاملے میں سنت الٰہیہ سے بالکل بے خبر ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب کوئی معجزہ صادر ہوتا ہے تو اس کے بعد نہ ماننے والوں بلکہ ماننے والوں کو بھی ایک عظیم بربادی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ جو ان لوگوں کے مطالبے کو تسلیم نہیں کرتا تو اس لیے نہیں کرتا کہ وہ ان پر رحم کرکے انھیں اس عظیم تباہی سے بچانا چاہتا ہے۔ اس موقعہ پر تمام زندہ مخلوقات کے بارے میں اللہ کی حکیمانہ تدابیر کو بھی بیان کر دیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکیمانہ سنت تمام زندہ مخلوقات تک وسعت پذیر ہے۔ یہاں وہ حکمت بتائی جاتی ہے جو ہدایت وضلالت کے فیصلوں کے پیچھے کام کرتی ہے اور جس میں اللہ تعالیٰ کی بے قید مشیت کام کرتی ہے۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

آیت مبارکہ :

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○37

لغۃ القرآن: [وَقَالُوْا : اور انہوں نے کہا][لَوْلَا : کیوں نہ][نُزِّلَ : نازل کی گئی][عَلَيْهِ : اس پر][اٰيَةٌ: نشانی][مِّنْ رَّبِّهٖ : اسکے رب سے][قُلْ : فرما دیجیے][اِنَّ اللّٰهَ : بیشک اللہ][قَادِرٌ: قادر][عَلٰٓي : پر][اَنْ يُّنَزِّلَ : یہ کہ وہ اتارے][اٰيَةً : کوئی نشانی][وَّلٰكِنَّ : اور لیکن][اَكْثَرَهُمْ : اکثر ان کے][لَا يَعْلَمُوْنَ : نہیں وہ جانتے]

ترجمہ : اور انھوں نے کہا کہ اس (رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اس کے رب کی طرف سے (ہر وقت ساتھ رہنے والی) کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی ؟ فرما دیجئے : بیشک اللہ اس بات پر (بھی) قادر ہے کہ وہ (ایسی) کوئی نشانی اتار دے لیکن ان میں سے اکثر لوگ (اس کی حکمتوں کو) نہیں جانتے

تشریح :

حق کا انکار کرنے کے باوجود کفار کا بار بار نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے معجزات کا مطالبہ کرنا۔

منکرین حق گاہے، گاہے رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے معجزات کا مطالبہ کرتے رہتے تھے لیکن جونہی ان کے پاس کوئی معجزہ آتا تو نہ صرف اس کا انکار کرتے بلکہ الٹا آپ کو جادو گر ہونے کا الزام دیتے۔ قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے تو درجنوں ایسی آیات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کفار نے نہ صرف آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عجیب و غریب معجزات کا مطالبہ کیا بلکہ ایک موقع پر انھوں نے بیت اللہ کا غلاف پکڑ کر یہاں تک اپنے لیے مطالبہ کیا :

(وَإِذۡ قَالُواْ ٱللَّهُمَّ إِن كَانَ هَٰذَا هُوَ ٱلۡحَقَّ مِنۡ عِندِكَ فَأَمۡطِرۡ عَلَيۡنَا حِجَارَةٗ مِّنَ ٱلسَّمَآءِ أَوِ ٱئۡتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٖ) [الأنفال : ۳۲]

"جب انھوں (کافروں) نے کہا: اے اللہ! اگر یہ قرآن واقعی تیری طرف سے ہے اور یہ نبی سچا ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا پھر ہمیں اذیت ناک عذاب میں مبتلا کر دے۔"

جس قوم کی ہٹ دھرمی اور گمراہی کا یہ عالم ہو اسے کیونکر ہدایت نصیب ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس موقع پر فقط یہی جواب دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے مطالبات سے بڑھ کر آیات و معجزات نازل کرنے پر قادر ہے لیکن اس کے باوجود تمہاری اکثریت اس حقیقت کو ماننے اور جاننے کو تیار نہیں ہے۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

کفار کی مطلوبہ نشانیاں نازل نہ کرنے کا سبب

یہ آیت صنادید قریش کے متعلق نازل ہوئی ہے جو عناد اور سر کشی کی بنا پر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کسی معجزہ اور نشانی کا سوال کرتے تھے۔ ورنہ اس سے پہلے بہت سی نشانیاں اور معجزے دیئے جا چکے تھے جو کسی منصف مزاج شخص کے ایمان لانے کے لیے کافی تھے اور جن نشانیوں کا یہ سوال کر رہے تھے 'اللہ تعالیٰ ان کے نازل کرنے پر بھی قادر تھا 'جیسا کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ متعدد نشانیاں نازل فرما چکا تھا ' مثلا ان کے مطالبہ پر چاند کو شق کیا گیا 'لیکن یہ اس کے باوجود ایمان نہیں لائے۔ لہٰذا ان کے مطالبہ کے موافق نشانیاں نازل کرنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا 'کیونکہ ہر نشانی نازل ہونے کے بعد یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔ سو واضح ہوا کہ یہ محض عناد اور ہٹ دھرمی سے نشانیوں کو طلب کرتے ہیں، اور ان کے اکثر لوگ یہ نہیں جانتے کہ اگر ان کے اجتماعی مطالبہ کے موافق کوئی نشانی نازل کر دی جائے اور یہ پھر بھی ایمان نہ لائے تو ان پر ایسا عذاب آئے گا جس سے یہ سب ملیامیٹ ہو جائیں گے 'تو ان کے مطالبہ پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل نہ فرمانا اس حکمت پر مبنی ہے 'ورنہ اللہ تعالیٰ ان کا مطالبہ پورا کرنے سے عاجز نہیں ہے۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

چونکہ سنت الٰہیہ ہے کہ جب کسی قوم نے اپنے نبی سے معجزے کا مطالبہ کیا اور پھر اس کے مطالبے کے مطابق معجزہ عطافرما دیا گیا، پھر بھی اس قوم نے نہیں مانا، تو عذاب الٰہی کا نزول ہوا، جس سے ساری قوم تباہ وبرباد ہو گئی اور مختلف قسم کے عذاب کا شکار ہو گئی۔ خدائے علیم وخبیر کا علم تھا کہ اگر اس قوم پر ہم ان کا مطلوبہ معجزہ عطافرمادیں، جب بھی یہ ماننے والے نہیں اور خدائے تعالیٰ کو اپنے فضل و کرم سے یہ منظور نہ تھا کہ اس کے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد میں اس طرح کا عذاب نازل فرمایا جائے، جو انبیاء سابقین کے عہد کے لوگوں پر نازل فرمائے گئے کہ جن پر عذاب ہوا اور قوم کی تباہ وبرباد ہو گئی۔ اسی لیے رب کریم نے معجزے کا مطالبہ کرنے والوں کے خود اپنے انجام سے بے خبری اور علمی کا اظہار کر کے ان کو سمجھنے اور سوچنے کی مہلت عطافرمادی۔

اس مقام پر یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ بہت بڑا رحیم و کریم ہے، جو جانوروں اور پرندوں پر بھی اپنا معجزہ نازل فرمادینے میں ان کا بھلا ہوتا، تو رب کریم ضرور اسکو نازل کردینے کو اپنے ذمہ کرم میں لے لیتا۔ لیکن وہ بخوبی جانتا ہے ان کا فرمائشی معجزہ نازل نہ فرمانا ہی ان پر بہت بڑا احسان ہے اور یہ بھی رب کریم کا ان پر بہت بڑا فضل ہے۔ چونکہ علم الٰہی میں تھا کہ کسی صورت میں بھی یہ ایمان لانے والے نہیں تھے،

اس لیے ان کی حسب خواہش معجزہ نہ نازل فرما کر ان کو نیست و نابود ہونے سے بچالیا۔۔ المختصر۔۔انسان تو اشرف المخلوقات ہے، رب کریم نے تو جانوروں اور پرندوں تک کی حفاظت اور ان پر احسان فرمانے کو اپنے ذمہ کرم میں رکھ لیا ہے۔

(تفسیر اشرفی۔علامہ محمد مدنی اشرفی جیلانی)

دراصل جس طرح کسی بھی کمزور سلطنت میں خود سر اور بدمعاش قسم کے لوگ سلطنت کو چیلنج کرنے لگتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ ہمارا کمزور حکمران ہماری گرفت نہیں کر سکتا۔ ان کا شاید اللہ کے بارے میں یہی گمان تھا حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ان کو ڈھیل دینا اور پکڑنے میں جلدی نہ کرنا اس کا سبب ہی یہ ہے کہ وہ قادر مطلق ہے 'وہ جب کسی کو پکڑنا چاہتا ہے اسے کوئی مشکل پیش نہیں آتی 'وہ کمزور حکمرانوں کی طرح جرائم پیشہ لوگوں کو پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا۔ مزید فرمایا کہ ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں کہ عذاب نہ آنے کی حکمتیں کیا ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ لوگ ابھی تک عذاب سے بچے ہوئے ہیں اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ کسی قوم پر اس وقت تک عذاب نہیں لاتا جب تک اس پر آخری حد تک اتمام حجت نہیں کرلیتا اور یہ بات پوری طرح کھل نہیں جاتی کہ ان میں کوئی ایسا صالح عنصر باقی نہیں رہا جس سے بھلائی کی امید کی جاسکے اور یہ قوم پوری طرح نیکی اور خیر کی صلاحیتوں سے محروم ہو چکی ہے۔ اہل مکہ کے بارے میں ابھی تک چونکہ یہ وقت نہیں آیا اور دعوت اپنے آخری مراحل کو نہیں پہنچی اس لیے یہ لوگ اللہ کے عذاب سے بچے ہوئے ہیں۔ لیکن بجائے اس کے کہ اس کی دی ہوئی مہلت سے فائدہ اٹھائیں 'غلط تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیلی میں مبتلا ہو کر مزید دلیر ہوتے جارہے ہیں۔ ان نادانوں کو یہ خیال بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ان کو نہ پکڑنا ان کے تمام تر کفر اور طغیان کے باوجود اللہ کی رحمت کا ظہور ہے۔ یہ بھی اس کا قانون ہے کہ بجائے غضب ناک ہونے کے عموماً انسانوں کے ساتھ وہ رحمت کا معاملہ کرتا ہے وہ غضب ناک ہوتا تو انکار کے پہلے ہی مرحلے میں تمام منکروں اور کافروں کو جلا کر راکھ کردیتا لیکن اپنے پیغمبر اور ان کے ایمان لانے والوں کو اذیتوں میں مبتلا دیکھ کر بھی انھیں مہلت پہ مہلت دیئے جارہا ہے کہ شاید یہ اس سے فائدہ اٹھا کر سنبھل جائیں اور اللہ کی رحمت کاملہ کے مستحق بن جائیں۔ رہی یہ بات کہ اللہ کی دی ہوئی یہ مہلت کب ختم ہوتی ہے اور کب اس کی آخری حد آتی ہے 'یوں تو اس کا علم سراسر اللہ کو ہوتا ہے 'لیکن اس کی آخری علامت یہ ہے کہ جب اللہ اپنے رسول کو ہجرت کرنے کا حکم دیتا ہے اور وہ اپنے دعوت کے مرکز کو چھوڑ کر کسی دوسری طرف کا رخ کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مہلت کی آخری حد آگئی 'اس کے بعد اللہ تعالیٰ کافروں کو زیادہ دیر دنیا میں زندہ رہنے کا موقع نہیں دیتا 'اگر ان کی ایک بڑی تعداد سنبھلنے میں جلدی کرے تو باقی لوگ بچ جاتے ہیں ورنہ سب عذاب کا شکار ہوتے ہیں۔ اللہ کا رسول لوگوں میں اس طرح ہوتا ہے جیسے جسم میں روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی 'روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی نکل جائے تو جسم مر جاتا ہے۔ پھر اس کو باقی رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہوتا اسی طرح اللہ کے رسول کے ہجرت کر جانے کے بعد وہ امت چونکہ مردہ ہو جاتی ہے اس لیے اس کو ختم کردیا جاتا ہے چنانچہ آنحضرت سے خطاب کرکے سورۃ انفال میں کہا گیا ہے کہ اے پیغمبر جب تک آپ ان میں موجود ہیں 'اس وقت تک ہم ان کو عذاب دینے والے نہیں اسی طرح جب تک آپ کے ساتھی ان میں اللہ کے سامنے استغفار کرنے کے لیے موجود ہیں اور وہ اللہ کا ذکر کرتے ہیں اس وقت تک بھی اللہ ان پر عذاب نہیں بھیجے گا۔ اندازہ فرمایئے کہ قوم جن سے دشمنی کرتی ہے اور جنھیں اذیتیں دیتی ہے وہی اصل میں ان کے لیے روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھی کی وجہ سے ان کی زندگی کا رشتہ قائم ہے بلکہ انھی کی وجہ سے ان کو رزق ملتا ہے۔ آج بھی اگر یہ امت کسی بڑے عذاب سے بچی ہوئی ہے تو اس کا سبب وہ اللہ والے اور وہ دین کی دعوت پیش کرنے والے اور وہ دین کے پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے سکھانے والے ہیں 'جو تکلیفیں اور دکھ اٹھا کر بھی اپنی ذمہ

داریوں کو ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ قوم بدنصیبی سے انھیں ذلیل کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑتی وہ بدنصیب امتوں کی طرح ان کو اپنا دشمن خیال کرتی ہے۔ لیکن حقیقت میں وہی ان کی زندگی 'ان کی سرفرازی اور ان کی بقا کے ضامن ہوتے ہیں۔ سچ کہا کسی نے

جنھیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

ابن جریر کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جو اپنے رب کے برابر دوسروں کو ٹھہرانے والے اور اس کی آیات سے رخ پھیرنے والے ہیں یہ کہتے ہیں (لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ) کہ محمد پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اترتی۔ جیسا کہ شاعر نے کہا:

تَعُدُّونَ عَقْرَ النِّيبِ أَفْضَل مَجْدِكُمْ ۔۔۔ بَنِي ضَوْطَرَى، لَولا الكَمِيَّ المُقَنَّعَا

یہاں لولا۔ ھلا کے معنی میں ہے۔ (ترجمہ: اے کمینی عورت کی اولاد! بوڑھی اونٹنیوں کو ذبح کرنا بڑی عزت خیال کرتے ہو بہادر سردار کیوں پیدا نہیں کرتے)

"الایۃ": یہ علامت و نشانی کو کہتے ہیں۔ یہ اس طرح کہ کفار نے اعتراض کرتے ہوئے کہا:

(مَالِ هَذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الأَسْوَاقِ لَوْلا أُنزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيرًا أَوْ يُلْقَى إِلَيْهِ كَنزٌ أَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا) [سورۃ الفرقان: 7، 8]۔

تو کفار اس قسم کی نشانی کے طلبگار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر (علیہ السلام) سے فرمایا یہ بات کرنے والوں سے کہہ دو۔ (إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَى أَنْ يُنَزِّلَ آيَةً) یعنی اللہ تعالی کو اس پر قدرت ہے کہ وہ ایسی حجت اتارے جیسا وہ ارادہ کرتے اور سوال کرتے ہیں (وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ) مگر ان کی اکثریت اس بات کو نہیں جانتی کہ اس نشانی اتارنے پر ان پر کیا وبال پڑے گا اور وہ یہ نہیں جانتے کہ اس کے اتارنے کو ترک کر دینے کی کیا وجہ ہے اگر ان کو وہ وجہ معلوم ہو جائے جس کی وجہ سے وہ ان پر اتارا نہیں جا رہا تو وہ کبھی یہ بات نہ کرتے اور نہ تم سے اس کا مطالبہ کرتے بلکہ ان کی اکثریت اس کو جانتی بھی نہیں۔ (طبری)

معاملہ کچھ اور ہے۔

وَمَا كَانَ اللهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ ۚ -وَمَا كَانَ اللهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ(الانفال:33)

اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ انہیں عذاب دے جب تک اے حبیب! تم ان میں تشریف فرما ہو اور اللہ انہیں عذاب دینے والا نہیں جبکہ وہ بخشش مانگ رہے ہیں۔

آیت مبارکہ :

وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا طٰٓـئِرٍ يَّطِيۡرُ بِجَنَاحَيۡهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمۡثَالُكُمۡ‌ؕ مَا فَرَّطۡنَا فِى الۡـكِتٰبِ مِنۡ شَىۡءٍ‌ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمۡ يُحۡشَرُوۡنَ

38○

لغۃالقرآن: [وَمَا : اور نہیں][مِنْ دَآبَّةٍ : سے چلنے والا][فِي الْأَرْضِ : میں زمین][وَلَا طٰٓئِرٍ : اور نہ کوئی پرندہ][يَّطِيْرُ : جو اڑتا ہے][بِجَنَاحَيْهِ : اپنے دونوں پروں کے ساتھ][اِلَّآ : مگر][أُمَمٌ: امتیں][اَمْثَالُكُمْ : تمہاری ہی طرح][مَا فَرَّطْنَا : نہیں ہم نے چھوڑی][فِي الْكِتٰبِ : کتاب میں][مِنْ شَيْءٍ : کوئی چیز][ثُمَّ : پھر][اِلٰى : طرف][رَبِّهِمْ : انکا رب][يُحْشَرُوْنَ : وہ اکٹھے کیے جائیں گے]

ترجمہ : اور (اے انسانو!) کوئی بھی چلنے پھرنے والا (جانور) اور پرندہ جو اپنے دو بازوؤں سے اڑتا ہو (ایسا) نہیں ہے مگر یہ کہ (بہت سی صفات میں) وہ سب تمہارے ہی مماثل طبقات ہیں، ☆ ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی (جسے صراحۃً یا اشارۃً بیان نہ کر دیا ہو) پھر سب (لوگ) اپنے رب کے پاس جمع کئے جائیں گے

تشریح:

کفار نشانی کا مطالبہ کرتے تھے اس کے جواب میں ان کی توجہ پرندوں کی طرف مبذول کی گئی ہے تاکہ وہ ان کی ساخت، پرورش اور پرواز کے نظام پر غور کریں۔

منکرین حق کا مطالبہ تھا کہ ہمارے پاس اللہ تعالی کی مزید نشانیاں آنی چاہئیں جس کے جواب میں یہ فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ مزید نشانیاں نازل کرنے پر قادر ہے۔ تاہم اگر انسان غور کرے تو اس کی چشم کشائی کے لیے اس کے گرد و پیش اتنے نشانات عبرت ہیں کہ جن کو دیکھ کر یہ مالک حقیقی کو پہچان سکتا ہے۔ اس کے لیے انسان کو دور دراز سفر کرنے کی ضرورت نہیں اگر وہ اپنے سامنے زمین پر چلنے والے جانور اور فضا میں اڑنے والے پرندوں پر غور کرے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نظام قدرت کی حدود و قیود کے اس طرح پابند ہیں کہ کوئی اس سے

سر موانحراف نہیں کر سکتا۔ یہ درند اور پرند نہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں بلکہ اس کی حمد و ثنا کے گیت گاتے ہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل آیت ۴۴ میں بیان کیا گیا ہے کہ ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے وہ تمام کے تمام اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرتے ہیں لیکن انسان ان کی تسبیحات کو نہیں سمجھ سکتے۔ سورۃ النحل آیت ۷۹ میں اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ دیکھو اور غور کرو کہ اللہ کے سوا کون ہے جو پرندوں کو فضا میں تھامے ہوئے ہے اس میں لاتعداد نشانیاں ہیں مگر ان لوگوں کے لیے جو تسلیم کرنے کی دولت سے بہرہ مند ہیں۔ اسی بات کو سورۃ الملک آیت ۱۹ میں یوں بیان کیا کہ کیا یہ لوگ پرندوں کی طرف غور نہیں کرتے کہ وہ ان کے سروں کے اوپر فضا میں پرواز کرتے ہوئے اپنے پروں کو کھولتے اور سمیٹ لیتے ہیں۔ رحیم و کریم رب کے سوا پرندوں کو کون سنبھالے ہوئے ہے۔ یہاں پرندوں کو آدمیوں کی مثل امت قرار دیتے ہوئے یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ سب کا ریکارڈ ہمارے پاس موجود ہے اور ہر کسی نے اپنے رب کی بارگاہ میں اکٹھا ہونا ہے۔ امام رازی (رض) اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

۱۔ حیوان اور پرندے کو بھی اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہے اور وہ اس کی حمد و تسبیح میں مصروف رہتے ہیں۔

۲۔ جس طرح انسانوں میں تولد و تناسل کا سلسلہ جاری ہے اسی طرح پرندے بھی آپس میں محبت اور مباشرت کا عمل اختیار کرتے ہیں۔

۳۔ جس طرح انسانوں کو ایک خاص مقصد اور تدبیر کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے اسی طرح حیوانوں اور پرندوں کو بھی خاص مقصد اور تدبیر کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔

۴۔ جس طرح اللہ تعالیٰ انسان کی حفاظت اور اس کے رزق کا ذمہ دار ہے یہی معاملہ پرندوں اور درندوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

۵۔ جس طرح قیامت کے دن انسانوں کو اکٹھا کرکے ان سے ایک دوسرے کا قصاص لیا جائے گا اسی طرح درندوں، پرندوں اور جانوروں کو جمع کرکے ان سے ایک دوسرے کا بدلہ چکایا جائے گا۔

۶۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے موت و حیات اور دیگر معاملات مقرر فرمائے ہیں اسی طرح حیوانوں اور پرندوں کے لیے ضابطے مقرر کیے ہیں۔

۷۔ جس طرح انسان اپنی روزی کا محتاج ہے اور اس کے لیے تگ و دو کرتا ہے اسی طرح دیگر جاندار اپنی خوراک کے محتاج ہیں اور اس کے لیے محنت کرتے ہیں۔

۸۔ انسانوں، حیوانوں اور پرندوں کے درمیان عادات اور خصائل کے لحاظ سے بھی کچھ قدریں مشترک ہیں شیر کی طرح بہادر، مور کی طرح خوبصورت خنزیر کی طرح بے حمیت، کوے کی طرح حریص اور لومڑی کی طرح بعض انسان چالاک اور عیار ہوتے ہیں۔

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

تم اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کیا اندازہ کر سکتے ہو اس کی قدرت کی یہ شان ہے کہ اس نے تمام جانوروں اور پرندوں کو مختلف امتوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ان کی غذا امزاج کے مطابق ہر قسم کے اعضاء عطا فرمائے اور ان کو شعور عطا کیا۔ یعنی خلق، موت، بعثت و احتیاج میں سب اسی مدبر امور کی طرف محتاج ہیں۔ یعنی تمام جاندار خواہ وہ بہائم ہوں یا درندے پرندے ہوں یا چرندے سب تمہاری مثل امتیں ہیں۔ اگرچہ یہ مماثلت جمیع وجوہ سے نہیں بلکہ بعض سے ہے ان وجوہ میں بعض مفسرین نے کہا کہ یہ حیوانات تمہاری طرح اللہ تعالیٰ کو جانتے اور اس کی تسبیح پڑھتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں۔ چنانچہ درختوں کی عبادت بحکم الٰہی عزوجل قیام ہے۔ چارپویں کی عبادت رکوع ہے۔ حشرات الارض سجدے میں

ہیں۔ طائران خوش الحان بالجبر نغمہ سنج وحمد ہیں۔ دریائی جانور یک سر مشغول تسبیح ہیں۔ پہاڑ، چاند، سورج، آسمان عبادت دائمی میں بہ تحیر محو ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ وہ مخلوق ہونے میں تمہاری مثل ہیں۔

بعض نے کہا کہ وہ انسان کی طرح باہمی محبت والفت میں ایک دوسرے سے تفہیم و تفہیم کرتے ہیں۔ بعض نے کہا روزی طلب کرنے۔ ہلاکت سے بچنے۔ نر مادہ میں امتیاز رکھنے میں تمہاری مثل ہیں۔ بعض نے کہا پیدا ہونے۔ مرنے اور مرنے کے بعد حساب کے لیے اٹھنے میں تمہاری مثل ہیں۔ (تفسیر الحسنات۔ علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ساری کائنات کے رسول ہیں

حضرت ابوہریرہ (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "میرے لئے ساری زمین کو مسجد اور پاک کرنے والی بنایا گیا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا:

ارسلت الی الخلق کافۃً "مجھے تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔" (ترمذی کتاب السیر باب 5)

اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ "اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر اس صورت میں کہ آپ تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں۔" (انبیاء۔ 107)

اسی لئے اونٹ ہرنیاں اور چڑیاں آپ کے پاس فریاد لے کر آتی ہیں اور آپ ان کی فریاد کو سنتے اور ان کے مسائل حل کرتے ہیں، یعنی آپ ان کی بولیاں بھی جانتے ہیں کیونکہ ان کے رسول جو ٹھہرے۔

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کی ساری مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں، اور آپ صرف انسانوں کے لئے رسول نہیں ہیں لہٰذا تمام جانور اور تمام پرندے بھی آپ کی امت میں شامل ہیں۔

(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنے جیسا بشر نہیں کہنا چاہیے

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ، "آپ فرمادیں اے لوگو! میں تمہاری طرح بشر ہوں"۔ (کہف، 110) اس سے دلیل پکڑ کر بعض لوگ کہنے لگے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہماری مثل بشر ہیں۔ حالانکہ ایسا کہنے میں بے ادبی کا پہلو ہے کیونکہ اللہ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے فرمایا ہے کہ آپ کہہ دیں کہ لوگو میں تمہاری طرح بشر ہوں، یعنی آپ کو اظہار عجز و تواضع کا حکم فرمایا گیا، اللہ تعالیٰ نے لوگوں سے یہ نہیں فرمایا کہ تم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنے جیسا بشر کہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ مگر اللہ نے یہ نہیں فرمایا: قولوا انہ بشر مثلنا۔ کے لوگوں تم کہو کہ آپ ہماری مثل بشر ہیں۔ حضور (صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم) کا کہنا اور ہے ہمارا کہنا اور ہے۔ اگر ایک بڑا شہر اپنے بارے میں کہے کہ میں بندہ حقیر پر تقصیر ہو تو یہ اس کی عاجزی ہے اور اگر اس کا شاگرد یا مرید اٹھ کر اپنے شیخ سے کہے کہ اے بندہ حقیر پر تقصیر! تو یہ اس کی گستاخی ہے۔

لیکن اگر کوئی مولانا بضد ہوں کہ میں تو آپ کو اپنے جیسا بشر ہی کہوں گا تاہم اسے کہیں کے مولانا! آپکو قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ تو قرآن میں نظر آگیا ہے مگر آپ کو وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا طٰۤـئِرٍ يَّطِيۡرُ بِجَنَاحَيۡهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمۡثَالُكُمۡ کان میں کیوں نظر نہیں آیا؟

(برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

(آیت) "قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی انما الھکم الہ واحد"۔ (الکہف: ۱۱۰)

ترجمہ: آپ کہئے کہ میں تمہاری ہی مثل بشر ہوں، میری طرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔

اس آیت کی بناپر بعض لوگ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنی مثل بشر کہتے ہیں۔ میں نے ایک شخص سے کہا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مماثل کوئی بشر نہیں ہے۔ اس نے کہا کیا آپ کے دو ہاتھ نہیں تھے؟ کیا آپ کی دو آنکھیں اور دو کان نہیں تھے؟ میں نے کہا تم دو ہاتھ تو دکھا دوگے مگر ان ہاتھوں میں یہ کمال کہاں سے لاؤ گے؟ کہ ان ہاتھوں سے اشارہ کریں تو سورج مغرب سے طلوع ہو جائے، ہاتھ اٹھا کر دعا کریں تو چاند شق ہو جائے، وضو کہاں سے لاؤ گے؟ کہ ان ہاتھوں سے اشارہ کریں تو سورج مغرب سے طلوع ہو جائے، ہاتھ اٹھا کر دعا کریں تو چاند شق ہو جائے، وضو کے برتن میں ہاتھ رکھ دیں تو انگلیوں سے فوارے کی طرح پانی جاری ہو جائے اور تم دو آنکھیں تو دکھا دوگے لیکن ان آنکھوں میں یہ کمال کہاں سے لاؤ گے؟ کہ ان آنکھوں سے جنات اور فرشتوں کو دیکھو حتی کہ رب کائنات کو بے حجاب دیکھو اور تم دو کان تو دکھا دوگے مگر ان کانوں میں یہ قوت کہاں سے لاؤ گے؟ کہ فرشتوں اور جنات کا کلام سن سکو، زمین پر ہوتے ہوئے آسمانوں کی آوازوں کو سن سکو، حتی کہ رب کائنات کا کلام سن سکو۔ وہ کہنے لگا کمالات کی بات کو چھوڑو، صرف اس بات میں تو آپ ہماری مثل ہیں۔ میں نے کہا اس طرح تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ تم کتے اور خنزیر کی مثل ہو، کیونکہ تمہارے بھی دو کان اور دو آنکھیں ہیں۔ اور ان کے بھی دو کان اور دو آنکھیں ہیں اور جس طرح تم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مماثل ہونے کے ثبوت میں سورۃ کہف کی یہ آیت پڑھتے ہو، وہ تمہیں کسی دوسری مخلوق کی مثل ثابت کرنے کے لیے یہ آیت پڑھ سکتا ہے:

(آیت) "وما من دآبۃ فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم"۔ (الانعام: ۳۸)

اور زمین میں چلنے والا ہر حیوان اور فضا میں اپنے بازوؤں سے اڑنے والا ہر پرندہ تمہاری مثل مخلوق ہے۔

جتنی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہم پر فضیلت ہے، تو سوچو کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنی مثل کہنے سے آپ کی کس قدر توہین ہو گی!

رہا یہ سوال کہ پھر اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ آپ کہئے کہ میں تمہاری ہی مثل بشر ہوں، میری طرف یہ وحی کی جاتی ہے۔

(تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

غور کرے کہ کس وجہ مماثلت کی بناپر یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور کس چیز میں تشبیہ دی گئی ہے؟ ظاہر ہے کہ دونوں کی حقیقت ایک نہیں ہو سکتی مثلکم ۔۔ یا۔۔ امثالکم کا لفظ ہی بتا رہا ہے، 'مشبہ' اور 'مشبہ بہ' بھی 'ایک دوسرے کے عین نہیں ہیں، بلکہ غیر ہیں، تو اب وجہ تشبیہ وہی صحیح ہو سکتی ہے، جو دونوں کو از روئے حقیقت غیر ہی رہنے دے، ایک دوسرے کا عین نہ بنائے۔

(تفسیر اشرفی۔علامہ محمد مدنی اشرفی جیلانی)

یعنی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صرف عدم الوہیت میں ہماری مثل ہیں۔نہ ہم خدا ہیں نہ آپ خدا ہیں اور اسی پر تنبیہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد فرمایا تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔خلاصہ یہ کہ کسی وجودی وصف میں کوئی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مماثل نہیں ہے نہ بشریت میں 'نہ عبدیت میں 'نہ نبوت اور رسالت میں اور اس کائنات میں جو بھی آپ کی مثل ہے 'وہ عدمی وصف میں آپ کی مثل ہے یعنی نہ وہ خدا ہے نہ آپ خدا ہیں۔نہ وہ واجب 'قدیم اور مستحق عبادت ہے 'نہ آپ واجب 'قدیم اور مستحق عبادت ہیں۔

لوح محفوظ تمام مخلوقات کے تمام احوال کی جامع ہے

اس آیت میں فرمایا ہے ہم نے کتاب میں کسی چیز کو نہیں چھوڑا اس آیت میں کتاب کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ایک یہ کہ کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے 'لوح محفوظ سے مراد وہ کتاب ہے جس میں تمام مخلوقات کے تمام احوال تفصیل سے لکھے ہوئے ہیں۔قرآن مجید میں ہے:

(آیت) "**وکل شیء فعلوہ فی الزبر، وکل صغیر و کبیر مستطر**"۔ (القمر: ۵۳۔ ۵۲)

ترجمہ: انھوں نے جو کچھ کیا 'وہ سب لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے 'ہر چھوٹا اور بڑا کام لکھا ہوا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تبارک وتعالی نے اپنی مخلوق کو ظلمت میں پیدا کیا 'پھر ان پر اپنے نور سے تجلی فرمائی 'سو جس نے اس نور کو پالیا 'اس نے ہدایت کو پالیا اور جس نے اس نور سے خطا کی وہ گمراہ ہو گیا۔اسی لیے میں کہتا ہوں کہ قلم اللہ کے علم پر خشک ہو چکا ہے۔ (سنن ترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ۲۶۵۱ 'صحیح البخاری 'ج ۳ 'رقم الحدیث: ۲۸۵۶ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث: ۴۲۹۶ 'صحیح ابن حبان 'ج ۱ 'رقم الحدیث: ۲۱۰ 'مسند ابو عوانہ 'ج ۱ رقم ۱۷ 'مسند احمد 'ج ۸ 'رقم الحدیث: ۲۲۰۶۵)

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یقین رکھو کہ اگر تمام امت تم کو نفع پہنچانے پر متفق ہو جائے تو وہ تم کو صرف وہی نفع پہنچا سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلے لکھ دیا ہے 'قلم اٹھا لیے گئے ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں۔ (سنن ترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ۲۵۲۴ 'مسند احمد ج ۱ 'ص ۳۰۷ '۳۰۳ '۲۹۳)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میں نوجوان شخص ہوں اور مجھے اپنے نفس پر زنا کا خوف ہے اور عورتوں سے نکاح کرنے کی میرے پاس وسعت نہیں ہے آپ خاموش رہے۔میں نے پھر عرض کیا آپ نے پھر مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔میں نے عرض کیا 'آپ نے پھر مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔میں نے چوتھی بار اسی طرح عرض کیا تو آپ نے فرمایا اے ابوہریرہ! جو کام تمہیں درپیش ہیں 'ان کے متعلق قلم (لکھ کر) خشک ہو چکا ہے 'خواہ تم خصی ہو یا ایسے رہو۔ (صحیح البخاری 'ج ۶ 'رقم الحدیث: ۵۰۷۶ 'سنن النسائی 'ج ۶ 'رقم الحدیث: ۳۲۱۵)

ان حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوح محفوظ میں تمام مخلوقات کے تمام احوال لکھ دیئے گئے ہیں اور قلم لکھ کر خشک ہو چکا ہے۔

قرآن مجید تمام عقائد اسلامیہ اور احکام شرعیہ کا جامع ہے

اس آیت میں کتاب کی دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہے اور اب معنی یہ ہوگا کہ ہم نے قرآن مجید میں کسی چیز کو نہیں چھوڑا۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں حساب 'الجبرا 'ریاضی اور سائنسی علوم اور ان کے قواعد کا ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح جدید اور قدیم میڈیکل سائنس کے علوم کا ذکر نہیں ہے 'تو پھر یہ معنی کس طرح درست ہوگا کہ ہم نے قرآن مجید میں کسی چیز کو نہیں چھوڑا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کا موضوع ہے دین کی معرفت 'عقائد اور احکام شرعیہ کا بیان۔ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا ہے:

(آیت) "ذلك الكتاب لا ريب فيه هدى للمتقين"۔

ترجمہ: یہ عظیم الشان کتاب! اس (کے منزل من اللہ ہونے) میں کوئی شک نہیں ہے 'یہ متقین کے لیے ہدایت ہے۔

"(آیت) "انا انزلنا اليك الكتاب بالحق لتحكم بين الناس بما ارك الله"۔ (النساء: ۱۰۵)

ترجمہ: بیشک ہم نے آپ پر کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس چیز کے ساتھ فیصلہ فرمائیں جو اللہ نے آپ کو دکھائی ہے۔

(آیت) "وما انزلنا عليك الكتاب الا لتبين لهم الذى اختلفوا فيه وهدى ورحمة لقوم يؤمنون"۔ (النحل: ٦٤)

ہم نے آپ پر یہ کتاب صرف اس لیے نازل فرمائی ہے کہ جس چیز میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے 'آپ اس کو صاف صاف بیان کردیں اور یہ کتاب ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔

(آیت) "ونزلنا عليك الكتاب تفسير تبيان القران۔ غلام رسول سعيديا لكل شىء وهدى ورحمة وبشرى للمسلمين"۔ (النحل: ۸۹)

ترجمہ: اور ہم نے آپ پر یہ کتاب نازل کی ہے جو ہر چیز کا روشن بیان ہے اور مسلمانوں کے لیے ہدایت 'رحمت اور بشارت ہے۔

اس آیت میں فرمایا ہے یہ کتاب ہر شے کا روشن بیان ہے۔ اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ اس میں تمام علوم وفنون کا روشن بیان ہے اور ماضی 'حال اور مستقبل کے تمام واقعات کا تفصیلی ذکر ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اس میں ہر پیش آمدہ مسئلہ کے لیے روشن ہدایت اور واضح شرعی رہنمائی ہے۔ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوجاتی ہے کہ اس کا موضوع عقائد اسلام اور احکام شرعیہ سارے کے سارے قرآن کریم سے ثابت نہیں ہیں۔ بعض قرآن مجید سے ثابت ہیں 'بعض رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت سے 'بعض آثار صحابہ سے 'بعض اجماع سے اور بعض قیاس سے ثابت ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا ہے، لہٰذا جو احکام سنت سے ثابت ہیں 'ان کی اصل بھی قرآن مجید میں ہے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحابہ کرام کی اقتداء کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا جو مسائل آثار صحابہ سے ثابت ہیں 'ان کی اصل بھی قرآن کریم میں ہے اور اجماع اور قیاس کا حجت ہونا بھی قرآن مجید سے ثابت ہے۔ لہٰذا جو مسائل اجماع اور قیاس سے ثابت ہیں 'ان کی اصل بھی قرآن مجید میں ہے۔
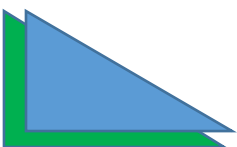
سنت کی حجیت پر دلائل

جو احکام رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت سے ثابت ہیں 'ان کی اصل یہ آیات ہیں:

(آیت) "وما اتکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا"۔ (الحشر: ۵۹)

ترجمہ: اور رسول تم کو جو (احکام) دیں ان کو قبول کرو اور جن کاموں سے تم کو منع کریں 'ان سے باز رہو۔

(آیت) "من یطع الرسول فقد اطاع اللہ"۔ (النساء: ۸۰)

ترجمہ: جس نے رسول کی اطاعت کی 'اس نے اللہ کی اطاعت کرلی۔

(آیت) "قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفر لکم ذنوبکم"۔ (آل عمران: ۳۱)

ترجمہ: آپ کہیئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو 'اللہ تم کو اپنا محبوب بنالے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔

آثار صحابہ کی حجیت پر دلائل

اور صحابہ کرام (رض) کی اطاعت اور اتباع کی اصل یہ احادیث ہیں:

حضرت عرباض بن ساریہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں تم کو اللہ سے ڈرنے 'احکام کو سننے اور اطاعت کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ خواہ تم پر حبشی غلام مسلط کردیا جائے 'جو لوگ بعد زندہ رہیں گے وہ بہت اختلاف دیکھیں گے۔ تم دین میں نئی نئی باتیں نکالنے سے آپنے آپ کو بچانا کیونکہ یہ گمراہی ہے 'تم میں سے جو شخص اس چیز کو پائے اس پر لازم ہے کہ وہ میری سنت پر عمل کرے اور خلفاء راشدین مھدیین کی سنت پر عمل کرے اور اس کو ڈاڑھوں سے پکڑ لے۔

امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (سنن ترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ۲۶۸۵ 'سنن ابوداؤد ج ۳ 'رقم الحدیث: ۴۶۰۷ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۱ 'رقم الحدیث: ۴۲ 'سنن دارمی ج ۱ 'رقم الحدیث: ۹۵ 'مسند احمد ج ۶ 'رقم الحدیث: ۱۷۱۴۵ 'طبع جدید 'مسند احمد ج ۴ ' ص ۱۲۷۔ ۱۲۶ 'طبع قدیم 'المستدرک 'ج ۱ ص ۹۷۔ ۹۶)

حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میری امت ضرور وہ کام کرے گی جو بنواسرائیل نے کیے تھے 'بالکل برابر برابر 'حتی کہ اگر ان میں سے کسی نے اپنی ماں کے ساتھ کھلم کھلا بدکاری کی ہو تو میری امت میں بھی لوگ ایسا کریں گے اور بنو اسرائیل بہتر (۷۲) فرقوں میں منقسم ہوگئے تھے اور میری امت تہتر فرقوں میں منقسم ہوگی 'اور ایک فرقے کے سوا سب دوزخ میں جائیں گے۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! وہ کون سا فرقہ ہے؟ آپ نے فرمایا جس ملت پر میں ہوں اور میرے اصحاب ہیں۔ (سنن ترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ۲۶۵۰ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت '۱۴۱۴ ھ)

حضرت عمر بن خطاب (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میرے بعد میرے اصحاب میں جو اختلاف ہوگا: اس کے متعلق میں نے اپنے رب سے سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی اے محمد (صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم) آپ کے اصحاب میرے نزدیک آسمان میں ستاروں کی طرح ہیں۔ بعض اصحاب بعض سے زیادہ قوی ہیں اور ہر ایک کا نور ہے ' جب ان کے مواقف میں اختلاف ہو تو جو شخص ان میں سے جس کے موقف پر بھی عمل کرے گا ' وہ میرے نزدیک ہدایت پر ہے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں تم نے ان میں سے جس کی بھی اقتداء کی ' تو ہدایت پا جاؤ گے۔ اس حدیث کو امام رزین نے روایت کیا ہے۔ (مشکوۃ المصابیح ' ص ۵۵۴ ' مطبوعہ قدیمی کتب خانہ ' کراچی)
اس حدیث کے آخری حصہ کو علامہ زبیدی نے امام دارمی اور امام ابن عدی کے حوالوں سے ذکر کیا ہے۔ (اتحاف السادۃ المتقین ' ج ۲ ' ص ۲۲۳ ' مطبوعہ مطبعہ میمنہ ' مصر ' ۱۳۱۱ ھ)

اجماع کی حجیت پر دلائل

اجماع کی اصل درج ذیل آیت اور احادیث ہیں :

(آیت) " **ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدی ویتبع غیر سبیل المؤمنین نولہ ما تولی ونصلہ جھنم وسآءت مصیرا** "۔ (النساء : ۱۱۵)

ترجمہ : جس شخص نے ہدایت واضح ہونے کے بعد رسول کی مخالفت کی اور مسلمانوں کے راستہ کے خلاف چلا تو ہم اس کو اسی طرح پھیر دیں گے جس طرف وہ پھیرا ہے اور اس کو جہنم میں پہنچائیں گے اور وہ کیسا برا ٹھکانا ہے۔

اس آیت میں تمام مسلمانوں کے موقف اور مسلک کی مخالفت پر عذاب کی وعید ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ تمام مسلمانوں کا اجتماعی موقف حجت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میری امت کبھی بھی گمراہی پر مجتمع نہیں ہوگی ' سو تم جماعت کو لازم رکھو کیونکہ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ (المعجم الکبیر ' ج ۱۲ ' رقم الحدیث : ۱۳۶۲۳ ' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی ' بیروت)
حافظ الھیثمی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی دو سندیں ہیں۔ ایک سند کے راوی صحیح اور ثقہ ہیں۔ (مجمع الزوائد ' ج ۵ ' ص ۲۱۸)
حضرت معاویہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے ' اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔ میں صرف تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ دیتا ہے ' اور یہ امت ہمیشہ اللہ کے دین پر قائم رہے گی اور کسی کی مخالفت ان کو نقصان نہیں پہنچائے گی حتی کہ قیامت آجائے گی۔ (صحیح البخاری ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۷۱ ' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ ' بیروت)

قیاس کی حجیت پر دلائل

(آیت) "ھوالذی اخرج الذین کفروا من اھل الکتب من دیارھم لاول الحشر ماظننتم ان یخرجوا وظنوا انھم مانعتھم حصونھم من اللہ فاتھم اللہ من حیث لم یحتسبوا وقذف فی قلوبھم الرعب یخربون بیوتھم بایدیھم وایدی المؤمنین فاعتبروا یاولی الابصار"۔ (الحشر: ۲)

ترجمہ: وہی ہے جس نے کفار اہل کتاب کو ان کے گھروں سے پہلی بار جلاوطن کرنے کے وقت نکالا 'تمہیں ان کے نکل جانے کا گمان (بھی) نہ تھا۔ وہ اس گھمنڈ میں تھے کہ ان کے مضبوط قلعے انھیں اللہ کے عذاب سے بچالیں گے 'سو ان کے پاس اللہ کا حکم آگیا جہاں سے انھیں گماں بھی نہ تھا اور اللہ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا 'وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو ویران کر رہے تھے اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے بھی 'سو اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو۔

اس آیت میں قیاس کی دلیل ہے 'کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اعتبار کرنے کا حکم دیا ہے اور اعتبار کا معنی ہے کسی چیز کو اس کی نظیر کی طرف لوٹانا 'یعنی جو حکم اصل شئے کے لیے ثابت ہوگا 'وہی حکم اس کی نظر کے لیے ثابت ہوگا۔ اس آیت میں مسلمانوں کو عبرت پکڑنے کا حکم دیا ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ جس کام کے سبب سے کفار اہل کتاب پر عذاب نازل ہوا ہے 'تم وہ کام نہ کرنا 'ورنہ تم پر بھی وہی عذاب نازل ہوگا اور یہی قیاس ہے کہ علت کے اشتراک کی وجہ سے حکم مشترک ہو۔

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی میری بہن فوت ہوگئی اور اس پر مسلسل دو ماہ کے روزے تھے۔ آپ نے فرمایا یہ بتاؤ اگر تمہاری بہن پر قرض ہوتا تو کیا تم اس کو ادا کرتیں۔ اس نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا تو اللہ کا حق ادائیگی کے زیادہ حق دار ہے۔ (صحیح البخاری 'ج ۲ 'رقم الحدیث: ۱۹۵۳' صحیح مسلم 'صیام '۱۵۴' (۱۱۴۸) ۲۶۵۱ 'سنن ترمذی 'ج ۲ 'رقم الحدیث: ۷۱۶' سنن ابوداؤد 'ج ۲ 'رقم الحدیث: ۳۳۱۰' سنن ابن ماجہ 'ج ۱ 'رقم الحدیث: ۱۷۵۹' سنن کبری للنسائی 'ج ۲ 'رقم الحدیث: ۲۹۱۲')

اس حدیث میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ کے حق کو بندے کے حق پر قیاس کیا ہے اور جس شخص پر روزے ہوں اور وہ فوت ہوجائے تو اس کا ولی اس کی طرف سے فدیہ دے گا۔

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت نے حج کی نذر مانی 'پھر وہ فوت ہوگئی۔ اس کا بھائی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس گیا اور اس کے متعلق سوال کیا آپ نے فرمایا یہ بتاؤ! اگر تمہاری بہن پر قرض ہوتا تو کیا تم اس کو ادا کرتے؟ اس نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا پھر اللہ کا حق ادا کرو 'وہ ادائیگی کے زیادہ حقدار ہے۔ (صحیح البخاری 'ج ۲ 'رقم الحدیث: ۱۸۵۲' ج ۷ 'رقم الحدیث: ۶۶۹۹' ج ۸ 'رقم الحدیث: ۷۳۱۵' سنن النسائی 'ج ۵ 'رقم الحدیث: ۲۶۳۱')

حضرت معاذ بن جبل (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے معاذ کو یمن کی طرف بھیجا اور فرمایا 'تم کس طرح فیصلہ کروگے؟ انھوں نے کہا میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا اگر (وہ مسئلہ) کتاب اللہ میں نہ ہو؟ انھوں نے کہا پھر سنت رسول اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا آپ نے فرمایا اگر (وہ مسئلہ) سنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں نہ ہو؟ انھوں نے کہا

میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ آپ نے فرمایا اللہ کا شکر ہے جس نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے رسول کو توفیق عطا فرمائی۔ (سنن الترمذی ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ۱۳۳۲ ' سنن ابو داؤد ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۳۵۹۲ ' مسند احمد ' ج ۵ ' ص ۲۳۶ ' ۲۳۰)

عبدالرحمٰن بن یزید بیان کرتے ہیں کہ ایک دن لوگوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) سے بہت زیادہ سوالات کیے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) نے فرمایا ایک زمانہ تھا کہ ہم بالکل فیصلہ نہیں کرتے تھے اور ہم اس مقام پر فائز نہ تھے۔ پھر اللہ عزوجل نے ہمارے لیے وہ چیز مقدر کر دی جو تم دیکھ رہے ہو۔ سو آج کے بعد جس شخص کو فیصلہ کرنا پڑے ' وہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرے۔ پھر اگر کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہو جس کا حل کتاب اللہ میں نہ ہو ' تو وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ کرے اور اگر کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہو جس کا حل نہ کتاب اللہ میں ہو ' اور نہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کے مطابق فیصلہ کیا ہو تو جس طرح صالحین نے اس کا فیصلہ کیا ہو ' اس کے مطابق فیصلہ کرے ' اور اگر کوئی ایسا امر درپیش ہو جس کا حل نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کا فیصلہ کیا ہو اور نہ صالحین نے اس کا فیصلہ کیا ہو ' تو پھر وہ اپنے رائے سے اجتہاد کرے اور یہ نہ کہے کہ میں ڈرتا ہوں اور میں خوف زدہ ہوں ' کیونکہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں تو جس چیز میں تمہیں شک ہو ' اس کو چھوڑ کر غیر مشکوک امر کو اختیار کرو۔ امام ابو عبدالرحمٰن نسائی نے کہا یہ حدیث بہت جید (عمدہ) ہے۔ (سنن النسائی ' ج ۸ ' رقم الحدیث : ۵۴۱۲ ' ۵۴۱۳ ' مطبوعہ دارالمعرفہ ' بیروت)

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ مسائل کے استنباط اور احکام کے اثبات کے لیے کتاب ' سنت ' اجماع اور قیاس کی ترتیب کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

قرآن مجید میں ہر چیز کے ذکر ہونے پر دلائل

اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا قرآن مجید میں صرف ان علوم کو بیان کیا گیا ہے جن کی مکلفین کو ہدایت اور اخروی فوز و فلاح میں احتیاج ہوتی ہے یا قرآن مجید میں دنیا اور آخرت کے ہر واقعہ اور ہر حادثہ کا ذکر موجود ہے۔ علامہ آلوسی کا مختار ثانی الذکر ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

اس آیت میں کتاب سے مراد قرآن مجید ہے۔ یہ بلخی اور ایک جماعت کا مختار ہے ' کیونکہ قرآن مجید میں ان تمام چیزوں کا ذکر ہے جن کی دین اور دنیا میں ضرورت پڑتی ہے ' بلکہ اس کے علاوہ دوسری چیزوں کا بھی ذکر ہے ' اور یہ ذکر یا مفصل ہے یا مجمل ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ عنہ سے منقول ہے کہ دین کا جو مسئلہ بھی پیش آئے گا ' اللہ کی کتاب میں اس کے متعلق ہدایت موجود ہے۔

امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) سے روایت کیا ہے۔ انھوں نے کہا اللہ گودنے والی پر اور گدوانے والی پر لعنت کرتا ہے ' اور بال نوچنے والی پر اور جو خوبصورتی کے لیے دانتوں میں جھری کرواتی ہیں ' اور اللہ کی بناوٹ کو تبدیل کرتی ہیں۔ ام یعقوب نے کہا اس کا کیا سبب ہے ؟ حضرت عبداللہ نے کہا میں اس پر کیوں نہ لعنت کروں جس پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے لعنت کی ہے اور اس پر کتاب اللہ میں لعنت ہے۔ اس عورت نے کہا بخدا میں نے قرآن مجید کو پڑھا ہے اس میں تو اس لعنت کا ذکر نہیں ہے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا بخدا اگر تم نے قرآن مجید کو پڑھا ہوتا تو تم اس لعنت کو پالیتیں ' پھر آپ نے یہ آیت پڑھی اور رسول تم کو جو (احکام) دیں ان کو قبول کرو
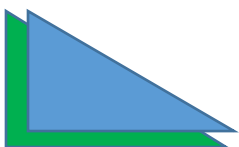
اور جن کاموں سے تم کو منع کریں ان سے باز رہو۔ (الحشر: ۵۹) (صحیح البخاری ج ۷ رقم الحدیث: ۵۹۳۹) صحیح بخاری میں اسی قدر ہے، لیکن علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعود (رض) نے اس عورت سے پوچھا کیا تم نے یہ آیت نہیں پڑھی اس نے کہا پڑھی ہے۔ حضرت ابن مسعود (رض) نے فرمایا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کام سے منع فرمایا ہے۔

ایک مرتبہ امام شافعی نے مکہ میں فرمایا تم جو چاہو مجھ سے سوال کرو میں تم کو اللہ کی کتاب سے اس کا جواب دوں گا ان سے سوال کیا گیا جو محرم بھڑ (تتیہ) کو مار ڈالے آپ اس کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ انھوں نے کہا وہ اس کو مار سکتا ہے اور اس پر حضرت ابن مسعود (رض) کی طرح استدلال کیا۔

امام ابن جریر اور امام ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود (رض) نے کہا اس قرآن میں ہر علم کو نازل کیا گیا ہے اور اس میں ہر چیز کا لیکن ہمارا علم ان چیزوں کو حاصل کرنے سے قاصر ہے جن کا قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے اور امام ابوالشیخ نے کتاب العظمہ میں حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کسی چیز سے غافل ہوتا تو چیونٹی، رائی کے دانہ اور مچھر سے غافل ہوتا حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا اگر میرے اونٹ کی رسی بھی گم ہو گئی تو میں اسے اللہ کی کتاب میں تلاش کرلوں گا (یہ اثر کسی صحیح یا معتبر سند سے منقول نہیں ہے۔ سعیدی غفرلہ) اور علامہ مرسی نے کہا قرآن مجید میں اولین اور آخرین کے علوم جمع ہیں اور ان علوم کا حقیقتاً احاطہ صرف اللہ تعالیٰ نے کیا ہے پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ماسوا ان چیزوں کے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ خاص کرلیا ہے، اور میں نے بعض علماء سے سنا اور اس کی صحت کا ذمہ ان ہی پر ہے کہ ایک دن محی الدین ابن العربی قدس سرہ اپنے دراز گوش پر سوار ہو کر جا رہے تھے، اچانک شیخ گدھے سے گرگئے اور ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ لوگ شیخ اکبر کو سوار کرانے کے لیے آگے بڑھے، انھوں نے کہا مجھے کچھ مہلت دو۔ انھوں نے کچھ مہلت دی۔ پھر شیخ نے ان کو سوار کرانے کی اجازت دی، لوگوں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی۔ شیخ نے کہا میں نے اللہ کی کتاب میں اس حادثہ پر غور کیا، تو مجھے سورۃ الفاتحہ میں اس کا ذکر مل گیا، اور یہ امر ہماری عقلوں سے ماوراء ہے۔ اسی طرح بعض علماء نے سورۃ الفاتحہ سے بادشاہوں کے نام نکالے ہیں اور ان کے احوال اور ان کی سلطنت کی مدت وغیرہ مستنبط کی ہے اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ ام الکتاب ہے۔ اس تفسیر کی بناء پر اس آیت میں اس تخصیص کی ضرورت نہیں ہے کہ قرآن مجید میں انہی چیزوں کا بیان کیا گیا ہے جن کی مکلفین کو ضرورت ہے۔ مثلاً دلائل توحید وغیرہ۔

(روح المعانی ج ۷ ص ۱۴۵۔ ۱۴۴ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

قرآن مجید میں صرف ہدایت کے مذکور ہونے پر دلائل

جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ قرآن مجید کا موضوع صرف ہدایت دینا ہے۔ اس لیے اس نے عقائد اسلامیہ اور احکام شرعیہ کی ہدایت دی ہے، اور اس سلسلہ میں موعظت اور نصیحت کے لیے انبیاء اور صالحین اور کفار اور منافقین کا تذکرہ کیا ہے اور جنت اور دوزخ کا بیان کیا ہے اور اخروی فوز و فلاح کی ہدایت کے لیے جو امور ضروری ہیں ان سب کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کے مقابلہ میں بعض علماء اور صوفیاء کا یہ نظریہ ہے کہ قرآن مجید میں تمام (آیت) "ماکان ومایکون" کا بیان ہے، یعنی ابتداء آفرینش عالم سے لے کر دخول جنت اور دخول نار تک ہر ہر جزی

اور مشخص واقعہ اور حادثہ کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔ ہر چند کہ ان کا صراحتا 'اور تفصیلا بیان نہیں ہے 'لیکن ان امور کا اجمالا ذکر ہے اور کچھ رموز 'اشارات اور کنایات ہیں جن سے ان تمام استخراج کیا جاسکتا ہے۔ ان کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے :

(آیت) "**ونزلنا علیك الکتاب تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدیالکل شیء وھدی ورحمة وبشری للمسلمین**"۔ (النحل : ۸۹)

ترجمہ : ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے جو ہر چیز کا روشن بیان ہے اور مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ آیت ان کے مطلوب پر دلالت کرتی 'کیونکہ اس میں یہ مذکور ہے کہ قرآن مجید میں ہر چیز کا روشن بیان ہے۔ اگر ہر چیز سے " ماکان ومایکون "مراد لیا جائے تو ان کے اپنے قول کے مطابق اس کا بیان رموز اور اشارات سے ہے اور اس کو تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی اور روشن یا واضح بیان نہیں کہا جاسکتا۔ ہاں 'اگر اس سے مراد عقائد اسلامیہ اور احکام شرعیہ ہوں تو ان کی ہر چیز کا قرآن مجید میں روشن بیان ہے۔ نیز وہ اس آیت سے بھی استدلال کرتے ہیں :

(آیت) "**ما کان حدیثا یفتری ولکن تصدیق الذی بین یدیه و تفصیل کل شیء وھدی ورحمة لقوم یؤمنون**"۔ (یوسف : ۱۱۱)

ترجمہ : یہ (قرآن) کوئی من گھڑت بات نہیں ہے 'لیکن یہ ان کتابوں کی مصدق ہے جو اس سے پہلے نازل ہوئی ہیں اور اس میں ہر چیز کی تفصیل ہے اور یہ ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔

لیکن اس آیت سے بھی ان کا استدلال صحیح نہیں ہے 'کیونکہ اس میں ہر چیز کی تفصیل ہے اگر اس سے یہ مراد ہو کہ اس میں دنیا اور آخرت کے ہر واقعہ اور ہر حادثہ اور آسمانوں اور زمینوں کی ہر چیز کی تفصیل ہے تو فی الواقع قرآن مجید میں ان چیزوں کی تفصیل نہیں ہے اور ان علماء کا بھی یہ کہنا ہے کہ ان تمام امور کا قرآن مجید میں اجمالا ذکر ہے 'نہ کہ تفصیلا اس لیے یہ آیت بھی ان کے مدعا پر دلیل نہیں ہے اور اگر اس آیت سے یہ مراد ہو کہ اس میں عقائد اسلامیہ اور احکام شرعیہ میں سے ہر چیز کی تفصیل ہے تو یہ معنی برحق ہے 'لیکن یہ معنی ہماری تائید کرتا ہے نہ کہ ان کی۔

قرآن مجید میں ہر چیز کے بیان کے متعلق مستند مفسرین کا نظریہ

امام ابوالحسن علی بن احمد الواحدی النیشاپوری متوفی ۴۶۸ ھ لکھتے ہیں

(آیت) "**مافرطنا فی الکتاب من شیء**"۔ (الانعام : ۳۸)

ترجمہ : ہم نے اس کتاب میں کسی چیز کو نہیں چھوڑا۔

عطانے ہے کہ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا اس کا معنی یہ ہے کہ بندوں کو جس چیز کی حاجت تھی 'ہم نے اس کا بیان کر دیا ہے اور صریح عبارت میں یا دلالت النص سے یا اجمال سے یا تفصیل سے 'جیسا کہ اس آیت میں فرمایا ہے :

(آیت) "**ونزلنا علیك الکتاب تبیانالکل شیء**"۔ (النحل : ۸۹)

ترجمہ : ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے جو ہر چیز کا روشن بیان ہے۔
یعنی قرآن مجید ہر اس چیز کا روشن بیان ہے جس کی دین میں احتیاج ہے 'اور سورۃ الانعام کی زیر بحث آیت کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔ جو "ماکان ومایکون "پر مشتمل ہے 'یعنی ہم نے لوح محفوظ میں ہر چیز کو لکھ دیا ہے 'جیسا کہ حدیث میں ہے قیامت تک کی تمام چیزوں کو لکھ کر قلم خشک ہو گیا ہے۔ (الویسط 'ج ۲ 'ص ۲۶۹۔ ۲۶۸ 'مطبوعہ دار الکتب العلمیہ 'بیروت '۱۴۱۰ھ)
علامہ واحدی نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے 'وہ یہ ہے :
حضرت عبادہ بن الصامت (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا۔ اس سے فرمایا لکھ تو اس نے ابد تک ہونے والی سب چیزوں کو لکھ دیا۔ (سنن الترمذی 'ج ۵ 'رقم الحدیث : ۳۳۳۰ 'سنن ابوداؤد 'ج ۳ 'رقم الحدیث '۴۷۰۰ 'مسند احمد 'ج ۵ 'ص ۳۱۷)
حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب اللہ نے قلم کو پیدا کیا تو اس سے فرمایا لکھ تو اس نے قیامت تک ہونے والی تمام چیزوں کو لکھ دیا۔ (المعجم الکبیر 'ج ۱۲ 'رقم الحدیث : '۱۲۵۰۰ 'مسند ابویعلی 'ج ۴ 'رقم الحدیث : '۲۳۲۶ 'سنن کبری للبیہقی 'ج ۹ 'ص ۳ 'الاسماء والصفات للبیہقی 'ص ۳۷۸ 'مجمع الزوائد 'ج ۷ 'ص ۱۹۰ 'اس حدیث کی سند صحیح ہے)
علامہ ابوالفرج جمال الدین عبدالرحمن بن علی بن محمد جوزی حنبلی متوفی ۵۹۷ ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :
کتاب کی تفسیر میں دو قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد لوح محفوظ ہے 'یعنی ہم نے ہر چیز کو ام الکتاب میں لکھ دیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہے 'یعنی ہم نے تمہاری حاجت کی ہر چیز قرآن مجید میں بیان کر دی ہے یا صراحتا یا اجمالا یا دلالۃ 'جیسا کہ سورۃ النحل : آیت ۸۹ میں ہے ہم نے آپ پر یہ کتاب نازل کی جو ہر چیز کا روشن بیان ہے یعنی ہر اس چیز کو بیان کر دیا جس کی دین میں احتیاج ہوتی ہے۔ (زاد المیسر ج ۳ ص ۳۵ 'مطبوعہ مکتب اسلامی 'بیروت '۱۴۰۷ھ)
امام فخر الدین محمد بن تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ الدین عمر رازی متوفی ۶۰۶ لکھتے ہیں :
قرآن مجید کی تمام یا اکثر آیتیں مطابقتا 'ضمناً 'اور التزاما اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اس کتاب کو نازل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دین اللہ کی معرفت اور اللہ کے احکام کی معرفت کو بیان کیا جائے۔ (تفسیر کبیر ج ۴ ص ۴۰ مطبوعہ دار الفکر بیروت '۱۳۹۸ھ)
علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ ھ لکھتے ہیں :
ایک قول یہ ہے کہ کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے 'کیونکہ اس میں تمام حوادث ثابت کیے گئے ہیں اور دوسرا قول یہ ہے کہ کتاب سے مراد قرآن مجید ہے یعنی ہم نے دین کی کسی چیز کو قرآن مجید میں نہیں چھوڑا 'اور دین کی ہر چیز کی اس میں دلالت ہے۔ یا تو بالکل واضح دلالت ہے اور اگر مجمل دلالت ہے تو اس کا بیان رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یا اجماع سے یا قیاس سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ (الجامع لااحکام القرآن جز ۶ ص ۳۲۸ 'مطبوعہ دار الفکر 'بیروت ۱۴۱۵ھ)
قاضی عبداللہ بن عمر بن محمد شیرازی شافعی متوفی ۶۸۵ ھ لکھتے ہیں :

کتاب سے مراد یا تو لوح محفوظ ہے ' کیونکہ اس میں دنیا کی ہر بڑی اور چھوٹی چیز لکھی ہوئی ہے اور اس میں کسی جاندار یا بے جان کی کسی چیز کو ترک نہیں کیا گیا اور یا کتاب سے مراد قرآن مجید ہے ' کیونکہ اس میں ان تمام چیزوں کی تدوین کی گئی ہے جن کی دین میں احتیاج ہوتی ہے۔ مفصلا بھی اور مجملا بھی۔ (البیضاوی مع الکازرونی ' ج ۲ ' ص ۴۰۶ مطبوعہ دارالفکر ' بیروت ۱۴۱۶ھ)

علامہ ابو الحیان عبداللہ بن یوسف اندلسی متوفی ۷۵۴ھ لکھتے ہیں :

اگر کتاب سے مراد قرآن مجید ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے اس کتاب میں ایسی کسی چیز کو نہیں چھوڑا جو اللہ کی معرفت کی دعوت دیتی ہو ' اور اس کے احکام کی طرف بلاتی ہو۔ اور اس میں اشارہ ہے کہ یہ کتاب تمام احکام شرعیہ پر مشتمل ہے۔ (البحر المحیط ' ج ۴ ' ص ۵۰۳ مطبوعہ دارالفکر بیروت ' ۱۴۱۲ھ)

علامہ ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر ابن قیم جوزیہ حنبلی متوفی ۷۵۱ھ لکھتے ہیں :

کتاب کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہے۔ اس بناء پر اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم نے اس چیز کو نہیں چھوڑا جس کے ذکر کی احتیاج ہے۔ (بدائع التفسیر ' ص ۱۴۸۔ ۱۴۷ ' مطبوعہ دار ابن الجوزی ' ریاض ' ۱۴۱۴ھ)

علامہ نظام الدین حسن بن محمد حسین قمی نیشاپوری متوفی ۷۲۸ھ لکھتے ہیں :

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ہم نے کتاب میں کسی چیز کے ذکر کو نہیں چھوڑا۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں طب ' حساب ' دیگر علوم اور لوگوں کے مذاہب کی تفصیلات تو نہیں ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تفریط نہ کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ جس چیز کی احتیاج ہو اس کو نہ چھوڑا جائے اور احتیاج اصول اور قوانین کی ہوتی ہے۔ اور وہ قرآن مجید میں مذکور ہیں اور علم الفروع کی تفاصیل کے متعلق علماء نے کہا ہے کہ وہ سنت ' اجماع اور قیاس سے ثابت ہیں۔ (غرائب القرآن ورغائب الفرقان علی ھامش ' جامع البیان ' جز ۷ ص ۴۲ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت ۱۴۰۹ھ)

علامہ ابو البرکات احمد بن محمد نسفی حنفی متوفی ۷۱۰ھ لکھتے ہیں :

اگر کتاب سے مراد قرآن مجید ہو تو اس کا معنی ہے کہ یہ کتاب اپنی عبارت ' دلالت ' اشارت اور اقتضاء کے اعتبار سے ان تمام امور پر مشتمل ہے جن کی طرف ہم اپنی عبادت میں محتاج ہیں۔ (مدارک التنزیل علی ھامش الخازن ' ج ۲ ' ص ۱۵ ' مطبوعہ دارالکتب العربیہ ' پشاور)

علامہ ابو سعود محمد بن عمادی حنفی متوفی ۹۸۲ھ لکھتے ہیں :

اگر اس آیت میں کتاب سے مراد قرآن مجید ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے اہم اشیاء کے بیان میں سے قرآن مجید میں کسی شے کو ترک نہیں کیا اور ان میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوقات کی مصلحتوں کی رعایت فرماتا ہے۔ (تفسیر ابو سعود علی ھامش التفسیر الکبیر ' ج ۳ ' ص ۱۶۹ ' مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۳۹۸ھ)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی حنفی متوفی ۱۲۲۵ھ لکھتے ہیں :

یا کتاب سے مراد قرآن مجید ہے ' کیونکہ اس میں ان تمام چیزوں کو مفصلا یا مجملا مدون کیا گیا ہے جن کی دین میں احتیاج ہوتی ہے۔ (التفسیر المظہری ' ج ۳ ' ص ۲۳۴ ' مطبوعہ بلوچشتان بک ڈپو ' ۱۴۰۴ھ)

سید محمد رشید رضا اپنے استاد الشیخ محمد عبدہ کی تقریر لکھتے ہیں :

اگر کتاب سے قرآن مجید مراد لیا جائے تو اس آیت کے عموم سے مراد دین کے موضوع کا عموم ہوگا 'جس دین کو دے کر رسولوں کو بھیجا جاتا ہے 'اور جس کی وجہ سے کتابوں کو نازل کیا جاتا ہے اور وہ ہدایت ہے کیونکہ ہر چیز کا عموم اس کے اعتبار سے ہوتا ہے اور اس آیت کا معنی ہے کہ ہم نے اس کتاب میں ہدایت کی ان اقسام میں سے کسی قسم کو ترک نہیں کیا جن کی وجہ سے رسولوں کو بھیجا جاتا ہے 'اور ہم نے ان کو اس کتاب میں بیان کر دیا ہے اور وہ دین کے اصول 'قواعد اور احکام ہیں اور ان میں انسان کی قوت بدنی اور قوت عقلی کی یہ رہنمائی کی گئی ہے کہ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے 'وہ ان سے کس طرح استفادہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی سنتوں کی رعایت کر کے کس طرح سے انفرادی اور اجتماعی کمال حاصل کرے اور قرآن مجید نے صریح عبارات اور اشارات سے اس کے حصول کا طریقہ بیان فرمایا ہے۔

بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ قرآن مجید میں تمام کائنات کے علوم ہیں اور تمام "**ماکان ومایکون**" کا ذکر ہے اور یہ کہ ایک دن شیخ محی الدین ابن العربی اپنے دراز گوش سے گرے گئے اور ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی تو انھوں نے لوگوں کو اس وقت تک یہ اجازت نہیں دی کہ ان کو اٹھائیں جب تک کہ انھوں نے سورۃ فاتحہ سے اپنے گدھے سے گرنے اور ٹانگ ٹوٹنے کے حادثہ کا استخراج نہیں کر لیا۔ یہ دعوی ایسا ہے کہ صحابہ میں سے کسی نے اس کا قول نہیں کیا اور نہ فقہاء تابعین اور علماء سلف صالحین میں سے کسی کا یہ قول ہے اور نہ ہی لوگوں میں سے کوئی شخص اس قول کو قبول کرے گا 'سوا ان لوگوں کے جن کا یہ اعتقاد ہے کہ گزرے ہوئے لوگوں نے جو کچھ اپنی کتابوں میں لکھ دیا ہے وہ سب حق ہے۔ خواہ اس کو عقل قبول کرے 'نہ اس کی نقل تائید کرے اور نہ اس پر لغت دلالت کرے۔ اس کے برعکس ائمہ سلف نے یہ کہا ہے کہ عبادات ضروریہ کے تمام احکام فرعیہ پر قرآن مجید مشتمل نہیں ہے نہ صریح عبارت سے 'نہ اشارۃ النص سے 'بلکہ قرآن نے یہ ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اتباع کرنا واجب ہے۔ لہٰذا ہر وہ چیز جو سنت سے ثابت ہے 'اس پر بھی قرآن دلالت کرتا ہے۔ نیز قرآن مجید نے قیاس صحیح کے قواعد کو ثابت کیا ہے اور دیگر قواعد کو بھی ثابت کیا ہے۔ لہٰذا قیاس کی فروع اور جزئیات پر بھی قرآن مشتمل ہے اور دین کی کوئی چیز ان سے خارج نہیں ہے۔ (المنار 'جز ۷ 'ص ۳۹۵ 'مطبوعہ دارالمعرفہ 'بیروت)

علامہ محمد جمال الدین قاسمی متوفی ۱۳۳۲ھ لکھتے ہیں:

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید شریعت کا کلیہ ہے اور اس میں امور کلیات جمع کیے گئے ہیں 'کیونکہ ان کے نزول کے مکمل ہونے سے شریعت تام ہو گئی 'لہٰذا جب ہم شریعت کے کلیات کی طرف نظر کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید ان تمام کو شامل ہے۔ (تفسیر القاسمی 'ج ٦ 'ص ۵۲۱ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت)

علامہ احمد مصطفیٰ المراغی لکھتے ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ کتاب سے مراد قرآن مجید ہے 'یعنی ہم نے قرآن مجید میں ہدایت کی ان اقسام میں سے کوئی قسم نہیں چھوڑی جن کی وجہ سے رسولوں کو بھیجا گیا ہے اور اس میں دین کے اصول 'احکام اور حکمتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ رہنمائی کی گئی ہے کہ انسان اپنی بدنی اور عقل قوتوں کو کس طرح استعمال کرے۔ (تفسیر المراغی 'ج ۷ 'ص ۱۱۹ 'مطبوعہ داراحیاء التراث العربی 'بیروت)

ڈاکٹر وھبہ زحیلی لکھتے ہیں:

اگر اس آیت میں کتاب سے مراد قرآن ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ قرآن مجید مکمل شریعت پر دلالت کرتا ہے اور اسلام کے مبادی اور تمام احکام کے اصول اور دین کے اخلاق و ضوابط پر محیط ہے۔ (التفسیر المنیر 'جز ۷ ص ۱۹۷ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت ۱۴۱۱ھ)

علامہ محی الدین شیخ زادہ متوفی ۶۸۵ھ لکھتے ہیں :

اگر کتاب سے مراد قرآن مجید ہو تو اس پر یہ اعتراض ہے کہ قرآن کریم میں علم طب اور علم حساب کی تفاصیل کا ذکر تو نہیں ہے `نہ دیگر علوم اور ان کے مباحث کا ذکر ہے اور نہ ائمہ کے مذاہب کا ذکر ہے اور نہ ان کے ان دلائل کا ذکر ہے جو علم الاصول اور علم الفروع میں ذکر کیے گئے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے کہ ہم نے کتاب میں سے کسی چیز کا ذکر نہیں چھوڑا ' اس سے مراد یہ ہے کہ مکلفین کو اپنے دین کی تفسیر کے فہم میں جن امور کی ضرورت ہوتی ہے 'ہم ان کو نہیں چھوڑا۔ اور جن امور کی حاجت نہیں ہے 'ان کی تفصیل نہیں کی اور علم الاصول بتمامہ قرآن کریم میں موجود ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں دلائل اصلیہ پوری تفصیل سے موجود ہیں اور ائمہ مذاہب کی تفاصیل اور ان کے اقوال کے ذکر کی اس میں کوئی حاجت نہیں ہے۔ باقی رہی علم الفروع کی تفاصیل تو علماء نے ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید اس پر دلالت کرتا ہے کہ اجماع 'خبر واحد اور قیاس شریعت میں حجت ہیں اور جو مسئلہ بھی ان تین ذرائع میں سے کسی ایک سے ثابت ہوگا 'وہ درحقیقت قرآن کریم میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور رسول تم کو جو (احکام) دیں 'ان کو قبول کرو اور جن کاموں سے تم کو روکیں ان سے باز رہو (الحشر: ۵۹) اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے تم میری سنت پر اور میرے بعد خلفاء راشدین کی سنت پر لازم عمل کرنا اور حضرت ابن مسعود (رض) نے فرمایا میں اس پر کیوں نہ لعنت کروں جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں لعنت کی ہے 'یعنی گودنے والی پر اور گدوانے والی پر اور بال جوڑنے والی پر اور بال جڑوانے والی پر۔

روایت ہے کہ ایک عورت نے پورے قرآن کو پڑھا پھر وہ حضرت ابن مسعود (رض) کے پاس آئی اور کہنے لگی میں نے گزشتہ رات پورے قرآن کو پڑھا اور مجھے اس میں یہ آیت نہیں ملی کہ گودنے والی پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے۔ حضرت ابن مسعود (رض) نے فرمایا اگر تم واقعی تلاوت کرتیں تو تو تم کو آیت مل جاتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور رسول تم کو جو (احکام) دیں ان کو قبول کرو 'اور جن کاموں سے منع کریں ان سے باز رہو 'اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں جو احکام دیئے ہیں 'ان میں یہ حکم بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ گودنے والی پر اور گدوانے والی پر لعنت فرماتا ہے 'اور روایت ہے کہ ایک دن امام شافعی مسجد حرام میں بیٹھے ہوئے تھے ایک شخص نے آکر پوچھا اگر محرم بھڑ (تتیہ) کو مار دے تو کیا اس پر تاوان ہے؟ امام شافعی نے فرمایا اس پر کوئی تاوان نہیں ہے۔ اس شخص نے پوچھا کہ حکم قرآن مجید میں کہاں ہے؟ کہا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور رسول تم کو جو (احکام) دیں وہ قبول کرو پھر سند کے ساتھ بیان کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم میری سنت پر اور میرے بعد خلفاء راشدین کی سنت پر لازماً عمل کرنا۔ پھر سند کے ساتھ ذکر کیا کہ جس محرم نے بھڑ کو قتل کیا تھا ' اس کے متعلق حضرت عمر (رض) نے یہی فرمایا تھا 'تو امام شافعی نے تین درجات کے ساتھ اس حکم کو قرآن مجید سے مستنبط کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب قرآن مجید اس پر دلالت کرتا ہے کہ اجماع حجت ہے اور خبر واحد حجت ہے اور قیاس حجت ہے 'لہٰذا ہر وہ حکم جو ان تین طریقوں میں سے کسی ایک سے ثابت ہوگا 'وہ درحقیقت قرآن مجید سے ثابت ہوگا اور اس تقریر کے مطابق اس آیت کا یہ معنی صحیح ہے کہ ہم نے کتاب میں کسی چیز کے بیان کو نہیں چھوڑا 'کیونکہ اس کتاب کا موضوع عقائد اسلام اور احکام شرعیہ کا بیان ہے اور وہ تمام عقائد اور احکام قرآن مجید میں یا صریح عبارت کے ساتھ موجود ہیں یا دلالت کے ساتھ موجود ہیں اور وہ دلالت اجماع 'خبر واحد یا قیاس میں سے کسی ایک سے حاصل ہوگی۔ (حاشیہ شیخ زادہ علی تفسیر البیضاوی 'ج ۲ 'ص ۱۶۴ 'مطبوعہ داراحیاء التراث العربی 'بیروت)

ہم نے یہ واضح کرنے کے لیے بہ کثرت دلائل اور حوالہ جات پیش کیے ہیں کہ قرآن مجید میں صرف عقائد اسلام اور احکام شرعیہ کو بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ ہمارے زمانہ میں یہ بات بہت مشہور ہو گئی ہے کہ قرآن مجید میں ابتداء افرینش عالم سے لے کر دخول جنت اور دخول نار تک تمام کوائن اور حوادث اور تمام مخلوقات کے تمام احوال بیان کیے گئے ہیں اور جیسا کہ قارئین پر واضح ہو چکا ہے ' یہ بالکل بے اصل بات ہے۔
(تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

جانوروں کے حساب اور قصاص کے متعلق احادیث

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا سنو ! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے قیامت کے دن ہر چیز مقدمہ پیش کرے گی ' حتی کہ وہ بکریاں بھی جنہوں نے ایک دوسرے کو سینگھ مارے تھے۔ (مسند احمد ' ج ۲ ' ص ۳۹۰ ' طبع قدیم ' اس حدیث کی سند حسن ہے ' مجمع الزوائد ' ج ۱۰ ' ص ۳۴۹)
امام ابویعلی نے اس حدیث کو حضرت ابو سعید خدری (رض) سے روایت کیا ہے اور اس کی سند حسن ہے۔ (مسند ابویعلی ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۱۴۰۰ ' مسند احمد ' ج ۳ ' ص ۲۹ ' مجمع الزوائد ' ج ۱۰ ' ص ۳۴۹)
حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیٹھے ہوئے تھے اور دو بکریاں گھاس چر رہی تھیں۔ ایک بکری نے دوسری بکری کو سینگھ مار کر اس کا حمل ساقط کر دیا تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہنسنے لگے۔ آپ سے عرض کیا گیا ' یارسول اللہ ! آپ کو کس چیز نے ہنسایا؟ آپ نے فرمایا مجھے اس بکری پر تعجب ہوا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے ! اس بکری سے قیامت کے دن قصاص لیا جائے گا۔ (مسند احمد ' ج ۵ ' ص ۱۷۳ ' مسند البزار ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ۳۴۵۰)
امام احمد کی سند صحیح ہے۔ (مجمع الزوائد ' ج ۱۰ ' ص ۳۵۲)
حضرت عثمان (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن سینگھ والی بکری سے بغیر سینگھ کی بکری کا قصاص لیا جائے گا۔ (مسند البزار ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ۳۴۴۹ ' مجمع الزوائد ' ج ۱۰ ' ص ۳۵۲)
حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن بعض مخلوق کا بعض سے حساب لیا جائے گا ' حتی کہ بغیر سینگھ والی بکری کا سینگھ والی بکری سے اور حتی کہ چیونٹی کا چیونٹی سے۔
(مسند احمد ' ج ۲ ' ص ۳۶۳ ' امام احمد کی سند صحیح ہے ' مجمع الزوائد ' ج ۱۰ ' ص ۵۲)
حضرت ثوبان (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن جبار تبارک وتعالی متوجہ ہوگا اور پل صراط پر اپنا پیر رکھ دے گا ' پھر فرمائے گا ' مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم ! کوئی ظالم ظلم کرکے مجھ سے بھاگ نہیں سکتا۔ پھر وہ بعض مخلوق کا بعض سے انصاف لے گا ' حتی کہ بغیر سینگھ کی بکری کا سینگھ والی بکری سے اس کو سینگھ مارنے کا انصاف لے گا۔ (المعجم الکبیر ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۱۴۲۱ ' اس حدیث کی سند میں ایک راوی یزید بن ربیعہ ضعیف ہے اور باقی ثقہ ہیں۔ مجمع الزوائد ' ج ۱۰ ' ص ۳۵۳)

آیت مبارکہ :

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○39

لغۃ القرآن: [وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ][كَذَّبُوْا : انہوں نے جھٹلایا][بِاٰيٰتِنَا : ہماری آیات][صُمٌّ: بہرے][وَّبُكْمٌ: اور گونگے][فِي : میں][الظُّلُمٰتِ : اندھیرے][مَنْ يَّشَاِ : جو چاہے][اللّٰهُ : اللہ][يُضْلِلْهُ : اسکو گمراہ کرتا ہے [وَمَنْ يَّشَاْ : اور جو چاہے][يَجْعَلْهُ : وہ اسے کردے][عَلٰي : پر صراط: راستہ مُّسْتَقِيْمٍ : راستہ سیدھا]

ترجمہ : اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ بہرے اور گونگے ہیں، تاریکیوں میں (بھٹک رہے) ہیں۔اللہ جسے چاہتا ہے اسے (انکارِ حق اور ضد کے باعث) گمراہ کر دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے اسے (قبولِ حق کے باعث) سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے

تشریح:

اللہ تعالیٰ کا کلام کامل اور حق ہے۔اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔اس کے باوجود جو لوگ کلام الٰہی کی تکذیب کرتے ہیں دراصل وہ تعصب اور جہالت کی تاریکیوں میں مبتلا ہیں۔ان کے کان حق بات سننے کے لیے تیار نہیں اس لیے وہ بہرے ہیں اور ان کی زبان حق بات کہنے کی جرات نہیں رکھتی اس لیے وہ گونگے ہیں۔اب جو شخص جہالت کی تاریکیوں میں سرگرداں ہو اور حق سننے اور حق کہنے کے وقت جان بوجھ کر بہرہ اور گونگا بن جائے وہ ہدایت کیسے حاصل کر سکتا ہے؟ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

نہ سنتے ہیں نہ پوچھتے ہیں ہدایت کیسے ملے

نہ کہنے والے کی سنتے ہیں نہ خود دوسرے سے پوچھتے ہیں اور نہ اندھیرے میں کچھ دیکھ سکتے ہیں۔جب سب قوی اپنی بے اعتدالیوں سے بے کار کر لیے تو حق کی تصدیق و قبول کا کیا ذریعہ ہو؟

من یشا اللہ یضللہ : گمراہ کرنا اسی کو چاہتا ہے جو خود ذرائع ہدایت کو اپنے اوپر مسدود کر لیتے ہیں۔

ولوشئنا لرفعنه بها ولکنه اخلد الی الارض (اعراف، رکوع 22

سچ بتاؤ مصیبت کے وقت کون کام آتا ہے

جب اندھے بہرے گونگے ہو کر آیات اللہ کو جھٹلایا اور گمراہی کے عمیق غار میں جا پڑے۔ اس پر اگر دنیا میں یا قیامت میں خدا کا سخت عذاب نازل ہو تو سچ سچ بتلاؤ کہ خدا کے سوا اس وقت کسے پکارو گے۔ دنیا کی چھوٹی چھوٹی مصیبتوں میں بھی جب گھر جاتے ہو تو مجبور ہو کر اسی خدائے واحد کو پکارتے ہو اور سب شرکاء کو بھول جاتے ہو فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ (العنکبوت)

جس پر اگر خدا چاہتا ہے تو اس مصیبت کو دور بھی کر دیتا ہے اسی سے اندازہ کر لو کہ نزول عذاب یا ہول قیامت سے بچانے والا بجز خدا کے اور کون ہو سکتا ہے پھر یہ کس قدر حماقت اور اندھا پن ہے کہ اس خدا کی عظمت وجلال کو فراموش کر کے اس کی نازل کی ہوئی آیات کی تکذیب اور فرمائشی آیات کا مطالبہ کرتے ہو۔ (تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی)

کچھ لوگوں میں قبول حق کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے

یعنی یہ لوگ جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی انتہائی موثر دعوت اور قرآن کریم کا معجزانہ بیان اور کائنات میں ہر طرف بکھری ہوئی نشانیاں دیکھ کر راہ ہدایت اختیار نہیں کرتے بلکہ ان کا انکار عناد کی صورت اختیار کر گیا ہے ان کی مخالفت دشمنی میں تبدیل ہو گئی ہے اور ہر صحیح اور حق بات انھیں گالی سنائی دیتی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جن بنیادی صلاحیتوں کی وجہ سے آدمی اپنی غلطی کو سمجھتا یا صحیح بات کو قبول کرتا ہے یہ ان تمام بنیادی صلاحیتوں سے حتیٰ کہ احساسات سے بھی عاری ہو گئے ہیں کیونکہ کسی بات کو سمجھنے کے لیے تین باتوں کی ضرورت ہے۔ پہلی یہ بات کہ جب اسے کوئی صحیح بات سمجھائی جائے تو وہ گوش ہوش سے سنے اور کھلے دل سے قبول کرے۔ لیکن جو آدمی سننے سے ہی انکار کر دے ' اسے ظاہر ہے دنیا کی کوئی طاقت ہدایت نہیں دے سکتی۔

دوسری بات جس کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر صحیح بات کی طلب پیدا ہو اور وہ اسے جاننے کے لیے دوسرے سے خود پوچھے یا اسے اگر کوئی بات سمجھائی جائے اور اسے کوئی بات سمجھ نہیں آتی یا اس کے ذہن میں کوئی سوال یا اشتباہ پیدا ہوتا ہے تو اسے دور کرنے کے لیے خود زبان کھولے۔ لیکن جو آدمی نہ خود پوچھے نہ جاننے کی کوشش کرے نہ اس کے اندر اس کی طلب پیدا ہو ظاہر ہے ایسے آدمی کو کون سمجھا سکتا ہے۔

تیسری بات جس کی ضرورت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی جہالت اور تاریکی کے ماحول سے نکل کر روشنی اور علم کے ماحول کو اختیار کرے۔ وہ بجائے تاریکی سے پیار کرنے کے روشنی سے پیار کرے اور جہاں جہاں بھی اسے روشنی دکھائی دے یا جہاں سے اسے روشنی مل سکتی ہو ' دیوانہ وار اس کی طرف لپکے۔ لیکن اگر اسے روشنی سے نفرت ہو جائے اور وہ تاریکی ہی میں رہنا پسند کرے یعنی علم سے اس کو نفور ہو اور جہالت سے محبت تو ایسے آدمی کو بھی راہ راست دکھانا بہت مشکل کام ہے۔ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ ہماری آیات کی تکذیب کر رہے ہیں اور

وہ کسی طرح بھی ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ' غور سے دیکھو وہ بہرے ہیں کہ آپ کی دعوت کو سن نہیں سکتے اور گونگے ہیں کہ آپ سے کچھ پوچھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ نہ روشنی کی کوئی کرن ان تک پہنچ سکتی ہے اور نہ وہ خود روشنی تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں وہ اگر اللہ کی آیات کی تکذیب کر رہے ہیں اور ہدایت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو اے پیغمبر! آپ ان کے بارے میں ہرگز پریشان نہ ہوں وہ بالکل اس قابل نہیں ہیں کہ وہ آپ کی باتیں سن کر سمجھ سکیں اور پھر اسے قبول کر کے ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہوں کیونکہ وہ ان بنیادی صلاحیتوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ آخر وہ اس صورت حال سے دوچار کیوں ہوئے اور کیوں اپنے بنیادی صلاحیتیں کھو بیٹھے ؟ کیا وہ پیدائشی طور پر معذور لوگ تھے یا وہ کسی سبب سے اس انجام کو پہنچے ؟ چنانچہ اس حوالے سے اسی آیت کریمہ کے دوسرے حصے میں اللہ تعالیٰ اپنی اس سنت کی طرف اشارہ فرمارہے ہیں جو قرآن کریم میں متعدد مواقع پر ذکر کی گئی ہے۔ اللہ کی سنت یہ ہے کہ اس نے انسان کو حواس خمسہ اور عقل کے جوہر سے نوازا ہے۔ اس کے گردو پیش میں اور خود اس کی فطرت کے اندر اپنی ذات کے عرفان کے لیے نشانیاں رکھی ہیں تاکہ ان سے کام لے کر آدمی اللہ کی معرفت حاصل کر سکے اور اللہ کے دیئے ہوئے طریقے کو اختیار کر سکے۔ پھر اللہ نے مزید کرم یہ فرمایا کہ صرف اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ انسانی ہدایت اور اس کی راہنمائی کے لیے اپنی کتابیں اتاریں ' اپنے رسول بھیجے اور انھوں نے سال ہا سال تک انسانی ہدایت کے لیے جان توڑ کوشش کی۔ جب ان تمام امکانات اور کوششوں کے باوجود ایک آدمی راہِ راست اختیار نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ اسے ایک خاص حد تک ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے مہلت دیتے ہیں۔ آخر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اسے ان صلاحیتوں سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو دل پر مہر لگانا کہا جاتا ہے اور جو آگے بڑھ کر ان تمام امکانات سے فائدہ اٹھاتا ہے ' اللہ کے رسول کی دعوت کو قبول کرتا ہے اللہ اس کے لیے صراط مستقیم کھول دیتے ہیں اور وہ ہدایت کا راستہ پالیتا ہے۔ یہ اس کی سنت ہے یہ لوگ اس سنت کی گرفت میں ہیں۔ رہی یہ بات کہ ہدایت کی طرف چلنے والے کو اللہ کس طرح توفیق سے نوازتا ہے اور مسلسل انکار کرنے والے کو کس طرح محروم کرتا اور راہ راست سے بھٹکاتا ہے۔ اس کو مختصر طور پر یوں سمجھ لیجئے خدا کا بھٹکانا یہ ہے کہ ایک جہالت پسند انسان کو آیات الٰہی کے مطالعہ کی توفیق نہ بخشی جائے اور ایک متعصب غیر حقیقت پسند طالب علم اگر آیات الٰہی کا مشاہدہ کرے بھی تو حقیقت رسی کے نشانات اس کی آنکھ سے اوجھل رہیں اور غلط فہم جمیلیوں میں الجھانے والی چیزیں اسے حق سے دور سے دور تر کھینچتی چلی جائیں۔ بخلاف اس کے اللہ کی ہدایت یہ ہے کہ ایک طالب حق کو علم کے ذرائع سے فائدہ اٹھانے کی توفیق بخشی جائے اور اللہ کی آیات میں اسے حقیقت تک پہنچنے کے نشانات ملتے چلے جائیں۔ ان تینوں کیفیتوں کی بکثرت مثالیں آئے دن ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ بکثرت انسان ایسے ہیں جن کے سامنے آفاق اور انفس میں اللہ کی بیشمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مگر وہ جانوروں کی طرح انھیں دیکھتے ہیں اور کوئی سبق حاصل نہیں کرتے اور بہت سے انسان ہیں جو حیوانات (Zoology) ' نباتات (Botany) ' حیاتیات (Biology) ' ارضیات (Geology) ' فلکیات (Astronomy) ' عضویات (Physiology) ' علم التشریح (Anatomy) اور سائنس کی دوسری شاخوں کا مطالعہ کرتے ہیں ' تاریخ ' آثار قدیمہ اور علوم اجتماع (Social Sciences) کی تحقیق کرتے ہیں اور ایسی ایسی نشانیاں ان کے مشاہدے میں آتی ہیں جو قلب کو ایمان سے لبریز کر دیں۔ مگر چونکہ وہ مطالعہ کا آغاز ہی تعصب کے ساتھ کرتے ہیں اور ان کے پیش نظر دنیا اور اس کے فوائد و منافع کے سوا کچھ نہیں ہوتا اس لیے اس مشاہدہ کے دوران میں ان کو صداقت تک پہنچانے والی کوئی نشانی نہیں ملتی ' بلکہ جو نشانی بھی سامنے

آتی ہے وہ انھیں الٹی دہریت 'الحاد' مادہ پرستی اور نیچریت ہی کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔ان کے مقابلہ میں ایسے لوگ بھی ناپید نہیں ہیں جو آنکھیں کھول کر اس کارگاہ عالم کو دیکھتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ

برگِ درختانِ سبز در نظر ہوشیار

ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

گزشتہ آیت کریمہ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ مشرکین مکہ نے رسول اللہ سے عذاب لانے کا مطالبہ کیا تھا اور مختلف وقتوں میں وہ قیامت کا مذاق تو اڑاتے ہی رہتے تھے۔اگلی آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اسی مطالبے کو ایک خوبصورت دلیل انفسی کی صورت میں توحید کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے اور ان کی گمراہی کو اس طرح مبرہن کر دیا ہے کہ جس کا جواب دینا ان کے لیے ممکن نہیں۔(روح القران۔ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

بے شک اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے۔ہدایت اور گمراہی اس کے قبضہ واختیار میں ہے لیکن وہ اسی کو گمراہ کرتا ہے جو دانستہ ہدایت سے روگردانی کرے اور جو حق کی تلاش میں کوشش کرے اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہدایت کے راستے عیاں کر دیتا ہے۔عام لفظوں میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ افعال کا اصل خالق تو اللہ تعالیٰ ہے مگر خیر وشر کا فاعل بندہ ہے وہ اپنی مرضی سے ان کا ارتکاب کرتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے اور اسی کو تقدیر کہتے ہیں۔

تقدیر کا مفہوم

اللہ تعالیٰ نے کائنات کی پیدائش سے پہلے ہر نیکی اور بدی اپنے ازلی علم کے ساتھ لکھ دی ہے۔جیسا ہونے والا تھا اور ہر انسان اپنی مرضی اور خوشی سے جو کچھ کرنے والا تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی علم کے مطابق اسے لوح محفوظ میں لکھ دیا، اس کا نام تقدیر یا قضاء ہے۔ایسا ہرگز نہیں کہ جو اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے ویسا ہی ہمیں کرنا پڑتا ہے اور ہم ویسا کرنے پر مجبور ہیں بلکہ جیسا کام ہم اپنے ارادہ سے کرنے والے تھے ویسا اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا، یہی تقدیر ہے۔

تقدیر کے متعلق افراط و تفریط

تقدیر کا مسئلہ جتنا اہم ہے اتنا ہی نازک اور پیچیدہ بھی ہے، اسی لیے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تقدیر کے بارے میں بحث و تکرار سے منع فرمایا۔اس کے باوجود بعض لوگوں نے اس کی گہرائی میں جانے کی کوشش کی اور افراط و تفریط کا شکار ہو کر گمراہ ہوگئے۔ان کے دو مشہور مذہب ہیں جن کو جبریہ اور قدریہ کہا جاتا ہے۔

1۔جبریہ:

ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان پتھر کی طرح مجبور محض ہے، وہ اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتا، بس جو بھی نیکی یا برائی اللہ تعالیٰ نے اس کی تقدیر میں لکھ دی ہے انسان وہی کرنے پر مجبور ہے۔یہ عقیدہ اسلام کے خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نیکی اور برائی کرنے کا

اختیار دے رکھا ہے۔ اگر انسان کے پاس نیکی کرنے کا اختیار نہ ہوتا تو انبیائے کرام (علیہم السلام) کو نیکی کی تبلیغ کے لیے مبعوث کرنے کی ضرورت نہیں تھی، للٰذا اللہ تعالیٰ نیکی اور بدی کرنے میں کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ حضرت مولانا روم (رح) نے درج ذیل مثال سے اس عقیدہ کی تردید کی ہے:

جبریہ عقیدے کا حامل ایک مسافر کسی باغ کے پاس سے گزر رہا تھا۔ اسے بھوک لگی تو باغ میں داخل ہو کر انگور کھانے شروع کر دیئے۔ باغ کے مالک نے پکڑ لیا اور پوچھا: "میری اجازت کے بغیر آپ نے یہ جرات کیوں کی؟" وہ کہنے لگا: خدا کی اجازت کے بغیر پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ خدا کا باغ، خدا کا بندہ، خدا کے حکم سے کھا رہا ہے۔ میرا تو کوئی اختیار نہیں خدا سے پوچھ وہ مجھے کیوں کھلا رہا ہے؟ باغ کے مالک نے اس کے ہاتھ اور پاؤں باندھ کر ڈنڈے مارنے شروع کر دیئے۔ وہ چیخ و پکار کرنے لگا کہ تم ظلم کر رہے ہو۔ مالک نے کہا: میں تو تیری طرح مجبور محض ہوں۔ خدا کے ڈنڈے، خدا کے حکم سے تم پر برس رہے ہیں۔ اس کارروائی کے بعد اس نے اپنے اس غلط عقیدہ سے توبہ کر لی۔

اس واقعہ کو لکھنے کے بعد حضرت مولانا روم (رح) فرماتے ہیں: اے انسان! اگر تو کتے کو پتھر مارے تو کتا پتھر کو نہیں کاٹتا بلکہ تجھے کاٹتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ پتھر مجبور محض ہے اور تو مختار ہے۔ ارے کم عقل! کتا تجھ میں اور پتھر میں فرق کرتا ہے اگر تو اس فرق کو نہ سمجھے تو تو پھر کتے سے بھی زیادہ بیوقوف ہے۔

2۔ قدریہ:

ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان مختار کل ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ یہ عقیدہ بھی اسلام کے خلاف ہے کیونکہ مختار کل صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ (رح) نے درج ذیل مثال سے اس عقیدہ کی تردید کی ہے:

ایک دفعہ ایک آدمی حضرت سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ انسان مختار کل ہے۔ آپؓ نے فرمایا تم ایک ٹانگ اوپر اٹھاؤ۔ اس نے اٹھالی۔ آپؓ نے فرمایا۔ اس ٹانگ کو اوپر رہنے دو اور اب دوسری ٹانگ بھی اوپر اٹھالو۔ وہ کہنے لگا اس طرح تو میں گر جاؤں گا تو آپؓ نے فرمایا۔ بس اتنا ہی اختیار انسان کے پاس ہے کہ وہ ایک ٹانگ اٹھا سکتا ہے اگر مختار کل ہوتا تو دونوں اٹھالیتا۔

(اسلامی عقائد)

تقدیر کے متعلق صحیح موقف

اہل سنت و جماعت کے نزدیک مذکورہ دونوں نظریات اسلام کے خلاف ہیں دراصل انسان نہ تو پتھر کی طرح مجبور محض ہے اور نہ خدا کی طرح مختار کل ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اچھے اور برے دونوں کام کرنے کا اختیار دیا ہے۔ اس کے ساتھ عقل اور تمیز بھی عطا کی ہے اور اسی لیے اس نے انبیائے کرام (علیہم السلام) کو مبعوث فرمایا تاکہ اچھے اور برے کو پہچان سکے۔ اب انسان اپنی مرضی سے اچھا کام کر سکتا ہے جس کا اسے ثواب ملے گا اور اپنی مرضی سے برائی بھی کر سکتا ہے جس کی اسے سزا ملے گی۔ البتہ بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں انسان بے بس ہے مثلاً زندگی و موت، کہاں پیدا ہوگا، کہاں مرے گا، شکل کیسی ہوگی وغیرہ مگر ان چیزوں کے متعلق انسان سے باز پرس بھی نہ ہوگی۔

(امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

المختصر۔۔اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں جس طرح چاہتا ہے تصرف فرماتا ہے۔وہ جس میں چاہتا ہے ہدایت پیدافرمادیتا ہے اور جس میں چاہتا ہے گمراہی پیدافرمادیتا ہے۔جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف بلائے جانے سے اعراض کرتا ہے اور جو دلائل اللہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں ان میں غور وفکر کرنے سے تکبر کرتا ہے، اس شخص میں اللہ تعالیٰ تکبر اور گمراہی پیدافرمادیتا ہے، اور جو انسان اپنی سماعت، بصارت اور عقل سے کام لیکر صحیح نیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی آیات میں غور وفکر کرتا ہے اور وسیع کائنات میں اس کی قدرت اور اس کی وحدت پر پھیلی ہوئی نشانیوں سے حق تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ اس میں ہدایت پیدا کردیتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے، کہ بندہ جس چیز کسب اور ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ وہی چیز اس میں پیدا کردیتا ہے۔اس لیے یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ جب اللہ تعالیٰ گمراہی کو پیدا کرتا ہے، تو گمراہ کی مذمت کس لیے ہے؟اور جب ہدایت اللہ تعالیٰ پیدافرماتا ہے، تو ہدایت یافتہ کی تعریف کس سبب سے ہے؟۔۔الحاصل۔۔ہدایت یافتہ ہدایت حاصل کرنے کے کسب وارادہ سے قابل تعریف ہوااور گمراہ راہ راست پر نہ آنے کے کسب وارادہ سے قابل مذمت قرار پایا۔

پہلے اللہ تعالیٰ نے کفار کی جاہلیت کو واضح کیااور یہ بتایا کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کا علم محیط ہے اور اس کائنات میں وہی حقیقی متصرف ہے۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ جب ان کافروں پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے، تو پھر یہ اللہ تعالیٰ ہی کی پناہ میں آتے ہیں اور اس کی اطاعت کرنے سے سرکشی نہیں کرتے۔اس سے معلوم ہوا کہ ان کی فطرت کا بھی یہی تقاضہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حقیقی مشکل کشا نہیں ،اور نہ ہی کوئی حقیقی طور پر حاجت روا ہے۔اور مصیبتوں اور تکلیفوں میں وہی واحد نجات دینے والااور کارساز ہے۔تواے رسول مکرم آپ ان مشرکین سے۔۔ (تفسیر اشرفی۔علامہ محمد مدنی اشرفی جیلانی)

آیت مبارکہ :

قُلۡ اَرَءَيۡتَكُمۡ اِنۡ اَتٰٮكُمۡ عَذَابُ اللّٰهِ اَوۡ اَتَتۡكُمُ السَّاعَةُ اَغَيۡرَ اللّٰهِ تَدۡعُوۡنَ‌ۚ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ○40

لغۃ القرآن: [قُلْ : فرما دیجیے][اَرَءَيْتَكُمْ : بتلاؤتم][اِنْ اَتٰىكُمْ : اگر آئے تم پر][عَذَابُ اللّٰهِ : اللہ کا عذاب][اَوْ اَتَتْكُمُ : یا آئے تم پر][السَّاعَةُ : قیامت][اَغَيْرَ اللّٰهِ : کیا علاوہ اللہ][تَدْعُوْنَ : تم پکارو گے][اِنْ كُنْتُمْ : اگر ہو تم][صٰدِقِيْنَ : سچ بولنے والے]
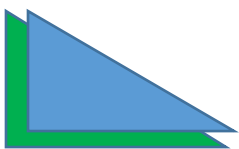
ترجمہ : آپ (ان کافروں سے) فرمائیے : ذرا یہ تو بتاؤ اگر تم پر اللہ کا عذاب آ جائے یا تم پر قیامت آ پہنچے تو کیا (اس وقت عذاب سے بچنے کے لیے) اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے ؟ (بتاؤ) اگر تم سچے ہو

تشریح : مشرکین عرب کا معاملہ بڑا عجیب تھا۔ایک طرف تو وہ بتوں کو خدا کا شریک بناتے اور ان کی پوجا کرتے لیکن دوسری طرف جب کسی سمندری طوفان میں ان کی کشتی پھنس جاتی، سارے مادی سہارے ٹوٹ جاتے اور انھیں موت سامنے نظر آتی تو پھر بتوں کو بھول جاتے اور خالق حقیقی کو پکارتے۔ان آیات میں مشرکین کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ دنیاوی عذاب کے وقت تم جس خدا کو مجبوراً پکارتے ہو یا قیامت کے دن بتوں کی بے بسی دیکھ کر جس خدا کو پکارو گے وہی حقیقی خدا ہے۔اس کے ساتھ بتوں کو شریک کرنا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔(امدادالکرم)

مصیبتوں میں صرف اللہ کو پکارنا انسان کا فطری تقاضا ہے

پہلے اللہ تعالیٰ نے کفار کی جاہلیت کو واضح کیا اور یہ بتایا کہ تمام کائنات میں اللہ تعالیٰ کا علم محیط ہے اور اس کائنات میں وہی حقیقی متصرف ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمادیا ہے کہ جب ان کافروں پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے۔ تو پھر یہ اللہ تعالیٰ ہی کی پناہ میں آتے ہیں اور اس کی اطاعت کرنے سے سرکشی نہیں کرتے۔اس سے معلوم ہوا کہ ان کی فطرت کا بھی یہی تقاضا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی مشکل کشا اور حاجت روا نہیں ہے اور مصیبتوں اور تکلیفوں میں وہی واحد نجات دینے والا اور کارساز ہے ' چنانچہ اس آیت میں فرمایا ہے :

اے رسول مکرم ﷺ ! آپ ﷺ ان مشرکین سے کہئے کہ جس طرح سابقہ امتوں پر عذاب آتے تھے ان کو زمین میں دھنسا دیا جاتا تھا یا ان پر سخت آندھیاں آتیں یا بجلی کی کڑک آ لیتی یا طوفان آتا اگر تم پر ایسا ہی عذاب آ جائے یا تم پر قیامت آ جائے تو کیا تم اس وقت اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے جو تم سے ان مصائب کو دور کرے گا یا تم اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بتوں کو پکارو گے جو تم کو ان تکلیفوں سے نجات دیں گے۔ بتاؤ اگر تم ان بتوں کی عبادت میں سچے ہو ؟ (تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

دراصل صحیح العقیدہ شخص عسر، یسر، بیماری، تندرستی، مشکل اور خوشحالی یعنی ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے مشکل کشائی کی تمنا اور آرزو کرتا ہے اس کے مقابلے میں باطل عقیدہ کا حامل انسان آسانی کے وقت اللہ کے سوا دوسروں سے رجوع کرتا ہے اور جب مسائل کے گرداب میں پھنس جائے تو ہر طرف سے مایوس ہو کر اللہ تعالیٰ کو صدائیں دیتا ہے اس کی اسی عادت کے پیش نظر نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فرمایا گیا ہے کہ آپ ان سے استفسار فرمائیں کہ اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب ٹوٹے یا تم پر ناگہانی کوئی مصیبت اور قیامت آن پڑے اگر تم واقعی اپنے عقیدے میں سچے ہو تو کیا پھر بھی تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو پکارو گے ؟ ایسا کبھی نہیں ہو گا بلکہ صرف اور صرف تم اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہو اور پکارو گے وہی تمہاری مشکل دور اور تکلیف رفع کرتا ہے۔(تفسیر فہم القرآن۔میاں محمد جمیل)
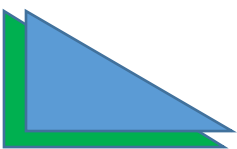
توحید ہر نفس کے اندر موجود ہے

گزشتہ آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ تم ایک نشانی کا مطالبہ کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ تمہارے گرد و پیش میں ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس سلسلہ میں پہلے مثال کے طور پر حیوانات کی زندگی کے مشاہدہ کی طرف توجہ دلائی گئی۔ اس کے بعد اب ایک دوسری نشانی کی طرف اشارہ فرمایا جا رہا ہے جو خود منکرین حق کے اپنے نفس میں موجود ہے۔ جب انسان پر کوئی بڑی آفت آ جاتی ہے یا موت اپنی بھیانک صورت کے ساتھ سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اس وقت ایک اللہ کے دامن کے سوا کوئی دوسری پناہ گاہ اسے نظر نہیں آتی۔ بڑے بڑے مشرک ایسے موقع پر اپنے معبودوں کو بھول کر خدائے واحد کو پکارنے لگتے ہیں۔ غالی سے غالی دہریہ بھی اللہ کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔ اسی نشانی کو یہاں حق نمائی کے لیے پیش کیا جا رہا ہے کیونکہ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ خدا پرستی اور توحید کی شہادت ہر انسان کے نفس میں موجود ہے ٗ جس پر غفلت و جہالت کے خواہ کتنے ہی پردے ڈال دیئے گئے ہوں ٗ مگر پھر بھی کبھی نہ کبھی وہ ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ کو اسی نشانی کے مشاہدے سے ایمان کی توفیق نصیب ہوئی۔ جب مکہ معظّمہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہاتھ پر فتح ہو گیا تو عکرمہ جدہ کی طرف بھاگے اور ایک کشتی پر سوار ہو کر حبش کی راہ لی۔ راستہ میں سخت طوفان آیا اور کشتی خطرہ میں پڑ گئی۔ اول اول تو دیویوں اور دیوتاؤں کو پکارا جاتا رہا۔ مگر جب طوفان کی شدت بڑھی اور مسافروں کو یقین ہو گیا کہ اب کشتی ڈوب جائے گی تو سب کہنے لگے کہ یہ وقت اللہ کے سوا کسی کو پکارنے کا نہیں ہے ٗ وہی چاہے تو ہم بچ سکتے ہیں۔ اس وقت عکرمہ کی آنکھیں کھلیں اور ان کے دل نے آواز دی کہ اگر یہاں اللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں تو کہیں اور کیوں ہو؟ یہی تو وہ بات ہے جو اللہ کا وہ نیک بندہ ہمیں بیس برس سے سمجھا رہا ہے اور ہم خواہ مخواہ اس سے لڑ رہے ہیں۔ یہ عکرمہ کی زندگی میں فیصلہ کن لمحہ تھا۔ انھوں نے اسی وقت اللہ سے عہد کیا کہ اگر میں اس طوفان سے بچ گیا تو سیدھا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جاؤں گا اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں گا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اس عہد کو پورا کیا اور بعد میں آ کر نہ صرف مسلمان ہوئے بلکہ اپنی بقیہ عمر اسلام کے لیے جہاد کرتے گزار دی اور خلعت شہادت سے سرفراز ہوئے۔

(روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

آیت مبارکہ :

بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ۟ 41

لغۃ القرآن: [بَلْ : بلکہ][اِيَّاهُ : صرف اسی کو][تَدْعُوْنَ : تم پکارو گے][فَيَكْشِفُ : پھر وہ دور کریگا][مَا تَدْعُوْنَ : جو تم پکاروگے][اِلَيْهِ : اسکی طرف][اِنْ شَآءَ : اگر چاہا اس نے][وَتَنْسَوْنَ : اور تم بھول جاؤگے][مَا تُشْرِكُوْنَ : جو تم شرک کرتے تھے]

ترجمہ : (ایسا ہرگز ممکن نہیں) بلکہ تم (اب بھی) اسی (االلہ) کو ہی پکارتے ہو پھر اگر وہ چاہے تو ان (مصیبتوں) کو دور فرما دیتا ہے جن کے لیے تم (اسے) پکارتے ہو اور (اس وقت) تم ان (بتوں) کو بھول جاتے ہو جنہیں (االلہ کا) شریک ٹھہراتے ہو

تشریح:

خلاصہ یہ ہے کہ سختی ٬مصیبت اور تنگی میں تم صرف اللہ ہی کو پکارتے ہو ٬تاکہ تمہاری مصیبتیں اور تکلیفیں دور ہو جائیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنی حکمت اور مشیت کے مطابق اگر چاہے تو تم سے وہ تکلیف دور کر دیتا ہے اور ایسے وقت میں تم اپنے بتوں کو بھول جاتے ہو اور اللہ کے سوا تم کو کوئی یاد نہیں آتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

(آیت) "قل من ینجیکم من ظلمت البر والبحر تدعونه تضرعا وخفیة لئن انجنا من هذه لنکونن من الشکرین، قل الله ینجیکم منها ومن کل کرب ثم انتم تشرکون"۔ (الانعام : ٦٤۔ ٦٣)

ترجمہ : آپ پوچھئے تمہیں خشکی اور سمندر کی تاریکیوں سے کون نجات دیتا ہے؟ جس کو تم عاجزی سے اور چپکے چپکے پکارتے ہو۔ اگر وہ ہمیں اس (مصیبت سے) سے بچالے تو ہم ضرور اس کے شکر گزار بن جائیں گے، آپ کہئے اللہ ہی تم کو اس (مصیبت) سے اور ہر مصیبت سے نجات دیتا ہے پھر (بھی) تم شرک کرتے ہو۔

(آیت) "فاذا رکبوا فی الفلك دعوا الله مخلصین له الدین فلما نجهم الی البر اذا هم یشرکون"۔ (العنکبوت : ٦٥)

ترجمہ : پھر وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو وہ اللہ کو پکارتے ہیں درآنحالیکہ وہ اخلاص سے اسی کی عبادت کرنے والے ہیں اور جب وہ اس کی عبادت کرنے والے ہوتے ہیں اور جب وہ ان کو خشکی کی طرف نجات دے دیتا ہے ٬تو یکایک وہ شرک کرنے لگتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کی فطرت میں اپنے خالق کی معرفت رکھی ہے اور اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ خدائے واحد کی پرستش کرے اور اسی کو پکارے۔ اس لیے انسان پر جب کوئی سخت مصیبت اور پریشانی آتی ہے تو اس کی امید کی نظریں اس کے سوا اور کسی کی طرف نہیں اٹھتیں؛

(آیت) "**فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ**"۔ (الروم: ۳۰)

ترجمہ: اللہ کی بنائی ہوئی سرشت کو اپنے اوپر لازم کرلو' جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی پیدا کی ہوئی سرشت میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن۔غلام رسول سعیدی)

اللہ کافروں کی دعا بھی قبول فرماتا ہے

فَيَكۡشِفُ مَا تَدۡعُوۡنَ اِلَيۡهِ اِنۡ شَآءَ سے معلوم ہوا اللہ کافروں کی دعا بھی سنتا پر ان کی دنیوی مصیبتیں بھی دور فرماتا ہے البتہ آخرت میں ان کے لئے کوئی حصہ نہیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اہل اسلام اللہ سے دنیا کی ایک بھلائی مانگتے ہیں اور کفار اللہ سے اس کا الٹ مانگتے ہیں تو کفار کی دعا قبول ہو جاتی ہے مسلمانوں کی نہیں اور اس میں اللہ کی طرف سے کوئی حکمت ہوتی ہے۔ جیسے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مکی دور میں رومیوں اور ایرانیوں کی باہم جنگ ہوئی۔ اہل اسلام رومیوں کی فتح کے لیے دعا کر رہے تھے اور کفار ایرانیوں کی فتح کے لیے دست بدعا تھے آخر ایرانی غالب آئے اور رومی شکست کھا گئے تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: الم۔ غلبت الروم فی ادنی الارض الخ (الروم)۔

ہر دعا کا قبول ہونا ضروری نہیں

اس جگہ ان شاء کہنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ پر کسی دعا کا قبول کرنا لازم نہیں خواہ وہ دعا مومن کی ہو یا کافر کی وہ جس کی دعا کو چاہے قبول فرمائے جس کو چاہے رد فرمادے۔ لہٰذا جہاں قرآن میں فرمایا گیا ہے: **ادعونی استجب لکم**۔ کہ تم مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ اس کا یہی مانا ہے کہ اگرچہ ہوگا تو قبول کروں گا یعنی اگر دعا قابل قبول ہوگی تو قبول کروں گا ورنہ نہیں۔

(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

آیت مبارکہ :

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ○42

لغۃ القرآن : [وَلَقَدْ : اور تحقیق] [اَرْسَلْنَآ : ہم نے بھیجا] [اِلٰٓی : طرف] [اُمَمٍ : امتیں] [مِّنْ : سے] [قَبْلِكَ : پہلے آپ] [فَاَخَذْنٰهُمْ : ہم نے پکڑا انکو] [بِالْبَاْسَآءِ : سختی کے ساتھ] [وَالضَّرَّآءِ : اور تکلیف] [لَعَلَّهُمْ : تاکہ وہ [يَتَضَرَّعُوْنَ : عاجزی کریں]

ترجمہ : اور بیشک ہم نے آپ سے پہلے بہت سی امتوں کی طرف رسول بھیجے، پھر ہم نے ان کو (نافرمانی کے باعث) تنگ دستی اور تکلیف کے ذریعے پکڑ لیا تاکہ وہ (عجز و نیاز کے ساتھ) گڑگڑائیں

تشریح : ان تین آیات میں قوموں کی تربیت اور ان کو گمراہی کی دلدل سے نکال کر صراط مستقیم پر لا کھڑا کرنے کے مختلف طریقوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے اور ساتھ ہی بتایا گیا کہ جو قوم کسی طرح قبول حق کے لیے آمادہ نہ ہو اس کا کیا انجام ہوتا ہے۔ ہدایت کا سب سے پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ انھیں آیات الٰہی سنائی جائیں اور دلائل و براہین سے ان کو راہ راست پر لایا جائے۔ سلیم الطبع لوگوں کے لیے اتنا ہی کافی ہوتا ہے اور جو لوگ اس سے ہدایت پذیر نہیں ہوتے انھیں مصائب اور تکالیف سے دوچار کر دیا جاتا ہے تاکہ اس طرح ان کے دل نرم ہو جائیں اور نافرمانی اور سرکشی سے تائب ہو جائیں۔ اور اگر اس طرح بھی وہ باز نہ آئیں تو ان کے لیے رزق کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ ہر چیز کی فراوانی ہو جاتی ہے اور وہ اس غلط تفسیر کے فہم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ عیش و عشرت کا یہ دور کبھی ختم نہ ہوگا۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے مالک حقیقی کے شکر گزار بندے بن جائیں جس نے ان کی تنگی کو فراخی سے بدل دیا اور ان بے آب و گیاہ ریگ زاروں کو سبزہ زاروں میں تبدیل کر دیا وہ الٹا اکڑنے لگتے ہیں۔ اور ناپائیدار سرور و نشاط میں وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غضب خداوندی کی بجلی گرتی ہے جو انھیں اور ان کے سارے متاع حیات کو دم بھر میں جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

مصیبتیں اور تکلیفیں بندوں کو اللہ کی طرف راجع کرنے کے لیے نازل ہوتی ہیں۔

اس سے پہلی آیت میں کافروں کی ایک قوم کا حال بیان فرمایا تھا جو سختیوں اور مصیبتوں میں اللہ کی طرف رجوع کرتی تھی اور اس آیت میں ان سے زیادہ سخت دل کافروں کا حال بیان فرمارہا ہے جو سخت تکلیفوں اور مصیبتوں میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے۔ الباساء کا معنی ہے شدت 'عذاب 'قوت اور شدت فقر اور اس کا اطلاق جنگ اور مشقت پر بھی کیا جاتا ہے اور الباساء جنگ کی شدت کو بھی کہتے ہیں اور "الضراء "ضرر سے بنا ہے 'ضرر نفع کی ضد ہے 'یعنی نقصان اور مرض کو بھی کہتے ہیں۔ اس آیت میں الباساء سے مراد ہے فقر کی تنگی اور الضراء سے مراد ہے بیماری کی سختی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کی عبرت کے لیے سابقہ امتوں کی مثال دی اور یہ بتلا کہ اپنے بندوں کو مشکلات اور سختیوں میں مبتلا کرنا اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے 'تاکہ وہ گمراہی اور کفر سے ہدایت اور ایمان کی طرف رجوع کریں۔ اس لیے فرمایا کہ ہم نے آپ نے پہلے کئی امتوں کی طرف رسول بھیجے جنھوں نے اپنی اپنی قوموں کو اللہ کو توحید اور اس کی عبادت کی دعوت دی۔ سو انھوں نے اپنے پیغمبروں کی دعوت کو قبول نہیں کیا تو ہم نے ان کو فقر اور معاش کی تنگی میں اور بیماریوں اور تکلیفوں میں مبتلا کر دیا 'تاکہ وہ اللہ سے ڈریں اور گڑ گڑا کر اللہ سے دعا کریں ' کیونکہ سختیاں جھیلنے سے انسان کندن بن جاتا ہے۔ مشرکین مکہ کو یہ اس لیے بتایا ہے کہ وہ بھی پچھلی امتوں کے کافروں کی طرح عذاب الہی کے منتظر تھے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مخالفت کرتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو موکد فرمایا کہ جب ان کافروں پر فقر اور مرض کا عذاب مسلط کیا گیا تو انھوں نے اللہ سے گڑ گڑا کر دعا کیوں نہیں کی 'ان کے دلوں میں نرمی پیدا ہوئی نہ خوف پیدا ہوا اور انھوں نے عبرت حاصل نہیں کی۔ سو ان کے دل پتھروں کی طرح بلکہ ان سے بھی سخت ہو گئے اور یہ لوگ جو نبیوں سے عناد رکھتے تھے 'شرک کرتے تھے اور فسق وفجور میں ڈوبے رہتے تھے 'شیطان نے ان کے ان کاموں کو ان کی نگاہوں میں خوش نما بنا دیا اور ان کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالا کہ اپنے باپ دادا کے طریقہ پر ڈٹے رہو 'کیونکہ یہی حق وصواب ہے۔ پھر جب انھوں نے اس تنبیہ کے باوجود اللہ کی طرف رجوع نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسا عذاب بھیجا جس سے وہ قومیں صفحہ ہستی سے مٹ گئیں۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

جہاں تک اللہ تعالیٰ کی نشانی یا اس کے عذاب کا معاملہ ہے تو جان رکھو اس کے عذاب کی مختلف صورتیں ہوا کرتی ہیں۔ جن میں ابتدائی شکل یہ ہوتی ہے اللہ تعالیٰ غربت وافلاس، تنگی اور حالات کی ترشی کے ذریعے لوگوں کو جھنجھوڑتا ہے تاکہ لوگ اپنی روش پر نظر ثانی کریں۔

اس ہلکی پھلکی گرفت میں اس کی رحمت پنہاں ہوتی ہے کہ جو میرے بندے مجھ سے دور اور میری رحمت سے محروم ہو چکے ہیں انھیں معمولی جھٹکے کے ذریعے احساس دلایا جائے کہ تمہیں ادھر ادھر کے سہارے تلاش کرنے اور دوسروں کو خوش کرنے کی بجائے صرف اپنے رب کا سہارا اور اسی کو خوش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن مسلسل گناہوں کی وجہ سے جب لوگوں کے دل سخت ہو جائیں اور وہ ہلکے پھلکے عذاب سے سبق حاصل کرنے کی بجائے گناہوں اور جرائم کے اس قدر دلدادہ ہو جائیں کہ برائی اور بے حیائی ان کی زندگی کا معمول اور فیشن بن جائے تو ان کو شیطانی کام خوبصورت دکھائی دیتے ہیں گویا کہ شیطان پوری طرح ان پر حاوی اور غالب ہو چکا ہوتا ہے۔ جب یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور نصائح کو مسلسل نظر انداز کر دینے کا وطیرہ اختیار کرتے ہیں تو پھر ان پر دنیا کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں تاکہ گناہ کرنے میں ان کی کوئی

حسرت باقی نہ رہے۔ جب یہ اپنی طرز زندگی پر پوری طرح شاداں وفرحاں اور مطمئن ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کا عذاب اچانک انھیں آلیتا ہے۔ پھر ایسی قوم کو صفحہ ہستی سے ناپید کر دیا جاتا ہے۔

جس سے نہ صرف ان کے نشانات اور اثرات ختم ہو جاتے ہیں بلکہ مدت دراز تک لوگ ان پر حسرت وافسوس کا اظہار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ مجرموں سے اللہ کی زمین پاک ہوئی، مظلوموں اور مجبوروں کو سکھ کا سانس لینا نصیب ہوا۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اکثر قومیں جن پر عذاب نازل ہوئے وہ غریب ہونے کے بجائے دولت مند اور ترقی یافتہ ہوا کرتی تھیں۔

(عَنْ أَبِي قَتَادَةَ بْنِ رِبْعِيٍّ الْأَنْصَارِيِّ أَنَّهُ كَانَ يُحَدِّثُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُرَّ عَلَيْهِ بِجِنَازَةٍ فَقَالَ مُسْتَرِيحٌ وَمُسْتَرَاحٌ مِنْهُ قَالُوا يَا رَسُولَ اللهِ مَا الْمُسْتَرِيحُ وَالْمُسْتَرَاحُ مِنْهُ قَالَ الْعَبْدُ الْمُؤْمِنُ يَسْتَرِيحُ مِنْ نَصَبِ الدُّنْيَا وَأَذَاهَا إِلَى رَحْمَةِ اللهِ وَالْعَبْدُ الْفَاجِرُ يَسْتَرِيحُ مِنْهُ الْعِبَادُ وَالْبِلَادُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ)

[رواہ البخاری: کتاب الرقاق، باب سکرات الموت]

"حضرت ابو قتادہ بن ربعی الانصاری (رض) بیان کیا کرتے تھے رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس سے جنازہ گزرا نبی محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہ راحت پا گیا اور اس سے سکون پا گئے صحابہ کرام (رض) نے استفسار کیا اے اللہ کے رسول کون سکون پا گیا اور کس نے اس سے سکون پایا فرمایا؟ آپ نے فرمایا بندہ مومن جب فوت ہوتا ہے تو دنیا کے مصائب اور اذیتوں سے اللہ کی رحمت کی طرف راحت میں چلا جاتا ہے جبکہ ایک فاجر آدمی کی موت سے لوگ، علاقہ، درخت اور جانور سکون محسوس کرتے ہیں۔"

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

قوم نوح قوم ثمود اور قوم لوط پر عذاب

نوح (علیہ السلام) کی پوری قوم کو پانی کے ایسے طوفان عام نے گھیر لیا جس سے پہاڑوں کی چوٹیاں بھی محفوظ نہ رہ سکیں، قوم عاد پر ہوا کا شدید طوفان آٹھ دن تک مسلسل رہا جس سے ان کا کوئی فرد باقی نہ بچا۔ قوم ثمود کو ایک خوفناک آواز کے ذریعہ تباہ کر دیا گیا۔ قوم لوط (علیہ السلام) کی پوری بستی کو الٹ دیا گیا جو آج تک اردن کے علاقہ میں ایک عجیب قسم کے پانی کی صورت میں موجود ہے، جس میں کوئی جانور مینڈک مچھلی وغیرہ زندہ نہیں رہ سکتی، اسی لیے اس کو بحر میت کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، اور بحر لوط کے نام سے بھی۔

الغرض دنیا کی راحت وکلفت در حقیقت سزاء وجزاء کے نمونے ہیں، اور یہ پوری دنیا آخرت کا شوروم ہے جس میں تاجر اپنے مال کے نمونے دکھانے کے لیے دکان کے سامنے لگاتا ہے، کہ ان کو دیکھ کر خریدار کو رغبت پیدا ہو، معلوم ہوا کہ دنیا کا رنج وراحت در حقیقت سزاء وجزاء نہیں بلکہ خالق سے کٹی ہوئی مخلوق کا رشتہ پھر اپنے خالق سے جوڑنے کی ایک تدبیر ہے۔ (تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی)

خلق را با تو چنیں بدخو کنند

تا ترا ناچار روآں سو کنند

ان آیات میں اللہ نے کفر و معصیت پر دار و گیر کی ترتیب بیان فرمائی کہ کفر و معصیت کی زندگی میں ڈوبے ہوئے لوگ غفلت کی نیند سے چونک جائیں کیونکہ عادت اللہ ایسے لوگوں کے ساتھ یہی جاری ہے کہ اول بلیات کا نزول ہوا کرتا ہے تاکہ لوگ اس شکنجہ میں سے نکل کر ڈھیلے پڑ جائیں، اور اگر اس پر بھی ایسے لوگوں نے اپنی اصلاح نہ کی عقائد اور اعمال کی درستی سے تو پھر استدراجا نعمتوں کی بارش برسائی جاتی ہے اور جب لوگ سرکشی اور طغیانی میں خوب سرخشار ہو جاتے ہیں تو پھر یکایک خدائی پکڑ میں پکڑے جاتے ہیں۔ اب جن مسلمانوں کو کفار مشرکین یہود و نصاری کی خوش حالی اور سامان عیش و عشرت دیکھ کر منہ میں پانی بھر آتا ہے وہ ان آیات کی روشنی میں ان کے عیش و عشرت اور مال دولت کے فیصلہ کو سمجھیں۔

ان آیات میں عام انسانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ دنیا میں کسی شخص یا جماعت پر عیش و عشرت کی فروانی دیکھ کر دھوکہ نہ کھائیں کہ یہی لوگ کامیاب زندگی کے مالک ہیں، اور یہی صحیح راستہ پر ہیں بلکہ بسا اوقات یہ حالت ان مبتلائے عذاب نافرمانوں کی بھی ہوتی ہے، جن کو سخت عذاب میں دفعۃً پکڑ ناطے کر لیا جاتا ہے، احادیث میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشادات سے بھی اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے حضرت عقبہ بن عامر سے روایت ہے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ اس کے معاصی کے باجود دنیاوی عیش و تنعّم اللہ نے اسے دے رکھا ہے یعنی باوجود گناہوں اور نافرمانیوں اور جے رہنے کے نعمت دولت اس پر برس رہی ہے، تو یقین کرلو کہ یہ خدا کی ڈھیل کا وقت گزر رہا ہے، پھر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہی آیت پڑھی، **فلما نسوا ماذکروا۔۔تا۔۔ مبلسون**۔ یعنی جب وہ اس نصیحت کو بھول گئے جو ان کو کی گئی تھی اور دیدہ دانستہ نافرمانی اور سرکشی پر اتر آئے تو پھر ہم نے تنبیہ کے طریقہ کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کیا جو ان کی خواہش کے مطابق تھا، اور ہماری حکمت کے بھی موافق تھا وہ یہ کہ ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے یعنی ان کی سختی اور بد حالی کو دور کر دیا، اور ان کے رزق میں وسعت کی اور ہر قسم کی نعموں کے دروازے ان پر کھول دیے کہ یہاں تک کہ جب وہ ان نعمتوں پر جو ان کو دی گئی تھیں، اترانے لگے اور حد سے گزر گئے تو ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا کہ ہمارا عذاب یک لخت ان پر آ گیا پس وہ اس ناگہانی عذاب کے آتے ہی ہر چیز سے ناامید ہو گئے۔

ایک دوسری روایت میں حضرت عبادہ بن صامت، سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جب اللہ کسی قوم کو باقی رکھنا اور ترقی دینا چاہتے ہیں تو دو وصف ان میں پیدا کر دیتے ہیں ایک ہر کام میں اعتدال اور میانہ روی دوسرے عفت و عصمت اور جب اللہ کسی قوم سے اپنا رشتہ توڑ لینا چاہتے ہیں تو اسے کشائش رزق عطا فرمائی جاتی ہے اور ان پر خیانت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور جب وہ مغرور ہو جاتے ہیں تو ناگہاں انھیں پکڑ لیتا ہے۔

حضرت حسن بصری کہتے ہیں کہ جس پر رزق وسیع ہوتا ہے وہ اس بات پر غور ہی نہیں کرتا کہ یہ بھی خدا کی ایک سیاست ہے اور جس کو تنگ حالی ہو وہ بھی غور نہیں کرتا کہ اس کی آزمائش کی گئی ہے اور مہلت دی گئی ہے رب کعبہ کی قسم جب گناہ گاروں کو پکڑنا مقصود ہوتا ہے تو دنیا میں انھیں سرسبز رکھا جاتا ہے۔ حضرت قتادہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو اس وقت تک نہیں پکڑا جب تک کہ وہ اپنی نعمت میں بدمست نہیں ہو گئی، دھوکا نہ کھاؤ، فاسق اور گناہ گار ہی دھوکا کھاتے ہیں۔

اب ان آیات اور احادیث بالا کی روشنی میں ہم ذرا اپنے ملک اور قوم کی حالت پر بھی غور کرلیں، کیا ہماری قوم اور ملک میں اعتدال میانہ روی اور عفت و عصمت رائج ہے کہ جو نشانی ہے حق تعالیٰ کے کسی قوم کو باقی رکھنے اور بڑھانے کی، یا ہمارے ملک اور قوم میں زندگی کے ہر گوشہ

میں خیانت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں جو نشانی ہے قوم کے برباد ہونے کی، اللہ تعالیٰ اپنے خاص کرم ورحم کے طفیل ہماری حالت پر رحم فرمادیں اور ہم کو نیک وبد سمجھنے کی فہم اور سمجھ عطافرمااور اپنے طرف رجوع ہونے کی توفیق نصیب فرمائیں، اور ہمارے اصلاح کی صورتیں غیب سے ظاہر فرماویں۔آمین۔ (درس احمد)

آیت مبارکہ :

فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○43

لغۃالقرآن: [فَلَوْلَآ : پھر کیوں نہ] [اِذْ : جب] [جَآءَهُمْ : آیا ان پر] [بَاْسُنَا : ہمارا عذاب] [تَضَرَّعُوْا : انہوں نے عاجزی کی] [وَلٰكِنْ : اور لیکن] [قَسَتْ : سخت ہوگئے] [قُلُوْبُهُمْ : ان کے دل] [وَزَيَّنَ : اور خوبصورت کیا] [لَهُمُ : ان کے لیے] [الشَّيْطٰنُ : شیطان نے] [مَا كَانُوْا : جو وہ تھے] [يَعْمَلُوْنَ : وہ عمل کرتے]

ترجمہ : پھر جب ان تک ہمارا عذاب آپہنچا تو انھوں نے عاجزی وزاری کیوں نہ کی ؟ لیکن (حقیقت یہ ہے کہ) ان کے دل سخت ہوگئے تھے اور شیطان نے ان کے لیے وہ (گناہ) آراستہ کردکھائے تھے جو وہ کیا کرتے تھے

تشریح :

اس آیت اور اس کے بعد والی آیت میں مجموعی طور پر یہ فرمایا گیا کہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب ان پر ہمارا عذاب آیا تو وہ گڑگڑاتے تاکہ ہم انھیں توبہ کا موقع دیتے لیکن ان کے تو دل سخت ہوگئے تھے اور شیطان نے ان کے اعمال ان کے لیے آراستہ کردیئے تھے پھر جب انھوں نے ان نصیحتوں کو بھلادیا جو انھیں کی گئی تھیں اور وہ کسی طرح نصیحت قبول کرنے کی طرف نہ آئے، نہ تو پیش آنے والی مصیبتوں سے اور نہ انبیاء (علیہ السلام) کی نصیحتوں سے، تو ہم نے ان پر ہر چیز یعنی صحت وسلامت اور وسعت رزق وعیش وغیرہ کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ اس عیش وعشرت پر خوش ہوگئے اور اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھنے لگے اور قارون کی طرح تکبر کرنے لگے تو ہم نے اچانک انھیں پکڑلیا اور انھیں مبتلائے عذاب کردیا اور اب وہ ہر بھلائی سے مایوس ہیں۔(تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری)

تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ہماری طرف سے جب کوئی سختی ان کو پہنچی تو وہ گڑگڑائے۔ یہ کیوں نہ کیا۔ شکوہ ہے اللہ کا لوگوں سے۔ اور قوموں کا حال تو اپنی جگہ اگر ہم اپنی زندگیوں کا حال سامنے رکھیں۔ کوئی پریشانی آئے۔ کوئی کام اپنے plan کے مطابق نہ ہوا ہو۔ تو انسان کی انسانیت اور اللہ کا بندہ ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں۔ ہم اللہ پر نعوذ باللہ کبھی نہ الزام دیں۔ ہم اپنے گناہوں کو دیکھیں کہ کیا وجہ ہوئی جو یہ مشکل آئی۔ اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے اندر بہتری آتی ہے۔ self improvement کا یہ راستہ ہے۔ اگر انسان اپنے آپ کو کمزور سمجھے اور اپنے آپ کو غلطی پر سمجھے تو اس کی اصلاح ہوتی ہے۔ لیکن کیا ہوا کہ جو قومیں تباہ ہونے والی ہوتی ہیں وہ کسی بھی مشکل پریشانی سے سبق سیکھتی نہیں۔ دل ان کے اتنے سخت ہوتے ہیں کہ یوں سمجھیں کہ لاعلاج ہو چکے ہیں۔ جیسے مثال کے طور پر آپ دیکھیں کہ کسی کے کوئی زخم لگا ہوا ہے۔ skin پر۔ اور آپ اس پر دوا لگاتی ہیں اور دوا کا اس پر reaction ہوتا ہے۔ تکلیف اس کو ہوتی ہے تو کم از کم اس کو امید تو ہے نہ کہ skin اس کی زندہ ہے۔ لیکن اگر زخم بھی ہے اور دوا لگائی جاتی ہے۔ انجکشن لگایا جاتا ہے۔ اس کی تکلیف بھی وہ شخص محسوس نہیں کرتا۔ پتہ چلتا ہے کہ یہ تو بالکل parallelize ہو گیا ایک طرح سے۔ تو قومیں بالکل اسی طرح بے حس ہو جاتی ہیں جب تباہ ہونے والی ہوں تو۔ گناہوں میں اتنے غرق ہو چکے ہوتے ہیں گویا کہ گناہ ان کے ایک طرح سے لاعلاج بیماری کی حد تک پہنچ چکے ہوتے ہیں last stages تک ان کی بیماری چلی گئی ہوتی ہے کہ کسی قسم کی تکلیف پریشانی کا ان پر اثر نہیں ہوتا۔ دلوں میں ان کے نرمی نہیں آتی۔ تو شکوہ کیا کہ ہماری طرف سے بھیجی گئی تکلیف ان کو پہنچی تو گڑگڑائے کیوں نہ۔ اللہ کی رحمت جوش میں آ جاتی۔ اللہ ان کو اپنے دامن رحمت میں پناہ دے لیتا۔ لیکن کیا ہوا۔ و لکن قست قلوبھم۔ ان کے دل سخت ہو گئے۔ اور دل دراصل روح کا گھر ہے۔ دل کا سخت ہونا۔ مردہ دل ہو جانا یعنی روح کی موت واقع ہو گئی۔ جیسے جسم میں سے جب روح نکل جاتی ہے تو جسم اکڑنے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح جب دلوں میں سے خدا خوفی اور ایمان نکل جاتا ہے دل سخت ہو جاتے ہیں۔

قست کا لفظ کسی عام چیز کے لیے نہیں آتا۔ کسی کپڑے کے لیے یا کسی اور چیز کے لیے نہیں آتا۔ بلکہ قست کا لفظ آتا ہی صرف دل کی سختی کے لیے ہے۔ تو فرمایا کہ دل ان کے سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کو اطمینان دلا دیا۔ کہ جو کچھ تم کر رہے ہو بالکل صحیح کر رہے ہو۔ کوئی میّز کی چھبن بھی محسوس نہ ہوئی۔ کوئی انھوں نے بحیثیت قوم رک کر اپنے آپ کو دیکھا ہی نہیں۔ بالکل ہی گناہوں میں ڈوب گئے۔ جیسے آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ گناہوں میں اور برائیوں میں قومیں enjoyment کا سامان کرتی ہیں۔ entertainment کا سامان تلاش کرتی ہیں۔ جو بھی اخلاقی خرابی اخلاقی زوال ان میں آ رہا ہوتا ہے۔ جو بھی فحاشی اور بے حیائی نظر آ رہی ہوتی ہے۔ اس کو وہ برائی سمجھتے ہی نہیں۔ اور اگر اس کا کوئی medical reason پتہ چل جائے کہ یہ چیز ان کے لیے medically نقصان دہ ہے تو بھی ہم دیکھتے ہیں۔ کہ اخلاقی برائیوں کا الزام خود کو سمجھنے کے بجائے genes کے سر پر ڈال دیا جاتا ہے۔ کیا کریں کہ genetic wakeful ہی انسان کا ایسا ہے۔ انسان تو ہے ہی بہت برا۔ نیچر ہی ہمارا یوں ہے۔ ہم تو مجبور ہیں کہ ہم برے کام کریں۔ تو لہٰذا ہمارا کوئی قصور۔ اور جب قصور ہی ہمارا نہیں تو ہم ٹھیک کیا کریں گے اپنے آپ کو۔ تو اس طرح جب اپنی تمام برائیوں اور کمزوریوں کا الزام انسان genes پر ڈال دیتا ہے۔ تو وہ تو بری ہو گیا نہ۔ آزاد ہو گیا۔ ہر ذمہ داری سے۔ اور ہر برائی کی ذمہ داری نعوذ باللہ خالق پر لی گئی۔ کہ جس نے genes بنائیں۔ جیسے آج کل وہ کہہ دیتے ہیں کہ gay ہونا تو فطرت میں ہے۔ ہم کیا کریں۔ اگر کوئی gay ہے نعوذ باللہ تو اس کی تو فطرت کا تقاضہ ہی یہ ہے۔ اس کا اپنا تو کوئی قصور نہیں۔ اور اللہ تعالٰی نے فطرت بنائی ہے۔ اور جب اللہ نے بنائی ہے تو اس کام پر پکڑے جانے کا کیا سوال اس طرح ہر گناہ کو justify کر لیتے ہیں۔ کوئی دلیل اس کی دے لیتے ہیں۔ یہ تو پرانے

زمانے میں بھی ایسے ہوتا رہا۔ یہ کوئی نئی latest آج کی ذہنیت اور سائیکالوجی نہیں ہے۔ آپ اگر پڑھیں اینتھر کے بارے میں یا Greece یا روم کے بارے میں۔ ان کے کلچر کے بارے میں۔ ان میں بھی برائیوں کا خوب چرچا تھا۔ جو جتنا زیادہ بے حیا جس کا جتنا زیادہ prevented لائف سٹائل ہوتا تھا۔ اتنا زیادہ اس کے elite ہونے کی علامت اس کے elite ہونے کا ثبوت تھا۔ ندامت اور شرمندگی کے ساتھ نہیں بلکہ پورے جوش و خروش کے ساتھ علانیہ برے کام کیا کرتے تھے۔ شیطان نے ان کے برے اعمال ان کے لیے خوب مزین کر دیئے تھے۔ خوبصورت بنا دیتے۔ تو کیا ہوا۔ (تفسیر تنویر۔ زاہدہ تنویر)

قسوت قلب بیماریوں کی بیماری۔ والعیاذ باللہ: سو ارشاد فرمایا گیا کہ سخت ہوگئے ان کے دل۔ سو قسوت قلب [دل کی سختی] ہی ان کا وہ اصل روگ تھا جس نے ان کا بیڑا غرق کر دیا۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ کہ اس سے حق و ہدایت اور وعظ و نصیحت کی بات ایسوں کے دلوں میں اثر ہی نہیں کرتی اور ایسے لوگوں کے دل پتھر بن جاتے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر سخت ہو جاتے ہیں۔ سو قسوت قلوب یعنی دلوں کی سختی بیماریوں کی بیماری اور محرومیوں کی محرومی ہے۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ بہر کیف ایسے لوگوں نے جب ان خدائی تنبیہات کی پروانہ کی اور ان کے دل ان سے نرم پڑنے کی بجائے اور سخت ہوگئے اور جن بداعمالیوں میں وہ لوگ لگے ہوئے تھے انہی میں مست و مگن رہے اور شیطان نے ان کے ان برے کاموں کو ان کی نگاہوں میں کھبا دیا تو بالآخر وہ اپنے انجام کو پہنچ کر رہے۔ والعیاذ باللہ۔ اللہ قسوت قلب کے ہر شائبے سے محفوظ رکھے ۔آمین ثم آمین۔ (تفسیر مدنی۔ مولانا اسحاق مدنی کشمیر)

اللہ تعالیٰ کی نعمت پر خوش ہونے کا حکم

یاد رہے کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کی نعمت پر خوش ہونا اگر فخر، تکبر اور شیخی کے طور پر ہو تو برا ہے اور کفار کا طریقہ ہے اور اگر شکر کے طور پر ہو تو بہتر ہے اور صالحین کا طریقہ بلکہ حکم الٰہی ہے، جیسا کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ فرماتا ہے:

"وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (۱۱)"

ترجمہ کنزالعرفان: اور اپنے رب کی نعمت کا خوب چرچا کرو۔

اور ارشاد فرماتا ہے:

"قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا"

ترجمہ کنزالعرفان: تم فرماؤ: اللہ کے فضل اور اس کی رحمت پر ہی خوشی منانی چاہیے۔

کفر اور گناہوں کے باوجود دنیوی خوشحالی کا اصلی سبب

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفر اور گناہوں کے باوجود دنیاوی راحتیں ملنا در اصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل اور اس کا غضب و عذاب ہے کہ اس سے انسان اور زیادہ غافل ہو کر گناہ پر دلیر ہو جاتا ہے بلکہ کبھی خیال کرتا ہے کہ گناہ اچھی چیز ہے ورنہ مجھے یہ نعمتیں نہ ملتیں اور یہ کفر ہے۔

حضرت عقبہ بن عامر (رض) سے روایت ہے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا جب تم یہ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو ان کے گناہوں کے باوجود ان کی پسند کے مطابق عطا فرمارہا ہے تو یہ ان کے لیے صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِستِدراج اور ڈھیل ہے، پھر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ آیت تلاوت فرمائی ۔ (تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری)

آیت مبارکہ :

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝44

لغۃ القرآن: [فَلَمَّا : تو جب] [نَسُوْا : انہوں نے بھلایا] [مَا : جو] [ذُكِّرُوْا : وہ نصیحت کیے گئے] [بِهٖ : اسکی] [فَتَحْنَا : ہم نے کھولے] [عَلَيْهِمْ : ان پر] [اَبْوَابَ : دروازے] [كُلِّ شَيْءٍ: ہر چیز] [حَتّٰى: یہاں تک کہ] [اِذَا فَرِحُوْا : جب وہ اترا گئے] [بِمَآ اُوْتُوْٓا : ساتھ وہ دیے گئے] [اَخَذْنٰهُمْ : ہم نے پکڑا انکو] [بَغْتَةً : ناگہاں] [فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ : جب وہ ناامید ہونے والے]

ترجمہ : پھر جب انھوں نے اس نصیحت کو فراموش کر دیا جوان سے کی گئی تھی تو ہم نے (انہیں اپنے انجام تک پہنچانے کے لیے) ان پر ہر چیز (کی فراوانی) کے دروازے کھول دیئے، یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں (کی لذتوں اور راحتوں) سے خوب خوش ہو (کر مدہوش ہو) گئے جو انھیں دی گئی تھیں تو ہم نے اچانک انھیں (عذاب میں) پکڑ لیا تو اس وقت وہ مایوس ہو کر رہ گئے

تشریح:

حضرت عقبہ (رض) بن عامر کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اگر کوئی بندہ گناہوں پر جما ہوا ہو اور دنیا میں ہر دل پسند چیز اس کو ملتی رہے تو (سمجھ لو کہ) یہ محض ڈھیل ہے پھر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ آیت تلاوت فرمائی : (فلما نسواما ذکروابہ فتحنا علیہم ابواب کل شیء)۔ (تفسیر مظہری۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی)

ابن جریر کہتے ہیں : رسولوں کی زبان پر ہم نے جو احکامات دیئے انہوں نے ان پر عمل کو ترک کر دیا۔ جیسا کہ مفسرین نے فرمایا :

شواہد

مجھے مثنی نے ابن عباس (رض) سے (فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ) کا مطلب یہ ذکر کیا کہ جس چیز کی ان کو نصیحت کی گئی تھی انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔

ہمیں القاسم نے ابن جریج سے اس کا مطلب یہ بتلایا ہے کہ جس چیز کی طرف اللہ تعالیٰ نے ان کو بلایا اور اس کے رسول نے دعوت دی انہوں نے اس کا انکار کر دیا اور اسے مسترد کر دیا۔

(فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ) : ہم نے ان کی تنگدستی کو خوشحالی اور وسعت عیش سے بدل دیا اور جسمانی امراض کی جگہ صحت و سلامتی ابدان واجسام دے دیا۔ یہ ہماری طرف سے استدارج ہے جیسا مفسرین نے ذکر کیا۔ (تفسیر طبری۔ ابی جعفر محمد بن جریر طبری)

مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ سے مراد

اس آیت کریمہ میں مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ کے دو مطلب علماء نے مراد لیے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد وہ مصائب ہیں 'جن سے انھیں دوچار کیا گیا تھا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ جب انھوں نے ان مصائب کی پروانہ کی اور جس مقصد کے لیے ان مصائب میں انھیں مبتلا کیا گیا تھا اسے قبول نہ کیا تو پھر اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ انھیں جس بات سے نصیحت کی گئی تھی یعنی اللہ کے رسول کی دعوت اور اللہ کی کتاب کے واسطے سے 'جب انھوں نے اس پر کان نہ دھرے تو تب اس سنت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مصائب کو ختم کر دیتا ہے اور لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ مصائب کا ایک وقتی دور آیا تھا 'جیسے ہر قوم پر آیا کرتا ہے 'وہ گزر گیا۔ اس لیے اس کا کوئی تعلق پیغمبر کی دعوت سے ہرگز نہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم پھر انھیں ڈھیل دے دیتے ہیں اور اس ڈھیل کو مزید موثر بنانے کے لیے ہر چیز کے دروازے ان پر کھول دیتے ہیں۔ یعنی وقت پر بارشیں ہونے لگتی ہیں 'کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں 'پیداوار میں اضافہ ہو جاتا ہے 'پھل دار درخت پھلوں سے گراں بار ہو جاتے ہیں 'زمین سبزے کا مخملی لباس پہن لیتی ہے 'جانوروں میں دودھ کی فراوانی ہو جاتی ہے 'صنعتوں کا پہیہ تیزی سے چلنے لگتا ہے 'کاروبار میں تیزی آجاتی ہے دولت کی ریل پیل ہو جاتی ہے اور ہن برسنے لگتا ہے 'جس چیز میں یہ قوم ہاتھ ڈالتی ہے وہ سونا بن جاتی ہے نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ اللہ سے اور دور ہو جاتے ہیں اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں پر شکر کرنے کی بجائے اترانے لگتے ہیں۔ دولت کے نشے میں تمام انسانی اقدار اور شرم و حیا کی تمام حدود کو پامال کر دیتے ہیں۔ اخلاقیات کا ایک ایک بندھن ٹوٹ جاتا ہے۔ اللہ کے رسولوں کی دعوت 'ان کے لیے ایک اجنبی آواز بن

جاتی ہے۔ پھر اللہ کا عذاب حرکت میں آتا ہے اور اچانک ان کو پکڑ لیا جاتا ہے۔ اب وہ ایسے ہو جاتے ہیں جیسے بارش والی رات میں باڑے کے ایک کونے میں سمٹی ہوئی بکریاں اور یا اس آدمی کی طرح جو اپنے جھونپڑے میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پناہ لیے ہوئے ہو اور سر پر گھٹا تلی کھڑی ہو بادل کڑکتے ہوں اور بجلی کوند رہی ہو کہ اچانک اس کے سر سے چھت اڑ جائے اب وہ جس طرح بے بسی کی تصویر بن کر اور حواس باختہ ہو کر رہ جاتا ہے اسے کچھ نہیں سوجھتا کہ اب وہ کیا کرے یہ لوگ اس سے زیادہ بے بس ہوتے ہیں۔ ان کا سارا کروفر ' ان کا سارا ٹھاٹھ باٹھ ان کی ساری سطوتیں ان کی اس بے بسی میں کچھ کام نہیں آتیں ' اب موت ان کے شکار میں ہوتی ہے اور یہ موت کے انتظار میں ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ان پر گزرتی ہے۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

گناہوں کے باوجود نعمتوں کا ملنا اللہ کی طرف سے استدراج اور ڈھیل ہے۔

اس آیت میں ان کے نصیحت کے بھولنے کی وجہ سے ان پر عذاب نازل کیا گیا ' حالانکہ بھولنے سے احتراز تو ان کے اختیار میں نہیں ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بھولنے سے مراد ترک کرنا ہے ' یعنی جب انھوں نے اس نصیحت کے تقاضوں پر عمل کرنا ترک کر دیا۔ ابن جریج نے اس کی تفسیر میں کہا ہے جس دین کی طرف ان کو اللہ اور اس کے رسولوں نے دعوت دی تھی ' اس کو انھوں نے ترک کر دیا ' بلکہ اس کا انکار کیا اور اس کو رد کر دیا تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔ یعنی معاش کی تنگی کو رزق کی وسعت سے بدل دیا اور بیماریوں کو صحت اور سلامتی کے ساتھ بدل دیا۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کس طرح فرمایا ہے کہ ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے، کھول دیئے حالانکہ یہ معلوم ہے کہ ان پر رحمت اور توبہ کے دروازے نہیں کھولے گئے تھے۔ ان کے علاوہ نیکی اور صلاح اور فلاح کے دروازے بھی بہت زیادہ ہیں ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کا معنی اس طرح نہیں ہے ' بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے رزق کی وسعت ' خوشحالی اور جسمانی صحت وسلامتی کے جو دروازے ان پر بند کر دیئے تھے ' بطور استدراج اور ان کو ڈھیل دینے کے لیے ہم نے وہ بند دروازے ان پر کھول دیئے۔ اس کی نظیر اس آیت میں ہے :
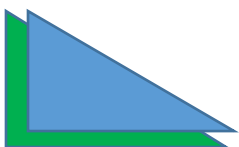
(آیت) " **وما ارسلنا فی قریۃ من نبی الا اخذنا اھلھا بالباسآء والضرآء لعلھم یضرعون، ثم بدلنا مکان السیئۃ الحسنۃ حتی عفوا وقالوا قد مس ابآءنا الضرآء والسرآء فاخذنھم بغتۃ وھم لا یشعرون** "۔ (الاعراف : ۹۵۔ ۹۴)

ترجمہ : ہم نے جب بھی کسی بستی میں کوئی نبی بھیجا تو اس بستی والوں کو (نبی کی تکذیب کی وجہ سے) ہم نے تنگی اور تکلیف میں گرفتار کر لیا ' تاکہ وہ گڑگڑا کر دعا کریں ' پھر ہم نے بدحالی کو خوشحالی سے بدل دیا ' حتی کہ وہ (مال اور اولاد میں) بہت زیادہ ہو گئے اور کہنے لگے ' ہمارے آباء واجداد کو بھی تکلیف اور راحت پہنچتی رہی ہے پھر ہم نے اچانک ان کو اپنی گرفت میں لے لیا درآنحالیکہ ان کو شعور نہ تھا۔

(آیت) " **واملی لھم ان کیدی متین** "۔ (الاعراف : ۱۸۳)

ترجمہ : اور انھیں ڈھیل دیتا ہوں ' بیشک میری خفیہ تدبیر بہت مضبوط ہے۔

محمد بن نضر حارثی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان بستی والوں کو بیس سال مہلت دی تھی۔ ابن جریج نے کہا کہ وہ خوشحالی میں مغرور تھے کہ اچانک ان پر عذاب آگیا۔ ابن زید نے کہا مبلس وہ شخص ہے جس پر ایسی مصیبت آجائے جس کا تدارک نہ ہو سکے۔ یا اس پر ایسا عذاب آئے جس سے بچاؤ نہ کیا جاسکے۔ (جامع البیان ' جز ۷ ص ۲۵۶۔ ۲۵۵ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت)

حضرت عقبہ بن عامر بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب تم یہ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو ان کے گناہوں کے باوجود ان کے سوالوں کے مطابق عطا فرما رہا ہے 'تو یہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے استدراج اور ڈھیل ہے 'پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی پھر جب وہ اس نصیحت کو بھول گئے جو ان کو کی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے (الایہ) (مسند احمد 'رقم الحدیث : ۱۷۳۱۳ 'مطبوعہ دار الفکر بیروت 'طبع جدید '۱۴۱۴ھ)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں 'حسن نے کہا جس شخص پر بھی اللہ نے دنیا وسیع کر دی ہے 'اور اس کو یہ خوف نہ ہو کہ اس کو ڈھیل دی گئی ہے تو اس شخص کا عمل ناقص ہوگا اور اس کی فکر ردی ہوگی اور جس شخص سے اللہ نے دنیا کی وسعت روک لی ہو اور اس نے اس تنگی میں خیر کا گمان نہ کیا ہو 'تو اس شخص کا عمل بھی ناقص ہوگا اور اس کی فکر ردی ہوگی اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف وحی کی جب تم فقر کو اپنی طرف آتا دیکھو تو نیک لوگوں کی طرح مرحبا کہو 'اور جب تم غنا کو اپنی طرف آتا دیکھو تو کہو یہ آزمائش ہے جس میں مجھے مبتلا کیا گیا۔ (الجامع لاحکام القرآن 'جز ۷ ص ۳۳۳ 'مطبوعہ دار الفکر 'بیروت ۱۴۱۵ھ) '

'جن لوگوں نے اپنے رب کے خلاف سرکشی کی تھی 'اس کے رسولوں کی تکذیب کی تھی اور ان کے احکام کی مخالفت کی تھی 'اللہ تعالیٰ نے ان کو اچانک بالکلیہ ہلاک کر دیا اور ان کو صفحہ ہستی سے مٹا کر نیست و نابود کر دیا۔ اس لیے فرمایا پس ظالموں کی جڑ کاٹ دی گئی اور فرمایا تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے 'یعنی کامل ثناء اور مکمل شکر اللہ رب العالمین کے لیے ہے 'جس نے اپنے رسولوں پر اور اپنی اطاعت کرنے والوں پر انعام فرمایا اور ان کو اپنے مخالف کافروں کے خلاف دلائل اور براھین سے غلبہ عطا فرمایا اور کافروں کو ان کے کفر اور رسولوں کی تکذیب کی وجہ سے جس عذاب کی وعید سنائی تھی 'وہ عذاب ان پر نازل کر دیا اور اپنی وعید کو سچا کر دیا۔

(تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

استدراج ایک خاص term ہے مراد ہے نافرمانیوں کے ساتھ ۔گناہوں کے ساتھ دنیا کی نعمتیں ملنا۔ پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔ مسند احمد میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا قول ہے کہ تم کسی بدکار پر نعمت اور خوشحالی کی وجہ سے کبھی مت رشک کرنا۔ تم کو معلوم نہیں کہ مرنے کے بعد اس پر کیا کچھ مشکلات پڑنے والی ہے۔ تو دنیا میں بھی پھر ایسی قوموں پر اللہ کا عذاب آیا۔

(تفسیر تنویر۔زاہدہ تنویر)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی قوم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے اور اس کے باوجود دنیاوی شان و شوکت اور رزق کی فراوانی سے لطف اندوز ہو رہی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ راضی ہے بلکہ اس کے لیے آزمائش اور ڈھیل ہے۔ مثال کے طور پر قارون کے پاس دولت کی اتنی فراوانی تھی کہ اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا مگر جب اچانک اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت آئی تو خزانوں سمیت زمین میں دفن کر دیا گیا۔ اسی طرح فرعون کے خاندان میں ہزاروں سال تک مصر کی حکومت رہی۔ وہ اپنے آپ کو سب سے بڑا رب کہلاتا تھا اور اس نے ہزاروں بے گناہ بچوں کو ذبح کرا دیا مگر جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت آئی تو فرعون کو لشکر سمیت سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ اس کی حکومت اور اس کی فوجیں اسے خدا کے عذاب سے نہ بچا سکیں۔ آج بھی دنیا کے حالات کچھ ایسے ہی ہیں کہ دولت و حکومت ان لوگوں کے پاس ہیں جو ظالم ہیں مگر یہ صورت حال ہمیشہ نہیں رہے گی ظالم لوگ بالآخر ناکام ہوں گے اور ان کے ظلم کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔

(امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

اٹلی کا شہر ہے۔ comi۔ آج تک عبرتناک مثال موجود ہے۔ ہر قسم کی اخلاقی برائی اور عمل میں ان کے ہاں perversion موجود تھا۔ ساتھ ہی ایک آتش فشاں پہاڑ تھا۔ ماؤنٹ وسوبیں وہ پھٹا۔ سارا شہر آناً فاناً لاوے اور راکھ میں ڈھک گیا۔ جو کس حال میں تھا۔ لاوے نے اسے اسی حال میں ڈھانپ لیا۔ جو گناہ کا کام وہ کر رہے تھے اسی حالت میں ان کے کھنڈرات نکلے ہیں۔ پورا شہر اسی طرح preserve ہوا ہوا ہے۔ ہر چیز ان کی اسی طرح موجود ہے۔ ہزاروں سال بعد excavation ہوئے۔ کھنڈرات برآمد ہوئے۔ تو پتہ چلا کہ انتہائی بے حیا اور انتہائی بے حیا اور انتہائی perverted ان کا کلچر تھا۔ عباد بن قامت (رض) سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جب اللہ کسی قوم کو باقی رکھنا چاہتا ہے اور باقی رکھنا چاہتا ہے تو دو وصف دو کوالیٹیز ان میں پیدا فرمادیتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہر کام میں اعتدال اور میانہ روی moderation ہوتا ہے ان کے اندر۔ امت مسلط اسے ہم نے پڑھا ہے قرآن میں۔ معتدل لوگ ہوتے ہیں۔ دوسرے عفت اور عصمت۔ حیا ہوتی ہے۔ اپنے کردار کی حفاظت کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور جب کسی قوم کو اللہ ہلاک کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو ان میں خیانت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ خیانت اور بدعملیوں کے باوجود دنیا میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ لیکن یوں سمجھیں جیسے کہ ان کی زندگیوں کی مہلت اب ختم ہی ہونے والی ہے۔ فرمایا۔ جب وہ خوب مگن ہوئے اچانک ہم نے ان کو پکڑ لیا۔ اب حال یہ تھا کہ وہ اب ہر چیز سے مایوس تھے۔

(تفسیر تنویر۔ زاہدہ تنویر)

حضرت حسن بصری وغیرہ علمائے کرام نے فرمایا ہے۔ (محاسن، ابن کثیر وغیرہ)۔ سو جب معاصی وذنوب کے ارتکاب کے باوجود دنیا ملنے لگے تو اس سے خوش ہونے کی بجائے فوراً توبہ واستغفار اور رجوع الی اللہ کی فکر کرنی چاہیے۔ وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْقُ لِمَا یُحِبُّ وَیُرِیْدُ۔ اللہ نفس وشیطان کے ہر شر سے ہمیشہ محفوظ رکھے۔ آمین۔ (تفسیر مدنی۔ مولانا اسحاق مدنی کشمیر)

فوائد

۱۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ ومعاصی کے باوجود دنیاوی راحتیں ملنا اللہ کا غضب اور عذاب ہے کہ اس سے انسان اور زیادہ غافل ہو کر گناہ پر دلیر ہو جاتا ہے۔ بلکہ کبھی خیال کرتا ہے کہ گناہ اچھی چیز ہے ورنہ مجھے یہ نعمتیں نہ ملتیں۔ یہ کفر ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ نیک کار پر تکالیف آنا رحمت الٰہی کا ذریعہ ہے کہ اس سے اس صالح کے درجات بلند ہوتے ہیں۔

۲۔ رب کی نعمت پر خوش ہونا اگر فخر تکبر اور شیخی کے طور پر ہو تو برا ہے اور طریقہ کفار ہے اور اگر شکر کے لیے ہو تو بہتر ہے۔ طریقہ صالحین ہے۔ رب فرماتا ہے۔ واما بنعمۃ ربک فحدث۔ اور فرماتا ہے قل بفضل اللہ وبرحمتہ فبذلک فلیفرحوا یہاں پہلی صورت مراد ہے۔

۳۔ مومن کی موت کے تین نام ہیں۔ (1 وفات) یعنی اپنا کام پورا کر دینے کا وقت۔ آگے آرام وانعام کا وقت۔ (2) وصال یعنی یار سے ملنے کا ذریعہ (3) شہادت یعنی رب کی بارگاہ میں حاضری کا ذریعہ۔ کافر کی موت کے بھی تین نام ہیں۔ تدمیر (تباہی) فدمنراہم تدمیرا۔ ہلاکت۔ اھلکنا ہم اور اخذ اخذنا ہم یونہی مومن کی زندگی کا نام حیات طیبہ ہے، کافر کی زندگی کا نام معیشۃ ضنکا۔
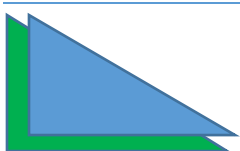
۴۔ اس سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اچانک موت بری ہے کہ اس میں توبہ کا وقت نہیں ملتا۔ مگر غافل کے لیے یہ عذاب ہے۔ مومن متقی کے لیے رحمت کہ بیماری کی تکلیف سے بچ جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت سلیمان و موسیٰ عزیر (علیہ السلام) کی وفات اچانک ہوئی۔ غافل بیمار ہو کر مرے تب بھی اچانک، مومن اچانک مرے تب بھی تیار کرکے مرتا ہے۔ (تفسیر نور العرفان۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی)

آیت مبارکہ :

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

45○

لغۃ القرآن : [فَقُطِعَ : کاٹ دی گئیں] [دَابِرُ : جڑیں] [الْقَوْمِ : قوم] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ] [ظَلَمُوْا : ظلم کیا جنہوں نے] [ۭوَالْحَمْدُ : اور تمام تعریفیں] [لِلّٰهِ : اللہ کے لیے] [رَبِّ : رب] [الْعٰلَمِيْنَ : جہانوں کا]

ترجمہ : پس ظلم کرنے والی قوم کی جڑ کاٹ دی گئی، اور تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے

تشریح :

ظالم قومیں جن کی چیرہ دستیوں سے اللہ کی مخلوق تنگ آچکی ہوتی ہے جب تباہ و برباد کردی جاتی ہیں تو ہر طرف اطمینان اور آرام کا سانس لیا جاتا ہے۔ اور واقعی وہ لمحہ اس قابل ہے کہ مظلوم اور ستم رسیدہ لوگ اپنے رب کریم کی حمد و ثنا کے گیت گائیں جس نے ان کی بے کسی اور بے بسی پر ترس کھا کر ان کو ان جابر ظالموں کی قید غلامی سے نجات بخشی۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

بے دینوں اور ظالموں کی ہلاکت اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے

اس سے معلوم ہوا کہ گمراہوں، بے دینوں اور ظالموں کی ہلاکت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اس پر شکر کرنا چاہیے۔ حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور صحابہ کرام (رض) کی سیرت مبارکہ میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں چنانچہ

ابو جہل کے قتل پر حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سجدہ شکر ادا کیا۔

عاشورہ کے دن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے روزہ رکھنے کا حکم دیا کہ اس دن فرعون ہلاک ہوا۔

حضرت ابو بکر صدیق (رض) نے یمامہ کی فتح اور مسیلمہ کذاب کے مرنے کی خبر ملنے پر سجدہ شکر کیا اور حضرت علی المرتضٰی (رض) نے جب (خارجیوں کے درمیان) ذُوالثَّدِیَّہ یعنی دو پستانوں والے مرد کو مردہ پایا تو سجدہ شکر کیا۔

لہٰذا مومن کی وفات پر "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ "پڑھئے اور موذی کافر کی موت پر "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ "پڑھئے۔

(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا اللہ کا بسایا ہوا ایک چمن ہے ‘ جس میں قومیں رنگارنگ پھولوں کی طرح بہار دے رہی ہیں۔ جب ان میں کوئی زہریلا درخت پیدا ہو جاتا ہے اور پھر اس کی ایک ایک چیز بدبو دینے لگتی ہے اس سے نکلنے والی گیس اس سے نکلنے والی شاخیں ‘ اس سے نکلنے والی بو ‘ جب سمیت پھیلانے لگتی ہے تو اللہ جو اس چمن کا نگران ہے وہ شروع شروع میں اسے پھیلنے سے روکتا ہے اور اس کے علاج کی فکر کرتا ہے۔ لیکن جب اس کا پھیلاؤ بڑھنے لگتا ہے تو پھر وہ اس کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ قوموں کے ساتھ بھی ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں ایسی قوموں کو ظالم کہا گیا ہے۔ یعنی وہ ظلم کی وجہ سے اپنے برے انجام سے دوچار ہوئیں۔ ظلم کا معنی ہے کسی چیز کو ایسی جگہ رکھنا جو اس کے رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ اسے اس طرح استعمال کرنا جو اس کے استعمال کا طریقہ نہیں۔ یہ لوگ ان معنوں میں ظالم تھے کہ انھوں نے ایک ایک نعمت اور ایک ایک صلاحیت کا غلط استعمال کیا۔ اللہ نے ان کو سر دیا تھا اللہ کے سامنے جھکانے کے لیے انھوں نے معبود باطلہ کے سامنے جھکا کر ظلم کیا۔ انھیں دل بخشا گیا تھا اللہ کے تصور اور اس کی محبت سے آباد رکھنے کے لیے۔ انھوں نے تمام طاغوتی قوتوں کو اپنے دل میں بسا کر اس دل سے ظلم کیا۔ اللہ نے ان کو ایک ایک نعمت عطا فرمائی تھی ‘ تاکہ یہ لوگ اللہ کا شکر ادا کریں۔ انھوں نے کفران نعمت کرکے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ اس کے نتیجے میں یہ لوگ اپنے انجام کو پہنچے۔

آج اللہ ظالم قوتوں کی جڑ کیوں نہیں کاٹ رہا؟

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ آج دنیا میں کیسی کیسی ظالم قوتیں ہیں ‘ جنھوں نے انسانیت کا مستقبل ہول ناک بنا دیا ہے۔ انسانوں پر وہ وہ ظلم ڈھائے جا رہے ہیں کہ گزشتہ ادوار میں جنھیں ہم قرون مظلمہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ایسے ظلم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور جب سے دنیا کی تاریخ معلوم ہے انسان دشمنی کی کوئی ایسی مثال ہمیں ڈھونڈے سے نہیں ملتی ‘ فلسطینیوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے جو کچھ اس سے پہلے بوسینیا میں ہو چکا ہے ‘ چیچنیا میں جو قیامت گزر گئی ‘ افغانستان میں انسان دشمنی اور درندگی کے جو ریکارڈ قائم کیے گئے اور آج تک ان کا سلسلہ جاری ہے اور کرنے والے ہاتھ وہ ہیں جنھیں اپنی تہذیب و تمدن اور انسان دوستی کے بڑے دعوے ہیں۔ آخر ان ظالموں کی جڑ کیوں نہیں کاٹی جاتی۔ یہ ظالم قوتیں روز افزوں سرفراز کیوں ہیں دنیا ان کے سامنے کیوں بے بس ہوتی جا رہی ہے ؟ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اللہ کا ایک قانون ہے کہ جب وہ قومیں جو اللہ کے دین کی علمبردار ہیں اور جنھیں دنیا میں عدل و احسان قائم کرنا ہے۔ اپنے مقصد زندگی کو بھول جائیں اور خود اپنے اپنے ممالک میں اللہ کی نافرمانی اور انسانی ظلم کی داستانیں دہراتے ہوئے کبھی اللہ کا خوف محسوس نہ کریں ‘ اللہ اگر انھیں دنیوی جاہ و منزلت اور دولت دنیا کے خزانے حوالے کر دے تو انھیں کفر کی خدمت یا اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے استعمال کریں اور خود دینی قوتوں پر ایسے ایسے مظالم ڈھائیں کہ انھیں دیکھ کر کفر بھی شرمانے لگے تو پھر اللہ تعالیٰ

ان ظالم قوتوں سے وہ کام لیتا ہے 'جو ایک ڈاکٹر ایک سڑ جانے والے عضو کو کاٹنے اور اسے انسانی جسم سے الگ کرنے کے لیے خنجر اور نشتر سے لیتا ہے۔ پھر دنیا میں بظاہر اسلامی خلافت بھی موجود ہو تو تقدیر چنگیز خان کے نشتر سے مسلمان امت کا آپریشن کرتی ہے 'تاکہ اس سے فاسد مادہ نکلے اور اس میں نشاۃ ثانیہ کے امکانات پیدا ہوں اور اگر مسلمان اپنی اصل حیثیت کو بر صغیر میں گم کر دے تو تیمور جیسے لوگوں سے تقدیر آپریشن کے نشتر کا کام لیتی ہے۔ اسی کو اقبالؒ نے کہا تھا کہ

ع تقدیر کے نشتر ہیں تیمور ہوں یا چنگیز

قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے:

وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (الانعام: ۱۲۹)

(اسی طرح ہم ظالموں کو ظالموں پر مسلط کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے انھیں سزا دلواتے ہیں)

یہ آج جو کچھ ہو رہا ہے 'یہ امت مسلمہ کو ان کے اعمال کی سزا مل رہی ہے۔ عوام نے جس طرح ظالموں کو برداشت کیا یا ظالموں کی خوشامد کرتے ہوئے ہمیشہ ان کے ظلم کی تائید کی اور دونوں نے مل کر اللہ کے دین کا راستہ روکا اور بعض علاقوں میں دین کے حوالے سے بے حسی اور بے اعتنائی کا ثبوت دیا گیا اور مجموعی طور پر دنیا کو اپنا مقصد زندگی بنا کر دین کو اجتماعی زندگی سے خارج کر دیا اور غضب خدا کا پورے عالم اسلام میں کہیں بھی اللہ کی حاکمیت کو نافذ کرنا تو دور کی بات ہے 'برداشت بھی نہیں کیا گیا اور جو قوتیں اس کے لیے کوشاں ہیں انھیں اپنے اپنے ملکوں میں نہ صرف اجنبی بنا دیا گیا بلکہ انھیں اذیتوں کا نشانہ بنایا گیا اور اب رفتہ رفتہ انھیں ایک گالی بنا دیا گیا ہے۔ یہ وہ اعمال ہیں 'جس کی پاداش میں امت مسلمہ آج عذاب کی گرفت میں ہے اور مغربی قوتوں سے ان کے اعمال کی سزا دلوائی جا رہی ہے۔ آج اس عذاب سے بچنے کی صرف ایک صورت ہے کہ امت مسلمہ مجموعی طور پر یا اس کا کوئی ایک ملک اسلام کا نمائندہ بن جائے۔ اسلام کو اپنا آئین بنا کر زندگی کے ہر شعبے کو اسلام کی تحویل میں دے دے اور پھر اول و آخر اسلام کا نمائندہ بن کر اپنے ملک کی ترقی کے اسباب پیدا کرے اور حکمت و بصیرت سے کام لیتے ہوئے مشکلات میں اپنے لیے راستہ نکالے۔ شروع میں قدرت کی طرف سے ان کے اخلاص کی آزمائش ہو گی 'لیکن بالآخر یہ ملک ایک عظیم قوت بن کر اٹھے گا اور قدرت ان کو اسی طرح نوازے گی جیسے قرون اولیٰ میں مسلمانوں کو نوازا گیا۔ پھر آج کی ظالم قوتیں یا اس کے سامنے جھک جائیں گی یا مٹ جائیں گی۔ تاریخ کے ہر دور میں قدرت کا یہی قانون کارفرما رہا ہے اور آج بھی اللہ کی اس سنت کے بدل جانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا "وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ "یعنی ہر طرح کا شکر اور ہر طرح کی تعریف اس اللہ کے لیے ہے 'جو جہانوں کا رب ہے۔ یعنی جس کی صفت ربوبیت نے تمام انسانوں کو زندگی کے امکانات عطا فرمائے ہیں۔ وہ ایک بچے سے لے کر بوڑھے تک اور ایک عام فرد سے لے کر ایک قوم تک اور قوم سے لے کر تمام اقوام دنیا تک صرف زندگی ہی نہیں دیتا بلکہ زندگی کے امکانات زندگی کے اسباب زندگی کے وسائل ظاہری اور معنوی 'ہر حیثیت سے عطا کرتا ہے کیونکہ وہ سب کا رب ہے 'سب کا پالنہار ہے۔ ظاہر ہے کہ جس نے اس طرح زندگی کے اسباب فراہم کر کے زندگی کو عام کیا ہے 'وہ کبھی یہ برداشت نہیں کرتا کہ دنیا میں زندگی دشوار بنا دی جائے۔ چنانچہ جب ایسی قومیں سر اٹھاتی ہیں 'جو دنیا میں زندگی کو دشوار کر دیتی ہیں تو پھر ان کو مٹا دینے اور ان کی جڑ کاٹ دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ایک ایسی قوت کو ختم کر دیا ہے جو انسانی زندگی کے لیے تباہ کن اور مہلک تھی اور جس کی موجودگی میں باقی انسانیت کے پھلنے پھولنے کے امکانات روز بروز کم ہوتے جا

رہے تھے۔ ایسی قوت کی موت گویا دوسروں کے لیے زندگی کا پیغام ہے۔ اس لیے جب ایسا کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو جس طرح ایک بدمعاش اور ڈاکو کے مرجانے سے پوری بستی سکھ کا سانس لیتی ہے اور اس پر اللہ کا شکر بجالاتی ہے ' اسی طرح ایسی قوم کے تباہ کردینے سے پوری نوع انسانی ' بلکہ کائنات کی دوسری مخلوقات بھی اللہ کی تعریف میں رطب اللساں ہوتی ہیں اور اس کا شکر ادا کرتی ہیں۔ سورۃ البقرہ اور دوسرے پارے کے آخر میں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اگر ہم اس طرح بعض قوموں کو تباہ نہ کرتے تو زمین فساد سے بھر جاتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ اہل دنیا پر بہت فضل و کرم کی نگاہ رکھتا ہے۔ اس لیے وہ ظالم قوتوں کو ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ اس لحاظ سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مغربی قوموں کا ظلم جس حد تک پہنچ چکا ہے ' شاید وہ تاریخ میں زیادہ عرصہ تک اپنا رویہ باقی نہ رکھ سکیں۔ امت مسلمہ کے لیے یہ ایک موقع ہے کہ وہ اپنے فرض کو پہچانے اور اللہ کے دین کی علمبردار بن کر شہادت حق کا فرض انجام دینے کے لیے اٹھ کھڑی ہو۔ اس کے نتیجے میں اللہ کا یہ قانون ضرور حرکت میں آئے گا کہ وہ کمزوروں کو طاقت عطا فرماتا ہے اور ظالم قوتوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔

یہاں ایک اور بات سمجھنا بہت ضروری ہے کہ ان آیات میں جو کچھ فرمایا جارہا ہے اس کے مخاطب وہ لوگ ہیں ' جو بار بار اللہ کے عذاب کا مطالبہ کرتے تھے۔ ان کے سامنے اللہ نے اپنی سنت کو پوری تفصیل سے بیان فرما کر یہ واضح کردیا ہے کہ ہم کسی بھی قوم پر عذاب لانے سے پہلے پوری طرح اس پراسس کو بروئے کار لاتے ہیں جو اس کے لیے ضروری ہے اور اس قوم پر پوری طرح اتمام حجت کرتے ہیں تاکہ کل کو وہ کوئی عذر پیش نہ کرسکیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ تاریخی طور پر پہلی معذب قوموں کا حوالہ دے کر مشرکین مکہ اور ان عذاب کا مطالبہ کرنے والوں پر یہ بات کھول دی گئی ہے کہ جو لوگ اس طرح عذاب کا مطالبہ جاری رکھتے ہیں انھیں کبھی ہدایت سے نوازا نہیں جاتا۔ وہ بالآخر اس عذاب کی گرفت میں آکر رہتے ہیں۔ اس لیے اے مشرکین مکہ ! اگر تم نے یہ سلسلہ جاری رکھا اور اپنی روش سے باز نہ آئے تو بالآخر تم بھی اسی انجام کو پہنچوگے ' جس انجام سے پہلی امتیں دوچار ہوچکی ہیں۔

مشرکین مکہ کے مطالبہ عذاب پر بہت کچھ کہا جاچکا ' لیکن اگلی آیت کریمہ میں ایک دوسرے پہلو سے اسی مطالبہ کا جواب دیا جارہا ہے :

(روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی تعلیقاً)

آیت مبارکہ :

قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ اَخَذَ اللّٰهُ سَمۡعَكُمۡ وَاَبۡصَارَكُمۡ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوۡبِكُمۡ مَّنۡ اِلٰـهٌ غَيۡرُ اللّٰهِ يَاۡتِيۡكُمۡ بِهٖ‌ ؕ اُنْظُرۡ كَيۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰيٰتِ ثُمَّ هُمۡ يَصۡدِفُوۡنَ ۝46

لغۃالقرآن: [قُلْ : فرما دیجیے] [اَرَءَيْتُمْ : مجھے بتلاؤ] [اِنْ اَخَذَ : اگر پکڑلے] [اللّٰهُ : اللہ] [سَمْعَكُمْ : تمہارے کان] [وَاَبْصَارَكُمْ : اور تمہاری آنکھیں] [وَخَتَمَ : اور مہر لگا دے] [عَلٰي : پر] [قُلُوْبِكُمْ : تمہارے دل] [مَّنْ : کون] [اِلٰهٌ: معبود] [غَيْرُ : علاوہ] [اللّٰهِ : اللہ] [يَاْتِيْكُمْ بِهٖ : جو لادے تمہیں] [اُنْظُرْ : یہ دیکھیں] [كَيْفَ : کس طرح] [نُصَرِّفُ : ہم پھیرتے ہیں] [الْاٰيٰتِ : آیات] [ثُمَّ : پھر] [هُمْ يَصْدِفُوْنَ : وہ اعراض کرتے ہیں]

ترجمہ : (ان سے) فرما دیجئے کہ تم یہ تو بتاؤ اگر اللہ تمہاری سماعت اور تمہاری آنکھیں لے لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے (تو) اللہ کے سوا کون معبود ایسا ہے جو یہ (نعمتیں دوبارہ) تمہارے پاس لے آئے؟ دیکھئے ہم کس طرح گوناگوں آیتیں بیان کرتے ہیں پھر (بھی) وہ روگردانی کئے جاتے ہیں

تشریح:

اللہ تعالیٰ مشرکین کے عقیدہ کی بے سروپائی کو ایک اور طریقہ سے واضح فرمارہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم دیتے ہیں کہ ان بیوقوفوں سے دریافت فرمایئے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں اندھا اور بہرہ کردے اور تمہارے دلوں پر غفلت کے پردے ڈال دے اور سمجھنے اور سوچنے کی قوت سلب کرلے تو بھلا بتاؤ تمہارے یہ خدا جن کی تم پوجا کیا کرتے ہو ان سے کسی میں ہمت ہے کہ وہ تمہیں یہ چیزیں عطا کردے۔ اور اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو پھر معبود حقیقی کو چھوڑ کر ان باطل اور عاجز چیزوں کی عبادت کرنا کہاں عقلمندی ہے کتنی واضح اور مضبوط دلیل ہے جس سے ہر ادنیٰ اور اعلیٰ، عامی اور عارف یکساں طور پر ہدایت کی روشنی حاصل کرسکتا ہے۔

قرآن کریم کا اسلوب استدلال اکتا دینے والا نہیں بلکہ اس میں وہ رنگینی اور تنوع ہے کہ طبیعت ہر بار ایک نیا لطف محسوس کرتی ہے اور ایک نئی لذت سے سرشار ہوتی ہے۔ کبھی عقلی دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔ کبھی تاریخی شواہد مذکور ہوتے ہیں۔ کبھی اپنی رحمت کا مژدہ سنایا جاتا ہے اور کبھی اپنی ناراضگی اور غضب کے انجام سے ڈرایا جاتا ہے۔ **وتصرف الایات الاتیان بها علی جهات من اعذار وانذار وترغیب وترهیب ونحو ذلك** (قرطبی، تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

{ **اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ** : دیکھو ہم کیسے بار بار نشانیاں بیان کرتے ہیں۔ } یعنی اے حبیب ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ، آپ دیکھیں کہ کبھی ہم انھیں اپنی نعمتیں یاد دلا کر ایمان لانے کی ترغیب دیتے ہیں ، کبھی سابقہ امتوں پر آنے والے عذابات یاد دلا کر اور کبھی اس بات سے ڈراتے ہیں کہ ہم چاہیں تو ان کے کانوں ، آنکھوں اور دلوں کو بے کار کر دیں اور کبھی ان کے سامنے اپنی الوہیت ، قدرت اور وحدانیت پر دلائل پیش کرتے ہیں تاکہ یہ کسی طرح ایمان لے آئیں لیکن ان کا حال یہ ہے کہ یہ ان نشانیوں سے منہ پھیر لیتے ہیں اور ایمان نہیں لاتے۔

(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

اللہ تعالیٰ کے مستحق عبادت ہونے پر دلیل

اس آیت سے اللہ تعالیٰ کی حکیمانہ خالقیت پر استدلال کرنا مقصود ہے کیونکہ انسان کے اشرف الاعضاء کان آنکھیں اور دل ہیں۔ کان قوت سامعہ کا محل ہیں ' آنکھیں قوت باصرہ کا محل ہیں اور دل حیات ' عقل اور علم کا محل ہے۔ اگر ان اعضاء سے یہ صفات زائل ہو جائیں تو انسان کے حواس اور اس کی کارکردگی کا نظام فاسد ہو جائے گا اور وہ دین و دنیا کے فوائد حاصل کرنے سے محروم ہو جائے گا اور یہ بالبداہت معلوم ہے کہ جس ذات نے ان قوتوں کو پیدا کیا اور ان کو زائل ہونے سے محفوظ رکھا ہے ' وہ اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ ان عظیم الشان اور عالی قدر نعمتوں کا دینے والا صرف سبحانہ وتعالیٰ ہے تو پھر یہ کہنا واجب ہے کہ تعظیم ' ثناء اور عبادت کا مستحق بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ بتوں کی عبادت کرنا باطل اور فاسد طریقہ ہے۔

اس آیت میں فرمایا ہے اگر وہ تمہارے دلوں پر مہر لگا دے۔ اس کا ایک معنی ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کے دلوں پر مہر لگا دے جس سے وہ ہدایت کو نہ سمجھ سکیں اور اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی عقلوں کو بالکل زائل کردے اور وہ پاگلوں اور مجنونوں کی طرح ہو جائیں اور اس کا تیسرا معنی یہ ہے کہ اللہ ان کے دلوں کو مردہ کر دے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ' دیکھئے ہم کس طرح بار بار دلائل بیان کرتے ہیں یعنی کبھی ہم انھیں اپنی نعمتیں یاد دلا کر ان کو ایمان لانے کی ترغیب دیتے ہیں اور کبھی انھیں پچھلی امتوں کا عذاب یاد دلا کر ڈراتے ہیں اور کبھی اس بات سے ڈراتے ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو تمہارے اشرف الاعضاء کو معطل اور بے کار کر دیں ' تاکہ تم ایمان لے آؤ اور کبھی اپنی الوہیت ' قدرت اور توحید پر دلائل پیش کرتے ہیں کہ تم ان دلائل سے متاثر ہو کر ایمان لے آؤ۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

کافروں کو بتایا جا رہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہاری صلاحیتیں سلب کر لے تو بتلاؤ کہ اس کے سوا کون ان کی قوت کار کو بحال کر سکتا ہے یاد رہے کہ جب اللہ تعالیٰ جسمانی اعضاء میں سے کسی ایک کو مکمل طور پر مفلوج کر دیتا ہے تو دنیا کا کوئی ڈاکٹر اور سرجن اسے بحال نہیں کر سکتا۔ مثال کے

طور پر اگر کسی شخص کی انگلی کٹ جائے تو دوبارہ انگلی کا وجود میں آنا ناممکن ہے اسی طرح اگر آنکھ اور کان اپنے مکمل نظام کے ساتھ ناکارہ ہو جائیں تو انھیں دوبارہ کارآمد بنانا کسی سرجن کے بس کا روگ نہیں۔اس لیے لفظ "اُنْظُرْ" کہہ کر توجہ دلائی گئی ہے کہ دیکھو اور غور کرو کہ اللہ تعالیٰ حقائق اور اپنی آیات کو کسی طرح مختلف زاویوں کے ساتھ بیان کرتا ہے لیکن اس کے باوجود لوگ بات سمجھنے اور ہدایت پانے کے لیے تیار نہیں ہوتے یہاں تیسری بار غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے کہ جس عذاب کا تم مطالبہ کرتے ہو وہ اللہ کے لیے مشکل نہیں۔

(اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِی قَلْبِی نُورًا وَفِی بَصَرِی نُورًا وَفِی سَمْعِی نُورًا وَعَنْ یَمِینِی نُورًا وَعَنْ یَسَارِی نُورًا وَفَوْقِی نُورًا وَتَحْتِی نُورًا وَأَمَامِی نُورًا وَخَلْفِی نُورًا وَاجْعَلْ لِّی نُورًا) [رواہ البخاری، کتاب الدعوات، باب الدعا اذا انتبہ باللیل]

"اے اللہ میرے دل میں نور پیدا فرما دے میری نگاہ میں بھی نور، میرے کانوں میں بھی نور، میرے دائیں بھی نور، میرے بائیں بھی نور، میرے اوپر بھی نور، میرے نیچے بھی نور، میرے آگے بھی نور، میرے پیچھے بھی نور، اور میرے لیے نور پیدا فرما۔"

(عَنْ عَائِشَۃَ (رض) قَالَتْ کَانَ رَسُولُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یَقُولُ اللّٰھُمَّ عَافِنِی فِی جَسَدِی وَعَافِنِی فِی بَصَرِی وَاجْعَلْہُ الْوَارِثَ مِنِّی لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ الْحَلِیمُ الْکَرِیمُ سُبْحَانَ اللّٰہِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِیمِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِینَ)

[رواہ الترمذی: کتاب الدعوات عن رسول اللہ، باب ماجاء فی جامع الدعوات عن النبی]

"حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرمایا کرتے تھے اے اللہ ! میرے جسم کو عافیت دے اور میری بصارت کو بھی عافیت دے اور میری طرف سے اس کو وارث بنا دے۔اللہ کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں جو کہ بردبار اور عزت والا ہے، اللہ تعالیٰ پاک ہے اور بہت بڑے عرش کا رب ہے اور تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو کہ تمام جہانوں کا رب ہے۔"

(تفسیر فہم القرآن۔میاں محمد جمیل القران)

اس بات کی طرف بھی اشارہ محسوس ہوتا ہے کہ تم جو بار بار رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کوئی نہ کوئی نشانی مانگتے ہو ' حالانکہ تمہارے پاس یہ قوتیں 'جن کے ذریعے سے تم زندگی کی خوشیوں سے متمتع ہو رہے ہو ' بجائے خود اللہ کی کتنی بڑی نشانیاں ہیں۔ان میں سے کوئی ایک نشانی بھی تم سے چھن جائے 'تب تمہیں اندازہ ہو کہ اس کی قدر و قیمت کیا ہے۔آنکھ ہی کو دیکھ لو۔یہ اس کی رحمتوں کا خزانہ ہے ' جس کے نتیجے میں انسان پر لطف و لذت کی ایک ایسی بے کراں دنیا وجود میں آتی ہے کہ جس کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے ' جب آدمی اس نعمت سے محروم ہو جاتا ہے۔کسی اندھے سے پوچھ کر دیکھیے کہ طلوع صبح کا حسن کیا ہوتا ہے۔شام جب پردہ شب میں محجوب ہوتی ہے تو وہ کیسے کیسے تسکین و اطمینان کے خزانے لٹاکے جاتی ہے۔رات کا آرام و راحت اپنے اندر قدرت کی کتنی بڑی دولت کا حامل ہے۔زمین پر پھیلے ہوئے بے کراں مناظر حسن اور آسمان پر سورج چاند اور ستاروں کی پھیلی ہوئی خوبصورت کائنات اللہ کی کتنی بڑی عنایت ہے۔آدمی ان میں سے کسی ایک بات پر بھی غور کرے تو وہ کبھی اس کی گرفت سے نکل نہ سکے۔اسی طرح یہ کان کا ایک چھوٹا سا پرزہ 'جس کے نتیجے میں ہم چڑیوں کے چہچہوں سے لے کر آواز اور سُر کے بے کراں سمندر سے جس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں اور جس طرح کانوں کے ذریعے سرود و غنا کی آبشار آدمی کے اندر گرتی ہے کبھی آدمی اس نعمت کی وسعتوں پر غور کرے تو شاید اسے اس نعمت کی کسی حد تک قدر و قیمت کا احساس ہو سکے۔اللہ نہ کرے کوئی آدمی خطرے میں گھر جائے اور قوت سماعت جواب دے جائے تو مدد دینے والے اس کو مدد دینے کے لیے چیختے رہیں وہ محض اس نعمت سے محرومی کے باعث کسی کو مدد کے لیے پکار بھی نہیں سکے گا۔یہ بظاہر ایک مختصر سا آلہ سماعت ہے اور آنکھ بظاہر دو سوراخوں کا نام

ہے ' لیکن اگر اللہ نہ کرے کوئی آدمی اس سے محروم ہو جائے تو دنیا بھر کے سائنسدان اس نعمت سے آدمی کو بہرہ ور نہیں کر سکتے۔ کسی سائنسدان کی پوتی کھیلتی ہوئی اس کی لیبارٹری میں چلی گئی۔ اس نے اس کی طرف دیکھا تو نجانے کیسے کان پر نظر آ کر رک گئی۔ سائنسدان اٹھ کر اپنی اس بچی کے پاس آیا اور اس کے کان کو پکڑ کر کہنے لگا : بظاہر یہ ایک چھوٹا سا آلہ ہے ' لیکن یہ اتنی بڑی چیز ہے کہ اگر یہ ضائع ہو جائے تو ہم سارے سائنسدان مل کر اسے نہیں بنا سکتے اور پھر رک کر کہنے لگا کہ جس ذات نے یہ آلہ سماعت پیدا کیا ہے ' کیا وہ ذات خود نہیں سنتی ہو گی اور دل تو ایک ایسی عظیم نعمت ہے کہ نہ صرف کہ زندگی کا سر رشتہ اس سے وابستہ ہے بلکہ انسانی احساسات ' تخیلات ' تصورات ' خوشی اور غم کی لہریں ' وہ سب اسی مرکز سے اٹھتی ہیں۔ نیکی اور بدی کے تصورات ' یہیں جنم لیتے اور یہیں جڑ پکڑتے ہیں۔ اگر یہ گھروندا مسمار ہو جائے تو انسانیت کا گھر اجڑ جاتا ہے۔ اندازہ فرمایئے ! یہ اللہ کی کتنی بڑی نشانیاں ہیں۔ کیا ان نشانیوں کے بعد بھی یہ لوگ اور نشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں ؟ اگر نشانی کا مطالبہ کسی بات کو سمجھنے کے لیے ہے تو اس کے لیے تو یہی نشانیاں کافی ہیں اور اگر محض بات کو الجھانے کا ارادہ ہو تو پھر اس بکھیڑے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے لیے آدمی کی فاسد نیت ہی کافی ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ دیکھو ! ہم کیسے مختلف پہلوؤں سے اپنی آیتیں پیش کرتے ہیں۔ کس طرح ہم بات کو سمجھاتے ہیں ' کس طرح ہر بات کو پانی کیے دیتے ہیں تاکہ سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ لیکن انکار کرنے والوں کو دیکھو کہ وہ پھر بھی اس سے اعراض کرتے ہیں۔ یعنی اللہ کی طرف سے تو ان کے سارے انکار کے باوجود افہام و تفہیم اور تبشیر و انذار کی صورت میں رحمت کی برکھا برس رہی ہے اور ادھر یہ پتھر بنے سنگدلی کا ثبوت دیتے ہوئے ہر بات کے انکار پر تلے ہوئے ہیں۔ بس ان کا حال ایسا ہی ہے ' جیسے کسی شاعر نے کہا کہ

اِدھر لاکھ لاکھ سخن یوں اضطراب میں

اُدھر ایک خاموشی میرے سب کے جواب میں

انسانوں کا باہم یہ معاملہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ لیکن اللہ کی نظر التفات جس کو کائنات ترستی ہے اور جس کے نتیجے میں زندگی عطا ہوتی ہے ' اس کے ساتھ یہ معاملہ صرف بدنصیب ہی کر سکتے ہیں اور مشرکین مکہ ایسے ہی بدنصیب لوگ تھے۔

(روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پوری زندگی پر اگر نظر ڈالی جائے اور آپ ﷺ کے اعمال واخلاق کا بغور مطالعہ کیا جائے تو کھلا معجزہ ہے (قرآن کی عملی شکل وصورت ہے) بلکہ سارے معجزات کا مجموعہ ہے مگر جو لوگ رشتۂ ہدایت سے سراسر محروم تھے اور جانوروں کی زندگی گذار رہے تھے ان میں سے ان کے لیے ان معجزات میں کوئی جاذبیت اور کشش نہیں تھی وہ اپنی نادانی کے مطابق حسی اور مادی معجزات مانگتے تھے ان میں سے بعض تو ان کی فرمائش کے مطابق پورے ہو گئے جیسے شق القمر کا معجزہ کے قریش کے علاوہ دنیا کے بہت سے لوگوں نے اس کو دیکھ لیا یا مٹی کی کنکریوں سے کلمہ شہادت کی آواز آنا مگر ہٹ دھرم اور گمراہ لوگوں نے پھر بھی نہ مانا اور ان معجزات کو سحر اور جادو کہہ کر ان کی تکذیب کی اس آیت کریمہ میں بھی مشرکین کے مطالبہ اور فرمائشوں کی طرف اشارہ ہے جو انہوں نے پیش کی تھی ایک یہ کہ اگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) واقعی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو ساری دنیا کے سارے خزانے ہمارے لئے جمع کریں دوسرے یہ کہ آئندہ حال واقعات جو پیش آئیں گے وہ سب ہمیں بتلادیں تاکہ ہم نقصانات سے اپنا بچاؤ کر سکیں۔ (تفسیر منازل العرفان۔ عبد الستار شاہ)

کبھی اللہ کے عذاب سے پوری قوم ہلاک نہیں ہوتی، صرف سرغنے ہلاک ہوتے ہیں

اب دو آیتیں اہم ہیں، ان میں اشارے ہیں جو وقت پر کھلیں گے، ہجرت کے بعد مدنی دور میں ان کے مصادیق پائے گئے، گذشتہ آیت میں تھا کہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ جب کوئی رسول مبعوث کیے جاتے ہیں تو ان کی قوم کو دو طرح سے آزمایا جاتا ہے، پھر اگر دونوں تدبیریں ناکام ہوتی ہیں تو اللہ کا عذاب آتا ہے۔

یہ عذاب دو طرح آتا ہے: کلی اور جزئی، قوم اگر کوئی معین معجزہ طلب کرتی ہے، اور وہ دکھایا جاتا ہے، پھر بھی قوم ایمان نہیں لاتی تو اللہ کا کلی عذاب آتا ہے، اور ساری قوم ہلاک ہو جاتی ہے، اور اگر قوم کوئی معجزہ طلب نہیں کرتی یا کرتی ہے مگر کسی مصلحت سے وہ معجزہ نہیں دکھایا جاتا، اور قوم کفر وعناد پر اڑی رہتی ہے تو ایک وقت کے بعد عذاب آتا ہے، قوم کے سرغنے ہلاک کیے جاتے ہیں اور عوام کے لیے ایمان کا راستہ کھل جاتا ہے۔

یہ بات ایک مثال سے سمجھائی ہے، انسان کی دو ہلاکتیں ہیں۔ ایک پورے وجود کی۔ دوسری اس کے اجزا کی، سماعت ختم ہو جاتی ہے، بصارت جواب دیدیتی ہے، اور دل ودماغ ماؤف ہو جاتے ہیں اور آدمی کسی کام کا نہیں رہتا، الہ تعالیٰ دونوں طرح کی ہلاکتوں پر قادر ہیں، اور معطل شدہ اعجا کو کوئی ٹھیک نہیں کر سکتا، اسی طرح جب اللہ کا عذاب آئے گا تو قریش کے لیڈر ہلاک ہوں گے، اور ان کو کوئی بچا نہیں سکے گا۔

چنانچہ ہجرت کے بعد سن 2 ہجری میں میدان بدر میں قریش کے سب سورمارے گئے، اور جن کے نصیب میں ایمان تھا وہ قید میں آئے، اور فدیہ لے کر چھوڑ دیے گئے۔

(قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَخَذَ اللَّهُ سَمْعَكُمْ وَأَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِهِ انْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُونَ)۔ ترجمہ: پوچھو۔ بتلاؤ، اگر اللہ تعالیٰ تمہاری سماعت اور تمہاری بصارت لے لیں، اور تمہارے دلوں پر مہر کر دیں۔ یعنی ان کو ناکارہ کر دیں۔ تو اللہ کے سوا کوئی معبود ہے جو تم کو یہ چیزیں لا دے؟ دیکھو، ہم کس طرح نہج بدل بدل کر باتیں بیان کرتے ہیں، پھر بھی وہ (قریش) روگردانی کرتے ہیں۔

جزئی ہلاکت میں کفر کے رؤسا کام آتے ہیں

اللہ کے رسول کے ساتھ مخالفت کے نتیجہ میں جو عذاب آتا وہ دو طرح آتا ہے، کبھی چٹ پٹ آتا ہے، جدھر سان گمان بھی نہیں ہوتا ادھر سے آتا ہے، جیسے فرعون سمندر میں ڈوبا تو اس کو کہاں گمان تھا کہ وہ غرقاب ہوگا؟ اور کبھی عذاب ڈھول بجاتا ہوا آتا ہے، پہلے علامات ظاہر ہوتی ہیں، عاد پر عذاب آیا تو بادل کی شکل میں ظاہر ہوا، پھر اس میں سے آگ برسی اور ساری قوم بھن گئی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: قریش پر عذاب خواہ کسی طرح آئے: ظالم ہی ہلاک ہوں گے، چنانچہ بدر کی جنگ اچانک پیش آئی، ان میں چودہ صحابہ شہید ہوئے، ان میں نامور کوئی نہیں تھا، اور کافروں کے ستر رؤسا کھیت رہے، ابو جہل (اس امت کا فرعون) بھی مارا گیا، قریش کا زور ٹوٹ گیا اور پانسہ پلٹ گیا۔

(قُلْ أَرَأَيْتَكُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللَّهِ بَغْتَةً أَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الظَّالِمُونَ)۔

ترجمہ: کہو۔ بتلاؤ اگر اللہ کا عذاب اچانک آئے یا اعلان کرتا ہوا آئے تو ظلم پیشہ لوگوں کے علاوہ بھی کوئی ہلاک ہو گا؟ نہیں! وہی دھار پر رکھ لیے جائیں گے۔

(ہدایت القرآن۔ مفتی سعید احمد پالنپوری)

صدف کا معنی ہے اعراض کرنا، منہ پھیر لینا۔ ثم یہاں بھی استبعاد کے لیے ہے یعنی چاہیے تو یہ تھا کہ اس طرح کے روشن دلائل سے متاثر ہو کر وہ دین حق قبول کرتے مگر یہ الٹا اس سے منہ پھیر رہے ہیں اور روگردانی کر رہے ہیں۔ کیا الٹی سمجھ کے ہیں یہ لوگ۔

آیت مبارکہ :

قُلْ اَرَءَیْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ یُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ○47

لغۃ القرآن: [قُلْ : فرما دیجیے] [اَرَءَیْتَكُمْ : مجھے بتلاؤ تم] [اِنْ : اگر] [اَتٰىكُمْ : تم پر آئے] [عَذَابُ : عذاب] [اللّٰهِ : اللہ کا] [بَغْتَةً : اچانک] [اَوْ جَهْرَةً : یا علانیہ] [هَلْ یُهْلَكُ : نہیں ہلاک کیے جائیں گے] [اِلَّا : مگر] [الْقَوْمُ : قوم [الظّٰلِمُوْنَ : ظلم کرنے والے]

ترجمہ : آپ (ان سے یہ بھی) فرما دیجئے کہ تم مجھے بتاؤ اگر تم پر اللہ کا عذاب اچانک یا کھلم کھلا آن پڑے تو کیا ظالم قوم کے سوا (کوئی اور) ہلاک کیا جائے گا

تشریح:

اس آیت کریمہ میں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً ۔ "بَغْتَةً" کے معنی کسی چیز کے اچانک دفعتاً بغیر کسی نوٹس کے بالکل بے خبری میں آجانے کے ہیں "جَھْرَۃً" کے معنی ہیں 'کھلم کھلا' ڈنکے کی چوٹ' دن دھاڑے۔ یعنی اے پیغمبر! ان سے پوچھئے کہ جس عذاب کا یہ مطالبہ کر رہے ہیں 'اگر وہ چپکے سے یا کھلم کھلا دن دھاڑے آجائے تو کیا انھوں نے اس کو روکنے کا کوئی انتظام کر رکھا ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اس سے بچنے کے لیے ایسے انتظامات کر لیے ہیں کہ وہ عذاب ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور اگر کچھ ایسے انتظامات نہیں ہیں اور ظاہر ہے اللہ کے

عذاب سے بچنے کے لیے کوئی بھی انتظام ممکن نہیں تو پھر یہ آخر کس برتے پر اللہ کے عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ تو ایک ایسی احمقانہ بات ہے ' جس کی امید کسی پاگل سے بھی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن ان کی جسارت کی داد دیجئے کہ یہ مسلسل اس کا مطالبہ کیے جا رہے ہیں اور دوسری یہ بات کہ اگر یہ عذاب آ جائے تو انھیں خوب معلوم ہے کہ اس کا نشانہ کون بنے گا یہ بجلی اگر گری تو انھیں خوب اندازہ ہے کہ کس کا گھر جلے گا۔ اس لیے کہ اللہ کا عذاب تو ہمیشہ اس کے نافرمانوں پر آتا ہے۔ ان لوگوں پر آتا ہے ' جو اللہ کی بجائے کسی اور کو خدا مانتے ہیں۔ جنھوں نے دنیا میں اس کے شریک بنا رکھے ہیں وہ زندگی اس کے احکام کے مطابق گزارنے کی بجائے ' اس کی معصیت میں گزارتے ہیں اور وہ کھلم کھلا اس کی عظمت و کبریائی کو تسلیم کرنے کی بجائے ' اس کی حاکمیت کو چیلنج کرتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ رویہ مسلمانوں کا تو نہیں مشرکین مکہ کا ہے تو پھر جب بھی عذاب آیا تو یہی لوگ اس کی زد میں آئیں گے تو یہ ظالم لوگ خود اپنی شامت کو دعوت کیوں دے رہے ہیں۔ دراصل یہاں جو بات فرمائی گئی ہے ' گزشتہ آیات میں جس سنت اللہ کا تذکرہ ہوا ہے یہ اسی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ جس قوم میں اللہ کے رسول آتے ہیں ' جب وہ قوم اللہ کے رسولوں کو ماننے سے انکار کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو متنبہ کرنے کے لیے ' ان کو مختلف قسم کی تکالیف میں مبتلا کرتا ہے۔ لیکن ان تکالیف میں جس طرح کافر مبتلا ہوتے ہیں ' اسی طرح مسلمان بھی مبتلا ہوتے ہیں۔ کافر یا تو ان تکلیفوں سے متاثر ہو کر راہ راست کی طرف آ جاتے ہیں اور اللہ کو پہچان کر اس کا دین اختیار کر لیتے ہیں اور یا ان کے دل مزید سخت ہو جاتے ہیں اور وہ اللہ کے دین کے خلاف اور کھل کھیلتے ہیں۔ مسلمان ان تکالیف میں مبتلا ہو کر اللہ کے سامنے عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان تکلیفوں سے اللہ کے ساتھ ان کا رشتہ اور مضبوط ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان مصائب پر صبر کے نتیجے میں ان کی سیرت و کردار کی تعمیر ہوتی ہے اور اس میں اور زیادہ جلا پیدا ہوتی ہے۔ کہنا یہ ہے کہ ان تکالیف کا سامنا جس طرح کافروں کو کرنا پڑتا ہے مسلمان بھی کرتے ہیں۔ لیکن جب اللہ کا عذاب آ جاتا ہے تو اللہ کے رسول اور ان پر ایمان لانے والوں کو اس علاقے سے نکال لیا جاتا ہے اور عذاب کا شکار صرف کافر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی قوم پر اللہ کا عذاب آیا تو ان کی طرف آنے والے رسول کو اپنے ماننے والوں سمیت ہجرت کر جانے کا حکم دیا گیا۔ تمام معذب قوموں کی تاریخ پڑھ جایئے ' آپ کو ہر طرف یہ اصول کار فرما دکھائی دے گا۔ سورۃ انفال میں اسی اصول کا تذکرہ کرتے ہوئے کافروں کے مطالبہ عذاب کے جواب میں پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ اے پیغمبر ! جب تک آپ ان میں ہیں ' اس وقت تک ہم ان کو عذاب نہیں دیں گے۔ مطلب یہ کہ جب ہم ان کو عذاب دینے کا فیصلہ کریں گے تو آپ کو وہاں سے نکال لیں گے اور آپ کے متبعین بھی آپ کے ساتھ ہجرت کر کے عافیت کی جگہ پر چلے جائیں گے۔ یہاں اسی اصول کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ نادانوں اس عذاب کا شکار تو تمہیں ہی ہونا ہوگا ' مسلمان تو اس کے فضل و کرم سے بچا لیے جائیں گے تو پھر تم آخر کس کے لیے عذاب کا مطالبہ کرتے ہو۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا عذاب آنے کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں

(1)۔۔ اچانک آنے والا عذاب۔ یہ وہ عذاب ہے جو پیشگی علامتوں کے بغیر آتا ہے اور اس کے ذریعے کفار کو تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔

(2)۔۔ کھلم کھلا آنے والا عذاب۔ یہ وہ عذاب ہے جس کے آنے سے پہلے اس کی علامتیں نمودار ہوتی ہیں تاکہ لوگ اگر اس عذاب سے بچنا چاہیں تو اپنے کفر اور سرکشی سے توبہ کر کے بچ سکتے ہیں اور اگر وہ توبہ نہ کریں تو انھیں عذاب میں مبتلا کر کے تباہ کر دیا جاتا ہے۔

(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

تو فرمایا "پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! مشرکین مکہ کو فرمایئے کہ اگر ان کے پاس رات کی تاریکی میں اچانک یا دن کی روشنی میں اعلانیہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آجائے تو ایسے ظالم لوگ ہی ہلاک ہوں گے جو اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے کیونکہ وہ اسی دنیا کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ جب یہ زندگی گئی تو وہ فی الواقع ہلاک ہو گئے اور آخرت میں ان کے لیے دائمی عذاب کے علاوہ کچھ نہیں۔ اگرچہ ایسے عمومی عذاب میں اہل ایمان بھی اس دنیاوی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں مگر اس عذاب یا آزمائش کے بدلے میں ان کی زندگی کی خطائیں معاف ہو جاتی ہیں اور آخرت کی دائمی زندگی میں عظیم ثواب اور بلند درجات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

(تفسیر کبیر، امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

کافروں کے عمومی عذاب میں آیا مومن بھی مبتلا ہوں گے یا نہیں؟

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے صرف اشرف الاعضاء کو زائل کرنے کی وعید سنائی تھی اور اس آیت میں عمومی عذاب کی وعید سنائی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ عذاب خواہ کسی قسم کا ہو ' اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سوا اس عذاب کو کوئی دور کرنے والا نہیں ہے اسی طرح خواہ کسی قسم کی خیر ہو ' اللہ عزوجل کے سوا اس کا کوئی عطا کرنے والا نہیں ہے۔ اس آیت میں عذاب کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ اچانک اور کھلم کھلا کیونکہ یا تو عذاب کی پہلے علامتیں نمودار ہوں گی یا پیشگی علامتوں کے بغیر عذاب آئے گا۔ ثانی الذکر اچانک عذاب ہے اور اول الذکر کھلم کھلا عذاب ہے۔ ثانی الذکر کا اچانک ہونا ظاہر ہے اور اول الذکر کو کھلم کھلا اس لیے فرمایا کہ اس عذاب کی علامتیں پہلے نمودار ہو چکی تھیں ' حتیٰ کہ اگر وہ اس عذاب سے بچنا چاہتے تو وہ کفر اور سرکشی سے توبہ کرکے بچ سکتے تھے۔ اس آیت میں فرمایا ہے کہ اگر یہ عذاب آجائے تو ظالم لوگوں کے سوا اور کون ہلاک کیا جائے گا اس پر یہ اعتراض ہے کہ جب عمومی عذاب آئے گا تو پھر نیک اور بد کی تمیز نہیں رہے گی اور کافروں کے ساتھ مومن بھی ہلاک ہو جائیں گے؟ جیسے کے اس کا جواب پہلے بیان ہو چکا ہے، امام رازی نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اگرچہ بظاہر مومن اور کافر دونوں ہلاک ہوں گے لیکن حقیقت میں ہلاکت صرف کفار کے لیے ہوگی اور مومنوں کے لیے یہ ضرر عظیم ثواب اور بلند درجات کا سبب ہوگا ' اس لیے ان کے حق میں یہ ہلاکت نہیں ہے۔ لیکن میرے نزدیک اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے ' یہ ہے کہ جب وہ کسی علاقہ کے کافروں پر عمومی عذاب نازل فرماتا ہے تو ایمان والوں کو وہاں سے نکال دیتا ہے ' جیسا کہ حضرت نوح (علیہ السلام) اور حضرت لوط (علیہ السلام) کی قوموں پر جب عذاب نازل فرمایا تو ایمان والوں کو وہاں سے نکال لیا۔

(تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ "ظالم سے کافر مراد ہیں۔ یعنی عذاب الٰہی صرف کافروں کو ہلاک کرنے کے لیے آتا ہے۔ جانوروں یا بعض بے قصور لوگوں کا اس میں مر جانا ان کے لیے عذاب نہیں بلکہ صالحین کے اس کے عوض درجات بلند کر دیئے جائیں گے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔ خیال رہے کہ اس عذاب سے مراد ظاہری عذاب ہے جو گزشتہ امتوں پر آتے تھے۔ عذاب باطنی جیسے نااتفاقی، قحط، قتل و غارت۔ یہ گناہوں سے بھی آجاتے ہیں۔" (تفسیر نور العرفان۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی)

آیت مبارکہ :

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○48

لغۃ القرآن : [وَمَا : اور نہیں] [نُرْسِلُ : ہم بھیجتے] [الْمُرْسَلِيْنَ : رسولوں کو] [اِلَّا : مگر] [مُبَشِّرِيْنَ : خوش خبری دینے] [وَمُنْذِرِيْنَ : اور ڈرانے والے] [فَمَنْ : پھر جو] [اٰمَنَ : ایمان لائے] [وَاَصْلَحَ : اور اصلاح کرے] [فَلَا : پھر نہیں] [خَوْفٌ: خوف] [عَلَيْهِمْ : ان پر] [وَلَا هُمْ : اور نہ وہ] [يَحْزَنُوْنَ : وہ غم گین ہوں گے]

ترجمہ : اور ہم پیغمبروں کو نہیں بھیجتے مگر خوشخبری سنانے والے اور ڈر سنانے والے بنا کر، سو جو شخص ایمان لے آیا اور (عملًا) درست ہو گیا تو ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غم گین ہوں گے

تشریح :

انبیاء کرام کی تشریف آوری کا مقصد یہ نہیں ہو تا کہ وہ نت نئے عجائبات کا مظاہرہ کرتے رہیں اور جیسی کچھ کسی نے فرمائش کی اس کی بجاآوری میں لگے رہیں۔ بلکہ ان کی آمد کا اصلی مقصد یہ ہے کہ نیکوکاروں کو رحمت الٰہی کا مژدہ سنائیں اور بدکاروں اور روسیاہوں کو اس کے عذاب الیم سے ڈرائیں۔ تاکہ نیک اور نیک ہو جائیں اور بدکار اپنی بدی اور گمراہی سے باز آ جائیں۔

ایمان کا تعلق دل سے ہے اور اصلاح کا تعلق اعمال سے۔ یعنی جس کا عقیدہ بھی صحیح ہے اور اعمال بھی نیک ہیں۔ ان کو اندیشہ ہائے سود و زیاں سے نجات دے دی گئی ہے۔ نہ گزرے ہوئے وقت پر وہ ملول و غم گین ہوں گے اور نہ آنے والے حالات کے بارے میں انھیں کچھ تشویش ہو گی۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

اس آیت اور اس کے بعد والی آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم اپنے رسولوں کو اس لیے نہیں بھیجتے کہ کفار ان سے اپنی من مرضی کے معجزات طلب کرتے پھریں بلکہ اس لیے بھیجتے ہیں کہ وہ اپنی قوم کو اطاعت پر ثواب کی بشارت اور نافرمانی کرنے پر عذاب کی وعید سنائیں تو جو اپنے کفر کو چھوڑ کر ان پر ایمان لے آیا اور اس نے اپنے اعمال کی اصلاح کر لی تو ان پر دنیوی یا اخروی عذاب کا کوئی خوف ہے اور نہ وہ ثواب ضائع ہونے کے

اندیشے سے غمگین ہوں گے اور جنہوں نے ہماری ان آیتوں کو جھٹلایا جو ہمارے رسولوں نے ان کے سامنے بیان کیں تو انھیں ان کی مسلسل نافرمانی کے سبب عذاب پہنچے گا۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

انبیاء و رسل کی اصل حیثیت

جب بھی اللہ کا کوئی رسول کسی قوم کی طرف ان کی ہدایت کے لیے آیا تو عموماً اس قوم کا رویہ یہ رہا کہ ان کے اندر شاید ان کا کوئی دشمن اتر آیا ہے یا کوئی ایسا اجنبی ہے جس نے ان سے ایسی باتیں کہنا شروع کر دی ہیں ' جس کا سننا بھی ان کو گوارا نہیں حالانکہ رسول ان کے پاس ایک حیات بخش پیغام لے کر آتا ہے۔ وہ بالکل ان سے سامنے کی باتیں کہتا ہے کہ اللہ تمہارا خالق ہے ' تم اس کی مخلوق ہو ' تمہیں وہ رزق دیتا ہے ' اسی نے تمہیں اولاد دی ہے ' یہ زندگی کا سروسامان سارا اسی کا عطا کردہ ہے۔ خود یہ زمین ' یہ تمہارا ملک ' یہ اسی کی ملک ہے۔ تمہاری تمام صلاحیتیں ' تمہارے جسم و جان کی رعنائیاں ' سب اسی کی دین ہیں۔ میں تمہیں صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ اس کی ان تمام نعمتوں اور تمام احسانات کا تم پر کوئی حق بھی ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس حق کو کس طرح ادا کرنا ہے اور اس کا کیا جواب دینا ہے۔ اسی طرح میں تمہیں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ تمہارا اس سے کیا تعلق ہے اور اس کا تم سے کیا رشتہ ہے۔ وہ تم سے کن باتوں کی وجہ سے راضی ہوتا ہے اور کن سے ناراض ہوتا ہے۔ خود تمہارے باہمی رشتوں کے حقوق و فرائض کیا ہیں۔ تمہیں یہاں کیسی زندگی گزارنی چاہیے ' جس کے نتیجے میں تمہیں یہاں ایک اچھی زندگی میسر آئے۔ تم خوف اور حزن سے بچ جاؤ ' تمہارے اندر آپس کی تلخیاں پیدا نہ ہوں ' جان مال اور عزت و آبرو ہر چیز سلامت رہے اور موت کے بعد بھی جو زندگی آنے والی ہے ' اس میں بھی تمہیں سرخروئی نصیب ہو۔ اندازہ فرمایئے ! ان میں سے ہر بات آدمی کی گم شدہ متاع ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ لوگ اس رسول کی طرف لپکتے ہوئے جائیں اور اپنی زندگی کے اسرار اور زندگی گزارنے کے طریقوں کا علم اس سے سیکھیں۔ لیکن بالکل اس کے برعکس نجانے اس سے کیوں دشمنی شروع کر دی جاتی ہے اور کیوں ان کا راستہ روکنا ' وہ اپنی زندگی کا فرض سمجھ لیتے ہیں۔ اس لیے یہاں اس آیت کریمہ میں مشرکین مکہ کو یہی بات سمجھائی جا رہی ہے کہ نادانوں اللہ کا آخری رسول تمہیں زندگی دینے کے لیے آیا ہے اور ایک زندگی بخش پیغام لے کر تمہارے پاس آیا ہے۔ تم بجائے اس سے فائدہ اٹھانے کے اس سے عذاب کا مطالبہ کرتے ہو۔ کہا باقی رسولوں کی طرح اس کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ تمہیں یہ بتانے کے لیے آیا ہے کہ دیکھو ! اگر اللہ کی فرمان بر داری میں زندگی گزاروگے تو ہم تمہارے پاس بشارتیں لے کر آئیں گے اور اگر اس کی نافرمانی کروگے تو پھر ہم تمہارے انجام سے تمہیں خبر دار کرنے کے لیے آئے ہیں ' یہ ہماری اصل حیثیت ہے۔ اس میں ہم سے لڑنے اور بار بار عذاب کا مطالبہ کرنے کی آخر کیا تک ہے ؟ رہی یہ بات کہ اگر تم ہماری دعوت کو قبول کر لوگے تو ہم اس پر تمہیں کیا بشارت دیں گے۔ اس کی وضاحت اسی آیت کے دوسرے جملے میں فرمائی گئی۔

فرمایا:

فَمَنْ اٰمَنَ وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ

(تو جو ایمان لائے اور جنھوں نے اصلاح کر لی تو ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم)

میں نہیں سمجھا کہ اس سے بڑھ کر ایک آدمی کے لیے کیا بشارت ہو سکتی ہے۔ ایمان لا کر خود اس کی اپنی جہت متعین ہو جاتی ہے اور اصلاح کے نتیجے میں وہ ایک صاف ستھرے اور اجلے کردار کا مالک بن جاتا ہے اور اس کے بعد یہ بات کہ نہ اسے مستقبل کا کوئی خوف ہو گا اور نہ ماضی کی محرومیاں کبھی اسے پریشان کریں گی۔ یہی تو دو باتیں ہیں 'جن کے حصول کے لیے دنیا سرگرداں ہے۔ دنیا بھر کے علم و ادب کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں اور عقل و دانش کا سارا سرمایہ اسی کے حصول میں صرف ہو رہا ہے لیکن ناکامیاں ہیں کہ وہ بار بار انسان کا مقدر بنتی جا رہی ہیں تو جو اللہ کے رسول یہ عظیم نعمت لے کر آئے ہیں اور اتنی بڑی خوشخبری سنانے کے لیے آئے ہیں 'اس کی طرف تو یہ سمجھتے ہوئے لپکنا چاہیے کہ یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

اخروی نجات کے لیے کیا چیز ضروری ہے

یہ یاد رہے رب کی رحمت کی خوشخبری دینا، عذاب سے ڈرانا حضور کی بھی صفت ہے۔ مگر آئندہ آنے والے نبی کی خوشخبری دینا انبیاء کرام کی صفت تھی، ہمارے حضور کی صفت نہیں۔ کیونکہ آپ آخری نبی ہیں۔ خیال رہے کہ جب بشارت نذارت کے ساتھ جمع ہو تو اس سے رحمت کی خوشخبری مراد ہوتی ہے۔ (تفسیر نور العرفان۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی)

اخروی نجات کے لیے ایمان اور نیک اعمال دونوں ضروری ہیں، ایمان لانے کے بعد خود کو نیک اعمال سے بے نیاز سمجھنے والے اور ایمان قبول کئے بغیر اچھے اعمال کو اپنی نجات کے لیے کافی سمجھنے والے دونوں احمقوں کی دنیا کے باسی ہیں البتہ ان دونوں صورتوں میں صاحب ایمان قطعاً بے ایمان سے بہتر ہے۔

امام غزالی (رح) فرماتے ہیں "جب بندہ ایمان لاتا ہے اور اس کے بعد اچھے اعمال کرتا اور برائیوں سے باز رہتا ہے نیز امید اور خوف کے درمیان اس طرح مُتَرَدِّد رہتا ہے کہ اسے عمل قبول نہ ہونے کا ڈر ہوتا ہے اور وہ اس بات سے ڈرتا ہے کہ وہ ہمیشہ نیک عمل نہ کر سکے اور اس کا خاتمہ اچھا نہ ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے اس بات کی امید بھی رکھتا ہے کہ وہ اسے مضبوط اور ثابت قول پر ثابت قدم رکھے گا، اس کے دین کو موت کی سختیوں سے بچائے گا حتّٰی کہ وہ توحید پر دنیا سے رخصت ہو جائے گا اور باقی کی زندگی اس کے دل کو خواہشات سے محفوظ رکھے گا تاکہ وہ گناہ کی طرف مائل نہ ہو تو ایسا آدمی عقلمند ہے لیکن اس کے علاوہ لوگ دھوکے میں ہیں اور عنقریب عذاب کو دیکھیں گے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون شخص سب سے زیادہ بھٹکا ہوا تھا اور کچھ وقت کے بعد اس کی خبر تم ضرور جان لوگے، اس وقت وہ کہیں گے

"رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ (۱۲)"

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہم نے دیکھا اور سنا تو ہمیں واپس بھیج دے تاکہ نیک کام کریں، بیشک ہم یقین کرنے والے ہیں۔

یعنی ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ جس طرح زمین میں بیج ڈالے اور ہل چلائے بغیر فصل پیدا نہیں ہوتی اسی طرح آخرت میں اجر و ثواب اچھے عمل کے بغیر نہیں ملتا، اے اللہ! عَزَّوَجَلَّ، تو ہمیں واپس بھیج دے، ہم اچھے عمل کریں گے، اب ہمیں تیری اس بات کی صداقت معلوم ہو گئی

وَ اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسٰنِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾ وَ اَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰى"

اور یہ کہ انسان کیلئے وہی ہو گا جس کی اس نے کوشش کی۔ اور یہ کہ اس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی۔

(لیکن اس وقت ان کی یہ باتیں انھیں کوئی فائدہ نہ دیں گی اور نہ ہی انھیں واپس بھیجا جائے گا)۔
(تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری)

آیت مبارکہ :

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ

49○

لغۃالقرآن : [وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ] [كَذَّبُوْا : جھٹلایا انہوں نے] [بِاٰيٰتِنَا : ہماری آیات] [يَمَسُّهُمُ : انہیں پہنچے گا] [الْعَذَابُ : عذاب] [بِمَا : بوجہ اس کے] [كَانُوْا : جو وہ تھے] [يَفْسُقُوْنَ : نافرمانی کرتے]

ترجمہ : اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا انھیں عذاب چھو کر رہے گا،اس وجہ سے کہ وہ نافرمانی کیا کرتے تھے

تشریح :

تمام رسولوں کاکام منکروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانا اور ایمان والوں کو جنت کی بشارت سنانا ہے، (یعنی ان کا یہ کام نہیں کہ کفار جو نشانیاں اور معجزات مانگتے جائیں وہ انھیں دکھاتے جائیں) رسولانِ گرامی اس لیے آتے ہیں کہ جو شخص ان پر ایمان لائے اور اچھے اعمال کرے ایسے لوگ دوستدارانِ خدا بن جاتے ہیں۔ انھیں دنیا میں اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہیں رہتا اور آخرت میں وہ غمزدہ نہ ہوں گے کیونکہ وہ جنت سے سرفراز کیے جائیں گے، کیونکہ جنت میں کوئی غم نہیں ہے اور جو لوگ انبیاء کو جھٹلائیں انھیں ان کی نافرمانی پر عذاب پہنچے گا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ (برہان القرآن القران۔علامہ قاری محمد طیب صاحب)

کفار کا طریقہ تھا کہ وہ سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے طرح طرح کے سوال کیا کرتے تھے۔ کبھی کہتے کہ آپ رسول ہیں، تو ہمیں بہت سی دولت اور مال دیجئے کہ ہم کبھی محتاج نہ ہوں، ہمارے لیے پہاڑوں کو سونا کر دیجئے، کبھی کہتے کہ ہمیں گزشتہ اور آئندہ کی خبریں سنائیے اور ہمیں ہمارے مستقبل کی خبر دیجئے، کیا کیا پیش آئے گا تاکہ ہم منافع حاصل کر لیں اور نقصانوں سے بچنے کیلئے سے انتظام کرلیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ قیامت کا دن بتایئے کب آئے گی۔
کبھی کہتے آپ کیسے رسول ہیں جو کھاتے پیتے بھی ہیں اور نکاح بھی کرتے ہیں۔

انکی ان تمام باتوں کا اگلی آیت میں جواب دیا گیا جس کا حاصل یہ ہے کہ اے منکرو! تمہارا یہ کلام بے محل اور جاہلانہ ہے، جو شخص کسی امر کا مدعی ہو اس سے وہی باتیں دریافت کی جا سکتی ہیں جو اس کے دعوی سے تعلق رکھتی ہوں۔ غیر متعلق باتوں کا دریافت کرنا اور اس کے دعویٰ کے خلاف حجت بنانا، انتہا درجہ کا جہل ہے۔ (تفسیر اشرفی۔ علامہ محمد مدنی اشرفی جیلانی)

دنیا میں ہر خطرے سے آگاہ کرنے والے اور ہر مصیبت سے بچانے والے کو 'اپنا سب سے بڑا محسن خیال کیا جاتا ہے۔ دنیا و آخرت کا سب سے بڑا خطرہ اللہ کی ناراضگی اور اس کے نتیجے میں اس کی طرف سے ملنے والا عذاب ہے۔ یہ رسول اسی سے خبردار کرنے اور بچانے کے لیے آتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ انسانیت کے سب سے بڑے محسن ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ دنیا ان سے وہی ایمان و ہدایت کا راستہ سیکھے 'جس سے وہ دنیا کی سعادتوں کی مستحق بنے اور اللہ کے عذاب سے بچ جائے۔ لیکن یہ مشرکین مکہ اور اسی طرح کی باقی کافر قومیں 'بجائے اس کے کہ اللہ کے رسول سے یہ سبق سیکھیں 'وہ بار بار کبھی اس سے عذاب کا مطالبہ کرتی ہیں 'حالانکہ وہ عذاب کے لیے دنیا میں نہیں آتے 'بلکہ عذاب سے بچانے کے لیے آتے ہیں اور کبھی قسم قسم کی نشانیاں ان سے مانگی جاتی ہیں۔ حالانکہ وہ زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے آتے ہیں اور انسانوں کے لیے انسانی زندگی کو آسان کرنے اور مشکلات سے بچنے کے طریقے سکھانے کے لیے آتے ہیں 'خوارق و عجائب کا ظہور اگرچہ رسولوں کے خصائص میں سے ہے۔ لیکن محض اتمام حجت کے لیے ہوتا ہے۔ لیکن لوگ ہمیشہ ان سے اسی طرح کی باتوں کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں لوگوں کے سامنے پیغمبروں کی اصل حیثیت کو بیان کرنا مقصود ہے 'وہیں شاید رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے ایک تسکین و تسلی کا پیغام بھی ہے کہ آپ کا چونکہ کام تبشیر و انذار ہے تو آپ ﷺ کی ساری توجہات اسی طرف رہنی چاہئیں۔ رہے مشرکین مکہ کے وہ مطالبات جن کا تعلق آپ ﷺ کے فرائض سے نہیں 'آپ ﷺ ان کو خدا پر چھوڑ دیئے 'ان کی وجہ سے کبھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

قوموں کے راہ ہدایت اختیار کرنے میں جو چیزیں موانع ثابت ہوئی ہیں اور جن کی وجہ سے لوگ پیغمبروں سے عجیب و غریب مطالبات کرتے رہے 'بلکہ ایمان لانے والی قومیں بھی اپنے دور زوال میں جن اسباب سے گمراہ ہوتی رہیں 'ان میں سب سے بڑا سبب اللہ کے نبیوں اور اس کے رسولوں کی اصل حیثیت کو نہ سمجھنا ہے۔ کافر دشمنی میں آکر مخالفتوں اور اذیتوں کی انتہا کر دیتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ اس پر انھیں عذاب سے ڈراتا ہے تو وہ نہایت ڈھٹائی کے ساتھ عذاب کا مطالبہ شروع کر دیتے ہیں۔ گزشتہ آیت میں اس حوالے سے پیغمبروں کی حیثیت کی وضاحت کی گئی ہے۔ لیکن غلط تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیلی کی بنیاد صرف یہی نہیں 'بلکہ اور بھی چند در چند غلط تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیلیوں کے اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ اس مخالفتوں اور اذیتوں کے طوفان اٹھنے سے پہلے بہت سارے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں 'جو پیغمبر کے بارے میں غلط تصورات رکھتے ہیں 'اس لیے پیغمبر پر ایمان نہیں لاتے کہ وہ انھیں اپنے تصورات کے مطابق دکھائی نہیں دیتا۔ انھوں نے اپنے تصورات میں یہ بات بٹھا رکھی ہوتی ہے کہ پیغمبر وہ انسانوں میں سے کوئی انسان نہیں ہوتا 'اس کی صفات غیر معمولی ہوتی ہیں 'اس کے ساتھ اللہ کے خزانے اترتے ہیں 'وہ کاہنوں سے بڑھ کر غیب کی اطلاعات دیتا ہے 'لیکن جب وہ پیغمبر میں اس طرح کی باتیں نہیں دیکھتے تو پھر وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یقیناً یہ پیغمبر نہیں۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں بھی مشرکین مکہ نے یہی طرز عمل اختیار کیا۔ قرآن کریم نے ان کی بات کو ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ط (الفرقان: ۷)
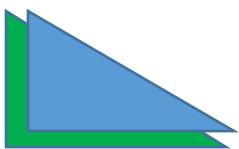
(وہ کہتے ہیں ' یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے ؟)
یہاں یہ بات یاد رہے کہ یہ تصور کافروں کا ہوتا ہے کہ وہ اپنے تئیں یہ سمجھتے کہ یہ رسول ہماری طرح کھانا کھاتا ہے 'کاروبار کے لیے بازار جاتا ہے ضروریات کے لیے بازار کا رخ کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تو ہماری طرح ایک آدمی ہے۔ حالانکہ آدمی کو پیغمبر یا پیغمبر کو آدمی نہیں ہونا چاہیے اور جب یہ دیکھتے کہ رسول اللہ بھی بعض دفعہ آنے والے حالات میں دشواریوں کا شکار ہوتے ہیں وہ حیران ہوتے کہ یہ کیسا پیغمبر ہے 'جو غیب کے حالات سے واقف نہیں۔ مختصر یہ کہ جس طرح سابقہ آیت میں پیغمبروں کی حیثیت کے حوالے سے ان کی بعض غلط تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیلیوں کو دور کیا گیا ہے 'اسی طرح آنے والی آیت کریمہ میں ایک دوسرے پہلو سے ان کے تصورات کی اصلاح فرمائی گئی ہے اور اس آیت میں اس طرح کھول کر بات کہی گئی ہے 'گویا اس حوالے سے حرف آخر کہہ دیا گیا ہے۔
(روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی تعلیقاً)

مسلمان کا تصور نبوت ورسالت

نبوّت ورسالت کسبی نہیں کہ آدمی عبادت وریاضت کے ذریعہ سے حاصل کرسکے، بلکہ محض عطائے الٰہی ہے، کہ جسے چاہتا ہے اپنے فضل سے دیتا ہے، ہاں ! دیتا اُسی کو ہے جسے اس منصبِ عظیم کے قابل بناتا ہے، جو قبلِ حصولِ نبوّت تمام اخلاق رذیلہ سے پاک، اور تمام اخلاق فاضلہ سے مزین ہو کر جملہ مدارج ولایت طے کر چکتا ہے اور اپنے نسب و جسم و قول و فعل و حرکات و سکنات میں ہر ایسی بات سے منزّہ ہوتا ہے جو باعثِ نفرت ہو، اُسے عقلِ کامل عطا کی جاتی ہے، جو اوروں کی عقل سے بدرجہا زائد ہے کسی حکیم اور کسی فلسفی کی عقل اُس کے لاکھویں حصّہ تک نہیں پہنچ سکتی
{اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ-}
[ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ-وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ (۲۱)]

اور جو اِسے کسبی مانے کہ آدمی اپنے کسب وریاضت سے منصبِ نبوّت تک پہنچ سکتا ہے، کافر ہے۔ جو شخص نبی سے نبوّت کا زوال جائز جانے کافر ہے۔ نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے اور یہ عصمت نبی اور مَلَک کا خاصہ ہے، کہ نبی اور فرشتہ کے سوا کوئی معصوم نہیں اماموں کو انبیا کی طرح معصوم سمجھنا گمراہی وبددینی ہے۔ عصمتِ انبیا کے یہ معنی ہیں کہ اُن کے لیے حفظِ الٰہی کا وعدہ ہو لیا، جس کے سبب اُن سے صدورِ گناہ شرعاً محال ہے، بخلاف ائمہ و اکابر اولیا، کہ اللہ عَزَّوَجَلَ اُنھیں محفوظ رکھتا ہے، اُن سے گناہ ہوتا نہیں ، مگر ہو تو شرعاً محال بھی نہیں۔

انبیا عَلَیْہِمُ السَّلَام شرک و کفر اور ہر ایسے امر سے جو خلق کے لیے باعثِ نفرت ہو، جیسے کذب و خیانت و جہل وغیرہا صفاتِ ذمیمہ سے، نیز ایسے افعال سے جو وجاہت اور مُروّت کے خلاف ہیں قبلِ نبوت اور بعدِ نبوت بالاجماع معصوم ہیں اور کبائر سے بھی مطلقاً معصوم ہیں اور حق یہ ہے کہ تعمّدِ صغائر سے بھی قبلِ نبوّت اور بعدِ نبوّت معصوم ہیں۔

اللہ تَعَالٰی نے انبیا عَلَیْہِمُ السَّلَام پر بندوں کے لیے جتنے احکام نازل فرمائے اُنھوں نے وہ سب پہنچا دیے، جو یہ کہے کہ کسی حکم کو کسی نبی نے چھپا رکھا، تقیہ یعنی خوف کی وجہ سے یا اور کسی وجہ سے نہ پہنچایا، کافر ہے۔
(المعتقد المنتقد"، ص۱۱۰) :فمنه العصمة :وهي من خصائص النبوة على مذهب أهل الحق، فتاوىٰ رضویہ)

آیت مبارکہ :

قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآىٕنُ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَ لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌۚ-اِنْ اَتَّبِـعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّؕ-قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَ الْبَصِیْرُؕ-اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ۠ 50

لغۃ القرآن: [قُلْ : کہہ دیجیے] [لَّآ : نہیں] [اَقُوْلُ : میں کہتا] [لَكُمْ : تم کو] [عِنْدِيْ : میرے پاس] [خَزَآىٕنُ : خزانے] [اللّٰهِ : اللہ] [وَلَآ : اور نہیں] [اَعْلَمُ : میں جانتا] [الْغَيْبَ : غیب] [وَلَآ : اور نہیں] [اَقُوْلُ : میں کہتا] [لَكُمْ : تم کو] [اِنِّىْ : بیشک میں] [مَلَكٌ : فرشتہ] [اِنْ اَتَّبِعُ : نہیں میں پیروی کرتا] [اِلَّا : مگر] [مَا : جو] [يُوْحٰٓى: وحی کی گئی] [اِلَيَّ : میری طرف] [قُلْ : فرما دیجیے] [هَلْ : کیا] [يَسْتَوِي : برابر ہیں] [الْاَعْمٰى: اندھا] [وَالْبَصِيْرُ : اور دیکھنے والا] [اَفَلَا : کیا نہیں] [تَتَفَكَّرُوْنَ : تم غور و فکر کرتے]

ترجمہ : آپ (ان کافروں سے) فرما دیجئے کہ میں تم سے (یہ) نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں از خود غیب جانتا ہوں اور نہ میں تم سے (یہ) کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو صرف اسی (حکم) کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ فرما دیجئے: کیا اندھا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں؟ سو کیا تم غور نہیں کرتے۔

تشریح:

کفار مکہ کے نزدیک زندگی فقط یہی دنیوی زندگی تھی۔ ان کی ساری کدوکاوش اور دوڑ دھوپ کا مدعا دولت، عزت اور وقار کا حصول تھا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں اپنے دن گزارتے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت مند کیسے بن جائیں۔ ان کی راتیں اسی پیچ و تاب کی نذر ہوتیں کہ وہ کس طرح اپنے حریف کی عزت کو خاک میں ملا کر اپنے جاہ و جلال کا پرچم لہرائیں۔ علاوہ ازیں شرف انسانی کا کوئی تصور ان کے ذہن میں موجود نہ تھا۔ وہ خود اور ان کے ارد گرد بسنے والے انسان جن سے ان کو عمر بھر کا واسطہ پڑا تھا کسی طرح بھی وحشی درندوں سے بہتر نہ تھے۔ بھلا وہ انسان جس کے ہاتھ غریبوں اور مسکینوں کو لوٹتے وقت نہ لرزیں اپنے قریبی رشتہ داروں کو قتل کرتے وقت نہ کانپیں۔ جن کے کان زندہ درگور ہونے والی بچیوں کی جگر دوز آہ و فغاں سن رہے ہوں اور ان کے دل ٹس سے مس نہ ہوں۔ رہزنی اور غارت گری جن کا پیشہ ہو اور جوا بازی اور شراب خوری جن کی تفریح طبع کا سامان ہو۔ بدکاری اور بدمعاشی جن کا روز کا مشغلہ ہو وہ کوئی شریف چیز نہیں ہو سکتا۔ انسان کے متعلق ایسا تصور قائم کرنے میں وہ معذور بھی تھے۔ کیونکہ انسان نام کا جو جانور انھیں ادھر ادھر دکھائی دے رہا تھا وہ انھیں لغویات اور خرافات کا مجسمہ تھا۔ اس لیے ان کو یہ بات سمجھانا آسان نہ تھا کہ انسان بھی منصب رسالت پر فائز ہو سکتا ہے۔ یہ ان کی ذہنیت تھی۔ اور اس سے بلند تر فضا میں پرواز کرنے کی ان کے مرغ فکر میں ہمت ہی نہ تھی۔

جب رحمت عالمیان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف فرما ہوئے اور دعوت اسلام کا آغاز کیا تو یہ لوگ نادان بچوں کی طرح اپنے ایمان لانے کے لیے ایسی شرطیں لگانے لگے جس سے ان کی مالی حالت بہتر ہو جائے۔ کہا کرتے، یہ ہمارے تپتے ہوئے صحرا گلشن و گزار بنا دیجئے۔ ان میں ندیاں بہنے لگیں اور چشمے ابلنے لگیں اور سرسبز و شاداب کھیت لہلہانے لگیں تو ہم جانیں کہ آپ سچے نبی ہیں اور آپ پر ایمان لانے سے ہمیں فائدہ ہوا اور اگر ہماری معاشی بدحالی جوں کی توں ہی رہے تو پھر آپ کو نبی ماننے سے ہمیں کیا فائدہ؟ اور اگر یہ نہیں کرتے تو اتنا ضرور کیجئے کہ ہمیں بتا دیا کرو کہ اس سال فلاں جنس کا بھاؤ چڑھ جائے گا تاکہ ہم اس کو ذخیرہ کر لیا کریں اور جب نرخ تیز ہو جائے تو اس کو بیچ کر نفع کمائیں۔ یا ہماری چوری ہو جائے تو چور کا سراغ بتائیں۔ لیکن یہ چیزیں بھی آپ نہیں کرتے تو پھر ہم خواہ مخواہ اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر کیوں اپنے آپ کو بدنام اور بے آرام کریں۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

جب وہ دیکھتے کہ یہ کھاتے پیتے بھی ہیں۔ کاروبار بھی کرتے ہیں۔ بال بچے دار بھی ہیں۔ تو وہ کہتے کہ یہ انسان ہیں۔ اور انسان (جس قسم کے انسان سے وہ واقف تھے) نبی کیسے ہو سکتا ہے۔ کفار کی اس بگڑی ہوئی اور پست ذہنیت کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبان پاک سے یہ اعلان کرایا کہ میں اس بات کا مدعی بن کر نہیں آیا کہ میں تمہارے ان ریتلے ٹیلوں کو ہموار کر کے رشک ارم بنا دوں گا۔ خشک زمینوں میں دریا بہا دوں گا۔ اور ہر چٹان سے چشمے ابلنے لگیں گے۔ میں تمہاری مادی خواہشات کی تکمیل کے لیے نہیں بھیجا گیا۔ میں تو تمہیں اللہ سے ملانے آیا ہوں۔ تمہارے ویران دلوں کو بسانے آیا ہوں۔ میں تو تمہارے گلستان حیات میں نیکی، تقویٰ، پاکیزگی اور خوش اخلاقی کے سدا بہار پھول کھلانے آیا ہوں۔ مجھے اس لیے تو مبعوث نہیں کیا گیا کہ میں تمہیں چنے اور جو، کھجور اور انگور کے بھاؤ بتاؤں بلکہ مجھے تو اعمال حسنہ کی جنس سے تمہیں آشنا کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ جن کی قدر و قیمت بازار محشر میں اتنی زیادہ ہو گی جس کا تم اب تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ افکار کی لطافت، ارادوں کی پختگی اور حوصلوں کی بلندی، یہ اعمال کا حسن، کردار کی رعنائی اور اخلاق کی پاکیزگی، یہ علمی کمالات اور دوسرے معجزات جن کا تم مجھ میں مشاہدہ کر رہے ہو ان سب کے باوجود میں انسان ہوں فرشتہ نہیں۔ فرشتہ تو انسان کامل کی گرد راہ کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ تمہارے ذہنوں میں انسان کا جو گھٹیا تصور ہے وہ انسان کامل کا نہیں بلکہ بھٹکے ہوئے انسان کا تصور ہے جو نفس اور شیطان کے دام فریب میں گرفتار ہو کر اور مدت

درازتک اس کا گرفتار ہو کر اور مدت درازتک اس کا گرفتار رہ کر اپنی مسند شرف وعزت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس لیے تم انسان کو اتنا حقیر نہ جانو۔ اپنی قدر پہچانو۔ اور اپنے شرف خداداد کا احترام کرتے ہوئے شیطان کے جال سے رستگاری حاصل کرنے کے لیے کوشش کرو۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زندگی کا ہر دور اور قرآن مجید کی ہر آیت ایک مستقل معجزہ ہے۔ نیز کفار مکہ کے مطالبہ پر چاند کو دو ٹکڑے بھی کیا گیا لیکن اس کے باوجود متعصب اور ضدی کفار اپنے کفر پر جمے رہے اور نئے معجزات کا مطالبہ کرتے رہے، مثلاً ان کے دو مطالبات یہ تھے کہ اگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) واقعی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو تمام دنیا کے خزانے ہمارے جمع کر دیں اور مستقبل میں پیش آنے والے تمام مفید اور نقصان دہ حالات سے ہمیں قبل از وقت آگاہ کر دیں تاکہ ہم ان کے مطابق تیاری کر لیں۔

اس آیت میں ان مطالبات کا جواب دیا گیا ہے۔ یعنی تم جو مجھ سے خزائن دنیا اور مستقبل کے حالات بتانے کا مطالبہ کرتے ہو یہ ٹھیک نہیں کیونکہ میرا یہ دعویٰ ہی نہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کے تمام خزانوں کا مالک ہوں اور از خود غیب جانتا ہوں۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ سارے خزانوں کا حقیقی مالک اور ہر غیب کا اصل علم تو اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے اور جو خزانے اور غیب اس نے مجھے عطا کئے ہیں ان کی تقسیم اور تعلیم بھی اللہ تعالیٰ کی وحی کے مطابق کرتا ہوں۔

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کئی معجزات دکھائے، غیب کی خبریں بھی بتائیں، چاند کو دو ٹکڑے کیا، درختوں اور پتھروں نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت ورسالت کی گواہی دی۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو کفار کے مذکورہ مطالبات بھی پورے ہو سکتے تھے مگر ان کا جوابی نفی میں دلانے سے مراد یہ ہے کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کے سامنے تواضع اور خضوع کا اظہار کریں تاکہ لوگ آپ کے متعلق وہ اعتقاد نہ کر لیں جو حضرت عیسیٰ کے متعلق کیا گیا تا۔

(تفسیر کبیر۔ امام رازی)

اس آیت سے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے علم غیب کی نفی پر استدلال کرنا درست نہیں ہے کیونکہ ذاتی اور غیر محدود علم غیب تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کا خاصہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ جس نبی کو چاہتا ہے علم غیب عطا فرماتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ غیب کا جاننے والا ہے اور اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں فرماتا سوائے رسول کے جس کو وہ پسند کر لے۔" (قرآن: 26-72:27) نیز نبی کا معنی ہی غیب اور مستقبل کی خبریں دینے والا ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا: "میں تمہیں بتاتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور جو تم اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو۔" (قرآن: 3:49)

اسی طرح اس آیت سے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مالک ومختار ہونے کی نفی کرنا بھی درست نہیں ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ کی طرح لامتناہی خزانوں کا حقیقی مالک تو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا لیکن اگر میرے جیسے گناہ گار بندے کو اللہ تعالیٰ نے چند غریب لوگوں کی مدد کرنے کا خزانہ اور اختیار دے رکھا ہے تو اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کتنا اختیار دیا ہو گا ہمارے حساب وکتاب کے پیمانے اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ وہ اختیار اللہ تعالیٰ کی نسبت سے اگرچہ محدود ہے لیکن ہماری نسبت سے لامحدود ہے، جیسا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کی قسم! بیشک میں اپنے حوض کو اب دیکھتا ہوں اور بیشک زمین کے خزانوں کی چابیاں مجھے عطا کی گئی ہیں۔" (بخاری: کتاب الجنائز: باب 73) جو ہستی اس دنیا میں رہتے ہوئے حوض کوثر کو دیکھ لے اور جس کو اللہ تعالیٰ زمین کے خزانوں کی چابیاں عطا

کردے اس کے علم غیب اور خزانوں کا صحیح اندازہ انسان نہیں کر سکتا یہ تو اللہ تعالیٰ اور اس کا پیارا نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں کتنا علم غیب اور کتنے خزانے عطا فرمائے ہیں۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ایک اور ارشاد ملاحظہ ہو: "بیشک میں تقسیم کرنے والا اور خازن ہوں اور اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے۔"

(بخاری: الخمس: باب 7) (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

کفار کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ رسول فرشتہ ہونا چاہیے، یہ کیسا رسول ہے؟ ہماری طرح کھانا کھاتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اگر یہ فرشتہ ہوتا تو ہم اس کو نبی مان لیتے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: نبی انسان ہوتے ہیں اور میں بھی ایک انسان ہوں اس آیت سے یہ وہم نہ ہو کہ فرشتہ نبی سے افضل ہوتا ہے۔ فرشتہ اگرچہ دکھائی نہیں دیتا، کھانے پینے سے پاک ہے۔ جو شکل چاہے اختیار کر سکتا ہے اور سفر کے لیے سواری کا محتاج نہیں مگر پھر بھی نبی سے افضل نہیں بلکہ فرشتے تو حضرت آدم کے علم کے سامنے لاجواب ہو گئے اور انھیں حضرت آدم کی تعظیم کے لیے سجدہ ریز ہونا پڑا تھا۔ اسی طرح شیر، گھوڑا، سانپ اور پرندے ایسے کام کر لیتے ہیں جو انسان نہیں کر سکتا لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جانور انسانوں سے افضل ہیں۔ بہر حال یہ حقیقت شکوک و شبہات سے بالاتر ہے کہ انسان ہی اشرف المخلوقات ہے اور وہ تمام جانوروں پر حکومت کر رہا ہے۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

اس آیت میں ایک اور نہایت اہم اور بنیادی چیز کی طرف بھی رہنمائی کی گئی ہے کہ اسلام کی اشاعت کا انحصار لالچ اور شعبدہ بازی پر نہیں بلکہ معرفت حق اور قبول حق پر ہے۔ یعنی کوئی اس لالچ میں ایمان نہ لائے کہ اسے فلاں جاگیر مل جائے گی۔ زمین میں چھپا ہوا کوئی خزانہ اس کے ہاتھ لگ جائے گا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں فقط وہی ایمان مقبول ہوگا جو حق کو حق سمجھ کر صرف اس لیے کہ وہ حق ہے قبول کیا جائے۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

بعض پریشان خیال لوگ اس آیت کریمہ میں غور کیے بغیر اس وہم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ حضور فخر موجودات علیہ افضل التحیات والتسلیمات علم میں، اختیار میں، بشری کمزوریوں میں عام انسانوں کی طرح ہیں۔ کاش! وہ اس آیت کے ان مختصر الفاظ میں بھی تدبر کرتے۔ قدرت نے پہلے ہی ان کا ازالہ فرما دیا ہے اور بتا دیا کہ تم میں اور میرے محبوب میں اتنا فرق ہے جتنا اندھے اور بینا میں ہوتا ہے۔ اب خود سمجھ لو کہ جس کی آنکھیں اللہ تعالیٰ کے نور سے روشن ہوں اور جو تہ در تہ اندھیروں میں بھٹک رہا ہو کیا برابر ہو سکتے ہیں۔ جس کی چشم مازاغ مقام دنی پر محو مشاہدہ ہو۔ کیا اس کی ہمسری وہ لوگ کر سکتے ہیں جو دوری کے حجابوں کے پیچھے سر پٹخ رہے ہوں۔ افلا تتفکرون کے الفاظ سے یہ بتایا کہ اس آیت میں جتنا کوئی زیادہ غور و فکر کرے گا اتنی ہی اس کو سمجھ دی جائے گی اور جو غور و تامل نہیں کرے گا وہ محروم رہے گا۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

اس آیت کے تین جملے دراصل مشرکین کے تین سوالوں کے جواب ہیں

(۱) مشرکین یہ کہتے تھے کہ اگر آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں تو آپ اللہ سے ہمارے لیے دنیا کے منافع اور اچھائیاں طلب کریں اور یہ کہ اللہ ہمارے لیے سعادتوں کے دروازے کھول دے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا آپ ان سے کہئے کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے 'ملک عطا کرتا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے' اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ خیر اسی کے ہاتھ میں ہے' میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ (خزانہ کا معنی ہے ایسی حفاظت کی جگہ جہاں لوگوں کے ہاتھ نہ پہنچ سکیں)

(۲) مشرکین یہ کہتے تھے کہ اگر آپ در حقیقت رسول ہیں تو آپ ہمیں یہ بتائیں کہ مستقبل میں کیا فائدے ہوں گے اور کیا نقصانات ہوں گے ؟ تاکہ ہم فوائد حاصل کرنے کی تیاری کریں اور نقصانات سے محفوظ رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا آپ ان سے کہئے کہ میں (از خود) غیب کو نہیں جانتا تو تم مجھ سے ان امور کا کیسے مطالبہ کرتے ہو ؟

(۳) مشرکین یہ کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا ہے اور شادی کرتا ہے اور لوگوں کے ساتھ رہتا ہے ؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا آپ ان سے کہئے کہ میں فرشتوں میں سے نہیں ہوں۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے قدرت اور علم غیب کی نفی کا محمل

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ان تین امور کی نفی کرائی۔ اس نفی کرانے میں کیا حکمت ہے ؟ اس کے متعلق حسب ذیل اقوال ہیں :

(الف) اس سے مراد یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی طرف سے اللہ کے سامنے تواضع اور خضوع کا اظہار کریں ' تاکہ لوگ آپ کے متعلق وہ اعتقاد نہ کرلیں جو حضرت مسیح (علیہ السلام) کے متعلق کیا گیا تھا۔

(ب) کفار مکہ آپ سے بہت زبردست معجزوں کے اظہار کا مطالبہ کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے ہم آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے حتی کہ آپ ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ جاری کردیں یا آپ کے لیے کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو ' پھر آپ اس کے درمیان سے کوئی دریا جاری کردیں یا جیسا کہ آپ کہتے ہیں آپ آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہمارے اوپر گرادیں یا آپ اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے بے حجاب لے آئیں یا آپ کا سونے کا گھر ہو یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور ہم آپ کے چڑھنے پر بھی ایمان نہیں لائیں گے ' حتی کہ آپ ہم پر ایک کتاب نازل کریں جسے ہم پڑھیں۔ آپ کہئے میرا رب سبحان ہے۔ میں تو صرف بشر رسول ہوں (بنی اسرائیل : ۹۳۔ ۹۰) یعنی صرف رسالت اور نبوت کا دعوی دار ہوں اور جن امور کو تم طلب کر رہے ہو ' ان کو اللہ کی قدرت کے بغیر حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ سو اس کلام سے مقصود یہ ہے کہ جن معجزات کا تم مطالبہ کر رہے ہو ان کو حاصل کرنے کے لیے میرے پاس مستقل قدرت نہیں ہے۔

(ج) میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ میں یہ دعوی نہیں کرتا کہ میرے پاس ایسی قدرت ہے جو اللہ تعالیٰ کے شایان شان ہے اور نہ میں غیب جانتا ہوں اس کا معنی یہ ہے کہ میں یہ دعوی نہیں کرتا کہ میں اللہ کے علم سے متصف ہوں اور ان دونوں جملوں کا حاصل یہ ہے کہ میں الوہیت کا مدعی نہیں ہوں (تفسیر کبیر ' ج ۴ ' ص ۴۸۔ ۴۷ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت ' ۱۳۹۸ ھ ' طبع قدیم)

قاضی بیضاوی متوفی ۶۸۵ ھ لکھتے ہیں

میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے مقدورات اور اس کے خزانے ہیں۔ اور میں غیب نہیں جانتا اس سے مراد یہ ہے کہ جس غیب کی میری طرف وحی نہ کی جائے ' یا جس غیب پر دلیل (عقلی یا سمعی) قائم نہ ہو ' اس کو میں نہیں جانتا ' یا میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میں فرشتوں کی جنس سے ہوں یا جن کاموں پر فرشتے قادر ہیں ان پر میں قادر

ہوں۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خدا ہونے اور فرشتہ ہونے کے دعوی سے برات کا اظہار کیا اور نبوت کا دعوی کیا جو بشر کے کمالات سے ہے۔ (انوار التنزیل مع الکازرنی ' ج ۲ 'ص ۴۱۱۔ ۴۱۰ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت ' ۱۴۱۶ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

مولانا شیخ الاسلام کا مختار یہ ہے کہ معنی یہ ہے کہ میں یہ دعوی نہیں کرتا کہ میں اللہ عزوجل کے افعال سے متعلق علم غیب کو جانتا ہوں 'حتی کہ تم مجھ سے یہ سوال کرو کہ قیامت کس وقت واقع ہوگی یا عذاب کس وقت نازل ہوگا؟ اور حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا ہے کہ یہ غیب کفار کے انجام کے ساتھ مخصوص ہے 'یعنی میں اس کا دعوی نہیں کرتا اور نہ میں فرشتہ ہونے کا دعوی کرتا ہوں حتی کہ تم مجھے خلاف عادت افعال کا مکلّف کرو 'مثلاً آسمان پر چڑھنے کا 'اس سے یہ وہم نہ ہو کہ فرشتہ نبی سے افضل ہوتا ہے کیونکہ شیر 'بھیڑیا 'سانپ اور پرندے ایسے کام کر لیتے ہیں جو انسان نہیں کر سکتا 'لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ انسان سے افضل ہوں۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی المعانی ج ۷ ص ۱۵۶۔ ۱۵۵ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی 'بیروت)

علماء دیوبند کے نزدیک علم غیب کی نفی کا محمل

اس آیت کو علماء دیوبند نے بھی اس پر محمول کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے مطلّقا علم غیب کی نفی نہیں کی گئی 'بلکہ مستقل اور بالذات علم کی نفی کی گئی ہے یا آپ سے تمام معلومات الٰہیہ کی نفی کی گئی ہے۔:

شیخ اشرف علی تھانوی متوفی ۱۳۶۲ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں

اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں تمام غیبوں کو (جو کہ معلومات الٰہیہ ہیں) جانتا ہوں (جیسا کہ کبھی کبھی بطور عناد اس قسم کی باتیں پوچھتے ہو کہ قیامت کب آئے گی؟) (بیان القرآن 'ج ا 'ص ۲۷۸ 'مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ 'کراچی)

شیخ شبیر احمد عثمانی متوفی ۱۳۶۹ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یعنی کوئی شخص جو مدعی نبوت ہو اس کا یہ دعوی نہیں ہوتا کہ تمام مقدورات الٰہیہ کے خزانہ اور اس کے قبضہ میں ہیں کہ جب اس سے کسی امر کی فرمائش کی جائے 'وہ ضرور ہی کر دکھلائے یا تمام معلومات غیبیہ وشہادیہ پر خواہ ان کا تعلق فرائض رسالت سے ہو یا نہ ہو 'اس کو مطلع کر دیا گیا ہے کہ جو کچھ تم پوچھو وہ فورا بتلا دیا کرے۔ (تفسیر عثمانی بر ترجمہ محمود الحسن 'ص ۱۷۷)

مفتی محمد شفیع دیوبندی متوفی ۱۳۹۶ھ اس آیت کے تحت خلاصہ تفسیر میں لکھتے ہیں:

اور نہ میں تمام غیب کی چیزوں کو جانتا ہوں (جو اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے) (معارف القرآن ج ۳ ص ۳۲۴ 'مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی ' ۱۴۱۳ھ)
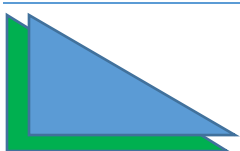
نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے علم غیب کا ثبوت

مفسرین کرام نے اس آیت میں علم غیب کی نفی کو مطلقاً علم غیب کی نفی پر محمول نہیں کیا 'بلکہ اس علم غیب کی نفی پر محمول کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی دیگر آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خصوصا اور دیگر (علیہم السلام) کو عموماً علم غیب عطا فرمایا ہے۔ان میں سے بعض آیات حسب ذیل ہیں :

(آیت) "ذلك من انبياء الغيب نوحيه اليك"۔ (آل عمران : ۴۴)

ترجمہ : یہ غیب کی بعض خبریں ہیں جس غیب کی ہم آپ کی طرف وحی فرماتے ہیں۔

انبیاء (علیہم السلام) کے علم کا ایک ذریعہ وحی ہے 'سوجب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف غیب کی وحی کی گئ تو آپ کو غیب کا علم ہو گیا۔ چونکہ شرح عقائد میں لکھا ہوا ہے کہ علم کے تین اسباب ہیں۔ حواس سلیمہ 'خبر صادق اور عقل (شرح عقائد 'ص ۱۰) اور جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو غیب کی خبریں دی گئیں تو آپ کو غیب کا علم حاصل ہو گیا۔قرآن مجید میں ہے :

(آیت) "تلك من انبياء الغيب نوحيها اليك"۔ (ھود : ۴۹)

ترجمہ : یہ غیب کی بعض خبریں ہیں جن خبروں کی ہم آپ کی طرف وحی فرماتے ہیں۔

عمومی طور پر انبیاء (علیہم السلام) کو غیب پر مطلع کرنے کا ذکر ان آیات میں ہے :

(آیت) "وما كان الله ليطلعكم على الغيب ولكن الله يجتبى من رسله من يشاء"۔ (ال عمران : ۱۷۹)

ترجمہ : اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ تمہیں غیب پر مطلع کرے ہاں (غیب پر مطلع کرنے کے لیے) وہ چن لیتا ہے جسے چاہے اور وہ اللہ کے رسول ہیں۔

(آیت) "علم الغيب فلا يظهر على غيبه احدا، الا من ارتضى من رسول"۔ (الجن : ۲۶۔ ۲۵)

ترجمہ : (اللہ) غیب کا جاننے والا ہے 'وہ اپنے غیب کا کسی پر اظہار نہیں فرماتا 'سوان کے جن کو اس نے پسند فرمالیا 'جو اس کے رسول ہیں۔

بعض علماء کی یہ تحقیق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء (علیہم السلام) کی طرف صراحتا علم غیب کی نسبت نہیں کی 'بلکہ اظہار غیب اور اطلاع علی الغیب کی نسبت کی ہے۔اس لیے یوں کہنا چاہیے کہ انبیاء (علیہم السلام) پر غیب ظاہر کیا گیا ' یا ان کو غیب پر مطلع کیا گیا اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے غیر سے علم غیب کی بلا استثناء نفی فرمائی ہے 'اس لیے یوں نہیں کہنا چاہیے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو علم غیب ہے 'بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو علم غیب دیا گیا 'یعنی عبارت میں کوئی ایسا قرینہ ہو جس سے معلوم ہو کہ اس علم سے مراد عطائی ہے 'ذاتی ہیں ہے۔

امام احمد رضا قادری متوفی ۱۳۴۰ھ لکھتے ہیں :

علم جب کہ مطلق بولا جائے خصوصاجب کہ طرف مضاف ہو تو اس سے مراد علم ذاتی ہوتا ہے۔اس کی تصریح حاشیہ کشاف پر میر سید شریف رحمۃ اللہ عنہ نے کردی ہے اور یہ یقینا حق ہے۔ کوئی شخص کسی مخلوق کے لیے ایک ذرہ کا بھی علم ذاتی مانے یقینا کافر ہے۔ (الملفوظ ' ج ۳ 'ص ۴۷ 'مطبوعہ نوری کتب خانہ لاہور)

امام احمد رضا قادری کی اس عبارت سے مذکور الصدر تحقیق کی تائید ہوتی ہے۔

مفتی محمد شفیع دیوبندی متوفی ۱۳۹۶ھ لکھتے ہیں :

اس معاملہ میں کسی مسلمان کو کلام نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو غیب کی ہزاروں لاکھوں چیزوں کا علم عطا فرمایا تھا 'بلکہ تمام فرشتوں اور اولین وآخرین کو جتنا علم دیا گیا ہے 'ان سب سے زیادہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو علم عطا فرمایا گیا ہے۔ یہی پوری امت کا عقیدہ ہے۔ہاں اس کے ساتھ ہی قرآن وسنت کی بیشمار تصریحات کے مطابق تمام ائمہ سلف وخلف کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ تمام کائنات کا علم محیط صرف اللہ تعالیٰ شانہ کی مخصوص صفت ہے۔ جس طرح اس کے خالق ورزاق قادر مطلق ہونے میں کوئی فرشتہ یا رسول اس کے برابر نہیں ہوسکتا 'اسی طرح اس کے علم محیط میں بھی کوئی اس کے برابر نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی فرشتہ یا پیغمبر کو لاکھوں چیزیں معلوم ہونے کے باوجود عالم الغیب نہیں کہا جاسکتا۔ (معارف القرآن ج ۳ ص ۳۲۸ 'مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی ۱۴۱۳ھ)

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر عالم الغیب کے اطلاق کا عدم جواز

ہمارے نزدیک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے علم غیب ثابت ہے۔اس کے باوجود ہمارے نزدیک آپ پر عالم الغیب کا اطلاق جائز نہیں ہے 'کیونکہ عالم الغیب کا لفظ عرف اور شرع میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہوچکا ہے۔اس کی نظیر یہ ہے کہ محمد عزوجل کہنا جائز نہیں ہے 'حالانکہ عزیز وجلیل ہیں۔اسی طرح محمد تبارک وتعالیٰ کہنا جائز نہیں ہے 'حالانکہ آپ بابرکت اور بلند ہیں 'کیونکہ عرف اور شرع میں عزوجل اور تبارک وتعالیٰ کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں۔

امام احمد رضا متوفی ۱۳۴۰ھ لکھتے ہیں :

مخلوق کو عالم الغیب کہنا مکروہ اور یوں کوئی حرج نہیں کہ اللہ کے بتائے سے امور غیب پر انھیں اطلاع ہے۔ (الامن والعلی 'ص ۲۰۳ 'مطبوعہ نوری کتب خانہ لاہور)

مولانا سردار احمد متوفی ۱۳۸۲ھ لکھتے ہیں :

لفظ عالم الغیب کا اطلاق ہم بھی عرفا غیر خدا عزوجل پر نہیں کرتے۔ (مناظرہ بریلی 'ص ۱۰۶ 'مطبوعہ المکتبۃ الحامدیہ 'لاہور)

ہم نے اپنی کتاب مقام ولایت ونبوت میں علماء اہل سنت اور خصوصا علماء دیوبند کی بکثرت عبارات پیش کی ہیں۔ جن میں مخلوق کی طرف علم غیب کی نسبت کی گئی ہے۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے علم غیب کے متعلق اہل سنت کا مسلک

امام احمد رضا قادری متوفی ۱۳۴۰ھ لکھتے ہیں :

(۱) بلاشبہ غیر خدا کے لیے ایک ذرہ کا علم ذاتی نہیں 'اس قدر تو ضروریات دین سے ہے اور منکر کافر۔

(۲) بلاشبہ غیر خدا کا علم معلومات الٰہیہ کو حاوی نہیں ہو سکتا۔ مساوی تو درکنار تمام اولین وآخرین وانبیاء ومرسلین وملائکہ مقربین سب کے علوم مل کر علوم الٰہیہ سے وہ نسبت نہیں رکھ سکتے جو کروڑہا کروڑ سمندروں سے ایک ذرہ سی بوند کے کروڑویں حصہ کو کہ وہ تمام سمندر اور یہ بوند کا کروڑواں حصہ 'دونوں متناہی ہیں 'اور متناہی کو متناہی سے نسبت ضرور ہے۔ بخلاف علوم الٰہیہ کے غیر متناہی در غیر متناہی در غیر متناہی ہیں اور مخلوق کے علوم اگرچہ عرش وفرش 'وشرق وغرب وجملہ کائنات از روز اول تا روز آخر کو محیط ہو جائیں یہ آخر متناہی ہیں کہ عرش وفرش دو حدیں ہیں 'شرق وغرب دو حدیں ہیں 'روز اول وروز آخر دو حدیں ہیں اور جو کچھ دو حدوں کے اندر ہے 'سب متناہی ہے بالفعل غیر متناہی کا علم تفصیلی مخلوق کو مل ہی نہیں سکتا 'تو جملہ علوم خلق کو علم الٰہی سے اصلا نسبت ہوتی ہی محال قطعی ہے 'نہ کہ معاذ اللہ توہم مساوات۔

(۳) یونہی اس پر اجماع ہے کہ اللہ عزوجل کے دیئے سے انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو کثیر وافر غیبوں کا علم ہے۔ یہ بھی ضروریات دین سے ہے 'جو اس کا منکر ہو کافر ہے کہ سرے سے نبوت ہی کا منکر ہے۔

(۴) اس پر بھی اجماع ہے کہ اس فضل جلیل میں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حصہ تمام انبیاء 'تمام جہاں سے اتم واعظم ہے۔ اللہ عزوجل کی عطا سے حبیب اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اتنے غیبوں کا علم ہے جن کا شمار اللہ عزوجل ہی جانتا ہے 'مسلمانوں کا یہاں ایک اجماع تھا۔ (خالص الاعتقاد 'ص ۳۹۔ ۳۸ 'مطبوعہ مطبع اہل سنت 'بریلی '۱۳۲۸ھ)

کیا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اتباع وحی کرنا آپ کے اجتہاد کے منافی ہے؟

اس آیت کے آخر میں ہے (آپ کہئے کہ) میں صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جس کی میری طرف وحی کی جاتی ہے 'آپ کہئے : کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہیں کیا تم غور نہیں کرتے۔ (الانعام : ۵۰)

امام فخر الدین عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں :

اس آیت میں یہ تصریح ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی طرف سے کوئی حکم نہیں دیتے تھے اور آپ اجتہاد نہیں کرتے تھے بلکہ آپ کے تمام احکام وحی سے صادر ہوتے تھے۔ اس کی تائید قرآن مجید کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے :

(آیت) "وماینطق عن الھوی۔ ان ھوالا وحی یوحی "۔ (النجم : ۴۔ ۳)

ترجمہ : اور وہ اپنی خواہش سے کلام نہیں کرتے 'ان کا کلام کرنا صرف وہ وحی ہے جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔

اور جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اجتہاد نہیں کرتے تو امت کے لیے بھی اجتہاد جائز نہیں ہے 'کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی اتباع کرنے کا حکم دیا ہے 'بلکہ ان پر لازم ہے کہ صرف وحی الٰہی کی اتباع کریں 'پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی تاکید فرمائی 'کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہیں ؟ کیونکہ بغیر وحی کے عمل کرنا اندھے کے عمل کے قائم مقام ہے اور وحی کے مطابق عمل کرنا دیکھنے والے کے عمل کے قائم مقام ہے۔ پھر فرمایا

کیا تم غور و فکر نہیں کرتے۔ اس سے صاحب عقل کو متنبہ کرنا مقصود ہے کہ وہ ان دونوں امور کا فرق سمجھے اور غافل نہ ہو۔ (تفسیر کبیر ج ۴ ' ص ۴۸ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت ' ۱۳۹۸ھ)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اجتہاد پر دلائل

امام رازی کی یہ تقریر صحیح نہیں ہے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور دیگر انبیاء (علیہم السلام) کا اجتہاد کرنا جائز ہے اور نصوص پر قیاس کرنا بھی جائز ہے۔ سورۃ انبیاء ۷۹۔۷۸ 'میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان (علیہما السلام) کے اجتہاد کا ذکر ہے اور امام بخاری نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت نے حج کی نذر مانی ' پھر وہ فوت ہوگئی ' اس کا بھائی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس گیا اور اس کے متعلق سوال کیا؟ آپ نے فرمایا یہ بتاؤ اگر تمہاری بہن پر قرض ہوتا تو کیا تم اس کو ادا کرتے؟ اس نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا پھر اللہ کا حق ادا کرو ' وہ ادائیگی کے زیادہ حقدار ہے۔ (صحیح البخاری ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۱۸۵۲ ' ج ۷ ' رقم الحدیث : ۶۶۹۹ ' ج ۸ ' رقم الحدیث : ۷۳۱۵ ' سنن النسائی ' ج ۵ ' رقم الحدیث : ۲۶۳۱ ')

اس حدیث میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ کے حق کو بندے کے حق پر قیاس کیا ہے اور یہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اجتہاد اور قیاس کی دلیل ہے۔

قرآن مجید میں ہے :

(آیت) "فاعتبروا یاولی الابصار "۔ (الحشر : ۲)

ترجمہ : اے صاحبان بصیرت اعتبار کرو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اعتبار کرنے کا حکم دیا ہے اور اعتبار کا معنی ہے ایک چیز سے دوسری چیز کی طرف منتقل ہونا اور یہی معنی قیاس میں بھی متحقق ہوتا ہے ' کیونکہ قیاس میں اصل کے حکم کو فرع کی طرف منتقل کرتے ہیں۔

قاضی ابوالخیر عبداللہ بن عمر بیضاوی متوفی ۶۸۵ ھ لکھتے ہیں :

اس آیت سے قیاس کی حجیت پر استدلال کیا گیا ہے کیونکہ اس آیت میں ایک حال سے دوسرے حال کی طرف تجاوز کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور دو چیزوں میں مشارکت کی وجہ سے ایک کا حکم دوسرے پر لاگو کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہی قیاس ہے۔ (انوار التنزیل علی ھامش عنایۃ القاضی ' ج ۸ ' ص ۱۷۷۔۱۷۶ ' مطبوعہ دار صادر ' بیروت)

علامہ شہاب الدین خفاجی متوفی ۱۰۶۹ھ لکھتے ہیں :

اس آیت میں ہمیں اعتبار کرنے کا حکم دیا ہے اور اعتبار کا معنی ہے کسی چیز کو اس کی نظیر کی طرف لوٹانا ' بایں طور کہ اس شے پر اس کی نظیر کا حکم عائد کیا جائے اور یہ اعتبار نصیحت حاصل کرنے ' قیاس شرعی اور قیاس لغوی کو شامل ہے اور یہ آیت نصیحت حاصل کرنے پر عبارۃ اور قیاس پر اشارۃ دلالت کرتی ہے۔ (عنایۃ القاضی ' ج ۸ ' ص ۱۷۶ ' مطبوعہ دار صادر ' بیروت)

صحابہ کرام کے اجتہاد پر دلائل

بکثرت احادیث میں صحابہ کرام (رض) کے اجتہاد کا ذکر ہے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ایک سرد رات میں جنبی ہوگئے۔ انھوں نے اجتہاد کرکے غسل کی بجائے تیمّم کرلیا ' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس کا ذکر کیا گیا تو آپ نے ان کو ملامت نہیں کی۔
(صحیح البخاری 'کتاب التیمم ' باب ۷)

امام ابوعیسی محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ ھ روایت کرتے ہیں :
حضرت معاذ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت معاذ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا پوچھا تم کس طرح فیصلہ کروگے ؟ انھوں نے کہا میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا اگر کتاب اللہ میں تصریح نہ ہو ؟ انھوں نے کہا پھر سنت رسول اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا آپ نے فرمایا اگر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت میں تصریح نہ ہو ؟ انھوں نے کہا میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ آپ نے فرمایا اللہ کی حمد ہے جس نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے رسول کو توفیق عطا فرمائی۔ (سنن الترمذی ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ۱۳۳۲ ' سنن ابوداؤد ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۳۵۹۲ ' مسند احمد ' ج ۵ ' ص ۲۳۶ ' ۲۳۰)
حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جب حاکم اجتہاد سے حکم کرے اور صحیح حکم دے تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور جب وہ حکم میں خطا کرے تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔ (سنن ترمذی ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ۱۳۳۱ ' صحیح البخاری ' ج ۸ ' رقم الحدیث : ۷۳۵۲ ' صحیح مسلم اقضیہ ' ۱۵ (۱۷۱۶) ۴۴۰۷ ' سنن ابوداؤد ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۳۵۷۴ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۲۳۱۴ ' سنن کبری للنسائی ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ۵۹۱۸)

آپ کا وحی کی اتباع کرنا اجتہاد کے منافی نہیں ہے

قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اجتہاد کیا ہے اور آپ کے صحابہ کرام کو اجتہاد کرنے کہ ہدایت بھی کی ہے۔ اب رہا یہ امر کہ اس آیت میں ہے "میں صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جس کی میری طرف وحی کی جاتی ہے " اس کی کیا توجیہ ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ میں قرآن مجید میں اپنی مرضی کچھ نہیں کہتا ' میں اس میں صرف اللہ تعالیٰ کی وحی کی اتباع کرتا ہوں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے اجتہاد سے جو احکام دیئے ان کی تائید اللہ کی وحی سے ہوگئی ' کیونکہ جب آپ احکام دے رہے تھے ' اس وقت نزول وحی کا زمانہ تھا۔ اگر آپ کے احکام میں خطا ہوتی تو اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی آپ کی اصلاح فرما دیتا اور جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے احکام کو برقرار رکھا تو معلوم ہوا کہ آپ کے احکام صحیح تھے اور چونکہ آپ کے احکام کو وحی کی تائید حاصل تھی ' تو گویا آپ مال کے اعتبار سے اتباع وحی کر رہے تھے۔
خلاصہ یہ ہے کہ منصوص احکام میں آپ صراحۃ ' اتباع وحی کرتے ہیں اور غیر منصوص احکام اور اجتہادی مسائل میں آپ مال کے اعتبار سے اتباع وحی کرتے تھے۔ اس لیے آپ کا یہ فرمانا صحیح ہے کہ میں صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جس کی میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ اس کی

تیسری توجیہ یہ ہے کہ کفار آپ سے مال طلب کرتے تھے۔ غیب کی باتیں پوچھتے تھے اور غیر معمولی کام کرنے کے لیے کہتے تھے۔ تو آپ سے فرمایا کہ آپ کہئے کہ میں صرف وحی کی اتباع کرتا ہوں 'میں وہی چیزیں دوں گا اور وہی چیزیں بتاؤں گا اور وہی کام کروں گا جس کی اللہ مجھے اجازت دے گا۔ اس لیے یہ آیت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اجتہاد کے خلاف نہیں ہے۔ یہاں چونکہ اجتہاد کی بحث آ گئی ہے 'اس لیے ہم اجتہاد کی تعریف اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اجتہاد میں مذاہب علماء بیان کریں گے۔ فنقول و باللہ التوفیق۔

اجتہاد کی تعریف

امام غزالی نے اجتہاد کی یہ تعریف کی ہے احکام شرعیہ کا علم حاصل کرنے کے لیے مجتہد کا اپنی طاقت کو خرچ کرنا۔ (المستغنی 'ج ۲ 'ص ۳۵۰)

علامہ آمدی نے کہا احکام شرعیہ میں سے کسی حکم شرعی کا ظن غالب حاصل کرنے کے لیے اتنی کوشش کرنا کہ اس سے زیادہ کوشش سے نفس عاجز ہو۔ (الاحکام 'ج ۴ 'ص ۶۹)

قاضی بیضاوی نے کہا احکام شرعیہ حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنا۔ (نہایۃ السؤل 'ج ۴ 'ص ۵۲۴ 'الابہاج 'ج ۳ 'ص ۲۴۶ 'الابہتاج 'ص ۲۶۷)

علامہ ابن ھمام نے کہا حکم شرعی ظنی کو حاصل کرنے کے لیے فقیہ کا اپنی طاقت کو خرچ کرنا۔ (تیسیر التحریر 'ج ۴ 'ص ۱۷۹)

ان تعریفات میں طاقت خرچ کرنے 'جدوجہد کرنے اور کوشش کرنے سے مراد یہ ہے کہ مجتہد علمی اور ذہنی کوشش کرے میں علت مشترکہ نکالے اور اس میں غور کرے کہ جس مسئلہ کو وہ قیاس سے معلوم کر رہا ہے 'کہیں وہ صراحتاً کتاب وسنت میں منصوص تو نہیں ہے۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اجتہاد کے متعلق علماء اسلام کے مذاہب

علماء اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ دنیاوی مصلحتوں اور جنگ کی تدبیروں اور ان جیسے امور میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا جتہاد کرنا جائز ہے اور آپ نے ان امور میں جتہاد کیا بھی ہے۔ ابن حزم نے اس کی یہ مثال دی ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مدینہ کے تہائی پھل دے کر غطفان سے صلح کا ارادہ کیا اور یہ مباح ہے 'کیونکہ آپ کے لیے جائز ہے کہ آپ اپنے مال سے جس کو چاہیں 'ہبہ، کردیں۔ اسی طرح جب مسلمانوں نے کھجوروں میں پیداوار کی کمی کی شکایت کی تو آپ نے کھجوروں میں پیوند لگانے کا حکم دیا 'کیونکہ ہر شخص کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی کھجور میں پیوند لگائے یا نہ لگائے اور احکام شرعیہ میں آپ کے اجتہاد کے متعلق اختلاف ہے کہ جن چیزوں میں نصوص وارد نہیں ہیں 'ان میں اجتہاد کرنا جائز ہے یا نہیں۔ بعض علماء کے نزدیک آپ کے لیے اجتہاد کرنا جائز نہیں ہے 'بعض کے نزدیک آپ کے لیے اجتہاد کرنا جائز ہے اور بعض نے اس مسئلہ میں توقف کیا ہے۔
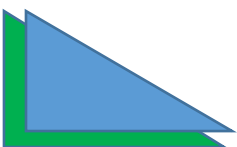
نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اجتہاد کے عدم جواز کے قائلین

استاذ ابو منصور کا مذہب یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے اجتہاد کرنا جائز نہیں ہے 'کیونکہ آپ کو نص کے حصول پر قدرت ہے۔ قرآن مجید میں ہے (آیت) "ان ھوالا وحی یوحی " (النجم : ۴) ان کا کلام کرنا صرف وہ وحی ہے جو ان کی طرف کی جاتی ہے 'ابن حزم کا بھی یہی مختار ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے گدھوں کی زکوۃ کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا مجھ پر ان کے متعلق کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔ (صحیح البخاری ج ۳ 'رقم الحدیث : ۲۸۶۰ 'صحیح مسلم 'زکوۃ '۲۴ '(۹۸۷) ۲۲۵۴ 'سنن نسائی 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۳۵۶۳)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جب کسی کام کے متعلق سوال کیا جاتا تو آپ وحی کا انتظار فرماتے تھے 'اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے لیے اجتہاد کرنا جائز نہیں تھا پھر ایک قول یہ ہے کہ آپ کے لیے اجتہاد کرنا عقلا ممتنع ہے۔ یہ امام الحرمین کا قول ہے جس کو انھوں نے تلخیص میں لکھا ہے اور ابو علی اور ابو ہاشم کا مذہب یہ ہے کہ اجتہاد سے عبادت نہیں کرتے تھے۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اجتہاد کے جواز کے قائلین

امام شافعی 'امام احمد 'اکثر مالکیہ 'قاضی ابو یوسف اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور دیگر انبیاء (علیہم السلام) کے لیے اجتہاد کرنا جائز ہے۔ امام شافعی نے "الرسالہ "میں اس پر یہ دلیل قائم کی ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے اور بندوں کو تدبر اور اعتبار کرنے کا حکم دیا ہے اور ان کے لیے مثالیں بیان فرمائی ہیں 'اسی طرح نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھی تدبر اور تفکر کرنے، کا حکم دیا ہے 'بلکہ آپ اللہ تعالیٰ کی آیات میں سب سے زیادہ غور وفکر کرنے والے ہیں اور سب سے زیادہ اعتبار کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا جو یہ ارشاد ہے (آیت) "ان ھوالا وحی یوحی " (النجم : ۴) ان کا کلام کرنا صرف وہ وحی ہے جو ان کی طرف کی جاتی ہے اس سے مراد قرآن کریم ہے اور اجتہاد شرعی کی اجازت دی گئی ہے۔ جنگی واقعات میں اس کی بہت مثالیں ہیں۔ مثلا نضر کو قتل کرنا اور بہت سے امور ہیں۔ آپ نے غور وفکر کرکے دو جائز کاموں میں سے کسی ایک کو اختیار کیا ہے اور احکام شرعیہ میں آپ کے لیے اجتہاد کرنا اس لیے جائز ہے کہ جب امت کے لیے احکام شرعیہ میں اجتہاد کرنا جائز ہے تو آپ کے لیے بہ طریق اولی جائز ہونا چاہیے۔ کیونکہ آپ خطاء سے معصوم ہیں اور امت خطاء سے معصوم نہیں ہے اور اس لیے بھی کہ اجتہاد سے کسی حکم کو معلوم کرنے میں منصوص حکم کو معلوم کرنے کی بہ نسبت زیادہ دشواری ہے اور جس عمل میں زیادہ مشقت ہو 'اس میں زیادہ ثواب ہوتا ہے۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اجتہاد کے متعلق توقف کے قائلین

علامہ الصیرنی نے "شرح الرسالہ" میں لکھا ہے کہ یہ امام شافعی کا مذہب ہے 'کیونکہ امام شافعی نے اس مسئلہ میں کئی اقوال نقل کیے ہیں اور کسی قول کو مختار قرار نہیں دیا اور یہ کہا کہ جس چیز میں نص کتاب نہ ہو اور اس میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کسی طریقہ کو بیان نہیں کیا 'اس میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے کہا اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق سے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس کا علم عطا فرمایا ہے اور بعض علماء نے، کہا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسی کام کے طریقہ کو بیان کیا ہے جس کی اصل کتاب میں ہے۔ اور بعض علماء نے کہا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس اللہ کا پیغام آتا تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس پیغام سے اللہ تعالیٰ کے فرض ادا کرنے کا طریقہ (سنت) بیان فرماتے، بعض نے کہا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سنت سے جتنے احکام بیان کیے ہیں 'وہ سب آپ کے دل میں القا کیے گئے تھے۔ پھر امام شافعی نے الناسخ والمنسوخ کے باب میں بیان کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

(آیت) "مایکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی"۔ (یونس : ١٥)

ترجمہ : مجھے یہ حق نہیں کہ اس قرآن کو اپنی طرف سے تبدیل کر دوں۔

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو یہ حق دیا ہے کہ جس مسئلہ میں کتاب کا حکم نازل نہیں ہوا ہے 'اس میں اللہ کی توفیق سے اپنی طرف سے بیان فرمائیں۔ پھر کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

(آیت) "یمحوا اللہ مایشآء ویثبت"۔ (الرعد : ٣٩)

ترجمہ : اللہ مٹاتا ہے جو چاہے اور ثابت کرتا ہے جو چاہے۔

اللہ جس فرض کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس فرض کو چاہتا ہے ثابت کر دیتا ہے۔

آپ کے اجتہاد کرنے کے متعلق امام شافعی نے یہ متعارض دلائل نقل کیے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ان کا رجحان توقف کی طرف ہے۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اجتہاد کے وقوع کے متعلق مذاہب علماء

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اجتہاد کے وقوع کے متعلق چار مذاہب ہیں۔ بعض علماء نے وقوع کا مطلقا انکار کا 'بعض علماء نے اصول اور قواعد میں آپ کے اجتہاد کرنے کا انکار کیا اور یہ کہا کہ آپ فروع اور مسائل میں اجتہاد کرتے تھے اور بعض نے اس میں توقف کیا۔ جنہوں نے اجتہاد کے وقوع کا انکار کیا 'انھوں نے کہا تمام سنت وحی ہے 'لیکن یہ وحی غیر متلو ہے اور قرآن مجید وحی متلو ہے اور سنن کے متعلق نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا سنو : مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کی مثل اس کے ساتھ ہے۔ امام مسلم نے حضرت یعلی بن امیہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص کے جبہ پر خوشبو کے لیپ کے آثار تھے 'اس نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا آپ مجھے عمرہ میں کیا کرنے کا حکم دیتے ہیں ؟ اس وقت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر وحی نازل ہوئی 'آپ کے اوپر کپڑا ڈال دیا گیا۔ حضرت یعلی کی یہ خواہش تھی کہ وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نزول وحی کی کیفیت دیکھیں۔ حضرت عمر (رض) نے کپڑے کی چادر ایک

طرف ہٹائی تو حضرت یعلی نے دیکھا کہ ان کو اونٹ کے بڑبڑانے کی آواز آرہی تھی 'جب آپ سے یہ کیفیت دور ہوئی تو آپ نے فرمایا اس خوشبو کے اثر کو دھو ڈالو اور جبہ اتار دو اور جو کچھ حج میں کرتے ہو 'وہی عمر میں بھی کرو۔ (صحیح مسلم 'ج ٦ '(١١٨٠) ٢٧٥٢ 'صحیح بخاری 'ج ٢ 'رقم الحدیث : '١٨٤٧ 'سنن ابوداؤد 'ج ٢ 'رقم الحدیث : '١٨٤٧)

یہ حدیث صحیح ہے اور اس میں یہ قطعی دلیل ہے کہ جس طرح آپ پر قرآن نازل ہوتا تھا 'اسی طرح سنت بھی نازل ہوتی تھی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غیر منصوص احکام میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اجتہاد نہیں کرتے تھے 'بلکہ وحی سے احکام حاصل کرکے بیان کرتے تھے۔

علامہ یحییٰ بن شرف نووی شافعی متوفی ٦٧٦ ھ لکھتے ہیں :

اکثر علماء نے کہا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے اجتہاد کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ واقع ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آیا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اجتہاد میں خطا جائز ہے یا نہیں۔ محققین کا مذہب یہ ہے کہ آپ کے اجتہاد میں خطا جائز نہیں ہے اور اکثر علماء جواز کے قائل ہیں 'لیکن آپ کو خطا پر برقرار نہیں رکھا جاتا۔ (شرح صحیح مسلم للنووی 'ج ا 'ص ٥٨٦ 'مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ مکہ مکرمہ '١٤١٧ھ)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اجتہاد کے وقوع کے ثبوت میں احادیث

جن لوگوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اجتہاد کے وقوع کا انکار کیا ہے 'انھوں نے حضرت یعلی کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ جب آپ سے عمرہ کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے اس وقت تک جواب نہیں دیا جب تک آپ پر وحی نازل نہیں ہوئی۔ لیکن بکثرت ایسی احادیث ہیں کہ نبی کریم نے نزول وحی کے بغیر فی الفور سائل کے جواب دیئے اور یہ جوابات آپ کے اجتہاد پر قوی دلیل ہیں اور حضرت یعلی کی حدیث کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ وحی سے احکام حاصل کرتے تھے 'لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ ہر حکم وحی سے حاصل کرتے تھے اور اجتہاد بالکل نہیں کرتے تھے 'جبکہ آپ نے بکثرت سوالات کے جوابات میں فی الفور احکام شرعیہ بیان فرمائے۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ٢٥٦ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فتح مکہ کے دن یہ خبر دی گئی کہ خزاعہ نے بنولیث کے ایک شخص کو اپنے مقتول کے بدلہ میں قتل کردیا ہے 'جس کو بنولیث نے قتل کیا تھا۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اونٹنی پر سوار ہو کر خطبہ دیا اور فرمایا بیشک اللہ نے مکہ میں قتل کو بند کردیا ہے اور ان پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور مومنوں کو مسلط کردیا ہے۔ سنو ! مکہ نہ مجھ سے پہلے کسی شخص کے لیے حلال تھا اور نہ میرے بعد کسی کے لیے حلال ہوگا۔ سنو ! وہ میرے لیے دن کی صرف ایک ساعت کے لیے حلال ہوا ہے اور سنو ! یہ وہی ساعت ہے 'نہ اس کے کانٹوں کو اکھاڑا جائے گا 'نہ اس کے درختوں کو کاٹا جائے گا اور نہ اس کی گری ہوئی چیز اٹھائی جائے گی 'ماسوا اعلان کرنے والے کے 'اور جن لوگوں کا کوئی شخص قتل کیا گیا ہو 'اس کو دو اختیار ہیں 'یا تو وہ دیت لے لے یا قصاص

لے لے۔ یمن کے ایک شخص نے کہا یارسول اللہ ! مجھے یہ لکھ کر دیں 'آپ نے فرمایا ابو فلاں کے لیے یہ لکھ دو۔ قریش کے ایک شخص نے کہا یارسول اللہ ! اذخر (ایک قسم کی گھاس) کا استثناء فرمالیجئے 'کیونکہ ہم اس کو اپنے گھروں میں اور قبروں میں رکھتے ہیں تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ماسوا اذ کرکے۔ (صحیح البخاری 'ج ۱ 'رقم الحدیث : ۱۱۲ 'صحیح مسلم 'حج ۴۴۵ '(۱۳۵۳) ۳۲۴۴ 'سنن ابوداؤد 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۲۰۱۸ 'سنن نسائی 'ج ۵ 'رقم الحدیث : ۲۸۷۵ 'سنن کبری للنسائی 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۳۸۵۷)

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اذخر کے استثناء کا سوال کیا گیا اور آپ نے وحی کی طرف مراجعت کے بغیر فی الفور اپنے اجتہاد سے اس کا استثناء کر دیا۔

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ایک شخص نے سوال کیا کہ محرم کیا پہنے ؟آپ نے فرمایا محرم قمیص پہنے 'نہ عمامہ 'نہ شلوار 'نہ ٹوپی 'نہ زعفرانی یا سرخ رنگ سے رنگا ہوا کپڑا۔ اگر اس کو نعلین نہ ملیں تو وہ موزے پہن لے اور ان کو (اوپر سے) کاٹ لے حتی کہ وہ ٹخنوں کے نیچے ہو جائیں۔ (صحیح البخاری ج ۱ 'رقم الحدیث : ۱۳۴ 'صحیح مسلم 'حج ۳ '(۱۱۷۷) ۲۷۴۷ 'سنن النسائی 'ج ۵ 'رقم الحدیث : ۲۶۶۷ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۲۹۳۲)

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سائل کے جواب میں وحی کی طرف مراجعت کیے بغیر فی الفور اپنے اجتہاد سے محرم کے لباس کے متعلق حکم شرعی بیان فرمایا :

حضرت ام عطیہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اے نبی ! جب آپ کے پاس ایمان والی عورتیں حاضر ہوں اور وہ آپ سے اس پر بیعت کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر لائیں گی اور نہ کسی نیکی کے کام میں آپ کی نافرمانی کریں گی تو آپ ان کو بیعت کرلیا کریں۔ (الممتحنہ : ۱۲) اور نیکی کے کاموں میں سے نوحہ کی ممانعت بھی تھی۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ ! آل فلاں کا استثناء کر دیجئے 'کیونکہ انھوں نے زمانہ جاہلیت میں (نوحہ کرنے میں) میری مدد کی تھی 'تو میرے لیے بھی ان کی مدد کرنا ضروری ہے۔ پس رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ماسوا آل فلاں کے۔ (صحیح مسلم 'جنائز '۳۳ '(۹۳۷) ۲۱۳۰ 'السنن الکبری للنسائی 'ج ٦ 'رقم الحدیث : ۱۱۵۸۷)

حضرت براء بن عازب (رض) بیان کرتے ہیں کہ میرے ماموں حضرت ابوبردہ بن نیار نے نماز عید سے پہلے قربانی کرلی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہ بکری کا گوشت ہے (یعنی قربانی نہیں ہے 'کیونکہ وہ نماز عید کے بعد ہے) انھوں نے کہا یارسول اللہ ! میرے پاس چھ ماہ کا بکرا ہے 'آپ نے فرمایا تم اس کی قربانی کرلو تمہارے علاوہ اور کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے۔ (صحیح مسلم 'الاضاحی '۴ '(۱۹۶۱) ۴۹۷۹ 'صحیح البخاری 'ج ۱ 'رقم الحدیث : ۹٦۵ 'سنن ابوداؤد 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۲۸۰۱ '۲۸۰۰ 'سنن ترمذی 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۱۵۱۳ 'سنن النسائی 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۱۵٦۳ 'سنن کبری للنسائی 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۴۴۸۷ 'سنن کبری 'للبیہقی 'ج ۹ 'ص ۲٦۲ 'مسند احمد 'ج ٦ 'رقم الحدیث : ۱۸۵۰۷ 'طبع جدید)

ان دونوں حدیثوں میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وحی کی طرف مراجعت کے بغیر استثناء بیان فرمایا ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب (رض) نے کہا میں خوشی سے سرشار تھا تو میں نے روزے کے باوجود بوسہ لے لیا 'میں نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آج میں نے بہت سنگین کام کیا ہے۔ میں نے روزے کی حالت

میں بوسہ لے لیا ؟ آپ نے فرمایا یہ بتاؤ ! اگر تم روزے کی حالت میں پانی سے کلی کرلو تو (دارمی میں ہے) میں نے تو اس سے کچھ نقصان نہیں ہوگا۔ آپ نے فرمایا تو اس سے کیسے ہوگا۔ (سنن ابو داؤد ج ۲ 'رقم الحدیث : '۳۳۸۵ 'سنن دارمی 'ج ۲ 'رقم الحدیث : '۱۷۲۴ 'مسند احمد ' ج ۱ 'ص ۲۱)

اس حدیث میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صراحتا قیاس سے حکم شرعی بیان فرمایا ہے اور روزے میں بوسہ لینے کو کلی کرنے پر قیاس فرمایا ہے اور یہ آپ کے اجتہاد پر واضح دلیل ہے۔

حضرت ابوذر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا ' یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! مالدار لوگ تو اجر وثواب لے گئے 'وہ ہماری طرح نماز پڑھتے ہیں اور ہماری طرح روزے رکھتے ہیں اور اپنے مال سے صدقہ دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کیا اللہ نے تمہارے لیے صدقہ کا سبب مہیا نہیں کیا؟ ہر بار "سبحان اللہ " کہنا صدقہ ہے 'ہر بار "الحمد للہ " کہنا صدقہ ہے اور ہر بار "لاالہ الا اللہ " کہنا صدقہ ہے 'اور نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے اور برائی سے روکنا صدقہ ہے اور تم میں سے ہر شخص کا جماع کرنا صدقہ ہے۔ صحابہ نے کہا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر ہم میں سے کوئی شخص محض شہوت سے جماع کرے 'پھر بھی اس کا یہ عمل صدقہ ہے ؟ آپ نے فرمایا یہ بتاؤ اگر تم میں سے کوئی شخص حرام محل میں شہوت پوری کرتا تو کیا اس کو گناہ ہوتا؟ سو اسی طرح جب وہ حلال محل میں شہوت پوری کرے گا 'تو اس کو اجر ملے گا۔ (صحیح مسلم 'زکوۃ '۵۳ '(۱۰۰۶) ۲۲۹۲ 'سنن ابوداؤد 'ج ۳ رقم الحدیث : ۷ ۴۹۴ 'مسند احمد 'ج ۵ 'ص ۱۶۸، ۱۶۷)

اس حدیث میں بھی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قیاس اور اجتہاد پر واضح دلیل ہے۔

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت نے حج کی نذر مانی 'پھر وہ فوت ہوگئی۔ اس کا بھائی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس گیا اور اس کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے فرمایا یہ بتاؤ اگر تمہاری بہن پر قرض ہوتا تو کیا تم اس کو ادا کرتے ؟ اس نے کہا ہاں ! آپ نے فرمایا پھر اللہ کا حق ادا کرو وہ ادائیگی کے زیادہ حقدار ہے۔ (صحیح البخاری 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ' : ۱۸۵۲ 'سنن النسائی 'ج ۵ 'رقم الحدیث : '۲۶۳۴۱)

اس حدیث میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ کے حق کو بندے کے حق پر قیاس کیا ہے اور یہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اجتہاد کی قوی دلیل ہے۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

جس طرح اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں ہو سکتے اسی طرح حقائق میں غور و فکر کرکے توحید و رسالت پر ایمان لانے والے اور حقائق سے آنکھیں بند کرکے گمراہی میں سر گرداں رہنے والے برابر نہیں ہو سکتے، لہٰذا عقل کے ناخن لو اور حقائق میں غور و فکر کرکے حق تلاش کرنے کی کوشش کرو۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

آیت مبارکہ :

وَاَنۡذِرۡ بِهِ الَّذِيۡنَ يَخَافُوۡنَ اَنۡ يُّحۡشَرُوۡۤا اِلٰى رَبِّهِمۡ لَيۡسَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ وَلِىٌّ وَّلَا شَفِيۡعٌ لَّعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ○51
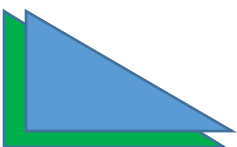
لغۃ القرآن: [وَاَنْذِرْ : اور آپ ڈرائیں] [بِهِ : اسکے ساتھ] [الَّذِيْنَ : ان لوگوں کو] [يَخَافُوْنَ : جو ڈرتے ہیں] [اَنْ يُّحْشَرُوْٓا : کہ وہ اکٹھے کیے جائیں] [اِلٰى: طرف] [رَبِّهِمْ : اپنے رب کی] [لَيْسَ : نہیں] [لَهُمْ : ان کے لیے] [مِّنْ : سے] [دُوْنِهٖ : اسکے علاوہ] [وَلِيٌّ: دوست] [وَّلَا : اور نہ] [شَفِيْعٌ: سفارشی] [لَّعَلَّهُمْ : تاکہ وہ] [يَتَّقُوْنَ : وہ پرہیزگار بن جائیں]

ترجمہ : اور آپ اس (قرآن) کے ذریعے ان لوگوں کو ڈر سنایئے جو اپنے رب کے پاس اس حال میں جمع کئے جانے سے خوف زدہ ہیں کہ ان کے لیے اس کے سوانہ کوئی مددگار ہو اور نہ (کوئی) سفارشی تاکہ وہ پرہیزگار بن جائیں

تشریح:

غور و فکر کی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے لیے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری کا تصور پیدا کرنا ضروری ہے جس کی یہاں تلقین کی گئی ہے۔یہی عقیدہ اور تصور انسان کو صراط مستقیم کی طرف لاتا ہے۔

قرآن مجید انسان کو اللہ تعالیٰ کی آیات، اس کے گرد و پیش کے ماحول، یہاں تک کہ اپنی ساخت وپرداخت پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ غور و فکر کرنا ایسی قوت ہے جس سے انسان کے بند دماغ کی گرہیں کھل جاتی ہیں اور اس کی آنکھوں پر پڑے ہوئے غفلت کے پردے ہٹ جاتے ہیں جو شخص ان صلاحیتوں سے عاری ہو جائے وہ اپنے سامنے کی بڑی سے بڑی حقیقت کو پہچاننے سے قاصر رہتا ہے۔ منکرین حق دنیاوی مسائل کی گرہیں کھولنے اور ترقی کرنے کے دعوے دار ہونے کے باوجود حقیقی اور دائمی حقائق سے غافل ہوتے ہیں۔اسی وجہ سے وہ مومن کی نسبت محشر کے میدان سے زیادہ لرزاں وترساں رہتے ہیں اس لیے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم ہوا کہ آپ ایسے لوگوں کو ڈرائیں جو اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونے سے ڈرتے ہیں اور جن سہاروں پر یہ بھروسہ کیے ہوئے ہیں وہاں کوئی خیر خواہ ان کی خیر خواہی اور کوئی سفارشی ان کی سفارش نہیں کر سکے گا لہٰذا انھیں اپنے باطل عقیدہ کو چھوڑنا اور برے اعمال سے پرہیز کرنا چاہیے۔

مفسرین کے دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ اس آیت میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مخاطب کیا گیا ہے کہ آپ کفار کے مطالبات پر پریشان ہونے اور ان پر مزید صلاحیتیں صرف کرنے کے بجائے ان لوگوں کی تعلیم و تربیت فلاح اور اصلاح کے لیے کوشش کریں اور ڈرائیں جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری کے تصور سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔

اور ایسے لوگوں کو اپنے آپ سے ہرگز دور نہ کریں جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے اور ہر وقت اس کے فضل و کرم کے طالب رہتے ہیں ان کے حساب کے بارے میں آپ مسؤل نہیں اور آپ کے حساب میں سے ان کے ذمہ نہیں ہوگا۔

شانِ نزول

تمام مفسرین نے اس آیت کا شان نزول بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اہل مکہ نے ایک دن آپ ﷺ سے یہ مطالبہ کیا کہ ہم آپ ﷺ کی محفل میں آنے اور آپ کی بات سمجھنے کے لیے تیار ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ بلال، خبیب (رض) اور اس قسم کے غریب لوگ ہماری آمد کے وقت آپ ﷺ کی محفل میں نہیں ہونے چاہئیں بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے کفار کی ہدایت کی طلب کے جذبے میں آکر ایسا کرنے کا عندیہ دیا تھا اور کچھ لوگوں کا یہ اعتراض بھی تھا کہ آپ ﷺ کی محفل میں بیٹھنے والے بعض لوگ ایسے ہیں جو اسلام قبول کرنے سے پہلے بڑے بڑے جرائم میں ملوث تھے۔ آپ ﷺ نے اپنی پاک فطرت کی بنا پر اس چیز کو محسوس کیا جس بنا پر یہ وضاحت نازل ہوئی کہ اے نبی ﷺ! آپ ﷺ نے اپنا حساب دینا ہے اور یہ اپنے حساب و کتاب کے بارے میں جواب دہ ہوں گے۔ ماضی کے حوالے سے ان لوگوں کو چھوڑ نا ظالموں کا ساتھ دینے کے مترادف ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے پر خلوص ایمان کی وجہ سے ان کے گناہوں کو معاف کر دیا ہے۔

(عن عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ (رض) قَالَ أَتَيْتُ النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فَقُلْتُ ابْسُطْ يَمِينَكَ فَلْأُبَايِعْكَ فَبَسَطَ يَمِينَهُ قَالَ فَقَبَضْتُ يَدِي قَالَ مَا لَكَ يَا عَمْرُو قَالَ قُلْتُ أَرَدْتُ أَنْ أَشْتَرِطَ قَالَ تَشْتَرِطُ بِمَاذَا قُلْتُ أَنْ يُغْفَرَ لِي قَالَ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ الْإِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ وَأَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا وَأَنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ وَمَا كَانَ أَحَدٌ أَحَبَّ إِلَيَّ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا أَجَلَّ فِي عَيْنِي مِنْهُ وَمَا كُنْتُ أُطِيقُ أَنْ أَمْلَأَ عَيْنَيَّ مِنْهُ إِجْلَالًا لَهُ وَلَوْ سُئِلْتُ أَنْ أَصِفَهُ مَا أَطَقْتُ لِأَنِّي لَمْ أَكُنْ أَمْلَأُ عَيْنَيَّ مِنْهُ وَلَوْ مُتُّ عَلَى تِلْكَ الْحَالِ لَرَجَوْتُ أَنْ أَكُونَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ ثُمَّ وَلِينَا أَشْيَاءَ مَا أَدْرِي مَا حَالِي فِيهَا فَإِذَا أَنَا مُتُّ فَلَا تَصْحَبْنِي نَائِحَةٌ وَلَا نَارٌ) [رواہ مسلم : کتاب التفسیر، باب قول اللہ تعالیٰ وانذر عشیرتک الاقربین]

”حضرت عمرو بن عاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنا دایاں ہاتھ آگے کیجیے تاکہ میں آپ ﷺ کی بیعت کروں جب آپ ﷺ نے اپنا دایاں ہاتھ آگے فرمایا تو میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا تب آپ ﷺ پوچھتے ہیں اے عمرو! کیا ہوا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ایک شرط کے ساتھ بیعت کرتا ہوں ارشاد ہوا کہ وہ کونسی شرط ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میرے گناہ معاف کر دیے جائیں۔ فرمایا عمرو تو نہیں جانتا یقیناً اسلام پہلے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے؟ اسی طرح ہجرت کرنے سے ہجرت سے پہلے کے بھی گناہ ختم ہو جاتے ہیں اور یقیناً حج سے بھی سابقہ غلطیاں معاف ہو جاتی ہیں۔ رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے زیادہ مجھے کوئی محبوب نہ تھا۔ اور نہ ہی میری آنکھ میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے زیادہ کسی کا

جلال تھا۔ میں انھیں اس جلال کی وجہ سے آنکھ بھر کے نہیں دیکھ سکا۔ اگر مجھ سے کوئی سوال کرے کہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کوئی وصف بیان کروں تو اس کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے آپ ﷺ کو کبھی آنکھ بھر کے دیکھا ہی نہیں۔ اگر میں اس حال میں فوت ہو گیا تو میں امید کرتا ہوں کہ میں اہل جنت میں سے ہوں گا۔ پھر اللہ مجھے جنت میں ولی مقرر کر دے تو میں نہیں جانتا وہاں کس حال میں ہوں گا تو جب میں فوت ہو جاؤں تو میرے ساتھ کوئی نوحہ کرنے والی اور آگ نہ لے کے آنا۔"

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے ذاتی احساسات

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب کوئی آدمی فوت ہونے لگتا تو عمرو بن عاص (رض) فرمایا کرتے کہ نہ معلوم لوگ نزع کے وقت کیوں نہیں بتلاتے کہ موت کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ جب عمرو بن عاص (رض) پر نزع کا عالم طاری ہوا تو میں نے ان کی بات یاد کرواتے ہوئے گذارش کی کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جب مجھ پر یہ وقت آئے گا تو میں بتلاؤں گا کہ موت کس طرح آتی ہے۔ اس کے جواب میں عمرو بن عاص (رض) صرف اتنا بتلا سکے کہ بھتیجے بس میں اتنا ہی بیان کر سکتا ہوں کہ مجھے نزع کا عالم یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے کسی نے احد پہاڑ میرے سینے پر رکھ دیا ہو اور پھر زار و قطار رونے لگے۔ اسی موقعہ پر ہی انھوں نے اپنے بیٹے حضرت عبداللہ کو وصیت کی تھی کہ میری قبر پر منکر نکیر کے سوالات تک کھڑے رہنا۔ تاکہ میں تسکین پاؤں"

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو آزمانے اور ان کی صلاحیتوں کو نکھارنے کے لیے بیشمار آزمائشیں بنائی ہیں۔ ان میں غربت اور امارت، شہرت اور گمنامی، حاکم اور محکوم ہونا بھی آزمائش کا ایک طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو دولت وثروت، شہرت و ناموری اقتدار اور اختیار دے کر آزماتا ہے کہ یہ لوگ نعمتوں سے محروم انسانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں اگر نعمتیں پانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے اور اس کی مخلوق کے ساتھ عاجزی اور خیر خواہی کا رویہ اختیار کرتے ہیں تو انھیں مزید نعمتیں دیتے ہوئے آخرت میں اجر وثواب سے نوازا جائے گا۔ اگر صاحب حیثیت لوگ خدا کے نافرمان اور اس کی مخلوق کے لیے ظالم ثابت ہوتے ہیں تو انھیں اذیت ناک سزاؤں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اسی طرح ہی نعمتوں سے محروم لوگوں کو آزمایا جاتا ہے کہ وہ دنیاوی نعمتوں سے محروم ہو کر صبر و شکر کا رویہ اختیار کرتے ہیں تو انھیں قیامت کے دن عظیم اجر وثواب عطا ہوگا۔ اور اگر یہ لوگ سرکشی اور نافرمانی کا رویہ اختیار کرتے ہیں تو انھیں اس کی سزا اور مزید محرومیوں سے واسطہ پڑے گا۔ اہل مکہ غریب صحابہ (رض) پر یہ طعن بھی کرتے تھے کیا یہ لوگ ہیں؟ جن پہ اللہ نے احسان کیا ہے کہ جن کو پیٹ پالنے کے لیے خوراک اور تن ڈھانپنے کے لیے پوشاک بھی میسر نہیں۔ یہاں ایک طرف کفار کو بین السطور سرزنش کی جارہی ہے کہ تم خدا کی نعمتیں پانے کے باوجود سرکش اور باغی ہو لہٰذا اپنا انجام سوچ لو۔ تمہارے مقابلے میں نعمتوں سے محروم لوگ اس کسمپرسی کے عالم میں بھی اپنے رب کے فرمان بردار یا تابع فرمان اور شکر گزار ہیں۔ اس طرح شکر گزار بندوں کو تسلی اور ان کی قدر افزائی کی گئی ہے۔ اگلی آیات میں غریب مومنین کو یہ کہہ کر اعزاز بخشا گیا ہے کہ اے نبی! جب یہ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں تو آپ ان کو سلام کرنے میں پہل کیا کریں۔

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران تعلیقاً)

متکبرین کی مذمت اور متواضعین کی عظمت

یعنی اے پیارے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ قرآن کے ذریعے ان لوگوں کو ڈرائیے جن کے دلوں میں خوف خدا اور فکر آخرت ہے کیونکہ وہی قرآن سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جینے کے خوف ہے کہ روز قیامت انھیں اللہ کے بالمقابل کوئی چھڑانے والا نہ ہوگا جو انھیں اللہ سے زبردستی چھڑالے گا گویا قرآن سے وہ کفار فائدہ نہیں اٹھا سکتے جنہیں کوئی خوف خدا اور فکر آخرت نہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی روز آخرت آنے والا ہے تو ان کے جھوٹے خدا انھیں اللہ سے جبراً چھڑالیں گے۔

یعنی مومن کی یہ شان ہے کہ وہ آخرت کی پکڑ سے ڈرتا رہتا ہے کی اللہ کے ہاں مجھے اپنے اعمال کا حساب دینا پڑے گا اور وہاں حکم الٰہی اور رحمت خداوندی کے بغیر کوئی میری شفاعت نہیں کر سکے گا اور یہ روزے قیامت کی پکڑ کا خوف ہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو گناہوں سے روکتا ہے۔

چنانچہ بندہ مومن تنہائی میں بھی اللہ سے ڈرتا ہے کہ کہیں روزے قیامت مجھ سے اس چیز کا مواخذہ نہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى۔ "

جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر جائے اور اپنے نفس کو بری خواہش سے روک لے تو جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہے (نازعات۔ 40) (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بشیر و نذیر ہیں اور قرآن پاک ہدایت۔ بشارت و نذرارت ہے

کہ ان کے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی حمایتی نہ کوئی سفارشی ہو۔ یعنی خائف ہیں حشر سے کہ اس دن سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی ناصر و مددگار نہیں تاکہ وہ پرہیزگار ہو جائیں۔ یعنی زمرہ اہل تقویٰ میں داخل ہو جائیں۔

زمانہ جاہلیت میں شفاعت کا تصور بہت غلط تھا وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ عزوجل کی مرضی نہ بھی ہو تو بھی یہ بت ان کی سفارش کرالیں گے۔ یہود و نصاریٰ کا خیالت ھا کہ نحن ابنوآء اللہ واحبآء وہ۔ ہم تو اللہ کے بیٹے اور لاڈلے ہیں لہٰذا ہمارے اعمال کیسے ہی کیوں نہ ہوں ہم بخش دیئے جائیں گے اس کا رد فرمایا گیا۔ البتہ انبیائ، الویائ، علماء شفاعت باذن الٰہی فرمائیں گے۔ شفاعۃ الرسول لھم باذن اللہ فھو شفیع حقیقۃ (قرطبیؒ) جب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم ہوا غیر متقین کے انذار کا تاکہ وہ متقی بن جائیں۔ تو اسی کے ساتھ حکم ہوا کہ تقویٰ والے غرباء خواہ وہ لباس میں میلے کچیلے ہوں ان کو ان مشرکوں کی خاطر علیحدہ نہ کرو۔ (تفسیر الحسنات۔ علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)

کافروں اور مسلمانوں کو ڈرانے کے الگ الگ محل

اس سے پہلے کی آیتوں میں فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ لہٰذا اس آیت میں فرمایا اس قرآن کے ساتھ ان لوگوں کو ڈرایئے جو اپنے رب کی طرف جمع کیے جانے سے ڈرتے ہیں۔ اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ ان لوگوں سے کون مراد ہیں؟ بعض نے کہا اس سے مراد کافر ہیں 'کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کافروں کو عذاب آخرت سے ڈراتے تھے 'اور بعض کافروں پر اس ڈرانے کا اثر ہوتا تھا اور وہ سوچتے تھے کہ شاید آپ ٹھیک کہتے ہوں۔ پھر فرمایا اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار اور اس کی اجازت کے بغیر کوئی ان کی شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا۔ اس میں یہود و نصاریٰ کا رد ہے جو کہتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ (المائدہ : ۱۸)

اور اس میں مشرکین کا بھی رد ہے جو یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ ان کے بت اللہ کے پاس ان کی شفاعت کریں گے اور بعض مفسرین نے کہا کہ ان لوگوں سے مراد مسلمان ہیں اور معنی یہ ہے کہ آپ مسلمانوں کو ڈرایئے جو اپنے رب کی طرف جمع کیے جانے سے ڈرتے ہیں 'کیونکہ مسلمانوں کو ہر چند کہ اپنے رب کے سامنے جمع کیے جانے کا یقین تھا 'لیکن ان کو اپنے اوپر عذاب کا یقین نہیں تھا 'کیونکہ ان کو یہ گمان تھا کہ ان کا خاتمہ ایمان اور نیک اعمال پر ہوگا۔ تاہم یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ان کو عذاب ہو 'اس لیے فرمایا کہ آپ انھیں آخرت کے عذاب سے ڈرائیں تاکہ وہ گناہوں سے باز رہیں اور نیک اعمال پر ثابت قدم رہیں۔ اس کے بعد فرمایا اس دن اللہ کی اجازت کے بغیر نہ کوئی مدد کر سکے گا 'نہ شفاعت کر سکے گا اور گناہ گار مسلمانوں کے لیے جو شفاعت کی جائے گی وہ اللہ کی اجازت سے ہوگی :

(آیت) "من ذالذی یشفع عندہ الا باذنہ"۔ (البقرہ : ۲۵۵)

ترجمہ : کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کی بارگاہ میں شفاعت کر سکے۔

(آیت) "ولا تنفع الشفاعۃ عندہ الالمن اذن لہ"۔ (سبا : ۲۳)

ترجمہ : اور اس کی بارگاہ میں صرف اسی کی شفاعت سے نفع ہوگا جس کے لیے وہ اجازت دے گا۔

(آیت) "ولا یشفعون الا لمن ارتضی"۔ (الانبیاء : ۲۸)

ترجمہ : اور وہ (فرشتے) اسی کی شفاعت کریں گے جس کے لیے وہ (رب) راضی ہوگا۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

قیامت کے دن شفاعت

یاد رہے کہ قیامت کے دن اللہ عَزَّوَجَلَّ کے مقابلے میں کوئی کسی کا حمایتی اور سفارشی نہ ہوگا ہاں اللہ عَزَّوَجَلَّ کی اجازت سے حمایتی و سفارشی ہوں گے جیسے انبیاء، اولیاء، شہداء، صلحاء، علماء اور حجاج کرام وغیرہا، یہ سب اللہ عَزَّوَجَلَّ کے اذن اور اس کی اجازت سے لوگوں کی حمایت اور سفارش کریں گے۔ انبیاءِ کرام (علیہ السلام) اور اولیاء عظام (رح) کی شفاعت تو واضح ہے۔ تبرکاً، دیگر حضرات کی شفاعت سے متعلق 4 احادیث پیش کی جاتی ہیں۔

(1)۔۔ حضرت عثمان بن عفان (رض) سے روایت ہے، سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن تین جماعتیں شفاعت کریں گی۔ انبیاء پھر علماء پھر شہید لوگ۔

(2)۔۔ حضرت ابو درداء (رض) سے روایت ہے، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ”شہید کے ستر اہل خانہ کے حق میں اس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔

(3)۔۔ حضرت جابر بن عبداللہ (رض) سے روایت ہے، رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: عالم اور عابد دونوں کو (قیامت کے دن) دوبارہ زندہ کیا جائے گا، اس کے بعد عابد سے کہا جائے گا کہ تو جنت میں داخل ہو جا اور عالم کو حکم ہو گا کہ تم ابھی ٹھہرو اور لوگوں کی شفاعت کرو۔

(4)۔۔ حضرت ابو موسیٰ اَشعری (رض) سے مرفوعاً روایت ہے کہ ”حاجی کی شفاعت اس کے خاندان کے چار سو افراد کے حق میں قبول کی جائے گی۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

آیت مبارکہ :

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○52

لغۃ القرآن: [وَلَا : اور نہ] [تَطْرُدِ : آپ دورکریں] [الَّذِيْنَ : ان لوگوں کو] [يَدْعُوْنَ : وہ پکارتے ہیں] [رَبَّهُمْ : اپنے رب کو] [بِالْغَدٰوةِ : صبح] [وَالْعَشِيِّ : اور شام] [يُرِيْدُوْنَ : وہ چاہتے ہیں] [وَجْهَهٗ: اس کی رضا] [مَا : نہیں] [عَلَيْكَ : آپ پر] [مِنْ : سے] [حِسَابِهِمْ : ان کا حساب] [مِّنْ : سے] [شَيْءٍ : کسی چیز] [وَّمَا : اور نہ] [مِنْ : سے] [حِسَابِكَ : آپ کا حساب] [عَلَيْهِمْ : ان پر] [مِّنْ : سے] [شَيْءٍ : کوئی چیز] [فَتَطْرُدَهُمْ : تو آپ دور کریں انکو] [فَتَكُوْنَ : پس آپ ہوجائیں گے] [مِنَ : سے] [الظّٰلِمِيْنَ : ظلم کرنے والے]

ترجمہ : اور آپ ان (شکستہ دل اور خستہ حال) لوگوں کو (اپنی صحبت و قربت سے) دور نہ کیجئے جو صبح و شام اپنے رب کو صرف اس کی رضا چاہتے ہوئے پکارتے رہتے ہیں، ان کے (عمل و جزا کے) حساب میں سے آپ پر کوئی چیز (واجب) نہیں اور نہ آپ کے حساب میں سے کوئی چیز ان پر (واجب) ہے (اگر) پھر بھی آپ انھیں (اپنے لطف و کرم سے) دور کر دیں تو آپ حق تلفی کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے (جو آپ کے شایان شان نہیں)

تشریح:

حضرات بلال، یاسر، خبیب وغیرہ غریب و مسکین صحابہ (رض) ہر وقت شمع رسالت پر پروانہ وار نثار ہوتے رہتے تھے۔ کفار جو نسلی برتری کے قائل تھے انھیں ہر گز یہ گوارا نہ تھا کہ وہ ان غریبوں کے پاس بیٹھیں۔ چنانچہ انھوں نے ایک دفعہ حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت اقدس میں کہلا بھیجا کہ ہم آپ کے پاس حاضر ہونا تو چاہتے ہیں لیکن آپ کے گرد گنواروں اور ناداروں کا ہجوم ہوتا ہے اور ان کے ساتھ بیٹھنے میں ہماری ہتک ہوتی ہے۔ اگر آپ ان کو اپنی مجلس سے اٹھادیں تو ہم حاضر ہو سکتے ہیں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خاطر مبارک میں خیال گزرا ہی تھا کہ فوراً جبرائیل (علیہ السلام) یہ حکم لے کر حاضر ہو گئے۔ اور ساری دنیا کو یہ بتادیا کہ یہی وہ بارگاہ بے کس پناہ ہے جہاں حاضر ہونے والوں کی قدر و قیمت کا اندازہ ان کے زرق برق لباس اور ان کی دولت و ثروت کی بنا پر نہیں لگایا جاتا بلکہ ایمان و تقویٰ کی بنا پر لگایا جاتا ہے۔ فتکون من الظالمین کے الفاظ سے قیامت تک آنے والی امت کو بھی اس طرز عمل پر ثابت قدم رہنے کی تاکید کر دی گئی۔ **فان فعلت کنت ظالما وحاشا من وقوع ذلك منه وانما هذا بيان للاحكام ولئلا يقع مثل ذلك ميں غيره من اهل الاسلام** (القرطبی) اگر آپ ایسا کریں تو آپ ظلم کا ارتکاب کریں گے۔ پناہ بخدا! کہ ایسا فعل حضور سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے صادر ہو۔ یہ تو محض احکام الٰہی کا بیان ہے تاکہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے علاوہ کسی فرزند اسلام سے بھی ایسی حرکت صادر نہ ہو۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

اس آیت کا دوسرا معنیٰ یہ بیان کیا گیا ہے کہ کفار نے غریب صحابہ کرام (رض) پر طعن مراد لیا تھا کہ یہ تو غربت کی وجہ سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں کہ یہاں کچھ روزی روٹی کا انتظام ہو جاتا ہے، یہ مخلص نہیں ہیں۔ اس پر پہلے تو صحابہ کرام (رض) کے اخلاص کا بیان فرمایا کہ یہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کی رضا چاہتے ہوئے دن رات اس کی عبادت کرتے ہیں پھر فرمایا کہ اے حبیب! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ پر ان کے احوال کی تفتیش لازم نہیں کہ یہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مخلص ہیں یا نہیں؟ (1) بلکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کو اپنے فیض صحبت سے نوازتے رہیں اور خلاصہ کلام یہ ہے کہ وہ ضعیف فقراء جن کا اوپر ذکر ہوا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دربار میں قرب پانے کے مستحق ہیں انھیں دور نہ کرنا ہی بجا ہے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

شان نزول

حضرت خباب (رض) نے قرآن مجید کی آیت مبارکہ اور ان (مسکین مسلمانوں) کو دور نہ کیجئے جو صبح وشام اپنے رب کی عبادت کرتے رہتے ہیں۔ (الانعام : ۵۲) کی تفسیر میں بیان کیا 'اقرع بن حابس تمیمی اور عیینہ بن حصن فنزاری آئے۔ انھوں نے دیکھا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسکین مسلمانوں میں سے حضرت صہیب 'حضرت بلال 'حضرت عمار اور حضرت خباب (رض) آپ کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں ' جب مشرکین نے ان کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گرد بیٹھے ہوئے دیکھا تو انھوں نے ان مسکین مسلمانوں کو حقیر جانا 'پس وہ آپ کے پاس آکر خلوت میں بیٹھے اور کہنے لگے 'ہم آپ کے ساتھ مجلس میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ عربوں میں ہماری کیا فضیلت ہے ؟ عرب کے وفود آپ کے پاس آتے رہتے ہیں اور ہم کو حیا آتی ہے کہ عرب لوگ ہم کو ان غلاموں کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھیں۔ تو جب ہم آپ کے پاس آیا کریں آپ ان لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا دیا کریں اور جب ہم آپ کی مجلس سے فارغ ہو جائیں تو پھر آپ چاہیں تو ان کو اپنے پاس بٹھا لیا کریں۔ آپ نے فرمایا اچھا 'انھوں نے کہا آپ ہمیں یہ لکھ کر دے دیں۔ آپ نے صحیفہ منگوایا اور حضرت علی (رض) کو لکھنے کے لیے بلایا اور ہم اس وقت ایک کونے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت حضرت جبرائیل (علیہ السلام) اس آیت کے لے کر نازل ہوئے اور ان (مسکین مسلمانوں کو) دور نہ کیجئے جو صبح وشام اپنے رب کی عبادت کرتے رہتے ہیں درآنحالیکہ وہ اسی کی رضا جوئی کرتے ہیں 'ان کا حساب بالکل آپ کے ذمہ نہیں ہے اور آپ کا حساب سرمواں کے ذمہ نہیں ہے 'پس اگر بالفرض آپ نے ان کو دور کر دیا تو آپ غیر منصفوں سے ہو جائیں گے۔ (الانعام : ۵۲)

پھر اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن کا ذکر کیا اور فرمایا اور اسی طرح ہم نے ان میں سے بعض کو بعض کے سبب آزمائش میں مبتلا کیا 'تاکہ انجام کار وہ (مال دار کافر) یہ کہیں کہ کیا ہم میں سے یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے احسان کیا ہے ' (اے کافرو!) کیا اللہ شکر گزاروں کو خوب جاننے والا نہیں ہے۔ (الانعام : ۵۳) پھر فرمایا اور جب آپ کے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں تو آپ کہیں تم پر سلام ہو، تمہارے رب نے (محض اپنے کرم سے) اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے، (الانعام : ۵۴) حضرت خباب نے کہا پھر ہم آپ کے قریب بیٹھتے تھے۔ حتی کہ ہم اپنے گھٹنوں کو آپ کے گھٹنوں کے ساتھ ملا کر بیٹھتے تھے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے ساتھ بیٹھتے تھے اور جب آپ اٹھ کر جانا چاہتے تو ہمیں مجلس میں چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور آپ صبر سے ان لوگوں کے ساتھ (بیٹھے) رہئے جو صبح اور شام اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں درآنحالیکہ وہ اسی کی رضا چاہتے ہیں 'اور آپ کی آنکھیں ان سے نہ ہٹیں کہ آپ دنیا کی زندگی کی زینت چاہتے ہوں اور آپ اس شخص کا کہا نہ مانیں جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور جو اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور اس کا معاملہ حد سے متجاوز ہو گیا۔ (الکہف : ۲۸)

حضرت خباب نے کہا پھر ہم نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ بیٹھتے تھے 'حتی کہ جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جانے کا وقت آتا تو ہم آپ کو چھوڑ کر اٹھ جاتے تھے۔ پھر آپ تشریف لے جاتے تھے۔ (سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۴۱۲۷ 'جامع البیان ' ج ۷ 'ص ۲۶۳ 'شعب الایمان 'ج ۷ 'رقم الحدیث : ۱۰۴۹۱ 'مصنف ابن ابی شیبہ 'ج ۱۲ 'رقم الحدیث : ۱۲۵۶۴ 'حلیۃ الاولیاء 'ج ۱ ص ۱۴۶ 'الدر المنثور 'ج ۳ 'ص ۱۳ 'اسباب النزول 'ص ۲۲۱۔ ۲۲۰)

خاتم الحفاظ علامہ جلال الدین سیوطی نے اس حدیث کو مسند ابو یعلی اور دلائل النبوۃ کے حوالوں سے بھی ذکر کیا ہے لیکن یہ ان کا تسامح ہے۔ مسند ابو یعلی اور دلائل النبوۃ میں یہ حدیث نہیں ہے۔ امام ابن جریر 'امام ابن ابی حاتم 'امام ابن الجوزی 'امام رازی 'علامہ قرطبی 'علامہ ابو الحیان اندلسی 'حافظ ابن کثیر اور علامہ آلوسی وغیر ھم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت (الانعام : ۵۲) ہم چھ نفوس کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ میرے متعلق 'حضرت ابن مسعود کے متعلق 'حضرت صہیب 'حضرت عمار 'حضرت مقداد اور حضرت بلال (رض) کے متعلق۔ قریش نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دل میں وہ بات آئی جو اللہ نے چاہا۔ آپ نے منصوبہ بنایا تو اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی ان (مسکین مسلمانوں) کو دور نہ کیجئے جو صبح شام اپنے رب کی عبادت کرتے رہتے ہیں 'درآنحالیکہ وہ اسی کی رضا کا ارادہ کرتے ہیں۔ (الانعام : ۵۲)

(تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

(صحیح مسلم 'فضائل الصحابہ '۴۶۔۴۵ '(۲۴۱۳) ۶۱۲۴ '۶۱۲۳ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث : '۴۱۲۸ 'سنن کبری للنسائی 'رقم الحدیث : '۸۲۲)

صبح وشام اخلاص سے عبادت کرنے کی وضاحت

اس آیت میں ان مسکین مسلمانوں کے متعلق فرمایا ہے 'وہ صبح وشام اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ وہ پابندی اور دوام کے ساتھ فرض نمازوں کو باجماعت پڑھتے ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس 'مجاہد اور حسن بصری کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد اللہ کا ذکر اور قرآن مجید کی تلاوت ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد صبح اور شام اللہ سے دعا کرنا ہو 'تاکہ دن کی ابتداء اور اس کا افتتاح اللہ کی دعا سے ہو اور دن کا اختتام بھی اللہ سے دعا پر ہو۔ نیز فرمایا درآنحالیکہ وہ اس کی رضا جوئی کرتے ہیں 'اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اخلاص سے اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اپنی عبادات اور اعمال میں اللہ کے سوا اور کسی چیز کی طرف توجہ نہیں کرتے 'اس آیت میں اور قرآن مجید کی دیگر آیات میں اللہ تعالیٰ کی ذات کو "وجہ (چہرہ) کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے 'کیونکہ انسان کے جسم کی شناخت اس کے چہرے سے ہوتی ہے اور اس کے تمام اعضاء میں سب سے زیادہ تکریم اس کے چہرے کی ہوتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو چہرے سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ وجہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جسم اور چہرہ ہے 'صبح اور شام کے وقت عبادت کا خصوصیت سے اس لیے ذکر فرمایا ہے کیونکہ ان اوقات میں لوگ آرام اور کام کاج میں مشغول ہوتے ہیں تو جو لوگ ان اوقات میں بھی عبادت میں مشغول ہوں 'وہ باقی اوقات میں بہ طریق اولی عبادت میں مشغول ہوں گے۔

مسکینوں کا حساب آپ کے ذمہ نہ ہونے کی وضاحت

جب سورۃ کہف کی یہ آیت نازل ہوئی اور آپ صبر سے ان لوگوں کے ساتھ (بیٹھے) رہئے جو صبح اور شام اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس وقت تک مجلس سے نہیں اٹھتے تھے 'جب تک کہ یہ مسکین مسلمان خود اس مجلس سے نہیں اٹھتے تھے 'جیسا

کہ سنن ابن ماجہ اور دیگر کتب حدیث کے حوالوں سے ہم بیان کر چکے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان کا حساب بالکل آپ کے ذمہ نہیں ہے اس کا معنی یہ ہے کہ ان کو ان کے اعمال کی جزاء دینا یا ان کو رزق مہیا کرنا آپ کے ذمہ نہیں 'بلکہ ان کو جزا دینا اور ان کو رزق مہیا کرنا اللہ کے ذمہ ہے۔ اسی طرح آپ کا رزق اور آپ کی جزا بھی اللہ کے ذمہ ہے 'کسی اور کے ذمہ نہیں ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر یہ مسکین مسلمان فقر میں مبتلا ہیں تو اس سے آپ کو کوئی ضرر نہیں ہوگا 'حتی کہ آپ مشرکین کی فرمائش پر ان کو اپنی مجلس سے اٹھانے کا ارادہ کریں 'آپ پر ان کے رزق اور ان کے اعمال کے محاسبہ کی ذمہ داری نہیں ہے کہ آپ مشرکوں کی فرمائش پوری کرنے کے درپے ہوں۔ آپ کا کام منصب رسالت کی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ آپ معاملات کے ظاہر پر عمل کریں اور ان کے باطن کو اللہ کے حوالے کر دیں اور ان مسکین مسلمانوں کا ظاہر حال یہ ہے کہ یہ صبح وشام اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں 'سو آپ ان کی طرف متوجہ ہوں 'ان کے ساتھ مجلس میں بیٹھیں اور ان کو اپنے پاس سے دور نہ کریں۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو منع کرنا دراصل امت کے لیے تعریض ہے

اس کے بعد فرمایا اگر آپ نے (بالفرض) ان کو دور کر دیا تو آپ غیر منصفوں سے ہو جائیں گے ظاہر ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ متصور نہیں ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے منع کرنے کے بعد بھی ان مسکین مسلمانوں کو اپنی مجلس سے دور کریں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے بطور تعریض دوسرے مسلمانوں کو سنانے کے لیے یہ فرمایا ہے کہ جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی امیر کافروں کی رعایت کرکے غریب مسلمانوں کو بالفرض اپنی مجلس سے اٹھا دیں 'تو آپ غیر منصفوں سے ہو جائیں گے 'تو کوئی اور مسلمان ایسا کرے گا 'تو وہ کیونکر ظالموں میں سے نہیں ہوگا۔ اس آیت کی نظیر یہ آیت ہے:

(آیت) "لئن اشرکت لیحبطن عملك"۔ (الزمر: ٦٥)

ترجمہ: اگر (بالفرض) آپ نے (بھی) شرک کیا تو آپ کا عمل ضائع ہو جائے گا۔

زیر بحث آیت اور مذکور الصدر احادیث سے یہ معلوم ہوا کہ کسی کافر یا فاسق کی اس کی دنیاوی شان و شوکت کی وجہ سے عزت کرنا اور کسی نیک مسلمان کی غربت اور افلاس کی وجہ سے بے توقیری اور تحقیر کرنا شرعا ممنوع ہے۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عصمت پر اعتراض کا جواب

جو لوگ انبیاء (علیہم السلام) کی عصمت پر طعن کرتے ہیں 'وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان مسکین مسلمانوں کو اپنی مجلس سے اٹھا دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھانے سے منع فرمایا ہے لہٰذا ان کو مجلس سے اٹھانا گناہ ہوا 'نیز

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر آپ نے ان کو مجلس سے اٹھایا تو آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے اور آپ نے ان کو مجلس سے اٹھا دیا تو آپ کا (معاذ اللہ) ظالم ہونا ثابت ہوا۔ سورۃ کہف میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر فرمایا ہے اور وہاں ارشاد ہے اور آپ صبر سے ان لوگوں کے ساتھ (بیٹھے) رہئے جو صبح اور شام اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں درآنحالیکہ وہ اس کی رضا چاہتے ہیں 'اور آپ کی آنکھیں ان سے نہ ہٹیں کہ آپ دنیا کی زندگی کی زینت چاہتے ہوں اور آپ اس شخص کا کہنا مانیں جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور جو اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور اس کا معاملہ حد سے متجاوز ہو گیا۔ (الکھف : ۲۸) اس آیت میں فرمایا ہے کہ آپ دنیا کی زندگی کی زینت کا ارادہ کرتے ہیں اور ایک اور آیت میں آپ کو دنیا کی زینت کا ارادہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہے۔ اور آپ دنیا کی زندگی کی ان زینتوں اور آرائشوں کی طرف اپنی آنکھیں نہ پھیلائیں 'جو ہم نے ان کے مختلف قسم کے لوگوں کو (عارضی) نفع اٹھانے کے لیے دے رکھی ہیں 'تاکہ ہم اس میں ان کو آزمائیں اور آپ کے رب کا رزق سب سے بہتر اور سب سے زیادہ باقی رہنے والا ہے۔ (طٰہٰ : ۱۳۱) جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو زینت دنیا کی طرف التفات کرنے سے منع فرمایا ہے اور سورۃ کہف کی آیت میں فرمایا ہے اور سورۃ کہف کی آیت میں فرمایا ہے کہ آپ زینت دنیا کا ارادہ کرتے ہیں تو آپ کا یہ فعل گناہ ہوا؟ (العیاذ باللہ)

پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان مسکین مسلمانوں کو مجلس سے اٹھانے سے منع فرمایا ہے اور اس کا ظلم فرمایا ہے 'تو آپ اگر ان کو مجلس سے اٹھاتے 'تب گناہ اور ظلم لازم آتا۔ لیکن آپ نے ان کو مجلس سے نہیں اٹھایا 'اس لیے گناہ اور ظلم لازم نہیں آیا۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ گناہ کا عزم بھی گناہ ہوتا ہے اور آپ نے ان کو اٹھانے کا عزم کر لیا تھا حتیٰ کہ آپ نے اس کو لکھوانے کے لیے حضرت علی (رض) کو بلا لیا تھا 'تو بہر حال گناہ لازم آ گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ممانعت کے بعد کام کیا جائے یا اس کا عزم کیا جائے 'تب گناہ ہو گا کہ اللہ کے حکم کی نافرمانی کی 'لیکن جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو اٹھانے کا ارادہ کیا تھا 'اس سے پہلے تو اللہ تعالیٰ نے منع نہیں فرمایا تھا۔ لہٰذا نافرمانی یا اس کا عزم کیسے لازم آیا؟ منع تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے عزم کے بعد فرمایا ہے اور ممانعت سے پہلے آپ کا یہ فعل جائز اور مباح تھا اور اس کا عزم بھی جائز اور مباح تھا۔ نیز ! آپ کا منصب 'تبلیغ اور اشاعت اسلام ہے اور آپ یہ چاہتے تھے کہ یہ بڑے بڑے سردار اسلام قبول کر لیں تو ان کو دیکھ کر ان کے متبعین بھی مسلمان ہو جائیں گے 'اس لیے آپ نے سوچا کہ اگر ان مسکین مسلمانوں کو وقتی طور پر مجلس سے اٹھا دیا جائے 'تو ہر چند کہ اس سے ان کی دل شکنی ہو گی 'لیکن یہ تھوڑا ضرر ہے اور اگر اس کے نتیجہ میں یہ بڑے بڑے سردار تبلیغ سے مسلمان ہو گئے تو یہ خیر کثیر اور عظیم فائدہ ہے اور زیادہ نفع کے لیے کم نقصان کو برداشت کر لیا جاتا ہے۔ اس لیے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی یہ سوچ برحق تھی اور آپ کا اجتہاد صحیح تھا اور ہم امام رازی کے اس جواب سے متفق نہیں ہیں کہ آپ کی یہ اجتہادی خطا تھی۔

(تفسیر کبیر 'ج ۴ 'ص ۵۰)

لیکن اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہے 'اس کو علم تھا کہ یہ کفار اس موقع پر ایمان لانے والے نہیں تھے 'اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس ارادہ سے باز رکھا اور فرمایا آپ ان کافروں کے اسلام لانے کے طمع میں ان مسکین مسلمانوں کو مجلس سے نہ اٹھائیے کیونکہ یہ کافر تو بہر حال اسلام نہیں لائیں گے تو آپ اپنے وفادار غلاموں کی دل آزاری کا نقصان کیوں اٹھائیں۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ آپ کا یہ فعل خلاف اولیٰ تھا۔ میں کہتا ہوں کہ خلاف اولی بھی تب ہوتا جب آپ اللہ تعالیٰ کے منع کرنے کے بعد اشاعت اسلام کے لیے ان مسکین مسلمانوں کو وقتی طور پر مجلس سے

اٹھانے کاارادہ کرتے اور جس وقت آپ نے ان کو مجلس سے اٹھانے کاارادہ کیا تھا 'اس وقت تک اللہ تعالیٰ نے منع ہی نہیں فرمایا تھا 'تو اللہ تعالیٰ کے کس حکم کی مخالفت ہوئی ؟ جس وجہ سے آپ کا یہ ارادہ خلاف اولی کاارادہ ہوتا یا اجتہادی خطا قرار دیا جاتا ؟
منکرین عصمت کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو زینت دینا کی طرف التفات کرنے سے منع فرمایا اور آپ نے کافر سرداروں کی دولت اور ثروت دیکھ کر زینت دنیا کاارادہ فرمالیا تھا اور یہ ممنوع کام کاارادہ فرمالیا تھا اور یہ ممنوع کام کاارادہ ہے اور گناہ کاارادہ ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ زینت دنیا کی وجہ سے ارادہ ممنوع ہے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کافر سرداروں کے مال و دولت کی وجہ سے ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے 'بلکہ اشاعت اسلام کی وجہ سے ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے 'تاکہ وہ لوگ مسلمان ہو جائیں اور ان کی وجہ سے ان کے متبعین بھی مسلمان ہو جائیں اور آپ کا یہ ارادہ کسی معصیت کا یا خلاف اولی کام کاارادہ نہیں ہے 'بلکہ فرائض رسالت میں سے ایک فرض کی ادائیگی کاارادہ ہے اور اس پر آپ کو فرض ادا کرنے کا اجر و ثواب ملے گا۔ ہاں ! اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہے 'اس کو علم تھا کہ یہ لوگ اس موقع پر اسلام لانے والے نہیں ہیں 'اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ ان کافروں کی خوشنودی کی خاطر اپنے وفا شعار اور اطاعت گزار غلاموں کو مجلس سے نہ اٹھائیں۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عصمت پر اعتراض کی اس وقت گنجائش ہوتی جب اس ممانعت کے بعد نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کسی مسکین مسلمان کو کافر سرداروں کی خاطر اپنی مجلس سے اٹھایا ہوتا یا اس کاارادہ کیا ہوتا۔
یاد رکھئے تمام انبیاء (علیہم السلام) معصوم ہیں 'نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد کوئی صغیرہ یا کبیرہ 'سہوا یا عمدا صورۃ یا حقیقتاً ان سے کبھی بھی کوئی گناہ صادر نہیں ہوا 'ہاں انبیاء سابقین (علیہم السلام) سے اجتہادی خطا ہوئی ہے۔ جیسے حضرت آدم (علیہ السلام) کا شجر ممنوع سے کھانا 'حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا قبطی کو مارنا اور حضرت یونس (علیہ السلام) کا خصوصی اجازت کے بغیر بستی سے چلے جانا وغیرہ 'اور ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ اجتہادی خطا سے بھی مامون اور محفوظ ہیں اور محققین کا یہی مذہب ہے جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے علامہ نووی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ (تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

یعنی رات دن اس کی عبادت میں حسن نیت اور اخلاص کے ساتھ مشغول رہتے ہیں

رہا مرنے کی تیاری میں مصروف

مرا کام اور اس دنیا میں تھا کیا۔

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق

اور انسان وحیوان میں یہی امتیازی فرق ہے کہ حیوانات کو اگلی زندگی کا کوئی فکر نہیں، بخلاف انسان کے اس کی سب سے بڑی فکر اہلِ عقل وہوش کے نزدیک دوسری زندگی کی درستی ہے، اسی عقیدہ و نظریہ پر شرافت ورذالت اور عزت وذلت کا معیار ظاہر ہے کہ زیادہ کھانا پینا یا زیادہ مال و دولت جمع کرلینا نہیں ہوگا، بلکہ اخلاق حسنہ اور اعمال صالحہ ہوں گے، جن پر آخرت کی عزت کا مدار ہے۔

انبیاء کے ابتدائی متبعین غریب عوام ہوتے ہیں

یہی وجہ تھی کہ جب ہر قل شاہ روم کے پاس آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا گرامی نامہ دعوت اسلام کے لیے پہنچااور اس نے آپ کی حقانیت وصدق کی تحقیق کرنا چاہی تو واقف کار لوگوں سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں جو سوالات کئے ہیں ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ ان کے اکثر متبعین غریب عوام ہیں یا قوم کے بڑے لوگ؟ جب اس کو بتلایا گیا کہ غریب لوگ ہیں تو اس نے کہا ہم اتباع الرسل یعنی رسولوں کے ابتدائی متبعین یہی لوگ ہوا کرتے ہیں۔

انہیں غریبوں کی دلداری مقدم ہے

یعنی جب ان کا ظاہر حال یہ بتلا رہا ہے کہ شب و روز خدا کی عبادت اور رضاجوئی میں مشغول رہتے ہیں تو اسی کے مناسب ان سے معاملہ کیجئے ان کا باطنی حال کیا ہے یا آخری انجام کیا ہوگا، اس کی تفتیش و محاسبہ پر معاملات موقوف نہیں ہو سکتے۔ یہ حساب نہ آپ کا ان کے ذمے ہے نہ ان کا آپ کے۔ لہٰذا اگر بالفرض آپ دولتمندوں کی ہدایت کی طمع میں ان غریب مخلصین کو اپنے پاس سے ہٹانے لگیں تو یہ بات بے انصافی کی ہوگی۔

موضح القرآن میں ہے کافروں میں بعض سرداروں نے حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا کہ تمہاری بات سننے کو ہمارا دل چاہتا ہے لیکن تمہارے پاس بیٹھتے ہیں رذیل لوگ ہم ان کے برابر نہیں بیٹھ سکتے اس پر یہ آیت اتری۔ یعنی خدا کے طالب اگرچہ غریب ہیں، ان ہی کی خاطر مقدم ہے۔

مقصد یہ ہے کہ اپنی مجلس سے نکالنا اور ہم نشینی ترک کرنا اس وقت جائز بلکہ ضروری ہو جاتا ہے اگر ہم نشینی سے دونوں میں سے کسی کا ضرر ہوتا ہو اگر آپس میں کسی کا نقصان نہ ہوتا ہو تو مجالست ترک کرنا واجب نہیں اور ان لوگوں کی ہم نشینی سے تو نہ آپ کا کوئی ضرر ہے نہ ان کا بلکہ دونوں کا فائدہ ہے آپ کی صحبت میں بیٹھ کر یہ نیکیاں کریں گے اور امت کی نیکیوں کا ثواب پیغمبر کو بھی ملنا یقینی ہے اور ان کو اپنی صحبت میں بٹھا کر آپ راہ راست بتاتے اور ہدایت کرتے رہیں گے اس سے ان کو فائدہ پہنچے گا۔ (تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی)

وَلَا تَطْرُدِ۔ اطراد عربی زبان میں دھتکارنے اور بدسلوکی سے نکالنے کو کہتے ہیں۔ قریش چونکہ غریب لوگوں کے لیے یہی لفظ استعمال کرتے تھے اس لیے قرآن کریم نے ان کے مطالبے کو رد کرتے ہوئے انہی کا لفظ استعمال کیا ' تاکہ ان کا جرم ریکارڈ پر رہے اور جب وہ اس کا جواب دیکھیں تو مزید انھیں اپنے جرم کی شدت کا احساس ہو اور ان کے خبث باطن پر چوٹ لگے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ایک تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے وہ یہ کہ مشرکین مکہ کا یہ مطالبہ محض اتفاقی نہیں تھا بلکہ یہ ان کی معاشرتی اقدار اور ان کے تصور حیات کا نتیجہ تھا۔ مکہ معظّمہ کی زندگی درحقیقت ایک طبقاتی زندگی تھی۔ وہاں کے رہنے والے یوں تو کئی طبقات میں بٹے ہوئے تھے لیکن امیر ' غریب اور حسب و نسب کی تقسیم سب سے زیادہ گہری تھی۔ قریش کسی کو جو ان کے اپنے خاندان سے تعلق نہ رکھتا ہو اپنے ہم پلہ ماننے کو تیار نہیں تھے۔ اور جہاں تک غریب لوگوں کا تعلق ہے وہ ان کو اپنی خدمت کے لیے تو برداشت کر سکتے تھے لیکن یہ سوچنا بھی انھیں گوارا نہیں تھا کہ یہ بھی معاشرے کے قابل ذکر لوگ ہیں۔ حیرت اور تشویش کی بات یہ ہے کہ قرآن کریم یہاں ان کے جس رویے کو بری طرح تنقید کا نشانہ بنا رہا ہے اور جس طرح اسے جڑ

سے اکھاڑ دینا چاہتا ہے اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ امت مسلمہ میں اس کے آثار بھی باقی نہ رہتے 'لیکن انتہائی دکھ کی بات ہے کہ باقی عالم اسلام کو تو چھوڑ یئے خود یہ ملک جس کو وجود ہی اسلام کے نام سے ملا ہے 'اس میں ابھی تک نہایت گہری طبقاتی تفریق پائی جاتی ہے۔ جاگیر دار 'امراء 'بڑے بڑے خاندانوں کے لوگ 'فوج 'سیاستدان اور بیورو کریٹس سارے ملک کے عوام کو اپنے ہاری اور کمین سمجھتے ہیں۔اس لیے اپنے اپنے دوائر میں ان کے ساتھ نہایت توہین آمیز سلوک روا رکھنا بلکہ ظلم کرنا بھی ان کے لیے کوئی غلط بات نہیں۔ یہی حال مشرکین مکہ کا تھا اس لیے ان کا حضور سے یہ مطالبہ کوئی حیرت انگیز مطالبہ نہ تھا بلکہ ان کی معاشرتی زندگی کا نتیجہ تھا۔ قرآن کریم نے اس پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جو ہدایات دی ہیں 'اس میں سب سے پہلی بات جو محسوس کرنے کی ہے وہ اس آیت کریمہ کا لہجہ ہے۔ جس میں بظاہر تنبیہ کا انداز ذرا تیکھا ہو گیا ہے۔اس میں خطاب چونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہے اس لیے بعض طبیعتوں کو گراں گزرتا ہے۔ لیکن اگر قرآن کریم کا ایک اسلوب سمجھ لیا جائے تو پھر یہ واہمہ پیدا نہیں ہوتا وہ یہ ہے کہ جب بھی کفار کی جانب سے ایسی کوئی بے سروپا بات کہی جاتی ہے یا کوئی لایعنی مطالبہ کیا جاتا ہے تو قرآن کریم میں پروردگار اس کا جواب دیتے ہوئے کفار کو مخاطب نہیں کرتے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس قابل نہیں ہیں کہ پروردگار ان کو مخاطب کرے۔اس لیے اس میں خطاب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فرمایا جاتا ہے۔ لیکن روئے سخن کفار کی طرف ہوتا ہے 'یا یوں کہہ لیجئے کہ بات حضور سے کی جا رہی ہوتی ہے لیکن سنائی کفار کو جاتی ہے۔اس لیے اس میں تنبیہ کا انداز اگر تیکھا ہو جاتا ہے یا کہیں غضب کا اظہار نظر آتا ہے تو اس کا تعلق اللہ کے رسول سے نہیں بلکہ ان کفار سے ہوتا ہے تاکہ وہ اچھی طرح اپنے انجام کے بارے میں سوچ لیں۔ یہاں بھی خطاب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ہو رہا ہے لیکن تنبیہ اور تہدید کا تعلق مشرکین مکہ سے ہے۔

دوسری چیز جو اس میں بہت قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ کفار مکہ جن لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کو تیار نہیں بلکہ انھیں اپنے قریب آنا بھی ان کے لیے گوارا نہیں اور وہ حضور سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہماری موجودگی میں آپ ان کو دور رہنے کا حکم دیں۔ کیسی دلنواز بات ہے کہ اللہ تعالیٰ انہی کی وکالت فرما رہے ہیں۔ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو ابھی تک غلامی کا عذاب جھیل رہے ہیں اور ان میں وہ بھی ہیں جو نئے نئے غلامی کی زنجیریں کاٹ کے نکلے ہیں۔ لیکن معاشرے میں ان کو تحفظ دینے والا کوئی نہیں۔ان میں ایسے بھی ہیں جو کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق نہیں رکھتے باہر سے آئے ہوئے لوگ ہیں اور یہ تمام لوگ ساتھ ساتھ اس قدر بے سروسامان بھی ہیں کہ نہ پہننے کو مناسب کپڑا ہے اور نہ کھانے کو ڈھب کی روٹی پیٹ پر پتھر باندھتے اور چیتھڑے پہنتے ہیں لیکن اسلام کی موجودہ قوت یہی لوگ ہیں۔ان کے بارے میں پروردگار ارشاد فرما رہے ہیں کہ آپ ان لوگوں کو اپنی صحبت سے دور مت ہٹایئے ان کا حال یہ ہے کہ وہ صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں۔ یعنی اہل دنیا سے اگرچہ ان کو کوئی ایسا قابل ذکر تعلق نہیں اور لوگ بھی ان کا نام لینے کے روادار نہیں 'لیکن انھوں نے اپنا رشتہ اللہ سے جوڑ رکھا ہے 'وہ اس ذات کو پکارتے ہیں جس کو پکارنے والا کبھی محروم نہیں رہتا اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ انھیں دولت دنیا کے نہ ہونے کے باعث غربت اور غریبی کے طعنے ملتے ہیں۔انھیں نجانے کیسے کیسے خطابات سے یاد کیا جاتا ہے اور خود ان کے شب و روز اللہ ہی بہتر جانتا ہے کیسی تلخیوں میں گزرتے ہیں۔ لیکن ان سارے دکھوں کے باوجود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ان میں سے کوئی چیز نہیں مانگتے 'وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں تو صرف اس لیے کہ وہ اپنے رب کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ان کے نزدیک اللہ کی خوشنودی کے مقابلے میں دنیا بھر کی دولت خزف ریزوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔اس لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا جا رہا ہے کہ کسی بھی تحریک کا سرمایہ اس کے جاںنثار

اور فداکار لوگ ہوتے ہیں جو اپنی زندگیاں تک اس تحریک پر قربان کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ جنھوں نے محض اللہ کی رضا کے لیے دنیا کی ہر نعمت سے منہ موڑ لیا ہے اور دنیا کا ہر دکھ اسلام اور ایمان کی خاطر برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ یہ لوگ اس لائق ہیں کہ آپ کی صحبت سے فائدہ اٹھائیں یا وہ نابکار جنھیں آپ کی نبوت تک گوارا نہیں۔ وہ محض بہانے تراشتے ہیں تاکہ آپ کے لیے ایسے حالات پیدا کریں کہ آپ کے جانثار بھی آپ سے دور ہو جائیں۔ اس لیے آپ ان کو ہرگز اپنے سے دور نہ ہٹائیے۔ وہ لوگ جن کا آپ کے سوا دنیا میں کوئی نہیں اور وہ آپ کی صحبت میں اللہ کی رضا کو ڈھونڈتے ہیں ' وہی آپ کی عنایت کے ہر طرح مستحق اور آپ کی توجہ کے حقدار ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان غریبوں کو جس طرح اپنے سینے سے لگایا کہ انھوں نے اگر اپنی جانثاری میں کبھی کمی نہیں کی تو حضور کی شفقتیں بھی ہمیشہ ان پر پھوار کی طرح برستی رہیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے غریبوں ہی میں زندگی گزارنا اور غریبوں ہی کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اپنا معمول بنالیا اور یہاں تک اللہ کے حضور عرض کی کہ یا اللہ میں چاہتا ہوں کہ میں غریبوں کے ساتھ زندہ رہوں اور قیامت کے دن غریبوں کے ساتھ اٹھایا جاؤں۔ سردار دیوان سنگھ مفتون متحدہ ہندوستان میں ریاست اخبار کے ایڈیٹر تھے اور وہ اپنی طرز کے واحد آدمی تھے جب انھوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ قول سنا تو بے ساختہ کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ جن ہونٹوں سے یہ قول نکلا ہے میں ان ہونٹوں کو بوسہ دوں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں غریبوں کا ساتھ دینے کے دعوے تو بہت کر رہے ہیں لیکن اگر کسی نے غربت کو عزت دی ہے اور فقر کو اپنا فخر فرمایا ہے اور فی الواقع غریبی امیری کا فرق مٹا کے رکھ دیا ہے اور طبقات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے تو وہ صرف رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات گرامی ہے۔ غیر مسلموں نے بھی جب کبھی غیر جانبداری سے آپ کے اس طرز عمل کو دیکھا ہے تو تسلیم کیے بغیر نہ رہ سکے۔ یوں تو اس کی مثالیں تاریخ میں بھری پڑی ہیں۔ لیکن ہماری قریبی تاریخ میں لاہور ہی میں ہری چند اختر کے نام سے ایک شاعر گزرے ہیں جو تقسیم کے بعد ہندوستان چلے گئے انھوں نے کہا تھا۔

جس کی حکمت نے یتیموں کو کیا درِ یتیم

اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولا کر دیا

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس طرز عمل کے نتیجے میں مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ یہ غریب لوگ جنکو اشراف قریش اپنے قریب نہیں آنے دیتے تھے ان کا اس حد تک احترام کرتے تھے کہ دنیا شاید اس کی مثال لانے سے عاجز ہو۔ ان غریب غلاموں میں حضرت بلال (رض) کا نام سب سے نمایاں ہے کیونکہ انھیں سب سے زیادہ آنحضرت کا قرب اور خدمت کا شرف میسر آیا۔ فتح مکہ کے موقع پر حضور نے انھیں کعبۃ اللہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان کہنے کا حکم دیا تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ کل کا غلام آج کا کس قدر نامور فرد بن چکا ہے اور خلافت راشدہ میں ان کے مقام و مرتبہ کا عالم یہ تھا کہ ایک دفعہ حضرت ابوسفیان اور حضرت عکرمہ جیسے بڑے بڑے اشراف قریش حضرت عمر فاروق (رض) کے گھر کے سامنے اذن باریابی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ دروازے پر ایک لڑکا دربانی کے فرائض انجام دے رہا تھا کہ اتنے میں حضرت بلال (رض) تشریف لائے انھیں دیکھ کر دربان ایک طرف ہٹ گیا وہ بغیر اجازت طلب کیے اندر داخل ہوئے۔ حضرت فاروق اعظم (رض) نے جیسے ہی دیکھا کہ بلال آئے ہیں ' اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا: جاء سیدنا و خادم سیدنا " ہمارا آقا آگیا اور ہمارے آقا کا خادم آگیا"۔ ابوسفیان برداشت نہ کر سکے ' بول اٹھے کہ یہ دن بھی آنا تھا کہ اشراف قریش اجازت کے طلبگار ہیں اور ایک آزاد کردہ غلام آتا ہے تو بغیر اجازت طلب کیے اندر چلا جاتا ہے۔ حضرت عکرمہ جو ابوجہل کے بیٹے تھے کہنے لگے ابوسفیان ہمیں شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں بلانے والے

نے سب کو ایک ہی وقت میں بلایا تھا۔ اس پکار پر جس نے پہلے لبیک کہا وہ آگے رہے گا اور جو پیچھے رہا وہ پیچھے رہے گا اس لیے اس میں شکایت کا کوئی موقع نہیں۔

مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ اس میں انبیاء کرام کی طبیعت کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ ہے اور اس حوالے سے یہ ہدایت دی گئی ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ انبیاء کرام اللہ کے عطا کردہ مزاج کی وجہ سے اپنے اندر یہ امتیازی چیز رکھتے ہیں کہ انھیں دنیا کی ہر چیز سے زیادہ صرف ایک چیز کی خواہش اور طلب ہوتی ہے کہ جن لوگوں کی طرف وہ ہدایت لے کر آئے ہیں وہ ان کی ہدایت کو قبول کر لیں۔ یہ ان کی خواہش بعض دفعہ اس حد تک ان پر غالب آجاتی ہے کہ وہ زندگی کی تمام آسانیوں بلکہ ضروریات تک کو دعوت و تبلیغ کی نذر کر دیتے ہیں اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر ان کے ایمان اور ان کی مغفرت کے لیے دعائیں مانگتے ہیں اور ان کے ایمان کے لیے جو بھی مناسب تجویز ان کے سامنے آتی ہے وہ اس پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں بعض دفعہ تو یہ صورت حال ہوتی ہے جس کی مثال انجیل میں دی گئی ہے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) فرماتے ہیں کہ لوگو! تم نے دیکھا نہیں کہ جب کسی ریوڑ کے مالک کی ریوڑ میں سے کوئی بھیڑ گم ہو جاتی ہے تو وہ اس کی تلاش میں ندیوں ' نالوں اور صحراؤں تک میں مارا مارا پھرتا ہے اور وہ اس تگ و دو میں اپنے ریوڑ تک کو بھول جاتا ہے اور جب اسے وہ بھیڑ مل جاتی ہے تو پھر واپس اپنے لوگوں میں آکر کہتا ہے کہ لوگو میرے ساتھ خوشیاں مناؤ کہ مجھے اپنی بھیڑ مل گئی ہے۔ یہ کیفیت ایک پیغمبر کی ہوتی ہے۔ یہاں پروردگار اس طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ تمہیں اپنی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو تلاش کرنا چاہیے 'لیکن ایک ایک بھیڑ کے پیچھے اس قدر سرگرداں نہیں ہونا چاہیے کہ باقی ریوڑ کا خیال بھول جائے اور ممکن ہے کہ ان کو نقصان پہنچ جائے اس لیے کہ اگر آپ کی دعوت کے مخاطبین میں سے ایک ایک آدمی مسلمان نہیں ہوتا یعنی اگر آپ کی ایک ایک بھیڑ واپس اپنے گلے میں نہیں آتی تو آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ جو بھیڑ اپنے گلے سے اتنی دور نکل جائے وہ حقیقت میں بھیڑیئے کا حصہ ہوتی ہے۔ اسی طرح جو آدمی ایمان کے لیے تبلیغ و دعوت کی ساری کاوشوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ آپ سے اس کے بارے میں بالکل نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ ایمان کیوں نہیں لایا۔ البتہ اگر آپ نے ان اشراف قریش کو قریب کرنے کے لیے ان غریب لوگوں کو اپنے سے دور کر دیا تو قیامت کے دن جب اس بارے میں آپ سے سوال ہوگا تو یہ اشراف قریش جن کے لیے ایمان کی خواہش میں آپ یہ سب کچھ کر رہے ہیں وہ وہاں آپ کے کسی کام نہیں آئیں گے۔ وہاں آپ کو خود ہی اس کا جواب دینا پڑے گا۔ اس لیے فرمایا کہ آپ ان غریب لوگوں کو اپنے سے دور نہ کریں۔ یہی آپ کی مجلس کی زینت اور آپ کے قافلے کا زیور ہیں اور اگر آپ نے خدانخواستہ ان کو دور کر دیا تو آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔

ظلم کا مفہوم

یہاں بظاہر ظالم کا لفظ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حوالے سے عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ظلم کا معنی بے انصافی یعنی ایک کا حق دوسرے کو دے دینا ہے یہاں یہ لفظ محبت کے حوالے سے استعمال ہو رہا ہے کہ آپ کی محبت اور شفقت کے مستحق یہ غریب لوگ ہیں جنھوں نے سب کچھ آپ اور اسلام کے لیے قربان کر دیا ہے وہی اس قابل ہیں کہ آپ کی صحبت سے فائدہ اٹھائیں اور آپ کی توجہ سے بہرہ ور ہوں۔ اگر آپ ان کی بجائے یہ حق اشراف قریش کو دے دیں گے تو یہ ان معنوں میں ظلم ہوگا کہ حق ان غریب صحابہ کا تھا

آپ نے اشراف قریش کو دے دیا۔ یہ گویا ایک ایسا گلہ ہے جو کبھی کبھی محبت کرنے والوں کی زبان پر آجایا کرتا ہے۔ صحابہ چونکہ جاں نثار اور فداکار ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کے محب اور عشاق بھی تھے ' انھیں بجا طور پر یہ گلہ زیب دیتا تھا کیونکہ ان میں بعض تو ایسے تھے جن کے لیے حضور سے چند لمحے دور رہنا بھی بڑا گراں گزرتا تھا جیسے ایک مچھلی پانی سے باہر زندہ نہیں رہ سکتی اسی طرح یہ لوگ حضور کی صحبت سے باہر اپنے لیے زندگی دشوار سمجھتے تھے۔ایک صحابی کا واقعہ اہل تفسیر نے نقل کیا ہے کہ انھوں نے ایک دن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عرض کیا کہ حضور جب تک میں آپ کی صحبت میں رہتا ہوں ' دل کو ایک اطمینان میسر رہتا ہے 'لیکن جب گھر چلا جاتا ہوں تو باوجود اس کے کہ اہل خانہ موجود ہوتے ہیں لیکن میرا دل اچاٹ ہو جاتا ہے 'میں جب تک آپ کو دیکھ نہیں لیتا مجھے چین نہیں پڑتا۔ کہا حضور یہاں تو ہمیں یہ نعمت میسر ہے کہ بار بار آپ کی زیارت ہوتی ہے لیکن قیامت کے دن جب آپ جنت کے اعلیٰ ترین درجے میں ہوں گے اور اگر ہمیں اللہ تعالیٰ نے جنت عطا کی بھی تو ظاہر ہے کہ ہم بہت نچلے درجے میں ہوں گے وہاں آپ کی زیارت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تو حضور اس جنت کا کیا فائدہ جس میں آپ کی زیارت نہ ہوسکے۔ اس پر قرآن کریم کی ایک آیت نازل ہوئی جس میں بتایا گیا کہ جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے انھیں قیامت کے دن حضور کا ساتھ نصیب ہوگا۔ حضور چاہے کتنے بھی بلند مقام پر ہوں حضور کی زیارت سے وہ برابر سعادت اندوز ہوتے رہیں گے۔

اشراف قریش کا یہ مطالبہ کہ ہم غریب مسلمانوں کے ساتھ آپ سے ملاقات نہیں کر سکتے یہ ہماری بڑائی اور عظمت کے خلاف ہے۔آنے والی آیت کریمہ میں ان کے اس قول اور ان کی خواہش کے پیچھے جو چیز کارفرما تھی اور جو ان کی اصل بیماری تھی اس سے پردہ اٹھایا جارہا ہے۔

(روح القران۔ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

کیارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غریب صحابہ کو اپنی مجلس سے ہٹانے کا کفار سے وعدہ کر لیا تھا؟

ابن ماجہ، ابن ابی حاتم اور ابن ابی شیبہ وغیر ہم نے حضرت خباب (رض) عنہٗ سے روایت کیا ہے کہ کفار مکہ میں سے اقرع بن حابس تمیمی اور عیینہ بن حصن فزاری وغیر ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے۔ وہاں انھوں نے صہیب رومی، بلال حبشی اور خباب (رض) جیسے نادار مسلمان آپ کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھے، انھیں یہ نادار لوگ بہت حقیر نظر آئے۔انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ خلوت میں بات کی اور کہا: ھم چاھتے ھیں کہ آپ ہمیں الگ وقت دے تاکہ اس سے اہل عرب ہماری فضیلت کو پہچانیں۔ کیونکہ آپ کے پاس وفود عرب آتے ہیں اور ہمیں حیا آتی ہے کے اہل عرب ہمیں ان غلاموں کے ساتھ بیٹھا دیکھیں، جب ہم فارغ ہو کر چلے جائیں تو آپ ان کے ساتھ بیٹھ جائیں۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ٹھیک ہے، وہ کہنے لگے: آپ ہمیں یہ بات لکھ دیں، حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کاغذ منگوایا اور حضرت علی (رض) کو بلایا تاکہ انھیں یہ لکھ دیں اور ہم ایک کونے میں بیٹھے دیکھ رہے تھے۔اتنے میں حضرت جبرائیل (علیہ السلام) یہ آیت لے کر نازل ہوئے۔وَلَا تَطۡرُدِ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ الخ (سنانے ابن ماجہ کتاب الزھد باب مجالسۃ الفقراء حدیث 676)

امام فخر الدین رازی علیہ الرحمہ نے اس آیت کے تحت اس حدیث کی طرف سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فقراء صحابہ کو سرداران قریش کی موجودگی میں اپنے پاس نہ بٹھانے کے بارہ میں کفار سے معاہدہ کرنا اور اسے لکھنے کا ارادہ کرنا ایک اجتہادی خطا ہے جس پر کوئی پکڑ نہیں۔ مولانا علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ نے اس کا تعاقب کرتے ہوئے لکھا کہ یہ خطا اجتہادی نہیں ہے، جس وقت اپنے فقراء صحابہ کو مجلس سے اٹھانے کا ارادہ کیا تب اس کی ممانعت کی آیت نازل نہیں ہوئی تھی جب ممانعت ہی نہ تھی تو خطا کیسے بن گئی۔

مگر میرے خیال میں امام رازی اور علامہ سعیدی دونوں کی باتیں اصل بحث سے غیر متعلق ہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ ابن ماجہ وابن ابی حاتم وغیرہ کی حضرت خباب (رض) سے مروی مذکورہ حدیث پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔اس کے متعدد جوابات ہیں۔

اول: اس حدیث کی سند یوں ہے۔ **حدثنا احمد بن محمد بن یحیی بن سعید القطان حدثنا عمرو بن محمد العنقزی حدثنا اسباط بن نصر عن السدی عن ابی سعید الازدی عن ابی الکنود عن خباب فی قولہ ولا تطرد الذین یدعون ربھم** الخ (ابن ماجہ حدیث 4127)

اس سند میں اسباط بن نصر ضعیف راوی ہے، اس کے بارے میں اکثر محدثین واہل رجال اچھی رائے نہیں رکھتے۔ ابو حاتم کہتے ہی: ابو نعیم نے اسباط بن نصر کو ضعیف قرار دیا ہے۔ انھوں کہا: اس کی احادیث عامیہ اور قابل سقوط ہیں، ان کی اسانید بدل دی گئی ہیں۔ امام نسائی نے کہا: وہ قوی نہیں ہے اور امام ساجی نے کہا: اس نے ایسی روایات ذکر کی ہیں جن کی متابعت نہیں کی گئی اور امام مسلم بن حجاج پہ نکیر کی گئی ہے کہ انھوں نے اسباط جیسے شخص سے ایک حدیث کیوں لی ہے۔ (تہذیب التنذیب جلد اول صفحہ 137 راوی 396 مطبوعہ دار احیاء التراث الاسلامی)

تو ایسے ضعیف اور نا قابل حجت راوی کی مروی حدیث سے سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی معصومیت پر اعتراض کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے اور یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ یہ خطا اجتہادی ہے یا نہیں۔

دوم: اس حدیث کے متن میں بھی غرابت ہے۔ کیونکہ اس میں یہ بھی ہے کہ کفار مکہ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا: آپ کے پاس وفود عرب آتے ہیں اور ہم نہیں چاہتے کہ وہ ہمیں ان غلاموں کے ساتھ بیٹھے دیکھیں۔ حالانکہ رسول اللہ کے پاس وفود عرب کی آمد کا سلسلہ مدنی دور میں فتح مکہ کے بعد شروع ہوا، مکی دور میں وفود عرب کے آنے کی بات کرنا نا قابل تسلیم ہے۔ یہ بات بھی ثابت کر رہی ہے کہ اس حدیث کے مضمون میں وضع شامل ہے۔

سوم: مسلم شریف کی صحیح روایت کے مطابق صرف اتنی بات درست ہے کہ جب کفار نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا کہ ان نادار صحابہ کو اٹھا دیا جائے تو۔ وقع فی قلب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ماشاء ان یقع۔ یعنی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قلب مبارک میں کوئی خیال آیا جو اللہ نے چاہا۔ (مسلم کتاب فضائل الصحابہ حدیث 2413)۔ اور صرف دل میں خیال کا آنا تو عصمت نبوت کے منافی نہیں ہے اور وہ خیال بھی اس لیے آیا کہ اگر یہ لوگ ایمان لے آئیں تو ان کی وجہ سے مزید بہت سے لوگ ایمان لا سکتے ہیں، یعنی وہ خیال بھی حب الٰہی وجذبۂ تبلیغ دین کے تحت تھا تو اس سے عصمت نبوت میں کیا فرق آسکتا ہے؟

[49]۔ یعنی اے پیارے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! اگر بالفرض آپ نے ان غریب صحابہ کو اپنے پاس سے اٹھایا تو آپ ناانصافی کرنے والے ہوں گے کیونکہ یہ مخلص لوگ ہیں اور آپ کے اس عمل سے ان کے دل ٹوٹیں گے، یہ بر سبیل فرضیت فرمایا گیا ہے یہ اسی طرح ہے جیسے ارشاد ہوا: **لَئِنۡ اَشۡرَكۡتَ لَيَحۡبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ**۔ (الزمر: 65)

اسلام میں معاشرے کے کمزور افراد کی اہمیت

مالدار کفار نے چاہا کہ غریب مسلمانوں کو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس سے اٹھادیا جائے تب وہ آپ کے پاس بیٹھیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے کی آیت اتار کر واضح کر دیا کہ دین کو مخلصین کی ضرورت ہے خواہ وہ کتنے غریب و نادار ہوں۔ متکبرین کی ضرورت نہیں، خواہ وہ کتنے مالدار ہوں۔ چنانچہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان متکبر مالداروں کو کھڑے کھڑے واپس لوٹا دیا۔

اسلام امیر و غریب کو ایک صف میں کھڑا کرتا ہے

یعنی ان مالداروں سے کہا گیا کہ اگر وہ غرباء کے ساتھ مل کر بیٹھنا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ اپنا منہ لے کر چلتے بنیں۔ اسلام میں تو روزانہ ہر شاہ و گدا کو پانچ بار ایک ہی صف میں کھڑا کیا جاتا ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

آگیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز
قبلہ رو ہو کے زمین بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔

(تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی)

نماز جنازہ کے بعد دعا کا جواز

يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ میں صحابہ کرام کا صبح شام دعا کرنا مذکور ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں کے صحابہ صرف صبح اور شام کو ہی دعا مانگتے تھے، بلکہ یہ معنی ہے کہ ہر وقت دعا کرتے تھے جیسے اللہ فرماتا ہے وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا اللہ کو صبح شام یاد کرو۔ (احزاب۔ 42)۔ گویا ہر وقت دعا کرنا صحابہ کی اللہ کے ہاں پسندیدہ ترین صفت ہے۔ لہٰذا دعا پر کوئی پابندی نہیں جب چاہو مانگو خواہ نماز پنجگانہ کے بعد مانگو یا نماز جنازہ کے بعد۔ کچھ لوگ نماز جنازہ کے بعد دعا سے سختی سے روکتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ کہہ کر ہر وقت دعا کی اجازت دی ہے۔ البتہ بعض کتب فقہ میں جو جنازہ کے بعد دعا کے لیے کھڑے ہونے سے منع کیا گیا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ نماز کی کیفیت پر نہ کھڑا ہوا جائے تاکہ وہ جنازہ میں اضافہ سے مشابہ نہ ہونے لگے۔ لہٰذا اگر جنازہ کے بعد صفیں توڑ کر دائرہ میں کھڑے ہو کر دعا کی جائے جیسا کہ عموماً کیا جاتا ہے تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں، بلکہ جنازہ کے وقت دعاء کرنا بہتر ہے کیونکہ اس وقت ہر شخص کی آنکھوں کے سامنے موت حاضر ہوتی ہے اور وہ صمیم قلب سے دعا کرتا ہے۔
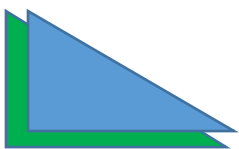
صحابہ کرام (رض) نماز جنازہ کے بعد دعا مانگا کرتے تھے

اور جنازہ کے بعد دعا کرنا خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابہ سے ثابت ہے۔ حضرت عمیر بن سعید (رض) سے مروی ہے کہ حضرت علی نے یزید بن مکفف کی نماز جنازہ پڑھائی، فکبر علیہا اربعا ثم مشی حتی اتاہ قال اللھم عبدک وابن عبدک نزل بک الیوم فاغفرلہ ذنبہ ووسع علیہ مدخلہ۔ آپ نے اس پر چار تکبیریں کہیں پھر چل کر اس کے پاس آئے اور کہا اے اللہ ! یہ تیرا بندہ ہے اور تیرے ایک بندے کا بیٹا ہے اس کے گناہ معاف فرما اور اس کی قبر کو کشادہ کر دے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ جلد 3 صفحہ 331 مطبعہ دائرۃ القرآن کراچی)

حضرت نافع سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) جب کسی جنازے پر جاتے اور جنازہ پڑھایا جا چکا ہوتا تو میت کے لئے دعا کرتے اور واپس آجاتے دوبارہ جنازہ پڑھاتے (الجوہر النقی فی ذیل البیہقی جلد 4 سفحہ 48 مطبوعہ حیدرآباد دکن)

اسی طرح مروی ہیں کہ حضرت عبداللہ بن سلام (رض) حضرت عمر فاروق (رض) عنہٗ کے جنازے سے رہ گئے۔ اپنے جنازہ پر پہنچ کر ارشاد فرمایا: ان سبقتمونی بالصلوۃ علیہ فلا تسبقونی باالدعاء لہ۔ اگر تم ان کی نماز جنازہ میں مجھ سے سبقت لے گئے ہو تو دعا کرنے میں تو مجھ پر سبقت نہ لے جاؤ۔ (مجھے دعاء میں تو شامل کر لو)۔ (المبسوط للسرخسی جلد 2 صفحہ 67 باب غسل المیت مطبوعہ مصر، بدائع الصنائع جلد 1 صفحہ 311 مطبوعہ بیروت)

یہ احادیث بتا رہی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابہ کرام نماز جنازہ کے بعد میت کے لئے دعا کرتے تھے۔ اس کی مزید تفصیل کے لیے راقم الحروف کی کتاب "دعا بعد نماز جنازہ کا جواز" کا مطالعہ مفید ہے۔ یہ میرے دور طالب علمی کی تصنیف ہے۔

سیرت رسول اور دنیا پرست علماء وصوفیاء کے کردار میں فرق

حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غریبوں کو اپنے پاس بٹھایا اور مغرور امیروں کو واپس کر دیا مگر دور حاضر کے دنیا پرست سجادہ نشینوں کو کوئی امیر جتنا بڑا اندرانہ دے وہ اسی قدر ان کا مقرر اور محبوب ہوتا ہے اور تھوڑا اندرانہ دینے والا اتنا ہی دور رہتا ہے یہی حال علماء سوء کا ہے۔ اللہ اپنے کسی نیک بندے کی ہمنشینی عطا فرمائے، یہ بہت بڑی نعمت ہے اگر میسر آجائے۔ یہاں سے عظمت صحابہ کرام (رض) بھی معلوم ہوئی۔ یہاں صحابہ کرام کے یہ اوصاف بتائے گئے کہ صبح شام دعا کرنا، رضائے رب کا چاہنا اور مال دنیا کا طلبگار نہ ہونا۔

(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

فوائد

ا۔ اس میں صالحین کو خوشخبری ہے کہ وہ حضور کے دروازہ سے درکارے نہ جائیں گے، نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ للذا جو حضور سے قرب چاہے وہ رب کی یاد کیا کرے یہ حکم تا قیامت جاری ہے۔

۲۔ لفظ مرید یہاں سے حاصل کیا گیا کہ یعنی مرید وہ جو رب کی رضا جوئی کے لیے شیخ کی بیعت کرے۔

۳۔ خیال رہے کہ یہاں ظلم سے مراد نہ کفر ہے نہ کسی کو ستانا۔ کیونکہ کسی کو اپنے پاس آنے کی اجازت نہ دینا کسی طرح جرم نہیں۔ للذا یہ معنی نہایت ہی موزوں ہیں کہ یہ کام آپ جیسے اخلاق مجسم کے کرم کریمانہ سے بعید ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غرباء و مساکین سے الفت سنت انبیاء ہے۔ (تفسیر نور العرفان۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی)

آیت مبارکہ :

وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْۤا اَهٰۤؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ○53

لغۃ القرآن: [وَكَذٰلِكَ : اور اسی طرح] [فَتَنَّا : ہم نے فتنے میں ڈالا] [بَعْضَهُمْ : ان کا بعض] [بِبَعْضٍ : بعض کے ساتھ] [لِّيَقُوْلُوْٓا : تاکہ وہ کہیں] [اَهٰٓؤُلَآءِ : کیا یہی لوگ] [مَنَّ : احسان کیا] [اللّٰهُ : اللہ نے] [عَلَيْهِمْ : ان پر] [مِّنْۢ : سے] [بَيْنِنَا: ہمارے درمیان] [اَلَيْسَ : کیا نہیں] [اللّٰهُ : اللہ] [بِاَعْلَمَ : خوب جانتا] [بِالشّٰكِرِيْنَ : شکر کرنے والوں کو]

ترجمہ : اور اسی طرح ہم ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعے آزماتے ہیں تاکہ وہ (دولت مند کافر غریب مسلمانوں کو دیکھ کر استہزاءً یہ) کہیں : کیا ہم میں سے یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے احسان کیا ہے؟ کیا اللہ شکر گزاروں کو خوب جاننے والا نہیں ہے

تشریح:

پہلی آیت میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہدایت فرمائی گئی تھی کہ غریب صحابہ (رض) کو اپنے سے دور نہ کیجیے اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے غریب صحابہ (رض) کو قدر افزائی اور فضل و کرم کا پیغام سنایا گیا ہے۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

ابتداء میں اکثر غریب لوگوں نے اسلام قبول کیا اور یہ چیز کفار کے سرداروں اور مالداروں کے لیے آزمائش کا ذریعہ بن گئی۔ وہ ان غریبوں کا مذاق اڑاتے اور کہتے : ”کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے احسان فرمایا یعنی اسلام اگر واقعی اللہ تعالیٰ کا احسان ہوتا تو سب سے پہلے ہم مالداروں کو اس کی توفیق ملتی کیونکہ ہم ہر لحاظ سے ان ناداروں سے بہتر ہیں۔ “لیکن ان کافروں کو کیا خبر کہ اللہ تعالیٰ ظاہری چمک دمک اور

مال و دولت نہیں دیکھتا۔ اسے تو صرف وہ لوگ پسند ہیں جو شکر گزار ہیں اور جو تکبر، ناشکری اور کفر اختیار کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے احسان کے مستحق نہیں ہیں۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

کفار کی طرف سے غریب صحابہ (رض) کی حوصلہ شکنی اور طعنہ زنی کے بدلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی حوصلہ افزائی اور قدر دانی، فضل و کرم کا پیغام اور گناہوں کی بخشش کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ کفار نے غریب صحابہ (رض) کو حقیر سمجھ کر ان کی دنیاوی پسماندگی کا مذاق اڑایا تھا جس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ پر چار کرم فرمائے۔

۱۔ صحابہ کے ایمان اور اخلاص کی قدر افزائی فرمائی۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی کا پیغام آیا۔

۳۔ رب رحیم کی رحمت کے حق دار ٹھہرائے گئے۔

۴۔ گناہوں کی بخشش کی خوشخبری دی گئی۔

یہاں جہالت کو گناہ کا سبب قرار دیا ہے۔ جہالت کا مفہوم واضح کرتے ہوئے مفسرین نے لکھا ہے جہالت سے مراد یہ نہیں کہ آدمی کو گناہوں کے بارے میں علم نہ ہو بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ آدمی جب گناہ کرتا ہے تو اس وقت وہ عملاً جاہل ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہر زبان میں یہ معروف ہے کہ جب کوئی پڑھا لکھا انسان غلطی کا ارتکاب کرے تو لوگ اسے جاہل قرار دیتے ہیں۔ گویا کہ گناہ کا دوسرا نام جہالت ہے۔ یہاں اس لیے بھی جہالت کا لفظ استعمال کیا ہے تاکہ کفار کو اس بات کا احساس ہو کہ دین سے بے بہرہ ہونا پرلے درجے کی جہالت ہے۔ بہر حال جہالت کی کسی شکل میں انسان سے غلطی ہو جائے پھر وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرے اور اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ گناہ معاف کرنے والا نہایت ہی مہربان ہے۔ کافر کی توبہ یہ ہے کہ وہ کفر سے تائب ہو کر اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہوئے اصلاح کا رویہ اختیار کرے۔ یقیناً اس کے سابقہ گناہوں کو معاف کر دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے احکام کو اس لیے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ مجرموں کا راستہ واضح ہو جائے یہاں ہدایت کے بجائے مجرموں کا راستہ واضح کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس طرح گمراہی کے مقابلے میں ہدایت اور کفر و نفاق کے مقابلے میں دین کا راستہ خود بخود نمایاں ہو جاتا ہے۔ مجرموں کے راستے کو واضح کرنے کا یہ بھی مقصد ہے کہ جس طرز حیات پر وہ اتراتے ہیں انھیں احساس ہو کہ یہ اللہ کے فرمان بردار بندوں کا طریقہ اور راستہ نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی اشارہ کرنا مقصود ہے کہ مجرموں کا راستہ جہنم ہو گا جو نہایت ہی برا راستہ ہے۔ یہاں مومنوں کو اپنی رحمت کی خوشخبری سنانے کے بعد مجرموں پر واضح فرمایا کہ اگر تم بھی بغاوت اور تکبر کا راستہ ترک کر کے نیک بندوں کے ساتھ عاجزی اور اپنے رب کے حضور سرافگندگی کا طریقہ اختیار کر لو۔ تو اس کی رحمت تمہیں بھی اپنے دامن میں پناہ دینے کے لیے تیار ہے۔ اگر تم نے اس کے نیک بندوں کے ساتھ تکبر اور اپنے رب کے ساتھ نافرمانی کا رویہ اپنائے رکھا تو یاد رکھو اس کا عذاب بڑا سخت ہے۔

(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لَمَّا قَضَى اللّٰهُ الْخَلْقَ كَتَبَ فِي كِتَابِهِ فَهُوَ عِنْدَهُ فَوْقَ الْعَرْشِ إِنَّ رَحْمَتِي غَلَبَتْ غَضَبِي) [رواہ البخاری: کتاب بدء الخلق]

” حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کائنات کی تخلیق سے فارغ ہوا تو اپنی کتاب میں جو کہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے عرش کے اوپر لکھا میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

بعض لوگوں کی بعض پر فضیلت کا آزمائش ہونا

اللہ تعالیٰ کا بعض لوگوں کو بعض لوگوں کے سبب آزمائش میں مبتلا کرنا یہ ہے کہ لوگ رزق اور اخلاق میں ایک دوسرے سے متفاوت رہیں۔ بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ غنی بنایا اور بعض لوگوں کو فقیر بنایا ،بعض لوگوں کو قوی بنایا ،بعض لوگوں کو ضعیف بنایا اور بعض لوگوں کو قوی بنایا ، بعض لوگوں کو ضعیف بنایا اور بعض لوگوں کو بعض لوگوں کا محتاج کردیا۔

حضرت ابن عباس (رض) نے اس کی تفسیر میں فرمایا اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کو مال دار بنایا اور بعض لوگوں کو فقراء بنایا اور مالداروں نے فقراء کے متعلق کہا ،کیا یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے احسان فرمایا ہے ،یعنی ان کو ہدایت دی ہے۔ انھوں نے یہ بطور استہزاء اور مذاق اڑانے کی خاطر کہا تھا۔ (جامع البیان ،جز ۷ ص ۲۷۰ ،مطبوعہ دارالفکر ،بیروت)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ ہر شخص اپنے بالمقابل کی بہ نسبت آزمائش میں مبتلا ہے ،مال دار کافر ،فقراء صحابہ سے ان کی اسلام میں سبقت پر حسد کرتے تھے اور وہ کہتے تھے کہ اگر ہم اب مسلمان ہوگئے تو ہم ان مسکینوں اور فقیروں کے تابع ہوں گے اور یہ چیز ان پر سخت دشوار تھی اور فقراء صحابہ ان مال دار کافروں کو عیش ،راحت اور فراخ دستی میں دیکھتے تھے ،اور وہ یہ سوچتے تھے کہ ان کافروں کو مال و دولت کی ایسی فراوانی اور وسعت کیسے حاصل ہو گئی ؟ جبکہ ہم مال اور وسائل کی سخت تنگی اور مشکلات میں مبتلا ہیں ،تو ایک فریق دوسرے فریق کو دین میں بلندی پر دیکھتا تھا اور دوسرا فریق اس کو دنیا میں فراخی میں دیکھتا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے ان میں سے بعض کو ،بعض کے سبب آزمائش میں مبتلا کیا۔ اور اس بناء پر کافر یہ کہتے تھے کیا ہم میں سے یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے احسان کیا ہے ؟ اور اھل حق جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل حق اور صائب ہے اور اس کے ہر فعل میں حکمت ہے اور اس کے کسی فعل پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

(تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

غریبوں کے ساتھ سلوک کے حوالے سے نصیحت

اس سے معلوم ہوا کہ امیری و غریبی کو حق کا پیمانہ قرار نہیں دیا جاسکتا، نیز سابقہ آیت کے شان نزول اور اس آیت کے درس سے بہت سے مذہبی لوگوں اور خود امیروں کو بھی درس حاصل کرنا چاہیے کیونکہ ہمارے زمانے میں بھی یہ رجحان موجود ہے کہ اگر امیر آتا ہے تو اس کی تعظیم کی جاتی ہے جبکہ غریب کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ غریب کی دل شکنی کی جاتی ہے اور امیر کے آگے بچھے بچھے جاتے ہیں اور خود امیروں کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ ہمیں ذرا ہٹ کر ڈیل کیا جائے اور ہمارے لیے اسپیشل وقت نکالا جائے اور ہمارے آنے پر مولوی آدمی ساری مصروفیت چھوڑ کر اس کے پیچھے پھرتا رہے۔ غریب آدمی پاس بیٹھ جائے تو امیر اپنے سٹیٹس کے خلاف سمجھتا ہے، اسے غریب کے کپڑوں سے بو آتی ہے، غریب کا پاس بیٹھنا اس کی طبیعت خراب کر دیتا ہے، غریب سے ہاتھ ملانا اس امیر کے ہاتھ پر جراثیم چڑھا دیتا ہے۔ الغرض یہ سب باتیں غرور و تکبر کی ہیں، ان سے بچنا لازم و ضروری ہے۔

ضمناً اعلیٰ حضرت (رح) اور ایک مغرور امیر کا واقعہ کالی از دلچسپی نہ ہو گا؟

ایک صاحب اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان (رح) کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور اعلیٰ حضرت (رح) بھی کبھی کبھی ان کے یہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ (رح) ان کے یہاں تشریف فرما تھے کہ ان کے محلے کا ایک بے چارہ غریب مسلمان ٹوٹی ہوئی پرانی چارپائی پر جو صحن کے کنارے پڑی تھی جھجکتے ہوئے بیٹھا ہی تھا کہ صاحب خانہ نے نہایت کڑوے تیوروں سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ ندامت سے سر جھکائے اٹھ کر چلا گیا۔ اعلیٰ حضرت (رح) کو صاحب خانہ کی اس مغرورانہ روش سے سخت تکلیف پہنچی مگر کچھ فرمایا نہیں، کچھ دنوں بعد وہ صاحب اعلیٰ حضرت (رح) کے یہاں آئے تو آپ نے اسے اپنی چارپائی پر جگہ دی۔ وہ بیٹھے ہی تھے کہ اتنے میں کریم بخش حجام اعلیٰ حضرت (رح) کا خط بنانے کے لیے آئے، وہ اس فکر میں تھے کہ کہاں بیٹھوں؟ اعلیٰ حضرت (رح) نے فرمایا: بھائی کریم بخش! کیوں کھڑے ہو؟ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ان صاحب کے قریب بیٹھنے کا اشارہ فرمایا۔ کریم بخش حجام ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اب ان صاحب کے غصہ کی یہ کیفیت تھی کہ جیسے سانپ پھنکاریں مارتا ہو اور فوراً اٹھ کر چلے گئے پھر کبھی نہ آئے۔

اپنی عادتوں پر غور کرکے ایک مرتبہ پھر اس آیت کا ترجمہ دیکھ لیں، فرمایا: اور یونہی ہم نے ان میں بعض کی دوسروں کے ذریعے آزمائش کی تاکہ یہ (مالدار کافر غریب مسلمانوں کو دیکھ کر) کہیں: کیا یہ لوگ ہیں جن پر ہمارے درمیان میں سے اللہ نے احسان کیا؟ کیا اللہ شکر گزاروں کو خوب نہیں جانتا؟ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

الحاصل۔۔ مذکورہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ ہر شخص اپنے بالمقابل کی بہ نسبت آزمائش میں مبتلا ہے۔ مالدار کافر فقراء صحابہ سے ان کی اسلام میں سبقت پر حسد کرتے تھے اور وہ کہتے تھے کہ اگر ہم اب مسلمان ہو گئے، تو ہم ان مسکینوں اور فقیروں کے تابع ہوں گے اور یہ چیز ان پر سخت دشوار تھی۔ اور فقراء صحابہ ان مالدار کافروں کو عیش، راحت اور فراخ دستی میں دیکھتے تھے اور وہ سوچتے تھے کہ ان کافروں کو مال و دولت کی فراوانی اور وسعت کیسے حاصل ہو گئی؟ جبکہ ہم مال اور سائل کی سخت تنگی اور مشکلات میں مبتلا ہیں۔ تو ایک فریق دوسرے فریق کو دین میں بلندی پر دیکھتا تھا، اور دوسرا فریق اسکو دنیا میں فراخی میں دیکھتا تھا۔

اسلئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے ان میں سے بعض کو بعض کے سبب آزمائش میں مبتلا کیا۔ اور اس بنا پر کافر یہ کہتے تھے، کیا ہم میں سے یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے احسان کیا ہے؟

۔۔اور۔۔ اہل حق جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل حق اور درست ہے اور اس کے فعل میں حکمت ہے اور اس کے کسی فعل پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔۔ تو اے محبوب! آیت مذکورہ میں جن غرباء مسلمین کا ذکر ہے، ان کو کافروں کی دلدہی کیلئے اپنی مجلس سے اٹھا دینا تو بڑی بات ہے، ان کے ساتھ کوئی ایسا سلوک بھی نہ کریں جس سے ان کی دل شکنی ہو اور یہ کبیدہ خاطر ہو جائیں۔ (تفسیر اشرفی۔ علامہ محمد مدنی اشرفی جیلانی)

آیت مبارکہ :

وَإِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ ۙ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○54

لغۃ القرآن : [وَإِذَا : اور جب] [جَآءَكَ : آئیں آپ کے پاس] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ] [يُؤْمِنُوْنَ : جو ایمان لاتے ہیں] [بِاٰيٰتِنَا : ہماری آیات کے ساتھ] [فَقُلْ : پس فرمادیں] [سَلٰمٌ: سلامتی ہو] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [كَتَبَ : لکھ دی] [رَبُّكُمْ : تمہارے رب نے] [عَلٰى نَفْسِهِ : اپنے آپ پر] [الرَّحْمَةَ ۙ: رحمت] [اَنَّهٗ : بیشک وہ] [مَنْ : جس نے] [عَمِلَ : عمل کیا] [مِنْكُمْ : تم سے] [سُوْٓءًۢا : برائی] [بِجَهَالَةٍ : جہالت سے] [ثُمَّ : پھر] [تَابَ : توبہ کی اس نے] [مِنْۢ : سے] [بَعْدِهٖ : اس کے بعد] [وَاَصْلَحَ ۙ: اور اصلاح کی] [فَاَنَّهٗ : بیشک وہ] [غَفُوْرٌ: بخشنے والا] [رَّحِيْمٌ : مہربان]

ترجمہ : اور جب آپ کے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں تو آپ (ان سے شفقتًا) فرمائیں کہ تم پر سلام ہو تمہارے رب نے اپنی ذات (کے ذمہ کرم) پر رحمت لازم کرلی ہے، سو تم میں سے جو شخص نادانی سے کوئی برائی کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ کرلے اور (اپنی) اصلاح کرلے تو بیشک وہ بڑا بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے

تشریح :

وہ مقدس گروہ جن کے شب و روز کا ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں صرف ہوتا ہے اور ان کے دل نور ایمان سے لبریز ہیں۔ ان کی مزید عزت افزائی کا سامان ہو رہا ہے۔ یعنی کیا ہوا کہ وہ پھٹے پرانے لباس میں ملبوس ہیں اور نان جویں کے علاوہ اور کوئی چیز کھانے کو میسر نہیں ہوتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی شان یہ ہے کہ اے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! جب وہ تیری خدمت میں حاضر ہوں تو آپ پہلے انھیں سلام فرمایئے اور انھیں یہ دعا دیجئے کہ تمہارا دین، تمہاری دنیا ہر قسم کے مصائب و آلام سے محفوظ رہے۔ چنانچہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے۔ الحمد للہ

الذی جعل فی امتی من امرنی ان ابدأھم بالسلام (قرطبی) اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے میری امت میں ایسے لوگ بھی پیدا فرمائے ہیں جنہیں پہلے سلام کرنے کا مجھے حکم فرمایا گیا ہے۔ نیز یہ وہ خوش نصیب ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا دامن پھیلا دیا ہے۔ ان میں سے اگر کوئی بھولے سے غلطی کر بیٹھتا ہے اور پھر نادم ہو کر توبہ کرتا ہے اور اپنے کردار کو درست کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بخش دیتا ہے اور اس پر رحمت فرماتا ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

شان نزول میں متعدد اقوال

اس آیت کے شان نزول کے متعلق پانچ اقوال ہیں:

(۱) حضرت انس بن مالک (رض) نے بیان کیا کہ یہ آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ہم سے بڑے بڑے گناہ سرزد ہوگئے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خاموش رہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

(۲) حسن بصری اور عکرمہ نے کہا یہ آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جن کو مجلس سے اٹھانے سے منع فرمایا تھا ' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب ان کو دیکھتے تو ابتدا اسلام کرتے اور فرماتے اللہ کا شکر ہے جس نے میری امت میں ایسے لوگوں کو رکھا ' جن کے متعلق مجھے ابتدا اسلام کرنے کا حکم دیا۔

(۳) عطاء نے کہا یہ آیت حضرت ابوبکر ' حضرت عمر ' حضرت عثمان ' حضرت علی ' حضرت حمزہ ' حضرت جعفر ' حضرت عثمان بن مظعون ' حضرت ابوعبیدہ ' حضرت مصعب بن عمیر ' حضرت سالم ' حضرت ابوسلمہ ' حضرت ارقم بن ابی الارقم ' حضرت عمار اور حضرت بلال (رض) کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

(۴) ابن السائب نے کہا عمر بن خطاب (رض) نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اشارۃ یہ کہا تھا کہ مالدار کافروں کی دلجوئی کے لیے مسکین کافروں کو موخر کردیجئے اور جب یہ آیت نازل ہوئی اور (ان مسکین مسلمانوں کو) دور نہ کیجئے جو صبح وشام اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں تو حضرت عمر (رض) اپنے اس مشورہ پر معذرت کرتے ہوئے اور استغفار کرتے ہوئے آئے ' تب یہ آیت نازل ہوئی۔

(۵) ابوسلیمان دمشقی نے کہا یہ آیت حضرت عمر بن خطاب (رض) کے اسلام کی بشارت دینے کے لیے نازل ہوئی تھی۔ جب حضرت عمر (رض) آئے اور اسلام قبول کیا تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان پر یہ آیت تلاوت کی۔

حسن بصری اور عکرمہ نے کہا اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب یہ لوگ آپ کے پاس آئیں تو آپ کہئے تم پر سلام ہو اللہ تعالیٰ نے ان کی عزت افزائی کے لیے آپ کو یہ حکم دیا تھا کہ آپ انھیں سلام کریں اور ابن زید نے کہا آپ کو اللہ کی طرف سے انھیں سلام پہنچانے کا حکم دیا گیا تھا۔ زجاج نے کہا سلام کا معنی انسان کے لیے آفات سے سلامتی کی دعا ہے۔ (زادالمیسر ج ۳ ص ۴۹۔ ۴۸ ' مطبوعہ مکتب اسلامی ' بیروت ' ۱۴۰۷ ھ)

(تفسیر تبیان القرآن۔ غلام رسول سعیدی)

نیک مسلمانوں کا احترام کرنا چاہیے

اس سے معلوم ہوا کہ نیک مسلمانوں کا احترام اور ان کی تعظیم کرنی چاہیے اور ہر ایسی بات سے بچنا چاہیے جو ان کی ناراضی کا سبب بنے کیونکہ انھیں ناراض کرنا اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہے، جیسا کہ حضرت عائذ بن عمرو (رض) فرماتے ہیں: حضرت سلمان، حضرت صہیب اور حضرت بلال (رض) کے سامنے حضرت ابو بکر صدیق (رض) نے ان کے مزاج کے خلاف کوئی بات کہہ دی پھر حضرت ابو بکر صدیق نے حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں حاضر ہو کر آپ کو اس کی خبر دی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "اے ابو بکر! (رض)، شاید تم نے انھیں ناراض کر دیا، اگر تم نے انھیں ناراض کر دیا تو اپنے ربعَزَّوَجَلَّ کو ناراض کر دیا۔ پھر حضرت ابو بکر (رض) ان کے پاس گئے اور کہا: اے میرے بھائیو! میں نے تم کو ناراض کر دیا؟ انھوں نے کہا: نہیں اے بھائی! اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے۔
(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

اولیاء اللہ کی تعظیم کی تاکید

عائذ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ حضرت سلمان ' حضرت صہیب اور حضرت بلال ' کے پاس چند لوگوں میں حضرت ابو سفیان آئے تو انھوں نے کہا اللہ کی تلواریں ' اللہ کی دشمنوں کی گردنوں میں اپنی جگہ پر نہیں پہنچیں۔ حضرت ابو بکر (رض) نے فرمایا تم لوگ قریش کے شیخ اور سردار کے متعلق ایسی باتیں کر رہے ہو۔ پھر حضرت ابو بکر (رض) نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جا کر یہ ماجرا سنایا تب حضرت ابو بکر (رض) ان کے پاس گئے اور کہا اے میرے بھائیو! میں نے تم کو ناراض کر دیا انھوں نے کہا نہیں ' اے بھائی اللہ آپ کی مغفرت فرمائے۔ (صحیح مسلم ' فضائل صحابہ ' ۱۷۰ ' ۲۵۰۴ ' المعجم الکبیر ' ج ۱۸ ' رقم الحدیث: ' ۲۸ ' مسند احمد ' ج ۱۵ ' رقم الحدیث: ' ۲۰۵۱۸ ' طبع دار الحدیث قاہرہ ' مسند احمد ' ج ۷ ' رقم الحدیث: ' ۲۰۶۶۵ ' طبع جدید دار الفکر ' مسند احمد ' ج ۵ ' ص ۶۵ ' طبع دار الفکر ' سنن کبری ' ج ۵ ' رقم الحدیث: ' ۸۲۷۷)
اس حدیث سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ نیک مسلمانوں کا احترام کرنا چاہیے اور جس بات سے انھیں غصہ آئے یا ان کو ایذاء پہنچے اس سے اجتناب کرنا چاہیے ' کیونکہ جو شخص اللہ کے اولیاء میں سے کسی کو ناراض کرتا ہے ' وہ اللہ کے عذاب اور اس کے غضب کا مستحق ہوتا ہے۔

جہالت کی وجہ سے گناہوں کی معافی کی وضاحت

اس آیت میں فرمایا ہے تم میں سے جس کسی نے ناواقفیت کی وجہ سے کوئی برا کام کر لیا ' پھر اس کے بعد توبہ کر لی اور اصلاح کر لی تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے۔
مجاہد نے کہا جس شخص نے اللہ کی معصیت میں کوئی کام کیا ' تو یہ اس کی جہالت ہے حتیٰ کہ وہ اس سے رجوع کر لے۔ (جامع البیان ' جز ۷ ص ۲۷۳ ' مطبوعہ دار الفکر ' بیروت ۱۴۱۵ھ)

امام رازی نے کہا جہالت کا معنی خطا اور غلطی ہے اور اس پر توبہ کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص نے غلبہ شہوت سے معصیت کی اور اس کا بیان یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان علم کے باوجود کوئی گناہ کرتا ہے اور پھر اس پر توبہ کرتا ہے 'تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیتا ہے۔ حسن بصری نے کہا جس نے کوئی معصیت کا کام کیا 'وہ جاہل ہے۔ پھر معصیت کو جہالت سے تعبیر کرنے کی وجہ سے اختلاف ہے۔ بعض نے کہا وہ اس سے جاہل ہے کہ اس کام کی وجہ سے اس سے کتنا ثواب جاتا رہا اور وہ کتنے عذاب کا مستحق ہو گیا؟ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہر چند کہ اس کو علم ہے کہ اس فعل کا نتیجہ مذموم ہے 'لیکن اس نے فوری اور دنیاوی لذت کو دیر سے اور آخرت میں ملنے والی خیر کثیر پر ترجیح دی اور جو شخص قلیل کو کثیر پر ترجیح دے 'اس کو عرف میں جاہل کہا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص نے عمداً کسی معصیت کا ارتکاب کیا ہر چند کہ وہ جاہل نہیں ہے لیکن اس نے کام جاہلوں والا کیا ہے 'اس لیے اس کے کام پر جہالت کے کام کا اطلاق کیا گیا ہے۔ (تفسیر کبیر 'ج ۴ 'ص ۵۳ 'مطبوعہ دارالفکر 'طبع قدیم '۱۳۹۸ھ)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب کا اس پر اجماع ہے کہ ہر معصیت جہالت ہے 'خواہ وہ معصیت عمداً کی جائے یا جہلاً 'کلبی نے کہا جہالت سے گناہ کرنے کا معنی یہ ہے کہ اسے اس کام کے معصیت اور گنا ہونے کا تو علم ہو 'لیکن اسے اس گناہ کی سزا کی کنہ اور حقیقت کا علم نہ ہو۔ عکرمہ نے کہا اللہ اور اس کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کے سوا دنیا کے تمام کام جہالت ہیں۔ زجاج نے کہا اس کی جہالت یہ ہے کہ فانی لذت کو باقی لذت پر ترجیح دے رہا ہے اور دنیاوی منفعت کو اخروی منفعت پر ترجیح دے رہا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ جہالت سے مراد ہے معصیت پر اصرار کرنا۔ ایک قول یہ ہے کہ جہالت سے مراد یہ ہے کہ وہ غلبہ شہوت کی وجہ سے ارتکاب معصیت کرے اور اس کا مقصد گناہ کو معمولی سمجھنا نہ ہو۔ یا کوئی شخص اس خیال سے گناہ کرے کہ وہ اس گناہ کے بعد توبہ کرکے نیک بن جائے گا اور اس سے جاہل ہو کہ وہ ایسا کر سکے گا یا نہیں 'یا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی مغفرت کے حصول کی بناء پر گناہ کا ارتکاب کرے 'اور وہ اس کے مال اور انجام سے جاہل ہو۔ (البحر المحیط 'ج ۳ ص ۵۶۱ 'مطوعہ دارالفکر 'بیروت '۱۴۱۲ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص نے شدید غصہ سے 'غلبہ شہوت یا حماقت کی بنا پر اخروی سزا سے غافل ہو کر کوئی گناہ کر لیا 'پھر اس نے اخلاص کے ساتھ اپنے گناہ پر توبہ کی 'اس گناہ سے رجوع کیا اور نادم ہوا اور مستقبل میں دوبارہ وہ گناہ نہ کرنے کا عزم کیا 'اپنے عمل کی اصلاح کی اور اس گناہ کی تلافی اور تدارک کیا اور اس گناہ کے بعد کوئی نیکی کی 'تاکہ اس گناہ کا اثر مٹ جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ کو بخش دے گا 'کیونکہ وہ بہت وسیع رحمت اور مغفرت والا ہے۔ (تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

یہاں یہ بھی درس ملتا ہے کہ

کسی کمزور کا مذاق اڑانا اللہ کو سخت ناپسند ہے

مالدار کفار نے غریب صحابہ کو دیکھ کر کہا: اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡۢ بَيۡنِنَا۔ اللہ کو ان کا یہ قول سخت ناپسند آیا اور قرآن اتار کر اس کی مذمت کی لہٰذا کسی کو مال و دولت میں اپنے سے کمتر دیکھ کر اس کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔

خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

حاضری دربار رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مقام
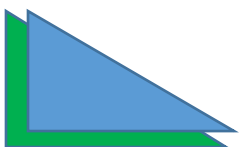
وَاِذَا جَاۗءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا کے الفاظ حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ الظاہری سے خاص نہیں ہیں۔ ان کا حکم تا قیامت عام ہے۔ کیونکہ اذاجاءک کے الفاظ عام ہیں جو کسی زمانہ یا دور کے ساتھ خاص نہیں ہیں، اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی قبر مبارک میں جلوہ فرما ہو کر اپنے دربار میں آنے والوں کی فریادیں سنتے ہیں اور ان کے لیے شفاعت فرماتے ہیں اور یہی صحابہ کرام (رض) کا عقیدہ و عمل ہے۔

لہٰذا آج بھی جب مومنین آپ کے روضہ مبارکہ پر حاضر ہو کر سلام عرض کرتے ہیں تو اندر سے جواب آتا ہے: سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ۔ اور جب سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا امتی آپ کے دربار میں کھڑے ہو کر استغفار کرتا ہے تو آپ فرماتے ہیں: مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْۗءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ اور کیوں نہ ہو جو شخص آپ کے پاس حاضر ہو وہ یقین اللہ کی رحمت کا حقدار ہے اور جو اس نے گناہ کیا ہو جب وہ وہاں توبہ و استغفار کرے گا تو اللہ کو غفور اور رحیم پائے گا۔ کیونکہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے صاف اعلان فرمایا ہے: وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَاۗءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا۔ "اور اگر وہ اپنی جانوں پر ظلم کر کے آپ کے پاس آجاتے اور پھر وہ اللہ سے بخشش مانگتے اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کی شفاعت کر دیتے تو وہ اللہ کو بخشنے والا مہربان پاتے" (نساء: 64)

امام ابن الحاج مالکی مصری متوفی 757ھ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں حاضر ہونے والا سمجھے کہ وہ آپ کے سامنے یوں ہی کھڑا ہے جیسے آپ اپنی حیات ظاہرہ کے ساتھ زندہ ہیں۔ کیونکہ آپ کی موت و حیات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ آپ اپنی امت کا مشاہدہ فرماتے ہیں۔ آپ ان کے احوال ان کی نیات، ان کے عزائم اور ان کے دلی ارادوں سے واقف ہیں، اس بارے میں آپ بھی کوئی خفا نہیں ہے۔ (المدخل جلد اول صفحہ 259 مطبوعہ دارالفکر بیروت)

فضیلت توبہ

یہ آیت فضیلت توبہ کا عظیم شان بیان ہے۔ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۔ اللہ کی طرف سے بہت امید افزا وعدہ ہے۔ یہ وہی مضمون ہے جو پیچھے اسی سورۃ انعام آیت 12 میں گزرا ہے کلہ نے فرمایا: كَتَبَ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ۔ (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

اللہ تعالیٰ کی رحمت غالب ہے

صحیح بخاری، مسلم، مسند احمد میں بروآیت ابوہریرہ (رض) مذکور ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوقات کو پیدا فرمایا اور ہر ایک کی تقدیر کا فیصلہ فرمایا تو ایک کتاب میں جو عرش پر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے یہ لکھا کہ ان رحمتی غلبت غضبی، یعنی میری رحمت میرے غصہ پر غالب ہے۔

اور حضرت سلمان (رض) فرماتے ہیں کہ ہم نے توراۃ میں یہ لکھا دیکھا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آسمان زمین اور ان کی ساری مخلوقات کو پیدا فرمایا، توصفت رحمت کے سو حصے کرکے اس میں سے ایک حصہ ساری مخلوقات کو تقسیم کردیا، اور آدمی اور جانور اور دوسری مخلوقات میں جہاں بھی کوئی اثر رحمت کا پایا جاتا ہے وہ اسی حصہ تقسیم شدہ کا اثر ہے، ماں باپ اور اولاد میں، باہمی ہمدردی اور محبت و رحمت کے تعلقات مشاہدہ کئے جاتے ہیں، وہ سب اسی ایک حصہ رحمت کے نتائج ہیں، باقی ننانوے حصے رحمت کے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لیے رکھے ہیں۔

قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کی بیشمار نصوص اس پر دلالت کرتی ہیں کہ توبہ کرنے سے ہر گنا معاف ہوسکتا ہے۔ خواہ غفلت و جہل کی وجہ سے سرزد ہوا ہو یا جان بوجھ کر شرارت نفس اور اتباع ہویٰ کی وجہ سے :

رحمت و مغفرت کے لیے دو شرطیں

اس جگہ یہ بات خاص طور پر قابل نظر ہے کہ اس آیت میں گناہ گاروں سے مغفرت اور رحمت کا جو وعدہ فرمایا گیا ہے وہ دو چیزوں کے ساتھ مشروط ہے، ایک توبہ دوسرے اصلاح عمل، توبہ کے معنی ہیں گناہ پر ندامت کے، حدیث میں ارشاد ہے : ان التوبۃ الندم، یعنی توبہ نام ہے ندامت کا۔

دوسرے آئندہ کے لیے اصلاح عمل اس اصلاح عمل میں یہ بھی داخل ہے کہ آئندہ اس گناہ کے پاس نہ جانے کا عزم اور پورا اہتمام کرے، اور یہ بھی شامل ہے کہ سابقہ گناہ سے جو حقوق کسی کے ضائع ہوئے ہیں تاحد اختیار ان کو ادا کرے خواہ وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد۔ حقوق اللہ کی مثال نماز، روزہ، زکوۃ حج وغیرہ فرائض میں کوتاہی کرنا ہے، اور حقوق العباد کی مثال کسی کے مال پر ناجائز قبضہ و تصرف کرنا۔ کسی کی آبرو پر حملہ کرنا، کسی کو گالی گلوچ کے ذریعہ یا کسی دوسری صورت سے ایذاء پہنچانا ہے۔

اسی طرح حقوق العباد میں اگر کسی کا مال ناجائز طور پر لیا ہے تو اس کو واپس کرے یا اس سے معاف کرائے اور کسی کو ہاتھ یا زبان سے ایذاء پہنچائی ہے تو اس سے معاف کرائے، اور اگر اس سے معاف کرانا اختیار میں نہ ہو، مثلاً وہ مرجائے، یا ایسی جگہ چلا جائے جس کا اس کو پتہ معلوم نہیں، تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ اس شخص کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائے مغفرت کرتے رہنے کا التزام کرے، اس سے امید ہے کہ صاحب حق راضی ہوجائے گا اور یہ شخص سبکدوش ہوجائے گا۔

اللہ کے آزاد کیے ہوئے بندے

ابوہریرہ سے روایت ہے کہ حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق پر اپنی تقدیر قائم کی تو عرش پر جو اس کی کتاب لوح محفوظ ہے اس میں تحریر فرمادیا کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی، چنانچہ حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جب مخلوق کے بارے میں نفاذ حکم سے اللہ تعالیٰ فارغ ہوگا تو تحت عرش سے کتاب نکالے گا جس میں لکھا ہوگا کہ میں ارحم الراحمین ہوں۔ پھر اپنی ایک یا دو مٹھی بھر مخلوق کو دوزخ سے نکالے گا جنہوں نے کچھ خیر کے کام نہ کیے ہوں گے اور ان کی آنکھوں کے درمیان ماتھے پر لکھا ہوگا عتقاء اللہ یعنی یہ اللہ کے آزاد کردہ ہیں۔

بندوں پر اللہ کا حق

معاذ بن جبل سے مروی ہے کہ کیا تم جانتے ہو کہ بندوں پر اللہ کا کیا حق ہے؟ حق یہ ہے کہ وہ اسی کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں۔ پھر پوچھا کہ بندوں کا حق اللہ پر کیا ہے؟ پھر کہا یہ ہے کہ خدا انھیں معاف کردے اور مبتلائے عذاب نہ کرے۔ (تفسیر ابن کثیر اردو)

مشرک سرداروں کے مطالبات اور جواب

بغوی کا بیان ہے کہ حضرت سلمان (رض) اور حضرت خباب بن الارت نے فرمایا اس آیت کا نزول ہمارے سلسلہ میں ہوا اقرع بن حابس تمیمی ٬عیینہ بن حصن فزاری اور بعض دوسرے لوگ جو مؤلفۃ القلوب (مسلمانوں) میں سے تھے ٬رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بلال ٬صہیب ٬عمار ٬خباب اور کچھ اور کمزور مسلمان بیٹھے ہوئے تھے آنے والوں نے ان بیچاروں (غریبوں) کو دیکھ کر تحقیر کی نظر سے دیکھا اور عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر آپ صدر مقام پر تشریف فرما ہوں اور ان لوگوں کو اور ان کے لباس کی بدبو کو اپنے پاس سے ہٹادیں تو ہم آپ کے پاس بیٹھیں گے اور آپ سے کچھ حاصل کریں گے ان غریب مسلمانوں کے پاس اونی چوغے تھے جن سے پسینہ کی وجہ سے بدبو پھیل رہی تھی۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں اہل ایمان کو اپنے پاس سے نہیں نکال سکتا۔ کہنے لگے اچھا تو ہمارے لیے الگ جگہ مقرر کردیجئے کہ (آنے والے) عرب ہماری بڑائی کو پہچان لیں کیونکہ آپ کے پاس عربوں کے وفد آتے رہتے ہیں ہمیں ان کے سامنے غلاموں کے ساتھ بیٹھتے شرم آتی ہے ہم جب آپ کے پاس آیا کریں تو آپ ان کو اٹھوادیا کریں اور جب ہم فارغ کو ہر چلے جائیں تو آپ کو اختیار ہے آپ پھر ان کو اپنے پاس بٹھالیا کریں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہاں (یہ ہوسکتا ہے) کہنے لگے اس کی ایک تحریر لکھ کردیجئے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کاغذ طلب فرمایا اور حضرت علی (رض) : کو بلوایا۔ راوی کا بیان ہے ہم ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے ہی تھے (اور تحریر لکھنے نہ پائے تھے) کہ جبرائیل آیت {وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ ۔۔ بِالشّٰكِرِیْنَ} تک لے کر نازل ہوئی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فوراً دست مبارک سے کاغذ پھینک دیا اور ہم

کو طلب فرمایا ہم خدمت میں پہنچے تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پڑھ رہے تھے۔ {سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ} چنانچہ ہم حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس برابر بیٹھتے رہے۔ جب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اٹھنے کا ارادہ کرتے تو خود اٹھ جاتے اور ہم کو بیٹھا چھوڑ جاتے اس پر اللہ نے نازل فرمایا: {وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ} اس کے بعد (بڑے بڑے سرداروں کے آنے پر بھی) حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے پاس بیٹھے رہتے اور ہم اتنے قریب بیٹھتے کہ ہمارے زانو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زانو سے چھونے لگتے پھر جب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اٹھنے کا وقت آجاتا تو ہم خود اٹھ جاتے اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): کو بیٹھا چھوڑ دیتے آخر آپ بھی اٹھ جاتے اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہم سے فرمایا تھا اللہ کا شکر ہے کہ مرنے سے پہلے اس نے مجھے حکم دے دیا کہ میں اپنی امت کی ایک جماعت کے ساتھ بیٹھا رہوں۔ تمہارے ہی ساتھ میرا مرنا جینا ہے۔ کلبی نے کہا اقرع اور عیینہ وغیرہ نے عرض کیا تھا۔ آپ ایک دن ہمارے لیے اور ایک دن ان کے لیے مقرر فرما دیجئے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں ایسا نہیں کر سکتا کہنے لگے اچھا تو مجلس ایک ہی رکھئے مگر ہماری طرف کو منہ اور ان کی طرف کو پشت رکھئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

قراءت قرآن کی مجلس میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا تشریف فرما ہونا

بغوی نے اپنی سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابو سعید خدری نے فرمایا۔ میں مہاجروں کی ایک جماعت میں بیٹھا ہوا تھا۔ برہنگی کی وجہ سے بعض لوگ بعض کی آڑ پکڑے ہوئے تھے اور ایک قاری پڑھ رہا تھا کہ رسول اللہ تشریف لے آئے اور آکر کھڑے ہو گئے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): کو کھڑا دیکھ کر قاری چپ ہو گیا آپ نے سلام کیا اور فرمایا تم کیا کر رہے تھے ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم): ایک قاری قرآن مجید پڑھ رہا تھا ہم اللہ کا کلام سن رہے تھے فرمایا اللہ کا شکر رہے کہ اس نے میری امت میں بعض لوگ ایسے بنا دیئے جن کے ساتھ مجھے اپنے آپ کو جمائے رکھنے کا حکم دیا اس کے بعد اظہار مساوات کے لیے آپ ہمارے وسط میں بیٹھ گئے پھر ہاتھ سے اشارہ فرمایا تو لوگوں نے گرداگرد حلقہ بنا لیا اور سب کے چہرے سامنے آگئے (کوئی آڑ میں نہیں رہا) میرا خیال ہے کہ میرے علاوہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کسی کو نہیں پہچانا ارشاد فرمایا اے نادار مہاجروکے گروہ قیامت کے دن تم کو نور کامل حاصل ہونے کی بشارت ہو مالداروں سے آدھے دن بیشتر غریب لوگ جنت میں جائیں گے اور اس آدھے دن کی مقدار پانسو برس ہو گی۔

(تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی)

فوائد

ا: اس آیت میں قیامت تک کے مسلمان داخل ہیں۔ جو بھی اس سرکار کے دربار میں دل سے حاضر ہوا اگلی بشارت کا مستحق ہے۔ ہمارے پاس سورج کا آنا یہ ہے کہ وہ طلوع ہو جائے اور ہمارا سورج کے پاس آنا یہ ہے کہ وہ طلوع ہو جائے اور ہمارا سورج کے پاس آنا یہ ہے کہ ہم آڑ ہٹا دیں۔ حضور ہمارے پاس آگئے۔ لقد جاء کم رسول ہم غفلت کی آڑ پھاڑ کر حضور تک پہنچ سکتے ہیں۔

۲: بھکاری تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو صاف صاف مانگ لیتے ہیں ان کے لیے ارشاد ہوا جاءوك فاستغفروا الله دوسرے وہ جو سخی کو دعائیں دیتے ہیں، ان کے لیے ارشاد ہوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔ تیسرے وہ جو منہ سے کچھ نہیں کہتے صرف سخی کے سامنے آجاتے ہیں۔ ان کے لیے یہ آیت ہے۔

۳: اس سے دو مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ حضور کی غلامی کی برکت سے اللہ کی رحمت، گناہوں کی معافی سب کچھ نصیب ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمے کرم پر لازم فرمائیں نہ کہ کسی دوسرے نے لہٰذا آیات میں تعارض نہیں۔

۴: خیال رہے کہ ہر گناہ کی توبہ جداگانہ ہے اگر حقوق مارے ہیں تو اس کی توبہ کے لیے ضروری ہے کہ حق ادا کرے پھر زبان سے توبہ کرے۔ اگر نمازیں نہ پڑھی ہوں تو توبہ یہ ہے کہ ان کی قضا کرے۔ اس کے بغیر توبہ کیسی۔

۵: اس سے معلوم ہوا کہ توبہ کے دو رکن ہیں۔ ایک تو گزشتہ پر ندامت اور دوسرے آئندہ کی اصلاح۔ اگر ایک جز کی بھی کمی رہ گئی تو توبہ قبول نہیں۔ نہ فرمانے سے معلوم ہوا کہ بہت عرصہ کے بعد بھی توبہ قبول ہو جاتی ہے مرتے مرتے توبہ کر لے۔

(تفسیر نور العرفان۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی)

آیت مبارکہ:

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ۠ 55

لغۃ القرآن: [وَكَذٰلِكَ : اور اسی طرح] [نُفَصِّلُ : ہم بیان کرتے ہیں] [الْاٰيٰتِ : آیات] [وَلِتَسْتَبِيْنَ : تاکہ واضح ہوجائے] [سَبِيْلُ : راستہ] [الْمُجْرِمِيْنَ : مجرموں کا]

ترجمہ: اور اسی طرح ہم آیتوں کو تفصیلاً بیان کرتے ہیں اور (یہ) اس لیے کہ مجرموں کا راستہ (سب پر) ظاہر ہو جائے

تشریح:

اے حبیب! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، جس طرح ہم نے آپ کے سامنے اس سورت میں اپنی وحدانیت کے دلائل تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں ہم اسی طرح اپنی حجتوں اور دلائل کو مفصل بیان فرماتے ہیں اور ہم قرآن مجید میں اطاعت گزاروں، گناہ کے بعد توبہ کر لینے والوں کے اوصاف اور گناہ پر اڑے رہنے والوں کی صفات بیان کرتے ہیں تاکہ حق ظاہر ہو جائے اور اس پر عمل کیا جائے اور اس لیے یہ چیزیں بیان کرتے ہیں کہ مجرموں کا راستہ اور ان کا طریقہ واضح ہو جائے تاکہ اس سے بچا جائے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

مجرم

مجرم کا لفظ۔ اللہ کی نظر میں مجرم کون ہے۔ ہم دنیا کے criminal کی بات نہیں کر رہے۔ دنیا میں تو ہم نے دو ٹرمز بنالیں ہیں۔ Sinner اور Criminal۔ گناہ گار اور مجرم۔ مجرم ہم اس کو سمجھتے ہیں جو دنیا میں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی زد میں آ جائے۔ وہ criminal ہے۔ تو کریمنل تو کوئی نہیں بننا چاہتا۔ اور sinner کون ہے جو اللہ کے بتائے ہوئے قوانین کی زد میں آ جائے۔ جو اللہ کا بنایا ہوا قانون ہے اس کو توڑے وہ گناہ گار ہے۔ تو گناہ گار ہونا تو کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ اس بات پر تو نہیں آتی ہے کہ یہ sin کیا چیز ہے۔ کتنا old facial out dated لفظ ہے۔ اس لفظ سے تو مضحکہ خیز ہنسی آنے لگتی ہے۔ اور تو اور فخر سے کہتے ہیں کہ ہاں ہم ہیں گنہگار۔ ہاں بھی ہاں ہم میں گنہگار۔ یہ ان کی گواہی اللہ لکھ لے گا۔ یہ تو confession ہے۔ خود contests کیا ہے کہ ہاں ہم بہت گناہ گار ہیں۔ تو اللہ کی نظر میں مجرم وہ جو اللہ کا بنایا ہوا قانون توڑے۔ ہو سکتا ہے کہ دنیا کی کسی عدالت میں اس کو سزا نہ ملے۔ لیکن مالک الملک کی عدالت تو لگنی ہے۔ قیامت کا دن تو آنا ہے۔ تو پتہ چل جائے گا۔ ان کو کہ کیسے کیسے انھوں نے اللہ کے قانون توڑے۔ کیسے یہ اللہ کے مجرم تھے۔ گنہگاروں کا دراصل ذکر ہے یہاں کہ یہ اللہ کے مجرم ہیں۔ اور مجرم کون ہے جو جہالت میں ڈوبا رہنا ہی پسند کرے۔ جہالت کو خوبی سمجھے۔ نہ توبہ کریں۔ نہ اصلاح۔ جان بوجھ کر گناہ کرتے رہیں۔ اور insist کریں کہ اللہ ہمیں بخشے گا۔ یعنی بخشش کو اللہ کا فضل نہ سمجھیں بلکہ بخشش کو اپنا حق سمجھ کر demand کریں۔ اللہ پر لازم کر لیں کہ وہ ضرور بخشے ہمیں اور اپنے پر لازم کر لیں کہ ضرور گناہ کریں ہم۔ یہ ہیں دراصل مجرم۔ (تفسیر تنویر۔ زاہدہ تنویر)

اخروی کامیابی تک پہنچانے والے راستے پر چلنے کی ترغیب

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کو چاہیے کہ وہ فلاح و کامیابی کے راستے پر چلے اور وہاں تک پہنچے جہاں نیک لوگ پہنچے اور اس کا سب سے بہترین راستہ فوری طور پر اپنے سابقہ گناہوں سے توبہ و استغفار کرنا اور آئندہ کے لیے نیک اعمال کرنا ہے۔ امام محمد غزالی (رح) فرماتے ہیں "زندگی کی ہر گھڑی بلکہ ہر سانس ایک نفیس جوہر ہے جس کا کوئی بدل نہیں، وہ اس بات کی صلاحیت رکھتا ہے کہ تجھے ابدی سعادت تک پہنچا دے اور دائمی بد بختی سے بچالے اس لیے اس سے زیادہ نفیس جوہر اور کیا ہو سکتا ہے، اگر تم اسے غفلت میں ضائع کر دوگے تو واضح نقصان اٹھاؤ گے اور اگر اسے گناہ میں صرف کروگے تو واضح طور پر ہلاک ہو جاؤ گے۔ اب اگر تم اس مصیبت پر نہیں روتے تو یہ تمہاری جہالت ہے اور جہالت کی مصیبت تمام مصیبتوں سے بڑھ کر ہے۔ (افسوس) لوگ غفلت کی نیند سوئے ہوئے ہیں، جب موت آئے گی تو وہ جاگ جائیں گے، اس وقت ہر مفلس کو اپنے افلاس کا اور ہر مصیبت زدہ کو اپنی مصیبت کا علم ہو جائے گا لیکن اس وقت اس کا ازالہ نہیں ہو سکے گا۔

مزید فرماتے ہیں "جب تم ان تین دہشت ناک باتوں پر ہمیشگی اختیار کروگے اور رات دن کے ہر حصے میں ان کی یاد تازہ کرتے رہوگے تو تمہیں گناہوں سے ضرور سچی اور خالص توبہ نصیب ہو جائے گی:

(1)۔۔گناہوں کی حد درجہ برائی بیان کرنا۔

(2)۔۔اللہ تعالیٰ کی سزا کی شدت، دردناک عذاب، اس کی ناراضی اور اس کے غضب و جلال کا ذکر کرنا۔

(3)۔۔اللہ تعالیٰ کے غضب و عذاب کی سختی کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی کمزوری اور ناتوانی کو یاد کرنا کہ جو شخص سورج کی تپش، سپاہی کے تھپڑ اور چیونٹی کے ڈنک کو برداشت نہیں کر سکتا تو وہ نار جہنم کی تپش، عذاب کے فرشتوں کے کوڑوں کی مار، لمبی گردنوں والے بختی اونٹوں کی طرح لمبے اور زہریلے سانپوں کے ڈنک اور خچر جیسے بچھوؤں کے ڈنک کیسے برداشت کر سکے گا۔ (تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری)

آیاتِ الٰہی کی تفصیل سے اہل ایمان اپنی منزل متعین کر سکتے ہیں

حاصل مضمون کے طور پر یہ فرمایا جارہا ہے کہ تم نے مشرکین مکہ کی روش کے ساتھ ساتھ ان کے مطالبات اور ان کے دلائل بھی دیکھے اور قرآن کریم نے ان کے الجھے ہوئے خیالات کے ازالے اور راہنمائی کے لیے نہایت موثر دلائل ارشاد فرمائے اور ساتھ ہی ساتھ قرآنی تعلیمات اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تربیت کے نتیجے میں صحابہ کرام کی صورت میں جو نہایت خوبصورت اور دل آویز کردار تیار ہوا اس کی جھلک بھی ہم نے دیکھی۔ پھر دونوں کے انجام کو ہمارے سامنے کھول کے رکھ دیا گیا۔ ایک کا انجام دنیا میں رسوائی اور آخرت میں تباہی اور دوسرے کا انجام دنیا میں بھی کامرانی اور آخرت میں بھی فوز و فلاح ٹھہرا۔ ان دونوں کی تفصیلات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے یہ تمام تفصیلات اس لیے کھول کر بیان کر دی ہیں تاکہ قرآن کریم پڑھنے والوں اور اس سے راہنمائی حاصل کرنے والوں کو یہ سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئے کہ قرآن کریم کی دعوت کیا ہے اور اس کے ماننے والوں کا سیرت و کردار کیسا ہوتا ہے اور مشرکین کی الجھنیں کیا ہیں اور ہر دور میں ان کا انجام کیا ہوا ان دونوں باتوں کے واضح ہو جانے کے بعد کسی بھی قرآن کریم کے طالب علم کے لیے ہدایت و ضلالت کے حوالے سے فیصلہ کرنا اس قدر آسان ہو گیا ہے کہ اب اس فیصلہ سے صرف وہی محروم رہ سکتا ہے جس نے اپنی آنکھوں پر تعصب کی پٹی باندھ رکھی ہو اور یا وہ ہوائے نفس کا شکار ہو گیا ہو کیونکہ جو آدمی بھی نفس کی خواہشات کو اپنے راہنما بنا لیتا ہے اس کے لیے کسی بھی صحیح بات کو قبول کرنا اور خیر و شر میں تمیز کرنا سب سے مشکل کام ہو جاتا ہے۔

آنے والی آیت کریمہ میں شرک کی تردید کے ساتھ ساتھ اس سے پیدا ہونے والے نتائج اور اس کی ہمہ گیری کو ایک نئے پہلو سے نہایت موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ (روح القران۔ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

آیت مبارکہ :

قُلۡ اِنِّیۡ نُہِیۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ؕ قُلۡ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَہۡوَآءَکُمۡ ۙ قَدۡ ضَلَلۡتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُہۡتَدِیۡنَ ○56

لغۃ القرآن : [قُلْ : فرما دیجئے] [اِنِّیْ : یقینا میں] [نُھِیْتُ : میں روکا گیا ہوں] [اَنْ : یہ کہ] [اَعْبُدَ : میں عبادت کروں] [الَّذِیْنَ : ان لوگوں] [تَدْعُوْنَ : تم پکارتے ہو] [مِنْ : سے] [دُوْنِ : علاوہ] [اللّٰهِ: اللہ] [قُلْ : فرمادیجیے] [لَّآ : نہیں] [اَتَّبِعُ : میں پیروی کرتا] [اَهْوَآءَكُمْ : خواہشات تمہاری] [قَدْ : تحقیق] [ضَلَلْتُ : میں گمراہ ہوا] [اِذًا : اس وقت] [وَّمَآ اَنَا : اور نہیں میں] [مِنَ : سے] [الْمُهْتَدِيْنَ : ہدایت پانے والے]

ترجمہ : فرمادیجئے کہ مجھے اس بات سے روک دیا گیا ہے کہ میں ان (جھوٹے معبودوں) کی عبادت کروں جن کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے ہو۔فرمادیجئے کہ میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کر سکتا اگر ایسے ہو تو میں یقیناً بہک جاؤں اور میں ہدایت یافتہ لوگوں سے (بھی) نہ رہوں (جو کہ ناممکن ہے)

تشریح:

اس آیت کریمہ میں دو دفعہ قُلْ کا لفظ آیا ہے جو اس بات کا قرینہ ہے کہ جو کچھ اس آیت کریمہ میں فرمایا جارہا ہے وہ مشرکین مکہ کے سوالات ' شبہات 'اعتراضات اور مطالبات کے جواب میں فرمایا جارہا ہے قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ عام طور پر معترضین کے سوالات و شبہات کا ذکر نہیں کرتا 'البتہ ! اس کے جواب سے ایک گہری نظر رکھنے والا سمجھ لیتا ہے کہ یہ کسی سوال کا جواب ہے یا محض براہ راست ایک ہدایت ہے۔ چنانچہ گزشتہ آیات کے ہم جب پس منظر کو دیکھتے ہیں 'جس میں مسلسل عقائد پر بحث ہو رہی ہے اور توحید کو بطور خاص دلائل سے مدلل کیا جارہا ہے تو جب ہم آیت نمبر ۱۴ پر پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ آپ مخالفت کے اس ہجوم اور انکار کرنے والوں کے طوفان میں استقامت کی تصویر بن کے کھڑے ہو جائیں اور ان کے سامنے دوٹوک اعلان کردیں کہ تم میری دعوت کو قبول کرو یا نہ کرو اور شرک کو چھوڑو یا نہ چھوڑو لیکن مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام کا

اعلان کروں۔ اور سب سے پہلا مسلمان بن کر کھڑا ہو جاؤں تاکہ لوگ میری استقامت کو دیکھتے ہوئے میری دعوت کو قبول کرنے کا شاید حوصلہ کر سکیں اور مزید یہ بھی فرمایا گیا کہ مجھے اس بات کا بھی حکم دیا گیا ہے کہ میں مشرکین کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھوں اور شرک کی معمولی آلائش بھی مجھے نہیں لگنی چاہیے۔ چنانچہ اس آیت کریمہ میں اسی بات کو اسی تسلسل میں ایک نئے پہلو سے ارشاد فرمایا جارہا ہے (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

اللہ کا استحقاق عبادت اور اس کی شان علم غیب

پیچھے آیت 14 کے تحت گزر چکا کہ کفار مکہ نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دعوت دی کہ آپ بھی ان کی طرح آباء قریش کے خداؤں کی پرستش کیا کریں۔ ان کے اسی مطالبہ کے جواب میں یہاں نہیں بات کہی جارہی ہے کہ آپ فرمادیں مجھے میرے رب نے تمہارے جھوٹے خداؤں کی پرستش سے پہلے ہی روک رکھا ہے یعنی میری طبیعت ہی ایسی رکھی گئی ہے کہ میں اللہ کے سوا کسی کی عبادت کر ہی نہیں سکتا اور اگر میں بالفرض کسی اور کی عبادت کروں تو میں گمراہی میں جاپڑوں گا جب کہ اللہ نے مجھے خلق خدا کو گمراہی سے نکال کر راہ ہدایت پر ڈالنے کے لیے بھیجا ہے۔ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صراط مُّسْتَقِيْمٍ۔

قرآن میں غیر اللہ کی دعا سے ممانعت سے مراد غیر اللہ کی عبادت ہے

قرآن مجید میں کئی جگہ غیر اللہ کی دعا سے روکا گیا ہے اور وہاں دعا بمعنی عبادت ہے جیسے۔ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۔ "اور اللہ کے سوا اس کی عبادت نہ کرو جو تمہیں نفع دے سکتا ہے نہ نقصان"۔ (یونس۔ 106)۔ وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا "مساجد اللہ کے لیے ہیں تو تم اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجو" (جن۔ 18)۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ۔ "جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو وہ تمہاری طرح اللہ کے بندے ہیں"۔ (اعراف : 194)۔ مگر نجدی لوگ ان آیات میں دعا کا معنی پکارنا لیتے ہیں، اس سے دلیل پکڑ کر وہ کہتے ہیں کہ ثابت ہوا یا رسول اللہ یا غوث اور یا علی وغیرہ پکارنا شرک ہے اور حرام ہے کیوں کہ قرآن صرف اللہ کے پکارنے کا حکم فرمارہا ہے۔

مگر یہ استدلال غلط ہے اور ان آیات میں دعا بمعنی عبادت ہے۔ اس کی دلیل میں یہ زیر بحث آیت ہے۔ کیونکہ قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ میں اعبد کے بعد تدعون بتارہا ہے کہ تدعون بمعنی تعبدون ہے۔ معنی یہ ہوا کہ جن خداؤں کو تم پوجتے ہو میں انھیں نہیں پوجتا۔ یہ اسی طرح ہے جیسے فرمایا گیا ہے لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (کافرون۔ 2) اس سے معلوم ہوا کہ غیر اللہ کی دعا سے جہاں رکھا گیا ہے وہاں دعا بمعنی عبادت اور پوجنا ہے یعنی کسی کو الہ اور معبود سمجھ کر پکارنا۔ کیونکہ یہ اس کی عبادت کے معنی میں ہے، اسی معنی میں کفار عرب اپنے بتوں کو پکارتے تھے، یعنی انھیں مستقل نفع رساں جانتے تھے۔ کیونکہ وہ انھیں اللہ کی خدائی میں شریک جانتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ تنہا ایک اللہ ساری خدائی کو نہیں چلا سکتا، اسے نائبین کی ضرورت ہے۔ اسی لیے انھوں کہا: اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ښ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ

عُجَابٌ۔ "اس شخص نے (حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے) کئی خداؤں کی جگہ ایک خدا بنالیا ہے؟ یہ تو بہت عجیب بات ہے"۔ (ص۔5)
تو اسی مفہوم میں وہ اپنے جھوٹے خداؤں کو پکارتے تھے اور یہ ان کی پرستش تھی۔ اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ قرآن میں کثیر مقامات پہ دعاء کے ساتھ الہ کا لفظ بولا گیا ہے۔ جیسے:
فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ۔ "اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو مت پوجو، ورنہ تم عذاب یافتہ لوگوں میں سے ہو جاؤگے۔ "شعراء۔213)
وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۔ "اور اللہ کے ساتھ کسی معبود کو مت پوجو اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے"۔ (قصص۔8)
لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ۔ "ہم اللہ کے سوا کسی معبود کو نہیں پوجیں گے، تب تو ہم ناحق بات کہیں گے"۔ (کہف۔14)
وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۔ "اور جو شخص اللہ کے سوا کسی اور کو پوجے، جبکہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تو اس کا حساب اللہ کے پاس ہے۔ "(مومنون۔117)۔
وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۔ "اور جو لوگ اللہ کے سوا کسی دوسرے معبود کو نہیں پوجتے۔ "(فرقان۔68)
یہ آیات اور اس مفہوم کی دیگر کثیر آیات بتارہی ہیں کہ قرآن میں جہاں اللہ کے سوا کسی کو پکارنے سے روکا گیا ہے وہاں معبود سمجھ کر بمعنی پکارنا مراد ہے اور یہ اس کی عبادت کرنے کے مترادف ہے لہٰذا ان مقامات پر دعا کا معنٰی عبادت کرنا ہی صحیح ہے۔
رہ گیا مسلمانوں کا یارسول اللہ اور یا علی وغیرہ کہنا تو معاذاللہ کوئی مسلمان رسولللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت علی (رض) یا کسی نبی ولی کو ہر گز معبود نہیں مانتا نہ ان کو مستقل نفع رساں جانتا ہے نہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اللہ ان کا محتاج ہے اور ان کے بغیر اللہ کا نظام قدرت نہیں چل سکتا جیسا کہ کفار عرب سمجھتے تھے۔ (برہان القرآن القران۔علامہ قاری محمد طیب صاحب)

بتوں کی عبادت کا خلاف عقل ہونا

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ ہم آیات کی تفصیل کرتے ہیں 'تاکہ حق ظاہر ہو اور مجرموں کا راستہ واضح ہو جائے اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے راستہ پر چلنے سے منع فرمایا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ مشرکین صرف اپنی خواہش اور اپنے باپ دادا کی اندھی تقلید کی وجہ سے بتوں کی عبادت کر رہے ہیں 'کیونکہ یہ بت محض جمادات اور پتھر ہیں جو انسان سے بہت کم درجہ کے ہیں 'جبکہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اشرف کا ارذل کی عبادت کرنا عقل اور درایت کے منافی ہے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ ان مشرکین کا بتوں کی عبادت کرنا ہدایت کے خلاف ہے اور ان کی خواہش پر مبنی ہے۔ اس لیے فرمایا کہ آپ کہئے کہ مجھے ان کی عبادت کرنے سے منع کیا گیا ہے 'جن کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے ہو 'آپ کہئے کہ میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کرتا۔ (اگر بالفرض میں نے ایسا کیا) تو میں گمراہ ہو جاؤں گا۔

غیر اللہ کو پکارنے میں مشرکوں اور مسلمانوں کا فرق

اس آیت میں "تدعون من دون اللہ" فرمایا ہے اور دعا کا معنی ہے طلب نفع یا دفع ضرر کے لیے ندا کرنا 'لیکن مشرکیں اپنی مہمات اور مشکلات میں بطور عبادت ان بتوں کو ندا کرتے تھے۔ اس لیے یہاں دعاء کا معنی عبادت ہے 'کیونکہ وہ ان بتوں کی عبادت کرتے تھے اور اس کا عقیدہ تھا کہ یہ بت نفع پہنچانے اور ضرر دور کرنے پر قادر ہیں۔ سوان کا بتوں کو پکارنا دراصل ان کی عبادت کرنا تھا 'اس لیے ہم نے یہاں دعا کا معنی پرستش اور عبادت کیا ہے اور حدیث میں بھی دعا کو عبادت فرمایا ہے۔

حضرت نعمان بن بشیر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دعا کرنا ہی عبادت ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی تمہارا رب فرماتا ہے! مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا 'بیشک جو لوگ میری عبادت کرنے سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب ذلت سے جہنم میں داخل ہوں گے۔ (المومن: ٦٠) ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(سنن الترمذی 'ج ۵ 'رقم الحدیث: ٣٣٨٣ 'سنن ابوداؤد 'ج ١ 'رقم الحدیث: ١٤٧٩ 'سنن ابن ماجہ 'ج ٢ 'رقم الحدیث: ٣٨٢٨ ' صحیح ابن حبان 'ج ٣ 'رقم الحدیث: ٨٩٠ 'مسند احمد 'ج ٤ 'ص ٢٦٧ 'المستدرک 'ج ٤ 'ص ٤٩١۔ ٤٩٠ 'الادب المفرد 'رقم الحدیث: ' ٧١٤ 'مصنف ابن ابی شیبہ 'ج ١٠ص ٢٠٠ 'حلیۃ الاولیاء 'ج ٨ ص ١٢٠ 'شرح السنہ 'ج ٣ 'رقم الحدیث: ١٣٧٨)

بعض مسلمان اپنی مشکلات اور مہمات میں یا علی مدد اور یا غوث الاعظم المدد کہتے ہیں 'افضل اور اولی تو یہی ہے کہ یا اللہ کہا جائے۔ اللہ کو پکارا جائے اور اس سے مدد طلب کی جائے 'لیکن ان مسلمانوں کی اس ندا سے غرض یہ ہوتی ہے کہ یہ اولیاء کرام 'اللہ تعالیٰ کی مدد کے مظہر ہوتے ہیں اور اللہ کی اجازت سے تصرف کرتے اور لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی یہ ندا شرک نہیں ہے۔ اسی طرح بعض شعراء کی نعتوں اور منقبتوں میں بھی یا رسول اللہ اور یا غوث اعظم کے الفاظ ہوتے ہیں 'یہ کلمات ذوق وشوق اور محبت سے کہے جاتے ہیں 'یہ بھی شرک نہیں ہے۔ شرک اس وقت ہوگا جب پکارنے والا اس اعتقاد سے پکارے کہ جس کو وہ پکار رہا ہے 'وہ مستقل ہے اور از خود سنتا ہے اور اپنی ذاتی طاقت سے از خود مدد کرتا ہے 'یا وہ اس کو مستحق عبادت سمجھتا ہو اور اس کو بطور عبادت ندا کرے۔ جیسا کہ مشرکین اپنے بتوں کو ندا کرتے تھے۔ مشرکین کے بتوں کو پکارنے اور بعض مسلمانوں کا اولیاء اللہ کو پکارنے میں یہ بنیادی فرق ہے۔ اس وجہ سے مشرکین کا بتوں کو پکارنا شرک نہیں ہے۔

مشرکین ان بتوں کی عبادت کرتے تھے 'اس کے برخلاف مسلمان اللہ کی عبادت کرتے ہیں 'نماز پڑھتے ہیں 'روزے رکھتے ہیں 'اللہ سے دعائیں کرتے ہیں اور "لا الہ الا اللہ" پڑھتے ہیں اور ان کا یہ ظاہر حال اس پر قرینہ ہے کہ وہ اپنی مشکلات میں جس کو پکار رہے ہیں 'اس کو خدا نہیں سمجھتے۔ بلکہ خدا کا مقرب بندہ اور ماذون فی التصرف سمجھتے ہیں۔ تاہم اپنی تمام حاجات اور تمام مشکلات میں صرف اللہ عزوجل کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور ہر چھوٹی اور بڑی چیز کا صرف اس سے سوال کرنا چاہیے اور صرف اسی سے مدد طلب کرنی چاہیے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ابن عباس (رض) کو یہ نصیحت فرمائی تھی کہ جب تم سوال کرو تو صرف اللہ سے سوال کرو اور جب تم مدد چاہو تو صرف اللہ سے مدد چاہو۔

(سنن ترمذی ٬ج ۴ ٬رقم الحدیث : ٬۲۵۲۴ ٬مسند احمد ٬ج ا ٬ص ۳۰۷ ٬۳۰۳ ٬۲۹۲ ٬طبع قدیم ٬مسند احمد ٬ج ۳ ٬رقم الحدیث : ٬۲۶۶۹ ٬ دارالحدیث قاہرہ ٬علامہ احمد شاکرنے کہااس کی سند صحیح ہے۔ مسند ابویعلی ٬ج ۴ ٬رقم الحدیث : ٬۲۵۵۶ ٬المعجم الکبیر ٬ج ۱۱ ٬رقم الحدیث : ٬ ۱۱۵۶۰ ٬۱۱۴۱۶ ٬۱۱۲۴۳ ٬مسند الشاب ٬رقم الحدیث : ٬۵۴۷ ٬کتاب الدعاللطبرانی ٬رقم الحدیث : ٬۴۱ ٬عمل الیوم واللیلہ لابن السنی ٬رقم الحدیث : ٬۴۲۷ ٬المستدرک ٬ج ۳ ٬ص ۵۴۲ ٬مشکوۃ ٬ص ۴۵۳)

انبیاء (علیہم السلام) اور صالحین کرام کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ اپنی مہمات ٬مشکلات اور تمام حاجات میں صرف اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے اور اسی سے استمداد اور استغاثہ کرتے تھے۔ سو ہمیں بھی ان کے اسوہ حسنہ پر عمل کرنا چاہیے اور اپنی ہر حاجت کا صرف اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا چاہیے ٬اور اسی سے مدد طلب کرنی چاہیے۔ ہاں انبیاء (علیہم السلام) اور صالحین عظام کا وسیلہ پیش کرنا ٬ایک جدا امر ہے۔ اس کے جواز اور استحسان میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے ٬اور جب مقربین بارگاہ صمدیت کے وسیلہ سے دعا کی جائے گی ٬تو اس کا مقبول ہونا زیادہ متوقع ہوگا۔
(تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

پیغمبر کبھی باطل کی پیروی نہیں کر سکتا

گزشتہ آیت میں وہ چیزیں بیان ہوئیں جو مومنین سے کہنے کے لائق ہیں۔ اس رکوع میں ان امور کا تذکرہ ہے جو مجرمین و مکذبین کے حق میں قابل خطاب ہیں۔ یعنی آپ فرمادیجئے کہ میرا ضمیر، میری فطرت، میری عقل، میرا نور و شہود اور وحی الٰہی جو مجھ پر اترتی ہے، یہ سب مجھ کو اس سے روکتے ہیں کہ میں توحید کامل کے جادہ سے ذرا بھی قدم ہٹاؤں۔ خواہ تم کتنے ہی حیلے اور تدبیریں کرو میں کبھی تمہاری خوشی اور خواہش کی پیروی نہیں کر سکتا۔ (تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی)

آیت مبارکہ:

قُلۡ اِنِّیۡ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّیۡ وَ کَذَّبۡتُمۡ بِہٖ ؕ مَا عِنۡدِیۡ مَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ بِہٖ ؕ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ یَقُصُّ الۡحَقَّ وَ ہُوَ خَیۡرُ الۡفٰصِلِیۡنَ ○57

لغۃ القرآن: [قُلْ : فرمادیجیے] [اِنِّيْ : بیشک میں] [عَلٰي : پر] [بَيِّنَةٍ : دلیل] [مِّنْ : سے] [رَّبِّيْ : اپنے رب] [وَكَذَّبْتُمْ : اور تم نے جھٹلایا] [بِهٖ: اسے] [مَا عِنْدِيْ : جو میرے پاس] [مَا : جو] [تَسْتَعْجِلُوْنَ : تم جلدی کرتے ہو] [بِهٖ: ساتھ اس کے] [اِنِ : نہیں] [الْحُكْمُ : حکم] [اِلَّا : مگر] [لِلّٰهِ: اللہ کیلئے] [يَقُصُّ : وہ بیان کرتا ہے] [الْحَقَّ : حق] [وَهُوَ : اور وہ] [خَيْرُ : بہتر] [الْفٰصِلِيْنَ : فیصلہ کرنے والا ہے]

ترجمہ: فرمادیجئے: (کافرو!) بیشک میں اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر (قائم) ہوں اور تم اسے جھٹلاتے ہو۔ میرے پاس وہ (عذاب) نہیں ہے جس کی تم جلدی مچارہے ہو۔ حکم صرف اللہ ہی کا ہے۔ وہ حق بیان فرماتا ہے اور وہی بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے

تشریح:

رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کام اللہ کا پیغام کھول کر بیان کرنا ہے

اس آیت کریمہ میں نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کہ میں تمہاری اصلاح کے لیے اللہ کی طرف سے پیغمبر بن کے آیا ہوں اور تمہاری زندگی کی راہنمائی کے لیے اس نے مجھ پر جو کتاب اتاری ہے میں وہ بلا کم وکاست تم تک پہنچا رہا ہوں اور تمہاری ہدایت واصلاح کے لیے جو کوشش بھی مجھ سے ممکن ہے "میں اپنی ہمت سے بڑھ کر اسے ادا کر رہا ہوں۔ گویا میرے اور تمہارے درمیان جو معاملہ چل رہا ہے وہ یہ ہے کہ تمہارے عقائد تمہارے معاملات اور تمہارے اخلاق میں جو فساد پیدا ہو چکا ہے میں اس نسخہ کیمیا سے کام لے کر جو اللہ نے مجھ پر اتارا ہے تمہاری اصلاح کی کوشش کر رہا ہوں۔ اب ہونا تو یہ چاہیے کہ اس دعوت و تبلیغ یا اصلاح وہدایت کے عمل میں تمہیں کسی بات پر اعتراض ہے یا تمہیں کوئی بات سمجھ نہیں آرہی تو سنجیدگی سے اسے پیش کرو میں پوری متانت اور توجہ سے اسے واضح

کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ میں تمہیں یہ کہتا ہوں کہ اپنی زندگی کی اصلاح کر لو اس سے تمہاری دنیا بھی بہتر ہو جائے گی اور آخرت میں بھی کامیاب و کامران ٹھہرو گے۔ تم بجائے میری بات پر توجہ دینے کے مجھ سے عذاب کا مطالبہ کرنے لگتے ہو اور کبھی نئی نئی نشانیاں دیکھنا چاہتے ہو حالانکہ کسی بات کو سمجھنے یا اس کو باور کرنے کے لیے بینات اور دلائل کی ضرورت ہوتی ہے میں تمہارے سامنے ایک سے ایک بڑھ کر بینہ پیش کر چکا ہوں۔ حتیٰ کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرے پیغمبر ہونے اور میری دعوت و تبلیغ کے برسر حق ہونے کی سب سے بڑی گواہی خود اللہ کی ذات ہے۔ اس نے اپنی یہ گواہی قرآن کریم کی صورت میں پیش فرمائی ہے اور یہ بات بھی دلائل سے واضح ہو چکی کہ قرآن کریم کے منزل من اللہ ہونے میں کوئی عقل کا اندھا ہی شک کر سکتا ہے۔ اب بجائے اس بینہ کو قبول کرنے اور اس پر غور کرنے کے تم نے صاف صاف اسے ماننے سے انکار کر دیا اور جب بینہ ہی قابل تسلیم نہ ٹھہرا تو جس کے ثبوت کے لیے وہ بینہ آیا ہے وہ خود قابل تسلیم کیسے ٹھہرے گا۔ اس لیے تم نے میری یعنی اللہ کے رسول کی تکذیب کر دی اور بار بار عذاب کا مطالبہ کرنے لگے کہ اگر تم واقعی اللہ کے نبی ہو تو اللہ کا عذاب ہمیں دکھاؤ اور تم اتنی بات نہیں سمجھتے کہ عذاب تو تباہی اور ہلاکت کا ذریعہ ہے اس کے آ جانے کے بعد مہلت عمل ختم ہو جاتی ہے اور یہ عذاب قوم کی کمر توڑ کے رکھ دیتا ہے۔ لیکن تم نے اسے ایک مذاق سمجھ رکھا ہے اور بار بار اس کا مطالبہ کر رہے ہو اگر تم اس بات پر غور کرو تو شاید تمہیں اپنی نا معقولیت کا خود ہی احساس ہونے لگے۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

کفار کا ایک مطالبہ یہ تھا کہ اگر قرآن مجید سچی کتاب ہے تو ہمارے انکار پر اللہ تعالیٰ ہم پر آسمان سے پتھر برسائے یا کوئی اور دردناک عذاب ہم پر مسلط کرے۔ (قرآن : 8:32) اس پر اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم فرمایا : ان کفار کو کہہ دو کہ جس عذاب کا تم مطالبہ کر رہے ہو اس کا اختیار میرے پاس نہیں ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے حکم پر منحصر ہے چاہے تو کسی ظالم کو جلدی سزا دے دے اور چاہے تو اس کی ساری سزا آخرت کے لیے موخر کر دے لیکن اگر اس کا اختیار میرے پاس ہوتا تو میں تمہارے مطالبے پر یہ معجزہ دکھا کر اسی وقت فیصلہ فرما دیتا مگر اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کسی ظالم کو کس وقت سزا دینا ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی ہے کہ ان کے سامنے حق بیان کر دیا جائے اور عذاب نازل نہ کیا جائے۔

اس کی ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر میرے پاس حضرت موسیٰ اور حضرت نوح جیسا جلال ہوتا تو اب تک تم پر عذاب آ چکا ہوتا مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ (قرآن : 21:107) اس لیے میں نزول عذاب کی دعا مانگنے والا نہیں ہوں۔ اس کی تائید میں درج ذیل احادیث ملاحظہ ہوں : (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

بعض احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ نہیں چاہتے تھے کہ کفار پر عذاب نازل ہو ' جیسا کہ حسب ذیل حدیث سے واضح ہوتا ہے۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زوجہ حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا ' یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا آپ پر کوئی ایسا دن آیا جو جنگ احد سے زیادہ شدید تھا؟ آپ نے فرمایا مجھے تمہاری قوم سے بہت زیادہ تکلیف پہنچی اور سب سے زیادہ تکلیف وہ تھی جو مجھے یوم عقبہ کو پہنچی۔ جب میں نے اپنے آپ کو ابن عبد یالیل بن عبد کلال پر پیش کیا (یعنی اس کو دعوت اسلام دی) لیکن اس نے وہ چیز قبول نہیں کی جو میں چاہتا تھا۔ پس میں غم زدہ ہو کر واپس چلا آیا ' اور قرن ثعالب پر پہنچ کر مجھے افاقہ ہوا ' اچانک میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو مجھ پر ایک بادل نے سایہ کیا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا اس میں جبرائیل تھے ' انھوں نے مجھے آواز

دی اور کہا آپ نے اپنی قوم سے جو کچھ کہا تھا ' وہ اللہ تعالیٰ نے سن لیا اور جو انھوں نے آپ کو جواب دیا ' وہ بھی سن لیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف پہاڑوں کا فرشتہ بھیجا ہے ' تاکہ آپ اس کو ان کفار کے متعلق جو چاہیں ' حکم دیں۔ حضور نے فرمایا پھر پہاڑوں کے فرشتہ نے مجھے آواز دی اور مجھے سلام کیا۔ پھر کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم کا جواب سن لیا اور میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں اور مجھے آپ کے رب نے آپ کے پاس اس لیے بھیجا ہے ' تاکہ آپ مجھے جو چاہیں حکم دیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں ان دونوں پہاڑوں کو ان پر بچھا دوں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بلکہ مجھے یہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں سے ان لوگوں کو پیدا کرے گا جو صرف اللہ کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔ (صحیح مسلم ' جہاد ' ۱۱۱ ' (۱۷۹۵) ۴۵۷۲ ' صحیح البخاری ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ۳۲۳۱ ' سنن کبری للنسائی ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ۷۷۰۶)

اس آیت میں اور اس حدیث میں اس طرح موافقت ہے کہ آیت میں کفار کی طرف سے عذاب کے مطالبہ پر عذاب نازل کرنے کا ذکر ہے اور حدیث میں کفار کی طف سے عذاب کے مطالبہ کا ذکر نہیں ہے ' بلکہ پہاڑوں کے فرشتے کی اس خواہش کا ذکر ہے کہ کفار پر عذاب نازل کیا جائے جس کے جواب میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مجھے امید ہے کہ ان کی پشتوں سے ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو اللہ کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ شرک نہیں کریں گے۔ (تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

1۔ ایک دفعہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کا فرشتہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں بھیجا کہ اگر آپ حکم دیں تو اس ساری بستی کو پہاڑوں کے درمیان کچل دیا جائے مگر آپ نے فرمایا: ”نہیں بلکہ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسلوں سے ایسے عبادت گزار پیدا فرمائے گا جو صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ ” (بخاری: کتاب بدء الخلق : باب 7)

(2) حضرت ابوہریرہ (رض) روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا گیا کہ آپ مشرکین کے خلاف دعا مانگیں تو آپ نے فرمایا: مجھے لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا بلکہ مجھے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ (مسلم: کتاب البر: باب 24)

(54) کسی چیز کے بارے میں حکم کا حقیقی اختیار تو صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی اور کا حکم نہ مانا جائے بلکہ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو حکم کا اختیار دے رکھا ہے ان کا حکم ماننا اور اطاعت کرنا بھی واجب ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان کی جو تم میں سے حکمران ہیں۔ ” (قرآن: 59:4) نیز ان کا حکم الٰہی اور ان کی اطاعت اطاعت خداوندی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ”جس نے رسول کی اطاعت کی تو یقیناً اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ ” (قرآن: 80:4) (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

یعنی اے حبیب! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، آپ فرمائیں کہ میں تو اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کی طرف سے روشن دلیل پر ہوں اور مجھے اس کی معرفت حاصل ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں جبکہ تم اس کے ساتھ اوروں کو شریک کرکے اسے جھٹلاتے ہو۔ یہاں روشن دلیل قرآن شریف، معجزات اور توحید کے واضح دلائل سب کو شامل ہیں۔

{مَا عِنۡدِیۡ مَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ بِهٖ: جس کی تم جلدی مچا رہے ہو وہ میرے پاس نہیں۔} چونکہ کفار مذاق اڑانے کیلئے حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا کرتے تھے کہ ہم پر جلدی عذاب نازل کرائیے، اس آیت میں انھیں جواب دیا گیا اور ظاہر کر دیا گیا کہ حضور پرنور (صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم) سے یہ سوال کرنا نہایت غلط ہے کیونکہ عذاب نازل کرنا اللہ عَزَّوَجَلَّ کا کام ہے، تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نہیں۔ ہاں اگر سرکارِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کیلئے دعا کر دیں تو بات جدا ہے جیسے حضرت نوح (علیہ السلام) سے دعا سے قوم نوح تباہ ہوئی اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے دعا سے فرعون اور اس کی قوم تباہ ہوئی اور دیگر انبیاء کرام (علیہ السلام) کی دعاؤں سے ان کی قومیں تباہ ہوئیں ایسے ہی حبیب کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعا سے کفار مکہ بھی برباد ہو جاتے۔ اگلی آیت میں مزید فرمایا کہ اے حبیب! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم فرماؤ اگر وہ عذاب میرے پاس ہوتا جس کی تم جلدی مچا رہے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان معاملہ ختم ہو چکا ہوتا اور میں تمہیں ایک لمحے کی مہلت نہ دیتا اور تمہیں رب عَزَّوَجَلَّ کا مخالف دیکھ کر بے دریغ ہلاک کر ڈالتا، لیکن اللہ تعالیٰ حلیم و کریم ہے وہ سزا دینے میں جلدی نہیں فرماتا تو اس کی بارگاہ میں رجوع کرو، نہ کہ اس کے حلم و کرم کی وجہ سے جَری ہو جاؤ۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری))

ایسا کیوں تھا؟

دراصل کفار عرب جب دلائل توحید کے سامنے بے بس ہو جاتے تو کہتے اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر آپ کا رب اتنی ہی طاقتوں والا ہے تو اسے کہیں ہم پر عذاب لے آئے۔ چنانچہ انھوں نے کہا: اِنۡ كَانَ هٰذَا هُوَ الۡحَقَّ مِنۡ عِنۡدِكَ فَاَمۡطِرۡ عَلَيۡنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ۔ (انفال۔ 32) اس کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ آپ کہہ دیں اے منکرو! میرے پاس میرے رب کی طرف سے کھلی دلیل ہے یعنی قرآن، اسے تم جھٹلاتے ہو اور اس پر غور کرنے کی بجائے عذاب کا مطالبہ کرتے ہو۔ میرے پاس عذاب نہیں ہے اس کا اختیار اللہ کے پاس ہے کیونکہ ہر حکم کا مالک اللہ ہے اللہ ہی ہر قوم کے بارے میں بہتر فیصلہ کرنے والا ہے کہاں سے نوازا جائے یا عذاب دیا جائے اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمۡ وَاَنۡتَ فِيۡهِمۡ ۔ "اے پیارے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! جب تک آپ ان میں ہیں اللہ انھیں عذاب دینے والا نہیں"۔ (انفعال۔ 33)۔

اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ سے معلوم ہوا حاکمیت کا حق صرف اللہ کا ہے۔ ہر حاکم قاضی اور افسر پر لازم ہے کہ اللہ ہی کا حکم نافذ کرے اس کے خلاف کسی حاکم کے حکم کی اطاعت جائز نہیں حتیٰ کہ والدین کا حکم بھی نہیں چل سکتا۔ (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

فوائد

ا: روشن دلیل سے نور نبوت، نور قرآن، معرفت الٰہی مراد ہے۔ حضور ہمیشہ سے اس نور پر تھے اور دوسروں کے لیے حضور خود دلیل ہیں اسی لیے رب نے انھیں برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب و نور کہا۔ فرماتا ہے۔ قد جاء کم برھان من ربکم۔ رب کی برہان حضور ہی تو ہیں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔

۲: یعنی عذاب الٰہی میرے پاس اور مستقل طور پر میرے قبضے میں نہیں ورنہ اب تک تم پر عذاب آگیا ہوتا کیونکہ میں خدا کے مجرموں کو مہلت نہ دیتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ نبی کی بددعا سے بھی عذاب نہیں آتا۔ وہ بعطاء الٰہی رب کی جنت و دوزخ کے مختار ہیں۔ حضرت ربیعہ نے حضور نے حضور سے عرض کیا تھا کہ میں آپ سے جنت مانگتا ہوں۔ حضور نے اعلان فرمایا تھا کہ جو بیر رومہ خرید کر وقف کر دے اسے کوثر دوں گا۔ یا یہ مقصد ہے کہ تم مجھ سے عذاب مانگتے ہو مگر میرے پاس صرف رحمت ہی رحمت ہے عذاب نہیں۔ میں رحمت والا نبی ہوں۔ وما ارسلناك الا رحمة اللعلامین۔

۳: یعنی حقیقی حکم رب کا ہی ہے بادشاہ حاکم، قاضی، ولی پیغمبر کے احکام رب کی عطا سے ہیں۔ اس میں عطا کی نفی نہیں۔ رب فرماتا ہے۔ اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔ اگر خدا کے سوا کسی کا حکم نہ ہوتا تو نبی کی عالم، بادشاہ کی اطاعت کیسے واجب ہوتی ہے۔

آیت مبارکہ :

قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ○58

لغۃ القرآن : [قُلْ : فرمادیجیے] [لَّوْ : کاش] [اَنَّ : بیشک] [عِنْدِيْ : میرے پاس] [مَا : جو] [تَسْتَعْجِلُوْنَ : تم جلدی طلب کر رہے ہو] [بِهٖ : اسکے ساتھ] [لَقُضِيَ : البتہ فیصلہ کردیاجاتا] [الْاَمْرُ : کام] [بَيْنِيْ : میرے درمیان] [وَبَيْنَكُمْ: اور تمہارے درمیان] [وَاللّٰهُ : اور اللہ] [اَعْلَمُ ؛ بہت جانتا ہے] [بِالظّٰلِمِيْنَ : ظالموں کو]

ترجمہ : (ان سے) فرمادیں: اگر وہ (عذاب) میرے پاس ہوتا جسے تم جلدی چاہتے ہو تو یقیناً میرے اور تمہارے درمیان کام تمام ہوچکا ہوتا۔ اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے

تشریح:

ذرا کلام الٰہی پر غور کرو۔ بارہا ایسا ہوتا ہے انسان بعض دوسرے انسانوں سے ایسے امور دیکھتا ہے کہ اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو جاتا ہے اور اس کی قوت برداشت جواب دے جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں دیکھو کہ انسان اللہ کی نافرمانی کرتا چلا جاتا ہے لیکن وہ پھر بھی اللہ کی زمین پر رہتے ہیں 'وہ اللہ کھانا وپینا فراہم کرتا ہے 'ان پر بارش برساتا ہے 'ان کے لیے ہر طرف سے فراوانی کے دروازے کھول دیتا ہے اور اس کے لیے اس کے سوا کوئی اور چارہ ہی نہیں رہتا کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق (رض) کی بات کو دہرائے۔ ایک بار وہ معرکہ جنگ میں تھے۔ معرکہ اس قدر گرم تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہ دیتا تھا اور کفار نے فیصلہ کن حملہ کیا ہوا تھا۔ ہر طرف سے بزن کا عالم تھا۔ آپ نے فرمایا: "اے اللہ آپ کس قدم حلیم اور بردبار ہیں! اے اللہ آپ کس قدر حلیم و بردبار ہیں۔ غرض یہ اللہ کا حلم اور بردباری ہی ہے کہ نافرمانوں کو مہلت دیئے جارہی ہے۔
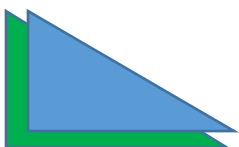
(آیت) "وَاللّٰہُ أَعْلَمُ بِالظَّالِمِیْنَ (58)

" اور اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ ظالموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جانا چاہیے ؟"۔ وہ جانتے ہوئے مہلت دیتا ہے۔ وہ حکمت کے ساتھ انھیں ڈھیل دیتا ہے اور علیم بھی ہے اور قدرت بھی رکھتا ہے کہ ان کے مطالبے کو بھی پورا کر دے اور انھیں سخت عذاب سے بھی دوچار کر دے۔"

بات یہ ہو رہی تھی کہ اللہ ظالموں کے بارے میں خوب جانتے ہیں 'اور یہ کہ حقیقت الوہیت اور شان کبریائی کیا ہے 'اس مناسبت سے یہاں شان کبریائی کے ایک وسیع تر میدان ان کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور یہ وسیع تر میدان عالم غیب ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اللہ کا علم تمام خفیہ باتوں پر محیط ہے۔ یہاں اللہ کے علم کی وسعت کی عجیب اور منفرد تصور کشی کی جاتی ہے اور اس میدان میں اللہ کے علم کی وسعتوں کی طرف دور تک راہوار خیال کو گامزن کیا جاتا ہے۔ (فی ظلال القرآن۔)

اس آیت کریمہ میں علمی نکات تو کئی ہیں۔ لیکن بطور خاص دو باتوں کو نمایاں کیا گیا ہے ایک یہ بات کہ تم جو بار بار مجھ سے عذاب کا مطالبہ کرتے ہو اور اس کی جلدی مچا رہے ہو تم نے شاید اس بات پر غور نہیں کیا کہ اگر یہ اختیار میرے پاس ہوتا کہ میں جب چاہتا تمہیں عذاب سے تباہ کر دیتا تو کچھ معلوم ہے اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ تم اب تک تباہ ہو چکے ہوتے کیونکہ تم نے میری دعوت کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے تم خود بھی اگر غور کرو کہ ایسے سلوک کا نتیجہ کیا ہونا چاہیے تو یقینا تمہیں فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگے گی اس لیے کہ تم خوب جانتے ہو کہ میری ذاتی زندگی برس ہابرس تمہارے سامنے گزری ہے 'تم گواہی دیتے ہو کہ میں نے ایسی پاکیزہ زندگی گزاری ہے جس میں کسی اخلاقی عیب کا کبھی تمہیں سراغ تک نہ مل سکا تم ہمیشہ مجھے الصادق اور الامین کہہ کر پکارتے رہے ہو اور پھر تم یہ بھی جانتے ہو کہ جو کلام میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں اس کا جواب لانا تمہارے بس میں نہیں۔ اگر وہ میرا کلام ہوتا تو میں بھی تمہاری ہی طرح ایک عرب ہوں اور اسی ماحول میں میں نے پرورش پائی ہے اس کلام کا جواب دینے میں تمہیں کبھی دشواری پیش نہ آتی۔ پھر جس طرح میں نے تمہارے ایک ایک دروازے پر دستک دی ہے اور کوئی سی ایسی مشکل نہیں جو اس راستے میں میرے لیے پیدا نہ کی گئی ہو اور میں نے اسے خندہ پیشانی سے برداشت نہ کیا ہو۔ تمہاری گالیاں سن کر میں نے دعائیں دیں 'تم نے مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر اذیتوں کی انتہا کر دی لیکن میں نے کبھی کوئی نالائم جملہ تک تمہارے لیے نہیں کہا۔ تم نے میرے راستے میں کانٹے بچھائے ہیں میرے ساتھیوں کو دہکتے انگاروں پر لٹایا ہے لیکن میں نے ہمیشہ تمہارے سامنے پھول پیش کیے اور تمہیں جنت کا راستہ دکھایا۔ اس پوری کشمکش کا نتیجہ کیا ہونا چاہیے کہ میں تمہاری اذیتوں سے تنگ آ کر تم پر عذاب کے بارے میں سوچنے لگوں کیونکہ بڑے سے بڑے انسان کے صبر کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے اور میں نجانے کب سے اس انتہا کو چھو رہا ہوں۔ ذرا غور کرو اگر یہ عذاب لانا میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمہارے ان مظالم کی وجہ سے کیا تم پر عذاب وارد نہ کر چکا ہوتا اور بہت پہلے میں تمہیں تباہ کر کے اپنے دل کو ٹھنڈا کر چکا ہوتا۔ لیکن یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے عذاب کا اختیار صرف اپنے پاس رکھا ہے '۔

دوسری بات جس کو ذکر کیا جا رہا ہے وہ اسی پہلی بات کا نتیجہ ہے وہ یہ کہ کسی قوم کو مہلت عمل کس حد تک ملنی چاہیے۔ اس کا دارومدار اس بات پر ہے کہ یہ معلوم ہو کہ اس قوم کے لوگوں میں قبولیت ایمان کی استعداد کہاں تک ہے جب تک اس بات کا اچھی طرح یقین نہ ہو جائے قوم کے بارے میں عذاب کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے اگر ان لوگوں میں ایک عنصر ایسا باقی ہو جن میں قبولیت ایمان کی استعداد ابھی تک بالکل ختم نہیں ہوئی اور اس کے سوتے بالکل خشک نہیں ہو گئے اس وقت تک اس پر عذاب لانے کا فیصلہ کرنا یقینا عدل کے تقاضے کے خلاف ہو گا اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ گھی نکالنے کے لیے دودھ کو بلونے والا اس وقت تک بلوتا رہتا ہے جب تک اس دودھ میں گھی کا

آخری حصہ باقی ہوتا ہے اور جب وہ دیکھتا ہے کہ گھی کی آخری تلچھٹ تک نکال لی گئی ہے تو پھر وہ بلونا بند کر دیتا ہے اور اگر وہ اپنے بلونے کے عمل کو پہلے بند کر دے یہ سمجھ کر کہ دودھ لسی بن چکا ہے اسے ضائع کر دے تو یہ اللہ کی نعمت کی ناقدری ہو گی اور ایک غلط عمل ہو گا جس کا جواب دینا پڑے گا۔ اسی طرح ایک پیغمبر جس قوم کی طرف مبعوث ہوتا ہے اس کے ایک ایک فرد پر اس امید کے ساتھ محنت کرتا ہے کہ شاید اس میں قبولیت ایمان کی استعداد کا کوئی سوتا باقی رہ گیا ہو اور میری کوشش سے ممکن ہے وہ کھل جائے اور اس کو اللہ ایمان کی توفیق دے دے۔ اب یہ بات کہ اس نعمت سے وہ قوم آخری حد تک کب محروم ہوتی ہے اس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ چنانچہ یہاں یہی بات فرمائی جا رہی ہے کہ تم جو عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہو۔ قدرت تم پر مہربان ہے وہ تمہیں آخری حد تک قبولیت ایمان کا موقع دینا چاہتی ہے لیکن تم ایسے بدنصیب ہو ' بجائے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے الٹا اس سے لڑ رہے ہو اور اس تاخیر کو اپنے لیے نعمت سمجھنے کی بجائے اللہ کے نبی پر طعن و تشنیع کا ذریعہ بنا رہے ہو۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

مجرموں کا فیصلہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے مطابق فرماتا ہے

یعنی جس پر چاہے جب چاہے اور جس قسم کا چاہے عذاب بھیجے یا نہ بھیجے ویسے ہی توبہ کی توفیق مرحمت فرما دے، یہ سب اللہ کے قبضہ میں ہے۔ کسی کا حکم اور زور اس کے سوا نہیں چلتا۔ وہ دلائل و براہین کے ساتھ حق کو بیان کر دیتا ہے۔ پھر جو نہ مانیں ان کے متعلق بہترین فیصلہ کرنے والا بھی وہی ہے۔ اگر ان کا فیصلہ کرنا یا سزا دینا میرے قبضہ اختیار میں ہوتا اور یہ نزول عذاب میں جلدی چاہنے والے مجھ سے عذاب کا مطالبہ کرتے تو اب تک کبھی کا جھگڑا ختم ہو چکا ہوتا۔ یہ تو خدا ہی کے علم محیط، حلم عظیم، حکمت بالغہ اور قدرت کاملہ کا پر تو ہے کہ بیشمار مصالح و حکم کی رعایت کرتے ہوئے باوجود پوری طرح جاننے اور قدرت رکھنے کے ظالموں پر فوراً عذاب نازل نہیں کرتا۔ آئندہ آیات میں اس کے علم محیط اور قدرت کاملہ کا ذکر ہے تاکہ ثابت ہو کہ تاخیر عذاب جہل یا عجز کی بناء پر نہیں۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زندگی کا سخت دن

حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ سے کہا کہ یا رسول اللہ ! کیا یوم احد سے بھی کوئی شدید دن آپ پر گزرا تو آپ نے فرمایا کہ عائشہ ! تمہاری اس قوم سے سخت ترین تکلیف جو مجھے پہنچی وہ یوم عقبہ میں پہنچی جب کہ میں نے ابن عبد یالیل پر اپنے کو پیش کیا تو میری دعوت اس نے منظور نہیں کی۔ میں نہ آیت غمگین ہو کر چل کھڑا ہوا۔ مقام قرن ثعالب میں آ کر میرے حواس ٹھیک ہوئے اور میں نے سر اٹھایا تو دیکھا کہ ایک ابر میرے اوپر چھایا ہوا ہے اس میں جبرائیل دکھائی دے رہے ہیں اور مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ یا محمد تمہاری قوم نے جو تم سے کہا، اللہ تعالیٰ نے سن لیا۔ ملک الجبال اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف بھیجا ہے تاکہ تم جو چاہو اس کو حکم دو۔ ملک الجبال نے بھی آواز دی اور سلام عرض کیا اور کہا کہ اللہ نے مجھے تمہاری طرف اسی لیے بھیجا ہے کہ اگر تم حکم دو یہ دونوں پہاڑ تمہاری قوم پر گرا دوں۔ تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ میں امید رکھتا ہوں کہ خدا انھیں کافروں کی نسل سے ایسے لوگ بھی پیدا کر دے جو مومن نکلیں اور کسی کو خدا کا شریک نہ ٹھہرائیں۔

سب کا علم اللہ کو ہے

یعنی لوح محفوظ میں ہے۔ لوح محفوظ میں جو چیز ہو گی وہ علم الہٰی میں پہلے ہو گی۔ اس اعتبار سے مضمون آیت کا حاصل یہ ہوا کہ عالم غیب و شہادت کی کوئی خشک وتر اور چھوٹی بڑی چیز حق تعالیٰ کے علم ازلی محیط سے خارج نہیں ہو سکتی۔ بناء علیہ ان ظالموں کے ظاہری و باطنی احوال اور ان کی سزا دہی کے مناسب وقت و محل کا پورا پورا علم اسی کو ہے۔ (تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی)

آیت مبارکہ :

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○59

لغۃ القرآن : [وَعِنْدَهٗ : اور اسکے پاس] [مَفَاتِحُ؛ چابیاں] [الْغَيْبِ : غیب] [لَا : نہیں] [يَعْلَمُهَآ : جانتا انہیں] [اِلَّا : مگر] [هُوَ: وہی] [وَيَعْلَمُ : اور وہ جانتا ہے] [مَا : جو] [فِي : میں] [الْبَرِّ : خشکی] [وَالْبَحْرِ: اور سمندر] [وَمَا : اور جو] [تَسْقُطُ : گرتا] [مِنْ : سے] [وَّرَقَةٍ : پتا] [اِلَّا : مگر] [يَعْلَمُهَا : وہ اسے جانتا ہے] [وَلَا : اور نہ] [حَبَّةٍ : کوئی دانہ] [فِيْ : میں] [ظُلُمٰتِ : اندھیرے] [الْاَرْضِ : زمین] [وَلَا رَطْبٍ : اور نہ تر] [وَّلَا يَابِسٍ : اور نہ خشک] [اِلَّا : مگر] [فِيْ : میں] [كِتٰبٍ : کتاب] [مُّبِيْنٍ : واضح]

ترجمہ : اور غیب کی کنجیاں (یعنی وہ راستے جن سے غیب کسی پر آشکار کیا جاتا ہے) اسی کے پاس (اس کی قدرت و ملکیت میں) ہیں، انھیں اس کے سوا (از خود) کوئی نہیں جانتا، اور وہ ہر اس چیز کو (بلاواسطہ) جانتا ہے جو خشکی میں اور دریاؤں میں ہے، اور کوئی پتّا نہیں گرتا مگر (یہ کہ) وہ اسے جانتا ہے اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی (ایسا) دانہ ہے اور نہ کوئی تر چیز ہے اور نہ کوئی خشک چیز مگر روشن کتاب میں (سب کچھ لکھ دیا گیا ہے)

تشریح:

اللہ کے کامل اور محیط علم کی یہ نہایت خوبصورت تصویر ہے۔ یہ علم اس قدر محیط ہے کہ زمان و مکان کا ایک ذرہ بھی اس سے باہر نہیں ہے۔ زمین و آسمان کی ہر چیز اس کے علم میں ہے۔ بر و بحر کے تمام موجودات اس کے علم کے دائرے کے اندر ہیں۔ فضاؤں اور زمین کی گہرائیوں میں پائے جانے والے تمام ذرات بھی اس کے دائرہ علم کے اندر ہیں۔ خشک و تر اور زندہ و مردہ ہر چیز اس کے علم میں ہے۔

ہمارے اس بیان اور آیت زیر بحث کے اسلوب بیان میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قرآن کا انداز نہایت ہی منفرد ' شامل و کامل ' گہرا و عمیق اور نہایت ہی موثر اور معنی آفریں ہے۔

ہمارا راہوار خیال اس مختصر آیت کے پیچھے سرپٹ بھاگتا ہے۔ ہمارا خیال عالم معلومات اور عالم مجہولات میں گھوڑے دوڑاتا ہے۔ انسان عالم غیب و عالم شہادت پر غور و فکر کرتا ہے تو اس کا وجدان اور مشاہدہ کانپ اٹھتا ہے کہ ہر وادی میں اور ہر طرف اسے مشاہدات و مظاہر کی نئی نئی شکلیں نظر آتی ہیں۔ انسان کی جدوجہد بڑی تیزی سے اپنی تلاش نامعلوم کے لیے جاری ہے۔ وہ غیب کے پردوں کو پھاڑ کر سب کچھ عیاں کرنا چاہتا ہے۔ وہ ماضی اور مستقبل کے تمام پردے ہٹانا چاہتا ہے۔ زمان و مکان کے آفاق اور گہرائیوں میں وہ دور تک جھانکنا چاہتا ہے لیکن وہ جس سمت سے آگے بڑھتا ہے اسے نظر آتا ہے کہ غیب کی چابیاں تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ ایک حد پر جا کر اس کو علم و اکتشافات کے دروازے مقفل نظر آتے ہیں اور آگے کی چابیاں اللہ کے پاس ہیں۔ غرض انسان کا وجدان کائنات کی تاریک وادیوں اور سمندر کی گہرائیوں میں دوڑتا ہے۔ یہ سب جگہیں اللہ کے علم کے زاویے سے عیاں ہیں۔ پھر ہمارا شعور دنیا کے ہر خزاں میں گرنے والے پتوں کی طرف جاتا ہے ' جن کی تعداد سے انسان بے خبر ہیں لیکن اللہ کی آنکھ ایک ایک کو دیکھ رہی ہے کہ کس طرح وہ امر ربی سے گرتا ہے اور اس پوری کائنات میں یہ علم ان پتوں تک وسیع ہے۔ اس کائنات میں اگنے والے بیشمار پودوں سے نکلنے والے چھوٹے چھوٹے بیج اور ان کا ایک ایک دانہ جو ظلمات ارض میں کہیں پڑا ہے وہ بھی اللہ کی نظر میں ہے۔ اس وسیع و عریض کائنات کا ہر خشک و تر اللہ کی نظروں میں ہے اور کوئی بھی چیز علم الہی سے باہر نہیں ہے۔

غرض یہ تصور سر کو چکرا دیتا ہے اور اس سے عقل مبہوت ہو جاتی ہے۔ یہ تصور اور شعور ہمیں تاریخ اور زمانوں کی طوالتوں میں لے جاتا ہے۔ یہ آفاق کائنات کی دوریوں کا تصور دلاتا ہے۔ عالم معلوم اور مشاہد اور عالم غیب اور مجہول کا تصور انسان کرتا ہے تو اس میں ہر طرف وسعت ہی وسعت نظر آتی ہے۔ راہوار خیال تھک کر چور چور ہو جاتا ہے لیکن قرآن کریم کے چند کلمات ان وسعتوں اور دوریوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ یہ ہے قرآن کا اعجاز ' اعجاز عبارت اور اعجاز خیال جس پہلو سے بھی ہم اس مختصر آیت پر نگاہ ڈالیں یہ معجز ہے اور یہ اعجاز ہمیں واضح طور پر اس طرف لے جاتا ہے کہ اس عظیم کلام کا مصدر اور منبع کیا ہے؟

قرآن کریم جو اسلامی تصور حیات کا مصدر اور سرچشمہ ہے اور جس سے اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی ہے ' وہ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ اس کائنات کے دو جہان ہیں ' ایک عالم غیب ہے اور دوسرا عالم مشاہدہ یا عالم شہادت۔ لہذا انسان جس جہان میں رہتا ہے اس کے تمام حقائق غیبی نہیں ہیں اور نہ اس کا واسطہ عالم مجہولات سے ہے بلکہ یہاں عالم شہادت بھی ہے۔

اس کائنات کے اندر بعض ناقابل تغیر قوانین اور سنن ہیں اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ سنن کائنات میں سے ضروری کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ اپنی اس صلاحیت اور ضرورت کے مطابق اسے یہ صلاحیت اس لیے دی گئی ہے کہ وہ یہاں خلافت ارضی کے منصب

سے وابستہ فرائض ادا کر سکے اور اپنی زندگی کو سنن کائنات کے ساتھ ہم آہنگ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس قدر صلاحیت دی ہے جس قدر اسے منصب خلافت کے تقاضے پورے کرنے کے لیے درکار ہے، تاکہ انسان کائناتی قوتوں کو مسخر کر کے اس زمین کو آباد کر سکے ' یہاں زندگی کو ترقی دے سکے اور انسانی زندگی کی بہتری کے لیے اللہ نے اس کائنات کے اندر جو ذخائر ودیعت کیے ہیں انھیں کام میں لا سکے۔

لیکن ان قوانین قدرت کے ساتھ ساتھ مشیت الٰہی بھی بطور ایک حقیقت کے موجود ہے۔ اگرچہ یہ تمام قوانین قدرت مشیت ایزدی کا نتیجہ ہیں لیکن یہ قوانین قدرت مشیت الٰہیہ کے بجائے تقدیر الٰہی کے مطابق کام کرتے ہیں۔ یہ تمام قوانین قدرت الٰہیہ کے تحت چلتے ہیں۔ یہ کوئی خود مختار یا کنٹرول سے باہر مشینری نہیں ہے۔ اللہ کی قدرت اور اس کی تقدیر ان قوانین پر پوری طرح محیط ہے۔ اس کائنات کی ہر حرکت اس کے دائرہ قدرت میں ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ کائنات ایک ناموس کے مطابق رواں دواں ہے لیکن یہ ناموس اللہ کا پیدا کردہ ہے۔ اللہ کا نظام قضا وقدر ان قوانین قدرت کو نافذ کرتا ہے۔ نظام قضا وقدر عالم غیب کا حصہ ہے اور اس کے بارے میں علم صرف اللہ کو ہوتا ہے۔ لوگوں نے جو سائنسی اصول وضع کر رکھے ہیں وہ بھی ظنی اور احتمالی ہوتے ہیں اور آج تک انسان نے اس کائنات کے جو راز معلوم کیے ہیں اور ان کے بھی یہ اعتراف موجود ہے۔

ذرا انسان کے اس مختصر وجود پر غور کیجیے۔ اس کے اندر ہر لحظہ لاکھوں ذرات سرگرداں ہیں۔ ہی سب تصرفات انسانی نقطہ نظر سے غیب ہیں۔ اگرچہ یہ تمام حرکات اور مؤثرات خود اس کے وجود کے اندر روبعمل رہتے ہیں۔ پھر اس عظیم کائنات کے اندر جو مؤثرات کام کر رہے ہیں وہ تو لا تعد ولا تحصی ہیں۔ انسان ان میں سے کچھ بھی نہیں جانتا۔

عالم غیب انسان کے ماضی پر بھی محیط ہے اور اس کائنات کے ماضی پر بھی محیط ہے۔ انسان اور اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی اس کائنات اور اس کی موجودہ حالت پر بھی عالم غیب محیط ہے۔ نیز ان کے مستقبل پر بھی عالم غیب محیط ہے۔ یہ سب امور سنن الٰہیہ کے مطابق روبعمل ہیں جن میں سے نہایت ہی قلیل مقدار کا علم ابھی تک انسان کو ہو سکا ہے۔ انسان ان سے فائدہ اٹھا رہا ہے اور انھیں منظم اور مربوط طریقے سے فریضہ خلافت کی ادائیگی میں استعمال کر رہا ہے۔

انسان اس کائنات میں اپنی خواہش کے مطابق نہیں آتا۔ نہ اسے یہ علم ہوتا ہے کہ اب وہ اس جہان میں وارد ہو گا۔ جب وہ اس جہان سے رخصت ہوتا ہے تب بھی اس رخصتی میں اس کی خواہش شامل نہیں ہوتی اور نہ اسے علم ہوتا ہے کہ کب اسے جانا ہے یہی صورت حال ہر زندہ مخلوق کی ہے۔ انسان جس قدر علم بھی حاصل کر لے اور اس کی معرفت اور آگاہی کا دائرہ کتنا ہی وسیع تر کیوں نہ ہو جائے وہ اس صورت حالات میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا۔

اسلامی ذہنیت اور اسلامی ماہیت کے اعتبار سے "غیبی علمی" نوعیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ غیب اور عدم علم اسائنسی اعتبار سے بھی بھی حقیقی علم ہے۔ جو لوگ غیب کا انکار کرتے ہیں وہ جاہل ہیں حالانکہ وہ دعوی کرتے ہیں کہ وہ بہت کچھ جاننے والے ہیں۔

اسلامی فکر کی اساس یہ ہے کہ ایک مسلمان ایسے غیبی حقائق کے وجود کا اقرار کرتا ہے جس کا حقیقی علم صرف اللہ کو ہے۔ اس علم کی کنجیاں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ پھر اسلامی فکر یہ بھی یقین رکھتی ہے کہ یہ کائنات سنن الٰہیہ کے مطابق چل رہی ہے۔ اور ان سنن الٰہیہ میں سے بعض ایسے ہیں جن کا علم فریضہ خلافت فی الارض کے لیے ضروری ہے۔ ان اصولوں کے ساتھ مضبوط اساسوں پر ہم آہنگی اختیار کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر کی وجہ سے انسان نہ علم ومعرفت سے محروم ہوتا ہے اور نہ حقیقت واقعیہ کے ادراک سے محروم ہوتا ہے۔

اس عالم شہادت سے آگے ایک عالم غیب ہے اور اس عالم مغیبات کا علم صرف اللہ کو ہے اور اپنے بندوں میں سے اگر اللہ چاہے تو کسی قدر علم کسی کو عطا کر دے۔

ایمان بالغیب وہ دشوار گزار گھاٹی ہے جس کو انسان نے ضرور عبور کرنا ہے۔ جب تک وہ اس مقام پر فائز نہیں ہوتا وہ حیوانی مقام سے بلند ہو کر انسانی مقام تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ حیوان صرف ان امور کا ادراک کر سکتا ہے جو اس کے حواس کے دائرے میں آتے ہیں۔ اس حقیقت کا ادراک صرف انسان ہی کر سکتا ہے کہ یہ کائنات صرف اسی قدر محدود نہیں ہے جو اس کے حواس میں آتی ہے یہ بہت ہی وسیع ہے بلکہ اس سے بھی وسیع تر ہے جو بذریعہ آلات اس کے ترقی دادہ حواس کے دائرہ ادراک میں آ رہی ہے۔ یہ اسلامی تصور اس کائنات کے تصور سے کہیں وسیع تر تصور ہے بلکہ اس کائنات کے بارے میں انسان سوچ کے اندر یہ ایک دور رس تبدیلی ہے۔ یہ انسانی شخصیت کے بارے میں بھی انسانی سوچ میں ایک دور رس تبدیلی ہے۔ انسانی شخصیت کے اندر جو قوتیں کارفرما ہیں ان کے بارے میں بھی انقلابی سوچ ہے۔ اس سوچ کے تحت ایک انسان کے اندر اس کائنات کے بارے میں اور اس کے پیچھے کام کرنے والی قوتوں کے بارے میں ایک نیا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس تصور کے اثرات اس کرہ ارض پر انسان کی عملی زندگی پر بھی پڑتے ہیں اس لیے کہ وہ انسان جو صرف ماحول کا اپنے حواس کے ساتھ ایک محدود مشاہدہ کرتا ہے اس انسان کے مساوی نہیں ہو سکتا جو اپنی بصیرت اور اپنے نظریات کی وجہ سے اس کائنات کے بارے میں وسیع تر سوچ رکھتا ہے۔ یہ عقلمند انسان فطرت کائنات کی آواز کو اپنی شخصیت کے نہاں خانے سے سنتا ہے اور اپنے دل کی گہرائیوں سے اشارات پاتا ہے۔ وہ یہ شعور رکھتا ہے کہ اس کا دائرہ کار زمان و مکان کی قید سے زیادہ وسیع ہے۔ اور اس کی شخصیت اس سے کہیں وسیع ہے جو وہ سمجھتا ہے یا اپنی عمر کے ایک مختصر عرصے میں وہ سمجھ سکتا ہے۔ وہ اس بات کا شعور رکھتا ہے کہ اس ظاہری اور پوشیدہ کائنات کے پس پست ایک عظیم حقیقت ہے اور یہ حقیقت اس کائنات سے بڑی اور اس کی خالق ہے۔ اس عظیم حقیقت کے وجود ہی سے تمام کائنات کا وجود مستعاد ہے۔ یہ ہے حقیقت باری تعالیٰ جسے آنکھیں نہیں پا سکتیں اور جو انسانی کی عقل کے احاطے میں نہیں آ سکتی۔

ایمان بالغیب وہ یونٹ ہے جہاں سے انسان اور حیوان کے راستے جدا ہوتے ہیں اور انسان عالم حیوانیت سے بلند ہوتا ہے۔ لیکن ہر زمانے کی طرح ہمارے دور کے مادہ پرست بھی یہ چاہتے ہیں کہ انسان کو انسانیت کے مقام بلند سے گرا کر عالم حیوانیت کی طرف لوٹا کر لے آئیں جہاں وہی چیز حقیقت سمجھی جاتی ہے جو حواس کے دائرے میں آتی ہے۔ یہ مادیت پسند اس بات کو ترقی پسندی کہتے ہیں حالانکہ یہ دراصل رجعت پسندی اور ناکامی ہے جس سے اللہ نے مسلمانوں کو ابھی تک بچایا ہے۔ لہٰذا ان کی امتیازی صفت ہی یہ قرار دی گئی کہ یومنون بالغیب (جو غیب پر ایمان لاتے ہیں) اور یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ جس پر ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ یہ نکتہ گرنے والوں اور منہ موڑنے والوں کے لیے ہلاکات اور تباہی کا مقام ہے۔

جو لوگ غیب اور سائنس کا باہم تقابل کرکے بحث کرتے ہیں وہ تاریخی واقعات کی فیصلہ کن تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک گویا مستقبل ان کے سامنے یقینی صورت میں موجود ہے حالانکہ جدید ترین سائنسی انکشافات یہ ہیں کہ مستقبل کا دار و مدار محض احتمالات پر ہے۔ مستقبل کے بارے میں انسان کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا۔

مارکس کی یہ عادت تھی کہ وہ تاریخی اسباب کی روشنی میں مستقبل کے لیے قطعی فیصلے کرتا تھا۔ لیکن آج کا انسان بچشم سر دیکھ سکتا ہے کہ مارکس کی ان تمام پیشین گوئیوں کا حشر کیا ہوا؟

مارکس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ سب سے پہلے انگلستان میں کمیونزم نافذ ہوگا کیونکہ انگلستان صنفی اعتبار سے چوٹی پر پہنچ چکا ہے۔ وہاں ایک طرف سرمایہ دار عروج پر ہے اور دوسری جانب جانب مزدور فقر و فاقے کے اعتبار سے اپنی آخری منزل تک پہنچ چکا ہے۔ لیکن بعد کے ادوار میں ہم نے دیکھا کہ نہایت ہی پسماندہ اقوام کے اندر کمیونزم کامیاب ہوا 'مثلاً روس اور چین میں اور صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہممالک میں سے کسی ایک میں بھی کمیونسٹ انقلاب برپا نہ ہوا۔

لینن اور اسٹالن نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ سوشلسٹ دنیااور سرمایہ دار دنیاکے درمیان کسی وقت بھی عالمگیر جنگ ہوگی 'لیکن ان دونوں کے خلیفہ خرد شیف باہم سلامتی اور دیانت کے جھنڈے اٹھائے ہوئے ہیں۔۔ میرا خیال ہے کہ ان لوگوں کی پیشین گوئیوں پر مزید بحث کرکے اپناوقت ضائع نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ان لوگوں کی یہ یقینی پیشین گویاں اس لائق نہیں کہ ان پر کوئی سنجیدہ بحث کی جائے۔

یقینی حقیقت اگر کوئی ہے تو یہی غیبی حقیقت ہے اور اس کے سوا تمام باتیں محض احتمالات ہیں۔ اگر کوئی حتمی بات ہے تو وہی ہے جس کا فیصلہ اللہ کی قضاوقدر نے کر دیا ہے اور مستقبل کے بارے میں اللہ نے کیا فیصلہ کیا ہے 'اس کا کسی کو علم نہیں ہے سوائے اللہ کے۔ ہاں تقدیر الٰہی کے اٹل حقیقت ہونے کے باوجود اس کائنات کے بارے میں کچھ سنن الٰہیہ ایسی بھی ہیں جو اٹل ہیں اور جو تقدیر الٰہیہ کا حصہ ہیں۔ ان میں سے بعض سنن الٰہیہ تک انسان کی رسائی بھی ممکن ہے اور ان تک رسائی حاصل کرکے انسان اپنے منصب خلافت الٰہیہ کے فرائض کو بہت ہی اچھی طرح ادا کرسکتا ہے۔ لیکن ان وسائل کے باوجود اللہ کا فیصلہ اور اس کی تقدیر سپریم ہے اور تقدیر الٰہی نامعلوم ہے۔ یہ اس کائنات کی اصل حقیقت ہے اور (ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم) (۱۷: ۹) یہ قرآن کریم اس بات کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو نہایت ہی سیدھی ہے۔

اب روئے سخن غیب کے علوم کی کنجیوں سے اس کائنات کے ایک خاص پہلو کی طرف مڑ جاتا ہے۔ یعنی ذات انسانی کی طرف جو اس کائنات ہی کا ایک حصہ ہے اور اللہ کی قدرت کے کرشموں میں سے اہم کرشمہ ہے جس سے اللہ کے علم محیط کا بہت ہی اچھی طرح اظہار ہوتا ہے۔ (فی ظلال)

مفتح کا معنی خزانہ ہے اور مفتح کا معنی کنجی ہے۔ اگر مفاتح کو مفتح کی جمع تسلیم کیا جائے تو آیت کا معنی ہوگا اللہ تعالیٰ کے پاس ہی غیب کے خزانے ہیں اور اگر مفتح کی جمع کہا جاوے تو پھر آیت کا مفہوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہی غیب (کے خزانوں) کی کنجیاں ہیں۔ پہلی آیت میں بتایا کہ ہر قسم کا اختیار اسی کو حاصل ہے۔ اس آیت میں تصریح فرمائی کہ علم کامل اور محیط سے بھی فقط وہی متصف ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ خدا صرف وہی ہو سکتا ہے جو بے پایاں قدرت اور بیکراں علم کا مالک ہو۔ لیکن اس آیت سے یہ سمجھنا کسی طرح درست نہیں کہ وہ کسی کو علم غیب سکھاتا بھی نہیں۔ بلکہ وہ جس کو چاہتا ہے جتنا چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ کوئی بخیل اس کی بخشش وعطا کا ہاتھ نہیں روک سکتا۔ اور جو کچھ اس نے سید الانبیاء محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عنایت فرمایا ہے اس کا اندازہ لگانا کسی کے بس کی بات نہیں۔ علامہ قرطبیؒ (رح) لکھتے ہیں۔ فاللہ تعالیٰ عندہ علم الغیب وبیدہ الطرق الموصلۃ الیہ لا یملکھا الا ھو فمن شاء اطلاعہ علیہا اطلعہ ومن شاء حجبہ عنھا حجبہ ولا یکون ذلک من افاضتہ الا علی رسلہ : یعنی غیب کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور علم غیب تک پہنچے کے ذریعے بھی اسی کے دست قدرت میں ہیں کوئی ان کا مالک نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ جس کو غیب کا علم دینا چاہتا ہے دے دیتا ہے اور جس کو محروم رکھنا چاہتا ہے اسے محروم کر دیتا ہے۔ اور امور غیب پر آگاہی صرف رسولوں کے ذریعے ہی حاصل کر ہو سکتی ہے جن پر علوم غیب کا فیضان فرمایا جاتا ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

غیب کے خزانوں کی چابیاں یعنی غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ اس علم غیب کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خشکی اور تری یعنی زمین وسمندر میں جو کچھ بھی ہے اس کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے حتیٰ کہ درختوں سے

جب کوئی پتا گرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتا ہے۔ نیز زمین کی تاریکیوں میں چھپا ہوا ہر دانہ اور ہر خشک و تر چیز اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ یا قرآن مجید میں لکھ دی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اور ہم نے آپ پر یہ کتاب نازل فرمائی جس میں ہر چیز کا بیان ہے۔" (قرآن 16:89) لہٰذا کائنات کی ہر چیز چاہے وہ چھوٹی ہے یا بڑی، ظاہر ہے یا پوشیدہ اللہ تعالیٰ کو اس کا کامل اور تفصیلی علم ہے، اس کے سوا اور کوئی از خود نہیں جانتا۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی اور کو غیب کا علم عطا نہیں کرتا بلکہ وہ قادر مطلق ہے جس کو چاہتا ہے جتنا چاہتا ہے غیب کا علم عطا کر دیتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وہ غیب جاننے والا ہے اور اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا سوائے اس رسول کے جس کو وہ پسند کرلے۔" (قرآن: 27-72:28) رسولوں کے علاوہ عوام کو علم غیب سے آگاہ کیوں نہیں کیا جاتا، اس سوال کے جواب کے لیے سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 179 اور حاشیہ نمبر 126 ملاحظہ کریں۔

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: خدا کی قسم! میرے اوپر نہ تمہارا رکوع پوشیدہ ہے اور نہ تمہارا خشوع اور بیشک میں تمہیں اپنی پشت کے پیچھے بھی دیکھتا ہوں۔" (بخاری: کتاب الاذان: باب 88) رکوع نماز کی ظاہری صورت کو اور خشوع باطنی کیفیت کو کہا جاتا ہے، لہٰذا اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہر چیز کے ظاہر و باطن کو جانتے ہیں اور جو چیز نگاہوں سے غائب ہے اسے بھی جانتے ہیں کیونکہ نماز میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا رخ قبلہ کی طرف ہوتا تھا اور صحابہ کرام (رض) پیچھے صفوں میں ہوتے تھے اس کے باوجود آپ ان کے ظاہر و باطن کا علم رکھتے تھے، لیکن یہ حقیقت شکوک و شبہات سے بالاتر ہے کہ کسی نبی، فرشتہ حتیٰ کہ سید المرسلین حضرت محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا علم بھی اللہ تعالیٰ کے برابر نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم ذاتی، قدیم اور غیر محدود ہے۔ ایسا علم اللہ تعالیٰ ہی کے شایان شان ہے کسی اور میں اس کا ثابت کرنا شرک ہے۔ اس کے برعکس انبیائے کرام (علیہم السلام) کا علم عطائی، حادث اور محدود ہے۔ ایسا علم انبیائے کرام (علیہم السلام) پر اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے، اس علم کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا کفر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے علم کو عطائی، حادیث یا محدود کہنا کفر ہے۔

علامہ قرطبیؒ اس تفصیل کا خلاصہ اس طرح بیان کرتے ہیں: "غیب کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور علم غیب تک پہنچانے والے ذرائع بھی اس کے دست قدرت میں ہیں۔ کوئی اور ان کا مالک نہیں ہے، پس اللہ تعالیٰ جس کو غیب کا علم دینا چاہتا ہے اسے عطا کر دیتا ہے اور جس کو محروم رکھنا چاہتا ہے اسے محروم کر دیتا ہے اور امور غیب پر آگاہی صرف رسولوں کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتی ہے جن پر علوم غیب کا فیضان فرمایا جاتا ہے۔" (تفسیر قرطبیؒ) (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

غیب کی چابیوں سے پانچ علوم غیب مراد ہیں جن کا ذکر سورۃ لقمان کی آخری آیت میں ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ السَّاعَةِ‌ۚ وَيُنَزِّلُ الۡغَيۡثَ‌ۚ وَيَعۡلَمُ مَا فِى الۡاَرۡحَامِ‌ؕ وَمَا تَدۡرِىۡ نَفۡسٌ مَّاذَا تَكۡسِبُ غَدًا‌ؕ وَمَا تَدۡرِىۡ نَفۡسٌۢ بِاَىِّ اَرۡضٍ تَمُوۡتُ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ خَبِيۡرٌ۔ "1۔ بیشک اللہ کے پاس قیامت کا علم ہے۔ 2۔ وہ بارش برساتا ہے۔ 3۔ وہ جانتا ہے جو کچھ ماؤں کے رحموں میں ہے۔ 4۔ اور کوئی جان نہیں جانتی کہ اس نے کل کیا کرنا ہے۔ 5۔ اور کوئی جان نہیں جانتی کہ وہ کس سرزمین میں مرے گی۔ اللہ علم والا خبر والا ہے۔" (لقمان۔34)

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے مروی ہے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا غیب کی پانچ چابیاں ہیں جنہیں اللہ ہی جانتا ہے پھر آپ نے یہی آیت پڑھی: اِنَّ اللّٰهَ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ السَّاعَةِ‌ ۚ وَيُنَزِّلُ الۡغَيۡثَ‌ ۚ وَيَعۡلَمُ مَا فِى الۡاَرۡحَامِ‌ؕ وَمَا تَدۡرِىۡ نَفۡسٌ مَّاذَا تَكۡسِبُ غَدًا‌ ؕ وَمَا تَدۡرِىۡ نَفۡسٌۢ بِاَىِّ اَرۡضٍ تَمُوۡتُ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ خَبِيۡرٌ ۔ (بخاری کتاب التفسیر سورۃ لقمان)

ان پانچ علوم کو غیب کی چابیاں اس لیے کہا گیا ہے کہ دراصل یہ پانچ علوم غیب کے پانچ بڑے دروازے ہیں کہ ہر غیب کی خبر ان کے تحت داخل ہے۔ کیونکہ جسے قیامت کا وقت معلوم ہے اسے آنے والے تمام احوال کی خبر ہے اور جو بارش کی خبر رکھتا ہے وہ آنے والی ہر خیر و شر سے واقف ہے اور جسے ماؤں کے پیٹوں میں مخفی حالات کی خبر ہے کے کس کے پیٹ میں بیٹا ہے اور کس کے پیٹ میں بیٹی، تو گویا کوئی پردہ اس کی نگاہ پر حائل نہیں ہو سکتا اور جس سے یہ معلوم ہو کہ اس نے کل کیا کرنا ہے تو گویا اس پہ آنے والا کوئی حال مخفی نہیں اور جسے اپنے مقام موت کی خبر ہے وہ گویا جانتا ہے کہ کل وہ کہاں ہو گا پرسوں کہاں ہو گا حتیٰ کہ جب اسے موت آئے گی تو کہاں ہو گا۔ الغرض جس کے پاس یہ پانچ علوم ہوں اس کے پاس ہر علم غیب کی چابی موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندوں کو پانچ بڑے علوم غیب بھی عطا فرماتا ہے

یاد رہے یہ پانچ علوم اصل میں اللہ ہی کے پاس ہیں مگر وہ ان میں سے کچھ حصہ اپنے مقرب بندوں میں سے جسے چاہے عطا فرماتا ہے۔ امام قرطبیؒ اس جگہ فرماتے ہیں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ غیب تک پہنچنے والے راستے اللہ کے ہاتھ میں ہیں وہ جسے چاہے غیب پر مطلع فرماتا ہے۔ (کیونکہ جس کے پاس چابی ہو وہ جس کے لیے چاہے دروازہ کھول سکتا ہے) جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطۡلِعَكُمۡ عَلَى الۡغَيۡبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجۡتَبِىۡ مِنۡ رُّسُلِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ۔ "اللہ تعالیٰ تمہیں غیب پہ مطلع کرنے والا نہیں، مگر وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے اس کام کے لے ی چن لیتا ہے"۔ (آل عمران: 179)۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَلَا يُظۡهِرُ عَلٰى غَيۡبِهٖۤ اَحَدًا ۔ اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰى مِنۡ رَّسُوۡلٍ "خدائے غیب داں اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا مگر جس رسول کو چاہے اس پر مطلع کر دیتا ہے" (جن، 26 (قرطبی جلد 7 صفحہ 2 مطبوعہ مصر)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی علیہ الرحمہ مَفَاتِحُ الۡغَيۡبِ لَا يَعۡلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ کے تحت فرماتے ہیں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ غیب کی چابیاں اللہ کے پاس ہیں اللہ کے سوا انھیں وہی جان سکتا ہے جسے اللہ توفیق دے۔ (تفسیر مظہری جلد 3 صفحہ 245)

امام سیوطی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ذهب بعضهم الى انه (صلى الله عليه وآله وسلم) اوتى علم الخمس ايضا و علم الساعة والروح و انه امر بكتم ذالك۔ بعض علماء نے فرمایا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو غیب کہ یہ 5 علوم بھی دیے گئے آپ کو قیامت اور روح کا علم بھی دیا گیا مگر آپ کو اس کے چھپانے کا حکم ہوا۔ (الخصائص الکبری جلد دوم صفحہ 195)

[57]۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو بحر و بر کی ہر چیز کا علم ہے کیونکہ وہ اسی کی پیدا کردہ ہے پھر کسی درخت سے گرنے والا کوئی پتہ اس کے علم کے بغیر نہیں گرتا۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "ہر درخت کے ہر پھل پر لکھا ہے کہ یہ فلاں بن فلاں کا رزق ہے"۔ (در منثور جلد 3 صفحہ 15 مطبوعہ دار المعرفہ بیروت)۔

اور زمین کی گہرائیوں میں موجود ہر ذرہ اور زمین کی ہر خشک و تر چیز کا علم اللہ نے روشن کتاب (لوح محفوظ) میں رکھا ہے۔ اس میں مشرکوں بت پرستوں کے لیے ہدایت ہے کہ وہ ایسے علم والے رب کو چھوڑ کر بے جان پتھروں اور جانوروں کو پوجتے ہیں یہ کس قدر جہالت ہے۔

یاد رہے لوح محفوظ کو کتاب مبین اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا معنیٰ بیان کرنے والی کتاب ہے، تو یہ کیسے بیان کرتی ہے اور کسے بیان کرتی ہے؟ اس کے جواب میں ملا علی قاری علیہ رحمۃ الباری فرماتے ہیں جب اولیاء کے نفوس قدسیہ عالم حس کی ظلمتوں سے پاک ہو جاتے اور ان کے قلوب مثل آئینہ بن جاتے ہیں تو ان کے دلوں پر لوح محفوظ کی تحریریں منعکس ہوتی ہیں تبو غیب پر مطلع ہوتے اور عالم جسمانیات میں تصرف کرتے ہیں۔ (مرقات شرح مشکوۃ جلد اول صفحہ 62 مطبوعہ ملتان)

اسی لئے ائمہ دین کے نزدیک لوح محفوظ کا علم علم مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ایک حصہ ہے۔ امام شرف الدین بوصیری علیہ الرحمہ اپنے مشہور عالم قصیدہ بردہ میں فرماتے ہیں۔

فان من جودك الدنيا و ضرتها و من علومك علم اللوح والقلم

یعنی بیشک دنیا اور اس کی سوتن (آخرت) نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فیض سے ہے اور لوح و قلم کا علم آپ کے علوم میں سے ایک حصہ ہے (قصیدہ بردہ فصل 10 شعر 152) (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

غیب کی چابیوں سے پانچ علوم غیب مراد ہیں جن کا ذکر سورۃ لقمان کی آخری آیت میں ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ۔ "1۔ بیشک اللہ کے پاس قیامت کا علم ہے۔ 2۔ وہ بارش برساتا ہے۔ 3۔ وہ جانتا ہے جو کچھ ماؤں کے رحموں میں ہے۔ 4۔ اور کوئی جان نہیں جانتی کہ اس نے کل کیا کرنا ہے۔ 5۔ اور کوئی جان نہیں جانتی کہ وہ کس سرزمین میں مرے گی۔ اللہ علم والا خبر والا ہے۔ "

(لقمان۔ 34)

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے مروی ہے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا غیب کی پانچ چابیاں ہیں جنہیں اللہ ہی جانتا ہے پھر آپ نے یہی آیت پڑھی: اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ۔ (بخاری کتاب التفسیر سورۃ لقمان)

ان پانچ علوم کو غیب کی چابیاں اس لیے کہا گیا ہے کہ دراصل یہ پانچ علوم غیب کے پانچ بڑے دروازے ہیں کہ ہر غیب کی خبر ان کے تحت داخل ہے۔ کیونکہ جسے قیامت کا وقت معلوم ہے اسے آنے والے تمام احوال کی خبر ہے اور جو بارش کی خبر رکھتا ہے وہ آنے والی ہر خیر و شر سے واقف ہے اور جسے ماؤں کے پیٹوں میں مخفی حالات کی خبر ہے کے کس کے پیٹ میں بیٹا ہے اور کس کے پیٹ میں بیٹی، تو گویا کوئی پردہ اس کی نگاہ پر حائل نہیں ہو سکتا اور جس سے یہ معلوم ہو کہ اس نے کل کیا کرنا ہے تو گویا اس پہ آنے والا کوئی حال مخفی نہیں اور جسے اپنے مقام

موت کی خبر ہے وہ گویا جانتا ہے کہ کل وہ کہاں ہوگا پرسوں کہاں ہوگا حتیٰ کہ جب اسے موت آئے گی تو کہاں ہوگا۔ الغرض جس کے پاس یہ پانچ علوم ہوں اس کے پاس ہر علم غیب کی چابی موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندوں کو پانچ بڑے علوم غیب بھی عطا فرماتا ہے

یاد رہے یہ پانچ علوم اصل میں اللہ ہی کے پاس ہیں مگر وہ ان میں سے کچھ حصہ اپنے مقرب بندوں میں سے جسے چاہے عطا فرماتا ہے۔ امام قرطبیؒ اس جگہ فرماتے ہیں آیت کا فمہوم یہ ہے کہ غیب تک پہنچنے والے راستے اللہ کے ہاتھ میں ہیں وہ جسے چاہے غیب پر مطلع فرماتا ہے۔ (کیونکہ جس کے پاس چابی ہو وہ جس کے لیے چاہے دروازہ کھول سکتا ہے) جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔ "اللہ تعالیٰ تمہیں غیب پہ مطلع کرنے والا نہیں، مگر وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے اس کام کے لے ی چن لیتا ہے"۔ (آل عمران: 179)۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۔ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ "خدائے غیب داں اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا مگر جس رسول کو چاہے اس پر مطلع کر دیتا ہے" (جن، 26 (قرطبیؒ جلد 7 صفحہ 2 مطبوعہ مصر)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی علیہ الرحمہ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ کے تحت فرماتے ہیں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ غیب کی چابیاں اللہ کے پاس ہیں اللہ کے سوا انھیں وہی جان سکتا ہے جسے اللہ توفیق دے۔ (تفسیر مظہری جلد 3 صفحہ 245)

امام سیوطی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: **ذهب بعضهم الی انه (صلی الله علیه وآله وسلم) اوتی علم الخمس ایضا و علم الساعة والروح و انه امر بکتم ذالك۔** بعض علماء نے فرمایا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو غیب کہ یہ 5علوم بھی دیے گئے آپ کو قیامت اور روح کا علم بھی دیا گیا مگر آپ کو اس کے چھپانے کا حکم ہوا۔ (الخصائص الکبری جلد دوم صفحہ 195)

[57]۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو بحر و بر کی ہر چیز کا علم ہے کیونکہ وہ اسی کی پیدا کردہ ہے پھر کسی درخت سے گرنے والا کوئی پتہ اس کے علم کے بغیر نہیں گرتا۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "ہر درخت کے ہر پھل پر لکھا ہے کہ یہ فلاں بن فلاں کا رزق ہے"۔ (در منثور جلد 3 صفحہ 15 مطبوعہ دار المعرفہ بیروت)۔ اور زمین کی گہرائیوں میں موجود ہر ذرہ اور زمین کی ہر خشک و تر چیز کا علم اللہ نے روشن کتاب (لوح محفوظ) میں رکھا ہے۔ اس میں مشرکوں بت پرستوں کے لیے ہدایت ہے کہ وہ ایسے علم والے رب کو چھوڑ کر بے جان پتھروں اور جانوروں کو پوجتے ہیں یہ کس قدر جہالت ہے۔

یاد رہے لوح محفوظ کو کتاب مبین اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا معنی بیان کرنے والی کتاب ہے، تو یہ کیسے بیان کرتی ہے اور کسے بیان کرتی ہے؟ اس کے جواب میں ملا علی قاری علیہ رحمۃ الباری فرماتے ہیں جب اولیاء کے نفوس قدسیہ عالم حس کی ظلمتوں سے پاک ہو جاتے اور ان کے قلوب مثل آئینہ بن جاتے ہیں تو ان کے دلوں پر لوح محفوظ کی تحریریں منعکس ہوتی ہیں تو غیب پر مطلع ہوتے اور عالم جسمانیات میں تصرف کرتے ہیں۔ (مرقات شرح مشکوۃ جلد اول صفحۃ 62 مطبوعہ ملتان) اسی لئے ائمہ دین کے نزدیک لوح محفوظ کا علم علم مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ایک حصہ ہے۔ امام شرف الدین بوصیری علیہ الرحمہ اپنے مشہور عالم قصیدہ بردہ میں فرماتے ہیں۔

فان من جودك الدنيا وضرتها ومن علومك علم اللوح والقلم

یعنی بیشک دنیا اور اس کی سوتن (آخرت) نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فیض سے ہے اور لوح و قلم کا علم آپ کے علوم میں سے ایک حصہ ہے (قصیدہ بردہ فصل 10 شعر 152) (تفسیر تبیان القرآن۔غلام رسول سعیدی)

خلاصہ

مفہوم آیت۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں تو جسے وہ چاہے وہی غیب پر مطلع ہو سکتا ہے بغیر اللہ تعالیٰ کے بتائے کوئی غیب نہیں جان سکتا۔کتاب مبین سے مراد لوح محفوظ ہے۔اللہ تعالیٰ نے ماکان ومایکون کے علوم اس میں مکتوب فرمائے اور اس قسم کے مفوہم کی وضاحت علم الغیب فلایظهر علی غیبہ احدا الا من ارتضی من رسول یعنی غیب کا جاننے والا ہے نہیں مطلع فرماتا اپنے غیب پر کسی کو مگر اسے جس سے اللہ راضی ہو جائے اپنے رسولوں سے۔ وغیرہ آیات میں جو مضامین ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ذاتی غیب کا علم سوا اللہ تعالیٰ کے کسی کو حاصل نہیں۔ مگر جسے اللہ تعالیٰ عطا فرمائے۔ بلکہ جس کو چاہتا ہے جتنا چاہتا ہے عطا فرماتا ہے جو کچھ اس نے سید الانبیاء حبیب کبریا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عنایت فرمایا اس کا اندازہ لگانا کسی کے بس کی بات نہیں وہ اس آیت کریمہ کے مفہوم کے منافی نہیں۔ چنانچہ صاحب تفسیر نسفی بھی یہی فرمایت ہیں۔اور اسی کے پاس ہیں کنجیاں غیب کی نہیں جانتا انھیں مگر وہی۔ مفاتح جمع ہے مفتاح کی۔ اور وہ عذاب و رزق کے خزانوں اور جو بندوں سے غائب ہیں ثواب، عذاب، عمر کی مدتیں، احوال حیات اور بعد الممات سب کو غیب کہا اس کے لیے بطریق استعارہ کنجی فرمایا اس لیے کہ کنجی پہنچا دیتی ہے اس تک جو خزانے میں محفوظ ہے اور جو کنجی اور اس کی کیفیت افتتاح کو جان لے وہ پہنچ جاتا ہے اس خزانہ تک۔ اس میں ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس مفتاح عیب ہیں اور تمہارے پاس مفتاح غیب جو غیب پر ایمان لے آیا اس پر اللہ تعالیٰ اس کے عیبوں سے پردہ ڈال دیتا ہے۔ اور وہ جانتا ہے جو کچھ بر میں ہے سبزہ سے اور زمین کے چلنے والوں سے اور دریا میں حیوان و جواہرات سے اور نہیں گرتا کوئی پتہ مگر وہ جانتا ہے اس میں ما نافیہ ہے اور من استغراقی۔ یعنی وہ ان پتوں کی گنتی کا احوال گرنے سے قبل اور اس کے بعد سب جانتا ہے اور کوئی دانہ نہیں زمین کی اندھیریوں میں اور کوئی تر نہیں نہ خشک مگر روشن کتاب میں ہے۔کتاب سے مراد علم اللہ یا لوح محفوظ ہے اس کے بعد کفاروں کو مخاطب فرما کر ارشاد ہوا۔ (تفسیر الحسنات۔علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)

فوائد

۱: اس میں اعلام یعنی بتانے کی نفی نہیں بتانے کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔اس آیت سے نبی کے علم غیب کی نفی پکڑنا غلط ہے ورنہ منکرین کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ بعض علم غیب وہ بھی مانتے ہیں۔

۲: معلوم ہوا کہ ہر ادنی اعلی چیز لوح محفوظ میں لکھ دی گئی ہے۔اور یہ لکھنا اس لیے نہیں کہ رب تعالیٰ کو اپنے بھول جانے کا اندیشہ تھا للذا لکھ لیا۔ بلکہ اپنے خاص مقرب بندوں کو بتانے کے لیے ہے جن کی نظر لوح محفوظ پر ہے۔اس آیت کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ علم غیب حساب سے، عقل سے حاصل نہیں ہوتا۔ یہ تو رب کی خاص ملک ہے۔اس کے پاس ہے جسے وہ دے اسے ملے اور غیب کی کنجیاں سے مراد وہ پانچ علوم

ہیں جو سورۃ لقمان کے آخر میں مذکور ہیں، عندہ علم الساعۃ الخ۔ چونکہ یہ پانچ چیزیں لاکھوں غیبوں کے کھل جانے کا ذریعہ ہیں اس لیے انھیں غیب کی کنجیاں فرمایا گیا۔

۳: لوح محفوظ کتاب مبین یعنی ظاہر کر دینے والی کتاب اس لیے فرمایا گیا۔ کہ لوح محفوظ علوم غیبیہ ان حضرات پر ظاہر کر دیتی ہے جن کی نظر اس پر ہے جیسے بعض فرشتے اور انبیاء و اولیاء کرام۔ اگر اس پر کسی کی نظر نہ ہو تو وہ کتاب مبین نہ ہو گی۔ مولانا فرماتے ہیں:

لوح محفوظ است پیش اولیاء
از چہ محفوظ اند محفوظ از خطاء

آیت مبارکہ:

وَهُوَ الَّذِىۡ يَتَوَفّٰٮكُمۡ بِالَّيۡلِ وَيَعۡلَمُ مَا جَرَحۡتُمۡ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبۡعَثُكُمۡ فِيۡهِ لِيُقۡضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى‌ ۚ ثُمَّ اِلَيۡهِ مَرۡجِعُكُمۡ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۞60

لغۃ القرآن: [وَهُوَ الَّذِيْ : اور وہ جو] [يَتَوَفّٰكُمْ : تم کو فوت کرتا ہے] [بِالَّيْلِ : رات کو] [وَيَعْلَمُ : اور وہ جانتا ہے] [مَا جَرَحْتُمْ بالنَّهَارِ : جو تم کرتے ہو دن میں] [ثُمَّ : پھر] [يَبْعَثُكُمْ : تمہیں اٹھاتا ہے] [فِيْهِ : اس میں] [لِيُقْضٰٓى: تاکہ پورا کیا جائے] [اَجَلٌ: وقت] [مُّسَمًّى : مقررہ] [ثُمَّ : پھر] [اِلَيْهِ : اسکی طرف] [مَرْجِعُكُمْ : تمہارا لوٹ کرجانا ہے] [ثُمَّ : پھر] [يُنَبِّئُكُمْ : وہ تمہیں خبر دے گا] [بِمَا كُنْتُمْ : جو تم تھے] [تَعْمَلُوْنَ : عمل کرتے]

ترجمہ: اور وہی ہے جو رات کے وقت تمہاری روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقییں قبض فرمالیتا ہے اور جو کچھ تم دن کے وقت کماتے ہو وہ جانتا ہے پھر وہ تمہیں دن میں اٹھا دیتا ہے تاکہ (تمہاری زندگی کی) معینّہ میعاد پوری کر دی جائے پھر تمہارا پلٹنا اسی کی طرف ہے، پھر وہ (روز محشر) تمہیں ان (تمام اعمال) سے آگاہ فرمادے گا جو تم (اس زندگانی میں) کرتے رہے تھے

تشریح:

نینداور بیداری کا یہ تسلسل جاری رہتا ہے یہاں تک کہ زندگی کا سفینہ وقت کے سمندر میں موجوں سے کھیلتا، طوفانوں سے الجھتا، بھنوروں سے بچتا موت کے ساحل پر لنگر انداز ہو جاتا ہے۔ اس کے پیچھے ایک آہنی دیوار کھڑی کر دی جاتی ہے۔ حال کے ہنگامے ماضی کی گود میں دم توڑ دیتے ہیں۔ ساری وابستگیاں اور دلبستگیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ ایک اور زندگی کی صبح طلوع ہوتی ہے۔ انسان اپنے مالک وخالق کے حضور میں جواب دہی کے لیے کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ یہاں "توفی "کا لفظ نیند کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کا حقیقی معنی ہے کسی چیز کو پورا پورا لے لینا۔ استیفاء الشیء (قرطبیؒ) کیونکہ نیند کے وقت انسان کا عقل وشعور معطل ہو جاتا ہے۔ چلنے پھرنے، دیکھنے سننے وغیرہ کی قوتیں بے کار ہو جاتی ہیں۔ اس لیے اس کے لیے توفی کا لفظ استعمال ہوا۔ اور موت کے وقت بھی مرنے والا کیونکہ اپنے مقررہ رات دن پورے گزار چکا ہوتا ہے اس لیے وہاں بھی توفی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ توفی المیت استوفی عدد ایام عمرہ والذی ینام کانہ استوفی حرکاتہ (قرطبیؒ) توفی کا یہ مفہوم خوب ذہن نشین رہے۔ تاکہ کوئی یہ بتا کہ توفی کا معنی موت ہے آپ کو حیات حضرت مسیح (علیہ السلام) سے منحرف نہ کر دے۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

انسان رات کو آرام کرنے کے لیے سوتا ہے اور نیند میں اس کا عقل وشعور معطل ہو جاتا ہے جو کہ ایک عارضی موت کی طرح ہے اور دن کو کام کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور بیداری میں اس کا عقل وشعور واپس آ جاتا ہے جو کہ ایک طرح سے دوبارہ زندگی ملنے کے مترادف ہے۔ رات اور دن کے آنے جانے کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے یہاں تک کہ اس کی زندگی کی مدت پوری ہو جاتی ہے اور وہ موت کے آغوش میں چلا جاتا ہے، پھر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے زندہ کرے گا اور اس کے سامنے اس کی زندگی کی فلم چلا دے گا جس سے اسے اپنے سارے اعمال نظر آ جائیں گے، پھر ان اعمال پر جزا وسزا کا فیصلہ صادر ہوگا، اچھے اعمال کے صلہ میں خوشی اور جنت ملے گی اور برے اعمال کے نتیجے میں شرمندگی اور جہنم سے واسطہ پڑے گا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر انسان کو بالآخر ایک دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے جہاں اس کی زندگی کے سارے اعمال ظاہر کر دیئے جائیں گے، لہٰذا آج اسے ہر غلط اقدام سے پہلے بار بار سوچنا چاہیے تاکہ کل میدان حشر میں اللہ تعالیٰ کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

دراصل اور وہ وہی ہے جو راتً کوً تمہاریً روحیںً قبض کرتا ہے۔ یعنی تمہاری جانیں تمام تصرفات سے نیند میں سلب فرمالیتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ دن میں کماؤ یعنی گناہوں وغیرہ سے جو کچھ تم کرتے ہو پھر تمہیں دن میں اٹھاتا ہے یعنی سلا کر جگاتا ہے دن میں تاکہ مقررہ مدت پوری ہو یعنی تمہاری دنیا کی زندگی کے دن پورے ہوں پھر اسی کی طرف تمہیں پھرنا ہے یعنی پھر تمہارا رجوع بعد موت کے بعثت میں ہے پھر وہ بتادے گا جو کچھ تم کرتے تھے اپنی زندگی کے لیل ونہار میں۔ بعض ارباب کلام اس کی یوں تصریح فرماتے ہیں کہ جسم انسان میں ہر حس کے لیے علیحدہ علیحدہ روح ہے جو نیند کے وقت قبض کر لی جاتی ہے پھر جب نیند چلی جاتی ہے تو وہ تمام ارواح لوٹا دیئے جاتے ہیں۔ مگر وہ روح جس سے انسان زندہ ہے وہ قبض نہیں کی جاتی مگر جب کہ اس کی زندگی کی مدت پوری ہو جائے۔ اور وہ ارواح معنوی ان سے مراد وہی روح ہے جو اس کے ساتھ وابستہ رہتی ہے جس سے سمع، بصر، اخذ، مشی، شم، یعنی، سننا، دیکھنا، پکڑنا، چلنا، سونگھنا دیکھنا وابستہ ہے۔ اور ثم یبعثکم فیہ سے مراد یہ ہے کہ تمہیں سلا کر جگا دیا جاتا ہے اور ارواح حواس لوٹا دی جاتی ہیں۔ اس سے یہ دلیل حاصل ہوئی کہ منکرین بعثت سمجھ سکیں کہ جب نیند میں ارواح حواس قبض کی جاتی ہے اور
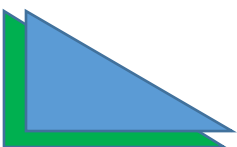
جاگنے میں وہ لوٹ آتی ہے۔ تو اسی طرح وہ روح جس سے حیات انسانی وابستہ ہے وہ بھی بعد موت واپس کر کے زندگی ہو سکتی ہے قلیلھا تقضی الی کثیرھا۔

(تفسیر الحسنات۔ علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)

نیند کا وفات صغری ہونا

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا کمال علم بیان فرمایا تھا کہ غیب اور شہادت کی کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا کمال بیان فرمایا ہے کہ وہ رات میں تمہاری روح قبض کرلیتا ہے اور دن میں پھر تمہاری روح لوٹا دیتا ہے اور تمہارے اس سونے اور جاگنے میں حشر و نشر کی دلیل ہے 'اور بالآخر تم نے اسی کی طرف لوٹنا ہے۔
اس جگہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ بلاشبہ سونے والا زندہ ہوتا ہے۔ وہ سانس لیتا ہے اور کروٹیں بدلتا ہے 'تو پھر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کس طرح درست ہوگا اور وہی رات میں تمہاری روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقیوں کو قبض کرلیتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ روح دو قسم کی ہیں۔
ایک روح کا تعلق احساس کے ساتھ ہے اور دوسری روح کا تعلق حیات اور حرکت بالارادہ کے ساتھ ہے۔ جب انسان سویا ہوا ہوتا ہے تو اس کی ارواح حساسہ ظاہر سے باطن میں چلی جاتی ہیں 'اس لیے اس کے حواس ظاہرہ عمل کرنے سے معطل ہو جاتے ہیں اور نیند کے وقت اس کے جسم کا ظاہر بعض اعمال سے معطل ہو جاتا ہے اور موت کے وقت اس کا پورا بدن ہر قسم کے عمل سے معطل ہو جاتا ہے 'اسی طرح نیند اور موت کی حالت میں ایک قسم کی مشابہت ہے اور اس اعتبار سے نیند پر بھی موت اور وفات کا اطلاق صحیح ہے۔
اس کے بعد فرمایا پھر اللہ تمہیں دن میں اٹھا دیتا ہے 'یعنی تمہاری ارواح حساسہ پھر باطن سے ظاہر میں لوٹا دی جاتی ہے اور تمہارے قوی ظاہرہ پھر کام کرنے لگتے ہیں 'تاکہ تم وہ کرسکو جو تمہارے مقدر کیے گئے ہیں اور جو عمر طبعی تمہارے لیے مقدر کردی گئی ہے 'اس کو تم پورا کرسکو ' اور اس کا کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے سونے اور جاگنے کے تسلسل کو جاری رکھتا ہے، تاآنکہ تم اپنی طبعی حیات کو پورا کرلو 'پھر تم نے دوبارہ زندہ ہو کر اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور وہ تم کو خبر دے گا کہ تم اپنی راتوں اور دونوں میں کیا کام کرتے تھے۔
نیند وفات صغری ہے اور موت وفات کبری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں وفاتوں کا ذکر درج ذیل آیت میں بھی فرمایا ہے۔
(آیت) "اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا فیمسك التی قضی علیھا الموت ویرسل الاخری الی اجل مسمی ان فی ذلك لایت لقوم یتفکرون"۔ (الزمر: ۴۲)
ترجمہ: جن کی موت کا وقت ہو اللہ ان کی جانوں کو قبض کرلیتا ہے اور جن کی موت کا وقت نہ ہو ان کی جانوں کو (بھی) نیند میں قبض کرلیتا ہے 'پھر جن کی موت کا حکم فرمادیا ان کی جانوں کو روک لیتا ہے اور دوسری (جانوں) کو ایک وقت مقررہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں۔

حدیث میں ہے ‘نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا نیند موت کا بھائی ہے

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا گیا ‘یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا اہل جنت کو نیند آئے گی؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا نیند موت کا بھائی ہے اور اہل جنت کو نیند نہیں آئے گی۔ (المعجم الاوسط ‘ ج ۱ ‘ رقم الحدیث : ‘۹۲۳ ‘ مسند البزار ‘ ج ۴ ‘ رقم الحدیث : ‘۳۵۱۷ ‘ حلیۃ الاولیاء ‘ ج ۷ ‘ ص ۹۰ ‘ علل متناھیہ ‘ ج ۲ ‘ رقم الحدیث : ‘۱۵۵۴ ‘ ۱۵۵۳ ‘ کامل ابن عدی ‘ ج ۴ ‘ ص ۱۵۳۳ ‘ مجمع الزوائد ‘ ج ۱۰ ‘ ص ۴۱۵)

حافظ الہیثمی نے کہا ہے کہ مسند البزار کی سند صحیح ہے۔

آیت مبارکہ :

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭحَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ۝۶۱

لغۃ القرآن : [وَهُوَ الْقَاهِرُ : اور وہ غالب ہے] [فَوْقَ : اوپر] [عِبَادِهٖ ؛ اپنے بندوں] [وَيُرْسِلُ : اور وہ بھیجتا ہے] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [حَفَظَةً : محافظ] [ۭ: یہاں تک کہ] [اِذَا جَاۗءَ : جب آتی ہے] [اَحَدَكُمُ : تمہارے ایک کو] [الْمَوْتُ : موت] [تَوَفَّتْهُ : فوت کرتے ہیں اسکو] [رُسُلُنَا : ہمارے فرشتے] [وَهُمْ : اور وہ] [لَا : نہیں] [يُفَرِّطُوْنَ : کوتاہی کرتے

ترجمہ : اور وہی اپنے بندوں پر غالب ہے اور وہ تم پر (فرشتوں کو بطور) نگہبان بھیجتا ہے، یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے (تو) ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اس کی روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی قبض کرلیتے ہیں اور وہ خطا (یا کوتاہی) نہیں کرتے

تشریح :

اللہ تعالیٰ بندوں کے تمام امور میں ہر طرح سے تصرف کرنے کی قدرت رکھتا ہے، وہی عطا کرتا اور وہی اپنی عطا روکتا ہے، وہی ملاتا اور وہی توڑتا ہے، وہی نفع و نقصان پہنچاتا ہے، وہی عزت و ذلت دیتا ہے، وہی زندگی اور موت دیتا ہے، اس کے فیصلے کو رد کرنے والا کوئی نہیں اور اس کے علاوہ اور کوئی جائے پناہ نہیں۔ (1) ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :

"وَاِنۡ يَّمۡسَسۡكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ‌ۚ وَاِنۡ يُّرِدۡكَ بِخَيۡرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضۡلِهٖ‌ؕ يُصِيۡبُ بِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ‌ؕ وَهُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ (۱۰۷)" (2)

ترجمہ : اور اگر اللہ تجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا کوئی تکلیف کو دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرمائے تو اس کے فضل کو کوئی رد کرنے والا نہیں۔ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنا فضل پہنچاتا ہے اور وہی بخشنے والا مہربان ہے۔ **وَيُرۡسِلُ عَلَيۡكُمۡ حَفَظَةً** : اور تم پر نگہبان بھیجتا ہے۔} ان سے مراد وہ فرشتے ہیں جو بنی آدم کی نیکی اور بدی لکھتے رہتے ہیں، انھیں کراماً کاتبین کہتے ہیں۔ ہر آدمی کے ساتھ دو فرشتے ہیں، ایک دائیں طرف اور ایک بائیں طرف۔ دائیں طرف کا فرشتہ نیکیاں لکھتا ہے اور بائیں طرف کا فرشتہ برائیاں لکھتا ہے۔

گناہ کرنے والے غور کریں

بندوں کو چاہیے کہ غور کریں اور بدیوں اور گناہوں سے بچیں کیونکہ ہر ایک عمل لکھا جاتا ہے اور روز قیامت وہ نامہ اعمال تمام مخلوق کے سامنے پڑھا جائے گا تو گناہ کتنی رسوائی کا سبب ہوں گے اللہ عَزَّوَجَلَّ پناہ دے۔ اسی کے پیش نظر امام محمد غزالی (رح) نے زبان کی حفاظت کے متعلق فرمایا: حضرت عطا بن ابی رباح (رح) فرماتے ہیں : تم سے پہلے لوگ فضول کلام کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ لوگ کتاب اللہ، سنتِ رسول، نیکی کی دعوت دینے،، برائی سے منع کرنے اور اپنی ایسی حاجت جس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ ہو کے علاوہ کلام کو فضول شمار کرتے تھے۔ کیا تم اس بات کا انکار کرتے ہو کہ تمہارے دائیں بائیں دو محافظ فرشتے کراماً کاتبین بیٹھے ہیں

" مَا يَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَيۡهِ رَقِيۡبٌ عَتِيۡدٌ "

کوئی بات وہ زبان سے نہیں نکالتا کہ اس کے پاس ایک محافظ تیار نہ بیٹھا ہو۔

کیا تمہیں اس بات سے حیا نہیں آتی کہ تمہارا نامہ اعمال جب کھولا جائے گا جو دن بھر صادر ہونے والی باتوں سے بھرا ہوگا، اور ان میں زیادہ تر وہ باتیں ہوں گی جن کا نہ تمہارے دین سے کوئی تعلق ہوگا نہ دنیا سے۔ ایک صحابی (رض) فرماتے ہیں "میرے ساتھ کوئی شخص بات کرتا ہے، اسے جواب دینا شدید پیاس کے وقت ٹھنڈے پانی سے زیادہ میری خواہش ہوتی ہے لیکن میں اس خوف سے اسے جواب نہیں دیتا کہ کہیں یہ فضول کلام نہ ہو جائے۔

{ **تَوَفَّتۡهُ رُسُلُنَا** : ہمارے فرشتے اس کی روح قبض کرتے ہیں۔} اِن فرشتوں سے مراد یا تو تنہا حضرت ملک الموت (علیہ السلام) ہیں، اس صورت میں جمع کا لفظ (رُسُل) تعظیم کے لیے ہے یا حضرت ملک الموت (علیہ السلام) اور وہ فرشتے مراد ہیں جو ان کے مددگار ہیں۔ جب کسی کی موت کا وقت آتا ہے تو حضرت ملک الموت (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے مددگاروں کو اس کی روح قبض کرنے کا حکم دیتے ہیں، جب

روح حلق تک پہنچتی ہے تو خود قبض فرماتے ہیں۔ (1) اور ان سب فرشتوں کی شان میں فرمایا کہ یہ کوئی کوتاہی نہیں کرتے یعنی تعمیل حکم میں ان سے کوتاہی واقع نہیں ہوتی اور ان کے عمل میں سستی اور تاخیر راہ نہیں پاتی بلکہ وہ اپنے فرائض ٹھیک وقت پر ادا کرتے ہیں۔

(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک وقت میں دنیا کے مختلف حصوں میں بیشمار لوگ فوت ہوتے ہیں تو ایک عزرائیل ان مختلف جگہوں سے کیسے روحیں قبض کرتا ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ سیوطی (رح) نے در منثور میں سورۃ الم السجدہ کی آیت نمبر 11 کی تفسیر میں کئی روایات درج کی ہیں، ان میں سے چار ملاحظہ کریں:

1۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا گیا: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ملک الموت تو ایک ہے اور مشرق و مغرب میں دو لشکر لڑتے ہیں اور ہلاک ہوتے ہیں (تو ملک الموت سب کی روحیں کیسے قبض کرتا ہے؟) فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کے لیے دنیا اس طرح گھیر دی ہے جس طرح ایک طشت تمہارے سامنے ہو، لہٰذا دنیا کی کوئی چیز ملک الموت سے چھوٹ نہیں سکتی۔

2۔ حضرت ابراہیم نے ملک الموت یعنی عزرائیل سے پوچھا کہ جب ایک شخص مشرق میں ہو اور دوسرا مغرب میں یا کسی ملک میں وبا پھوٹ پڑے یا دو لشکر آپس میں لڑائی شروع کر دیں تو آپ ان کی روحیں کیسے قبض کرتے ہیں؟ ملک الموت نے کہا: میں روحوں کو اللہ کے حکم سے پکارتا ہوں اور تمام روحیں میری ان دو انگلیوں کے درمیان آجاتی ہیں۔

3۔ حضرت ابن عباس سے دو ایسے اشخاص کے بارے میں پوچھا گیا جن میں سے ایک مشرق اور دوسرا مغرب میں ایک ہی وقت میں فوت ہوئے تو ملک الموت دو مختلف جگہوں سے ایک ہی وقت میں کیسے روحیں قبض کرتا ہے؟ فرمایا: ملک الموت کے سامنے مشرق، مغرب، ہوا، سمندر اور تاریکیاں ایسے ہی ہیں جیسے کسی آدمی کے سامنے دستر خوان ہو وہ جہاں سے چاہے لے لیتا ہے۔

4۔ ملک الموت کے سامنے زمین سمیٹ کر طشت کی طرح کر دی گئی ہے، لہٰذا وہ جس جگہ چاہتا ہے روح کو پکڑ لیتا ہے۔

مذکورہ روایات سے معلوم ہوا کہ ملک الموت کے لیے ظاہر و باطن اور دور و نزدیک میں کوئی فرق نہیں ہے، ساری زمین سمیٹ کر دستر خوان کی طرح اس کے سامنے رکھ دی گئی ہے۔ ملک الموت کی بصیرت واقعی بڑی وسیع ہے مگر اللہ تعالیٰ نے بصیرت کی جو وسعتیں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عطا فرمائی ہیں وہ فرشتوں سے کہیں زیادہ ہیں، جیسا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے تمام زمین کو میرے لیے لپیٹ دیا ہے اور میں نے اس کے مشارق اور مغارب کو دیکھ لیا ہے۔" (مسلم: حدیث نمبر 2889) اللہ تعالیٰ نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو صرف زمین ہی نہیں بلکہ آسمانوں کا علم بھی عطا فرمایا، جیسا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا ہاتھ میرے کندھوں کے درمیان رکھا جس کی ٹھنڈک میں نے اپنے سینے میں محسوس کی، پھر میں نے جان لیا جو کچھ آسمانوں میں تھا اور زمین میں تھا۔" (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

(ترمذی: تفسیر القرآن: حدیث نمبر 3233)

فرشتے بھی اللہ کے بندے اور نورانی مخلوق ہیں، بندہ کے معنی ہے، غلام، نوکر، حکم ماننے والا، بندگی کرنے والا، عبادت کرنے والا، اور فرشتے دن رات فقط اللہ تعالی کی عبادت، اطاعت اور تسبیح و تحمید میں مصروف و مشغول ہیں، قرآنِ مجید میں ہے:

(وَلَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ عِندَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ) [الأنبياء:19،20]

ترجمہ: "آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اُسی اللہ کا ہے اور جو اس کے پاس (فرشتے) ہیں وہ اس کی عبادت سے نہ سرکشی کرتے ہیں اور نہ تھکتے ہیں۔ وہ دن رات (اس اللہ کی) تسبیح بیان کرتے ہیں اور ذرا سی بھی سستی نہیں کرتے۔"

اسی طرح سورۂ زخرف میں ہے:

(وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَنِ إِنَاثًا أَشَهِدُوا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْأَلُونَ) [زخرف:19]

ترجمہ: "اور انہوں نے فرشتوں کو جو کہ خدا کے بندے ہیں عورت قرار دے رکھا ہے، کیا یہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے ان کا یہ دعویٰ لکھ لیا جاتا ہے اور (قیامت میں) ان سے بازپرس ہوگی"۔ (بنوری)

فرشتے ہر وقت انسان کے ساتھ ہیں جو اسے حوادث اور شیاطین کے جسمانی حملوں سے بچاتے ہیں۔ قرآن مجید میں:

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ۔ "اور بیشک تم پر محافظین مقرر ہیں"۔ (الانفطار۔10) لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ۔ "انسان کے لیے آگے پیچھے محافظ فرشتے ہیں جو اسے حکم خداوندی سے بچاتے ہیں"۔ (الرعد: 11) امام قرطبیؒ فرماتے ہیں مروی ہے کہ دو فرشتے رات کو ہر انسان کے لئے اترتے ہیں اور دو فرشتے دن کو ایک اس کے آگے چلتا ہے ایک پیچھے (قرطبیؒ جلد 7 صفحہ 6 [61]۔ امام کلبی روایت کرتے ہیں ہر انسان کی روح ملک الموت ہی قبض کرتا ہے پھر اگر مرنے والا مومن ہو تو اس کی روح رحمت والے فرشتوں کے سپرد کردیتا ہے اگر کافر ہو تو عذاب والے فرشتوں کے حوالے کرتا ہے (ابن جریر) گویا اگر ایک وقت میں دنیا کے ہزارہا مقامات پر لوگ مریں تو ملک الموت آنِ واحد میں ہر جگہ پہنچ کر سب کی ارواح کو بیک وقت قبض کرسکتا ہے۔

اولیاء اللہ کا آنِ واحد میں متعدد جگہ موجود ہونا

قاضی ثناءاللہ پانی پتی علیہ الرحمہ اس جگہ فرماتے ہیں۔ ملک الموت کی نذر ساری زمین پر ہے جیسے سورج ایک جگہ ٹھہر کر ساری زمین کو روشن کرتا ہے اسی طرح بعض اولیاء کی حالت یہ ہے کہ وہ اذن ربی سے انا واحد میں اجسام مثالیہ کے ساتھ متعدد مقامات پر حاضر ہوتے ہیں۔ (مظہری جلد 3 صفحہ 248)

اس موضوع پر امام جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے **المنجلی فی تطور الولی** اس میں انھوں نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اولیائے کاملین آنِ واحد میں متعدد مقامات پر حاضر ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے اس بات سے گفتگو کا آغاز کیا ہے کہ ولی کامل شیخ عبدالقادر طشطوطی (رح) ایک رات میں اپنے دو مریدوں کے ہاں رہے۔ جب ان دو مریدوں کی باہم ملاقات ہوئی تو ایک نے کہا: آج رات شیخ صاحب میرے گھر مقیم تھے دوسرے نے کہا وہ میرے گھر مقیم تھے ایک نے کہا اگر وہ آج رات میرے گھر مقیم نہ ہوئے تھے تو میری بیوی کو طلاق ہے دوسرے نے بھی یہی قسم اٹھالی۔

یہ مصالح امام سیوطی علیہ الرحمہ کے پاس لایا گیا کیا ان دونوں کی طلاق واقع ہوگی یا ان میں سے کسی ایک کی واقع ہوئی یا کسی کی طلاق جاری نہ ہوئی۔ امام سیوطی علیہ الرحمہ نے اس کے جواب میں یہ رسالہ لکھا **المنجلی فی تطور الولی** اور اس میں انھوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ یہ باب کرامت و معجزہ ہے اور انبیاء اولیاء آنِ واحد میں متعدد مقامات پہ اپنے اجسام مثالیہ کے ساتھ حاضر ہو سکتے ہیں۔ اس رسالہ میں انھوں نے کثیر ائمہ دین اور اولیائے کاملین کے اقوال و احوال لکھے ہیں۔

مثلاً انھوں نے شیخ سراج الدین بن الملقن کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ولی کامل شیخ قضیب البان موصلی علیہ الرحمہ طبقات اولیاء میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ موصل (عراق) ہی میں سن 750 ہجری میں ان کا وصال ہوا اور امام سیوطی فرماتے ہیں کہ شیخ قضیب البان ابدال زمانہ میں سے تھے، شدید رد کیا گیا کہ وہ نماز میں شامل نہیں ہوتے جب ان سے یہ کہا گیا تو بہت سے شیخ قضیب البان کھڑے ہو گئے، ہر طرف قضیب البان ہی کھڑے نظر آ رہے تھے اور وہ کہہ رہے تھے کہ بتاؤ کون سا قضیب البان نماز نہیں پڑھتا۔

(المنجلی فی تطور الولی مندرجہ الحاوی للفتاوی جلد 1 صفحہ 208 تا 212 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حاضر ناظر ہونا

ابن ابی حاتم نے اس آیت کے تحت زہیر بن محمد (رض) عنہٗ سے روایت کیا ہے کے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ نے ساری زمین پلیٹ کی طرح ملک الموت کے سامنے رکھ دی ہے جہاں سے جو چاہے اٹھا لے۔" (ابن ابی حاتم جلد 9 صفحہ 3105 حدیث 17830 مطبوعہ مکۃ المکرمہ) جب ملک الموت ساری زمین پر ہر وقت حاضر ناظر ہے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تصرف کا کیا عالم ہوگا کہ سب ملائک حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خدام ہیں۔

شارح بخاری امام قسطلانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

حتی لو کن المسلمون فی کل لمحۃ اکثر من الف الف لوسعھم ذالك القبال النبوی والالتفات الروحانی۔

اگر دس کروڑ آدمی مختلف اطراف عالم سے بیک وقت حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر درود شریف پڑھیں تو آپ سب کی طرف توجہ فرماتے اور سب کو سلام کا جواب دیتے ہیں۔ آگے آپ فرماتے ہیں: اگر سوال کیا جائے کہ تمام مشارق و مغارب سے درود و سلام بھیجنے والوں کو آپ بیک وقت کیسے جواب دے سکتے ہیں تو ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کیا آپ کا حال برزخ میں عزرائیل (علیہ السلام) سے افضل و اکمل ہے اور عزرائیل علیہ السلام آن واحد میں ایک لاکھ افراد کی جانے قبض کر سکتے ہیں اور ایک جان کا قبض کرنا انھیں دوسری جان کے قبض سے مشغول نہیں کرتا اور اس کے ساتھ وہ اپنے رب کی تسبیح و تقدیس میں بھی مصروف ہیں، یوں ہی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (برزخ میں) زندہ ہے نماز ادا کرتے اور اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں اور اس کے مشاہدہ میں مشغول رہتے ہیں اور ہر سلام کہنے والے کو جواب بھی دے لیتے ہیں (مواہب لدنیہ جلد 4 صفحہ 586 مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت)

اور امام سیوطی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:
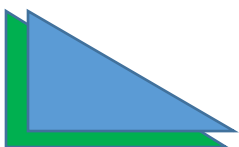
حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اشغال بعد از وصال یہ ہے کہ آپ کی نظر ساری امت کے اعمال پر ہے۔ آپ ان کے لئے استغفار کرتے اور ان کے لئے حل مشکلات کی دعا فرماتے ہیں اور اطراف عالم میں جہاں چاہیں آتے جاتے ہیں اور اس پر احادیث وآثار وارد ہیں۔ (انباء الاذکیاء صفحہ 7 مطبوعہ مصر)

مولانا عبدالحی لکھنوی دیوبندی مثال حاضر و ناظر کی بہت اچھی وضاحت کرتے ہیں۔ وہ اپنے والد کا قول نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

السر فی خطاب التشھد ان الحقیقۃ المحمدیۃ کانہا ساریۃ فی وجود کل وجود و حاضر فی باطن کل عبد و انکشاف ھذہ الھالۃ علی الاتم فی حالۃ الصلوۃ فحصل محل الخطاب۔

تشہد کے خطاب (السلام علیک ایھا النبی) میں یہ راز ہے کہ حقیقت محمدیہ گویا ہر وجود میں ساری ہے اور ہر عبد کے باطن میں حاضر ہے اور اس بات کا انکشاف مکمل طریقہ سے حالت نماز میں ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ خطاب برمحل ہے۔ (السعایۃ فی شرح الوقایۃ جلد دوم صفحہ 227 تا 228)

اسی طرح غیر مقلدین کے سند التحقیق نواب صدیق حسن خان بھوپالی مسئلہ حاضر و ناظر پر بہت خوبصورت روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

وبعض عرفاء قدس سرہ گفتہ اند کہ ایں خطاب بجہت سریان حقیقت محمدیہ است (علیہ الصلوۃ والسلام) در ذرائر موجودات وافراد ممکنات، پس آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) در ذوات مصلیان موجود و حاضر است، پس مصلی را باید کہ ازیں معنی آگاہ شود غافل نہ بود تا بانوار قرب و اسرار معرفت منور و فائز گردد۔ شعر

در راہ عشق محلّہ قرب و بعد نیست مے بینمت عیان و دعامی فرستمت

یعنی بعض عرفاء قدس سرہم کہتے ہیں کہ السلام علیک ایہا النبی کا خطاب اس لیے ہے کہ حقیقت محمدیہ کائنات کے ہر ذرہ میں اور ممکنات کے ہر فرد میں موجود ہے۔ للذا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خود نمازیوں کی ذات میں حاضر و موجود ہیں، للذا نمازی کو اس معنی سے غافل نہیں بلکہ آگاہ ہونا چاہیے۔ تاکہ وہ انوار قرب واسرار معرفت سے منور و فائز ہو۔ شعر (دور و نزدیک نہیں کچھ راہ وفا میں۔ دیکھ کر تجھ کو عیاں بھیجوں دعامیں) (مسلک الختام شرح بلوغ المرام صفحہ 459)

اس لیے ہم دیوبندی اور اہلحدیث علماء سے مخلصانہ گزارش کرتے ہیں کہ وہ مولانا عبدالحہ لکھنوی اور نواب صدیق حسن خان صاحب کی مذکورہ بالا تحریرات کی روشنی میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حاضر و ناظر ہونے کا معاملہ طے کریں۔ حضور سید اکائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حاضر و ناظر ہونا آپ کی ایک شان ہے جو بعض دلائل سے اشارۃً یا اقتضاءً حاصل ہے اور مومن کو چاہیے جہاں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی فضیلت ثابت ہوتی ہو تو اسے مانے اور حرز جاں بنائے یہی تقاضائے محبت صادقہ ہے۔

(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور وہی اپنے بندوں پر غالب ہے اور تم پر نگرانی کرنے والے فرشتے بھیجتا ہے ' (الایہ) (الانعام: ٦١)

اللہ تعالیٰ کے قہر کا معنی

اس سے پہلی آیتوں میں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت پر دلائل تھے اور اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت پر دلیل ہے۔ اس آیت کے شروع میں فرمایا ہے اور وہ اپنے بندوں پر قاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ کبھی عدم پر قہر فرماتا ہے تو ممکن کو عدم سے وجود میں لے آتا ہے اور کبھی وجود پر قہر فرماتا ہے تو ممکن کو وجود سے عدم کی طرف لے آتا ہے۔ اسی طرح وہ ہر چیز پر اس کی ضد سے قہر فرماتا ہے۔ مثلاً نور پر ظلمت کے ساتھ قہر فرماتا ہے اور ظلمت پر نور کے ساتھ 'دن پر رات کے ساتھ اور رات پر دن کے ساتھ قہر فرماتا ہے حیات پر موت کے ساتھ 'موت پر حیات کے ساتھ قہر فرماتا ہے اور یہ قہر کا ایسا بحر ہے جس کا کوئی ساحل نہیں ہے۔ وہ ہر چیز پر اس کی ضد کے ساتھ قہر فرماتا ہے۔ وہ مالک الملک ہے جس کو چاہتا ہے 'ملک عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک چھین لیتا ہے 'وہ جس کو چاہتا ہے 'عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے 'ذلت میں مبتلا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(آیت) "وان یمسسك اللہ بضر فلا کاشف لہ الا ھو وان یردك بخیر فلا راد لفضلہ"۔ (یونس: ۱۰۷)

ترجمہ: (اے مخاطب) اور اللہ اگر تجھے کوئی ضرر پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اسے دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے لیے کسی خیر کا ارادہ کرلے تو اس کے سوا کوئی اور اس کے فضل کو روکنے والا نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے دن کام کاج کے لیے بنایا ہے اور رات نیند کے لیے بنائی ہے۔ اگر انسان دن میں نیند کا معمول بنانا چاہیں اور رات کو کام کاج کا معمول بنانا چاہیں تو نہیں بنا سکتے۔ وہ قہراً رات کو سونے اور دن کو کام کاج پر مجبور ہیں۔ کتنی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان جاگنا چاہتا ہے اور نیند اس پر غالب آجاتی ہے اور کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ وہ سونا چاہتا ہے اور اس کو نیند نہیں آتی 'صحت اور بیماری اور حیات اور موت میں انسان کا مغلوب ہونا اور اللہ تعالیٰ کا ان پر غالب ہونا اور بھی واضح ہے۔

کراما کاتبین کی تعریف اور ان کے فرائض

اس کے بعد فرمایا اور وہ تم پر حفاظت کرنے والے فرشتے بھیجتا ہے۔ حفظۃ 'حافظ کی جمع ہے جیسے طلبہ طالب کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو بندوں کے اعمال کی حفاظت کرتے ہیں اور بندوں کی آفات سے حفاظت کرتے ہیں۔ قتادہ سے منقول ہے کہ وہ عمل 'رزق اور میعاد حیات کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ دو فرشتے رات کے اعمال کو لکھنے کے لیے ہیں اور دو دن کے اعمال کے لکھنے کے لیے ہیں۔ ایک فرشتہ نیکیوں کو لکھتا ہے اور دوسرا فرشتہ برائیوں کو لکھتا ہے 'اور مباح کاموں کے لکھنے میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ کل پانچ فرشتے حفظہ ہیں۔ دو دن کے 'دو رات کے اور ایک فرشتہ وہ ہے جو دن رات میں سے کسی بھی وقت جدا نہیں ہوتا۔

کراما کاتبین کے متعلق قرآن مجید کی آیات:

(آیت) "وان علیکم لحفظین، کراما کاتبین، یعلمون ما تفعلون"۔ (الانفطار: ۱۲۔۱۰)

ترجمہ: اور بیشک تم پر ضرور حفاظت کرنے والے (فرشتے مقرر) ہیں 'معزز لکھنے والے 'وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔

(آیت) "اذ یتلقی المتلقیان عن الیمین وعن الشمال قعید، ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید"۔ (ق: ۱۸۔۱۷)

ترجمہ: جب (اس کے ہر قول اور فعل کو) لے لیتے ہیں دو لینے والے (فرشتے) ایک دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف بیٹھا ہوتا ہے' وہ جو کچھ زبان سے کہتا ہے' اس کو لکھنے کے لیے ایک نگہبان (فرشتہ) تیار ہوتا ہے۔

(آیت) "ووضع الکتب فتری المجرمین مشفقین مما فیہ ویقولون یویلتنا مال ھذا الکتب لایغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصھا ووجدوا ما عملوا حاضرا ولا یظلم ربك احدا"۔ (الکھف: ۴۹)

ترجمہ: اور نامہ اعمال رکھ دیا جائے پس آپ دیکھیں گے کہ مجرم اس سے ڈر رہے ہوں گے جو اس میں (مذکور) ہے اور وہ کہیں گے ہائے ہماری کم بختی! یہ کیسا نوشتہ اعمال ہے کہ اس نے نہ کوئی چھوٹا گناہ چھوڑا ہے نہ بڑا گناہ' مگر اس کا احاطہ کرلیا ہے' اور جو کچھ انھوں نے کیا تھا' وہ سب اپنے سامنے موجود پائیں گے اور آپ کا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

کراما کاتبین کے فرائض اور وظائف کے متعلق احادیث

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے تمہارے پاس باری باری آتے ہیں اور فجر اور عصر کی نمازوں میں جمع ہوتے ہیں۔ پھر جن فرشتوں نے تمہارے ساتھ رات گزاری ہے' وہ اوپر چڑھ جاتے ہیں۔ ان کا رب ان سے سوال کرتا ہے' حالانکہ وہ ان سے زیادہ جاننے والا ہے' تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟ وہ کہتے ہیں ہم نے جس وقت ان کو چھوڑا تو وہ (فجر کی) نماز پڑھ رہے تھے اور جب ہم ان کے پاس گئے تو وہ (عصر کی) نماز پڑھ رہے تھے۔ (صحیح البخاری' ج ا رقم الحدیث: ۵۵۵' صحیح مسلم' المساجد ۲۱۰' (۶۳۲) ۱۴۰۵' سنن النسائی' ج ا' رقم الحدیث: ۴۸۷' ۴۸۶' السنن الکبری للنسائی' ج ۴' رقم الحدیث: ۷۷۶۰)

حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم برہنگی سے احتراز کرو' کیونکہ تمہارے ساتھ وہ (فرشتے) ہوتے ہیں جو تم سے بیت الخلاء اور عمل تزویج کے سوا کسی وقت جدا نہیں ہوتے' تم ان سے حیا کرو اور ان کا اکرام کرو۔ (سنن ترمذی' ج ۴' رقم الحدیث: ۲۸۰۹' شعب الایمان' ج ۶' رقم الحدیث: ۷۷۳۹)

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ ھ روایت کرتے ہیں:

مجاہد بیان کرتے ہیں کہ دائیں طرف کا فرشتہ نیکیاں لکھتا ہے اور بائیں طرف کا فرشتہ برائیاں لکھتا ہے۔

ابراہیم تیمی بیان کرتے ہیں کہ دائیں جانب کا فرشتہ بائیں جانب کے فرشتہ کا امیر ہوتا ہے' جب بندہ کوئی برائی کرتا ہے تو دائیں جانب والا فرشتہ بائیں جانب والے فرشتے سے کہتا ہے' رک جاؤ' شاید یہ توبہ کرلے۔

مجاہد بیان کرتے ہیں کہ ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے ہوتے ہیں۔ ایک دائیں جانب اور ایک بائیں جانب۔ جو دائیں جانب ہے' وہ نیکیاں لکھتا ہے اور جو بائیں جانب ہے' وہ برائیاں لکھتا ہے۔ (جامع البیان' جز ۲۶ ص ۲۰۵' ۲۰۴ مطبوعہ دار الفکر' بیروت)

خاتم الحفاظ حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ ھ لکھتے ہیں:

امام ابن ابی الدنیا نے الندیہ میں اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا نیکیاں لکھنے والا دائیں جانب ہے اور برائیاں لکھنے والا بائیں جانب ہے' جب بندہ کوئی نیکی کرتا ہے تو دائیں جانب والا دس نیکیاں لکھ لیتا ہے' اور جب وہ کوئی برائی کرتا ہے تو دائیں

جانب والا بائیں جانب والے سے کہتا ہے 'اس کو چھوڑ دو 'حتی کہ یہ تسبیح کرے یا استغفار کرے۔ پھر جب جمعرات کا دن آتا ہے تو اس وقت تک جو نیکیاں اور برائیاں ہوں 'وہ لکھ دی جاتی ہیں اور اس کے ماسوا کو چھوڑ دیا جاتا ہے 'پھر یہ نوشتہ لوح محفوظ پر پیش کیا جاتا ہے 'تو اس میں یہ تمام چیزیں لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔

امام ابن ابی الدنیا احنف بن قیس سے روایت کرتے ہیں کہ دائیں جانب والا نیکیاں لکھتا ہے اور وہ بائیں جانب والے فرشتہ پر امیر ہوتا ہے۔ اگر بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے رک جاؤ پھر اگر بندہ استغفار کرے تو وہ اس کو وہ گناہ لکھنے سے منع کرتا ہے اور اگر وہ استغفار کی بجائے گناہ پر اصرار کرتا ہے تو وہ اس گناہ کو لکھ لیتا ہے۔ (الدرالمنثور 'ج ۷ 'ص ۵۹۴ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت '۱۴۱۴ھ)

امام ابو محمد عبداللہ بن محمد المعروف بابی الشیخ الاصبہانی المتوفی ۳۹۶ھ روایت کرتے ہیں:

ابن جریج (رح) بیان کرتے ہیں دو فرشتے ہیں۔ ان میں سے ایک دائیں جانب ہے جو نیکیاں لکھتا ہے اور دوسرا فرشتہ بائیں جانب ہے 'جو برائیاں لکھتا ہے۔ جو دائیں جانب ہے وہ اپنے صاحب کی شہادت کے بغیر لکھتا ہے اور جو بائیں جانب ہے وہ اپنے صاحب کی شہادت کے بغیر نہیں لکھتا۔ اگر بندہ بیٹھ جائے تو ایک فرشتہ دائیں جانب ہوتا ہے اور دوسرا بائیں جانب اور اگر بندہ چلنے لگے تو ایک فرشتہ بندہ کے آگے ہوتا ہے اور ایک پیچھے 'اور اگر وہ سو جائے تو ایک فرشتہ اس کے سر کی جانب ہوتا ہے اور ایک پیروں کی جانب 'اور ابن المبارک (رح) نے کہا انسان کے ساتھ پانچ فرشتے مقرر کیے جاتے ہیں 'دو فرشتے رات کے 'دو دن کے 'یہ آتے جاتے رہتے ہیں اور پانچواں فرشتہ دن رات کے کسی وقت میں اس سے الگ نہیں ہوتا۔ (کتاب العظمہ 'رقم الحدیث: ۵۲۱ 'ص ۱۸۵ 'مطبوعہ مکتبہ دارالباز 'مکہ مکرمہ '۱۴۱۴ھ)

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ جب کسی مسلمان کے جسم کو کسی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے تو فرشتہ سے فرماتا ہے: اس کے اس عمل کو لکھتے رہو جو یہ کیا کرتے تھا 'پھر اگر اس کو شفا دیتا ہے تو اس کو غسل سے پاک کر دیتا ہے اور اگر اس کو روح کو قبض کر لیتا ہے تو اس کو بخش دیتا ہے اور اس پر رحم فرماتا ہے۔ (شعب الایمان 'ج ۷ 'رقم الحدیث: ۹۹۳۳ 'مطبوعہ دارالکتب العلیہ بیروت '۱۴۱۰ھ)

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو مسلم اپنے جسم کی کسی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے مرض میں اس کی صحت کے ہر نیک عمل کو لکھتا رہتا ہے۔

(شعب الایمان 'ج ۷ 'رقم الحدیث: ۹۹۳۴ 'مطبوعہ دارالکتب العلیہ بیروت)

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ اپنے بندہ مومن کے ساتھ دو فرشتے مقرر کر دیتا ہے جو اس کے عمل کو لکھتے رہتے ہیں۔ جب وہ بندہ فوت ہو جاتا ہے تو جو فرشتے اس کے عمل لکھتے تھے 'وہ اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ تو اب ہمیں اجازت دے تو ہم آسمان پر چڑھ جائیں۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے میرا آسمان ان فرشتوں سے بھرا ہوا ہے جو میری تسبیح کر رہے ہیں۔ وہ عرض کریں گے تو کیا ہم زمین میں قیام کریں؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میری زمین میری مخلوق سے بھری ہوئی ہوئی ہے جو میری تسبیح کر رہی ہے 'وہ کہیں گے پھر ہم کہاں جائیں؟ اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائے گا تم میرے اس بندہ کی قبر پر قیام کرو اور سبحان اللہ 'الحمد اللہ 'اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ پڑھو اور قیامت تک اس کو میرے اس بندہ کے لیے لکھتے رہو۔ (شعب الایمان 'ج ۷ 'رقم الحدیث: ۹۹۳۱ 'مطبوعہ دارالکتب العلیہ بیروت)

آیا دل کی باتوں کو کراما کاتبین لکھتے ہیں یا نہیں؟

بعض احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے دل کی باتوں اور ارادوں پر مطلع ہوتے ہیں اور ان کو لکھ لیتے ہیں۔

امام مسلم بن حجاج قشیری ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جب میرا بندہ کسی گناہ کا ارادہ کرے تو اس کو نہ لکھو اور اگر وہ اس پر عمل کرے تو اس کا ایک گناہ لکھ لو اور اگر وہ نیکی کا ارادہ کرے اور اس پر عمل نہ کرے تو ایک نیکی لکھ لو اور اگر وہ اس پر عمل کرے تو دس نیکیاں لکھ لو۔ امام مسلم نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے اور ایک روایت اس طرح کی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا فرشتے عرض کرتے ہیں اے رب! تیرا یہ بندہ گناہ کرنے کا ارادہ کر رہا ہے 'حالانکہ اسے گناہ پر خوب بصیرت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس کا انتظار کرو 'اگر یہ اس گناہ کو کرے تو اس کا ایک گناہ لکھ لو اور اگر اس کو ترک کر دے تو اس کی ایک نیکی لکھ لو 'کیونکہ اس نے میری وجہ سے اس گناہ کو ترک کیا ہے۔ (صحیح مسلم 'ایمان '۲۰۵ '۲۰۳ '(۱۲۸) ۳۲۷ 'صحیح البخاری 'ج ۸ 'رقم الحدیث: ۷۵۰۱ 'سنن ترمذی 'ج ۵ 'رقم الحدیث: ۳۰۸۴ 'سنن کبری للنسائی 'ج ٦ 'رقم الحدیث: ۱۱۸۱ 'صحیح ابن حبان 'ج ۲ 'رقم الحدیث: ۳۸۰ 'مسند احمد 'ج ۳ 'رقم الحدیث: ۷۳۰۰)

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ فرشتے دل کی باتوں اور ارادوں پر مطلع ہوتے ہیں اور بعض دیگر احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے دل کے احوال اور نیات پر مطلع نہیں ہوتے۔

امام عبداللہ بن محمد ابوالشیخ الاصبہانی المتوفی ۳۹٦ھ روایت کرتے ہیں۔

ضمرہ بن حبیب بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا فرشتے اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کے عمل لے کر اوپر چڑھتے ہیں 'اس عمل کو وہ بہت زیادہ اور بہت بابرکت گمان کرتے ہیں۔ وہ اللہ کی سلطنت میں جہاں تک اللہ چاہتا ہے 'اس دل کی نگہبانی کرنے والا ہوں۔ میرے اس بندہ نے یہ عمل میرے لیے اخلاص سے نہیں کیا 'اس کو سجین (جہنم کی ایک وادی) میں ڈال دو اور وہ اللہ عزوجل کے بندوں میں سے ایک اور بندے کے عمل کو لے کر اوپر چڑھیں گے 'اور عمل کو بہت کم گمان کریں گے۔ پھر وہ اللہ کی سلطنت میں سے جہاں تک اللہ چاہے گا 'اس عمل کو لے کر پہنچیں گے۔ پھر اللہ عزوجل ان کی طرف وحی فرمائے گا تم حفاظت کرنے والے ہو اور جو کچھ اس کے دل میں ہے 'میں اس پر نگہبان ہوں۔ اس کے اس عمل کو دگنا چوگنا کر دو اور اس کو علیین میں ڈال۔ (کتاب العظمہ 'رقم الحدیث: ۵۲۲ 'ص ۱۸۵ 'مطبوعہ بیروت 'کتاب الزھد لابن المبارک 'رقم الحدیث: ۴۵۲ 'مطبوعہ بیروت)

امام ابن المبارک کی روایت میں ہے میرے اس بندے نے اخلاص سے عمل کیا ہے 'اس کو علیین میں لکھ دو۔

بہ ظاہر ان حدیثوں میں تعارض ہے 'لیکن حقیقت میں تعارض نہیں ہے 'کیونکہ جس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے دل کی باتوں پر مطلع ہوتے ہیں۔ وہ صحیح بخاری 'صحیح مسلم 'صحیح ابن حبان اور سنن ترمذی اور سنن نسائی کی روایت ہے اور جس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے دل کی باتوں پر مطلع نہیں ہوتے 'وہ کتاب العظمہ اور کتاب الزھد کی روایت ہے اور ثانی الذکر کتابیں اول الذکر کتابوں کے پائے کی نہیں ہیں۔ نیز اول الذکر حدیث متصل ہے اور ثانی الذکر مرسل روایت ہے اور اول الزکر سندا صحیح ہے اور ثانی الزکر سندا ضعیف ہے۔ اس لیے ترجیح پہلی حدیث کو ہے اور راجح یہی ہے کہ فرشتے دل کی باتوں پر بھی مطلع ہوتے ہیں اور موخر روایت کی یہ توجیہ کی جا سکتی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ریا اور اخلاص کو

مستثنیٰ فرمایا ہے' اخلاص کو مخفی رکھا' تاکہ قیامت کے دن اس بندے کی عزت افزائی کی جائے اور ریا کو مخفی رکھا' تاکہ ریاکار کے عمل کی قیامت کے دن زیادہ رسوائی ہو' جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عدی بن حاتم (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن کچھ لوگوں کو جنت میں جانے کا حکم دیا جائے گا' حتیٰ کہ جب وہ جنت کے قریب ہوں گے اور جنت کی خوشبو سونگھیں گے' اور جنت کے محلوں کی طرف دیکھیں گے اور ان چیزوں کی طرف دیکھیں گے جو اللہ تعالیٰ نے جنتیوں کے لیے تیار کی ہیں تو ان کو ندا کی جائے گی کہ جنت سے واپس آجائیں' ان کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ وہ حسرت کے ساتھ جنت سے واپس آئیں گے اور کہیں گے' اے ہمارے رب! کاش! تو ہمیں اپنا ثواب دکھانے سے پہلے اور اپنے اولیاء کے لیے جو تو نے نعمتیں تیار کی ہیں ان کو دکھانے سے پہلے ہمیں دوزخ میں داخل کر دیتا تو یہ ہم پر آسان ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے یہ ارادہ اس وقت کیا تھا کہ جب تم خلوت میں ہوتے تو میرے ساتھ بہت بڑا مقابلہ کرتے تھے اور لوگوں کے سامنے تم میرے لیے عاجزی کرتے تھے۔ تم لوگوں کے لیے دکھاوا کرتے تھے اور تم اپنے دلوں سے مجھے اس کے خلاف دیتے تھے اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے اور مجھ سے نہیں ڈرتے تھے' اور تم لوگوں کو بزرگ جانتے تھے اور مجھے بڑا نہیں جانتے تھے۔ سو آج میں تم کو دردناک عذاب چکھاؤں گا اور تم کو چواب سے محروم کروں گا۔ (المعجم الاوسط' ج ۶' رقم الحدیث: ۵۴۷۴' المعجم الکبیر' ج ۱۷' رقم الحدیث: ۱۹۹' ص ۸۶' حلیۃ الاولیاء' ج ۴' ص ۱۲۵۔ ۱۲۴' شعب الایمان' ج ۵' رقم الحدیث: ۶۸۰۹' مجمع الزوائد' ج ۱۰' ص ۲۲۰)

اعمال کو لکھوانے کی حکمتیں:

اس میں اختلاف ہے کہ ایک شخص کی نیکیاں اور برائیاں لکھنے والے فرشتے ہر روز بدلتے ہیں یا اخیر عمر تک وہی فرشتے لکھتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بہرحال ثابت ہے کہ دن اور رات کے فرشتے بدلتے رہتے ہیں' اسی طرح اس میں اختلاف ہے کہ بندہ کی موت کی بعد فرشتے کیا کرتے ہیں؟ بعض نے کہا وہ آسمان پر جا کر عبادت کرتے ہیں' لیکن ہم شعب الایمان کے حوالے سے یہ حدیث ذکر کر چکے ہیں کہ وہ قیامت تک اس بندے کی قبر پر بیٹھ کر اس کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں۔

کراماً کاتبین جو بندوں کے اعمال لکھتے ہیں اس کی کیا حکمت ہے؟ ایک حکمت تو یہ ہے کہ قیامت کے دن بندہ کے سامنے اس کے خلاف ایک مادی حجت قائم کر دی جائے' تاکہ وہ اپنے کسی قول یا عمل سے انکار نہ کر سکے۔ دوسری حکمت یہ ہے کہ جب بندہ کو یہ معلوم ہوگا کہ اس کے اعمال لکھ کر محفوظ کیے جا رہے ہیں۔ اور برسر محشر لوگوں کے سامنے یہ اعمال پیش کیے جائیں گے' تو لوگوں کے سامنے اپنی برائیاں اور بے حیائیاں کھلنے کے خوف سے وہ برے اور فحش کاموں کے ارتکاب سے باز رہے گا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ فرشتوں نے ابن آدم کی پیدائش پر یہ کہا تھا کہ یہ زمین میں خون ریزی اور فتنہ و فساد کرے گا اور جب وہ خود اپنے ہاتھوں سے مسلمانوں کی نیکیاں لکھیں گے تو ان پر ابن آدم کی پیدائش کی حکمت کامل طریقہ سے واضح ہو گی۔ چوتھی حکمت یہ ہے کہ انسان کے اعمال میزان میں وزن کیے جائیں گے۔ بظاہر یہ مستبعد معلوم ہوتا ہے کیونکہ اعمال از قبیل اعراض ہیں' لہٰذا ہو سکتا ہے کہ اعمال کے وزن کرنے سے مراد صحائف اعمال کا وزن کرنا ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: 'حتیٰ کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے اس کی روح کو قبض کرتے ہیں اور وہ کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔ (الانعام: ۶۱)

(آیت) "اللہ یتوفی الانفس حین موتھا"۔ (الزمر: ۴۲)

ترجمہ: اللہ موت کے وقت روحوں کو قبض کرتا ہے۔

(آیت) "قل یتوفکم ملك الموت الذی وکل بکم ثم الی ربکم ترجعون"۔ (السجدہ: ۱۱)

ترجمہ؛آپ کہئے کہ موت کا فرشتہ تمہاری روح قبض کرتا ہے جو تم پر مقرر کیا گیا ہے 'پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

اور زیر تفسیر آیت میں فرمایا ہے ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے اس (کی روح) کو قبض کرتے ہیں۔ (الانعام: ٦١)

ان آیات میں اس طرح تطبیق دی گئی ہے کہ روح قبض کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اس اعتبار سے ہے کہ وہ روح قبض کرنے کا فاعل حقیقی ہے اور ملک الموت کی طرف اس اعتبار سے نسبت ہے کہ وہ ظاہری فاعل ہے اور روح قبض کرنے والے فرشتوں کا رئیس ہے 'اور دوسرے فرشتوں کی طرف اس اعتبار سے نسبت ہے کہ وہ روح قبض کرنے میں ملک الموت کے اعوان اور انصار ہیں۔ بعض صوفیاء نے کہا کہ انسان کے درجہ اور مقام کے اعتبار سے احوال مختلف ہوتے ہیں 'اس لیے بعض انسانوں کی روح اللہ تعالیٰ بلاواسطہ قبض کرتا ہے 'بعض کی روح، الملک الموت قبض کرتا ہے اور بعض کی دیگر فرشتے روح قبض کرتے ہیں۔

موت کے وقت مسلمانوں اور کافروں کی روحوں کے نکلنے کی کیفیت

امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مرنے والے کے پاس فرشتے آتے ہیں۔ پاس جب وہ کوئی نیک شخص ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں 'اے پاکیزہ روح نکلو تم پاکیزہ جسم میں تھیں 'تم تعریف کی ہوئی باہر آؤ 'تمہیں خوشی اور مسرت کی نوید ہو اور رب کے راضی ہونے کی بشارت ہو۔ اس کو یونہی کہا جاتا رہے گا 'حتی کہ روح باہر آ جائے گی۔ پھر وہ روح آسمان کی طرف چڑھے گی۔ اس کے لیے آسمان کو کھلوایا جائے گا۔ پوچھا جائے گا 'یہ کون ہے؟ پھر اسے بتایا جائے گا یہ فلاں ہے! آسمان والے کہیں گے 'پاکیزہ روح کو خوش آمدید ہو 'یہ پاکیزہ جسم میں تھی 'تم تعریف کی ہوئی داخل ہو۔ تمہیں خوشی اور مسرت کی بشارت ہو 'اور رب کے راضی ہونے کی نوید ہو۔ اس سے یونہی کہا جاتا رہے گا 'حتی کہ وہ اس آسمان (عرش الہی) میں پہنچے گی 'جس پر اللہ عزوجل جلوہ فرما ہے۔ اور جب مرنے والا کوئی برا شخص ہوتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں نکل اے خبیث (ناپاک) روح! تو خبیث جسم میں تھی 'نکل تو مذمت کی ہوئی ہے۔ تجھے کھولتے ہوئے بدبودار پانی کی بشارت ہو 'اور اسی قسم کے اور پانی کی۔ اسے یونہی کہا جاتا رہے گا 'حتی کہ وہ روح جسم سے نکلے گی۔ پھر اس کو آسمان کی طرف چڑھایا جائے گا 'اور اس کے لیے آسمان کو کھلوایا جائے گا۔ پوچھا جائے گا یہ کون ہے؟ پھر بتایا جائے گا 'یہ فلاں ہے پھر کہا جائے گا اس ناپاک روح کا آنا نامبارک ہو 'یہ ناپاک جسم میں تھی 'تو مذمت کی ہوئی واپس ہو جا 'تیرے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے 'پھر اس کو آسمان سے بھیج دیا جائے گا 'پھر قبر تک پہنچے گی۔

علامہ محمد احمد شاکر متوفی ۱۳۷٦ھ نے کہا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (مسند احمد 'ج ۸ 'رقم الحدیث: ۸۷۵۴ 'مطبوعہ دار الحدیث: القاہرہ 'مسند احمد 'ج ۲ 'ص ۳٦۵۔ ۳٦۴ 'طبع قدیم 'سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث: ۴۲٦۲)

امام ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب مومن پر موت کا وقت آتا ہے تو اس کے پاس رحمت کے فرشتے سفید ریشم کو لے کر آتے ہیں اور کہتے ہیں (اے روح) نکلو اور آنحالیکہ تم اللہ سے راضی ہو اور اللہ تم سے راضی ہو 'تم اللہ کی

راحت اور خوشی کی طرف نکلو ' اور رب کی رضا کی طرف نکلو۔ پھر روح مشک کی پاکیزہ خوشبو کی طرف نکلتی ہے ' حتی کہ بعض فرشتے اس روح کو لیتے ہیں اور اس کو آسمان کے دروازے کی طرف لاتے ہیں اور آسمان والے کہتے ہیں ' یہ کیسی پاکیزہ خوشبو ہے جو زمین کی طرف سے آئی ہے ؟ پھر وہ اس روح کو مومنین کی ارواح سے ملاتے ہیں اور وہ روحیں اس روح سے مل کر اسی طرح خوش ہوتی ہیں ' جیسے کوئی شخص اپنے بچھڑے ہوئے دوست سے مل کر خوش ہوتا ہے۔

پھر وہ اس سے پوچھتے ہیں کہ فلاں شخص کیسا ہے ؟ فلاں شخص کیسا ہے ؟ پھر کہتے ہیں کہ اس کو چھوڑو ' وہ دنیا کے غم میں ہے اور جب وہ کہتا ہے کہ کیا وہ تمہارے پاس نہیں آیا ؟ تو وہ کہتے ہیں ؟ کہ اس کو دوزخ میں ڈال دیا گیا ' اور جب کافر کے پاس موت کا وقت آتا ہے تو فرشتے اس کے پاس ٹاٹ کو لے کر آتے ہیں اور اس کو روح سے کہتے ہیں ' نکل درآنحالیکہ تو اللہ تعالیٰ سے ناراض ہے اور اللہ تجھ سے ناراض ہے۔ تو اللہ کے عذاب کی طرف نکل ' تو وہ انتہائی ناگوار بدبو کی طرح نکلتی ہے۔ حتی کہ وہ اس کو زمین کے دروازہ کی طرف لاتے ہیں اور زمین والے کہتے ہیں ' یہ کیسی ناگوار بدبو ہے ؟ پھر وہ اس کو کفار کی روحوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ (سنن نسائی ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ۱۸۳۲ ' صحیح ابن حبان ' ج ۷ ' رقم الحدیث : ۳۰۱۴ ' المستدرک ' ج ۱ ' ص ۳۵۳)

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ ھ لکھتے ہیں :

امام بزار اور امام ابن مردویہ نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب مومن پر موت کا وقت آتا ہے تو اس کے پاس فرشتے ریشم میں مشک اور گل ریحان کے گچھے لے کر آتے ہیں۔ پھر اس کے جسم سے روح اس طرح نکال لیتے ہیں جس طرح آٹے سے بال نکال لیا جاتا ہے ' اے پاکیزہ روح ' اللہ کی خوشی اور اس کی کرامت کی طرف راضیہ اور مرضیہ ہو کر چلو ' اور اس کو ریشم میں لپیٹ کر علیین کی طرف لے جاتے ہیں اور کافر پر جب موت کا وقت آتا ہے تو فرشتے ایک ٹاٹ میں انگارے لے کر آتے ہیں اور بڑی سختی سے اس کی روح کو کھینچتے ہیں اور کہا جاتا ہے ' اے ناپاک روح ' نکل درآنحالیکہ تو اللہ سے ناراض ہے اور اللہ تجھ سے ناراض ہے ' نکل اللہ کی دی ہوئی ذلت اور اس کے عذاب کی طرف۔ اور جب روح نکل جاتی ہے تو اس کو اس انگارے پر رکھ کر ٹاٹ میں لپیٹ دیا جاتا ہے اور اس کو سجین کی طرف لے جایا جاتا ہے۔ (شرح الصدور ' ص ٦٤ ' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ ' بیروت ' ۱۴۰۴ ھ) (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۫ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِیْنَ ۝62

لغۃ القرآن: [ثُمَّ رُدُّوْۤا : پھر لوٹائے جاتے ہیں] [اِلَى: طرف] [اللّٰهِ : اللہ] [مَوْلٰىهُمُ : ان کا مالک] [الْحَقِّ: حق] [اَلَا : خبردار] [لَهُ : اسکے لیے] [الْحُكْمُ: حکم] [وَهُوَ : اور وہ] [اَسْرَعُ : بہت جلد] [الْحٰسِبِیْنَ : حساب لینے والا]

ترجمہ : پھر وہ (سب) اللہ کے حضور لوٹائے جائیں گے جو ان کا مالک حقیقی ہے، جان لو ! حکم (فرمانا) اسی کا (کام) ہے، اور وہ سب سے جلد حساب کرنے والا ہے

تشریح:

یعنی جب لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوں گے تو فرشتے انھیں حساب کی جگہ میں اس اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی جزاء کی طرف لوٹائیں گے جو ان کے تمام امور کا حقیقی مالک ہے۔ اے لوگو ! سن لو، قیامت کے دن بندوں کے درمیان اسی کا فیصلہ نافذ ہے کسی اور کا کوئی فیصلہ کسی بھی طرح نافذ نہیں ہو سکتا اور وہ انتہائی قلیل مدت میں تمام مخلوق کا حساب کرنے والا ہے۔

حساب ہونے سے پہلے اپنا محاسبہ کر لیا جائے

علامہ اسماعیل حقی (رح) اس آیت کے تحت فرماتے ہیں "جب مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا اور اعمال کا حساب ہونا ہے اور اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق سے اس کے اعمال کا حساب لینا ہے تو عقلمند انسان پر لازم ہے کہ وہ حساب کے معاملے میں جرح ہونے سے پہلے ہی اپنے نفس کا محاسبہ کرلے کیونکہ انسان راہ آخرت میں تاجر ہے، اس کی عمر اس کا مال و متاع ہے، اس کا نفع اپنی زندگی کو عبادات اور نیک اعمال میں صرف کرنا ہے اور اس کا نقصان گناہوں اور معاصی میں زندگی بسر کرنا ہے اور اس کا نفس اس تجارت میں اس کا شریک ہے اور نفس اگرچہ نیکی اور برائی دونوں کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن یہ نیکی کے مقابلے میں گناہوں اور نفسانی خواہشات کی طرف زیادہ مائل اور متوجہ ہوتا ہے اس لیے اس کا محاسبہ کرنا انتہائی ضروری ہے

امام محمد غزالی (رح) فرماتے ہیں "انسان کو چاہیے کہ رات سوتے وقت ایک گھڑی مقرر کرے تاکہ وہ اپنے نفس سے اس دن کا سارا حساب کتاب لے سکے اور جس طرح کاروبار میں شریک شخص سے حساب کرتے وقت (انتہائی احتیاط اور) مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے اسی طرح اپنے نفس کے ساتھ حساب کرتے ہوئے بہت سی احتیاط کرنی چاہیے کیونکہ نفس بڑا مکار اور حیلہ ساز ہے، وہ اپنی خواہش کو انسان کے سامنے اطاعت کی شکل میں پیش کرتا ہے تاکہ انسان اسے بھی نفع شمار کرے حالانکہ وہ نقصان ہوتا ہے اور انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس سے مباحات تک کا حساب لے کہ یہ تو نے کیوں کیا، یہ تو نے کس کے لیے کیا اور اگر اس میں کوئی عیب دیکھے تو اپنے نفس کو اس کا ذمہ دار ٹھہرائے (لیکن افسوس کہ فی زمانہ) انسان کس طرح فارغ ہے کہ وہ اپنے نفس سے حساب نہیں لیتا، اگر انسان ہر گناہ پر اپنے گھر میں ایک پتھر بھی رکھتا جائے تو تھوڑے دنوں میں اس کا گھر پتھروں سے بھر جائے گا، اگر کراماً کاتبین اس انسان سے لکھنے کی مزدوری طلب کریں تو اس کے پاس کچھ باقی نہ رہے گا۔ اگر انسان کبھی غفلت میں چند بار سُبْحَانَ اللّٰہ پڑھتا ہے تو تسبیح ہاتھ میں لے کر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے میں نے یہ سو مرتبہ پڑھ لیا جبکہ سارا دن بیہودہ بکواسات کرتا پھرتا ہے انھیں شمار نہیں کرتا اور نہ ہی انھیں شمار کرنے کے لیے کوئی ایسی چیز ہاتھ میں لیتا ہے تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ میں نے سارے دن میں کتنے گناہ کئے ہیں۔ اس صورت حال کے باوجود یہ سوچنا کہ میرا نیکیوں کا پلڑا وزنی ہو جائے کتنی بے عقلی ہے! اسی لیے حضرت عمر فاروق (رض) نے فرمایا "اس سے پہلے کہ تمہارے اعمال تولے جائیں تم اپنے اعمال کا خود جائزہ لے لو۔ اور اپنا محاسبہ کرنے میں آپ (رض) کی کیفیت یہ تھی کہ جب رات ہوتی تو اپنے پاؤں پر درے لگاتے اور کہتے کہ بتا تو نے آج کیا کیا۔ حضرت انس (رض) فرماتے ہیں: میں نے حضرت عمر فاروق (رض) کو ایک دیوار کے پیچھے یہ کہتے ہوئے سنا "واہ واہ! لوگ تجھے امیر المومنین کہتے ہیں لیکن خدا کی قسم! تو اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا اور اس کے عذاب میں مبتلا ہونے کو تیار رہتا ہے۔

(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ لوگوں کو زندہ فرمائے گا تو فرشتے ان کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کریں گے جو ان کا حقیقی مالک ہے۔ اس دنیا میں تو نمرود اور فرعون جیسے کئی ظالم لوگ ناحق مالک بن کر اپنا حکم چلاتے رہے ہیں اور حقیقی مالک کو تسلیم نہیں کیا، مگر قیامت کے دن ہر خاص وعام اور کافر و مومن کو مشاہدہ ہو جائے گا کہ حقیقی مالک تو صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اس دن صرف اسی کے حکم کے مطابق فیصلے ہوں گے اور اس کا کوئی فیصلہ عدل وانصاف کے خلاف نہیں ہوگا۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ یہاں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ آدم سے لے کر قیامت تک آنے والے بیشمار انسانوں کا حساب وکتاب اور پھر ہر انسان کی زندگی کا پورا ریکارڈ چیک کرنا، اس پر تو بہت لمبا عرصہ لگے گا۔ مگر اللہ تعالیٰ کے کاموں کو اپنے کاموں پر قیاس کرنا جہالت ہے۔ وہ قادر مطلق ہے اور ایک انسان سے حساب لیتے وقت دوسرے انسانوں سے غافل نہیں ہوتا۔ جس طرح سورج ایک وقت میں دنیا کی ہر چیز کو اپنی روشنی سے منور کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی ایک وقت میں دنیا کے ہر انسان کو اپنی توجہ سے فیضیاب کرتا ہے۔ اگر ملک الموت کو دنیا کے مختلف حصوں سے روحیں قبض کرنے میں کوئی وقت نہیں لگتا تو اللہ تعالیٰ جو ملک الموت کا خالق ہے اس کو بھی تمام دنیا کا حساب لینے میں کسی وقت کی محتاجی نہیں ہے۔ زمان ومکان کی وسعتیں اس کی قدرت کے سامنے سمٹ جاتی ہیں اور جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو وہ صرف اتنا فرماتا ہے کہ "ہو جا "تو وہ ہو جاتا ہے۔ (قرآن: 2:117) حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا حساب دنیا کے دنوں میں سے نصف دن کی مقدار میں لے لے گا۔ (صفوۃ التفاسیر) دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا حساب اتنی دیر میں لے

لے گا جتنی دیر میں بکری کا دودھ دوہا جاتا ہے۔ (روح المعانی) ان احادیث میں اللہ تعالیٰ کی اپنی مشیت اور ارادہ کا اظہار ہے وگرنہ وہ کسی وقت کا محتاج نہیں ہے جیسا کہ حضرت علی (رض) سے پوچھا گیا کہ ایک وقت میں اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کا حساب کیسے لے گا؟ آپ نے فرمایا: جس طرح اللہ تعالیٰ ایک وقت میں سب انسانوں کو رزق دیتا ہے اسی طرح وہ ایک وقت میں ان کا حساب بھی لے سکتا ہے۔ (تفسیر الشعراوی)

تقسیم ایوارڈز کا سب سے بڑا اجتماع

قیامت کے پچاس ہزار سالہ طویل ترین دن میں حساب وکتاب کا مرحلہ اور جنت و دوزخ کا فیصلہ تو بالکل مختصر وقت میں مکمل ہو جائے گا، باقی سارے دن میں کیا ہو گا؟ آیئے قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کا جواب تلاش کرتے ہیں:

میدان حشر کی گرمی اور سختی سے گھبرا کر سارے انسان حضرت آدم کے پاس جا کر عرض کریں گے: آپ ہم سب کے باپ اور سب سے پہلے نبی ہیں۔ آج اللہ تعالیٰ کے ہاں ہماری شفاعت فرمائیں تاکہ حساب وکتاب کا سلسلہ شروع ہو۔ وہ فرمائیں گے: آج اللہ تعالیٰ جلال میں ہے مجھے تو خود اپنی فکر لاحق ہے، لہٰذا آپ اس سفارش کے لیے کسی اور کے پاس جائیں۔ سارے انسان مختلف انبیائے کرام (علیہم السلام) سے یہی جواب سنتے ہوئے آخر میں ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کے پاس آئیں گے۔ رحمت عالم حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس سفارش کی حامی بھر کر بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہو جائیں گے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: یا محمد! اپنا سر سجدہ سے اٹھاؤ تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی۔ (مسلم: کتاب الایمان: حدیث نمبر 326) اس تفصیل کو ایک شعر میں ملاحظہ کریں۔

خلیل و نجی، مسیح و صفی سبھی سے کہی کہیں نہ بنی
یہ بے خبری کہ خلق پھری، کہاں سے کہاں تمہارے لیے

اس کے بعد حساب وکتاب شروع ہو گا اور بہت جلد مکمل ہو جائے گا۔ اب کفار مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے اور ان کے لیے جہنم کا اعلان ہو گا، مگر کفار کو کیا خبر کہ جن اہل ایمان کو وہ زندگی میں ستایا کرتے تھے ان کو جنت میں کیا ملے گا کیونکہ کفار تو جنت میں جا نہیں سکیں گے، اس لیے اللہ تعالیٰ میدان حشر میں ان کفار کے سامنے اہل ایمان کو ایوارڈز اور اعزازات سے نوازیں گے تاکہ کفار کو بھی اہل ایمان کی عظمتوں کا مشاہدہ ہو جائے۔

میرے خیال میں یہ خدائی ایوارڈز کی تقسیم کا سب سے بڑا اجتماع ہو گا جس میں انسان اول حضرت آدم لے کر قیامت تک آنے والے سارے کافر اور مومن موجود ہوں گے۔ بنی نوع انسان کا اتنا بڑا اجتماع نہ پہلے کبھی ہوا اور نہ قیامت کے بعد کبھی ہو گا۔ اس اجتماع میں اہل ایمان خواتین و حضرات، کمسن بچوں اور کمسن بچیوں کو ان کے مراتب کے مطابق نورانی کرسیاں، عرش کا سایہ، حق شفاعت، نورانی جبے اور نورانی تاج عنایت کئے جائیں گے، مگر اعلیٰ قسم کے ایوارڈز انبیائے کرام کو ملیں گے جو نورانی منبروں پر تشریف فرما ہوں گے۔ اس سارے اجتماع میں ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کی شان نرالی ہو گی۔ اللہ تعالیٰ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سب

سے اعلیٰ ایوارڈ مقام محمود عطافرما کر اپنے ساتھ عرش پر بٹھائے گا۔ (تفسیر ابن جریر: سورۃ نمبر 17: آیت نمبر 79) اور آپ کی شفاعت سے گناہ گار اہل ایمان کی بخشش کا سلسلہ شروع ہوگا۔ وہ کیسا سہانا منظر ہوگا، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا حسن رضا خان بریلوی (رح) نے کیا خوب کہا:

فقط اتنا سبب ہے انعقاد بزم محشر کا
کہ ان کی شان محبوبی دکھائی جانے والی ہے

ایوارڈ یافتہ کے مخالفین کا حسد سے جلنا یا پشیمانی سے کف افسوس ملنا ایک فطری امر ہے۔ اسی لیے اس دن کافر اپنے ہاتھوں کو چبا چبا کر کہے گا: اے کاش! میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا راستہ اختیار کیا ہوتا۔ (قرآن: 25:27) یہ آیت پوری انسانیت کے لیے لمحہ فکریہ ہے تاکہ دنیا والے آج نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا راستہ اختیار کرلیں ورنہ آخرت میں پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کیا خوب کہا میرے اعلیٰ حضرت (رح) نے:

آج لے ان کی پناہ آج مدد مانگ سے
پھر نہ مانیں گے، قیامت میں اگر مان گیا

(امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پھر وہ اللہ کی طرف لوٹائے جائیں گے جو ان کا برحق مالک ہے، سنو اسی کا حکم ہے اور وہ سب سے جلد حساب لینے والا ہے۔ (الانعام: ٦٢)

اللہ تعالیٰ کے مولی اور حق ہونے کا معنی

اس آیت میں فرمایا ہے 'پھر وہ اللہ کی طرف لوٹائے جائیں گے جو ان کا ایسا مولی ہے جو حق ہے۔ مولی کا ایک معنی ہے آزاد کرنے والا 'اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو عذاب سے آزاد فرمادے گا 'جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ (مسند الحمیدی 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ١١٢٦) نیز اللہ تعالیٰ نے اپنی اضافت اپنے بندوں کی طرف فرمائی ہے 'یعنی ان کا مولی اور یہ اضافت انتہائی رحمت کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ پھر فرمایا ان کا مولی جو حق ہے 'اس میں یہ اشارہ ہے کہ دنیا میں انسان باطل آقاؤں کے ماتحت تھا اور وہ نفس 'شہوت اور غضب کے احکام کی اطاعت کرتا تھا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(آیت) "ارءیت من اتخذ الھہ ھوہ"۔ (الفرقان: ۴۳)

ترجمہ: کیا آپ نے اسے دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کر اپنا معبود بنالیا۔

اور جب انسان مر جاتا ہے تو باطل آقاؤں کے احکام کی اطاعت سے آزاد ہو جاتا ہے اور صرف اپنے حقیقی مولی کے زیر تصرف آجاتا ہے۔

”روح“ کے انسان کی حقیقت ہونے پر امام رازی کے دلائل

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ ھ لکھتے ہیں :

یہ آیت اس پر قوی دلیل ہے کہ انسان کی حقیقت یہ جسم نہیں ہے ' بلکہ یہ روح ہے۔ کیونکہ اس آیت میں صراحتا یہ فرمایا ہے کہ انسان مر جائے گا اور مرنے کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹایا جائے گا ' اور اس مردہ جسم کا اللہ کی طرف لوٹانا تو ممکن نہیں ہے ' تو ثابت ہوا کہ اس کی روح کو اللہ کی طرف لوٹایا جائے گا اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بدن کے ساتھ تعلق سے پہلے روح موجود تھی ' کیونکہ اس عالم سے اللہ کی بارگاہ کی طرف روح کا لوٹانا اسی وقت ہو سکتا ہے جب روح پہلے سے موجود ہو اور یہ آیت بھی اس پر دلالت کرتی ہے :

(آیت) " ارجعی الی ربك "۔ (الفجر : ۲۸)

ترجمہ : اپنے رب کی طرف لوٹ جا۔ (تفسیر کبیر ' ج ۴ ' ص ۶۰۔ ۵۹ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت ' ۱۳۹۸ ھ)

امام رازی کے دلائل پر بحث و نظر

امام رازی کی اس تقریر سے معاد جسمانی کا انکار لازم آتا ہے ' جبکہ اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ انسان کا حشر روح مع الجسم ہوگا اور اس مردہ جسم کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ زندہ کر دے گا ' اور جسم میں روح ڈال کر اس کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اس جسم کے زندہ کیے جانے اور اللہ کے سامنے اس کے پیش کیے جانے پر دلائل مذکور ہیں۔

(آیت) " وقالوا اذا کنا عظاما ورفاتاء انالمبعوثون خلقا جدیدا، اولم یروا ان اللہ الذی خلق السموت والارض قادر علی ان یخلق مثلھم وجعل لھم اجلا لاریب فیہ فابی الظلمون الا کفورا "۔ (بنواسرائیل : ۹۹۔ ۹۸)

ترجمہ ؛ اور انھوں نے کہا جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا واقعی ہم از سر نو پیدا کیے جائیں گے ' کیا انھوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ان کی مثل بنانے پر قادر ہے اور اس نے ان کے لیے موت کا ایک وقت مقرر کر رکھا ہے جس میں کوئی شبہ نہیں ہے ' پس ظالموں نے کفر کرنے کے سوا ہر بات کا انکار کر دیا۔

(آیت) " قال من یحی العظام وھی رمیم، قل یحییھا الذی انشاھا اول مرۃ "۔ (یس : ۷۹۔ ۷۸)

ترجمہ : اس نے کہا جب ہڈیاں بوسیدہ ہو کر گل جائیں گی تو ان کو کون زندہ کرے گا ؟ آپ کہیے انھیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلی بار انھیں پیدا کیا تھا۔

قرآن مجید کی ان آیتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف صرف روح نہیں لوٹائی جائے گی ' بلکہ روح اور جسم دونوں لوٹائے جائیں گے اور انسان صرف روح کا نام نہیں ہے ' بلکہ روح اور جسم دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ رہا یہ اعتراض کہ پیدا ہونے کے بعد جسم کی ساخت اور اس کی تشخص میں عمر کے ساتھ تبدیلی آتی رہتی ہے اور مرنے کے بعد جسم بوسیدہ ہو کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے اور انسان واحد کی حقیقت اور اس کا تشخص تو معین اور غیر متبدل ہونا چاہیے اور وہ تعین تو صرف روح میں ہے ' اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کے جسم میں اجزاء اصلیہ ہوتے

ہیں جو اس کے جسم کے تمام مختلف ادوار میں مشترک رہتے ہیں اور ان ہی اجزاء کے ساتھ روح کا تعلق ہوتا ہے اور انسان کی حقیقت اور اس کے تشخص کا مدار روح اور ان اجزاء اصلیہ پر ہے۔

جسم سے پہلے روح کے پیدا ہونے پر دلائل اور بحث و نظر

البتہ امام رازی کا یہ کہنا صحیح ہے کہ روح کو جسم سے پہلے پیدا کیا گیا ہے اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے :
حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا روحیں مجتمع لشکر ہیں 'جو ان میں سے ایک دوسرے سے متعارف ہوتی ہیں وہ ایک دوسرے سے الفت رکھتی ہیں 'اور جو ایک دوسرے سے ناآشنا ہوتی ہیں 'وہ آپس میں اختلاف کرتی ہیں۔ (صحیح البخاری 'ج ۴ 'رقم الحدیث : ۳۳۳۶ 'صحیح مسلم "۱۵۹ '(۲۶۳۸) ۶۵۸۴ 'سنن ابوداؤد 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۴۸۳۴ 'مسند احمد 'ج ۲ 'ص ۵۳۷ "۵۲۷ '۲۹۵ 'طبع قدیم)
حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ ھ لکھتے ہیں
اس حدیث سے مراد یہ ہو سکتی ہے کہ اس سے ابتداء خلقت کی خبر دینا مقصود ہو 'جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ روحوں کو جسموں سے پہلے پیدا کیا گیا ہے اور جب روحوں کا جسموں میں حلول ہو تو ان کی آپس میں شناسائی یا عدم شناسائی عالم ارواح کے اعتبار سے ہوئی 'تو روحیں جب دنیا میں ایک دوسرے سے ملیں تو ان کا ایک دوسرے سے متفق یا مختلف ہونا بھی اسی سابق شناسائی یا عدم شناسائی کے اعتبار سے تھا۔ (فتح الباری 'ج ۶ 'ص ۳۶۹ 'مطبوعہ لاہور '۱۴۰۱ ھ)
حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ ھ نے بھی لکھا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روحوں کو جسموں سے پہلے پیدا کیا ہے۔ (الحاوی للفتاوی 'ج ۲ 'ص ۱۰۰ 'مطبوعہ المکتبہ النوریہ الرضویہ 'لائلپور 'پاکستان)
علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ ھ نے بھی لکھا ہے : کہ حدیث میں ہے کہ روحوں کو جسموں سے پہلے پیدا کیا گیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ جسموں کے فنا ہونے کے بعد بھی روحیں باقی رہتی ہیں۔ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حدیث میں ہے شہداء کی روحیں سبز پرندوں کے پوٹوں میں رہتی ہیں۔ (عمدۃ القاری ج ۱۵ ص '۲۱۶ 'مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ 'مصر ۱۳۴۸ ھ)
حافظ عسقلانی اور حافظ سیوطی نے یہ تو لکھا ہے کہ روحیں جسموں سے پہلے پیدا کی گئی ہیں 'لیکن یہ نہیں لکھا کہ یہ حدیث کس امام نے کسی صحابی سے روایت کی ہے؟ البتہ علامہ ابن قیم جوزیہ نے لکھا ہے کہ امام ابو عبداللہ بن مندہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عمرو بن عنبہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بندوں کی روحیں بندوں سے دو ہزار سال پہلے پیدا کی گئی ہیں۔ سو جو روحیں ایک دوسرے سے متعارف تھیں 'وہ ایک دوسرے سے الفت رکھتی ہیں اور جو روحیں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھیں 'وہ ایک دوسرے سے اختلاف کرتی ہیں۔ (الروح 'ص ۱۵۴۔ ۱۵۳ 'مطبوعہ دارالحدیث 'قاہرہ '۱۴۱۰ ھ)
پھر علامہ ابن قیم جوزیہ متوفی ۷۵۱ ھ نے اس حدیث کی سند پر اعتراض کیا ہے کہ اس میں ایک راوی عتبہ بن سکن ہے۔

امام دار قطنی نے اس کے متعلق یہ کہا کہ یہ متروک ہے اور ایک راوی ارطاۃ بن منذر ہے۔ امام ابن عدی نے کہا اس کی بعض احادیث غلط ہیں۔ (الروح ص ۱۶۵ 'مطبوعہ قاہرہ)

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کی اصل صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے جس کو ہم نے شروع میں بیان کیا ہے۔ اس میں اگرچہ دوہزار سال پہلے کے الفاظ نہیں ہیں 'لیکن وہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ روحیں ایک مجتمع لشکر کی صورت میں پہلے پیدا ہو چکی تھیں۔ نیز اس کی مزید تائید ان حدیثوں سے ہوتی ہے۔

امام ابوعیسی محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب اللہ نے آدم کو پیدا کیا تو ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا تو ان کی پشت سے ہر وہ روح گر گئی جس کو وہ ان کی اولاد سے قیامت تک پیدا کرنے والا ہے اور اس نے ان میں سے ہر انسان کی دو آنکھوں کے درمیان نور کی ایک چمک بنائی۔ پھر ان سب کو حضرت آدم (علیہ السلام) پر پیش کیا 'حضرت آدم (علیہ السلام) نے کہا اے میرے رب یہ کون لوگ ہیں ؟ فرمایا یہ تمہاری اولاد ہے۔ حضرت آدم (علیہ السلام) نے ان میں سے ایک شخص کو دیکھا جس کی دونوں آنکھوں کے درمیان کی چمک انھیں بہت اچھی لگی۔ پوچھا اے میرے رب ! یہ کون ہے ؟ فرمایا یہ تمہاری اولاد میں سے آخری امتوں میں سے ایک شخص ہے۔ اس کو داؤد کہا جاتا ہے 'حضرت آدم (علیہ السلام) نے پوچھا اے میرے رب ! اس کی عمر کتنی ہے ؟ فرمایا ساٹھ سال۔ عرض کیا اے میرے رب ! میری عمر سے چالیس سال اس کی عمر زیادہ کردے 'جب حضرت آدم (علیہ السلام) کی عمر پوری ہو گئی تو اس کے پاس ملک الموت آئے۔ حضرت آدم (علیہ السلام) نے کہا کیا ابھی میری عمر سے چالیس سال باقی نہیں ہیں ؟ ملک الموت نے کہا کیا آپ نے اپنے بیٹے داؤد کو یہ عمر نہیں دی ؟ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا حضرت آدم (علیہ السلام) نے انکار کیا تو ان کی اولاد نے بھی انکار کیا اور حضرت آدم بھول گئے تو ان کی اولاد بھی بھول گئی اور حضرت آدم (علیہ السلام) نے (اجتہادی) خطا کی تو ان کی اولاد نے بھی خطا کی۔ امام ابو عیسیٰ نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے اور یہ متعدد سندوں کے ساتھ از ابوہریرہ (رض) از نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مروی ہے۔ (سنن ترمذی 'ج ۵ 'رقم الحدیث : ۳۰۸۷ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت ۱۴۱۴ھ)

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کی پشت سے ان کی تمام اولاد کی روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقیوں کو نکالا گیا ' جس سے یہ واضح ہو گیا کہ روحوں کو جسموں سے پہلے پیدا کیا گیا ہے۔

نیز امام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری متوفی ۴۰۵ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابی بن کعب (رض) روایت کرتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کی اولاد کو ان کی پشتوں سے نکالا جو قیامت تک پیدا ہونے والے تھے 'پہلے ان کو ارواح بنایا 'پھر ان کو صورتیں دیں اور گویائی عطا کی 'وہ بولنے لگے۔ پھر ان سے عہد اور میثاق لیا اور ان کو اپنی جانوں پر گواہ کیا 'کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں ؟ انھوں نے کہا کیوں نہیں ؟ ہم نے گواہی دی ! (یہ اس لیے کہ) کہیں تم قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم اس عہد سے غافل تھے 'اور ہم نے تمہارے باپ آدم کو تم پر گواہ کیا ہے کہ تم یہ کہو کہ ہم کو پتا نہ تھا 'یا یہ کہو کہ ہم اس سے غافل تھے۔ سو تم میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا 'کیونکہ میں تمہاری طرف رسول بھیجوں گا جو تم کو میرا عہد اور میثاق یاد دلائیں گے اور میں تم پر اپنی کتابوں کو نازل کروں گا۔ پس انھوں نے کہا ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو ہمارا رب اور ہمارا معبود ہے۔ تیرے سوا کوئی ہمارا رب نہیں ہے 'نہ

تیرے سوا کوئی معبود ہے۔ حضرت آدم (علیہ السلام) نے ان کی طرف دیکھا تو ان میں غنی اور فقیر اور خوبصورت اور بد صورت لوگوں کو دیکھا تو حضرت آدم (علیہ السلام) نے کہا اے میرے رب! اگر تو اپنے تمام بندوں کو برابر کر دیتا اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میرا شکر ادا کیا جائے۔ پھر حضرت آدم (علیہ السلام) نے چراغوں کی طرح روشن انبیاء (علیہم السلام) کو دیکھا ' ان سے نبوت اور رسالت کا عہد ومیثاق لیا گیا اور اس میں ان آیتوں کی تصدیق ہے:

(آیت) "واذ اخذنا من النبیین میثاقھم ومنك ومن نوح وابراھیم وموسی وعیسیٰ ابن مریم واخذنا منھم میثاقا غلیظا"۔ (الاحزاب: ۷)

ترجمہ: اور (یاد کیجئے) جب ہم نے نبیوں سے میثاق لیا اور آپ سے اور نوح سے اور ابراہیم سے اور موسیٰ سے اور عیسیٰ بن مریم سے اور ہم نے ان سے پختہ میثاق لیا۔

(آیت) "فاقم وجھك للدین حنیفا فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ"۔ (الروم: ۳۰)

ترجمہ: سو آپ اللہ کی اطاعت کے لیے اپنی ذات کو ثابت قدم رکھیں ادیان باطلہ سے اعراض کرتے ہوئے ' اپنے آپ کو اللہ کی بنائی ہوئی سرشت پر لازم کر لو ' جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے ' اللہ کی سرشت میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔

(آیت) "ھذا نذیر من النذر الاولی"۔ (النجم: ۵۶)

ترجمہ: یہ ایک ڈرانے والے ہیں پہلے ڈرانے والوں میں سے۔

(آیت) "وما وجدنا لاکثرھم من عھد وان وجدنا اکثرھم لفسقین"۔ (الاعراف: ۱۰۲)

ترجمہ: اور ہم نے ان کے اکثر لوگوں سے عہد کی وفا نہیں پائی اور ہم نے ان میں سے اکثر کو نافرمان ہی پایا۔

(آیت) "ثم بعثنا من بعدہ رسلا الی قومھم فجآء وھم بالبینات فما کانوا لیؤمنوا بما کذبوا بہ من قبل"۔ (یونس: ۱۰)

ترجمہ: پھر نوح کے بعد ہم نے ان لوگوں کی طرف رسول بھیجے جو ان کے پاس روشن دلیلیں لے کر آئے تو وہ ان پر ایمان لانے کے لیے تیار نہ ہوئے ' کیونکہ وہ اس سے پہلے ان کی تکذیب کر چکے تھے۔

پس حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی روح ان ارواح میں سے تھی جن سے آدم (علیہ السلام) کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے عہد لیا تھا ' پھر اللہ تعالیٰ نے یہ روح حضرت مریم کی طرف بھیجی ' جو اپنے گھر والوں سے الگ ہو کر ایک شرقی مقام میں آگئی تھی۔ پھر لوگوں کی طرف سے انھوں نے ایک پردہ بنالیا ' تو ہم نے ان کی طرف اپنے ایک فرشتہ کو بھیجا جس نے ان کے سامنے ایک تندرست آدمی کی صورت اختیار کی۔۔ پھر مریم نے اس کو اپنے پیٹ میں لے لیا اور یہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی روح تھی۔

یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور شیخین نے اس کو روایت نہیں کیا۔ امام ذہبی نے بھی اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ (المستدرک ' ج ۲ ' ص ۳۲۳۔ ۳۲۴ ' مطبوعہ دارالباز ' مکہ مکرمہ)

اس حدیث میں بھی یہ تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی پشت سے ان کی اولاد کی روحوں کو نکالا اور ان دونوں حدیثوں کی تصدیق اس آیت میں ہے۔
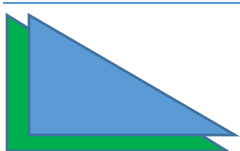
(آیت) "واذ اخذ ربك من بنی ادم من ظهورهم ذريتهم واشهدهم على انفسهم الست بربكم قالوا بلى شهدنا ان تقولوا يوم القيمة انا كنا عن هذا غفلين"۔ (الاعراف : ۱۷۲)

ترجمہ : اور (یاد کیجئے) جب آپ کے رب نے بنو آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو ان کی جانوں پر گواہ بنایا (فرمایا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں ' سب نے کہا کیوں نہیں ! ہم نے گواہی دی (یہ اس لیے کہ) کہیں تم قیامت کے دن کہو ہم تو اس سے بے خبر تھے۔

علامہ ابن قیم نے ان دلائل کے معارضہ میں یہ حدیث پیش کی ہے کہ فرشتہ ماں کے پیٹ میں روح پھونکتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ روح جسم کے ساتھ یا اس کے بعد حادث ہوتی ہے ' وہ حدیث یہ ہے :

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵٦ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اور آپ صادق اور مصدوق ہیں ' کہ تم میں سے ہر ایک کی خلقت اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک جمع کی جاتی ہے (یعنی نطفہ) پھر وہ جما ہوا خون بن جاتا ہے ' پھر چالیس دن کے بعد وہ گوشت کا ٹکڑا بن جاتا ہے ' پھر چالیس دن کے بعد اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتا ہے اور اس کو چار کلمات لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے ' اور اس سے کہا جاتا ہے اس کا عمل لکھو اور اس کا رزق اور شقی یا سعید ہونا ' پھر وہ اس میں روح پھونکتا ہے۔ بیشک تم میں سے ایک شخص عمل کرتا رہتا ہے حتی کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر لکھا ہوا غالب آجاتا ہے ' پھر وہ دوزخیوں کا عمل کرتا ہے اور ایک شخص عمل کرتا رہتا ہے حتی کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر لکھا ہوا غالب آجاتا ہے پھر وہ جنتیوں کا عمل کرتا ہے۔

(صحیح البخاری ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ۳۳۳۲ ' ۳۳۰۸ ' ج ۷ ' رقم الحدیث : ٦۵۹٤ ' ج ۸ ' رقم الحدیث : ۷٤۵٤ ' صحیح مسلم قدر ' ۱ ' (۲٦٤۳) ٦۵۹۹ ' سنن الترمذی ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ۲۱٤٤ ' سنن ابوداؤد ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ٤۷۰۸ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۷٦ ' صحیح ابن حبان ' ج ١٤ ' رقم الحدیث : ٦۱۷٤ ' مسند احمد ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۳٦۱٤ ' مسند حمیدی ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۱۳۱ ' سنن کبری للنسائی ' رقم الحدیث : ۱۱۲٤٦ ')

ہر چند کہ اس حدیث کا ظاہر معنی یہ ہے کہ جس وقت فرشتہ پھونک مارتا ہے ' اس وقت اللہ تعالیٰ اس میں روح پیدا کرتا ہے لیکن دوسرے دلائل سے مطابقت کے لیے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ فرشتہ کے پھونک مارتے وقت اللہ تعالیٰ اس میں وہ روح بھیج دیتا ہے جو اس سے پہلے پیدا کی جاچکی ہے۔

قیامت کے دن جلد حساب لینے کا بیان

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا سنو ! اسی کا حکم ہے یعنی صورۃ اور معنا ہر طرح اسی کا حکم ہے۔ اس آیت سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ کسی شخص کی اطاعت ثواب کو واجب نہیں کرتی اور کسی شخص کی معصیت عذاب کو واجب نہیں کرتی کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اطاعت کرنے والے کا یہ حق ہوتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ثواب عطا کرنے کا حکم دے ' حالانکہ اللہ تعالیٰ پر کسی کا حکم نافذ نہیں ہوسکتا ' بلکہ ہر چیز پر اسی کا حکم نافذ ہے۔

اس کے بعد فرمایا اور وہ سب سے جلد حساب لینے والا ہے حسب ذیل آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے جلد حساب لینے کے متعلق فرمایا ہے:

(آیت) "واللہ یحکم لا معقب لحکمہ وھو سریع الحساب"۔ (الرعد: ۴۱)

ترجمہ: اللہ حکم فرماتا ہے اور اس کے حکم کو رد کرنے والا کوئی نہیں ہے اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا حساب بہت جلد لے لے گا۔ اور ایک ہی وقت میں کسی ایک شخص سے حساب لینا اور اس وقت میں کسی دوسرے سے حساب لینا اس کے لیے مانع اور رکاوٹ نہیں ہوگا۔

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا حساب اتنی دیر میں لے لے گا جتنی دیر میں بکری کا دودھ دوہا جاتا ہے' اور بعض حدیثوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نصف یوم کی مقدار میں حساب لے لے گا۔ بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود حساب نہیں لے گا' بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرشتوں کو حساب لینے کا حکم دے گا۔ سو ہر فرشتہ ہر بندے سے حساب لے گا اور بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ خود حساب لے گا اور کافروں سے فرشتے حساب لیں گے' کیونکہ اگر اللہ کافروں سے خود حساب لیتا تو ان سے کلام بھی فرماتا' حالانکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ ان سے کلام نہیں فرمائے گا لیکن اس کا یہ جواب ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں سے رحمت کے ساتھ کلام نہیں فرمائے گا' بلکہ غضب کے ساتھ ان سے کلام فرمائے گا اور قرآن مجید کی ظاہر آیتیں اس قسم کے کلام پر دلالت کرتی ہیں:

(آیت) "ویوم نحشرھم جمیعا ثم نقول للذین اشرکوا این شرکآء کم الذین کنتم تزعمون"۔ (الانعام: ۲۲)

ترجمہ: اور جس دن ہم سب کو جمع کریں گے' پھر شرک کرنے والے لوگوں سے کہیں گے تمہارے وہ شرکاء کہاں ہیں جن کا تم دعوی کیا کرتے تھے؟

(آیت) "فذوقوا بما نسیتم لقاء یومکم ھذا انا نسینکم وذوقوا عذاب الخلد بما کنتم تعملون"۔ (السجدہ: ۱۴)

ترجمہ: پس اب تم (اس کا مزہ) چکھو کہ تم نے اس دن کی حاضری کو بھلا دیا تھا۔ بیشک ہم نے تمہیں فراموش کر دیا اور دائمی عذاب کا مزہ چکھو' ان (برے) کاموں کے بدلے جو تم کرتے تھے۔

باقی حساب لینے کی کیا کیفیت ہوگی؟ اس کا عقل انسانی احاطہ نہیں کر سکتی ہم اللہ کے حساب لینے پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی کیفیت کو عالم الغیب والشادۃ کے سپرد کرتے ہیں (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی المعانی ج ۷ ص ۱۷۸' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت)

حساب کے متعلق قرآن مجید کی آیات

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

(آیت) "فیومئذ لا یسئل عن ذنبہ انس ولا جان"۔ (الرحمٰن: ۳۹)

ترجمہ: اس دن کسی انسان اور جن سے اس کے گناہ کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن حساب نہیں لیا جائے گا لیکن اس کے معارض دوسری آیت ہے:
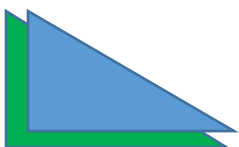
(آیت) "فوربك لنسئلنهم اجمعين، عما كانوا يعملون"۔ (الحجر: ۹۳۔ ۹۲)

ترجمہ: سو آپ کے رب کی قسم ہم ان سے ضرور سوال کریں گے ان سب کاموں کے متعلق جو وہ کرتے تھے۔

ان آیتوں میں تطبیق اس طرح دی گئی ہے کہ ان سے یہ سوال نہیں کیا جائے گا کہ تم نے کیا کیا ہے؟ کیونکہ ان کے اعمال فرشتے نے لکھے ہوئے ہیں 'بلکہ ان سے یہ سوال کیا جائے گا کہ فلاں کام تم نے کیوں کیا ہے؟ دوسرا جواب یہ ہے کہ قیامت کے دن احوال مختلف ہوں گے۔ کسی سے کسی وقت کوئی سوال نہیں کیا جائے گا اور کسی دوسرے وقت سوال کیا جائے گا۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ کسی وقت کسی کو اپنا عذر بیان کرنے کی جرات نہیں ہوگی اور کسی وقت وہ ایک دوسرے کے خلاف اپنی حجتیں پیش کریں گے۔ جیسا کہ ان آیتوں میں ہے:

(آیت) "هذا يوم لا ينطقون، ولا يؤذن لهم فيعتذرون"۔ (المرسلات: ۳۶۔ ۳۵)

ترجمہ: اس دن وہ نہ کوئی بات کر سکیں گے اور نہ انھیں عذر پیش کرنے کی اجازت دی جائے گی۔

(آیت) "ثم انكم يوم القيمة عند ربكم تختصمون"۔ (الزمر: ۳۱)

ترجمہ: پھر یقینا تم قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے جھگڑا کرو گے۔

پہلی آیت میں فرمایا کہ وہ اس دن کوئی بات نہیں کر سکیں گے اور دوسری آیت میں فرمایا وہ جھگڑا کریں گے 'اس کا یہی محمل ہے کہ قیامت کے دن احوال مختلف ہوں گے۔

حساب کی کیفیت کے متعلق احادیث

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زوجہ حضرت عائشہ (رض) جب بھی کوئی حدیث سنتی تھیں اور اس کو نہ سمجھ پاتیں تو وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھتی تھیں 'حتی کہ اس کو سمجھ لیتیں۔ اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص سے حساب لیا گیا اس کو عذاب دیا گیا حضرت عائشہ (رض) نے عرض کیا 'کیا اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرماتا؟

(آیت) "فاما من اوتى كتبه بيمينه، فسوف يحاسب حساب يسيرا"۔ (انشقاق: ۸۔ ۷)

ترجمہ: پھر جس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا 'تو عنقریب اس سے آسان حساب لیا جائے گا۔

آپ نے فرمایا اس سے مراد صرف اعمال کو پیش کرنا ہے 'لیکن جس سے حساب میں مناقشہ کیا گیا (کہ فلاں کام تم نے کیوں کیا) وہ ہلاک ہو جائے گا۔ (صحیح البخاری 'ج ۱ 'رقم الحدیث: ۱۰۳ 'مطبوعہ دار الکتب العلمیہ 'بیروت)

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن لوگوں کے درمیان سب سے پہلے قتل کے متعلق فیصلہ کیا جائے گا۔

(صحیح البخاری 'ج ۷ 'رقم الحدیث: '۶۸۶۴ 'صحیح مسلم 'دیات '۲۸ '(۱۶۷۸) ۴۳۰۲ 'سنن الترمذی 'ج ۳ 'رقم الحدیث: '۱۴۰۲ 'سنن النسائی 'ج ۷ 'رقم الحدیث: '۴۰۰۴ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث: '۲۶۱۵)

یہ حدیث حقوق العباد پر محمول ہے اور حقوق اللہ میں سب سے پہلے نماز کا حساب لیا جائے گا۔

امام ابوعیسی محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : قیامت کے دن بندہ کے عمل سے سب سے پہلے نماز کا حساب لیا جائے گا ' اگر نمازیں درست ہوئیں تو وہ کامیاب اور کامران ہوگیا اور اگر نمازیں فاسد ہوئیں تو وہ ناکام اور نقصان اٹھانے والا ہوگیا۔ اگر اس کے فرض میں کمی ہو تو رب تبارک وتعالیٰ فرمائے گا ' دیکھو میرے اس بندہ کے نفل ہیں ؟ پھر فرائض کے نقصان کو نوافل سے پورا کیا جائے گا۔ پھر باقی اعمال کا بھی اسی طرح معاملہ ہوگا۔

(سنن الترمذی ' ج ا ' رقم الحدیث : ۴۱۳ ' سنن ابوداؤ ' ج ا ' رقم الحدیث : ۸۶۴ ' سنن النسائی ' ج ا ' رقم الحدیث : ۴۶۶ ' ۴۶۵ ' سنن ابن ماجہ ' ج ا ' رقم الحدیث : ۱۴۲۵ ' مسند احمد ' ج ۲ ' ص ۴۲۵ ' ۲۹۰ ' ص ۱۰۳ ' ۶۵ ' ج ۵ ' ص ۷۷ ' ۳ ' ۷۲)

قاضی ابوبکر ابن العربی المالکی المتوفی ۵۴۳ ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں :

اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ فرائض کی تعداد میں جو کمی رہ گئی ہے ' وہ نوافل سے پوری ہوجائے اور یہ بھی احتمال ہے کہ فرائض کے خشوع میں جو کمی رہ گئی ہو ' وہ نوفل سے پوری ہوجائے اور میرے نزدیک پہلا احتمال زیادہ ظاہر ہے ' کیونکہ آپ نے باقی اعمال کا بھی یہی حکم بیان فرمایا ہے اور زکوۃ میں صرف فرض ہے یا نفل ہے ' پس جس طرح زکوۃ کا فرض فاضل صدقات سے پورا ہوجاتا ہے ' اسی طرح نماز کا فرض بھی نفل سے پورا ہوجائے گا اور اللہ کا فضل بہت وسیع ہے اور اس کا وعدہ بہت نافذ ہونے والا ہے اور اس کا عزم اتم اور اعم ہے۔ (عارضۃ الاجوذی ' ج ۲ ' ص ۲۰۷ ' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی ' بیروت)

علامہ سیوطی متوفی ۹۱۱ ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں ' امام بیہقی نے کہا ہے کہ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ نماز کی سنتوں میں جو کمی رہ جاتی ہے ' وہ نوافل سے پوری کی جائے گی۔ کیونکہ کوئی سنت واجب کا بدل نہیں ہوسکتی ہے۔ حدیث قدسی ہے جتنا مجھ سے فرائض کے ذریعہ قرب حاصل ہوتا ہے ' اتنا اور کسی چیز سے نہیں ہوتا اور شیخ عزالدین نے کہا ہے کہ زکوۃ واجبہ کے ایک درھم کا آٹھواں حصہ نفلی ہزار درہم سے زائد ہے اور کوئی آدمی ساری عمر نفلی قیام کرے ' بلکہ تمام زمانہ قیام کرے تو وہ صبح کی دو رکعت فرض کے برابر نہیں ہے۔ (سنن النسائی ' ج ا شرح الحدیث : ۴۶۵ ' دارالمعرفہ ' بیروت ' ۱۴۱۲ ھ)

امام ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ ' ھ روایت کرتے ہیں :

زید بن حارث بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر صدیق (رض) کی وفات کا وقت آیا تو انھوں نے حضرت عمر (رض) کو بلا کر فرمایا اللہ کا رات میں ایک حق ہے جس کو وہ دن میں قبول نہیں کرتا ' اور اللہ کا دن میں ایک حق ہے جس کو وہ رات میں قبول نہیں کرتا ' اور جب تک فرض ادا نہ کیا جائے اللہ نفل کو قبول نہیں کرتا۔ (الحدیث)

(مصنف ابن ابی شیبہ ' ج ۱۳ ' رقم الحدیث : ۱۶۲۸۰ ' ص ۱۴ ' رقم الحدیث : ۱۸۹۰۲ ' کتاب الزھد لابن المبارک ' رقم الحدیث : ۹۱۴ ' حلیۃ الاولیاء ' ج ا ' ص ۳۶ ' جامع الاحادیث الکبیر ' ج ۱۳ ' رقم الحدیث : ۱۸۹ ')

امام ابوعیسی محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے ؟ انھوں نے کہا یارسول ! مفلس وہ شخص ہے جس کے پاس درھم ہو نہ کوئی متاع ہو۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میری امت میں سے مفلس وہ شخص ہوگا جو قیامت کے دن نماز ' روزہ اور زکوۃ لے کر آئے گا اور اس نے کسی کو گالی دی ہوگی اور کسی کو تہمت لگائی ہوگی ' کسی کا مال کھایا ہوگا اور کسی کا خون بہایا ہوگا اور کسی کو مارا ہوگا ' وہ شخص بیٹھ جائے گا اور اس کی نیکیوں میں سے اس کو بدلہ دیا جائے گا اور اس کو بدلہ دیا جائے گا۔ پھر اگر اس پر جو حقوق ہیں ' ان کی ادائیگی سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہوجائیں تو ان کے گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے۔ پھر اس کو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ (سنن الترمذی ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ' ٢٤٢٦ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث : ' (٢٥٨١) صحیح ابن حبان ' ج ١٠ ' رقم الحدیث : ' ٤٤١١ ' مسند احمد ' ج ٣ ' رقم الحدیث : ' ٨٠٣٥ ' سنن کبری للبیہقی ' ج ٦ ' ص ٩٣)

حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن بندہ کو پیش کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا ' کیا میں نے تیرے لیے کان اور آنکھیں نہیں بنائی تھیں ؟ اور کیا مال اور اولاد نہیں دیئے تھے ؟ کیا تیرے لیے مویشیوں اور کھیتوں کو مسخر نہیں کیا تھا ؟ کیا تجھے سرداری اور خوش حالی نہیں دی تھی ؟ پھر کیا تو مجھ سے اس دن ملاقات کا یقین رکھتا تھا ' وہ کہے گا نہیں اللہ تعالیٰ فرمائے گا ' آج میں تجھے اس طرح فراموش کردوں گا جس طرح تو نے مجھے بھلا دیا تھا۔ (سنن الترمذی ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ' ٢٤٣٦)
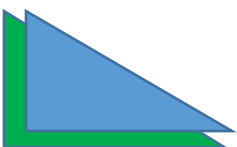
امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ٢٥٦ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ مومن اپنے رب کے قریب کیا جائے گا ' حتی کہ اللہ اس کو اپنی رحمت سے گھیر لے گا۔ پھر اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کرائے گا (فرمائے گا) تم فلاں گناہ پہچانتے ہو ؟ وہ دوبارہ کہے گا اے میرے رب ! میں پہچانتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے دنیا میں تمہارا پردہ رکھا تھا اور آج میں تمہیں بخش دیتا ہوں۔ پھر اس کی نیکیوں کا صحیفہ لپیٹ دیا جائے گا باقی رہے کفار تو ان کو تمام لوگوں کے سامنے پکار کر بلایا جائے گا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا تھا۔

(صحیح البخاری ' ج ٥ ' رقم الحدیث : ' ٤٦٨٥ ' صحیح مسلم ' توبہ ' ٥٢ ' (٢٧٦٨) ٦٨٨٢ ' سنن ابن ماجہ ' ج ١ ' رقم الحدیث : ' ١٨٣ ' السنن الکبری ' للنسائی ' ج ٦ ' رقم الحدیث : ' ١١٢٤٢ ' مسند احمد ' ج ٢ ' رقم الحدیث : ' ٥٨٢٩)

امام مسلم بن حجاج قشیری ٢٦١ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابوذر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بیشک میں ضرور اس شخص کو جانتا ہوں جو سب سے آخر میں جنت میں داخل ہوگا اور سب سے آخر میں دوزخ سے نکلے گا ' ایک شخص کو قیامت کے دن لایا جائے گا پس کہا جائے گا اس پر اس کے چھوٹے چھوٹے گناہ پیش کرو اور اس کے بڑے بڑے گناہ اس سے دور رکھو۔ پھر اس سے کہا جائے گا ' کہ تو نے فلاں دن یہ کام کیا تھا اور فلاں دن یہ یہ کام کیا تھا ' وہ کہے گا ہاں ' اور اس کا انکار نہیں کرسکے گا اور وہ اس سے ڈر رہا ہوگا کہ کہیں اس کے بڑے بڑے گناہ نہ پیش کردیئے جائیں ' پھر اس سے کہا جائے گا کہ تمہارے ہر گناہ کے بدلہ میں ایک نیکی ہے۔ تب وہ شخص کہے گا ' اے میرے رب میں نے تو اور بھی بہت سے کام

کیے تھے جن کو میں یہاں نہیں دیکھ رہا ' پھر میں نے دیکھا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہنسے حتی کہ آپ کی مبارک داڑھیں ظاہر ہوگئیں۔ (صحیح مسلم 'ایمان ۳۱۴' (۱۹۰) ۴۵۹ ' سنن الترمذی ' رقم الحدیث : ۲۶۰۵)

امام ابوعیسی محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابوامامہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ مجھ سے میرے رب نے یہ وعدہ کیا ہے کہ میری امت میں سے ستر ہزار کو بغیر حساب اور عذاب کے جنت میں داخل فرمائے گا اور ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار (مزید) ہوں گے اور میرے رب نے دونوں ہاتھوں سے تین بار لپ (بک) بھرنے کا وعدہ کیا ہے۔

(سنن الترمذی 'ج ۴ ' رقم الحدیث : ۲۴۴۵ ' سنن ابن ماجہ 'ج ۲ ' رقم الحدیث : ۴۲۸۶ ' صحیح ابن حبان 'ج ۱۶ ' رقم الحدیث : ۷۲۴۶ ' مسند احمد ج ۸ ' رقم الحدیث : ۲۲۴۸۱ ' المعجم الکبیر 'ج ۷ ' رقم الحدیث : ۷۶۷۲ ')

حساب کی کیفیت کے متعلق صحابہ 'تابعین اور علماء کے نظریات

علامہ محمد بن احمد السفارینی الحنبلی المتوفی ۱۱۸۸ھ لکھتے ہیں :

حساب کی کیفیات اور اس کے احوال مختلف اور متفاوت ہیں 'بعض کا حساب آسان ہوگا اور بعض کا حساب مشکل ہوگا 'بعض کے ساتھ عدل ہوگا ' بعض پر فضل ہوگا 'بعض کی تکریم ہوگی 'بعض کی زجر و توبیخ ہوگی 'بعض سے درگزر ہوگا اور بعض کی گرفت ہوگی۔ اور یہ سب اکرم الاکرمین اور ارحم الراحمین کی مرضی اور مشیت پر موقوف ہے۔

سب سے پہلے علماء مجاہدوں 'مال داروں اور خوش حالوں سے حساب لیا جائے گا۔ حقوق اللہ میں سب سے پہلے نماز اور حقوق العباد میں سب سے پہلے قتل کا حساب ہوگا۔

اس میں بھی اختلاف ہے کہ کس چیز کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا : "لاالہ الا اللہ" کے متعلق سوال ہوگا اور ضحاک نے کہا لوگوں سے ان کے گناہوں کے متعلق سوال کیا جائے گا اور علامہ قرطبی نے کہا تمام اقوال اور افعال کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ قرآن مجید میں ہے :

(آیت) "والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسؤلا"۔ (بنواسرائیل : ۳۶)

ترجمہ : بیشک کان 'آنکھ اور دل 'ان سب کے متعلق پوچھا جائے گا۔

(آیت) "فوربک لنسئلنھم اجمعین، عما کانوا یعملون"۔ (الحجر : ۹۳۔ ۹۲)

ترجمہ : سو آپ کے رب کی قسم ہم ان سے ضرور سوال کریں گے ان سب کاموں کے متعلق جو وہ کرتے تھے۔

امام رازی کا بھی یہی رجحان ہے کہ ہر کام کے متعلق سوال ہوگا۔ اس آیت میں فرمایا ہے کہ ہم ان سب سے سوال کریں گے 'اس کا تقاضا یہ ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) سے بھی سوال کیا جائے گا۔ انبیاء (علیہم السلام) سے سوال کے متعلق اس آیت میں تصریح ہے۔

(آیت) "فلنسئلن الذین ارسل الیھم ولنسئلن المرسلین"۔ (الاعراف : ۶)

ترجمہ : سو بیشک ہم ان لوگوں سے ضرور سوال کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے 'اور ہم ضرور رسولوں سے بھی پوچھیں گے۔
یہ آیتیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ بہ شمول انبیاء (علیہم السلام) ہر شخص سے سوال کیا جائے گا۔ البتہ ان سے بطور مناقشہ سوال نہیں ہوگا 'بلکہ تعظیم و تکریم کے ساتھ سوال کیا جائے گا اور احادیث میں جن کے متعلق یہ بشارت ہے کہ وہ بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے 'وہ ان آیات کے عموم سے مخصوص اور مستثنی ہیں۔ انبیاء (علیہم السلام) سے تبلیغ رسالت کے متعلق سوال ہوگا اور کفار سے انبیاء (علیہم السلام) کی تکذیب کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ علامہ بلبانی نے لکھا ہے کہ کفار نے جو نیک کام کیے ہیں ان سے ان کے عذاب میں تخفیف متوقع ہے (یہ صحیح نہیں ہے 'قرآن مجید میں تصریح ہے کہ ان کے عذاب میں تخفیف نہیں کیا جائے گی۔ (آیت) "**لا یخفف عنہم العذاب ولا ھم ینظرون**"۔ (البقرہ : ۱۶۲)
شیخ ابن تیمیہ نے عقیدہ واسطیہ میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومن سے تنہائی میں حساب لے گا اور اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کرائے گا 'جیسا کہ کتاب اور سنت میں ہے 'اور جن لوگوں کی نیکیوں اور برائیوں کا وزن کیا جاتا ہے کفار سے اس قسم کا حساب نہیں لیا جائے گا 'کیونکہ ان کی کوئی نیکیاں نہیں ہیں 'لیکن ان کے اعمال کا شمار کیا جائے گا 'ان سے ان کا اقرار کرایا جائے گا۔

نعمتوں کی کتنی مقدار پر حساب لیا جائے گا

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) نے فرمایا جو شخص ایک قدم بھی چلتا ہے 'اس سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا کہ اس کا اس سے کیا ارادہ تھا۔ امام ترمذی 'امام ابن حبان 'امام حاکم اور امام بغوی نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلے یہ سوال کیا جائے گا کیا میں نے تمہارے جسم کو صحت مند نہیں بنایا تھا؟ کیا میں نے تم کو ٹھنڈا پانی نہیں پلایا تھا؟ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے ! قیامت کے دن تم سے سایہ 'ٹھنڈے پانی اور کھجور کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ امام احمد 'امام بیہقی 'اور ابو نعیم نے حسن سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تین چیزوں کے متعلق بندہ سے سوال نہیں کیا جائے گا 'دھوپ سے بچنے کے لیے سایہ 'روٹی کا وہ ٹکڑا جس سے وہ اپنی پیٹھ سیدھی رکھ سکے اور کپڑے کا اتنا ٹکڑا جس سے وہ اپنی شرم گاہ ڈھانپ سکے۔
امام احمد نے سند جید کے ساتھ حضرت ابی عسیب (رض) سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت ابوبکر اور حضرت عمر (رض) کے ساتھ کسی انصاری کے باغ میں داخل ہوئے۔ باغ کے مالک نے کھجوروں کا ایک خوشہ توڑ کر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پیش کیا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے اصحاب نے اس کو کھایا 'پھر آپ نے ٹھنڈا پانی منگا کر پیا۔ پس فرمایا قیامت کے دن تم سے اس کا سوال کیا جائے گا۔ عرض کیا گیا 'یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان چیزوں کے متعلق بھی قیامت کے دن سوال کیا جائے گا؟ آپ نے فرمایا ہاں ! سوا ان تین چیزوں کے 'وہ کپڑا جس کے ساتھ شرم گاہ کو لپیٹا جاسکے 'روٹی کا وہ ٹکڑا جس سے بھوک مٹائی جاسکے اور اتنا حجرہ جو دھوپ اور بارش سے بچانے کے لیے کافی ہو۔

حساب کو آسان کرنے کا طریقہ

امام طبرانی 'امام بزار اور امام حاکم نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تین خصلتیں جس میں ہوں 'اللہ اس سے آسان حساب لے گا 'اور اس کو اپنی رحمت سے جنت میں داخل کر دے گا۔ صحابہ نے پوچھا وہ کیا خصلتیں ہیں ؟فرمایا جو تم کو محروم کرے اس کو دو۔ جو تم سے تعلق توڑے اس سے تعلق جوڑو۔ جو تم پر زیادتی کرے اس کو معاف کردو۔

امام اصبہانی نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اگر تم کر سکتے ہو کہ جب تم صبح اٹھو یا جب شام ہو تو تمہارے دل میں کسی کے خلاف کینہ نہ ہو تو ایسا کرلو 'کیونکہ اس سے تمہارا حساب زیادہ آسان ہوگا۔

امام بیہیقی نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ ایک اعرابی نے کہا یا رسول اللہ ! قیامت کے دن مخلوق کا حساب کون لے گا؟آپ نے فرمایا اللہ ! اس نے کہا رب کعبہ کی قسم ! ہماری نجات ہو گئی۔آپ نے فرمایا اے اعرابی وہ کیسے ؟اس نے کہا اس لیے کہ کریم جب قادر ہوتا ہے تو معاف کر دیتا ہے۔

کسی نے خوب کہا ہے کہ کریم جب قادر ہوتا ہے تو بخش دیتا ہے اور جب تم سے کوئی لغزش ہو تو وہ پردہ رکھتا ہے اور جلدی غصہ کرنا اور انتقام لینا 'یہ کریم کی عادت نہیں ہے۔

مذکور الصدر احادیث میں ہے کہ تم کسی کی زیادتی معاف کردو 'اس سے تمہارا حساب آسان ہوگا۔اس کا معنی یہ ہے کہ تم بندوں کی خطاؤں کو معاف کردو 'اللہ تعالیٰ تمہاری خطاؤں کو معاف کر دے گا۔

علامہ قرطبی اور دیگر علماء نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کی تکریم کے لیے اللہ تعالیٰ حساب کے وقت ان سے بغیر ترجمان کے کلام فرمائے گا اور کفار کی اہانت کے لیے ان سے خود کلام نہیں فرمائے گا 'بلکہ فرشتے ان سے حساب لیں گے۔ (لوامع الانوار البحیہ 'ج ۲ 'ص ۱۷۷۔ ۱۷۳ 'ملخصا 'مطبوعہ المکتب الاسلامی 'بیروت '۱۴۱۱ھ)　　　　(تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

فوائد

۱۔یعنی مرتے ہی ان کی روحیں بارگاہ الٰہی میں پیش ہو کر پھر قبر میں واپس لائی جاتی ہیں جیسا کہ حدیث شریف سے ثابت ہے۔

۲: چنانچہ قیامت میں سا سرے عالم کا سارا حساب دنیا کے چھوٹے دن کے آدھے کی بقدر ہوگا۔یعنی 4 گھنٹہ میں۔ باقی اتنا بڑا دن حضور کی نعت گوئی اور اظہار شان میں صرف ہوگا۔رب فرماتا ہے۔عسی ان یبعثك ربك مقاما محمودا۔

(تفسیر نور العرفان۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی)

آیت مبارکہ :

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ○63

لغۃ القرآن: [قُلْ (کہہ دیں] [مَنْ : جس پر] [يُّنَجِّيْكُمْ] [نجات دیتا ہے تمہیں] [مِّنْ] [سے] [ظُلُمٰتِ : [اندھیروں] [الْبَرِّ : [خشکی] [وَالْبَحْرِ : اور سمندر " میں " ہے] [تَدْعُوْنَهٗ] [تم سب پکارتے ہو اسے] [تَضَرُّعًا : عاجزی سے] [وَّخُفْيَةً : اور چپکے چپکے] [لَئِنْ : البتہ اگر] [اَنْجٰىنَا : اس نے نجات دی ہمیں] [مِّنْ : سے] [هٰذِهٖ : یہ] [لَنَكُوْنَنَّ : ضرور ہم ہوجائیں گے] [مِنَ : سے] [الشّٰكِرِيْنَ : شکر گزاروں کو]

ترجمہ : آپ (ان سے دریافت) فرمائیں کہ بیابان اور دریا کی تاریکیوں سے تمہیں کون نجات دیتا ہے؟ (اس وقت تو) تم گڑگڑا کر (بھی) اور چپکے چپکے (بھی) اسی کو پکارتے ہو کہ اگر وہ ہمیں اس (مصیبت) سے نجات دے دے تو ہم ضرور شکر گزاروں میں سے ہو جائیں گے

تشریح:

مشرکین عرب کا معاملہ بڑا عجیب تھا، ایک طرف تو وہ بتوں کو خدا کا شریک بناتے اور ان کی پوجا کرتے لیکن دوسری طرف جب خشکی یا سمندر کی تاریکیوں اور مصیبتوں میں گھر جاتے، سارے مادی سہارے ٹوٹ جاتے اور انھیں موت سامنے نظر آرہی ہوتی تو بتوں کو بھول جاتے اور بڑی عاجزی وزاری کے ساتھ خالق حقیقی کو مدد کے لیے پکارتے کہ اگر وہ انھیں اس مصیبت سے نجات دے دے تو وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کریں گے اور ہمیشہ کے لیے اس کے شکر گزار بندے بن جائیں گے۔ ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو فرمایا کہ ان ناقدر دانوں کو ان کا وعدہ یاد دلاؤ اور ان سے پوچھو کہ جب تمہیں ہلاکت کا خطرہ ہو تو اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہو اور جب اللہ تعالیٰ تمہیں اس مصیبت سے نجات دے دے تو پھر تم شرک کی طرف لوٹ جاتے ہو۔ یہ کیسی انسانیت ہے اور تم کیسے انسان ہو؟

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مصیبت کے وقت بعض کافر بھی دل میں عاجزی سے یا زبان سے گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں، مگر مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ہر حال میں (خوشی یا غمی) میں اللہ تعالیٰ کو یاد رکھیں اور اس کے ساتھ کئے ہوئے وعدہ کو پورا کریں۔ یاد رکھیں ! ہر مسلمان کا اللہ تعالیٰ سے پہلا وعدہ یہ ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے گا اور اس کے احکام کے مطابق زندگی گزارے گا۔

اوپر سے آنے والے عذاب سے مراد آسمانی عذاب ہے جیسے ابابیل پرندوں کی چھوٹی چھوٹی کنکریوں نے ابرہہ کی فوج اور ہاتھیوں کو تہس نہس کر دیا اور نیچے سے آنے والے عذاب سے مراد زمینی عذاب ہے جیسے قارون اور اس کے خزانوں کو زمین ہضم کر گئی۔ فرعون اور اس کے لشکر کو پانی کی لہروں نے نگل لیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) کا ارشاد ہے : اوپر والے عذاب سے مراد برے حکام ہیں اور نیچے والے عذاب سے مراد برے خدام ہیں۔ (تفسیر ابن جریر) یعنی قانون بنانے والے حکمران، اس کے نافذ کرنے والے حکومت کے ملازمین اگر دونوں ہی برے ہوں تو عوام کا عذاب میں مبتلا ہونا ایک لازمی امر ہے مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ برے حکمران کہاں سے آتے ہیں ؟ ان حکمرانوں کو یا تو عوام خود اپنے ووٹوں سے منتخب کرتے ہیں یا عوام کی برائیوں کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ ان کو عوام پر مسلط کر دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دو ارشادات ملاحظہ ہوں :

1۔ " جیسے تمہارے اعمال (اچھے یا برے) ہوں گے ویسے ہی حکام تم پر مسلط کئے جائیں گے۔ "
(شعب الایمان للبیہقی : جلد 6 : ص 23)

2۔ " اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں سب بادشاہوں کا مالک اور بادشاہ ہوں، سب بادشاہوں کے قلوب میرے ہاتھ میں ہیں، جب میرے بندے میری اطاعت کرتے ہیں تو میں ان کے بادشاہوں اور حکام کے قلوب میں ان کی شفقت ورحمت ڈال دیتا ہوں اور جب میرے بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان کے حکام کے دل ان پر سخت کر دیتا ہوں۔ وہ ان کو ہر طرح کا برا عذاب چکھاتے ہیں، اس لیے تم حکام اور امراء کو برا کہنے میں اپنے اوقات ضائع نہ کرو بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور اپنے عمل کی اصلاح کی فکر میں لگ جاؤ تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو درست کر دے۔ " (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)
(مشکوٰۃ : کتاب الامارہ : باب 3)

مصیبت ٹل جانے کے بعد اللہ کو بھول جانے پر ملامت

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے الوہیت پر بعض دلائل بیان فرمائے تھے کہ اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے ' اور اس کی قدرت ہر چیز کو شامل ہے اور وہ تمام مخلوق پر غالب ہے اور ان کے اعمال فرشتوں سے حفاظت کراتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور قسم کی دلیل بیان فرمائی ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کمال اور اس کی رحمت ' اس کے فضل اور اس کے احسان پر دلالت کرتی ہے۔

اس آیت میں خشکی کی تاریکیوں کا ذکر فرمایا ہے ' اس سے مراد حسی تاریکی بھی ہے اور معنوی تاریکی بھی۔ حسی تاریکی ' رات کا اندھیرا ' گہرے بادلوں کا اندھیرا ' بارش اور آندھیوں کا اندھیرا ہے ' اور سمندروں کی حسی تاریکی رات کا اندھیرا ' بادلوں کا اندھیرا اور موجوں کے تلاطم کا اندھیرا ہے اور

معنوی تاریکی ' ان اندھیروں کی وجہ سے خوف شدید ' نشانیوں کے نہ ملنے کی وجہ سے منزل کی ہدایت نہ پانے کا خوف اور دشمن کے اچانک ٹوٹ پڑنے کا خوف ہے۔

اس سے مقصود یہ ہے کہ جب اس قسم کے اسباب مجتمع ہو جائیں جن سے بہت گھبراہٹ اور شدید خوف لاحق ہوتا ہے اور انسان کو نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور وہ ہر طرف سے ناامید ہو جاتا ہے ' تو اس وقت وہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے ' اور اس وقت وہ زبان اور دل دونوں سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی فطرت سلیمہ کا یہی تقاضا ہے کہ اس حال میں صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا جائے اور اسی کے فضل و کرم پر اعتماد کیا جائے اور اسی کو ماوی و ملجا اور جائے پناہ قرار دیا جائے۔ اور جب اس حال میں وہی فریاد رس اور دستگیر ہے تو ہر حال میں صرف اسی کو پکارنا چاہیے۔ اسی سے مدد طلب کرنی چاہیے اور اسی کی عبادت کرنی چاہیے ' لیکن انسان بڑا ناشکرا ہے ' جب وہ مشکلات کے بھنور سے نکل جاتا ہے تو سمجھتا ہے کہ اس کو مادی اسباب کی وجہ سے یہ نجات ملی ہے ' اور پھر وہ اخلاص اور رجوع الی اللہ کو ترک کر دیتا ' اور اپنی خواہشات کے تراشیدہ بتوں کی پرستش کرنے لگتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ اللہ سے دعا کرتا ہے اور عاجزی سے گڑگڑاتا ہے اور اس کی طرف اخلاص سے متوجہ ہوتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ وہ آئندہ زندگی میں اللہ تعالیٰ کا مطیع ' فرمان بردار اور شکر گزار بن کر رہے گا ' لیکن جیسے ہی وہ امن اور سلامتی کو پالیتا ہے۔ وہ پھر اپنی سابقہ روش پر لوٹ جاتا ہے۔

بہ ظاہر اس آیت میں مشرکین کو زجر و توبیخ کی گئی ہے اور ان کے طریقہ کار کی مذمت کی گئی ہے لیکن یہ صورت حال ان مسلمانوں پر بھی منطبق ہوتی ہے جو عام طور پر اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی یاد سے غافل رہتے ہیں لیکن جب ان پر اچانک کوئی آفت آ ٹوٹتی ہے اور انھیں اس سے نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تو بے اختیار اللہ کو یاد کرتے ہیں اور گڑگڑا کر اس سے دعا کرتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ ان سے اس مصیبت کو دور کر دیتا ہے ' تو پھر وہ خدا کو بھول جاتے ہیں اور اپنے عیش و طرب اور لہو و لعب میں مست اور بے خود ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو قرآن کریم میں متعدد جگہ بیان فرمایا ہے۔ ان میں سے بعض آیتیں یہ ہیں :

(آیت) "واذا مسکم الضر فی البحر ضل من تدعون الا ایاہ فلما نجکم الی البر اعرضتم وکان الانسان کفورا "۔

(بنی اسرائیل : ٦٧)

ترجمہ : اور جب تمہیں سمندر میں کوئی آفت پہنچتی ہے تو اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے تھے وہ سب گم ہو جاتے ہیں پھر جب وہ تمہیں خشکی کی طرف نجات دیتا ہے تو تم (اس سے) منہ پھیر لیتے ہو اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔

(آیت) "واذا مس الانسان ضر دعا ربہ منیبا الیہ ثم اذا خولہ نعمۃ منہ نسی ما کان یدعوا الیہ من قبل وجعل للہ اندادا لیضل عن سبیلہ "۔ (الزمر : ٨)

ترجمہ : اور جب انسان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتا ہے ' اسی کی طرف رجوع کرتے ہوئے ' پھر جب اللہ اپنی طرف سے اسے کوئی نعمت عطا فرما دے تو وہ اس (مصیبت) کو بھول جاتا ہے جس کے لیے اس سے پہلے وہ اللہ کو پکارتا تھا ' اور اللہ کے لیے شریک قرار دیتا ہے ' تاکہ اوروں کو بھی اس کی راہ سے بہکا دے۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

الغرض۔۔ ایسے اسباب جمع ہو جائیں جن سے بہت گھبراہٹ اور شدید خوف لاحق ہوتا ہے اور انسان کو نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور وہ ہر طرف سے ناامید ہو جاتا ہے، تو اس وقت وہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس وقت وہ زبان اور دل دونوں سے اللہ تعالیٰ
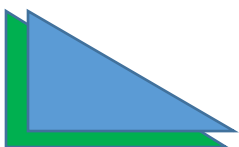
کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت سلیمہ کا یہی تقاضا ہے کہ اس حال میں صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا جائے اور اسی کے فضل و کرم پر اعتماد کیا جائے اور اسی کو ماویٰ وملجا اور جائے پناہ قرار دیا جائے۔ اور جب اس حال میں وہی فریادرس اور دستگیر ہے، تو ہر حال میں صرف اسی کو پکارنا چاہیے، اسی سے مدد طلب کرنی چاہیے اور اسی کی عبادت کرنی چاہیے۔
تو اے مکہ کے کافرو! کہ جب تم ان مذکورہ بالا مصیبتوں کا شکار ہوتے ہو، تو وہ کون نجات دہندہ ذات ہے (جس سے دعا کرتے ہو گڑگڑا کر اور چپکے)۔ اس وقت تمہارا حال یہ ہوتا کہ اسے پکارتے ہو دھاڑیں مار کر، اور دل میں نہایت ہی عجز وانکسار سے اس وقت یہ کہتے ہو (کہ اگر) اللہ تعالیٰ نے ہم کو (اس بلا سے نجات دے دی، تو ہم ضرور شکر گزار ہوں گے) اور اس نعمت کی وجہ سے اسپر مداومت کرنے والوں سے ہوں گے ظاہر ہے کہ شکر نام ہے اعتراف نعمت کا، بشر طیکہ اس نعمت کے حقوق بھی قائم رکھے جائیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمت کے حقوق یہ ہیں کہ اس منعم حقیقی کی اطاعت میں زندگی بسر کرے اور برائیوں سے بچے، نہ یہ کہ الٹا اس کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک بنائے جنھیں کسی شے کی بھی قدرت نہیں۔ (تفسیر اشرفی۔ علامہ محمد مدنی اشرفی جیلانی)

بد اعمالی کے باوجود اللہ فریاد سنتا ہے

یعنی حق تعالیٰ باوجود علم محیط اور قدرت کاملہ کے جس کا بیان اوپر ہوا، تمہاری بد اعمالیوں اور شرارتوں کی سزا فوراً نہیں دیتا۔ بلکہ جب مصائب و شدائد کی اندھیریوں میں پھنس کر تم اس کو عاجزی سے پکارتے ہو اور پختہ وعدے کرتے ہو کہ اس مصیبت سے نکلنے کے بعد کبھی شرارت نہ کریں گے اور ہمیشہ احسان کو یاد رکھیں گے، تو بسا اوقات تمہاری دستگیری کر کے ان مہالک اور ہر قسم کی سختیوں سے نجات دے دیتا ہے لیکن تم پھر بھی اپنے وعدہ پر قائم نہیں رہتے اور مصیبت سے آزاد ہوتے ہی بغاوت شروع کر دیتے ہو۔

سب تکالیف گناہوں کا اثر ہیں

رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ کسی انسان کو جو کسی لکڑی سے معمولی خراش لگتی ہے، یا قدم کو کہیں لغزش ہو جاتی ہے یا کسی رگ میں خلش ہوتی ہے یہ سب کسی گناہ کا اثر ہوتا ہے، اور جو گناہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں وہ بہت ہیں۔ مولانا رومی (رح) نے خوب فرمایا

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند
با من و تو مردہ، با حق زندہ اند

جب انسان اللہ کو چھوڑتا ہے تو مصیبتیں بڑھتی ہیں:
تجربہ شاہد ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ سے غافل ہو کر صرف مادّی سامانوں کے پیچھے پڑ جاتا ہے تو جوں جوں یہ سامان بڑھتے ہیں پریشانیاں اور مصائب اور بڑھتے ہیں

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

شخصی طور پر کسی دوا یا انجکشن کا کسی وقت مفید ثابت ہونا یا کسی مادّی تدبیر کا کامیاب ہو جانا غفلت و معصیت کے ساتھ بھی ممکن ہے، لیکن جب مجموعی حیثیت سے پوری خلق خدا کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ سب چیزیں ناکام نظر آتی ہیں، موجودہ زمانہ میں انسان کو راحت پہنچانے اور اس کی ہر تکلیف کو دور کرنے کے لیے کیسے کیسے آلات اور سامان ایجاد کئے گئے ہیں اور کئے جا رہے ہیں کہ اب سب پچاس سال پہلے کے انسان کو ان کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ امراض کے علاج کے لیے نئی نئی زود اثر دوائیں اور طرح طرح کے انجکشن اور بڑے بڑے ماہر ڈاکٹر اور ان کے لیے جا بجا شفا خانوں کی بہتات کون نہیں جانتا کہ اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے کا انسان ان سب سے محروم تھا۔ لیکن مجموعی حالات کا جائزہ لیا جائے تو ان آلات و سامان سے محروم انسان اتنا بیمار اور کمزور نہ تھا، جتنا آج کا انسان بیماریوں کا شکار ہے،

مومن کا کام

مومن کا کام یہ ہے کہ اپنے تمام مصائب اور تکلیفوں کو دور کرنے کے لیے مادی سامان اور تدبیروں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے، ورنہ انجام وہی ہوگا جو روز مشاہدہ میں آرہا ہے، کہ ہر تدبیر مجموعی حیثیت سے الٹی پڑتی ہے، سیلابوں کو روکنے اور ان کے نقصانات سے بچنے کی ہزار تدبیریں کی جاتی ہیں مگر وہ آتے ہیں اور بار بار آتے ہیں، امراض کے علاج کی نئی نئی تدبیریں کی جاتی ہیں، مگر امراض روز بروز بڑھتے جاتے ہیں، اشیاء کی گرانی رفع کرنے کے لیے ہزاروں تدبیریں کی جاتی ہیں، اور وہ سطحی طور پر موثر بھی معلوم ہوتی ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے نتیجہ یہ ہے کہ گرانی روز بروز بڑھتی جاتی ہے، چوری، ڈکیتی، اغواء، رشوت ستانی، چور بازاری کو روکنے کے لیے کتنی مادّی تدبیریں آج ہر حکومت استعمال کر رہی ہے، مگر حساب لگایئے تو ہر روز ان جرائم میں اضافہ ہوتا نظر آتا ہے، کاش آج کا انسان صرف شخصی اور سطحی اور سرسری نفع نقصان کی سطح سے ذرا بلند ہو کر حالات کا جائزہ لے تو اس کو ثابت ہوگا کہ مجموعی حیثیت سے ہماری مادّی تدبیریں سب ناکام ہیں بلکہ ہمارے مصائب میں اضافہ کر رہی ہیں، پھر اس قرآنی علاج پر نظر کرے کہ مصائب سے بچنے کی صرف ایک ہی راہ ہے، کہ خالق کائنات کی طرف رجوع کیا جائے، مادّی تدبیروں کو بھی اسی کی عطا کی ہوئی نعمت کے طور استعمال کیا جائے، اس کے سوا سلامتی کی کوئی صورت نہیں۔

عاجزی اور خلوص سے دعاء کرو

تدعونہ تضرعا و خفیۃ کہ تم اس سے گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعا کرتے ہو۔

تضرعزاری کرنا اور خوب گڑگڑا کر مانگنا۔ تضرعًا اور خفیۃً دونوں مصدر ہیں لیکن معنی اسم فاعل کے ہیں۔ چپکے چپکے دعا اور ذکر کرنا سنت ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم نہ کسی بہرے کو پکارتے ہو نہ غائب کو (یعنی اللہ نہ بہرا ہے نہ غائب کہ اس کو زور سے پکارا جائے بلکہ ہر وقت حاضر ہے اور پست ترین آواز کو بھی سنتا ہے) آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم عاجزی اور خلوص کے ساتھ دعا کرتے ہو (یعنی

چپکے چپکے دعا کرنے سے مراد ہے خلوص کے ساتھ دعا کرنا) کیونکہ چپکے چپکے دعا کرنے میں ریاکاری کا شائبہ نہیں ہوتا محض خلوص ٹپکتا ہے۔
(تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی)

آیت مبارکہ :

قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ

64○

لغۃ القرآن : [قُلِ : آپ کہہ دیں] [اللّٰهُ : اللہ] [يُنَجِّيْكُمْ : نجات دیتا ہے تمہیں] [مِنْهَا : اس سے] [وَ مِّنْ : سے] [كُلِّ : ہر طرح] [كَرْبٍ : غم] [ثُمَّ : پھر] [اَنْتُمْ : تم] [تُشْرِكُوْنَ : تم سب شریک بناتے ہو]]

ترجمہ : فرمادیجئے کہ اللہ ہی تمہیں اس (مصیبت) سے اور ہر تکلیف سے نجات دیتا ہے تم پھر (بھی) شرک کرتے ہو

تشریح : کفار عالب جب سمندری سفر میں طوفان میں گھر جاتے تو پکارنے لگتے اے اللہ ! اگر تو ہمیں اس مصیبت سے بچالے تو ہم تیرے شکر گزار بندے بن جائیں گے یعنی تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے۔ جب اللہ رب العزت انھیں بچا کر کنارے لگادیتا تو وہ پھر لات و منات اور عزیٰ وھبل کی عبادت کرنے لگتے۔ دوسری جگہ فرمایا گیا: حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِى الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۔ "حتی کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ تمہیں خوشگوار ہوا کے ساتھ لے کر چلتی ہیں پھر اچانک ان پر تیز ہوا آ پہنچتی ہے اور ہر طرف سے طوفان اٹھنے لگتے ہیں اور کشتی والوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ گھر گئے ہیں تو وہ اللہ کو خالص دین کے ساتھ پکارنے لگتے ہیں کہ اے اللہ ! اگر تو ہمیں اس سے نجات دے دے تو ہم تیرے شکر گزار بندے بن جائیں گے پھر جب اللہ انھیں نجات دے دیتا ہے تو وہ زمین میں ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ "یونس، 22)۔
اس میں ایمان والوں کے لئے درس عبرت ہے کہ انھیں کفار کے طور طریقہ کو اپنا کر ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ مصیبت میں اللہ کو یاد کریں اور مصیبت کے ٹل جانے کے بعد اللہ کو بھول جائیں۔ بلکہ مومن وہ ہے جو ہر حال میں اپنے رب کو یاد رکھتا ہے۔
(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

عام نفس بشری کی خباثت کا بیان ہے کہ مصیبت کے وقت تو کم ظرف انسان رونے گڑگڑانے چلانے لگتا ہے۔اور ادھر مصیبت ختم ہوئی کہ ادھر پھر وہی اکڑ پیدا ہو جاتی ہے۔ (آیت) "ومن کل کرب"۔یعنی ایک وہی مصیبت کی کیا تخصیص ہے، نجات جس غم سے بھی ملتی ہے، نجات دینے والا ہر حال میں وہی ہوتا ہے۔ (تفسیر ماجدی)

اے محبوب ! ان مشرکین کو (بتادو کہ) ایسے پرآشوب حالات میں (اللہ تعالیٰ) (نجات دیتا ہے تم کو اس سے اور ہر مصیبت سے) مگر تمہارا عجیب حال ہے کہ نجات پا جاتے ہو اور تمام نعمتوں کا مشاہدہ کرلیتے ہو، اس کے باوجود (پھر) بھی (تم شریک بناتے ہو) غیر خدا کو خدا کا۔۔ الغرض۔۔ تمہارا یہ شرک کرنا بھی ترک شکر الٰہی ہے، اس لیے کہ جو خدا کا حقیقی معنوں میں شاکر ہوگا، وہ مشرک نہیں ہوسکتا۔

۔۔اے مشرکو ! کیا عذاب چلاتے ہو اور نزول عذاب الٰہی کا مطالبہ کرتے ہو ! غور سے سن لو کہ مصائب وآلام میں تم جس کو پکارتے ہو اور وہ تمہیں نجات عطا فرماتا ہے، تو کیا تم نے یہ سمجھ لیا کہ وہ عذاب نازل نہیں فرما سکتا؟ ارے نادانو ! عذاب نازل نہ فرمانے میں اس کی حکمت بالغہ ہوتی ہے۔ (تفسیر اشرفی۔علامہ محمد مدنی اشرفی جیلانی)

آیت مبارکہ :

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۤى اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ یَلْبِسَكُمْ شِیَعًا وَّ یُذِیْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍؕ اُنْظُرْ كَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّهُمْ یَفْقَهُوْنَ○65

لغۃ القرآن: قُلْ : کہہ دیں] [هُوَ : وہ] [الْقَادِرُ : قادر ہے] [عَلٰٓي :" اس بات " پر] [اَنْ : کہ] [يَّبْعَثَ : وہ بھیجے] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [عَذَابًا : عذاب] [مِّنْ : سے] [فَوْقِكُمْ : تمہارے اوپر] [اَوْ : یا] [مِّنْ : سے] [تَحْتِ : نیچے] [اَرْجُلِكُمْ : تمہارے پاؤں کے] [اَوْ : یا] [يَلْبِسَكُمْ : وہ بھڑا " لڑا " دے تمہیں] [شِيَعًا : گروہ گروہ کر کے] [وَّيُذِيْقَ : اور وہ مزہ چکھا دے] [بَعْضَكُمْ : تم میں سے بعض کو] [بَاْسَ : لڑائی] [بَعْضٍ : بعض کے] [اُنْظُرْ : دیکھیے] [كَيْفَ : کیسے] [نُصَرِّفُ : ہم پھیر

پھیر کر بیان کرتے ہیں] [الْاٰیٰتِ : واضع دلائل] [لَعَلَّھُمْ : تاکہ وہ] [یَفْقَھُوْنَ : سب سمجھ جائیں]

ترجمہ : فرمادیجئے : وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر عذاب بھیجے (خواہ) تمہارے اوپر کی طرف سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا تمہیں فرقہ فرقہ کرکے آپس میں بھڑائے اور تم میں سے بعض کو بعض کی لڑائی کا مزہ چکھادے۔ دیکھئے ! ہم کس کس طرح آیتیں بیان کرتے ہیں تاکہ یہ (لوگ) سمجھ سکیں

تشریح : خدا کے امہال و در گزر کو دیکھ کر مامون اور بے فکر نہ ہونا چاہیے۔ جس طرح وہ شدائد و مصائب سے نجات دے سکتا ہے۔ اسے یہ بھی قدرت ہے کہ کسی قسم کا عذاب تم پر مسلط کر دے۔

اوپر اور نیچے سے عذاب

اور حضرت عبداللہ بن عباس، اور مجاہد وغیرہ ائمۃ تفسیر نے فرمایا کہ اوپر کے عذاب سے مراد یہ ہے کہ ظالم بادشاہ اور بے رحم حکام مسلط ہو جاویں، اور نیچے کے عذاب سے مراد یہ ہے کہ اپنے نوکر، غلام اور خدمت گار یا ماتحت ملازم بے وفا غدار، کام چور، خائن جمع ہو جاویں۔ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چند ارشادات سے بھی حضرت عبداللہ بن عباس (رض) کی اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے، مشکوۃ شریف میں بحوالہ شعب الایمان بیہقی رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ ارشاد منقول ہے : کما تکونون کذلک یوٴمر علیکم، یعنی جیسے تمہارے اعمال بھلے یا برے ہوں گے ویسے ہی حکام اور امراء تم پر مسلط کئے جائیں گے، اگر تم نیک اور اللہ تعالیٰ کے فرمان بردار ہوگے تو تمہارے حکام و امراء بھی رحم دل، انصاف پسند ہوں گے، اور تم بد عمل ہوگے تو تم پر حکام بھی بے رحم اور ظالم مسلط کر دیئے جائیں گے، مشہور مقولہ اعمالکم عمالکم کا یہی مفہوم ہے۔

حدیث قدسی :

اور مشکوۃ میں بحوالہ حلیہ ابی نعیم روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ : اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں سب بادشاہوں کا مالک اور بادشاہ ہوں، سب بادشاہوں کے قلوب میرے ہاتھ میں ہیں، جب میرے بندے میری اطاعت کرتے ہیں تو میں ان کے بادشاہوں اور حکام کے قلوب میں ان کی شفقت و رحمت ڈال دیتا ہوں، اور جب میرے بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان کے حکام کے دل ان پر سخت کر دیتا ہوں، وہ ان کو ہر طرح کا برا عذاب چکھاتے ہیں، اس لیے تم حکام اور امراء کو برا کہنے میں اپنے اوقات ضائع نہ کرو، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اپنے عمل کی اصلاح کی فکر میں لگ جاؤ، تاکہ تمہارے سب کاموں کو درست کر دے۔

عذاب کی تین قسمیں

اس میں عذاب کی تین قسمیں بیان فرمائیں (۱) جو اوپر سے آئے، جیسے پتھر برسنا یا طوفانی ہوا اور بارش (۳) جو پاؤں کے نیچے سے آئے، جیسے زلزلہ یا سیلاب وغیرہ یہ دونوں خارجی اور بیرونی عذاب ہیں۔ جو اگلی قوموں پر مسلط کئے گئے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعا سے اس امت کو اس قسم کے عام عذاب سے محفوظ کر دیا گیا ہے یعنی اس قسم کا عام عذاب جو گزشتہ اقوام کی طرح اس امت کا استیصال کر دے نازل نہ ہوگا۔ جزئی اور خصوصی واقعات اگر پیش آئیں تو اس کی نفی نہیں۔ ہاں تیسری قسم عذاب کی جسے اندرونی اور داخلی عذاب کہنا چاہیے اس امت کے حق میں باقی رہی ہے اور وہ پارٹی بندی، باہمی جنگ وجدل اور آپس کی خونریزی کا عذاب ہے۔ موضح القرآن میں ہے کہ قرآن شریف میں اکثر کافروں کو عذاب کا وعدہ دیا۔ یہاں کھول دیا کہ عذاب وہ بھی ہے جو اگلی امتوں پر آیا آسمان سے یا زمین سے اور یہ بھی ہے کہ آدمیوں کو آپس میں لڑادے اور ان کو قتل یا قید یا ذلیل کرے، حضرت نے سمجھ لیا کہ اس امت پر یہی عذاب ہوگا، اکثر عذاب الیم اور عذاب مہین اور عذاب شدید اور عذاب عظیم ان ہی باتوں کو فرمایا ہے آخرت کا عذاب بھی ہے ان پر جو کافر ہی مرے۔

اچھا وزیر نعمت ہے برا وزیر عذاب ہے

اسی طرح ابوداؤد، نسائی میں حضرت عائشہ (رض) سے روایت ہے کپ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ:
جب اللہ تعالیٰ کسی امیر اور حاکم کا بھلا چاہتے ہیں تو اس کو اچھا وزیر اور اچھا نائب دیدتے ہیں کہ اگر امیر سے کچھ بھول ہو جائے تو وہ اس کو یاد دلادے اور جب امیر صحیح کام کرے تو وہ اس کی مدد کرے، اور جب کسی حاکم وامیر کے لیے کوئی برائی مقدر ہوتی ہے تو برے آدمیوں کو اس کے وزراء اور ماتحت بنادیا جاتا ہے۔ (الحدیث)

حکام اور ملازمین کی تکالیف عذاب ہیں

ان روایات اور آیت مذکورہ کی متذکرہ تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو جو تکالیف اور مصائب اپنے حکام کے ہاتھوں پہنچتے ہیں وہ اوپر سے آنے والا عذاب ہے، اور جو اپنے ماتحتوں اور ملازموں کے ذریعہ پہنچتے ہیں وہ نیچے سے آنے والا عذاب ہے، یہ سب کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہوتے، بلکہ ایک قانون الٰہی کے تابع انسان کے اعمال کی سزا ہوتے ہیں، حضرت سفیان ثوری (رح) نے فرمایا کہ جب مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو میں اس کا اثر اپنے نوکر اور اپنی سواری کے گھوڑے اور باربرداری کے گدھے کے مزاج میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ یہ سب میری نافرمانی کرنے لگتے ہیں، مولانا رومی (رح) نے فرمایا کہ

خلق را با تو چنیں بدخو کنند
تا ترا ناچار رو آنسو کنند

فرقہ پرستی عذاب ہے

عذاب کی ایک قسم یہ ہے کہ قوم مختلف پارٹیوں میں بٹ کر آپس میں بھڑ جائے، اسی لیے جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مسلمانوں کو خطاب کرکے فرمایا:

لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض (اخرجہ ابن ابی حاتم عن زید بن اسلم) مظہری۔

یعنی تم میرے بعد پھر کافروں جیسے نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔

حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ جا رہے تھے، ہمارا گزر مسجد بنی معاویہ پر ہوا تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسجد میں تشریف لے گئے اور دو رکعت نماز پڑھی، ہم نے بھی دو رکعت ادا کی، اس کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دعا میں مشغول ہوگئے اور بہت دیر تک دعا کرتے رہے، اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے تین چیزوں کا سوال کیا، ایک یہ کہ میری امت کو غرق کرکے ہلاک نہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی، دوسرے یہ کہ میری امت کو قحط اور بھوک کے ذریعہ ہلاک نہ کیا جائے یہ بھی قبول فرمالی، تیسری دعا یہ کہ میری امت آپس میں جنگ وجدل سے تباہ نہ ہو، مجھے اس دعا سے روک دیا گیا (مظہری بحوالہ بغوی)۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعائیں

ابن عباس سے مروی ہے کہ حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ میں نے خدائے عزوجل سے دعا کی تھی کہ میری امت کو چار چیزوں سے دور رکھ۔ چنانچہ دو باتوں سے اللہ تعالیٰ نے میری امت کو محفوظ رکھا اور دو سے نہیں رکھا۔ میں نے دعا کی تھی کہ میری امت پر آسمان سے پتھراؤ نہ ہو اور اہل فرعون کی طرح وہ غرق ہو کر نہ مریں اور ان میں تفرقہ گیری نہ ہو اور یہ کہ وہ ایک دوسرے سے جنگ نہ کریں، تو اللہ تعالیٰ نے پتھراؤ نہ ہونے اور غرق سے محفوظ رہنے کی دعائیں تو قبول کرلیں لیکن آپس میں فرقہ پسندی اور گروہ بندی اور جنگ و قتال باقی رہا۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری قل ھو القادر الخ، تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اٹھے وضو کیا اور دعا مانگنے لگے کہ اے خدا میری امت پر اوپر اور نیچے سے عذاب نازل نہ فرما اور ان میں گروہ بندی اور جنگ نہ ہو، تو جبرائیل آئے اور کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! اللہ تعالیٰ نے تمہاری امت کو آصمان سے عذاب نازل ہونے اور پاؤں تلے سے عذاب ابلنے سے محفوظ کردیا ہے

علماء کا اختلاف رائے رحمت ہے

علامہ عبد الرؤف مناوی شارح جامع صغیر کی تحقیق کے مطابق فقہاء امت کے مختلف مسالک کا وہ درجہ ہوگا جو زمانہ سابق میں انبیاء (علیہم السلام) کی مختلف شرائع کا تھا کہ مختلف ہونے کے باوجود سب کی سب اللہ ہی کے احکام تھے، اسی طرح مجتہدین امت کے مختلف مسلک اصول قرآن وسنت کے ماتحت ہونے کی وجہ سے سب کے سب احکام خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی کہ لائیں گے۔

اس اجتہادی اختلاف کی مثال محسوسات میں ایسی ہے جیسے شہر کی بڑی سڑکوں کو چلنے والوں کی آسانی کے لیے مختلف حصوں میں تقسیم کردیا جاتا ہے، ایک حصہ پر بسیں چلتی ہیں دوسرے پر دوسری گاڑیاں یا ٹرام، اسی طرح سائیکل سواروں اور پیادہ چلنے والوں کے لیے روڈ کا علیحدہ ایک حصہ ہوتا ہے۔

اختلاف رائے جو اپنی حدود کے اندر ہو، یعنی قرآن وسنت کے قطعی اور اعتقادی مسائل اور قطعی احکام میں نہ ہو، صرف فروعی مسائل اجتہادیہ میں ہو، جن میں قرآن وسنت کی نصوص ساکت یا مبہم ہیں، اور وہ بھی جنگ وجدل اور لعن وطعن کی حد تک نہ پہنچے تو وہ بجائے مضر ہونے کے مفید اور ایک نعمت ورحمت ہے، جیسے کائنات عالم کی تمام چیزوں کا شکل وصورت، رنگ وبو اور خاصیت ومنفعت میں اختلاف ہے، حیوانات میں لاکھوں مختلف قسمیں بنی نوع انسان میں مزاجوں اور پیشوں، صنعتوں اور رہن وسہن کے طریقوں میں اختلاف، یہ سب اس عالم کی رونق بڑھانے والے اور بیشمار منافع کے اسباب ہیں۔

بہت سے لوگ جو اس حقیقت سے واقف نہیں وہ مذاہب فقہاء اور علماء حق کے فتوؤں میں اختلاف کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، ان کو یہ کہتے سنا جاتا ہے کہ علماء میں اختلاف ہے تو کدھر جائیں، حالانکہ بات بالکل صاف ہے کہ جس طرح کسی بیمار کے معاملہ میں ڈاکٹروں طبیبوں کا اختلاف رائے ہوتا ہے تو ہر شخص یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ان میں سے فنی اعتبار سے زیادہ ماہر اور تجربہ کار کون ہے، بس اس کا علاج کرتے ہیں، دوسرے ڈاکٹروں کو برا نہیں کہتے، مقدمہ کے وکیلوں میں اختلاف ہو جاتا ہے، تو جس وکیل کو زیادہ قابل اور تجربہ کار جانتے ہیں اس کے کہنے پر عمل کرتے ہیں، دوسروں کی بدگوئی کرتے نہیں پھرتے، یہی اصول یہاں ہونا چاہیے، جب کسی مسئلہ میں علماء کے فتوے مختلف ہو جائیں تو مقدور بھر تحقیق کرنے کے بعد جس عالم کو علم اور تقویٰ میں دوسروں سے زیادہ اور افضل سمجھیں اس کا اتباع کریں اور دوسرے علماء کو برا بھلا کہتے نہ پھریں۔

ہر مسلمان کی ذمہ داری

حافظ ابن قیم (رح) نے اعلام الموقعین میں نقل کیا ہے کہ ماہر مفتی کا انتخاب اور درصورت اختلاف ان میں سے اس شخص کے فتوے کو ترجیح دینا جو اس کے نزدیک علم اور تقوی میں سب سے زیادہ ہو، یہ کام ہر صاحب معاملہ مسلمان کے ذمہ خود لازم ہے، اس کا کام یہ تو نہیں کہ علماء کے فتووں میں کسی فتوے کو ترجیح دے لیکن یہ اسی کا کام ہے کہ مفتیوں اور علماء میں سے جس کو اپنے نزدیک علم اور دیانت کے اعتبار سے زیادہ

افضل جانتا ہے اس کے فتوے پر عمل کرے، مگر دوسرے علماء اور مفتیوں کو برا کہتا نہ پھرے، ایسا عمل کرنے کے بعد اللہ کے نزدیک وہ بالکل بری ہے، اگر حقیقۃً کوئی غلطی فتویٰ دینے والے سے ہو بھی گئی تو اس کا وہی ذمہ دار ہے۔

نہ ہر اختلاف برا ہے نہ ہر اتفاق اچھا ہے

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نہ ہر اختلاف مطلّقاً مذموم اور نہ ہر اتفاق مطلّقاً محمود و مطلوب ہے۔ اگر چور، ڈاکو، باغی ایک جماعت بنا کر باہم متفق ہو جائیں تو کون نہیں جانتا کہ ان کا یہ اتفاق مذموم اور قوم کے لیے مہلک ہے اور اس کے خلاف جو سعی و عمل عوام یا پولیس وغیرہ کی طرف سے اس جماعت کی مخالفت میں ہوتا ہے وہ ہر عقلمند کی نظر میں اختلاف محمود و مفید ہے۔

معلوم ہوا کہ خرابی اختلاف رائے میں نہیں اور نہ کسی ایک رائے پر عمل کرنے میں ہے بلکہ ساری خرابیاں دوسروں کے متعلق بدگمانی اور بدزبانی سے پیش آتی ہیں جو علم و دیانت کی کمی اور اغراض واہنواء کی زیادتی کا نتیجہ ہوتا ہے، اور جب کسی قوم یا جماعت میں یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے تو ان کے لیے یہ اختلاف رحمت بھی اختلاف عذاب کی صورت میں منتقل ہو جاتا ہے، اور مسلمانوں کی پارٹیاں بن کر ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدل اور بعض اوقات قتل و قتال تک میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور ایک دوسرے کے خلاف لعن طعن اور دل آزار کلمات کو تو مذہب کی حم آیت سمجھ لیا جاتا ہے، حالانکہ مذہب کا اس غلو اور زیادتی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بلکہ یہ وہی جدال ہے جس سے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شدت کے ساتھ منع فرمایا ہے، صحیح احادیث میں اس کو قوموں کی گمراہی کا سبب قرار دیا ہے

(ترمذی، ابن ماجہ)

مسلمانوں کی باہمی جنگیں

مراد یہ ہے کہ تم میں سے بعض بعض کو قتل کرنے لگیں۔ حضرت جابر بن عبداللہ (رض) کی روایت ہے کہ جب آیت مذکورہ کا پہلا حصہ (یعنی) قل ہو القادر علی ان یبعث علیکم عذابًا من فوقکم نازل ہوا تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کہا: اَعُوْذُبِوَجِهِكَ الكريم جب (اس سے آگے دوسرا حصہ) او یلبسکم شیعا ویذیق بعضکم باس بعض نازل ہوا تو آپ نے فرمایا یہ (پہلے عذاب سے) آسان اور سہل ہے۔ رواہ البخاری وغیرہ۔

فائدہ: آیت (کے آخری حصہ) کی تعبیر ہجرت سے ۳۵ سال کے بعد نظروں کے سامنے آ گئی جب جنگ جمل و صفین میں مسلمان باہم کشت و خون میں مبتلا ہو گئے۔

عبداللہ بن عبدالرحمٰن انصاری کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک مسجد میں تین دعائیں کیں۔ اللہ نے دو دعائیں تو قبول فرمالیں اور ایک دعا رد فرما دی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ سے دعا کی کہ میری امت پر کسی غیر دشمن کو مسلط نہ فرمائے کہ وہ سب پر چیرہ دستی کرے اللہ نے یہ دعا قبول فرمالی۔ حضور (صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم) نے دعا کی کہ سب امت کو (عمومی پیہم) قحط سالیوں سے ہلاک نہ کرے اللہ نے یہ دعا بھی قبول فرمالی۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دعا کی کہ امت کو باہم خانہ جنگی میں مبتلانہ کرے اللہ نے یہ دعا قبول نہیں فرمائی۔ رواہ البخاری۔

ابن ابی حاتم نے زید بن اسلم کا بیان نقل کیا ہے کہ جب آیت: { **قل هو القادر على ان يبعث عليكم عذاب من فوقكم** } نازل ہوئی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میرے بعد لوٹ کر کافر نہ ہو جانا کہ باہم ایک دوسرے کی گردن تلوار سے مارنے لگو صحابہ (رض) نے عرض کیا ہم شہادت دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں (کیا اس شہادت کے باوجود ہم ایسا کر سکتے ہیں) ایک شخص بولا ایسا کبھی نہیں ہو سکتا یعنی ہم سب مسلمان ہیں پھر ایک دوسرے کی گردن مارے ایسا نہیں ہو سکتا

جابر بن عتیک سے روایت ہے کہ ہمارے پاس عبداللہ بن عمر مقام بنی معاویہ میں آئے جو انصار کا ایک گاؤں ہے اور کہا کیا تم جانتے ہو کہ تمہاری اس مسجد میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کہاں نماز پڑھی تھی؟ میں نے کہا، ہاں۔ اور ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ پھر پوچھا، وہاں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کن تین باتوں کی دعا کی تھی۔ میں نے کہا، ہاں، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دعا کی تھی کہ کوئی دشمن میری امت پر غالب نہ ہو اور قحط نہیں ہلاک نہ کرے۔ تو یہ دونوں باتیں منظور کر لی گئیں، اور یہ بھی دعا کی تھی کہ ان کی آپس میں جنگ نہ ہو تو یہ دعا قبول نہ ہوئی۔ تو عبداللہ بن عمر نے کہا کہ تم نے ٹھیک کہا۔ چنانچہ قیامت تک مسلمانوں کے آپس میں جنگیں ہوتی رہیں گے۔ یہ حدیث صحاح ستہ میں درج نہیں ہے لیکن اس کی اسناد جید اور قوی ہے۔

یعنی قرآن کو یا عذاب کے آنے کو۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ سب جھوٹی دھمکیاں ہیں، عذاب وغیرہ کچھ نہیں آتا۔

(تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ کہیے کہ وہی اس پر قادر ہے کہ تم پر تمہارے اوپر سے عذاب بھیجے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا تمہیں مختلف گروہوں میں تقسیم کر دے اور تمہارے بعضوں کو بعض کی لڑائی کا مزہ چکھادے۔ دیکھیے ہم کس طرح بار بار دلیلوں کو بیان کر رہے ہیں تاکہ یہ سمجھ سکیں۔ (الانعام: ٦٥)

اللہ کی طرف سے دیئے جانے والے عذاب کی اقسام

اس سے پہلے اللہ سبحانہ نے یہ بیان فرمایا تھا کہ مشرکین وغیرہ جب مصائب میں اخلاص کے ساتھ اس کو پکارتے ہیں تو وہ ان کو ان مصائب اور آفات سے نجات دے دیتا ہے اور اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ وہ مختلف طریقوں سے تم پر عذاب نازل کرنے پر قادر ہے 'تاکہ مشرکین عبرت اور نصیحت حاصل کریں اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور توحید پر ایک نوع کی دلیل ہے 'تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر تمہارے اوپر سے عذاب بھیجے۔ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا اس سے مراد ہے۔ برے اور بدکار نوکر اور خدام۔ مجاہد نے کہا اس سے مراد ہے زلزلہ 'اور زمین میں دھنسنے کا عذاب۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمہیں مختلف گروہوں میں تقسیم کر دے اور تمہارے بعض کو بعض کی لڑائی کا مزہ چکھادے۔ مجاہد نے کہا اس امت کے جو لوگ ایمان لے آئے ان کا عذاب ایک دوسرے کو قتل کرنا ہے اور جنہوں نے تکذیب کی ان کا عذاب کڑک اور زلزلہ ہے۔

اوپر سے عذاب نازل ہونے کی مثال یہ ہے جیسے نوح (علیہ السلام) کی قوم پر طوفانی بارشیں ہوئیں ' جیسے حضرت لوط (علیہ السلام) کی قوم پر پتھر برسے یا جیسے ابرہہ کے ہاتھیوں پر ابابیلوں نے کنکریاں برسائیں اور جو عذاب پاؤں کے نیچے سے ظاہر ہوا اس کی مثال زلزلے ہیں 'اور جیسے قارون کو زمین میں دھنسا دیا گیا۔ یا بارش اور فصلوں کی پیداوار روک کر قحط کا عذاب نازل کیا گیا۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی (آیت) "قل ھو القادر علی ان یبعث علیکم عذابا من فوقکم "تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں تیرے چہرے کی پناہ میں آتا ہوں اور جب یہ آیت نازل ہوئی (آیت) "او من تحت ارجلکم "تو آپ نے فرمایا میں تیرے چہرے کی پناہ میں آتا ہوں اور جب یہ آیت نازل ہوئی (آیت) "او یلبسکم شیعا و یذیق بعضکم باس بعض "۔ تو رسول اللہ نے فرمایا یہ زیادہ سہل اور زیادہ آسان ہے۔

(صحیح البخاری 'ج ۵ 'رقم الحدیث : ۴۶۲۸ 'السنن الکبری اللنسائی 'رقم الحدیث : ۱۱۱۶۵)

امت کے اختلاف اور لڑائیوں سے نجات کی دعا سے اللہ تعالیٰ کا آپ کو منع فرمانا

اس آیت میں فرمایا ہے یا تمہیں مختلف گروہوں میں تقسیم کردے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ رنگ و نسل اور زبان اور فقہی واعتقادی نظریات میں اختلاف کی وجہ سے یہ امت مختلف فرقوں میں بٹ جائے گی۔ نیز فرمایا اور تمہارے بعض کو بعض کی لڑائی کا مزہ چکھا دے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ان اختلافات کی وجہ سے یہ امت باہم جدال اور قتال کرے گی۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دعا کی کہ آپ کی امت کو اللہ ان تمام قسم کے عذابوں سے محفوظ رکھے۔ اللہ تعالیٰ نے اوپر اور نیچے سے دیئے جانے والے عذابوں سے حفاظت کے متعلق آپ کی دعا قبول کرلی اور امت کے آپس میں تفرقہ اور لڑائیوں سے حفاظت کی دعا کرنے سے آپ کو منع کردیا جیسا کہ حسب ذیل احادیث سے واضح ہوتا ہے۔

امام مسلم بن حجاج قشیری ۲۶۱ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ثوبان (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے تمام روئے زمین کو میرے لیے لپیٹ دیا 'سو میں نے ان کے تمام مشارق اور مغارب کو دیکھ لیا 'اور یقینا جتنی زمین میرے لیے لپیٹی گئی ہے میری امت کا ملک وہاں تک پہنچے گا 'اور مجھے سرخ اور سفید (سونے اور چاندی کے) دو خزانے دیئے گئے ہیں اور میں نے اپنے رب سے اپنی امت کے لیے یہ سوال کیا کہ وہ ان کو عام قحط سے نہ ہلاک کرے 'اور یہ کہ ان کے اوپر ان کا ایسا مخالف دشمن مسلط نہ کرے جو ان کو بالکل ختم کردے۔ تب میرے رب نے فرمایا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب میں کوئی تقدیر بنا دیتا ہوں تو وہ مسترد نہیں ہوتی اور میں نے آپ کی امت کے لیے یہ کردیا ہے کہ میں ان کو قحط عام سے ہلاک نہیں کروں گا 'اور یہ کہ میں ان پر ان کا مخالف ایسا دشمن مسلط نہیں کروں گا جو ان کو بالکل ختم کردے 'خواہ وہ تمام روئے زمین سے ان کے اوپر چڑھائی کرے 'حتی کہ آپ کی امت کے بعض افراد بعض کو ہلاک کریں گے اور بعض بعض کو قید کریں گے۔

(صحیح مسلم 'فتن '۱۹ (۲۸۸۹) ۷۱۲۵ 'سنن ابوداؤد 'رقم الحدیث : ۴۲۵۲ 'سنن الترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث : ۲۱۸۲ 'سنن النسائی 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۱۶۳۷ 'صحیح ابن حبان 'ج ۱۶ 'رقم الحدیث : ۷۲۳۶ 'سنن ابن ماجہ ج ۲ 'رقم الحدیث : ۳۹۵۲ 'المعجم الکبیر 'ج ۴ 'رقم الحدیث : ' ۳۶۲۲ 'مسند احمد 'ج ۷ 'رقم الحدیث : ۲۱۱۰۹ 'جامع البیان 'جز ۷ 'ص ۲۹۱)

امام ابو عیسی محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت خباب بن ارت (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک مرتبہ بہت لمبی نماز پڑھی 'صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ نے ایسی نماز پڑھی ہے جو آپ عام طور پر نہیں پڑھتے۔ آپ نے فرمایا ہاں ! اللہ سے رغبت اور اس سے خوف کی نماز تھی 'میں نے اللہ تعالیٰ سے تین چیزوں کا سوال کیا 'اس نے مجھے دو چیزیں عطا کردیں 'اور ایک سے منع کردیا۔ میں نے اللہ سے سوال کیا کہ میری امت کو قحط میں ہلاک نہ کرنا تو اللہ نے مجھے یہ عطا کردیا 'اور میں نے سوال کیا کہ میری امت پر ان کے مخالف کو مسلط نہ کرنا تو یہ مجھے عطا کردیا اور میں نے سوال کیا کہ میری امت کے بعض 'بعض سے جنگ نہ کریں تو مجھے اس سے منع فرمادیا۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔ (سنن الترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث : ۲۱۸۲ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت '۱۴۱۴ھ)

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ روایت کرتے ہیں :

حسن بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں نے اپنے رب سے سوال کیا تو مجھے تین چیزیں دی گئیں اور ایک چیز سے منع کردیا گیا 'میں نے اپنے رب سے سوال کیا کہ میری امت پر ان کا مخالف دشمن نہ مسلط کیا جائے جو ان کو بالکل ختم کردے اور ان پر قحط نہ مسلط کیا جائے اور وہ گمراہی پر متفق نہ ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ عطا کردیا اور میں نے یہ سوال کیا کہ وہ متفرق نہ ہوں اور بعض 'بعض سے لڑائی نہ کریں تو مجھے اس دعا سے روک دیا گیا۔

حسن بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی (آیت) " ویذیق بعضکم باس بعض "۔ (الخ) (الانعام : ۶۵) تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وضو کرکے اپنے رب سے یہ سوال کیا کہ وہ آپ کی امت پر اوپر سے عذاب نہ بھیجے اور نہ نیچے سے عذاب بھیجے اور نہ ان کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرے اور نہ بعض کو بعض کی لڑائی کا مزہ چکھائے۔ جیسا کہ بنو اسرائیل کو چکھایا تھا تو حضرت جبرائیل (علیہ السلام) آپ کی طرف نازل ہوئے اور کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ نے اپنے رب سے چار چیزوں کا سوال کیا ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو چیزیں عطا فرمادی ہیں اور دو چیزوں کے سوال سے منع فرمادیا ہے۔ آپ کی امت پر نہ اوپر سے عذاب آئے گا اور نہ ان کے پیروں کے نیچے سے ایسا عذاب آئے گا جو ان کو جڑ سے اکھاڑ دے 'کیونکہ عذاب کی یہ دونوں قسمیں ہر اس امت کے لیے تھیں جس نے اپنے نبی کی تکذیب کی ہو اور اپنے رب کی کتاب کو مسترد کردیا ہو 'لیکن وہ ان کو مختلف گروہوں میں تقسیم فرمائے گا اور ان کو ایک دوسرے کے ساتھ لڑائی کا مزہ چکھائے گا اور ان دو قسموں کے عذاب ان لوگوں کے لیے ہوتے ہیں جو کتاب کا اقرار کرتے ہیں اور انبیاء (علیہم السلام) کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو آپ کی زندگی میں آپ کی امت کو اس قسم کے فتنوں کے عذاب سے محفوظ رکھا۔ (جامع البیان 'جز ۷ ص ۲۹۳۔ ۲۹۲ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت)

ان تمام احادیث اور روایات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس دعا سے منع فرمادیا 'یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول نہیں کی۔ ہر چند کہ اللہ تعالیٰ کسی کی دعا قبول کرنے پر مجبور نہیں ہے 'لیکن اس نے اپنے فضل و کرم سے اپنے احباء کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ وہ ان کا سوال رد نہیں فرماتا 'اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سب سے بڑھ کر محبوب ہیں اور سب سے زیادہ مستجاب ہیں۔ اسی لیے جو چیز اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف تھی 'اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کی دعا مانگنے سے منع فرمادیا 'تاکہ آپ کی دعا کا مسترد کرنا لازم نہ آئے۔

امام ابو عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شام کے وقت اور صبح کو ان کلمات سے دعا مانگنے کو ترک نہیں کرتے تھے۔ اے اللہ! میں تجھ سے دنیا اور آخرت میں عافیت کا سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ میں تجھ سے اپنے دین اور اپنی دنیا میں اور اپنے اہل اور اپنے مال میں 'عفو اور عافیت کا سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ میرے عیوب پر پردہ رکھ اور جن چیزوں سے مجھے خوف ہے 'ان سے مامون رکھ۔ اے اللہ! مجھے آگے اور پیچھے سے 'دائیں اور بائیں سے 'اوپر سے اور نیچے سے حفاظت میں رکھ اور میں نیچے کی مصیبت (دھنسا دینے) سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔
(سنن ابن ماجہ 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۳۸۷۱ 'مطبوعہ دارالفکر بیروت)

اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ یہ ہر قسم کے عذاب سے پناہ کے لیے بہت جامع دعا ہے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اظہار عبودیت 'امتثال امر اور ہماری تعلیم کے لیے صبح و شام یہ دعا مانگتے تھے کہ جب آپ اتنے عظیم الشان رسول اور اللہ کے محبوب ہو کر اس قدر یہ دعا کرتے ہیں تو ہم جو دعاؤں کے ویسے ہی زیادہ محتاج ہیں 'ہمیں کس قدر یہ دعا کرنی چاہیے۔

فقہ کا لغوی اور اصطلاحی معنی

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا دیکھئے ہم کس طرح بار بار دلیلوں کو بیان کرتے ہیں 'تاکہ یہ تفقہ کریں (سمجھ سکیں)

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ ھ لکھتے ہیں :

حاضر علم سے غائب علم تک رسائی حاصل کرنے کو فقہ کہتے ہیں اور اصطلاح میں احکام شرعیہ کے علم کو فقہ کہتے ہیں۔ (المفردات ص ۳۸۴ 'مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ 'ایران '۱۳۴۲ھ)

علماء شافعیہ نے فقہ کی یہ تعریف کی ہے احکام شرعیہ عملیہ کا علم جو دلائل تفصیلیہ سے حاصل ہو 'اور حکم شرعی کی تعریف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خطاب جو مکلفین کے افعال سے متعلق ہو 'اور احکام شرعیہ یہ ہیں۔ فرض 'واجب 'سنت موکدہ 'سنت غیر موکدہ 'مستحب 'مباح 'حرام 'مکروہ تحریمی ' اساءت 'مکروہ تنزیہی 'خلاف اولی 'امام ابوحنیفہ (رح) سے فقہ کی یہ تعریف منقول ہے۔

نفس کا یہ پہچاننا کہ کیا چیز اس کے لیے ضرر کا باعث ہے اور کیا چیز اس کے لیے نفع کا باعث ہے۔

دلائل اجمالیہ یہ ہیں۔ مثلا امر وجوب کے لیے ہے اور نہی تحریم کے لیے ہے 'اور دلائل تفصیلیہ یہ ہیں مثلا (آیت) "اقیموا الصلوۃ "اور (آیت) لا تقربوا الزنا"۔ اور دلائل تفصیلیہ سے احکام شرعیہ کے حصول کی مثال یہ ہے۔ نماز کا امر کیا گیا ہے 'کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے (آیت) "اقیموا الصلوۃ "اور جس چیز کا امر کیا گیا ہے وہ واجب ہے 'کیونکہ امر وجوب کے لیے ہے 'لہٰذا نماز واجب ہے۔ دوسری مثال یہ ہے زنا سے نہی کی گئی ہے 'کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا (آیت) "لا تقربوا الزنا "اور جس چیز سے نہی کی جائے وہ حرام ہے 'کیونکہ نہی تحریم کے لیے ہے۔ لہٰذا زنا حرام ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن۔ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ؕ 66○

لغۃ القرآن: وَكَذَّبَ : اور جھٹلایا] [بِهٖ : اس کو] [قَوْمُكَ : آپ کی قوم نے] [وَهُوَ : اور وہ] [الْحَقُّ : حق] [قُلْ : آپ کہہ دیں] [لَّسْتُ : نہیں ہوں میں] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [بِوَكِيْلٍ : کوئی داروغہ ، نگہبان]

ترجمہ : اور آپ کی قوم نے اس (قرآن) کو جھٹلا ڈالا حالانکہ وہ سراسر حق ہے۔ فرما دیجئے : میں تم پر نگہبان نہیں ہوں۔

تشریح : جب کفار مکہ نے قرآن مجید کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا حالانکہ وہ سچی کتاب ہے اور اس میں بیان ہونے والی ساری خبریں حق ہیں تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : میں تمہاری ہدایت کا ذمہ دار نہیں ہوں، میرا کام دعوت و تبلیغ ہے اور تمہیں آخرت کے عذاب سے ڈرنا ہے، اب اگر تم قرآن مجید پر ایمان نہیں لاتے تو جس برے انجام سے قرآن تمہیں ڈراتا ہے وہ اپنے مقرر وقت پر خود تمہارے سامنے آ جائے گا۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

یہاں روئے سخن حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف ہے۔ اس خطاب کے ذریعے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے بعد آنے والے اہل ایمان کے کاسہ دل کو ایمان ویقین سے بھر دیا جاتا ہے۔ اگرچہ ایک داعی کی پوری قوم اور پورا معاشرہ حق کو جھٹلا دے تب بھی اسے یقین ہوتا ہے کہ حق غالب رہے گا اس لیے کہ سچائی کے بارے میں فیصلہ کرنا اہل جاہلیت کا کام نہیں ہے ' یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ حق اور باطل کا فیصلہ کرے۔ اللہ ہی ہے جو یہ اعلان کر سکتا ہے کہ فلاں چیز حق ہے اور فلاں چیز باطل۔ لہٰذا جھٹلانے والوں کے کسی فیصلے کی کوئی حقیقت اور حیثیت نہیں ہے۔

اس کے بعد حضرت نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی قوم سے دامن چھڑا لیں اور اعلان کر دیں کہ وہ ان سے بری الذمہ ہیں اور یہ کہ اب ان کی اور ان کی قوم کی راہیں جدا ہو گئی ہیں اور یہ بھی اعلان کر دیں کہ وہ ان کے معاملے میں کسی چیز کے مختار و حوالہ دار نہیں ہیں اور نہ ان کی نگہبانی کے ذمہ دار ہیں۔ ان کا فریضہ اس وقت ختم ہو جاتا ہے جب وہ پیغام پہنچا دیں اور سمجھا دیں کیونکہ ذمہ داری اور نگہبانی رسولوں کی ڈیوٹی میں شامل نہیں ہے۔ جب کوئی رسول پیغام پہنچا دے اور سمجھا دے تو اس کا فریضہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد رسول اقوام کو چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اپنے فطری انجام تک پہنچ جائیں ' کیونکہ ہر بات اپنے مقررہ وقت پر ظاہر ہو جاتی ہے اور جب بات سامنے آ جاتی ہے تو سب اسے جان لیتے ہیں۔

(آیت) "لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (67)

" ہر خبر کے ظہور میں آنے کا ایک وقت مقرر ہے ' عنقریب تم کو خود انجام معلوم ہو جائے گا"۔

یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ کیا بات ہے جو ظاہر ہونے والی ہے۔ایسے مقامات پر بات کو مجمل رکھنا زیادہ خوفناک ہوتا ہے۔مارے ڈر کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔

آیات میں حق پر ثابت قدمی کی تلقین ہے یقین دلایا گیا ہے کہ باطل کا ظاہری غلغلہ جس قدر بھی ہوں اس کا انجام بہر حال برا ہوگا اور ایک مقررہ وقت پر اللہ کی جانب سے اہل باطل کو پکڑا جاتا ہے اور یہ کہ ہر بات کے ظہور کا وقت مقرر ہے اور ہر حاضر صورت حال کا ایک انجام سامنے آنے والا ہے۔(فی ظلال)

اس آیت میں فرمایا ہے حالانکہ یہی حق ہے۔اس میں کس چیز کو حق فرمایا ہے اس میں حسب ذیل اقوال ہیں:

(۱) کفار نے اس عذاب کا انکار کیا ' حالانکہ اس کا نزول حق ہے۔

(۲) کفار نے اس قرآن کا انکار کیا ' حالانکہ یہ قرآن حق ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے الوہیت اور توحید پر استدلال کے لیے جو آیات نازل کی ہیں کفار نے ان دلائل کا انکار کیا ' حالانکہ یہ دلائل حق ہیں۔

اس کے بعد فرمایا آپ کہیے کہ میں تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں 'یعنی اگر تم ان دلائل سے اعراض کرتے ہو اور حق کا انکار کرتے ہو تو میں تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں 'یعنی نہ میں تم پر جبر کرکے تمہیں مومن بنا سکتا ہوں اور نہ تمہارے اعراض کرنے کی تمہیں سزا دے سکتا ہوں۔میں تو تم کو صرف آخرت کے عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔اس نہج پر قرآن مجید میں اور بھی آیات ہیں:

(آیت) "نحن اعلم بما یقولون وما انت علیھم بجبار فذکر بالقران من یخاف وعید"۔(ق:۴۵)

ترجمہ: ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں اور آپ ان سے جبرا منوانے والے نہیں ہیں تو آپ قرآن سے اس کو نصیحت فرمائیں جو میرے عذاب کی وعید سے ڈرتا ہو۔

(آیت) "فذکر انما انت مذکر لست علیھم بمصیطر"۔(الغاشیہ: ۲۲-۲۱)

ترجمہ: پس آپ نصیحت کرتے رہیں آپ تو نصیحت ہی کرنے والے ہیں، آپ ان کو جبر سے منوانے والے نہیں ہیں۔

(تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

پیغمبر کا کام متنبہ کرنا ہے

یعنی میرا یہ منصب نہیں کہ تمہاری تکذیب پر وہ عذاب نازل کر دوں یا اس کے وقت اور نوعیت وغیرہ کی تفصیل بتلاؤں میرا کام صرف باخبر اور متنبہ کر دینا ہے۔آگے ہر چیز کے وقوع کا علم الٰہی میں ایک وقت مقرر ہے۔جب وقت آ جائے گا تم خود جان لوگے کہ میں جس چیز سے ڈراتا تھا وہ کہاں تک سچ ہے۔ (تفسیر گلدستہ۔مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہر خبر کا ایک وقت مقرر ہے 'اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو خبر دی ہے اس کا ایک وقت مقرر ہے اور اس وقت میں یقینا اس خبر کا ظہور ہوگا اور اس میں کوئی تقدیم تاخیر نہیں ہوگی۔اس سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے لیے عذاب آخرت کی جو خبر دی ہے 'وہ عذاب یقینا نازل ہوگا۔اور اس سے یہ مراد ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو یہ خبر دی ہے کہ کفار کے ساتھ جنگ میں مسلمان کافروں پر غالب ہوں گے تو بغیر شک و شبہ کے اس خبر کا ظہور ہوگا۔یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کفار کے لیے وعید ہے 'کیونکہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کا

انکار کرتے تھے اور دنیا میں بھی ان کے لیے وعید ہے جیسا کہ بدر وغیرہ میں وہ شکست سے دوچار ہوئے اور مسلمانوں کو بھی ڈرنا چاہیے ' کیونکہ اگر انھوں نے قرآن مجید کے احکام پر عمل نہیں کیا ' بلکہ قرآن کریم کے احکام کی خلاف ورزی کی ' تو یہ قرآن مجید کے انکار کے مترادف ہے ' تو ایسا نہ ہو کہ وہ بھی عذاب الٰہی سے دوچار ہو جائیں۔ (تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۡ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ○67

لغۃ القرآن : لِكُلِّ : کے لیے] [نَبَاٍ : خبر] [مُسْتَقَرٌّ : ٹھکانا ہے] [وَ : اور] [سَوْفَ : عنقریب] [تَعْلَمُوْنَ : تم سب جانتے ہو]

ترجمہ : ہر خبر (کے واقع ہونے) کا وقت مقرر ہے اور تم عنقریب جان لوگے

تشریح :

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو خبریں دیں ان کے لیے وقت معین ہیں، ان کا وقوع کسی تاخیر کے بغیر ٹھیک اسی وقت ہوگا اور عنقریب تم دنیا و آخرت میں ان خبروں کے درست ہونے کو جان لوگے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری)

دنیا کا ہر کام اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ کے علم اور مشیت سے ہوتا ہے

نَبَاٌ کسی اہم حادثہ کی خبر کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد اس عذاب کی خبر ہے جو قرآن دے رہا ہے۔ مُسْتَقَر موضع استقرار اور وقت استقرار دونوں مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی مصدر کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کوئی کام اتفاق سے نہیں ہوتا بلکہ ہر کام اور ہر واقعہ اللہ کے علم اور اس کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ دنیا کا کوئی چھوٹا یا بڑا واقعہ چاہے وہ پتہ گرنے کا ہو یا ایٹم بم گرنے کا ' اللہ کے علم سے باہر نہیں۔ پیچھے ہم پڑھ چکے ہیں کہ پروردگار فرماتا ہے کہ جنگل میں کوئی پتہ نہیں گرتا ' مگر اللہ اسے جانتا ہے اور کوئی خشک و تر چیز ایسی نہیں جو اللہ کے علم میں نہ ہو زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ نہیں گرتا مگر اللہ کی کتاب علم میں وہ محفوظ ہوتا ہے۔ جس طرح دنیا کا ہر واقعہ اور دنیا کی ہر بات اللہ کے علم میں ہے اسی طرح اس کی قدرت میں بھی ہے۔ اس لیے اللہ خوب جانتا ہے کہ کسی قوم پر عذاب آنا چاہیے یا نہیں اور اگر عذاب آنا ہے تو اس کا وقت کونسا ہے اور اس کی جگہ کونسی ہے کیونکہ دنیا کے ہر واقعہ کا وقت اور اس کی جگہ اللہ کی تقویم میں پہلے سے طے ہے۔ اے مشرکین مکہ تم پر اگر ابھی تک عذاب نہیں آیا اور تم مجھ سے بار بار اس کا مطالبہ کر رہے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ عذاب لانا میرا کام نہیں کیونکہ میں اللہ کا رسول

بن کر آیا ہوں ' دنیا میں عذاب لانے کے لیے تو نہیں آیا۔ میری تمام مساعی کا حاصل تمہیں عذاب سے بچانا ہے۔ لیکن تم اگر اپنی کرتوتوں سے مسلسل عذاب کو دعوت دے رہے ہو تو یقینا وہ اللہ کے علم میں ہے اور وہی جانتا ہے کہ اس کے آنے کا وقت کیا ہے۔ لیکن تمہیں اس بات کا یقین رکھنا چاہیے کہ اگر علم خداوندی میں اس کا فیصلہ ہو چکا ہے تو اس کا آنا اٹل ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی۔ اب رہی یہ بات کہ وہ وقت کونسا ہوگا تو اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ تمہیں اللہ نے جو مہلت عمل دے رکھی ہے جب تک اس کی آخری گھڑی نہیں آجاتی یعنی تمہارے اندر جو قدرت نے ایمان قبول کرنے کی جو استعداد رکھی ہے جب تک اس کی آخری ٹہنی کہ نہیں ٹوٹ جاتی اس وقت تک عذاب نہیں آئے گا۔ لیکن جیسے ہی وہ مقررہ گھڑی پہنچ جائے گی 'جس میں تم اپنی مہلت عمل کھو بیٹھوگے تو پھر تمہارے عذاب کے آنے میں کوئی تاخیر نہیں ہوگی۔
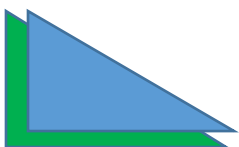
سلسلہ بیان جہاں تک پہنچ چکا ہے 'اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور مسلمانوں کی دعوتی اور تبلیغی کاوشیں ایک خاص مرحلے میں داخل ہو گئی ہیں۔ ایک طرف تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے جانثاروں کی معیت میں تبلیغ وتذکیر کے بھرپور عمل سے مکہ معظّمہ میں رہنے والے لوگوں کو دولت ایمان سے منور کر دینا چاہتے ہیں اور آپ کی شدید خواہش ہے کہ مکہ معظّمہ اللہ کا گھر اور مہبط وحی ہونے کی وجہ سے اس کا حق رکھتا ہے کہ یہ مرکز اسلام بنے اور یہیں سے اسلام کا نور پوری دنیا میں پھیلے اور وہ اسی صورت ممکن ہے کہ یہاں کے رہنے والے اسلام کی دعوت قبول کریں اور اس کے دست و بازو بن کر اس تحریک کو پوری دنیا میں پھیلا دیں اور دوسری طرف مشرکین مکہ کا حال یہ ہے کہ وہ دعوت و تبلیغ پر تو کیا کام کریں گے وہ تو عذاب کی دھمکیوں کو بھی خاطر میں لانے کو تیار نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس دعوت اور اس دین کا مذاق اڑانا ایک معمول بنا لیا ہے۔ حضور جس کسی مجلس میں بھی جاتے ہیں اور جس قبیلے کے سامنے اپنی دعوت پیش کرتے ہیں۔ آپ کو نہایت ناگوار صورتحال سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور بعض دفعہ ایسی ناگفتنی باتیں سننی پڑتی ہیں کہ جن کا برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسی صورتحال کے حوالے سے آنحضرت اور مسلمانوں کو خاص ہدایات دی جارہی ہیں۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

گناہوں پر اصرار نہ کیا جائے

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کافروں اور گناہ گاروں کے لیے عذابات کی جو خبریں دی ہیں ان کا اپنے وقت پر واقع ہونا یقینی ہے، یہ اعلان سننے کے بعد بھی کفر پر اڑے رہنا اور گناہوں میں مشغول رہنا حد درجہ کی حماقت ہے لہٰذا ہر انسان کو چاہیے کہ وہ عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کفر اور گناہوں پر اصرار کرنا چھوڑ دے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سچی توبہ کرکے اپنے گناہوں کی معافی مانگ کر خود کو ہلاکت سے بچالے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ”(گناہوں پر) اصرار کرنے والے ان لوگوں کے لیے ہلاکت ہے جو اپنے گناہوں پر قائم ہیں (اور اس کے باوجود وہ توبہ واستغفار نہیں کرتے) حالانکہ وہ جانتے ہیں (کہ ان کا فعل گناہ ہے۔) (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

طبری فرماتے ہیں

ہر خبر کی ایک قرار گاہ جس میں وہ قرار پکڑنے والی ہے اور اس کی ایک انتہا ہے جس تک وہ پہنچ کر رہتی ہے جس سے اس کی حقانیت وصداقت اسکے کذب اور بطلان سے کھل جاتی ہے اور اے تکذیب کرنے والو! تم کو میری خبر کی وعید انہی سے معلوم ہو جائے گی جبکہ وہ عذاب تمہارے

آنگن کو آ گھیرے گا چناچہ انہوں نے اس عذاب کو آنکھوں سے دیکھ لیا جب وہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء مومنین کے ہاتھوں وہ ہلاکت کے گھاٹ اترے۔

شواہد :

مجھے محمد بن الحسین نے سدی سے " و کذب بہ قومك ۔۔ الایۃ " کے متعلق نقل کیا کہ قریش نے سچے قرآن کو جھٹلا دیا۔ الوکیل : محافظ کو کہا جاتا ہے۔ (لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ) کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی خبر بدر کے روز موعود عذاب کے مطابق پوری ہوئی۔

ہمیں مثنی نے مجاہد سے (لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ) کا مطلب یہ ذکر کیا ہے کہ ہر خبر کی ایک حقیقت خواہ وہ دنیا میں ظاہر ہو یا آخرت میں جو دنیا میں ہے اسے عنقریب تم دیکھ لوگے اور جس کا تعلق آخرت سے ہے وہ عنقریب تمہارے سامنے ظاہر کر دی جائے گی۔

مجھے مثنی نے ابن عباس سے (لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ) کا مطلب یہ ذکر کیا کہ ہر خبر کی ایک حقیقت ہے۔

مجھے محمد بن سعد نے ابن عباس (رض) سے اس کا مطلب ذکر کیا ہے : ہر خبر کے لیے فعل اور حقیقت ہے۔ جو اس میں سے دنیا سے متعلق ہو اور جو اس میں سے آخرت سے متعلق ہو۔ حسن بسری اس کا مطلب یہ ذکر کرتے کہ اس سے مراد وہ آزمائش ہے جو اصحاب رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مابین پیش آئی تھی۔

مجھے مثنی نے حسن سے (لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ) کا مطلب یہ نقل کیا کہ ہر خبر کی سزا رد کی جاتی ہے جب اس گناہ کو کر لیا جاتا ہے تو اس کی سزا کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ (تفسیر طبری)

نباء کسی بڑے حادثے کی خبر کو کہا جاتا ہے، یہاں اس سے مراد اسی عذاب کی خبر ہے جس سے قرآن حکیم خبردار کرتا ہے۔ سو اس سے واضح فرما دیا گیا کہ پیغمبر کی اصل ذمہ داری تو انذار اور تبلیغ ہے۔ اور اس کو انھوں نے پورا کر دیا۔ اور باحسن وجوہ پورا کر دیا۔ اور اس سے وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوگئے، اب رہ گئی یہ بات کہ وہ عذاب کب اور کس شکل میں آئے گا تو اس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے، البتہ اس بارے میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔ جب وہ مقرر وقت آ جائیگا تو تم لوگ اصل حقیقت کو خود دیکھ لوگے اور اچھی طرح دیکھ لوگے، والعیاذ باللہ العظیم، اللہ تعالیٰ ہمیشہ اور ہر حال میں اور ہر اعتبار سے اپنی حفاظت و پناہ میں رکھے۔ آمین ثم آمین، (تفسیر مدنی۔ مولانا اسحاق مدنی کشمیر)

آیت مبارکہ :

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ 68

لغۃ القرآن: وَاِذَا : اور جب] [رَاَيْتَ : آپ دیکھتے ہیں] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [يَخُوْضُوْنَ : وہ سب نکتہ چینی کر رہے ہوں] [فِيْٓ : میں] [اٰيٰتِنَا : ہماری آیتیں] [فَاَعْرِضْ : تو آپ اعراض کریں] [عَنْهُمْ : ان کو] [حَتّٰي : یہاں تک کہ] [يَخُوْضُوْا : وہ سب لگ جائیں] [فِي : میں] [حَدِيْثٍ : بات] [غَيْرِهٖ : اس کے علاوہ] [وَاِمَّا : اور اگر] [يُنْسِيَنَّكَ : بھلا دے آپکو] [الشَّيْطٰنُ : شیطان نے] [فَلَا : پس نہیں] [تَقْعُدْ : آپ بیٹھیں] [بَعْدَ : کے بعد] [الذِّكْرٰي : یاد آنے کے] [مَعَ : ساتھ] [الْقَوْمِ : قوم] [الظّٰلِمِيْنَ : سب ظالموں کا]

ترجمہ : اور جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں (کج بحثی اور استہزاء میں) مشغول ہوں تو تم ان سے کنارہ کش ہو جایا کرو یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں، اور اگر شیطان تمہیں (یہ بات) بھلا دے تو یاد آنے کے بعد تم (کبھی بھی) ظالم قوم کے ساتھ نہ بیٹھا کرو

تشریح :

صحبت کا اثر مسلم ہے۔ انسان اپنے ہم نشین کی عادات، اخلاق اور عقائد سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان لوگوں کے پاس بیٹھنے سے سختی سے منع کیا ہے جن کارات دن کا مشغلہ اسلام، پیغمبر اسلام اور قرآن حکیم پر طعن و تشنیع کرنا ہے۔ ایسے لوگوں کی صحبت سے پرہیز ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا دل بھی ان کی باتوں سے متاثر ہونے لگے۔ آج کل کی عام گمراہی کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگ اس حکم پر عمل

نہیں کرتے اور ان بد عقیدہ لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے میں کوئی ضرر نہیں سمجھتے۔ نتیجہ وہی نکلتا ہے کہ متعدی مرض کے مریض کے پاس بیٹھنے والا بھی اس مرض کا شکار ہو جاتا ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

حضرت سدی کہتے ہیں جب بھی مسلمان مشرکین مکہ کے پاس (حرم کعبہ) میں بیٹھتے تو وہ قرآن اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں عیب جوئی شروع کر دیتے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر ابن جریر جلد 7 صفحہ 148 مطبوعہ مکہ)

یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے مسلمانو! جب تم کسی قوم کو قرآنی آیات اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزات و کمالات پر حرف گیری کرتے دیکھو تو ان کے قریب مت بیٹھو۔ ہاں اگر کوئی دوسری بات ہو یعنی مذہبی معاملات سے ہٹ کر خرید و فروخت وغیرہ کا معاملہ ہو تو ان کے پاس بیٹھا جاسکتا ہے اور اگر تم بھول کر بے دینوں کی محفل میں چلے جاؤ تو تنبیہ ہو جانے کے بعد دوبارہ ادھر کا رخ مت کرو۔ اس میں یہ درج ہے کہ منکرین ختم نبوت، جاحدین حدیث، طاعنین صحابہ کرام واہل بیت یعنی رافضی و ناصبی فرقے، تفضیلی فرقہ یعنی افضیلت شیخین کے منکرین، انبیاء و اولیاء کے توسل کو شرک سے تعبیر کرنے والے، پیروں فقیروں اور قبور کو سجدہ کرنے والے یعنی سجدہ تعظیمی کے قائلین اور دیگر گمراہ فرقوں کی مجالس میں جانا جائز نہیں ہے نہ ہی ان کی کتابیں پڑھنا جائز ہے۔ الا یہ کہ مدد کے لئے پڑھی جائیں، یہیں ختم ان کے ٹی وی چینلز کے دیکھنے اور ان کی کسی ویب سائٹ کے کھولنے کا ہے۔ کیونکہ یہ ایسے ہی ہے جیسے ان کے پاس بیٹھ کر ان کی بات سنی جائے۔

بدمذہب لوگوں کے پاس بیٹھنے کی برائی اور حرمت:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ۔ اور تم ان لوگوں کی طرف مائل مت ہو جاؤ جنہوں نے ظلم کیا ایسا نہ ہو گی تمہیں آگ چھوئے۔ اور اللہ کے سوا کوئی بچانے والا نہ ہوگا پھر تمہاری مدد نہیں کی جائے گی۔ (ھود، 113)

حدیث طیبہ میں بدمذہب لوگوں کے پاس بیٹھنے اور ان کے ساتھ کھانے پینے اور رشتے استوار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

حضرت حذیفہ (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

لکل امة مجوس و مجوس ھذہ الامة الذین یقولون لا قدر، من مات منھم فلا تشھدوا جنازتہ و من مرض منھم فلا تعودوھم وھم شیعة الدجال و حق علی اللہ ان یلحقھم بالدجال۔

"ہر امت کے مجوسی تھے اور قدری لوگ (تقدیر کے منکرین) اور اس امت کے بھی مجوس ہیں وہ کہتے ہیں کوئی تقدیر نہیں ہے جو شخص ان میں سے مر جائے تو تم اس کے جنازے میں مت شریک ہو اور جو ان میں سے مریض ہو تو تم اس کی عیادت مت کرنے جاؤ وہ دجال کے ساتھی ہیں اور اللہ کا حق ہے کہ انھیں دجال کے ساتھ ملائے۔ (سنن ابی داؤد کتاب السنہ حدیث 469)

حضرت ابوہریرہ (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

سیکون فی اخر امتی اناس یحدثونکم ما لم تسمعوا انتم ولا اباؤکم فایاکم وایاھم۔

"میری امت کے آخری دور میں کچھ لوگ ہوں گے جو تمہیں ایسی احادیث سنائیں گے جو کبھی تم نے سنی ہو گی نہ تمہارے باپ دادا نے تو تم ان سے دور رہو تم سے دور رہیں۔" (مسلم مقدمہ باب 4 حدیث 7)

حضرت معاذ بن جبل (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

"شیطان انسان کا بھیڑیا ہے، جیسے بکریوں کا بھیڑیا ہوتا ہے، وہ ریوڑ سے الگ ہونے والی، دور چلی جانے والی اور کنارے پر رہنے والی بکری کو اٹھالے جاتا ہے تو تم گھاٹیوں میں مت داخل ہو، وعلیکم الجماعۃ اور تم پے ضروری ہے کہ جماعت کے ساتھ رہو۔ " (مسند احمد بن حنبل جلد 5 صفحہ 233 مطبوعہ دارالفکر بیروت)

حضرت ابراہیم بن میسرہ (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

من وقر صاحب بدعة فقد اعان علی ھدم الاسلم۔ یعنی "جس نے کسی بدعتی (نئے اختراعی عقیدہ والے شخص) کی تعظیم کی اس نے اسلام کو منہدم کرنے میں مدد دی"۔ (مشکوۃ بروایت بیہقی کتاب الایمان باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ فصل سوم)

بدمذہب لوگوں کی کتابیں پڑھنا اور ان کی ویب سائٹس کا دیکھنا بھی حرام ہے

اس آیت اور ان احادیث میں بدمذہب اور گمراہ لوگوں کی مجلس میں بیٹھنے سے اس لئے روکا گیا کہ اس سے اہل ایمان کا ایمان کمزور ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ ان کی کوئی بات دل میں ایسی بیٹھ جائے گے ایمان کو متزلزل کردے اور دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ گمراہ بددین فرقوں کی مجالس میں بیٹھتے ہیں وہ آہستہ آہستہ ان کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں اس کی مثال منکرین ختم نبوت ہے منکرین حجیت حدیث ہیں صحابہ کرام کو گالیاں دینے والے ہیں اور وہ لوگ ہیں جو شرک و بدعت کی غلط تعریف کرکے مسلمانوں پر شرک و بدعت کے فتوے لگاتے ہیں انبیاء و اولیاء کے توسل کو شرک سے تعبیر کرتے ہیں اور ایسی ہی دیگر گمراہیوں میں مبتلا ہیں۔

جب ان کی مجلس میں جانا حرام ہے تاکہ ایمان و عقیدہ خراب نہ ہو تو ان کی کتابیں پڑھنا اور انٹرنیٹ پر ان کی کتابوں اور مجالس کا دیکھنا بھی حرام ہے۔ (برہان القرآن القران۔علامہ قاری محمد طیب صاحب)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور (اے مخاطب!) جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں کو (طعن تشنیع کا) مشغلہ بناتے ہیں تو ان سے اعراض کرو ' حتیٰ کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں۔اور اگر شیطان تمہیں بھلادے تو یاد آنے کے بعد ظلم کرنے والے لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو۔ (الانعام: ٦٨)

دین میں تفرقہ ڈالنے کی مذمت

امام ابو عبدالرحمٰن بن ادریس رازی بن حاتم متوفی ٣٢٧ ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ اس قسم کی آیتوں میں اللہ نے مسلمانوں کو اپنی جماعت کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے اور ان کو آپس میں اختلاف کرنے اور تفرقہ سے منع فرمایا ہے اور یہ خبر دی ہے کہ اس سے پہلے کی قومیں اپنے دین میں اختلاف کرنے اور مناظرے کرنے کی وجہ سے ہلاک اور تباہ و برباد ہو گئیں۔

سعید بن جبیر نے بیان کیا ہے کہ خوض کا معنی ہے تکذیب کرنا ' اور یہ آیت مشرکین اور اہل اعداء کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ سدی نے بیان کیا ہے کہ مشرکین جب مسلمانوں کے ساتھ بیٹھتے تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن مجید کے متعلق بدگوئی کرتے اور ان کا مذاق

اڑاتے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ جب تک وہ کسی اور موضوع پر بات نہ کریں ان کے پاس نہ بیٹھو۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ' ج ۴ 'ص ۱۳۱۴ 'مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الریاض ' ۱۴۱۷ھ)

اس سے پہلی آیت میں یہ فرمایا تھا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) منکروں اور مکذبوں کے اعمال کے ذمہ دار ' محافظ اور نگہبان نہیں ہیں۔ آپ کا کام صرف تبلیغ کرنا ہے اور وقت آنے پر انھیں اپنی تکذیب کا انجام خود معلوم ہو جائے گا اور اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ جب یہ لوگ دین اسلام ' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن مجید پر نکتہ چینی کریں تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان کی مجلس میں نہ بیٹھیں۔ اس آیت میں عام مسلمانوں سے خطاب کیا گیا ہے۔

اسی طرح جب بدعتی اور گمراہ فرقے اپنی بدعت کی ترویج اور اشاعت کر رہے ہوں اور اہل سنت و جماعت کا رد کر رہے ہوں 'تو ان کی مجلس سے بھی احتراز کرنا لازم ہے اور گمراہ لوگوں کے ساتھ الفت اور محبت کے ساتھ ملنا جلنا ' ربط ضبط بڑھانا بھی جائز نہیں ہے 'اور عام مسلمانوں کے لیے ان گمراہ فرقوں کا لٹریچر پڑھنا بھی جائز نہیں ہے۔ کیونکہ وہ یہ کتابیں پڑھ کر شکوک و شبہات میں مبتلا ہوں گے۔ البتہ اہل علم کو ان کی کتابیں پڑھنی چاہئیں اور ان کے شکوک و شبہات کا رد کرنا چاہیے۔

شیطان کے لیے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نسیان میں مبتلا کرنا ممکن نہیں

جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ اس آیت میں عام مسلمانوں سے خطاب ہے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس آیت کے مخاطب نہیں ہیں اور اس پر قوی قرینہ یہ ہے کہ اس آیت کے آخر میں فرمایا ہے اگر شیطان تمہیں بھلادے تو یاد آنے کے بعد ظلم کرنے والے لوگ کے ساتھ نہ بیٹھو اور یہ بات شرعاً محال ہے کہ شیطان کا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر تسلط ہو اور وہ آپ کو کوئی بات بھلادے 'اللہ تعالیٰ شیطان سے فرماتا ہے۔

(آیت) "ان عبادی لیس لك علیهم سلطان الا من اتبعك من الغوین"۔ (الحجر: ۴۲)

ترجمہ: بیشک میرے خاص بندوں پر تجھے غلبہ نہیں ہوگا۔ البتہ جو تیری پیروی کرے 'گمراہوں میں سے۔

اور شیطان نے خود بھی اعتراف کیا کہ اللہ کے خاص بندوں پر اس کا کوئی زور نہیں چل سکے گا:

(آیت) "قال فبعزتك لاغوینهم اجمعین، الا عبادك منهم المخلصین "، (ص: ۸۳۔ ۸۲)۔

شیطان نے کہا پس تیری عزت کی قسم میں ان سب کو ضرور بہکاؤں گا 'ماسوا ان کے جو ان میں سے تیرے خاص بندے ہیں۔

اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بڑھ کر کون اللہ کا خاص بندہ ہے 'پس معلوم ہوا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر شیطان کا کوئی زور اور غلبہ یا تصرف اور تسلط نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ شیطان نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھلادے 'اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس آیت میں خطاب سے مراد عام مسلمان ہو 'لیکن سید ابوالاعلی مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ نے اس کے برعکس ترجمہ کیا ہے 'وہ لکھتے ہیں:

اور اے محمد ! جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ یہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں لگ جائیں ' اور اگر کبھی شیطان تمہیں بھلاوے میں ڈال دے تو جس وقت تمہیں اس غلطی کا احساس ہو جائے اس کے بعد ایسے ظالم لوگوں کے پاس نہ بیٹھو۔ (تفہیم القرآن ' ج ۱ ' ص ۵۴۹ ' طبع مارچ ۱۹۸۳ء)

مفتی محمد شفیع دیوبندی متوفی ۱۳۹۶ھ لکھتے ہیں :

اور اگر خطاب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہے تو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ کے رسول و نبی پر بھی بھول اور نسیان کا اثر ہو جایا کرے تو ان کی تعلیمات پر کیسے اعتماد و اطمینان رہ سکتا ہے ؟ جواب یہ ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) کو بھی کسی خاص حکمت و مصلحت کے تحت بھول تو ہو سکتی ہے مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراان کو تنبیہ بذریعہ وحی وہ جاتی ہے ' جس سے وہ بھول پر قائم نہیں رہتے۔ اس لیے بالآخر ان کی تعلیمات بھول اور نسیان کے شبہ سے پاک ہو جاتی ہیں۔ (معارف القرآن ' ج ۳ ' ص ۳۷۲ ـ ۳۷۱ ' طبع جدید ' ۱۴۱۳ھ)

شیخ امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں :

یہاں خطاب اگرچہ واحد کے صیغہ سے ہے ' جس کا غالب قرینہ یہی ہے کہ خطاب آنحضرت سے ہو لیکن یہ خطاب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے واسطے سے تمام مسلمانوں سے ہے۔ (تدبر قرآن ' ج ۳ ' ص ۷۷ ' مطبوعہ فاران فاؤنڈیشن ' ۱۴۰۹ھ)

ہمارے نزدیک اس آیت میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خطاب نہیں ہے ' بلکہ عام مسلمانوں کو خطاب ہے اور اس کا غالب قرینہ یہ ہے کہ اس آیت کے آخر میں ہے اگر شیطان تمہیں بھلا دے۔ الایہ اور یہ محال ہے کہ شیطان نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دل میں وسوسہ اندازی کرے اور کوئی حکم شرعی آپ کو بھلا دے۔ بعض مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ آیت میں آپ کو خطاب ہے لیکن اس سے مراد آپ کی امت ہے ' جیسا کہ اس آیت میں ہے :

(آیت) "لئن اشرکت لیحبطن عملك"۔ (الزمر : ۶۵)

ترجمہ : اگر (بالفرض) آپ نے (بھی) شرک کیا تو آپ کے سب عمل ضائع ہو جائیں گے۔

قرآن اور سنت کی روشنی میں انبیاء (علیہم السلام) کا نسیان :

انبیاء (علیہم السلام) کے نسیان میں بھی کلام کیا گیا ہے۔

شیخ ابو جعفر محمد حسن الطوسی المتوفی ۴۶۰ھ لکھتے ہیں :

جبائی نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) پر سہو اور نسیان جائز ہے۔ اس کے برخلاف رافضی یہ کہتے ہیں کہ انبیاء (علیہم السلام) پر سہو اور نسیان جائز نہیں ہے۔ جبائی کا یہ قول صحیح نہیں ہے، کیونکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جن امور کو انبیاء (علیہم السلام) اللہ تعالیٰ کی طرف سے ادا کرتے ہیں ان میں سہو اور نسیان جائز نہیں ہے۔ اور جن امور کو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ادا نہیں کرتے ' ان میں سہو اور نسیان جائز ہے۔ اور ان پر سہو اور نسیان کیسے جائز نہیں ہوگا ؟ حالانکہ وہ سوتے ہیں اور بیمار ہوتے ہیں اور ان پر بے ہوشی طاری ہوتی ہے اور نیند بھی سہو ہے اور وہ اپنے بہت سے تصرفات میں بھول جاتے ہیں۔ (التفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی ' ج ۴ ' ص ۱۶۶ ـ ۱۶۵ ' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی ' بیروت)

جس طرح بشری تقاضے سے اور کئی جسمانی عوارض انبیاء (علیہم السلام) پر طاری ہوتے ہیں ' ان پر نسیان بھی طاری ہوتا ہے۔

حضرت آدم (علیہ السلام) کے متعلق قرآن مجید میں ہے :

(آیت) ”فنسی ولم نجد له عزما“۔ (طہ : ۱۱۵)

ترجمہ : سو وہ بھول گئے اور ہم نے ان کا کوئی عزم نہیں پایا۔

اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے حضرت خضر (علیہ السلام) سے فرمایا :

(آیت) ”لا تؤاخذنی بما نسیت“۔ (الکہف : ۷۳)

ترجمہ : میرے بھولنے کی وجہ سے مجھ سے مواخذہ نہ کریں۔

اور ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

(آیت) ”واذکر ربك اذا نسیت“۔ (الکہف : ۲۴)

ترجمہ : اور جب آپ بھول جائیں تو (یاد آتے ہی) اپنے رب کا ذکر کیجئے۔ :

امام ابوعیسی محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : حضرت آدم بھول گئے ' سو ان کی اولاد بھی بھول گئی۔ (سنن الترمذی ' ج ۵ ' رقم الحدیث : ۳۰۸۷ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت)

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نماز پڑھائی ' اس میں آپ نے کچھ زیادتی یا کمی کی۔ جب آپ نے سلام پھیرا تو آپ سے کہا گیا ' نماز میں کوئی نیا حکم آیا ہے ؟ آپ نے پوچھا کیوں ؟ صحابہ نے کہا آپ نے اس اس طرح نماز پڑھائی ہے ' آپ نے پیر موڑے اور قبلہ کی طرف منہ کیا دو سجدے کیے ' پھر سلام پھیر دیا۔ پھر ہماری طرف منہ کرکے فرمایا اگر نماز میں کوئی نیا حکم آتا تو میں تم کو خبر دیتا ' لیکن میں محض تمہاری طرح بشر ہوں ' میں اسی طرح بھولتا ہوں جس طرح تم بھولتے ہو ' پس جب میں بھول جاؤں تو مجھے یاد دلایا کرو اور جب تم میں سے کسی کو نماز میں شک ہو تو وہ صحیح امر پر غور کرے ' نماز پوری کرے ' پھر (سہو کے) دو سجدے کرلے۔

(صحیح البخاری ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۴۰۱ ' صحیح مسلم ' مساجد ' ۸۹ ' (۵۷۲) ۱۲۵۱ ' سنن ابوداؤد ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۱۰۲۰ ' سنن النسائی ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ۱۲۴۲ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۱۲۱۱ ')

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے رات کے وقت ایک شخص کو ایک سورت پڑھتے ہوئے سنا ' تو آپ نے فرمایا اللہ اس شخص پر رحم کرے اس نے مجھے فلاں فلاں آیت یاد دلا دی جس کو میں فلاں فلاں سورت سے بھلا دیا گیا تھا۔

(صحیح البخاری ' ج ٦ ' رقم الحدیث : ۵۰۳۸ ' صحیح مسلم ' صلوۃ المسافرین ' ۲۲۴ ' ۷۸۸ ' ۱۸۰٦ ' سنن ابوداؤد ج ۱ ' رقم الحدیث : ۱۳۳۱ ' سنن کبری للنسائی ' ج ۵ ' رقم الحدیث : ۸۰۰٦ ' مسند احمد ' ج ۹ ' رقم الحدیث : ۲۴۳۸۹ ' مسند احمد ' ج ۱۷ ' رقم الحدیث : ۲۴۲۱٦ ' طبع دارالحدیث قاہرہ)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سہو اور نسیان کے متعلق فقہاء اور محدثین کا موقف

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری مالکی قرطبی متوفی ٦٦٨ ھ لکھتے ہیں :

ائمہ نے کہا ہے کہ جب انبیاء (علیہم السلام) پر نسیان طاری ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو اس نسیان پر برقرار نہیں رکھتا 'بلکہ ان کو اس پر متنبہ فرمادیتا ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ ان کو علی الفور متنبہ فرماتا ہے یا تاخیر سے۔ قاضی ابوبکر اور اکثر علماء اول الذکر کے قائل ہیں اور ابو المعالی ثانی الذکر کے قائل ہیں۔ علماء کی ایک جماعت نے افعال بلاغیہ اور عبادات شرعیہ میں سہو کو منع کیا ہے اور اقوال تبلیغیہ میں سہو اتفاقا ممنوع ہے اور فرقہ باطنیہ نے یہ کہا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر سہو اور نسیان جائز نہیں ہے۔ آپ قصدا اور عمدا نسیان کی صورت طاری کرتے ہیں تاکہ احکام شرعیہ مسنون ہو جائیں 'ایک بہت بڑے امام ابوالمظفر الاسفرائنی نے بھی اپنی کتاب الاوسط میں یہی لکھا ہے 'لیکن یہ نظریہ صحیح نہیں ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن 'جزء ٧ 'ص ١٥ مطبوعہ دارالفکر 'بیروت ١٤١٥ ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ١٢٧٠ ھ لکھتے ہیں :

اس میں کسی مسلمان کو شک نہیں ہے کہ شیطان کا نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دل میں وسوسے ڈال کر سہو اور نسیان پیدا کرنا محال ہے قاضی عیاض نے کہا ہے 'بلاشبہ حق یہ ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) کی کسی بھی خبر میں غلطی واقع ہونا محال ہے۔ خواہ سہوا یا عمدا تندرستی میں بیماری میں 'خوشی میں یا غضب میں 'نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سیرت 'آپ نے اقوال اور آپ کے افعال جن کے مجموعہ سے ہر موافق و مخالف و مومن اور منکر واقف ہے 'ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی کوئی غلط بات نہیں فرمائی 'نہ آپ کو کبھی کسی بات یا کسی کلمہ میں وہم ہوا۔ اگر ایسا ہوا تو یہ منقول ہوتا جیسا کہ نماز میں آپ کو سہو واقع ہونا منقول ہے۔ البتہ دنیاوی معاملات میں بعض مرتبہ آپ نے اپنی رائے سے رجوع فرمایا جیسے کھجوروں میں پیوند لگانے کا واقعہ ہے۔

(روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی المعانی جز ٧ ص ١٨٣ 'مطبوعہ داراحیاء التراث العربی 'بیروت)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سہو اور نسیان کی بحث میں یہ حدیث بھی پیش نظر رہنی چاہیے۔

امام مالک بن انس اصبحی متوفی ١٤١ ھ روایت کرتے ہیں :

انہیں یہ حدیث پہنچی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بیشک میں بھولتا ہوں یا بھلا دیا جاتا ہوں 'تاکہ (کسی کام کو) سنت کروں (موطاامام مالک 'رقم الحدیث : مطبوعہ دارالفکر 'بیروت)

حافظ ابو عمرو یوسف بن عبداللہ ابن البر مالکی متوفی ٤٦٣ ھ اس کی شرح میں لکھتے ہیں :

آپ کی مراد یہ ہے کہ میں امت کے لیے طریقہ معین کروں کہ وہ سہو کی صورت میں کس طرح عمل کریں اور میرے فعل کی اقتداء کریں۔

(الاستذکار 'ج ٤ 'ص ٤٠٢ 'مطبوعہ مؤسستہ الرسالہ 'بیروت '١٤١٣ ھ)

نیز حافظ ابن عبدالبر مالکی لکھتے ہیں :

امام مالک نے از ابن شہاب 'از سعید بن المسیب روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک شب خیبر سے واپس ہوئے ' جب رات کا آخری حصہ ہوا تو آپ نے ایک جگہ قیام فرمایا اور حضرت بلال (رض) سے کہا تم صبح تک ہمارا پہرہ دینا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے اصحاب سو گئے۔ جب تک حضرت بلال (رض) کی تقدیر میں تھا 'وہ پہرہ دیتے رہے۔ پھر انھوں نے اپنی سواری سے ٹیک لگا لی 'وہ اس وقت فجر کے مقابل تھے۔ پھر ان کی آنکھوں پر نیند غالب آ گئی 'رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیدار ہوئے 'نہ حضرت بلال (رض) نہ قافلہ کا اور کوئی فرد حتی کہ ان پر دھوپ آ گئی 'پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) گھبرا گئے۔ پس بلال نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرے نفس کو بھی اسی ذات نے پکڑ لیا تھا جس نے آپ کے نفس کو پکڑ لیا تھا۔ تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہاں سے کوچ کرو 'تو انھوں نے اپنی سواریاں اٹھائیں اور وہاں سے کچھ دور چلے۔ پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت بلال کو نماز کی اقامت کہنے کا حکم دیا 'پھر آپ نے ان کو صبح کی نماز پڑھائی 'پھر نماز ادا کرنے کے بعد آپ نے فرمایا جو شخص نماز کو بھول جائے تو جب اسے یاد آئے وہ نماز پڑھے 'کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مجھے یاد کرنے کے لیے نماز پڑھو۔

(موطا امام مالک 'رقم الحدیث : ۲۵)

اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کبھی کبھی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عام آدمیوں کی طرح سو جاتے تھے اور بہت کم ہوتا تھا تاکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت پوری ہو اور آپ کی امت کے لیے ایک ایسی سنت قائم ہو جائے جو آپ کے بعد باقی رہے اور اس پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے میں البتہ بھولتا ہوں یا بھلا دیا جاتا ہوں 'تاکہ میں کسی کام کو سنت کروں اور علاء بن خباب کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اگر اللہ ہمیں بیدار کرنا چاہتا تو بیدار کر دیتا 'لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ کیا کہ تمہارے بعد والوں کے لیے یہ سنت ہو جائے اور آپ کے سونے کا جو طبعی 'فطری اور معروف طریقہ تھا اور آپ سے پہلے نبیوں کا بھی 'وہ یہ ہے کہ جس کو آپ نے خود بیان فرمایا کہ بیشک میری آنکھیں سوتی ہیں اور میرا دل نہیں سوتا 'آپ نے اپنے اس معمول کو مطلقا بیان فرمایا ہے اور کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں فرمایا۔

ایک اور حدیث میں ہے ہم گروہ انبیاء کی آنکھیں سوتی ہیں اور ہمارے دل نہیں سوتے۔ اس حدیث میں آپ نے یہ خبر دی ہے کہ تمام نبیوں کا یہی معمول ہے 'اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ آپ نے فرمایا صف مل کر کھڑے ہو کیونکہ میں تم کو اپنے پس پشت بھی دیکھتا ہوں ' سو یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جبلت 'فطرت اور آپ کی عادت ہے۔ باقی رہا سفر میں نماز کے وقت آپ کو سوتے ہوئے رہ جانا تو یہ آپ کی عادت کے خلاف تھا 'تاکہ آپ کی امت کے لیے قضاء نماز کی سنت کا عمل قائم ہو اور آپ کی امت کو یہ تعلیم دیں کہ جو شخص نماز کے وقت سوتا رہا 'حتی کہ نماز کا وقت نکل گیا 'اس پر کیا کرنا واجب ہے اور وہ کس طرح کرے گا اور اس وقت میں آپ کی نیند کو اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کے لیے تعلیم کا سبب بنا دیا۔ (التمہید ج ٦ 'ص ۳۹۳۔ ۳۸۵ 'ملتقطا 'مطبوعہ مکتبہ قدوسیہ 'لاہور '۱۴۰۴ھ)

نیز حافظ ابن عبدالبر مالکی متوفی ۴۶۳ھ لکھتے ہیں :

اس دن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا صبح کی نماز کے وقت طلوع آفتاب تک سوتے رہنا 'یہ وہ امر ہے جو آپ کی عادت اور طبیعت سے خارج ہے 'اور انبیاء (علیہم السلام) کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کی آنکھیں سوتی ہیں اور ان کا دل نہیں سوتا اور اس وقت آپ کی نیند اس لیے تھی کہ یہ امر سنت ہو جائے اور مسلمانوں کو یہ امر معلوم ہو جائے کہ یہ شخص نماز کے وقت سوتا رہے 'یا نماز پڑھنا بھول جائے 'حتی کہ نماز کا

وقت نکل جائے اس کے لیے کیا حکم ہے ؟ اور یہ اس قبیل سے ہے کہ آپ نے فرمایا بیشک میں بھول جاتا ہوں یا بھلا دیا جاتا ہوں 'تا کہ کوئی کام سنت ہو جائے۔ اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی فطرت اور عادت یہ تھی کہ نیند آپ کے دل کو نہیں ڈھانپتی تھی اور یہ ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا میری آنکھیں سوتی ہیں اور میرا دل نہیں سوتا 'اور یہ حکم عام ہے کیونکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے ' ہم گروہ انبیاء کی آنکھیں سوتی ہیں اور دل نہیں سوتا۔ (یہ حدیث صحیح ہے 'الجامع الصغیر 'ج ا رقم الحدیث : ۲۵۲۶)

اور جب اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ کیا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت کو قضاء نماز کا طریقہ تعلیم فرمائے تو اس نے آپ کی روح کو قبض کر لیا اور مسلمان آپ کے ساتھ تھے 'ان کی روحوں کو بھی نیند میں قبض فرما لیا اور سورج طلوع ہونے کے بعد ان سب کی روحوں کو لوٹا دیا 'تا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبان سے اللہ تعالیٰ ان پر اپنی مراد بیان فرمائے۔ فقہاء اور محدثین نے اس حدیث کی یہی تاویل کی ہے اور یہ بالکل واضح ہے اور اس کی مخالفت کرنے والا بدعتی ہے۔ (التمہید ج ۵ 'ص ۲۰۹۔ ۲۰۵ 'ملخصا مطبوعہ مکتبہ قدوسیہ 'لاہور ' ۱۴۰۴ھ)

نیز حافظ ابن عبدالبر مالکی متوفی ۴۶۳ھ لکھتے ہیں :

امام مالک از ابن شہاب 'از عبدالرحمٰن اعرج 'از عبداللہ بن بحینہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دو رکعت نماز پڑھائی 'پھر آپ بیٹھے بغیر کھڑے ہو گئے لوگ بھی آپ کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ جب آپ نے پوری نماز پڑھ لی تو ہم آپ کے سلام پھیرنے کے منتظر تھے 'آپ نے اللہ اکبر کہا اور بیٹھ کر سلام سے پہلے دو سجدے کیے 'پھر سلام پھیر دیا۔ (موطا امام مالک 'رقم الحدیث : ۲۱۸ 'مطبوعہ دار الفکر)

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ مخلوق میں سے کوئی شخص بھی وہم اور نسیان سے محفوظ نہیں ہے۔ اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جو نسیان طاری ہوتا ہے 'وہ امت کے نسیان کی طرح نہیں ہوتا 'کیا تم نہیں دیکھتے کہ نبی کریم نے ارشاد فرمایا ہے بیشک میں بھولتا ہوں یا بھلا دیا جاتا ہوں 'تا کہ (کوئی کام) سنت ہو جائے۔ (التمہید ج ۱۰ 'ص ۱۸۴۔ ۱۸۳ 'ملخصا مطبوعہ مکتبہ قدوسیہ 'لاہور '۱۴۰۴ھ)

فاسق اور بدعقیدہ سے اجتناب کے متعلق قرآن 'سنت اور آثار سے تصریحات

اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے :

(آیت) "ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار "۔ (ھود : ۱۱۳)

ترجمہ : اور ظالموں سے میل جول نہ رکھو 'ورنہ تمہیں دوزخ کی آگ چھوئے گی۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو آیات متشابہات کی پیروی کرتے ہیں تو یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے 'ان سے پرہیز کرو۔

(صحیح البخاری 'ج ۵ 'رقم الحدیث : ۴۵۴۷ 'سنن ابوداؤد ج ۳ 'رقم الحدیث : ۴۵۹۸ 'کتاب السنہ 'ج ا "رقم الحدیث : ۵')

امام ابوبکر عمرو ابی عاصم الشیبانی المتوفی ۲۸۷ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت عمر بن خطاب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عائشہ (رض) سے فرمایا اے عائشہ ! جو لوگ اپنے دین سے الگ ہوگئے 'وہ شیعی (ایک فرقہ) تھے۔ یہ لوگ بدعتی اور اپنی خواہش کے پیروکار تھے اور اس امت کے گمراہ لوگ تھے۔ اے عائشہ ! بدعتی اور خواہش کے پیروکار کے سوا ہر گناہ گار کی توبہ ہے 'ان کی کوئی توبہ نہیں ہے۔ میں ان سے بیزار ہوں اور یہ مجھ سے بری ہیں۔

(کتاب السنہ 'ج ا 'رقم الحدیث : ۴ 'المعجم الصغیر 'ج ا 'رقم الحدیث : ۵۶۰ 'اس حدیث کی سند ضعیف ہے)

امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت معاذ بن جبل (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص بدعتی کی تعظیم کرنے کے لیے گیا 'اس نے اسلام کو منہدم کرنے پر اعانت کی۔ (المعجم الکبیر 'ج ۲۰ 'رقم الحدیث : ۱۸۸ 'ص ۹۶ 'حلیۃ الاولیاء 'ج ٦ 'ص ۹٦ 'اس کی سند میں بقیہ ضعیف ہے)

امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابوبرزہ اسلمی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جن چیزوں کا مجھے تم پر خوف ہے وہ تمہارے پیٹوں اور شرمگاہوں کی گمراہ کن خواہشیں ہیں اور فتنوں سے گمراہ کرنے والی چیزیں ہیں۔ (مسند احمد 'ج ۴ 'ص ۴۲۰ 'حلیۃ الاولیاء 'ج ۲ 'ص ۳۲ 'کتاب السنہ 'رقم الحدیث : ۱۴)

امام مسلم بن حجاج قشیری ۲٦۱ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : آخر زمانہ میں دجال اور کذاب ہوں گے۔ اور تم کو ایسی باتیں سنائیں گے جو تم نے سنی ہوں گی نہ تمہارے باپ دادا نے 'تم ان سے دور رہنا 'وہ تم سے دور رہیں 'کہیں وہ تم کو گمراہ نہ کردیں کہیں وہ تم کو فتنہ میں نہ ڈال دیں۔ (مقدمہ صحیح مسلم 'باب ۳ 'حدیث ۲ 'مسند احمد 'ج ۸ رقم الحدیث : ۸۵۸۰ 'طبع دارالحدیث 'قاہرہ 'مسند احمد 'ج ۲ 'ص ۳۴۹ 'طبع قدیم)

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ 'ھ روایت کرتے ہیں :

کہ حضرت عمر (رض) نے رکوع کے بعد دعاء قنوت پڑھی اس میں یہ الفاظ تھے جو تیری نافرمانی کرے 'ہم اس سے قطع تعلق کرتے ہیں اور اس کو ترک کرتے ہیں۔ (سنن کبری للبیہقی 'ج ۲ 'ص ۴۱۱ 'مطبوعہ نشر السنہ 'ملتان)

امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا منکرین تقدیر اس امت کے مجوس ہیں ' اگر وہ بیمار ہو جائیں تو ان کی عیادت نہ کرو اور اگر وہ مر جائیں تو ان کے جنازہ پر نہ جاؤ۔ (سنن ابوداؤد ' ج ٣ ' رقم الحدیث : ٤٦٩١ ' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ ' بیروت)

رضین بن عطاء بیان کرتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے حضرت یوشع بن نون کی طرف وحی کی ' میں تمہاری قوم میں سے ایک لاکھ چالیس ہزار نیکو کاروں کو اور ساٹھ ہزار بدکاروں کو ہلاک کرنے والا ہوں حضرت یوشع نے عرض کیا : اے میرے رب ! تو بدکاروں کو تو ہلاک فرمائے گا ؟ نیکوکاروں کو کیوں ہلاک فرمائے گا ؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ بدکاروں کے پاس جاتے تھے ' ان کے ساتھ کھاتے اور پیتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کی وجہ سے ان پر غضبناک نہیں ہوتے تھے۔ (شعب الایمان ج ٧ رقم الحدیث : ٩٤٢٨ مطبوعہ دارالکتب العلمیہ ' بیروت ١٤٠١ ھ)

امام عبداللہ بن عبدالرحمن دارمی سمرقندی متوفی ٢٥٥ ھ روایت کرتے ہیں :

ایوب بیان کرتے ہیں کہ ابوقلابہ نے کہا کہ اہل اھواء (بدعتی) کے ساتھ بیٹھو نہ ان سے بحث کرو ' کیونکہ میں اس سے بےخوف نہیں ہوں کہ وہ تم کو اپنی گمراہی میں ڈبو دیں گے ' یا جس دین کو تم پہچانتے ہو اس میں شبہات ڈال دیں گے۔ (سنن الدارمی ' ج ١ ' رقم الحدیث : ٣٩١)

نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر (رض) کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ فلاں شخص آپ کو سلام کہتا ہے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ اس نے دین میں نئی باتیں نکالی ہیں (بدعتی ہوگیا ہے) اگر وہ بدعتی ہوگیا ہے تو اس کو میرا سلام نہ کہنا۔ (سنن الدارمی ' ج ١ ' رقم الحدیث : ٣٩٣ ' مطبوعہ دارالکتاب العربی ' بیروت ' ١٤٠٧ ھ)

اس اسماء بن عبید بیان کرتے ہیں کہ بدعتیوں میں سے دو شخص ابن سیرین کے پاس گئے اور کہا اے ابوبکر ! ہم آپ کو ایک حدیث سنائیں۔ انھوں نے کہا نہیں۔ انھوں نے کہا پھر ہم آپ کے سامنے کتاب اللہ سے ایک آیت پڑھیں ' انھوں نے کہا نہیں۔ تم یہاں سے اٹھ کر چلے جاؤ ' ورنہ میں اٹھ جاؤں گا ' سو وہ دونوں چلے گئے۔ کسی نے کہا اے ابوبکر ' اگر وہ آپ کو قرآن مجید کی ایک آیت سنا دیتے تو کیا حرج تھا ؟ انھوں نے کہا مجھے یہ خوف تھا کہ وہ میرے سامنے ایک آیت پڑھیں گے ' پھر اس میں معنوی تحریف کریں گے ' کہیں ان کی بیان کردہ باطل تاویل میرے دل میں بیٹھ نہ جائے۔ (سنن الدارمی ج ١ ' رقم الحدیث : ٣٩٧ ' مطبوعہ بیروت)

سلام بن ابی مطیع بیان کرتے ہیں کہ ایک بدعتی نے ایوب سے کہا میں آپ سے ایک بات کے متعلق سوال کرتا ہوں۔ وہ اٹھ کر چل دیئے اور کہا میں آدھی بات کا بھی جواب نہیں دوں گا۔ (سنن الدارمی ' ج ١ ' رقم الحدیث : ٣٩٨)

ہشام بیان کرتے ہیں کہ حسن اور ابن سیرین نے کہا بدعتیوں کے پاس نہ بیٹھو ' نہ ان سے بحث کرو اور نہ ان کی باتیں سنو۔ (سنن الدرامی ' ج ١ ' رقم الحدیث : ٤٠١ ' مطبوعہ دارالکتاب العربی ' بیروت ' ١٤٠٧ ھ)

اہل بدعت کے مصداق

اصحاب الاہواء اور اہل بدعت سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین اور عقائد میں ایسی نئی نئی باتیں داخل کردیں جن کی دین میں کوئی اصل نہیں ہے اور وہ دین کے عقائد اور احکام کی مغیر ہیں۔ مثلا رافضیہ جنہوں نے خلفاء ثلاثہ کی خلافت کا انکار کیا اور ان کو غاصب اور کافر قرار دیا ' اور

ناصبیہ جنہوں نے اہل بیت رسول کو برا کہا اور ان سے بغض رکھا 'اور خارجی ہیں جنہوں نے حضرت علی (رض) اور حضرت معاویہ (رض) دونوں پر لعنت کی اور ان کو کافر کہا اور معتزلہ ہیں جنہوں نے تقدیر کا انکار کیا اور ہمارے دور میں منکرین حدیث ہیں جن میں سے بعض مطلقا حدیث کا انکار کرتے ہیں اور بعض ان احادیث کا انکار کرتے ہیں جو ان کی عقل کے خلاف ہوں 'بعض بدعتی ائمہ کی تقلید کو شرک کہتے ہیں اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زیارت کے لیے سفر کو حرام کہتے ہیں 'بعض بدعتی دعا میں فوت شدہ بزرگوں کے وسیلہ کو ناجائز کہتے ہیں اور بعض لوگ تعین عرفی پر تعیین شرعی کے احکام جاری کرتے ہیں اور کوئی شخص ایصال ثواب کے لیے بغیر وجوب کے بطور استحسان عرفا کسی دن کی تعیین کرے تو اس کو ناجائز اور حرام کہتے ہیں اور جو مسلمان یارسول اللہ ! کہے 'اس کو مشرک کہتے ہیں اور بعض غالی لوگ مزاروں کا طواف کرتے ہیں اور ان کو سجدہ کرتے ہیں۔

فاسق اور بدعقیدہ سے اجتناب کے متعلق فقہاء کی تصریحات

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ٦٦٨ ھ لکھتے ہیں :

اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ کبیرہ گناہ کرنے والوں کی مجلس میں بیٹھنا جائز نہیں ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا جو شخص قرآن مجید کی آیات پر طعن کرے 'اس کی مجلس ترک کردی جائے 'خواہ وہ مومن ہو یا کافر۔ اسی طرح ہمارے علماء نے دشمن کے علاقہ اور اس کی عبادت گاہوں میں داخل ہونے سے کیا ہے اور کفار اور بدعقیدہ لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے منع کیا ہے۔ ان کے ساتھ دوستی رکھی جائے 'نہ ان کی باتیں سنی جائیں اور نہ ان سے مناظرہ کیا جائے۔ فضیل بن عیاض نے کہا جس شخص نے بدعقیدہ سے دوستی رکھی 'اللہ اس کے عمل کو ضائع کردے گا 'اور اس کے دل سے اسلام کے نور کو نکال دے گا اور جس نے اپنی بیٹی کی شادی کسی بدعقیدہ سے کی 'اس نے اس سے رحم منقطع کردیا اور جو شخص کسی بدعتی کے ساتھ بیٹھا 'اللہ تعالیٰ اس کو حکمت نہیں دے گا اور جب اللہ تعالیٰ نہ جان لیتا ہے کہ فلاں شخص کسی بدعتی سے بغض رکھتا ہے تو مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے گا۔ (جامع البیان 'جز ٧ ص ١٤۔ ١٣ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت ١٤١٥ ھ)

علامہ ابوسلیمان خطابی متوفی ٣٨٨ ھ لکھتے ہیں :

مسلمانوں کے درمیان جو تین دن سے زیادہ قطع کلام کو ممنوع قرار دیا گیا ہے اس کا محمل یہ ہے کہ وہ دنیاوی معاملات اور معاشرتی وجوہ میں سے کسی وجہ سے ایک دوسرے سے ناراض ہوں اور دین کی وجہ سے جو ناراضگی ہو 'وہ دائمی ہے جب تک کہ وہ توبہ نہ کرے۔ اس لیے بدعقیدہ اور بدعتی شخص سے جب تک وہ توبہ نہ کرے 'دوستی اور محبت کا کوئی تعلق نہ رکھا جائے۔ (معالم السنن 'ج ٧ 'ص ٥ 'مطبوعہ دارالمعرفہ ' بیروت)

علامہ علاء الدین محمد بن علی بن محمد حصکفی حنفی متوفی ١٠٨٨ ھ لکھتے ہیں :

کسی شخص کو ولیمہ میں بلایا گیا اور اس گھر میں لہو ولعب اور گانا بجانا تھا تو وہاں بیٹھ کر کھانا کھالے اور اگر جس جگہ دستر خوان بچھا تھا 'وہاں یہ برے کام تھے تو اس کو وہاں نہیں بیٹھنا چاہیے 'بلکہ اٹھ کر چلے جانا چاہیے 'کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے 'پس یاد آنے کے بعد ظلم کرنے والے لوگوں کے پاس نہ بیٹھو۔ (الانعام : ٦٨) اگر وہ ان لوگوں کو منع کرنے پر قادر ہے تو منع کرے 'ورنہ صبر کرے۔ اگر وہ لوگوں کا پیشوا ہے
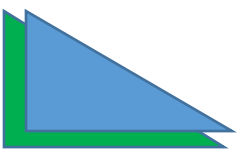
اور منع کرنے پر قادر نہیں ہے تو اٹھ کر چلا جائے 'کیونکہ اس کے بیٹھے رہنے سے دین کی بدنامی ہو گی۔ (الدر المختار ج ۵ ص ۲۲۱ 'مطبوعہ دارا حیاء التراث العربی 'بیروت ۱۴۰۷ھ)

علامہ ابن عابدین شامی نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ اگر دستر خوان پر لوگ ایک دوسرے کی غیبتیں کر رہے ہوں تب بھی اٹھ کر چلا جائے کیونکہ غیبت لہو ولعب سے بڑا گناہ ہے۔

نیز علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں :

کو بوڑھا شخص مذاق کرتا ہو 'جھوٹ بولتا ہو 'اور بے ہودہ باتیں کرتا ہو 'اس کو سلام نہ کرے 'اور جو شخص لوگوں کو گالیاں دیتا ہو اور اجنبی خواتین کے چہروں کو دیکھتا ہوں اس کو بھی سلام نہ کرے 'اور نہ فاسق ملعون کو سلام کرے اور نہ گانے بجانے والے کو سلام کرے اور جو لوگ کسی گناہ میں مشغول ہوں 'ان کو بھی سلام نہ کرے۔ (رد المختار 'ج ۵ 'ص ۲۶۷ 'مطبوعہ بیروت)

(تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ○69

لغۃ القرآن: وَمَا : اور جو] [عَلَي :" ان " پر] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [يَتَّقُوْنَ : سب بچے رہیں] [مِّنْ : سے] [حِسَابِهِمْ : ان کے حساب] [مِّنْ : سے] [شَيْءٍ : کچھ] [وَلٰكِنْ : اور لیکن] [ذِكْرٰي : نصیحت کرنا ہے] [لَعَلَّهُمْ : تاکہ وہ] [يَتَّقُوْنَ : سب بچے رہیں]

ترجمہ : اور لوگوں پر جو پرہیزگاری اختیار کئے ہوئے ہیں ان (کافروں) کے حساب سے کچھ بھی (لازم) نہیں ہے مگر (انہیں) نصیحت (کرنا چاہیے) تاکہ وہ (کفر سے اور قرآن کی مذمت سے) بچ جائیں

تشریح :

مشرکین اور منکرین اللہ تعالیٰ کی سطوت و قدرت جاننے کے باوجود معبودان باطل پر امیدیں لگائے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو استہزاء کا نشانہ بناتے ہیں اور دین کو کھیل تماشا سمجھتے ہیں۔ ان سے اجتناب کرنے کا حکم دینے کے ساتھ ان کا انجام بتلایا گیا ہے۔

اس آیت مبارکہ میں ان لوگوں سے اجتناب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

۱۔ جو دین کو کھیل اور تماشا سمجھتے ہیں۔

۲۔ جو دنیا کے اسباب و وسائل اور ترقی پر غرور کرتے ہیں۔

یہاں اجتناب سے مراد ان لوگوں کے ساتھ قلبی محبت اور ان کے لادینی اشغال میں حصہ دار بننا ہے۔ ایسے لوگوں سے ایک حد تک دور رہتے ہوئے نصیحت کرتے رہنا چاہیے۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

اس آیت کے شان نزول کے متعلق تین اقوال ہیں

(۱) مسلمانوں نے کہا اگر ایسا ہو کہ جب بھی مشرکین قرآن مجید کا مذاق اڑائیں اور اس پر اعتراضات کریں تو ہم ان کو منع کریں ' پھر ہمارے لیے مسجد حرام میں بیٹھنا اور کعبہ کا طواف کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ تب یہ آیت نازل ہوئی اور پرہیزگاروں سے ان کے اعمال پر کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔

(۲) مسلمان نے کہا اگر ہم ان کو قرآن مجید پر اعتراض کرنے سے منع نہ کرتی تو ہم کو یہ خوف ہے کہ ہم گناہ گار ہوں گے تب یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ دونوں روایتیں حضرت ابن عباس (رض) سے مروی ہیں اور مذکور ذیل تیسری روایت مقاتل سے مروی ہے :

(۳) اگر ان کے اعتراضات کے وقت ہم ان کے پاس سے اٹھ جائیں تو ہمیں یہ خوف ہے کہ ہم ان کے اعتراضات کے وقت ان کے پاس بیٹھیں گے تو گناہ گار ہوں گے۔ (زادالمیسر ج ۳ ص ' ۶۲ مطبوعہ مکتب اسلامی ' بیروت ' ۱۴۰۷ھ)

خلاصہ یہ ہے اگر مسلمانوں نے قرآن مجید نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور دین اسلام پر اعتراض کرنے والوں کے پاس بیٹھنے سے احتراز کیا ' تو ان کے اعتراضات اور نکتہ چینیوں پر مسلمانوں سے باز پرس نہیں ہوگی اور مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ان لوگوں کو نصیحت کرتے رہیں ' ہوسکتا ہے یہ لوگ اپنی اسلام دشمنی سے باز آجائیں۔

بعض مفسرین نے کہا جب یہ لوگ اسلام اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف طعن و تشنیع کی باتیں کریں اور اس وقت مسلمان ان کی مجلس سے اٹھ جائیں تو ان کا مجلس سے اٹھنا اس پر دلالت کرے گا کہ مسلمانوں کو مشرکین کی یہ باتیں ناگوار گزریں ہیں۔ ہوسکتا ہے مسلمانوں کے اس واک آوٹ سے ان مشرکوں کو حیا آئے اور ان کا ضمیر انھیں ان باتوں پر ملامت کرے اور آئندہ کے لیے وہ مسلمانوں کے سامنے ان دل آزار باتوں سے احتراز کریں۔

ثانی الذکر تفسیر واک آوٹ کی اصل ہے۔ : (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

قرآن مجید متعدد مقامات پر یہ حقیقت عیاں کرتا ہے کہ دنیا پرست لوگوں نے دین کو کھیل اور تماشا بنالیا ہے جس طرح تماشا دل بہلانے کے لیے اور کھیل جسمانی تقویت کے لیے ہوتا ہے یہی سوچ اور وطیرہ دنیادار کا دین کے بارے میں

ہوا کرتا ہے یہ دین کو دنیاوی مفاد، شہرت و منصب اور محض ذہنی سکون کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کے مشاغل سے دور رہتے ہوئے انھیں موقع بموقع نصیحت کرتے رہنا چاہیے اور ان کو یہ حقیقت باور کرانی چاہیے کہ جس دنیا کے جاہ وجلال اور اسباب و وسائل پر تم نازاں خود سپردگی کا انداز اختیار کیے ہوئے ہو۔ مرنے کے بعد یہ سب دھرے کا دھرا رہ جائے گا اور تمہیں ایسی عدالت میں پیش ہونا ہے جہاں کسی ولی کی ولایت، سفارشی کی سفارش اور فدیہ دینے والے کا فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس طرح دنیا کے اسباب ہی نہیں بلکہ جن لوگوں اور معبودان باطل پر بھروسہ کیے ہوئے ہو وہ بھی تمہیں فائدہ نہیں پہنچا سکیں گے۔

جو لوگ دنیا کے بندے اور برائی کے دھندے میں مبتلا ہو کر موت کی آغوش میں جائیں گے انھیں جہنم میں پینے کے لیے ابلتا ہوا پانی اور اذیّت ناک عذاب دیا جائے گا کیونکہ یہ دنیا کے بندے بن کر توحید و رسالت کا انکار کرنے والے تھے۔

(عَنْ أَبِي أُمَامَةَ عَنِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فِي قَوْلِهِ وَيُسْقَى مِنْ مَاءٍ صَدِيدٍ يَتَجَرَّعُهُ قَالَ يُقَرَّبُ إِلَيْهِ فَيَتَكَرَّهُهُ فَإِذَا دَنَا مِنْهُ شُوِيَ وَجْهُهُ وَوَقَعَتْ فَرْوَةُ رَأْسِهِ وَإِذَا شَرِبَهُ قَطَّعَ أَمْعَاءَهُ حَتَّى خَرَجَ مِنْ دُبُرِهِ) [رواہ احمد]

"حضرت ابوامامہ (رض) بیان کرتے ہیں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جہنمیوں کے بارے فرمایا کہ ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا وہ ان کو جلادے گا۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا وہ ان کے قریب کیا جائے گا تو وہ اس کو ناپسند کریں گے۔ جونہی وہ اس کے قریب ہوگا تو اس کا چہرہ جھلس جائے گا۔ اس کے سر کے بال بھی گر جائیں گے اور جب وہ پیے گا تو اس کی آنتیں کٹ جائیں گی یہاں تک کہ وہ اس کی پشت سے نکل جائے گا۔" (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

(إِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّومِ۔ طَعَامُ الْأَثِيمِ۔ كَالْمُهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ كَغَلْيِ الْحَمِيمِ۔ خُذُوهُ فَاعْتِلُوهُ إِلَى سَوَاءِ الْجَحِيمِ۔ ثُمَّ صُبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيمِ۔ ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ۔ إِنَّ هَذَا مَا كُنْتُمْ بِهِ تَمْتَرُونَ) [الدخان: ۴۳ تا ۵۰]

"بلاشبہ زقوم کا درخت گناہ گار کا کھانا ہوگا۔ جو پگھلے تانبے کی طرح پیٹ میں جوش مارے گا۔ جیسے کھولتا ہوا پانی جوش مارتا ہے۔ پھر حکم ہوگا کہ اسے پکڑ لو پھر اسے گھسیٹتے ہوئے جہنم کے درمیان تک لے جاؤ۔ پھر حکم ہوا کہ کھولتے پانی کا عذاب اس کے سر پر انڈیل دو۔ پھر اسے کہا جائے گا چکھ! تو بڑا معزز اور شریف بنا پھرتا تھا۔ یہ ہے جس میں تم شک کیا کرتے تھے۔"

نیک لوگوں کی ذمہ داری:

لفظی تحقیق: یتقون: اس کا مصدر "اتقاء" ہے اور "وقی" سے بنا ہے جس کے معنی ہیں بچانا، حفاظت کرنا، "اتقاء" کے معنی ہیں خود بچنا، پرہیز کرنا۔ حساب: شمار، گنتی، یہاں اس سے مراد ان کے کام اور عمل ہیں۔ ذکری: اس کے معنی وہی ہیں جو ذکر کے ہیں اور یہ اس کی دوسری شکل ہے اس کا معنی ہے یاد دھانی۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو کعبہ کا طواف اور عبادت کی نیت سے مسجد حرام میں جائے ان کی باتوں سے کوئی سروکار نہ رکھے اور ان کی حرکتوں کو برا سمجھے اور ان کے ستانے پر صبر کرے تو ان کے کاموں کی برائی اس کے سر نہ پڑے گی کیونکہ وہاں اپنے کام سے گیا ہے اور اس کی غرض کعبہ کا طواف اور عبادت ہے، لیکن ہاں! وعظ و نصیحت ان کے کانوں تک کسی طرح پہنچانے رہنا چاہیے جس کی قسمت میں ہوگا وہ سنور جائے گا۔

ارشاد ہے کہ جو لوگ ان لوگوں سے بچتے ہیں اور ان کے ساتھ نہیں اٹھتے بیٹھتے، وہ ان لوگوں کے گناہوں کے ذمہ دار نہیں ٹھہرائے جائیں گے، اگر کسی کو اپنے کسی کام سے ایسے لوگوں میں ان کی شرارت بھری باتوں کے درمیان جانا پڑے تو ان کا شریک نہیں ٹھہرایا جائے گا اور ان کے گناہوں کا وبال اس پر نہیں پڑے گا اور نہ اس وقت وہ انہیں سمجھا سکتا ہے، ہاں! جب بھی مناسب موقع اور محل ہو ان کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے تاکہ ان میں سے جسے سیدھے راستے پر آنا ہو وہ آ جائے۔

"مسلم شریف" کی روایت میں آتا ہے کہ مسلمان کو ہمیشہ پر امید رہنا چاہیے اور خیر خواہی کی بات کرتے رہنا چاہیے، دین نام ہی خیر خواہی کا ہے، لوگ کتنے بھی غلط کام کرنے والے اور ہٹ دھرم ہوں تبلیغ کا کام جاری رہنا چاہیے، پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ کے پیغمبر مکمل درجے کے اطاعت گزار ہوتے ہیں اور وہ تبلیغ دین کا کام پورے خلوص کے ساتھ انجام دیتے ہیں اس کے باوجود قیامت کے دن حال یہ ہوگا کہ کسی پیغمبر کے پیچھے صرف ایک ہی امتی ہوگا اور بعض پیغمبر ایسے بھی ہوں گے جن کے ساتھ کوئی بھی امتی نہیں ہوگا، تاہم اس میں پیغمبر کا کوئی قصور نہیں ہے کیونکہ پیغمبر نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا، اب کوئی مانتا ہے یا نہیں مانتا، یہ پیغمبر کی ذمہ داری نہیں ہے۔ (ربانی)

مسائل

۱۔ گمراہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے رہنا چاہیے۔

۲۔ دین کو کھیل تماشا سمجھنے والوں کو نصیحت کرنی چاہیے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی کارساز نہیں۔

۴۔ کافروں کے لیے کھولتے ہوئے پانی کا عذاب ہوگا۔

آیت مبارکہ :

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۧ 70

لغۃالقرآن : وَذَرِ : اور چھوڑ دو] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [اتَّخَذُوا : ان سب نے بنا لیا] [دِيْنَهُمْ : اپنے دین کو] [لَعِبًا : کھیل] [وَّلَهْوًا : اور تماشا] [وَّغَرَّتْهُمُ : اور دھوکے میں ڈال دیا ہے ان کو] [الْحَيٰوةُ : زندگی] [الدُّنْيَا : دنیوی] [وَذَكِّرْ : اور نصیحت کرتے رہو] [بِهٖٓ : اس کو] [اَنْ : کہ] [تُبْسَلَ : ہلاکت میں " نہ " ڈالا جائے] [نَفْسٌ : کوئی نفس] [بِمَا : اس وجہ سے جو] [كَسَبَتْ : اس نے کمایا] [لَيْسَ : "کہ " نہ ہو] [لَهَا : اس کیلیے] [مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ : اللہ کے علاوہ کی] [وَلِيٌّ : کوئی مددگار] [وَلَا : اور نہ] [شَفِيْعٌ : کوئی سفارشی] [وَاِنْ : اور اگر] [تَعْدِلْ : تو بدلے میں دے] [كُلَّ : ہر] [عَدْلٍ : عدل] [لَا : نہیں] [يُؤْخَذْ : وہ لیا جائے گا] [مِنْهَا : اس سے] [اُولٰٓئِكَ : وہی لوگ] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [اُبْسِلُوْا : سب ہلاکت میں ڈالے گئے] [بِمَا : اس وجہ سے جو] [كَسَبُوْا : ان سب نے کمایا] [لَهُمْ : ان کے لیے] [شَرَابٌ : پینا ہے] [مِّنْ : سے] [حَمِيْمٍ : کھولتے ہوئے پانی] [وَّعَذَابٌ : اور عذاب ہے] [اَلِيْمٌ :
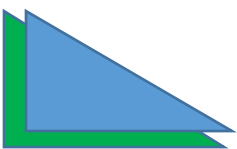
دردناک] [بِمَا : اس وجہ سے جو] [كَانُوْا : تھے سب] [يَكْفُرُوْنَ : وہ سب انکار کرتے ہیں]]

ترجمہ : اور آپ ان لوگوں کو چھوڑے رکھیئے جنھوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنالیا ہے اور جنہیں دنیا کی زندگی نے فریب دے رکھا ہے اور اس (قرآن) کے ذریعے (ان کی آگاہی کی خاطر) نصیحت فرماتے رہیئے تاکہ کوئی جان اپنے کئے کے بدلے سپرد ہلاکت نہ کردی جائے، (پھر) اس کے لیے اللہ کے سوانہ کوئی مددگار ہوگا اور نہ کوئی سفارشی، اور اگر وہ (جان اپنے گناہوں کا) پورا پورا بدلہ (یعنی معاوضہ) بھی دے تو (بھی) اس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے کئے کے بدلے ہلاکت میں ڈال دیئے گئے ان کے لیے کھولتے ہوئے پانی کا پینا ہے اور دردناک عذاب ہے اس وجہ سے کہ وہ کفر کیا کرتے تھے

تشریح:

ارشاد فرمایا کہ اے حبیب! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، آپ ان لوگوں سے معاشرتی تعلقات اور میل جول چھوڑ دیں جنھوں نے اپنے دین کو ہنسی مذاق اور کھیل بنالیا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا اور اس کی محبت ان کے دلوں پر غالب آ گئی اور اے حبیب! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، آپ قرآن کے ذریعے انھیں نصیحت کریں تاکہ کوئی جان اپنے دنیوی برے اعمال کی وجہ سے آخرت میں ثواب سے محروم اور ہلاکت کے سپرد نہ کردی جائے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سوا نہ اس ہلاک ہونے والے کا کوئی مددگار ہوگا اور نہ ہی سفارشی اور اگر وہ پکڑے جانے والا شخص اپنے عذاب سے چھٹکارے کے بدلے میں سارے معاوضے دیدے تو وہ اس سے نہ لیے جائیں گے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ان کے اعمال کی وجہ سے ہلاکت کے سپرد کردیا گیا اور ان کے لیے ان کے کفر کے سبب کھولتے ہوئے پانی کا مشروب اور دردناک عذاب ہے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! کفار کو حیات دنیا نے دھوکا دے دیا ہے بس آپ انھیں نصیحت کرتے رہیں گے اگر وہ کفر پر مر گئے تو روز قیامت اللہ کے بالمقابل ان کا کوئی سفارشی و حمایتی نہ ہوگا اور اگر وہ اپنی خلاصی کے لئے کوئی بھی معاوضہ دیں گے تو قبول نہیں کیا جائے گا اور انھیں جہنم میں کھولتے پانی اور دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

کافر کے لیے کوئی بخشش نہیں ہے:

وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا۔ سے معلوم ہوا کہ کافر اگر روز قیامت بڑے سے بڑا معاوضہ دے دے تو بھی اس کی بخشش نہیں ہے، دوسری جگہ یوں فرمایا گیا:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ۔ "جو لوگ کفر پہ مر جائے تو اگر وہ ساری زمین سونے سے بھر کردیں تو بھی ان سے قبول نہ کی جائے گی۔" (آل عمران۔ 91)

یہاں اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا سے معلوم ہوا اسلام ہی ایک سنجیدہ مذہب ہے باقی سب کھیل تماشا ہے جیسے عیسائیوں کی کرسمس شراب نوشی اور عیاشی سے عبارت ہے۔ ہندوؤں کی دیوالی بھی میلہ ٹھیلا ہے۔ بدھ مذہب والے چین و جاپان میں اپنے مذہبی تہوار پر بے حیائی کے

ریکارڈ توڑ دیتے ہیں۔ یہی ان کا دین ومذہب ہے جبکہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور اس کے مذہبی تہوار عبادت اور صدقہ سے معمور ہیں۔ اتَّخَذُوا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا کا یہ معنی بھی ہے کہ انھوں نے اس دن کو جو اللہ نے ان کے لیے بنایا تھا، کھیل تماشا بنالیا یعنی اس کا مذاق اڑانے لگے۔ (برہان القرآن القران۔علامہ قاری محمد طیب صاحب)

گناہوں پر اصرار حالت کفر میں موت کا سبب بن سکتا ہے

علامہ اسماعیل حقی (رح) اس آیت کے تحت فرماتے ہیں "یاد رکھیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرنا اور ان کا مذاق اڑانا کفر ہے اور کفر کی سزا جہنم کا دائمی دردناک عذاب ہے اسی طرح کسی مسلمان کا گناہوں پر اصرار کرنا بھی ایسا عمل ہے جس سے اس کی موت کفر کی حالت میں ہو سکتی ہے۔ حضرت ابو اسحاق فزاری (رح) فرماتے ہیں "ایک شخص اکثر ہمارے پاس بیٹھا کرتا اور اپنا آدھا چہرہ ڈھانپ کر رکھتا تھا، ایک دن میں نے اس سے کہا کہ تم ہمارے پاس بکثرت بیٹھتے ہو اور اپنا آدھا چہرہ ڈھانپ کر رکھتے ہو، مجھے اس کی وجہ بتاؤ۔اس نے کہا: میں کفن چور تھا، ایک دن ایک عورت کو دفن کیا گیا تو میں اس کی قبر پر آیا، جب میں نے اس کی قبر کھود کر اس کے کفن کو کھینچا تو اس نے ہاتھ اٹھا کر میرے چہرے پر تھپڑ مار دیا۔ پھر اس شخص نے اپنا چہرہ دکھایا تو اس پر پانچ انگلیوں کے نشان تھے۔ میں نے اس سے کہا: اس کے بعد کیا ہوا؟ اس نے کہا: پھر میں نے اس کا کفن چھوڑ دیا اور قبر بند کرکے اس پر مٹی ڈال دی اور میں نے دل میں پختہ ارادہ کرلیا کہ جب تک زندہ رہوں گا کسی کی قبر نہیں کھودوں گا۔ حضرت ابو اسحاق فزاری (رح) فرماتے ہیں "میں نے یہ واقعہ امام اوزاعی (رح) کو لکھ کر بھیجا تو انھوں نے مجھے لکھا کہ اس سے پوچھو: جن مسلمانوں کا انتقال ہوا کیا ان کا چہرہ قبلے کی طرف تھا؟ میں نے اس کے بارے میں اُس کفن چور سے پوچھا تو اس نے جواب دیا "ان میں سے زیادہ تر لوگوں کا چہرہ قبلے سے پھرا ہوا تھا۔ میں نے اس کا جواب امام اوزاعی (رح) کو لکھ کر بھیجا تو انھوں نے مجھے تحریر بھیجی جس پر تین مرتبہ "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ "لکھا ہوا تھا اور ساتھ میں یہ تحریر تھا "جس کا چہرہ قبلے سے پھرا ہوا تھا اس کی موت دین اسلام پر نہیں ہوئی، تم اللہ تعالیٰ سے اس کے عفو، مغفرت اور اس کی رضا طلب کرو۔

(تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری)

بسل کا معنی

اس آیت میں بسل کا لفظ ہے 'بسل کا معنی ہے بہادر ہونا 'کسی کو اس کی حاجت سے روکنا 'منع کرنا۔ابسلہ کا معنی ہے کسی کو ہلاکت کے سپرد کردینا ' رہن رکھنا۔

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ ھ لکھتے ہیں:

بسل کا معنی ہے کسی شئے کا ضم ہونا اور روکنا 'جس شخص کے چہرے پر ناگواری ہو اس کو باسل کہتے ہیں اور کیونکہ اس میں منع کا معنی ہے 'اس لیے حرام چیز اور رہن رکھی ہوئی چیز کو بسل کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

(آیت) "وذکر بہ ان تبسل نفس بما کسبت"۔ (الانعام: ۷۰)

ترجمہ: اور ان کو اس (قرآن) کے ساتھ ان کو نصیحت کرتے رہو کہیں یہ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہلاکت میں مبتلا نہ ہو جائیں

اس آیت میں بسل منع اور محروم کے معنی میں ہے

بسل کا معنی ہلاک ہونا بھی ہے اور ثواب سے محروم بھی ہلاک کو متضمن ہے۔ اس لیے ہم نے اس کا معنی ہلاکت کیا ہے۔

بت پرستی کا لہو ولعب ہونا:

خلاصہ یہ ہے کہ اے رسول! آپ اور مسلمانوں میں سے جو آپ کے پیروکار ہیں 'وہ ان مشرکین سے اعراض کریں' جنہوں نے اپنے ہاتھون سے بت بنا کر پھر ان کی عبادت کرکے اپنے دین کو لہو ولعب بنالیا ہے 'انھوں نے اپنی عمر اس غیر مفید عبادت میں ضائع کرکے اس کو لہو ولعب بنالیا ہے۔ انھوں نے اپنے آباء واجداد کی تقلید میں بغیر کسی شرعی دلیل کے کچھ جانوروں سے نفع اندوزی اور ان کے کھانے کو حرام قرار دے لیا اور یہ بھی لہو ولعب ہے اور انھوں نے اس بیکار اور بے مقصد عبادت میں اشتغال کی وجہ سے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت اور آپ کی دعوت سے باوجود دلائل اور معجزات دیکھنے کے اعراض کیا 'اور ان کا یہ عمل بھی لہو ولعب ہے وہ اس حقیر دنیا کی لذتوں میں منہمک ہوگئے اور انھوں نے فانی دنیا کی لذتوں کو آخرت کی دائمی اور سرمدی لذتوں پر ترجیح دی اور وہ اللہ کی آیات میں غور وفکر کرنے کی بجائے ان کا مذاق اڑانے اور ان پر طعن وتشنیع کرنے میں منہمک ہوگئے۔ سو آپ ان لوگوں سے اعراض کیجئے یعنی ان لوگوں سے حسن معاشرت اور ملنا جلنا چھوڑ دیجئے 'یہ معنی نہیں ہے کہ ان کو دین کی تبلیغ کرنا چھوڑ دیجئے اور ان کو عذاب الہی سے ڈرایا نہ کریں 'جیسا کہ اس آیت میں فرمایا ہے۔

(آیت) "ذرھم یاکلوا ویتمتعوا ویلھھم الامل فسوف یعلمون"۔ (الحجر: ۳)

ترجمہ: انھیں چھوڑ دیجئے وہ کھائیں اور فائدہ اٹھائیں اور ان کی جھوٹی امیدیں ان کو غافل رکھیں 'پس وہ عنقریب جان لیں گے۔

اور لوگوں کو قرآن مجید سے ہدایت دیجئے اور نصیحت کیجئے تاکہ وہ خیر سے محروم نہ رہیں اور وہ لوگ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے جہنم میں گر کر ہلاک نہ ہو جائیں 'اور ہر شخص نے اپنے آپ کو اپنے دنیاوی اعمال کے بدلہ میں رہن رکھا ہوا ہے:

(آیت) "کل نفس بما کسبت رھینہ۔ الا اصحب الیمین"۔ (المدثر: ۳۹-۳۸)

ترجمہ: ہر شخص اپنے عمل کے بدلہ میں گروی ہے، سوائے دائیں طرف والوں کے۔

اس کے بعد فرمایا اللہ کے سوا نہ ان کا کوئی مددگار ہوگا 'نہ شفاعت کرنے والا اور اگر وہ ہر قسم کا فدیہ دیں تو ان سے نہیں لیا جائے گا۔

اس آیت میں کافروں کے لیے شفاعت کی نفی کی گئی ہے۔ اس قسم کی قرآن مجید بہت آیتیں ہیں:

(آیت) "ما للظلمین من حمیم ولا شفیع یطاع"۔ (المؤمن: ۱۸)

ترجمہ: ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا 'نہ سفارشی جس کی بات مانی جائے۔

اور یہ بھی فرمایا دیا کہ ان سے کسی قسم کا فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا یعنی جس طرح دنیا میں جسمانی یا مالی فدیہ دے کر قید سے آزاد ہو جاتے ہیں ' آخرت میں نجات کا اس طرح کا کوئی حیلہ نہیں کار گر نہیں ہو گا اور نہ وہاں کسی کے زور یا سفارش سے کوئی فائدہ پہنچے گا اور ان کو یہ سزا جو دی جائے گی یہ دنیا میں ان کے کیے ہوئے کاموں کا بدلہ ہیں ' ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا ' جو ان کے پیٹوں کو جلا ڈالے گا اور ان کی انتڑیوں کو کاٹ ڈالے گا۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :

(آیت) "وسقوا ماآء حمیمافقطع امعآءھم "۔ (محمد : ۱۵)

ترجمہ : اور ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا جو ان کی انتڑیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔ (تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۖ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ۗ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۗ وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿71﴾

لغۃ القرآن : قُلْ : کہہ دیں] [اَنَدْعُوْا : کیا ہم پکاریں] [مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ : اللہ کے علاوہ کی] [مَا لَا : جو نہیں] [يَنْفَعُنَا : وہ نفع دے سکے ہمیں] [وَلَا : اور نہ] [يَضُرُّنَا : وہ نقصان پہنچا سکے ہمیں] [وَنُرَدُّ : اور ہم پھرجائیں] [عَلٰٓي :" اس بات " پر] [اَعْقَابِنَا : اپنی ایڑیوں] [بَعْدَ : اس کے بعد کہ] [اِذْ : جب] [هَدٰىنَا : ہمیں ہدایت دے] [اللّٰهُ : اللہ] [كَالَّذِي : اس شخص کی طرح جو] [اسْتَهْوَتْهُ : بہکایا ہو اسے] [الشَّيٰطِيْنُ : شیطان] [فِي الْاَرْضِ : زمین میں ہے] [حَيْرَانَ : حیران کر کے] [لَهٗٓ : اس کیلیے] [اَصْحٰبٌ : ساتھی ہوں] [يَّدْعُوْنَهٗٓ : وہ سب بلائیں اسے] [اِلَى : تک] [الْهُدَى : ہدایت] [ائْتِنَا : ہماری طرف آجا] [قُلْ : آپ کہہ دیں] [اِنَّ : بیشک]

[هُدَى : ہدایت] [اللهِ : الله] [هُوَ : وہ] [الْهُدٰي : ہدایت] [وَاُمِرْنَا : اور ہمیں حکم دیا گیا ہے] [لِنُسْلِمَ : کہ ہم فرماں بردار ہوں] [لِرَبِّ : رب کیلیے] [الْعٰلَمِيْنَ : تمام جہانوں کا]

ترجمہ : فرمادیجئے : کیا ہم اللہ کے سواایسی چیز کی عبادت کریں جو ہمیں نہ (تو) نفع پہنچاسکے اور نہ (ہی) ہمیں نقصان دے سکے اور اس کے بعد کہ اللہ نے ہمیں ہدایت دے دی ہم اس شخص کی طرح اپنے الٹے پاؤں پھر جائیں جسے زمین میں شیطانوں نے راہ بھلا کر درماندہ و حیرت زدہ کر دیا ہو جس کے ساتھی اسے سیدھی راہ کی طرف بلا رہے ہوں کہ ہمارے پاس آ جا (مگر اسے کچھ سوجھتا نہ ہو) ، فرمادیں کہ اللہ کی ہدایت ہی (حقیقی) ہدایت ہے، اور (اسی لیے) ہمیں (یہ) حکم دیا گیا ہے کہ ہم تمام جہانوں کے رب کی فرمان بر داری کریں

تشریح :

کفار اس بات میں بڑے کوشاں رہا کرتے تھے کہ مسلمان اسلام کو چھوڑ کر اپنے باپ دادا کا مذہب پھر اختیار کر لیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کریم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کو حکم فرماتے ہیں کہ آپ انھیں فرمایئے کہ یہ خیال خام اپنے دل سے نکال دیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ شاہراہ ہدایت پا لینے کے بعد جس پر نور ہی نور ہے۔ ہم شرک وکفر، فسق وفجور کے بھیانک اندھیروں کی طرف لوٹ جائیں۔ ہر گز نہیں۔ اگر ہم ایسا کریں تو پھر ہماری حالت اس شخص سے مختلف نہ ہوگی جو اپنی منزل مقصود کی طرف ایسے ساتھیوں کی رفاقت میں بڑھا چلا جارہا ہے۔ جو راہ کے پیچ وخم اور نشیب وفراز سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور پھر راستہ میں کوئی شیطان اسے بہکا دے اور وہ اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر اس کے پیچھے ہولے۔ اس کے ہمراہی اس کو پیچھے سے آواز دیں کہ کدھر بھٹک کر جارہے ہو۔ سیدھی راہ تو ادھر ہے۔ اور وہ ششدر و درماندہ تصویر حیرت بنا کھڑا ہو اور کچھ فیصلہ نہ کر سکے کہ اسے کدھر جانا ہے۔ اے کفار تمہاری یہ توقع عبث ہے کہ ہم دولت کا یقین سے مالا مال ہونے کے بعد شک وگمان کے بھنور میں کود پڑیں گے۔ آیت میں استھوتہ کا لفظ ہے اس کا مفہوم ہے زین له الشیطان ھواہ (قرطبیؒ) یعنی شیطان نے جس کی نفسانی خواہش کو مزین وآراستہ کر دیا ہو اور وہ اس پر فریفتہ ہو چکا ہو اور حق کا دامن چھوڑ کر باطل کی پیروی میں مگن ہو گیا ہو۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

ظاہر بات ہے الٹے پاؤں چلنا عقل وفکر کے خلاف اور حقیقت سے منہ موڑنا ہے یہ تو اس شخص کا وطیرہ ہے جس کو شیطان نے کسی صحرا اور بیابان میں بہکا دیا ہو۔ وہ حیرانی اور پریشانی کے سوا کوئی راستہ نہیں پاتا۔ اور ادھر ادھر بہکا پھر رہا ہے۔ یہی مشرک کی مثال ہے کہ وہ عقیدہ و عمل کی دنیا میں صحیح فکر اختیار کرنے کے بجائے فکری اور عملی آوارگی کا شکار رہتا ہے۔ اسے توحید کی دعوت سمجھ نہیں آتی اور اس کی حالت صحرا میں بہکے ہوئے مسافر کی ہے۔ جسے صحیح راستے کی طرف بلایا جائے تو وہ اس قدر حواس باختہ ہو چکا ہوتا ہے اسے کوئی بات سنائی اور سجھائی نہیں دیتی۔

ایسے شخص سے بحث مباحثہ کرنے کے بجائے اسے کہنا چاہیے کہ ہدایت تو اللہ کی طرف سے نصیب ہوا کرتی ہے اور ہمیں یہی حکم ہے کہ ہم غیر اللہ کی پیروی کرنے کی بجائے صرف اور صرف رب العالمین کی غلامی اور اس کے حکم کی پیروی کریں۔

اس کا حکم اور اس کی اتباع یہ ہے کہ نماز قائم کی جائے اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرا جائے کیونکہ اسی کی طرف سب نے لوٹ کر جانا ہے۔ اس نے حق کے ساتھ زمین وآسمان کو پیدا کیا۔ جس دن وہ "کُنْ" فرمائے گا تو سب کچھ اس کے سامنے حاضر ہو جائے گا۔ اس کا حکم صادر ہونے اور ہر چیز کا اس کے حضور اکٹھا ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

اسی کی زمین وآسمان پر بادشاہی ہے اسی کے حکم سے پہلا اور دوسرا صور پھونکا جائے گا وہ ہر قسم کے غائب اور ظاہر کو جانتا ہے۔ اس کے ہر حکم اور کام میں حکمت ہے اور وہ ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے۔

(عَنْ عَبْدِاللَّهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ (رض) قَالَ جَاءَ أَعْرَابِیٌّ إِلَى النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ مَا الصُّورُ قَالَ قَرْنٌ يُنْفَخُ فِيهِ)

[رواہ الترمذی : کتاب الصفۃ القیامہ، باب ماجاء فی شان الصور]

"حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص (رض) بیان کرتے ہیں ایک دیہاتی نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا کہ صور کیا ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا وہ ایک سینگ ہے جس میں پھونکا جائے گا۔"

(عَنْ أَبِي سَعِيدٍ (رض) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) كَيْفَ أَنْعَمُ وَصَاحِبُ الْقَرْنِ قَدِ الْتَقَمَ الْقَرْنَ وَاسْتَمَعَ الْإِذْنَ مَتٰى يُؤْمَرُ بِالنَّفْخِ فَيَنْفُخُ فَكَأَنَّ ذٰلِكَ ثَقُلَ عَلٰى أَصْحَابِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فَقَالَ لَهُمْ قُولُوا حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ عَلَى اللهِ تَوَكَّلْنَا) [رواہ الترمذی : کتاب صفۃ القیامۃ، باب ماجاء فی صفۃ الصور]

"حضرت ابو سعید (رض) بیان کرتے ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں کیسے نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤں؟ جبکہ سینگ والے نے سینگ منہ میں ڈالا ہوا ہے اور اجازت کا منتظر ہے کب اس کو پھونکنے کا حکم ملے تو وہ پھونک مار دے۔ نبی محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابہ (رض) پر یہ بات گراں گزری نبی معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے فرمایا تم کہو ہمیں اللہ ہی کافی ہے اور وہ بہتر کارساز ہے اور ہم اپنے اللہ پر ہی توکل کرتے ہیں۔" (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

صور والا فرشتہ حکم کے انتظار میں ہے

حضور فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کی پیدائش کے بعد صور کو پیدا کیا اور اسے حضرت اسرافیل کو دیا وہ اسے لیے ہوئے ہیں اور عرش کی طرف نگاہ جمائے ہوئے ہیں کہ کب حکم ہو اور میں اسے پھونک دوں۔ حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں میں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صور کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ایک نرسنگھا ہے میں نے کہا وہ کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا بہت ہی بڑا ہے واللہ اس کے دائرے کی چوڑائی آسمان وزمین کے برابر ہے اس میں سے تین نفخے پھونکے جائیں گے، پہلا گھبراہٹ کا دوسرا بیہوشی کا تیسرا رب العلمین کے سامنے کھڑے ہونے کا۔ اول اول جناب باری حضرت اسرافیل کو صور پھونکنے کا حکم دے گا وہ پھونک دیں گے جس سے آسمان وزمین کی تمام مخلوق گھبرا اٹھے گی مگر جسے اللہ چاہے۔

امام بن جریر بھی اسی کو پسند فرماتے ہیں حضور کا ارشاد ہے کہ حضرت اسرافیل صور کو اپنے منہ میں لیے ہوئے اپنی پیشانی جھکائے ہوئے حکم الٰہی کے منتظر ہیں۔ مسند احمد میں ہے کہ ایک صحابی کے سوال پر حضور نے فرمایا صور ایک نر سنگھے جیسا ہے جو پھونکا جائے گا۔

سب سے پہلے قتل و خون کا فیصلہ ہوگا، اللہ تعالیٰ اپنی راہ کے شہیدوں کو بھی بلائے گا ان کے ہاتھوں سے قتل شدہ لوگ اپنا سر اٹھائے ہوئے حاضر ہوں گے رگوں سے خون بہ رہا ہوگا کہیں گے کہ باری تعالیٰ دریافت فرما کہ اس نے مجھے کیوں قتل کیا؟ پس باوجود علم کے اللہ عزوجل مجاہدین سے پوچھے گا کہ تم نے انھیں کیوں قتل کیا؟ وہ جواب دیں گے اس لیے کہ تیری بات بلند ہو اور تیری عزت ہو اللہ عالی فرمائے گا تم سچے ہو اسی وقت ان کا چہرہ نورانی ہو جائے گا سورج کی طرح چمکنے لگے گا اور فرشتے انھیں اپنے جھرمٹ میں لے کر جنت کی طرف چلیں گے پھر باقی کے اور تمام قاتل و مقتول اسی طرح پیش ہوں گے اور جو نفس ظلم سے قتل کیا گیا ہے اس کا بدلہ ظالم قاتل سے دلوایا جائے گا اسی طرح ہر مظلوم کو ظالم سے بدلہ دلوایا جائے گا یہاں تک کہ جو شخص دودھ میں پانی ملا کر بیچتا تھا اسے فرمایا جائے گا کہ اپنے دودھ سے پانی جدا کر دے، ان فیصلوں کے بعد ایک منادی باآواز بلند ندا کرے گا جسے سب سنیں گے، ہر عابد اپنے معبود کے پیچھے ہولے اور اللہ کے سوا جس نے کسی اور کی عبادت کی ہے وہ جہنم میں چل دے،

حاملہ عورتوں کے حمل گر پڑیں گے

اس روز لرزا دینے والا صور پھونکا جائے گا، اور اس کے بعد پھر دوسری بار پھونکا جائے گا۔ اس روز سب کے سب بے انتہاء خوف زدہ ہوں گے، لوگ گر پڑیں گے، مائیں دودھ پینے والے بچوں کو بھول جائیں گی، حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہو جائیں گے، لڑکوں پر خوف کے مارے بڑھاپا طاری ہو جائے گا، شیاطین جان بچانے کے خیال سے زمین کے کناروں تک بھاگ جائیں گے لیکن فرشتے انھیں مار مار کر واپس لائیں گے۔ ایک دوسرے کو پکارتا رہے گا لیکن کوئی کسی کو پناہ نہ دے سکے گا سوا خدا کے۔ لوگ اسی گھبراہٹ کے عالم میں ہوں گے کہ زمین ہر طرف کے گوشت سے پھٹنے لگے گی۔ ایسا امر عظیم ظاہر ہوگا کہ کبھی نہ دیکھا گیا اور ایسا کرب و ہول لاحق ہوگا کہ اللہ ہی جانتا ہے پھر لوگ آسمان کی طرف دیکھیں گے تو اس کے پرزے اڑ رہے ہوں گے۔ ستارے ٹوٹ رہے ہوں گے، سورج اور چاند سیاہ پڑ جائیں گے۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا لیکن مردوں کو اس کی خبر نہ ہوگی۔

شہداء گھبراہٹ سے محفوظ رہیں گے

ابوہریرہ نے کہا یارسول اللہ اللہ تعالیٰ جب فرمائے گا۔ **ففزع من فی السموات و من فی الارض الا من شاء اللہ**۔ تو اللہ تعالیٰ کس کو مستثنیٰ فرمائے گا، تو آپ نے فرمایا وہ شہداء ہیں۔ فزع اور گھبراہٹ تو زندوں کو ہوا کرتی ہے اور وہ زندہ تو ہیں لیکن خدا کے پاس ہیں خدا انھیں رزق دیتا ہے۔ اللہ نے اس دن کے فزع سے انھیں محفوظ رکھا ہے کیونکہ وہ تو اللہ کا عذاب ہے اور عذاب تو اشرار خلق پر اترتا ہے۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے **تذھل کل مرضعۃ** الخ والی آیت میں پیش فرمایا ہے کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے شیر خوار بچے سے غافل ہو جائے گی۔

ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا۔ جب تک خدا چاہے وہ عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ طویل عرصہ تک یہ کیفیت رہے گی۔ پھر اللہ پاک بیہوشی لانے والے صور کا حکم اسرافیل کو دے گا۔ اس لیے سب اہل سموت والارض بے ہوش ہو جائیں گے۔ لیکن جس کو خدا چاہے وہ ہوش میں رہے گا۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت

حضرت فرماتے ہیں کہ پھر میرے پاس آئیں گے میں جاؤں گا اور سجدے میں فحص پر گر پڑوں گا۔ ابوہریرہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! فحص کیا چیز ہے؟ حضرت نے فرمایا عرش کے سامنے کا حصہ۔ اب اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو بھیجے گا، وہ میرا بازو پکڑ کر اٹھائے گا۔ اللہ عزوجل فرمائے گا، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ میں عرض کروں گا، یارب! تونے مجھ سے شفاعت کا حق دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ چنانچہ یہ حق مجھے عطا فرما اور لوگوں کے درمیان فیصلہ فرمادے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، اچھا تم شفاعت کر سکتے ہو اور میں انسانوں کے درمیان اپنے فیصلے نافذ کروں گا۔

عرش خداوندی کا ظہور

حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں پھر میں واپس آکر لوگوں کے ساتھ کھڑا ہو جاؤں گا۔ ہم سب لوگ کھڑے ہی ہوں گے کہ آسمان سے ایک زور کی آواز ہوگی کہ ہم گھبرا اٹھیں گے۔ زمینی جن وانس سے دگنی تعداد میں آسمان سے فرشتے نازل ہوں گے۔ وہ زمین سے قریب تر آجائیں گے۔ زمین ان کے نور سے چمک اٹھے گی، وہ صف بندی کر لیں گے۔ ہم ان سے پوچھیں گے کیا خدائے پاک تمہارے اندر ہے۔ وہ کہیں گے نہیں، وہ آنے ہی والا ہے۔ فرشتے آسمان سے دوبارہ اس تعداد میں اتریں گے کہ اترے ہوئے فرشتوں سے دگنی تعداد میں اور جن و انس سے بھی دگنی تعداد میں زمین ان کے نور سے چمک اٹھے گی۔ وہ قرینے سے کھڑے ہو جائیں گے۔ ہم پوچھیں گے کیا خدائے پاک تمہارے اندر ہے؟ وہ کہیں گے نہیں، وہ آنے ہی والا ہے۔ پھر تیسری دفعہ اس سے بھی دگنی تعداد میں نزول ملائکہ ہوگا۔ اب خدائے جبار عزوجل ابر کے چتر لگائے آٹھ فرشتوں سے اپنا تخت اٹھوائے تشریف فرما ہوگا۔ حالانکہ اس وقت تو اس کا تخت چار فرشتے اٹھائے رہتے ہیں۔ ان کے قدم آخری نیچے والی زمین کی تہہ میں ہیں زمین وآسمان ان کے نصف حصہ جسم کے مقابلہ میں ہے۔ ان کے کندھوں پر عرش خداوندی ہے، ان کی زبانوں پر تسبیح و تحمید رہے گی۔ (ابن کثیر)

علم الغیب والشادۃ۔۔الخ: جو خدا یہ صفات رکھتا ہے جن کا ذکر ان دو تین آیات میں ہوا، وہی اسی لائق ہے کہ ہم اس کے تابع فرمان ہوں، اس کے سامنے انتہائی عبودیت اختیار کریں اور ہر آن اس سے ڈرتے رہیں۔ اسی کا ہم کو حکم ہوا ہے جس سے ہم کسی حال منہ نہیں موڑ سکتے۔

(تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی)

گمراہی میں بھٹکنے والے شخص کی مثال

خلاصہ یہ ہے کہ اے رسول مکرم ﷺ ! آپ ان مشرکوں سے کہئے کہ اللہ بزرگ و برتر جو نفع اور نقصان کا مالک ہے 'کیا اس کو چھوڑ کر ہم ان بتوں کی پرستش کریں جو ہمیں نفع دینے یا نقصان پہنچانے پر قدرت نہیں رکھتے اور ہم الٹے پیر شرک اور کفر کی طرف لوٹا دیئے جائیں 'جب کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے نجات دے کر اسلام کی طرف ہماری رہنمائی کر چکا ہے۔ پھر ہماری مثال اس شخص کی طرح ہو گی جس کو کسی جنگل یا صحراء میں جنات نے راستہ بھٹکا دیا ہو اور اس کی عقل کام نہ کر رہی ہو کہ وہ کدھر جائے 'وہ حیران اور پریشان پھر رہا ہو اور اس کے دوست اور ساتھی اس کو بلا رہے ہوں کہ ہماری طرف آؤ 'ادھر سیدھا راستہ ہے۔

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بتوں کی اور اللہ کی طرف دعوت دینے والوں کی یہ مثال بیان فرمائی ہے 'جیسے ایک شخص راستہ سے بھٹک گیا ہو اور اسے کوئی شخص پکارے کہ اس طرف آؤ اور اس کے خیر خواہ بھی ہوں جو اس کو بلائیں کہ اس راستہ پر آؤ تو اگر وہ اگر وہ پہلے بلانے والے کی پکار پر چلا جائے تو وہ اس کو تباہی کے گڑھے میں گرا دے گا۔ اور اگر وہ ہدایت کی دعوت دینے والے کے پاس چلا جائے تو راستہ کی ہدایت پا جائے گا اور یہ صحرا یا جنگل میں بلانے والے جنات ہیں۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم 'ج ۴ 'ص ۱۳۲۲ 'مکتبہ نزار مصطفیٰ مکہ مکرمہ '۱۴۱۷ ھ)

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا یہ جنات ہیں جو جنگل میں بھٹکے ہوئے انسان کو اس کا نام اور اس کے باپ دادا کا نام لے کر بلاتے ہیں۔ اے فلاں بن فلاں بن فلاں ! ادھر آؤ۔ (جامع البیان 'جز ۷ ص ۳۰۸ 'مطبوعہ دار الفکر 'بیروت ۱۴۱۵ ھ)

جو انسان حق سے باطل کی طرف لوٹ آئے یا حق کو چھوڑ کر باطل کی طرف آئے 'اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے پیروں پر لوٹ گیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان ابتداء میں جاہل تھا۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں سے علم اور ہدایت کو حاصل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(آیت) "واللہ اخرجکم من بطون امھتکم لا تعلمون شیئا وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ لعلکم تشکرون"۔ (النحل : ۷۸)

ترجمہ : اور اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے پیدا کیا 'حالانکہ تمہیں کسی چیز کا علم نہ تھا اور تمہارے کان 'آنکھیں اور دل بنائے تاکہ تم شکر بجالاؤ۔

سو جو شخص علم سے جہل کی طرف لوٹ جائے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے پیروں پر لوٹ گیا۔

آپ ان سے کہئے کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اللہ رب العلمین کی اطاعت کے لیے سر تسلیم خم کر دیں 'یعنی صرف اسی کی اخلاص سے عبادت کریں اور ہم کو نماز قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور نماز قائم کرنے کا معنی یہ ہے کہ اللہ سے اس طرح مناجات کی جائے 'گویا کہ بندہ اللہ کے سامنے کھڑا ہوا اس کو دیکھ رہا ہے 'جس کے آثار سے ایک اثر یہ ہے کہ وہ بے حیائی اور برائی کے کاموں سے رک جائے اور اس کا نفس پاکیزہ ہو جائے اور نیز ہمیں اللہ سے ڈرتے رہنے کا حکم دیا ہے یعنی خوف خدا سے ہر قسم کے کاموں اور گناہوں کو چھوڑ دیا جائے اور فرائض وواجبات پر پابندی سے عمل کیا جائے اور سنن اور مستحبات کا نفس کو عادی بنایا جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو تین باتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ اخلاص کے ساتھ صرف اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کی جائے ' دوام کے ساتھ کامل طریقہ سے نماز پڑھی جائے اور ظاہر و باطن ہر حال میں تقوی کے تقاضوں پر عمل کیا جائے۔ پھر فرمایا قیامت کے دن تم سب اللہ کے سامنے پیش کیے جاؤ گے ' وہ تمہارے اعمال کا حساب لے گا اور تم کو تمہارے اعمال کی جزا دے گا۔ پس عقل اور حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا جائے۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

خلاصہ مفہوم یہ ہے کہ

اس آیت کریمہ میں حق و باطل کی دعوت دینے والوں کی ایک تمثیل بیان فرمائی گئ کہ جس طرح ایک مسافر اپنے رفیقوں کے ساتھ تھا کہ جنگل میں غول بیابانی یعنی بھوتوں اور شیطانوں نے اسے راستہ سے بہکا دیا اور اسے ۔ بجا دیا کہ منزل مقصود کی راہ یہی ہے اس کے رفیق اسے منزل مقصود کی راہ راست کی طرف بلانے لگے وہ حیران و ششدر ہو کر رہ گیا کہ کدھر جائے۔ انجام یہ ہوا کہ اگر وہ غلط راہ پر چل دیا تو ہلاک ہو گا اور رفیقوں کا کہا مانے تو سلامت رہے گا منزل مقصود مل جائے گی۔

یہی حال اس شخص کا ہے جو

طریقہ اسلام سے بہکا اور گمراہی کی طرف چل دیا۔ مسلمان اسے راہ راست پر بلاتے رہے اگر یہ ان کی آواز لبیک کہے تو راہ پا جائے ورنہ ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔

ان ھدی اللہ ھو الھدی۔ کا یہی مفہوم ہے کہ جو طریق اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو واضح کیا وہی ہدایت ہے اور جو اس کے سوا ہے وہ باطل و گمراہی ہے۔ یہی مفہوم علامہ آلوسی (رح) نے روح المعانی میں بیان فرمایا۔

(تفسیر الحسنات۔ علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)

آیت مبارکہ :

وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ؕ وَهُوَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝72

لغۃ القرآن : وَاَنْ : اور یہ کہ] [اَقِيْمُوا : تم سب قائم کرو] [الصَّلٰوةَ : نماز] [وَاتَّقُوْهُ : اور سب اسی سے ڈرو] [وَهُوَ : اور وہ] [الَّذِيْٓ :" وہ ہے " جو] [اِلَيْهِ : اپنی طرف] [تُحْشَرُوْنَ : تم سب اکٹھے کئے جاؤ گے]

ترجمہ : اور یہ (بھی حکم ہوا ہے) کہ تم نماز قائم رکھو اور اس سے ڈرتے رہو اور وہی اللہ ہے جس کی طرف تم (سب) جمع کئے جاؤ گے

تشریح :

نماز "سب سے بڑی مظہر عبودیت"

یعنی سب سے پہلا یہ کام کرو کہ نماز قائم کرو۔ نماز ایک ایسی عبادت ہے ' جس سے پوری طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو آدمی اپنی ذات اور اپنی ذات سے متعلق تمام علائق کو اللہ کے سپرد کرنا چاہتا ہے 'اس کی صورت کیا ہونی چاہیے۔ نماز کی کیفیت پر اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرنے کا کیا معنی اور مفہوم ہے ؟ آدمی جب نماز کا آغاز کرتا ہے تو سب سے پہلے ہاتھ اٹھاتا ہے اور انھیں کندھوں سے اوپر کانوں کے برابر تک اٹھا کر فی الحقیقت یہ اعلان کرتا ہے کہ میں اللہ کی کبریائی کو تسلیم کرتے ہوئے اللہ سے غلامی کا عہد کرتا ہوں اور تمام دنیا اور اس میں بڑائی کے دعوے داروں کو اپنی پشت کے پیچھے پھینکتا ہوں اور پھر وہ "اللہ اکبر "کہتے ہوئے 'یعنی اللہ کی کبریائی کا اعلان کرتے ہوئے 'ہاتھ باندھ کر سرتا پا غلام کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ دنیا میں دین اور بے دینی کی جو اصل جنگ ہے 'اس کی بنیاد ہی یہ ہے کہ انسانی زندگی اور پھر پوری کائنات میں اصل بڑائی کا مستحق کون ہے ؟ دنیا نے اس کبریائی اور عظمت کے تخت پر نجانے کس کس کو فائز کیا ہے۔ لیکن ایک نماز پڑھنے والا سب سے پہلے اسی بنیادی حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ میں دنیا میں ہر کسی کے سامنے جھکنے اور ہر تخت کے سامنے سر جھکانے اور ہر قوت کے مظہر سے ڈرنے اور ہر جبروت کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے انکار کرتا ہوں۔ میرا آستانہ میری کبریائی کا مرکز میرے لیے قوت کا سرچشمہ اور میری نگاہ میں عظمت وکبریائی کی مستحق صرف اللہ کی ذات ہے۔ اس لیے میں اس کے سوا کسی اور کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں۔ یہ قول واقرار اور یہ نعرہ دراصل پوری دنیا کی قوتوں سے تصادم اختیار کرنے والی بات ہے اور اس راستے پر چلنے کا حوصلہ وہی شخص کر سکتا ہے 'جس نے سوچ سمجھ کر اللہ سے اپنا رشتہ جوڑا ہو۔ چنانچہ نماز کے آغاز ہی سے اس سفر کا آغاز ہو جاتا ہے اور پھر اعتراف واقرار اور بندگی وغلامی کی جتنی صورتیں اور جتنے مظاہر ہو سکتے ہیں 'ایک نمازی ان تمام کو اختیار کرتا ہے۔ وہ زبان سے ثناء کرتا ہے 'پھر بار بار اللہ کی عظمت کا نعرہ لگاتا ہے 'اللہ سے پناہ کی درخواست کرتا ہے سورۃ فاتحہ کی شکل میں حمد وثناء کے ساتھ ساتھ اللہ سے تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری مستقیم کا طلب گار ہوتا ہے پھر کبھی اس کے سامنے رکوع کی شکل میں جھکتا ہے اور کبھی سجدے کی صورت اپنا سب کچھ اس کے سامنے ڈھیر کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ علامتی طور پر روزانہ پانچ وقت اللہ سے وفاداری کا عہد واقرار بھی کرتا ہے اور اپنی عبودیت کے تمام سرمائے کو اس کے حوالے کرنے کا اعلان بھی کرتا ہے۔ اس لیے یہاں سب سے پہلے نماز کا حکم دیا گیا ہے کہ اگر تم سوچ سمجھ کے نماز پڑھو گے اور پھر پورے معاشرے میں نظام صلوٰۃ قائم کر دو گے 'جس کے نتیجے میں نماز کے مراکز قائم ہوں گے 'اللہ کی عظمت اور اس کی کبریائی کے ہمہ پہلو اعلان کے لیے پانچ وقت اذانیں ہوں گی 'معاشرے کا ایک ایک فرد ہر نماز کے وقت میں مسجد کا رخ کرے گا 'اس طرح پوری آبادی میں پانچ وقت بار بار اللہ کے ساتھ لو لگانے اور ہر طرح اسی کو اپنی ذات کا مرجع وماویٰ سمجھنے کی ایک مشق بھی ہوتی رہے گی اور ایک اظہار بھی جاری رہے گا۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اللہ سے وابستگی اور اس سے مکمل تعلق اور خود سپردگی کی اور بہتر صورت کیا ہو سکتی ہے ؟

تقویٰ کیا ہے؟

مزید فرمایا کہ نماز کے ذریعے جب تم نے اچھی طرح اللہ سے اپنا تعلق قائم کرلیا تو اب اجتماعی زندگی میں اس کو جاری وساری کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے اندر تقویٰ کی دولت پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ تقویٰ کیا ہے؟ نہایت اختصار کے ساتھ اگر اسے الفاظ کا جامہ پہنایا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمام شرعی حدود وقیود اور تمام شریعت کے عائد کردہ حقوق وفرائض کی نگہداشت کرنا اور اپنے آپ کو اس کا پابند بنالینا ' اس کا نام تقویٰ ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس پابندی کے اظہار میں صرف جسم ہی شامل نہ ہو بلکہ اس کی جڑیں دل کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہوں۔ آدمی زندگی کے ہر عمل میں اس کا ارتکاب کرنے سے پہلے سو دفعہ سوچے کہ میں جو کچھ کرنے لگا ہوں کیا میرا یہ عمل شریعت کے احکام کے مطابق ہے یا نہیں؟ اور کیا میرے دل ودماغ میں اللہ کی رضا کے حصول اور اللہ کے رسول کے کامل اتباع کے سوا کوئی اور جذبہ کارفرما تو نہیں؟ بس اس صلاحیت کو اپنے اندر پیدا کرنا اور اپنی پوری زندگی کو اس کی تصویر بنادینا۔ یہ ہے وہ تقویٰ جس کا یہاں حکم دیا جارہا ہے۔ جب آدمی اس تقویٰ کی زنجیر اپنی صلاحیتوں کو پہنا دیتا ہے اور اس کی آنکھوں میں اس نور کی روشنی اتر آتی ہے اور اس کا دل ودماغ اسی کی چمک دمک سے روشن ہوجاتا ہے اور اس کی شخصیت اسی کے پرتو میں ڈھلتی ہے تو پھر وہ ایک ایسا متقی انسان بن جاتا ہے ' جس کی پوری زندگی اللہ کے سامنے خودسپردگی کی علامت ہوتی ہے۔ اس آیت کریمہ میں یہی بات فرمائی جارہی ہے کہ اگر تم واقعی اپنے آپ کو رب العالمین کے سپرد کرنا چاہتے ہو تو تمہیں یہ دو کام کرنے ہوں گے۔ ایک نماز کی پابندی اور دوسرا تقویٰ کا اہتمام۔

نماز کی پابندی اور تقویٰ کا حصول ' آخرت پر یقین کے بغیر ممکن نہیں

عجیب بات یہ ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے اس حد تک وابستہ ہیں کہ جب نماز سے آدمی محروم ہوجاتا ہے تو تقویٰ کا سررشتہ خود بخود اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور جب وہ نماز کی حقیقت سے وابستہ ہوجاتا ہے تو تقویٰ خود بخود اس کے اندر اترنے لگتا ہے۔ لیکن اس آیت کریمہ کے تیسرے جملے میں ایک اور حقیقت کی طرف ہماری راہنمائی کی گئی ہے کہ تم اگر یہ دونوں دولتیں حاصل کرنا چاہتے ہو تو وہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تم اپنے دل ودماغ میں ایک تصور کو مستحکم نہ کرلو کیونکہ اس کے استحکام کے بغیر نماز اور تقویٰ کی فکر انسان میں پیدا نہیں ہوتی اور جب وہ تصور مستحکم ہوجاتا ہے تو پھر نماز اور تقویٰ سے دور رہنا اور زندگی کی تعمیر سے بے نیاز ہونا یہ تقریباً ناممکن ہوجاتا ہے اور وہ تصور کیا ہے؟ وہ یہ احساس ہے کہ مجھے ایک نہ ایک دن اس دنیا سے جانا ہے کیونکہ کوئی بھی دنیا میں آنے والا اللہ کے پیغمبروں سمیت ایسا نہیں جسے یہاں سے کوچ نہ کرنا ہو۔ جو بھی اس دنیا میں آتا ہے ' وہ جانے کے لیے آتا ہے۔ یہ دنیا نہ ہمیشہ قائم رہے گی اور نہ کوئی اس دنیا میں آنے والا ہمیشہ باقی رہے گا۔ امیر مینائی نے بڑی سچی بات کہی۔

جو زندہ ہے وہ موت کی تکلیف سہے گا
جب احمد مرسل نہ رہے ' کون رہے گا

یعنی اگر کسی کو دنیامیں ہمیشہ رہنا ہوتا تو شاید وہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات مبارک ہوتی۔ کیونکہ یہ دنیا انہی کے لیے بسائی گئی اور وہ اللہ کے بعد اس دنیا پر سب سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔ لیکن اللہ کا یہ قانون ایسا اٹل ہے کہ اللہ کے سوا ہر ایک کو یہاں سے جانا ہے اور ہر ایک کو موت آتی ہے۔ صرف ایک اللہ کی ذات ہے 'جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور اسی احساس اور تصور کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ صرف یہی بات کافی نہیں کہ مجھے ایک دن موت سے ہمکنار ہونا ہے بلکہ اس احساس میں یہ بات بھی شامل ہونی چاہیے کہ مرنے کے بعد مجھے ایک طویل عرصے تک عالم برزخ میں رہنا ہے اور اس کے بعد مجھے میدان حشر میں اللہ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا۔ جہاں مجھ سے میری زندگی کا حساب مانگا جائے گا۔ پوچھا جائے گا کہ تم زندگی کیسے گزار کے آئے ہو؟ اس کے ایک ایک لمحے کا حساب دو 'کیونکہ زندگی عطا کرنے والے نے زندگی تمہیں امانت کے طور پر دی تھی۔ تم یہ بتاؤ کہ تم نے اس امانت میں خیانت تو نہیں کی 'اس کو اسی طرح گزارا 'جس طرح اللہ نے اپنی کتابوں اور اپنے رسولوں کی معرفت تمہیں ہدایت بخشی تھی؟ یہ دو باتیں کہ ایک دن مرنا ہے اور پھر ایک دن زندگی کے ایک ایک لمحے اور ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے 'اس سے زندگی میں وہ تبدیلی آتی ہے 'جس کے نتیجے میں نمازیں بھی قائم ہوتی ہیں اور تقویٰ کی زندگی بھی وجود میں آتی ہے۔

قیامت اور اس کی تفصیلات کے بارے میں ہمیشہ ہی اہل دنیا کو شبہات رہے ہیں۔ مشرکینِ مکہ بھی ایسے ہی شبہات کی گرفت میں تھے کوئی سرے سے اس کا منکر تھا کوئی مانتا تھا 'لیکن تفصیلات کو قبول کرنے سے انکاری تھا اور جو لوگ فکر و دانش کی دولت سے کسی حد تک مالامال بھی تھے 'ان کی فکر نارسائی بعض دفعہ ان کو یہ بات سمجھنے سے محروم رکھتی تھی کہ آخر یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے اور یہ کیوں ضروری ہے کہ ایک دن قیامت آ جائے۔ چنانچہ قیامت کے وجود پر عقل و دانش اور حکمت کے حوالے سے اگلی آیت کریمہ میں توجہ دلائی جارہی ہے۔

(روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

یہاں سے نماز کی اہمیت معلوم ہوئی۔ حدیث میں ہے روز قیامت سب سے پہلے بندے سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا اگر یہ سوال درست ہو گیا تو باقی سوالات میں نرمی کر دی جائے گی اگر یہ درست نہ ہوا تو باقی سوالات سخت کر دیے جائیں گے۔ (ترمذی کتاب الصلاۃ باب 188۔ ابوداود کتاب الصلاۃ باب 145) (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

الغرض۔۔ یہ کس طرح کے نفع و نقصان پر قادر نہیں۔۔ لہٰذا۔۔ ان کی جو عبادت کرے اسے کوئی فائدہ ہونیوالا نہیں۔۔ یونہی۔۔ اگر کوئی ان کی عبادت سے انکار کر دے، تو اسے کوئی نقصان پہنچنے والا نہیں ہے۔

اے کافرو! آخر تم چاہتے کیا ہو؟ (اور) تمہارا مقصد کیا؟ کیا تمہاری یہ خواہش ہے کہ ہم (الٹے رخ پلٹا دیئے جائیں، بعد اس کے کہ ہدایت دے دی ہم کو اللہ تعالیٰ) (نے)۔۔ الغرض۔۔ تم یہ چاہتے ہو کہ ہم مرتد ہو جائیں اور شرک کی طرف رجوع کریں، بعد اس کے کہ ہدایت دی ہمیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کی طرف اور کفر وضلالت کے قید خانے سے نجات دی۔ اور اب اگر ہم دین حق سے پھر جائیں تو ہو جائینگے ویسے (جیسے وہ، جس کو پھسلا کر کر دیا شیطانوں نے زمین میں حیرت زدہ) نہ جانتا ہے اور نہ کچھ تدبیر کر سکتا ہے۔ اور وہ زمین بھی ایسے بیابان میں ہو، جو سیدھی راہ سے دور ہو۔ (اسکے کچھ لوگ ہیں جو) از راہ شفقت (اسے بلا رہے ہیں ہدایت کی طرف کہ ہمارے پاس آ جاؤ) اور شیطان اسے اپنی طرف بلاتے ہیں اور وہ اس امر میں متردد ہے کہ شیطانوں کے ساتھ جاؤں۔۔ یا۔۔ یاروں کی طرف۔ پھر اگر وہ شیطان کا کہا مانتا ہے۔ تو ہلاکت میں پڑتا ہے اور اگر یاروں کی پکار کو سنتا ہے تو نجات پاتا ہے۔

اس تمثیل کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص مرتد ہوگیا، وہ اس شخص کے مثل ہے جسے شیطان مومنین کے لشکر میں سے بھگا لے گئے ہوں اور خطرناک بیابان میں ڈال دیا ہو۔ لشکری رفیق جو مومن لوگ ہیں، تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری مستقیم یعنی شریعت اسلامیہ کی طرف آنے کیلئے اسے پکارتے ہیں اور شیطان صفت لوگ فریب دینے والے اور ضلالت کے میدان کی طرف کھینچتے ہیں۔ اب اگر وہ شخص مومنین کی پکار پر پھر آئے، تو اپنے کو لشکر اسلام میں پہنچا کر اپنی اصل منزل پر آجائے اور اگر شیطانوں کے ساتھ رہے تو کفر اور بے دینی پر مرے۔

تو اے محبوب ! (کہہ دو کہ) ہدایت وہ نہیں ہے جس کی طرف شیطان بلا رہا ہے، بلکہ بیشک (اللہ تعالیٰ) (کی ہدایت ہی تو ہدایت ہے) یعنی اسلام ہی دین صحیح اور راہ مستقیم ہے، جس میں ہمیں ہدایت دی گئی ہے۔ (اور ہمیں حکم دیا گیا) ہے (کہ ہم گردن جھکادیں سارے جہان کے پروردگار کیلئے اور اس کے سچے مطیع و فرمان بردار ہوجائیں۔

(اور یہ) حکم دیا گیا ہے (کہ نماز قائم رکھو) اسے کما حقہ ہمیشہ ادا کرتے رہو (اور اللہ تعالیٰ) (سے ڈرتے رہو)، نہ کبھی اس کی نافرمانی کرو اور نہ ہی کبھی نماز کی ادائیگی میں سستی کرو اور اچھی طرح ذہن نشین رکھو، اللہ تعالیٰ (وہ ہے جس کی طرف تمہارا حشر کیا جائے گا)۔ قیامت کے دن اس کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے، جہاں حساب کتاب ہوگا اور جزاء و سزا کے فیصلے صادر فرمائے جائینگے۔ (تفسیر اشرفی۔ علامہ محمد مدنی اشرفی جیلانی)

آیت مبارکہ :

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ۬ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ 73○

لغۃ القرآن: وَهُوَ : اور وہ] [الَّذِيْ : جو] [خَلَقَ : اس نے پیدا کیے] [السَّمٰوٰتِ : آسمانوں کی] [وَالْاَرْضَ : اور زمین کو] [بِالْحَقِّ : حق کے ساتھ] [وَيَوْمَ : اور وہ دن] [يَقُوْلُ : وہ کہے گا] [كُنْ : ہوجا] [فَيَكُوْنُ : تو وہ ہوجاتا ہے] [قَوْلُهُ : اس کی بات] [الْحَقُّ : حق] [وَلَهُ : اور اسی کی] [الْمُلْكُ : بادشاہی] [يَوْمَ : وہ دن] [يُنْفَخُ : پھونکا جائے گا] [فِي : میں] [الصُّوْرِ : صور] [عٰلِمُ : جاننے والا ہے] [الْغَيْبِ : غیب کی] [وَالشَّهَادَةِ : اور ظاہر کا] [وَهُوَ : اور وہ] [الْحَكِيْمُ : حکمت والا] [الْخَبِيْرُ : خوب خبردار ہے]

ترجمہ : اور وہی (اللہ) ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو حق (پر مبنی تدبیر) کے ساتھ پیدا فرمایا ہے اور جس دن وہ فرمائے گا: ہو جا، تو وہ (روز محشر بپا) ہو جائے گا۔ اس کا فرمان حق ہے، اور اس دن اسی کی بادشاہی ہو گی جب (اسرافیل کے ذریعے صور میں پھونک ماری جائے گی، (وہی) ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے، اور وہی بڑا حکمت والا خبر دار ہے
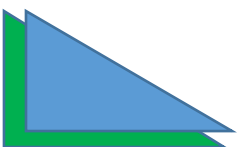
تشریح:

عبادت کے لائق تمہارے بے بس اور بے کس معبودان باطل نہیں بلکہ وہ ذات یکتا وہ بے ہمتا عبادت کے لائق ہے جو ان صفات کی مالک ہے جن کا ذکر آیات میں موجود ہے۔ اس کا کوئی کام عبث و فضول نہیں۔ اس کی کوئی تخلیق بے مقصد نہیں۔ اس وسیع و عریض کائنات کی کسی حقیر سی حقیر چیز پر غور کرو، اس کی افادیت کا آپ کو احساس ہونے لگے گا۔ یہ بے ڈھنگا اور بد وضع پرند جسے ہم گدھ کہتے ہیں نوع انسانی کا کتنا بڑا خدمت گزار ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو دنیا بھر کی میونسپل کمیٹیاں اور صحت کے ادارے ان مردہ جانوروں کو ٹھکانے لگانے سے عاجز آ جاتے۔ اور ان کی گلی سڑی بدبو دار لاشوں سے زندگی تلخ ہو جاتی۔ غرضیکہ چیونٹی سے لے ہاتھی تک، ممولے سے لے کر عقاب تک جدھر بھی آپ فکر کی نگاہ ڈالیں آپ کو حکمت ربانی کے جلوے نظر آئیں گے۔ یہاں میں نیویارک سائنس اکیڈیمی کے پریذیڈنٹ اے۔ سی۔ موریسن کے مضمون کا ایک مختصر اقتباس پیش کرتا ہوں جس سے بالحق کا مفہوم نہایت واضح ہو جائے گا۔

"زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چکر کاٹ رہی ہے۔ اگر اس کی رفتار ایک ہزار میل کی بجائے ایک سو میل ہوتی تو دن اتنے لمبے ہوتے کہ سورج کی تپش تمام کھیتوں کو بھون کر رکھ دیتی۔ اور راتیں اتنی لمبی اور سرد ہوتیں کہ زندگی کی اگر کچھ رمق سورج کی تپش سے بچ جاتی تو رات کی سردی اسے منجمد کرکے رکھ دیتی۔ سورج کا درجہ حرارت بارہ ہزار ڈگری فارن ہیٹ ہے۔ لیکن زمین کو اس سے اتنی مناسب دوری پر رکھ دیا گیا ہے کہ وہاں سورج کی حرارت اتنا قدر ہی پہنچتی ہے جو حیات بخش ہے۔ لیکن اگر سورج کا درجہ حرارت بارہ ہزار ڈگری کے بجائے چھ ہزار ڈگری ہوتا تو کرہ زمین برف کے نیچے دب جاتا۔ اور اگر اٹھارہ ہزار ڈگری ہوتا تو ساری زمین اس کی تمازت سے جل کر راکھ ہو جاتی زمین کا جھکاؤ 23 درجہ کا زاویہ بناتا ہے اور اسی جھکاؤ سے ہمارے موجودہ موسم مناسب وقفوں کے بعد باری باری آتے ہیں۔ اگر اس میں یہ جھکاؤ نہ ہوتا تو سمندر سے اٹھنے والے بخارات جنوب اور شمال میں حرکت کرتے اور اتنی زور سے برف باری ہوتی کہ ساری زمین ڈھک جاتی۔ اگر چاند کی دوری زمین سے اتنی نہ ہوتی جتنی اب ہے بلکہ صرف پچاس ہزار میل ہوتی تو سمندروں میں مدوجزر اس شدت سے آتا کہ پہاڑوں تک کو بھی بہا کر لے جاتا۔ اگر زمین کی سطح موجودہ سطح سے صرف دس فٹ زیادہ موٹی ہوتی تو یہاں آکسیجن ہی نہ ہوتی اور کوئی جانور زندہ نہ رہتا۔ اور اگر سمندر چند فٹ اور گہرے ہوتے تو ساری کاربن ڈائی آکسائیڈ اور آکسیجن صرف ہو جاتی اور روئے زمین پر کوئی سبز پتہ نظر نہ آتا۔ اس حکیمانہ نظام پر غور کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کارخانہ ہستی اتفاقاً معرض وجود میں نہیں آ گیا بلکہ ایک حکیم و دانا خالق نے اس کی تخلیق فرمائی ہے ورنہ زندگی کا کوئی امکان نہ تھا (Reader\'s Digest Oct, 1960) یہ اقتباس پڑھ لینے کے بعد اب اس آیت کو دوبارہ پڑھیئے اور اس کے نازل کرنے والے مولائے برحق کے حضور میں سر بسجود ہو جایئے۔ اور جس ذات قدس صفات نے امی ہوتے ہوئے اس حقیقت پنہاں کے رخ سے نقاب الٹا ہے اس پر زبان دل وروح صلوٰۃ وسلام عرض کیجئے۔

امئے بود کہ ماز اثر حکمت او واقف از سر نہاں خانہ تقدیر شدیم (اقبال)

بعض لوگوں نے صور کو صورۃ کی جمع تصور کیا ہے اور معنی یہ کیا ہے کہ صورتوں میں جب پھونکا جائے گا تو وہ حقائق میں تبدیل ہو جائیں گی یا بے جان مجسموں میں پھونک مارنے سے وہ زندہ ہو جائیں گے۔ لیکن یہ معنی دوسری آیتوں اور احادیث نبویہ سے تطبیق نہیں کھاتا۔ حدیث شریف میں یہی ہے کہ حضرت اسرافیل (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے حکم سے پہلی بار صور پھونکیں گے تو سب زندہ اشیاء موت کی نیند سو جائیں گی۔ اور جب دوسری بار پھونکیں گے تو ہر چیز زندہ ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہو جائے گی۔ اس صور کی حقیقت کیا ہے۔ اس کی شکل و صورت اور طول و عرض کتنا ہے۔ اس کے متعلق نہ قرآن نے بتایا نہ صاحب قرآن نے اور نہ اس کے جاننے کی کوئی ضرورت ہے۔ اس لیے اس بارے میں سکوت ہی اولیٰ ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

قرآن اور احادیث کی روشنی میں صور پھونکنے کا بیان

اس کے بعد فرمایا اور اس کی حکومت ہو گی جس دن صور میں پھونکا جائے گا۔ مذکورہ ذیل میں بھی صور پھونکنے کا ذکر ہے:

(آیت) "**ونفخ فی الصور فصعق من فی السموت ومن فی الارض الا من شآء اللہ ثم نفخ فیہ اخری فاذا ھم قیام ینظرون**"۔ (الزمر: ٦٨)

ترجمہ: اور صور پھونکا جائے گا جو آسمانوں اور زمینوں میں ہے سب بے ہوش ہو جائیں گے مگر جن کو اللہ چاہے پھر دوبارہ صور میں پھونکا جائے گا 'تو وہ اچانک دیکھتے ہوئے کھڑے ہو جائیں گے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آیا اور اس نے کہا صور کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا وہ ایک سینگھ جس میں پھونکا جائے گا۔

(سنن ترمذی 'ج ٤ 'رقم الحدیث: ٢٤٣٨ 'سنن ابو داؤد 'ج ٣ 'رقم الحدیث: ٤٧٤٢ 'صحیح ابن حبان 'ج ١٦ 'رقم الحدیث: ٧٣١٢ 'مسند احمد 'ج ٢ 'رقم الحدیث: ٦٥١٧ 'سنن الدارمی 'ج ٢ 'رقم الحدیث: ٢٧٩٨)

حضرت ابو سعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں کس طرح نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤں 'حالانکہ سینگھ والے نے اپنے منہ میں سینگھ ڈال رکھا ہے اور وہ غور سے سن رہا ہے کہ کب اسے اس میں پھونک مارنے کا حکم دیا جائے 'تو وہ اس میں پھونک مارے۔ یہ حدیث نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب پر دشوار گزری 'آپ نے ان سے فرمایا یوں کہو ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے اور ہم نے اللہ تعالیٰ ہی پر توکل کیا ہے۔ (سنن الترمذی 'ج ٤ 'رقم الحدیث: ٢٤٣٩ 'مسند احمد 'ج ٤ 'رقم الحدیث: ١١٦٩٦)

امام مسلم بن حجاج قشیری ٢٦١ھ نے حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) سے قیامت کے فتنوں کے متعلق ایک طویل حدیث روایت کی ہے۔ اس میں مذکور ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا پھر صور پھونک دیا جائے گا 'جو شخص بھی اس کو سنے گا 'وہ ایک طرف گردن جھکائے گا اور دوسری طرف سے اٹھالے گا۔ جو شخص سب سے پہلے اس کی آواز سنے گا 'وہ اپنے اونٹوں کا حوض درست کر رہا ہو گا 'وہ بے ہوش ہو جائے گا اور دوسرے لوگ بھی بے ہوش ہو جائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ شبنم کی طرح ایک بارش نازل فرمائے گا 'جس سے لوگوں کے جسم اگ پڑیں گے۔ پھر دوسری بار صور پھونکا جائے گا پھر لوگ کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے۔ پھر کہا جائے گا 'اے لوگو! اپنے رب کے پاس آؤ اور (فرشتوں سے کہا جائے گا) ان کو کھڑا کرو۔ ان سے سوال کیا جائے گا 'پھر کہا جائے گا 'دوزخ کے لیے ایک گروہ نکالو 'کہا جائے گا 'کتنے لوگوں کا 'کہا جائے گا ہر ہزار میں سے نو

سو ننانوے۔ آپ نے فرمایا یہ وہ دن ہے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا اور اس دن ساق (پنڈلی) کھولی جائے گی۔ (صحیح مسلم 'فتن '۱۱٦ '(۲۹۴۰) ۷۲۹۴۷ 'سنن کبری للنسائی 'ج ٦ 'رقم الحدیث : ۱۱٦۲۹)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: دو بار صور پھونکنے کے درمیان چالیس کا وقفہ ہوگا۔ لوگوں نے کہا اے ابوہریرہ! چالیس دن؟ انھوں نے کہا میں نہیں کہہ سکتا۔ لوگوں نے کہا چالیس ماہ؟ انھوں نے کہا میں نہیں کہہ سکتا۔ لوگوں نے کہا چالیس سال؟ انھوں نے کہا میں نہیں کہہ سکتا۔ پھر اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی نازل فرمائے گا۔ جس سے لوگ اس طرح اگیں گے جس طرح سبزہ اگتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ (رض) نے کہا ایک ہڈی کے سوا انسان کے جسم کی ہر چیز گل جائے گی اور وہ دم کی ہڈی کا سرا ہے 'اور قیامت کے دن اسی سے انسان کو دوبارہ بنایا جائے گا۔

(صحیح البخاری 'ج ٦ 'رقم الحدیث : ۴۹۵۵ 'صحیح مسلم 'فتن ۱۴۱' (۲۹۵۵) ۷۲۸۰ 'السنن الکبری للنسائی 'ج ٦ 'رقم الحدیث : ۱۱۴۵۹)

صحیحین کے علاوہ دوسری کتابوں میں ہے کہ یہ مدت چالیس سال ہے۔ امام ابن مردویہ نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ دو مرتبہ صور پھونکنے کی مدت چالیس سال ہے 'اور ایک سند ضعیف سے حضرت ابن عباس (رض) سے بھی روایت ہے کہ دو بار صور پھونکنے کی مدت چالیس سال ہے۔ امام حاکم اور امام یعلی نے حضرت ابوسعید خدری (رض) سے روایت کیا ہے کہ آپ سے پوچھا گیا 'یارسول اللہ! دم کی ہڈی کیسی ہے! آپ نے فرمایا وہ رائی کے دانے کی طرح ہے۔ وہ پشت کی جڑ میں ایک باریک ہڈی ہے اور وہ دم کی ہڈی ہے 'جو چوپائے میں دم کے سر کی جگہ ہوتی ہے۔ اس حدیث میں ہے کہ ایک ہڈی کے سوا انسان کے جسم کی ہر چیز گل جائے گی۔ اس قاعدہ سے انبیاء (علیہم السلام) مستثنی ہیں۔ کیونکہ سنن ابو داؤد میں یہ حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء (علیہم السلام) کے جسموں کو کھانا زمین پر حرام کر دیا ہے اور اسی طرح شہداء بھی اس قاعدہ سے مستثنی ہیں 'کیونکہ قرآن مجید نے شہداء کی حیات کی تصریح کی ہے۔ (فتح الباری ج ۸ ص ۵۵۳۔ ۵۵۲ 'مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ 'لاہور ۱۴۰۱ ھ)

علامہ ابی مالکی متوفی ۸۲۸ ھ نے لکھا ہے کہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں یہ دلیل ہے کہ صور میں پھونکا جائے گا۔ امام غزالی نے لکھا ہے کہ اس میں حقیقتاً پھونک ماری جائے گی۔ ایک قول یہ ہے کہ صور پھونکنے والا کہے گا 'اے بوسیدہ اجسام اور منتشر ہڈیو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم فیصلہ کے لیے جمع ہو جاؤ۔ (اکمال اکمال المعلم 'ج ۹ 'ص ۴۱۰ 'مطبوعہ دار الکتب العلمیہ 'بیروت ۱۴۱۵ ھ)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے اصحاب کی جماعت میں تشریف فرما تھے آپ نے فرمایا جب اللہ تبارک وتعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے سے فارغ ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے صور کو پیدا کیا اور وہ حضرت اسرافیل (علیہ السلام) کو عطا کیا ' انھوں نے اس صور کو اپنے منہ میں رکھا ہوا ہے اور وہ نظر اٹھا کر عرش کی طرف دیکھ رہے ہیں اور اس انتظار میں ہیں کہ انھیں کب حکم دیا جائے۔ حضرت ابوہریرہ (رض) نے پوچھا یارسول اللہ! صور کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا وہ ایک سینگھ ہے۔ انھوں نے پوچھا وہ کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا وہ عظیم ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے اس کی گولائی اتنی بڑی ہے جتنی آسمانوں کی چوڑائی ہے۔ ایک اور راوی نے کہا زمین میں تین مرتبہ صور پھونکا جائے گا۔ پہلی مرتبہ پھونکنے سے لوگ دہشت زدہ ہو جائیں گے 'دوسری بار پھونکنے سے سب مر جائیں گے اور تیسری بار پھونکنے سے سب رب العلمین کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے۔ اللہ عزوجل پہلی مرتبہ حضرت اسرافیل (علیہ السلام) کو صور پھونکنے کا حکم دے گا تو حضرت اسرافیل (علیہ السلام) سے فرمائے گا 'دہشت ڈالنے کے لیے صور میں پھونکو تو آسمان اور زمین میں سب دہشت زدہ ہو جائیں گے۔ سوا ان کے جنہیں اللہ چاہے 'اور اللہ تعالیٰ حکم دے گا کہ وہ مسلسل رکے بغیر صور میں پھونکتے رہیں 'اس کا ذکر اس آیت میں ہے :

"(آیت) "وما ینظر ھؤلاء الا صیحۃ واحدۃ مالھا من فواق"۔ (ص : ١٥)
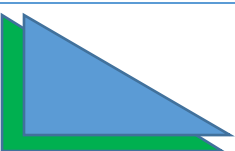
ترجمہ : اور وہ ایک زبردست چیخ کا انتظار کر رہے ہیں جس کے درمیان سانس لینے کی بھی مہلت نہیں ہو گی۔

پھر اللہ تعالیٰ پہاڑوں کو اڑا دے گا تو وہ بادلوں کی طرح چل رہے ہوں گے ' پھر وہ خاک کا ڈھیر ہو جائیں گے ' اور زمین اپنے ساکنوں کے ساتھ لرز رہی ہو گی۔ اس کا ذکر اس آیت میں ہے :

(آیت) "یوم ترجف الراجفۃ، تتبعھا الرادفۃ، قلوب یومئذ واجفۃ"۔ (النزعت : ٨۔ ٦)

ترجمہ : جس دن لرزنے والی لرز جائے گی ' پھر پیچھے آنے والی اس کے پیچھے آئے گی بہت سے دل اس دن لرز رہے ہوں گے۔

اور زمین اس طرح ہلنے اور جھولنے لگے گی جس طرح بلند جہاز کو سمندر میں موجیں ہر طرف دھکیلتی رہتی ہیں یا جس طرح چھت میں لٹکی ہوئی قندیل کو ہوا جھونٹے دیتی رہتی ہے ' پھر لوگ زمین پر گرنے لگیں گے۔ دودھ پلانے والیاں بچوں کو بھول جائیں گی ' حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہو جائیں گے ' اور بچے بوڑھے ہو جائیں گے ' شیاطین جان بچانے کے لیے زمین کے آخری کناروں تک بھاگیں گے ' فرشتے ان سے مقابلہ کرکے ان کے چہروں پر ماریں گے ' اور لوگ پیٹھ موڑ کر بھاگیں گے۔

زمین ہر طرف سے پھٹنے لگے گی اور ایسا عظیم واقعہ ظاہر ہو گا جو اس سے پہلے دیکھا نہ گیا تھا اور ایسی گھبراہٹ اور دہشت طاری ہو گی جس کو اللہ ہی جانتا ہے ' پھر لوگ آسمان کی طرف دیکھیں گے ' تو وہ پرزے پرزے ہو کر اڑ رہا ہو گا ' سورج اور چاند دھندلا جائیں گے اور ستارے بکھر جائیں گے ' آسمان بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا لیکن مردوں کو اس کی بالکل خبر نہیں ہو گی۔ حضرت ابوہریرہ (رض) نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کس کا استثناء فرمایا ہے ؟

(آیت) "یوم ینفخ فی الصور ففزع من فی السموت ومن فی الارض الا من شآء اللہ"۔ (النمل : ٨٧)

ترجمہ : اور جس دن صور میں پھونکا جائے گا تو جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں ' وہ سب گھبرا جائیں گے مگر جنہیں اللہ چاہے گا۔

آپ نے فرمایا وہ شہداء ہیں وہ اپنے رب کے نزدیک زندہ ہیں اور ان کو رزق دیا جاتا ہے ' اور گھبراہٹ کا اثر (ظاہرا) زندہ لوگوں پر ہو گا۔ سو اللہ تعالیٰ ان کو اس دن کی گھبراہٹ سے محفوظ اور مامون رکھے گا اور یہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے برے لوگوں پر بھیجے گا اور اس کا ذکر اس آیت میں ہے :

(آیت) "یایھا الناس اتقوا ربکم ان زلزلۃ الساعۃ شیء عظیم، یوم ترونھا تذھل کل مرضعۃ عما ارضعت وتضع کل ذات حمل حملھا وتری الناس سکاری وما ھم بسکاری ولکن عذاب اللہ شدید"۔ (الحج : ٢۔ ١)

ترجمہ : اے لوگو ! اپنے رب سے ڈرو ' بیشک قیامت کا زلزلہ بڑی (بھاری) چیز ہے ' جس دن تم اسے دیکھو گے تو ہر دودھ پلانے والی اس (بچے) سے غافل ہو جائے گی جس کو اس نے دودھ پلایا تھا اور ہر حاملہ اپنا حمل گرا دے گی اور (اے مخاطب) تو لوگوں کو مخمور دیکھے گا ' حالانکہ وہ نشہ میں نہیں ہوں گے ' لیکن اللہ کا عذاب بہت سخت ہے۔

پھر جب تک اللہ چاہے گا لوگ اس عذاب میں مبتلا رہیں گے اور ایک طویل عرصہ تک یہ حالت رہے گی ' پھر اللہ تعالیٰ اسرافیل کو حکم دے گا کہ وہ موت کا صور پھونکیں ' سو وہ موت کا صور پھونکیں گے۔ جس سے تمام آسمانوں اور زمینوں کے لوگ ہلاک ہو جائیں گے ' ماسوا ان کے جنہیں اللہ چاہے گا اور جب وہ سب ہلاک ہو جائیں گے تو مالک الموت (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوں گے اور عرض کریں گے ' اے میرے رب تمام آسمانوں اور زمینوں کے لوگ ہلاک ہو گئے ' ماسوا ان کے جنہیں تو نے چاہا ' اللہ عزوجل پوچھے گا حالانکہ وہ خوب جاننے والا ہے ' تو کون کون

باقی رہ گیا؟ وہ کہیں گے 'اے میرے رب تو باقی ہے جو زندہ ہے اور تو نہیں مرے گا 'اور تیرے عرش کو اٹھانے والے باقی ہیں اور جبرائیل اور میکائیل باقی ہیں اور میں باقی ہوں۔

اللہ عزوجل فرمائے گا جبرائیل اور میکائیل کو بھی فوت ہونا چاہیے 'پس عرش کہے گا 'اے میرے رب ! تو جبرائیل اور میکائل کو بھی مار ڈالے گا ! اللہ عزوجل فرمائے گا خاموش رہو ! میں نے اپنے عرش کے نیچے ہر ایک کے لیے موت مقرر کر دی ہے 'وہ دونوں مر جائیں گے۔ پھر ملک الموت (علیہ السلام) اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے اور عرض کریں گے 'جبرائیل اور میکائیل فوت ہو گئے۔ اللہ عزوجل پوچھے گا 'حالانکہ وہ خوب جاننے والا ہے 'تو اب کون باقی ہے ؟ وہ عرض کریں گے 'اے میرے رب ! تو باقی ہے جو زندہ ہے اور جس کو موت نہیں آئے گی اور تیرے عرش کے حاملین باقی ہیں اور میں باقی ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا 'میرے عرش کے حاملین کو بھی موت آجائے 'پس وہ مر جائیں گے۔ پھر ملک الموت اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے حاضر ہوں گے 'عرض کریں گے اے میرے رب ! تیرے عرش کے حاملین بھی فوت ہو گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ پوچھے گا حالانکہ وہ خوب جاننے والا ہے۔ تو اب کون باقی ہے ؟ وہ کہیں گے 'اے میرے رب تو باقی ہے جو زندہ ہے اور جس کو موت نہیں آئے گی اور میں باقی ہوں۔ اللہ عزوجل فرمائے گا تو بھی میری مخلوق میں سے ایک مخلوق ہے 'میں نے تجھے اسی کام کے لیے پیدا کیا تھا 'اب تو بھی مر جا سو وہ مر جائے گا 'اور اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا کوئی باقی نہیں رہے گا۔ "الواحد الاحد الصمد "جو نہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا 'وہی آخر ہو گا جیسا کہ وہ اول تھا۔ آپ نے فرمایا اہل جنت پر موت ہو گی نہ اہل نار پر موت ہو گی۔ پھر آسمان اور زمین کو اس طرح لپیٹ دیا جائے گا جس طرح اوراق کو لپیٹ دیا جاتا ہے 'ان کو پھر کھولا جائے گا اور پھر لپیٹا جائے گا۔ پھر فرمائے گا میں جبار ہوں 'پھر اللہ تبارک وتعالیٰ بلند آواز سے فرمائے گا، "لمن الملک الیوم "آج کس کی بادشاہی ہے 'پھر فرمائے گا (آیت) "للہ الواحد القھار "۔ (غافر : ١٦) اللہ واحد قہار کی بادشاہی ہے۔ پھر فرمائے گا 'سنو ! جس نے میرے لیے شریک بنایا ہو 'وہ لے آئے۔ سنو ! جس نے میرے لیے شریک بنایا ہو 'وہ لے آئے۔ پھر اس آسمان اور زمین کے علاوہ دوسرے آسمان اور زمین پیدا کرے گا اور ان کو پھیلا کر دراز کر دے گا 'جس میں تم کو کوئی کجی اور نقص نہیں دکھائی دے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ مخلوق کو زبردست آواز کے ساتھ جھڑکے گا 'پھر لوگ اس نو پیدا شدہ زمین میں پہلے کی طرح ہو جائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر عرش کے نیچے سے پانی نازل فرمائے گا 'پھر تم پر چالیس دن تک آسمان سے بارش ہوتی رہے گی 'حتی کہ تم پر بارہ ہاتھ پانی بلند ہو جائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ جسموں کو اگنے کا حکم دے گا تو وہ سبزیوں کی طرح اگنے لگیں گے 'جب اجسام پہلے کی طرح مکمل ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا 'حاملین عرش زندہ ہو جائیں 'پھر اللہ عزوجل حضرت اسرافیل کو صور پکڑنے کا حکم دے گا 'پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا 'جبرائیل اور میکائل زندہ ہوں 'سو وہ زندہ ہو جائیں گے۔ پھر اللہ عزوجل ارواح کو بلائے گا 'وہ لائی جائیں گی۔ مسلمانوں کی روحیں نور کی طرح چمک رہی ہوں گی اور دوسری روحیں تاریک ہوں گی۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کو صور میں ڈال دے گا 'پھر اللہ تعالیٰ اسرافیل سے فرمائے گا ان کو زندہ کرنے کے لیے صور میں پھونکو 'تو وہ زندہ کرنے کے لیے صور پھونکے گا ' پھر تمام روحیں شہد کی مکھیوں کی طرح نکلیں گی جن سے زمین اور آسمان بھر جائیں گے 'اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائے گا 'تمام روحیں اپنے اجسام میں داخل ہو جائیں 'تو سب روحیں جسموں میں داخل ہونے لگیں گی اور نتھنوں کے راستہ داخل ہوں گی۔ جس طرح زہر کسی مار گزیدہ میں سرایت کر جاتا ہے۔ پھر زمین پھٹنے لگے گی اور میں سب سے پہلے زمین سے نکلوں گا 'لوگ سرعت کے ساتھ اپنے رب کی طرف نکلیں گے 'تم سب تیس سال کی عمر میں اٹھو گے اور اس دن سب کی زبان سریانی ہو گی :

(آیت) "خشعا ابصارھم یخرجون من الاجداث کانھم جراد منتشر، مھطعین الی الداع یقول الکافرون ھذا یوم عسر "۔ (القمر : ٨۔ ٧)

ترجمہ: وہ نیچی آنکھیں کیے ہوئے قبروں سے نکلیں گے ' گویا وہ زمین پر پھیلے ہوئے ٹڈی دل ہیں ' بلانے والے کی طرف دوڑتے ہوئے ' کافر کہیں گے یہ بڑا سخت دن ہے۔

یہ قبروں سے نکلنے کا دن ہے ' اس دن ہم تم کو جمع کریں گے اور تم میں سے کسی کو نہیں چھوڑیں گے ' پھر وہ ایک جگہ میں ستر سال تک کھڑے رہیں گے۔ اللہ تمہاری طرف نہ دیکھے گا اور نہ کسی کا کوئی فیصلہ کرے گا ' خلقت روئے گی اور جب آنسو ختم ہو جائیں گے تو آنکھوں سے خون بہنے لگے گا ' لوگ اپنے پسینہ میں شرابور ہو جائیں گے ' ان کی ٹھوڑیوں اور منہ تک پسینہ پہنچا ہوا ہوگا ' لوگ کہیں گے کہ ہمارے رب کے پاس کون شفاعت کرے گا ' تاکہ وہ ہمارے درمیان فیصلہ کرے۔ لوگ کہیں گے کہ تمہارے باپ حضرت آدم (علیہ السلام) سے زیادہ اس کا کون حقدار ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا ہے اور ان میں اپنی پسندیدہ روح پھونکی ہے اور ان سے بالمشافہ کلام کیا ہے۔ پھر لوگ حضرت آدم (علیہ السلام) کے پاس جا کر اپنا مقصد بیان کریں گے ' حضرت آدم (علیہ السلام) اس سے انکار کر دیں گے۔ پھر وہ ہر نبی کے پاس باری باری جائیں گے اور وہ اس کام سے انکار کریں گے۔ پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا پھر وہ میرے پاس آئیں گے ' حتیٰ کہ جب وہ میرے پاس آئیں گے تو میں عرش کے نیچے سجدہ میں گر پڑوں گا ' حتیٰ کہ اللہ عزوجل میرے پاس ایک فرشتہ بھیجے گا جو مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھائے گا ' پھر اللہ عزوجل پوچھے گا ' حالانکہ وہ خوب جاننے والا ہے۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا بات ہے؟ میں کہوں گا ' اے میرے رب ' تو نے مجھ سے شفاعت کا وعدہ فرمایا تھا ' پس اپنی مخلوق کے متعلق میری شفاعت قبول فرما اور ان کا فیصلہ فرما ' اللہ عزوجل فرمائے گا ' میں نے تمہاری شفاعت قبول کی ' میں تمہارے پاس آ کر تمہارے درمیان فیصلہ کروں گا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں واپس آ کر لوگوں کے ساتھ کھڑا ہو جاؤں گا ' سو جس وقت ہم کھڑے ہوئے ہوں گے تو آسمان سے ایک زبردست آواز آئے گی جس سے ہم گھبرا جائیں گے ' اور زمین کے جن وانس سے دگنی تعداد میں آسمان سے فرشتے نازل ہوں گے ' حتیٰ کہ وہ زمین کے قریب آ جائیں گے اور زمین ان کے نور سے روشن ہو جائے گی ' وہ اپنی صفیں بنائیں گے۔ ہم ان سے پوچھیں گے ' کیا تم میں ہمارا رب ہے؟ وہ کہیں گے ' نہیں وہ آنے والا ہے۔

پھر تیسرا آسمان سے اس سے دگنے فرشتے نازل ہوں گے اور وہ زمین کے جن وانس سے بھی دگنے ہوں گے ' حتیٰ کہ جب وہ زمین کے قریب ہوں گے تو زمین ان کے نور سے روشن ہو جائے گی۔ اور وہ اپنی صفیں بنائیں گے۔ ہم ان سے کہیں گے ' کیا تم میں ہمارا رب ہے؟ وہ کہیں گے نہیں ' وہ آنے والا ہے۔ پھر اس سے دگنے فرشتے نازل ہوں گے۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ بادلوں اور فرشتوں کے جھرمٹ میں نازل ہوگا۔ آٹھ فرشتے اس کا عرش اٹھائے ہوئے ہوں گے ' حالانکہ اس وقت تو اس کا عرش چار فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں ' ان کے اقدام سب سے نچلی زمین کی تہہ میں ہیں۔ تمام زمینیں اور آسمان ان کی آدھے دھڑ تک پہنچتے ہیں ' عرش ان کے کندھوں پر ہے اور وہ بلند آواز سے تسبیح پڑھ رہے ہیں۔ "سبحان ذی الملك والملکوت، سبحان ذی العزۃ والجبروت، سبحان الحی الذی لا یموت، سبحان الذی یمیت الخلائق ولا یموت، سبوح قدوس رب الملائکۃ والروح قدوسا قدوسا، سبحان ربنا الاعلی، سبحان ذی الملکوت والجبروت والکبریاء والسلطان والعظمۃ سبحانہ ابد الاباد"۔

پھر اللہ تعالیٰ زمین پر جہاں چاہے گا ' اپنا عرش رکھے گا۔ پھر فرمائے گا ' مجھے اپنی عزت اور جلال کی قسم! کوئی شخص بھی ظلم کر کے میرے قریب نہیں ہوگا ' پھر ایک منادی ندا کرے گا جس کو تمام مخلوق سنے گی۔ اے جن اور انس کی جماعت! میں نے جب سے تمہیں پیدا کیا ہے آج تک خاموش تھا ' تمہاری باتیں سنتا رہا تمہارے اعمال دیکھتا رہا۔ اب تم خاموش رہو تمہارے اعمال کے صحیفے تم کو پڑھ کر سنائے جائیں گے ' جو شخص نیکیاں پائے ' وہ

اللہ کی حمد کرے اور جس کے صحیفے اس کے خلاف ہوں 'وہ صرف اپنے نفس کو ملامت کرے 'پھر اللہ تعالیٰ دوزخ کو حکم دے گا تو اس میں سے ایک سیاہ چمکتی ہوئی گردن نمودار ہو گی۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

(آیت) "وامتازوا الیوم ایھا المجرمون، الم اعھد الیکم یبنی ادم ان لا تعبدوا الشیطان انہ لکم عدو مبین"۔ (یسین: ۵۹۔۶۰)

ترجمہ: اے مجرمو! آج (نیکوں سے) الگ ہو جاؤ 'اے آدم کی اولاد! کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا 'بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ جن و انس کے سوا تمام مخلوق کے درمیان فیصلہ فرمائے گا 'بعض کا بعض سے قصاص لیا جائے گا 'حتیٰ کہ بغیر سینگھ والی بکری کا سینگھ والی بکری سے قصاص لیا جائے گا 'حتیٰ کہ جب کسی کا کسی پر حق نہیں رہے گا 'تو فرمائے گا 'تم سب مٹی ہو جاؤ 'اس وقت کافر کہے گا:

(آیت) "یلیتنی کنت ترابا"۔ (النباء: ۴۰)

ترجمہ: اے کاش! میں مٹی ہو جاتا۔

پھر اللہ عزوجل جن اور انس کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ پس سب سے پہلے خون کے متعلق فیصلہ فرمائے گا 'اس شخص کو لایا جائے گا جو اللہ کی راہ قتل کیا گیا اور اس کے قاتل کو لایا جائے گا 'مقتول کی رگوں سے خون بہ رہا ہو گا 'وہ کہیں گے 'اے ہمارے رب! ہم کو اس شخص نے قتل کیا ہے۔ اللہ عزوجل پوچھے گا حالانکہ وہ خوب جاننے والا ہے 'تم نے ان سے قتال کیوں کیا تھا؟ وہ کہے گا: اے میرے رب؟ میں نے تیری عزت کی خاطر ان سے قتال کیا تھا 'اللہ عزوجل فرمائے گا تم نے سچ کہا پھر اللہ تعالیٰ اس کا چہرہ سورج کی طرح منور کر دے گا 'پھر فرشتے اس کو جنت کی طرف لے جائیں گے۔ پھر اس شخص کو لایا جائے گا جو دنیا میں بغیر اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی اطاعت کے 'محض دنیاوی غلبہ کی وجہ سے قتل کیا گیا تھا 'اور اس کا قاتل بھی آئے گا۔ مقتول اپنے خون میں لتھڑے ہوئے سر اٹھائے ہوئے ہوں گے اور ان کی آنتیں خون میں لتھڑی ہوئی ہوں گی 'وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہم کو اس شخص نے قتل کیا ہے اللہ عزوجل پوچھے گا 'حالانکہ وہ ان سب سے زیادہ جاننے والا ہے 'تم نے ان کو کیوں قتل کیا؟ وہ کہے گا 'اے میرے رب! میں نے غلبہ حاصل کرنے کے لیے ان کو قتل کیا۔ اللہ عزوجل فرمائے گا تم ہلاک ہو گئے 'پھر اس کا چہرہ سیاہ اور اس کی آنکھیں نیلی کر دی جائیں گی 'پھر ہر قاتل کو مقتول کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا 'پھر اللہ تعالیٰ باقی مخلوق کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ پھر دودھ میں پانی ملانے والے کو اس بات کا مکلّف کرے گا کہ وہ اس دودھ سے پانی کو الگ کر کے فروخت کرے 'حتیٰ کہ کسی شخص کا کسی شخص پر کوئی حق باقی نہیں رہے گا تو ایک منادی ندا کر کے تمام مخلوق کو سنائے گا اور کہے گا 'سنو! سب لوگ اپنے اپنے خداؤں کے ساتھ لاحق ہو جائیں اور ان کے ساتھ جن کی وہ اللہ کو چھوڑ کر پرستش کرتے تھے 'اور جس شخص نے بھی اللہ کو چھوڑ کر کسی معبود کی پرستش کی تھی 'اس کے سامنے وہ معبود متمثل کر دیا جائے گا اور اس دن ایک فرشتہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی شکل میں بنادیا جائے گا۔ نصاریٰ اس کے پیچھے چلے جائیں گے اور ایک فرشتہ حضرت عزیر کی شکل میں بنادیا جائے گا 'یہودی اس کے پیچھے چلے جائیں گے 'پھر ان کے معبود ان کو جہنم کی طرف لے جائیں گے 'اور اس کا ذکر اس آیت میں ہے:

(آیت) "لو کان ھولاء الھۃ ما وردوھا وکل فیھا خلدون"۔ (الانبیاء: ۹۹)

ترجمہ: اگر یہ (سچے) معبود ہوتے تو جہنم میں نہ جاتے اور (یہ) سب اس میں ہمیشہ رہیں گے۔
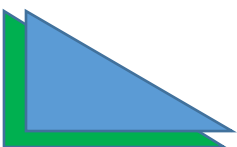
حتیٰ کہ جب صرف مومن رہ جائیں گے اور ان میں منافق بھی ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے پاس جس طرح چاہے گا 'اپنی ہیبت میں آئے گا۔ پس فرمائے گا 'اے لوگو 'اپنے خداؤں کے ساتھ لاحق ہو جاؤ اور ان کے ساتھ جن کی تم عبادت کرتے تھے 'وہ کہیں گے بخدا 'اللہ کے سوا ہمارا کوئی معبود نہیں ہے اور ہم اس کے سوا اور کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ پھر اللہ ان کے پاس سے ہٹ جائے گا 'پھر اللہ ان کو برقرار رکھے گا اور جتنی دیر اللہ ٹھہرنا چاہے گا 'ٹھہرے گا۔ پھر جس طرح چاہے گا 'ان کے پاس اپنی ہیبت میں آئے گا اور فرمائے گا 'اے لوگو! سب لوگ اپنے اپنے خداؤں کے ساتھ مل جاملے ہیں۔ تم بھی اپنے معبودوں سے جاملو 'وہ کہیں گے بخدا اللہ کے سوا ہمارا کوئی معبود نہیں ہے اور ہم اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ پھر اللہ عزوجل فرمائے گا میں تمہارا رب ہوں 'وہ کہیں گے ہم تجھ سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں 'پھر اللہ فرمائے گا 'کیا تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان کوئی ایسی نشانی ہے جس سے تم اس کو پہچان لو؟ وہ کہیں گے ہاں! پھر اللہ ان کے لیے اپنی پنڈلی کھولے گا اور ان کے لیے اللہ کی عظمت سے تجلی فرمائے گا جس سے وہ اس کو پہچان لیں گے۔ پھر وہ سجدہ میں گر جائیں گے 'پھر جب تک اللہ چاہے گا 'وہ اس کو سجدہ کریں گے 'اور اللہ عزوجل منافقوں کی پشتوں کو گائے کی پشتوں کی طرح سیدھا (بغیر لچک کے) کردے گا 'وہ اپنی پیٹھوں کے بل پر گر پڑیں گے۔

پھر اللہ عزوجل ان کو اٹھنے کا حکم دے گا 'پھر ان کے لیے جہنم کی پشت کے اوپر (پل) بنادیا جائے گا۔ جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہوگا 'اس میں جگہ جگہ آنکڑے اور کانٹے ہوں گے 'اور اس میں پھسلنے کی جگہیں ہوں گی۔ بعض مسلمان اس پر سے پلک جھپکنے میں گزر جائیں گے اور بعض ہوا کے جھونکے کی طرح گزر جائیں گے 'بعض تیز رفتار گھوڑے کی طرح اور بعض تیز چلنے والے کی طرح گزریں گے 'بعض صحیح سالم گزر جائیں گے 'بعض زخمی ہو کر گزریں گے 'بعض منہ کے بل جہنم میں گر جائیں گے۔ اللہ عزوجل کی مخلوق میں سے ایک گروہ جہنم میں جا گرے گا 'ان کے اعمال ان کو ہلاک کریں گے۔ بعض کے صرف پیروں تک آگ پہنچے گی 'اس سے آگے تجاوز نہیں کرے گی 'بعض کی نصف پنڈلیوں تک آگ پہنچے گی 'بعض کے معقد ازار تک آگ پہنچے گی 'بعض کے چہروں کے سوا پورے جسم تک آگ پہنچے گی 'اور ان کے چہروں پر اللہ نے آگ کو حرام کردیا ہوگا اور جب جنت میں چلے جائیں گے تو لوگ کہیں گے کہ ہمارے رب کے پاس ہماری کون شفاعت کرے گا؟ تاکہ ہم بھی جنت میں چلے جائیں۔ پس وہ کہیں گے کہ تمہارے باپ حضرت آدم (علیہ السلام) سے زیادہ اس کا اور کون حقدار ہوگا۔ اللہ عزوجل نے ان کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور ان میں اپنی پسندیدہ روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی پھونکی اور ان سے بالمشافہ کلام کیا 'پھر لوگ حضرت آدم (علیہ السلام) کے پاس جائیں گے اور ان سے شفاعت طلب کریں گے۔

حضرت آدم کو اپنا (صورۃ) گناہ یاد آئے گا 'وہ کہیں گے میں اس کے لائق نہیں ہوں 'لیکن تم حضرت نوح (علیہ السلام) کے پاس جاؤ 'وہ اللہ کے پہلے رسول (علیہ السلام) ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی طرف بھیجا۔ پھر وہ حضرت نوح (علیہ السلام) کے پاس جائیں گے اور ان سے شفاعت طلب کریں گے 'وہ کہیں گے میں اس کے لائق نہیں ہوں 'لیکن تم حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس جاؤ 'کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا خلیل بنایا ہے، پھر لوگ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس جائیں گے اور ان سے شفاعت طلب کریں گے 'وہ کہیں گے 'میں اس کے لائق نہیں ہوں 'لیکن تم حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس جاؤ اللہ تعالیٰ نے ان سے سرگوشی میں کلام کیا ہے اور ان پر توراۃ نازل کی ہے۔

پھر لوگ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس جائیں گے اور ان سے شفاعت طلب کریں گے 'وہ کہیں گے میں اس کے لائق نہیں ہوں 'لیکن تم روح اللہ اور کلمتہ اللہ حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کے پاس جاؤ وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے پاس جاکر ان سے شفاعت طلب کریں گے 'وہ کہیں گے میں اس کے لائق نہیں ہوں 'لیکن عنقریب میں صاحب شفاعت کی طرف تمہاری رہنمائی کروں گا۔ تم (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جاؤ 'رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا پھر لوگ میرے پاس آئیں گے اور میرے رب کے پاس میری تین شفاعتیں

ہیں جن کا اس نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے ' پھر میں جنت کی طرف روانہ ہوں گا اور جنت کے دروازہ کو کھلواؤں گا ' پھر میرے لیے جنت کے دروازہ کو کھول دیا جائے گا اور مجھے تعظیم کے ساتھ خوش آمدید کہا جائے گا۔

میں جنت میں داخل ہو کر عرش کے اوپر اپنے رب عزوجل کو دیکھوں گا میں اس کے سامنے سجدہ میں گر پڑوں گا۔ اور جب تک اللہ چاہے گا ' میں سجدہ میں رہوں گا۔ پھر اللہ تعالیٰ مجھے اپنی ایسی حمد اور تمجید کرنے کی اجازت دے گا جو اس نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو نہیں دی تھی۔ پھر اللہ عزوجل مجھ سے ارشاد فرمائے گا اے محمد اپنا سر اٹھائیے اور شفاعت کیجئے ' آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی اور سوال کیجئے آپ کو دیا جائے گا۔ پس میں اپنا سر اٹھاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ مجھ سے پوچھے گا ' حالانکہ وہ سب کچھ جاننے والا ہے۔ کیا بات ہے۔؟ میں کہوں گا اے میرے رب ! تو نے مجھ سے شفاعت کا وعدہ کیا تھا۔ تو اہل جنت کے متعلق میری شفاعت قبول فرما ' اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے تمہاری شفاعت قبول کرلی اور میں نے ان کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت دے دی ' سو وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے۔

اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ فرماتے تھے ' تم دنیا میں اپنے گھروں اور بیویوں کو اس قدر نہیں پہچانتے جس قدر تم جنت میں اپنے گھروں اور بیویوں کو پہچانو گے۔ پھر رسول اللہ نے فرمایا میں شفاعت کروں گا اور یہ کہوں گا ' اے میرے رب ! میری امت میں سے جو لوگ دوزخ میں گر گئے ہیں اللہ عزوجل فرمائے گا ' جاؤ جن کی صورت تم پہچانتے ہو ' ان کو دوزخ سے نکال لو۔ پھر ان لوگوں کو دوزخ سے نکال لیا جائے گا حتی کہ دوزخ میں میرا ایک امتی بھی نہیں رہے گا۔ پھر اللہ عزوجل شفاعت کی اجازت دے گا۔ اور ہر نبی ' ہر شہید اور لعنت کرنے والے کے سوا ہر مومن شفاعت کرے گا ' کیونکہ لعنت کرنے والے کو نہ شہید لکھا جائے گا اور نہ اس کی شفاعت کرنے کی اجازت دی جائے گی۔ پھر اللہ عزوجل فرمائے گا جس کے دل میں ایک دینار کے برابر بھی ایمان ہو ' اس کو دوزخ سے نکال لو۔ پھر فرمائے گا جس کے دل میں دو تہائی (٣۔٢) دینار کے برابر بھی ایمان ہو ' پھر فرمائے گا جس کے دل میں نصف دینار کے برابر بھی ایمان ہو ' پھر فرمائے گا جس کے دل میں ایک تہائی (٣۔١) دینار کے برابر بھی ایمان ہو ' پھر فرمائے گا ' جس کے دل میں ایک قیراط (چھ جو) کے برابر بھی ایمان ہو ' پھر فرمائے گا جس کے دل میں ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو ' اس کو دوزخ سے نکال لو اور بیشک ابلیس لعنہ اللہ اس دن یہ امید کرے گا کہ اس کی بھی کوئی شفاعت کرے گا۔

اور جب ہر شخص شفاعت کر چکے گا اور دوزخ میں کوئی ایسا شخص نہیں باقی بچے گا جس نے اللہ کے لیے کوئی نیکی کی ہو ' تب اللہ تعالیٰ فرمائے گا ' اب میں باقی رہ گیا ہوں ' اور میں سب سے زیادہ نیکی کرنے والا ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ دوزخ میں اپنا ہاتھ داخل کرے گا۔ اور بیشمار لوگوں کو دوزخ سے نکال لے گا جن کی تعداد کو وہی جانتا ہے ' وہ لوگ جلی ہوئی لکڑیوں کی طرح ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو نہر الحیوان میں ڈال دے گا ' وہ اس طرح اگنے لگیں گے جیسے دریا کے کنارے کی مٹی میں دبا ہوا دانہ اگنے لگتا ہے ' جو سورج کی دھوپ میں سرسبز اور سائے میں زرد ہو جاتا ہے۔ عربوں نے جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ سنا تو وہ کہنے لگے ' یا رسول اللہ لگتا ہے کہ آپ جنگل میں رہے ہیں۔ وہ شاداب سبزیوں کی طرح اگیں گے اور ذرات کی طرح پھیلے ہوئے ہوں گے۔ ان کی پیشانیوں پر لکھا ہوا ہوگا رحمٰن کے آزاد کیے ہوئے دوزخی اس تحریر سے اہل جنت ان کو پہچانیں گے ' جب تک اللہ چاہے گا ' وہ جنت میں اسی طرح رہیں گے۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے ' اے اللہ ! یہ تحریر ہم سے مٹا دے ' سو اللہ تعالیٰ ان سے یہ تحریر مٹا دے گا۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں یہ حدیث مشہور ہے اور بہت طویل اور بہت غریب ہے۔ متفرق احادیث میں اس کے متفرق ٹکڑے ہیں۔ اس میں درج بعض امور لائق انکار ہیں۔ اسماعیل بن رافع قاضی مدینہ اس کی روایت میں منفرد ہیں ' اس کی صحت میں اختلاف ہے۔ بعض نے اس کی توثیق کی ہے ' بعض نے اس کو ضعیف کہا ہے ' بعض نے انکار کیا ہے بعض نے متروک کہا ہے۔ دراصل یہ حدیث کئی احادیث کو جوڑ کر بنائی گئی ہے اور اس

کو ایک ہی سند سے بیان کر دیا گیا ہے 'اس لیے یہ قابل انکار ہو گئی۔ میں نے اپنے استاذ حافظ المزی سے سنا ہے کہ یہ ولید بن مسلم کی ایک تصنیف ہے جس کو اس نے جمع کر رکھا ہے 'گویا یہ بعض الگ الگ حدیثوں کے شواہد ہیں۔

(کتاب العظمتہ 'رقم الحدیث : ۳۸۸ '۷ '۱۳ 'جامع البیان 'ج ۲۴ 'ص ۳۹ '۳۸ '۳۸ 'تفسیر امام ابن ابی حاتم 'ج ۱۰ 'ص ۳۲۶۲ '۳۲۵۶۔ '۳۲۵۶ 'تفسیر ابن کثیر 'ج ۳ 'ص ۵۲ '۴۶ 'تفسیر در منثور 'ج ۷ 'ص ۲۶۲۔۲۵۶) (تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهِيۡمُ لِاَبِيۡهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصۡنَامًا اٰلِهَةً‌ ۚ اِنِّىۡۤ اَرٰٮكَ وَقَوۡمَكَ فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ۝74

لغۃالقرآن: وَ اِذْ : اور جب] [قَالَ : فرمایا] [اِبْرٰهِيْمُ : ابراہیم] [لِاَبِيْهِ : اپنے باپ] [اٰزَرَ : آزر سے] [اَتَتَّخِذُ : کیا تو بناتا ہے] [اَصْنَامًا : بتوں کو] [اٰلِهَةً : معبود] [اِنِّىْٓ : بیشک میں] [اَرٰىكَ : دیکھتا ہوں تجھے] [وَقَوْمَكَ : اور تیری قوم کو] [فِيْ : میں] [ضَلٰلٍ : گمراہی] [مُّبِيْنٍ : واضح]

ترجمہ : اور (یاد کیجئے) جب ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے باپ آزر (جو حقیقت میں چچا تھا محاورہ عرب میں اسے باپ کہا گیا ہے) سے کہا : کیا تم بتوں کو معبود بناتے ہو ؟ بیشک میں تمہیں اور تمہاری قوم کو صریح گمراہی میں (مبتلا) دیکھتا ہوں

تشریح :

عرب کے مشرک یہودی اور عیسائی سب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی عظمت وجلالت شان اور رسالت کے معترف تھے۔ اور اہل عرب کو اس پر ناز تھا کہ وہ اس مقدس ہستی کی اولاد ہیں اس لیے حضرت خلیل (علیہ السلام) کے حالات پیش کرکے انھیں بتایا جارہا ہے کہ تم عجب ستم ظریف ہو کہ جس کے نام سے تمہیں یہ ساری عزت اور سروری نصیب ہے۔ جس کی نسل سے ہونے کو تم اپنے لیے وجہ عزت وافتخار سمجھتے ہو۔ اس کے دین اور اس کے مقصد حیات سے تم بالکل بیگانگی اختیار کرچکے ہو بلکہ اس گمراہی کو تم اپنا دین بناچکے ہو جس کو مٹانے کے لیے انھوں نے عمر بھر جہاد کیا۔ جن بتوں کو ریزہ ریزہ کرکے انھوں نے بھڑکتے ہوئے آتش کدوں میں کودنا گوارا کیا تم پھر انھیں بتوں کی پوجا میں سرگرم ہو اور ان کے دین حنیف کی طرف تمہیں دعوت دی جاتی ہے تو خشم گین اور غضب ناک ہو کر رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) برحق سے لڑنے کے لیے کمربستہ ہو جاتے ہو عجیب الٹی کھوپڑی کے لوگ ہو تم۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے والد کا نام آزر تھا یا چچا کا؟ حضرت خلیل (علیہ السلام) کے والد مسلمان تھے یا کافر؟ اس مقام پر علامہ آلوسی بغدادی (رح) نے اپنی تفسیر روح المعانی میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں اور اس نزاع کا فیصلہ انھیں پر چھوڑتا ہوں۔ علامہ مذکور رقم طراز ہیں۔ علماء اہل سنت میں سے ایک جم غفیر کی رائے یہ ہے کہ آزر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے والد نہ تھے۔ کیونکہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آباؤاجداد میں کوئی بھی کافر نہ تھا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے۔ "لم ازل انقل من اصلاب الطاھرین الی ارحام الطاھرات والمشرکون نجس"۔ کہ میں ابتدا سے آخر تک پاک لوگوں کی پشتوں سے پاک خواتین کے رحموں میں منتقل ہوتا چلا آیا ہوں اور مشرک نجس ہیں۔ اس کے بعد آلوسی (رح) فرماتے ہیں کہ امام رازی (رح) کا یہ کہنا کہ یہ شیعہ کا مذہب ہے درست نہیں۔ امام رازی (رح) نے اچھی طرح چھان بین نہیں کی۔ اس لیے یہ غلطی ہو گئی۔ علماء اہل سنت کی اکثریت کا یہ قول ہے کہ آزر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے چچا کا نام ہے اور اب کا لفظ چچا کے معنی میں عام استعمال ہوتا ہے۔ اپنے اس مسلک کی تائید میں علامہ مذکور نے کئی آثار نقل کئے ہیں لیکن یہاں صرف ایک چیز پیش کی جاتی ہے۔ یہ تو ایک واضح امر کہ جس کی موت کفر وشرک پر ہو اس کے لیے مغفرت نہیں۔ اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اپنے والد کی وفات کے سالہا سال بعد جب بابل سے ہجرت کرکے مصر گئے۔ وہاں سے حضرت ہاجرہ (رض) کے ساتھ نکاح کرکے شام آئے اور مدت دراز کے بعد اسماعیل (علیہ السلام) کی ولادت ہوئی اور حکم ربانی سے آپ ننھے اسماعیل (علیہ السلام) اور ان کی والدہ ہاجرہ (علیہ السلام) کو اس لق ودق صحرا میں چھوڑ آئے جہاں کعبہ کی تعمیر ہوتی تھی۔ اس واقعہ کے برسوں بعد جب اسماعیل (علیہ السلام) جوان ہوئے اور کعبہ کی تعمیر مکمل ہو گئی تو اس وقت یہ دعا آپ نے مانگی۔ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں۔ ربنا اغفرلی والوالدی وللمومنین یوم یقوم الحساب۔ اے رب! مجھے بھی بخش دے اور میرے والدین اور مسلمانوں کو بھی بخش دے۔ اگر حضرت کے والدین کافر ہوتے تو ایک پیغمبر یہ جانتے ہوئے کہ کافر کی بخشش نہیں ہو سکتی کبھی ان کی مغفرت کے لیے دعا نہ کرتے۔ (روح المعانی) لیکن وہ علماء جن کی تحقیق یہ ہے کہ آزر حضرت کے والد ہی تھے وہ بھی اس بات سے سختی سے منع کرتے ہیں کہ عام مجالس میں ان کے متعلق باتیں کی جائیں۔

حضرت صدر الافاضل (رح) یہاں لکھتے ہیں: "قاموس میں ہے کہ آزر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے چچا کا نام ہے۔ علامہ جلال الدین (رح) سیوطی نے مسالک الحنفا میں بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ چچا کو باپ کہنا تمام ممالک میں معمول ہے بالخصوص عرب میں۔ قرآن کریم میں بھی ہے۔ نعبد الھك والہ ابائك ابراھیم واسمعیل واسحق الھا واحدا۔ اس میں حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کو حضرت یعقوب (علیہ السلام) کے آبا میں ذکر کیا گیا ہے باوجودیکہ آپ عم ہیں۔ حدیث شریف میں بھی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عباس (رض) کو اب (باپ) فرمایا۔ چنانچہ ارشاد کیا ردو علی ابی۔ یہاں ابی سے حضرت عباس (رض) مراد ہیں۔ (خزائن العرفان)۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

اس آیت کے ضمن میں پیدا ہونے والے چند سوالات اور ان کے جوابات ملاحظہ ہوں:

1۔ آزر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا باپ تھا یا چچا؟ اس میں اختلاف ہے تاہم لغت، تفسیر اور تاریخ کی اکثر کتب میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے والد کا نام تارخ اور چچا کا نام آزر لکھا ہے۔

2۔ اگر آزر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا چچا تھا تو قرآن مجید میں اس کو باپ کیوں کہا گیا؟ عربی زبان میں "اب" اور "والد" کے معنی ہیں: "باپ" مگر "اب" عام ہے جو سگے باپ، سوتیلے باپ، دادا، ماموں، چچا اور استاد پر بھی بولا جاتا ہے۔ قرآن وحدیث میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "کیا تم اس وقت موجود تھے جب حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے اپنی اولاد سے پوچھا: میرے بعد تم

کس کی عبادت کروگے؟ انھوں نے کہا: ہم اس ایک خدا کی عبادت کریں گے جو آپ کے آباء یعنی حضرات ابراہیم، اسماعیل واسحاق علیہم لاسلام کا معبود ہے اور ہم اس کے فرمان بردار رہیں گے۔ " (قرآن: 133:2)

اس آیت میں حضرت اسماعیل کو حضرت یعقوب کے آباء میں ذکر کیا گیا ہے حالانکہ حضرت اسماعیل، حضرت یعقوب کے باپ نہیں بلکہ چچا ہیں۔ اسی طرح حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے چچا حضرت عباس (رض) کو ایک دفعہ " میرا باپ " کے نام سے یاد فرمایا۔ (تفسیر الشعراوی) مگر والد صرف سگے باپ کو کہا جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے ہر جگہ آزر کو حضرت ابراہیم کا "اب "فرمایا ہے کہیں بھی والد نہیں فرمایا۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی لکھتے ہیں کہ چچا کو باپ کہنا عمومی محاورہ ہے خصوصاً اس صورت میں جب چچا نے پرورش کی ہو اور یہ ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) بچپن میں یتیم ہوگئے ہوں اور چچا آزر نے آپ کی پرورش کی ہو۔ (تفسیر مظہری۔ سورۃ انعام: زیر آیت 76)

3۔ آزر مسلمان تھا یا کافر؟ آزر کافر تھا کیونکہ وہ مرتے دم تک بتوں کی عبادت کرتا رہا۔

4۔ آزر اگر کافر تھا تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اس کے لیے دعا کیوں مانگی؟ کفار کے مرنے کے بعد ان کے لیے نجات کی دعا کرنا ممنوع ہے۔ (قرآن: 113:9) لیکن ان کی زندگی میں ان کے لیے ہدایت کی دعا کرنا جائز ہے جیسا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے چچا ابو جہل اور حضرت عمر بن خطاب (رض) کے لیے ہدایت کی دعا فرمائی: " یا اللہ! ان دو آدمیوں یعنی ابو جہل اور عمر بن خطاب میں سے جو تجھے زیادہ پسند ہے اس کو مسلمان بنا کر اسلام کو عزت عطا فرما۔ " (ترمذی: ابواب المناقب: باب 18) کیونکہ یہ دونوں مکہ میں بااثر آدمی تھے، ان میں سے کسی ایک کے ایمان لانے سے اسلام کو تقویت ملے گی۔ اسی طرح حضرت ابراہیم (علیہ السلام) بھی اپنے چچا آزر کے لیے ہدایت کی دعا اس لیے مانگا کرتے تھے کیونکہ وہ حاکم وقت نمرود کا وزیر اور اپنے قبیلے کا سردار تھا۔ اس کے ایمان لانے سے اہل ایمان کو تقویت ملتی۔ نیز آزر نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے ایمان لانے کا وعدہ بھی کیا تھا مگر جب آزر کی کفر پر موت ہو گئی اور اس کے لیے توبہ کا دروازہ بند ہو گیا تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے آزر کے لیے دعا مانگنا ترک کر دی۔

(تفسیر ابن جریر: سورۃ توبہ: زیر آیت نمبر 114)

(5) آزر کی موت کب واقع ہوئی؟ آزر کی موت اس وقت ہوئی جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو آگ میں پھینکا گیا۔ آپ پر آگ ٹھنڈی ہو گئی تو آزر کہنے لگا: میری قرابت داری کی برکت سے آگ نے اسے نہیں جلایا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آگ کا ایک شعلہ بھیجا جس نے آزر کو جلا کر ہلاک کر دیا۔ (تفسیر روح المعانی: سورہ انبیاء: زیر آیت نمبر 69) آزر کے کفر پر مرنے کے بعد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اس سے بزاری کا اعلان کر دیا اور اس کے لیے دعا مانگنا ترک کر دی جیسا کہ سورۃ توبہ کی آیت نمبر 114 میں مذکور ہے۔

6۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے والد حضرت تارخ مسلمان تھے یا کافر؟ اہل سنت کے نزدیک حضرت تارخ مسلمان تھے اور اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے حضرت تارخ کے انتقال کے بعد آخر دم تک ان کے لیے دعائے مغفرت جاری رکھی۔ مثال کے طور پر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کے ساتھ جب خانہ کعبہ تعمیر کر لیا تو ایک سو سال سے زائد عمر یعنی اپنی عمر کے آخری حصہ میں اپنے مرحوم والدین کے لیے درج ذیل دعا مانگی: "اے ہمارے پروردگار! مجھے اور میرے والدین کو بخش دے اور سب

اہل ایمان کو بھی جس دن حساب قائم ہوگا۔ " (قرآن : 14:41) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اس دعا کو اتنا قبول عام نصیب ہوا کہ آج بھی مسلمان نماز میں انہی الفاظ کے ساتھ اپنے والدین کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو آگ میں پھینکنے اور تعمیر کعبہ کے درمیان تقریباً پچاس سال کا وقفہ ہے۔ظاہر ہے اس دعا کا مستحق آزر نہیں ہوسکتا کیونکہ اسے مرے ہوئے پچاس سال گزر چکے تھے اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اس کے کفر پر مرنے کے باعث پچاس سال پہلے اس سے بےزاری کا اعلان کر چکے تھے، لہٰذا اس دعا میں والد سے مراد حضرت ابراہیم کے حقیقی باپ حضرت تارخ ہیں۔ اگر وہ کافر ہوتے تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے دعائے مغفرت نہ کرتے۔

(7) کیا نبی کا باپ کافر ہوسکتا ہے یا نہیں ؟اس میں اختلاف ہے مگر اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ انبیائے کرام (علیہم السلام) کے والدین میں سے کوئی بھی مشرک اور کافر نہیں تھا بلکہ سبھی توحید پرست تھے۔ اس سلسلہ میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دو ارشادات ملاحظہ ہوں :

1۔ "میں ابتداء سے آخر تک پاک لوگوں کی پشتوں سے پاک خواتین کے رحموں میں منتقل ہوتا چلا آیا ہوں اور مشرک ناپاک ہیں۔" (تفسیر روح المعانی)

2۔ "میں نکاح سے پیدا ہوا ہوں اور بدکاری سے پیدا نہیں ہوا۔ حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر حتیٰ کہ میرے باپ اور میری ماں نے مجھے جنا اور مجھے زمانہ جاہلیت کی بدکاری سے کوئی چیز نہیں پہنچی۔" (تفسیر الشعراوی) یعنی آدم اور حوا (علیہا السلام) سے لے کر حضرت عبداللہ اور حضرت آمنہ تک حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ساری مائیں اور باپ پاک یعنی توحید پرست تھے، ان میں سے کوئی بھی ناپاک یعنی مشرک نہیں تھا۔ اب آزر کو جو کہ مشرک تھا اگر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا حقیقی باپ تسلیم کیا جائے تو نہ صرف حضرت ابراہیم (علیہ السلام) بلکہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی ایک مشرک کی اولاد قرار پاتے ہیں جو کہ درست نہیں ہے، کیونکہ آپ کے سارے آباء و اجداد شرک سے پاک تھے۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی ولادت باسعادت

توراۃ کے نسخہ سجینہ کا جو ترجمہ عبرانی سے یونانی میں تین سو سال قبل مسیح کیا گیا اور جس میں نامور دانشور یہودی شریک تحقیق ہوئے ان کے حوالے سے ماہر اثریات سر چارلس مارسٹن نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا سن ولادت ۲۱۶۰ قبل مسیح تحریر کیا ہے۔ آپ کی عمر مبارک ۱۷۵ سال تھی چنانچہ مذکورہ تحقیق کے مطابق آپ کی وفات پرملال ۱۹۸۵ قبل مسیح قرار پائی۔ تاہم یہ تحقیق حتمی حیثیت نہیں رکھتی۔

جدید تحقیق میں نہ صرف وہ شہر معلوم ہوگیا ہے جس میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی ولادت ہوئی بلکہ آپ کے دور کے حالات و واقعات قدرے تفصیل کے ساتھ سامنے آئے ہیں۔ آپ جنوبی عراق میں دریائے فرات کے کنارے واقع شہر ار میں پیدا ہوئے جس کو موجودہ جغرافیہ کی زبان میں تل ابیب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے پیدائشی شہر کی آبادی کا ڈھائی لاکھ سے لے کر پانچ لاکھ تک اندازہ کیا گیا ہے۔ آثار قدیمہ کے کھنڈرات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی زندگی کا مقصد دولت کمانا، سود خوری اور مقدمہ بازی مشغلہ تھا۔ گویا کہ اخلاقی اور اعتقادی اعتبار سے یہ قوم تباہی کے گڑھے پر کھڑی تھی۔ اس وقت کے مذہبی حالات کا آپ اندازہ اس بات سے لگائیں کہ آپ کے شہر ار میں پانچ ہزار خداؤں کے نام دریافت کیے گئے ہیں۔ دوسرے شہروں اور قصبات کے الگ الگ خدا مقرر تھے۔ ہر شہر کا ایک خاص خدا ہوتا تھا، جس کو رب البلد یعنی خدائے شہر کہتے تھے۔ ظاہر ہے لوگ اس کا احترام دوسرے خداؤں سے زیادہ کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے پیدائشی شہر ار کا بڑا خدا ننار تھا (چاند دیوتا) اسی وجہ سے بعض مورخین نے اس شہر کا نام قمرینہ بھی لکھا ہے۔ ننار کا بت شہر میں سب سے اونچی جگہ رکھا گیا تھا۔ جس کے ساتھ ہی اس کی بیوی (نن گل) کا معبد تھا۔ لوگ بتوں، مزاروں کے سامنے مراقبے کرتے، سجدہ ریز ہوتے اور طواف کرتے تھے۔

ننار کی شان شاہی محل سرا کی تھی۔ یہاں ہر وقت نئی عورتیں آکر ٹھہرتی۔ یہاں بہت سی عورتوں نے اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا۔ وہ عورت بڑی محترم سمجھی جاتی تھی جو اپنی چادر عفت کو یہاں قربان کر دیتی۔ اس مزار کے نام بہت سے رقبے وقف تھے جن کی آمدنی مجاور ہی استعمال کر سکتے تھے۔

اس شرک وخرافات کی یلغار اور بھرمار میں رب کریم کا فضل و کرم جوش میں آیا۔ اس نے شرک ورسومات کے مرکز میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو پیدا فرمایا۔ اس کی قدرت کا کرشمہ اور سنت قدیمہ ہے کہ جب بھی برائی حد سے بڑھنے لگتی ہے تو رب کبریا حق و باطل کا معرکہ برپا کرتا ہے۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا چہرہ مبارک

واقعہ معراج کا ذکر کرتے ہوئے نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ مجھے جبرائیل (علیہ السلام) ساتویں آسمان پر لے گئے۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بزرگ شخصیت بیت المعمور کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تشریف فرما ہے۔ جبرائیل (علیہ السلام) نے تعارف کرواتے ہوئے فرمایا۔

(هٰذَا اَبُوْكَ اِبْرَاهِيْمُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ) [مشکوٰۃ: باب فی المعراج]

”یہ آپ کے والد گرامی ابراہیم (علیہ السلام) ہیں آپ آگے بڑھ کر سلام عرض کریں چنانچہ میں نے سلام کیا۔“

جواباً حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے سلام کہتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

(قَالَ مَرْحَبًا لِاِبْنِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ) [مشکوٰۃ: باب فی المعراج]

”خوش آمدید (جی آیاں نوں) نیک بیٹا اور نبی صالح بھی۔“

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحابہ (رض) کا ذوق و شوق دیکھتے ہوئے مزید فرمایا کہ جس نے ابراہیم (علیہ السلام) کے رخ زیبا کا اندازہ لگانا ہو وہ مجھے دیکھ لے۔

(قَالَ أَمَّا إِبْرَاهِيمُ فَانْظُرُوا إِلَى صَاحِبِكُمْ) [رواہ البخاری: کتاب احادیث الانبیاء]

جیسا کہ ابھی ابھی ذکر کیا گیا ہے حضرت خلیل (علیہ السلام) کی قوم کے لوگ صنم پرستی کے ساتھ ساتھ ستارہ پرستی کے بھی قائل تھے۔ سیدنا ابراہیم (علیہ السلام) نے مناسب جانا کہ اب وقت آگیا ہے کہ معبودان ارضی کے ساتھ معبودان فلکی (چاند سورج، ستاروں) کی پرزور تردید کی جائے۔ لیکن اسلوب بیان ایسا اختیار فرمایا۔ کہ شرک کا مریض، یکایک بدک نہ جائے، کیونکہ مریض شرک بہت جلد باز اور ہلکی طبیعت کا واقع ہوا ہے۔ جب بھی اس کو محسوس ہو جائے کہ نسخہ توحید کے ساتھ میرا علاج ہونے والا ہے تو پہلے ہی بھاگنا اور منہ بسورنا شروع کر دیتا ہے۔

(وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ) [الزمر : ۴۵]

"جب ایک اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت کے منکروں کے دل کڑھنے لگتے ہیں۔ جب اس کے علاوہ دوسروں کا تذکرہ ہوتا ہے تو یکایک خوشی سے کھل جاتے ہیں۔"

حضرت خلیل (علیہ السلام) نے نہایت اچھے اور دلچسپ انداز میں توحید سمجھانے کی کوشش فرمائی۔ یہ انداز بیان ان کی زبردست معجزانہ فصاحت و بلاغت اور حکمت و دانائی کا مرقع ہے۔ جب شام ہوئی تو پردہ ظلمت سے ستارے درخشاں ہوئے تو اپنی قوم کا عقیدہ نقل کرتے ہوئے فرمایا۔ یہ میرا رب ہے۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد چمکتا ہوا ستارہ ڈوب گیا۔ فرمایا ڈوبنے والا رب نہیں ہو سکتا۔ پھر چاند نمودار ہوا، فرمایا یہ ہے میرا رب، لیکن چاند بھی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ صبح ہوئی اور مہر جہاں روشن ہوا، فرمایا یہ میرا رب ہے یہ ان سب سے بڑا ہے، لیکن سورج کو دوام اور روشنی کو بھی قرار نہیں۔ پہلے بڑھ رہی تھی، دوپہر کے بعد ڈھلنے لگی شام کو سورج غروب ہو گیا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پکار اٹھے یہ سب محکوم و مجبور اور بے بس ہیں ان کو لانے اور لے جانے والا حقیقی مالک اللہ ہی عبادت کے لائق ہے۔ اب ان کا مکالمہ قرآن کے الفاظ میں سنیے !

"اس طرح ابراہیم (علیہ السلام) کو ہم نے زمین وآسمان کا نظام حکومت دکھایا تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں ہو جائے۔ چنانچہ جب رات چھا گئی، تو اس نے ایک تارا دیکھا کہا یہ میرا رب ہے۔ لیکن جب وہ تارا ڈوب گیا تو کہنے لگے میں ڈوبنے والے کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ جب چمکتے ہوئے چاند کی طرف دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے۔ جب وہ بھی ڈوب گیا تو فرمایا۔ اگر میرا رب مجھے ہدایت سے نہ نوازتا تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہوتا۔ پھر سورج کو چمکتا ہوا دیکھا تو فرمایا یہ میرا رب ہے۔ اور یہ ان سب سے بڑا ہے۔ مگر جب وہ بھی غروب ہو گیا تو فرمایا اے برادران قوم میں بری ہوں، ان سے جن کو تم شریک بناتے ہو۔ میں نے تو اپنا چہرہ اس ہستی کی طرف کر لیا ہے، جس نے زمین وآسمان کو پیدا فرمایا اور میں مشرکوں کا ساتھی نہیں ہوں۔ اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی۔ فرمایا کیا اللہ تعالیٰ کے بارے میں میرے ساتھ جھگڑتے ہو۔ حالانکہ اس نے مجھے صراط مستقیم دکھائی، میں تمہارے بنائے ہوئے معبودان باطل سے نہیں ڈرتا، ہاں اگر میرا رب میرا نقصان چاہے تو ضرور نقصان ہو جائے گا۔ میرے رب کا علم ہر چیز پر محیط ہے کیا اب بھی تم نصیحت حاصل نہیں کرو گے ؟ آخر تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے کیوں ڈروں ؟ اللہ نے تم پر کوئی دلیل نہیں اتاری۔ ہم دونوں فریقوں میں کون امن و سلامتی کا حق دار ہے۔ بتاؤ اگر کچھ علم رکھتے ہو۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ ابراہیم (علیہ السلام) کے ایمان کا تدریجی عمل تھا، حالانکہ اس خطاب کے سیاق و سباق سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ نہ ابراہیم (علیہ السلام) کے ایمان کا تدریجی عمل تھا اور نہ ہی ایک لمحہ کے لیے ان کو معبود تصور کرتے تھے۔ کیونکہ قرآن مجید واقعہ کے آخر میں واشگاف الفاظ میں اعلان کرتا ہے۔

کہ ہم نے ابراہیم کو ان کی قوم کے خلاف دلائل دیے۔ ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کرتے ہیں یقیناً تیرا رب حکیم و علیم ہے۔

(وَلَقَدْ اٰتَیْنَآ اِبْرٰهِیْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِیْنَ)[الانبیاء: ۵۱]

"ہم نے ابراہیم کو ابتداء ہی سے ہدایت سے نوازا تھا اور ہم اس کو خوب جاننے والے تھے۔"

ارشاد الٰہی سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) کو ابتدا سے ہی رشد و ہدایت حاصل ہو چکی تھی، بقول بعض مفسرین، اگر پھر بھی وہ ستارے اور چاند سورج ہی کو معبود تصور کر رہے تھے تو وہ ہدایت کیا تھی جو پہلے سے اللہ تعالیٰ نے عطا فرما رکھی تھی۔

چاند، سورج کی حیثیت

(وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ لَا الشَّمْسُ يَنبَغِي لَهَا أَن تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ)[یٰس: ۳۹-۴۰]

"سورج اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے۔ جو زبردست علیم ہستی کا مقرر کیا ہوا ہے۔ اور چاند کے لیے بھی ہم نے منزلیں مقرر کر رکھی ہیں، یہاں تک کہ ان منزلوں سے گزرتا ہوا بالآخر وہ کھجور کی سوکھی ہوئی ٹہنی کی مانند پتلا ہو جاتا ہے نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو پکڑے اور نہ رات دن سے آگے نکل سکتی ہے ہر ایک اس فضا میں تیر رہا ہے۔ (یٰسین: ۳۸ تا ۴۰)

(قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِن جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُم بِ تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ أَفَلَا تَسْمَعُونَ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِن جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُم بِلَيْلٍ تَسْكُنُونَ فِيهِ أَفَلَا تُبْصِرُونَ)[القصص: ۷۱، ۷۲]

"آپ فرمادیں کیا تم نے غور نہیں کیا اگر اللہ تعالیٰ قیامت تک تم پر رات کو لمبا کر دے۔ کون ہے جو اللہ کے سوا رات کو بدل کر دن کی روشنی لے آئے؟ کیا تم سنتے نہیں ہو؟ آپ اعلان کر دیں! غور کرو اگر اللہ تعالیٰ قیامت تک تم پر دن چڑھائے رکھے کون ہے جو اس کے بغیر دن کو رات میں بدل دے، جس میں تم آرام کرتے ہو؟ کیا پھر بھی تم نہیں دیکھتے؟"

(وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ) (حٰم السجدۃ: ۳۷)

"رات اور دن، سورج اور چاند اللہ کی نشانیاں ہیں۔ سورج چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اس ذات کبریاء کو سجدہ کرو جس نے ان کو پیدا کیا ہے اگر واقعتاً تم اسی کی عبادت کرنے والے ہو۔" (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

یہاں لِاَبِيْهِ اٰزَرَ سے عرفی باپ مراد ہے کیونکہ آزر ابراہیم (علیہ السلام) کا باپ نہیں بلکہ چچا تھا اور اسی نے آپ کو پالا تھا۔ اس لئے اسے آپ کا باپ ہی کہا گیا ہے اور عربی میں چچا کو بلکہ ہر بزرگ شخص کو اب (باپ) کہہ دیا جاتا ہے آج بھی اہل مکہ و مدینہ کو ہم نے دیکھا ہے کہ بزرگوں کو ابوی (میرا باپ) کہتے رہتے ہیں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اسی معنی (sence) میں آذر کو اب کہا، اس کی دلیل یہ ہے کہ جب آذر آتش نمرود میں جھلس کر حالت کفر میں مر گیا تو ابراہیم علیہ السلام نے اس کے لئے استغفار ختم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۔ جب آپ پر واضح ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو آپ اس سے بیزار ہو گئے ” (توبہ : 114) کیونکہ کافر کے لئے استغفار جائز نہیں ہے۔

جبکہ آپ نے آخری عمر میں تعمیر کعبہ کے بعد دعا فرمائی ۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ ۔ اے اللہ میری اور میرے والدین کی بخشش فرما۔ (ابراہیم : 41) اب والد اور والدہ سگے ماں باپ ہی کو کہا جاتا ہے۔ دوسرے بزرگوں کے لیے یہ الفاظ نہیں کہے جا سکتے۔ معلوم ہوا آپ کے سگے والدین مشرک نہ تھے ورنہ آپ ان کے لئے اپنی آخری عمر میں بخشش نہ مانگتے۔

یہی تحقیق انیق علامہ جلال الدین سیوطی (رح) کی ہے دیکھیں الحاوی للفتاویٰ جلد 2 صفحہ 215 ۔ اور یہی علامہ محمود آلوسی بغدادی کی گہری تحقیق کا خلاصہ ہے۔ دیکھیں روح المعانی جلد 7 صفحہ 195 مطبوعات دار احیاء التراث العربی۔ اور یہی کچھ شیخ محقق شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کی تحقیقات کا لب لباب ہے۔ دیکھیں اشعۃ اللمعات جلد 4 صفحہ 368 ۔ اور آج تورات میں بھی ابراہیم (علیہ السلام) کے والد کا نام تارخ ہی لکھا ہے دیکھیں بائبل عہد نامہ قدیم کتاب پیدائش باب 11 صفحہ 26 صفحہ 13 مطبوعہ بائبل سوسائٹی پرانی انارکلی لاہور۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اس گفتگو سے معلوم ہوا کافر کا نبی سے رشتہ داری کام نہیں آئے گی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ دین کے لیے خاندان سے بھی ٹکر لی جا سکتی ہے۔ یعنی خاندان کو دین پر قربان کیا جا سکتا ہے دین کو خاندان پر نہیں۔

(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : اور (یاد کیجئے) جب ابراہیم نے اپنے (عرفی) باپ آزر سے کہا کیا تم بتوں کو معبود قرار دیتے ہو ؟ بیشک میں تمہیں اور تمہاری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا دیکھتا ہوں۔ (الانعام : ۷۴)

آیات سابقہ سے مناسبت

اس سے پہلے آیت ۷۱ ' میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا : آپ کہیے کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر ان کی پرستش کریں جو ہم کو نہ نفع دے سکتے ہیں ' نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں تو اس آیت میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کی قوم کا ذکر کیا۔ ان کی قوم بھی بت پرستی کرتی تھی اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) ان کو بت پرستی سے منع کرتے تھے۔ سو اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ ہمارے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کفار مکہ کو بت پرستی سے منع کرنا ' ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ کے جد محترم سیدنا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اپنی قوم کو بت پرستی سے منع کرتے تھے ' اور اس میں یہ تنبیہ ہے کہ اپنے نیک آباء واجداد کی پیروی کرنی چاہیے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے آزر اور اپنی قوم کے ساتھ بت پرستی کے ابطال اور توحید کے احقاق پر جو مناظرہ کیا ' اس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ' تاکہ اس سے مشرکین عرب کے خلاف استدلال کیا جائے ' کیونکہ تمام مذاہب اور ادیان کے ماننے والے ان کی فضیلت اور بزرگی کا اعتراف کرتے تھے ' اور سب ان کی ملت کی طرف انتساب کے دعوی دار تھے۔ یہود و نصاری ان کی ملت کی اتباع کے مدعی تھے ' اور مشرکین عرب اپنے آپ کو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد کہتے تھے۔ اس لیے ان کی شخصیت اور سیرت سب پر حجت تھی۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا نام ‘ نسب اور تاریخ پیدائش

امام ابوالقاسم علی بن الحسن ابن العساکر متوفی ۵۷۱ ھ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا نسب اس طرح لکھا ہے :
ابراہیم بن آزر اور وہ تارخ ہیں بن ناحور بن شاروغ بن ارغو بن فالع بن عابر شالخ بن ارفخشذ بن سام بن نو بن لمک بن متوشلخ بن خنوخ اور وہ ادریس ہیں ‘ بن یارد بن مھلائیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم۔
حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن ہیں ‘ اور آپ کی کنیت ابوالضیفان ہے۔ صحیح یہ ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) عراق کے شہر بابل کے موضع کوثی میں پیدا ہوئے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ آزر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے باپ نہیں تھے ‘ صحیح وہ ہے جو ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے وہ ابراہیم بن آزر ہیں اور توراۃ میں ہے وہ ابراہیم بن تارخ ہیں۔ (مختصر تاریخ دمشق ج ۳ ص ‘ ۳۴۴ مطبوعہ دارالفکر ‘ دمشق ‘ ۱۴۰۴ ھ)
اس میں اختلاف ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے والد آزر تھے یا تارخ ؟ ہماری تحقیق یہ ہے کہ آپ کے والد تارخ تھے جیسا کہ انشاء اللہ ہم عنقریب بیان کریں گے۔
محمد بن عمر واقدی بیان کرتے ہیں کہ حضرت نوح (علیہ السلام) اور حضرت آدم (علیہ السلام) کے درمیان دس صدیاں ہیں اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور حضرت نوح (علیہ السلام) کے درمیان دس صدیاں ہیں۔ پس حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن حضرت آدم (علیہ السلام) کی پیدائش کے دو ہزار سال بعد پیدا ہوئے ‘ ایوب بن عتبہ قاضی یمامہ بیان کرتے ہیں :
حضرت آدم (علیہ السلام) اور حضرت نوح (علیہ السلام) کے درمیان دس آباء تھے اور یہ ایک ہزار سال کا عرصہ ہے اور حضرت نوح (علیہ السلام) اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے درمیان دس آباء تھے اور یہ بھی ایک ہزار سال کا عرصہ ہے اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے درمیان سات آباء ہیں اور ان کے سال معلوم نہیں اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے درمیان ایک ہزار پانچ سو سال ہیں اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے درمیان چھ سو سال کا عرصہ ہے اور یہ زمانہ فترت ہے۔ (مختصر تاریخ دمشق ج ۳ ص ‘ ۳۴۹۔ ۳۴۸ مطبوعہ دارالفکر ‘ دمشق ‘ ۱۴۰۴ ھ)
علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ ھ لکھتے ہیں :
حضرت ابراہیم (علیہ السلام) ‘ حضرت آدم (علیہ السلام) کی پیدائش کے تین ہزار تین سو سینتیس (۳۳۳۷) سال بعد پیدا ہوئے ‘ اس وقت طوفان نوح کو بارہ سو تریسٹھ (۱۲۶۳) سال گزر چکے تھے۔ زیادہ صحیح یہ ہے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) دو سو سال کی عمر گزار کر فوت ہوئے۔ کلبی نے کہا ایک سو پچھتّر (۱۷۵) سال کی عمر تھی اور مقاتل نے کہا ایک سو نوے (۱۹۰) سال کی عمر تھی۔ آپ حبرون میں مقام غارہ پر مدفون ہیں۔ وہ جگہ اب مدینۃ الخلیل کے نام سے مشہور ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۵ ص ‘ ۲۴۰ مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ ‘ مصر ۱۳۴۸ ھ)

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی زندگی کے اہم واقعات

حضرت ابراہیم خلیل اللہ (علیہ السلام) نے متعدد بار توحید کو ثابت کیا اور مشرکین کے قول کو دلائل سے باطل کیا۔ انھوں نے اپنے عرفی باپ سے مناظرہ کیا ' اپنی قوم سے ' بادشاہ وقت سے اور کافروں سے مناظرہ کیا اور راہ حق میں سرخرو ہوئے۔ عرفی باپ سے مناظرہ کی یہ مثال ہے :-

(آیت) "اذقال لابیہ یابت لم تعبد مالا یسمع ولا یبصر ولا یغنی عنك شیئا"۔ (مریم : ۴۲)

ترجمہ : جب ابراہیم نے اپنے (عرفی) باپ سے کہا اے میرے باپ تم کیوں ایسے کی پرستش کرتے ہو جو نہ سنتا ہے ' نہ دیکھتا ہے اور میں تمہارے کسی کام آسکتا ہے۔

اور اپنی قوم سے مناظرہ کی یہ مثال ہے

(آیت) "فلما را الشمس بازغۃ قال ھذا ربی ھذا اکبر فلما افلت قال یقوم انی بری مما تشرکون"۔ (الانعام : ۷۸)

ترجمہ : پھر جب انھوں نے روشن آفتاب دیکھا تو کہا ' یہ میرا رب ہے ؟ یہ (ان سب سے) بڑا ہے ' پھر جب وہ غروب ہو گیا تو انھوں نے کہا اے میری قوم ! میں ان سب سے بیزار ہوں جن کو تم اللہ کا شریک قرار دیتے ہو۔

اور بادشاہ وقت سے مناظرہ کی یہ مثال ہے :

(آیت) "اذقال ابراھیم ربی الذی یحی ویمیت قال انا احی وامیت قال ابراھیم فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بھا من المغرب فبھت الذی کفر"۔ (البقرہ : ۲۵۸)

ترجمہ : جب ابراہیم نے کہا میرا رب زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اس (بادشاہ) نے کہا میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں ' ابراہیم نے کہا بیشک اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اس کو مغرب سے نکال تو اس پر وہ کافر ہکا بکا رہ گیا۔

اور کافروں سے مناظرہ کی یہ مثال ہے :

(آیت) "فجعلھم جذاذا الا کبیرا لھم لعلھم الیہ یرجعون"۔ (الانبیاء : ۵۸)

ترجمہ : پس (ابراہیم نے) بڑے بت کے سوا سب بتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تاکہ وہ ان کی طرف رجوع کریں۔

اور جب کافران کو دلائل سے جواب دینے سے عاجز آ گئے تو انھوں نے کہا ان کو جلا ڈالو اور اپنے بتوں کی مدد کرو ' حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو آگ میں ڈال دیا گیا اور اللہ نے اس آگ کو سلامتی کے ساتھ ٹھنڈا کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیا گیا انھوں نے اپنا دل عرفان الہی کے لیے ' زبان توحید پر برھان کے لیے اور اپنے بدن کو اللہ کی راہ میں آگ میں جھونکنے کے لیے اور اپنے بیٹے کو قربانی کے لیے اور اپنے مال کو مہمانوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔

آزر کے متعلق مفسرین کے مختلف اقوال

علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی بن محمد جوزی حنبلی متوفی ۵۹۷ ھ نے آزر کے متعلق چار قول لکھے ہیں :

(۱) حضرت ابن عباس (رض) ‘ حسن ‘ سدی اور ابن اسحاق نے کہا کہ آزر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے والد کا نام ہے۔

(۲) مجاہد نے کہا آزر بت کا نام ہے اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے والد کا نام تارخ ہے۔

(۳) زجاج نے کہا کہ آزر نام نہیں ہے ‘ بلکہ مذمت کا کلمہ ‘ گویا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا اے خطاکار ! تو بتوں کو معبود قرار دے رہا ہے۔

(۴) مقاتل بن حیان نے کہا کہ آزر حضرت ابراہیم کے باپ کا نام نہیں ہے ‘ یہ ان کا لقب ہے : (زادالمیسر ج ۳ ‘ ص ۷۶۔ ۷۵ ‘ مطبوعہ مکتب اسلامی ‘ بیروت ‘ ۱۴۰۷ ھ)

اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے والد کا نام آزر ہے یا تارخ ہے۔ دراصل یہ اختلاف ایک اور اختلاف پر مبنی ہے اور وہ یہ ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) کے والدین کا کافر ہونا جائز ہے یا نہیں۔ امام ابن جریر ‘ امام رازی ‘ علامہ قرطبی ‘ اور علامہ ابوالحیان وغیرہم کی رائے ہے کہ ان کے والدین کا کافر ہونا جائز ہے ‘ اور متاخرین میں سے علامہ نیشاپوری ‘ علامہ سیوطی اور علامہ آلوسی ‘ کی تحقیق یہ ہے کہ انبیاء کرام (علیہم السلام) کے آباء کرام مومن تھے اور ہمارے نبی کریم سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سلسلہ نسب میں تمام آباء اور امہات مومن تھے۔ اب ہم وہ روایات ذکر کریں گے جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے والد کا نام تارخ تھا اور آزر آپ کا چچا تھا ‘ اور عرب محاورات میں چچا پر باپ کا اطلاق ہوتا رہتا ہے۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا باپ تارخ تھا نہ کہ آزر !

امام ابواسحاق زجاج متوفی ۳۱۱ ھ لکھتے ہیں :

نسب بیان کرنے والوں کے درمیان اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے والد کا نام تارخ تھا ‘ اور قرآن اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کا نام آزر تھا۔ (معانی القرآن واعرابہ للزجاج ‘ ج ۲ ‘ ص ۲۶۵)

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ مجاہد نے کہا کہ آزر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے باپ کا نام نہیں ہے ‘ وہ بت کا نام ہے۔ (جامع البیان ‘ جز ۷ ص ۳۱۶ ‘ مطبوعہ دارالفکر ‘ بیروت ۱۴۱۵ ھ)

امام ابو عبدالرحمٰن بن ادریس رازی بن حاتم متوفی ۳۲۷ ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں :

ضحاک حضرت ابن عباس (رض) سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے باپ کا نام آزر نہیں تھا ‘ ان کے باپ کا نام تارخ تھا۔

مجاہد بیان کرتے ہیں کہ آزر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا باپ نہیں تھا۔

ضحاک بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس (رض) نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے آزر سے کہا کیا تم اللہ کو چھوڑ کر بتوں سے مدد مانگتے ہو ایسا نہ کرو اور حضرت ابن عباس فرماتے تھے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے والد کا نام آزر نہیں تھا ' ان کے باپ کا نام تارخ تھا۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ' ج ۴ ' ص ۱۳۲۵ ' مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ مکہ مکرمہ ' ۱۴۱۷ ھ)

خاتم الحفاظ حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ ھ لکھتے ہیں :

امام ابن ابی حاتم اور امام ابوالشیخ نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ آزر بت ہے اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا باپ نہیں ہے ' وہ ابراہیم بن تارخ بن ناحور بن شاروغ بن عابر بن فالع ہیں۔

قرآن مجید میں آزر کے اوپر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے اب (باپ) کا اطلاق کیا گیا ہے۔ اس کی یہ توجیہ کی گئی ہے کہ عرب میں "اب" کا اطلاق عم پر بہ کثرت کیا جاتا ہے ' اگرچہ یہ مجاز ہے۔ قرآن مجید میں ہے ؛

(آیت) " ام کنتم شھدآء اذ حضر یعقوب الموت اذ قال لبنیہ ما تعبدون من بعدی قالوا نعبد الھک والہ ابائک ابرھیم واسمعیل واسحق "۔ (البقرہ : ۱۳۳)

ترجمہ : کیا تم (اس وقت) حاضر تھے جب یعقوب کو موت آئی جب انھوں نے اپنے بیٹوں سے فرمایا تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے ' انھوں نے کہا ہم آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیم ' اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کریں گے۔

اس آیت میں حضرت اسماعیل پر باپ کا اطلاق کیا گیا ہے ' حالانکہ وہ حضرت یعقوب کے باپ نہیں ' بلکہ چچا ہیں اور امام ابوالعالیہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا کہ اس آیت میں چچا پر باپ کا اطلاق کیا گیا ہے اور انھوں نے محمد بن کعب قرظی سے روایت کیا ہے کہ ماموں والد ہے اور چچا والد ہے اور اس آیت کی تلاوت کی۔ (الحاوی للفتاوی ' ج ۲ ' ص ۲۱۴ ' مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ لائل پور ' پاکستان)

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے والد کے مومن ہونے پر دلیل

امام ابن المنذر نے اپنی تفسیر میں سند صحیح کے ساتھ حضرت سلیمان بن صرد سے روایت کیا ہے کہ جب کفار نے حضرت ابرہیم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو آگ میں ڈالنے کا ارادہ کیا وہ لکڑیاں جمع کرنے لگے ' حتی کہ ایک بوڑھی عورت بھی لکڑیاں جمع کرنے لگی۔

جب وہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو آگ میں ڈالنے لگے تو آپ نے کہا (آیت) "۔ حسبی اللہ ونعم الوکیل "۔ اور جب انھوں نے آپ کو آگ میں ڈال دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

(آیت) "ینار کونی بردا وسلاما علی ابراھیم "۔ (الانبیاء : ٦٩)

ترجمہ : اے آگ تو ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے چچا نے کہا میری وجہ سے ان سے عذاب دور کیا گیا ہے ' تب اللہ تعالیٰ نے آگ کی ایک چنگاری بھیجی جو اس کے پیر پر لگی اور اس کو جلا دیا۔

اس اثر میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ آزر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا چچا تھا اور اس اثر سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آزر اس وقت میں ہلاک کیا گیا تھا جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو آگ میں ڈالا گیا تھا اور اللہ سبحانہ نے قرآن مجید میں یہ خبر دی ہے کہ جب حضرت ابراہیم (علیہ
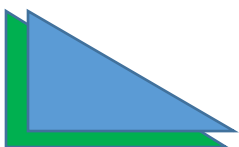
السلام) کو یہ معلوم ہوگیا کہ آزر اللہ کا دشمن ہے تو انھوں نے اس کے لیے استغفار کرنا ترک کر گیا 'اور احادیث میں آیا ہے کہ جب وہ حالت شرک میں مر گیا تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو دشمن خدا ہونا معلوم ہوگیا اور انھوں نے پھر اس کے لیے استغفار نہیں کیا۔

امام ابن ابی حاتم نے سند صحیح کے ساتھ حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اپنے (عرفی) باپ کے لیے مسلسل استغفار کرتے رہے اور جب وہ مر گیا تو ان کو معلوم ہوگیا کہ یہ اللہ کا دشمن ہے۔ پھر انھوں نے اس کے لیے استغفار نہیں کیا اور انھوں نے محمد بن کعب 'قتادہ 'مجاہد اور حسن وغیرہم سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اس کی حیات میں اس کے ایمان کی امید رکھتے تھے اور جب وہ شرک پر مر گیا تو وہ اس سے بیزار ہوگئے۔ پھر آگ میں ڈالے جانے کے واقعہ کے بعد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے شام کی طرف ہجرت کی 'جیسا کہ قرآن مجید نے اس کی تصریح کی ہے 'پھر ہجرت کے کافی عرصہ بعد وہ مصر میں داخل ہوئے اور وہاں حضرت سارہ کے سبب سے ظالم بادشاہ کے ساتھ ان کا واقعہ پیش آیا اور انجام کار حضرت ہاجرہ آپ کی باندی بنادی گئیں اس کے بعد پھر شام کی طرف لوٹ گئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ حضرت ہاجرہ اور اس کے بیٹے حضرت اسماعیل کو مکہ میں منتقل کردیں اور وہاں آپ نے یہ دعا کی:

(آیت) "ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتك المحرم ربنا لیقیموا الصلوۃ فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم وارزقھم من الثمرات لعلھم یشکرون، ربنا انك تعلم ما نخفی وما نعلن وما یخفی علی اللہ من شیء فی الارض ولا فی السماء، الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر اسماعیل واسحق ان ربی لسمیع الدعاء، رب اجعلنی مقیم الصلوۃ ومن ذریتی ربنا وتقبل دعاء، ربنا اغفر لی ولوالدی وللمؤمنین یوم یقوم الحساب، (ابراہیم: ۴۱۔۳۷)

ترجمہ: اے ہمارے رب 'بیشک میں نے اپنی بعض اولاد کو بے آب وگیاہ وادی میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس ٹھہرایا ہے 'اے ہمارے رب! تاکہ وہ نماز قائم کریں 'سو تم کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کردے اور ان کو بعض پھل عطا فرماتا کہ وہ شکر ادا کریں 'اے ہمارے رب! بیشک تو جانتا ہے جس کو ہم چھپاتے ہیں اور جس کو ہم ظاہر کرتے ہیں اور آسمان اور زمین میں سے کوئی چیز اللہ پر مخفی نہیں ہے سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں 'جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے 'بیشک میرا رب ضرور میری دعا سننے والا ہے 'اے میرے رب! مجھے نماز قائم کرنے والا رکھ اور میری اولاد (سے) بھی 'اے ہمارے رب! مجھے اور میرے والدین کو بخش دے اور سب ایمان والوں کو جس دن حساب قائم ہوگا۔

اس آیت میں یہ تصریح ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے چچا آزر کے فوت ہونے کے طویل عرصہ بعد اپنے والدین کی مغفرت کے لیے دعا کی۔ اس سے یہ واضح ہوگیا کہ قرآن مجید میں جس شخص کے کفر اور اس سے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے بیزار ہونے کا ذکر ہے وہ ان کے چچا تھے نہ کہ ان کے حقیقی والد۔

امام محمد بن سعد نے الطبقات میں کلبی سے روایت کیا ہے کہ جس وقت حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے بابل سے شام کی طرف ہجرت کی تو ان کی عمر سینتیس (۳۷) سال تھی 'پھر انھوں نے کچھ عرصہ حران میں قیام کیا 'پھر کچھ عرصہ اردن میں قیام کیا پھر وہاں سے مصر چلے گئے اور کچھ عرصہ وہاں قیام کیا 'پھر وہاں سے شام کی طرف لوٹ گئے اور ایلیا اور فلسطین کے درمیان قیام کیا۔ پھر وہاں کے لوگوں نے آپ کو ستایا تو آپ رملہ اور ایلیا کے درمیان چلے گئے اور امام ابن سعد نے واقدی سے روایت کیا ہے کہ نوے سال کی عمر میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام)

کے ہاں حضرت اسماعیل (علیہ السلام) پیدا ہوئے اور ان دونوں اثروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آگ میں ڈالے جانے والے واقعہ کے بعد جب آپ نے بابل سے ہجرت کی تھی اور مکہ مکرمہ میں جو آپ نے دعا کی تھی ان کے درمیان پچاس اور کچھ سال کا عرصہ ہے۔ (الحاوی للفتاوی 'ج ۱ 'ص ۲۱۵۔ ۲۱۴ 'مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ فیصل آباد)

خلاصہ یہ ہے کہ آزر کے مرنے کے پچاس سے زیادہ سال کے بعد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے والدین کی مغفرت کے لیے دعا کی ہے اور جب کہ آزر سے وہ بیزار ہو چکے تھے اور اس کے لیے دعا کو ترک کر چکے تھے تو اس سے یہ ظاہر ہوا کہ آزر اور شخص تھا اور ان کے والد اور شخص تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے ان کے چچا آزر کو اب (عرفی باپ) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور ان کے حقیقی باپ کو والد کے لفظ سے تعبیر کیا ہے 'تاکہ تغییر عنوان تغییر معنون پر دلالت کرے۔ ہم نے علامہ سیوطی کے جس استدلال کو تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے 'علامہ آلوسی نے بھی اس کا خلاصہ ذکر کیا ہے۔ (روح المعانی 'جزء ۷ 'ص ۱۹۵ 'طبع بیروت)

قیامت کے دن آزر کو باپ کہنے کی توجیہ

اس سلسلہ میں اس حدیث سے بھی اعتراض کیا جاتا ہے:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اپنے (عرفی) باپ آزر سے قیامت کے دن ملاقات ہوگی اور آزر کے چہرے پر دھواں اور گردوغبار ہوگا۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اس سے فرمائیں گے کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم میری نافرمانی نہ کرنا؟ ان کے (عرفی) باپ کہیں گے آج میں آپ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) فرمائیں گے 'اے میرے رب تو نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا کہ تو قیامت کے دن مجھ کو شرمندہ نہیں کرے گا اور اس سے بڑی اور کیا شرمندگی ہوگی کہ میرا (عرفی) باپ رحمت سے دور ہو، اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے جنت کافروں پر حرام کردی ہے 'پھر کہا جائے گا اے ابراہیم! تمہارے پیروں کے نیچے کیا ہے؟ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) دیکھیں گے تو وہ گندگی میں لتھڑا ہوا ایک بجو ہوگا۔ اور اس کو ٹانگوں سے پکڑ کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ (صحیح البخاری 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ۳۳۵۰ 'سنن کبری للنسائی 'ج ٦ 'رقم الحدیث: ۱۱۳۷۵ ' المستدرک 'ج ۲ 'ص ۳۳۸ 'کنز العمال 'ج ۱۱ 'رقم الحدیث: ۳۲۲۹۲ 'مشکوۃ المصابیح 'ج ۳ 'رقم الحدیث: ۵۵۳۸)

حافظ عماد الدین ابن کثیر شافعی متوفی ۷۷۴ ھ لکھتے ہیں:

یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے باپ کا نام آزر ہے اور جمہور اہل نسب 'بہ شمول حضرت ابن عباس (رض) سب اس پر متفق ہیں کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے باپ کا نام تارخ ہے اور اہل کتاب تارح کہتے ہیں (البدایہ والنہایہ 'ج ۱ 'ص ۱۴۲ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت '۱۹۷۴ء)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

بعض علماء رحمہم اللہ اس بات کے قائل ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تمام آباء کرام شرک اور کفر کی آلودگی سے پاک اور منزہ ہیں۔ ان کے نزدیک آزر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے چچا ہیں' ان کو مجازا باپ کہا گیا ہے اور ان کے باپ کا نام تارخ ہے اسی وجہ سے مطلقاً نہیں فرمایا کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اپنے باپ سے ملاقات ہوگی' تاکہ ان کے حقیقی والد کی طرف ذہن متوجہ نہ ہو' اور ان کے والد کے ساتھ آزر کا ذکر کیا' تاکہ معلوم ہو کہ یہاں مجازی باپ مراد ہے۔ (اشعۃ اللمعات' ج ۴' ص ۳۶۸' مطبوعہ مطبع تیج کمار' لکھنؤ)

شیخ محمد ادریس کاندھلوی متوفی ۱۳۹۴ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

تحقیق یہ ہے کہ آزر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا چچا تھا' اس کو مجاز متعارف کے طور پر باپ کہا گیا ہے اور آپ کے باپ کا نام تارخ ہے۔ بعض محققین علماء جنہوں نے آدم (علیہ السلام) سے لے کر ہمارے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تمام آباء سے کفر کی نفی کی ہے ان کی یہی تحقیق ہے۔ اس بناء پر اس حدیث میں آزر کا ذکر اس لیے ہے کہ اگر یوں کہا جاتا کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اپنے باپ سے ملاقات ہوگی' تو اس سے ان کے حقیقی والد کی طرف ذہن چلا جاتا' اور جب آزر کی قید لگائی تو ان کے حقیقی والد کی طرف ذہن نہیں جائے گا۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے اس چچا پر باپ کا اطلاق اس لیے کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا اختلاط اور ان کی الفت اپنے اس چچا کے ساتھ بہت زیادہ تھی اور مشرکین کا رئیس تھا اور اسی کے ساتھ ان کا مناظرہ ہوا تھا۔ (التعلیق الصبیح' ج ۶' ص ۳۰۱' مطبوعہ مکتبہ نعمانیہ' لاہور)

اس حدیث پر دوسرا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) زندگی میں آزر کے دشمن خدا ہونے کی وجہ سے اس سے بیزار ہو گئے تھے' تو پھر قیامت کے دن اس کی سفارش کیوں کی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) آزر کے لیے نجات کی دعا کرنے سے بیزار ہو گئے تھے اور قیامت کے دن انھوں نے اس کی نجات کے لیے سفارش نہیں کی' بلکہ اس کے عذاب میں تخفیف کے لیے سفارش کی تھی اور بعض خصوصیات کی بنا پر کفار کے عذاب میں تخفیف کر دی جاتی ہے۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تمام آباء کرام کے مومن ہونے پر دلیل

ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سلسلہ نسب میں تمام آباء کرام مومن تھے اس پر دلیل یہ ہے کہ احادیث صحیحہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر حضرت عبداللہ تک نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تمام آباء کرام اپنے اپنے زمانوں میں سب سے خیر (بہتر) اور سب سے افضل تھے' اور قرآن مجید میں یہ تصریح ہے:

(آیت) "**ولعبد مومن خیر من مشرك ولو اعجبكم**"۔ (البقرہ: ۲۲۱)

ترجمہ: اور بیشک مومن غلام' مشرک (آزاد) سے بہتر ہے خواہ وہ تمہیں اچھا لگے۔

اور جب مومن مشرک سے بہتر اور افضل ہے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آباء کرام اپنے اپنے زمانہ میں سب سے بہتر اور افضل تھے تو ضروری ہوا کہ وہ مومن ہوں۔ نیز احادیث اور آثار اس پر دلالت کرتے ہیں کہ حضرت آدم (علیہ السلام) یا حضرت نوح (علیہ السلام) کے بعد سے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت تک' بلکہ قیامت تک روئے زمین پر کچھ ایسے لوگ رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی

توحید پر قائم رہے اور اس کی عبادت کرتے رہے اور ان ہی کی وجہ سے زمین محفوظ رہی ' ورنہ زمین اور زمین والے ہلاک ہوجاتے ' اور ان مقدمات سے قطعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آباء میں کوئی مشرک نہیں تھا۔ کیونکہ زمین کبھی مومنین اور مشرکین سے خالی نہیں رہی اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آباء اپنے اپنے دور میں سب سے بہتر اور افضل تھے اور مومن مشرک سے بہتر اور افضل ہوتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوگیا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تمام آباء کرام مومن تھے ' پہلے ہم اس امر پر دلائل پیش کریں گے کہ زمین کبھی مومنین اور موحدین سے خالی نہیں رہی اور پھر اس امر پر دلائل پیش کریں گے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر حضرت عبداللہ تک نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تمام آباء کرام اپنے اپنے زمانوں میں سب لوگوں سے بہتر اور افضل تھے۔

موحدین اور عابدین سے زمین کبھی خالی نہیں رہی

خاتم الحفاظ حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ ھ لکھتے ہیں:

امام عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں از معمر ' از ابن جریج ' از ابن المسیب روایت کیا ہے ' روئے زمین پر ہمیشہ قیامت تک کم از کم سات مسلمان رہے ہیں اور اگر وہ نہ ہوتے تو زمین اور زمین والے ہلاک ہوجاتے۔

امام بخاری اور مسلم کی شرط کے مطابق یہ حدیث صحیح ہے اور ہرچند کہ یہ حضرت علی (رض) کا قول ہے ' لیکن اس قسم کی بات رائے سے نہیں کہی جاسکتی پس یہ حدیث حکما مرفوع ہے۔ امام ابن المنذر نے اس حدیث کو امام عبدالرزاق کی سند سے اپنی تفسیر میں درج کیا ہے۔ امام ابن جریر نے اپنی تفسیر میں شہر بن حوشب سے روایت کیا ہے۔ انھوں نے زمین میں ہمیشہ چودہ ایسے نفوس رہے جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ زمین والوں سے عذاب دور کرتا تھا اور ان کی برکت زمین میں پہنچاتا تھا ' ماسوا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے زمانہ کے ' کیونکہ وہ اپنے زمانہ میں صرف ایک تھے۔

امام ابن المنذر نے قتادہ سے اپنی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ ہمیشہ زمین میں اللہ کے اولیاء رہے ہیں ' جب سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو زمین پر اتارا ہے ' کبھی زمین ابلیس کے لیے خالی نہیں رہی ' اس میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء رہے ہیں ' جو اس کی اطاعت کرتے رہے ہیں۔

حافظ ابو عمرو ابن عبدالبر از قاسم ' از امام مالک روایت کرتے ہیں کہ مجھے یہ حدیث پہنچی ہے کہ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا جب تک زمین میں شیطان کا ولی ہے ' تو زمین میں اللہ کا ولی بھی ہے۔

امام احمد بن حنبل نے کتاب الزہد میں بخاری اور مسلم کی شرط کے مطابق سند صحیح کے ساتھ حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) کے بعد زمین کبھی ایسے نفوس سے خالی نہیں رہی جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ زمین والوں سے عذاب دور کرتا ہے۔ یہ حدیث بھی حکما مرفوع ہے۔

امام ازرقی نے تاریخ مکہ میں زہیر بن محمد سے روایت کیا ہے کہ ہمیشہ زمین پر کم از کم سات ایسے رہے ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتے تو زمین اور زمین والے ہلاک ہو جاتے۔

امام ابن المنذر نے اپنی تفسیر میں سند صحیح کے ساتھ ابن جریج سے روایت کیا ہے 'انھوں نے کہا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد سے کچھ لوگ ہمیشہ فطرت پر رہے 'اللہ کی عبادت کرتے رہے۔

امام بزار نے اپنی مسند میں اور امام ابن جریر 'امام ابن المنذر اور امام ابن ابی حاتم نے اپنی اپنی تفاسیر میں اور امام حاکم نے المستدرک میں تصحیح سند کے ساتھ اس آیت "کان الناس امۃ واحدۃ" کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) اور حضرت نوح (علیہ السلام) نے درمیان دس قرن ہیں اور ان میں سے ہر ایک شریعت حق پر ہے۔ پھر ان کے بعد لوگوں میں اختلاف ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء (علیہم السلام) کو بھیجا اور زمین والوں پر اللہ تعالیٰ نے جو سب سے پہلا رسول بھیجا 'وہ حضرت نوح (علیہ السلام) تھے۔ اور امام محمد بن سعد نے طبقات میں حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) سے حضرت آدم (علیہ السلام) تک دس آباء ہیں اور وہ سب اسلام پر تھے۔ (الحاوی للفتاوی 'ج ۲ 'ص ۲۱۳۔ ۲۱۲ 'مطبوعہ فیصل آباد)

امام مسلم بن حجاج قشیری ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت قائم نہیں ہوگی حتیٰ کہ زمین اللہ اللہ نہ کہا جائے۔ حضرت انس (رض) دوسری روایت ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب تک ایک شخص بھی اللہ اللہ کہتا رہے گا اس پر قیامت قائم نہیں ہوگی۔ (صحیح مسلم 'ایمان ۲۳۴ '(۱۴۸) ۳۶۹ '۳۶۸ 'سنن الترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ۲۲۱۴ 'صحیح ابن حبان 'ج ۱۵ 'رقم الحدیث: ۶۸۴۹ 'مسند احمد 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ۱۳۸۳۴ 'طبع جدید 'مسند احمد 'ج ۳ 'ص ۲۶۸ '۲۰۱ '۱۰۷ 'طبع قدیم 'مسند ابو یعلی 'ج ۶ 'رقم الحدیث: ۳۵۲۶ 'مصنف عبدالرزاق 'ج ۱۱ 'رقم الحدیث: ۲۰۸۴۷ 'مسند ابو عوانہ 'ج ۱ 'ص ۱۰۱ 'المستدرک 'ج ۴ 'ص ۴۹۴ 'شرح السنہ 'ج ۷ 'ص ۴۱۷۸ 'کنز العمال 'ج ۱۴ 'رقم الحدیث: ۳۸۵۸۵ 'مسند البزار 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ۳۴۱۸ 'مجمع الزوائد 'ج ۷ 'ص ۳۳۱ 'ج ۸ 'ص ۱۲ 'مشکوۃ المصابیح 'ج ۳ 'رقم الحدیث: ۵۵۱۶)

اس صحیح حدیث سے یہ واضح ہو گیا کہ ہر دور میں اللہ اللہ کہنے والے مسلمان بندے روئے زمین پر رہے ہیں اور کسی دور میں بھی اللہ اللہ کہنے والوں سے زمین خالی نہیں رہی 'ورنہ قیامت آچکی ہوتی۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تمام آباء کرام کا اپنے اپنے زمانہ میں سب سے افضل اور بہتر ہونا

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مجھے بنو آدم کے ہر قرن اور ہر طبقہ میں سب سے بہتر قرن اور طبقہ سے مطعوث کیا جاتا رہا حتی کہ جس قرن میں میں ہوں۔

(صحیح البخاری ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ' ۳۵۵۷ ' مسند احمد ' ج ۹ ' رقم الحدیث : ' ۹۳۶۰ ' ۸۸۴۳ ' طبع دارالحدیث قاہرہ ' مسند احمد ' ج ۲ ' ص ۴۱۷ ' طبع قدیم ' مشکوۃ المصابیح ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ' ۵۷۳۹ ' کنزالعمال ' ج ۱۱ ' رقم الحدیث : ' ۳۳۰۰۵ ' دلائل النبوۃ للبیقھی ' ج ۱ ' ص ۱۷۵)

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا میں محمد بن عبداللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار ہوں۔ جب بھی لوگوں کے دو گروہ ہوئے اللہ تعالیٰ نے مجھے ان میں سے بہتر گروہ میں رکھا ' میں (جائز) ماں باپ سے پیدا کیا گیا ہوں ' مجھے زمانہ جاہلیت کی بدکاری سے کوئی چیز نہیں پہنچی۔ میں نکاح سے پیدا کیا گیا ہوں ' بدکاری سے پیدا نہیں کیا گیا ' حضرت آدم (علیہ السلام) کے زمانہ سے لے کر پاکیزگی کا یہ سلسلہ میرے باپ اور میری ماں تک پہنچا ہے ' میں بطور شخصیت کے تم سب سے بہتر ہوں اور بہ طور باپ کے تم سب سے بہتر ہوں۔ (دلائل النبوۃ ' ج ۱ ' ص ۱۷۵ ' ۱۷۴)

امام ابونعیم اصبہانی متوفی ۴۳۰ ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ میرے ماں باپ کبھی بھی بدکاری پر جمع نہیں ہوئے۔ اللہ عزوجل ہمیشہ مجھے پاک پشتوں سے پاک رحموں کی طرف منتقل فرماتا رہا ' جو صاف اور مہذب تھیں۔ جب بھی دو شاخیں پھوٹیں ' میں ان میں سے بہتر شاخ میں تھا۔ (دلائل النبوۃ ج ۱ ' رقم الحدیث : ۱۵)

امام ابوعیسی محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس بن عبدالمطلب (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قریش آپس میں بیٹھے ہوئے اپنے حسب ونسب کا ذکر کر رہے تھے۔ انھوں نے آپ کی مثال اس طرح دی جیسے زمین کے گھورے (گندگی ڈالنے کی جگہ) میں کھجور کا درخت پیدا ہوگیا ہو۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا اور مجھے ان میں سب سے بہتر لوگوں میں اور سب سے بہتر گروہوں میں اور سب سے بہتر فرقوں میں رکھا ' پھر قبیلوں کا انتخاب کیا اور مجھے سب سے بہتر قبیلہ میں رکھا ' پھر گھروں کا انتخاب کیا اور مجھے سب سے بہتر گھر میں رکھا۔ پس میں بطور شخص سب سے بہتر ہوں اور بہ طور گھر سب سے بہتر ہوں۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن ہے۔

(سنن الترمذی ' ج ۵ ' رقم الحدیث : ' ۳۶۲۷ ' دلائل النبوۃ للبیہقی ' ج ۱ ' ص ۱۶۹ ' دلائل النبوۃ لابی نعیم ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ' ۱۶)

مطلب بن ابی وداعہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس (رض) نے کوئی ناگوار بات سنی تھی۔ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے ' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا میں کون ہوں؟ صحابہ نے کہا آپ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔ علیک السلام ' آپ نے فرمایا میں **محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب** ہوں ' بیشک اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا اور مجھے سب سے بہتر

مخلوق میں رکھا۔ پھر اللہ نے ان کے دو گروہ کیے 'تو مجھے سب سے بہتر گروہ میں رکھا۔ پھر اللہ نے ان کو قبائل میں منقسم کیا تو مجھے سب سے بہتر قبیلہ میں رکھا 'پھر اللہ نے ان کو گھروں میں منقسم کیا تو مجھے سب سے بہتر گھر میں رکھا اور سب سے بہتر شخص میں رکھا۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔

(سنن الترمذی 'ج ۵ 'رقم الحدیث : '۳۶۲۸ 'دلائل النبوۃ للبیہقی 'ج ۱ 'ص ۱۷۰ 'المعجم الکبیر 'ج ۲۰ 'رقم الحدیث : ۶۷۶۔۶۷۵ 'مسند احمد 'ج ۴ 'ص ۱۶۶۔۱۶۵)

امام ابو نعیم اصبہانی متوفی ۴۳۰ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابن عباس (رض) "وتقلبک فی الساجدین "کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں 'نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمیشہ انبیاء (علیہم السلام) کی پشتوں میں منقلب ہوتے رہے 'حتی کہ آپ اپنی والدہ سے پیدا ہوئے۔ '(دلائل النبوۃ ج ۱ 'رقم الحدیث : ۱۷)

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ عزوجل نے سات آسمانوں کو پیدا کیا اور ان میں سے اوپر والے آسمانوں کو پسند کیا اور ان میں سکونت رکھی 'اور باقی آسمانوں میں اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہا 'سکونت دی۔ پھر اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا اور مخلوق میں سے بنو آدم کو پسند کیا اور بنو آدم میں سے عربوں کو پسند کیا اور عربوں میں سے مضر کو پسند کیا اور مضر میں سے قریش کو پسند کیا اور قریش میں سے بنو ہاشم کو پسند کیا اور بنو ہاشم میں سے مجھے پسند کیا 'سو میں پسندیدہ لوگوں میں سے پسند کیا گیا ہوں۔ لہٰذا جس نے عربوں سے محبت رکھی اس نے میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت کی اور جس نے عربوں سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھنے کی وجہ سے ان سے بغض رکھا۔ ('دلائل النبوۃ ج ۱ 'رقم الحدیث : '۱۸ 'المعجم الکبیر ج ۱۲ 'رقم الحدیث : '۱۳۶۵۰ 'المستدرک 'ج ۴ 'ص ۸۷۔۸۶ 'کامل ابن عدی 'ج ۲ 'ص ۱۰۳ '۱۴۷ 'علل ابن ابی حاتم 'ج ۲ 'ص ۳۲۸ '۳۶۷ 'مجمع الزوائد 'ج ۸ 'ص ۲۱۵)

اس حدیث کی سند میں حماد بن واقد کے سواسب کی توثیق کی گئی ہے اور وہ بھی متعبر روای ہے۔

امام مسلم بن حجاج قشیری ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت واثلہ بن اسقع (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کی اولاد سے کنانہ کو پسند کرلیا اور کنانہ سے قریش کو پسند کرلیا اور قریش میں سے بنو ہاشم کو پسند کرلیا اور بنو ہاشم میں سے مجھے پسند کرلیا۔

(صحیح مسلم 'فضائل ۱' (۲۲۷۶) ۵۸۲۸ 'سنن ترمذی 'ج ۵ 'رقم الحدیث : '۳۶۲۵ 'صحیح ابن حبان 'ج ۱۴ 'رقم الحدیث : '۶۲۴۲ 'مسند احمد 'ج ۶ 'رقم الحدیث : '۱۶۹۸۴ 'المعجم الکبیر 'ج ۲۲ 'رقم الحدیث : '۱۶۱)

امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت جبرائیل (علیہ السلام) سے روایت کیا کہ انھوں نے کہا میں نے زمین کے تمام مشارق ومغارب کو الٹ پلٹ کر دیکھ لیا تو (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے افضل کسی شخص کو نہیں پایا اور نہ بنو ہاشم سے افضل کسی خاندان کو پایا۔

اس حدیث کی سند میں موسیٰ بن عبیدہ ربذی ایک ضعیف راوی ہے۔

(المعجم الاوسط 'ج ۷ 'رقم الحدیث : ۶۲۸۱ 'مجمع الزوائد 'ج ۸ 'ص ۴۰۰ 'طبع جدید دارالفکر 'بیروت '۱۴۱۴ھ)
ان تمام احادیث صحیحہ اور روایات معتبرہ سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم (علیہ السلام) سے حضرت عبداللہ تک نبی (علیہ السلام) کے نسب میں تمام آباء کرام اپنے اپنے زمانہ کے تمام لوگوں سے خیر اور افضل تھے 'اور قرآن مجید میں تصریح ہے اور اس پر مسلمانوں کا اجماع بھی ہے کہ مومن مشرک سے خیر اور افضل ہے 'لہٰذا ثابت ہوا کہ آپ کے تمام آباء کرام مومن تھے۔
ان احادیث میں سے ہمارا استدلال ان احادیث سے ہے جن میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نسب کے لیے خیر اور افضل کا لفظ ہے اور جن احادیث میں ہے کہ میں پاکیزہ پشتوں سے پاکیزہ رحموں کی طرف منتقل کیا گیا ہوں 'ان سے ہمارا استدلال نہیں ہے۔ ان احادیث کو ہم نے صرف رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے شرافت نسب کے لیے بیان کیا ہے۔

ابوین کریمین کے ایمان کے مسئلہ میں تفسیر کبیر پر بحث و نظر

امام رازی نے تفسیر کبیر میں اس مسئلہ سے اختلاف کیا ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے باپ کا نام آزر تھا اور اس پر یہ دلیل قائم کی ہے کہ یہود و نصاری نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تکذیب پر بہت حریص تھے۔ اگر فی الواقع حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے والد کا نام آزر نہ ہوتا اور قرآن کہتا کہ ان کے باپ آزر نے یوں کہا تو عادۃ یہود و نصاری کا خاموش رہنا ممکن نہ تھا اور وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تکذیب کرتے اور کہتے کہ آزر ان کے باپ نہیں ہیں اور جب انھوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تکذیب نہیں کی تو معلوم ہوا کہ قرآن مجید کا بیان کیا ہوا نسب صحیح ہے اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے باپ آزر ہی ہیں۔ (تفسیر کبیر 'ج ۴ 'ص ۷۰ 'دارالفکر '۱۳۹۸ھ)
اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اہل کتاب کے نزدیک حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے والد کا نام تارح ہے۔ بائبل میں لکھا ہے نحور انتیس برس کا تھا جب اس سے تارح پیدا ہوا 'اور تارح کی پیدائش کے بعد نحور ایک سو انیس برس اور جیتا رہا اور اس سے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں اور تارح ستر برس کا تھا جب اس سے ابرام اور نحور اور حاران پیدا ہوئے۔ (پرانا عہد نامہ 'احبار باب : ۱۱ آیت ۲۶۔ ۲۴ 'مطبوعہ بائبل سوسائٹی ' لاہور)
باقی رہا یہ کہ پھر اہل کتاب نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر یہ اعتراض کیوں نہیں کیا کہ قرآن نے آزر کو باپ کہا ہے جبکہ وہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا چچا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اہل کتاب محاوات عرب سے واقف تھے کہ محاورات عرب میں چچا پر باپ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ نیز قرآن مجید میں حضرت اسماعیل کو اولاد یعقوب (علیہ السلام) کا باپ فرمایا ہے 'حالانکہ وہ ان کے بالاتفاق چچا تھے 'اور اس پر بھی اہل کتاب نے اسی وجہ سے اعتراض نہیں کیا تھا۔ ورنہ امام رازی کی تقریر کے مطابق یہودیوں کو اس کی تکذیب کرنی چاہیے تھی۔
نیز امام رازی نے لکھا ہے کہ شیعہ کے نزدیک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آباء واجداد میں سے کوئی شخص کافر نہیں تھا اور اس پر ان کی کئی دلیلیں ہیں۔ ایک دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے۔ (آیت) "الذی یراك حین تقوم و تقلبك فی الساجدین "(الشعراء : ۲۱۹) جو آپ کو حالت قیام میں دیکھتا ہے اور سجدہ کرنے والوں میں آپ کے پلٹنے کو دیکھتا ہے پھر امام رازی نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے

اس آیت کے دیگر محامل بیان کیے ہیں۔ (تفسیر کبیر ' ج ۴ 'ص ۷۱) لیکن ہمارا بنیادی استدلال اس دلیل سے نہیں ہے ' یہ دلیل تائید کے درجہ میں ہے۔ ہمارا بنیادی استدلال اس سے ہے کہ آزر کے مرنے کے تقریباً پچاس بعد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے والدین کی مغفرت کی دعا کی۔ (ابراہیم : ۴۱) جب کہ اس کی موت علی الشرک کی وجہ سے وہ اس سے بیزار ہو چکے تھے۔ لہٰذا اپنے والدین کی مغفرت کی دعا کرنا ان کے ایمان کی دلیل ہے۔ امام رازی نے اس دلیل سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ شیعہ کی طرف سے دوسری دلیل انھوں نے یہ پیش کی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں ہمیشہ پاکیزہ پشتوں سے پاکیزہ رحموں میں منتقل ہوتا رہا اور مشرک نجس ہیں ' اس سے ثابت ہوا کہ آپ کے آباء مومن تھے۔ اس پر امام رازی نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کے آباء مشرک نہ ہوں ' کیونکہ پاکیزہ پشتوں کا معنی ہے آپ نکاح سے پیدا ہوئے ہیں زنا سے نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے اس حدیث سے استدلال نہیں کیا ' ہمارا استدلال صحیح بخاری کی اس حدیث سے ہے۔ مجھے بنو آدم کے ہر قرن اور ہر طبقہ میں سے سب سے بہتر قرن اور طبقہ سے مبعوث کیا جاتا رہا ' حتیٰ کہ جس قرن میں میں ہوں۔ اس سے لازم آیا کہ آپ کے تمام آباء خیر تھے اور مومن مشرک سے خیر اور بہتر ہے۔ لہٰذا آپ کے تمام آباء کا مومن ہونا ثابت ہوا ' اس دلیل سے بھی امام رازی نے تعرض نہیں کیا۔ امام رازی نے شیعہ کی طرف سے تیسری دلیل یہ پیش کی ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے بہت شدت اور سختی کے ساتھ آزر کا رد کیا ہے ' اگر وہ ان کے باپ ہوتے تو ان کے ساتھ نرمی سے کلام کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ ان کے چچا تھے ' پھر اس دلیل کا رد کیا ہے کہ ان کی یہ سختی اس کے شرک پر اصرار کی وجہ سے تھی۔ (تفسیر کبیر ' ج ۴ 'ص ۷۱ 'ملخصا) ہرچند کہ ہم نے اس دلیل سے استدلال نہیں کیا ' لیکن اس پر امام رازی کا اعتراض قوی نہیں ہے۔ کیونکہ کفر اور شرک کے باوجود ماں باپ کے ساتھ نرمی سے کلام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ دیکھئے فرعون حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا باپ نہیں تھا ' اس نے صرف حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی پرورش کی تھی اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو اس سے نرم گفتاری کا حکم دیا :

(آیت) " اذھبا الی فرعون انہ طغی، فقولا لہ قولا لینا لعلہ یتذکر او یخشی "۔ (طہ : ۴۴)

ترجمہ : (اے موسیٰ اور ہارون) آپ دونوں فرعون کے پاس جائیے بیشک اس نے بہت سر اٹھا رکھا ہے ' آپ دونوں اس سے نرمی سے بات کریں ' تاکہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈرے۔

اگر آزر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا باپ ہوتا تو آپ اس سے اس قدر سختی اور شدت کے ساتھ بات نہ کرتے ' لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ آپ کا باپ نہیں ' چچا تھا۔ اس آیت میں فرمایا کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے آزر سے کہا کیا تم بتوں کو معبود قرار دیتے ہو ؟ بیشک میں تمہیں اور تمہاری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا دیکھتا ہوں۔ (الانعام : ۷۴) اگر آزر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا باپ ہوتا تو وہ اس سے اس قدر اہانت آمیز کلام نہ فرماتے۔

اس بحث کے بعد امام رازی نے لکھا ہے کہ رہے ہمارے اصحاب تو ان کا قول یہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے والد کافر تھے ' اور انھوں نے ذکر کیا ہے کہ قرآن مجید کی اس آیت میں تصریح ہے کہ آزر کافر تھا اور وہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا والد تھا۔ (تفسیر کبیر ج ۴ ص ۷۱ مطبوعہ دارالفکر بیروت ' ۱۳۹۸ ھ)

ہم اس قول کی شناعت سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔ امام رازی صحیح العقیدہ تھے 'دین اسلام کے لیے ان کی بڑی خدمات ہیں اور اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ان کو اس قول سے رجوع کی توفیق دی۔ جن دلائل کو انھوں نے تفسیر کبیر میں رد کر دیا ہے 'اسرار التنزیل میں ان ہی دلائل سے انھوں نے رسول اللہ کے والدین کریمین اور آپ کے تمام آباء کرام کا ایمان ثابت کیا ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے اس کا خلاصہ نقل کیا ہے 'ہم اس کا اقتباس یہاں پیش کر رہے ہیں۔

ابوین کریمین کے ایمان کے متعلق امام رازی کا صحیح موقف

مسلک ثانی: نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے والدین سے شرک ثابت نہیں ہے 'بلکہ وہ اپنے جد اکرم حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے دین حنیف پر تھے 'جیسا کہ عرب کی ایک جماعت اس دین پر تھی۔ مثلاً زید بن عمرو بن نفیل اور ورقہ بن نوفل وغیرھما 'اور یہ علماء کی ایک جماعت کا مسلک ہے۔ انہی میں سے امام فخر الدین رازی ہیں 'انھوں نے اپنی کتاب اسرار التنزیل لکھا ہے 'جس کی عبارت یہ ہے ایک قول یہ ہے کہ آزر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا والد نہیں تھا اور اس پر کئی وجوہ سے استدلال کیا گیا ہے۔ ایک دلیل یہ ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) کے آباء کافر نہیں تھے اور اس پر کئی دلائل ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (آیت) "**الذی یراك حین تقوم وتقلبك فی الساجدین** "اس آیت کا معنی یہ ہے کہ آپ کا نور ایک ساجد سے دوسرے ساجد کی طرف منتقل ہوتا رہا اور اس تقدیر پر یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تمام آباء مسلمان تھے اور اب قطعی طور پر یہ کہنا واجب ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے والد کافروں میں سے نہیں تھے اور آزر آپ کا چچا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ (آیت) "**وتقلبك فی الساجدین** "کے اور بھی کئی محامل ہیں اور جب کہ ہر محمل کے متعلق ایک روایت وارد ہے اور ان میں باہم کوئی منافات بھی نہیں ہے تو اس آیت کو ان تمام محامل پر محمول کرنا واجب ہے 'اور جب یہ صحیح ہے تو ثابت ہوگیا کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے والد بت پرستوں میں سے نہیں تھے '۔ پھر امام رازی نے فرمایا سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تمام آباء کے مشرک نہ ہونے پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں ہمیشہ پاکیزہ پشتوں سے پاکیزہ رحموں کی طرف منتقل ہوتا رہا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا (آیت) "**انما المشرکون نجس** "مشرک محض ناپاک ہیں پس واجب ہوا کہ آپ کے اجداد کرام سے کوئی شخص مشرک نہ ہو۔ امام رازی کا کلام ختم ہوا۔ تم امام رازی کی امامت اور جلالت پر غور کرو 'وہ اپنے زمانہ میں اہل سنت کے امام ہیں اور بدعتی فرقوں کا رد کرنے والے ہیں 'اور وہ اپنے زمانہ میں مذہب اشاعرہ کے ناصر اور موید ہیں اور وہی چھٹی صدی ہجری میں ایسے عالم ہیں جو اس امت کے لیے بطور مجدد بھیجے گئے ہیں اور میرے نزدیک امام فخر الدین رازی کے مذہب کی تائید میں اور بھی دلائل ہیں۔ (الحاوی للفتاوی 'ج ۲ 'ص ۲۱۰ 'مطبوعہ فیصل آباد)

امام رازی نے یہ بحث اسرار التنزیل وانوار التاویل ص ۲۷۳۔ ۲۶۹ 'مطبوعہ بغداد '۱۹۹۰ء میں کی ہے۔ یہ کتاب مجھے بعد میں ملی انشاء اللہ الشعرا: ۲۱۹ میں 'میں اس کتاب سے امام رازی کی اصل عبارات پیش کروں گا۔
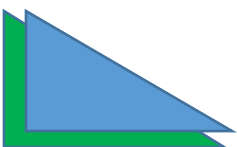
ابوین کریمین کے ایمان کی بحث میں حرف آخر

یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے والدین کریمین کے ایمان کا مسئلہ متقدمین علماء پر مخفی رہا۔ یہ مسئلہ اللہ تعالیٰ نے متاخرین پر منکشف کیا ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ لکھتے ہیں:

لیکن متاخرین علماء نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے والدین کریمین 'بلکہ حضرت آدم (علیہ السلام) تک آپ کے تمام آباء وامہات کا ایمان ثابت کیا ہے 'اس اثبات کے لیے انھوں نے تین طریقے اختیار کیے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ سب حضرات حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے دین پر تھے۔ دوسرا یہ کہ ان حضرات کو دعوت اسلام نہ پہنچی 'بلکہ یہ حضرات زمانہ فترت میں ہی انتقال کرچکے تھے 'ان کو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا زمانہ نہ ملا۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ کے والدین کریمین کو اللہ تعالیٰ نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعا سے آپ کے دست اقدس پر دوبارہ زندگی عطا فرمائی اور وہ آپ پر ایمان لائے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے والدین کے زندہ کرنے کی حدیث اگرچہ اپنی حدذات میں ضعیف ہے 'لیکن متعدد طریق سے اس کی تصحیح اور تحسین کردی گئی ہے اور یہ بات گویا متقدمین سے پوشیدہ رہی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت متاخرین علماء پر کھول دی۔ (آیت) "واللہ یختص برحمتہ من یشاء "اس بارے میں رسائل تصنیف کیے اور دلائل سے اس مسئلہ کا اثبات فرمایا 'مخالفین کے شبہات کے جوابات دیئے۔ ان دلائل اور جوابات کو اگر یہاں نقل کیا جائے تو بات لمبی ہو جائے گی۔ ان کے رسائل میں دیکھ لیا جائے۔ واللہ اعلم۔ (اشعۃ اللمعات 'ج ۱ 'ص ۷۱۸ 'مطبوعہ مطبع تیج کمار 'لکھنؤ)

میں نے ابوبین کری میں کے مسئلہ پر بہت تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ خصوصا اس لیے کہ تفسیر کبیر میں امام رازی نے جو گفتگو کی ہے 'اس سے بہت سے ؟ صحیح العقیدہ علماء بھی متشوش تھے 'اس لیے میں نے چاہا کہ امام رازی کی تفسیر کبیر کی بحث کا جواب لکھوں اور یہ واضح کروں کہ امام رازی نے اس نظریہ سے رجوع فرمالیا ہے اور یہی سلف صالحین اور علماء ربانیین کی نشانی ہے۔ آخر میں میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری اس کاوش کو قبول فرمائے اور مجھے اپنی رضا اور اپنے حبیب اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خوشنودی عطا فرمائے 'اس بحث کی مزید تفصیل کے لیے البقرہ: ۱۱۹) کا بھی مطالعہ فرمائیں:

بتوں کی پرستش کا کھلی ہوئی گمراہی ہونا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے جب ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے (عرفی) باپ آزر سے کہا کیا تم بتوں کو معبود قرار دیتے ہو؟ بیشک میں تمہیں اور تمہاری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا دیکھتا ہوں۔ (الانعام: ۷۴)

یعنی تمہاری عبادت کا طریقہ ہر صاحب عقل سلیم کے نزدیک کھلی ہوئی گمراہی اور جہالت ہے اور اس سے زیادہ واضح جہالت اور گمراہی کیا ہوگی کہ تم اپنے ہاتھوں سے بت بنا کر ان کی پرستش کرتے ہو۔ قرآن مجید میں ہے:

"(آیت) "قال اتعبدون ما تنحتون، واللہ خلقکم وما تعملون "۔ (الصفت: ۹۶۔ ۹۵)

ترجمہ: ابراہیم نے کہا کیا تم ان بتوں کی پرستش کرتے ہو جن کو تم خود تراشتے ہو؟ حالانکہ تمہیں اور تمہارے سب کاموں کو اللہ نے ہی پیدا فرمایا ہے۔

اور یہ بت بالکل بہرے ہیں ' تمہارے فریاد کو نہیں سنتے ' نہ تمہیں کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ تمہیں کسی نقصان سے بچا سکتے ہیں:

(آیت) " قال افتعبدون من دون اللہ مالا ینفعکم شیئا ولا یضرکم، اف لکم ولما تعبدون من دون اللہ افلا تعقلون "۔ (الانبیاء: ٦٧۔٦٦)

ترجمہ: ابراہیم نے کہا کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ایسوں کی عبادت کرتے ہو جو تمہیں کچھ نفع پہنچا سکیں اور نہ نقصان 'تف ہے تم پر (اور تمہارے بتوں پر) جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو پس کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔

اور ایک مقام پر اللہ تعالیٰ بتوں کی پرستش کا بطلان بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

(آیت) " ان الذین تدعون من دون اللہ لن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا لہ وان یسلبھم الذباب شیئا لا یستنقذوہ منہ ضعف الطالب المطلوب "۔ (الحج: ٧٣)

ترجمہ؛ بیشک تم اللہ کو چھوڑ کر (جن (بتوں) کی عبادت کرتے ہو 'وہ سب مل کر بھی ہرگز ایک مکھی نہیں بنا سکتے 'اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کرلے جائے تو وہ اس سے چھڑا نہیں سکتے 'طالب اور مطلوب دونوں کمزور ہیں۔

پھر ایسے کمزور 'لاچار 'بے حس اور بے جان تراشیدہ پتھروں کو اپنا خدا ماننا اور ان کی پرستش کرنا کھلی ہوئی گمراہی کے سوا اور کیا ہے؟ (تفسیر تبیان القرآن۔غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ:

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ○75

لغۃ القرآن: وَكَذٰلِكَ : اور اسی طرح] [نُرِيْٓ : ہم دکھانے لگے] [اِبْرٰهِيْمَ : ابراہیم] [مَلَكُوْتَ : نظام سلطنت] [السَّمٰوٰتِ : آسمانوں کی] [وَ : اور] [الْاَرْضِ : " جو " زمین میں ہے] [وَلِيَكُوْنَ : اور تاکہ وہ جائے] [مِنَ : سے] [الْمُوْقِنِيْنَ : یقین کرنے والوں]
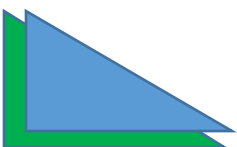
ترجمہ : اور اسی طرح ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو آسمانوں اور زمین کی تمام بادشاہتیں (یعنی عجائبات خلق) دکھائیں اور (یہ) اس لیے کہ وہ عین الیقین والوں میں ہو جائے

تشریح : امام رازی (رح) فرماتے ہیں کہ جلال خداوندی کے انوار و تجلیات ہر لمحہ ضوفشاں ہیں لیکن انسان روح کسی نہ کسی حجاب کے باعث ان مشاہدہ سے محروم رہتی ہے۔ جیسے جیسے حجاب ہٹا اور سرکتا جاتا ہے ویسے ہی انوار کا مشاہدہ شروع ہو جاتا ہے۔ حضرت خلیل (علیہ السلام) نے جب تمام حجابات کو تار تار کر دیا اور انوار الٰہی کے مشاہدہ میں کوئی آڑ باقی نہ رہی تو زمین و آسمان کی بے کراں وسعتوں میں قدرت خداوندی کے جو اسرار تھے سب ظاہر ہو گئے اور نگاہ ابراہیمی پر ہر چیز منکشف کر دی گئی **فلما زال ذلك الحجا لا جرم تجلی له ملکوت السموات بالتمام** (تفسیر کبیر، تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو عجائبات کائنات پر مطلع کر دیا گیا

یعنی جس طرح بت پرستی کی شناعت و قبح ہم نے ابراہیم پر ظاہر کر کے اس کی قوم کو قائل کیا اسی طرح علویات و سفلیات کے نہ آیت محکم اور عجیب و غریب نظام ترکیبی کی گہرائیوں پر بھی اس کو مطلع کر دیا تاکہ اسے دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے وجود و وحدانیت وغیرہ پر اور تمام مخلوقات سماوی وارضی کے محکومانہ عجز و بیچارگی پر استدلال اور اپنی قوم کے عقیدے کواکب پرستی و ہیاکل سازی کو علیٰ وجہ البصیرت رد کر سکے اور خود بھی حق الیقین کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہو بلاشبہ عالم کا یہ اکمل و احکم اور بہترین نظم و نسق ہی ایسی چیز ہے جسے دیکھ کر بالبداہت اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس عظیم الشان مشین کا بنانے اور چلانے والا، اس کے پرزوں کو نہ آیت مضبوط ترتیب و سلیقہ سے جوڑنے والا اور ہزاروں لاکھوں برس سے ایک ہی انداز پر اس کی حفاظت کرنے والا، بڑا زبردست حکیم و قدیر صانع ہے جس کے حکیمانہ تصرف اور نفوذ و اقتدار سے مشین کا کوئی چھوٹا بڑا پرزہ باہر نہیں جا سکتا۔ یہ کام یونہی بخت و اتفاق یا بے شعور طبیعت یا اندھے بہرے مادہ سے نہیں ہو سکتا۔

(تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی)

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو دکھائے گئے ملکوت کا مصداق

مجاہد بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے سات آسمان کھل گئے ' حتیٰ کہ عرش بھی پھر انھوں نے ان کو دیکھ لیا اور ان کے لیے سات زمینیں کھل گئیں، اور انھوں نے ان کو بھی دیکھ لیا۔

عطاء بیان کرتے ہی کہ جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو آسمان کے ملک کے اوپر اٹھایا گیا تو انھوں نے ایک بندے کو زنا کرتے ہوئے دیکھا ' انھوں نے اس کے خلاف دعا کی ' وہ ہلاک ہو گیا۔ انھوں نے دوبارہ اٹھایا گیا ' انھوں نے پھر ایک بندے کو زنا کرتے ہوئے دیکھا ' انھوں نے

اس کے خلاف دعا کی ' وہ ہلاک ہو گیا۔ انھیں پھر اٹھایا گیا ' انھوں نے پھر ایک بندے کو زنا کرتے ہوئے دیکھا ' انھوں نے پھر اس کے خلاف دعا کی تو ان کو ندا کی گئی اے ابراہیم ! ٹھہرو تم مستجاب بندے ہو اور میرے اپنے بندہ کے ساتھ تین معاملات ہیں ' یا تو وہ مجھ سے توبہ کرے تو میں اس کی توبہ قبول فرماؤں گا ' یا میں اس سے نیک اولاد پیدا کروں گا ' یا بدکاری میں اس کو ڈھیل دوں گا اور پھر میں اس کو دیکھ لوں گا۔ اس حدیث کو امام ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ ھ نے شہر بن حوشب سے روایت کیا ہے۔ (تفسیر ابن ابی حاتم 'ج ۴ 'ص ۱۳۲۶)

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ ہم سے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) ایک ظالم بادشاہ سے بھاگ کر ایک سرنگ میں چھپ گئے 'اللہ تعالیٰ نے ان کا رزق ان کی انگلیوں کے پوروں میں رکھ دیا۔ جب بھی وہ اپنی انگلی کو چوستے 'تو ان کو رزق مل جاتا جب وہ اس سرنگ سے باہر آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو آسمانوں کی حکومت دکھائی 'ان کو سورج اور چاند اور ستارے اور بادل اور ایک عظیم مخلوق دکھائی اور ان کو زمین کی حکومت دکھائی تو ان کو پہاڑ 'سمندر 'دریا 'درخت اور ہر قسم کے جانور اور ایک عظیم مخلوق دکھائی۔

امام ابن جریر نے کہا ہے کہ ملکوت کی زیادہ بہتر تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو آسمان اور زمین کا ملک دکھایا اور جو چیزیں ان میں پیدا کی گئی ہیں 'مثلا سورج 'چاند 'ستارے اور جانور وغیرہ اور ان کے لیے تمام امور کے ظاہر اور باطن منکشف کر دیئے۔

حضرت ابن عباس (رض) نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے تمام امور کے ظاہر اور باطن منکشف کر دیئے اور مخلوق کے اعمال میں سے کوئی عمل ان سے مخفی نہیں رہا اور جب وہ گناہ کرنے والوں پر لعنت کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم اس کی طاقت نہیں رکھتے اور ان کو پہلی کیفیت پر لوٹا دیا۔ اس حدیث کو امام ابن ابی حاتم نے بھی روایت کیا ہے۔

(تفسیر ابن ابی حاتم 'ج ۴ 'ص ۱۳۲۷)

حضرت عبدالرحمٰن بن عائش (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صبح کی نماز پڑھائی 'آپ سے کسی نے کہا میں نے آج سے پہلے آپ کو زیادہ خوش نہیں دیکھا 'آپ نے فرمایا ایسا کیوں نہ ہو۔ میرے پاس میرا رب (خواب میں) نہایت حسین صورت میں آیا۔ اس نے کہا اے محمد ! یہ مقرب فرشتے کس چیز میں بحث کر رہے ہیں؟ میں نے کہا تو ہی خوب جانتا ہے ! پھر اللہ نے اپنا دست قدرت میرے دو کندھوں کے درمیان رکھا تو میں نے آسمانوں اور زمینوں کی تمام چیزوں کو جان لیا 'پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت کی :

(آیت) "و کذلك نری ابراهيم ملكوت السموت والارض وليكون من الموقنين"۔

(جامع البیان 'جز ۷ ص ۳۲۲ 'مسند احمد ج ۸ 'رقم الحدیث : '۲۲۱۷۰ 'طبع جدید دار الفکر 'شیخ احمد شاکر نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے 'مسند احمد 'ج ۱۶ 'رقم الحدیث : '۲۲۰۰۸ طبع دار الحدیث قاہرہ 'مسند احمد 'ج ۵ ص ۲۴۳ طبع قدیم 'سنن ترمذی '۵ 'رقم الحدیث : '۳۲۴۶ '۳۲۴۴ 'شرح السنہ 'ج ۱ 'رقم الحدیث : '۴۶۵ الشریعہ الآجری 'ص ۴۳۳ '۴۳۲ مسند ابو یعلی "رقم الحدیث : '۲۶۰۸)

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو آسمانوں اور زمینوں کی تمام حکومت اور مخلوق دکھائی تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر برقرار رہیں اور اللہ تعالیٰ نے جس چیز کی ہدایت دی ہے 'اس کی حقیقت کو جان لیں 'اور انھیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی معرفت اور اپنی قوم کی گمراہی اور جہالت پر بصیرت حاصل ہو۔ (تفسیر تبیان القرآن۔ غلام رسول سعیدی)

نیوٹن کا اقرار

یورپ کا مشہور و معروف حکیم سائنسدان نیوٹن کہتا ہے کہ کواکب کی حرکات حالیہ ممکن نہیں کہ محض عام قوت جاذبہ کے فعل کا نتیجہ ہوں یہ قوت جاذبہ تو کواکب کو شمس کی طرف دھکیلتی ہے۔ اس لیے کواکب کو سورج کے گرد حرکت دینے والا ضروری ہے کہ خدائی ہاتھ ہو۔ جو باوجود قوت جاذبہ کی عام کشش کے ان کو اپنے مدارت پر قائم رکھ سکے۔ کوئی سبب طبعی ایسا نہیں بتلایا جاسکتا جس نے تمام کواکب کو کھلی فضا میں جکڑ بند کر دیا ہے کہ وہ سب سورج کے گرد چکر لگاتے وقت ہمیشہ معین مدارت پر اور ایک خاص جہت ہی میں حرکت کریں جس میں کبھی تخلف نہ ہو۔ پھر کواکب کی حرکات اور درجات سرعت میں ان کی اور سورج کی درمیانی مسافت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو دقیق تناسب اور عمیق توازن قائم رکھا گیا ہے کوئی سبب طبعی نہیں جس سے ہم ان منظّم و محفوظ نوامیس کو وابستہ کر سکیں۔ ناچار اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ سارا نظام کسی ایسے زبردست حکیم و علیم کے ماتحت ہے جو ان تمام اجرام سماویہ کے مواد اور ان کی کمیات سے پورا پورا واقف ہے وہ جانتا ہے کہ کس مادہ کی کس قدر مقدار سے کتنی قوت جاذبہ صادر ہوگی۔ اسی نے اپنے زبردست اندازے سے کواکب اور شمس کے درمیان مختلف مسافتیں اور حرکت کے مختلف مدارج مقرر کئے ہیں کہ ایک کا دوسرے سے تصادم و تنزاحم نہ ہو اور عالم ٹکرا کر تباہ نہ ہو جائے۔ ہر چھوٹا بڑا سیارہ نہ آیت مضبوط نظام کے ماتحت معین وقت پر طلوع و غروب ہوتا ہے جب کوئی سیارہ غروب ہو کر دنیا کو اپنے اس فیض و تاثیر سے محروم کر دے جو طلوع کے وقت حاصل تھا تو نہ اس ستارہ کی اور نہ کسی مخلوق کی قدرت میں ہے کہ ایک منٹ کے لیے اسے واپس لے آئے یا غروب سے روک دے

اللہ تعالیٰ کی شان

یہ رب العالمین ہی کی شان ہے کہ کسی وقت بھی کسی قسم کے افاضہ سے عاجز نہیں وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَا اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ) (یہ علویات کا حال ہے تو سفلیات کا اسی سے اندازہ کرلو یہی تکوینی عجائب اور ملکوت السمٰوات والارض ہیں جن کے دیکھنے سے ابراہیم کی زبان پر لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ اور اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ الخ بے ساختہ جاری ہو گیا جو اگلی آیات میں مذکور ہے) کما تدل علی الفاء فی قول تعالیٰ فلما جن الخ)۔ (تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی)

ملکوت میں رحموت اور رہبوت کی طرحت مبالغہ کے لیے یعنی ملک عظیم اور سلطنت وسیع۔ نری معناہ اریناہ (قرطبیؒ) ہم نے دکھادی یہ رؤیت بصر سے تھی یا بصیرت سے ؟ یعنی صرف آنکھوں نے دیکھا تھا یا دل کو بھی اس کا علم و عرفان نصیب ہوا تھا ؟ بعض کا خیال ہے کہ پردہ اٹھ گیا تھا اور عرش سے تحت الثرا تک ہر چیز نظر آنے لگی تھی۔ اور بعض نے فرمایا کہ آسمان اور زمین کی تمام اشیا کی حقیقت پر آگاہی بخش دی گئی تھی تاکہ کائنات کی ان مختلف چیزوں پر مطلع ہو کر وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، علم، قدرت اور حکمت کے بارے میں عین الیقین کے مرتبہ علیا پر فائز ہو جائیں۔ امام رازی (رح) لکھتے ہیں کہ اگرچہ عام انسان بھی کائنات کے بعض اسرار پر آگاہ ہوتے ہیں لیکن اس عالم خلق کی ہر چیز میں خواہ

وہ جنس ہو یا نوع یا صنف ہو یا شخص حکمت الٰہی کے جو آثار پائے جاتے ہیں ان سے جس طرح اکابر انبیاء آگاہ ہوتے ہیں وہ آگاہی کسی اور کو نصیب نہیں ہوتی۔ وان کان (جمیع الموحدین) یعرفون اصل ھذا الدلیل الا ان الاطلاع علی اثار حکمۃ اللہ فی کل واحد من مخلوقات ھذا العالم بحسب اجناسھا وانواعھا واصنافھا واشخاصھا واحوالھا لا یحصل الا للاکابر من الانبیاء (علیہم السلام) (کبیر) جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو حقائق اشیا کا اتنا علم ارزانی فرما دیا گیا تھا تو تعجب ہے ان لوگوں کی کم نگاہی پر جو نبی الانبیا کے متعلق یہ خیال کرتے ہیں کہ نعوذ باللہ آپ کو یہ خبر بھی نہ تھی کہ نر کھجور سے مادہ کھجور کس طرح باردار ہوتی ہے۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

حضرت سدی (تابعی) (رض) سے مروی ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو ایک پہاڑ پر کھڑا کیا گیا ان کے لیے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے گئے اور انھوں نے اللہ کا سارا ملک دیکھ لیا اور جنت میں اپنا مقام بھی ملاحظہ کر لیا، پھر ان کے لئے زمین منکشف کی گئ اور انھوں نے نیچے تک سب دیکھ لیا۔ (ابن ابی حاتم جلد 4 صفحہ 1326 حدیث 7502 مطبوعہ مکہ)

عبد بن حمید اور ابوالشیخ حضرت عطاء سے روایت کیا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام پر آسمان و زمین کو منکشف کیا گیا تو آپ نے ایک شخص کو زنا کرتے دیکھا اپنے دعا کی وہ ہلاک کر دیا گیا پھر ایک شخص کو زنا کرتے دیکھا اس کے لئے دعا کی وہ بھی ہلاک ہو گیا۔ پھر ایسے ہی تیسرے شخص کے لیے اپنے دعا کرنا چاہی تو اللہ نے فرمایا اے ابراہیم! ٹھہر جاؤ تم مستجاب ہو تمہاری ہر دعا قبول ہوتی ہے (اگر تم ایسے ہی دعا کرتے رہے تو بہت سی مخلوق ہلاک ہو جائے گی) میں اپنے بندے سے تین طرح کا معاملہ کرتا ہوں۔ اسے توفیق توبہ دیتا ہوں یا اس کی نسل سے ایسا شخص پیدا کرتا ہوں جس کی وجہ سے زمین تسبیح سے بھر جاتی ہے یا اسے اپنے پاس بلا لیتا ہوں پھر چاہو تو اسے معاف کروں یا عذاب دوں۔ (در منثور جلد 3 صفحہ 302 مطبوعہ دار الفکر بیروت)

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لئے مشاہدہ ارض و سما میں فرق

یاد رہے! ابراہیم (علیہ السلام) پر تھوڑی دیر کے لیے ارض و سما منکشف کئے گئے مگر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ساری دنیا مستقل واضح کر دی گئی چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے مروی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ان اللہ رفع لی الدنیا فانا انظر الیھا والی ما ھو کائن فیھا الی یوم القیامۃ کما انظر الی کفی ھذہ۔ اللہ نے ساری دنیا مجھ پر کھول دی ہے تو میں دنیا کو اور اس میں تا قیامت ہونے والی ہر چیز کو یوں دیکھتا ہوں جیسے اپنے اس ہتھیلی کو۔ (کنز العمال بروایت نعیم بن حماد جلد 11 صفحہ 378 حدیث 31810 بسند ضعیف) (والضعیف مقبول فی باب الفضائل)　　　　(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

آیت مبارکہ :

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيۡهِ الَّيۡلُ رَاٰ كَوۡكَبًا‌ ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّىۡ‌ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الۡاٰفِلِيۡنَ ۝76

لغۃالقرآن: فَلَمَّا : پھر جب] [جَنَّ : چھا گئی] [عَلَيْهِ : اس پر] [الَّيْلُ : رات] [رَاٰ : اس نے دیکھا] [كَوْكَبًا : ایک ستارہ] [قَالَ : فرمایا] [هٰذَا : یہ] [رَبِّيْ : میرا رب] [فَلَمَّآ : پس جب] [اَفَلَ : وہ غائب ہوگیا] [قَالَ : فرمایا] [لَآ : نہیں] [اُحِبُّ : میں پسند کرتا] [الْاٰفِلِيْنَ : غائب ہوجانے والوں کو]

ترجمہ : پھر جب ان پر رات نے اندھیرا کر دیا تو انھوں نے (ایک) ستارہ دیکھا (تو) کہا: (کیا تمہارے خیال میں) یہ میرا رب ہے؟ پھر جب وہ ڈوب گیا تو (اپنی قوم کو سنا کر) کہنے لگے: میں ڈوب جانے والوں کو پسند نہیں کرتا

تشریح:

انبیائے کرام (علیہم السلام) اعلان نبوت سے پہلے بھی اور بعد میں بھی معصوم، توحید پرست اور کفر وشرک سے پاک ہوتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی ظالم کو نبی نہیں بناتا۔ (قرآن: 2:124) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) توحید پرست تھے مگر ان کی قوم سورج، چاند، ستاروں اور بتوں کی عبادت کرتی تھی۔ آپ نے اپنی قوم کو شرک سے نفرت دلانے اور توحید سے عقیدت پیدا کرنے کے لیے بڑے حکیمانہ انداز میں عام فہم مثالیں بیان کیں، یعنی اے میری قوم! تم سورج، چاند اور ستاروں کو رب سمجھتے ہو اور تمہارے خیال میں یہ میرے بھی رب ہیں۔ آیئے ذرا حقائق کی روشنی میں تجزیہ کرتے ہیں کہ کیا واقعی یہ میرے رب ہو سکتے ہیں؟ ہر گز نہیں۔ یہ جب غروب ہو جاتے ہیں تو اس وقت تم کس کی عبادت کروگے۔ نیز یہ خود مجبور ہیں، وقت معین پر طلوع ہوتے ہیں اور غروب ہوتے ہیں اور اس کے خلاف کرنے پر قادر نہیں ہیں تو جو خود تغیر پذیر ہیں اور اپنے وجود اور اپنی حرکات میں کسی دوسری طاقت کے تابع ہیں وہ ہمارے معبود اور رب کیسے ہو سکتے ہیں، اس لیے میں تو ہمیشہ کی طرح تمہارے شرک سے بیزار ہوں اور تمہارے باطل خداؤں سے منہ پھیر کر صرف اسی کی طرف توجہ کرتا ہوں جو سورج، چاند، ستاروں اور زمین و آسمان کا خالق ومالک ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے مجھے تمہاری اس گمراہی سے بچائے رکھا۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

جس شہر میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی ولادت ہوئی اس کا نام ار تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں آثار قدیمہ کے ماہرین نے کھدائی کرکے اس کو دریافت کرلیا ہے۔ اور اس سے جو تحریریں اور دوسری اشیاد ستیاب ہوئی ہیں ان سے آپ کے زمانہ کے لوگوں کے مذہبی، تمدنی اور معاشی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ سر لیونا ڈوولی (Sir Leonard woolly) نے اپنی کتاب (Abraham) میں جو لندن میں 1932ء میں شائع ہوئی ہے ماہرین آثار قدیمہ کے جو تاثرات قلم بند کئے ہیں ذیل میں کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے :۔

"اندازہ کیا گیا ہے کہ 2100 قبل مسیح کے لگ بھگ زمانہ میں جسے اب عام طور پر محققین حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے ظہور کا زمانہ تسلیم کرتے ہیں۔ شہر "ار" کی آبادی ڈھائی لاکھ کے قریب تھی اور بعید نہیں کہ پانچ لاکھ ہو۔ بڑا صنعتی اور تجارتی مرکز تھا۔ جس ریاست کا یہ صدر مقام تھا اس کے حدود موجودہ حکومت عراق سے شمال میں کچھ کم اور مغرب میں کچھ زیادہ تھے۔ ملک کی بیشتر آبادی صنعت و تجارت پیشہ تھی۔ اس عہد کی جو تحریرات آثار قدیمہ کے کھنڈروں سے دستیاب ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں ان لوگوں کا نقطہ نظر خالص مادہ پرستانہ تھا۔ دولت کمانا اور زیادہ سے زیادہ آسائش فراہم کرنا ان کا سب سے بڑا مقصد حیات تھا۔ سود خوری کثرت سے پھیلی ہوئی تھی۔ آپس میں بہت مقدمہ بازیاں ہوا کرتی تھیں۔ آبادی تین طبقوں پر مشتمل تھی۔ (1) عمیلو : یہ اونچے طبقہ کے لوگ تھے۔ جن میں پجاری، حکومت کے عہدہ دار اور فوجی افسر وغیرہ شامل تھے۔ اس طبقہ کو خاص امتیازات حاصل تھے۔ ان کے فوجداری اور دیوانی حقوق دوسروں سے مختلف تھے۔ اور ان کے جان و مال کی قیمت دوسروں سے بڑھ کر تھی۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے خاندان کا اسی طبقہ میں شمار ہوتا تھا۔
(2) مشکینو : یہ تجار، اہل صنعت اور زراعت پیشہ لوگ تھے۔ (3) آردو : یعنی غلام، مزدور پیشہ۔

ار کے کتبات میں تقریباً پانچ ہزار خداؤں کے نام ملتے ہیں۔ ملک کے مختلف شہروں کے الگ الگ خدا تھے۔ ہر شہر کا ایک خاص محافظ ہوتا تھا جو رب البلد یا مہادیو سمجھا جاتا تھا۔ ار کا رب البلد "ننار" (چاند دیوتا) تھا۔ دوسرا بڑا شہر "لرسہ" تھا۔ اس کا رب البلد "شماش" (سورج دیوتا) تھا۔ ان بڑا خداؤں کے ماتحت بہت سے چھوٹے خدا بھی تھے جو زیادہ تر آسمانی تاروں اور سیاروں میں سے تھے۔ ان دیوتاؤں اور دیویوں کی شبیہیں بتوں کی شکل میں بنائی گئی تھیں اور تمام مراسم عبادت انہی کے آگے بجالائے جاتے تھے۔

نںار کا بت ار میں سب سے اونچی پہاڑی پر ایک عالی شان عمارت میں نصب تھا۔ مندر میں بکثرت عورتیں دیوتا کے نام پر وقف تھیں اور ان کی حیثیت دیوداسیوں (Religious Prostitutes) کی تھی۔ وہ عورت بڑی معزز خیال کی جاتی تھی جو خدا کے نام پر اپنی بکارت قربان کردے۔ کم از کم ایک مرتبہ اپنے آپ کو "راہ خدا" میں کسی اجنبی کے حوالہ کرنا عورت کے لیے ذریعہ نجات خیال کیا جاتا تھا۔

نںار محض دیوتا ہی نہ تھا۔ بکثرت باغ، مکانات اور زمینیں اس کے مندر کے لیے وقف تھیں۔ بہت سے کارخانے مندر کے ماتحت قائم تھے۔
ار کا شاہی خاندان جو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے زمانہ میں حکمران تھا اس کے بانی اول کا نام ار نمو تھا جس نے 2300 برس قبل مسیح ایک وسیع سلطنت قائم کرلی تھی۔ اسی سے اس خاندان کو نمو کا نام ملا جو عربی میں جا کر نمرود ہوگیا۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی ہجرت کے بعد اس خاندان اور اس قوم پر مسلسل تباہی نازل ہونی شروع ہوئی۔ پہلے عیلامیوں نے ار کو تباہ کیا اور نمرود کو نںار کے بت سمیت پکڑ کر لے گئے۔ پھر لرسہ میں ایک عیلامی حکومت قائم ہوئی جس کے ماتحت ار کا علاقہ غلام کی حیثیت سے رہا۔ ان تباہیوں نے نںار کے ساتھ ار کے لوگوں کا عقیدہ متزلزل کردیا۔ (ماخوذ از تفہیم القرآن)

مندرجہ بالا اقتباس سے معلوم ہوا کہ آپ کے ہم وطن ستاروں، چاند اور سورج کے پرستار تھے۔ اس لیے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) ان کے معبودوں کے حالات سے ہی ان کی خدائی پر ضرب کاری لگا رہے ہیں کہ جن کے یہ حالات ہوں۔ جن کو ایک جگہ قرار نصیب نہ ہو۔ جو کبھی طلوع ہو رہے ہیں اور کبھی غروب ہو رہے ہیں۔ جن کے طلوع و غروب کا وقت بھی ان کے اختیار میں نہ ہو۔ اور ان کی گردش کا جو راستہ مقرر ہے اس سے بھی بال برابر ادھر ادھر نہ ہو سکتے ہوں۔ جو ایک بے اختیار غلام کی طرح انقیاد و اطاعت کا پٹہ گلے میں ڈالے صبح و شام تعمیل حکم میں سرگرداں نظر آتے ہوں انھیں معبود بنانا، ان کو خدا سمجھنا کتنی نادانی اور بے سمجھی ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

مفسرین اور مؤرخین کا بیان ہے کہ نمرود بن کنعان بڑا جابر بادشاہ تھا، سب سے پہلے اسی نے تاج سر پر رکھا۔ یہ بادشاہ لوگوں سے اپنی پوجا کرواتا تھا، کاہن اور نجومی بڑی کثرت سے اس کے دربار میں حاضر رہتے تھے۔ نمرود نے خواب دیکھا کہ ایک ستارہ طلوع ہوا ہے اور اس کی روشنی کے سامنے آفتاب و ماہتاب بالکل بے نور ہو گئے۔ اس سے وہ بہت خوف زدہ ہوا اور اس نے کاہنوں سے اس خواب کی تعبیر دریافت کی۔ انھوں نے کہا کہ اس سال تیری سلطنت میں ایک فرزند پیدا ہوگا جو تیرے ملک کے زوال کا باعث ہوگا اور تیرے دین والے اس کے ہاتھ سے ہلاک ہوں گے۔ یہ خبر سن کر وہ پریشان ہوا اور اس نے حکم دیا کہ جو بچہ پیدا ہو قتل کر ڈالا جائے اور مرد عورتوں سے علیحدہ رہیں اور اس کی نگہبانی کے لیے ایک محکمہ قائم کر دیا گیا مگر تقدیراتِ الٰہیہ کو کون ٹال سکتا ہے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی والدہ ماجدہ حاملہ ہوئیں اور کاہنوں نے نمرود کو اس کی بھی خبر دی کہ وہ بچہ حمل میں آگیا لیکن چونکہ حضرت کی والدہ صاحبہ کی عمر کافی کم تھی ان کا حمل کسی طرح پہچانا ہی نہ گیا۔ جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی ولادت کا وقت قریب آیا تو آپ کی والدہ اس تہ خانے میں چلی گئیں جو آپ کے والد نے شہر سے دور کھود کر تیار کیا تھا، وہاں آپ (علیہ السلام) کی ولادت ہوئی اور وہیں آپ رہے۔ پتھروں سے اس تہ خانہ کا دروازہ بند کر دیا جاتا تھا، روزانہ والدہ صاحبہ دودھ پلا آتی تھیں اور جب وہاں پہنچتی تھیں تو دیکھتی تھیں کہ آپ (علیہ السلام) اپنی انگلی کا کنارہ چوس رہے ہیں اور اس سے دودھ برآمد ہوتا ہے۔ آپ (علیہ السلام) بہت جلد بڑھتے تھے۔ اس میں اختلاف ہے کہ آپ (علیہ السلام) تہ خانہ میں کتنا عرصہ رہے، بعض کہتے ہیں سات برس اور بعض نے کہا کہ تیرہ برس اور بعض نے کہا کہ سترہ برس رہے۔

اسلامی عقیدہ اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا واقعہ

یہ مسئلہ یقینی ہے کہ انبیاء کرام (علیہ السلام) ہر حال میں معصوم ہوتے ہیں اور وہ شروع ہی سے ہر وقت معرفتِ الٰہی سے شناسا ہوتے ہیں۔ اس عقیدہ کو ذہن نشین رکھتے ہوئے اس آیت اور اس کے بعد والی دو آیات کی تفسیر سمجھنے کیلئے قرآن پاک میں بیان کردہ واقعے کو ذیل میں ذرا تفصیل سے پڑھئے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے ابتدا ہی سے توحید کی حمایت اور کفریہ عقائد کا رد کرنا شروع فرما دیا اور پھر جب ایک سوراخ سے رات کے وقت آپ (علیہ السلام) نے زہرہ یا مشتری ستارہ کو دیکھا تو لوگوں کے سامنے توحید باری تعالیٰ کی دلیل بیان کرنا شروع کر دی کیونکہ اس زمانہ کے لوگ بت اور ستاروں کی پرستش کرتے تھے تو آپ (علیہ السلام) نے ایک نہایت نفیس اور دل نشیں پیرایہ میں انھیں غور و فکر کی طرف رہنمائی کی جس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ تمام جہان عدم سے وجود میں آنے والا ہے اور پھر ختم ہونے والا ہے تو یہ معبود نہیں ہو سکتا بلکہ تمام جہان بذات خود کسی وجود میں لانے والی ذات کا محتاج ہے جس کے قدرت و اختیار سے اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی

ہیں۔ چنانچہ پہلے آپ (علیہ السلام) نے ستارے کو دیکھا تو فرمایا کہ "کیا اسے میرا رب کہتے ہو؟ پھر جب وہ ڈوب گیا تو فرمایا کہ "میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی جس میں ایسے تغیرات ہو رہے ہیں وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ پھر اس کے بعد آپ (علیہ السلام) نے چاند کو چمکتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: کیا اسے میرا رب کہتے ہو؟ پھر جب وہ ڈوب گیا تو فرمایا: اگر مجھے میرے رب عَزَّوَجَلَّ نے ہدایت نہ دی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں سے ہو جاتا۔ اس میں اس قوم کو تنبیہ ہے کہ جو چاند کو معبود مانتے تھے، انھیں آپ (علیہ السلام) نے گمراہ قرار دیا اور خود کو ہدایت پر۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ آپ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی یہ باتیں ان کا رد کرنے کیلئے ہی تھیں۔ چاند کے معبود نہ ہونے پر بھی آپ (علیہ السلام) نے یہی دلیل بیان فرمائی کہ اس کا ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہونا قابل فنا ہونے کی دلیل ہے۔ پھر اس کے بعد آپ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے سورج کو جگمگاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ "کیا اسے میرا رب کہتے ہو؟ یہ تو ان سب سے بڑا ہے، پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو فرمایا: اے میری قوم! میں ان چیزوں سے بیزار ہوں جنہیں تم اللہ عَزَّوَجَلَّ کا شریک ٹھہراتے ہو۔ یوں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے ثابت کر دیا کہ ستاروں میں چھوٹے سے بڑے تک کوئی بھی رب ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا، ان کا معبود ہونا باطل ہے اور قوم جس شرک میں مبتلا ہے آپ (علیہ السلام) نے اس سے بیزاری کا اظہار کر دیا اور اس کے بعد دین حق کا بیان فرمایا جو اگلی آیتوں میں آ رہا ہے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے ستارے، چاند اور سورج کے بارے میں فرامین لوگوں کو سمجھانے کیلئے تھے اور معاذاللہ، اپنے بارے میں نہ تھے اس کی بہت واضح دلیل یہ بھی ہے کہ جب آپ (علیہ السلام) نے ستارے، چاند اور سورج کے بارے یہ فرمایا تو کیا آپ (علیہ السلام) نے اس سے پہلے دن رات کے فرق کو اور سورج چاند کے غروب ہونے کو کبھی نہیں دیکھا تھا، ایسا تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ تو معلوم ہوا کہ سورج چاند ستارے کے حوالے سے آپ کا کلام صرف قوم کو سمجھانے کیلئے تھا اور اس چیز کا اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ بیان خود نیچے آیت نمبر 83 میں موجود ہے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پھر جب ان پر رات کو تاریکی پھیل گئی تو انھوں نے ایک ستارہ دیکھا انھوں نے کہا یہ میرا رب ہے؟ پھر جب وہ ڈوب گیا تو کہا میں ڈوب جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پھر جب انھوں نے جگمگاتا ہوا چاند دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے؟ پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا اگر میرا رب مجھے ہدایت پر برقرار نہ رکھتا تو میں ضرور گمراہ لوگوں میں سے ہو جاتا۔ پھر جب انھوں نے روشن آفتاب دیکھا تو کہا یہ رب ہے۔ (ان سب سے) بڑا ہے 'پھر جب وہ غروب ہو گیا تو انھوں نے کہا اے میری قوم میں ان سب سے بیزار ہوں جن کو تم اللہ کا شریک قرار دیتے ہو۔ میں نے اپنا رخ اس ذات کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ہے جب کہ میں باطل مذاہب سے اعراض کرنے والا ہوں، اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ (الانعام: ۷۶، ۷۹)

آیت مبارکہ :

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَىِٕنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ○77

لغۃ القرآن : فَلَمَّا : پھر جب] [رَاَ : اس نے دیکھا] [الْقَمَرَ : چاند کو] [بَازِغًا : چمکتا ہوا] [قَالَ : فرمایا] [هٰذَا : یہ] [رَبِّيْ : میرا رب] [فَلَمَّآ : پس جب] [اَفَلَ : وہ غائب ہوگیا] [قَالَ : فرمایا] [لَىِٕنْ : البتہ اگر] [لَّمْ : نہیں] [يَهْدِنِيْ : ہدایت دی مجھے] [رَبِّيْ : میرا رب] [لَاَكُوْنَنَّ :" تو " یقینا میں ہوجاؤں گا] [مِنَ : سے] [الْقَوْمِ : قوم] [الضَّآلِّيْنَ : گمراہوں]

ترجمہ : پھر جب چاند کو چمکتے دیکھا (تو) کہا : (کیا تمہارے خیال میں) یہ میرا رب ہے ؟ پھر جب وہ (بھی) غائب ہوگیا تو (اپنی قوم کو سنا کر) کہنے لگے : اگر میرا رب مجھے ہدایت نہ فرماتا تو میں بھی ضرور (تمہاری طرح) گمراہوں کی قوم میں سے ہو جاتا

تشریح :

یہ اصل میں اھذا ربی استفہام انکاریہ ہے۔ یعنی اے میری قوم کیا یہ میرا رب ہے ؟ ہرگز نہیں۔ یہ خیال کرنا کہ اس وقت حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو عرفان توحید حاصل نہ تھا اس لیے وہ ایک ٹمٹاتے ہوئے تارے کو اپنا رب سمجھنے لگے سخت غلطی ہے۔ پیغمبر کا دامن نبوت سے پہلے بھی کفر و شرک سے پاک ہوتا ہے۔ چاند کے متعلق بھی آپ نے یہی فرمایا تھا کہ ھذا ربی اور جب وہ بھی ڈوب گیا تو آپ فرماتے ہیں لئن لم یھدنی ربی اگر میرا رب مجھے ہدایت نہ فرماتا تو جس گمراہی میں میری ساری قوم گرفتار تھی میں بھی اس سے نہ بچ سکتا۔ ان الفاظ سے اس امر کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے کہ آپ کو دل "ربی " (میرا رب) کے یقین اور ایمان سے منور اور روشن تھا۔ ورنہ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ ابھی تک حقیقی رب کا کوئی تصور ان کے ذہن میں نہ تھا اور چاند کو آپ نے رب مان لیا تھا تو جب اس کے ڈوب جانے سے اس کی خدائی کا طلسم بھی ٹوٹ گیا تو آپ کو حیرت کا اظہار کرنا چاہیے تھا کہ لو جسے خدا سمجھ رہے تھے وہ تو فانی نکلا۔ اب کسے خدا مانا جائے۔ آپ نے اظہار حیرت نہیں کیا بلکہ چاند کے غروب ہونے پر آپ نے اپنی قوم کے باطل عقیدہ کو غلط ثابت کرنے کے بعد فورا فرمایا۔ لئن لم یھدنی ربی۔ یعنی وہ رب نہیں جسے تم نے رب سمجھ رکھ ہے بلکہ حقیقی رب تو وہ ہے جو میرا پروردگار ہے جو مجھے ہر باطل سے بچا کر راہ حق پر چلا رہا ہے۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

ستارے ' چاند اور سورج کی الوہیت کے عقیدہ کو باطل کرنا

جب رات کا اندھیرا چھا گیا تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے ایک بہت چمک دار ستارہ دیکھا 'انھوں نے اپنی قوم سے اثناء استدلال میں فرمایا یہ میرا رب ہے 'حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا یہ قول قوم کے سامنے ستارے کی ربوبیت کے انکار کی تمہید تھی اور ان کے خلاف حجت قائم کرنے کا مقدمہ تھا 'تو پہلے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے ان کے دماغ میں یہ بات ڈالی کہ وہ ان کے موافق ہیں۔ پھر مشاہدہ اور عقل سے اس قول کا رد فرمایا 'چنانچہ جب وہ غروب ہو گیا تو فرمایا یہ کیا بات ہوئی؟ میں غروب ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا 'کیونکہ خدا وہ ہے جس کا تمام کائنات پر غلبہ ہے 'وہ تمام دنیا کو ہر وقت دیکھنے والا ہے 'ان کی باتوں کو سننے والا ہے 'وہ کبھی کسی چیز سے غافل ہوتا ہے 'نہ غائب ہوتا ہے۔
ستارہ کی الوہیت کے عقیدہ کو باطل کرنے کے بعد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) چاند کی الوہیت کو باطل کرنے کے درپے ہوئے 'جو ستارہ سے زیادہ روشن تھا اور اسی طرح انکار کی تمہید کے طور فرمایا یہ میرا رب ہے اور جب وہ بھی غروب ہو گیا تو اپنی قوم کو سنانے کے لیے فرمایا اگر میرا رب مجھے ہدایت پر برقرار نہ رکھتا تو میں ضرور گمراہ لوگوں میں سے ہو جاتا۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے اس قول میں ان کی قوم پر تعریض ہے کہ وہ گمراہی کا شکار ہے اور اس میں یہ تنبیہ ہے کہ جس نے چاند کو خدا مانا وہ بھی گمراہ ہے اور اس میں یہ رہنمائی ہے کہ الوہیت کے متعلق صحیح عقیدہ کی معرفت وحی الٰہی پر موقوف ہے۔
چاند کی خدائی کے عقیدہ کو باطل کرنے کے بعد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سورج کی الوہیت کے عقیدہ کو باطل کرنے کی طرف متوجہ ہوئے 'تمام سیاروں میں سب سے عظیم سیارہ سورج ہے۔ اس کی حرارت اس کی روشنی اور اس کا نفع سب سے زیادہ ہے۔ اس لیے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اس کے انکار کی تمہید کے طور پر فرمایا یہ میرا رب ہے 'یہ تمام ستاروں اور سیاروں میں سب سے بڑا ہے۔ سو یہی سب کی بہ نسبت الوہیت کے زیادہ لائق ہے اور جب دیگر ستاروں کی طرح سورج بھی ان کے افق سے غروب ہو گیا 'تب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے عقیدہ کی تصریح کی اور اپنی قوم کے شرک سے بیزاری کا اظہار کیا اور فرمایا اے میری قوم! میں ان سب سے بیزار ہوں جن کو تم اپنا رب قرار دیتے ہو 'میں آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنے والے کی طرف اپنا رخ کر چکا ہوں 'میں ہر گمراہی کے عقیدہ سے منہ موڑ کر دین حنیف 'دین حق اور دین توحید پر ثابت قدم اور برقرار ہوں۔ میں ان مشرکوں کے گروہ سے نہیں ہوں 'جو اللہ کو چھوڑ کر خود ساختہ معبودوں کی پرستش کرتے ہیں میں اس کی عبادت کرتا ہوں جو تمام کائنات کا خالق 'اس کا مدبر اور اس کا مربی ہے 'جس کے قبضہ وقدرت میں ہر چیز ہے۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا ستارے کو "ھذا ربی" کہنا شک کی بنا پر نہیں تھا"

اس استدلال میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے جو یہ فرمایا تھا یہ میرا رب ہے 'یہ آپ نے بطور تنزل فرمایا تھا کہ اگر بر سبیل فرض یہ ستارہ میرا رب ہو تو اس کا غروب ہو جانا اس کے رب ہونے کی تکذیب کرتا ہے اور یا یہاں استفہام محذوف ہے 'جس کا آپ نے ذکر نہیں فرمایا کہ کہیں قوم بات اور استدلال مکمل ہونے سے پہلے ہی بدک نہ جائے 'اس لیے آپ نے سوال کو دل میں رکھ کر فرمایا یہ میرا رب ہے 'اور آپ کا منشا تھا 'کیا یہ میرا رب ہے؟ یہ توجیہات اس لیے ضروری ہیں کہ نبی ایک آن کے لیے بھی حقیقتاً ستارہ کو اپنا رب نہیں کہہ سکتا اور نہ کبھی اسے اللہ کی توحید میں تردد ہو سکتا ہے 'ہر نبی پیدائشی مومن اور نبی ہوتا ہے۔ نیز حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے متعلق قرآن مجید میں تصریح ہے کہ وہ اپنی قوم کے ساتھ مناظرہ کرنے سے پہلے بھی مومن تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(آیت) "ولقد اتینا ابراھیم رشدہ من قبل و کنا بہ علمین۔ اذ قال لابیہ وقومہ ما ھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون"۔ (الانبیاء: ۵۲۔۵۱)

ترجمہ: اور بیشک ہم نے پہلے ہی سے ابراہیم کو ہدایت عطا فرمادی تھی اور ہم انھیں خوب جانتے تھے اور جب انھوں نے اپنے (عرفی) باپ اور اپنی قوم سے کہا یہ کیسے بت ہیں جن کی پرستش پر تم جمے بیٹھے ہو۔

(آیت) "ان ابرھیم کان امۃ قانتا للہ حنیفا ولم یك من المشرکین، شاکرا لانعمہ اجتبہ وھدہ الی(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری مستقیم)"۔ (النحل: ۱۲۱۔۱۲۰)

ترجمہ: بیشک ابراہیم اپنی ذات میں ایک فرمان بردار امت تھے باطل سے الگ حق پر قائم رہنے والے اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے، اس کی نعمتوں پر شکر کرنے والے 'اللہ نے ان کو چن لیا اور ان کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت دی۔

استدلال سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا

ان آیات میں الوہیت اور اللہ تعالیٰ کی توحید کے اثبات کے لیے مناظرہ کا ثبوت ہے اور یہ کہ دین حق کے اثبات اور اس کی نصرت کے لیے مناظرہ کرنا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی سنت ہے۔ ان آیات میں یہ بتایا ہے کہ جو غروب یا غائب ہو جائے 'وہ خدا نہیں ہو سکتا اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا جسم نہیں ہو سکتا 'کیونکہ اگر وہ جسم ہوتا تو وہ کسی ایک افق کے سامنے ہوتا تو دوسرے افق سے غائب ہوتا۔ نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خدا صفات حادثہ کا محل نہیں ہو سکتا کیونکہ جو محل حوادث ہو وہ متغیر ہوگا اور متغیر خدا نہیں ہو سکتا۔ جس طرح غروب ہونے والا خدا نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں بھی تغیر کا معنی ہے۔ نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ عقائد میں تقلید جائز نہیں ہے 'بلکہ عقائد دلائل پر مبنی ہوتے ہیں ورنہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے اس استدلال سے یہ بھی ثابت ہوا کہ عقائد میں تقلید جائز نہیں ہے 'بلکہ عقائد دلائل پر مبنی ہوتے ہیں ورنہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے اس استدلال کا کوئی فائدہ نہ ہوتا اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انبیاء

(علیہم السلام) کے عقائد دلائل پر مبنی ہوتے ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مخلوق کے احوال سے استدلال کیا جائے۔ جس طرح حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے ستارہ ' چاند اور سورج کے غروب ہونے سے یہ استدلال کیا کہ ڈوبنے والا اور متغیر خدا نہیں ہو سکتا۔ (تفسیر تبیان القرآن۔غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ○78

لغۃ القرآن: فَلَمَّا : پھر جب] [رَاَ : اس نے دیکھا] [الشَّمْسَ : سورج] [بَازِغَةً : چمکتا ہوا] [قَالَ : فرمایا] [هٰذَا : یہ] [رَبِّيْ : میرا رب] [هٰذَآ : یہ] [اَكْبَرُ : زیادہ بڑا ہے] [فَلَمَّآ : پس جب] [اَفَلَتْ : وہ " بھی " ڈوب گیا] [قَالَ : فرمایا] [يٰقَوْمِ : اے میری قوم] [اِنِّيْ : بیشک میں] [بَرِيْۗءٌ : بیزار ہوں] [مِّمَّا : "اس "سے جو] [تُشْرِكُوْنَ : تم سب شریک بناتے ہو]

ترجمہ : پھر جب سورج کو چمکتے دیکھا (تو) کہا: (کیا اب تمہارے خیال میں) یہ میرا رب ہے (کیونکہ) یہ سب سے بڑا ہے؟ پھر جب وہ (بھی) چھپ گیا تو بول اٹھے: اے لوگو! میں ان (سب چیزوں) سے بیزار ہوں جنہیں تم (االلہ کا) شریک گردانتے ہو

تشریح:

یہ تیسرا تجربہ ہے اور یہ تجربہ اس کائنات کے سب سے بڑے کرے کے ساتھ ہوا جسے دیکھا جا سکتا ہے۔ جس کی ضو پاشیاں عیاں ہیں اور جس کی گرمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ سورج تو روز طلوع و غروب ہوتا رہتا ہے لیکن وہ آج حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی نظروں میں بالکل ایک نئی چیز ہے۔ (وہ نئے زاویئے سے اسے دیکھ رہے ہیں) آج تو ابراہیم ان تمام چیزوں کو اس زاویئے سے جانچ رہے ہیں کہ آیا ان میں سے کوئی چیز اس قابل ہے کہ اسے الہ تسلیم کیا جائے اس پر دل مطمئن بھی ہو جائے اور اس پریشانی اور حیرت انگیز مسئلے کے حل کی طویل جدوجہد میں یہ امر فیصلہ کن ہو۔

(آیت) "قال ھذا ربی ھذا اکبر"۔ (٦ : ٧٨) "کہا یہ میرا رب ہے ! یہ سب سے بڑا ہے۔" "لیکن تعجب ہے کہ یہ بھی غائب ہو رہا ہے۔

اس مقام پر دونوں حقائق آپس میں جرٹے ہیں۔ اس اتصال والتباس سے ایک چنگاری نکلتی ہے۔ یہاں فطرت صادقہ اور ذات کبریا کے درمیان اتصال ہو جاتا ہے۔ قلب سلیم روشنی سے معمور ہو جاتا ہے اور پھر یہ روشنی پوری کائنات کو منور کر دیتی ہے۔ اس کے ذریعے انسان کی عقل و فکر بھی روشن ہو جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو مطلوب الٰہی مل جاتا ہے۔ جس طرح ان کی فطرت اور ان کے شعور میں وہ موجود تھا۔ اس کا تصور ان کے فہم وادراک میں بھی آجاتا ہے اور فطرت کے شعور احساس اور عقلی ادراک کے درمیان اتحاد و توافق ہو جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو اپنا رب والہ مل جاتا ہے۔ لیکن یہ الہ کسی چمکدار ستارے کی شکل میں بھی نہیں۔ کسی طلوع ہونے والے چاند کی شکل میں نہیں ' بلند ہونے والے سورج کی شکل میں نہیں ' کسی ایسی شکل میں نہیں جسے آنکھ دیکھ سکے ' کسی ایسی صورت میں بھی نہیں جسے انسان چھو سکے ' بلکہ یہ الہ ان کے شعور اور فطرت میں ہے ' ان کی عقل اور فہم میں ہے ' اس پوری کائنات میں ہر جگہ موجود ہے۔ وہ ان تمام مخلوقات کا خالق ہے جسے آنکھ دیکھ سکتی ہے جسے محسوس کیا جاسکتا ہے یا جس کا انسانی عقل ادراک کر سکتی ہے۔

اب وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی اور ان کی قوم کے درمیان اب مکمل جدائی کا وقت آگیا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ آپ ان تمام معبودات باطلہ سے اپنی اعلانیہ برات کا اظہار کر دیں اور دو ٹوک انداز میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے ان کے نقطہ نظر اور ان کے منہاج حیات اور مشرکانہ عقائد وخیالات کو یکسر رد کر دیں۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ یہ لوگ ذات کبریائی کے بالکل منکر نہ تھے لیکن صورت حال ایسی تھی کہ وہ لوگ حقیقی الہ کے ساتھ ان جھوٹے خداؤں کو شریک کرتے تھے اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) الہ العالمین کی طرف اس طرح متوجہ ہوئے تھے کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتے تھے۔

" تو ابراہیم پکار اٹھا " اے برادران قوم ! میں ان سب سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ میں یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا ہے اور میں ہر گز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

اب گویا ان کا رخ آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے والے کی طرف مڑ گیا اور اس قدر یک سوئیکے ساتھ مڑا کہ اس میں شرک کا شائبہ تک نہ رہا۔ انھوں نے فیصلہ کن بات کر دیں یقین محکم کا اظہار کر دیا اور آخری طور پر اپنا رخ متعین کر لیا۔ اب نہ تو کوئی تردد ہے ' نہ الجھن۔ عقل وادراک اس طرح روشن ہو گئے جس طرح اس کا شعور اور ضمیر روشن تھے۔

ایک بار پھر ہم آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا خوش کن منظر دیکھ رہے ہیں۔ یہ ایک نظریہ حیات کا منظر ہے جو نفس انسانی کے اندر نمودار ہو گیا ہو ' جو کسی دل پر غالب اور حاوی ہو گیا ہو ' جو پوری طرح واضح اور نمایاں ہو گیا ہو اور اس سے ہر قسم کا غبار چھٹ گیا ہو۔ یہ منظر ہمارے سامنے آتا ہے اور اس کی حالت یہ ہے کہ ایک انسان کی شخصیت پر وہ چھایا ہوا ہے اور اس نے اس شخصیت کے ہر پہلو کو ڈھانپ لیا ہے۔ اس شخصیت کا کاسہ دل کو شراب اطمینان سے بھر دیا ہے اب اسے اپنے اس رب پر پورا اعتماد ہے جسے اس نے طور پر پالیا ہے اور وہ اس کے ارد گرد کے وجود پر چھایا ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جو سیاق کلام کے آنے والے جملوں کے اندر اچھی طرح نمایاں ہے۔ (فی ظلال القرآن)

یہاں سے ابراہیم (علیہ السلام) کے بچپن کے وہ احوال بتائے جارہے ہیں جب آپ اس غار سے نکل کر باہر آئے جہاں آپ کی ولادت ہوئی اور پہلی بار اپنے شام و سحر اور ارض و سما کی وسعت کا نظارہ کیا اس وقت آپ کی زبان مبارک سے جو پہلے الفاظ نکلے وہ اللہ رب العزت نے یہاں قرآن مجید میں درج فرمائے ہیں۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی ولادت اور بچپن کے احوال

حضرت سدی (رض) سے مروی ہے کہ نمرود نے خواب میں دیکھا کہ ایک ستارے کے طلوع سے شمس القمر بے نور ہو گئے ہیں کاہنوں نے اسے بتایا کہ تمہاری دارالحکومت میں اس سال کے دوران ایک بچہ پیدا ہونے والا ہے کہ تمہاری حکومت اور تمہارے اہل و عیال اس کے ہاتھ پر تباہ ہوں گے۔ نمرود نے اپنے شہر کے مردوں اور عورتوں کو الگ الگ کر دیا تاکہ وہ بچہ پیدا نہ ہو مگر کسی طرح ابراہیم (علیہ السلام) کے والدین کا ملاپ ہوا اور آپ کی والدہ امید سے ہو گئیں مگر انھیں حمل کے آثار ظاہر نہ ہوئے ہار یہ بات چھپی رہی۔ جب العدۃ کا وقت قریب آیا تو وہ جنگل میں چلی گئیں۔ وہاں ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے۔

محمد بن اسحاق کہتے ہیں ابراہیم (علیہ السلام) کی والدہ نے انھیں ایک غار میں رکھا اور اوپر سے بڑے پتھر کے ساتھ غار کا منہ بند کر دیا۔ انھیں ڈر تھا کہ اگر نمرود کے لوگوں کو بچے کا علم ہوا تو وہ اسے قتل کر دیں گے۔ پھر چند دن کے بعد وہ ابراہیم علیہ السلام کو دیکھنے وہاں گئیں تو دیکھا کہ وہ اپنی انگلیاں چوس رہے ہیں۔ ایک انگلی سے دودھ، ایک سے پانی، ایک سے شہد اور ایک سے مکھن نکل رہا ہے اور وہ اسے چوس رہے ہیں۔ محمد بن اسحاق سے مروی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام ایک دن میں ایک مہینے کے برابر بڑھتے تھے اور ایک مہینے میں ایک سال کے برابر۔ وہ غار میں پندرہ ماہ رہے، پھر ان کی والدہ ایک دن انھیں رات کے وقت وہاں سے لے کر باہر نکلیں تو انھوں نے آسمان و زمین میں نظر عبرت ڈال کر غور و فکر کیا، آپ نے دیکھا لوگ ستاروں اور شمس و قمر کو مانتے اور انھیں سجدے کرتے ہیں۔

چنانچہ رات کے پہلے پہر اپنے ایک بڑا ستارہ دیکھا جو مشتری یا زہرہ تھا۔ آپ نے فرمایا کیا یہ میرا خدا ہے جب وہ ڈوب گیا تو آپ نے کہا جو ڈوب جائے وہ معبود نہیں ہو سکتا۔ میں اسے خدا ماننا پسند نہیں رکھتا۔ پھر رات کے پچھلے پہر چاند نکل آیا۔ آپ نے فرمایا کیا یہ میرا خدا ہے؟ جب وہ ڈوب گیا تو آپ نے کہا اگر میرے رب نے مجھے پہلے سے ہدایت دی ہوتی یعنی بچپن ہی سے مجھے نور معرفت سے نہ نوازا ہوتا تو میں بھی اسی طرح پرستوں میں سے ہو جاتا پھر ابراہیم (علیہ السلام) نے دن چڑھنے پر سورج کو چمکتے دیکھا تو کہا کیا یہ میرا خدا ہے یہ بڑا ہے جب وہ ڈوب گیا تو آپ نے کہا لوگو! میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں (بغوی جلد 2 صفحہ 150۔ خازن جلد 2 صفحہ 151۔ در منثور جلد 3 صفحہ 305 مطبوعہ دارالفکر بیروت)

یہاں تین بار ھذا ربی جملہ استفہامیہ ہے اصل میں اھذا ربی یعنی ابراہیم (علیہ السلام) نے ستارے چاند اور سورج کو دیکھ کر فرمایا کیا یہ میرا رب ہے؟ جیسے قرآن میں ہے: اَفَاۡئِنۡ مِّتَّ فَهُمُ الۡخٰلِدُوۡنَ۔ اگر آپ فوت ہو جائیں تو کیا کفار ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ (انبیاء۔ 34) یہ اصل میں اَفَھُمُ الْخٰلِدُوْنَ ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے ھذا ربی بطور استہزاء کہاں ہو جیسے جہنم میں کافر سے کہاں جائے گا ذُقۡ ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡكَرِيۡمُ۔ عذاب چکھو تم بڑے معزز و مکرم ہو۔ (دخان۔ 49)

معلوم ہوا انبیاء بچپن سے ہی ہدایت یافتہ ہوتے ہیں وہ زندگی بھر کسی گمراہ یا گناہ میں ملوث نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کہا گیا۔ وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ رُشۡدَهٗ مِنۡ قَبۡلُ۔ ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو پہلے ہی سے ہدایت دی تھی۔ (انبیاء: 51) اور

عیسیٰ (علیہ السلام) نے ماں کی گود میں کہا: قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا۔ "میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا ہے۔" (مریم: 30)۔ (برہان القرآن القران۔علامہ قاری محمد طیب صاحب)

آیت مبارکہ:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۚ﴿79﴾

لغۃ القرآن: اِنِّیْ : بیشک میں نے] [وَجَّهْتُ : رخ کرلیا] [وَجْهِيَ : اپنا چہرہ] [لِلَّذِيْ : اس کے لیے جس نے] [فَطَرَ : پیدا کیا] [السَّمٰوٰتِ : آسمانوں کی] [وَالْاَرْضَ : اور زمین کو] [حَنِيْفًا : سیدھی راہ والے] [وَمَآ : اور جو] [اَنَا : میں] [مِنَ : سے] [الْمُشْرِكِيْنَ : سب مشرک]

ترجمہ: بیشک میں نے اپنا رخ (ہر سمت سے ہٹا کر) یکسوئی سے اس (ذات) کی طرف پھیر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو بے مثال پیدا فرمایا ہے اور (جان لو کہ) میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں

تشریح:

سورج، چاند، تارے خدا نہیں تو پھر کون خدا ہے؟ اس کا جواب دیا کہ خدا وہ قدرت والا اور حکمت والا ہے جو ہر چیز پر غالب ہے کسی سے مغلوب نہیں جو ہر کا داتا ہے۔ کسی کا محتاج نہیں۔ وہ قدرت والا جس نے آسمانوں کو بھی پیدا فرمایا اور زمین کو بھی۔ میں تو ہر باطل سے منہ موڑ کر یکسوئی سے اسی کی طرف دل وجان سے متوجہ ہوں اور کسی بڑی سے بڑی چیز کو بھی اس کا شریک خیال نہیں کرتا۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) جب شہر میں آئے اور انھیں نمرود کو دکھانے لے گئے اور نمرود ایک بدصورت آدمی تھا، ابرہیم (علیہ السلام) نے اسے دیکھا کہ تخت پر بیٹھا ہے اور نہایت خوبصورت غلام اور لونڈیاں اس کے تخت کے گرد صف باندھے ہیں۔ انھوں نے پوچھا یہ کون شخص ہے جسے دکھانے مجھے لایا گیا ہے؟ جواب ملا کہ یہ سب کا خدا ہے۔ پھر پوچھا اس کے تخت کے گرد کون لوگ ہیں؟ جواب ملا کہ یہ سب اس کی مخلوق اور اس کے پیدا کئے ہوئے لوگ ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ یہ جواب سن کر مسکرانے لگے، اور فرمایا یہ کیسا خدا ہے جس نے دوسروں کو اپنے سے

بہتر بنایا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا، کہ وہ ان سب سے بہتر ہوتا۔ غرضیکہ حضرت ابراہیم برابر بتوں کی مذمت کیا کرتے اور اس سلسلے میں ان کی قوم ان سے جھگڑتی رہتی۔ (تفسیر اشرفی۔علامہ محمد مدنی اشرفی جیلانی)

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے جھوٹے معبودوں سے بیزاری ظاہر کرنے کے بعد اپنا عقیدہ اور دین حق کا اعلان فرمادیا چنانچہ فرمایا کہ "میں نے ہر باطل سے جدا ہو کر اپنا منہ اس اللہ عَزَّوَجَلَّ کی بارگاہ کی طرف کیا جس نے آسمان اور زمین بنائے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ یعنی اسلام کے سوا باقی تمام ادیان سے جدا رہ کر میں اللہ عَزَّوَجَلَّ کے سامنے جھکنے والا ہوں۔

حنیف کے معنی

اس آیت میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے خود کو حنیف فرمایا۔ حنیف کے معنی ہیں "تمام جھوٹے دینوں سے صاف اور ہر باطل سے جدا۔"

دینِ حق کے استحکام کی صورت

اس سے معلوم ہوا کہ دین حق کا قیام و استحکام جب ہی ہو سکتا ہے جب کہ تمام باطل دینوں سے بیزاری اور دین حق پر پختگی ہو۔ دین کے معاملے میں پلپلے پن کا مظاہرہ کرنے، سب کو اپنی اپنی جگہ درست ماننے اور سب مذاہب میں اتفاق اور اتحاد پیدا کرنے کی کوششیں کرنے سے دین حق کا استحکام ممکن نہیں۔

نماز سے پہلے پڑھا جانے والا وظیفہ

حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نماز شروع کرنے سے پہلے ایک وظیفہ پڑھا کرتے تھے، اس کے بارے میں حضرت علی المرتضیٰ (رض) فرماتے ہیں: تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب نماز شروع کرنے کے لیے کھڑے ہوتے تو یہ پڑھا کرتے تھے "وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ "میں نے ہر باطل سے جدا ہو کر اپنا منہ اس کی طرف کیا جس نے آسمان اور زمین بنائے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ بیشک میری نماز اور میری قربانیاں اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا رب ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں مسلمان ہوں۔ (تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری)

بس میں نے خدا کا دروازہ پکڑ لیا

یعنی ساری مخلوق سے یکسو ہو کر صرف خالق جل و علی کا دروازہ پکڑ لیا ہے جس کے قبضہ اقتدار میں سب علویات و سفلیات ہیں۔

ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے

صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ ہر مولود فطرت پر خلق ہوتا ہے۔ حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اللہ نے اپنے بندوں کو حنیف پیدا کیا ہے۔ یعنی خدا ہی کا ہو کر رہنے والا اور فرمایا اللہ تعالیٰ کی فطرت وہ ہے جس پر کہ انسان کی پیدائش ہوئی اور جو چیز جیسی پیدا کر دی گئی اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی

باطل معبودوں سے اظہار براءت کرنے کے بعد آئندہ کلام میں آپ نے قوم کو الٰہ حق کی ہستی کی طرف راہ نمائی کی جس کے وجود پر تمام ممکنات دلالت کر رہے ہیں چنانچہ فرمایا۔

انی وجهت وجهی للذی فطر السموت والارض حنیفا وما انا من المشرکین

میں سب کو چھوڑ کر اپنا منہ اس کی طرف موڑتا ہوں جس نے آسمان وزمین کو پیدا کیا اور میں اس کے ساتھ کسی اور کو ساجھی قرار دینے والوں میں سے نہیں ہوں۔ یعنی آسمان اور اس کی ساری کائنات اور زمین اور اس کی تمام موجودات اپنے وجود میں ایسی واجب الوجود ہستی کی محتاج ہیں جو ان کو عدم سے وجود میں لانے والی ہیں میں نے اسی کی طرف اپنا رخ پھیر لیا اور تمام مذاہب کو چھوڑ کر اسی کی اطاعت اختیار کر لی۔

(تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی)

آیت مبارکہ :

وَحَآجَّهٗ قَوۡمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوۡٓنِّىۡ فِى اللّٰهِ وَقَدۡ هَدٰٮنِ ؕ وَلَاۤ اَخَافُ مَا تُشۡرِكُوۡنَ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ رَبِّىۡ شَيۡــًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّىۡ كُلَّ شَىۡءٍ عِلۡمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوۡنَ ۝80

لغۃ القرآن: وَحَآجَّهٗ : اور جھگڑا کیا اس سے] [قَوۡمُهٗ : اس کی قوم نے] [قَالَ : اس نے کہا] [اَتُحَآجُّوۡٓنِّىۡ : کیا تم سب جھگڑتے ہو مجھ سے] [فِي : میں] [اللّٰهِ : اللہ] [وَقَدْ : حالانکہ تحقیق] [هَدٰنِ : اسی نے مجھے ہدایت دی] [وَلَآ : اور نہ " ان لوگوں کی جو "] [اَخَافُ : ڈرتا ہوں] [مَا : نہیں] [تُشْرِكُوْنَ : تم سب شریک بناتے ہو] [بِهٖٓ : اس کو] [اِلَّآ : مگر] [اَنْ : کہ] [يَّشَآءَ : چاہتا] [رَبِّيْ : میرا رب] [شَيْـًٔا : کچھ

بھی] [وَسِعَ : گھیر رکھا ہے] [رَبِّيْ : میرا رب] [كُلَّ : ہر] [شَيْءٍ : چیز] [عِلْمًا : " اپنے " علم سے] [اَفَلَا : تو کیا نہیں] [تَتَذَكَّرُوْنَ : تم سب غور کرتے]

ترجمہ : اور ان کی قوم ان سے بحث وجدال کرنے لگی (تو) انھوں نے کہا: بھلا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو حالانکہ اس نے مجھے ہدایت فرمادی ہے، اور میں ان (باطل معبودوں) سے نہیں ڈرتا جنہیں تم اس کا شریک ٹھہرا رہے ہو مگر (یہ کہ) میرا رب جو کچھ (ضرر) چاہے (پہنچا سکتا ہے)۔ میرے رب نے ہر چیز کو (اپنے) علم سے احاطہ میں لے رکھا ہے، سو کیا تم نصیحت قبول نہیں کرتے

تشریح : ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے دلائل کے سامنے وہ لاجواب ہوگئے تو پھر آپ سے جھگڑنے لگے اور کہنے لگے۔ اے ابراہیم تم خداؤں کی ہتک سے باز آجاؤ ورنہ ان کے غضب کا شکار ہو جاؤ گے اور پھر رہائی کی کوئی صورت نظر نہ آئے گی۔ آپ فرماتے ہیں کہ مجھے ایسی دھمکیاں کیوں دیتے ہو اپنے خداؤں کو کہہ دو کہ میرا جو بگاڑ سکتے ہیں بگاڑ لیں۔ مجھے ان سے ذرا اندیشہ نہیں۔ ہاں اگر میرا رب مجھے کسی آزمائش میں مبتلا کر دے تو مجھے مجال دم زدن نہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

قوم نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو ڈرانا شروع کر دیا
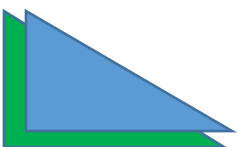
جب ابراہیم (علیہ السلام) نے ستاروں اور چاند سورج کے معبود ہونے کی نفی کی تو ستارہ پرست لوگ بگڑ گئے اور آپ سے جھگڑنے لگے کہ اس لڑکے کو ہمارے آباء واجداد کے دین پر طعن کرنے کی جرات کیسے ہوئی۔ آپ نے فرمایا تم اللہ کی توحید پر مجھ سے جھگڑتے ہو جبکہ اللہ نے اپنے کرم سے مجھے بچپن ہی سے نور ہدایت سے نوازا ہے۔ لوگوں نے کہا ہمیں ڈر ہے کہ ہمارے جھوٹے خدا اور یہ ستارے تمہیں تباہ کر دیں گے۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا جواب

آپ نے فرمایا مجھے ان چیزوں سے کوئی ڈر نہیں جنہیں تم اللہ کی عبادت میں شریک کرتے ہو البتہ اگر اللہ مجھے کسی تکلیف میں مبتلا کرنا چاہے تو الگ بات ہے وہ سب جانتا ہے کہ کسے رحمت دینی ہے کسے زحمت۔ تو تم نصیحت کیوں نہیں پکڑتے کہ بے جان بت اور حکم خدا کے تحت گردش کناں ستارے معبود نہیں ہو سکتے۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

فوائد

ا۔ ابراہیم (علیہ السلام) کی ہدایت فطری تھی کہ آپ بچپن شریف سے ہی عارف باللہ تھے۔ اس لیے آپ نے کبھی شرک، کفر کوئی گناہ نہ کیا۔ یہی حال سارے پیغمبروں کا ہے کہ وہ رب سے ہدایت یافتہ ہوتے ہیں۔

۲۔ کسی کے ذریعہ نقصان پہنچ سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ نفع نقصان مخلوق سے پہنچ جاتا ہے۔ مگر رب کے ارادے سے مخلوق سبب ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم نے ایسے خطرناک موقعہ پر بھی تقیہ نہ کیا بلکہ اپنے ایمان کا اعلان فرمادیا۔

۳۔ معلوم ہوا کہ پیغمبر کے دل میں مخلوق کی ایسی ہیبت نہیں آتی جو انھیں ادائے فرائض سے روک دے۔

(تفسیر نور العرفان۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی)

آیت مبارکہ:

وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ۭ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۘ81

لغۃ القرآن: وَكَيْفَ : اور کیونکر] [اَخَافُ : ڈرتا ہوں] [مَآ : نہیں] [اَشْرَكْتُمْ : تم نے شریک بنایا ہے] [وَلَا : اور نہ] [تَخَافُوْنَ : تم سب ڈرتے] [اَنَّكُمْ : کہ بیشک تم] [اَشْرَكْتُمْ : تم نے شریک بنایا ہے] [بِاللّٰهِ : اللہ کا] [مَالَمْ : جو نہیں] [يُنَزِّلْ : اس نے اتاری] [بِهٖ : اس کو] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [سُلْطٰنًا : کوئی دلیل] [فَاَيُّ : تو کون ہے] [الْفَرِيْقَيْنِ : دونوں فریقوں میں سے] [اَحَقُّ : زیادہ حقدار ہیں] [بِالْاَمْنِ : امن کا] [اِنْ : اگر] [كُنْتُمْ : ہو تم] [تَعْلَمُوْنَ : تم سب جانتے ہو]

ترجمہ: اور میں ان (معبودان باطلہ) سے کیونکر خوفزدہ ہو سکتا ہوں جنہیں تم (اللہ کا) شریک ٹھہراتے ہو درآنحالیکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ کے ساتھ (بتوں کو) شریک بنا رکھا ہے (جبکہ) اس نے تم پر اس (شرک) کی کوئی دلیل نہیں اتاری (اب تم ہی جواب دو!) سو ہر دو فریق میں سے (عذاب سے) بے خوف رہنے کا زیادہ حق دار کون ہے؟ اگر تم جانتے ہو

تشریح:

گزشتہ سے پیوستہ: اور ابراہیم (علیہ السلام) کے خطاب کا ردعمل

چاہیے تو یہ تھا کہ واضح قرائن دیکھنے اور ٹھوس دلائل سننے کے بعد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی قوم سر تسلیم خم کرتی لیکن انھوں نے اسی روش کو اختیار کیا جو ہمیشہ سے منکرین حق اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ قیل و قال اور حیلہ سازی سے بڑھ کر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ لڑائی، جھگڑے پر اتر آئے۔ ابراہیم (علیہ السلام) نے ان سے جھگڑنے کے بجائے فقط اتنا فرمایا کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کی ذات یعنی اس کی توحید کے بارے میں مجھ سے جنگ وجدال کرتے ہو؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہدایت سے سرفراز فرمایا ہے۔

ابتدا ہی سے مشرکوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ انبیاء (علیہ السلام) اور موحدین کو نہ صرف اپنی مادی اور افرادی قوت سے ڈراتے ہیں بلکہ اپنے عقیدہ کو سچ ثابت کرنے اور موحدین کو خوفزدہ کرنے کے لیے یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ اگر تم نے اسی طرح ہمارے معبودوں کی مخالفت جاری رکھی تو وہ تمہیں تہس نہس کر دیں گے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ موحد کو اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے مطابق کوئی تکلیف پہنچے تو مشرک طعنہ دیتے ہیں کہ یہ ہمارے معبودوں کی گستاخی کا نتیجہ ہے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو بھی مشرکوں نے یہ کہہ کر ڈرایا کہ عنقریب ہمارے معبود تجھے خوفناک گرفت میں لینے والے ہیں۔ جس کے جواب میں جناب ابراہیم (علیہ السلام) نے دوٹوک انداز میں فرمایا کہ میں تمہارے معبودان باطل سے کس طرح خوف کھا سکتا ہوں۔ حالانکہ تمہاری حالت یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے سے نہیں ڈرتے جبکہ تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے کا کوئی جواز اور دلیل نہیں۔ عقیدہ توحید اپنانے اور اس کے تقاضے پورے کرنے سے انسان دنیا و مافیھا کے خوف سے بے خوف، اس کا دل مطمئن اور اپنے آپ میں امن و سکون محسوس کرتا ہے۔

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

یہ ابراہیم (علیہ السلام) کا اپنی قوم کو جواب ہے 'جب انھوں نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو اپنے بتوں سے ڈرایا تھا کہ اگر تم نے ان کی مذمت کرنا نہ چھوڑی تو تمہیں کوئی آفت یا مصیبت پہنچے گی۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا میں ان بتوں سے کیسے ڈروں جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو 'جو کسی کو نفع پہنچانے یا اس کو ضرر پہنچانے پر قادر نہیں ہیں۔ اگر وہ کسی چیز پر کچھ قادر ہوتے تو جس وقت میں نے ان کو کلہاڑے سے ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا 'اسی وقت میرا کچھ بگاڑ لیتے 'اور میں ان بتوں سے کیسے ڈر سکتا ہوں جو کسی نفع اور نقصان پر قادر نہیں ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کون مامون اور محفوظ ہے؟ جو اس کی عبادت کرتا ہے جس کی قدرت میں نفع اور ضرر پہنچانا ہے یا وہ جو اس کی عبادت کرتا ہے جو کسی نفع اور ضرر کا مالک نہیں ہے۔

(تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

ابراہیم نے کہا کہ جن بتوں کو تم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ میں ان سے کیوں ڈروں جب کہ تم اللہ سے جس کی پوری کائنات پر حکمرانی ہے نہیں ڈرتے۔ بت بے جان پتھر نہ تمہارا کچھ بگاڑ اور سنوار سکتے ہیں نہ میرا، میں تو علم حقیقی کی بنا پر کہہ رہا ہوں جو مجھے اللہ کی طرف سے حاصل ہوا ہے تمہارا ان بتوں کو نفع و نقصان کا مالک و مختار سمجھنا تمہارا اپنا وہم و قیاس ہے جس کے لیے تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں۔ لہٰذا تم خود ہی سوچ لو کہ اللہ کی طرف سے عذاب کا مستحق کون ہوگا اور امن و سلامتی کا کون ؟ شعر اقبال :

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزاروں سجدوں سے دیتا ہے تجھ کو نجات

ایک شخص حضرت ابوطالب کے پاس آیا اور کہا کہ "تیرا بھتیجا ہمارے بتوں اور ہمارے آباؤ اجداد کو برا بھلا کہتا ہے اب ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔ اسے کہیں کہ وہ ہمارے دین کو برا نہ کہے وہ جو چاہتا ہے ہم اسے دینے کو تیار ہیں آپ نے فرمایا "خدا کی قسم اگر میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج بھی رکھ دیں تو حق کہنے سے نہ رکوں گا۔ "

(ابن ہشام : ۲/۱۰۱، البدایۃ والنہایۃ : ۳/۵۶) (تسہیل)

کامل ایمان والے کی شان

جریر ابن عبداللہ کہتے ہیں کہ ایک وقت ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ چلے اور جب مدینہ سے باہر ہوئے تو ایک سوار ہماری طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ یہ سوار ہماری طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ یہ سوار تم سے ملنے کے لیے آرہا ہے۔ جب وہ ہم تک پہنچا تو ہمیں سلام کہا، حضرت نے پوچھا کہاں سے آرہے ہو ؟ اس نے کہا اپنے اہل و عیال اور اپنے قبیلہ والوں کے پاس سے۔ پھر آپ نے کہا کہاں جاؤ گے ؟ کہاں رسول اللہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہو، میں ہی اللہ کا رسول ہوں۔ اس نے کہا یا رسول اللہ ! مجھے ایمان کی تعلیم دیجیے۔ آپ نے فرمایا کہو کہ خدا کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں، اور یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خدا کے رسول ہیں، اور نماز پڑھا کرو، زکوۃ دیا کرو، رمضان کے روزے رکھو، اور حج کرو۔ اس نے کہا مجھے ان سب باتوں کا اقرار ہے۔ پھر جب وہ روانہ ہو چکا تو اس کے اونٹ کا پاؤں ایک جنگلی چوہے کے ایک سوراخ میں پھنس گیا اور اونٹ گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی یہ سوار بھی گر پڑا اور اس کا سر پھٹ گیا، گردن ٹوٹ گئی۔ آپ نے فرمایا مجھ پر اس کی دیکھ بھال ضروری ہے۔ ساتھ ہی عمار بن یاسر اور حذیفہ نے دوڑ کر اسے اٹھایا۔ پھر کہنے لگے یا رسول اللہ ! یہ تو مر چکا۔ آپ دوسری طرف پلٹ گئے۔ پھر فرمایا، کیا تم جانتے ہو کہ میں نے اس کی طرف سے رخ کیوں پلٹا۔ میں نے دو فرشتوں کو دیکھا تھا کہ جنت کے پھل اس کے منہ میں دے رہے ہیں جس سے میں سمجھ گیا کہ وہ بھوکا مرا ہے۔ پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ یہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ اپنے ایمان کے ساتھ ظلم یعنی شرک کو شامل نہیں کرتے۔ پھر فرمایا، اپنے بھائی کا انتظام کرو، چنانچہ ہم نے اس کو غسل دیا، کفن پہنایا، خوشبو ملی اور جب قبر کی طرف لے جانے لگے تو حضرت تشریف لائے پھر قبر کے کنارے بیٹھ گئے اور فرمایا کہ بغلی قبر بناؤ۔ کھلی نہ رکھو۔ ہماری قبریں بغلی ہوتی ہیں اور کھلی قبریں دوسروں کی، اور یہ ان لوگوں میں سے تھا جو بہت ہی تھوڑا عمل کر کے اجر کثیر حاصل کر لیتے ہیں

یہاں ظلم سے مراد شرک ہے

حضرت عبداللہ (رض) بن مسعود کا بیان ہے کہ جب یہ آیت اتری تو مسلمانوں پر بڑی شاق گزری انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم میں سے کون (باوجود مؤمن ہونے کے) اپنے نفس پر ظلم نہیں کرتا (پھر ہمارے محفوظ رہنے کی کیا شکل ہے) حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ظلم سے مراد) شرک ہے۔ کیا تم نے لقمان کا وہ قول نہیں سنا جو انھوں نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا : { يَابُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ } ۔ (رواہ البخاری و مسلم)

محفوظ رہنے کا مستحق کون ہے :

حضرت ابراہیم نے مشرکوں سے سوال کیا تھا کہ محفوظ رہنے کا مستحق کون ہے۔ مشرکوں کی طرف سے جب کوئی جواب نہیں ملا تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے خود فرمایا الذین امنوا۔۔۔ اس صورت میں یہ ابراہیم (علیہ السلام) کا کلام ہوگا جو اللہ نے نقل فرمایا ہے یا یہ اللہ نے اپنی طرف سے فیصلہ فرمایا اور یہ براہ راست اللہ کا قول ہے۔

ایک عجیب شخص

ابن ابی حاتم نے بکر بن سوادہ کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک دشمن نے مسلمانوں پر حملہ کرکے ایک مسلمان کو مار ڈالا پھر دوبارہ حملہ کرکے دوسرے مسلمان کو قتل کردیا۔ پھر تیسری مرتبہ حملہ کرکے ایک اور مسلمان کو قتل کردیا پھر (مسلمان ہونے کے ارادہ سے رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور) عرض کیا اس حالت میں بھی مجھے اسلام سے فائدہ پہنچ سکتا ہے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہاں وہ شخص فوراً مسلمانوں میں شامل ہوگیا (یعنی مسلمان ہوگیا) پھر اپنے (گزشتہ) ساتھیوں پر حملہ کرکے ایک کو پھر دوسرے کو قتل کردیا پھر تیسرے کو مارا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ آیت مذکورہ کا نزول اسی شخص کے حق میں ہوا۔ (تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی)

آیت مبارکہ :

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۠ 82○

لغۃ القرآن : الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [اٰمَنُوْا : سب ایمان لائے] [وَلَمْ : اور نہیں] [يَلْبِسُوْٓا : ان سب نے مخلوط کیا] [اِيْمَانَهُمْ : اپنے ایمان کو] [بِظُلْمٍ : ظلم کے ساتھ] [اُولٰٓئِكَ : وہی لوگ] [لَهُمُ : ان سے] [الْاَمْنُ : امن ہے] [وَهُمْ : اور وہ] [مُّهْتَدُوْنَ : سب ہدایت پانے والے ہیں]

ترجمہ : جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو (شرک کے ظلم کے ساتھ نہیں ملایا انہی لوگوں کے لیے امن (یعنی اخروی بے خوفی) ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں

تشریح :

حضرت ابن مسعود (رض) فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام (رض) علیہ بہت پریشان ہوئے۔ اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں عرض کی۔ اینالم یظلم نفسہ ؟ ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے آپ پر ظلم نہ کیا ہو۔ تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ یہاں ظلم سے مراد گناہ نہیں بلکہ شرک ہے۔ لیس ھو کما تظنون انما ھو کما قال لقمان لابنہ یا بنی لا تشرک باللہ ان الشرک لظلم عظیم (قرطبیؒ, تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

اس آیت میں ایمان سے مراد ہے اللہ عَزَّوَجَلَّ کو ماننا اور ظلم سے مراد شرک ہے۔ البتہ معتزلہ اس آیت میں "ظلم" سے مراد گناہ لیتے ہیں، یہ صحیح احادیث کے خلاف ہے اس لیے اس کا اعتبار نہیں۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

اس مباحثہ میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعض مفسرین نے کہا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور اس کی قوم کے درمیان جو مباحثہ ہوا تھا ' اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان فیصلہ سنایا ہے کہ دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے وہی محفوظ رہے گا جس نے اللہ تعالیٰ کی اخلاص کے ساتھ عبادت کی ہو اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں شرک کی آمیزش نہ کی ہو 'اور بعض مفسرین نے کہا کہ یہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی قوم کی طرف سے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو جواب ہے جب انھوں نے فرمایا پس ہر دو فریق میں سے بے خوف ہونے کا کون زیادہ حقدار ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کے ساتھ ظلم کو نہیں ملایا 'تو وہی دنیا اور آخرت میں محفوظ اور مامون ہونے کے زیادہ حقدار ہیں 'لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح ہے۔

(تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

یہی وہ محبت تھی جس کے ذریعے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو یہ توفیق دی گئی کہ انھوں نے اپنے ساتھ مجادلہ کرنے والوں کے تمام دلائل کو رد کر دیا۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے ان کے سامنے یہ انکشاف کیا کہ ان کے تمام دلائل بودے ہیں 'الہوں کے بارے میں ان کے تمام تصورات غلط ہیں اور ان کا یہ وہم بھی فرضی ہے کہ ان کے الہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو کوئی گزند پہنچا سکتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ مسلم تھی کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے وجود کے منکر نہ تھے اور نہ اس بات کے منکر تھے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات میں قوت اور حکومت اور اقتدار کا مالک ہے۔ غلطی صرف یہ تھی کہ وہ لوگ اپنے ان الہوں کو اللہ کے ساتھ شریک کرتے تھے۔ جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے ان کے سامنے یہ بات رکھی کہ جو شخص صرف اللہ وحدہ پر یقین رکھتا ہے وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ اللہ کے سوا اوروں سے تو اس شخص کو ڈرنا چاہیے جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرتا ہے۔ جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے ان کے سامنے یہ حقیقت رکھی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ڈال دی تھی تو ان کے تمام مقابلے میں برتر و سربلند ہو گئے۔ یوں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا مقام اور درجہ بلند کر دیتا ہے اور یہ اللہ کے تصرفات ہیں اس کی حکمتوں کے تقاضوں کے مطابق۔ (فی ظلال القرآن)

ایمان کی ابتدا اور انتہا توحید پر ہے باقی دین کے ارکان توحید کا تقاضا ہیں۔ توحید یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات میں کسی کو شریک نہ سمجھے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کا کسی کو حصہ بنانا اس کی صفات میں کسی کو شریک سمجھنا پرلے درجے کا ظلم ہے۔ کیونکہ ظلم کا بنیادی معنی یہ ہے "وَضْعُ الشَّيءِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ" "کسی چیز کو اس کے اصلی مقام سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھنا۔" (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

آیت مبارکہ :

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭاِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝83

لغۃ القرآن: وَتِلْكَ : یہ] [حُجَّتُنَآ : ہماری دلیل تھی] [اٰتَيْنٰهَآ : دیا ہم نے اسے] [اِبْرٰهِيْمَ : ابراہیم] [عَلٰي : پر] [قَوْمِهٖ : اس کی قوم] [نَرْفَعُ : ہم بلند کردیتے ہیں] [دَرَجٰتٍ : درجات کو] [مَنْ : جس پر] [نَّشَاۗءُ : ہم چاہیں گے] [اِنَّ : بیشک] [رَبَّكَ : اپنے رب سے] [حَكِيْمٌ : حکمت والا] [عَلِيْمٌ : خوب جاننے والا ہے]

ترجمہ: اور یہی ہماری (توحید کی) دلیل تھی جو ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو ان کی (مخالف) قوم کے مقابلہ میں دی تھی۔ ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کر دیتے ہیں۔ بیشک آپ کا رب بڑی حکمت والا خوب جاننے والا ہے

تشریح:

حضرت ابراہیمؑ نے توحید کے ایسے واضح اور عام تفہم دلائل بیان کئے جن کے سامنے ان کی قوم عاجز اور لاجواب ہو گئی۔ یہ دلائل دراصل اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے دل میں ڈالے اور یہ اللہ تعالیٰ کا آپ پر خاص کرم تھا اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بلند درجات عطا فرماتا ہے۔

(امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

کیا لطف ہے اس آیت میں۔ ہماری دلیل تھی اور ہم ہی نے ابراہیم (علیہ السلام) کو عطا فرمائی تھی۔ وہ دلیل جسے اللہ تعالیٰ اپنی فرما رہے ہیں اس کی عظمت وجلالت کا کیا کہنا! کفر و شرک کی اس اندھیر نگری میں جس ہستی کو اس دلیل سے سرفراز فرمایا گیا اس کی رفعت شان کی کیا حد! اس مقام پر رب کو کاف خطاب کی طرف مضاف کرنے میں جو لطف ہے اس سے اہل دل ہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اے مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! تیرا رب ہے تو وہ سارے جہان کا رب۔ لیکن اس کی ربوبیت کا جو تعلق مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا سے ہے وہ کسی سے نہیں۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا انداز تبلیغ

بت پرستی کے معاملہ میں حضرت خلیل اللہ نے سخت الفاظ استعمال فرمائے ہیں، کیونکہ اس کی گمراہی مشاہدہ میں آنے والی چیز ہے، اور نجوم پرستی کے معاملہ میں ایسے سخت الفاظ استعمال نہیں فرمائے، بلکہ ایک خاص تدابیر سے معاملہ کی حقیقت کو قوم کے ذہن نشین فرمایا، کیونکہ

سیاروں اور ستاروں کا بے بس اور بے اختیار ہونا اتنا واضح اور کھلا ہوا نہیں تھا جتنا خود تراشیدہ بتوں کا، اس سے معلوم ہوا کہ عوام اگر کسی ایسی غلطی میں مبتلا ہوں جس کا غلطی اور گمراہی ہونا عام نظروں میں واضح نہ ہو تو عالم اور مبلغ کو چاہیے کہ تشدد کے بجائے ان کے شبہات کو دور کرنے کی تدبیر کرے۔ (تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی)

مسلمانوں پر مصائب نازل ہونے کی وجوہات

اس آیت میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے دیئے ہوئے ان تمام دلائل کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر اس سے پہلی آیتوں میں آ چکا ہے۔ ان کی قوم کے کافروں نے کہا تھا کہ تم ہمارے بتوں کی مخالفت کرتے ہو ' اس لیے تمہیں ان کی مخالفت کی وجہ سے کوئی آفت یا مصیبت پہنچ جائے گی۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کے ساتھ کسی ظلم کی آمیزش نہیں کی ' وہی لوگ ہر قسم کی آفتوں اور مصیبتوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

اس جگہ یہ سوال ہوتا ہے کہ بہت سے مسلمان بھی آفات اور مصائب کا شکار رہتے ہیں۔ پھر یہ کہنا کس طرح صحیح ہوگا کہ ایمان والے دنیا اور آخرت کے عذاب سے محفوظ رہتے ہیں؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ آفات اور مصائب انسان کی اپنی بعض بداعمالیوں کے سبب سے لاحق ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(آیت) "وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم ویعفوا عن کثیر "۔ (الشوری : ۳۰)

ترجمہ : اور جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے تو وہ تمہاری ہی شامت اعمال کا نتیجہ ہے اور تمہاری بہت سی خطاؤں کو وہ معاف کر دیتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک اور صالح بندوں کو آزمائش میں مبتلا کرتا ہے اور اس آزمائش میں ان کی استقامت اور ان کا ضبط اور صبر ان کے تقرب اور ان کے درجات کی بلندی کا سبب بنتا ہے اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کو جو بلند درجات عطا فرمائے گا ' تو اس کی دلیل اور حجت کے طور پر آفات ' مصائب اور مشکلات میں ان کی استقامت اور ان کے صبر وضبط کو ظاہر فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(آیت) "احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لا یفتنون"۔ (العنکبوت : ۲)

ترجمہ : کیا لوگوں کا یہ گمان ہے کہ وہ اس کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کی آزمائش میں نہیں ڈالا جائے گا۔

(آیت) "ولنبلونکم بشیء من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات بشر الصبرین، الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون، اولئك علیھم صلوات من ربھم ورحمۃ واولئك ھم المھتدون "۔ (البقرہ : ۱۵۵۔۱۵۷)

ترجمہ : اور ہم تمہیں کچھ ڈر ' بھوک اور مال ' جان اور پھلوں میں کمی سے ضرور آزمائیں گے اور آپ صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنایئے جب ان لوگوں کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں ' بیشک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور بیشک ہم اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں ' یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی جانب سے صلوات اور رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

انبیاء (علیہم السلام) ' علماء اور مومنین کے درجات کی بلندی

نیز اس آیت میں فرمایا ہے ہم جس کو چاہتے ہیں اپنے بندوں میں سے ان کے درجات بلند کرتے ہیں، یہ درجات ایمان علم و حکمت اور نبوت کے درجات ہیں ' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

(آیت) "تلك الرسل فضلنا بعضهم علی بعض منهم من کلم الله ورفع بعضهم درجت"۔ (البقرہ: ۲۵۳)

ترجمہ: یہ سب رسول ' ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام فرمایا اور کسی کو (سب پر) درجات کی بلندی عطا فرمائی ہے۔

رسولوں کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں اور علماء کے درجات کی بلندی کا بھی ذکر فرمایا ہے:

(آیت) "یرفع الله الذین امنوا منکم والذین اوتوا العلم درجت"۔ (المجادلہ: ۱۱)

ترجمہ: تم میں سے جو لوگ کامل ایمان لائے اور جنہیں علم دیا گیا ' اللہ ان کے درجات بلند فرمائے گا۔؛

اور آخرت میں اللہ تعالیٰ اجر و ثواب کے اعتبار سے ان کے درجات بلند فرمائے گا۔ اس آیت میں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی دلیل کی قوت اور غلبہ کے اعتبار سے دنیا میں بلند درجہ عطا فرمایا۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ:

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۙ 84

لغۃ القرآن: وَوَهَبْنَا : اور ہم نے دیا] [لَهٗٓ : اس کیلیے] [اِسْحٰقَ : اسحاق] [وَيَعْقُوْبَ : اور یعقوب] [كُلًّا : ہر ایک کو] [هَدَيْنَا : ہم نے ہدایت دی] [وَنُوْحًا : اور نوح کو] [هَدَيْنَا : ہم نے ہدایت دی] [مِنْ قَبْلُ : اس سے قبل] [وَ مِّنْ : اور اس کی] [ذُرِّيَّتِهٖ : اولاد میں سے] [دَاوٗدَ : داؤد] [وَ : اور] [سُلَيْمٰنَ : سلیمان] [وَ : اور

] [اَيُّوْبَ : ایوب] [وَيُوْسُفَ : اور یوسف] [وَمُوْسٰي : اور موسیٰ] [وَ : اور] [هٰرُوْنَ : ہارون] [وَكَذٰلِكَ : اور اسی طرح] [نَجْزِي : ہم بدلہ دیا کرتے ہیں] [الْمُحْسِنِيْنَ : سب نیکی کرنے والوں کو]

ترجمہ : اور ہم نے ان (ابراہیم (علیہ السلام)) کو اسحاق اور یعقوب (بیٹا اور پوتا علیہما السلام) عطا کئے، ہم نے (ان) سب کو ہدایت سے نوازا، اور ہم نے (ان سے) پہلے نوح (علیہ السلام) کو (بھی) ہدایت سے نوازا تھا اور ان کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون (علیہم السلام کو بھی ہدایت عطا فرمائی تھی)، اور ہم اسی طرح نیکو کاروں کو جزا دیا کرتے ہیں

تشریح:

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو نہ صرف دلائل کے اعتبار سے برتری عنایت فرمائی تھی بلکہ رہتی دنیا تک امامت کے منصب سے سرفراز کرتے ہوئے انبیاء کی صورت میں نیک اولاد عنایت فرمائی جنھوں نے ان کے مشن کو جاری وساری رکھا تاآنکہ نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دین حنیف کا پھریرا پوری دنیا میں سربلند فرمایا۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) تن تنہا اپنی قوم اور حاکم وقت کے سامنے ڈٹے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف دلائل کے اعتبار سے انھیں اپنی قوم پر برتری عنایت فرمائی بلکہ ایک وقت وہ بھی آیا کہ پوری دنیا کی امامت سے سرفراز کیا گیا اور ان کی دعوت کو چار سو پھیلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسی اولاد اور وارث نصیب فرمائے کہ جن میں اولوالعزم انبیاء عظیم الشان خلفاء پیدا ہوئے۔ ان میں ایسی شخصیات بھی تھیں جو بیک وقت منصب خلافت و نبوت پر فائز ہوئیں اور انھوں نے توحید کی دعوت کو دنیا میں عام کیا۔ یہاں ان انبیاء کا نام بنام ذکر کیا گیا ہے جو انفرادی اوصاف کے اعتبار سے باقی انبیاء سے برتر تھے۔ جس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے جو اوصاف ان شخصیات میں پائے جاتے تھے وہ سب کے سب نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات میں ودیعت کر دیے گئے ہیں۔ ان انبیاء (علیہ السلام) کو ایک دوسرے کے باپ، اولاد اور بھائی قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے ان کو اپنے کام کے لیے

منتخب فرما کر صراط مستقیم کی ہدایت سے نوازا تھا۔ اس بات کی وضاحت بھی کر دی گئی کہ ہدایت وہی ہوتی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت قرار دے اور وہ اپنے بندوں میں جسے چاہتا ہے ہدایت کی دولت سے مالا مال فرماتا ہے۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل تعلیقا)

ان آیات میں 18 انبیائے کرام (علیہم السلام) کے اسمائے گرامی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سے حضرت نوح تو حضرت ابراہیم کے جد امجد ہیں اور باقی سب کو حضرت ابراہیم کی اولاد فرمایا گیا ہے۔ ان میں سے بعض بعض کے آباء واجداد، اولاد اور بھائی بھتیجے ہیں۔ نیز حضرت ابراہیم کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ آپ کے بعد قیامت تک جتنے انبیاء ورسل (علیہم السلام) آئے وہ سب آپ کی اولاد میں سے تھے یعنی حضرت ابراہیم کے ایک بیٹے حضرت اسحاق کی اولاد سے ہزاروں انبیائے بنی اسرائیل آئے اور حضرت ابراہیم کے دوسرے بیٹے حضرت اسماعیل سے آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لائے۔

سارے انبیائے کرام (علیہم السلام) ہدایت یافتہ، اللہ تعالیٰ کے منتخب کردہ، صالح اور صراط مستقیم پر گامزن ہوتے ہیں۔ان میں سے کوئی بھی مشرک نہیں ہوتا کیونکہ شرک نیک اعمال کو ضائع کردیتا ہے۔ نیز سارے انبیائے کرام (علیہم السلام) اپنے زمانے کے لوگ میں سب سے افضل ہوتے ہیں۔ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگرچہ عزت وذلت اور نجات وعذاب کا اصل مدار انسان کے ذاتی اعمال پر ہوتا ہے لیکن آباء واجداد میں کسی نبی یا ولی کا ہونا یا اولاد میں علماء وصالحین کا ہونا بھی باعث شرف وبرکت ہے۔(امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تسلسل

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پر اپنی نعمتیں بیان فرمائی ہیں۔ان میں سے ایک یہ نعمت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کفار کے مقابلہ میں حجت اور دلیل کے اعتبار سے غالب اور سرخرو کیا اور دوسری نعمت یہ تھی کہ ان کے درجات بلند فرمائے اور تیسری نعمت یہ ہے کہ ان کی نسل سے اللہ تعالیٰ نے انبیاء (علیہم السلام) کو مبعوث فرمایا 'جن کا ذکر اس آیت میں فرمایا ہے۔حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کی زوجہ حضرت سارہ دونوں بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔اس وقت حضرت لوط (علیہ السلام) کی طرف جاتے ہوئے ان کے پاس فرشتے آئے اور ان کو حضرت اسحاق (علیہ السلام) کی ولادت کی بشارت دی۔اس بشارت سے حضرت سارہ کو بہت تعجب ہوا۔انھوں نے کہا۔

(آیت) "**قالت یویلتیء الدوانا عجوز وهذا بعلی شیخا ان هذا لشیء عجیب، قالوا اتعجبین من امر الله رحمت الله وبر کته علیکم اهل البیت انه حمید مجید**"۔(ھود: ۷۳۔۷۲)

ترجمہ: سارہ نے کہا ہائے افسوس! کیا میں بچہ جنوں گی 'حالانکہ میں بوڑھی ہو چکی ہوں اور یہ میرا شوہر (بھی) بوڑھے ہیں 'بیشک یہ عجیب بات ہے۔فرشتوں نے کہا کیا تم اللہ کے حکم سے تعجب کرتی ہو اے ابراہیم کے اہل بیت 'تم پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں 'بیشک وہی ہے تعریف کیا ہوا بڑی بزرگی والا۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاق کے نبی ہونے کی بشارت دی

(آیت) "**وبشرنه باسحق نبیا من الصلحین**"۔(الصفت: ۱۱۲)

ترجمہ: اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق نبی کی بشارت دی جو صالحین میں سے ہیں۔

اور پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاق کے بعد حضرت سارہ کو (ان کے پوتے) حضرت یعقوب کی بشارت دی:

(آیت) "**فبشرنها باسحق ومن ورآء اسحاق یعقوب**"۔(ھود: ۷۱)

ترجمہ: اور ہم نے سارہ کو اسحاق کی بشارت دی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی:

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد میں حضرت اسماعیل:(علیہ السلام) کو ذکر نہ کرنے کی وجہ

اس آیت میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے دو بیٹوں میں سے حضرت اسحاق کا ذکر فرمایا ہے اور حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کا ذکر نہیں فرمایا 'اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور حضرت سارہ کے بوڑھے ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانی کا ظہور اول حضرت اسحاق کی پیدائش سے ہوا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس جگہ انبیاء بنی اسرائیل کا ذکر کرنا مقصود ہے اور بنواسرائیل کے تمام انبیاء حضرت اسحاق (علیہ السلام) اور حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی اولاد سے ہیں۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) حضرت نوح (علیہ السلام) کی اولاد میں سے ہیں 'ان سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح (علیہ السلام) کو نبوت اور حکمت سے نوازا تھا اور یہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی بہت بڑی نعمت ہے 'ان کے جداکرم نبی تھے۔ وہ خود بھی نبی تھے اور ان کی اولاد میں بھی انبیاء (علیہم السلام) ہیں۔ حضرت داؤد (علیہ السلام) حضرت سلیمان (علیہ السلام) 'حضرت یوسف (علیہ السلام) 'حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت ہارون (علیہ السلام) یہ سب ان کی ذریت طیبہ ہے:

(آیت) "ذریۃ بعضها من بعض"۔ (ال عمران: ۳۴)

ترجمہ: ان میں سے بعض 'بعض کی اولاد ہیں۔

اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ "من ذریتہ "کی ضمیر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی طرف راجع ہے یا حضرت نوح (علیہ السلام) کی طرف۔ اگر یہ ضمیر حضرت نوح (علیہ السلام) کی طرف راجع ہو تو اس آیت کا معنی ہو گا حضرت نوح (علیہ السلام) کی اولاد میں سے حضرت داؤد '(علیہ السلام) حضرت سلیمان 'حضرت ایوب 'حضرت یوسف 'حضرت موسیٰ 'حضرت ہارون 'حضرت زکریا 'حضرت یحییٰ 'حضرت عیسیٰ اور حضرت الیاس ہیں اور اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے اور اگر یہ ضمیر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی طرف راجع ہو تو یہ تمام انبیاء حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد قرار پائیں گے۔ اس اعتبار سے تو یہ مناسب ہے 'کیونکہ اس کلام کا سیاق و سباق حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پر نعمتوں کا بیان ہے اور یہ ان کے حق میں اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے کہ یہ سارے انبیاء (علیہم السلام) ان کی اولاد ہیں 'لیکن اس پر اعتراض ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے صلبی بیٹے نہیں ہیں 'بلکہ وہ ان کی بیٹی حضرت مریم کے بیٹے ہیں اور دور کی پشتوں میں جا کر آپکے نواسے ہوئے تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر ان کی اولاد کا اطلاق کس طرح درست ہوا '؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اطلاق مجازی ہے۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ:
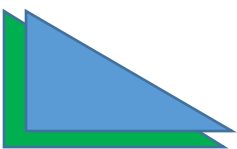
وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۙ﴿85﴾

لغۃ القرآن: وَزَكَرِيَّا : اور زکریا] [وَيَحْيٰى : اور یحی] [وَعِيْسٰي : اور عیسیٰ] [وَاِلْيَاسَ : اور الیاس] [كُلٌّ : تمام] [مِّنَ : سے] [الصّٰلِحِيْنَ : نیکوں]

ترجمہ: اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس (علیہم السلام کو بھی ہدایت بخشی)۔ یہ سب نیکوکار (قربت اور حضوری والے) لوگ تھے

تشریح:

بنی اسماعیل و بنی اسرائیل کے آباؤ اجداد ایک اللہ کو ماننے والے تھے

یہ چاروں اللہ کے مشہور اور عظیم پیغمبر ہیں۔ عیسیٰ (علیہ السلام) تو عیسائی امت کی وجہ سے بہت ممتاز شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کو اللہ نے غیر معمولی معجزات سے نوازا تھا۔ ان کی دنیوی زندگی کا بظاہر اختتام بھی غیر معمولی طریقے سے ہوا اور مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق وہ قرب قیامت میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلیفہ کی حیثیت سے دوبارہ تشریف لائیں گے اور غلبہ اسلام کو مکمل کریں گے۔ حضرت یحییٰ انہی کے ہمعصر ' پیش رو اور عزیزوں میں سے ہیں۔ حضرت زکریا حضرت یحییٰ کے والد گرامی اور حضرت الیاس وہی پیغمبر ہیں جنھیں توراۃ ایلیاکے نام سے یاد کرتی ہے۔ ان چاروں میں قدر مشترک ان کا زہد ' فقر اور دنیا سے بے رغبتی ہے۔ یہ دنیا اور اہل دنیا سے بے نیاز خالصتاً اللہ کی رضا میں شاکر ' اللہ کے برگزیدہ بندے تھے اور انہی صفات کے اشتراک کے باعث انھیں ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی غیر معمولی شخصیتوں کے حوالے سے لوگوں نے ان کے بارے میں بہت کچھ افراط و تفریط سے بھی کام لیا ہے۔ اس لیے ان کے بارے میں فرمایا جارہا ہے کہ ان کی شخصیتوں میں صفات کے اعتبار سے کتنا بھی غیر معمولی پن ہو لیکن اپنی ذات میں وہ اللہ کے نیک بندوں میں سے تھے خدا نہیں تھے۔ ان کو جو کچھ معجزات عطا ہوئے اور ان کی شخصیتوں میں جو ایک جاذبیت عظمت اور غیر معمولی پن نظر آتا ہے وہ صرف اس ہدایت اور اس صلاح و تقویٰ کے باعث ہے جو اللہ سے تعلق کے باعث ان کی شخصیتوں کا امتیازی پہلو تھا۔ وہ اپنی تمام تر عظمتوں میں اللہ پر ایمان رکھنے والے اس کی شریعت پر چلنے والے اللہ کی ذات و صفات میں شریک نہ کرنے والے اور قوم کو توحید کی دعوت دینے والے اللہ کے نیک بندے تھے ' جنھوں نے دنیا میں ہر طرح سے شرک کی جڑ مارنے کی کوشش کی اور لوگوں کو اللہ کی وحدانیت پر ایمان لانے کی ترغیب دی اے مشرکین مکہ اور اے امت نصاریٰ تم نے نجانے یہ شرک کا مرض کہاں سے پال لیا ہے۔ دیکھو جہاں جہاں بھی عظمتیں نظر آتی ہیں وہ سب اللہ کی بندگی کے باعث اور اللہ کی توحید سے وابستگی کا نتیجہ ہیں۔ اگلی آیت میں مزید چار پیغمبروں کا ذکر فرمایا گیا۔ جن میں پہلے نمبر پر حضرت اسماعیل ہیں جو

قریش کے جد امجد اور حضرت ابراہیم کے بڑے صاحبزادے ہیں اس رکوع کے آغاز میں جہاں انبیاء کا ذکر شروع ہوا وہاں سب سے پہلے حضرت اسحاق جو حضرت اسماعیل کے بھائی ہیں ان کا ذکر کیا گیا اور پھر ان کی اولاد میں اٹھنے والے جستہ جستہ پیغمبروں کا ذکر ہے۔ اب آخر میں حضرت اسماعیلؑ کا ذکر کیا جا رہا ہے تاکہ سلسلہ ابراہیمی کو مکمل کرتے ہوئے یہ بتایا جائے کہ وقت کی سب سے بڑی قومیں بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں کے آباؤاجداد توحید کے علمبردار تھے اور وہ دنیا میں اسی کی تعلیم اور ترغیب کے لیے تشریف لائے تھے اور اسی بنیاد پر ان کی اپنی قوموں سے کشمکش جاری رہی۔ لیکن نجانے ان دونوں قوموں نے شرک کا جواز کہاں سے پیدا کر لیا۔ حضرت اسماعیلؑ کے بعد حضرت یونس کا ذکر ہے جو اللہ کے مشہور پیغمبر ہیں جو نینوا میں مبعوث ہوئے اور ایک لاکھ انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے اور اس کے بعد حضرت لوطؑ کا ذکر ہے یہ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے ہیں انہی کے زیر تربیت رہے۔ اللہ نے انھیں نبوت سے نوازا انھوں نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی 'بری عادتوں کو چھوڑنے کا حکم دیا' مکارم اخلاق کی تعلیم دی۔ لیکن قوم نے بجائے قبول کرنے کے جب انتہائی دشمنی اور کمینگی کا ثبوت دیا تو اللہ نے ان پر عذاب نازل کیا اور آج بھی وہ قوم بحر مردار کے نیچے ابدی نیند سو رہی ہے اور اس کے گرد و پیش میں ان کے کھنڈرات پھیلے ہوئے ہیں۔ درمیان میں حضرت یسعؑ کا ذکر آیا ہے یہ ہماری تاریخ کے لیے ایک غیر معروف نام ہے لیکن پہلی آسمانی کتابوں میں الیسع سے ملتے جلتے دو نبیوں کے ناموں کا ذکر ہے ایک الیشع جن کا زمانہ ۱۳ے قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔ دوسرے یسعیاہ جن کا زمانہ ۶۲۰ قبل مسیح کہا جاتا ہے۔ پہلا نام قرآن کے تلفظ کے زیادہ قریب ہے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ شاید یہی پیغمبر مراد ہیں۔ یہاں جن پیغمبروں کا ذکر ہوا ہے صرف یہی نسل ابراہیمی سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ جیسے اس سے پہلے عرض کیا جا چکا کہ مشرق وسطیٰ میں آنے والے بیشتر انبیاء حضرت ابراہیم ہی کی اولاد سے تھے۔ ان میں سے اس مختصر تعداد کا ذکر کرنا صرف اس وجہ سے ہے کہ یہ وہ پیغمبر ہیں جن سے اس وقت کی قومیں متعارف تھیں۔ یہ مقصود نہیں ہے کہ تمام انبیاء کا ذکر کیا جائے بلکہ صرف یہ توجہ دلانا ہے کہ اللہ نے حضرت ابراہیم کی نسل سے جتنے پیغمبر اٹھائے جن میں سے چند ایک یہ ہیں وہ سب اسی سلسلہ ہدایت کے افراد تھے جس ہدایت کو لے کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مبعوث ہوئے ہیں۔

(روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

صالحین کا معنی نیکوکار لوگ بھی ہے اور یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے لوگ جو قرب الٰہی کی صلاحیت واہلیت والے ہیں۔ معلوم ہوا تمام انبیاء گناہوں سے پاک ہیں وہ کسی ایسے فعل میں ملوث نہیں ہو سکتے جو انھیں معاذ اللہ عتاب الٰہی کا سزاوار کرے، کیونکہ اگر انبیاء سے بھی گناہ سرزد ہوتے ہو تو وہ صالحین کیسے کہلا سکتے ہیں؟

حسنین کریمین (رض) اور ان کی ذریت کے اولاد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہونے کے دلائل

اس آیت سے حسنین کریمین (رض) کے اولاد رسول ہونے کی دلیل بھی حاصل ہوئی۔ کیونکہ اس جگہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو بھی نوح (علیہ السلام) کی ذریت میں سے قرار دیا گیا کیونکہ یہ سارا کلام و من ذریتہ کے نیچے داخل ہے اور عیسیٰ (علیہ السلام) صرف اپنی والدہ کے ذریعہ نوح کی ذریت ہیں۔ اسی طرح حسنین کریمین اور ان کی اولاد بھی سیدہ فاطمہ (رض) کے ذریعے اولاد رسول ہیں۔

اموی امیر حجاج بن یوسف نے حضرت یحیٰی بن یعمر (رض) سے کہا تم اولاد فاطمہ (رض) کو قرآن سے ذریت رسول قرار دیتے ہوں مجھے تو قرآن میں یہ چیز کہیں نظر نہیں آئی۔ انھوں نے حجاج کو اسی آیت کا حوالہ دیا (در منثور جلد 3 صفحہ 311)

اسی لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حسنین کریمین کو اپنے بیٹے کہہ کر پکارتے تھے۔ چنانچہ امام حسن مجتبیٰ (رض) عنہٗ کے بارے میں آپ کا ارشاد ہے، عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) منبر پر تشریف لائے تو اپنے ساتھ اپنے نواسے حسن (رض) عنہٗ کو بھی بٹھایا اور ارشاد فرمایا:
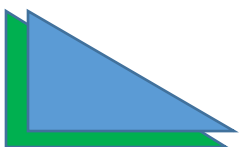
ان ابنی ھذا سید و لعل اللہ یصلح بہ بین فئتین من المسلمین عظیمتین۔ "بیشک میرا یہ بیٹا سید ہے اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کروادے گا۔"

(بخاری کتاب المناقب باب علامات النبوۃ فی الاسلام حدیث 3629)

پھر اس بارہ میں قرآن کریم کی آیت مباہلہ بھی ہماری راہ نمائی کرتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۣ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَي الْكٰذِبِيْنَ۔ آ جاؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلا لیتے ہیں اور تمہارے بیٹوں کو بھی اور ہم اپنی بیٹیوں کو بلاتے ہیں اور تمہاری بیٹیوں کو بھی اور ہم خود بھی آ جاتے ہیں اور تم بھی آ جاؤ پھر ہم مباہلہ کرتے ہیں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کرتے ہیں۔ (آل عمران۔ 61)

تو اس آیت مباہلہ کے نزول پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے ساتھ ابناء نا (اپنے بیٹوں) کے تحت اپنے نواسوں حسنین کریمین (رض) کو اور ونساء نا (اپنی بیٹیوں) کے تحت سیدہ خاتون جنت فاطمۃ الزہراء (رض) کو لیکر مباہلہ کے لیے نکلے۔ جیسا کہ ہم اس آیت کے تحت بیان کر آئے ہیں۔ یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ رب العزت کے قرآن اور عمل محبوب رحمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مطابق حسنین کریمین رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سگے بیٹوں کے حکم میں ہیں اور ان کی اولاد ذریت مصطفیٰ مقام رکھتی ہے اس لئے ان کو سبطین رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ بظاہر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نواسے ہیں مگر اللہ اور رسول نے انھیں ابناء مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا درجہ دیا ہے۔

لہٰذا جو لوگ حسنی اور حسینی سادات کرام ہیں وہ ان دلائل کی روشنی میں نسل رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں اور ان کی رگوں میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خون مبارک ہے ان کا احترام کرنا حقیقت میں احترام رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حصہ ہے اگر ان میں سے کوئی عمل کے لحاظ سے کمزور بھی ہو تو بھی اس کی سیادت نسبی میں فرق نہیں آتا سوا اس کے کہ وہ گمراہی اور کفر میں مبتلا ہو جائے۔
جیسے بعض خود کو سید کہنے کے باوجود صحابہ کرام (رض) کو گالیاں دیتے، خلفائے راشدین پر لعن طعن کرتے اور امہات المومنین کے سب وشتم کرتے ہیں، آئمہ اہل بیت کو تمام انبیاء کرام سے افضل جانتے ہیں اور تحریف قرآن کے قائل ہیں ان لوگوں کی نسبی شرافت ختم ہو گئی ہے ہر شرافت ایمان کی بنیاد پر قائم ہے جب ایمان ہی نہیں تو شرافت کیسی؟ نوح (علیہ السلام) کے سگے بیٹے سے کہہ دیا گیا۔ **انه ليس من اهلك**۔
(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)
مزید وضاحت

نواسوں کا اولاد میں داخل ہونا

امام ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ ابو الاسود سے روایت کرتے ہیں کہ حجاج نے یحییٰ بن یعمر کو بلا کر کہا کہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ تم یہ کہتے ہو کہ حضرت حسن اور حضرت حسین نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اولاد ہیں۔ کیا قرآن مجید میں اس پر کوئی دلیل ہے؟ میں نے اول سے آخر تک قرآن مجید پڑھا ' مجھے اس پر کوئی دلیل نہیں ملی یحییٰ بن یعمر نے کہا تم نے سورۃ الانعام کی یہ آیت نہیں پڑھی "**ومن ذريته الى قوله ويحيى وعيسىٰ**" اس نے کہا کیوں نہیں، انھوں نے کہا کیا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد نہیں ہیں ' حالانکہ ان کا کوئی باپ نہیں ہے۔ حجاج نے کہا آپ نے سچ کہا۔
(تفسیر امام ابن ابی حاتم 'ج ۴ 'ص ۱۳۳۵ 'مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الریاض '۱۴۱۷ھ)
ابو اسحاق ابراہیم الزجاج المتوفی ۳۱۱ھ نے لکھا ہے ' جائز ہے کہ یہ انبیاء (علیہم السلام) حضرت نوح (علیہ السلام) کی اولاد میں سے ہوں اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ انبیاء (علیہم السلام) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد میں سے ہوں۔
(معانی القرآن واعرابہ للزجاج 'ج ۲ 'ص ۲۶۹ 'مطبوعہ عالم الکتب ' بیروت '۱۴۰۸ھ)
زجاج نے کہا ہے کہ من ذریتہ کی ضمیر کا ابراہیمؑ کی طرف لوٹنا بھی جائز ہے۔ اس پر یہ اعتراض ہوگا کہ ان انبیاء میں حضرت لوط (علیہ السلام) کا بھی ذکر ہے اور وہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد میں سے نہیں ہیں ' بلکہ وہ ان کے بھتیجے ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ وہ ان کے بھانجے ہیں اور جو شخص ماموں پر باپ کا اطلاق کرتا ہے وہ اس آیت سے استدلال کرتا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہ ضمیر حضرت نوح (علیہ السلام) کی طرف لوٹتی ہے اور یہ بہت مناسب ہے۔ (الحرر الوجیز 'ج ۶ 'ص ۹۷ 'مطبوعہ مکتبہ تجاریہ 'مکہ مکرمہ)
امام ابن ابی حاتم اپنی سند کے ساتھ محمد بن کعب سے روایت کرتے ہیں کہ ماموں بھی والد ہے اور چچا بھی والد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط (علیہ السلام) کی ان کے ماموں کی طرف نسبت کی ہے اور فرمایا "**ومن ذريته**" (الی قولہ) (آیت) "وزکریا ویحی وعیسیٰ والیاس کل من الصلحین"۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم 'ج ۴ 'ص ۱۳۳۶ 'مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الریاض '۱۴۱۷ھ)

نواسوں کو اولاد میں شمار کرنے کے متعلق مذاہب فقہاء

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ٦٦٨ ھ لکھتے ہیں :

اگر یہ کہا جائے کہ یہ مذکور انبیاء (علیہم السلام) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد میں سے ہیں تو اس پر یہ اعتراض ہوگا کہ اس آیت میں حضرت یونس (علیہ السلام) اور حضرت لوط (علیہ السلام) کا ذکر بھی کیا گیا اور وہ دونوں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد میں سے نہیں ہیں ' حضرت لوط (علیہ السلام) ان کے بھتیجے تھے اور ایک قول یہ ہے کہ ان کے بھانجے تھے۔ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا یہ تمام انبیاء (علیہم السلام) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد کی طرف منسوب ہیں ' اگرچہ ان میں بعض انبیاء ایسے ہیں جو ماں اور باپ کی طرف سے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے بیٹے نہیں ہیں ' کیونکہ حضرت لوط (علیہ السلام) ' حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے بھائی کے بیٹے ہیں اور عرب چچا کو باپ کہتے ہیں ' جیسا کہ قرآن مجید نے حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی اولاد سے نقل فرمایا ہے ' انھوں نے کہا۔

(آیت) " **نعبد الھک والہ ابآئک ابراھیم واسمعیل واسحق** "۔ (البقرہ : ١٣٣)

ترجمہ : ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں گے اور آپ کے باپ دادا ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کریں گے۔

حالانکہ حضرت اسماعیل (علیہ السلام) ' حضرت یعقوب (علیہ السلام) کے چچا تھے۔

اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو بھی حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی ذریت سے شمار فرمایا ہے ' حالانکہ وہ ان کی بیٹی کے بیٹے ہیں ' اسی بناء پر حضرت فاطمہ (رض) کی اولاد نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذریت ہے اور جو فقہاء بیٹیوں کی اولاد کو بھی اولاد میں داخل کرتے ہیں ' وہ اسی آیت سے استدلال کرتے ہیں اور ان کا استدلال اس حدیث سے بھی ہے :

حضرت ابوبکر (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت حسن (رض) کو لے کر آئے اور ان کو منبر پر چڑھایا ' پھر آپ نے فرمایا میرا یہ بیٹا سید ہے اور بیشک اللہ تعالیٰ اسی کے سبب سے مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے درمیان صلح کرائے گا۔ (صحیح البخاری ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ٣٦٢٩' سنن الترمذی ' ج ٥ ' رقم الحدیث : ٣٧٩٨' سنن ابوداؤد ' ج ٣ ' رقم الحدیث : ٤٦٦٢' سنن النسائی ' ج ٢ ' رقم الحدیث : ١٤٠٩' صحیح ابن حبان ' ج ١٥ ' رقم الحدیث : ٦٩٦٤' مسند احمد ' ج ٧ ' رقم الحدیث : ٢٠٤٧٠ ' طبع جدید ' مسند احمد ' ج ٥ ' ص ٥١ ' ٤٤ ' طبع قدیم ' المعجم الکبیر ' ج ٣ ' رقم الحدیث : ٢٥٩١' مجمع الزوائد ' ج ٩ ' ص ١٧٥)

ہمیں کسی کے متعلق یہ علم نہیں ہے کہ اس نے بیٹیوں کی اولاد پر ان کے نانا کی اولاد کے اطلاق کو ناجائز کہا ہو اور لغت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ' کیونکہ ولد (بیٹا) کا لفظ تولد سے مشتق ہے اور وہ لامحالہ اپنی ماں کے باپ سے متولد ہیں۔ سو قرآن مجید کی آیت " **ومن ذریتہ** " (الانعام : ٨٤) اس حدیث اور لغت سے یہ ثابت ہے کہ کسی شخص کی بیٹی کی اولاد پر بھی اس شخص کی اولاد کا اطلاق ہوتا ہے ' اس سے حسب ذیل مسئلہ متفرق ہوتا ہے۔

امام ابوحنیفہ اور امام شافعی یہ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کے لیے کسی جائیداد کو وقف کیا تو اس میں اس کی بیٹیوں کی اولاد بھی داخل ہوگی ' اسی طرح جب کسی شخص نے اپنے قرابت داروں کے لیے وصیت کی تو اس میں بیٹیوں کی اولاد بھی داخل ہوگی۔ امام ابوحنیفہ (رح) کے نزدیک ہر ذی رحم محرم کو قرابت شامل ہے ' اور ان کے نزدیک اس وصیت سے چچا ' پھوپھی ' ماموں اور خالہ کے بیٹے

ساقط ہو جائیں گے ' کیونکہ وہ محرم نہیں ہیں اور امام شافعی (رح) کے نزدیک ہر ذی رحم محرم اور اس کے غیر کو قرابت شامل ہے ' سوان کے نزدیک اس وصیت سے چچا کا بیٹا اور اس کا غیر ساقط نہیں ہوگا ' اور امام مالک کے نزدیک اس وصیت میں بیٹیوں کی اولاد داخل نہیں ہوگی اور اس کا اپنے قرابت داروں کے لیے وصیت کرنا اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کے لیے وصیت کرنے کی مثل ہے اور اس وصیت میں بیٹے کی اولاد داخل ہوگی اور بیٹیوں کی اولاد داخل نہیں ہوگی۔

امام شافعی کا بھی ایک قول اسی طرح ہے۔

امام مالک کی دلیل یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے :

(آیت) " **یوصیکم اللہ فی اولادکم** "۔ (النساء : ١١)

ترجمہ : اللہ تمہاری اولاد (کے حصوں) کے متعلق حکم دیتا ہے۔

تمام مسلمان اس آیت کا یہ معنی سمجھتے ہیں کہ اس آیت میں اولاد سے مراد صلبی اولاد ہے اور خصوصا بیٹا مراد ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

(آیت) " **وللرسول ولذی القربی** "۔ (الانفال : ٤١)

ترجمہ : رسول کے لیے اور اس کے قرابت داروں کے لیے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ حصص قرابت داروں میں سے چچا کو دیئے ' ماموں کو نہیں دیئے ' اسی طرح عرف میں بیٹیوں کی اولاد ان کے نانا کی طرف منسوب نہیں کی جاتی اور شجرہ نسب میں وہ نانا کے ساتھ نہیں ملتی۔

(الجامع لاحکام القرآن ' جز ' ص ٣٠ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت ١٤١٥ ھ)

بیٹی کی اولاد پر اولاد کے اطلاق اور اولاد میں اس کے داخل ہونے پر یہ دلیل ہے کہ قرآن مجید میں ہے :

(آیت) " **فمن حاجک فیہ من بعد ما جآءک من العلم فقل تعالوا ندع ابنآءنا وابنآءکم ونسآءنا ونسآءکم وانفسنا وانفسکم ثم نبتہل فنجعل لعنت اللہ علی الکذبین**۔ (آل عمران ٦١)

ترجمہ : پھر (اے رسول مکرم) آپ کے پاس وحی آنے کے بعد بھی جو لوگ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق بحث کریں تو آپ (ان سے) کہیں ' آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلالیں اور تم اپنے بیٹوں کو اور ہم اپنی عورتوں کو اور تم اپنی عورتوں کو اور ہم اپنے آپ کو اور تم اپنے آپ کو ' پھر ہم عاجزی کے ساتھ اللہ سے دعا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ڈالیں۔

احادیث میں ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے بیٹوں کے لیے حضرت حسن اور حضرت حسین (رض) کو بلایا تھا ' اس سے واضح ہوا کہ بیٹی کی اولاد بھی اولاد میں داخل ہے۔

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ٩١١ ھ لکھتے ہیں :

امام ابن ابی شیبہ ' امام سعید ' بن منصور ' امام عبد بن حمید ' امام ابن جریر اور امام ابو نعیم شعبی سے روایت کرتے ہیں کہ اہل نجران عیسائیوں کی ایک بڑی قوم تھے۔ انھوں نے حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کے متعلق ایک سنگین بات کہی اور وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس مسئلہ میں بحث کر رہے تھے ' تو اللہ تعالیٰ نے ان سے مباہلہ کرنے کا حکم دیا۔ صبح کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لائے اور
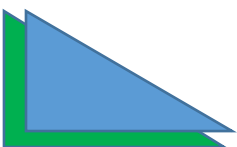
آپ کے ساتھ حضرت حسن ٗحضرت حسین (رض) اور حضرت سیدہ فاطمہ (رض) تھیں ٗتوانھوں نے مباہلہ کرنے سے انکار کردیا اور جزیہ دینے پر صلح کی۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مجھے سب نے بشارت دی تھی حتی کہ درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں نے بھی کہ اگر یہ مباہلہ کرتے تو تمام اہل نجران ہلاک ہوجاتے۔

امام مسلم ٗامام ترمذی ٗامام ابن المنذر ٗامام حاکم اور امام بیہقی نے (اپنی سنن میں) حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ (آیت) " قل تعالوا ندع ابناء نا وابناء کم "تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی ٗحضرت فاطمہ ٗ حضرت حسن اور حضرت حسین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو بلایا اور فرمایا اے اللہ ! یہ سب میرے اہل بیت ہیں۔ (درمنثور ٗج ۲ ص ۲۳۳۔ ۲۳۲ مطبوعہ دارالفکر ٗبیروت ۱۴۱۴ ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ ھ لکھتے ہیں :

بعض علماء نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ بیٹی کی اولاد کو بیٹا کہنا ٗیہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خصوصیت ہے۔ اور ہمارے اصحاب (فقہاء احناف) کے اس مسئلہ میں مختلف فتوے ہیں اور میرا رجحان یہ ہے کہ بیٹی کی اولاد ٗاولاد میں داخل ہے۔

(روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی المعانی جز ۷ ص ۲۱۴ ٗمطبوعہ دار احیاء التراث العربی ٗبیروت)

حضرت الیاس (علیہ السلام) کے نسب اور ان کے مصداق میں اختلاف ہے۔ امام ابن جریر متوفی ۳۱۰ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) نے فرمایا ادریس الیاس ہیں اور اسرائیل یعقوب ہیں۔

اور اہل انساب نے یہ کہا ہے کہ ادریس (علیہ السلام) حضرت نوح (علیہ السلام) کے جد (دادا) ہیں۔ وھب بن منبہ سے اسی طرح مروی ہے ٗ کیونکہ اس آیت میں حضرت الیاس (علیہ السلام) کو حضرت نوح (علیہ السلام) کے دادا ہیں ٗاس لیے اہل انساب کا قول صحیح ہے۔

(جامع البیان ٗجز ۷ ص ۳۴۰ ٗمطبوعہ دارالفکر ٗبیروت ۱۴۱۵ ھ)

امام ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ ھ نے بھی حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) کا یہ قول روایت کیا ہے کہ حضرت الیاس (علیہ السلام) ہی حضرت ادریس ہیں۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ٗج ۴ ٗص ۱۳۳۶ ٗمطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ مکہ مکرمہ ٗ۱۴۱۷ ھ)

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبیؒ متوفی ۶۶۸ ھ لکھتے ہیں :

ایک قوم نے یہ وہم کیا ہے کہ الیس ہی الیاس ہیں ٗحالانکہ اس طرح نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کا الگ الگ ذکر کیا ہے۔ وھب بن منبہ نے کہا کہ حضرت الیسع حضرت الیاس کے شاگرد ہیں اور یہ دونوں حضرت زکریا اور حضرت یحیٰؑ اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے پہلے گزرے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت الیاس (علیہ السلام) ہی حضرت ادریس ہیں اور یہ صحیح نہیں ہے ٗ۔ کیونکہ حضرت ادریس (علیہ السلام) حضرت نوح (علیہ السلام) کے دادا ہیں اور حضرت الیاس (علیہ السلام) ان کی اولاد میں سے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت الیاس (علیہ السلام) ہی حضرت خضر (علیہ السلام) ہیں اور دوسرا قول یہ ہے کہ نہیں ٗبلکہ حضرت الیسع حضرت خضر ہیں ٗ (جامع البیان ٗجز ۷ ص ۳۱ ٗ مطبوعہ دارالفکر ٗبیروت ۱۴۱۵ ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ ھ لکھتے ہیں :

امام ابن اسحاق نے حضرت الیاس (علیہ السلام) کا نسب اس طرح بیان کیا ہے 'الیاس بن لیس بن فخاص بن العیزار بن ہارون۔ یہ وہ ہارون ہیں جو حضرت موسیٰ بن عمران (علیہم السلام) کے بھائی ہیں۔ قتبی نے نقل کیا ہے کہ حضرت الیاس حضرت یوشع کے نواسے ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ وہ حضرت اسماعیل کے نواسے ہیں۔ حضرت ابن مسعود نے کہا وہ ادریس ہیں 'اور امام ابن اسحاق نے حضرت ادریس کا نسب اس طرح بیان کیا ہے 'ادریس بن یرد بن مہلائیل 'بن انوش بن قینان بن شیث بن آدم اور وہ حضرت نوح (علیہ السلام) کے دادا ہیں۔ حضرت ابن عباس (رض) نے بیان کیا کہ حضرت نوح (علیہ السلام) اور حضرت ادریس (علیہ السلام) کے درمیان ایک ہزار سال ہیں (روح المعانی جز ۷ ص ۲۱۴ 'مطبوعہ دار احیاء التراث العربی 'بیروت) (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

انبیاء کو اللہ تعالیٰ نے جہان والوں پر فضیلت دی ہے

بات اصل میں یہ ہے کہ وہ فضیلت جس کا تعلق نبوت سے ہے وہ سراسر اللہ کی عطا ہے وہ ایک منصب ہے جسے اہل دنیا نہیں بلکہ اللہ عطا فرماتے ہیں اور یہ منصب جسے مل جاتا ہے وہ اپنی اس منصب کی عظمت کے باعث تمام دنیا سے بالا بلند ہو جاتا ہے دنیا چاہے اسے قبول کرے یا نہ کرے وہ اپنی اس منصبی فضیلت کے باعث ہر حال میں عزت و شرف کا مالک رہتا ہے۔ کسی چمن میں اگر پھول کھلتا ہے تو اس کی شادابی اور رعنائی اور اس کی دلکشی اور عطر بیزی اس بات کی محتاج نہیں کہ اس کے گردوپیش میں رہنے والے اس سے اپنے مشام جان کو معطر کرتے ہیں یا نہیں۔ وہ بے ذوقوں کے ہجوم میں رہ کر بھی پھول ہی رہتا ہے اور اس کی انفرادیت میں کبھی کمی پیدا نہیں ہوتی۔ اندھوں کا کوئی ہجوم اگر پتھروں کے ڈھیر پر زندگی گزار رہا ہو اور ان کے سامنے اگر ہیرے رکھ دیئے جائیں تو وہ اپنی بصارت سے محرومی کے باعث ان ہیروں کے ساتھ بھی وہی سلوک کریں گے جو وہ پتھروں کے ساتھ کر رہے ہیں۔ وہ بیشک انھیں اٹھا کر پھینک دیں یا انھیں توڑ پھوڑ دیں کیونکہ وہ دیکھ نہیں پاتے کہ ان کی آب و تاب کا عالم کیا ہے لیکن ان کی اس ناقدری کے باوجود ہیرے کی عظمت اور اس کی آب و تاب میں کبھی کمی نہیں آتی۔ اسی طرح پیغمبر اپنی قوم کی جانب سے چاہے کسی بھی سلوک کا مستحق سمجھا جائے لیکن وہ اپنی ذاتی وجاہت ' شخصی عظمت 'تعلیم کی کشش 'مقصد کی شناخت 'مکارم اخلاق کی انفرادیت اور انسانیت کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کے باعث ہر حال میں ایسی ہی چمک دمک کا مالک رہتا ہے جیسے گھٹاٹوپ اندھیرے میں ایک جلتی ہوئی شمع یا بادلوں میں گھرا ہوا چاند۔ وقت کے حالات کا تناؤ 'غلط رویوں کا چلن 'بگڑی ہوئی قوم کی ضد اور انانیت کا غبار ہو سکتا ہے کہ وقتی طور پر اس سورج کی چمک کو دبائے رکھے لیکن تاریخ بالآخر ان کی عظمت کو سلام کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اور وہ چند افراد جو پیغمبر کی زندگی میں مشرف بہ اسلام ہوتے ہیں وہ بڑھتے بڑھتے ایک امت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے لے کر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) تک کی زندگیوں کو دیکھ لیجئے۔ ان کی قوموں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا وہ اپنے پیچھے گنتی کے چند متبعین چھوڑ کے گئے لیکن آج دنیا کی بڑی بڑی قومیں ان کے نقوش قدم کو تلاش کر رہی اور ان کی عظمتوں کو سلام کر رہی ہیں۔ اس سے قرآن پاک کا یہ کہنا ایک حقیقت بن کر ابھرتا ہے کہ ہم نے ان کو جہانوں پر فضیلت دی تھی۔ یہاں چونکہ ایک بہت مختصر تعداد کا ذکر ہوا ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ یہ غلط تفسیر پیدا ہو کہ کیا دنیا کو ہدایت کے راستے پر چلانے کے لیے صرف یہی ایک مختصر سا گروہ بھیجا گیا تھا کیا یہی توحید کے

پر ستاروں کا قافلہ ہے جو چند نفوس قدسیہ پر مشتمل ہے جبکہ دنیا اہل شرک سے بھری ہوئی ہے اس لیے اگلی آیت میں اس غلط کا ازالہ فرمایا گیا۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

آیت مبارکہ :

وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَالۡيَسَعَ وَيُوۡنُسَ وَلُوۡطًا‌ ؕ وَكُلًّا فَضَّلۡنَا عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ۙ‏ 86

لغۃ القرآن: وَاِسْمٰعِيْلَ : اور اسماعیل] [وَالْيَسَعَ : اور یسع] [وَ : اور] [يُوْنُسَ : یونس] [وَلُوْطًا : اور لوط] [وَكُلًّا : اور ہر ایک سے] [فَضَّلْنَا : ہم نے فضیلت دی ہے] [عَلَي الْعٰلَمِيْنَ : جہان والوں پر] [

ترجمہ : اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط (علیہم السلام کو بھی ہدایت سے شرف یاب فرمایا)، اور ہم نے ان سب کو (اپنے زمانے کے) تمام جہان والوں پر فضیلت بخشی

تشریح:

اس آیت اور اس سے اوپر والی دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے اٹھارہ انبیاء کرام (علیہ السلام) کا ذکر فرمایا اور ان کے ذکر میں جو ترتیب آیت میں موجود ہے وہ نہ تو زمانہ کے اعتبار سے ہے اور نہ فضیلت کے اعتبار سے لیکن جس شان سے انبیاء کرام (علیہ السلام) کے اسماء ذکر فرمائے گئے اس میں ایک عجیب لطیفہ ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء عَلَيْهِمُ الصَّلٰوةُ عَزَّوَجَلَّ سے ہر ایک جماعت کو ایک خاص طرح کی کرامت وفضیلت کے ساتھ ممتاز فرمایا، جیسے حضرت نوح، ابراہیم، اسحاق اور یعقوب (علیہ السلام) کا پہلے ذکر کیا کیونکہ یہ انبیاء (علیہ السلام) کے اصول ہیں یعنی ان کی اولاد میں بکثرت انبیاء (علیہ السلام) ہوئے جن کے نسب انھیں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ پھر نبوت کے بعد عظیم مقامات ومراتب میں سے ملک واختیار اور سلطنت واقتدار ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور سلیمان (علیہ السلام) کو اس کا بہت بڑا حصہ عطا فرمایا اور اس شعبے کا زیادہ تر تعلق مقام شکر سے ہے۔ پھر اس کے بعد حضرت ایوب (علیہ السلام) کا تذکرہ ہے کیونکہ مراتب رفیعہ (بلند مراتب) میں سے مصیبت وبلاء پر صابر رہنا بھی ہے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب (علیہ السلام) کو اس مرتبے کے ساتھ ممتاز فرمایا پھر ملک اور صبر کے دونوں مرتبے حضرت یوسف (علیہ السلام) کو عنایت کئے کہ آپ (علیہ السلام) نے شدت وبلاء پر مدتوں صبر فرمایا، پھر اللہ تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ ملک مصر عطا کیا۔ پھر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہ السلام) کا تذکرہ ہے کیونکہ معجزات کی کثرت اور دلائل وبراہین کی قوت بھی مراتب معتبرہ میں سے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے حضرت

موسیٰ اور حضرت ہارون عَلَيۡهِمَا الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام کو اس کے ساتھ مشرف کیا۔ پھر زہد اور ترک دنیا بھی مراتب معتبرہ میں سے ہے اور حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت الیاس (علیہ السلام) کو اس کے ساتھ مخصوص فرمایا پھر ان حضرات کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء کرام (علیہ السلام) کا ذکر فرمایا کہ جن کے نہ پیروکار باقی رہے اور نہ ان کی شریعت جیسے حضرت اسمٰعیل، حضرت یَسع، حضرت یونس اور حضرت لوط (علیہ السلام)۔ (1)

اس شان سے انبیاء کرام (علیہ السلام) کا ذکر فرمانے میں ان کی کرامتوں اور خصوصیتوں کی ایک عجیب باریکی نظر آتی ہے۔

{ وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ : اور ہم نے سب کو تمام جہان والوں پر فضیلت عطا فرمائی۔ } اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ انبیاء کرام (علیہ السلام) فرشتوں سے افضل ہیں کیونکہ عالم یعنی جہان میں اللہ عَزَّوَجَلَّ کے سوا تمام موجودات داخل ہیں تو فرشتے بھی اس میں داخل ہیں اور جب تمام جہان والوں پر فضیلت دی تو فرشتوں پر بھی فضیلت ثابت ہو گئی۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے 'ہم نے ان کو ہدایت دی 'اس کا معنی ہے ہم نے ان کو جنت کے راستوں کی طرف ہدایت دی 'یا اس کا معنی ہے ہم نے ان کو احکام شرعیہ پر عمل کرنے اور محاسن اخلاق کو حاصل کرنے کی ہدایت دی۔

انبیاء (علیہم السلام) کا ملائکہ سے افضل ہونا

اس آیت میں فرمایا ہے اور ہم نے ان (سب) انبیاء کو تمام جہان والوں پر فضیلت دی اس آیت سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) ملائکہ سے افضل ہیں 'کیونکہ عالم کا لفظ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر موجود کو شامل ہے اور ملائکہ بھی عالمین میں داخل ہیں۔ سو اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) ملائکہ سے افضل ہیں اور اس پر دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ حضرت آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کریں اور حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ادنی کو اعلی کے لیے سجدہ کا حکم دیا جائے اور تیسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو تمام چیزوں کے اسماء کی تعلیم دی اور پھر حضرت آدم (علیہ السلام) سے فرمایا آپ انھیں ان چیزوں کے نام بتائیں اور جب حضرت آدم (علیہ السلام) نے ان چیزوں کے نام بتا دیئے تو فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ حضرت آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کریں۔ سورۃ بقرہ ۳۴۔۳۰ میں یہ واقعہ مذکورہ ہے اور اس سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی فرشتوں سے افضل ہوتا ہے 'اور چوتھی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں شہوت اور غضب کو رکھا ہے جو علمی اور عملی کمالات کے حصول سے مانع ہیں 'پھر اس میں نجی 'خانگی اور تمدنی ضرورت اور حاجات رکھی ہیں اور کمزوریاں اور بیماریاں رکھی ہیں جو فضائل اور محاسن کے حصول سے مانع ہوتی ہیں اور فرشتوں کے اندر ان میں سے کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ ہر وقت تسبیح 'تہلیل اور عبادت کرتے ہیں اور ان کے لیے کوئی چیز مانع اور حائل نہیں ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مشاغل 'صوارف اور موانع کے باوجود معرفت الہی اور عبادات میں کمال حاصل کرنا زیادہ اخلاص اور فضیلت کا موجب ہے۔ اس لیے عام اور خاص ملائکہ سے انبیاء (علیہم السلام) افضل ہیں اور عام ملائکہ سے کامل مسلمان اور عبادت گزار مومنین افضل ہیں 'لیکن وہ خاص ملائکہ یعنی رسل ملائکہ سے افضل نہیں ہیں 'بلکہ رسل ملائکہ ان سے افضل ہیں اور فساق فجار اور کفار سے عام ملائکہ بھی افضل ہیں۔

اس آیت سے یہ مسئلہ بھی مستنبط کیا گیا ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) تمام اولیاء سے افضل ہیں 'کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء (علیہم السلام) کو العلمین پر فضیلت دی ہے اور العلمین میں اولیاء کرام بھی داخل ہیں۔

بظاہر اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ انبیاء (علیہم السلام) ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بھی افضل ہوں 'کیونکہ اس میں فرمایا ہے ہم نے ان (سب) کو العلمین "پر فضیلت دی ہے اور "العلمین "میں ہمارے نبی بھی داخل ہیں۔اس لیے مفسرین نے اس آیت میں یہ قید لگائی ہے کہ ان سب کو اپنے اپنے زمانوں میں تمام جہان والوں پر فضیلت دی ہے۔

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اٹھارہ انبیاء (علیہم السلام) کا ذکر فرمایا ہے 'ان کے علاوہ قرآن مجید میں سات انبیاء (علیہم السلام) کا اور ذکر فرمایا ہے۔ وہ یہ ہیں: حضرت آدم 'حضرت ادریس 'حضرت ھود 'حضرت ذوالکفل 'حضرت صالح 'اور حضرت شعیب (علیہم السلام) اور ہمارے نبی سیدنا محمد خاتم الانبیاء والمرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔

ان آیتوں میں اس پر دلیل ہے کہ جس رسول نے سب سے پہلے حلال اور حرام اور دیگر شرعی احکام بیان کیے 'وہ حضرت نوح (علیہ السلام) ہیں۔ (تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

کسی غیر نبی کو کسی نبی سے افضل کہنا کفر ہے

یہ بات ہر شخص سے بالاتر ہے کہ انبیاء کا منصب قطعی ہے، جس کا منکر کافر ہے اور کسی غیر نبی کا منصب قطعی نہیں خواہ وہ صدیق ہو شہید ہو یا صالح۔ لہٰذا کسی صحابی، تابعی، امام، مجتہد یا بڑے سے بڑے ولی قطب یا غوث کے علمی یا روح القران۔ڈاکٹر محمد اسلم صدیقیانی مقام سے انکار کفر نہیں۔ (سوا صحابیت صدیق اکبر (رض) کے، کہ وہ نص قرآن سے ثابت ہے اور اس کا منکر کافر ہے۔اس کے سوا ان کی کسی فضیلت سے انکار کفر نہیں) تو جس کا مقام و منصب حتمی قطعی اور نا قابل انکار ہے وہ یقیناً اس سے افضل ہے جس کا منصب قطعی و حتمی نہیں ہے تو جس نے کسی غیر نبی کو کسی نبی سے افضل کہا اس نے دوسرے لفظوں میں اس بے ایمان لانا ضروری قرار دیا اور اس کے منکر کو کافر ٹھہرا دیا۔اسی لیے جب اہل تشیع نے نبوت کے ساتھ امامت کو لگایا اور اس سے انکار کو بھی کفر کہا تو وہ خود کفر میں مبتلا ہو گئے اور علماء نے کسی غیر نبی کو انبیاء پر افضل کہنا کفر قرار دیا ہے۔

امام شاہ فضل الرسول علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ہم غالی رافضیوں کو اس لیے کافر کہتے ہیں کہ وہ آئمہ کو انبیاء سے افضل مانتے ہیں۔

(المعتقد المنتقد صفحہ 130 مطبوعہ استنبول ترکی)

اسی طرح قصیدہ بدءالامالی مطبوعہ استنبول میں جزم کیا گیا کہ کوئی ولی کسی نبی اور رسول سے افضل نہیں ہو سکتا حاشیہ میں کہا گیا کہ ولی کو نبی سے افضل ماننا کفر ہے۔

یہ مقام اہل تشیع یوں کے لیے جائے عبرت ہے کہ وہ بارہ آئمہ اہل بیت کے بارہ میں شدید غلو میں مبتلا ہو گئے ہیں بلکہ وہ اس سے آگے بڑھ کر کہتے ھیں کہ جس نبی نے آئمہ اہل بیت کے منصب جلیل سے حسد کیا اسے اللہ نے مصائب میں مبتلا کیا جیسے نوح (علیہ السلام) گرداب طوفان

میں، یونس (علیہ السلام) بطن ماہی میں، ابراہیم (علیہ السلام) نار نمرود میں اور یوسف علیہ السلام چاہ کنعان میں اس لئے ڈالے گئے کہ انھوں نے ائمہ اہل بیت سے حسد کیا۔ (اہل تشیع کی معتبر کتاب انوار نعمانیہ صفحہ 8 مطبوعہ ایران)

اسی طرح اس جگہ قادیانیوں کو بھی عبرت پکڑنی چاہیے۔ مرزا قادیانی نے خود کو تمام انبیاء سے افضل قرار دیا، دعوہ نبوت کے علاوہ یہ اس کا ایک اور کفر ہے اس نے فارسی اشعار میں کہا:

"انبیاء گرچہ بودہ اندب سے۔ من بعرفاں نہ کم ترم زک سے۔ ہر نبی راکہ دادہ شد جام، داد آں جام را مرا بتمام۔ زندہ شد ہر نبی بآمدنم۔ ہر رسولے نہاں بپیراہنم۔" یعنی انبیاء اگرچہ بہت ہوئے مگر میں عرفان میں کسی سے کم تر نہیں ہوں۔ ہر نبی کو جو جام کچھ دیا گیا مجھے اللہ نے وہ جام پورا دیا۔ میرے آنے سے ہر نبی زندہ ہوگیا اور ہر رسول میرے لباس میں چھپا ہے۔

(نزول المسیح مندرجہ روحانی خزائن جلد 18 صفحہ 477 مطبوعہ لندن)

اور اس نے کہا مجھے جس قدر نشانات دیے گئے وہ اور کسی نبی کو نہ دیے گئے۔

(نزول المسیح مندرجہ روحانی خزائن جلد 18 صفحۃ 460 مطبوعہ لندن)

تو واضح ہوا کہ مرزا قادیانی اپنی تحریرات کی روشنی میں دائرہ اسلام سے خارج ہیں وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ سے صریح مخالفت ہے۔

(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

آیت مبارکہ:

وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○87

لغۃ القرآن: وَ مِنْ : سے] [اٰبَآئِهِمْ : ان کے آباو اجداد] [وَذُرِّيّٰتِهِمْ : اور ان کی اولاد] [وَاِخْوَانِهِمْ : اور ان کے بھائیوں] [وَاجْتَبَيْنٰهُمْ : اور ہم نے منتخب کیا ان کو] [وَهَدَيْنٰهُمْ : اور ہم نے ہدایت دی انہیں] [اِلٰى : کی طرف] [صراط : راستے] [مُّسْتَقِيْمٍ : سیدھے]

ترجمہ: اور ان کے آباؤ (واجداد) اور ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے بھی (بعض کو ایسی فضیلت عطا فرمائی) اور ہم نے انھیں (اپنے لطف خاص اور بزرگی کے لئے) چن لیا تھا اور انھیں سیدھی راہ کی طرف ہدایت فرمادی تھی

تشریح:

صحیح راستہ کی پہچان

یعنی خالص توحید اور معرفت واطاعت خداوندی کا راستہ ہی وہ ہے۔ جس پر حق تعالیٰ اپنے فضل و توفیق سے مقبول بندوں کو چلاتا ہے پھر اس کے صلہ میں حسب استعداد درجات بلند کرتا ہے۔

مشرکین کو تنبیہ

حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر انعامات آلٰہیہ بیان فرما کر ایک طرف تو یہ قانون قدرت بتلا دیا گیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی محبوب چیزوں کو قربان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں بھی اس سے بہتر چیزیں عطا فرما دیتے ہیں، دوسری طرف مشرکین مکہ کو یہ حالات سنا کر اس طرف ہدایت کرنا مقصود ہے کہ تم لوگ محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بات نہیں مانتے تو دیکھو جن کو تم بھی سب بڑا مانتے ہو یعنی حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کا پورا خاندان وہ سب یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ قابل عبادت صرف ایک ذات حق تعالیٰ ہے، اس کے ساتھ کسی کو عبادت میں شریک کرنا یا اس کی مخصوص صفات کا ساجھی بتلانا کفر و گمراہی ہے، تم لوگ خود اپنے مسلمات کی رو سے بھی ملزم ہو۔

شرک تمام اعمال کو غارت کر دیتا ہے

مذکورہ انبیاء میں سے بعض کے باپ دادا کو بعض کی اولاد کو اور بعض کے بھائیوں کو بھی ہم نے نبوبت عطا فرمائی۔ یعنی کسی نبی کا باپ دادا بھی نبی تھا جیسے یوسف علیہ سلام، کسی کی اولاد میں نبوت تھی، جیسے ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) اور کسی کا بھائی بھی نبی تھا، جیسے موسیٰ (علیہ السلام)۔

اوپر جن حضرات کا ذکر ہوا ان کے ابا اور ان کی ذریت اور ان کے بھائیوں میں سے بھی بہت سوں کو ہدایت دیں یہ معنی اس صورت میں ہے کہ جب ھدینا محذوف مانا جائے اور فضلنا سے بھی متعلق ہو سکتا ہے جس کا معنی یہ ہوگا کہ ان حضرات کے ابا اور ضروریات اور اخبار میں سے بھی بہت سوں کو فضیلت دی اور پھر فرمایا "واجتبینھم وھدینھم الی صراط مستقیم "اور ہم نے ان کو چن لیا اور ان کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت دیں اس میں مضمون سابق کی تاکید اور تقریر ہے پھر فرمایا "ذلك ھدی اللہ "الخ یہ صراط مستقیم کی ہدایت اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس کی ہدایت کا فیصلہ فرمادے اور اس میں یہ بتایا کہ ہدایت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے کسی کو غلط فہمی اور گھمنڈ نہیں ہونا چاہیے کہ میں صاحب ہدایت ہو حضرات انبیاء کرام ہو یا اولیاء سب سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں

سب کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے اور صراط مستقیم پر باقی رکھا ہے پھر ارشاد ہے "**ولو اشرکوا** "اگر بالفرض یہ لوگ شرک کرتے تو جو عمل کیا کرتے تھے وہ سب ثواب کے اعتبار سے باطل ہو جاتے سورۃ زمر میں فرمایا "**ولقد اوحی الیك والی الذین من قبلك لئن اشرکت لیحبطن عملك ولتکونن من الخسرین** "(الزمر)

کیونکہ شرک اور کفر تمام اعمال کو باطل کر دیتا ہے حضرات انبیاء (علیہم السلام) سے شرک اور کفر کا صدور محال ہے بلکہ وہ گناہوں سے بھی پاک ہوتے ہیں کیونکہ وہ منجانب اللہ معصوم ہیں یہ بات بطور فرض فرمائی اور اس سے دوسروں کو سبق دینا اور تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ جب انبیاء کرام کا یہ حال ہے تو دوسرا کوئی شخص جو مشرک ہو گا اس کے اعمال صالحہ کا ثواب کیسے اور کیوں مل سکتا ہے کافر اور مشرک کے اعمال شروع سے غیر معتبر اور باطل ہے اور اگر کسی نے اسلام کی حالت میں بڑے نیک اعمال انجام دیئے پھر شرک کا ارتکاب کیا تو گزشتہ سارے اعمال باطل ہو جائیں گے (العیاذ باللہ من الشرک)

ارشاد ہے: "**اولئك الذین اتینہم الکتب والحکم والنبوۃ** "یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب دی اور حکم دیا اور نبوت عطا کی اس میں جو لفظ کتاب ہے اس سے جنس مراد ہے جس جس نبی کو کتاب ملی عموم جنس میں ان سب کا ذکر آگیا اور الحکم جو فرمایا اسے حکمت یعنی حقائق الاشیا کی معرفت مراد ہیں اور لوگوں کے درمیان صحیح صحیح فیصلے کرنا بھی مراد لے سکتے ہیں کیونکہ حضرات انبیاء کرام (علیہم السلام) اپنی امت کے درمیان فیصلے بھی فرماتے تھے یہاں لفظ نبوت وارد ہوا ہے لفظ رسالت مذکور نہیں نبی تو ہر پیغمبر ہیں لیکن رسول کے بارے میں علماء کرام فرماتے ہیں کہ وہ خاص ہے کیونکہ رسول وہ ہے جسے نئی شریعت اور نئی کتاب دی گئی ہو اور رسولوں کی تعداد 313 یا 315 کسی موقع پر مجبور ہو جب کہ انبیاء کی تعداد اسی حدیث میں 124000 مذکور ہوا (مشکوۃ ص 511)

یہاں لفظ نبوت لا کر سب کو مضمون بالا میں شریک فرمایا آگے ارشاد ہے **فَاِنۡ یَّكۡفُرۡ بِهَا هٰۤؤُلَآءِ فَقَدۡ وَكَّلۡنَا بِهَا قَوۡمًا لَّیۡسُوۡا بِهَا بِكٰفِرِیۡنَ** پس اگر یہ لوگ یعنی اہل مکہ اور ان کے علاوہ دوسرے کفار ان پیغمبروں کی نبوت کا انکار کریں جس میں سید کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن حکیم کا انکار بھی ہے کیونکہ ثابت تمام پیغمبروں کی نبوت کی خبر سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور قرآن مجید نے دی ہے سو ہم نے ان کے لئے ایسے لوگوں کو مقرر کر دیا ہے جو اس کے منکر نہیں یعنی اگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مخاطب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بات نہیں مانتے اور تمام انبیاء سابقین کی ہدایات پیش کر دینے کے باوجود وہ انکار ہی پر تلے ہوئے ہیں تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) غم نہ کریں کیونکہ ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت و ہدایت کو ماننے اور اپنانے کے لئے ایک بہت بڑی قوم کو مقرر کر رکھا ہے وہ کبھی کفر و انکار کے پاس نہیں جائیں گے اس میں عہد مبارک کے موجودین مہاجرین اور انصار بھی داخل ہیں اور قیامت تک آنے والے بیشمار مسلمان بھی اور یہ آیت کریمہ ان سب کے لئے مایا فخر اور بشارت عظیمہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کو مقام مدح میں ذکر فرمایا ہے **اللھم اجعلنا منھم وفیھم واحشرنا فیھم ومعھم واکثر ھذا الجمع الی قیام الساعۃ**۔ (اٰمین) (منازل)

خلافت علی بلا فصل پہ اہل تشیع کی بے بنیاد دلیل کا جواب

اہل تشیع اس آیت میں وَمِنۡ اٰبَآٮِٕهِمۡ وَذُرِّيّٰتِهِمۡ وَاِخۡوَانِهِمۡ سے حضرت علیؓ کی خلافت وامامت ثابت کرنے کی سعی بیکار کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جیسے انبیاء سابقین کے آباء، اولاد اور اخوان کو منزلت دی گئی، تو چاہیے کہ یہ فضیلت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھی حاصل ہو۔ چنانچہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اولاد کو اور آپ کے بھائی علی المرتضٰی (رض) کو بھی منزلت دی گئی اور ان کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ۔ کہ اے علی تم میرے لیے ایسے ہو جیسے موسیٰ (علیہ السلام) کے لیے ہارون علیہ السلام تھے (بخاری ومسلم) تو حضرت علی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بھائی ہیں اور حضرات حسن وحسین (رض) آپ کی ذریت ہیں تو یہ سب امام ہیں۔

اس کا جواب واضح ہے کہ اس آیت میں نبوت کا ذکر ہے، جیساکہ ہم ابھی بتا چکے ہو۔ تو کیا اہل تشیع ورسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذریت میں نبوت جاری کرنا چاہتے ہیں؟ یہاں تو نبوت کا ذکر ہو رہا ہے اس کا خلافت سے کوئی تعلق نہیں۔ طرحاں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمانا کہ اے علی! تم میرے لیے ایسے ہو جیسے موسیٰ کے لئے ہارون تو اس میں بھی امامت خلافت کا کوئی ذکر نہیں کیونکہ ہارون موسیٰ (علیہ السلام) کی حیات ہی میں فوت ہوگئے تھے وہ ان کے خلیفہ کیسے بنے؟ شیعہ مفسر ملا فیض کاشانی لکھتا ہے:

روی القمی عن الباقر (علیه السلام) قال مات هارون قبل موسیٰ وماتا جمیعا فی التیه۔ قمی نے امام باقی (رض) سے روایت کیا ہے کہ فرمایا: ہارون (علیہ السلام) موسیٰ (علیہ السلام) سے پہلے فوت ہوگئے اور دونوں کا وصال میدان تیہ میں ہوا۔

(تفسیر صافی جلد اول صفحہ 435 سورۃ مائدہ زیر آیت یتیھون فی الارض مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ تہران ایران)

(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

آیت مبارکہ:

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهۡدِىۡ بِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ‌ؕ وَلَوۡ اَشۡرَكُوۡا لَحَبِطَ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۝88

لغۃ القرآن: ذٰلِكَ : وہ] [هُدَى : ہدایت] [اللّٰهِ : اللہ] [يَهْدِي : ہدایت دیتا] [بِهٖ : اس کو] [مَنْ : جسے] [يَّشَآءُ : وہ چاہتا ہے] [مِّنْ : سے] [عِبَادِهٖ : اپنے بندوں میں

] [وَلَوْ : اور اگر] [اَشْرَكُوْا : سب نے شرک کیا] [لَحَبِطَ : یقینا ضائع ہوجاتا] [عَنْهُمْ : ان کو] [مَا : جو] [كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ : ہیں وہ سب کرتے]

ترجمہ : یہ اللہ کی ہدایت ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کے ذریعے رہنمائی فرماتا ہے، اور اگر (بالفرض) یہ لوگ شرک کرتے تو ان سے وہ سارے اعمال (خیر) ضبط (یعنی نیست و نابود) ہو جاتے جو وہ انجام دیتے تھے

تشریح:

یہاں ہدایت سے پہلی مراد اللہ کی توحید ہے کیونکہ اس عقیدے کے بغیر کوئی عبادت بھی قابل قبول نہیں ہوتی۔ عقیدہ توحید کی ضد شرک ہے جو ہر برائی کا منبع، عظیم گناہ اور انتہا درجے کا ظلم ہے اس لیے یہاں اٹھارہ عظیم المرتبت ہستیوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ اگر یہ ہستیاں بھی شرک کا ارتکاب کرتیں تو ان کی زندگی بھر کی عبادت وریاضت ضائع کردی جاتی۔

(عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي بَكْرَةَ (رض) عَنْ أَبِيهِ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِأَكْبَرِ الْكَبَائِرِ ثَلَاثًا قَالُوا بَلَى يَا رَسُولَ اللّٰهِ قَالَ اَلْإِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَعُقُوقُ الْوَالِدَيْنِ وَجَلَسَ وَكَانَ مُتَّكِءًا فَقَالَ أَلَا وَقَوْلُ الزُّورِ قَالَ فَمَا زَالَ يُكَرِّرُهَا حَتَّى قُلْنَا لَيْتَهُ سَكَتَ) [رواہ البخاری: کتاب الشادات، باب ما قیل فی شہادات الزور]

”عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ (رض) اپنے والد سے بیان کرتے ہیں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کیا میں تم کو بڑے گناہ کی خبر نہ دوں آپ نے ان الفاظ کو تین مرتبہ دہرایا صحابہ کرام (رض) نے عرض کی کیوں نہیں اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا اور پھر آپ ﷺ ٹیک چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ فرمایا اور جھوٹی بات کہنا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس بات کو دہراتے رہے یہاں تک ہم نے سوچا کاش! آپ خاموش ہو جائیں۔“

(عن ابْنِ عَبَّاسٍ (رض) يَقُولُ لَمَّا بَعَثَ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ إِلَى نَحْوِ أَهْلِ الْيَمَنِ قَالَ لَهُ إِنَّكَ تَقْدَمُ عَلَى قَوْمٍ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ فَلْيَكُنْ أَوَّلَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَى أَنْ يُوَحِّدُوا اللّٰهَ تَعَالَى فَإِذَا عَرَفُوا ذَلِكَ فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّ اللّٰهَ قَدْ فَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِي يَوْمِهِمْ وَلَيْلَتِهِمْ فَإِذَا صَلَّوْا فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّ اللّٰهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ زَكَاةً فِي أَمْوَالِهِمْ تُؤْخَذُ مِنْ غَنِيِّهِمْ فَتُرَدُّ عَلَى فَقِيرِهِمْ فَإِذَا أَقَرُّوا بِذَلِكَ فَخُذْ مِنْهُمْ وَتَوَقَّ كَرَائِمَ أَمْوَالِ النَّاسِ) [رواہ البخاری: کتاب التوحید،]

”حضرت عبداللہ بن عباس (رض) بیان کرتے ہیں جب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے معاذ بن جبل (رض) کو اہل یمن کی طرف بھیجا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم اہل کتاب کی طرف جارہے ہو سب سے پہلے تم جس بات کی انھیں دعوت دو وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایک جانیں جب وہ اس کی توحید کے قائل ہو جائیں تو انھیں بتانا۔ اللہ نے ان پر پانچ نمازیں دن اور رات میں فرض کی ہیں۔ جب وہ نماز پڑھنے لگیں تو ان کو بتانا اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں سے ان پر زکوۃ فرض کی ہے۔ جو ان کے مالدار لوگوں سے لے کر ان کے غربا کو دی جائے۔ جب وہ اس بات کا اقرار کرلیں تو ان سے زکوۃ وصول کرنا اور ان کے بہترین مال سے بچنا۔“

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

منصب نبوت اللہ کی خصوصی عطا ہے جو محنت سے حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ اللہ اپنے فضل سے جسے چاہے عطا فرماتا ہے اور کوئی نبی (معاذ اللہ) شرک کرنے والا نہ تھا۔ اگر بالفرض کوئی نبی شرک کرنے والا ہوتا تو اس کے سب اعمال ضائع ہو جاتے۔ اسی معنی میں ابراہیم علیہ السلام کے لیے بار بار کہا گیا: وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔ اس کا مقصد مشرکوں کو سمجھانا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولوں کے راستہ سے ہٹے ہوئے ہیں۔ اور اسی لیے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے فرمایا گیا:

وَلَقَدْ أُوْحِيَ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ "اور آپ کی طرف اور آپ سے پہلے والے رسولوں کی طرف وحی کی گئی کہ اگر تم نے (بالفرض) شرک کیا تو تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور تم نقصان اٹھانے والے ہو جاؤگے"۔ (زمر۔ 65) (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

انبیاء (علیہ السلام) ایک دوسرے کے بھائی ہوتے ہیں:

(عن ابی هُرَيْرَةَ (رض) قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يَقُوْلُ أَنَا أَوْلَى النَّاسِ بِابْنِ مَرْيَمَ وَالْأَنْبِيَاءُ أَوْلَادُ عَلَّاتٍ لَيْسَ بَيْنِي وَبَيْنَهُ نَبِيٌّ) [رواہ البخاری: کتاب احادیث الانبیاء،]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں میں نے رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا لوگو! میں ابن مریم کے زیادہ قریب ہوں اور تمام انبیاء (علیہ السلام) علاتی بھائی ہیں میرے اور ان کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔

" (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

اللہ کی ہدایت

یہ اللہ کی ہدایت ہے۔ اس سے مراد وہ ہدایت ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور رسل (علیہم السلام) کو ہدایت دی ہے اور ان کو دین حق کے ساتھ متصف ہونے کی توفیق دی ہے ' جس کے سبب سے انھوں نے دنیا اور آخرت کی عزت اور کرامت کو حاصل کیا اور اللہ کی ہدایت کا معنی ہے اللہ کی توحید کا اقرار کرنا ' ہر قسم کے شرک سے دائما مجتنب رہنا اور اخلاص کے ساتھ اللہ کی اطاعت اور عبادت کرنا۔ پھر فرمایا (بفرض محال) اگر ان نبیوں اور رسولوں نے بھی شرک کیا تو ان کے نیک اعمال ضائع ہو جائیں گے ' کیونکہ اللہ تعالیٰ شرک کی آمیزش کے ساتھ کسی نیک عمل کو قبول نہیں فرماتا۔ اس آیت میں انبیاء (علیہم السلام) کی امتوں کے لیے تعریض ہے کہ جب انبیاء (علیہم السلام) سے بھی اللہ تعالیٰ نے یہ فرمادیا کہ اگر انھوں نے بالفرض شرک کیا تو ان کے نیک اعمال ضائع ہو جائیں گے تو ان کی امتیں کس گنتی شمار میں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ' یہ وہ انبیاء ہیں جن کو ہم نے کتابیں دی ہیں ان کتابوں سے مراد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے صحیفے ہیں اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی توراۃ ہے ' حضرت داؤدؑ کی زبور ہے اور حضرت عیسیٰ علیہم الصلوۃ والسلام کی انجیل ہے اور حکم سے مراد ہے کتاب اللہ میں مذکور احکام کی تفسیر اور معرفت ' اور نبوت کا معنی ہے اللہ کی طرف سے غیب کی خبریں اور احکام شرعیہ حاصل کرکے بندوں تک پہنچانا۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

معلوم ہوا کہ ہدایت نبوت خاص کرم ہے جو خاص بندوں کو ملتا ہے۔ کوئی عمر بھر عبادت سے بھی نبی تو کیا صحابی نہیں بن سکتا۔ یہ ہدایت کسبی نہیں محض وہبی ہے۔ اس لیے فرمایا گیا۔ اگر نبیوں نے کفر کیا ہوتا تو ان کے نیک اعمال برباد ہو جاتے کہ نہ ان کے نام رہتے نہ فیضان لیکن ان کے نام فیضان بلکہ کام تا ابد باقی ہیں چنانچہ جناب ابراہیم کا کعبہ صفا مروہ قربانی سب موجود ہیں۔ لہٰذا وہ حضرات مومن تھے۔ یونہی اگر صحابہ حضور کے بعد کافر ہو گئے ہوتے تو ان کا نام، کام، فیضان باقی نہ رہتے۔ مگر حضرت صدیقؓ کی مسجد نبوی، عمر فاروقؓ کی نماز تراویح۔ فتوحات اسلامیہ، جناب عثمانؓ کا جمع کیا ہوا قرآن سب موجود ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ مومن ہیں۔

(تفسیر نور العرفان۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی)

پھر فرمایا اگر اہل مکہ نے میری کتاب کی ان آیات کا کفر اور انکار کیا تو میں نے ان آیات پر ایمان لانے کے لیے ایسی قوم کو مقرر کیا ہے جو اس کا انکار نہیں کریں گے۔ ابن جریج نے کہا اس قوم سے مراد اہل مدینہ اور انصار ہیں۔ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا اہل مدینہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مدینہ میں تشریف لانے سے پہلے اہل ایمان کے لیے مدینہ میں جگہ بنا چکے تھے۔

قتادہ نے اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے: کہ اگر قریش نے ہماری آیات کی تکذیب کی (تو کیا نقصان ہے!) ہم نے اس سے پہلے اٹھارہ نبیوں کا ذکر کیا ہے جو ہماری آیات پر ایمان لانے والے ہیں۔ امام ابن جریر نے اسی تفسیر کو راجح قرار دیا ہے۔ (جامع البیان ' جز ۷ ص ۳۴۵۔ ۳۴۲ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت ۱۴۱۵ ھ) (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَإِنْ يَكْفُرْ بِهَا هَٰؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ ○89

لغۃ القرآن: أُولٰئِكَ : وہی لوگ] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [اٰتَيْنٰهُمُ : ہم نے دی انہیں] [الْكِتٰبَ : کتاب] [وَالْحُكْمَ : اور حکومت یا حکمت] [وَالنُّبُوَّةَ : اور نبوت] [فَاِنْ : پھر اگر] [يَّكْفُرْ : انکار کرے] [بِهَا : اس کے] [هٰٓؤُلَاۗءِ : یہ لوگ] [فَقَدْ : تو تحقیق] [وَكَّلْنَا : ہم نے مقرر کردیے ہیں] [بِهَا : اس کے] [قَوْمًا : قوم ہے] [لَيْسُوْا :" یہ " سب نہیں ہیں] [بِهَا : اس کے] [بِكٰفِرِيْنَ : سب انکار کرنے والے]

ترجمہ : (یہی) وہ لوگ ہیں جنہیں ہم نے کتاب اور حکم (شریعت) اور نبوت عطا فرمائی تھی۔ پھر اگر یہ لوگ (یعنی کفّار) ان باتوں سے انکار کردیں تو بیشک ہم نے ان (باتوں) پر (ایمان لانے کے لیے) ایسی قوم کو مقرر کردیا ہے جو ان سے انکار کرنے والے نہیں (ہوں گے)

تشریح:

ارشاد فرمایا کہ جن انبیائے کرام (علیہ السلام) کا ذکر کیا گیا یہی وہ ہستیاں ہیں جنہیں ہم نے کتاب، حکمت اور نبوت عطا کی ہے تو اگر یہ کفارمکہ کتاب، حکمت اور نبوت کا انکار کرتے ہیں تو ہم نے ان تمام چیزوں کے حقوق ادا کرنے کیلئے ایسی قوم مقرر کر رکھی ہے جو ان چیزوں کا انکار کرنے والی نہیں۔ اس قوم سے یا انصار مراد ہیں یا مہاجرین یا تمام صحابہ کرام (رض) یا تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانے والے وہ تمام مسلمان جنہیں اللہ تعالیٰ خدمت دین کی توفیق بخشے جیسے مبلغین، علماء، اولیاء سلاطین وغیرہا۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نصرت فرمائے گا اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دین کو قوت دے گا اور اس کو تمام ادیان پر غالب کرے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ غیبی خبر واقع ہو گئی۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

یعنی اگر کفارمکہ دین کی ہدایت نہیں لیتے تو ہم نے اس کی خدمت کے لیے دوسری قوم تیار کر رکھی ہے جو اس کا انکار نہیں کرے گی۔ اس سے انصار مدینہ بھی مراد ہیں کہ جب کفار مکہ نے دین کو جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے انصار مدینہ کے ذریعے اعلاء دین کا کام لے لیا اور اس میں تا قیامت وہ سب لوگ شامل ہیں جو دین کی خدمت کو اپناتے ہیں جیسے علماء ربانیین، مشائخ دین اور حفاظ وقراء قرآن۔

(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

یاد رہے ہر نبی کو بلاواسطہ مستقل کتاب نہ دی گئی بلکہ بعض انبیاء کو کتابیں دی گئی اور کچھ دیگر انبیاء کو انہی کتب کی تبلیغ کے لئے بھیجا گیا۔ جیسے موسیٰ (علیہ السلام) کو توراۃ دی گئی اور ان کے بھائی ہارون (علیہ السلام) اور خادم یوشع بن نون علیہ السلام اور دیگر متعدد انبیاء بنی اسرائیل توراۃ ہی کی تبلیغ کرتے تھے گویا انھیں بالواسطہ (بواسطہ موسیٰ (علیہ السلام)) کتاب دی گئی۔

(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

اس سے دو مسئلے معلوم ہوئے۔ ایک یہ کہ کوئی پیغمبر علم وحکمت سے خالی نہیں کیونکہ یہاں حکمت سے مراد کتاب الہی کا فہم اور ان کی خاص تعلیم ہے۔ دوسرے یہ کہ کوئی نبی اصل نبوت میں کسی دوسرے نبی کا تابع نہیں۔ تمام انبیاء مستقل اور ذاتی نبی ہیں۔ ہاں کتاب میں بعض نبی بعض کے تابع ہیں جیسا پہلے بیان کیا گیا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبوت کو علیحدہ طور پر بیان فرمایا لہٰذا قادیانی بروزوی، ظلی، مراقی، مذاقی، افیونی، بھنگی، چرسی، نبی ہونا باطل محض ہے۔ (تفسیر نور العرفان۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی)

انبیاء کا اصولی راستہ ایک ہی ہے

تمام انبیاء عقائد، اصول دین اور مقاصد کلیہ میں متحد ہیں۔ سب کا دستور اساسی ایک ہے ہر نبی کو اس پر چلنے کا حکم ہے آپ بھی اس طریق مستقیم پر چلتے رہنے کے مامور ہیں۔ گویا اس آیت میں متنبہ کر دیا کہ اصولی طور پر آپ کا راستہ انبیائے سابقین کے راستے سے جدا نہیں۔ رہا فروع کا اختلاف وہ ہر زمانہ کی مناسبت و استعداد کے اعتبار سے پہلے بھی واقع ہوتا رہا ہے اور اب بھی واقع ہو تو مضائقہ نہیں۔

(تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی)

یہ قرآن مجید پورے عالم کے لیے ذکر اور نصیحت بنا کر بھیجا گیا ہے۔

(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رض) قَالَ قَالَ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَا مِنَ الْأَنْبِيَاءِ نَبِيٌّ إِلَّا أُعْطِيَ مَا مِثْلُهُ آمَنَ عَلَيْهِ الْبَشَرُ وَإِنَّمَا كَانَ الَّذِي أُوتِيتُ وَحْيًا أَوْحَاهُ اللَّهُ إِلَيَّ فَأَرْجُو أَنْ أَكُونَ أَكْثَرَهُمْ تَابِعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ)

[رواہ البخاری: کتاب فضائل القران، باب کیف نزل الوحی]

"حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا انبیاء کرام میں سے ہر نبی کو ایسی چیزیں دی گئی ہیں جس پر لوگ ایمان لے آئیں مجھے وحی عنایت کی گئی اس میں اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا میں امید کرتا ہوں قیامت کے دن میری پیروی کرنے والے سب سے زیادہ ہوں گے۔"

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔)

زندگی کی راہنمائی کے لیے تین چیزیں درکار ہوتی ہیں

1 ایک ایسی کتاب جس میں زندگی کے تمام معاملات کے حوالے سے ایک قانون دیا گیا ہو پھر قانون کے نافذ کرنے کے لیے قوت حاکمہ کی ہیئت ترکیبی کی تفصیل بھی دی گئی ہو اور اللہ سے چونکہ بندوں کا تعلق صرف ضابطے کا نہیں بلکہ رابطے کا بھی ہے۔ اس لیے اس میں پروردگار سے تعلق جوڑنے کی تمام ممکن ہدایات بھی دی گئی ہوں اور پھر اس کے لیے ترغیب اور ترہیب سے کام بھی لیا گیا ہو۔ انسانی زندگی صرف قانون کی عملداری سے مکمل نہیں ہوتی بلکہ اس کی حقیقی پہچان اخلاقیات سے ہوتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کتاب میں مکارم اخلاق کی تفصیل بھی ہو اور ساتھ ہی ساتھ حقوق و فرائض کا ایک پورا ضابطہ جسے اخلاق کے ساتھ مربوط کر دیا جائے اور قانون کا تحفظ بھی اسے حاصل ہو۔

2 کتاب کے صحیح فہم کا ایک نمونہ اور ایک آئیڈیل ہمارے سامنے ہو جس کو دیکھ کر ہم اندازہ کر سکیں کہ کتاب کے سمجھنے اور اس کے مفاہیم کے تعین میں ہمیں کن حدود کا خیال رکھنا ضروری ہے اور حتی الامکان یہ نمونہ ایسا ہو جو کتاب کے مبہمات کو کھول دے' اس کے اجمالات کی تفصیل بیان کر دے' احکام کو عملی شکل دے دے اور آداب کو شخصیت کا سراپا عطا کر دے۔

3 اس کتاب پر عمل درآمد کے لیے ایک ایسی مرکزی شخصیت ہو جو پورے جوش و جذبہ سے اس کتاب کے علم کو عام کرے ' اس کے فہم کو آسان کرے ' اس کے مطابق اخلاق تیار کرے اور پھر اس کے ہمہ جہتی نفاذ کے لیے پوری کوششیں بروئے کار لائے۔

انھی تینوں ضرورتوں کو یہاں کتاب ' حکم اور نبوت کے نام سے یاد فرمایا گیا کہ اللہ نے ہدایت دینے کے لیے جو انبیاء مبعوث فرمائے ان کے ذریعے سے یہ تینوں ضرورتیں پوری فرمائیں۔ ان پر کتاب نازل کی گئی جو انسانی ہدایت کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتی تھی اور پھر انھیں اس کتاب کا صحیح فہم اور اس کے اصولوں کو معاملاتِ زندگی پر منطبق کرنے کی صلاحیت اور مسائل حیات میں فیصلہ کن رائے قائم کرنے کی خداداد قابلیت بھی عطا فرمائی تھی۔ اور پھر انھیں انسانی زندگی کی راہنمائی کے لیے پوری طرح کتاب سے آشنا کرنے اور ان کی زندگیوں میں اس کتاب کو نافذ کرنے کا ایک عزم بالجزم بھی عطا فرمایا تھا جو ان کے تمام احساسات پر غالب آ گیا تھا۔ اس کو یہاں نبوت سے تعبیر فرمایا گیا۔ یعنی یہ لوگ جنکا یہاں ذکر ہوا ہے انھیں اللہ نے یہ کتاب ' حکم اور نبوت کی نعمت سے مشرف فرمایا تھا اور انھوں نے اس نعمت کی قدر کی خود بھی برگزیدہ ہوئے اور انسانوں کو بھی اس سے سیراب فرمایا۔ اب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے واسطے سے مشرکین مکہ کو توجہ دلائی جا رہی ہے کہ اب یہی نعمتیں ہم نے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عطا کی ہیں اور ان کے واسطے سے ہم تمہیں نوازنا چاہتے ہیں۔ اب ہونا تو یہ چاہیے کہ تم اس نعمت کی قدر کرو اور تم بھی اللہ کے انعامات کے مستحق ٹھہرو جو پہلے اس کی قدر کرنے والے حاصل کر چکے ہیں لیکن اگر تم نے اس کی قدر کرنے کی بجائے اپنا یہی رویہ جاری رکھا تو پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ اس کی ہرگز پروا نہ کریں ہم نے اس ذمہ داری کو اٹھانے کے لیے ایسے لوگوں کو مقرر کر دیا ہے جو اس کو اٹھانے میں کبھی تساہل سے کام نہیں لیں گے اور کبھی اس کی ناقدری نہیں کریں گے۔ جن حالات میں یہاں یہ بات کہی جا رہی ہے حقیقت یہ ہے ان حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ اس کتاب خداوندی کی حقانیت اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کی صداقت کی بہت بڑی دلیل ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی

ہم جانتے ہیں کہ یہ سورۃ مکی سورتوں میں سے ہے اور مکہ معظّمہ میں مسلسل تیرہ سال بتدریج جس طرح مخالفت کی چکی شدید سے شدید تر ہوتی گئی ہے وہ کسی بھی تاریخ کے طالب علم سے مخفی نہیں ہے۔ ہر آنے والا دن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور مسلمانوں کے لیے اذیت رسانی اور مخالفت کا نیا پیغام بن کر طلوع ہوتا رہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ مشرکین مکہ میں انتقام کی آگ شدید ہوتی گئی۔ زندگی کا کوئی دکھ اور انسانی طاقت کا کوئی حربہ ایسا نہیں جو انھوں نے اس تحریک کا راستہ روکنے اور مسلمانوں کو ہراساں کرنے کے لیے استعمال نہ کیا ہو۔ بار بار آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قتل کرنے کے منصوبے بنے۔ مسلمان اس اذیت رسانی کے عمل سے تنگ آ کر ایک سے زیادہ مرتبہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ سازشوں اور منصوبوں کی بڑھتی ہوئی آگ سے بچنے کے لیے تین سال تک آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں نے شعب ابی طالب میں محصور رہ کر وقت گزارا۔ حتیٰ کہ مکی زندگی کے آخری سال جب حضور ﷺ نے طائف کا سفر کیا تو اس میں جو قیامت گزری ہے ہر مسلمان اس سے واقف ہے۔ انھی سالوں میں جبکہ مخالفت کی بھٹی پورے جوش سے دہک رہی تھی ' یہ سورۃ نازل ہوئی ہے۔ اور اس میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ آپ ﷺ ان کی مخالفت کی پروا نہ کریں۔ حالانکہ ان کی مخالفت مسلمانوں کے لیے ایک بڑا عذاب بن

چکی ہے اور تحریکِ اسلامی کے بچ نکلنے یا آگے بڑھنے کی کوئی صورت بظاہر دکھائی نہیں دیتی۔ ظاہر بیں نگاہیں صاف دیکھ رہی ہیں کہ اس صورتحال سے بچ نکلنا مسلمانوں کے لیے ناممکن ہوتا جا رہا ہے جو مسلمان مکہ معظّمہ میں باقی ہیں وہ مسلسل اذیتوں سے حوصلہ ہار دیں گے اور یا موت سے ہمکنار ہو جائیں گے اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قریش مکہ کسی وقت بھی موقع پا کر قتل کر دیں گے اور جو مسلمان ہجرت کر کے دوسرے ملکوں میں جا چکے ہیں وہ غریب الوطنی کی موت مارے جائیں گے۔ لیکن پروردگار فرما رہے ہیں کہ اے پیغمبر ﷺ آپ ان کے رویے اور ان کی مخالفت کی ہر گز پروا نہ کریں اگر یہ آپ پر ایمان نہیں لا رہے تو نہ لائیں ہم نے ایمان لانے کے لیے ایک ایسی قوم مقرر کر دی ہے جو اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھائے گی اور تم ان کو دیکھو گے کہ وہ کبھی بھی اس ذمہ داری سے پہلو تہی نہیں کرے گی۔ ایسے ناگفتہ بہ اور ناموافق حالات میں اتنی بڑی پیش گوئی اور وہ بھی پوری تحدی اور قطعیت کے ساتھ کرنا جبکہ حالات دور دور تک اس کا ساتھ دیتے نظر نہیں آتے یہ کسی بھی انسان کے بس کی بات نہیں۔ ایسی پیش گوئی پورے یقین کے ساتھ اللہ کی ذات کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا اس لیے کہ اگر رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں جبکہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا ہو کوئی آدمی یہ کہے کہ ابھی اس تاریکی سے سورج طلوع ہونے والا ہے تو کوئی سننے والا کبھی اس کا یقین نہیں کرے گا۔ جھلس ڈالنے والے صحرا میں جہاں دور دور تک پانی کا نشان تک نہ ہو کوئی آدمی چشمہ ابلنے کی بات کرنے لگے تو یقیناً سننے والے اس کی دماغی صحت کا مذاق اڑائیں گے جبکہ یہ دونوں باتیں کسی نہ کسی حد تک ممکن دکھائی دیتی ہیں۔ صحرا میں چشمے کا نکل آنا اور اندھیرے کے بعد سورج کا طلوع ہو جانا کوئی ناممکن بات نہیں۔ لیکن ڈوبتی ہوئی تحریک اور بند گلی میں گھر جانے والا قافلہ کسی انقلاب کا پیش خیمہ بن جائے یا مستقبل قریب میں اس کے ہاتھوں انقلاب کی شمع جلنے لگے ' یہ ایک ایسی انہونی بات ہے کہ جس کا کبھی یقین نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن قرآن کریم پورے یقین و اذعان سے یہ بات کہہ رہا ہے کہ یہ آفتاب طلوع ہو کے رہے گا البتہ کب طلوع ہو گا یہ تم نہیں جانتے ہو۔ یہ ہم جانتے ہیں۔ تمہارا کام صرف اس سحر کی امید میں رات کی تاریکی سے لڑنا ہے اور اپنے سفر کو جاری و ساری رکھنا ہے۔ تم اپنے حوصلوں کو باقی رکھو اور اس نوید جانفزا کو یقینی سمجھ کر اس کے انتظار میں اس کشمکش میں ثابت قدم رہو۔ اس لحاظ سے اگر اتنے بڑے دعوے کو قرآن پاک کے سچا ہونے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے برحق ہونے کی دلیل نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے۔

دوسری بات جو اس آیت سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں جس طرح یہ نوید سنائی جا رہی ہے کہ عنقریب ایک قوم اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھائے گی اور پھر یہ انقلاب تیزی سے آگے بڑھے گا اسی طرح یہ بات بھی اس سے مترشح ہوتی ہے کہ جو لوگ اس وقت تک اسلام قبول کر چکے اور اذیتوں سے گزر رہے ہیں لیکن انھوں نے کسی وقت بھی استقامت کا دامن نہیں چھوڑا۔ انھیں اور مستقبل قریب میں ایمان لانے والوں کی استقامت کو خراج تحسین پیش کیا جا رہا ہے اور یا یوں کہہ لیجئے کہ اللہ کے راستے میں ان کی ثابت قدمی اور استقامت کو شرف قبول بخشا جا رہا ہے۔ چنانچہ تاریخ ان دونوں باتوں کو ثابت کرتی ہے کہ مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد جس طرح تیزی سے اسلام پھیلا اور حدیبیہ کے معاہدے کے بعد جس طرح اس میں مزید تیزی آئی اور فتح مکہ کے بعد جس طرح فوج در فوج لوگوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا وہ تمام اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ اور پروردگار کے اس دعویٰ کی روشن دلیلیں ہیں۔ اسی طرح آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات طیبہ میں اسلام اور مسلمانوں کو جن مراحل سے گزرنا پڑا اور پھر حضور کے انتقال پر ملال کے بعد صحابہ کو عرب کی جس عظیم بغاوت کو کچلنا پڑا اور پھر جس طرح وقت کی بڑی بڑی قوتیں اسلام اور مسلمانوں کے مقابلے میں اٹھ کھڑی ہوئیں اور جس طرح مسلمانوں نے استقامت اور شجاعت سے ان کا مقابلہ کیا وہ قرآن کریم کے اس کلمہ تحسین کی زندہ گواہیاں ہیں جو صحابہ کی سرفروشانہ کارناموں نے تاریخ کے سپرد کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ
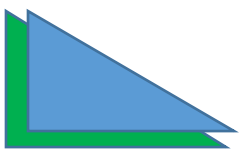
یہاں پروردگار جس طرح یہ فرمارہا ہے کہ یہ لوگ اگر ایمان نہیں لاتے تو نہ لائیں آپ کو ہرگز اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ ہم نے اس کے لیے ایک ایسی قوم اٹھادی ہے اور مقرر کردی ہے کہ جو اس راستے پر ایسی ثابت قدمی سے چلے گی کہ کبھی لڑکھڑاہٹ ان کے قدموں میں نہیں آئے گی اور کبھی کفر اور نافرمانی کا چھینٹا ان کے دامن پر نہیں پڑنے پائے گا اس حوالے سے جب ہم صحابہ کی زندگیوں کو دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ کیسے کیسے نامساعد حالات میں آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے سامنے جب اس طرح کی پیش گوئیاں فرماتے تھے تو وہ اس کا یقین کیسے کرلیتے تھے اور پھر بڑی سے بڑی مخالفت میں ثابت قدم کیسے رہتے تھے۔ یہ ہر سوچنے والے دماغ کے لیے ایک ایسا لمحہ فکریہ ہے جو قوموں کی تاریخ میں غور کرنے والوں کو ہمیشہ سوچنے پر مجبور کردیتا ہے۔ مکی زندگی میں جس طرح یہ پیش گوئی ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے لیکن مسلمانوں نے اسے دل و جان سے قبول کیا۔ اسی طرح جنگ بدر کے موقع پر جب حضور مسلمانوں کو لے کر قریش کے ایک ہزار کے عظیم اور مسلح لشکر کے مقابلے میں نکلے تو ہر دیکھنے والی نگاہ سہمی جارہی تھی کہ یا اللہ آخر یہ کیا مقابلہ ہے کہ ایک طرف مسلح لوگوں کا ایک عظیم لشکر ہے اور دوسری طرف مٹھی بھر مدینہ کے بخار کے مارے ہوئے 'فاقوں کے ستائے ہوئے غیر مسلح لوگ ہیں۔ لیکن انھوں نے جس پامردی اور حوصلہ مندی سے اس پوری صورتحال کا مقابلہ کیا وہ حیران کردینے والی بات ہے اور دنیا میں شاید ہی ہمیں اس کی کوئی مثال مل سکے۔ سلسلہ نبوت کی آخری کڑی آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب ان کی گرفتاری کا وقت آیا تو ان کے وہ بارہ حواری جو ان کے خاص مقرب لوگ تھے وہ بھی ثابت قدم نہ رہ سکے اور انھیں تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے۔ لیکن ادھر صحابہ کا حال یہ تھا کہ جب راستہ میں آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے مشورہ لیا کہ ایک طرف قافلہ تجارت ہے اور دوسری طرف قریش کا لشکر بتاؤ کدھر جانا چاہیے۔ لیکن ساتھ ہی اشاروں سے یہ بات بھی واضح کردی کہ میں تو لشکر کے مقابلے میں جانے کو ترجیح دیتا ہوں اور اللہ تعالیٰ نے دونوں میں سے ایک میں کامیابی کا وعدہ فرمایا ہے تو صحابہ نے جواب میں جو کہا وہ تاریخ میں ہمیشہ آب زر سے لکھا جائے گا۔ مہاجرین میں سے حضرت مقداد بن عمرو نے اس سوال کے جواب میں عرض کیا۔ یارسول اللہ جدھر آپ کا رب آپ کو حکم دے رہا ہے اسی طرف چلیے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم بنی اسرائیل کی طرح یہ کہنے والے نہیں ہیں کہ جاؤ تم اور تمہارا خدا دونوں لڑیں ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ نہیں ہم کہتے ہیں چلیے آپ اور آپ کا خدا دونوں لڑیں اور ہم آپ کے ساتھ جانیں لڑائیں گے جب تک ہم میں سے ایک آنکھ بھی گردش کررہی ہے۔ انصار میں سے حضرت سعد بن معاذ اٹھے۔ انھوں نے عرض کی:

لقد اٰمنا بك و صدقناك و شهدنا ان ما جئت به هو الحق و اعطيناك عهودنا و مواثيقنا على السمع و الطاعة۔ فامض يا رسول الله لما اردت۔ فو الذى بعثك بالحق لو استعرضت بنا هٰذا البحر فخضته لخضناه معك وما تخلف منا رجل واحد وما نكره ان تلقى بنا عدونا غدًا انا لنصبر عند الحرب صُدُقٌ عند اللقآء و لعل الله يريك منا ما تقر به عينك نسر بنا على بركة الله

" ہم آپ پر ایمان لائے ہیں 'آپ کی تصدیق کرچکے ہیں کہ آپ جو کچھ لائے ہیں وہ حق ہے اور آپ سے سمع و طاعت کا پختہ عہد باندھ چکے ہیں۔ پس اے اللہ کے رسول 'جو کچھ آپ نے ارادہ فرمالیا ہے اسے کر گزریئے۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر آپ ہمیں لیکر سامنے سمندر پر جا پہنچیں اور اس میں اتر جائیں تو ہم آپ کے ساتھ کودیں گے اور ہم میں سے ایک بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہم کو یہ ہرگز ناگوار نہیں ہے کہ آپ کل ہمیں لے کر دشمن سے جا بھڑیں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہیں گے 'مقابلہ میں سچی جاں نثاری دکھائیں

گے اور بعید نہیں کہ اللہ آپ کو ہم سے وہ کچھ دکھوادے جسے دیکھ کر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں پس اللہ کی برکت کے بھروسے پر آپ ہمیں لے چلیں"۔

صحابہ کی زندگی ایسی سرفروشانہ مثالوں سے بھرپور ہے۔ ان کے اسی کردار کی یہاں تحسین فرمائی جارہی ہے اور آنے والے حالات میں ان کی مزید استقامت کی پیش گوئی بھی فرمائی گئی ہے۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

آیت مبارکہ :

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ ۗ قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ ۝90

لغۃ القرآن: أُولٰئِكَ : وہی لوگ] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [هَدَى : ہدایت دی] [اللّٰهُ : اللہ] [فَبِهُدٰىهُمُ : پس ان کی ہدایت " راہ " پر] [اقْتَدِهْ : تو چل] [قُلْ : آپ کہہ دیں] [لَآ : نہیں] [اَسْـَٔلُكُمْ : میں مانگتا تم سے] [عَلَيْهِ : اس پر] [اَجْرًا :] [اِنْ : اگر] [هُوَ : وہ] [اِلَّا : مگر] [ذِكْرٰي : نصیحت کرنا ہے] [لِلْعٰلَمِيْنَ : جہان والوں کے لیے]

ترجمہ : (یہی) وہ لوگ (یعنی پیغمبرانِ خدا) ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت فرمائی ہے پس (اے رسولِ آخر الزماں !) آپ ان کے (فضیلت والے سب) طریقوں (کو اپنی سیرت میں جمع کرکے ان) کی پیروی کریں (تاکہ آپ کی ذات میں ان تمام انبیاء و رسل کے فضائل و کمالات یکجا ہو جائیں)، آپ فرما دیجئے: (اے لوگو!) میں تم سے اس (ہدایت کی فراہمی پر کوئی اجرت نہیں مانگتا۔ یہ تو صرف جہان والوں کے لیے نصیحت ہے

تشریح:

اقتدا کا معنی ہے کسی کے کام کے موافق کوئی کام کرنا۔ علامہ قطب الدین رازی (رح) کشاف کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ یہاں اقتدا سے مقصود صرف اخلاق فاضلہ اور صفات کمال ہیں ان جلیل القدر انبیاء کی موافقت کرنا ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر وہ خوبی اور کمال جو دوسرے انبیاء میں متفرق طور پر پایا جاتا تھا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان سب کمالات کے جامع ہیں۔ اس لیے سب سے افضل و اکمل ہیں۔ (روح المعانی)۔

حسن یوسف، دم عیسیٰ، ید بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا تمام صفات انبیاء کا جامع ہونا

اس آیت کا معنی ہے اے رسول مکرم ان نبیوں اور رسولوں نے جو عمل کیا ہے آپ ﷺ اس کے مطابق عمل کریں اور جس منہاج پر یہ چلتے ہیں 'اس منہاج پر چلیں اور ہماری دی ہوئی ہدایت اور توفیق کے مطابق جس طرح انھوں نے زندگی گزاری ہے ' آپ ﷺ اس طرح زندگی گزاریں اور ان تمام نبیوں اور رسولوں کے جس قدر محاسن اور خوبیاں ہیں آپ ﷺ وہ سب اپنے اندر جمع کرلیں۔اس آیت میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عظیم منقبت ہے کہ تمام نبیوں اور رسولوں میں جو خوبیاں اور کمالات الگ الگ اور متفرق طور پر پائے جاتے تھے 'وہ سب کمالات آپ کی ذات میں جمع ہوگئے جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں اس لیے مبعوث کیا گیا ہوں تاکہ حسن اخلاق کو مکمل کردوں

(الموطار قم الحدیث : ١٦٧٧ 'مشکوۃ 'رقم الحدیث : ٥٠٦٧ '٥٠٦٦)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مجھے اس لیے مبعوث کیا گیا ہے کہ میں صالح اخلاق کو مکمل کردوں۔ (المستدرک ج ٢ 'ص ٦١٣ 'سنن کبری للبیہقی 'ج ١٠ 'ص ٩٢ ' الاستذکار 'ج ٢٦ 'رقم الحدیث : ٣٨٩٤٢ 'مسند احمد 'ج ٩ رقم الحدیث : ٨٩٣٢ 'شیخ احمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے 'مطبوعہ دارالحدیث : قاہرہ 'مسند احمد 'ج ٢ 'ص ٣٨١ 'طبع قدیم کنز العمال 'ج ١١ 'رقم الحدیث : ٣١٩٦٩)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مجھے صرف مکارم اخلاق کو پورا کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

(مسند البزار 'ج ٣ 'رقم الحدیث : ٢٤٧٠ 'المعجم الاوسط 'ج ٧ 'رقم الحدیث : ٦٨٩١ 'علامہ الہیثمی نے کہا امام بزار کی سند صحیح ہے 'مجمع الزوائد 'ج ٩ 'ص ١٥ 'طبرانی کی روایت میں ایک راوی ضعیف ہے 'الدر المنتشرہ 'رقم الحدیث : ١٦٨)

علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ ہمارے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام انبیاء (علیہم السلام) سے افضل ہیں اور اس کی تقریر یہ ہے کہ صفات کمال اور خصال شرف ان میں متفرق ہیں۔حضرت داؤد (علیہ السلام) اور حضرت سلیمان (علیہ السلام) نعمت پر بہت شکر کرنے والے تھے 'اور حضرت ایوب (علیہ السلام) آزمائشوں پر بہت صبر کرنے والے تھے اور حضرت یوسف (علیہ السلام) صبر اور شکر کے جامع تھے اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) قوی شریعت کے بانی اور غالب معجزات کے حامل تھے اور حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ (علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت الیاس (علیہم السلام) زہد میں راسخ قدم رکھتے تھے۔حضرت اسماعیل پر صدق غالب تھا اور حضرت یونس اللہ کی بارگاہ میں بہت گڑگڑا کر دعا کرنے والے تھے۔اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جن انبیاء (علیہم السلام) کا یہاں ذکر فرمایا ہے ' ان میں سے ہر ایک پر شرف اور فضیلت کی کوئی نہ کوئی صفت غالب تھی۔پھر اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ حکم دیا کہ وہ ان تمام انبیاء کی اتباع کریں 'گویا کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ حکم دیا کہ عبودیت اور اطاعت کی کل صفات جو

ان تمام انبیاء (علیہم السلام) میں متفرق طور پر پائی جاتی ہیں 'آپ تنہا ان صفات سے متصف ہو جائیں اور خصائل رفیعہ اور شمائل جمیلہ کو اپنی ذات میں جمع کر لیں 'اور جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم دیا تو یہ محال ہے کہ آپ ان صفات کمال کے حصول میں کوئی کوتاہی کریں۔ پس ثابت ہوا کہ شرف اور فضیلت کی یہ تمام صفات آپ کی ذات میں جمع ہو گئیں اور جو کمال تمام انبیاء (علیہم السلام) میں متفرق تھے 'وہ سب آپ کی ذات مبارکہ میں جمع ہو گئے۔ لہٰذا یہ کہنا واجب ہے کہ ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام انبیاء سے افضل ہیں۔
(تفسیر کبیر 'ج ۵ 'ص ۷۵ 'مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت '۱۴۱۵ھ 'ج ۱۳ 'ص ۱۷ 'مطبوعہ مصر)
(تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا افضل الانبیاء ہونا

اسی لئے ائمہ دین فرماتے ہیں کہ کوئی ایسا منصب و مرتبہ نہیں جو کسی نبی کو دیا گیا ہو۔اور حبیب خدا اشرف الانبیاء (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دامن اس سے خالی ہو، بلکہ کسی نبی کو جو فضیلت یا معجزہ دیا گیا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس سے بڑھ کر فضیلت یا معجزہ عطا فرمایا گیا۔ چنانچہ آدم علیہ السلام سب سے پہلے بشر ہیں تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سب سے پہلی تخلیق خداوندی ہیں، حضرت آدم (علیہ السلام) مسجود ملائکہ ہیں اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہ ہیں جن پر سب فرشتے درود بھیجتے ہیں اور تا قیامت بھیجیں گے۔ سجدہ آدم تو ایک بار ہوا اور درود سرور دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تا قیامت جاری ہے۔اسی طرح اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ ہیں تو ہمارے آقا و مولی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حبیب اللہ ہیں، ابراہیم (علیہ السلام) نے کعبہ بنایا تو آپ نے کعبہ بسایا، بلکہ کعبہ بنا کر ابراہیم علیہ السلام نے آمد مصطفیٰ کے لیے دعا کی: رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ الخ۔ (بقرہ۔129)
اسی طرح اگر موسیٰ (علیہ السلام) کو توراۃ دی گئی تو محمد عربی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قرآن دیا گیا توراۃ کے احکام منسوخ ہو گئے مگر قرآن کے احکام تا قیامت جاری ہیں موسیٰ (علیہ السلام) توراۃ لینے کوہ طور پر گئے اور ہمارے آقا سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جہاں ہوں قرآن وہیں پہنچ جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے لیے پتھر سے چشمے نکالے گئے اور حضور سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی انگشتانِ مبارک سے چشمے بہائے گئے۔ یوں ہی عیسیٰ (علیہ السلام) کو صرف اندھے پن اور کوڑھی پن کے دور کرنے کی فضیلت دی گئی جبکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لعاب دہن کو ہر مرض کی شفاء بنایا گیا، بلکہ آپ کے جسم مبارک سے لگنے والا لباس ہر مرض کی شفاء ٹھہرا۔ یوں ہی ہر نبی کو جو فضیلت دی گئی ہے جو خلق دیا گیا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں وہ فضیلت یا وہ خلق اس سے بڑھ کر رکھا گیا۔ سب انبیاء کرام نے دین کے لیے مصائب جھیلے مگر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مصائب سب انبیاء سے زیادہ تھ ۔ کما ھو مصرح فی الحدیث۔

بعض کفار اس غلط فہم میں مبتلا تھے کہ نبوت کا دعویٰ صرف مال و دولت اکٹھا کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم فرماتے ہیں کہ آپ اعلان کر دیجئے کہ دعوت اسلام میرا پیشہ نہیں بلکہ مقصد حیات ہے۔ میں اس کے ذریعہ سے دولت جمع نہیں کرنا چاہتا بلکہ میرا مدعا تو فقط یہ ہے کہ تم گمراہی کی دلدل سے نکل کر شاہراہ ہدایت پر آ جاؤ۔ تمہارے رب سے تمہارا ٹوٹا ہوا رشتہ پھر جوڑ دیا جائے۔

جو کتاب میں تمہیں پڑھ کر سناتا اور سمجھاتا ہوں اس سے میری ذاتی اغراض وابستہ نہیں۔ یہ تو ہر قسم کی اغراض سے بالاتر ہے یہ تو ایک آفاقی دعوت رشد اور ایک عالمی پیغام ہدایت ہے۔ اس کے پیش نظر کسی شخص، کسی قوم اور کسی ملک کی برتری دوسروں پر قائم کرنا نہیں بلکہ سب کو ایک سطح پر ایک صف میں کھڑا کرنا اور امن و سلامتی کی راہ پر گامزن کرنا ہے۔ عرب اپنی قومی اور لسانی برتری پر محکم یقین رکھتے تھے۔ ان کی عرب قومیت کے جذبات کو مشتعل کرکے اور ان کے دلوں میں دوسرے ممالک پر عربی غلبہ واقتدار کی ہوس بیدار کرکے اپنی طرف مائل کرنا بہت آسان تھا اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اتنی مشکلات سے بھی دو چار نہ ہونا پڑتا۔ لیکن یہ کامیابی عارضی اور وقتی ہوتی۔ اگر ایسا کیا جاتا تو ایک عالمی دین قوم و وطن کی تنگ حدود میں بند ہو کر رہ جاتا۔ اس لیے جہاں کہیں بھی قرآن کا ذکر کیا گیا ہے کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ یہ عرب کے لیے ہے بلکہ فرمایا ان **ھو الا ذکری للعلمین** سب جہانوں کے لیے ہے۔ سب شرقی و غربی، رومی و حبشی، عربی اور عجمی کے لیے اس کا پیغام ہدایت ہے۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا آپ کہئے میں اس (تبلیغ رسالت) پر تم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا اس سے مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو انبیاء سابقین (علیہم السلام) کی سیرت پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے اور تمام انبیاء (علیہم السلام) کی سیرت یہ تھی کہ وہ دین کو پہنچانے اور شریعت کی تبلیغ کرنے پر اجر اور معاوضہ کا مطالبہ نہیں کرتے تھے تو آپ نے بھی ان کے طریقہ کی پیروی کی اور فرمایا میں دین کے پہنچانے کے عوض تم سے کسی معاوضہ کا مطالبہ نہیں کرتا اور یہ قرآن تو تمام جہان والوں کے لیے نصیحت ہے 'یعنی تمام انسانوں کو اپنی دنیا اور آخرت کی صلاح اور فلاح کے لیے جن امور کی ضرورت ہوتی ہے 'وہ سب قرآن مجید میں موجود ہیں اور اس میں یہ دلیل ہے کہ ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام دنیا کے انسانوں کی طرف مبعوث ہیں 'نہ کہ کسی ایک قوم کی طرف۔

(تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

فرما دیجئے میں قرآن پر کوئی تم سے اجرت نہیں مانگتا

یعنی وحی بتانے۔ تبلیغ رسالت کرنے دعوت توحید دینے میں۔
علامہ نسفی (رح) فرماتے ہیں اس میں یہ دلیل ہے کہ تعلیم قرآن و حدیث پر اجرت جائز نہیں اور یہ صحیح ہے لیکن اگر تعلیم قرآن و حدیث بلا اجرت ہو۔ لیکن اوقات تعلیم۔ مقام تعلیم کی پابندی پر اجرت لینا اس کے عدم جواز پر کوئی دلیل نہیں اور اس کی ممانعت بھی کہیں نہیں اور ظاہر ہے کہ عدم جواز کو مستلزم نہیں چنانچہ علامہ آلوسی روح المعانی میں فرماتے ہیں۔
یعنی میں کم یا زیادہ اجرت نہیں مانگتا جیسے مجھ سے پہلے انبیاء اپنی امت سے اجرت تبلیغ نہیں مانگتے تھے۔ لیکن احسان کے بدلے احساناً اجرت لینا دینا یہ تو مکارم اخلاق اور محاسن افعال سے ہے اس بنا پر اس آیت کریمہ سے فقہاء نے استدلال کیا کہ تعلیم و تبلیغ پر اخذ اجرت جائز ہے۔ اس پر فقہاء نے مفصل مسائل لکھے ہیں۔
یعنی اے پیارے رسول ﷺ! آپ ﷺ فرما دیں کہ میں قرآن کی تبلیغ پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا یہ تو تمام جہانوں کے لئے نصیحت ہے۔ جب قرآن تمام جہانوں کے لئے نصیحت ہے تو معلوم ہوا کہ قرآن والے رسول حضور خاتم المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام جہانوں کے لیے رسول ہیں۔ اسی لئے فرمایا گیا: وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین (انبیاء: 107) اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں: ارسلت الی الخلق

کافتہ۔ مجھے تمام مخلوق خدا کی طرف رسول بنایا گیا ہے۔(ترمذی کتاب السیر باب 5)

(برہان القرآن القران۔علامہ قاری محمد طیب صاحب)

ان ھو الا ذکری للعلمین۔ وہ تو نہیں مگر نصیحت سارے جہان کو ہے۔اس پر علامہ صاوی فرماتے ہیں۔(ترجمہ)

اس آیت کریمہ میں آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت عامہ قیامت تک کے لیے ثابت ہوتی ہے اور اس سے علماء نے یہ دلیل بھی لی ہے کہ آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام انبیاء (علیہم السلام) سے افضل ہیں۔

خلاصہ بیان علامہ صاوی (رح) یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں اس امر کی وضاحت ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت عام رسالت ہے اور قیامت تک کے لیے ہے اور علماء رحمہم اللہ نے اس آیت کریمہ کو حجت مانا اس امر پر کہ حضور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے افضل ہیں۔ جتنے فضائل وخضائل فرداًفرداًاور نبیوں (علیہم السلام) میں تھے ان سب کے جامع ہمارے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔ (تفسیر الحسنات۔علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)

آپ تمام انسانیت کے لئے بلکہ تمام جہانوں کے لئے رسول ہیں تو قیامت تک پیدا ہونے والا ہر انسان آپ کا امتی اور آپ کا متبع ہے اور آپ کی رسالت کی موجودگی میں اسے کسی دوسرے نبی کی رسالت کی ضرورت نہیں ہے رہا قرب قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آنا تو وہ اپنی رسالت منوانے کے لیے نہیں آئیں گے وہ پیارے آقا تاجدار مدینہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت کے ڈنکے بجانے کے لیے آئیں گے۔

(برہان القرآن القران۔علامہ قاری محمد طیب صاحب)

آیت مبارکہ :

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَاۗءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَاۗؤُكُمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ○91

لغۃالقرآن: وَمَا : اور جو] [قَدَرُوا : قدر پہچانی ان سب نے] [اللّٰهَ : اللہ] [حَقَّ : "جو "حق ہے] [قَدْرِهٖٓ : اس کی قدر پہچانے کا] [اِذْ : جب] [قَالُوْا : ان سب نے کہا] [مَآ : نہیں] [اَنْزَلَ : اسنے نازل کی] [اللّٰهُ : اللہ] [عَلٰي : پر] [بَشَرٍ : کسی انسان] [مِّنْ : سے] [شَيْءٍ : کچھ] [قُلْ : آپ کہہ دیں] [نْ : جس پر] [اَنْزَلَ : اسنے نازل کی] [الْكِتٰبَ : کتاب] [الَّذِيْ : جو] [جَاۗءَ : آیا ہو] [بِهٖ : اس کو] [مُوْسٰي : موسیٰ] [نُوْرًا : نور] [وَ : اور] [هُدًى : ہدایت] [لِلنَّاسِ : لوگوں کے لیے] [تَجْعَلُوْنَهٗ : تم سب کردیتے ہو اسے] [قَرَاطِيْسَ : اوراق میں] [تُبْدُوْنَهَا : تم سب ظاہر کرتے ہو ان کو] [وَتُخْفُوْنَ : اور تم سب چھپاتے ہو] [ك يْرًا : کثرت سے] [وَعُلِّمْتُمْ : اور تم سب سکھائے گئے ہو] [مَالَمْ : جو نہیں] [تَعْلَمُوْٓا : تم سب جانتے تھے] [اَنْتُمْ : تم] [وَلَآ : اور نہ " ان لوگوں کی جو "] [اٰبَاۗؤُكُمْ : تمہارے ماں باپ] [قُلِ : کہ دو "کہ "] [اللّٰهُ : اللہ] [ثُمَّ : پھر] [ذَرْهُمْ : چھوڑو انہیں] [فِي : میں] [خَوْضِهِمْ : اپنی غلط باتوں] [يَلْعَبُوْنَ : وہ سب کھیلتے رہے]

ترجمہ : اور انھوں نے (یعنی یہود نے) اللہ کی وہ قدر نہ جانی جیسی قدر جاننا چاہیے تھی، جب انھوں نے یہ کہہ (کر رسالت محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا انکار کر) دیا کہ اللہ نے کسی آدمی پر کوئی چیز نہیں اتاری۔ آپ فرما دیجئے : وہ کتاب کس نے اتاری تھی جو موسیٰ (علیہ السلام) لے کر آئے تھے جو لوگوں کے لیے روشنی اور ہدایت تھی؟ تم نے جس کے الگ الگ کاغذ بنا لیے ہیں تم اسے (لوگوں پر) ظاہر (بھی) کرتے ہو اور (اس میں سے) بہت کچھ چھپاتے (بھی) ہو، اور تمہیں وہ (کچھ) سکھایا گیا ہے جو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا، آپ فرما دیجئے : (یہ سب) اللہ (ہی کا کرم ہے) پھر آپ انھیں (ان کے حال پر) چھوڑ دیں کہ وہ اپنی خرافات میں کھیلتے رہیں

تشریح:

اس آیت کے نازل ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہود کا ایک گروہ اپنے حبر (مذہبی پیشوا) مالک بن صیف کو لے کر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بحث کرنے کے لیے آیا۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مالک بن صیف سے فرمایا: میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی قسم دیتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ پر توراۃ نازل کی، کیا تم نے توراۃ میں یہ نہیں پڑھا کہ اللہ تعالیٰ موٹے حبر کو پسند نہیں کرتا؟ (جو حرام کھا کر موٹا ہو جاتا ہے) اس نے کہا ہاں یہ توراۃ میں ہے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تو بھی تو موٹا حبر ہے اور یہودیوں کے مال کھا کر موٹا ہو گیا ہے۔ اس پر وہ غضب ناک ہو کر کہنے لگا: خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا۔ حبر کے ساتھیوں نے جب یہ بات سنی تو وہ اسے ملامت کرتے ہوئے کہنے لگے: کیا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر اللہ تعالیٰ نے توراۃ نازل نہیں کی؟ تو نے یہ کیوں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا۔ مالک نے کہا: دراصل محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے غضب ناک کر دیا تھا تو میں نے یہ کہہ دیا۔ یہود نے اسے کہا: تو نے غضب میں آ کر اللہ تعالیٰ کے بارے میں غلط بات کہہ دی اور اللہ تعالیٰ کی ناقدری کر دی، لہٰذا تو اس قابل نہیں کہ تجھے حبر کے عہدے پر برقرار رکھا جائے، چنانچہ یہود نے اسے حبر کے عہدہ سے معزول کر دیا۔

(تفسیر خازن,) (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی المعانی)

قدر کا کیا معنی ہے؟ صاحب روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی المعانی لکھتے ہیں کہ قدر کا اصل معنی تو کسی چیز کی مقدار کو جاننا ہے لیکن اب اس کا اطلاق کسی چیز کو اس کے تمام پہلوؤں سے پہچاننے پر ہوتا ہے۔ اب کثرت استعمال سے یہی اس کا معنی حقیقی ہو گیا ہے۔ **واصل القدر معرفة المقدار بالسبر ثم استعمل فی معرفة الشیء علی اتم الوجوه حتی صار حقیقة فیه**

(روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

اخفش کہتے ہیں کہ وہ لوگ جن کی زبان سے اگلا جملہ نکل رہا ہے انھوں نے گویا اللہ تعالیٰ کو صحیح طور پر پہچانا ہی نہیں۔ اس کی حکمت اور رحمت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا۔

یہ کہنے والے کون تھے؟ بعض نے کہا ہے کہ مشرکین مکہ نے یہ بات کہی تھی۔ کیونکہ وہ سرے سے ہندوستان کے برہمنوں کی طرح وحی اور نبوت کے ہی قائل نہ تھے۔ لیکن اس پر یہ شبہ وارد ہوتا ہے کہ ان کے نظریہ کی تردید حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر نزول توراۃ سے درست نہیں۔ کیونکہ وہ تو موسیٰ (علیہ السلام) کی نبوت کے بھی قائل نہ تھے۔ اور جمہور کا یہ خیال ہے کہ یہ بات یہود نے کہی تھی۔ لیکن اس پر شبہ یہ

وار ہوتا ہے کہ یہود یہ کیوں کر کہہ سکتے تھے کہ کوئی انسان نبی نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ وہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور صدہا دوسرے انبیاء کی نبوت کو تسلیم کرتے تھے۔ نیز یہ سورۃ مکی ہے اور مکہ میں یہود موجود ہی نہ تھے۔ تو ان سے یہ مکالمہ کیسے ہوا۔ اس لیے اس آیت کی وضاحت ضروری ہے۔ حقیقت یوں معلوم ہوتی ہے کہ جب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نبوت اور نزول وحی کا دعویٰ کیا تو اہل مکہ کے لیے یہ بالکل انوکھی چیز تھی۔ وہ اس بات کے قائل ہی نہ تھے کہ کوئی نبی بھی خدا کی طرف سے مبعوث ہوتا ہے اور اس پر خدا کی طرف سے وحی بھی آتی ہے۔ پہلے پہل تو انھوں نے صاف انکار ہی کر دیا۔ لیکن جب آیات قرآنی کا جمال ان کے دلوں کو لبھانے لگا اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی روح پرور سیرت انہیں اپنی طرف مائل کرنے لگی تو وہ اب مسئلہ کو سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ اور اس مشکل کو حل کرنے کے لیے انھوں نے یہود یثرب کی طرف رجوع کیا۔ ان کوتاہ اندیشوں کو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت میں اپنی محرومی اور ذلت نظر آ رہی تھی۔ انھیں اپنے ہاتھوں اپنا تاج اتار کر دوسرے کے سر پر رکھنا کب گوارا تھا۔ چنانچہ انھوں نے از راہ عناد و حسد اپنے مسلمات اور نظریات کے خلاف انھیں کہلا بھیجا کہ اے اہل حرم! تم اس شخص کو ہرگز نبی نہ ماننا۔ ہم اپنے علم کی بنا پر تمہیں بتاتے ہیں کہ خدا نے آج تک کسی انسان پر وحی نہیں بھیجی تو یہ انسان ہو کر کیسے اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ نبی ہیں اور وحی سے مشرف ہیں۔ ان یہود کے رد میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تمہارا یہ قول درست ہے تو پھر موسیٰ (علیہ السلام) بھی تو انسان تھے ان پر وحی کیسے نازل ہوئی۔ اور تورات کون لایا؟ جب موسیٰ (علیہ السلام) پر توراۃ نازل ہوئی حالانکہ وہ انسان تھے تو حضور پر نور محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر قرآن کے نازل ہونے کیا شک ہے۔ یہود کے اس قول کی تکذیب کرنے کے بعد ان کی مزید مذمت کی جا رہی ہے کہ تم وہ ناشکرے اور احسان فراموش ہو کہ توراۃ جیسی سراپا نور و ہدایت کتاب کو تم نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ جس حصہ کو اپنی خواہشات اور اغراض کے مطابق پایا اسے اپنا لیا اور جس حصہ کو اپنے دنیاوی مقاصد سے متصادم محسوس کیا اسے چھپا دیا۔ کیا وحی الٰہی کے امینوں اور رسالت موسوی کے وارثوں کو یہ بات زیب دیتی ہے؟

اے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ان سے زیادہ بحث مباحثہ کی ضرورت نہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نازل فرمائی ہے۔ تمہارے انکار سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ کہہ کر انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیجئے اللہ تعالیٰ ان کو کیفر کردار تک پہنچائے گا۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

توراۃ صرف مذہبی رہنماؤں کے پاس ہوتی تھی اور انھوں نے توراۃ کی آیات کو الگ الگ کاغذات پر لکھا ہوا تھا۔ قرآن مجید کی طرح نہ تو توراۃ عوام کی زبانی یاد تھی اور نہ اس کے نسخے عوام کے پاس ہوتے تھے، اس لیے جب کبھی عوام کو کسی مسئلہ کی ضرورت پڑتی اور وہ مذہبی رہنماؤں کے پاس جاتے تو وہ اپنی مرضی کے جوابات والے کاغذات انھیں دکھاتے اور جو آیات ان کی مرضی کے خلاف ہوتیں وہ کاغذات توراۃ کے فولڈر سے نکال کر کہیں علیحدہ رکھ دیتے۔ اس طرح وہ توراۃ کی اکثر آیات مثلاً رجم کی سزا اور حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق بشارات کو عوام سے چھپا لیتے تھے، مگر قرآن مجید کی حفاظت کی کیا شان ہے۔ یہ صرف علماء ہی نہیں بلکہ عوام کے گھروں اور سینوں میں بھی محفوظ ہے، لہٰذا کوئی عالم کسی آیت کی غلط تاویل تو کر سکتا ہے مگر اس کی آیات کو چھپا نہیں سکتا۔

ذاتی خواہشات کے لیے مذہبی احکام کو چھپانے اور ان کی غلط تاویل کرنے والے دین فروشی صرف اہل کتاب میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں اور ان کے لیے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سخت عذاب کی خبر دی ہے، جیسا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم) نے فرمایا: "جس سے کوئی علمی سوال پوچھا گیا اور اس نے اس علم کو چھپایا تو قیامت کے دن اسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔"

(ترمذی: ابواب العلم: باب 3)

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذریعہ یہود کو گزشتہ انبیائے کرام (علیہم السلام) اور بنی اسرائیل کے بارے میں بہت سی ایسی معلومات بھی ملیں جن کو نہ وہ خود جانتے تھے اور نہ ہی ان کے باپ دادا، نیز اس آیت میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پہلے خبر پر سوال کیا کہ حضرت موسیٰ پر کتاب کس نے نازل کی اور آخر میں خود ہی جواب دیا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر توراۃ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی۔ اسی طرح حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر قرآن مجید بھی اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ ان واضح دلائل کے بعد بھی اگر وہ انکار کرتے ہیں تو آپ غم نہ کریں اور انھیں ان فضول بحثوں میں سرگرداں رہنے دیں۔

(امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

عظمت قرآن اور جھوٹے دعویدارانِ وحی کی برائی

کفار مکہ کسی آسمانی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے تھے وہ کہتے تھے اللہ تعالیٰ نے کسی انسان پر کوئی کتاب نہیں اتاری۔ (آج بھی لامذہب قومیں یہی کہتی ہیں) اور چونکہ قرآن مجید میں یہود کی برائیاں بکثرت بیان کی گئی ہیں تو کیا یہود نے بھی بعض مواقع پر محل قرآن سے ضد کی بنیاد پر کہا کہ اللہ نے کسی انسان پر کوئی کتاب نہیں اتاری۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں یہ آیت اتاری اور فرمایا یہ کہنا کہ اللہ نے کوئی کتاب نہیں اتاری اللہ کی سخت بے قدری و ناشکری کرنا ہے۔ اگر یہ بات ہے تو بتاؤ موسیٰ (علیہ السلام) پر سراپا نور و ہدایت کتاب توراۃ کس نے اتاری تھی؟ تو جو رب توراۃ اتار سکتا ہے کیا وہ قرآن نہیں اتار سکتا؟ گویا یہود ایسی ضدی قوم ہے کہ اگر انھیں قرآن کی مخالفت میں اپنی کتاب سے بھی انکار کرنا پڑے تو کر دیتے ہیں۔

یعنی اے یہود تم نے اپنی کتاب کے ٹکڑے کر دیے ان میں سے کچھ کو ظاہر کرتے ہو اور اکثر کو چھپاتے ہو چنانچہ انھوں نے حضور کی بشارت پر مشتمل آیات توراۃ سے نکال دی ہیں بلکہ اپنی مرضی کے خلاف ہر چیز نکال دی ہے۔

۔ یعنی اے یہود! تمہیں توراۃ کے ذریعے وہ کچھ بتایا گیا جو تم اور تمہارے باپ دادا نہ جانتے تھے اور توراۃ میں سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آمد پر بھی پر روشنی ڈالی گئی تھی مگر ان بد بختوں نے اپنی کتاب کے ٹکڑے کر ڈالے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے رسول! آپ انھیں ان کی بیہودگی میں کھیلنے دیں ان کے ایمان نہ لانے پر غمزدہ اور پریشان نہ ہوں۔

(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

مناسبت اور شان نزول

قرآن مجید کا موضوع توحید، رسالت اور آخرت کو ثابت کرنا ہے۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے بیان کردہ دلائل توحید کو نقل فرمایا پھر ان کو مزید مستحکم فرمایا اور اب اللہ تعالیٰ نے رسالت کے اثبات کے لیے دلائل کو ذکر فرمایا۔
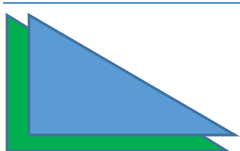
اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے متعلق نازل ہوئی ہے یا مشرکین کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ یہودیوں کے متعلق نازل ہونے پر یہ قرینہ ہے کہ نبوت اور رسالت کے یہود معتقد تھے' اس لیے اس آیت میں جو معارضہ ذکر کیا گیا ہے کہ اگر کسی بشر پر کوئی چیز نازل نہیں ہوتی تو بتاؤ: موسیٰ پر توراۃ کیسے نازل ہوئی؟ یہ معارضہ صرف یہود پر ہی حجت ہو سکتا ہے' مشرکین تو نبوت اور رسالت کے معتقد نہیں تھے۔ تاہم اس کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ بعض مشرکین اہل کتاب سے سن کر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی رسالت کے معتقد تھے' وہ صرف سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت ماننے سے انکار کرتے تھے اور مشرکین کے متعلق اس آیت کے نزول پر یہ قرینہ ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور پوری سورت یکبارگی نازل ہوئی ہے اور یہود سے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مناظرے مدینہ منورہ میں ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ آیت مشرکین ہی سے متعلق ہے' لیکن اس اعتراض کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ ایک آیت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی تھی اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس آیت کو اس سورت میں رکھوا دیا اور روایات دونوں کے متعلق ہیں۔

امام ابن جریر متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

سعید بن جبیر بیان کرتے ہیں کہ مالک بن صیف نام کا ایک یہودی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ بحث کر رہا تھا۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں تمہیں اس ذات کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ (علیہ السلام) پر توراۃ کو نازل کیا ہے۔ کیا تم نے توراۃ میں یہ نہیں پڑھا کہ اللہ تعالیٰ موٹے عالم کو ناپسند کرتا ہے اور وہ موٹا عالم تھا' وہ غضب ناک ہو گیا' اس نے کہا بخدا اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں کی۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (جامع البیان' جز ۷ ص ۳۴۷' مطبوعہ دارالفکر' بیروت ۱۴۱۵ھ)

اور مشرکین کے متعلق یہ روایت ہے:

مجاہد بیان کرتے ہیں کہ مشرکین قریش نے یہ کہا تھا کہ اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نازل نہیں کی تو اللہ نے اس کے رد میں یہ آیت نازل کی۔ (جامع البیان' جز ۷ ص ۳۴۹' مطبوعہ دارالفکر' بیروت ۱۴۱۵ھ)

اس آیت کا آخری حصہ جس میں یہ مذکور ہے تم نے اس کے الگ کاغذ بنا لیے' تم ان کو ظاہر کرتے ہو اور ان میں سے اکثر حصہ کو چھپا لیتے ہو یہ اس روایت کو مسترد کرتا ہے کیونکہ توراۃ میں تحریف کرنا بہر حال یہودیوں کا کام تھا۔ مشرکین کا کام نہیں تھا' اس لیے صحیح یہی ہے کہ یہ آیت یہود کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

توراۃ میں تحریف کے متعلق امام رازی کا موقف اور بحث و نظر

امام فخر الدین محمد بن تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ الدین عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

اس آیت میں توراۃ کو نور اور ہدایت فرمایا ہے اور یہاں نور سے مراد نور معنوی ہے اور ہدایت بھی نور معنوی ہے اور ان میں فرق یہ ہے کہ پہلی جگہ نور سے مراد اس کا فی نفسہ ظاہر ہونا ہے اور دوسری جگہ اس سے مراد دوسروں کے لیے مظہر ہونا ہے۔

اس کے بعد فرمایا تم نے اس کے الگ الگ کاغذ بنا لیے' تم ان کو ظاہر کرتے ہو اور ان میں سے اکثر حصہ کو چھپا لیتے ہو۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ ہر کتاب کو کاغذوں میں محفوظ کیا جاتا ہے تو اگر یہود نے تورات کو غذوں میں محفوظ کر لیا تھا تو ان کی مذمت کس وجہ سے کی جارہی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی مذمت کاغذوں میں محفوظ کرنے کی وجہ سے نہیں ہے 'بلکہ اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے کتاب کے دو حصے کر دیئے تھے۔ ایک حصہ لوگوں پر ظاہر کرتے تھے اور اس کا اکثر حصہ چھپا لیتے تھے۔

اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یہود تورات کو چھپانے پر کیونکر قادر تھے؟ جبکہ وہ مشرق اور مغرب میں پھیل چکی تھی اور بہت سے لوگوں نے اس کو حفظ کر لیا تھا اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اگر اب کوئی شخص قرآن مجید سے کچھ آیتوں کو چھپانا چاہے تو اس پر قادر نہیں ہو سکے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تورات میں تحریف کرنے سے مراد یہ ہے کہ انھوں نے تورات کی آیات کی من گھڑت اور باطل تفسیر کی تھی اور اگر یہ کہ جائے کہ سید نا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق تو تورات میں بہت کم آیات تھیں 'اگر آیات کو چھپانے سے مراد ان کا صحیح محمل چھپانا اور ان باطل تاویل کرنا ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ کیسے فرمایا ہے کہ تم اس میں سے اکثر حصہ کو چھپا لیتے ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہود بعض احکام کی آیات میں بھی باطل تاویل کرتے تھے۔ مثلا رجم کی آیت کی باطل تاویل کرتے تھے۔

(تفسیر کبیر 'ج ۵ 'ص ٦٣ 'مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت '١٤١٥ھ 'ج ١٣ 'ص ٧٩ 'مطبوعہ مصر)

یہ امام رازی کی تقریر ہے لیکن اس پر بھی یہ اعتراض ہوتا ہے کہ سید نا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق اور رجم کے متعلق مل کر بھی آیات بہت قلیل ہیں 'جبکہ قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ تم اس کا اکثر حصہ چھپا لیتے ہو۔ اس لیے صحیح یہی ہے کہ یہودی تورات میں لفظی تحریف بھی کرتے تھے اور معنوی تحریف بھی کرتے تھے اور امام رازی کا اس کو قرآن مجید پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے 'کیونکہ کسی دور میں بھی تورات کی اشاعت قرآن مجید کی طرح نہیں ہوئی اور نہ اس کے قرآن مجید کی طرح حافظ ہیں۔ اسی لیے قرآن مجید سے کسی آیت کا چھپا لینا ممکن نہیں ہے اور تورات سے کچھ چھپا لینا کچھ دشوار نہ تھا 'خصوصا جس زمانہ میں قرآن کریم نازل ہوا یا اس سے پہلے کیونکہ اس وقت نشر و اشاعت کے اتنے ذرائع اور وسائل نہ تھے اور یہودیوں کی تعداد اس وقت بھی دنیا میں بہت کم تھی اور وہ شرق و غرب میں پھیلے ہوئے نہ تھے 'اس لیے قرآن مجید کے الفاظ کو بلاوجہ ان کے ظاہری اور حقیقی معنی سے ہٹانا اور آیات کے چھپانے کو باطل تاویل پر محمول کرنا ہماری رائے میں درست نہیں ہے۔ "واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب"۔

آیت مذکورہ کا منسوخ نہ ہونا

اس کے بعد فرمایا آپ کہئے "اللہ "اس کا معنی یہ ہے کہ عقل سلیم یہ شہادت دیتی ہے کہ جو کتاب ہدایت اور نور ہے 'اور جس کی تائید میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) ایسے قوی معجزات لے کر آئے ہوں 'اس کو نازل کرنے والا اللہ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ اور یہ اس طرح ہے جیسے کوئی شخص وجود باری پر استدلال کرتے ہوئے کہے وہ کون ہے جو مردہ میں جان ڈالتا ہے؟ وہ کون ہے جو لاعلمی کے بعد علم پیدا کرتا ہے؟ وہ کون ہے جس نے آنکھ کے ڈھیلے میں بینائی رکھی؟ وہ کون ہے جس نے کان کے سوراخ میں سماعت رکھی؟ پھر وہ کہنے والا خود کہے: اللہ اور اس سے متصور یہ ہے کہ جب کلام یہاں تک پہنچے گا تو ہر صاحب عقل اعتراف کرے گا کہ اس فعل کا فاعل اللہ ہی ہے 'اور اخیر میں فرمایا پھر ان کو

ان کی کج بحثی میں کھیلنے کے لیے چھوڑ دیں اس کا معنی یہ ہے کہ جب آپ نے ان کے خلاف حجت پوری کر دی اور ان کے تمام شکوک و شبہات کو زائل کر دیا اور ان کو عذاب خداوندی سے ڈرا چکے تو آپ اپنی ذمہ داری پوری کر چکے ' اس کی نظیر یہ آیت ہے:

(آیت) "فان اعرضوا فما ارسلنك عليهم حفيظا ان عليك الا البلاغ"۔ (الشوری: ۴۸)

ترجمہ: پس اگر وہ اعراض کریں تو ہم نے آپ کو ان کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا ' آپ کا کام تو صرف پہنچا دینا ہے۔

بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت آیت قتال سے منسوخ ہے۔ یہ قول بعید ہے ' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پھر ان کو ان کی کج بحثی کے لیے چھوڑ دیں یہ ارشاد بطور تہدید ہے اور یہ حصول قتال کے منافی نہیں ہے ' لہٰذا اس آیت کو منسوخ قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ کی قدر ناشناسی

اس آیت کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اور انھوں نے اللہ کی اس طرح قدر نہ کی جس طرح قدر کرنے کا حق تھا ' جب انھوں نے کہا اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا۔ امام رازی نے فرمایا اس کا معنی یہ ہے کہ یہود نے نبوت اور رسالت کا انکار کیا اور جس نے نبوت اور رسالت کا انکار کیا ' اس نے رسولوں کے بھیجنے میں اللہ تعالیٰ کی حکمت پر طعن کیا اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفت سے جہالت ہے اور یہی معنی ہے اللہ تعالیٰ کی قدر نہ کرنے کا۔

اخفش نے کہا اس آیت کا معنی ہے انھوں نے اللہ کی کما حقہ معرفت حاصل نہیں کی اور حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا اس کا معنی یہ ہے انھوں نے اللہ تعالیٰ کی کما حقہ تعظیم نہیں کی۔ ہمارا یہ دور اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ناقدری اور ان کی تعظیم نہ کرنے کا دور ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض واعظین اولیاء اللہ کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بڑھا دیتے ہیں ' وہ کہتے ہیں کہ خضر ولی تھے اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نبی تھے۔ اور حصول علم کے لیے نبی کو بھی ولی کے پاس جانا پڑتا ہے ' حالانکہ تحقیق یہ ہے کہ حضرت خضر (علیہ السلام) نبی تھے ' جیسا کہ ہم نے شرح صحیح مسلم جلد سادس میں بیان کیا ہے۔ نیز کہتے ہیں کہ حضرت زکریا کو جب بیٹے کی طلب ہوئی تو وہ ایک ولیہ حضرت مریم کے پاس گئے ' اور وہاں دعا کی تو ان کی دعا قبول ہوئی ' حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت زکریا جب اس طرف متوجہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مریم کو بے موسمی پھل دے رہا ہے تو ان کا ذہن اس طرف متوجہ ہوا جو بے موسمی پھل دے سکتا ہے ' وہ مجھے بڑھاپے میں اولاد بھی دینے پر قادر ہے۔ اور پھر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے بیٹے کے لیے دعا کی ' اس طرح اولیاء اللہ کی شان میں یہ حدیث بیان کرتے ہیں:

حضرت معاذ بن جبل (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ عزوجل فرماتا ہے جو لوگ میری ذات سے محبت رکھتے ہیں ' ان کے لیے نور کے منبر ہوں گے اور ان پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کریں گے۔ (سنن ترمذی ' ج ۴ ' رقم الحدیث: ' ۲۳۹۷ ' مسند احمد ' ج ۸ ' رقم الحدیث: ' ۲۲۱۴۱ ' صحیح ابن حبان ' ج ۱ ' رقم الحدیث: ' ۵۷۷ ' المعجم الکبیر ج ۲۰ ' رقم الحدیث: ' ۱۴۴ ' حلیۃ الاولیاء ' ج ۲ ' ص ۱۳۱)

حالانکہ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ انبیاء اور شہداء بھی ان کی تحسین کریں گے ' یہ اس بات کی چند مثالیں ہیں کہ آج کل کے واعظین اولیاء اللہ کو نبی اور رسول سے بڑھا دیتے ہیں اب چند مثالیں اس امر کی بیان کرتے ہیں کہ یہ لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اللہ سے بڑھا دیتے ہیں۔

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ ھ لکھتے ہیں

امام دار قطنی اور امام ابن شاھین نے اپنی اپنی سندوں سے روایت کیا ہے کہ جنگ احد میں حضرت قتادہ بن نعمان (رض) کی آنکھ نکل کر رخسار پر گر گئی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس آنکھ کو لوٹا دیا اور وہ دونوں آنکھوں میں زیادہ تندرست اور صحیح آنکھ تھی۔ (الاصابہ ' ج ۳ 'ص ۲۲۵ 'مطوعہ دارالفکر 'بیروت '۱۳۹۸ھ)

اس دور کے واعظین اس حدیث میں یہ نکتہ آفرینی کرتے ہیں کہ خدا کی دی ہوئی آنکھ میں وہ روشنی نہیں تھی جو مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دی ہوئی آنکھ میں تھی (العیاذ باللہ) حالانکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعریف کرنے کے لیے یوں کہا جاسکتا ہے کہ آنکھیں تو دونوں ہی خدا کی دی ہوئی تھیں 'لیکن پہلی آنکھ ماں باپ کے واسطے سے ملی تھی اور دوسری آنکھ سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہاتھوں سے ملی تھی۔ اسی طرح بعض کلمہ طیبہ میں اللہ کا نام پہلے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام بعد میں لینے کی یہ توجیہ بیان کرتے ہیں کہ پہلے اللہ کا نام لینے سے زبان پاک ہو جائے گی 'پھر اس زبان سے نام محمد لیا جائے۔ حالانکہ اہل علم پر مخفی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کلام پاک قرآن مجید کو کسی ناپاک مرد یا عورت (خواہ جنبی ہو 'محتلم ہو یا حائض و نفساء ہو) کا زبان سے پڑھنا ناجائز اور حرام ہے۔ اسی طرح جنبی اور بے وضو کا قرآن مجید کو چھونا بھی حرام ہے اور ادب واحترام کی وجہ سے احادیث کو ان حالتوں میں نہ پڑھنا اور نہ چھونا ایک الگ بات ہے 'لیکن اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے اس کی ممانعت نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زیادہ ادب اور احترام اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کے نام کا ہے 'اور کلمہ طیبہ میں اللہ کے نام کو پہلے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ تقدم کی جتنی بھی وجوہ یہاں ہو سکتی ہیں 'تقدم بالذات ہو 'تقدم بالشرف ہو یا تقدم بالذکر ہو 'ہر وجہ سے اللہ تعالیٰ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر مقدم ہے۔

اسی طرح ایک شعر ہے :

خدا جس کو پکڑے چھڑائے محمد
محمد کا پکڑا چھڑا کوئی نہیں سکتا

اول تو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں اختیارات کا تقابل کرنا ہی غلط اور باطل ہے۔ پھر یہ کہنا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طاقت اور اقتدار اور آپ کا اختیار اللہ کے اختیار اور اقتدار سے زیادہ ہے۔ (معاذ اللہ) خالص کفر اور زندیقی ہے۔ (آیت) " وماقدروااللہ حق قدرہ "ان لوگوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اللہ تعالیٰ سے بڑھا کر نہ اسلام کی کوئی خدمت کی ہے 'نہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خوش اور راضی کیا ہے اور دلائل کے اعتبار سے بھی یہ مردود ہے۔ اللہ تعالیٰ ابوطالب 'ابولہب اور دیگر کفار اور مشرکین کو دائمی عذاب میں مبتلا کرے گا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کی شفاعت نہیں فرمائیں گے اور ان کو دائمی عذاب

سے نہیں چھڑائیں گے اور حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم کو دیکھ کر ایک مرتبہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تیوری چڑھائی اور پیٹھ پھیر لی تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ عبس نازل فرمائی اور آپ کو ان کی طرف توجہ نہ کرنے سے منع کیا اور ارشاد فرمایا :

(آیت) "واما من جاءک یسعی، وھو یخشی، فانت عنہ تلھی"۔ (عبس : ۱۰۔ ۸)

ترجمہ : اور جو دوڑتا ہوا آپ کے پاس آیا 'اور وہ اپنے رب سے ڈر رہا ہے 'تو آپ اس سے بے توجہی کرتے ہیں :

یاد رکھئے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایسی تعریف کبھی خوش نہیں ہوں گے بلکہ اس کے برعکس ناراض اور رنجیدہ ہوں گے 'جس تعریف میں آپ کا مرتبہ اللہ تعالیٰ سے بڑھانے کا وہم ڈالا جائے گا یا اس کا تصور دیا جائے۔

امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ ھ روایت کرتے ہیں :

جبیر بن محمد اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک اعرابی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ! لوگ مشقت میں پڑ گئے اور بچے ضائع ہو گئے اور مال لوٹ لیے گئے اور مویشی ہلاک ہو گئے 'آپ ہمارے لیے بارش کی دعا کیجئے۔ ہم آپ کو اللہ کی بارگاہ میں شفیع بناتے ہیں اور اللہ کو آپ کے حضور شفیع لاتے ہیں 'رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا افسوس ہے ! تم کو پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو ؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بار بار سبحان اللہ 'سبحان اللہ فرماتے رہے 'حتی کہ آپ کے اصحاب کے چہروں پر خوف کے آثار ظاہر ہوئے 'آپ ﷺ نے پھر فرمایا تم پر افسوس ہے اللہ کو اس کی مخلوق میں سے کسی کے پاس شفیع اور سفارشی نہیں بنایا جاتا 'اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بہت بلند ہے۔ تم پر افسوس ہے کیا تم کو پتا ہے اللہ کی کیا شان ہے ؟ اس کا عرش تمام آسمانوں پر اس طرح محیط ہے 'آپ نے اپنی انگلیوں سے گنبد بنا کر دکھایا اور وہ اس طرح چرچرا رہا ہے جس طرح سواری کے بوجھ سے پالان چرچراتا ہے۔

(سنن ابو داؤد 'ج ۴ 'رقم الحدیث : ۴۷۲۶ 'مطبوعہ دار الفکر 'بیروت '۱۴۱۴ ھ)

حافظ زکی الدین ابو محمد المنذری المتوفی ۶۵۶ ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں :

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلالت بیان کرنے کے لیے یہ مثال ذکر فرمائی ہے 'تاکہ سننے والے کو اللہ تعالیٰ کی بلند شان 'جلالت قدر اور عظیم ذکر کا اندازہ ہو اور کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو کسی مخلوق کے پاس سفارشی نہ بنائے 'ورنہ اللہ تعالیٰ کسی چیز سے مشابہ نہیں ہے 'اور نہ وہ کسی صورت سے مکیف ہے۔ (مختصر سنن ابو داؤد 'ج ۷ ص ۹۶ 'مطبوعہ دار المعرفہ 'بیروت)

ایک اعرابی نے اللہ تعالیٰ کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس سفارشی بنایا تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بہت رنجید ہوئے ' بار بار افسوس کیا : اور سبحان اللہ 'سبحان اللہ پڑھا۔ آپ سوچئے کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اللہ تعالیٰ سے بڑھانے کی نکتہ آفرینی کی گئی تو اس سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کتنا افسوس ہو گا ؟

اس سے بھی بڑا ظلم یہ ہے کہ آج کل کے واعظین یہ حکایت بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت جنید بغدادی دجلہ پر آئے اور یا اللہ کہتے ہوئے اس پر زمین کی طرح چلنے لگے 'بعد میں ایک شخص آیا۔ اس کو بھی دریا کے پار جانا تھا اور کشتی کوئی نہ تھی 'اس نے حضرت کو جاتے ہوئے دیکھا تو پوچھا میں کس طرح آؤں ؟ آپ نے فرمایا یا جنید یا جنید کہتا چلا آ۔ اس نے یہی کہا اور دریا پر زمین کی طرح چلنے لگا۔ جب بیچ دریا میں پہنچا تو شیطان نے دل میں وسوسہ ڈالا کہ حضرت خود تو یا اللہ کہیں اور مجھ سے یا جنید کہلواتے ہیں۔ میں بھی یا اللہ کیوں نہ کہوں ؟ اس نے

یا اللہ کہا اور ساتھ ہی غوطہ کھایا ' پکارا حضرت میں چلا ' فرمایا وہی کہہ کہ یا جنید یا جنید ' جب کہا دریا سے پار ہوا۔ بعد میں حضرت سے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا ارے نادان ! ابھی تو جنید تک پہنچا نہیں اللہ تک رسائی کی ہوس ہے۔

اس حکایت کو پڑھ کر بے اختیار زبان پر یہ آیت آتی ہے۔ (آیت) "وما قدروا اللہ حق قدرہ "انھوں نے اللہ کی کما حقہ قدر اور تعظیم نہیں کی اس حکایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا جنید کہنے سے بندہ پار لگتا ہے اور یا اللہ کہنے سے ڈوب جاتا ہے اور اس میں مخلوق کے ذکر کو اللہ کے ذکر سے بڑا درجہ دینا ہے اور اس حکایت میں اللہ کے ذکر کے ارادہ کو شیطان کا وسوسہ قرار دیا ہے اور یہ بہت بڑا ظلم ہے اور اس میں حضرت جنید پر بہتان ہے ' اللہ کے نیک اور صالح بندے اپنے متوسلین کو اللہ کے ذکر کی تلقین کرتے ہیں ' نہ کہ اپنے ذکر کی۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ سے اس حکایت کے متعلق سوال کیا گیا ' تو انھوں نے اس کا رد فرمایا۔

مسئلہ : از شفاخانہ فرید پور ڈاک خانہ خاص اسٹیشن پتمبر پور مسؤلہ عظیم اللہ کمپونڈر ' ۷ رمضان ۳۹ھ)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ جنید ایک بزرگ کامل تھے ' انھوں نے سفر کیا ' راستے میں ایک دریا پڑا ' اس کو پار کرتے وقت ایک آدمی نے کہ مجھ کو بھی دریا کے پار کر دیجئے۔ تب ان بزرگ کامل نے کہا تم میرے پیچھے یا جنید یا جنید کہتے چلے آؤ اور میں اللہ اللہ کہتا چلوں گا۔ درمیان میں وہ آدمی بھی اللہ اللہ کہنے لگا ' تب وہ ڈوبنے لگا ' اس وقت ان بزرگ نے کہا کہ تو اللہ مت کہو ' یا جنید یا جنید کہو ' تب اس آدمی نے یا جنید جنید کہا جب وہ نہیں ڈوبا ' یہ درست ہے یا نہیں اور بزرگ کامل کے لیے کیا حکم ہے اور آدمی کے لیے کیا حکم ہے ؟ بینوا توجروا "۔

الجواب : یہ غلط ہے کہ سفر میں دریا ملا بلکہ دجلہ ہی کے پار جانا تھا ' اور یہ بھی زیادہ ہے کہ میں اللہ اللہ کہتا چلوں گا اور یہ محض افتراء ہے کہ انھوں نے فرمایا تو اللہ اللہ مت کہہ یا جنید کہنا ' خصوصا حیات دنیاوی میں ' خصوصا جبکہ پیش نظر موجود ہیں ' اسے کون منع کر سکتا ہے کہ آدمی کا حکم پوچھا جائے اور حضرت سید الطائفہ جنید بغدادی (رح) کے لیے حکم پوچھنا کمال بے ادبی و گستاخی و دریدہ دہنی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(فتاوی رضویہ ' ج ۹ ' ص ۱۹۷ ' مطبوعہ مکتبہ رضویہ ' کراچی)

اعلیٰ حضرت نے اس حکایت کا جو رد کیا ہے ' اس سے معلوم ہوا کہ (الملفوظ ج ۱ ' ص ۱۱۷ ' مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ' اور ج ۱ ' ص ۱۲۷ ' مطبوعہ نوری کتب خانہ لاہور) میں اس حکایت کی نسبت جو اعلی حضرت کی طرف کی گئی ہے اور اس کو اعلیٰ حضرت کا ملفوظ قرار دیا گیا ہے ' وہ صحیح نہیں ہے۔ اعلی حضرت کے دل میں اللہ تعالیٰ کی جو عظمت اور جلالت ہے ' اس سے یہ بہت بعید ہے کہ وہ ایسی حکایت بیان کریں ' اس سلسلہ میں یقینا الملفوظ کے مرتب کو سہو ہوا ہے۔ اس پر دلیل فتاوی رضویہ کی مذکور الصدر عبارت ہے :

(آیت) "وما قدروا اللہ حق قدرہ"۔ (الانعام : ۹۱)

ترجمہ : اور انھوں نے اللہ کی قدر نہ کی جس طرح اس کی قدر کرنے کا حق تھا۔

اس آیت کی تفسیر میں ہم نے اپنے دور کے واعظین کی چند مثالیں بیان کی ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور معرفت سے بے بہرہ ہیں اور وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اولیاء کرام کی شان میں غلو کرنے کے لیے ان کی قدر و منزلت کو اللہ تعالیٰ سے بڑھا دیتے ہیں اور ان کو بڑھانے کے لیے اللہ کی شان کو ان سے کم دکھاتے ہیں۔ معاذ اللہ۔ اس تحریر سے ہمارا مقصد صرف اصلاح ہے ' میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس تحریر کو نفع آور بنائے اور اس عاجز کو سلامتی کے ساتھ اسلام پر قائم رکھے اور عزت اور کرامت کے ساتھ ایمان پر خاتمہ

فرمائے اور اپنے فضل سے مغفرت فرمائے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت نصیب فرمائے۔ آمین یارب العلمین "۔
(تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ○92

لغۃ القرآن : وَهٰذَا : اور اس] [كِتٰبٌ : کتاب] [اَنْزَلْنٰهُ : نازل کیا ہے اس کو] [مُبٰرَكٌ : برکت کی گئی ہوئی] [مُّصَدِّقُ : تصدیق کرنے والی ہے] [الَّذِيْ : جو] [بَيْنَ يَدَيْهِ : اس سے آگے ہے] [وَلِتُنْذِرَ : اور تاکہ آپ ڈرائیں] [اُمَّ الْقُرٰي : ام القری " مکہ والوں " کو] [وَمَنْ : اور جو] [حَوْلَهَا : اس کے اردگرد ہیں] [وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ جو] [يُؤْمِنُوْنَ : وہ سب ایمان لاتے ہیں] [بِالْاٰخِرَةِ : آخرت کے بدلے] [يُؤْمِنُوْنَ : وہ سب ایمان لاتے ہیں] [بِهٖ : اس کو] [وَهُمْ : اور وہ] [عَلٰي : پر] [صَلَاتِهِمْ : اپنی نماز] [يُحَافِظُوْنَ : وہ سب پابندی کرتے ہیں]

ترجمہ : اور یہ (وہ) کتاب ہے جسے ہم نے نازل فرمایا ہے، بابرکت ہے، جو کتابیں اس سے پہلے تھیں ان کی (اصلًا) تصدیق کرنے والی ہے۔ اور (یہ) اس لیے (نازل کی گئی ہے) کہ آپ (اولًا) سب (انسانی) بستیوں کے مرکز (مکّہ) والوں کو اور (ثانیًا ساری دنیا میں) اس کے ارد گرد والوں کو ڈر سنائیں، اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اس پر وہی ایمان لاتے ہیں اور وہی لوگ اپنی نماز کی پوری حفاظت کرتے ہیں

تشریح :

اس کتاب کی متعدد صفات اور خصوصیات بیان ہو رہی ہیں جس کے بارے میں اہل مکہ اس کشمکش میں مبتلا تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے بھی یا نہیں۔ فرمایا یہ مبارک ہے یعنی برکت والی ہے۔ برکت کا معنی ہے الزیادۃ والنماء۔ کسی تھوڑی چیز کا زیادہ ہو جانا۔ کسی چھوٹی چیز کا بڑا

ہو جانا۔ امت اسلامیہ کی ساری تاریخ قرآن کی اس ایک صفت کی جلوہ گاہ ہے۔ عرب کے ان پڑھ ساربان وسیع ملکوں اور عظیم قوموں کی زمام اقتدار اپنے ہاتھ سے لیتے ہیں اور ساری دنیا عدل وانصاف اور پاکیزگی اور تقویٰ کے نور سے جگمگا اٹھتی ہے۔ وہ ایک ایک کوڑی کے لیے انسانی جان ضائع کرنے والا بھوکا بدو اتنا سیر چشم اور دل کا غنی ہو جاتا ہے کہ کسریٰ کے محلات کی ثروت اور بیش قیمت ساز وسامان اس کی حفاظت میں مدینہ طیبہ بھیجا جاتا ہے اور اس میں ایک سوئی کی خیانت بھی نہیں ہوتی۔ سنگ دل اعرابی اس کتاب کے اثر سے اتنا رحیم و کریم ہو جاتا ہے کہ وہ اس خیمہ کو اکھاڑنا بھی گوارا نہیں کرتا جس میں ایک فاختہ نے انڈے دے رکھے ہیں۔ اس کتاب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ سابقہ کتابوں اور انبیاء کی تصدیق کرتی ہے اور ان کتابوں کے ماننے والوں اور مخالفین کے ہاتھوں ان میں جو رد و بدل ہو گیا ہے اس کا پتہ بتاتی ہے۔ اور اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اہل مکہ اور اس کے شرق و غرب اور جنوب و شمال میں پھیلی ہوئی ساری انسانی دنیا کو خدا کے عذاب سے اور بدکاریوں کے طبعی نتائج سے ڈراتی ہے۔ اے مکہ کے دانشورو! تم خود سوچو جو کتاب ان خوبیوں کی حامل ہو۔ اور جس کے پیش نظر سارے عالم انسانیت کی اصلاح ہو اور جس کے اثر سے ان وحشیوں اور درندہ صفت بدوؤں سے ایک ایسی جماعت بھی تیار ہو چکی ہو جو اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی تعمیل میں سرگرم ہو کیا یہ کسی انسان کی بنائی ہوئی کتاب ہو سکتی ہے۔ یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو اس نے اپنی ساری مخلوق کی ہدایت کے لیے اپنے مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء پر نازل فرمائی ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

قرآن مجید کی خیر اور برکت

اس آیت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہود کے اس قول کو باطل فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی نازل نہیں کی اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے کتابیں نازل کی ہیں، تو پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل فرمایا ہے، ہم نے اس کتاب کو بہت خیر اور برکت والی بنایا ہے اور یہ سابقہ آسمانی کتابوں کی تائید، تصدیق اور حفاظت کرتی ہے۔

اس کتاب کی خیر و برکت یہ ہے

قرآن مجید کا سابقہ آسمانی کتابوں کا مصدق ہونا

اس آیت میں فرمایا ہے کہ یہ کتاب سابقہ آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ اس تصدیق کی تفصیل یہ ہے کہ آسمانی کتابوں میں دو چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ اصول اور فروع، اصول سے مراد ہیں عقائد، مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، توحید، رسالت، ملائکہ، تقدیر، قیامت، مرنے کے بعد اٹھنا، جزاء و سزا، جنت اور دوزخ وغیرہ۔ اور ظاہر ہے کہ زمان و مکان کی تبدیلی اور انبیاء کے فرق سے ان عقائد میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ توراۃ، زبور اور انجیل میں جو عقائد تھے، وہی عقائد قرآن مجید میں ہیں، اس لحاظ سے قرآن مجید ان سابقہ کتابوں کا مصدق ہے

اور فروع سے مراد ہیں احکام شریعت اور ہر زمانہ کے مخصوص حالات، رسم و رواج اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے اس زمانہ کے نبی کی شریعت دوسرے انبیاء سے مختلف ہوتی ہے اور یوں تمام انبیاء کے احکام شریعت ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن نفس عبادات اور اطاعت

رسول اور اتباع شریعت میں تمام آسمانی کتابیں متفق ہیں اور اس چیز میں قرآن ان کا مصدق ہے۔ نیز ان تمام سابقہ آسمانی کتابوں میں یہ لکھا ہوا تھا کہ آخری زمانہ میں نبی آخر سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مبعوث کیا جائے گا جو سابقہ شریعت کو منسوخ کردیں گے اور سب لوگوں کو صرف ان کی شریعت کی اتباع کرنی ہوگی اور جب ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مبعوث ہوگئے اور قرآن مجید کے ذریعہ آپ ﷺ کی شریعت نافذ ہوگئی تو سابقہ آسمانی کتابوں کی یہ بشارت پوری ہوگئی ' اس لحاظ سے قرآن مجید تمام سابقہ آسمانی کتابوں کا مصدق ہے۔

مکہ مکرمہ کا ام القری ہونا

اس آیت میں مکہ مکرمہ کو اللہ تعالیٰ نے ام القری فرمایا ہے ' ام القری کا لفظی معنی ہے شہروں کی ماں۔ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا مکہ مکرمہ کو ام القری اس لیے فرمایا ہے کہ تمام زمینیں اس کے نیچے سے نکال کر پھیلائی گئی ہیں اور ابوبکر اصم نے کہا ہے کہ مکہ تمام دنیا والوں سے پہلے آباد ہوا ہے ' تو گویا یہی اصل ہے اور باقی تمام شہر اور قصبات اس کے تابع ہیں۔ نیز تمام دنیا کے مسلمانوں کی ہر دور میں مرکزی عبادت حج ہے اور حج مکہ مکرمہ میں ہوتا ہے اور اس وجہ سے تمام مخلوق مکہ مکرمہ میں جمع ہوتی ہے ' جیسے بچے ماں کے گرد جمع ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کو ام القری فرمایا ' نیز حج کی وجہ سے مکہ مکرمہ میں انواع واقسام کی تجارت ہوتی ہے اور اس شہر میں کسب معاش اور روزی حاصل کرنے کے ذرائع دوسرے شہروں کی بہ نسبت زیادہ ہیں ' اس لیے اس کو ام القری فرمایا اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ کی عبادت کا پہلا گھر مکہ مکرمہ میں بنایا گیا ' اس لیے اس کو ام القری فرمایا۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عمومی بعثت پر یہودیوں کے اعتراض کا جواب

اس آیت میں فرمایا ہے تاکہ آپ مکہ والوں اور اس کے گردونواح کے لوگوں کو ڈرائیں۔

یہود کی ایک جماعت کا یہ نظریہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صرف جزیرہ عرب کے رسول ہیں اور وہ اس آیت سے مسلمانوں پر الزام قائم کرتے ہیں کہ اس آیت میں فرمایا ہے ' تاکہ آپ ﷺ مکہ والوں اور اس کے گردونواح کے لوگوں کو عذاب سے ڈرائیں۔ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اس آیت میں مکہ اور اس کے ارد گرد کے لوگوں کو ڈرانے کا ذکر ہے اور باقی علاقہ کے لوگوں کو ڈرانے کی نفی نہیں ہے ' جبکہ دوسری آیات سے ثابت ہے کہ آپ تمام جہان والوں کے لیے (عذاب الہی سے) ڈرانے والے ہیں۔ چنانچہ فرمایا

(آیت) "تبرك الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعلمین نذیرا"۔ (الفرقان: ١)

ترجمہ: وہ بڑی برکت والا ہے جس نے اپنے (مقدس) بندے پر فیصلہ کرنے والی کتاب نازل کی ' تاکہ وہ تمام جہانوں کے لیے ڈرانے والے ہوں۔

(آیت) "قل یایها الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا"۔ (الاعراف: ١٥٨)

ترجمہ: آپ کہیے اے لوگو! بیشک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

(آیت) "وقل للذین اوتوا الکتب والامیین ءاسلمتم فان اسلموا فقد اهتدوا وان تولوا فانما علیك البلاغ"۔

(آل عمران : ۲۰)

ترجمہ : اور آپ اہل کتاب اور ان پڑھ لوگوں سے کہیئے : کیا تم اسلام لے آئے ؟ اگر انھوں نے اسلام قبول کر لیا تو انھوں نے ہدایت پالی اور اگر انھوں نے اعراض کیا تو آپ کا کام صرف حکم پہنچا دینا ہے۔

اس آیت میں یہ تصریح ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اہل کتاب اور غیر اہل کتاب دونوں کے لیے رسول ہیں اور اس سے پہلی آیات میں یہ تصریح ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام مخلوق کے لیے رسول ہیں۔ اسی طرح اس حدیث میں بھی یہ تصریح ہے۔

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مجھے پانچ ایسی چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں ' پہلے نبی بالخصوص ایک قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور مجھے بالعموم تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے اور میرے لیے غنیمتیں حلال کر دی گئیں اور وہ مجھ سے پہلے حرام تھیں اور میرے لیے تمام روئے زمین مسجد اور طہارت کا ذریعہ بنا دی گئی اور ایک ماہ کی مسافت سے دشمن پر میرا رعب طاری کر دیا جاتا ہے اور مجھے شفاعت دی گئی ہے۔

(سنن دارمی ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۱۳۸۹ ' صحیح البخاری ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۳۳۵ ' صحیح مسلم ' المساجد ' ۳ (۵۲۱) ۱۴۳ ' سنن الترمذی ' ۳ " رقم الحدیث : ۱۵۵۹ ' سنن النسائی ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۷۳۶ ۔ ۴۳۲)

آخرت پر ایمان نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانے کو مستلزم ہے

اس آیت میں فرمایا ہے جو لوگ آخرت پر ایمان لاتے ہیں وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لاتے ہیں ' اور اس آیت کا بظاہر یہ معنی ہے کہ آخرت پر ایمان لانا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانے کو مستلزم ہے۔ علماء نے اس کی کئی وجوہات بیان کی ہیں۔

ایک وجہ یہ ہے کہ جو شخص آخرت پر ایمان لائے گا وہ وعدہ وعید اور ثواب و عذاب پر بھی ایمان لائے گا اور ایسا شخص ثواب کے حصول کی کوشش کرے گا اور عذاب کے موجبات سے بچے گا ' اور وہ توحید اور رسالت کے دلائل میں غور و فکر کرے گا ' اور یہ اس کے اللہ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانے کا ذریعہ ہوگا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دین میں مرنے کے بعد اٹھنے اور قیامت قائم ہونے کے عقیدہ پر بہت زور دیا گیا ہے اور اتنا زور کسی اور نبی کے دین میں نہیں دیا گیا ' اس وجہ سے آخرت پر ایمان لانا سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانے کو مستلزم ہے۔

تمام عبادات میں نماز کی اہمیت

نیز اس آیت میں فرمایا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان لاتے ہیں وہ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس جگہ یہ سوال ہوتا ہے کہ آخرت پر ایمان لانے والے تمام نیک اعمال کی حفاظت کرتے ہیں اور تمام برے کاموں سے بچتے ہیں تو اس آیت میں نماز کا خصوصیت کے ساتھ کیوں ذکر فرمایا ہے ؟ اس کا جواب ہے کہ اس سے مقصود اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ ایمان لانے کے بعد سب سے افضل اور اشرف عبادت نماز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں نماز پر ایمان کا اطلاق فرمایا ہے :

(آیت) "وما کان اللہ لیضیع ایمانکم"۔ (البقرہ: ۱۴۳)

ترجمہ: اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ تمہارا ایمان (نماز) ضائع کردے۔

نیز احادیث میں عمداً نماز ترک کرنے پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے۔

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے عمداً نماز کر ترک کیا اس نے کھلم کھلا کفر کیا۔ اس کی روایت میں محمد بن ابی داؤد منفرد ہے ' باقی راوی ثقہ ہیں۔

(المعجم الاوسط 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ۳۳۷۳ 'مطبوعہ ریاض '۱۴۱۵ ھ)

حضرت مسور بن مخرمہ (رض) حضرت عمر (رض) کی عیادت کے لیے گئے اور ان کا حال پوچھا 'گھر والوں نے کہا جیسا تم دیکھ یا امیر المومنین! نماز 'حضرت عمر (رح) نے کہا اللہ! یہ نماز کا وقت ہے اور فرمایا اس شخص کا اسلام میں کوئی حصہ (ایک روایت میں ہے حق) نہیں جو نماز کو ترک کرے 'پھر انھوں نماز پڑھی اور ان کے زخم سے خون بہہ رہا تھا۔

(المعجم الاوسط 'ج ۹ 'رقم الحدیث: ۸۱۷۸ 'علل دار قطنی 'ج ۲ 'رقم الحدیث: ۲۲۷۔ حافظ ھیثمی نے کہا اس حدیث کے تمام راوی صحیح ہیں۔ مجمع الزوائد 'ج ۱ ص ۲۹۶)

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا انسان پر اور کفر و شرک کے درمیان نماز کو ترک کرنا ہے۔

(صحیح مسلم 'ایمان ۱۳۴ (۸۲) ۲۴۱ 'سنن ابوداؤد 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ۴۶۷۸ 'سنن ترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ۲۶۲۸ 'سنن النسائی ' ج ۱ 'رقم الحدیث: ۴۶۴ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۱ 'رقم الحدیث: ۱۰۷۸ 'مسند احمد 'ج ۳ 'ص ۲۸۹ 'طبع قدیم 'مسند احمد 'ج ۵ 'رقم الحدیث: ۱۴۹۸۳)

امام ابوعیسی محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت بریدہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہمارے درمیان اور ان کے درمیان عہد 'نماز ہے۔ سو جس نے نماز کو ترک کیا اس نے کفر کیا۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن 'صحیح غریب ہے۔ اور یہ حدیث حضرت انس (رض) اور حضرت ابن عباس (رض) سے بھی مروی ہے۔

(سنن ترمذی ج ۴ 'رقم الحدیث: ۲۶۳۰ 'سنن النسائی 'ج ۱ 'رقم الحدیث: ۴۶۲ 'سنن ابن ماجہ 'رقم الحدیث: ۱۰۷۹)

تارک نماز کے متعلق مذاہب فقہاء

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ ھ لکھتے ہیں:

حضرت جابر (رض) کی حدیث کا معنی یہ ہے کہ جس شخص نے نماز کو ترک کیا اس کے اور کفر کے درمیان کوئی مانع اور حجاب نہیں ہے وہ کافر ہوگیا اور یہ حدیث اسی ظاہری معنی پر محمول ہے ‘ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب وہ نماز ترک کردے تو جمہور کا قول یہ ہے کہ اگر اس نے آخر وقت تک نماز نہیں پڑھی تو اس کو قتل کردیا جائے گا۔ حضرت علی ‘ امام احمد ‘ امام ابن المبارک ‘
اسحاق اور علامہ ابن حبیب مالکی کے نزدیک اس کو کفر کی بنا پر قتل کیا جائے گا اور امام مالک ‘ امام شافعی اور دیگر علماء کے نزدیک اس کو حدا قتل کیا جائے گا فقہاء احناف نے یہ کہا ہے کہ اس کو قتل نہیں کیا جائے گا ‘ اس کو نماز پڑھنے کا حکم دیا جائے گا اور اس کو اس وقت تک سزا دی جائے گی اور قید میں رکھا جائے گا ‘ جب تک وہ نماز نہ پڑھ لے۔
صحیح یہ ہے کہ وہ شخص کافر نہیں کیونکہ کفر انکار کو کہتے ہیں اور یہ نماز کی فرضیت کا منکر نہیں ہے ‘ اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے۔
امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ٢٧٥ ھ روایت کرتے ہیں :
حضرت عبادہ بن الصامت (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ عزوجل نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ جس شخص نے ان نمازوں کے لیے اچھی طرح وضو کیا اور ان کو اپنے اوقات میں پڑھا اور ان کا پورا پورا رکوع اور خشوع کیا تو اللہ نے از راہ کرم اس کی مغفرت کرنے کا ذمہ لیا ہے اور جس نے ایسا نہیں کیا تو اللہ پر اس کا کوئی ذمہ نہیں ہے ‘ اگر وہ چاہے تو اس کو بخش دے اور وہ چاہے تو اس کو عذاب دے۔ (سنن ابوداؤد ‘ ج ١‘ رقم الحدیث : ٤٢٥‘ سنن النسائی ‘ ج ١‘ رقم الحدیث : ٤٦٠‘ سنن ابن ماجہ ‘ ج ١‘ رقم الحدیث : ١٤٠١‘ مسند احمد ‘ ج ٥‘ رقم الحدیث : ٢٢٧٥٦‘ ٢٢٦٧‘ ٢٢٨٣‘ طبع دارالفکر ‘ مسند احمد ج ٥ ‘ ص ٣٢٢ ‘ ٣١٧‘ طبع قدیم)
اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ نماز کا ترک کرنا کفر نہیں ہے اور یہ شرک سے کم درجہ کی معصیت ہے اور شرک سے کم درجہ کی معصیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے مغفرت کرنے کا اعلان فرمایا ہے :
(آیت) ” ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر مادون ذالک لمن یشآء “۔ (النساء : ٤٨)
ترجمہ : بیشک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور جو اس سے کم (گناہ) ہو اسے جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا۔
قرآن مجید اور حدیث شریف کی تصریح سے واضح ہوگیا کہ سستی اور کاہلی سے نماز کو ترک کرنا کفر اور شرک نہیں ہے۔ (المفہم ‘ ج ١‘ ص ٢٦٢‘ ٢٧١‘ دارابن کثیر ‘ بیروت ‘ ١٤١٧ ھ)
تارک نماز کو قتل کرنے کے عدم جواز پر یہ دلیل ہے کہ اسلام میں صرف تین جرموں کی سزا قتل ہے ‘ کسی مسلمان کو ناجائز قتل کیا ہو ‘ شادی شدہ شخص نے زنا کیا ہو یا کسی شخص نے اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کرلیا ہو۔ ان تین جرموں کے سوا اور کسی جرم میں کسی مسلمان کو (بطور حد) قتل کرنا جائز نہیں ہے۔
امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ٢٥٦ ھ روایت کرتے ہیں :
حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کسی مسلمان کو ناجائز قتل کیا ہو ‘ شادی شدہ شخص نے زنا کیا ہو یا کسی شخص نے اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کرلیا ہو۔ ان تین جرموں میں سے کسی ایک کے سوا قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ (وہ یہ ہیں) جان کا بدلہ جان ‘ شادی شدہ زانی اور دین سے نکلنے والا اور جماعت کو چھوڑنے والا۔

(صحیح البخاری ' ج ۸ ' رقم الحدیث : ۶۸۷۸ ' صحیح مسلم ' قسامہ ' ۲۵ ' (۱۶۷۶) ۴۲۹۶ ' سنن ابو داؤد ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ۴۳۵۲ ' سنن ترمذی ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ۱۴۰۷ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۲۵۳۴ ' سنن کبری ' ج ۸ ' ص ۲۸۴ ' ۲۸۳ ' ۲۱۳ ' سنن نسائی ' ج ۷ ' رقم الحدیث : ۴۰۳۰ ' ۴۰۲۹ ' صحیح ابن حبان ' ج ۱۰ ' رقم الحدیث : ۴۴۰۸ ' مسند احمد ' ج ۱ ص ۴۲۸ ' ۳۲۲ ' طبع قدیم ' مسند احمد ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۳۶۲۱)

یہ حدیث امام ابو حنیفہ کی دلیل ہے کہ تارک نماز قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ (تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ○93

لغۃ القرآن: وَمَنْ : اور جو] [اَظْلَمُ : بڑا ظالم] [مِمَّنِ : اس سے جو] [افْتَرٰي : باندھے] [عَلَي اللّٰهِ : اللہ تعالیٰ پر] [كَذِبًا : جھوٹ] [اَوْ : یا] [قَالَ : فرمایا] [أُوْحِيَ : وحی کی گئی ہے] [اِلَيَّ : میری طرف] [وَلَمْ : اور نہیں] [يُوْحَ : وحی کی گئی] [اِلَيْهِ : اپنی طرف] [شَيْءٌ : کچھ بھی] [وَمَنْ : اور جو] [قَالَ : فرمایا] [سَأُنْزِلُ : عنقریب میں اتاروں گا] [مِثْلَ : مثل] [مَآ : نہیں] [اَنْزَلَ : اسنے نازل کی] [اللّٰهُ : اللہ] [وَلَوْ : اور اگر] [تَرٰي : آپ دیکھتے ہیں] [اِذِ : جب] [الظّٰلِمُوْنَ : سب ظالم ہیں] [فِي : میں] [غَمَرٰتِ : سختیوں " مبتلا ہوتے ہیں "] [الْمَوْتِ : موت کا] [

وَالْمَلٰٓئِكَةُ : اور فرشتے " بھی "] [بَاسِطُوْٓا : سب پھیلائے ہوتے ہیں] [اَيْدِيْهِمْ : ان کے ہاتھ] [اَخْرِجُوْٓا : تم سب نکالو] [اَنْفُسَكُمْ : اپنے آپ کو] [اَلْيَوْمَ : آج] [تُجْزَوْنَ : تم سب کو بدلہ دیا جائے گا] [عَذَابَ : عذاب] [الْهُوْنِ : ذلت کے] [بِمَا : اس وجہ سے جو] [كُنْتُمْ : ہو تم] [تَقُوْلُوْنَ : تم سب کہتے ہو] [عَلَي اللّٰهِ : اللہ تعالیٰ پر] [غَيْرَ الْحَقِّ : ناحق " بات کہ کر "] [وَكُنْتُمْ : حالانکہ تم تھے] [عَنْ : کے بارے میں] [اٰيٰتِهٖ : اپنی نشانیاں] [تَسْتَكْبِرُوْنَ : تم سب تکبر کرتے]

ترجمہ : اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان باندھے یا (نبوت کا جھوٹا دعوی کرتے ہوئے یہ) کہے کہ میری طرف وحی کی گئی ہے حالانکہ اس کی طرف کچھ بھی وحی نہ کی گئی ہو اور (اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا) جو (خدائی کا جھوٹا دعویٰ کرتے ہوئے یہ) کہے کہ میں (بھی) عنقریب ایسی ہی (کتاب) نازل کرتا ہوں جیسی اللہ نے نازل کی ہے۔ اور اگر آپ (اس وقت کا منظر) دیکھیں جب ظالم لوگ موت کی سختیوں میں (مبتلا) ہوں گے اور فرشتے (ان کی طرف) اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوں گے اور (ان سے کہتے ہوں گے :) تم اپنی جانیں جسموں سے نکالو۔ آج تمہیں سزا میں ذلت کا عذاب دیا جائے گا۔ اس وجہ سے کہ تم اللہ پر ناحق باتیں کیا کرتے تھے اور تم اس کی آیتوں سے سرکشی کیا کرتے تھے

تشریح:

یہ آیت مُسَیلِمَہ کذّاب کے بارے میں نازل ہوئی جس نے یمن کے علاقے یمامہ میں نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا۔ قبیلہ بنی حنیفہ کے چند لوگ اس کے فریب میں آگئے تھے۔ یہ کذاب، سیدنا ابوبکر صدیق (رض) کے زمانہ خلافت میں حضرت وحشی (رض) کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ (1)
اس کے بارے میں فرمایا کہ اس سے بڑھ کر ظالم کون ؟ جو اللہ عَزَّوَجَلَّ پر جھوٹ باندھے یا نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے اور کہے کہ میری طرف وحی کی گئی حالانکہ اس کی طرف کسی شے کی وحی نہیں بھیجی گئی۔ یہ آیت صراحت کے ساتھ مرزا قادیانی کا بھی رد کرتی ہے کیونکہ وہ بھی اس کا مدعی تھا کہ میری طرف وحی نازل کی جاتی ہے۔ آج کل قادیانی لوگوں کو مختلف طریقوں سے دھوکا دیتے ہیں۔ کچھ یہ کہتے ہیں کہ مرزا غلام احمد نے نبوت کا نہیں بلکہ مجدد ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور ہم اسے صرف مجدد مانتے ہیں جبکہ بعض کہتے ہیں کہ مرزا نے مطلق نبوت و رسالت کا دعویٰ نہیں کیا تھا بلکہ ایک خاص قسم کی نبوت کا دعویٰ کیا تھا حالانکہ مرزا قادیانی کی کتابوں میں بیسیوں جگہ مطلق نبوت و رسالت کا دعویٰ موجود ہے اور جو ظلی و بروزی نبوت کا دعویٰ ہے وہ بھی نبوت ہی کا دعویٰ ہے اور وہ بھی قطعاً کفر ہے، نیز مرزا کے منکروں کو کافر اور ماننے والوں کو صحابی اور بیویوں کو ازواج مطہرات کہنا ان کی کتابوں میں عام ہے لہٰذا کسی بھی مسلمان کو ان کے دھوکے میں نہیں آنا چاہیے۔
{ وَمَنۡ قَالَ : اور جس نے کہا۔ } آیت کا یہ حصہ عبداللہ بن ابی سرح کے بارے میں نازل ہوا جو کاتب وحی تھا۔ جب آیت " وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ " نازل ہوئی، اس نے اس کو لکھا اور آخر تک پہنچتے پہنچتے انسانی پیدائش کی تفصیل پر مطلع ہو کر متعجب ہوا اور اس حالت میں آیت کا آخری حصہ "فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ " بے اختیار اس کی زبان پر جاری ہوگیا۔ اس پر اس کو یہ گھمنڈ ہوا کہ مجھ پر وحی آنے لگی اور مرتد

ہوگیا، یہ نہ سمجھا کہ نور وحی اور قوت و حسنِ کلام کی وجہ سے آیت کا آخری کلمہ خود زبان پر آگیا ہے اور اس میں اس کی قابلیت کا کوئی دخل نہ تھا۔ زور کلام بعض اوقات خود اپنا آخر بتادیا کرتا ہے جیسے کبھی کوئی شاعر نفیس مضمون پڑھے وہ مضمون خود قافیہ بتادیتا ہے اور سننے والے شاعر سے پہلے قافیہ پڑھ دیتے ہیں ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ہر گز ویسا شعر کہنے پر قادر نہیں تو قافیہ بتانا ان کی قابلیت نہیں، کلام کی قوت ہے اور یہاں تو نورو حانی اور نور نبی سے سینہ میں روشنی آتی تھی چنانچہ مجلس شریف سے جدا ہونے اور مرتد ہوجانے کے بعد پھر وہ ایک جملہ بھی ایسا بنانے پر قادر نہ ہوا جو نظم قرآنی سے ملتا جلتا ہو۔ آخر کار زمانہ اقدس ہی میں فتح مکہ سے پہلے پھر اسلام سے مشرف ہوگیا۔ (1) اس کے بارے میں فرمایا کہ اس سے بڑھ کر ظالم کون؟ جو کہے: عنقریب میں بھی ایسی ہی کتاب اتار دوں گا جیسی اللہ عَزَّوَجَلَّ نے نازل کی ہے۔

(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

مسیلمہ اور اسود العنسی کے احوال

امام ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ مسیلمہ کا نام مسیلمہ بن ثمامہ بن کثیر تھا' یہ قبیلہ بنو حنیفہ سے تھا۔ اس نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد میں دس ہجری میں نبوت کا دعوی کیا' یہ کلمہ پڑھتا تھا "لا الہ الا اللہ وان محمدا عبدہ ورسولہ" اس کا زعم تھا کہ وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ نبوت میں شریک ہے' بنو حنیفہ بہت جلد اس کے تابع ہوگئے۔ اس نے اپنی قوم کے دو آدمیوں کو اپنا خط دے کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بھیجا' اس میں لکھا تھا' یہ مسیلمہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جانب سے محمد رسول اللہ کی طرف ہے۔ سلام علیک! میں اس معاملہ میں تمہارا شریک ہوں' سو نصف زمین میری ہے اور نصف تمہاری ہے' لیکن قریش بے انصاف قوم ہے۔ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس مکتوب کو پڑھا تو آپ نے اس کے قاصدوں سے فرمایا تم کیا کہتے ہو؟ انھوں نے کہا وہی جو ہمارے صاحب نے کہا ہے' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ایلچیوں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں تم دونوں کو قتل کر دیتا۔ پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کا جواب لکھا "بسم اللہ الرحمن الرحیم"۔ محمد رسول اللہ کی جانب سے مسیلمہ کذاب کی طرف' اس پر سلام ہو جو ہدایت کا پیروکار ہے:

(آیت) "ان الارض للہ یورثھا من یشآء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین"۔ (الاعراف: ۱۲۸)

ترجمہ؛ بیشک زمین اللہ کی ملکیت ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس کا وارث بناتا ہے اور نیک انجام اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے ہے۔

جب مسیلمہ نے یہ جواب پڑھا تو وہ مایوس ہوگیا اور بنو حنیفہ نے کہا ہمارا خیال ہے کہ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے صاحب کو اپنا شریک بنانے پر تیار نہیں ہیں۔

امام ابن اسحاق نے کہا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد میں مسیلمہ اور صنعاء کے صاحب اسود بن عزہ العنسی اور طلیحہ اور سجاح تمیمیہ نے نبوت کا دعوی کیا تھا' سجاح مسیلمہ کے پاس گئی اور کہنے لگی' تم پر کیا وحی آئی ہے' اس نے کہا مجھ پر یہ وحی آئی ہے:

"الم تر الی ربك كيف خلق الحبلى اخرج منها نسمة تسعى بين صفاق وحشا"۔

ترجمہ ؛کیا تم نے اپنے رب کی طرف نہیں دیکھا ' اس نے کس طرح حاملہ کو پیدا کیا ' اس سے ایک روح نکالی جو باریک کھال اور پیٹ کے اندر دوڑتی ہے۔

اس نے کہا میں گواہی دیتی ہوں کہ تم نبی ہو۔ مسیلمہ نے کہا تم مجھ سے شادی کر لو ' ہم دونوں مل کر عرب کو کھالیں گے۔ اس نے شادی کر لی اور اس کے منادی نے ندا کی ' سنو ! ہم بنو حنیفہ کے دین میں داخل ہو گئے ہیں اور بنو حنیفہ کے منادی نے ندا کی ' سنو ! ہمارے نبی نے تمہاری نبیہ سے شادی کر لی ہے اور سجاح نے مسیلمہ سے کہا ' اپنی قوم سے یہ دو لمبی نمازیں عشاء اور فجر منسوخ کر دو ' تو مسیلمہ کے منادی نے ان دو نمازوں کے منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا ' اس سے بنو حنیفہ بہت خوش ہوئے۔

پھر مسیلمہ اسی حال میں یمامہ چلا گیا ' یہاں تک کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا وصال ہو گیا ' اور تمام اہل یمامہ اسلام سے مرتد ہو کر مسیلمہ کے تابع ہو گئے اور دیگر مرتدین بھی آ کر ان سے مل گئے اور ان کی شوکت بہت بڑھ گئی۔ حضرت ابو بکر صدیق (رض) نے اس کی طرف بہت خطوط لکھے ' اس کو بہت نصیحتیں کیں اور بہت ڈرایا ' بالآخر آپ نے حضرت خالد بن ولید (رض) کی قیادت میں مسلمانوں کا ایک عظیم لشکر بھیجا ' جس نے مسیلمہ سے قتال کیا اور انجام کار مسیلمہ حضرت وحشی (رض) کے ہاتھوں مارا گیا۔ (المفہم ' علی المسلم ج ٦ ' ص ٤١۔ ٣٩ ' ملخصا مطبوعہ دار ابن کثیر ' بیروت ' ١٤١٧ ھ)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : میں نے ایک رات خواب دیکھا کہ میرے ہاتھوں میں سونے کے دو کنگن رکھ دیئے گئے ہیں میں ان سے گھبرا گیا اور ان کو ناپسند کیا ' پھر مجھے ان کو پھونک مارنے کی اجازت دی گئی تو وہ اڑ گئے ' میں نے اس کی یہ تعبیر کی کہ میرے بعد دو کذاب نکلیں گے۔ عبید اللہ نے کہا ان میں سے ایک العنسی ہے جس کو فیروز نے یمن میں قتل کیا اور دوسرا مسیلمہ ہے۔

(صحیح البخاری : ج ۵ ' رقم الحدیث : ٤٣٧٣ ' صحیح مسلم ' رویا ' ٢٢ ' (٢٢٧٤) ٥٨٢٦ ' سنن الترمذی ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ٢٢٩٩ ' صحیح ابن حبان ' ج ١٥ " رقم الحدیث : ٦٦٥٤ ' دلائل النبوۃ للبیہقی ' ج ٥ ' ص ٣٣٥ ' مسند احمد ' ج ٣ ' رقم الحدیث : ٨٢٥٥٦ ' طبع دار الفکر)

اس حدیث میں ہے کہ دو کذاب نکلیں گے اس کا معنی ہے میری وفات کے بعد ان کا ظہور اور غلبہ ہوگا ' ورنہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات میں موجود تھے اور ان کے متبعین بھی تھے۔ صنعاء اور یمامہ کے لوگ اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور اسلام کے معاون اور مددگار تھے ' لیکن وہ لوگ مسیلمہ اور العنسی کی سنہری باتوں میں آ گئے۔ یہ دونوں شہر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہاتھوں کی طرح تھے ' کیونکہ آپ ان سے قوت حاصل کرتے تھے اور سونے کے دو کنگن صاحب یمامہ اور صاحب صنعاء تھے ' اور ان کی چکنی چپڑی باتوں کو سونے کی ملمع کاری سے تشبیہ دی ہے اور آپ نے جو ان کو پھونک مار کر اڑایا ' اس میں یہ اشارہ ہے کہ یہ آپ کی امت کے ہاتھوں ہلاک ہوں گے۔

امام ابن اسحاق نے کہا ہے کہ صاحب صنعاء اسود بن کعب ہے ' اس کا لقب ذو خمار ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایک دن یہ جا رہا تھا اور سامنے سے ایک گدھا آ رہا تھا ' وہ لڑکھڑایا اور منہ کے بل گر گیا تو اس نے کہا اس گدھے مجھے سجدہ کیا ہے۔ پھر یہ اسلام سے مرتد ہو گیا اور اس نے نبوت کا دعوی کیا ' جاہل لوگ اس کے پیروکار ہو گئے اور یہ صنعاء پر قابض ہو گیا اور اس نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عامل مہاجر بن اسد مخزومی کو صنعاء سے نکال دیا۔ فیروز دیلمی اور قیس بن مکشوح نے اس کو قتل کر دیا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس اس کا سر لے کر آئے اور بعض مورخین نے کہا ہے کہ یہ واقعہ حضرت ابو بکر صدیق (رض) کی خلافت میں ہوا۔ اور میرے نزدیک یہی صحیح ہے۔

کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا وہ میرے بعد نکلیں گے۔ یعنی ان کا ظہور اور غلبہ میرے بعد ہوگا۔ (المفہم ' ج ٦ 'ص ٤٥۔ ٤٤ 'ملخصا مطبوعہ دار ابن کثیر ' بیروت ' ١٤١٧ھ)

معرفت کے جھوٹے دعوی داروں کا رد اور ابطال

علامہ قرطبی مالکی نے لکھا ہے کہ نبوت کے جھوٹے دعوی داروں کی سلک میں وہ لوگ منسلک ہیں جو فقہ ' حدیث اور علوم دینیہ کے حصول سے اعراض کرتے ہیں ' اور کہتے ہیں کہ میرے دل میں یہ بات واقع ہوئی ہے یا میرے دل نے یہ کہا ہے اور ان کا یہ زعم ہوتا ہے کہ چونکہ ان کا دل گناہوں کی کدورتوں اور ظلمتوں سے پاک اور صاف ہے اور وہ غیر اللہ کے اختلاط سے مامون ہیں ' اس لیے اللہ تعالیٰ ان کے دل پر علوم اور معرفت کی تجلیات نازل فرماتا ہے اور وہ حقائق ربانیہ اور اسرار کائنات کے واقف ہیں ' اس وجہ سے وہ قواعد شرع سے مستغنی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ شرعی احکام عام لوگوں کے لیے ہیں اور خواص اولیاء اللہ ان سے مستغنی ہیں اور وہ حضرت اور خضر (علیہما السلام) کے واقعہ سے استدلال کرتے ہیں اور اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

حضرت وابصہ بن معبد الاسدی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وابصہ سے فرمایا تم نیکی اور گناہ کے متعلق آئے ہو؟ انھوں نے کہا جی! آپ نے ان کی انگلیوں کو اکٹھا کرکے ان کے سینہ پر مارا اور تین بار فرمایا اے وابصہ! اپنے نفس سے فتوی لو ' اپنے دل سے فتوی لو ' نیکی وہ ہے جس پر تمہارا نفس مطمئن ہو ' جس پر تمہارا دل مطمئن اور گناہ وہ ہے جس سے تمہارے ضمیر میں خلش ہو اور تمہارے سینہ میں کھٹک ہو ' خواہ لوگ تمہیں فتوی دیتے ہیں۔ (سنن دارمی ' ج ٢ ' رقم الحدیث : ٢٥٣٣ ' مطبوعہ دار الکتاب العربی ' بیروت ' ١٤٠٧ھ)

حضرت ابو ثعلبہ خشنی (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا : یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھے بتائیے کیا چیز میرے لیے حلال ہے اور کیا چیز حرام ہے؟ انھوں نے کہا پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) منبر پر رونق افروز ہوئے اور نظر جھکائی۔ پھر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا نیکی وہ ہے جس پر ضمیر پر سکون ہو اور دل مطمئن ہو اور گناہ وہ ہے جس پر ضمیر میں خلش ہو اور دل مطمئن نہ ہو خواہ تمہیں مفتی فتوے دیتے رہیں۔ (مسند احمد ج ٦ ' رقم الحدیث : ١٧٧٥٧ ' طبع دار الفکر ' مسند احمد ج ٤ ' ص ١٩٤ ' طبع قدیم)

ان احادیث کا محمل یہ ہے کہ جس پیش آمدہ مسئلہ میں قرآن مجید اور حدیث شریف کی صریح ہدایت نہ ہو اور نہ اس کے متعلق اجماعی حکم موجود ہو اور اس میں حلال اور حرام مشتبہ ہو ' اس میں انسان اپنے ضمیر کے فیصلہ پر عمل کرے۔ مثلا روزے میں انجکشن لگوانے کے متعلق ہمارے دور کے اکثر مفتی کہتے ہیں کہ اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا ' لیکن ایک سلیم الفطرت انسان کا ضمیر یہ کہتا ہے کہ جب منہ سے دوا کھانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور منہ سے کھائی ہوئی دوا نظام ہضم کے مراحل طے کرنے کے بعد خون میں مل جاتی ہے اور اسی وقت وہ دوا موثر ہوتی ہے ' تو اگر وہ دوا انجکشن کے ذریعہ براہ راست خون میں پہنچا دی جائے تو بطریق اولی روزہ ٹوٹ جانا چاہیے۔ ان احادیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن مجید ' احادیث اور ائمہ مجتہدین سے بے نیاز ہو کر انسان اپنے بے لگام دل کے فیصلوں پر عمل کرے ' جیسا کہ ان بناوٹی پیروں اور معرفت کے جھوٹے دعوی داروں نے سمجھ رکھا ہے۔ علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ ان لوگوں کے زندیق ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے ' اسلامی حکومت ہو

توان کو قتل کر دیا جائے۔ ان سے توبہ طلب کی جائے نہ ان سے بحث کی جائے 'کیونکہ ان کے اقوال سے احکام شرعیہ کا منہدم ہونا اور ہمارے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد نبوت کا اثبات لازم آتا ہے۔ الجامع لاحکام القرآن جزء ۷ ص ۳۷ '۳۶ مطبوعہ دار الفکر 'بیروت مختصرا وموضحا)

حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے احوال

اس آیت کے دوسرے حصہ میں فرمایا ہے اور جو یہ کہے کہ میں عنقریب ایسی چیز نازل کروں گا جیسی اللہ نے نازل کی ہے مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے متعلق نازل ہوئی ہے 'وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے وحی لکھتا تھا 'یہ مرتد ہو کر مشرکین سے جاملا تھا۔ مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ (آیت) "ولقد خلقنا الانسان من سلالة من طين ۔۔ ثم انشأنه خلقا اخر " (المومنون: ۱۴۔ ۱۲) تو عبداللہ بن سعد کو انسان کی خلقت پر بہت تعجب ہوا اور اس نے بے ساختہ کہا (آیت) "تبارك الله احسن الخالقين "رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مجھ پر اسی طرح یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ اس وقت عبداللہ بن سعد کو اپنے ایمان میں شک پڑ گیا اور اس نے کہا اگر (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صادق ہیں تو مجھ پر بھی ایسی ہی وحی کی گئی ہے 'جیسی ان پر وحی کی گئی ہے پھر وہ اسلام سے مرتد ہو کر مشرکین سے جاملا اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اس کی مذمت میں نازل کی اور جو یہ کہے کہ میں عنقریب ایسی چیز نازل کروں گا جیسی اللہ نے نازل کی ہے۔

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے وحی لکھتے تھے ان کو شیطان نے لغزش دی 'وہ کفار کے ساتھ جاملے 'رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فتح مکہ کے دن ان کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ حضرت عثمان (رض) نے ان کے لیے پناہ طلب کی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو پناہ دے دی۔

(سنن ابوداؤد ج ۴ 'رقم الحدیث: ۴۳۵۸ 'سنن النسائی 'ج ۷ 'رقم الحدیث: ۴۰۸۰)

سعد بیان کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن عبداللہ بن سعد بن ابی سرح حضرت عثمان (رض) کے پاس چھپ گئے 'پھر حضرت عثمان نے ان کو لا کر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے کھڑا کر دیا اور کہا یارسول اللہ ! عبداللہ کو بیعت کر لیجئے۔ آپ نے سراقدس اوپر اٹھایا اور تین بار اس کی طرف دیکھا اور ہر بار انکار کر دیا 'پھر تین بار انکار کے بعد بیعت کر لیا 'پھر اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کیا تم میں کوئی سمجھدار آدمی نہیں تھا کہ جب اس نے دیکھا کہ میں اس کو بیعت کرنے سے انکار کر رہا ہوں تو وہ اس کو قتل کر دیتا 'صحابہ نے کہا یارسول اللہ ! ہم نہیں جان سکے کہ آپ کے دل میں کیا ہے ؟ آپ نے آنکھوں سے ہماری طرف اشارہ کیوں نہ کر دیا ؟ آپ نے فرمایا نبی کے لیے یہ جائز نہیں کہ اس کی آنکھ خیانت کرنے والی ہو۔ (سنن ابوداؤد 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ۴۳۵۹ 'سنن النسائی 'ج ۷ 'رقم الحدیث: ۴۰۷۸)

امام ابوعبدالرحمن احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ ھ نے اس کو زیادہ تفصیل سے روایت کیا ہے۔

سعد بیان کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے چار مردوں اور دو عورتوں کے سوا سب کو امان دے دی۔ وہ چار مرد یہ تھے۔ عکرمہ بن ابی جہل 'عبداللہ بن خطل 'مقیس بن صبابہ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح۔ آپ نے فرمایا اگر یہ لوگ کعبہ کے

پردوں سے بھی لٹکے ہوئے ہوں تو ان کو قتل کردینا۔ عبداللہ بن خطل کعبہ کے پردوں میں چھپا ہوا پکڑا گیا۔ حضرت سعد بن حریث اور حضرت عمار بن یاسر نے اس کو پکڑا اور حضرت سعد (رض) نے حضرت عمار پر سبقت کی۔ وہ دو مردوں سے زیادہ جوان تھے انھوں نے اس کو قتل کردیا 'اور مقیس بن صبابہ کو لوگوں نے بازار میں پکڑ کر قتل کردیا اور عکرمہ سمندر میں ایک کشتی پر سوار ہوگئے۔ اس کشتی کو تیز ہواؤں نے آلیا۔ کشتی والوں نے کہا خلوص کے ساتھ اللہ سے دعا کرو کیونکہ تمہارے معبود یہاں پر کسی کام نہیں آسکتے۔ عکرمہ نے دل میں کہا بخدا اگر اس سمندر میں میری نجات صرف اخلاص سے ہو سکتی ہے تو خشکی میں بھی صرف اللہ کے ساتھ اخلاص ہی کام آسکتا ہے۔ پھر انھوں نے کہا اے اللہ ! میں تجھ سے عہد کرتا ہوں کہ اگر تو نے مجھے اس گرداب سے بچالیا تو میں سیدھا (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جاؤں گا اور جا کر ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دوں گا اور میں ان کو ضرور معاف کرنے والا اور کریم پاؤں گا 'پھر وہ آپ کے پاس گئے اور مسلمان ہوگئے۔ اور رہے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح تو وہ حضرت عثمان بن عفان (رض) کے پاس چھپ گئے 'جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے لوگوں کو بیعت کے لیے بلایا تو حضرت عثمان (رض) نے ان کو لے جا کر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس کھڑا کردیا اور کہا یارسول اللہ ! عبداللہ کو بیعت کرلیجئے۔ آپ نے تین بار اس کی طرف دیکھا اور ہر بار انکار کیا 'پھر تین بار انکار کے بعد آپ نے بیعت کرلیا۔ پھر آپ نے اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کیا تم میں اتنا سمجھ دار شخص کوئی نہیں تھا کہ جب اس نے دیکھا کہ میں اس کو بیعت کرنے سے ہاتھ کھینچ رہا ہوں تو وہ اس کو قتل کردیتا 'انھوں نے کہا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمیں کیا پتا تھا کہ آپ کے دل میں کیا ہے ؟ آپ نے ہماری طرف آنکھوں سے اشارہ کیوں نہ کردیا ؟ آپ نے فرمایا نبی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کی آنکھ خیانت کرنے والی ہو۔

(سنن النسائی 'ج ٧ 'رقم الحدیث : ٤٠٧٨ 'سنن ابوداؤد 'ج ٢ 'رقم الحدیث : ٢٦٨٣ 'ج ٤ 'رقم الحدیث : ٤٣٥٩)

عبداللہ بن سعد بن ابی سرح فتح مکہ کے ایام میں دوبارہ مسلمان ہوئے اور انھوں نے اسلام پر بہت اچھی طرح عمل کیا اور اس کے بعد ان سے کوئی ناپسندیدہ بات صادر نہیں ہوئی 'وہ قریش کے معزز دانش مند سرداروں میں سے ایک تھے 'پھر حضرت عثمان غنی (رض) نے ٢٥ ھ میں انھیں مصر کا گورنر بنادیا '٢٧ ھ میں انھوں نے افریقیہ کو فتح کیا۔ مصر کی فتح کے موقع پر حضرت عمرو بن العاص صاحب میمنہ تھے 'مصر کی تمام جنگوں میں حضرت عمرو بن العاص ہی والی تھے 'جب حضرت عثمان (رض) نے ان کو معزول کرکے حضرت عبداللہ بن سعد (رض) کو ان کی جگہ مقرر کیا تو حضرت عمرو بن العاص حضرت عثمان (رض) پر نکتہ چینی کرنے لگے اور ان کی خلافت پر تنقید کرنے لگے 'حضرت عبداللہ بن سعد حضرت عثمان (رض) کی شہادت تک فلسطین میں رہے۔ انھوں نے حضرت علی اور حضرت معاویہ (رض) دونوں میں سے کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی 'حضرت معاویہ (رض) کی خلافت منعقد ہونے سے پہلے ان کی وفات ہوگئی۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ افریقیہ میں فوت ہوئے اور صحیح یہ ہے کہ ٣٦ ھ یا ٣٧ ھ میں عسقلان میں فوت ہوئے۔

(الاستیعاب 'ج ٢ 'ص ٣٧٨۔ ٣٧٦ 'علی ھامش الاصابہ 'مختصر تاریخ دمشق 'ج ١٢ 'ص ٢٣١۔ ٢٢٧ 'ملخصا)

کافر کے جسم سے روح نکالنے کی کیفیت

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور (اے مخاطب!) کاش تو وہ منظر دیکھے جب یہ ظالم موت کی سختیوں میں مبتلا ہوں گے اور فرشتے ان کی طرف ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوں گے اور کہیں گے 'نکالو اپنی جانوں کو آج تمہیں ذلت والے عذاب کی سزا دی جائے گی' کیونکہ تم اللہ پر ناحق بہتان تراشتے تھے اور تم اس کی آیتوں (پر ایمان لانے) سے تکبر کرتے تھے۔ (الانعام: ۹۳)
اس جگہ یہ سوال ہوتا ہے کہ کافروں میں بلکہ کسی بھی انسان میں یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ اپنے بدن سے اپنی جان نکال سکے' پھر ان کو یہ حکم دینے کا کیا فائدہ ہے کہ "نکالو اپنی جانوں کو" اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امر مکلّف کرنے کے لیے نہیں ہے' بلکہ ان کو عاجز کرنے اور ان کو رسوا کرنے کے لیے ہے' موت کے وقت کفار بہت سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے اور جس طرح کوئی کانٹے دار شاخ کیچڑ اور گارے میں پھنسی ہوئی ہو تو اس کو کھینچ کر بڑی سختی سے نکالا جاتا ہے' اسی طرح ان کی روح ان کے بدن سے عذاب اور سختی کے ساتھ نکالی جائے گی' اس وقت ان سے فرشتے کہیں گے کہ اگر تم آسانی کے ساتھ روح کو اپنے بدن سے نکال سکتے ہو تو نکال لو۔ کافر مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے اور اللہ سے ملاقات کے منکر تھے' اس لیے اللہ تعالیٰ ان کو ذلت والے عذاب میں مبتلا کر کے ان کی روحوں کو ان کے جسموں سے نکلواتا ہے۔

موت کے وقت مسلمان اور کافر کے حالات

اس آیت میں موت کے وقت کافر کے حالات بیان ہوئے اور حدیث پاک میں مسلمان اور کافر دونوں کی موت کے حالات بیان کئے گئے ہیں، چنانچہ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جب مسلمان کی موت قریب ہوتی ہے تو رحمت کے فرشتے سفید ریشمی کپڑے لے کر آتے ہیں اور کہتے ہیں: اے روح! تو راضی خوشی حالت میں اور اس حال میں نکل کہ اللہ تعالیٰ تم سے راضی ہے، تُو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے رزق سے اپنے پروردگار کی طرف نکل جو ناراض نہیں ہے۔ پھر روح عمدہ خوشبودار مشک کی طرح خارج ہوتی ہے اور فرشتے اسے اسی وقت اٹھا کر آسمان کے دروازے پر لے جاتے ہیں اور کہتے ہیں: یہ کتنی اچھی خوشبو ہے جو زمین سے آئی ہے۔ اس کے بعد اسے مسلمانوں کی روحوں کے پاس لے کر آتے ہیں۔ وہ روحیں اس شخص سے بھی زیادہ خوش ہوتی ہیں جو کسی گئے ہوئے شخص کے واپس آنے پر خوش ہوتا ہے اور وہ روحیں اس سے دریافت کرتی ہیں: دنیا میں پیچھے رہنے والا فلاں شخص کیسے کام کرتا ہے؟ پھر روحیں کہتی ہیں: ابھی ٹھہرو اور اسے چھوڑ دو، یہ دنیا کے غم میں ہے۔ یہ روح کہتی ہے: کیا وہ شخص تمہارے پاس نہیں تھا؟ (یعنی دنیا سے تو وہ آ چکا تو کیا تمہارے پاس نہیں ہے؟) روحیں کہتی ہیں: (اگر وہ دنیا سے آ چکا اور ہمارے پاس نہیں ہے تو پھر) وہ جہنم میں گیا ہوگا۔ اور جب کافر کی موت آتی ہے تو عذاب کے فرشتے بوریے کا ایک ٹکڑا ڈالے آ کر کہتے ہیں: اے روح! تو اللہ تعالیٰ کے عذاب کی طرف نکل کیونکہ تو اللہ تعالیٰ سے ناراض ہے اور اللہ تعالیٰ تجھ سے ناراض ہے، اس کے بعد وہ جلے ہوئے بدبودار مردار کی طرح نکلتی ہے حتّٰی کہ فرشتے اسے زمین کے دروازے پر لاتے ہیں تو فرشتے پوچھتے ہیں: یہ کیا بدبو ہے، یہاں تک کہ اسے کافروں کی روحوں میں لے جاتے ہیں۔
(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

حضرت عبادہ بن الصامت (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو اللہ کی ملاقات سے محبت رکھے ' اللہ بھی اس کی ملاقات سے محبت رکھتا ہے اور جو اللہ کی ملاقات کو ناپسند کرے ' اللہ بھی اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔
(صحیح البخاری ' ج ٧ ' رقم الحدیث : ' ٦٥٠٧ ' صحیح مسلم ' الدعوات ' ١٤ ' (٢٦٨٢) ٦٦٩٤ ' سنن الترمذی ' ج ٢ ' رقم الحدیث : ' ١٠٦٨ ' سنن النسائی ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ' ١٨٣٧)
حافظ ابن کثیر متوفی ٧٧٤ ھ نے لکھا ہے کہ جب کافر کی موت کا وقت آتا ہے تو فرشتے اس کو عذاب اور سزا اور گلنے میں ڈالے جانے والے طوقوں اور زنجیروں ' دوزخ ' گرم پانی اور اللہ تعالیٰ کے غضب کی بشارت دیتے ہیں تو اس کی روح اس کے جسم میں منتشر ہو جاتی ہے اور جسم سے نکلنے سے انکار کرتی ہے۔ تب فرشتے اس کے چہرے اور دبر پر مارتے ہیں اور کہتے ہیں نکالو اپنی جانوں کو آج تمہیں ذلت والے عذاب کی سزا دی جائے گی ' کیونکہ تم اللہ پر ناحق بہتان تراشتے تھے۔
حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کافر بندے پر موت وارد کرتا ہے تو اس کے پاس دو فرشتے بھیجتا ہے اور اس کے پاس ایک ٹاٹ کا ٹکڑا بھیجتا ہے۔ جو ہر بدبودار چیز سے زیادہ بدبودار اور ہر سخت چیز سے زیادہ سخت ہوتا ہے ' فرشتے اس سے کہتے ہیں ' اے خبیث روح ! جہنم کی طرف نکل اور دردناک عذاب کی طرف ' اور تیرا رب تجھ پر ناراض ہے ' باہر نکل تو نے بہت برے اعمال بھیجے ہیں ' وہ روح ایسے بدبودار مردہ کی طرح نکلے گی کہ اگر تم میں سے کوئی شخص دیکھ لے تو اپنی ناک بند کرلے اور آسمان کے ارد گرد والے فرشتے کہیں گے ' سبحان اللہ ! زمین سے ایک مردہ اور خبیث روح آئی ہے ' اس کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ پھر اس کے جسم کو زمین پر پھینکنے کا حکم دیا جائے گا اور اس کی قبر میں تنگی کی جائے گی اور اس کو اونٹ کی گردن جتنے موٹے سانپوں سے بھر دیا جائے گا ' وہ اس کا گوشت کھالیں گے اور اس کی ہڈیوں میں سے بھی کچھ نہیں چھوڑیں گے ' پھر اس کے پاس بہرے اور اندھے فرشتے بھیجیں جائیں گے ' ان کے پاس لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے ' وہ کچھ دیکھیں گے نہیں ' تاکہ انھیں رحم آئے اور کوئی آواز نہیں سنیں گے ' تاکہ انھیں اس پر ترس آئے۔ وہ اس کو بری طرح ماریں گے ' اور اس کے لیے دوزخ کی ایک کھڑکی کھول دی جائے گی جس سے وہ صبح و شام کو دوزخ میں اپنا ٹھکانا دیکھے گا ' اور وہ اللہ سے یہ دعا کرے گا کہ وہ اس کو اسی جگہ رکھے اور دوزخ میں نہ بھیجے۔
حافظ الہیثمی المتوفی ٨٠٧ ھ نے کہا کہ یہ حدیث المعجم الکبیر میں ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ (مجمع الزوائد ج ٢ ' ص ٣٢٩)
(تفسیر تبیان القرآن۔ غلام رسول سعیدی)
جھوٹی وحی بنا کر اللہ کی طرف منسوب کرنے والے ظالموں کو جب موت آتی ہے تو وہ منظر دیدنی ہوتا ہے۔ فرشتے ان کی طرف ہاتھ بڑھا کر سخت غضب میں کہتے ہیں کہ نکالو اپنی جان اور ہمارے سپرد کرو۔ آج تمہیں رسوا کن عذاب ہوگا کیونکہ تم نے اللہ پر جھوٹی وحی باندھی۔ اس میں مرزا غلام احمد قادیانی کی بری موت بھی شامل ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کی عبرتناک موت

قرآن مجید کی اس آیت کی صداقت مرزا قادیانی کی موت پر بھی واضح ہوئی۔ جب اسے موت آئی تو اس کی سخت بری حالت تھی۔ اس نے خود کہا تھا اگر میں جھوٹا ہوں تو اللہ مجھے ہیضے یا تعاون جیسی بری موت میں مارے گا۔ (مجموعہ اشتہارات جلد سوم صفحہ 579 مطبوعہ لندن) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہیضے میں مارا اور وہ مرتے ہوئے اپنی ہی غلاظت میں لت پت تھا اور اسے دست اور قے آتے جا رہے تھے۔ چنانچہ مرزا قادیانی کا رشتہ دار مرزا ناصر کہتا ہے:

"حضرت (مرزا) صاحب رات کو بیمار ہوئے، جب مرض شدید ہوئی تو مجھے جگایا گیا، جب میں حضرت صاحب کے پاس پہنچا تو آپ نے مجھے مخاطب کرکے فرمایا: مرزا صاحب! مجھے وبائی ہیضہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ اگلے روز دس بجے آپ کا وصال ہو گیا۔"

(حیات ناصر صفحہ 14 مرتبہ شیخ یعقوب علی عرفانی قادیانی)

گویا مرزا قادیانی نے خود اپنی زبان سے اقرار کر لیا کہ اسے ہیضہ ہو گیا ہے اور اسی سے اس کی موت واقع ہوئی اور اس کے وہ الفاظ پورے ہوئے جو اس نے اپنی موت سے قریبا ایک برس قبل کہے تھے۔ کہ اگر وہ جھوٹا ہے تو اللہ اسے طاعون یا ہیضے جیسی بری موت سے مارے گا۔

مرزا قادیانی کا بیٹا مرزا بشیر الدین لکھتا ہے:

"جب میں نے پہلی نظر آپ پر ڈالیں تو میرا دل بیٹھ گیا۔ آپ پر سخت گھبراہٹ طاری تھی، آپ بول نہیں سکتے تھے (زبان بند ہو گئی تھی، اللہ نے وقت آخر توبہ کی توفیق نہ دی) تھوڑی دیر بعد آپ کو غرغرہ شروع ہو گیا، سانس لمبا لمبا کھینچ کھینچ کر آنے لگا۔ آپ ایک یا دو بار قضاء حاجت کے لیے پاخانہ تشریف لے گئے، اتنے میں آپ کو ایک زبردست دست آیا (فرشتے نے اندر سے آنتوں کو شدید مروڑ دیا) اب آپ پاخانہ نہیں جا سکتے تھے۔ میں نے چارپائی کے قریب ہی انتظام کر دیا، آپ وہیں بیٹھ کر فارغ ہوئے (اور کمرہ غلاظت و گندگی کی بدبو سے بھر گیا) اس کے بعد ایک اور دست آیا اور ایک قے آئی (یعنی اوپر نیچے دونوں طرفوں سے گندگی نکلنے لگی، یہی ہیضہ ہے) جب آپ قے سے فارغ ہو کر لیٹنے لگے تو اتنا ضعف تھا کہ آپ پشت کے بل چارپائی پہ گر گئے اور آپ کا سر چارپائی پہ گر گئے اور آپ کا سر چارپائی کی لکڑی (پائے) سے ٹکرا گیا اور حالت دگرگوں ہو گئی۔ (سیرت المہدی مصنفی مرزا بشیر الدین جلد 1 صفحہ 9)۔

دوستانِ خدا کی موت اور دشمنان خدا کی موت

اللہ کے نیک بندوں کے منہ سے وقت وصال کلمہ طیبہ، درود شریف اور قرآنی آیات نکلتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارک وصال کے وقت یہ آیت پڑھ رہے تھے: لمثل ھذا فلیعمل العملون۔ "ایسی ہی جزا کے لیے کام کرنے والوں کو کام کرنا چاہیے۔" (صافات، 61) اور سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ وقت موت یہ آیات پڑھ رہے تھے: تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فی الارض ولا فساداً۔ والعاقبۃ للمتقین۔ "یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لیے بناتے ہیں جو زمین میں سرکشی نہیں چاہتے اور نہ فساد، اور اچھا انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے۔" (قصص، 83)

صاحب برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب القرآن فرماتے ہیں :

میرے والد گرامی محقق اسلام شیخ الحدیث علامہ محمد علی رحمہ اللہ کا وقت وصال آیا تو انھوں نے باوجود ضعف مغرب کی نماز بیٹھ کر مگر باجماعت پڑھی، پھر لیٹے گئے اور بار بار پڑھنے لگے : **حسبی اللہ و نعم الوکیل نعم المولی و نعم النصیر**۔ یہی پڑھتے پڑھتے ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ میری نانی جان رحمت بی بی رحمۃ اللہ علیہا ولیہ کاملہ تھیں، جب ان کا وقت وصال آیا تو ان پہ سکرات موت طاری تھے۔ ایسے میں مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے اذان کی آواز آئی تو اسی بے ہوشی میں ان کے ہاتھ نماز کے لیے سینے پہ بندھ گئے اور وہ نماز کی تسبیحات پڑھنے لگیں۔ اس سے کچھ دیر بعد اسی بے ہوشی میں فرمانے لگیں : وہ دیکھو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لے آئے، ساتھ میں ابو بکر صدیق اور عمر فاروق (رض) بھی ہیں اور تھوڑی دیر بعد ان کی روح پرواز کر گئی۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔ یہ ہوتی ہے اللہ کے نیک بندوں کی موت۔

مگر دشمنان خدا کے منہ سے وقت وصال گندگی ہی نکلتی ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے منہ سے زندگی بھر نبوت و رسالت کے جھوٹے دعوے، اللہ پہ افتراء اور انبیاء کرام، صحابہ و اہل بیت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور صالحین کی شان میں توہین نکلتی رہی، تو اس کے منہ سے وقت موت بدبودار قے کی غلاظت ہی نکلنی چاہیے تھی۔ انہی مفترین کے بارہ میں اللہ تعالیٰ یہاں آیت 93 میں فرمارہا ہے کہ جب ظالموں پہ سکرات موت طاری ہوتے ہیں تو فرشتے انھیں جھڑک کر کہتے ہیں : **اَخۡرِجُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ‌ؕ اَلۡيَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ عَذَابَ الۡهُوۡنِ بِمَا كُنۡتُمۡ تَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ غَيۡرَ الۡحَـقِّ**۔ "اپنی جانیں نکالو ! آج تمہیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا، کیونکہ تم اللہ پر جھوٹی باتیں باندھتے تھے (مثلاً نبوت و رسالت کے جھوٹے دعوے کرتے تھے)۔ "

اور انہی لوگوں کے بارہ میں دوسری جگہ فرمایا گیا : **فَكَيۡفَ اِذَا تَوَفَّتۡهُمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ يَضۡرِبُوۡنَ وُجُوۡهَهُمۡ وَاَدۡبَارَهُمۡ ۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوۡا مَاۤ اَسۡخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوۡا رِضۡوَانَهٗ فَاَحۡبَطَ اَعۡمَالَهُمۡ** ۔ (محمد۔ 27) (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

آیت مبارکہ :

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۭ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝ 94

لغۃ القرآن: وَ : اور] [لَقَدْ : البتہ تحقیق] [جِئْتُمُوْنَا : آئے ہو تم ہمارے پاس] [فُرَادٰي : اکیلے اکیلے] [كَمَا : جیسا کہ] [خَلَقْنٰكُمْ : ہم نے پیدا کیا تمہیں] [اَوَّلَ : پہلی] [مَرَّةٍ : مرتبہ] [وَّتَرَكْتُمْ : اور تم چھوڑ آئے ہو] [مَا : جو] [خَوَّلْنٰكُمْ : دے رکھا تھا ہم نے تمہیں] [وَرَاۗءَ : پیچھے] [ظُهُوْرِكُمْ : اپنی پیٹھوں کے] [وَمَا : اور نہ] [نَرٰي : ہم دیکھ رہے] [مَعَكُمْ : تمہارے ساتھ ہوں] [شُفَعَاۗءَكُمُ : تمہارے سفارشی] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [زَعَمْتُمْ : تم نے گمان کیا] [اَنَّهُمْ : بیشک وہ] [فِيْكُمْ : تم میں " سے "] [شُرَكٰۗؤُا : شریک ہیں] [لَقَدْ : البتہ تحقیق] [تَّقَطَّعَ : بالکل منقطع ہوگئے] [بَيْنَكُمْ : اپنے درمیان] [وَضَلَّ : اور جاتے رہے] [عَنْكُمْ : تم سے] [مَا : نہیں] [كُنْتُمْ : ہو تم] [تَزْعُمُوْنَ : سب دعویٰ کرتے]

ترجمہ : اور بیشک تم (روز قیامت) ہمارے پاس اسی طرح تنہا آؤ گے جیسے ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ (تنہا) پیدا کیا تھا اور (اموال واولاد میں سے) جو کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا تھا وہ سب اپنی پیٹھ پیچھے چھوڑ آؤ گے، اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو نہیں دیکھیں گے جن کی نسبت تم (یہ) گمان کرتے تھے کہ وہ تمہارے (معاملات) میں ہمارے شریک ہیں۔ بیشک (آج) تمہارا باہمی تعلق (واعتماد) منقطع ہو گیا اور وہ (سب) دعوے جو تم کیا کرتے تھے تم سے جاتے رہے

تشریح:

گزشتہ آیت میں کافروں کی موت کے احوال بیان ہوئے تھے اور اس آیت میں قیامت کے احوال کا بیان ہے چنانچہ ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن ان کافروں سے کہا جائے گا: بیشک تم ہمارے پاس حساب وجزا کے لیے ایسے اکیلے آئے جیسے ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا، نہ تمہارے ساتھ مال ہے، نہ جاہ، نہ اولاد جن کی محبت میں تم عمر بھر گرفتار رہے اور نہ بت جنہیں پوجتے رہے۔ آج ان میں سے کوئی تمہارے کام نہ آیا بلکہتم وہ سب مال ومتاع اپنے پیچھے چھوڑ آئے جو ہم نے تمہیں دیا تھا اور آج ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو نہیں دیکھتے جنہیں تم گمان کرتے تھے کہ وہ تمہارے عبادت کرنے میں ہمارے شریک ہیں۔ بیشک تمہارے درمیان جدائی ہو گئی اور تم سے وہ بت غائب ہو گئے جن کے معبود ہونے کا تم دعوی کرتے تھے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

دنیا میں کفار اپنی اجتماعی قوت اور مالی وسائل کی بناپر قرآن مجید اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ لیکن موت کے بعد سب کو اکیلے، اکیلے رب کے حضور پیش ہونا ہوگا۔ جس کے لیے موت کے بعد اٹھنے اور محشر کے میدان میں حاضری کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔

اللہ تعالٰی کے احکام سے انحراف اور موت کے بعد اٹھنے کا جو لوگ انکار کرتے ہیں ان کو خبر دار کیا گیا ہے۔ کہ اس وقت کا تصور کرو۔ جب اللہ تعالٰی ایک، ایک کو اپنی بارگاہ میں اس طرح کھڑا کریں گے جس طرح اس نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے۔ جس دولت پر تم اتراتے ہو، جو اقتدار اور اختیار تمہارے تکبر کا باعث بنا ہے جن پیروں فقیروں اور باطل معبودوں پر بھروسہ کرتے ہوئے موت کا انکار اور ہماری آیات سے انحراف کیا وہ سب کا سب پیچھے رہ جائے گا۔ کوئی ایک شخص بھی تمہاری سفارش کرنے کی جرات نہیں کر سکے گا۔ اس وقت تمام وسائل ختم اور ہر قسم کے رشتے ناتے کٹ چکے ہوں گے اور وہ زعم بھی ختم ہو جائے گا جس کی بنا پر مشرک دنیا میں شرک کیا کرتے تھے۔ کہ فلاں، فلاں ہمیں اللہ سے چھڑوائے گا۔

ظالم کو اس کی کربناک موت کا احساس دلاتے ہوئے یہ بھی بتلایا جا رہا ہے کہ جس طرح موت وحیات کی کشمکش اور نزع کے عالم میں مرنے والے کی کوئی مدد نہیں کر سکتا اور موت کے فرشتے ظالم کو جھڑکیاں دیتے ہوئے اسے اپنی جان نکالنے کا حکم دیتے ہیں حالانکہ جان نکالنا یعنی روح قبض کرنا مرنے والے کے اختیار میں نہیں یہ اختیار صرف اور صرف روح قبض کرنے والے فرشتہ کو دیا گیا۔ اس کے سوا کوئی کسی کی روح نہیں نکال سکتا۔ بیشک کوئی آگ میں چھلانگ لگائے یا دریا میں کود پڑے وہ وقت معین سے پہلے مر نہیں سکتا۔ جس طرح موت کی سختیاں اور نزع کی کربنا کیاں انسان کو کسی کی مدد اور سہارے کے بغیر ہی برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ ایسے ہی ہر انسان تن تنہا رب کبریا کی عدالت میں پیش ہوگا۔ وہاں نہ سفارشی ہوگا اور نہ ہی کوئی مددگار اور غم خوار قریب آئے گا۔ اس تصور کو یہ کہہ کر مزید واضح کیا گیا ہے کہ تم ایسے ہی اکیلے اکیلے اللہ تعالٰی کے حضور پیش ہونے والے ہو۔ جس طرح پیدائش کے وقت انسان اکیلا پیدا ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ تخلیق کے وقت انسان گناہوں سے پاک پیدا ہوتا ہے اور مرتے وقت انسان گناہوں کے انبار ساتھ لے کر جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو باور کرایا گیا ہے کہ جن سہاروں پہ تم تکیہ اور جن امیدوں کو سہارا بنائے ہوئے ہو۔ وہ سب کی سب دم توڑ جائیں گی اور اس وقت تمہارے اس طرح اوسان خطا ہوں گے کہ کوئی دنیا کے سہاروں کا تصور بھی نہیں کر سکے گا۔

(عَنْ عَاءِشَةَ قَالَتْ لَمَّا نَزَلَتْ وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ قَامَ رَسُولُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عَلَى الصَّفَا فَقَالَ يَا فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ يَا صَفِيَّةَ بِنْتَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ يَا بَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ لَا أَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْءًا سَلُونِي مِنْ مَالِي مَا شِءْتُمْ)[رواہ مسلم : کتاب الایمان، باب فی قولہ تعالیٰ وانذر عشیرتک الاقربین]

”حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں جب یہ آیت نازل ہوئی ”اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیے ”رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صفا پر کھڑے ہو کر فرمایا اے فاطمہ میری بیٹی، اے صفیہ بنت عبدالمطلب، اے عبدالمطلب کے خاندان کے لوگو ! میرے مال میں سے جو چاہو مانگ لو لیکن اللہ کے ہاں میں تمہارے کچھ کام نہیں آؤں گا۔“

(عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ (رض) عَنِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ إِنَّكُمْ مَحْشُورُونَ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا ثُمَّ قَرَأَ كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ وَأَوَّلُ مَنْ يُكْسٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِبْرَاهِيمُ وَإِنَّ أُنَاسًا مِنْ أَصْحَابِي يُؤْخَذُ بِهِمْ ذَاتَ الشِّمَالِ فَأَقُولُ أَصْحَابِي أَصْحَابِي فَيَقُولُ إِنَّهُمْ لَمْ يَزَالُوا مُرْتَدِّينَ عَلٰى أَعْقَابِهِمْ مُنْذُ فَارَقْتَهُمْ فَأَقُولُ كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي إِلٰى قَوْلِهِ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ)

[رواہ البخاری : کتاب احادیث الانبیاء، بَاب قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَاتَّخَذَ اللّٰهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلاً]

”حضرت عبداللہ بن عباس (رض) بیان کرتے ہیں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم لوگوں کو ننگے پاؤں، ننگے بدن، بغیر ختنوں کے اکٹھا کیا جائے گا پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی (كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِيْنَ) اور سب سے پہلے قیامت کے دن حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو لباس پہنایا جائے گا میری امت کے بائیں جانب کچھ لوگوں کو علیحدہ کردیا جائے گا میں کہوں گا میری امت میرے اصحاب کدھر گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ لوگ تو آپ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد دین سے پھر گئے تھے پھر میں اللہ کے نیک بندے عیسیٰ (علیہ السلام) کی طرح کہوں گا میں تو اس حد تک گواہ ہوں جب تک میں ان میں موجود تھا۔ جب تو نے مجھے فوت کرلیا وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي إِلٰى قَوْلِهِ الْعَزِيزُ الْحَكِيم “

(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لِكُلِّ نَبِيٍّ دَعْوَةٌ مُسْتَجَابَةٌ وَإِنِّي اخْتَبَأْتُ دَعْوَتِي شَفَاعَةً لِأُمَّتِي وَهِيَ نَاءِلَةٌ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ مَنْ مَاتَ مِنْهُمْ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْءًا)

[رواہ الترمذی : کتاب الدعوات عن رسول اللہ باب فضل لاحول ولا قوۃ الا باللہ]

”حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہر نبی کی ایک مقبول دعا ہوتی ہے اور میں نے وہ دعا اپنی امت کی سفارش کے لیے رکھی ہے۔ انشاء اللہ یہ ہر اس آدمی کو فائدہ دے گی جو شرک کی حالت میں فوت نہ ہوا ہوگا۔“

(تفسیر فہم القرآن ۔ میاں محمد جمیل القران)

اس آیت سے حسب ذیل سبق حاصل ہوتے ہیں

انسان کو دنیا میں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے اور اس کے احکام اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سیرت طیبہ کے مطابق زندگی بسر کرے اور اگر اس نے اپنی زندگی شیطان اور نفس کی پیروی میں گزار دی تو آخرت میں وہ بالکل یکہ و تنہا ناکام اور خائب و خاسر ہوگا 'جو انسان ساری عمر مال و دولت کے حصول میں سرگرداں رہا اور دنیا کی دلفریبیوں میں منہمک اور مشغول رہا اور اس نے نجات اخروی کی کوئی تیاری نہیں کی 'وہ شخص قیامت کے دن کف افسوس ملتا ہوا رہ جائے گا۔ جو شخص دنیا میں جھوٹی امیدوں سے وابستہ رہا اور باطل مذاہب کے ساتھ پیوستہ رہا 'قیامت کے دن جب اس پر ان جھوٹے خداؤں کا جھوٹ ظاہر ہوگا 'اس وقت اس کی آنکھوں کے سامنے سے فریب کا پردہ اتر جائے گا 'وہ سلامتی اور سچائی کی راہ پر واپس آنا چاہے گا لیکن اس وقت بہت دیر ہو چکی ہوگی۔

(تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

قبر و حشر کی تنہائی کے ساتھی بنانا عقلمندی ہے

یاد رہے کہ مرنے کے بعد انسان قبر میں اکیلا ہوگا اور دنیا کے مال و متاع، اہل و عیال، عزیز رشتہ دار اور دوست احباب میں سے کوئی بھی اس کے ساتھ قبر میں نہ جائے گا بلکہ یہ سب اسے قبر کے تاریک گڑھے میں تنہا اور اکیلا چھوڑ کر چلے جائیں گے، اسی طرح میدان حشر میں بھی انسان اس طرح اکیلا ہوگا کہ اس وقت اس کا ساتھ دینے کی بجائے ہر ایک اس سے بے نیاز ہو کر اپنے انجام کی فکر میں مبتلا ہوگا، یونہی بارگاہ الٰہی میں اپنے اعمال کا حساب دینے بھی یہ تنہا حاضر ہوگا لہٰذا دانائی یہی ہے کہ دنیا کی زندگی میں رہتے ہوئے اپنے ایسے ساتھی بنا لیے جائیں جو قبر کی وحشت انگیز تنہائی میں اُنسیّت اور غمخواری کا باعث ہوں اور قیامت کے دن نفسی نفسی کے ہولناک عالم میں تسکین کا سبب بنیں اور یہ ساتھی نیک اعمال ہیں جیسا کہ حضرت انس بن مالک (رض) سے روایت ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "میت کے ساتھ تین چیزیں جاتی ہیں، دو واپس لوٹ آتی ہیں اور ایک اس کے ساتھ باقی رہتی ہے، اس کے اہل و عیال، اس کا مال اور اس کا عمل اس کے ساتھ جاتے ہیں اور اس کے اہل و عیال اور اس کا مال واپس لوٹ آتے ہیں اور اس کا عمل باقی رہتا ہے۔

اس سے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مستثنیٰ ہیں آپ پہلے ہی مقام محمود پر فائز ہوں گے۔ ابراہیم (علیہ السلام) کے بعد تمام انبیاء، اولیاء و صلحاء اور مومنین کو لباس دیدیا جائے گا البتہ کفار بے لباس ہی رہیں گے۔ وَتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَاءَ ظُهُوْرِكُمْ۔ سے معلوم ہوا انسان کے ساتھ مال نہیں جائے گا اعمال جائیں گے۔ لہٰذا زیادہ توجہ مال کمانے پر نہیں اچھے اعمال کمانے پر رہنی چاہیے۔

کفار مکہ سمجھتے تھے کہ اللہ اکیلا نظام کائنات نہیں چلا سکتا بلکہ ان کے دوسرے (جھوٹے) خدا اس کی مدد کرتے ہیں۔ لہٰذا اگر قیامت نام کا کوئی دن آنے ہے تو ان کے دوسرے خدا انھیں اللہ سے بچالیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا رد کرتے ہوئے فرمایا اے منکرو! روز قیامت تمہارا اپنے جھوٹے خداؤں سے کوئی رابطہ نہ ہوگا وہ تم سے روپوش ہو جائیں گے، یعنی وہ جن کو تم سمجھتے ہو کہ وہ تمہاری تخلیق میں ہمارے شریک ہیں۔

حقیقت شرک کیا ہے؟

زَعَمۡتُمۡ اَنَّهُمۡ فِیۡكُمۡ شُرَكٰٓؤُا سے معلوم ہوا شرک کی حقیقت یہ ہے کہ غیر خدا کو اللہ کی ذات و صفات میں اللہ کے ساتھ شریک کیا جائے، یعنی جیسی اللہ کی ذات و صفات ہیں انھیں اسی طرح غیر خدا کے لیے مانا جائے جیسے کفار مکہ اپنے خداؤں کو اپنی تخلیق میں اللہ کے ساتھ شریک مانتے تھے۔ اسی لیے فرمایا گیا: اَنَّهُمۡ فِیۡكُمۡ شُرَكٰٓؤُا۔

اس کی مثال یوں ہے کہ آج ہندوؤں نے کئی خدا اور دیوتا بنا رکھے ہیں۔ کوئی بارش برسانے والا دیوتا، کوئی اولاد دینے والا، کوئی روزی دینے والا، چنانچہ بارش کے لیے وہ ایک دیوتا کے قدموں میں گرتے، اولاد کے لیے دوسرے کے آگے ماتھا رگڑتے ہیں اور دیگر مصائب کے لیے دوسرے دیوتاؤں سے فریاد کرتے ہیں۔ یہ ہے حقیقت شرک، کفار مکہ کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ ان کو جب دعوت توحید دی گئی تو انھوں نے کہا: اَجَعَلَ الۡاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۔اِنَّ هٰذَا لَشَیۡءٌ عُجَابٌ "اس نے (محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے) کئی خداؤں کی جگہ ایک خدا بنا لیا ہے، یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔" (ص۔5) گویا وہ سمجھتے تھے کہ اکیلا خدا سارے نظام کائنات کو نہیں چلا سکتا، لہٰذا چھوٹے خدا بڑے خدا کا کام آسان کرتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ یہ حقیقت شرک ہے۔

کوئی مسلمان حقیقت شرک میں مبتلا نہیں ہو سکتا

الحمد للہ کوئی مسلمان کسی نبی، ولی یا فرشتہ کے بارہ میں ایسا عقیدہ نہیں رکھتا۔ البتہ وہ ان کے وسیلہ سے اللہ سے مانگتے ہیں اور اگر وہ انھیں غائبانہ پکارتے ہیں تو صرف اس خیال سے کہ اللہ نے انھیں سننے کی طاقت دی ہے یا اللہ ان تک خبر پہنچاتا ہے اور وہ ہماری حالت پہ مطلع ہو کر ہمارے لیے اللہ سے دعاء کرتے ہیں اور اللہ سے ہماری مشکل حل کرواتے ہیں۔ اب اسے شرک کہنا فتنہ انگیزی کے سوا کچھ نہیں۔

علماء اہل حدیث میں سے مولانا وحید الزمان حیدر آبادی کہتے ہیں:

اما لو ظن احد بان سماع النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) او سماع علی او سماع احد من الاولیاء اوسع من سماع عامة الناس بحیث یشمل سائر اقطار الاقالیم وسائر اقطار الارض فھذا لا یکون شرکا لان اللہ تعالیٰ قد اعطی بعض الملائکة بل بعض الحیوانات سمعا وبصرا اقوی واوسع من سمع العامة وبصرھم۔ "اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، حضرت علی یا کوئی ولی تمام اطراف جہان و اقالیم ارض کی آوازیں سن سکتا ہے تو یہ شرک نہیں کیونکہ اللہ نے بعض ملائکہ بلکہ بعض حیوانات کو تمام انسانوں سے زیادہ سماعت و بصارت دے رکھی ہے۔" (ہدیۃ المہدی صفحہ 25 مطبع میور پریس دہلی)

(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

جناب علامہ ابو الحسنات سید محمد احمد قادریؒ نے مدعیان نبوت کاذبہ پر بڑی کمال کی تحقیق بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں:

چونکہ اس رکوع میں متنبّی اور مدعی کا تذکرہ آیا ہے۔

بنابریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر حالات عہد رسالت سے آج تک کے دعیان نبوت کے بیان کر دیئے جائیں تاکہ اس قسم کے فتنوں سے محفوظ رہ کر تمہارے ہم عصروں کو بھی متنبہ کردیں تاکہ وہ بھی ہوشیار رہیں اور اس موت سے بچیں۔

وھا انا اشرع فی المقصود بعون المعبود

یہ امر واضح رہنا چاہیے کہ ملت حنیف کی سب سے بڑی مصیبت وجود مدعیان نبوت ہے چنانچہ مخبر صادق (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی امت کو اپنے بعد آنے والے مفاسد و فتن کی اطلاع دی چنانچہ چودہ سو سال پہلے فرمایا۔

عن ثوبان (رض) انما اخاف علی امتی الائمۃ المضلین وانہ سیکون فی امتی کذأبون ثلاثون کلھم یزعم انہ نبی اللہ وانا خاتم النبیین لا نبی بعدی (مسلم شریف)

ترجمہ :۔ مجھے اپنی امت کے گمراہ کرنے والوں کی طرف سے خوف ہے اور میری امت میں تیس کذاب پیدا ہوں گے ہر ایک کا دعویٰ ہوگا کہ وہ اللہ کا نبی ہے اور میں نبیوں کا خاتم ہوں میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔

اس حدیث میں غالباً عدد و قلّت کے ساتھ تیس فرمایا کہ کم سے کم اتنے ضرور ہی نکلیں گے اور اس قسم کی کافی حدیثیں ہیں مختصراً ایک حدیث یہاں نقل کی گئی۔

ایسے مدعیوں کے متعلق اہل سنت و جماعت کا یہ عقیدہ ہے

دعوی النبوۃ بعد نبینا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کفر بالاجماع (شرح فقہ اکبر)

ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنا بالاجماع کفر ہے اور نبوت کا مدعی مرتد ہے۔ے

اس فتنہ کی ابتداء شیوع کہانت سے معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ پہلا فتنہ عہد رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں ابن صیاد مدنی سے شروع ہوا۔ اس کے متعلق اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدعی نبوت تھا مگر اس کے دست ضلال پرست پر کسی نے بیعت نہ کی۔ یہ منافقانہ طور پر مسلمان بھی ہوا مگر نبوت **مصطفی علیہ التحیۃ والثنا** کو **محدود فی الامیین** مانتا تھا۔

فاروق اعظم (رض) نے اس کے قتل کا ارادہ بھی کیا مگر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اگر یہ دجال ہے جس کا حال تمہیں بتایا گیا تو تم اسے قتل نہ کر سکو گے اس لیے کہ اس کی موت دست مسیح موعود میں ہے اور اگر یہ وہ نہیں تو اس کے قتل کا فائدہ نہیں جیسا کہ بخاری و مسلم میں مفصل بیان ہے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سے مکالمہ بھی فرمایا اور فیصلہ دیا کہ اس پر صدق و کذب مختلط ہے اور یہ خود بھی دجال ہونے کی بابت منکر تھا۔ یہ مقام حرہ میں جبکہ لشکر یزید اہل مدینہ پر غالب آیا اور وہیں مفقود ہو گیا۔

ا۔ دجال اکبر جس کے ظہور کا انتظار ہے

وہ حضرت تمیم داری (رض) کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کسی جزیرہ میں قید ہے اس کی مفصل حدیث مسلم شریف اور ابوداؤد میں ہے۔

۲۔ اسود عنسی

یہ شخص مدعی نبوت تھا اسود عنسی کا نام عبلہ بن کعب ہے لقب ذوالحمار ہے یمن کا رہنے والا تھا۔ مقام صنعاء میں رہائش پذیر تھا۔ اس نے کچھ کلام کلام آسمانی کے نام سے مرتب کرکے اپنے دام افتادہ افراد کو پیش کیا۔ ابن اثیر اور ابن خلدون میں ہے کہ اس کے کلام میں **والمائسات میسا والوارسات ورسا یحجون جمعاً وفرادی علی فلائص بیض وصفر** ۔ ابن اثیر اور یاقوت حموی میں بھی اس کے حالات ملتے ہیں۔ مخبر صادق طبیب حاذق حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے وصال سے دو دن قبل اس کے قتل کی خبر دے دی تھی اسے فیروز دیلمی نے قتل کرایا تھا اس کا فتنہ تین چار ماہ سے زیادہ نہ رہا۔

۳۔ طلیحہ اسدی

یہ طلیحہ بن خویلد اسدی قبیلہ بنی اسد کی طرف منسوب ہے۔ نواح خیبر میں آباد تھا۔ عہد رسالت میں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی یہ مرتد ہوا ۔ مقام سیما میں اقامت گزیں ہوا اور یہاں سے اپنی نبوت کا جال پھیلایا۔ چند دنوں میں ہزارہا اس کے حلقہ تزویر میں پھنس گئے۔ اس نے اپنی شریعت میں نماز کے اندر صرف قیام لازم کیا۔ رکوع وسجدہ حذف کردیئے گئے۔ اس نے اپنی نبوت کی دعوت بارگاہ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں اپنے چچازاد بھائی جبال یا حبال کے ہاتھ بھیجی اور مدینہ منورہ آکر اس نے وہ من وعن پہنچادیا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انھیں بددعادی۔

پھر اس سے جہاد ہوا۔ شجاعان اسلام نے مقابلہ کیا اور بدحواس ہو کر راہ ہزیمت اختیار کی اس لشکر کے سردار حضرت ضرار (رض) تھے۔ یہ فاتحانی سہرا سر پر لگا کر مدینہ منورہ آرہے تھے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات قیامت آیات ظہور پذیر ہو گئی۔

مختصر یہ کہ طلیحہ بن اسد اور غطفان کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہو گیا اور عہد فاروقی میں ملک شام سے حج کو آیا اور حضرت فاروق (رض) کے ہاتھ پر بیعت کی اس کی وحیوں میں سے ایک خود ساختہ وحی یہ بھی ہے۔ **والحمام والیمام والصرد والصوام قد ضمن قبلکم بالحوام یبلغن ملکنا العراق والشام** ۔ قسم ہے اہلی پرندوں اور جنگلی پرندوں اور ترمتی کی جو خشک زمین میں رہتی ہے کہ زمانہ ماضی میں سالہا سال سے یہ قرار پاچکا ہے کہ ہمارا ملک عراق اور شام تک وسعت پذیر ہوگا اور ابھی اسی قسم کی خرافات ہیں۔

۴۔ مسیلمہ کذاب

اس نے اپنی نبوت قبیلہ بنو حنیفہ میں شروع کی اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حضور ایک عریضہ لکھنے کی جرأت کر ڈالی وہ خط یہ تھا۔ **من مسیلمہ رسول اللہ الی محمد رسول اللہ اما بعد فانی قد اشرکت فی الامر او ان لنا نشف الامر ولقریش نصفھا ولکن قریشا قوم یعتدون** ۔ مسیلمہ کی طرف سے حضور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نام یہ عریضہ ہے معلوم ہو کہ میں امر نبوت میں آپ کا شریک ہوں۔ عرب کی سرزمین آدھی میری ہے اور آدھی قریش کی لیکن قوم قریش زیادتی کرتی ہے۔

اس کا جواب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بدیں الفاظ دے دیا۔ **من محمد رسول اللہ الی مسیلمہ الکذاب سلام علی من اتبع الھدی اما فان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین** ۔ اللہ کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے مسیلمہ کذاب کے نام پر سلام اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے معلوم ہو کہ زمین اللہ کی ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس کا مالک بنائے اور انجام کار متقیوں کا ہے۔

مسیلمہ کا عقائد آج کے متنبیّ قادیانی کے عقائد سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ تصریح کے لیے ائمہ تلبیس دیکھیں۔ اس کا کلام وحی بھی عجیب بند شوں کا حامل ہے۔ الفیل وما الفیل لہ ذنبو بیل و خرطوم طویل ۔ یاضفدع بنت ضفدع نقی ما تنقین اغلاك فی الماء واسفلك فی الطین۔

اس نے بڑے بڑے معرکے کئے حتی کہ حضرت وحشی (رض) کے ہاتھ سے نیزہ رکھا کر واصل جہنم ہوا مگر اس کی جماعت میں سجاح جیسے فتنہ پر ورا بھی باقی تھے۔ اس کے فریب سے فرصت پا کر بجرم ارتداد تمام بالغوں کے قتل کا فرمان امیر المومنین صدیق اکبر (رض) نے دیا اور اس طرح یہ فتنہ جنگ یمایمہ پر ختم ہو گیا۔

سجاح بنت حارث تمیمیہ

اس نے دعویٰ نبوت کرکے یمامہ پر چڑھائی کی تیاری کی۔ طول طویل داستان کا اختصار یہ ہے کہ مسیلمہ نے بجائے جنگ کرنے کے جنگل میں ایک خیمہ سجایا۔ معطر کرایا۔ سجاح کو پیام دیا کہ آپ اور میں علیحدہ گفتگوئے نبوت کرلیں اس کے بعد پھر جو مرضی ہو وہ کریں۔ غرض کہ تنہا خیمہ میں سجاح جب آ گئی تو اسے اپنی تازہ وحی سنائی اور کہا مجھ پر ابھی یہ وحی اتری ہے۔ الم ترکیف فعل ربک بالحبلی اخرج منھا نسمۃ تسعی۔ بین صفاق و حشی کیا تو نے اپنے رب کو نہ دیکھا وہ حاملہ عورتوں کے ساتھ کیا کرتا ہے ان سے چلتے پھرتے جاندار نکالتا ہے جھلیوں اور آنتوں سے پھر جب دیکھا کہ سجاح اس پر وحی کو برداشت کر گئی تو بولا مجھ پر یہ وحی بھی آئی ہے۔

ان اللہ خلق للنساء اقراجاً ۔ وجعل الرجال لھن ازواجاً ۔ فنولج فیھن ایلاجا ثم نخرج اذنشاء اخراجاً ۔ فینتجن لنا سخالا انتاجاً ۔ یہ گندی وحی بھی جب دیکھا کہ سجا برداشت کر گئی تو بد مستی میں یہ اشعار بکنے لگا۔

الا قومی الی المجدع فقد ھیئی لك المضجع

وان شئت فرشناك وان شئت علی اربع

وان شئت بتثلثۃ وان شئت بہ اجمع

غرض کہ پھر بستر عیش و نشاط گرم ہو گیا اور تین دن تک باہر نہ نکلے اور کیا کیا ہوا پھر حضرت خالد بن ولید (رض) کے لشکر سے گھبرا کر بھاگی آخر میں یہ مسلمان ہو گئی اور بصرہ میں مری حضرت سمرہ بن جندب (رض) نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ پھر مختار بن عبید ثقفی نے بھی دعویٰ نبوت کیا اور اہل بیت نبوت کے ساتھ آخر پوری دشمنی کی۔

پھر حارث کذاب دمشقی۔ اول اول نہایت عابد مرتاض رہا مگر بغیر اتباع مرشد خود روہی رہا۔ جب اسے خلیفہ عبد الملک (رح) کے پیش کیا تو منجملہ عجائب و غرائب کمالات کے یہ کمال وہاں بھی ظاہر ہوا کہ اس سے خلیفہ نے پوچھا کیا تو نبی ہے؟ کہا ہاں میں خدا کا نبی ہوں۔ عبد الملک (رح) نے دمشق کے ایک قوی نوجوان کو یہ حکم دیا کہ اس کے نیزہ مار اس نے نیزہ مارا مگر حارث پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ درباری لوگ کچھ عقیدہ کی طرف جھکنے لگے عبد الملک (رح) نے کہا تم نے نیزہ بسم اللہ پڑھ کر نہ مارا اب بسم اللہ پڑھو اور مارو چنانچہ ایسا ہی کیا گیا وہ زخمی ہوا اور مر گیا یہ واقعہ ۶۵ھ کا ہے۔

پھر مغیرہ عجلی۔اس نے۔اول دعویٰ امامت کیا پھر مدعی نبوت ہو کر احیاء موتی اور غیب دانی ظاہر کرتا ہوا ۱۱۹ھ میں بحکم خالد بن عبداللہ قسری جو خلیفہ عبدالملک رحمہم اللہ کی طرف سے عراق کا امیر مقرر تھا اسے گرفتار کیا۔اس کے ساتھ چند اس کے خاص حواری پکڑے گئے اور مٹی کا تیل سرکنڈوں پر ڈلوا کر اسے جلادیا۔

اس طرح بینا بن سمعان تمیمی اس کے زمانہ میں پیدا ہوا اور ہنود کی طرح اس نے تناسخ اور حلول کے عقیدوں کو رواج دیا اور حاکم کوفہ نے اسے بھی جلوادیا۔ابو منصور عجلی اس کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ قیامت تک نبی آتے رہیں گے غالباً مرزائیوں نے اس سے یہ عقیدہ لیا ہے یہ بھی سولی دیا گیا۔

صالح بن طریف بر غواطبّی یہودی تھا۔آل اس کے ایک قلعہ میں پیدا ہوا۔شاعری سیکھی اور ایک وحشی قوم میں اپنے جادو کے کرتوت دکھا کر نبی بنا اپنے اوپر قرآن اترنے کا دعویٰ کیا آخر سنتالیس سال تک اپنا دعوت نبوت رائج کرکے پھر عزت نشین ہوگیا اور اس کے بیٹے اور پوتے وصیت کے موافق باپ کی نبوت کو رواج دیتے رہے غرضیکہ ۳۶۹ھ میں یہ ساری سلطنت غارت ہوئی۔پھر بہافریہ روزانی نیشاپوری نکلا اور آخر قتل ہوا۔پھر اسحاق اخرس مغربی اصفہان پہنچ کر کامل دس سال تک گونگا رہا اول تمام علوم میں مہارت حاصل کی۔شعبدہ بازی وغیرہ میں کمال حاصل کیا۔اصفہان کے ایک عربی مدرسہ کے پاس ٹھہرا گونگا مشہور ہوچکا تھا کہ کامل دس سال کے بعد پچھلی شب چیخنا شروع کردیا آواز سن کر چاروں طرف سے مدرسہ کے طلبہ ومدرسین جمع ہوگئے تو پھر نماز شروع کردی اور قرآن کریم تجوید سے ایسا پڑھا کہ سننے والے حیران رہ گئے۔شدہ شدہ تمام شہر میں شہرہ ہوگیا۔قاضی شہر سے ملاقات ہوئی انھوں نے حالات معلوم کرنے چاہیں اسحاق نے کہا تمام حالات تو کہنے کی ممانعت ہے مختصراً عرض کرتا ہوں۔

کہ آج رات دوفرشتے حوض کوثر سے پانی لے کر میرے پاس آئے مجھے غسل دیا اور کہنے لگے السلام علیك یانبی اللہ میں نے جواب میں تامل کیا اور گھبرایا کہ ایک فرشتہ کہنے لگا یانبی اللہ افتح فاك بسم اللہ الازلی میں نے منہ کھوڑ دیا۔فرشتہ نے ایک سفید سی چیز میرے منہ میں ڈالی جو شہد سے زیادہ شریں مشک سے زیادہ معطر تھی۔اس کا میرے حلق میں اترنا تھا کہ میں گویا ہوگیا۔میرے منہ سے یہ کلمہ جاری ہوگیا۔

اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا رسول اللہ

فرشتوں نے کہا آپ بھی نبی ہیں میں نے چیخ کر کہا یہ کیونکر ممکن ہے حضور خاتم النبیین ہیں تو فرشتوں نے کہا۔جیسے حضرت ہارون (علیہ السلام) غیر شرعی اور تابعی نبی تھے اسی طرح آپ بھی ظلی بروزی نبی بنائے گئے ہیں۔غرضیکہ یہ فتنہ ابو جعفر عباسی کے زمانہ میں پیدا ہوا اس کا عمل دخل بصرہ اور عمان تک ہوگیا اور آخر مارا گیا۔اس کے بعد استاد سیس خراسانی کا فتنہ ظاہر ہوا۔اسلامی سیاست کی باگ ڈور اس زمانہ میں خلیفہ ابو جعفر منور عباسی کے ہاتھ میں تھی۔ہرات سے سجستان،خراستان میں استاد سیس نے اپنی استادی ظاہر کی اور نبوت کا دعویٰ کردیا۔نبوت کا دعویٰ اتنا بارآور ہوا کہ چند سال میں اس کے پیرو تین لاکھ تک ہوگئے اور اپنی جمعیت کے بل بوتے پر ملک گیری کا خطبہ پیدا ہوا۔مختصر یہ کہ خراسان کا کثیر علاقہ اس کے قبضہ میں آگیا۔خلیفہ منصور کی فوجیں اس کی جمعیت سے پیہم ہزیمت پا کر پسپا ہوچکی تھیں۔مختصر یہ کہ ایک زبردست جنگ کے بعد سیس اپنے بیٹوں سمیت گرفتار ہوا۔

۱۴۔پھر ابو عیسیٰ اسحاق اصفہانی۔۱۵۔حکیم مقطع خراسانی

۱۶۔ عبداللہ مہجون اہوازی ۱۷۔ پھر بابک بن عبداللہ حزمی

۱۸۔ احمد بن کتال بلخی ۱۹۔ یحیٰی بن فارس ساباطی

۲۰۔ علی بن محمد خارجی ۲۱ اور حمدان بن اشعت قرمطی

۲۲۔ ابو سعید حسن بن بہرام جنابی قرمط ۲۳۔ ذکرویہ بن ماہر قرمطی

۲۴۔ یحیٰی بن زکرویہ قرطمی ۲۵۔ حسین بن زکرویہ صاحب الشام

۲۶۔ ابو طاہر قرمطی ۲۹۔ حامیم بن من اللہ مح کسی

۳۰۔ محمد بن علی شلغمانی ۳۱۔ عبدالعزیز باسیندی

۳۲۔ ابو الطیب احمد بن حسین ۳۳۔ ابو علی منصور

۳۴۔ اصغر بن ابو الحسین تغلبی ۳۵۔ ابو عبداللہ بن ہشام ضمیری

۳۶۔ حسن بن صباح حمیری

یہ شخص حسن بن صباح) مہبط وحی ہونے اور خدا عزوجل کیا حکام بلاواسطہ پانے کا مدعی ہونے کے علاوہ ایسے خوفناک فرقہ کا بانی تھا جس کی خوفناک خفیہ سازشوں اور جان ستانیوں کا تصور بدن پر لرزہ طاری کر دیتا ہے لہٰذا اس کا مختصر حال لکھنا ضروری متصور ہوا۔ یہ خبیث شہر سوط علاقہ خراسان میں پیدا ہوا۔

۴۶۵ھ میں نیشاپور آیا یہاں کے استاد بھائی نظام الملک تھے ان سے ملا۔ وزیر اعظم سلطان الپ ارسلاں سلجوقی کے تھے۔ انھوں نے دربار سلطان الپ ارسلاں سلجوقی تک پہنچایا اور اسے معتمدین خاص کا عہدہ دلایا۔ چند روز میں اس نے رسوخ حاصل کر کے اپنے محسن نظام الملک کی جڑیں کھودنے کی سعی بے حاصل کی۔ مختصر یہ کہ حسن بن صباح بہت سی چالوں کے بعد دربار شاہی سے نکال دیا گیا۔

پھر یہ اصفہان آیا اور یہاں اس قلعہ الموت میں جو شہر قزوین اور دریائے خزر کے مابین واقع ہے میں آ کر مذہب اسماعیل کی تبلیغ شروع کی اور اپنے ریاکارانہ زہد اور اتقاء کا سکہ جما کر ہزار ہا لوگ اپنے تابع کر لیے جب حاکم علاقہ کو اس کا علم ہوا تو رات کے وقت قلعہ سے ایک دستہ نکلا اور حسن بن صباح کو حراست میں لے کر قلعہ کے اندر بند کر دیا۔ لیکن حسن بن صباح قلعہ میں داخل ہوتے ہی ایسی چال چلا۔

کہ حاکم قلعہ جسے مہدی علوی کہتے تھے قلعہ الموت سے بالکل بےدخل ہو گیا وہ چال یہ چلی کہ یہ سرزمین جعفری نام کے ایک امیر کے زیر حکومت تھی جس نے ایک علوی کو اپنی نیابت پر سرفراز کر رکھا تھا۔ ابن صباح نے مہدی علوی سے کہا کہ دوسرے شخص کی مملوکہ زمین پر عبادت جائز نہیں اور یہ مقام گوشہ عافیت میں ہے اس وجہ میں مجھے بہت مرغوب ہے۔

اس لیے درخواست ہے کہ عبادت کے لیے اس قلعہ کی اتنی زمین میرے نام بیع کر دو جس پر بیل کا ایک چرسہ محیط ہو سکے میں اس کے عوض تین ہزار دینار سرخ آپ کی نذر کر دوں گا۔ وہ شخص طبع نفسانی سے ابن صباح کے دام تزویر میں آ گیا اور ابن صباح کو اتنی زمین دینے کا اقرار کر لیا حتیٰ کہ بیع نامہ کی تکمیل کر دی۔

ابن صباح نے بیل کی ایک کھال منگا کر اس کا نہایت باریک تسمہ کاٹا اور اس کو ایک حلقہ کی شکل دی جس سے سارا قلعہ احاطہ میں آ گیا۔ قلعہ دار یہ پیمائش دیکھ کر بولا تم نے مجھ سے نماز کے لیے جگہ مانگی تھی اور اس کے لیے ایک چرسہ بیل کی کھال کا کہا تھا۔ ابن صباح نے کہا چرسہ کھال

سے میری مراد یہی تھی کہ جتنی جگہ چرسہ محیط ہوسکے وہ سب اس بیع میں داخل ہے اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اتنی رقم گزڈیڑھ گز زمین کی ادا کرنے والا کوئی بڑا ہی بیوقوف ہوسکتا ہے۔

اس میں جھگڑا بڑھا لیکن ابن صباح کے مرید قلعہ کے بہت سے سپاہی بھی ہوچکے تھے سب تائید کو کھڑے ہوگئے اور قلعہ دار سے کہنے لگے کہ اتنی بزرگ ہستی کبھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔ یہ سودا بہر حال تمام قلعہ کا ہوا ہوگا۔ آخرش یہ قلعہ ابن صباح کے قبضہ میں آگیا۔ اس قلعہ پر قبضہ کرلینے کے بعد اس نے اپنا خطاب شیخ الجبل کرلیا۔ اور اپنے معتقدوں کے ذریعہ اپنا پراپیگنڈہ شروع کردیا اور ایک ایسی جماعت بنائی جو اس کے اشارہ پر جاں سپاری کے لیے ہر لمحہ آمادہ ہے۔ قلعہ الموت کے ارد گرد نظر فریب مرغزاروں کے علاوہ۔

دیدہ زیب سیرگاہیں بنائیں۔ وہاں محل رخ کو شکلیں تعمیر کرائیں عالیشان محل نہایت موزونیت سے تعمیر اکرئے ان کے بیچ میں ایک باغ لگایا جس کا نام جنت رکھا اور اس میں وہ تمام سامان مہیا کئے جو ایک انسان کے لیے موجب دلآویزی اور باعث تفریح ہوں اشیاء بدیعہ ہر قسم کے میوہ دار درخت گلگشت کے لیے اعلیٰ پھلواری۔ چینی کے نفیس ظروف، بلوری، طلائی، نقری، سامان فرش فروش، پھر انسانی تعیش کے لیے مزامیر، چھنگ ور باب، دودھ، شربت کی نہریں، شراب و شہد نلوں کے ذریعہ ان نہروں میں پہنچایا جاتا۔ پھر وہاں کمسن ماشوپری تمثال نازنینیں رکھیں۔ غرضیکہ دل لبھانے اور جنت کے تمام افسانے مہیا کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزداشت نہ کیا۔

دوسرا گروہ ان رفقاء کا بنایا جو حسن بن صباح کے ساتھ رہتا۔ تیرا گروہ فدائیوں کا تیار کیا۔ ان کو سفید پوشاک۔ سرخ دستار اور پٹ کہ۔ ہاتھ میں تیر یا چھری۔ بھنگ اس وقت تک ایک نامعلوم چیز تھی۔

حسن بن صباح نے اسے معلوم کیا اور جسے اپنی فدائی جماعت میں داخل کرتا اسے بھنگ گھوٹ کر پلاتا پھر اسی مدہوشی میں اسے جنت پہنچاتا۔ جب اسے ہوش آتا تو وہ اپنے کو مہوشوں کی گود میں پاتا۔ چند دن اسے وہاں رنگ رلیاں منانے کو چھوڑتا۔ پھر بھنگ گھوٹ کر پلوادیا جاتا اور اسی مدہوشی میں اسے واپس منگوالیتا۔ جب اسے ہوش آتا تو اسے عیش آباد کی یاد ستاتی۔ انھیں بلی کا گوشت کھلایا جاتا تھا تاکہ یہ بلی کی طرح غضب و غصہ کے وقت آپے سے باہر ہو کر حملہ کریں۔ غرضیکہ اہل بیت اطہار اور اسلام کے فدائیوں کی سخت مخالفت کی۔ مساجد کو جلایا اور سخت فتنہ برپا کرکے ۹۰ سال کی عمر میں مرگیا۔ پینتیس سال الموت کے قلعہ پر نہایت کامیاب حکومت کی۔ اس کے جانشین اس کی موت کے بعد سات کے قریب ہوئے۔

ایک سو چھتیس سال یعنی ۶۵۴ھ تک ان کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ سات جانشینوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ کیا بزرگ امیہ۔ ۲۔ محمد بن کیا بزرگ امیہ۔ ۳۔ حسن بن محمد معروف بہ حسن ثانی۔ ۴۔ محمد ثانی بن حسن۔ ۵۔ جلال۔ ۶۔ علاء والدین محمد ثالث۔ ۷۔ رکن الدین خورشید شاہ

اس کے بعد رشید الدین ابوالحشر نبی بننے کو اٹھا۔ پھر محمد بن عبداللہ بن تومرت حسنی اٹھا۔ یہ مہدویت کا مدعی تھا۔ فتوحات کرتے کرتے آخر اس نے اپنی موت کی خبر دی اور حسب پیشگوئی مرگیا۔ اس کا جانشین عبدالمومن ہوا۔ ابن زکریا طمامی نبوت سے بھی آگے بڑھا اور خدائی کا دعویٰ کرکے مرگیا۔ حسین بن حمدان خصیبی نے بھی دعویٰ نبوت کیا۔

ابوالقاسم احمد بن قسی علی بن شمیم محمود واحد گیلانی عبدالحق بن سبعین مرسی

احمد بن عبداللہ منثم عبداللہ بن راعی شالی عبدالعزیز طرابلسی اویس رومی

احمد بن ہلال حسانی سید محمد جونپوری حاجی محمد فرہی جلال الدین اکبر شاہ

جلال الدین اکبر کے مختصر حالات

یہ ۹۴۹ھ سندھ کے ریگستان امر کوٹ میں پیدا ہوا اس کا باپ سلطان نصیر الدین ہمایوں بادشاہ شیر شاہ کے ہاتھوں آوارہ دشت غربت تھا۔ ہمایوں تو ایران چلا گیا اور اپنے بیٹے اکبر کو ایک سال کی عمر میں اپنے بھائی عسکری مرزا حاکم قید ہار کے سپرد کر گیا۔ اکبر بارہ سال چار ماہ کا تھا۔ پھر ۹۶۳ھ میں ہمایوں نے دہلی میں کوٹھے سے گر کر داعی اجل کو لبیک کہا تو اکبر تخت نشین ہوا۔ اس وقت اکبر کی عمر تیرہ سال نو ماہ تھی۔ ایام طفلی میں اکبر کی تعلیم کا کوئی انتظام ہی نہ ہو سکا تھا اور وہ اسی جہالت میں سخت پر متمکن ہوا۔ اکبر تقریباً اکاون سال تک سریر حکومت پر متمکن رہا ۔ تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر کا ابتدائی دور انیس سال تک تو اتباع اسلام پر تھا۔ اور اس کے بعد کا دوسرا دور بائیس سال گمراہی کے دورہ میں گزرا۔ حتیٰ کہ دور گمراہی میں نبوت و مہدویت تک دعاوی کئے۔ علماء اسلام پر سخت تشدد ہوئے والعیاذ باللہ۔ سید محمد نور بخش جونپوری یہ اول اولیائے مغلوب الحال میں سے تھے۔ ایک روز بحالت استغراق آواز سنی۔

انت مھدی

تو مہدی ہے۔ پس اس پر اسے یقین ہوا۔ اور دعویٰ مہدیت کر ڈالا۔ اسی حال میں مر گئے۔ بایزید روشن جالندھری۔ یہ بھی نبوت کا مدعی تھا۔

احمد بن عبداللہ سلجماسی احمد بن علی محیرتی محمد مہدی ازم کی سیاتائی سیہوی

محمد بن عبداللہ کرد میر محمد حسین مشہدی مرزا علی محمد باب شیرازی زریں تاج قرۃ العین

یہ ایک عورت عجوبہ روزگار پیدا ہوئی اس کا کچھ حال نذر ناظرین کرتا ہوں۔ اس کے باپ حاجی ملا صالح قزوینی مشہور شیعی عالم تھے۔ انھوں نے اسکا نام زریں تاج رکھا۔ گھر ہی میں حدیث۔ تفسیر۔ فقہ پڑھی۔ اس کے علاوہ الٰہیات و فلسفہ میں بھی اعلیٰ دستگاہ حاصل کی۔ جوان ہوئی۔ شادی اس کے حقیقی چچا مجتہد ملا محمد تقی کے بیٹے ملا محمد کے ساتھ ہوئی یہ بھی جوان صالح اور علوم و فنون میں متبحر عالم تھے۔

زریں تاج نے علی محمد باب کے حالات اپنے خاوند سے خفیہ سنے اور اس نے علی محمد باب کو خفیہ طور پر ایک خط لکھا۔ باب نے اس کا جواب دیا۔ نہ معلوم اس میں کیا جادو کی پڑیا تھی کہ نادیہ فریفتہ ہو گئی اور علی محمد باب پر ایمان لے آئی۔ زریں تاج نے اپنی بابت اپنے تعلقات مخفی رکھے اور علی محمد سے خط وکتابت بھی پوشیدہ ہوتی رہی۔ جب باب نے اندازہ کر لیا کہ یہ بحث و مناظرہ میں طاق و مشتاق ہے اور اس سے کام چلے گا۔ زریں تاج کو لکھ دیا کہ اب تم ملت بابیہ کی تبلیغ کرو اور اس کے ساتھ زریں تاج کو خطاب قرۃ العین دے دیا۔

یہ اپنی ہٹ کی پختہ تھی۔ بابیت میں اتنی سخت نکلی کہ اس نے بابیت کے مقابلہ میں عیال مال و منال سب کو لات مار دی۔ قرۃ العین کے تبلیغی فرائض کی ادائیگی اول گھر سے شروع ہوئی۔ مختصر یہ کہ خاوند کو چھوڑا۔ خسر پر کفر کا فتویٰ جڑا۔ طلاق ہوئی اور یہ یہاں سے نکل کر کربلا پہنچ گئی۔ وہاں مجلس درس قائم کی۔ بڑا اجتماع ہوتا رہا۔ پردہ کی پابند تھی۔ پھر کربلا سے بغداد پہنچی۔ وہاں سے نکلی تو کرمان اور ہمدان جاتے ہوئے بہت سے لوگوں کو بابی بنالیا۔ اس کے صلہ میں علی محمد باب نے اسے طاہرہ کا خطاب دیا۔ غرضیکہ تبلیغ مابیت میں زریں تاج۔ قرۃ العین۔ طاہرہ نے مصیبتیں بھی اٹھائیں۔ راستہ میں ڈاکوؤں سے ٹکر ہوئی کپڑے اتار دیئے گئے۔ پھر اس عورت نے حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا (رض) کا منظر بننے کا دعویٰ کیا۔ پھر علی محمد باب کی منقبت میں اس نے نہ معلوم کیا کیا لکھا۔ اس کے دو قصیدے جو ملے ان کا مخلص یہ ہے۔

نفحات وصلک اوقدت جرعات شوقک فی الحشا

زعمت بہ سینہ کم آتشے کہ نہ زد زمانہ کماتشاء
جذبات شوقک الجمت بسلاسل الغم والبلا
ہمہ عاشقان شکستہ دل کہ دہند جاں خود برملا
لمعات وجھک اشرقت و شعاع طلعتک اعتلا
زچہ روالست بربکم نہ زنی بزن کہ بلی بلی
چہ شود کہ آتش حیرتے بزنی بلقلہ طور دل
فصبکتہ ودکتہ متدکا متزلزلا
اگرآں صنم زدہ ستم پئے کشتن من بے گناہ
لقد استقام بسیفہ فلقد رضیت بمارضی
چوں شنید نالہ مرگ من پئے ساز من پئے برگ من
فمشی الی مھرولا وبکی علی مجلجلا
بحر الوجود تموجت لعل الشھود توجلت
صعق الحمود تلجلجت بلقاہ متجملاً
سحراں نگار ستمگرم۔ قدمے نہادہ بہ بسترم
واذارایت جمالہ طلع الصباح کانما
بگزار منزل ماومن۔ بہ گزین بہ ملک فناوطن
فاذافعلت بمثل ذافلقد بلغت بماتشاء
ہمہ اہل مسجد وصومعہ پئے ورد صبح ودعائے شب
من وذکر وطرہ طلعت تو من الغداۃ الی العشا

قصیدۂ دیگر

گر بتو افتادم نظر چہرہ بہ چہرہ روبرو شرح دہم غم ترا نکتہ بنکتہ مو بمو
از پئے دیدن رخت جاں ہمچو صبا افتادہ ام خانہ بخانہ دربدر کوچہ بکوچہ کو بکو
دور دہان تنگ تو عارض عنبرین خطت غنچہ بغنچہ گل بہ گل لالہ بہ لالہ بو بہ بو
میرود از فراق تو خون دل از دو دیدہ ام دجلہ بدجلہ یم بہ یم چشمہ چشمہ جو بہ جو
مہر ترا دل حزیں باختہ بر قماش جان رشتہ برشتہ نخ بہ نخ تار بہ تار زپو بہ پو
در دل خویش طاہرہ گشت نیافت جز ترا صفحہ بہ صفحہ لا بہ لا۔ پردہ بہ پردہ۔ تو بہ تو

قرۃ العین کی عبرت ناک موت

بعض کا بیان ہے اس کا گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کی زلفیں کاٹ کر سر کے بیچ کے بال ایک خچر کی دم سے باندھے اور دار القضاء تک اس طرح لائی گئی پھر اسے زندہ جلایا گیا۔ غرضیکہ مختلف روایات ہیں خسر الدنیا والاخرۃ

اس کے بعد شیخ بھیک اور شیخ محمد خراسانی مسیحیان کاذب پیدا ہوئے۔ پھر مومن خاں اچی یہ بھی بابی فرقہ کا مبلغ بنا۔ مرزا یحییٰ نوری معروف بہ صبح ازل یہ بھی بابی فرقہ کا مسند نشین ہوا۔ پھر بہاء اللہ نوری مازندران میں بابی تھا اس نے خدا کا اوتار ہونے کا دعویٰ کیا اور چند بابیوں کے بعد۔ محمد احمد مہدی سوڈانی کو بھی اسی فتنہ پرور جماعت میں بتایا جاتا ہے۔ بہرحال اس سے بھی فتنہ مہدویت زوروں پر رہا۔ انگریزوں نے اسے مہدی قرار دے کر اس کی لاش نکال کر جلائی اس کا مقبرہ توپوں سے اڑایا اور کیا کیا ہوا۔ اس سب کے بعد قادیاں ضلع گورداسپور تحصیل بٹالہ میں۔

وہ ہوں جس کا تخت سب سے اوپر بچھایا گیا میں وہ ہوں جس سے خدا نے بیعت کی۔

بقول شخصے

یوں تو مہید بھی ہو عیسیٰ بھی سلمان بھی ہو تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

مرزا غلام احمد حکیم غلام مرتضی کا بیٹا خاندان مغلیہ سے تھا یہ اٹھارہ سو انتالیس یا چالیس میں قادیاں میں پیدا ہوا۔ اس کے تعلیمی مبلغ کا یہ حال تھا کہ چھ سات سال کی عمر میں قرآن ناظرہ کیا۔ اس کے بعد کچھ فارسی پڑھی تیرہ چودہ سال کی عمر میں اس کی شادی اس کے حقیقی ماموں کی بیٹی حرمت بی بی سے ہوئی جن سے مرزا سلطان احمد پیدا ہوئے۔ یہی وہ حرمت بی بی ہے جو مطلقہ رکھی گئی اور خان بہادر مرزا سلطان احمد کی والدہ کے نام سے مشہور ہیں۔

مرزا صاحب کی بساط تعلیم نہایت مختصر تھی۔ پھر سیالکوٹ میں لالہ بھیم سین کی سفارش سے ضلع کچہری میں دس پندرہ روپیہ ماہوار کے ملازم ہو گئے۔ لالہ بھیم سین اور مرزا صاحب نے مل کر مختاری کے امتحان کی تیاری کی۔ لالہ بھیم سین تو امتحان میں کامیاب ہو گئے اور مرزا صاحب رہ گئے اور فیل شدہ لوگوں میں ان کا نام آیا۔ پھر انھیں اس امر کی فکر ہوئی کہ خاندان کا زوال ہو چکا ہے وہ واپس عروج پائے۔ جب کوئی بھی راہ عروج ترقی کی نہ ملی تو پیری مریدی کی طرف توجہ دی۔ مگر اس میں بھی کوئی کامیابی نظر نہ آئی۔

آخر مولوی محمد حسین بٹالوی ان کے بچپن کے رفیق دہلی سے حدیث پڑھ کر آئے تھے ان سے ملے اور رد آریہ میں ایک کتاب لکھنے کا خیال ظاہر کیا۔ مولوی محمد حسین بٹالوی نے اس خیال کی تائید کی۔ قصہ مختصر آریوں کے ساتھ اس کے دنگل شروع ہو گئے۔ عامۃالناس لاہور میں اس کی حمایت واعانت کرتے رہے۔ آخر یہ قادیاں چلے آئے اور یہاں سے آریوں کو بذریعہ اشہارات۔ چھیڑتے رہے اور جب مناظرہ چیلنج آریہ دیتے تو بلطائف الحیل ٹالتا رہا یہ تمام حالات و کوائف مرزا جی کے مجموعہ اشہارات موسومہ بہ تبلیغ رسالت کی جلد اول میں مفصل ملیں گے۔ پھر مرزا صاحب نے الہام بازی میں قدم رکھا اور اپنے ملہم و مستجاب الدعوات ہونے کا پراپیگنڈا شروع کیا۔ اس کے بعد براہین احمدیہ کی تبلیغ شروع کر دی۔

اس کا اعلان ہونے پر دھڑا دھڑا روپیہ آنا شروعوا۔ اول اس کی قیمت پانچ روپیہ رکھی گئی پھر نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز کی سوجھی اور دس روپیہ قیمت کر دی گئی اور پھر اعلان عام کر دیا گیا۔ کہ ۵۶۲ صفحات تو شائع ہو چکے ہیں۔ باقی کا اللہ تعالیٰ متولی و مہتمم ہو گیا یہ کتاب چار ہزار آٹھ سو صفحات کی ہوگی۔ پھر اسے تو سردست ملتوی کر دیا گیا۔ اور اس کی بجائے "سرمہ چشم آریہ "اور رسالہ "سراج منیر "وغیرہ چھاپنی شروعکر دیں

اور اعلان کر دیا کہ تین سو جزو کے وعدے پورے نہیں کئے جا سکتے۔ پھر دعویٰ مجددی تشروع ہوا۔ اس سلسلہ میں حکیم نور دین آملے اور اشتہار بازی میں ترقی ہو گئی۔ پھر ہوشیار پور میں چلہ کشی ہوئی اور اس میں ایک لڑکا پیدا ہونے کی ان کو بشارت ملی۔ مرزا جی کو چونکہ یقین واثق تھا ۔اسی وجہ میں انھوں نے اعلان عام کر دیا۔ ان ایام میں نصرت بیگم حاملہ بھی تھیں۔ لیکن تاریخ ولادت جس دن پوری ہوئی تو لڑکے کی بجائے لڑکی آئی۔ تمام قادیاں میں اس ولادت سے ناکامی کی آوازیں آنے لگیں۔ آخر ش دوسرے حمل میں لڑکا پیدا ہو گیا۔ پھر کیا تھا۔ مرزا صاحب نے ڈھنڈورا پیٹا کہ جس کی ولادت کی میں پیشگوئی کر رہا تھا وہ آج ۷ اگست ۱۸۸۷ء کو پیدا ہو گیا۔ یہ بچہ ایسا ہو گا ویسا ہو گا اور کیا ہو گا اس کا نام عنموائیل عرف بشر حسب الہام رکھا گیا۔

اس پر عام طور پر مذاق اڑائے وہ اڑے کہ اسی حالت میں مرزا صاحب نے مسیح بننے کی سخن سازی شروع کر دی۔ پھر لاہور۔ لدھیانہ۔ دہلی میں مناظرے ہوئے۔ ان کا انجام جو ہونا تھا وہ ہوا۔ کہ محمد بیگم سے نکاح آسمانی کا اعلان ہوا۔ اس کا قصہ بھی طویل ہے۔ مختصر یہ کہ مرزا صاحب اس نکاح میں ناکام رہے۔ اگرچہ اس نکاح پر مرزا صاحب کو **الحق من ربك فلا تكونن من الممترين**۔ کی وحی بھی ہو چکی تھی۔ غرضیکہ پھر آتھم سے مناظرہ کی ٹھہری۔ مولوی محمد حسین بٹالوی نے جا کر جنڈیالہ والوں کو کہا کہ مرزا صاحب میں اتنی قابلیت نہیں مگر جنڈیالہ والے نہ مانے اور مرزا جی ہی کو انھوں نے مناظرہ تجویز کیا۔ آخر نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کو شرمندگی اٹھانی پڑی۔ آخر مرزا صاحب نے پندرہ مہینے میں آتھم کی ہلاکت کی پیشگوئی کی وہ بھی غلط ہوئی۔ پھر پنڈت لیکھرام کا قتل ہوا اسے بھی مرزا جی نے اپنی کسی پیشگوئی کا نتیجہ لکھ مارا۔

پھر حضرت شیخ المشائخ فاضل اجل عالم نے بے بدل صوفی صافی پیر طریقت حامی شریعت حضرت پیر سید مہر علی شاہ صاحب (رح) کو دعوت مبارزت دے ماری۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت نے "شمس الہدایۃ تالیف فرمائی تھی جس میں حیات مسیح پر وہ دلائل قاہرہ تھے کہ اس کے مطالعہ کے بعد حیات مسیح پر کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ آخر ش مرزا صاحب کے وعدہ پر حضرت پیر صاحب (رح) لاہور تشریف لائے اور شاہی مسجد میں برائے مناظرہ جا رہے تھے۔ کہ راستہ میں جلی قلم کے چھپے ہوئے پوسٹر دیواروں پر چسپاں دیکھے گئے تھے کہ جن کا عنوان اس طرح تھا۔

پیر مہر علی کا فرار

لوگ حیران تھے کہ پیر صاحب کہ ہم بچشم خود میدان مناظر ہمیں تشریف لے جاتا دیکھ رہے ہیں۔ ان کے متعلق یہ کیا دروے باقی ہو رہی ہے۔ غرضیکہ ۲۹ اگست کو پیر صاحب واپس تشریف لے آئے۔ پھر مرزا جی کی طرف سے انواع واقسام کی اشتہار بازی ہوتی رہی۔ مختصر یہ کہ ان کی عربی دانی کی حقیقت منکشف عوام ہوئی۔ شاعری کی شان یہ تھی کہ شعر ملاحظہ کریں۔

کرم خاکی ہوں نہ میں پیارے نہ آدم زاد ہوں بشر کی جائے نفرت اور انسانوں کی عار

مضمون طویل ہو گیا اور یہ رام کہانی ابھی پوری نہ ہوئی۔ بہر حال اس کے فتنہ نے آج پاکستان بن جانے کے بعد بھی ان لوگوں کو ہزارہا کی تعداد میں اسیر دام حکومت کر دیا جو حق نوش اور حق نیوش تھے۔ اس سلسلے میں بھی ایک سال کی نظر بندی کا شکار ہوا اور دیگر علمائے کرام اور مسلمان مصائب وآلام سے دوچار ہوئے۔ **اللھم افتح بینی وبین قومی بالحق وانت خیر الفاتحین**۔

(تفسیر الحسنات۔ علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)

آیت مبارکہ :

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الۡحَبِّ وَالنَّوٰىؕ يُخۡرِجُ الۡحَىَّ مِنَ الۡمَيِّتِ وَمُخۡرِجُ الۡمَيِّتِ مِنَ الۡحَىِّ‌ؕ ذٰ لِكُمُ اللّٰهُ‌ فَاَنّٰى تُؤۡفَكُوۡنَ ○95

لغۃ القرآن : اِنَّ : بیشک] [اللّٰهَ : اللہ] [فَالِقُ : پھاڑنے والا ہے] [الْحَبِّ : دانے] [وَالنَّوٰى : اور گھٹلی کو] [يُخْرِجُ : وہ نکالتا ہے] [الْحَيَّ : زندہ کو] [مِنَ : سے] [الْمَيِّتِ : بےجان] [وَمُخْرِجُ : اور وہ نکالنے والا ہے] [الْمَيِّتِ : بےجان] [مِنَ : سے] [الْحَيِّ : جاندار] [ذٰلِكُمُ : وہ] [اللّٰهُ : اللہ] [فَاَنّٰى : تو کہاں] [تُؤْفَكُوْنَ : تم سب پھیرے جاتے ہو]

ترجمہ : بیشک اللہ دانے اور گٹھلی کو پھاڑ نکالنے والا ہے وہ مردہ سے زندہ کو پیدا فرماتا ہے اور زندہ سے مردہ کو نکالنے والا ہے، یہی (شان والا) تو اللہ ہے پھر تم کہاں بہکے پھرتے ہو

تشریح :

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : بیشک اللہ ہی دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے ‘ وہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے ‘ یہی تو اللہ ہے، تم کہاں بھٹک رہے ہو۔ (الانعام : ۹۵)

زمین کی نشانیوں سے وجود باری تعالیٰ اور توحید پر دلائل

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے توحید اور رسالت اور قرآن مجید کا بیان فرمایا تھا اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے الوہیت اور وجود باری پر دلائل دیئے ہیں۔ ایک باریک سے دانہ کو چیر کر اللہ اس میں ایک کونپل پیدا کرتا ہے 'وہ کونپل اس قدر کمزور ہوتی ہے کہ اگر ہم اس کو ہاتھ میں لے کر مسل دیں تو ہمارے ہاتھ میں صرف پانی کی نمی رہ جائے گی لیکن اللہ اس کونپل میں اتنی قوت پیدا فرماتا ہے کہ وہ سخت زمین کو چیر کر زمین کے اندر نفوذ کر جاتی ہے 'اس کا ایک حصہ زمین کے نیچے چلا جاتا ہے اور ایک حصہ زمین کے اوپر نکل آتا ہے 'پھر نچلے حصہ سے جڑیں بنتی ہیں جو دور تک زمین کی گہرائی میں چلی جاتی ہیں اور اوپر کے حصہ سے ایک تناور درخت بن جاتا ہے جس میں شاخیں ہوتی ہیں 'ان میں سرسبز پتے ہوتے ہیں 'شگوفے کھلتے ہیں اور پھل اور پھول لگتے ہیں 'اسی ایک دانہ سے جس کی طبیعت واحد ہوتی ہیں 'مختلف رنگ کے پھل 'پھول اور پتے پیدا ہوتے ہیں 'مختلف ذائقے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ان میں مختلف خواص اور الگ الگ تاثیریں ہوتی ہیں۔ کیا یہ سب کچھ خود بخود ہو رہا ہے؟ کیا یہ صرف دانہ یا بیج کا کارنامہ ہے؟ کیا یہ کسی بے جان بت یا دیوی یا دیوتا کا کیا دھرا ہے؟ یہ دیوی اور دیوتا تو خود اپنے مرنے اور جینے میں کسی اور کی مشیت کے پابند ہیں 'سورج 'چاند اور ستارے ایک مقرر شدہ نظام کے تحت گردش کر رہے ہیں۔ پھر ان میں سے کسی نے کبھی یہ دعوی نہیں کیا کہ وہ اس نظام کی تخلیق کا موجب ہے۔ بتاؤ اللہ کے سوا کون ہے جو اس تخلیق کا دعوی رکھتا ہے؟ کیا کبھی کسی نے یہ نعرہ لگایا کہ میں اللہ کا شریک ہوں؟ کیا کبھی کسی نے کسی نبی کسی رسول کو بھیجا 'کوئی کتاب نازل کی کہ اللہ کے سوا فلاں فلاں اور بھی اس کار تخلیق میں اس کے معاون اور شریک ہیں؟ پھر ہمیں کیا پڑی ہے کہ بلاوجہ 'بلادلیل اور بلادعوی کے کسی کو اللہ کا شریک مان لیں؟

اسی ایک درخت پر غور کرلو 'اس کی جڑیں بھی لکڑی کی ہیں 'اس کا تنا بھی لکڑی کا اور جڑیں زمین کے نیچے جا رہی ہیں اور تنا زمین کے اوپر جا رہا ہے 'اگر لکڑی کی طبیعت کا تقاضا زمین کے نیچے جانا ہے تو تنا اوپر کیوں جا رہا ہے؟ اور اگر لکڑی کی طبیعت کا تقاضا زمین کے اوپر جانا ہے تو جڑیں زمین کے نیچے کیوں جا رہی ہیں؟ معلوم ہوا کہ لکڑی کی طبیعت کا تقاضا کچھ بھی نہیں 'یہ سب کچھ ایک قادر قیوم کے حکم سے ہو رہا ہے 'وہ جس حصہ کو چاہتا ہے 'اس کو نیچے کر دیتا ہے اور جس حصہ کو چاہتا ہے 'اوپر کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا وہ نطفہ سے زندہ بشر پیدا فرماتا ہے اور زندہ بشر سے نطفہ نکالتا ہے 'اسی طرح بے جان انڈے سے مرغی کا چوزہ نکالتا ہے اور زندہ مرغی سے بے جان انڈا نکالتا ہے 'اور ایک ضد سے دوسری ضد کا نکلنا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ سب کچھ محض طبعی تقاضوں سے نہیں ہو رہا 'بلکہ ایک زبردست مدبر اور علیم کی قدرت سے ہو رہا ہے۔ اس کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ ایک بے جان بیج سے سرسبز کونپل نکل آتی ہے 'اور سرسبز درخت سے بے جان بیج نکل آتے ہیں 'اسی طرح کافر کے ہاں مومن اور مومن کے ہاں کافر پیدا ہوتا ہے 'اور عالم کے ہاں جاہل اور جاہل کے ہاں عالم پیدا ہوتا ہے۔

اور جب تم اللہ کے وجود اور اس کے واحد ہونے کے ان دلائل کا مشاہدہ کر رہے ہو تو پھر ان بتوں کی پرستش کیوں کر رہے ہو؟ اور اللہ کو چھوڑ کر اس کی مخلوق کو کیوں پکارتے ہو؟ ان کی عبادت کیوں کرتے ہو؟ اور ان سے منتیں اور مرادیں کیوں مانگتے ہو؟ اس کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ جب تم یہ مشاہدہ کر رہے ہو کہ اللہ تعالیٰ مردہ سے زندہ پیدا کر دیتا ہے تو تم مرنے کے بعد دوبارہ پیدا ہونے کا کیوں انکار کرتے ہو؟ جب وہ ایک

بے جان قطرہ سے جیتا جاگتا انسان کھڑا کر دیتا ہے تو وہ تمہارے مرنے اور پھر ریزہ ریزہ ہونے کے بعد تم کو ان ہی منتشر ذرات سے دوبارہ کیوں پیدا نہیں کر سکتا؟ تم سوچتے کیوں نہیں اور ادھر ادھر کیوں مارے مارے پھر رہے ہو؟

(تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

اللہ تعالیٰ اپنی کمال قدرت اور علم و حکمت کے دلائل بیان فرماتا ہے اس لیے کہ مقصد اعظم ایک مسلمان کا درحقیقت اللہ تعالیٰ کے افعال اور صفات کا عرفان حاصل کرنا ہے اور اس امر کا جاننا کہ حقیقتاً ہر شے کا خالق وہی ہے اور جس میں ایسی صفات کمالیہ ہوں وہی مستحق عبادت ہے نہ کہ وہ بہت جو بے جان اور جماد محض ہیں جنہیں مشرک پوجتے ہیں چنانچہ سب میں بڑا کمال صنعت و خلق یہ ہے کہ دانہ اور گٹھلی کو چیر کر ان سے سبزہ اور درخت پیدا کرنا اور ایسی سنگلاخ زمینوں میں ان کے نرم ریشوں کو رواں کرنا جہاں آہنی میخ بھی کام نہ کر سکے۔ یہ اس کی قدرت کے عجائبات ہیں پھر جاندار سبزہ کو بے جان دانے اور گٹھلی سے اور انسان و حیوان کو محض ایک قطرہ منی سے اور پرند کو انڈے سے پیدا کرنا یہ اس کی قدرت کاملہ کا ایک نقشہ ہے۔ یہ ہے خلاصہ آیات بالا کا اب قدرے تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

تفسیر نسفی میں ہے (ترجمہ) بیشک اللہ چیرنے والا دانہ اور گٹھلی کا سبزہ اور درخت سے یعنی اللہ نے پیدا فرمایا دانہ بالوں سے اور گٹھلی کھجور سے۔ فلق کے معنی شق کرنے کے ہیں یعنی چیرتا ہے۔ مجاہد سے اس کی تفسیر یوں ہے کہ چیرنے سے گٹھلی اور گندم مراد ہے۔ جب دانہ گٹھلی تر زمین میں بو دی جاتی ہے تو کچھ دن کے بعد اللہ کے حکم سے وہ دو طرفہ چیرتی ہے اوپر کی طرف چراؤ سے پودے درخت بنتے ہیں جو زمین کو پھاڑ کر تنہ شاخیں پتے پھول پھل کی شکل میں نکلتے ہیں جنکے رنگ۔ مزے تاثیریں مختلف ہوتی ہیں اور نیچے والے حصہ سے درخت کی جڑیں زمین کے نیچے چلتی ہیں۔ جڑ زمین سے کھاد پانی چوس کر شاخوں کو پہنچاتی ہیں اور شاخیں ہوا، دھوپ، چاندنی سے اثرات حاصل کرکے جڑ کو پہنچاتی ہیں یہ اس کی قدرت کاملہ کا مظاہرہ ہے۔

یخرج الحیی من المیت۔ اللہ تعالیٰ بے جان خشک دانہ سے اور گٹھلی سے تر جاندار درخت پودے نکالتا ہے اسی طرح جاندار جانور کو بے جان نطفے سے پیدا فرماتا ہے جاندار پرندوں کو بے جان انڈوں سے نکالتا ہے۔ جاندار مومن کو بے جان کافر سے پیدا فرماتا ہے کہ ماں باپ کافر، بیٹا مومن، ایمان زندگی ہے، کفر موت ہے۔ دانہ گٹھلی بے جان چیزیں ہیں اور پودے درخت سبزہ جاندار ہیں۔

ومخرج المیت من الحی۔ اللہ تعالیٰ جاندار بوٹے اور درخت سے بے جان دانہ گٹھلی پیدا فرماتا، جاندار جانور سے بے جان نطفہ پیدا فرماتا ہے بے جان مردہ کافر سے جاندار مومن پیدا کرتا ہے۔ زندہ پرورش کا محتاج ہے۔ اس لیے اس پر ہر وقت رحمت کا نزول کی ضرورت ہے۔ یہ حجت دلیل الٰہی عزوجل ہے ان پر جو مشاہدہ تخلیق کرنے کے بعد بھی بعثت بعد الموت کے منکر ہیں ان کو بتایا گیا کہ وہ قادر علی الاطلاق ہے جو اس طرح تخلیق فرماتا ہے کہ کتم عدم سے منصہ شہود پر لاتا ہے وہی اس امر پر قادر ہے کہ تمہیں مرنے کے بعد پھر اٹھائے یہ ہی تمہارا خدا عزوجل ہے جو محیی اور ممیت ہے اور وہی اس کا حق دار ہے کہ اسے رب عزوجل مانا جائے نہ کہ بت جو بے حس، بے جان اور حماد محض ہیں۔ **ذلکم اللہ فانی توفکون**۔ تو کہاں پھر رہے ہو اور اپنے حقیقی رب سے منحرف ہو رہے ہو اور اس کی محبت کے سوا غیر کی طرف پلٹنا بعد وضاحت دلائل خلاف عقل و دانش ہے۔ کوئی بھی عقل مند ایسا نہیں کرتا۔ فالق الاصباح۔ وہ صبح پھاڑنے والا ہے اندھیری رات میں سے عمود صبح ظاہر کرتا ہے اور نور بہار پیدا کرتا ہے۔ اصباح اور صبح کے ایک ہی معنی ہیں یعنی نورانی صبح کا پیدا کرنے والا عرب کا مشہور شاعر امرء القیس کہتا ہے۔

الا ایھا اللیل الطویل الا انجیلی بصبح وما الاصباح منك بامثل

خبر دار اے لمبی رات کیا تو صبح نہیں ظاہر کرے گی اور صبح کی روشنی بھی میرے لیے تیری سیاہی سے بہتر نہیں ہے۔ فالق کے معنی چیرنے والا۔ یعنی اللہ تعالیٰ صبح صادق کے ذریعہ صبح کاذب کی سیاہی کو چیرتا ہے۔ وجعل الیل سکنا۔ اللہ تعالیٰ نے رات کو سکون چین کے لیے پیدا فرمایا تاکہ اس میں دن بھر کی تھکان سے سکون حاصل کرو۔

والشمس والقمر حسباناً۔ اللہ تعالیٰ نے سورج چاند کو دنیا کے حساب کے لیے پیدا فرمایا یعنی ان سے حساب اوقات ان کے دور اور سیر کے ذریعہ معلوم کرتے ہو چاند سے قمری مہینے بنتے ہیں ان سے زکوۃ، روزے اور حج وابستہ ہیں۔ سورج سے شمسی مہینے بنتے ہیں۔ سورج چاند کی رفتار سے ان کے طلوع و غروب کا حساب رکھا گیا۔ ان میں سے کوئی مقرر کردہ حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا ان کی حرکت مقرر فرما دی گئی جس سے دن مہینے اور سال بنتے ہیں۔ موسم کا تعین ہوتا ہے، گرمی۔ سردی بہار خزاں کا تعین ہوتا ہے۔ **ذلك تقدير العزيز العليم**۔ یہ تعین ہے غالب اور علم والے کی اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا ان کے محور سے زائد نہ چلنا اور اپنے اپنے محور پر مسخر رکھنا۔ یہ شان قہاری کا مظاہرہ ہے۔ چاند سورج کی تدبیر و تدویر سے اس کی شان قدرت واضح ہے۔ وھو الذی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت و قدرت کے اظہار کے لیے ہے وہی ہے جس نے۔ **جعل لکم النجوم**۔ جعل۔ بمعنی خلق ہے بنائے یا پیدا کئے تمہارے لیے ستارے تاکہ ان سے سفر میں رہبری حاصل کرو۔ النجوم۔ نجم کی جمع ہے۔ لغت میں نجم وہ ہے جو فلکی اور روشن ہو۔ **لتھدوا بھا فی ظلمت البر والبحر**۔ تاکہ رہبری حاصل کرو خشکی کی اندھیریوں اور دریا میں دونوں کی طرف یعنی خشکی اور دریا کے ساتھ ستاروں کی وضاحت اس لیے کی کہ دونوں میں ستاروں سے مدد لی جاتی ہے۔ سیارات یعنی حرکت رہنے والے ستارے کل سات ہیں۔ ثوابت تارے بیشمار ہیں یہ تارے اس لیے پیدا فرمائے کہ مسافر جب جنگلوں اور سمندروں میں سفر کرے اور رات کی اندھیریاں آجاویں تو ان ستاروں سے وقت اور سمت معلوم کرسکیں۔ قطب نما اور گھڑیاں ستاروں ہی کے حساب سے بنائے گئے ہیں۔ قد فصلنا الآیت لقوم یعلمون۔ بیشک تفصیل سے بیان کردیں ہم نے آیتیں ان کے لیے جو جانتے ہیں۔

(تفسیر الحسنات۔ علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)

زندگی کی پیدائش اور حرکت ایک معجزہ ہے جسے پیدا کرنا ایک طرف، اس کے بھید کو بھی کوئی نہیں پاسکتا۔ زمین میں ہر لحظہ دانوں سے پھوٹ پھوٹ کر تناور اور پھلنے پھولنے والے درخت نکلتے ہیں۔ خاموش، ساکن، اور سوکھی گٹھلیوں سے بلند کھجوریں پھوٹتی ہیں۔ جو زندگی دانے اور گٹھلی میں پوشیدہ ہے وہ پودے اور کھجور میں آکر ظاہر اور متحرک ہو جاتی ہے۔ اس کا بھید ایک سربستہ راز ہے جسے صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

حیات کی حقیقت اور اس کا مصدر صرف خالق کو معلوم ہے۔ انسان آج بھی پہلے انسان کی مانند ظواہر و اشکال کے سامنے کھڑا ہو کر اس کے خصائص واطوار کا مشاہدہ تو کرسکتا ہے مگر اس سے پہلے انسان کی طرح اس کے غیب سے پردہ نہیں اٹھا سکتا۔ حرکت و نشو و نما کو دیکھتا ہے مگر مصدر اور جوہر سے ناواقف ہے۔ لیکن زندگی اپنی راہ پر رواں دواں ہے، اور معجزہ ہر لحظہ واقع ہو رہا ہے۔

زندہ کا مردہ سے نکلنا شروع سے چلا آیا ہے، یہ کائنات تھی، زمین تھی مگر اس میں حیات نہ تھی۔ پھر زندگی آئی جس کو موت میں سے نکالا گیا کیسے نکالا گیا؟ ہم نہیں جانتے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، کہ زندگی موت سے اور زندہ مردہ سے نکل رہا ہے! ہر لحظہ ذرات زندوں کے اجسام و اعضا کا حصہ بن رہے ہیں اور زندہ خلیوں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ پھر اس کے برعکس ہر لحظہ زندہ خلیے مردہ ذروں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک دن پورا زندہ جسم مردہ ہو جاتا ہے۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قادر نہیں۔ ابتدا میں موت سے زندگی نکالنے والا وہی تھا، پھر مردہ ذرات کو انسانی اجسام کا حصہ بنا کر زندہ کرنے والا بھی وہی ہے۔ یہ ایک ایسا چکر ہے جس کی ابتداء و انتہا اور اس کی کیفیت و نتائج کو سوائے

اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا۔اس میں کسی کا ذرہ بھر دخل نہیں ہے۔سب کچھ اسی قادر و علیم کی قدرت و علم سے ہو رہا ہے۔زندگی اللہ کی صفت خلق سے وجود میں آئی۔اس کے سوا اس کی جو تعبیر بھی کی جائے وہ غلط اور باطل ہے۔یورپ کے لوگ جب سے کلیسا سے بھاگے ہیں '' گویا کہ وہ گدھے ہیں جو شیر سے بھاگے ہوں ''اسی دن سے وہ کائنات کی موت وحیات کی پیدائش کا راز معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انھوں نے اللہ کے وجود کا اعتراف کرنا چھوڑ دیا۔جس کی وجہ سے ان کوششوں کا نتیجہ صفر ہے۔

حیات پر جدید تحقیق کے نتائج

ڈاکٹر فرینک ایلن جو کینیڈا کی ایک یونیورسٹی کا بیالوجی کا پروفیسر ہے کہتا ہے : (مقالہ) : "علم کی نشو ونما اتفاقاً ہوئی ہے یا قصداً؟" اس کا ترجمہ ڈاکٹر ترشاش عبدالمجید سرمانی "اگر زندگی کسی حکمت سے اور کسی سابق منصوبے سے پیدا نہیں ہوئی تو، پھر یہ اتفاقاً پیدا ہوئی ہے۔اب سوال یہ ہے کہ وہ اتفاق کونسا ہے؟ تاکہ ہم اس پر غور کریں اور زندگی کی پیدائش کا پتہ چلائیں۔اتفاق اور احتمال کے نظریات کی اب کچھ درست حسابی بنیادیں موجود ہیں۔جو انھیں ان معاملات پر منطبق کرتی ہیں۔جہاں مطلق صحیح حکم نہ لگایا جاسکے۔یہ نظریات ہمیں ایسے فیصلے پر پہنچاتے ہیں جو درستی سے قریب تر ہو، ریاضی کے طریقے سے اتفاق اور احتمال کا نظریہ تحقیق کے لحاظ سے بہت آگے بڑھ چکا ہے۔حتیٰ کہ ہم بعض ظواہر کی پیشگوئی پر قادر ہو چکے ہیں۔جن کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ وہ اتفاق سے واقع ہوتے ہیں۔بعض ایسی چیزیں جن کے وقوع کی ہم کوئی اور تفسیر نہیں کر سکتے۔ان تحقیقات کی ترقی کے باعث ہم اس پر قادر ہیں کہ اتفاقاً واقع ہونے والی چیزوں میں اور ان میں جن کا اس طرح وقوع ناممکن ہے، تمیز کر سکیں۔ہم زمانے کی ایک معین مدت میں اس وقوع کا احتمال ظاہر کر سکتے اب ہم اس چکر کو دیکھتے ہیں جو زندگی کی پیدائش میں اتفاقات کے کھیل سے ہوتا ہے۔(معلوم رہے کہ یہ ڈاکٹر فرینکلن کا خیال ہے ورنہ اسلامی نقطہ نظر سے کائنات میں کوئی چیز بھی اتفاقیہ طور پر نہیں ہوتی۔ہر ایک ضابطہ، قانون و قوت، جگہ وغیرہ خدا کے ہاں مقرر ہے اور سب کچھ لگے بندھے قوانین کے مطابق ہو رہا ہے۔)

تمام زندہ خلیوں میں پروٹین بنیادی مرکب ہے اور اس میں پانچ عناصر ہوتے ہیں : کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن اور سلفر اور ایک جزء میں ذرات کی تعداد ۴ لاکھ تک ہوتی ہے۔چونکہ کیمیاوی عناصر کی تعداد ۱۰۰ سے زائد ہے، ہر ایک کو اندازے کی غیر مرتب تقسیم پر بانٹا گیا ہے۔پس ان پانچ عناصر کا اجتماع تاکہ وہ پروٹین کے جزئیات میں سے ایک جزیہ بن جائے، اس مادے کی کمیت کو معلوم کرنے کے لیے اس کا حساب معلوم کیا جاسکتا ہے۔جس کو ہمیشہ کے لیے باہم ملایا جائے تاکہ وہ جزئی حاصل ہو سکے، پھر زمانے کا فاصلہ بھی معلوم ہو سکتا ہے تاکہ اس جزئی کے درجات میں اجتماع ہو سکے۔

مشہور ریاضی دان عالم شارنر یوجین نے تمام عوامل کا حساب کیا ہے اور معلوم کیا ہے کہ اتفاقیہ طور پر ایک پروٹین جزئی کا بننا ۱۰/۱ کی نسبت سے ہو سکتا ہے۔یعنی ایک کو دس تک ہر ہندسے میں فی نفسہ ضرب دینا ۱۶۰ بار اور یہ ایک ایسی رقم ہے جس کا بولنا یا کلمات میں اس کی تعبیر کرنا ناممکن ہے۔مناسب ہے کہ اس تفاعل کے لیے جتنا مادہ ضروری ہے تاکہ ایک جزئی پیدا ہو سکے۔یہ اس ساری کائنات سے لاکھوں کروڑوں مرتبہ زیادہ ہوگا اور زمین پر صرف ایک جزئی کو پیدا کرنے کے لیے۔۔یعنی اتفاقیہ طور پر پیدا کرنے کے لیے۔۔لاانتہا سالوں کی ضرورت ہوگی۔ جسے اس عالم ریاضی نے اندازاً یہ بتایا ہے کہ دس کو اس کے نفس میں ۲۴۳ بار ضرب دی جائے تو اتنے سال لگیں گے۔

پروٹین لمبے سلسلوں کے ساتھ اپنی کھٹائیوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ سوان جزئیات کے ذریعے کس طرح تالیف پاتے ہیں؟ جب وہ اس طریقے کے علاوہ مرکب ہوں جس سے وہ ہوتے ہیں تو زندگی کے قابل نہیں ہوتے بلکہ بعض دفعہ زہر بن جاتے ہیں۔ جے بی سیتھر نے وہ طریقے شمار کیے ہیں جن سے کہ ذرات کا پروٹین کے ایک بسیط جزئی میں مرکب ہونا ممکن ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ دس کو اسی طرح فی نفسہ ۱۸ سے ضرب دیں تو اتنے ملین اس کی تعداد ہوگی۔ اس بنا پر یہ عقلاً محال ہے کہ یہ تمام اتفاقات ایک بھی پروٹین کو پیدا کر سکیں۔

لیکن پروٹین کیمیاوی مردہ مادہ ہے اور اس میں زندگی اس وقت رینگتی ہے جب وہ عجیب بھید اس میں داخل ہوتا ہے۔ جس کی حقیقت کو ہم نہیں جانتے۔ وہ ایک غیر محدود عقل ہے (اس سے اس کی مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور یہ ایک فلسفیانہ نام ہے) اور وہ اکیلا خدا ہے جو اپنی حکمت کے ساتھ یہ پا سکتا ہے کہ یہ پروٹینی جزئی زندگی کا مسکن بن سکتی ہے، سو اس نے اس کو بنایا، اس کی تصویر کھینچی، اور اس پر زندگی کا بھید انڈیل دیا۔

مشی گن یونیورسٹی کا علوم طبیعات کا پروفیسر ڈاکٹر ایرفنگ ولیم اپنے مقالے: "مادیت تنہا کافی نہیں" (جو اسی نام کی کتاب میں وارد ہے!) میں لکھتا ہے: "سائنس ہمیں یہ بتانے سے قاصر ہے کہ وہ نہایت چھوٹے چھوٹے غیر محدود دقائق کیسے پیدا ہوتے ہیں۔ اور انھی سے تمام مادے بنتے ہیں۔ اسی طرح سائنس ہم پر یہ کھولنے سے بھی قاصر ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے ذرے کیونکر جمع ہوتے ہیں اور ان میں زندگی کیونکر آتی ہے۔ اس کا مدار محض اتفاقات پر ہے۔ بیشک یہ نظریہ جو دعویٰ کرتا ہے کہ ترقی یافتہ حیات کی تمام صورتیں موجودہ ترقی کی حالت تک محض اندھا دھند چھلانگوں اور اجتماعات کے باعث پہنچی ہیں بلاشبہ ایک نظریہ ہے مگر اسے قبول نہیں کیا جا سکتا، صرف فرض کیا جا سکتا ہے۔ پس یہ منطق اور دلیل کی بنیاد پر قائم نہیں ہے۔

ڈاکٹر مالکوم ونسٹر پروفیسر زوالوجی بائلر یونیورسٹی اپنے مقالے: "سائنس میرے ایمان کو مضبوط کرتی ہے" میں لکھتا ہے کہ: میں زوالوجی کے مطالعہ میں مشغول ہوا۔ جو ان وسیع علمی میدانوں میں سے ہے جو علم الحیاۃ سے بحث کرتے ہیں۔ اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اللہ کی ساری مخلوقات میں کائنات میں بسنے والی کوئی چیز زندوں سے زیادہ حیران کن نہیں ہے۔ تم کسی راستے کے کنارے پر اگی ہوئی کمزور سی برسیم کو دیکھو، کیا تمہیں انسان کی بنائی ہوئی تمام چیزوں اور آلات میں اتنی تابناک چیز نظر آتی ہے؟ یہ ایک زندہ آلہ ہے جو دن رات ایک دائمی صورت میں کھڑا رہتا ہے۔ اس میں ہزارہا کیمیاوی اور طبیعی عمل پائے جاتے ہیں۔ اور یہ سب پروٹو پلازم کی قوت کے تحت پورے ہوتے ہیں۔ یہ وہی مادہ ہے جو تمام زندہ کائنات کی ترکیب میں داخل ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ پیچ در پیچ زندہ آلہ کہاں سے آیا ہے؟ اللہ نے اس کو یوں اکیلا نہیں بنایا۔ بلکہ اس نے حیات کو پیدا کیا ہے اور اپنے نفس کی حفاظت پر اسے قادر بنایا ہے۔ یہ کہ وہ ایک نسل سے دوسری نسل تک برابر چلتا ہے اور ان تمام خاصیتوں اور امتیازات کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ جو ہمیں ایک نبات اور دوسری میں تمیز کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ زندہ چیزوں میں کثرت کا مطالعہ کرنا نہایت عجیب اور چونکا دینے والا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی قدرت ظاہر ہوئی ہے۔ جدید نبات جس تناسلی خلیے سے بارآور ہوتی ہے وہ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ طاقتور خوردبین کے بغیر نظر نہیں آ سکتا۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ نباتات کی صفات میں سے ہر صفت، ہر رگ، وریشہ، ہر شاخ، ہر پیچ یا پتہ ان انجینئروں کے زیر نگرانی بنتا ہے جو نہایت چھوٹے ہیں۔ وہ اس خلیے کے اندر رہ سکتے ہیں جس سے نبات پیدا ہوتی ہے۔ انجینئروں کا یہ فرقہ کروموسوم کہلاتا ہے۔ (یعنی وراثت کو نقل کرنے والے) حیات اور حیاتیات پر اسی قدر بات چیت کے بعد اب ہم قرآنی آیات کی طرف لوٹتے ہیں۔

(ذلکم اللہ ربکم) [الانعام : ۱۰۲]

"یہ ہے تمہارا اللہ تمہارا رب"

جو اس دائمی مسلسل و متواتر معجزے کا موجد ہے۔ وہی اس کا حق دار ہے کہ تم اس کے آگے جھکو۔ اس کی عبودیت، خضوع، خشوع اور اتباع کا اقرار و اعلان کرو۔ پھر فرمایا:

"پھر تم کہاں اور کیونکر پھرائے جاتے ہو؟" (فی ظلال القرآن) (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

یہ وہ معجزہ ہے جس کے راز تک کوئی نہیں پہنچ سکا یہ تو بڑی بات ہو گی کہ کوئی یہ معجزہ کر دیکھائے۔ کیا معجزہ؟ یعنی زندگی کی تخلیق اور اس کی نشو و نما اور اس کی حرکت 'ہر وقت ایک زندہ اور بڑھنے والے درخت سے مردہ بیج نکالتا ہے اور ایک بے جان گٹھلی ایک بڑھنے والے درخت سے نکلتی ہے۔ پھر اس بیج اور اس گٹھلی کے اندر پوشیدہ زندگی ایک پودے اور ایک درخت کی شکل اختیار کرتی ہے۔ یہ ایک خفیہ راز ہے جس کی حقیقت کا علم صرف اللہ کی ذات کریم کو ہے۔ اس زندگی کا اصل مصدر اور منبع کیا ہے 'اس بات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ انسان نے جو بھی عملی ترقی کی ہے 'جس قدر زندگی کے ظاہری امور کا مطالعہ کیا ہے اور جس قدر خصائص بھی متعین کئے ہیں اس کی انتہاء پر ایک راز ہے جو غائب ہے۔ اس سلسلے میں جس طرح پہلے انسان کا علم محدود تھا اسی طرح اس آخری دور کے ترقی یافتہ انسان کا علم بھی محدود ہے۔ انسان صرف مظاہر اور خواص حیات سے واقف ہے لیکن اسے زندگی کے اصل منبع اور اس کی اصل ماہیت کا علم نہیں ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ زندگی ہماری آنکھوں کے سامنے رواں دواں ہے اور یہ معجزہ ہر لحظہ واقعہ ہوتا رہتا ہے۔

اللہ وہ ذات ہے جس نے روز اول سے ایک مردہ حالت سے انسان کو زندگی بخشی۔ یہ کائنات تو تھی مگر انسان نہ تھا یہ زمین تھی مگر اس پر زندگی نہ تھی۔ پھر یہ زندگی اذان الٰہی سے نمودار ہوئی۔ یہ کیسے نمودار ہوئی؟ اس کا ہمیں علم نہیں ہے اور اس وقت سے لے کر آج تک یہ زندگی مردے سے نمودار ہو رہی ہے اور مردہ ذرات زندگی کے ذریعے زندگی پاتے ہیں۔ یہ بے جان مواد زندہ عضوی شکل اختیار کرتا ہے 'اور پھر یہ زندگی خلیہ انسان کے جسم میں اور تمام جانداروں کے جسم میں داخل ہوتا ہے۔ یہ زندہ ذرات اب مزید تغیر پذیری کے ذریعے زندہ خلیے بن جاتے ہیں اور اس کے بعد یہ زندہ خلیے پھر مر جاتے ہیں۔ کیونکہ زندہ خلیے ہر وقت مردہ خلیوں کی شکل اختیار کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ہو یہ زندہ شخص یا جانور ایک دن مردہ ذرات کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ ہے مفہوم اس جملے کا۔

(آیت) "یُخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ وَمُخۡرِجُ الۡمَیِّتِ مِنَ الۡحَیِّ" (95)

" وہ زندہ کو مردے سے خارج کرنے والا ہے اور مردے کو زندہ سے خارج کرنے والا ہے۔"

اللہ کے سوا کوئی بھی یہ کام نہیں کر سکتا اور یہ بھی ناممکن ہے کہ آغاز حیات کے وقت اللہ کے سوا کوئی اور حیات پیدا کر سکے اور نہ کوئی یہ قدرت رکھتا کہ وہ مردہ ذروں کو زندہ ذروں کی شکل دے دے۔ یہ اللہ ہی ہے جو ان زندہ ذروں کو پھر مردہ ذروں کی شکل دیتا ہے اور یہ سرکل ایک ایسا سرکل ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ اس کا آغاز کب ہوا اور کب یہ سرکل ختم ہو گا۔ سائنس دان جو قیافے لگاتے رہتے ہیں وہ محض احتمالات ہیں

۔

اس کرہ ارض پر ظہور حیات کے خصائص کے بارے میں آج تک سائنس دانوں نے جو نظریات بیان کیے ہیں ان میں سے کوئی نظریہ بھی تشفی بخش نہیں ہے۔ صرف یہ نظریہ تشفی بخش ہے کہ اس دنیا پر تخلیق کائنات ذات باری کا کارنامہ ہے اور یورپ میں جب قرون وسطی میں عوام
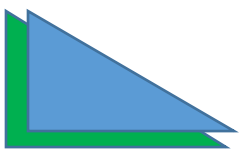
کنیسہ سے بھاگ کھڑے ہوئے جس طرح بدکے ہوئے گدھے ہوں یا جس طرح شیر کے ڈر سے جانور بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔مذہب سے فرار اختیار کرنے والوں نے جب اس کرہ ارض پر تخلیق حیات کے راز کے عقدے کو حل کرنا چاہا ' پھر جب انھوں نے خود اس کائنات کی تخلیق کے رازوں سے پردہ اٹھانا چاہا ' اور یہ کام انھوں نے خدا کے نظریے کو اپناتے ہوئے کیا تو ان کی تمام مساعی ناکام رہیں اور بیسوی صدی میں اس موضوع پر جو کچھ بھی لکھا گیا وہ ایک مذاق کے سوا کچھ نہ تھا اور یہ تمام تحریریں عناد اور انکار مذہب پر مبنی تھیں اور کوئی مخلصانہ مساعی نہ تھیں۔

ان سائنس دانوں میں سے بعض صحیح الفکر لوگوں نے اپنے عجز ناتوانی کا اعراف کیا ہے۔ایسے لوگوں کی باتوں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس موضوع پر انسان کا علم کس قدر محدود ہے۔ہمارے ہاں بعض ایسے لوگ اب بھی موجود ہیں جو ستر ہویں یا انیسویں صدی کے مغربی افکار کو نقل کرتے ہیں۔اور دعوی کرتے ہیں کہ وہ سائنس دان ہیں اور صرف مشاہدے کے قائل ' جبکہ اہل مذہب عالم غیب کو ماننے والے ہوتے ہیں۔ایسے لوگ کو سمجھانے کے لیے میں یہاں بعض بڑے سائنس دانوں کے اقوال نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں مثلا بعض امریکی علماء یہاں تک پہنچے ہیں۔

ڈاکٹر فرانک ایلن ' کورنل یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں اور کینیڈا کی مانٹو یا یونیورسٹی میں حیاتیات کے استاد ہیں۔اپنے ایک مقالے میں جس کا عنوان ہے " یہ دنیا یہ یا اتفاقا وجود میں آئی یا منصوبے کے تحت "۔یہ مقالہ بتجلی فی عصر العلم کتاب ترجمہ ڈاکٹر مرداش عبدالحمید سرفان سے نقل کیا گیا ہے۔

" اگر یہ زندگی کسی سابقہ متعین منصوبے اور اسکیم کے تحت وجود میں نہیں لائی گئ تو پھر یہ اتفاقا وجود میں آ گئ ہو گی۔وہ "اتفاق "کیا ہے؟ معلوم ہونا چاہیے تاکہ ہم اس پر غور کریں اور دیکھیں کہ اس "اتفاق "کے ذریعے زندگی کا ظہور کس طرح ہوتا ہے۔"

" اتفاق اور احتمال (بخت واتفاق) کے جو نظریات اس وقت پائے جاتے ہیں پہلے کی طرح نہیں ہیں۔دور جدید میں اب ان کے لیے ریاضی کے کچھ ٹھوس اصول اور قواعد مرتب ہو چکے ہیں اور اگر کسی موضوع پر یقینی فیصلہ نہ کی جاسکتا ہو تو ان اصولوں کے مطابق بخت واتفاق کے اصولوں کو کام میں لایا جاتا ہے اور ان اصولوں کے مطابق جو نتائج سامنے آتے ہیں وہ اقرب الی الصواب ہوتے ہیں اگرچہ ان نتائج کے غلط ہوئے کے امکان کو بھی مسترد نہیں کیا جاسکتا۔یہ حقیقت ہے کہ ریاضی کے زاویہ سے نظریہ بخت واتفاق نے کافی ترقی کرلی ہے۔ان قواعد اور اصولوں کے مطابق انسان کے لیے ممکن ہو گیا ہے کہ وہ بعض واقعات کے بارے میں بات کرسکے۔جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ واقعات اتفاقا ہو گئے ہیں اور جن کے ظہور کے اسباب و عوامل دوسرے ذرائع سے معلوم نہیں ہو سکتے۔(مثلا تاش کے کھیل میں پھول کا پھینکنا) ان تحقیقات کی وجہ سے انسان اس بات پر قادر ہو گیا ہے کہ وہ یہ بتاسکے کہ کیا چیز اتفاقا وجود میں آ جاتی ہے اور کیا امر جو اتفاقا وجود میں نہیں آ سکتا۔

(اسلامی تصور حیات کے مطابق اس دنیا میں بخت واتفاق نہیں ہے۔ہر چیز کی تخلیق تقدیر الہی کے مطابق ہوتی ہے۔ان خلقنا کل شیء بقدر۔ (ہم نے ہر چیز کو اندازے کے مطابق تخلیق کیا) اللہ نے تخلیق کائنات کے لیے اٹل قوانین وضع کئے ہیں۔جو واقعات ہوتے ہی ان ہر بار سنت الٰہیہ کے مطابق تقدیر الہی تصرف کرتی ہے۔اسی طرح یہ قوانین قدرت بھی کبھی کبھی ٹال دیئے جاتے ہیں اور ایک خارق عادت معجزہ صادر ہو جاتا ہے۔یہ بھی ایک خاص حکمت الٰہیہ کے مطابق ہوتا ہے کیونکہ یہ نوامیس فطرت اور خارق عادت بظاہر دونوں اللہ کی تقدیر کے مطابق ہوتے ہیں۔ہم نے جو سائنس دانوں کے حوالے دیئے ہیں تو ضروری نہیں ہے کہ ہم محولہ بالا عبارت سے پوری طرح متفق بھی ہوں) اور یہ

بھی بتایا جاسکتا ہے کہ کونسا واقعہ کس قدر عرصے کے بعد اتفاقاً نمودار ہوسکتا ہے۔ اس تمہید کے بعد اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آیا اس کرہ ارض پر زندگی کا ظہور بطور اتفاق ہوسکتا ہے۔"

تمام زندہ خلیوں میں پروٹین بنیادی عناصر ترکیبی ہیں۔ یہ پروٹین پانچ عناصر سے مرکب ہوتے ہیں۔ کاربن ہائیڈروجن ' نائٹروجن ' آکسیجن اور گندھک۔ ایک پروٹین میں چالیس ہزار ایٹم ہوتے ہیں، کیمیاوی عناصر کی تعداد ۹۲ ہے۔ اور یہ سب غیر منظم اور نامعلوم مقداروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

(عقل انتہائی بھی فلسفیانہ اصطلاحات میں سے ایک ہے۔ ایک مسلمان اللہ پر صرف اس کے اسمائے حسنیٰ ہی کا اطلاق کرسکتا ہے اس لیے اللہ پر اس لفظ کا اطلاق مناسب نہیں ہے)

ان پانچ عناصر کے آپس میں ملنے کے احتمال کے تعین کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس مادے کی مقدار اور زمانے کا تعین ہو اور وہ مادہ مسلسل ان عناصر پر مشتمل مخلوطہ میں رہے اور پھر اس قدر طویل عرصے تک وہ مادہ یونہی رہے تاکہ اس عرصے میں "اتفاقاً" واقعہ ہو جائے اور یوں ایک عدد پروٹین حاصل ہو جائے۔ "غرض یہ تعین ضروری ہے کہ کتنا مادہ کتنے عرصے کے لیے ضروری ہے۔"

" سوئٹزر لینڈ کے ایک ریاضی دان نے کچھ حساب لگایا ہے (چار لزیوجین جے) اس نے اس کا حساب لگا کر کہا ہے کہ احتمال کے طور پر ایک پروٹین کی تشکیل پر ایک نسبت: دس کی قیمت ۱۶۰ مرتبہ لگائی جائے (۱:۱۶۰:۱) یہ اس قدر بڑی رقم بنتی ہے کہ زبان سے اس کا ادا کرنا بھی مشکل ہے نہ الفاظ کے ذریعے اسے بیان کیا جاسکتا ہے اور بطور اتفاق اس عمل کی تکمیل کے لیے یعنی ایک پروٹین کی تشکیل کے لیے اس قدر مادے کی ضرورت ہے جس کے ساتھ اس پوری کائنات کو کئی ملین بار بھرا جاسکتا ہو اور اگر صرف روئے زمین پر اتفاقاً ایک پروٹین کو پیدا کرنا ہو تو اس کے لیے کئی بلین سالوں کی ضرورت ہوگی اور یعنی ۱۰ کی "۲۴۳ (۲۴۳:۱۰) یہ زمانہ مذکور ماہر طبیات نے تجویز کیا ہے۔

" پروٹین اینوایسڈ کے طویل سلسلوں سے تشکیل پاتے ہیں 'تو سوال یہ ہے کہ ان جزئیات کے ذرات کی باہم تالیف کس طرح ہوتی ہے؟ جس طرح ان کی تشکیل طبعی ہوتی ہے اگر اس کے سوا کسی اور طریق سے ان کی تالیف ہو تو وہ زندگی کے اہل ہی نہیں رہتے 'اور بعض اوقات ایسے پروٹین زہر بن جاتے ہیں۔ ایک برطانوی سکالر۔ ج۔ ب سیتھر (J.B.SeAther) نے حساب لگایا ہے کہ ان سلسلوں میں پروٹینی ایٹم کس تعداد میں ہوتے ہیں ان کے نزدیک ان کی تعداد (۴۸:۱۰) ہوتی ہے۔ اس لیے عقلاً یہ بات محال ہے کہ احماض امینہ کا یہ پورا سلسلہ محض اتفاقی طور پر تالیف پا جائے اور دنیا میں ایک پروٹین بن جائے۔"

" لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بات پیش نظر رہے کہ پروٹین ایک کیمیاوی مادہ ہے جس کے اندر کوئی زندگی نہیں ہوتی اور اس کے اندر زندگی اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک اس کے اندر وہ خفیہ عمل نہیں ہو جاتا جو آج تک ایک عجیب راز ہے اور جس کی حقیقت کا ہمیں کوئی علم نہیں ہے اور اس بات کو صرف "عقل لا انتہائی "۲۔ جانتا ہے اور یہ صرف اللہ ہے جس کی حکمت بالغہ کی وجہ سے ممکن ہوتا ہے کہ یہ پروٹینی جزء مقر حیات بنتا ہے۔ یہ حیات کی منزل ہے جسے اللہ نے بنایا۔ اس کو ایک بہترین شکل دی ہے اور اس کو راز حیات بخشا ہے۔"

نباتات کی موروثی صفات کے ایک ماہر مسٹر ایرٹنگ ولیم 'استاد طبیعیات جامعہ ایوی میجیگن مقالے بعنوان "صرف مادیت کافی نہیں ہے "میں لکھتے ہیں:

سائنس اس بات پر قادر نہیں ہے کہ نہایت ہی چھوٹے ایٹم لاتعداد صورت میں کس طرح وجود میں آجاتے ہیں ' جن سے دنیا کے تمام مادے مرکب ہوتے ہیں اور اس طرح سائنس کوئی قابل اعتماد توجیہ نہیں کرسکتی کہ ان چھوٹے چھوٹے ایٹموں سے ذی حیات جاندار کس طرح اتفاقا بن جاتے ہیں اور یہ نظریہ کہ تمام جاندار اپنی موجودہ ترقی یافتہ صورت میں بسبب حدوث عفرات عشوریہ اور ھجائن کے تجمعات کی وجہ سے پہلے پہنچے ایک ایسا نظریہ ہے جو کسی ایسی دلیل ومنطق کی اساس پر قائم نہیں ہے جس پر اطمینان ہوتا ہو ' یہ بات محض تسلیم کرلینے کی وجہ سے ہی ممکن ہے۔"

(یہ بھی سائنس دانوں کا خبط ہے کہ عناصر کی مقدار معلوم نہیں ہے۔ ان عناصر کی مقدار بھی مقرر ہے)

باہلر یونیورسٹی کے پروفیسر طبیعیات ڈاکٹر البرٹ میکومب ونسٹر اپنے ایک مقالے کا عنوان یہ دیتے ہیں "سائنس نے میرا ایمان باللہ کو مضبوط کردیا"۔ وہ لکھتے ہیں :

' میں نے حیاتیات کے مطالعہ میں اپنے آپ کو مصروف رکھا۔ حیاتیات وہ علم ہے جس کا موضوع زندگی ہے جس کا میدان مطالعہ بہت ہی وسیع ہے اور اللہ کی تمام مخلوقات میں سے زیادہ دلکش چیز اس دنیا کی زندہ مخلوق ہے۔"

" ذرا پودے کو دیکھئے ' یہ نہایت ہی چھوٹا پودا ہے۔ یہ راستے کے ایک کنارے پر اگا ہوا ہے۔ کیا آپ بیشمار انسانی مصنوعات وآلات میں سے کسی چیز کو اس کے مقابلے میں پیش کرسکتے ہیں۔ یہ ایک زندہ آلہ ہے اور مسلسل رات دن چلتا رہتا ہے۔ اس کے اندر ہزاروں کیمیاوی عمل اور رد عمل واقعہ ہوتے رہتے ہیں ' طبعی تغیرات ہوتے ہیں اور پروٹوپلازم کے تحت ہوتے ہیں۔ یہ وہ مادہ ہے جو تمام زندہ کائنات کی ترکیب میں داخل ہوتا ہے۔"

" سوال یہ ہے کہ یہ زندہ اور پیچیدہ آلہ کہاں سے آگیا ؟ اسے اللہ نے صرف اس کو اس شکل میں نہیں بنایا بلکہ اللہ نے پوری زندگی کو بھی تخلیق کیا ہے اور اسے اپنے تحفظ کی قوت بھی دی ہے۔ وہ اس زندگی کو تسلسل بھی ہے اور اس نے اس کے اندر وہ تمام خواص رکھے ہیں اور تمام خصوصی صفات اس کے اندر ودیعت کیں ہیں جن کی وجہ سے ہم ایک پودے اور دوسرے پودے کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ زندہ اشیاء میں اس عظیم کثرت کا مطالعہ بھی ایک عظیم اور دلچسپ موضوع ہے اور اس سے قدرت کی طاقت کی بوقلمونیوں کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ خلیہ جس کے ذریعے نسل کشی ہوتی ہے اور ایک نیا پودا وجود میں آتا ہے اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ صرف مائیکروسکوپ سے نظر آتا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس پودے کے خواص ' ہر رگ ' ہر ریشہ ' ہر شاخ اور ہر تنا ' ہر جڑ اور ہر چھوٹا ریشہ ' ایسے انجینئروں کی زیر نگرانی سرانجام پاتا ہے کہ یہ تمام نقوش اس چھوٹے سے خلیہ کے اندر موجود ہوتے ہیں اور اس کے اندر موجود رہتے ہیں۔ یہ انجینئر کون ہوتے ہیں ؟ یہ کروموسوم ہوتے ہیں۔"

میں سمجھتا ہوں کہ اس قدر حوالے کافی ہیں اب پھر ہم دوبارہ اس حسن ادا کی طرف لوٹتے ہیں جو قرآن کی ایک کی عبارت میں موجود ہے۔ :

(آیت) "ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ (٦ : ١٠٢) (یہ سارے کام کرنے والا تو اللہ تمہارا رب ہے۔ "جو اس معجزہ حیات کا موجد ہے اور اس معجزے کا ظہور تسلسل سے ہو رہا ہے لیکن راز حیات کسی کو بھی معلوم نہیں ہے۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ تمہارا رب اور وہی اس بات کا مستحق ہے کہ تم لوگ اس کے حلقہ بگوش بنو۔ اس کے ساتھ خشوع و خضوع کرو اور اس کے احکام کا اتباع کرو۔

(آیت) "فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ (95) "پھر تم کدھر بہکے چلے جارہے ہو؟ "تم اس سچائی سے صرف نظر کرکے دوسری راہوں پر چل رہے ہو حالانکہ یہ راہ حق ہے عقلی طور پر واضح ہے 'دل لگتی بات ہے اور چشم بصیرت کے لیے تشفی ہے۔

یہ معجزہ یعنی مردے سے زندہ کو نکالنا "قرآن نے اس کا ذکر بار بار کیا ہے اور اس حقیقت کو بھی قرآن نے بار بار دہرایا ہے کہ اللہ نے اس کائنات کو سب سے پہلے پیدا کیا گیا ہے جو بتلاتے ہیں کہ خالق خائنات وحدہ لاشریک ہے۔ یہ اس لیے کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ خالق کائنات ایک ہے اور اسی وحدہ لاشریک کی بندگی کی ضرورت ہے۔ عقیدہ و نظریہ میں بھی وحدہ لاشریک کو مانا جائے اور ربوبیت بھی اسی وحدہ لاشریک کی تسلیم کی جائے۔ مراسم عبودیت بھی اسی کے سامنے بجالائے جائیں اور زندگی کے قوانین اور ضوابط بھی اسی کے احکام سے اخذ کئے جائیں۔ صرف اسی کے نافذ کردہ قانونی نظام یعنی شریعت کی پابندی کی جائے۔

(اس مصنف نے اس مقالے میں برٹرینڈرسل کے اس نظریے کی تردید کی ہے کہ زندگی اتفاق کے طور پر وجود میں آتی ہے اور اتفاقا چلی جاتی ہے)

قرآن کریم میں ان باتوں کا ذکر محض لاہوتی فلسفیانہ انداز میں نہیں کیا جاتا۔ یہ دین تو بہت ہی معقول اور سنجیدہ دین ہے اور لوگوں کا وقت لاہوتی مباحث اور فلسفیانہ موشگافیوں میں ضائع نہیں کرتا۔ دین اسلام کا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگوں کے تصور حیات کو درست کیا جائے اور انھیں صحیح افکار اور صحیح عقائد دیئے جائیں تاکہ ان کی ظاہری اور باطنی زندگی درست ہوسکے۔ لوگوں کی زندگی کی اصلاح صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ وہ صرف اللہ وحدہ کی بندگی کی طرف لوٹ جائیں اور اپنے جیسے انسانوں کی غلامی کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکیں۔ جب تک کہ وہ اپنی پوری زندگی میں اللہ کی اطاعت اختیار نہ کرلیں اور روزمرہ کی زندگی میں اللہ وحدہ کی شریعت کو نہ اپنالیں۔ حیات کے بارے میں ان کا عقیدہ اور نظریہ درست نہیں ہوسکتا، ان کی زندگی میں ایسے لوگوں کا اقتدار نہ ہو جو زبردستی ان پر مسلط ہوگئے ہوں 'جو بالفاظ دیگر حق الوہیت کے دعویدار ہیں اور لوگوں کی زندگیوں پر اللہ کے حق حاکمیت کے بجائے وہ خود اپنا حق استعمال کرتے ہی۔ یوں وہ اس دنیاکے جھوٹے خداؤں میں شامل ہوگئے ہیں انھوں نے لوگوں کی حیات دنیوی میں بگاڑ پیدا کردیا ہے اور یہ فساد محض اس لیے ہے کہ لوگ اللہ کے سوا کسی اور کی اطاعت کرنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان باتوں پر تعقیب یہ آتی ہے۔

(آیت) "ذَٰلِكُمُ اللَّهُ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ (95) "یہ سارے کام تو اللہ تمہارے رب کے ہیں پھر تم کدھر بہکے چلے جارہے ہو؟ "تمہاری زندگی میں ربوبیت یعنی مکمل اطاعت کا مستحق تو وہی ہے۔ رب کا مفہوم ہے مربی 'جس کی طرف انسان متوجہ ہو 'جو سردار اور حاکم ہو 'اپنے ان مفہومات کے ساتھ اللہ کے سوا کوئی اور رب نہیں ہے۔

(لفظ رب کی توضیح کے لیے دیکھئے امیر جماعت اسلامی پاکستان کی کتاب المصطلحات الاربعہ فی القرآن) (فی ظلال القرآن)

آیت مبارکہ :

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ○96

لغۃ القرآن: فَالِقُ : پھاڑ نکالنے والا ہے] [الْاِصْبَاحِ : صبح کی روشنی] [وَجَعَلَ : اور بنادیا] [الَّيْلَ : رات کو] [سَكَنًا : سکون " کے لیے "] [وَّالشَّمْسَ : اور سورج] [وَالْقَمَرَ : اور چاند کو] [حُسْبَانًا : حساب کرنے کے لیے] [ذٰلِكَ : وہ] [تَقْدِيْرُ : اندازہ ہے] [الْعَزِيْزِ :" جو " غالب] [الْعَلِيْمِ : بہت علم والے کا]

ترجمہ : (وہی) صبح (کی روشنی) کو رات کا اندھیرا چاک کرکے نکالنے والا ہے، اور اسی نے رات کو آرام کے لیے بنایا ہے اور سورج اور چاند کو حساب و شمار کے لئے، یہ بہت غالب بڑے علم والے (ربّ) کا مقررہ اندازہ ہے

تشریح:

اللہ عَزَّوَجَلَّ اپنی مزید عظمتیں بیان فرماتا ہے چنانچہ فرمایا کہ وہ تاریکی کو چاک کرکے صبح نکالنے والا ہے چنانچہ صبح کے وقت مشرق کی طرف روشنی دھاگے کی طرح نمودار ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خط نے تاریکی چاک کردی، یہ بھی اس کی قدرت ہے۔ نیز اس نے رات کو آرام کا ذریعہ بنایا کہ مخلوق اس میں چین پاتی ہے اور دن کی تھکاوٹ اور ماندگی کو استراحت سے دور کرتی ہے اور شب بیدار زاہد تنہائی میں اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کی عبادت سے چین پاتے ہیں۔ نیز اس نے سورج اور چاند کو اوقات کے حساب کا ذریعہ بنایا کہ ان کے دورے اور سیر سے عبادات و معاملات کے اوقات معلوم ہوتے ہیں مثلاً چاند سے قمری مہینے اور سورج سے شمسی مہینے بنتے ہیں۔ چاند سے اسلامی عبادات اور سورج سے موسموں اور نمازوں کا حساب لگتا ہے غرضیکہ ان میں عجیب قدرت کے کرشمے ہیں۔ یہ سب زبردست، علم والے کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے۔ آیت سے
معلوم ہوا کہ علم ریاضی، علمِ نَباتات، علم فلکیات اور علم الحیوانات بھی بہت اعلیٰ علوم ہیں کہ ان سے رب تعالیٰ کی قدرت کاملہ ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ عَزَّوَجَلَّ نے آسمانی اور زمینی چیزوں کو اپنی قدرت کا نمونہ بنایا ہے۔

فقر و محتاجی دور ہونے کی دعا

حضرت مسلم بن یسار (رض) فرماتے ہیں، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ دعا مانگا کرتے تھے "اللھُمَّ فَالِقَ الْاِصْبَاحِ وَجَاعِلَ اللَّیْلِ سَکَنًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا اِقْضِ عَنِّی الدَّیْنَ وَاَغْنِنِی مِنَ الْفَقْرِ وَمَتِّعْنِی بِسَمْعِیْ وَبَصَرِیْ وَقُوَّتِیْ فِیْ سَبِیْلِکَ " اے اللہ ! عَزَّوَجَلَّ، (اے) تاریکی کو چاک کرکے صبح نکالنے والے اور رات کو آرام (کا ذریعہ) بنانے والے اور سورج و چاند کو (اوقات کے) حساب (کا ذریعہ بنانے والے) میرے قرض کو پورا فرمادے اور محتاجی سے مجھے غنا عطا فرما اور مجھے میری سماعت، بصارت اور قوت سے اپنی راہ میں فائدہ اٹھانے والا بنا۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

آسمان کی نشانیوں سے وجود باری اور توحید پر دلائل

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے نباتات اور زمین کی نشانیوں سے اپنے وجود اور توحید پر استدلال فرمایا تھا اور اس آیت میں سورج اور چاند اور آسمان کی نشانیوں سے اپنے وجود اور توحید پر استدلال فرمایا ہے۔

اس آیت کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا 'اللہ تعالیٰ نے ظلمات اور نور کو پیدا فرمایا ہے 'اب فرمایا ہے کہ وہ رات کی ظلمت اور تاریکی کو چیر کر صبح کی روشنی کو پیدا فرماتا ہے جو آسمان کے کناروں پر پھیل جاتی ہے اور اس سے رات کی سیاہی مضمحل ہوتی ہوئی کافور ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ اپنی قدرت سے متضاد چیزیں پیدا فرماتا ہے اور اس سے اس کی غالب قدرت اور عظیم سلطنت ظاہر ہوتی ہے۔

اس کے بعد فرمایا اور اس نے رات کو آرام کے لیے بنایا 'یعنی رات کو جب اندھیرا چھا جاتا ہے 'تو لوگ دن کے کام کاج سے رک جاتے ہیں اور تھکے ہارے لوگ رات کی گود میں سو جاتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(آیت) "وجعلنا نومکم سباتا، وجعلنا الیل لباسا، وجعلنا النھار معاشا "۔ (النباء: ١١۔ ٩)

ترجمہ: اور ہم نے تمہاری نیند کو راحت بنایا اور ہم نے رات کو پردہ پوش کردیا اور دن کو روزی کمانے کا وقت بنایا۔

پھر فرمایا اور سورج اور چاند کو حساب کے لیے بنایا 'یعنی سورج کے یومیہ دورہ سے دن اور رات وجود میں آتے ہیں جن کو تم چوبیس ساعتوں میں تقسیم کرتے ہو اور چاند کے حساب سے تم مہینوں کا تعین کرتے ہو اور بارہ مہینوں کی گنتی سے تم سال کا حساب کرتے ہو۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

(آیت) "الشمس والقمر بحسبان "۔ (الرحمٰن: ٧)

ترجمہ: سورج اور چاند ایک حساب کے ساتھ (گردش میں) ہیں۔

(آیت) "ھو الذی جعل الشمس تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ والقمر نورا وقدرہ منازل لتعلموا عدد السنین والحساب "۔ (یونس: ٥)

ترجمہ: وہی ہے جس نے سورج کو روشن بنایا اور چاند کو نور اور اس کی منزلیں مقرر کیں تاکہ تم لوگ سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لیا کرو۔

یعنی سورج اور چاند کی گردش کے لیے ایک سال کا نصاب اور نظام مقرر کر دیا ہے۔ گرمیوں میں دن کا بڑا ہونا اور سردیوں میں دن کا چھوٹا ہونا اسی مقررہ نصاب اور نظام کی وجہ سے وجود میں آتا ہے اور سورج کے طلوع اور غروب میں اور طلوع کے بعد بتدریج نصف النہار تک پہنچنے میں اور زوال کے بعد ڈھل جانے میں تمہاری نمازوں کے اوقات اور ماہ رمضان میں سحری اور افطاری کے اوقات ہیں اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی علامتوں سے تم مہینوں کا تعین کرتے ہو اور ماہ رمضان، عید الفطر، عید الاضحیٰ اور حج کی عبادات انجام دیتے ہو۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی تین نشانیاں بیان فرمائی ہیں، رات کو چیر کر صبح کو پیدا کرنا، رات کو آرام کے لیے بنایا اور سورج اور چاند کو حساب کے لیے بنایا۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ تعالیٰ کی ان صفات کے ساتھ ثناء کر کے دعا کی ہے۔

امام مالک بن انس اصبحی متوفی ۱۷۹ھ روایت کرتے ہیں:

امام مالک کو یحییٰ بن سعید سے یہ حدیث پہنچی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس طرح دعا کرتے تھے۔ اے اللہ (رات کی تاریکی سے) صبح کو چیر کر نکالنے والے اور رات کو آرام کے لیے بنانے والے، سورج اور چاند کو حساب کے لیے بنانے والے، میری طرف سے قرض کو ادا کر دے اور مجھے فقر سے غنی کر دے اور میری سماعت اور بصارت اور میری طاقت سے مجھے اپنے راستہ میں نفع عطا فرما۔ (موطا امام مالک، رقم الحدیث: ۴۹۳، مطبوعہ دارالفکر، بیروت، ۱۴۰۹ھ) (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

آفاق سے توحید کے دلائل

صبح کے وقت مشرق کی طرف روشنی دھاگے کی طرح نمودار ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خط نے تاریکی چاک کر دی۔ یہ بھی اس کی قدرت ہے۔ ایسے ہی وہ کفر کی ظلمت پھاڑ کر اس میں نبوت کا نور پھیلانے والا ہے۔ (تفسیر نور العرفان۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی)

اللہ تعالیٰ جس طرح "فَالِقُ الْحُبِّ وَالنَّوٰی" ہے اسی طرح "فَالِقُ الْاِصْبَاحِ" بھی ہے۔ اسی نے رات کو سکون کے لیے بنایا اور شمس و قمر کو حساب کے لیے۔ ماہ و سال کا حساب انہی سے ہوتا ہے۔ البتہ کہیں سورج سے اور کہیں چاند سے، اسلام نے لوگوں کی آسانی کے لیے سورج کا پیچیدہ حساب چھوڑ کر چاند کا حساب اختیار کیا۔ چاند کے طلوع و غروب سے ماہ و سال کا حساب لگانا آسان تر ہے۔ حج، رمضان، عیدین وغیرہ کا حساب چاند پر مبنی ہے۔ صبح کی تاریکی سے روشنی پھوٹنے کو دانے اور گٹھلی کے پھوٹنے کی مانند ٹھہرایا گیا ہے۔ دونوں سے حیات پھوٹتی ہے۔ نور کا پھوٹنا نباتات اور پودے کے زمین سے پھوٹنے کی مانند ہوتا ہے۔ نور کا تاریکی سے پھوٹ کر نکلنا ایسی حرکت رکھتا ہے جو اپنی شکل میں دانے اور گٹھلی کے پھٹنے سے مشابہ ہوتا ہے۔ اس حرکت کے ساتھ نور کا نکلنا یوں ہے جیسے کہ انگوری مٹی کے پردے میں سے ظاہر ہوتی ہے۔ دونوں میں حرکت، زندگی رونق اور جمال کی صفات و علامات مشترک ہیں۔ پھر دانے اور گٹھلی کے پھٹنے اور صبح کے پھٹنے میں اور رات کے سکون میں ایک تعلق یہ بھی ہے۔ کہ اس کائنات کے اندر صبح و شام کا آنا، حرکت و سکون کا پیدا ہونا، نباتات اور حیات کے ساتھ براہ راست متعلق ہوتا ہے۔

سورج کے سامنے زمین کا گھومنا، چاند کا اتنے بڑے حجم کے باوجود اور زمین کا اس قدر دوری کے باوجود، سورج کا اتنے بڑے حجم اور حرارت میں اتنا زیادہ گرم ہونے کے باوجود یہ سارے کام کو مل کر انجام دینا اور باشندگان کرہ ارض کی خدمات ہر وقت اور ہر لحہ انجام دینا۔ ایک صاحب غلبہ واقتدار اور علیم اللہ کا ٹھہرایا ہوا اندازہ ہے۔ اگر یہ اندازہ اور خدائی حساب نہ ہوتا تو زمین پر یوں زندگی نمودار نہ ہوتی۔ نباتات واشجار نہ پھوٹتے، نور وظلمت اور حیات وموت کا یوں ظہور نہ ہوتا۔ یہ ایک دقیق ٹھہرایا ہوا، مقرر کردہ حساب ہے۔ جس کے ساتھ یہ کائنات بندھی ہوئی ہے۔ یہ کوئی محض اتفاقی حادثہ نہیں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ زندگی کائنات کے اندر محض ایک عبوری لحہ ہے، خالق کائنات کو اس کی کوئی پروا نہیں۔ ایسے اقوال کبھی فلسفہ اور علم کہلاتے تھے۔ مگر علم کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بے دین حضرات کی اہواء وخرافات ہیں جو ان کے قلوب ونفوس میں رچی ہوئی ہیں۔ انسان جب ان کے فیصلوں کو پڑھے تو محسوس کرتا ہے کہ یہ لوگ اپنی مقرر کردہ علمی حدود کی تعریفات سے خود تجاوز اور فرار کر رہے ہیں۔ وہ اللہ سے بھاگنا چاہتے ہیں جس کے دلائل وجود توحید وقدرت خود ان کے نفوس وقلوب کو گھیرے ہوئی ہیں۔ وہ بھاگ کر جہاں بھی چلے جائیں۔ اللہ کو آخر کار اپنے سامنے پائیں گے۔ پھر وہ گھبرا کر ایک اور راستہ اختیار کریں گے اور آخر کار اس کی انتہا پر بھی انھیں اللہ سامنے ملے گا! یہ بیچارے مصیبت زدہ مسکین ہیں جو ایک زمانے میں کلیسا اور اس کے اللہ سے بھاگے تھے، مگر اللہ نے ان کی گردنیں پھر اپنے سامنے جھکالیں۔ وہ اس صدی کے اوائل تک برابر بھاگتے رہے، مگر پیچھے مڑ کر نہ دیکھا مگر اللہ تعالیٰ تو ان کے تعاقب میں تھا! اگر وہ پیچھے دیکھیں تو شک کریں گے کہ کلیسا کی دوڑ ان کے پیچھے ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اور شاید ان کی طاقت ہی ختم ہو چکی ہے۔ ان بے چارے مساکین کے "علمی نتائج "آج خود ان کے مد مقابل بن کر سامنے کھڑے ہیں، بھاگ جانے کا کیا سوال ہے؟

فرینک ایلن جس کے کچھ اقتباسات ہم نے گزشتہ صفحات میں پیش کیے ہیں لکھتا ہے: "زمین کا زندگی کے لیے مناسب ہونا ایسی صورتیں اختیار کرتا ہے کہ ہم اسے محض اتفاق یا حادثہ کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ زمین ایک گول کرّہ ہے جو فضا میں لٹکا ہوا ہے اور اپنے گرد گردش کرتا رہتا ہے۔ اسی سے رات دن کا چکر چل رہا ہے۔ اور وہ سال بھر میں ایک دفعہ سورج کے گرد گھومتا ہے۔ جس سے موسم اور فصول پیدا ہوتے ہیں۔ یہ گھومنا ہمارے اس کرّے کی سطح کو زندگی کی پیدائش اور نشوونما کا مزید صالح جز مہیا کرتا ہے۔ زمین کے ٹھہراؤ کی صورت میں اس قدر مختلف انواع واقسام کی نباتات کا پیدا ہونا اور ان کی نشوونما ممکن نہ ہوتی۔ پھر زمین گیس کے ایک غلاف سے ڈھکی ہوئی ہے۔ جس میں بہت سی ایسی گیسیں موجود ہیں جو زندگی کے لیے لازم ہیں۔ یہ گیسیں بہت بلندی تک زمین کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جو پانچ سو میل سے زائد فاصلہ ہے۔ پھر ان گیسوں کی موٹائی اس قدر ہے جو لاکھوں کروڑوں شہاب ثاقب کو ہم تک پہنچنے سے روکتی ہے۔ ان تاروں کا ٹوٹنا تیس میل فی منٹ کی رفتار سے بھی تیز تر ہوتا ہے۔ اور یہ فضائی غلاف جو زمین کو محیط ہے وہ زمین کے درجہ حرارت کو زندگی کے لیے مناسب حدود کے اندر قائم رکھتا ہے۔ وہ سمندروں سے پانی کے بخارات کو اٹھا کر براعظموں کے اندر تک لے جاتا ہے۔ وہاں پر وہ گاڑھا ہو کر بادل بنتا ہے اور برستا ہے۔ جو زمین کی مردگی کو زندگی میں بدلتا رہتا ہے۔ بارش خالص پانی کا مصدر ہے اگر وہ نہ ہوتی تو زمین ایک لق ودق صحرا بن کر رہ جاتی اور اس میں زندگی کی کوئی علامت باقی نہ رہ سکتی۔ یہاں سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ فضا اور سمندر جو زمین پر ہیں وہ اس کے توازن کو برقرار رکھنے کی مشینیں ہیں۔"

ان لوگوں کے سامنے علمی دلائل بیشمار موجود ہیں۔ جو ان کے "اتفاقات" کے نظریے کو رد کرتے ہیں اور زندگی کی نشوونما کے متعلق ان کے عجز کا اعلان کرتے ہیں۔ اس طبیعات کے عالم نے جن موافقات اور مناسبات کا ذکر کیا ہے۔ کائنات میں زندگی کے لیے صرف یہی نہیں اور بھی

بیشمار اسباب و علل موجود ہیں۔اب نتیجہ اس کے سوانہیں کہ کہا جائے "ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۔ "اسی ذات نے ہر چیز کو اس کی پیدائش اور رہنمائی بخشی اور ہر چیز کو پیدا فرما کر اس کے خاص اندازے مقرر کیے ہیں۔(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

آیت مبارکہ :

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○97

لغۃالقرآن: وَهُوَ : اور وہ] [الَّذِيْ : جو] [جَعَلَ : بنائے اس نے] [لَكُمُ : تمہارے لیے] [النُّجُوْمَ : ستارے] [لِتَهْتَدُوْا : تاکہ تم سب راہ پاؤ] [بِهَا : اس کے] [فِي : میں] [ظُلُمٰتِ : اندھیروں] [الْبَرِّ : خشکی] [وَالْبَحْرِ : اور سمندر " میں " ہے] [قَدْ : تحقیق] [فَصَّلْنَا : ہم نے کھول کر بیان کردی ہیں] [الْاٰيٰتِ : واضع دلائل] [لِقَوْمٍ :" اس " قوم کے لیے] [يَّعْلَمُوْنَ : وہ سب علم رکھتے]

ترجمہ : اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے ستاروں کو بنایا تاکہ تم ان کے ذریعے بیابانوں اور دریاؤں کی تاریکیوں میں راستے پاسکو۔ بیشک ہم نے علم رکھنے والی قوم کے لیے (اپنی) نشانیاں کھول کر بیان کردی ہیں

تشریح:

اہل علم و دانش کے لیے کائنات ہستی کی ہر چیز میں توحید کی دلیلیں موجود ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی آپ کوئی چیز لیں اس کی وضع و قطع کی موزونیت، اس کی خصوصیات، اس کے ان گنت فوائد اور پھر سارے نظام عالم کے ساتھ اس کی وابستگی کو دیکھ کر انسان مجبورا کہہ اٹھتا ہے کہ اس کے بنانے والی ذات بڑی قدرت، علم اور حکمت کی مالک ہے۔ جتنا علم زیادہ ہوگا اسی مناسبت سے عرفان توحید زیادہ ہوگا۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

بحری سفر میں مستقل طور پر اور خشکی کے سفر میں بسا اوقات رات کی تاریکی میں ستاروں کے ذریعے منزل کی سمت متعین کردی جاتی ہے۔ اگر ستارے نہ ہو تو آج بھی سمندر میں سفر ناممکن ہے۔

خواہ بیابان کی تاریکیاں ہوں۔۔ یا۔۔ دریا کی، ان ستاروں کے سبب تمہیں منزل تک پہنچانے والے راستے کا پتا ملتا رہے۔

اس رہنمائی کے سوا ستاروں کے دوسرے بھی فائدے ہیں۔۔ مثلا: آسمان کی زینت ورونق ہونا اور شیطان پر رجم کرنا اور انھیں بھگانا۔ اللہ تعالیٰ نے ستاروں سے جس فائدے کا ذکر فرمایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں قدرت کی دلیل بالکل واضح ہے کہ باوصف اس کے کہ زمین اور آسمان میں بعد مسافت ہے، مگر تاروں کو آسمان زمین کی راہیں پہچاننے کیلئے حق تعالیٰ نے پیدا فرمایا۔ ان سب کو بیان کردینے کے بعد فرماتا ہے کہ۔۔۔

(ہم نے تفصیل کردی نشانیوں کی) اور مفصل طور پر بیان کردیا۔ لیکن یہ سب (انکے لئے) ہے (جو) طبع مستقیم، فکر سلیم اور (علم رکھتے ہوں)، اور خدا کی طرف سے پیش کردہ دلیل کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

زمین اور آسمانوں میں وجود باری اور اس کی توحید پر نشانیوں کو بیان کردینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے وہ نشانیاں بیان فرمائیں، جو خود انسان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ (تفسیر اشرفی۔ علامہ محمد مدنی اشرفی جیلانی)

یہ انسان پر اللہ کا انعام ہے انھیں ستاروں سے تشبیہ دیتے ہوئے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے آپ نے صحابہ کرام کے بارے میں فرمایا۔ میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں تم ان میں سے جس کی بھی اقتدا کروگے ہدایت پالوگے۔ (موسعۃ اطراف الحدیث النبوی جلد اول صفحہ 559) ستارے سورج سے روشنی پاتے ہیں اور صحابہ نے نبوت کے سراج منیر سید الانبیاء سے روشنی حاصل کی۔

(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

سید قطب شاہ فرماتے ہیں:

یہ نظام فلکی کے منظر کا تتمہ ہے جس کے اندر سورج چاند اور ستارے سرگرداں اور یہ پوری کائنات کے منظر کا حصہ ہے جو نہایت ہی وسیع ' نہایت ہی حیران کن ہے اور جس کی تمام حرکات وسکنات انسانی زندگی اور اس کے مفادات اور ضروریات کے ساتھ وابستہ ہیں۔

(آیت) "لِتَهۡتَدُواْ بِهَا فِي ظُلُمَٰتِ ٱلۡبَرِّ وَٱلۡبَحۡرِ "۔ (٦ : ٩٧ '

" تاکہ تم ان کے ذریعے صحرا اور سمندروں کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرو۔"

صحراؤں اور سمندروں کی دوریوں میں انسان ہمیشہ ستاروں کے ذریعے راستہ معلوم کرتا آیا ہے اور آج بھی وہی نظام ہے۔ اصول وہی ہیں اگرچہ دور جدید کے انکشافات کی وجہ سے وسائل بدل گئے ہیں۔ سمندری سفر کے لیے جدید آلات تیار ہوگئے ہیں لیکن اصل الاصول یہی ہے ان سفروں میں قطب شمالی اور ستاروں سے ہدایت لی جاتی ہے۔ ظلمات البر والبحر میں حسی اور حقیقی اندھیرا بھی شامل ہے اور فکری اور تصوراتی اندھیرا بھی۔ لہٰذا نص قرآن جس طرح آج سے صدیوں پہلے بامقصد تھی اسی طرح آج بھی بامقصد اور بامصداق ہے۔ آج کی بحری زندگی میں بھی اسی اصول کے مطابق ہے۔ آج بھی قرآن انسانوں سے اسی طرح مخاطب ہے جس طرح آج سے پہلے تھا حالانکہ آج کے دور میں انسانی انفس اور آفاق میں اللہ نے انسان کو وسیع علم سے نوازا ہے لیکن آج بھی ہماری بحری سفری زندگی اسی آیت کی مصداق ہے۔

قرآن آج بھی فطری انداز میں انسانوں کو خطاب کرتا ہے اور تکوینی حقائق ان کے سامنے رکھتا ہے۔ محض نظریاتی بنیادوں پر خطاب نہیں کرتا بلکہ "واقعی "صورت انسان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو آج تک قائم ہے اس صورت میں خطاب کے نتیجے میں صانع کائنات کی کارفرمائی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اللہ کی تقدیر اس کی تدبیر اور اس کی شان رحیمی عقل ونظر سے بالکل روشن نظر آتی ہے۔ انسان بصیرت حاصل کرتا ہے 'اس کے ادراک کو جلا ملتی ہے اور وہ کائنات پر تدبر بھی کرتا ہے۔ اس سے نصیحت بھی حاصل کرتا ہے اور اپنے علم '

اپنی معرفت اور ترقی کو اس کائنات میں کار فرما حقیقت کبری کے ادراک کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ حقیقت انسان کے سامنے رکھنے کے بعد کہ اللہ بحر و بر کے اندھیروں میں ان کی راہنمائی کا انتظام کرتا ہے یہ تعقیب آتی ہے۔

(آیت) "قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (97)

" دیکھو ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں 'ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں"۔

اس لیے کہ صحرا کی پہنائیوں اور سمندر کی تاریکیوں میں ستاروں سے ہدایت تب ہی لی جا سکتی ہے جب انسان کو ستاروں کے مداروں 'ان کے دوروں اور مختلف اوقات میں ان کے مواقع کے بارے میں علم حاصل ہو اور معنوی اندھیروں میں ہدایت وہ لوگ لے سکتے ہیں جنہیں علم ہو کہ یہ کائنات صانع حکیم کی بنائی ہوئی ہے جیسا کہ ہم نے کہا یہاں ہدایت سے مراد دونوں قسم کی ہدایات ہیں 'حسی اور بحری سفر کی ہدایات بھی اور معنوی اور گمراہی قلب و نظر کی ہدایات بھی۔ وہ لوگ جو ستاروں کو حسی رہبری کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اس رہبری سے اپنے خالق تک پہنچنے کی ہدایت و بصیرت اخذ نہیں کرتے وہ گویا علم سے محروم ہیں کیونکہ انھوں نے ان چیزوں سے جھوٹی اور حقیر ہدایت تو لی لیکن ہدایت کبری اخذ نہ کی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس کائنات کا تعلق رب کائنات سے کاٹنا چاہتے ہیں اور اس کائنات کے ان دلائل سے وہ ہدایت اخذ نہیں کرتے جو مبدع عظیم پر دال ہیں۔ صدق اللہ العظیم۔ (فی ظلال القرآن)

الٹا ہی اثر

ستاروں کے بارے میں بھی بہت توہم پرستی پائی گئی۔ انگلش کا جو لفظ ہے۔disaster۔ اس کا مطلب ہوتا ہےstars are against us۔ ستارے میرے خلاف ہیں۔ تو ستاروں کو تقدیر کا مالک بنا لیا۔ تو بتایا کہ وہ تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ اور ستارہ پرستی کی جو جدید شکل ہمارے معاشرے میں نظر آتی ہے۔ وہhorescopesپر یقین رکھتا۔ کہ toursکے ساتھ یہ ہونے والا ہے۔ اورscorpioکے ساتھ یہ۔ تمام انسانیت کو 12 کیٹیگریز میں تقسیم کر دیا گیا۔ اور اس پر اتنا یقین کر لیا کہ اچھا تم کینسر ہو۔ تو کینسر کا تو Picecusکے ساتھ گزارا نہیں۔ اچھا تم یوں ہو۔ اچھا تم فلاں ہو۔ اتنا ان چیزوں کے اندر ملوث ہو گئے۔ اور اتنی سنجیدگی کے ساتھ ان کو لینے لگ گئے۔ تو ہم پرستی کا شکار ہو گئے۔ یہ بھی شرک ہی کی ایک قسم ہے۔ ان کو تو پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ یقین کرنا تو بہت دور کی بات۔ پڑھنا بھی اس لیے avoid کرنا چاہیے کہ بعض دفعہ انسان کے دماغ میں وہی خیال بس جاتا ہے۔ رہ جاتا ہے۔ ہنر شعوری طور پر انسان کی وھم کا یا شگون کا شکار ہو سکتا ہے۔ تو فرمایا کہ یہ تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ صرف ایک ہدایت کا یاguidanceکا ذریعہ ہیں۔lamps میں۔ اللہ نے ان کو آسمان میں لگا دیا۔lamps کی سی حالت ہے ان کی۔ یاmaps کی طرح ہیں۔ آج بھیships وغیرہ ستاروں سے راہ نمائی لیتے ہیں۔ پرانے زمانے میں تو جب گھڑی نہیں تھی تو ستاروں کو دیکھ کر ہی وقت کا اندازہ لگایا جاتا تھا۔ کہ رات کی کتنی گھڑیاں گزر گئیں۔ اور کتنی باقی ہیں۔ اور خشکی کا سفر کرتے وقت کا اندازہ لگایا جاتا تھا۔ کہ رات کی کتنی گھڑیاں گزر گئیں۔ اور کتنی باقی ہیں۔ اور خشکی کا سفر کرتے وقت بھی تاروں ہی سے راہ نمائی لی جاتی تھی۔

(تفسیر تنویر۔ زاہدہ تنویر)

آیت مبارکہ :

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ○98

لغۃ القرآن: وَهُوَ : اور وہ] [الَّذِيْٓ :" وہ ہے " جو] [اَنْشَاَكُمْ : اس نے پیدا کی تمہیں] [مِّنْ : سے] [نَّفْسٍ : نفس کو] [وَّاحِدَةٍ : ایک] [فَمُسْتَقَرٌّ : پھر ٹھہرنے کی جگہ ہے] [وَّمُسْتَوْدَعٌ : اور ایک سون ہے جانے کی] [قَدْ : تحقیق] [فَصَّلْنَا : ہم نے کھول کر بیان کردی ہیں] [الْاٰيٰتِ : واضع دلائل] [لِقَوْمٍ :" اس " قوم کے لیے] [يَفْقَهُوْنَ : سب سمجھ جائیں]

ترجمہ : اور وہی (االلہ) ہے جس نے تمہیں ایک جان (یعنی ایک خلیہ) سے پیدا فرمایا ہے پھر (تمہارے لئے) ایک جائے اقامت (ہے) اور ایک جائے امانت (مراد رحم مادر اور دنیا ہے یا دنیا اور قبر ہے)۔ بیشک ہم نے سمجھنے والے لوگوں کے لیے (اپنی قدرت کی) نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں

تشریح :

زمین وآسمان کی مختلف اشیاء کے ذکر کے بعد قدرت اپنے شاہکار حضرت انسان کا ذکر کر رہی ہے کہ ان سب کا اصل الاصول اور جد امجد ایک آدم ہے (علیہ السلام)۔ مستقر کا معنی ہے قرار پکڑنے کی جگہ۔ مستودع کہتے ہیں اس جگہ کو جہاں کوئی چیز بطور امانت رکھی جاتی ہے۔آیت میں ان الفاظ سے کیا مراد ہے۔اس کے متعلق علماء کے متعدد اقوال ہیں بعض نے کہا کہ مستقر سے مراد ماں کا شکم ہے اور مستودع سے باپ کی پیٹھ۔ بعض نے کہا کہ مستقر سے مراد زمین ہے جہاں انسان دنیوی زندگی بسر کرتا ہے اور مستودع سے مراد قبر ہے جہاں مرنے کے بعد حشر تک کا درمیانی عرصہ گزارنا ہوتا ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

انسان ایک نطفہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جس کی بنیاد ایک خلیہ ہے جو انسان کی پیدائش کی اصل بنتا ہے مرد کی صلب کے اندر ایک ٹھکانے پر ہوتا ہے، پھر اس کا مستقر عورت کا رحم ہوتا ہے اس کے بعد زندگی نشو و نما اور پھیلاؤ حاصل کرتی ہے۔جب تک اللہ کے حکم سے روئے زمین پر انسانی حیات موجود رہے گی یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ حیات کو سمجھنے کے لیے گہرائی پر اترنا، غور و فکر کرنا ضروری ہے۔ جتنی بات انسان کے سمجھنے کی ہے

اور اس کے لیے ضروری یا مفید ہے وہ اللہ تعالیٰ نے کھول کر بیان فرمادی ہے۔ جہاں سے عالم غیب کی حدود شروع ہوتی ہیں وہاں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں۔ نفس واحدہ سے حیات کا نکلنا اور پھر ایک طویل سلسلہ قائم ہو جانا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور صفت تخلیق پر دلالت کرتا ہے۔ جسے سوچ کر انسان اللہ کی طرف گامزن ہو سکتا ہے۔ مذکر اور مونث کی ایک متناسب تعداد ہر وقت دنیا میں موجود رہتی ہے تاکہ توالد و تناسل کا سلسلہ قائم رہ سکے اور ایک مقرر وقت تک دنیا کا سلسلہ چل سکے۔ اس موضوع پر مفصل گفتگو کی گنجائش نہیں۔ صرف مذکر یا مونث کے نطفے کی پیدائش کی کیفیت اور اس کے متعلق بعض باتوں پر مختصراً کلام کرنا ضروری ہے تاکہ پتہ چل سکے کہ ربانی تقسیم سے کس طرح یہ تذکیر و تانیث کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ جو حیات کے قیام و استمرار کا ذریعہ ہے۔

نر و مادہ کا تناسب و توازن

اللہ تعالیٰ علیم و قدیر کی تقدیر سے نر و مادہ کے کروموسوم باہم ملتے اور مذکر یا مونث بچے کی پیدائش کا سبب بنتے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک غیبی تدبیر ہے۔ جس میں اللہ کے سوا کسی کا ہاتھ کارفرما نہیں۔ اللہ تعالیٰ کبھی مذکر اور کبھی مونث یا صرف مذکر یا صرف مونث پیدا فرماتا ہے۔ یہ اس توازن و تناسب کو برقرار رکھتا ہے جو زمین پر توالد و تناسل کے لیے ضروری ہے۔ اس سے انسانیت میں انتشار نہیں پڑتا۔ کوئی شخص یہ بھی سوچ سکتا تھا کہ صرف نسل کی بقاء و کثرت کے لیے تو چند نروں کا وجود کافی ہو سکتا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ توازن و تناسب کیوں قائم فرمایا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حیوانات میں تو واقعی ایسا ممکن اور درست تھا مگر نسل انسانی میں صرف پیدائش کافی نہ تھی۔ بلکہ انسانی نشو و نما اور تربیت اولاد کے لیے ضروری تھا کہ بچے ایک خاندان میں والدین کے زیر سایہ پیدا ہوں اور نشو و نما پائیں۔ صرف اسی صورت میں زمین پر انسانیت برقرار رہ سکتی تھی۔ پس قضاء و قدر خداوندی کا یہ فیصلہ ہوا کہ نر و مادہ میں عدد کا تناسب بھی قائم رکھا جائے۔ حیوانات میں یہ ضروری نہ تھا لہٰذا وہاں پر اس تعداد اور توازن کا قائم رکھنا لازم نہ ہوا۔ اگر صرف اس توازن ہی کو لیا جائے تو یہ اللہ تعالیٰ خالق کائنات کی حکمت و تدبیر اور رحمت و تقدیر پر دلالت کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس آیت کا اختتام جو اس جملے پر فرمایا گیا ہے کہ (قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ) کی گہرائی یہی ہے۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

انسان کے نفس سے وجود باری تعالیٰ اور توحید پر دلائل

زمین اور آسمانوں میں وجود باری اور اس کی توحید پر نشانیوں کا بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے وہ نشانیاں بیان فرمائیں جو خود انسان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس نے تم کو ایک نفس سے پیدا فرمایا اور وہ حضرت آدم (علیہ السلام) ہیں جن کی نسل سے ازدواج اور تناسل کے ذریعہ تمام انسان پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(آیت) "یایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیرا ونسآء "

(النساء: ۱)

ترجمہ: اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان (آدم) سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی زوجہ (حوا) کو پیدا کیا اور ان دونوں سے بکثرت مردوں اور عورتوں کو پھیلا دیا۔

تمام انسانوں کو ایک نفس سے پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کے وجود 'اس کی وحدت 'اس کے علم اور اس کی قدرت اور اس کی حکمت پر دلالت کرتا ہے ' کہ انسان غور کرے جس طرح تمام انسانوں کا سلسلہ ایک نفس پر جا کر ختم ہو جاتا ہے 'اسی طرح اس کائنات اور حوادث کا سلسلہ بھی ایک اصل اور ایک فاعل مختار پر ختم ہو جاتا ہے اور وہ اللہ عزوجل کی ذات مقدسہ ہے اور وجود واحد ہے اور واجب اور قدیم ہے 'ورنہ اسے بھی کسی موجد کی ضرورت ہوتی اور اس تمام کائنات کو اس نمط واحد پر اس نے علم اور حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے 'اور ظاہر ہے اس کے علم اور قدرت کے بغیر انسانوں کا یہ سلسلہ وجود میں نہیں آسکتا تھا۔

تمام انسان نسلا 'برابر ہیں

تمام انسانوں کا ایک نفس سے پیدا ہونا جس طرح اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی معرفت کا ذریعہ ہے 'اسی طرح اس میں یہ رہنمائی بھی ہے کہ تمام انسان ایک اصل اور ایک نوع سے ہیں 'ان کا ایک خمیر ہے۔ یہ ایک ماں باپ کی اولاد ہیں 'یہ سب آپس میں بھائی ہیں 'انھیں باہم بھائیوں کی طرح شیر وشکر رہنا چاہیے اور اختلاف اور انتشار نہیں کرنا چاہیے 'ان میں رنگ 'نسل اور علاقہ اور زبان کا جو اختلاف ہے 'وہ محض شناخت اور تعارف کے لیے ہے ورنہ اصل ان سب کی ایک ہے 'اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(آیت) "یایھا الناس اناخلقنکم من ذکر وانثی وجعلنکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عنداللہ اتقکم"۔ (الحجرات: ۱۳)

ترجمہ: اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا 'اور ہم نے تمہیں (مختلف) بڑی قومیں اور قبائل بنایا 'تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو 'بیشک اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ بزرگی والا وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہو۔

امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ روایت کرتے ہیں:

ابو نضرہ بیان کرتے ہیں کہ ایام تشریق کے وسط میں جس شخص نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خطبہ سنا 'اس نے مجھ سے بیان کیا کہ آپ نے فرمایا اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے 'سنو! کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے اور نہ عجمی کی عربی پر کوئی فضیلت ہے 'کسی گورے کی کالے پر کوئی فضیلت نہیں ہے نہ کسی کالے کی گورے پر کوئی فضیلت ہے۔ (الحدیث)

(مسند احمد 'ج ۱۷ 'رقم الحدیث: ۲۳۳۸۱ 'مطبوعہ دارالحدیث قاہرہ 'مسند احمد 'ج ۵ ص ۴۱۱ 'طبع قدیم 'حافظ الہیثمی نے کہا اس حدیث کے تمام راوی صحیح ہیں۔ مجمع الزوائد 'ج ۳ 'ص ۲۶۶)

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایام تشریق کے وسط میں ہمیں حجۃ الوداع کا خطبہ دیا اور فرمایا اے لوگو! تمہارا رب واحد ہے اور تمہارا باپ واحد ہے 'سنو! کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے اور نہ کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت ہے 'نہ گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو گورے پر کوئی فضیلت ہے 'مگر صرف تقوی سے 'بیشک تم میں سب سے زیادہ عزت والا

وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو 'سنو کیا میں نے تبلیغ کر دی ہے ؟ صحابہ نے کہا کیوں نہیں یار سول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ نے فرمایا تو حاضر غائب تک یہ پیغام پہنچادے۔ (شعب الایمان ج ۴ ص ۲۸۹ 'مطبوعہ دار الکتب العلمیہ 'بیروت ۱۴۱۰ھ)

(تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

ڈارون کے نظریہ کا بطلان

معلوم ہوا ڈارون کا یہ نظریہ کہ بندروں سے انسان بنے ہیں قرآن کے خلاف ہے قرآن تو فرمارھا ہے کے سب انسانوں کو ایک جان سے پیدا کیا گیا۔ بلکہ یہ نظریہ عقل کے بھی خلاف ہے اگر یہ بات ہوتی تو آج بندر موجود نہ ہوتے مگر آج سے ہزار ہا برس پہلے بھی بندر بندر ہی تھے اور انسان انسان پر اب بھی بندر بندر ہی ہیں اور انسان انسان ہیں بلکہ ہر مخلوق جیسے ہزاروں برس قبل تھی ویسے ہی اب بھی ہے مثلاً اونٹ بھیڑ بکری گائے گھوڑا گدھا وغیرہ سب اپنی ایک ہی حالت پر چلے آرہے ہیں تو صرف بندروں میں ہی یہ تبدیلی کیسے آئی ؟ بلکہ یہ نظریہ تذلیل انسانیت ہے۔
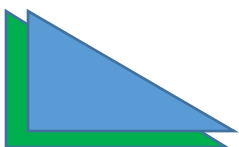
یاد رہے ! جو انسان مرنے کے بعد جلا دیا جائے، اس کی راکھ کے ذرے جہاں پڑیں وہی اس کا مستودع ہے اور اللہ تعالی اسے وہیں سے اٹھالے گا اور انہی ذروں سے روح کا تعلق قائم کر کے سوالات قبر بھی ہو جاتے ہیں۔

(برہان القرآن القران۔علامہ قاری محمد طیب صاحب)

اسارے انسان صرف ایک نفس سے پیدا ہوئے۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) بی بی مریم سے پیدا ہوئے، اور وہ اپنے آباء وامہات کی نسبت سے آدم (علیہ السلام) کی اولاد سے ہیں اس میں اگر ایک طرف قدرت الٰہی کا مظاہرہ ہے، کہ اس نے ایک ہی اصل سے کروروں اور اربوں انسانوں کی تخلیق فرمائی اور تخلیق کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔۔ نیز۔۔ بیشمار آدمیوں کے اجزاء مادیہ کو پشت سیدنا آدم میں رکھ دیا، جن کو ان کے وقت پر ظاہر فرماتا رہا اور وہ بھی اس عجیب قدرت و حکمت کے ساتھ، کہ یہ اربوں انسان شکل و صورت، رنگ وروپ قدو قامت، زبان وبیان، طبیعت ومزاج اور ذہن وفکر وغیرہ وغیرہ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف وممتاز ہیں۔ یہاں تک کہ ان کروڑوں انسانوں کے انگوٹھے کا نشان بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتا۔۔۔

دوسری طرف یہ اس کا عظیم احسان ہے، کہ اس نے ہم سارے انسانوں کا دادا صرف ایک کو بنایا، اس لیے کہ کوئی کسی کے متعلق سمجھتا ہے کہ اس کا ہمارا دادا ایک ہے، تو پھر ایک دوسرے سے ناراض نہیں ہوتا اور اگر بعض لوگ ناراض بھی ہوں، تو محسوس نہیں کرتا۔ایسی صورت میں فطرت سلیمہ، انسانیت، کی بنیاد پر ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کا مطالبہ کرتی ہے۔

(تو) اے ایک جان یعنی ایک ذات سے پیدا ہونے والو ! تمہارے واسطے پشت پدر۔۔ یا۔۔ روئے زمین میں (جائے قیام بھی ہے اور) رحم مادر میں (محل وداع بھی) ہے، جہاں بطور امانت رکھا جاتا، پھر نکال لیا جاتا ہے۔

ایک قول کے مطابق قرار کی جگہ قبر ہے اور امانت کی جگہ دنیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جہاں آدمی کو قرار نہ ہو، امانت رہنے کی جگہ وہی ہے۔ تو اس حساب سے صلب پدر، رحم مادر اور قبر سب امانت کی جگہ ہے، جس کو بہر حال چھوڑنا ہوتا ہے۔ رہ گئی قرار کی جگہ، جہاں جا کر پھر نکلنا ہی نہ ہو، تو وہ ایمانوالوں کیلئے بہشت ہے اور کافروں کیلئے دوزخ ہے۔

(بیشک) مذکورہ بیان سے (تفصیل فرمادی ہم نے آیتوں) یعنی اپنی وحدانیت کی نشانیوں (کی، ان کے لیے جو سمجھیں)، یعنی ان لوگوں کیلئے جو اپنی عقل وفکر اور گہری نظر سے پوشیدہ اور نہایت باریک نکتے سمجھتے ہیں۔

اس مقام پر یہ نکتہ ذہن میں رہے کہ جب ذکر نجوم اور آیات آفاق کا تذکرہ فرمایا، تو یہ کہا کہ یہ نشانیاں ان کے لیے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔۔ لیکن۔۔ جب تخلیق انسانی میں آیات انفس کی طرف اشارہ فرمایا، تو یہ ارشاد فرمایا کہ 'یہ ان کے لیے ہیں جو سمجھیں'۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آیات آفاق اظہر واجلی اور ظاہر وروشن ہیں، جن میں کوئی پوشیدگی نہیں، خاص طور سے اہل علم کیلئے۔

اسکے برخلاف آیات انفس ادق اور اخفی یعنی نہایت دقیق اور بہت زیادہ پوشیدہ ہیں، تو اسکو سمجھنے کیلئے فقہ کی ضرورت ہے، جس سے خفی معنی معلوم کئے جاتے ہیں، اسی لیے پہلی جگہ **لقوم یعلمون** ہے، تو دوسری جگہ **لقوم یفقھون** ہے۔۔۔

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے زمین کی نشانیوں سے وجود باری تعالیٰ اور توحید پر استدلال کیا۔ دوسری بار آسمان کی نشانیوں میں سے سورج اور چاند سے استدلال کیا۔ پھر تیسری بار ستاروں سے استدلال کیا۔ چوتھی بار نفس انسان سے استدلال کیا۔ اور اب پانچویں بار آسمان سے نازل ہونے والی بارش سے استدلال کیا۔ اس آنے والی آیت میں وجود باری اور اس کی توحید پر دلیل بھی ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بیان بھی ہے۔ (تفسیر اشرفی۔ علامہ محمد مدنی اشرفی جیلانی)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرکے نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس کو اس طرح قدم قدم آگے بڑھنے کے امکانات سے بہرہ ور فرمایا اور ہر سطح پر اس کی ضروریات کو اس طرح پورا فرمایا اور ہر مرحلے پر اس کی ہدایات کے ایسے سامان فرمائے کہ ان کی تفصیل دیکھ کر آدمی حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ کیونکہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ تمام مخلوقات کے بچوں سے زیادہ بے بسی کی تصویر ہوتا ہے۔ ایک بلی کا بچہ آنکھیں کھولتے ہی اپنی ماں کے پستان تلاش کرلیتا ہے 'مرغی کا بچہ چند گھنٹوں کے بعد اپنی ماں کے پیچھے چلنے لگتا ہے 'ایک بھینس کا بچہ چند ہی گھنٹوں میں اٹھ کر لڑکھڑاتا ہوا اپنی غذا کی جگہ پہنچ جاتا ہے۔ لیکن انسان کا بچہ جب زمین پر اترتا ہے تو نہ خود چل سکتا ہے نہ پکڑ سکتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے نہ سن سکتا ہے کسی طرح کا احساس بھی اپنے اندر نہیں رکھتا لیکن عجیب بات ہے کہ ان تمام چیزوں کی تلافی کے لیے ماں کے سینے میں مامتا کا جوش پیدا کردیا جاتا ہے اس کی بانھیں بے تابانہ اپنے بچے کو اٹھانے کے لیے لپکتی ہیں۔ باپ کے کندھے اس کا بوجھ اٹھانے کے لیے بے قرار ہو ہو جاتے ہیں۔ ماں جوش محبت میں اسے سینے سے لگاتی ہے تو وہیں اس کے لیے غذا کے سوتے جاری کردیئے جاتے ہیں پھر وہ آہستہ آہستہ حواس سے نوازا جاتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

واللهُ اَخۡرَجَکُمۡ مِّنۡۢ بُطُوۡنِ اُمَّهٰتِکُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ شَیۡـًٔا ۙ وَّ جَعَلَ لَکُمُ السَّمۡعَ وَ الۡاَبۡصَارَ وَ الۡاَفۡـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ۔

(اللہ وہ ذات ہے 'جس نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس طرح نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔ پھر اس نے تمہیں قوت سماعت عطا کی 'قوت بصارت عطا کی اور عقل وخرد سے نوازا تاکہ تم شکر ادا کرو) (النحل: ۷۸)

یعنی انسان کو جن علمی خزانوں سے مالامال کیا ان میں سب سے پہلے مشاہداتی قوت پھر سماعی قوت یعنی مشاہدات کے بعد مسموعات کا علم اور سمعی و بصری ذرائع سے کام لینے کا جذبہ اور اسی کے ضمن میں باقی حواس کو بھی شامل سمجھئے کیونکہ یہ دونوں ذرائع باقی حواس کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ لیکن جہاں حواس اپنا سفر مکمل کر لیتے ہیں وہاں اللہ تعالیٰ عقل و خرد کا چراغ روشن فرماتے ہیں جس میں دماغ اپنا کام کرتا ہے اور قلبی بصیرت اپنا فرض انجام دیتی ہے۔ اَفْئِدَۃَ دماغی اور قلبی دونوں قوتوں پر دلالت کرتا ہے۔ پھر ان نعمتوں کے ساتھ ساتھ انسان کی غذائی ضرورتوں کے لیے سطح زمین پر دستر خوان بچھا دیا گیا ہے آسمان سے پانی برستا ہے اور عناصر قدرت اس دستر خوان کو سجانے کے لیے ہمہ وقت اپنا فرض انجام دیتے ہیں۔ پھر نسل انسانی کی بقاکے لیے انسان ہی کی جنس سے اس کا جوڑا پیدا کیا گیا اور پھر آگے توالد و تناسل سے انسانی قافلے کو اس طرح پروان چڑھایا گیا کہ آغاز حضرت آدم اور حضرت حوا سے ہوا اور بڑھتے بڑھتے یہ قافلہ اربوں تک پہنچ گیا۔ ان میں اگرچہ شکلوں صورتوں زبانوں اور لہجوں کا اختلاف ہے لیکن جبلی تقاضوں اور فطری داعیات کے لحاظ سے کامل اتفاق پایا جاتا ہے۔ ایک بہت بڑا اختلاف ہم مرد اور عورت میں دیکھتے ہیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ ان دونوں کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ سازگاری کے جو ظاہری محرکات پائے جاتے ہیں اس کا نتیجہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ایک کشش اور ایک ضرورت محسوس کرتے ہیں اور ہر ایک اپنی جگہ دوسرے کے لیے اپنے اندر ایک خلا محسوس کرتا ہے اور جب تک ان دونوں میں فطری اور شرعی طریقے سے یکجائی پیدا نہیں ہوتی وہ خلا بھرنے کا نام نہیں لیتا اس طرح انسانی قافلے کا ایک ساتھ چلنا خاندان اور قوموں کی شکل اختیار کرنا اور انسانی معاشرے کا وجود میں آنا کیا بجائے خود اس بات کی دلیل نہیں کہ اگر اس انسانی قافلے کا خالق ایک نہیں بلکہ دو ہوتے تو ان میں یہ یکسانی یہ ہم آہنگی پھر ان کو قدم قدم پر ضرورتوں کا مہیا کرنا ہر سطح پر ان کی نمود و پرداخت اور ان کی تربیت کے امکانات کو بروئے کار لانا کیا دو خداؤں کی صورت میں ایسا دور دور تک ممکن ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہاں اللہ کی وحدانیت پر استدلال کرتے ہوئے توجہ دلائی جا رہی ہے کہ انسانوں! خود اپنے تخلیقی عمل اور اپنے گرد و پیش میں پھیلے ہوئے انسانی قافلے کو اور اب تمہاری ضرورتوں کی تکمیل کے لیے اللہ کی بے کراں نعمتوں کو دیکھو یہ سب کس بات پر دلالت کر رہی ہیں کیا اس بات پر کہ خدا ایک ہے اور وہی تمہارا اللہ ہے یا اس بات پر کہ یہاں مختلف قوتیں ' مختلف قوانین یا مختلف دیوتا اپنی اپنی خدائی کا صور پھونک رہے ہیں اور یہ کائنات ان کی ایک رزم گاہ ہے جس میں یہ تصادم جاری ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو یہ جو ہمیں نمود و پرداخت کا عمل دکھائی دیتا ہے اور جس میں قدم قدم پر انسان نوازا جا رہا ہے کیا اس کا دور دور تک امکان ہو سکتا تھا؟ پھر اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے صرف تمہیں پیدا ہی نہیں فرمایا بلکہ اس نے تمہارے لیے مستقر بھی پیدا فرمایا جس طرح جب ایک بچہ جوان ہو جاتا ہے تو ماں باپ کو اس کا گھر بسانے کی فکر ہوتی ہے ' چنانچہ جب اس کا گھر بسانے کا فیصلہ ہوتا ہے تو پہلے اس کے لیے گھر بنایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب انسانوں کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو پہلے ان کے لیے ایک مستقر بنایا یعنی ایک ایسی جگہ جہاں جا کر وہ رہ سکیں اور بس سکیں۔ یقیناً وہ جگہ ایسی ہونی چاہیے جہاں ان کے قرار ' ان کی سکونت اور رہائش کی آسانیاں میسر ہوں ' جہاں وہ ساری چیزیں موجود ہوں جو ایک گھر کو گھر بناتی ہیں اور جو رہنے والوں کی ضرورت ہوتی ہیں اس حوالے سے جب ہم دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ تمام زمین پر جہاں جہاں بھی نسل انسانی آباد ہے پروردگار نے کس طرح اس کے رہنے اور بسنے کے امکانات اور وسائل مہیا فرما دیئے ہیں۔ پہاڑوں کے غار اور سایہ دار درختوں کے جھنڈ اور چٹانوں کے سائے یہ تو وہ چیزیں ہیں جو حیوانوں کو بھی میسر ہیں لیکن انسان نے اس سے بہت آگے قدم بڑھایا وار اس کی فطرت میں یہ بات ڈال دی گئی کہ تم اگر اس دنیا میں تسخیر کا عزم لے کر نکلو گے تو اس کی ایک ایک چیز تمہارے لیے ہے۔ صرف اولوالعزمی اور حوصلہ مندی کی ضرورت ہے چنانچہ انسان نے پہاڑوں کے سینے چیر ڈالے '

فضاؤں میں کمندیں ڈالیں ' لوہے میں قوت پرواز پیدا کردی ' سمندر کی تہوں میں اتر گیا ' ہر جگہ سے اس نے اپنی قوت تسخیر سے خراج وصول کیا اور یہ صرف اس لیے ہوا کہ اللہ نے پہلے سے یہ خزانے اسی کے لیے پیدا فرمائے تھے اور اس میں تجسّس و جستجو کا مادہ رکھا تھا اور حوصلہ مندی اس کے ہم رکاب کردی گئی تھی اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا تھا کہ قدرت نے زمین کو اس کے لیے مستقر ٹھہرایا تھا۔ ذرا اندازہ فرمائیے کہ یہ مستقر انسان کے لیے ایسا کافی ثابت ہوا ہے کہ انسان پیدا بعد میں ہوتا ہے زمین اپنی آغوش اس کے لیے پہلے کھول دیتی ہے وہ اندر سمٹ کر بیٹھتا ہے آکسیجن اسے ڈھونڈ لیتی ہے۔ باہر نکلتا ہے تو ہوائیں اس سے اٹھکیلیاں کرتی ہیں ' گھٹائیں اس کے استقبال کے لیے جھوم کے اٹھتی ہیں ' سورج اپنی روشنی سے اس کے راستے کو روشن کرتا ہے ' زمین اپنا سینہ اس کے لیے وا کردیتی ہے کیونکہ اس کا مستقر اس سے بخل نہیں کرسکتا اور اللہ کے حکم سے سرتابی نہیں کرسکتا۔ قرآن کریم یہاں اس حقیقت کو واشگاف کررہا ہے کہ انسانو ! اگر اس زمین و آسمان کے الگ الگ خدا ہوتے تو کیا زمین پر اترنے کے بعد تمہارے لیے یہی امکانات مہیا ہوتے اور تمہارے تخلیقی عمل سے لے کر تمہارے زندگی گزارنے کے آخری مرحلے تک اسی طرح تمہاری نگرانی ' تمہاری حفاظت اور تمہاری دیکھ بھال ہوتی۔ یقینا یہ پورا سلسلہ عمل ایک ہی اللہ کے وجود اور ایک ہی معبود اور تمہارے عبد ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

مستقر اور مستودع کا معنی

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا پھر ہر ایک کے ٹھہرنے کی جگہ اور اس کی سپردگی کی جگہ ہے حضرت ابن مسعود (رض) نے فرمایا استقرار کی جگہ رحم ہے اور سپردگی کی جگہ وہ زمین ہے جہاں وہ دفن ہوگا۔ اور حسن بصری نے کہا استقرار کی جگہ قبر میں ہے اور اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ استقرار کی جگہ قبر ہے اور سپردگی کی جگہ صلب (پشت) میں ہے۔ حضرت ابن عباس (رض) سے ایک روایت یہ ہے کہ استقرار کی جگہ زمین میں ہے اور سپردگی کی جگہ پشت میں ہے۔ سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ مجھ سے حضرت ابن عباس (رض) نے پوچھا کیا تم نے شادی کرلی ہے ؟ میں نے کہا نہیں فرمایا اللہ عزوجل تمہاری پشت سے ان کو نکالے گا جن کو اس نے تمہاری پشت کے سپرد کیا ہے اور حضرت ابن عباس (رض) سے دوسری روایت یہ ہے کہ مستقر وہ ہیں جو پیدا ہوچکے اور مستودع وہ ہیں جو ابھی پیدا نہیں ہوئے اور حضرت ابن عباس (رض) سے ایک اور روایت یہ ہے کہ مستودع وہ ہیں جو اللہ کے نزدیک ہیں۔

الجامع لاحکام القرآن جزء ۷ ص ۴۳ ' مطبوعہ دار الفکر ' بیروت ۱۴۱۵ھ)

قرآن مجید کی ایک اور آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مستقر زمین میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

(آیت) "ولکم فی الارض مستقر ومتاع الی حین"۔ (البقرہ : ۳۶)

ترجمہ : اور تمہارے لیے ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھہرنے کی جگہ اور فائدہ ہے۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

وَهُوَ الَّذِيٓ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۚ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَىۡءٍ فَاَخۡرَجۡنَا مِنۡهُ خَضِرًا نُّخۡرِجُ مِنۡهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًاۚ وَمِنَ النَّخۡلِ مِنۡ طَلۡعِهَا قِنۡوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنۡ اَعۡنَابٍ وَّالزَّيۡتُوۡنَ وَالرُّمَّانَ مُشۡتَبِهًا وَّغَيۡرَ مُتَشَابِهٍؕ اُنۡظُرُوۡۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثۡمَرَ وَيَنۡعِهٖؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكُمۡ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ○99

لغۃالقرآن: وَهُوَ : اور وہ] [الَّذِيٓ :" وہ ہے " جو] [اَنْزَلَ : اسنے نازل کی] [مِنَ السَّمَآءِ : آسمان سے] [مَآءً : پانی] [فَاَخْرَجْنَا : تو ہم نے نکالیں] [بِهٖ : اس کو] [نَبَاتَ : نباتات] [كُلِّ : ہر] [شَيْءٍ : چیز] [فَاَخْرَجْنَا : پھر ہم نے نکالی] [مِنْهُ : اس سے] [خَضِرًا : سبز " شاخ "] [نُّخْرِجُ : ہم نکالتے ہیں] [مِنْهُ : اس سے] [حَبًّا : غلہ] [مُّتَرَاكِبًا : ایک دوسرے سے جڑے ہوئے] [وَمِنَ : اور میں سے] [النَّخْلِ : کھجور کے درختوں] [مِّنْ : سے] [طَلْعِهَا : اس کے گابھے] [قِنْوَانٌ : گچھے ہیں] [دَانِيَةٌ : جھکے ہوئے] [وَّجَنّٰتٍ : اور باغات ہیں] [مِّنْ : سے] [اَعْنَابٍ : انگوروں] [وَالزَّيْتُوْنَ : اور زیتون] [وَالرُّمَّانَ : اور انار] [مُشْتَبِهًا : ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں] [وَّغَيْرَ : اور نہیں] [مُتَشَابِهٍ : ملتے جلتے] [اُنْظُرُوْٓا : تم سب دیکھو] [اِلٰى : کی طرف] [ثَمَرِهٖٓ : اس کے پھل] [اِذَآ : جب " کہ "] [اَثْمَرَ : وہ پھل دیتا ہے] [وَيَنْعِهٖ : اور اس کے پکنے کی طرف] [اِنَّ : بیشک] [فِي : میں] [ذٰلِكُمْ : یہ " سب "]

[لَاٰيٰتٍ : یقینا نشانیاں ہیں] [لِّقَوْمٍ : اس قوم کیلئے] [يُّؤْمِنُوْنَ : وہ سب ایمان لاتے ہیں]

ترجمہ : اور وہی ہے جس نے آسمان کی طرف سے پانی اتارا پھر ہم نے اس (بارش) سے ہر قسم کی روئیدگی نکالی پھر ہم نے اس سے سرسبز (کھیتی) نکالی جس سے ہم اوپر تلے پیوستہ دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے گابھے سے لٹکتے ہوئے گچھے اور انگوروں کے باغات اور زیتون اور انار (بھی پیدا کئے جو کئی اعتبارات سے) آپس میں ایک جیسے (لگتے) ہیں اور (پھل، ذائقے اور تاثیرات) جداگانہ ہیں۔ تم درخت کے پھل کی طرف دیکھو جب وہ پھل لائے اور اس کے پکنے کو (بھی دیکھو)، بیشک ان میں ایمان رکھنے والے لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں

تشریح:

قرآن مجید میں انسانی زندگی، پھل، پھول، نباتات اور درخت وغیرہ کے اگانے کے سلسلے میں پانی کا ذکر کئی مرتبہ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے سبب حیات قرار دیا ہے۔ زمین کی زینت، مردہ زمین کی زندگی، پودوں اور سبزی ترکاری کی شادابی، ان کی پیدائش اور قیام، پھر ان کا رنگ برنگے پھل پھول پیدا کرنا، غلے، میوے، چارہ، بیشمار نفع آور اشیاء کا پیدا ہونا، پکنا اور انسان کے کھانے کے قابل ہونا، ان کی خوبصورتی اور زینت ان تمام چیزوں کو وجود باری تعالیٰ پر دلیل توحید الوہیت اور ربوبیت قرار دیا گیا ہے۔ "اور وہ وہی خدا ہے جس نے اوپر سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ساتھ ہر چیز کی انگوری نکالی۔"

ہر چیز کے اگانے میں پانی کا جو کام ہے وہ شہری و دیہاتی اور عالم و جاہل پر واضح ہے۔ مگر اس کا کام اس ظاہر سے بہت آگے، بہت گہرا اور بہت موثر ہے۔ سائنس کی جدید ترین تحقیقات بتاتی ہیں کہ زمین کی سطح شروع شروع میں بالکل گرم تھی۔ اور وہ نباتات کو اگانے کے قابل نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ نے اسے پانی اور کئی اور فضائی عوامل سے کاشت اور بیج اگانے کے قابل بنایا۔ بارش کے ساتھ ایک قدرتی کھاد بھی نائٹروجن گیس کے ساتھ زمین پر برستی ہے۔ جو زمین کو زرخیز اور سبزی ترکاری وغیرہ اگانے کے قابل بناتی ہے۔ انسان نے بھی اسی سے کھاد بنانے اور زمین کو زرخیز کرنے کا طریقہ سیکھا ہے، پھر سورج، چاند، ہوا وغیرہ بھی اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ سطح زمین کے اوپر اور اس کے اندر بیشمار ایسے کیمیاوی اور غیر کیمیاوی مادے موجود ہیں جو اس سارے کام میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔

نباتات کے مختلف ادوار واطوار

"پس نکالا ہم نے اس سے سبز انگوری کو جس سے ہم تہ در تہ دانے نکالتے ہیں اور کھجور کی کونپل سے لٹکے ہوئے گچھے اور انگوروں کے باغ اور زیتون و انار باہم ملتے جلتے اور نہ ملتے جلتے۔"
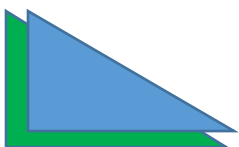
ہر انگوری شروع میں سبز ہوتی ہے اور یہاں پر خضرا کا لفظ زیادہ موثر اور گہرا ہے بہ نسبت اخضر کے۔ اس سبز انگوری سے دانے پیدا ہوتے ہیں جو اوپر نیچے بالیوں میں سجے ہوتے ہیں۔ بعض غلے اور پھل شکل و صورت اور مزے میں باہم ملتے جلتے ہوتے ہیں اور بعض نہیں۔ ایک ہی پھل کسی زمین میں ترش اور تلخ ہوتا ہے۔ اور دوسری جگہ میٹھا۔ تاثیر میں بھی بعض ایک جیسے ہیں بعض مختلف، پھر فرمایا:

"جب وہ درخت پھل لائے تو اس کے پھل کو دیکھو، اور پھر اس کے پکنے کا مشاہدہ کرو۔"

ان پھلوں کو دیکھ کر دل میں سرور اور آنکھوں میں نور پیدا ہوتا ہے۔ جب کچے ہوں تو رنگ وروپ اور رونق ہوتی ہے۔ پکنے پر آئیں تو آہستہ آہستہ بدلتے جاتے ہیں۔ اور پک کر تیار ہوں تو ہر دیکھنے والے کا جی للچاتا ہے۔ سبحان اللہ! یہ صنعت، یہ مہارت، یہ کاری گری ایک ہی عزیز و علیم کی ہے۔ اس لیے فرمایا:

"بیشک اس میں بہت سے دلائل ہیں ان کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔"

انھیں کھاتو ہر ایک لیتا ہے لیکن نور بصیرت اور حس ایمان کے ساتھ وہی دیکھتا ہے جس میں ایمان ہو۔ پھلوں اور غلوں کے مختلف ادوار پر غور کریں گے تو ان میں ایمان باللہ، وحدانیت، قدرت، علم و صنعت ملیں گے۔ جو تمہیں زبان حال اور زبان قال سے احسن الخالقین کی حمد و ثنا پر آمادہ کریں گے۔ اتنی آیات قدرت کو دیکھ کر جو انسان کے ماحول میں اس کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے بکھری پڑی ہیں۔ جو لوگ توحید خداوندی کا اعتراف و اقرار نہ کریں، خود ساختہ معبودوں کو پکاریں، ان میں ایسی صفات اور طاقت مانیں جس کا ان میں کہیں نام و نشان نہیں۔ تو پھر یہی کہا جاسکتا ہے کہ مشرک اندھے، بہرے اور گونگے ہیں۔ بے عقل و بے شعور ہیں، ناشکرے ہیں، حیوانات سے بھی بدتر ہیں۔ اس لیے اگلی آیت میں شرک اور مشرکین اور ان کے بنائے ہوئے شرکاء کا رد کیا گیا ہے۔

زمین کے جن پودوں یا ان کے متعلقات کے نام قرآن مجید میں آئے ہیں ان کی تعداد اور نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ من ۲۔ کھجور ۳۔ زیتون ۴۔ انگور ۵۔ انار ۶۔ انجیر ۷۔ سدرہ یا بیری ۸۔ جھاؤ ۹۔ شجر مسواک ۱۰۔ حنا یا کافور ۱۱۔ ادرک ۱۲۔ مسور ۱۳۔ پیاز ۱۴۔ لہسن۔ ۱۵۔ ککڑی ۱۶۔ ببول عرب یا کیلا ۱۷۔ لوکی ۱۸۔ رائی ۱۹۔ ریحان ۲۰۔ زقوم ۲۱۔ ضریع ۲۲۔ طوبی ۲۳۔ شجر ۲۴۔ ثمر ۲۵۔ برگ ۲۶۔ اناج ۲۷۔ زراعت ۲۸۔ چارہ ۲۹۔ ترکاری ۳۰۔ افزائش نباتات۔

کھجور:

لیکن یہاں ہم صرف کھجور اور انگور کے بارے میں کچھ لکھیں گے۔ ان کو دیگر پودوں پر ایک امتیاز اور برتری حاصل ہے۔ یوں تو تمام نباتات اور پودے خالق ارض و سماء کے پیدا کیے ہوئے ہیں لیکن ان چند پودوں کا تذکرہ اس ذات الٰہی نے خود اپنے کلام میں کیا ہے، اس طرح ان پودوں کا نام ابد الآباد تک کلام الٰہی میں محفوظ ہوگیا اور کلام الٰہی میں ان کا ذکر آنے سے ان کی خصوصیتوں کا سمجھنا ایک علمی و دینی ضرورت بن گئی ہے۔

قرآنی نام:

۱۔ نَخْل، نَخِیل، نَخْلَۃ

دیگر نام:

Date (انگریزی)، Datte (فرانسیسی)، Tamar-Tamarim (عبرانی)، کھجور (اردو، پنجابی، ہندی)، خرما (فارسی)، کھرجور (سنسکرت) کرجورو (کشمیری)۔

نباتاتی نام :

(Phoenix dactylifera Linn. (Family: Palmae/Aracaceae)

قرآن مجید میں کھجور کاتذکرہ :

۱۔البقرہ،آیت : ۲۲۶۶۔الانعام،آیت : ۱۰۰۳۔الانعام،آیت : ۱۴۲

۴۔الرعد،آیت : ۵۴۔النحل،آیت : ۱۱، ۶۱۰۔النحل،آیت : ۶۷

۷۔بنی اسرائیل،آیت : ۹۱، ۸۹۰۔الکہف،آیت : ۹۳۲۔مریم،آیت : ۲۳

۱۰۔مریم،آیت : ۲۵، ۱۱۲۴۔طٰہٰ آیت : ۷۱ ۱۲۔المؤمنون : ،آیت : ۱۹

۱۳۔الشعراء،آیت : ۱۴۱۴۸۔یٰسٓ،آیت : ۳۵، ۱۵۳۳۔قٓ،آیت : ۱۰

۱۶۔القمر،آیت : ۲۰، ۱۷۱۸۔الرحمٰن،آیت : ۱۱، ۱۸۱۰۔الرحمٰن،آیت : ۶۹، ۶۸

۱۹۔الحاقۃ،آیت : ۷، ۲۰۶۔عبس،آیت : ۳۲، ۲۴

قرآنی ارشادات کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے متعدد باران احسانوں اور مہربانیوں کاذکر کیا ہے جواس نے پھلوں کی صورت میں انسان پر کیے ہیں۔ ان پھلوں میں یوں توانگور،انجیر،انار اور زیتون کاتذکرہ کئی بار بار آیا ہے لیکن جس پھل اور درخت کاحوالہ سب سے زیادہ دیا گیا ہے وہ کھجور ہے۔اس کا بیان نخل۔النخیل (جمع) اور نخلۃ (واحد) کے ناموں سے بیس مرتبہ قرآن کریم میں کیا گیا ہے۔

کھجور کی قسموں اوراس کی گٹھلیوں وغیرہ کاذکر بھی قرآن پاک میں الگ الگ ناموں سے کیا گیا ہے۔مثلاً سورۃالحشر آیت ۵ میں کھجور کی ایک نفیس قسم کو "لینۃ "کہا گیا ہے۔اسی طرح سورۃالنساء کی دوآیات ۵۳اور ۱۲۴میں "نقیرا "کالفظ تمثیل کے طور پر استعمال ہوا ہے جس کے لغوی معنی یوں تو کھجور کی گٹھلی میں چھوٹی سی نالی کے ہیں لیکن تشبیہ دی گئی ہے ایسی چیز سے جو نہ ہونے کے برابر یعنی حقیر ترین ہو۔ایسی ہی مثال سورۃفاطر آیت ۱۳میں لفظ "قطمیر "سے دی گئی ہے جس کے معنی اس باریک جھلی کے ہیں۔جو کھجور کی گٹھلی کے اوپر ہوتی ہے۔ "النوی "کے معنی زیادہ تر مفسرین نے عام گٹھلی کے لیے ہیں۔ "العرجون "کھجور کے گچھے کی ٹہنی کو کہتے ہیں جو درخت پر خشک ہو کر ہنسلی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔چنانچہ سورۃیٰسٓ آیت ۳۹میں اس کی مثال نئے چاند سے دی گئی ہے۔ "حبل "کے معنی یوں تو کسی بھی رسی کے ہو سکتے ہیں۔لیکن پرانے زمانے میں عرب عام طور پر کھجور کی پتیوں سے بنی ہوئی رسی مراد لیتے تھے۔اسی طرح سورۃالقمر کی آیت ۱۳میں لفظ "دسر "کااستعمال ہوا ہے،اس کے معنی بھی Palm-Fibre کے لیے گئے ہیں۔مختلف ناموں کے حوالے سے کھجور کاذکر قرآن حکیم میں اٹھائیس بار ہوا ہے۔

سائنس دانوں کاخیال ہے کہ کھجور کی کاشت آٹھ ہزار سال قبل جنوبی عراق میں شروع ہوئی تھی۔اس وقت دنیا میں کہیں بھی پھلدار پودوں کی کھیتی کاتصور تک نہ تھا۔

عربوں میں ایک پرانی کہاوت تھی کہ سال میں جتنے دن ہوتے ہیں اتنے ہی کھجور کے استعمال کے فوائد ہیں،اور حقیقت بھی کچھ ایسی ہی لگتی ہے۔ایک طرف اس کی لکڑی عمارت اور فرنیچر بنانے کے کام آتی ہے تو دوسری جانب اس کی پتیوں سے جن کو شاخیں کہا جاتا ہے بیشمار مصنوعات تیار کی جاتی ہیں۔

کھجور کی گٹھلیاں جانوروں کے لیے موزوں چارہ ہیں اور اس کے پھل انسان کے لیے بہترین غذا ہیں۔ اس کی غذائیت کا اندازہ اس کے کیمیاوی اجزاء سے کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں تقریباً ساٹھ فیصد Invert sugar اور Sucrose کے علاوہ اسٹارچ، پروٹین، Cellulose, Pectin, Tannin اور چربی مختلف مقدار میں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں وٹامن اے، وٹامن بی، وٹامن بی ٹو اور وٹامن سی بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کے معدنیاتی اجزاء بھی اہمیت کے حامل ہیں، یعنی سوڈیم، کیلشیم، سلفر، کلورین، فاسفورس اور آئرن، سے بھرپور ہے۔ کھجور میں نر اور مادہ درخت ہوتے ہیں۔ دونوں کے پھولوں کے ذریعہ (Cross Polination) ہوتا ہے۔ تب ہی مادہ پودوں میں پھل آتے ہیں۔ ایک نر درخت کے پھول ایک سو مادہ درختوں کے (Polination) کے لیے کافی سمجھے جاتے ہیں۔ اسلام سے قبل عرب قبائل کی آپس کی دشمنی اور رقابت میں ایک دوسرے کو نقصان اور ضرر پہنچانے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ دشمن کے کھجور کے باغات تہس نہس کر دیے جائیں۔ نر پودوں کو خاص طور سے کاٹ دیا جاتا تھا۔

کھجور کے بے مثال طبّی فوائد ہیں۔ بلغم اور سردی کے اثر سے پیدا ہونے والی بیماریوں میں کھجور کھانا مفید ہے۔ یہ دماغ کا ضعف مٹاتی ہے اور یادداشت کی کمزوری کا بہترین علاج ہے۔ قلب کو تقویت دیتی ہے اور بدن میں خون کی کمی کو دور کرتی ہے، گردوں کو قوت دیتی ہے، سانس کی تکالیف میں بالعموم اور دمہ میں بالخصوص سود مند ہے۔ کھانسی، بخار اور پیچش میں اس کے استعمال سے افاقہ ہوتا ہے۔ یہ دافع قبض کے ساتھ پیشاب آور بھی ہے۔ قوت باہ کو بڑھانے میں مددگار ہے۔ غرضیکہ کھجور کا استعمال ایک مکمل غذا بھی ہے اور اچھی صحت کے لیے ایک لاجواب ٹانک بھی۔ طب نبوی میں کھجور کی بڑی افادیت بیان کی گئی ہے۔ کھجور کی عالمی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ پیداواری ملکوں میں مقامی کھپت کے ماسوا پانچ سے آٹھ لاکھ ٹن کھجور دنیا کے بازاروں میں بھیجی جاتی ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق ۱۹۸۲ء میں کھجور کی عالمی پیداوار چھبیس لاکھ ٹن تھی جس کا ۵۶ فیصد حصہ عراق، سعودی عرب، مصر اور ایران میں پیدا کیا گیا۔ عراق کا شہر بصرہ کھجور کی تجارت کے لیے زمانہ قدیم سے بہت مشہور رہا ہے۔ آج بھی سب سے زیادہ کھجوریں اسی بندرگاہ سے برآمد کی جاتی ہیں۔ عراق میں ۴۴۵ اقسام کی کھجوریں پائی جاتی ہیں کھجور کے اعتبار سے عراق پوری دنیا میں سرفہرست ہے۔ کھجور کی تاریخی اور سماجی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی غذائی اور طبّی خصوصیات کی روشنی میں اسے "نباتاتی نعمت" کہا جائے تو نہایت مناسب ہوگا۔ اسی نعمت کی بنا پر قرآن مجید میں اس کا کئی بار ذکر ہوا ہے ان لوگوں کے لیے جو عقل و تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیل رکھتے ہیں۔

انگور

قرآنی نام:

عنب، اعناب (جمع)

دیگر نام:

Grape (انگریزی)، فرشک، انگور (فارسی)، عنب (عربی)، انگور (اردو، فارسی)

قرآن مجید میں انگور کا تذکرہ:

۱۔ البقرہ، آیت: ۲۶۶ ۲۔ الانعام، آیت: ۱۰۰ ۳۔ الرعد، آیت: ۴

۴۔ النحل، آیت: ۱۱ ۵۔ النحل، آیت: ۶۷ ۶۔ بنی اسرائیل، آیت: ۹۱

۷۔ الکہف، آیت : ۳۲ ۸۔ المؤمنون، آیت : ۱۹ ۹۔ یٰس، آیت : ۳۴

۱۰۔ النباء، آیت : ۳۲ ۱۱۔ عبس، آیت : ۲۸۔ ۲۷

انگور کا شمار قدرت کی بہترین نعمتوں میں کیا جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم میں اس کا ذکر عنب اور اعناب (جمع) کے نام سے مندرجہ بالا گیارہ آیات میں کیا گیا ہے۔ انگور فارسی لفظ ہے جس کا نباتاتی نام Vitis Vinifera ہے۔ اس طرح کھجور کے بعد انگور کی تاریخ بھی پھلوں میں سب سے قدیم مانی جا سکتی ہے۔

انگور سے پیدا کی گئی قسموں (Varieties) کی تعداد آٹھ ہزار تک پہنچ چکی ہے۔ اس کی کاشت دنیا کے بہت سے ممالک میں عام ہے جن میں سرفہرست ہیں اٹلی، فرانس، روس، اسپین، ترکی، ایران، افغانستان، جاپان، شام، الجیریا، مراکش، فلسطین اور امریکہ۔ انگور کی کل عالمی پیداوار کا نصف یورپ کے ممالک پیدا کرتے ہیں۔

کیمیاوی طور سے انگور، گلوکوز اور فرکٹوز کا بہترین ذریعہ ہے جو اس میں پندرہ سے پچیس فیصد تک پائے جاتے ہیں اس کے سوا Tartaric acid اور Malic acid بھی خاصی مقدار میں ملتے ہیں۔ سوڈیم پوٹاشیم، کیلشیم اور آئرن کی قابل قدر مقدار اس میں موجود ہے جبکہ پروٹین اور چربی برائے نام ہے۔ اس میں ایک بہت اہم کمپاؤنڈ بھی دریافت ہوا ہے جس کو وٹامن "پی" (P) کہا گیا ہے۔ یہ کیمیاوی جز ذیابیطس سے پیدا شدہ خون کے بہنے کو روکتا ہے۔ جسم کے ورم اور نسوں کی سوجن کو کم کرتا ہے اور Atherosclerosis کا موثر علاج ہے۔ کیمیاوی اجزاء کی بنا پر انگور ایک ایسا لاجواب ثمر ہے جو نہایت ہاضم ہونے کے ساتھ انتہائی فرحت بخش اور Demulcent ہے۔ خون کو صاف کرتا ہے اور جسم میں خون کی مقدار بڑھاتا ہے اور عام جسمانی کمزوری کو دفع کرتا ہے۔ کچے انگور کا رس گلے کی خرابیوں میں مفید سمجھا جاتا ہے۔ اس کی پتیاں اسہال کو روکتی ہیں۔ اس کی بیلوں سے حاصل کیا گیا رس (Sap) جلد کی بیماریوں میں کام میں لایا جا سکتا ہے۔ یورپ میں یہی رس Ophthalmia کا بہترین علاج مانا جاتا ہے۔ انگوری سرکہ معدہ کی خرابیوں، ہیضہ اور قولنج کی اچھی دوا ہے۔

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

وھو الذین انزل من السماء وما۔ وہی ذات ہے جس نے آسمان سے اتارا پانی یعنی بادلوں سے بارش۔ انزل۔ سے بارش مراد ہے جو کھیتوں باغوں کو زندگی دیتی ہے۔ سماء۔ لغت میں ہر اونچی چیز کو کہتے ہیں جیسے سما البیت۔ مکان کے چھت کو کہتے ہیں۔ بادل بلندی پر ہوتے ہیں اس کی طرف اشارہ ہے ماء سے بارش کا پانی مراد ہے۔ **اخرجنا بہ نبات کل شی**۔ تاکہ نکالیں تمہارے لیے اس پانی سے سبزیاں ہر قسم کی یعنی ان کی نشو و نما کا سبب پانی کو بتایا ایک جو سبب ہے اور مسببات کے انواع اصناف مختلفہ ہیں یہ بھی شان قدرت ہے۔ نبات۔ مصدر رہے اس کے معنی اُگنا ہے یعنی اگنے والی چیز۔ جب اگنے والی چیز سر نکالتی ہے جسے کو نپل کہتے ہیں۔ کل شی سے مراد ہر اگنے والی چیز۔ انھیں کو نباتات کہتے ہیں۔ **فاخرجنا منہ خضراً**۔ تو نکالا ہم نے ان سبزیوں سے سخت سبز رنگ اور ہلکے سبز رنگ۔ خضرً۔ سے مراد ہری ڈالیں ہرے پتے ہیں۔ اخضر۔ اصل سبز رنگ کو کہتے ہیں جو بذات خود سبز ہو۔ **نخرج منہ حبا متراکباً**۔ جو شاخیں نکلتی ہیں ان سے دانہ بنتا ہے جو نکالتے ہیں ہم اس سے سبزی سے دانہ ایک پر ایک چڑھا ہوا وہ بالوں میں دانہ کا نقشہ ہے جو دانہ پر دانہ چڑھا ہوا ہوتا ہے یعنی بارش کے ذریعہ پہلے ہر نبات کی کونپلیں زمین سے نکلتی ہیں پھر وہ کونپلیں سبز لکڑیاں، سبز شاخیں پتے بن جاتی ہیں پھر انھیں پتوں میں سے اوپر تلے چنے ہوئے دانے نکلتے ہیں اب آگے باغ کی شان قدرت بیان کی جاتی ہے۔

و من النخل من طلعھا قنوان دانیۃ۔ اور کھجور سے اس کی شاخیں میں گچھے، کھجور کے درخت کو نخل کہا جاتا ہے۔ کیونکہ تمام میوؤں میں کھجور افضل ہے کہ اس میں لذت بھی ہے غذائیت بھی حضرت مریمؑ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی ولادت کے وقت کھجوریں ہی کھائی تھیں۔ خزاں کا اثر کھجور کے درخت پر نہیں ہوتا۔ یہ درخت جفاکش ہوتا ہے یہ درخت پانی کھاد کا محتاج نہیں اس کی عمر بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کٹ جانے کے باوجود پھر تازہ ہو جاتا ہے۔ دیار حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں بڑی برکات سے اس کی کثرت ہے۔ خود سرکار کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے دست مبارک سے اس کے درخت زمین میں لگائے اور ان میں چودہ سو برس گزر جانے کے باوجود آج تک پھل لگتا رہا۔ اب نجدی حکومت نے کٹوا دیئے ہیں۔ لیکن ہر سال اس میں سے شاخیں نکلتی رہتی ہیں۔ اس مبارک درخت میں جب پھل لگنے کا وقت آتا ہے تو سرے پر پٹھا نکلتا ہے اسے طلع کہتے ہیں پھر اس پٹھے میں گچھے لگتے ہیں۔ اسے قنو کہتے ہیں۔ قنوان قنو کی جمع ہے جسے صفوان صفو کی جمع ہے۔ دانیۃ۔ دنو سے بنا اس کے معنی قرب ہیں یعنی اس بارش کی برکت سے کھجور کے درخت میں گابھے اور گابھوں میں ایسے گچھے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے شاخیں پھلوں کے وزن سے زمین کے قریب تک آ جاتی ہیں۔ مدینہ منورہ میں ایسے کھجور کے درخت دیکھنے میں آتے ہیں جن کے گچھے زمین پر پڑے ہیں ان کی کیفیت بیان فرمائی ہے۔ وجنت من اعناب۔ اور باغ انگور کے۔ جنات۔ جمع ہے جنت کی۔ اس کا معنی گھنا باغ ہے۔ انگور کے ایک یا دو درخت فائدہ مند نہیں ہوتے اس لیے باغ کا ذکر فرمایا کھجور کا ایک ہی درخت مفید ہوتا ہے مگر انگور کے باغ جس میں کثرت سے بیل ہوتی ہے جو فائدہ مند ہوتی ہے۔ اعناب۔ عنب کی جمع ہے یعنی ہم بارش کے ذریعہ انگوروں کے باغ لگاتے ہیں۔ والزیتون والرمان مشتبھا وغیر متشابہ۔ اور ایسے ہی زیتون اور انار جس طرح کھجور کی نشو ونما کی گئی ایسے ہی زیتون اور انار کی بھی کی گئی۔ زیتون کے درخت اور پھل دونوں کو زیتون ہی کہتے ہیں اس کے تیل کو زیت کہتے ہیں۔ اس کے درخت شام وغیرہ کے علاقہ میں بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ **مشتبھا دغیر متشابہ**۔ زیتون اور انار کے درخت اور ان کے پتے تو ہم شکل ہوتے ہیں مگر پھل مختلف ہیں۔

زیتون کا درخت بالکل انار کی طرح ہوتا ہے یعنی برابر کے پھل انگور اور کھجور کے ہوتے ہیں۔ لیکن انار کا پھل بڑا ہوتا ہے۔ انار کا پھل جب شروع میں نکلتا ہے تو بہت کمزور اور ننھے منے ہوتے ہیں لیکن جب پک جاتا ہے اور ان کا نضج مکمل ہو جاتا ہے تو ان کی منافعت ان میں جمع ہو جاتی ہے اور پھل بڑا بھی ہو جاتا ہے اور لذیز بھی۔ غیر متشابہ۔ انگور، انار، کھجور دیکھنے میں متشابہ ہوتے ہیں مگر ان کے مزے مختلف ہیں۔ انظروا الی ثمرہ اذا اثمر۔ تو ان پھلوں میں غور کرو کہ کیسے چھوٹے اور مختلف مزے کے ہوتے ہیں جن سے نفع حاصل نہ کیا جا سکے۔ وینعہ۔ ینع مصدر ہے۔ اس کے معنی پھل پک جانا ہے یعنی ان میں غور کرو اور اللہ تعالیٰ کی شان قدرت پر ایمان لاؤ کہ ایک ہی پھل ایک ہی وقت میں کچھ ہے اور دوسرے وقت میں کچھ۔ پھر ان پھلوں کا پکنا دیکھو موٹے۔ خوشبودار اور خوشنما ہو جاتے ہیں۔ **ان فی ذلکم لایت یقوم یومنون**۔ بیشک اس میں ایمان والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ (تفسیر الحسنات۔ علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)

سابقہ آیات سے ارتباط

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے زمین کی نشانیوں سے وجود باری تعالیٰ اور توحید پر استدلال کیا 'دوسری بار آسمان کی نشانیوں میں سے سورج اور چاند سے استدلال کیا 'پھر تیسری بار ستاروں سے استدلال کیا 'چوتھی بار نفس انسان سے استدلال کیا اور اب پانچویں بار آسمان سے نازل ہونے

والی بارش سے استدلال کیا۔ اس آیت میں وجود باری اور اس کی توحید پر دلیل بھی ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بھی بیان ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اولاً آسمان سے پانی بادلوں کی طرف آتا ہے اور پھر بادلوں سے زمین پر پانی برستا ہے۔ اور بعض علماء کہتے ہیں کہ دریاؤں اور سمندروں سے بخارات اوپر اٹھ جاتے ہیں اور بادل بن جاتے ہیں اور برسنے برستا ہے۔ اور بعض علماء کہتے ہیں کہ دریاؤں اور سمندروں سے بخارات اوپر اٹھ جاتے ہیں اور بادل بن جاتے ہیں اور برسنے لگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے: وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا اس کا معنی ہے آسمان کی جانب سے پانی برسایا۔

کھجور کے فضائل اور اس کا مومن کی صفت پر مشتمل ہونا

اللہ نے اس آیت میں چار قسم کے درخت بیان فرمائے ہیں۔ کھجور ' انگور زیتوں اور انار اور درخت کے پھلوں سے پہلے کھیتوں کا ذکر فرمایا ' کیونکہ کھیتوں سے غذا حاصل ہوتی ہے اور درختوں کے پھلوں سے لذت حاصل ہوتی ہے اور غذا الذت سے اہم اور اس پر مقدم ہے ' اور کھجور کو باقی پھلوں پر مقدم کیا ' کیونکہ کھجور غذا کے قائم مقام ہے، خصوصا عربوں میں اور حکماء نے بیان کیا ہے کہ کھجور کی حیوان کے ساتھ کئی وجوہ سے مناسبت ہے اس کے متعلق حدیث میں ہے :

امام احمد بن علی المثنی التمیمی التوفی ۳۰۷ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت علی بن ابی طالب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کھجور کے درخت کی توقیر اور تعظیم کرو ' وہ تمہاری پھوپھی ہے ' کیونکہ وہ اس مٹی سے پیدا کی گئی ہے جس سے حضرت آدم پیدا کیے گئے تھے اس کے علاوہ اور کسی درخت کو گابھن نہیں کیا جاتا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بچہ جننے والی عورتوں کو تازہ کھجوریں کھلاؤ اور تازہ کھجوریں میسر نہ ہوں تو چھوارے کھلاؤ ' اور اللہ کے نزدیک اس درخت سے زیادہ اور کوئی عزت والا درخت نہیں ہے ' جس کے نیچے مریم بنت عمران اتری تھیں۔ (مسند ابو یعلی ' موصلی ج ۱ ' رقم الحدیث : ۴۵۵ ' حلیۃ الاولیاء ' ج ٦ ' ص ۱۳۳ ' کامل ابن عدی ' ج ٦ ' ص ۲۴۲۴ ' مجمع الزوائد ج ۵ ' ص ۸۹)

اس حدیث کی سند منقطع ہے۔ عروہ بن رویم کی حضرت علی سے ملاقات نہیں ہے ' اس کے علاوہ اس کا ایک روای مسرور بن سعید ضعیف ہے۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵٦ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا درختوں میں سے ایک درخت ہے جس کے پتے نہیں گرتے اور وہ مسلمان کی مثل ہے۔ مجھے بتاؤ ' وہ کون سا درخت ہے ؟ لوگوں کا خیال جنگل کے درختوں کی طرف گیا ' حضرت عبداللہ نے کہا میرا ذہن کھجور کے درخت کی طرف گیا ' لیکن مجھے (بڑے لوگوں کے سامنے بولنے سے) شرم آئی۔ پھر لوگوں نے کہا یارسول اللہ ! بتائیے ! وہ کونسا درخت ہے ؟ آپ نے فرمایا وہ کھجور کا درخت ہے ' میں نے حضرت عمر (رض) سے اس کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا اگر تم اس وقت یہ بتادیتے کہ یہ کھجور کا درخت ہے تو مجھے یہ فلاں فلاں چیز سے زیادہ محبوب ہوتا۔

(صحیح البخاری ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ٦۲۔ ٦۱ ' صحیح مسلم ' منافقین ' ٦۳ ' (۲۸۱۱) ٦۹٦۵ ' سنن کبری للنسائی ' ج ٦ ' رقم الحدیث : ۱۱۲٦۱ ' مسند احمد ' ج ۲ ' ص ۱۲۳ ' ٦۱ ' طبع قدیم)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کھجور کے درخت کو مومن اور مسلم کے ساتھ اس لیے تشبیہ دی ہے کہ اس درخت میں خیر بہت زیادہ ہے 'اس کا سایہ دائمی ہے 'اس کا پھل میٹھا ہے اور یہ ہمیشہ کھایا جاتا ہے۔ تازہ بھی اور خشک بھی 'اس کے منافع بہت ہیں 'اس کے تنے کے شہتیر بناتے ہیں جو تعمیر کے کام آتے ہیں۔ اس کے پتوں سے رسی 'چٹائی 'ٹوپی اور پنکھے بنائے جاتے ہیں 'اس کی گٹھلی سے تسبیح بنتی ہے اور کئی قسم کے کام آتی ہے 'پھر یہ بہت حسین و جمیل درخت ہے۔ اسی طرح مومن میں بھی بہت خیر ہے۔ اس کا عبادت کرنا 'اچھے اخلاق سے پیش آیا 'عبادت میں توانائی حاصل کرنے کے لیے کھانا پینا 'آرام کرنا اور سونا۔ غرضیکہ حسن نیت سے اس کا ہر کام عبادت ہے 'اور اس میں اجر و ثواب ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مومن کی صفت یہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے محبت کرتا ہے اور درختوں میں کھجور کے درخت کی یہ صفت ہے کہ وہ آپ سے بہت محبت کرتا ہے حتیٰ کہ کھجور کا ایک شہتیر جس سے ٹیک لگا کر آپ خطبہ دیتے تھے 'وہ آپ کے فراق سے چلا چلا کر رونے لگا 'مومن کی محبت کے متعلق یہ حدیث ہے۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : کوئی بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہوگا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے اھل 'اس کے مال اور سب لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤ۔ ایک اور روایت میں ہے حتیٰ کہ میں اس کے نزدیک اس کی اولاد 'اس کے والد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

(صحیح البخاری 'ج ۱ 'رقم الحدیث : ۱۵ 'صحیح مسلم 'ایمان ۶۹ (۴۴) ۱۶۷۔۱۶۶ 'سنن النسائی 'ج ۸ 'رقم الحدیث : ۵۰۱۳ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۱ 'رقم الحدیث : ۶۷)

اور آپ سے محبت کی بناء پر آپ کے فراق میں کھجور کے درخت کے رونے کے متعلق یہ حدیث ہے :

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت جابر (رض) عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جمعہ کے دن کھجور کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے تھے۔ انصاری کی ایک خاتون نے کیا یا رسول اللہ ! کیا میں آپ کے لیے ایک منبر نہ بنادوں ' ! آپ نے فرمایا اگر تم چاہو تو انھوں نے آپ کے لیے ایک منبر بنادیا 'پھر جب جمعہ کا دن آیا تو آپ منبر پر کھڑے ہوگئے تو وہ کھجور کا تنا بچہ کی طرح چیخ چیخ کر رونے لگا 'آپ نے اس کو اپنے ساتھ لپٹایا تو وہ بچہ کی طرح سسکیاں اور سبکیاں بھرنے لگا۔ حضرت جابر نے کہا وہ آپ کے ذکر کے فراق سے رو رہا تھا دوسری سند کے ساتھ حضرت جابر سے روایت ہے کہ مسجد نبوی کی چھت کھجور کے تنوں سے بنی ہوئی تھی اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کھجور کے ایک تنے کے ساتھ کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے۔ جب آپ کے لیے منبر بنادیا گیا اور آپ اس پر بیٹھ گئے تو ہم نے اس تنے سے اس طرح رونے کی آواز سنی جس طرح اونٹنی اپنے بچوں کے فراق میں روتی ہے 'حتیٰ کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے آکر اس پر اپنا ہاتھ رکھا تو پھر اس کو قرار آگیا۔

(صحیح البخاری 'ج ۴ 'رقم الحدیث : ۳۵۸۵ '۳۵۸۴ 'سنن الترمذی 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۵۰۵ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۱ 'رقم الحدیث : ۱۹۹ 'سنن النسائی 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ۱۳۹۵ 'مسند احمد 'ج ۵ 'ص ۱۳۹ 'طبع قدیم 'مسند ابو یعلی 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۱۰۶۷ 'دلائل النبوۃ لابی

نعیم ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۳۱۰ ' ۳۰۲۔۳۱۰ ' المعجم الاوسط ' ۲ ' رقم الحدیث : ۵۲۰۷ ' مصنف ابن ابی شیبہ ' ج ۱۱ ' رقم الحدیث : ۱۱۷۹۷۔ ۱۱۷۹۶ ' مجمع الزوائد ' ج ۲ ' ص ۱۸۱۔ ۱۸۰)

امام عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی سمرقندی متوفی ۲۵۵ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت بریدہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خطبہ دیتے وقت طویل قیام کرتے ہوئے تھک جاتے تو ایک کھجور کے تنے کے سہارے کھڑے ہو جاتے۔ صحابہ میں سے کسی شخص نے کہا اگر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پسند کریں تو میں آپ کے لیے منبر بنادوں جس پر بیٹھ کر آپ خطبہ دیں ' آپ نے فرمایا بنادو ' تو انھوں نے تین یا چار سیڑھیوں کا منبر بنادیا ' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس میں آرام ملا ' جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس تنے سے الگ ہوئے اور منبر پر بیٹھے تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جدائی کی وجہ سے وہ تنا اونٹنی کی طرح چیخ چیخ کر رونے لگا ' جب آپ نے اس کے رونے کی آواز سنی تو آپ نے اس کے اوپر اپنا ہاتھ رکھا اور فرمایا تم دو چیزوں میں سے ایک کو اختیار کرلو ' اگر تم چاہو تو میں تم کو اسی جگہ رہنے دوں اور اگر تم چاہو تو میں تمہیں جنت میں لگا دوں تم جنت کی نہروں اور چشموں کے پانی سے سیراب ہو ' تمہارے پتے اور پھل خوبصورت ہوں اور اولیاء اللہ تمہارے پھلوں سے کھائیں۔ اس تنے نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کچھ کہا جس کو آپ نے سنا اور فرمایا اس نے یہ اختیار کرلیا ہے کہ میں جنت میں اگا دوں۔

(سنن دارمی ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۳۲ ' المعجم الاوسط ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ۲۲۷۱ ' دلائل النبوۃ لابی نعیم ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۳۱۰)

امام طبرانی اور امام ابونعیم کی روایت میں ہے ' تمہارے پھلوں سے متقی اولیاء اللہ اور انبیاء و مرسلین کھائیں۔

کھجور ' انگور ' زیتون اور انار کے خواص :

کھجور کا مزاج گرم خشک ہے ' اس کی اصلاح انار اور سکنجبین سے ہو جاتی ہے۔ اس میں وٹامنز (حیاتین) اور تمام اہم معدنی نمکیات پائے جاتے ہیں ' اس کے استعمال سے خون کے سرخ ذرات میں اضافہ ہوتا ہے ' یہ کولیسٹرول کو متوازن رکھتی ہے ' مدینہ منورہ کی کھجور عجوہ خاص طور پر دل کے لیے مفید ہے ' یہ پیٹ کے کیڑے مارتی ہے اور پیشاب کھول کر لاتی ہے ' سو گرام کھجور میں ۲۱۴ حرارے ' ۲ گرام پروٹین ' ۳۷ گرام نشاستہ ' ایک گرام چکنائی ' ۵ء ۵ ملی گرام کیلشیم ' ۹ء ۲ گرام سوڈیم ' ۰ء ۷۹ ملی گرام پوٹاشیم ' ۲۷ ملی گرام فاسفورس ' ۵ء ۳ ملی گرام فولاد اور ۷ ملی گرام پھوک ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کھجور کے بعد انگور کا ذکر فرمایا ہے ' کیونکہ انگور تمام پھلوں میں افضل ہے ' کیونکہ یہ پھل بھی اول سے لے کر آخر تک نفع بخش ہے۔ اس سے سرکہ اور نبیذ بھی بنایا جاتا ہے۔ انگور دو قسم کے ہوتے ہیں ' ایک چھوٹا انگور ہوتا ہے ' یہ جب خشک ہو جائے تو اس کو کشمش کہتے ہیں ' اور بڑا انگور ۴ جب خشک ہو جائے تو اس کو منقی کہتے ہیں۔ انگور کا مزاج گرم تر ہے ' یہ زود ہضم اور کثیر الغذا ہے ' خون صالح بہ کثرت پیدا کرتا ہے اور بدن کو فربہ کرتا ہے ' سو گرام انگور میں ۶۹ حرارے ' ایک گرام پروٹین ' ۱۶ گرام نشاستہ ' ایک گرام چکنائی ' ۱۷ ملی گرام کیلشیم ' ۲۱ ملی گرام فاسفورس ' ۶ء ملی گرام فولاد ' ۱۰۰ ملی گرام وٹامن اے ' ۰ء ۰۷ ملی گرام وٹامن بی اور ۴۲ ملی گرام وٹامن سی ہوتا ہے۔

انگور کے بعد زیتون کا ذکر فرمایا ہے ' اس کا پھل سبز اور سیاہ رنگ کا ہوتا ہے۔ یہ فلسطین ' عرب ' ایران اور جنوبی یورپ میں پیدا ہوتا ہے '

زیتون کا ذکر فرمایا ہے ' اس کا پھل سبز اور سیاہ دو رنگ کا ہوتا ہے۔ یہ فلسطین ' عرب ' ایران اور جنوبی یورپ میں پیدا ہوتا ہے ' زیتون کا تیل

بہت مفید ہے۔ سردی کے دردوں میں اس سے بدن کی مالش کی جاتی ہے ' یہ بدن کو غذائیت بخشتا ہے۔ اعصاب کو تقویت دیتا ہے ' بڑھاپے کے تمام عوارض میں مفید ہے ' جدید سائنسی تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ روغن زیتون کولیسٹرول کو حل کرلیتا ہے۔

انار دو قسم کا ہوتا ہے۔ سرخ دانوں والا اور سفید دانوں والا۔ سرخ دانوں والے کا ذائقہ کھٹا میٹھا ہوتا ہے اور سفید دانوں والا شیریں ہے۔ اس کا مزاج سرد تر ہے۔ اس میں غذائیت کم ہے ' خون صالح پیدا کرتا ہے۔ اس میں جراثیم کش خصوصیات بھی ہیں ' ۱۰۰ گرام انار میں ۳۰۴ ملی گرام کیلشیم اور ۲۵ ملی گرام فاسفورس ' ۳۔۲ ملی گرام فولاد ' ۲۰۴ ملی گرام وٹامن اے ' ۱۰۸ ملی گرام وٹامن بی اور ۸۔۳ ملی گرام وٹامن سی ہوتا ہے۔

پھلوں کی ابتدائی حالت اور ان کے پکنے سے وجود باری پر استدلال

اس آیت کے آخر میں فرمایا ہے "جب یہ درخت پھل لائیں تو ان کے پھل اور اس کے پکنے کی طرف دیکھو ' بیشک اس میں ایمان لانے والے لوگوں کے لیے ضرور نشانیاں ہیں"۔

اس آیت کا یہی حصہ موضع استدلال ہے ' اور یہی اس آیت سے مقصود ہے ' کیونکہ پھل کے پکنے کے بعد اور اس کی ابتداء کی حالتیں ' شکل و صورت ' رنگ ' ذائقہ اور مزاج کے اعتبار سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ بعض پھلوں کا رنگ ابتداء میں سبز ہوتا ہے اور پکنے کے بعد سرخ یا زرد ہوجاتا ہے اور ابتداء میں ان کا ذائقہ ترش ہوتا ہے اور بعد میں شیریں ہوجاتا ہے اور ابتداء میں اس کی تاثیر سرد ہوتی ہے اور پکنے کے بعد گرم ہوجاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ پھلوں کی نشو و نما میں جو یہ تغیر ہوتا ہے اس کا موجد اور خالق کون ہے؟ پھلوں کی طبیعت ' موسم ' ستارے اور افلاک تو ان کے موجد نہیں ہوسکتے ' کیونکہ ان کی نسبت سب چیزوں کی طرف مساوی ہے اور جس کی نسبت سب کی طرف مساوی ہو ' اس سے بعض میں مثلا سرد اور بعض میں گرم ' تاثیرات صادر نہیں ہوسکتیں۔ نیز موسم ' ستارے اور افلاک تو خود ایک لگے بندھے نظام کے تابع ہیں ' ان سے یہ اثرات صادر نہیں ہوسکتے۔ معلوم ہوا کہ ان مختلف اور متضاد اثرات کا خالق وہی قادر و قیوم اور مدبر عالم ہے جو اپنی رحمت ' مصلحت ' حکمت ' علم اور قدرت سے اس ساری کائنات کا نظام چلا رہا ہے۔

توڑے بغیر پکنے سے پہلے درخت پر لگے ہوئے پھلوں کی بیع کا عدم جواز

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ظہور صلاحیت سے پہلے پھلوں کے بیچنے سے منع فرمایا ' بیچنے والے اور خریدنے والے دونوں کو منع فرمایا۔ ایک اور روایت میں ہے کھجوروں کی بیع سے منع فرمایا تاوقتیکہ وہ سرخ یا زرد نہ ہوجائیں اور سفید ہونے سے پہلے بالیوں کی بیع سے منع فرمایا ' تاوقتیکہ وہ آفات سے محفوظ نہ ہوجائیں۔

(صحیح البخاری ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ۲۱۹۴ ' صحیح مسلم ' بیوع ۴۹ ' (۱۵۳۴) ۳۷۸۸ ' سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : ۳۳۶۸۔۳۳۶۷ ' سنن الترمذی ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ۱۲۳۰ ' سنن النسائی ' ج ۷ ' رقم الحدیث : ۴۵۵۱ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۲۲۱۷)

فقہاء احناف کے نزدیک ظہور صلاحیت کا یہ معنی ہے کہ پھل اتنی مقدار کو پہنچ جائیں کہ وہ قدرتی آفات سے محفوظ ہو جائیں اور فقہاء شافعیہ کے نزدیک اس کا معنی پھلوں کا پک جانا اور اس میں مٹھاس کا آ جانا ہے۔ (مبسوط ' ج ۱۲ 'ص ۱۹۶)

باغوں میں پھلوں کی مروجہ بیع کے جواز کی صورتیں

ہمارے زمانہ کے اکثر اسلامی شہروں میں باغات کے پھلوں کی بیع کا طریقہ یہ ہے کہ درختوں پر لگے ہوئے پھلوں کی بیع ہوتی ہے۔ پھلوں کو درختوں سے توڑ کر بیع نہیں کرتے اور بالعموم اس وقت بیع کی جاتی ہے جب پھلوں کا ظہور بھی نہیں ہوتا اور صرف ان کا بور ظاہر ہوتا ہے 'اور کبھی بور کے بھی ظہور سے پہلے بیع ہو جاتی ہے۔ ان احادیث کے پیش نظر بیع کی یہ مروجہ صورتیں باطل ہیں۔ ہمارے فقہاء نے اس کے حال کی چار صورتیں بیان کی ہیں:

(۱) علامہ سرخسی حنفی متوفی ۴۸۳ھ نے بیان کیا کہ خریدار ظہور سے پہلے پھلوں کو خرید لے اور ایک مدت معینہ تک زمین کو کرائے پر لے 'پھر پھلوں کے اتارنے تک جو زمین سے افزائش اور روئیدگی حاصل ہو گی 'وہ کرایہ کا عوض اور اس کا جائز حق ہو گا۔ (المبسوط ' ج ۱۲ 'ص ۱۹۶ 'مطبوعہ دارالمعرفہ 'بیروت '۱۳۹۸ھ)

(۲) اگر بعض پھلوں کے بور کا ظہور ہو گیا ہو اور بعض یا اکثر کا ظہور نہ ہوا ہو تو جن کا ظہور ہو گیا ہے 'ان کو اصل قرار دیا جائے، اور جن کا ظہور نہیں ہوا اور ان کا تابع قرار دیا جائے۔ یا امام مالک 'امام محمد بن حسن شیبانی 'امام حلوانی اور بعض دیگر فقہاء کے نزدیک جائز ہے 'اگرچہ ظاہر الروایہ کے خلاف ہے۔ (المبسوط ج ۱۲ ص ۱۹۷ 'مطبوعہ دارالمعرفہ بیروت '۱۳۹۸ھ)

(۳) درختوں پر جس قدر بھی بور یا پھل ہوں ان کو خریدار خرید لے 'اس کے بعد فصل تک جس قدر بھی پھل آئیں ان سب کو باغ کا مالک خریدار پر حلال کر دے۔ (المبسوط ' ج ۱۲ 'ص ۱۹۷ 'فتح القدیر ' ج ۵ 'ص ۴۹۲ 'مطبوعہ سکھر 'البحرالرائق ' ج ۵ 'ص ۳۰۱ 'مطبوعہ مصر)

یہ تین حل صرف اس صورت میں ہیں جب باغ کے درختوں میں سے کسی ایک پر بھی کم از کم بور لگ گیا ہو 'لیکن ہمارے ہاں اس وقت باغ کے پھلوں کی بیع ہوتی ہے جب باغ کے کسی ایک درخت پر بھی بور تک نہیں ہوتا۔ اس صورت میں صرف یہ حل ہے کہ اس بیع کو حکما بیع قرار دیا جائے 'اس لحاظ سے یہ بیع جائز ہو جائے گی۔

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:

میں کہتا ہوں کہ ہمارے زمانہ میں ضرورت کا متحقق ہونا مخفی نہیں ہے۔ خاص طور پر دمشق میں جہاں پھلوں کے درخت بہت زیادہ ہیں اور چونکہ لوگوں پر جہالت کا غلبہ ہے 'اس لیے شرعی حال پر ان سے عمل کرانا عادۃ محال ہے۔ ہر چند کہ انفرادی طور پر بعض لوگوں سے عمل کرانا ممکن ہے 'لیکن دنیا کے تمام لوگوں سے اس پر عمل کرانا محال ہے اور لوگوں سے ان کی عادت چھڑانے میں بہت حرج ہے اور اس صورت میں جن شہروں میں صرف اس طرح پھلوں کی بیع ہوتی ہے 'ان کے لیے ان پھلوں کا کھانا حرام ہو جائے گا اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بیع سلم کی رخصت ضرورت کی بناء پر ہی دی ہے 'حالانکہ وہ بھی بیع المعدوم ہے۔ پس چونکہ یہاں بھی ضرورت متحقق ہے 'اس لیے اس بیع کو بیع سلم کے ساتھ ب بطریق دلالت لاحق کرنا ممکن ہے۔ سو اب یہ بیع اس حدیث کے مخالف نہیں ہے۔ "کوئی شخص وہ چیز فروخت نہ کرے جو

اس کے پاس نہیں ہے"۔اس وجہ سے فقہاء نے اس بیع کو استحسانا جائز قرار دیا ہے 'ظاہر قیاس کے مطابق اس بیع کو ناجائز ہونا چاہیے۔
(ردالمختار 'ج ۴ 'ص ۵۳ مطبوعہ استنبول 'ج ۴ 'ص ۳۹۔۳۸ 'مطبوعہ بیروت)

(تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا پہچانا مشکل نہیں۔ تمہارے اوپر اور نیچے، تمہارے دائیں اور بائیں میری مصنوعات اور تخلیقات کا جو بازار سجا ہوا ہے اسی میں غور کرو۔ ہر چیز یہ پکارتی ہوئی سنائی دے گی کہ وہ اپنی نیرنگیوں اور بوقلمونیوں سمیت خود بخود موجود نہیں ہو گئی بلکہ اس کا ایک بنانے والا ہے جو سب کچھ جاننے والا ہر چیز پر قدرت والا ہے۔ ذرا دیکھو بیج کا دانہ شق ہو رہا ہے۔ اس میں سے ایک نرم و نازک بال نکل آئی ہے۔ اسے آپ کمزور نہ سمجھئے یہ تو مٹی کی کئی انچ موٹی تہ کو چیر کر نکلی ہے۔ یہ بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔ وہ بال اب ایک ننھے سے تنے میں تبدیل ہو رہی ہے۔ ہوا کے تھپیڑوں کو برداشت کرنے کے لیے مناسب فاصلوں پر اس میں گرہیں ڈالی جارہی ہیں۔ اب اس کے سر پر ایک خوشہ سا نمودار ہوگیا ہے۔ اس کی جیبیں اب دانوں سے بھر گئی ہیں۔ یہ پودا جو پہلے ہرا بھرا اور نرم و نازک تھا اب اپنا رنگ تبدیل کر رہا ہے۔ غور کرنے والی آنکھ خود فیصلہ کرلے کہ کیا یہ اندھے مادے کی کاریگری ہے یا علیم و حکیم پروردگار کی صنعت کا اعجاز ہے۔ پھل لگنے سے لے کر پکنے تک اس کی مقدار، اس کی بو اور اس کے ذائقہ میں آہستہ آہستہ موقع بموقع جو تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں اسی پر انسان غور کرے تو حقیقت واضح ہو جائے گی۔ اس آیت میں "انظر" کے معنی سرسری دیکھنے کے نہیں بلکہ غور و فکر سے دیکھنے کے ہیں۔ ای نظر اعتبار لا نظر الابصار المجرد عن التفکر (قرطبیؒ) میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ جس قوم کی آسمانی کتاب نے اسے کائنات کی ہر چیز میں فکر و تدبر کرنے کی ترغیب دلائی وہی قوم اس میدان میں سب سے پیچھے نظر آرہی ہے۔ کیا ملت اسلامیہ کے نوجوان اپنا مقام پہچانیں گے۔ اپنا فریضہ ادا کرنے کے لیے کمر ہمت باندھیں گے۔ اپنے اولوا العزم اسلام کی طرح لگاتار محنت، مسلسل جد و جہد کو اپنا شعار بنائیں گے۔ اس طرح صرف وہ خود ہی شہرت کے آسمان پر مہر و ماہ بن کر نہیں چمکیں گے بکہ اپنی ملت کا نام بھی روشن کردیں گے۔ اور انسانیت کی قیادت ایک بار پھر ان ہاتھوں میں آجائے گی جنہیں کنتم خیر امۃ کا اعزاز بخشا گیا ہے۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

آیت مبارکہ :

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝١٠٠

لغۃ القرآن: وَجَعَلُوْا : اور ان سب نے مقرر کیا ہے] [لِلّٰهِ : اللہ کے لیے] [شُرَكَآءَ : شریک] [الْجِنَّ : جنوں کو] [وَخَلَقَهُمْ : حالانکہ اس نے پیدا کیا انکو] [وَخَرَقُوْا : اور ان سب نے گھڑ رکھتے ہیں] [لَهٗ : اس کی] [بَنِيْنَ : بیٹے] [وَبَنٰتٍ : اور بیٹیاں]

[بِغَیْرِ : بغیر] [عِلْمٍ : علم] [سُبْحٰنَهٗ : وہ پاک ہے] [وَتَعٰلٰى : اور بہت بلند ہے] [عَمَّا :" اس " سے جو] [يَصِفُوْنَ : وہ سب بیان کرتے ہیں]

ترجمہ : اور ان کافروں نے جِنّات کو اللہ کا شریک بنایا حالانکہ اسی نے ان کو پیدا کیا تھا اور انھوں نے اللہ کے لیے بغیر علم (و دانش) کے لڑکے اور لڑکیاں (بھی) گھڑ لیں۔ وہ ان (تمام) باتوں سے پاک اور بلند و بالا ہے جو یہ (اس سے متعلق) کرتے پھرتے ہیں

تشریح:

سابقہ آیات میں بیان کردہ دلائل قدرت اور عجائب حکمت اور اس انعام و اکرام اور ان نعمتوں کے پیدا کرنے اور عطا فرمانے کا تقاضا یہ تھا کہ اس کریم کارساز پر ایمان لاتے لیکن اس کی بجائے بت پرستوں نے یہ ستم کیا کہ جنوں کو خدا عَزَّوَجَلَّ کا شریک قرار دیا کہ ان کی اطاعت کرکے بت پرست ہو گئے اور اللہ عَزَّوَجَلَّ کیلئے معاذاللہ بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لیں حالانکہ اللہ عَزَّوَجَلَّ ان کی بیان کی ہوئی چیزوں سے پاک اور بلند ہے اور یہ چیزیں اس کی شان کے لائق ہی نہیں۔

(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

ان مشرکین کی حماقت کی کوئی حد ہے کہ انھوں نے جنوں کو جو ان جیسی مخلوق ہیں خدا کا شریک بنایا ہوا ہے۔ مزید برآں اس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لی ہیں۔ یہ ایسی خرافات تھیں جن میں اہل عرب کے علاوہ اور قومیں بھی مبتلا تھیں۔ عیسائی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اور بعض یہود حضرت عزیر (علیہ السلام) کو خدا کا بیٹا اور مشرکین عرب فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں یقین کرتے تھے۔ نعوذ باللہ۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

صفات باری تعالیٰ اور رد شرک

ان تمام نشانیوں کے باوجود مشرکین نے جنات کو خدا کا شریک ٹھہرا لیا۔ جنات سے مراد شیاطین ہیں، کیونکہ کافر جنات کو شیاطین کہا جاتا ہے۔ دراصل ہر بت کے ساتھ ایک شیطان چمٹا ہوتا ہے جو لوگوں کو اس کی طرف کھینچتا ہے، اس لیے کہا گیا کہ مشرکین نے جنات کو خدا بنا لیا۔ پھر بعض کفار شیطان کو حقیقتن اللہ کا شریک مانتے ہیں، کیسی مجوس کے ان کے نزدیک دو خدا ہیں۔ ایک یزدان جو خالق ایک خیر ہے دوسرا اہرمن جو خالق شر ہے۔ اسی کو شیطان کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا کہ جب خود شیاطین بھی اللہ کے پیدا کردہ ہیں تو وہ اس کے شریک کیسے ہو سکتے ہیں۔ (.برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

مشرکین کے اپنے شرکاء کے متعلق نظریات اور ان کے فرقے

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ توحید پر پانچ دلیلیں قائم اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ مشرکین کے نظریات بیان فرمارہا ہے 'اور ان کے باطل نظریات کارد فرمارہا ہے۔

حسن بصری وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ آیت مشرکین عرب کے متعلق نازل ہوئی ہے اور جنوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنانے کا معنی یہ ہے کہ وہ جنوں کی اس طرح اطاعت کرتے ہیں جس طرح عزوجل کی اطاعت ہوتی ہے۔ قتادہ وغیرہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور کلبی نے کہا یہ آیت زندیقوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ اور ابلیس دو بھائی ہیں۔ اللہ انسانوں اور مویشیوں کا خالق ہے اور ابلیس جنات 'درندوں اور بچھوؤں کا خالق ہے اور اس قول کے قریب مجوس کا قول ہے جو کہتے ہیں کہ اس جہان کے دو بنانے والے ہیں۔ ایک خدا قدیم ہے اور دوسرا شیطان حادث ہے اور ان کا زعم یہ ہے کہ برائی کا پیدا کرنے والا حادث ہے۔

الجامع لاحکام القرآن جز ۷ ص ۴۹۔ ۴۸ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت ۱۴۱۵ھ)

امام فخرالدین محمد بن تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ الدین عمر رازی متوفی ۶۰۶ ھ لکھتے ہیں :

اللہ تعالیٰ کے لیے شریک قرار دینے والوں کے حسب ذیل فرقے ہیں

(۱) بت پرست لوگ ہیں۔ یہ اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ بتوں کو کسی چیز کے پیدا کرنے پر قدرت نہیں ہے 'لیکن یہ بتوں کو عبادت میں اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیتے ہیں اور بتوں کی عبادت کرتے ہیں۔

(۲) بعض مشرکین یہ کہتے ہیں کہ اس عالم کے مدبر کواکب ہیں 'اور ان کے دو فرقے ہیں ایک فرقہ یہ کہتا ہے کہ کواکب واجبۃ الوجود لذواتھا ہیں اور ایک فرقہ یہ کہتا ہے کہ یہ ممکنۃ الوجود لذواتھا ہیں اور حادثہ ہیں اور ان کا خالق اللہ تعالیٰ ہے 'مگر اللہ سبحانہ نے اس عالم اسفل کی تدبیر ان کی طرف سونپ دی ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ (علیہ الصلوۃ والسلام) نے ان ہی سے مناظرہ کیا تھا 'جب کہا تھا "**لا احب الافلین**"۔

(۳) بعض مشرکین یہ کہتے ہیں کہ اس جہان کے دو خدا ہیں۔ ایک برائی کا خالق ہے 'وہ اہرمن ہے اور ایک بھلائی کا خالق ہے 'وہ یزدان ہے۔ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا یہ آیت زندیقوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ اور ابلیس دو بھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انسانوں 'مویشیوں اور نیکیوں کا خالق ہے اور ابلیس درندوں 'سانپوں 'بچھوؤں اور برائیوں کا خالق ہے۔ حضرت نے جو مذہب بیان کیا ہے 'وہ مجوسیوں کا مذہب ہے جو یزدان اور اہرمن کے قائل ہیں۔

(۴) کفار یہ کہتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور وہ یہ کہتے تھے کہ جن سے مراد فرشتے ہیں 'کیونکہ جن کا معنی ہے چھپی ہوئی چیز اور فرشتے بھی آنکھوں سے چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔

(۵) یہود حضرت عزیرؑ کو اور عیسائی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔

(تفسیر کبیر 'ج ۵ 'ص ۹۰۔ ۸۸ مختصرا وموضحا "مطبوعہ داراحیاء التراث العربی 'بیروت '۱۴۱۵ھ)

اللہ تعالیٰ کے لیے مولود نہ ہونے پر دلائل

اس آیت کے آخری حصہ میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے انھوں نے بلا علم اللہ کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لیں۔ وہ اس سے پاک اور بالاتر ہے جو وہ بیان کرتے ہیں '، اللہ تعالیٰ سے اولاد کی نفی پر علماء اسلام نے حسب ذیل دلائل قائم کیے ہیں :

(۱) خدا اور معبود کا واجب لذاتہ ہونا ضروری ہے '، اگر خدا کے لیے بیٹے کو فرض کیا جائے تو وہ واجب لذاتہ ہوگا یا ممکن لذاتہ ہوگا '، اگر وہ واجب لذاتہ ہو تو اس کا مولود ہونا باطل ہے '، کیونکہ مولود والد سے متاخر اور اس کی طرف محتاج ہوتا ہے اور واجب لذاتہ کسی سے متاخر اور کسی کا محتاج نہیں ہوتا '، بلکہ مستغنی اور قدیم ہوتا ہے اور اگر وہ ممکن لذاتہ ہو تو پھر وہ اللہ کا بندہ اور اس کی مخلوق ہوگا اور مولود والد کا بندہ اور اس کی مخلوق نہیں ہوتا '، نیز مولود والد کی جنس سے ہوتا ہے اور ممکن '، محتاج اور حادث '، واجب مستغنی اور قدیم کی جنس سے نہیں ہے۔

(۲) مولود کی احتیاج اس لیے ہوتی ہے کہ والد کی موت کے بعد وہ اس کا قائم مقام ہو اور اس کے مشن کو آگے بڑھائے اور اللہ عزوجل پر موت کا آنا محال ہے '، اس لیے اس کا مولود بھی محال ہے۔

(۳) مولود والد کا جز ہوتا ہے اور جس کا کوئی جز ہو وہ مرکب ہوتا ہے اور مرکب حادث ہوتا ہے '، اس لیے اللہ کا مولود ہونا اس کے مرکب اور حادث ہونے کو مستلزم ہے اور اس کا مرکب اور حادث ہونا محال ہے '، اس لیے اس کا مولود بھی محال ہے۔

(۴) مولود والد کے مشابہ ہوتا ہے اور اللہ کے مشابہ کوئی چیز نہیں ہے '، اس لیے اللہ تعالیٰ کا مولود ہونا محال ہے۔

باقی رہا یہ امر کہ موجودہ عیسائی کہتے ہیں کہ ہم اللہ کو باپ اور عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا مجازا کہتے ہیں '، باپ سے مراد رحیم اور شفیق ہے ؛۔ جسمانی لحاظ سے باپ مراد نہیں ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پھر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خصوصیت سے بیٹا کیوں کہتے ہو ؟ اور اس پر اصرار کیوں کرتے ہو ؟ ساری کائنات کو اللہ کا بیٹا کہو '، وہ سب پر شفیق اور رحیم ہے۔ اللہ تعالیٰ کو شفیق اور رحیم اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو عزیز اور رحیم کیوں نہیں کہتے۔ جب کہ باپ اور بیٹا کے الفاظ جسمانی رشتہ کو ظاہر کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جناب سے صراحتا نقص ہے اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے متصور نہیں کہ وہ خدا کو باپ کہیں جو اس کے لیے نقص کا موجب ہے۔

(تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

مشرکین عرب بہت سی قوتوں کو اور بہت سی شخصیات کو اللہ کا شریک بنا کر پوجتے تھے اور اپنی مشکلات میں ان سے مدد مانگتے تھے۔ انہی میں سے جنات بھی تھے جن کے بارے میں ان کا خیال یہ تھا کہ مختلف علاقوں میں یا مختلف جگہوں میں ان جنات کا بسیرا ہوتا ہے اور وہاں وہ ایک طرح سے اپنی حکومت قائم رکھتے ہیں۔ اسی لیے وہ بعض درختوں '، بعض ٹیلوں '، بعض پہاڑوں اور بعض وادیوں کو مختلف جنات سے منسوب کرتے تھے۔ اس لیے جب وہ کسی ایسی جگہ کے پاس سے گزرتے تو وہ جنات کی جے پکارتے اور ان آستانوں پر چڑھاوے چڑھاتے اور بعض دفعہ وہاں بندگی کی رسوم بھی بجالاتے اور اگر کہیں اس کے آس پاس رات گزارنے کا موقع ملتا تو وہ بلند آواز سے ان سے پناہ اور مدد طلب کرتے اور یہ سمجھتے تھے کہ ان جنات کی ناراضگی ہمارے لیے مشکلات پیدا کر سکتی ہے۔ اس لیے ان کو خوش رکھنا ضروری ہے۔ اللہ کی بڑی مخلوقات تین ہیں انسان '، فرشتے اور جنات اور ان میں جنات کو سب سے فروتر مقام حاصل ہے اس لیے بطور خاص یہاں ان کا تذکرہ کیا گیا۔ کہ کائنات کی ایک ایک چیز تو خدا اور اس کی صفات سے متعلق وہ شہادتیں فراہم کر رہی ہے جن کا تذکرہ گزشتہ آیات میں ہوا لیکن اے مشرکین عرب

تمہاری خرد باختگی اور تمہاری حماقت کا یہ عالم ہے کہ تم نے سب سے مرتبے میں کم تر مخلوق یعنی جنات کو اللہ کی صفات میں شریک کر ڈالا ان کی بندگی کرنے لگے اور ان سے مدد ماننے لگے حالانکہ جس طرح اللہ نے تمہیں پیدا کیا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی پیدا کیا ہے اور یہ بالکل واضح بات ہے کہ خدا کی پیدا کی ہوئی کوئی مخلوق آخر اس کی خدائی میں کیسے شریک ہو سکتی ہے۔ یہ بات اس آیت کریمہ میں بطور خاص اس لیے فرمائی گئی ہے کہ مشرکین عرب اس بات کا عقیدہ رکھتے تھے کہ ساری کائنات کا خالق اللہ ہی ہے اس عمل تخلیق میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں اس لیے فرمایا گیا کہ جب تم سب کو اور جنات کو بھی اس کی مخلوق سمجھتے ہو تو پھر اللہ کے ساتھ ان کو شریک کیسے ٹھہراتے ہو۔ اس کے بعد ان کی شرک کی عادت سیہ کو مزید نمایاں کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کا شرک صرف جنات تک محدود نہیں بلکہ انھوں نے اللہ کے لیے بیٹے اور بیٹیاں بھی تراش رکھے ہیں کیونکہ مشرکین عرب فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ ممکن ہے وہ کسی کو اللہ کا بیٹا بھی قرار دیتے ہوں اور یا پھر یہاں ضمناً عیسائیوں کا ذکر کر دیا گیا ہے کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ کے بیٹا مانتے تھے لیکن ساتھ ہی یہ فرمایا کہ ان کے ان باطل عقائد اور ان واہیات اقوال پر ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ تو پھر آخر وہ کس بنیاد پر اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ مزید فرمایا کہ اللہ اس سے پاک ہے اور بلند ہے جو کچھ وہ بیان کرتے ہیں۔ یہ سبحان کا لفظ تنزیہ کا کلمہ ہے یعنی اس لفظ سے اللہ کی پاکیزگی اور شریک سے اس کے پاک ہونے کو بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ ایک بہت بڑی دلیل بھی ہے یہ بات ہر عقل مند آدمی سمجھ سکتا ہے کہ اگر کسی ذات کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کی جائے جو اس کی مسلمہ حیثیت اور اس کی مسلمہ صفات کے خلاف ہو تو کوئی عقل مند آدمی اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوگا۔ مثلاً اگر کسی شخص کو بادشاہ تسلیم کیا جائے اور پھر اس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ کسی کا ملازم یا غلام ہے تو بادشاہت اور غلامی میں چونکہ کھلا تضاد ہے اس لیے کوئی آدمی اسے قبول نہیں کرے گا۔ اسی طرح اگر کسی ذات کے بارے میں یہ بات ثابت ہو کہ وہ بہت سرمایہ دار 'بہت خداترس اور بہت مخیر آدمی ہے تو کوئی آدمی اگر اس کے بارے میں یہ کہے کہ اس نے فلاں آدمی سے دس روپے چھین لیے ہیں یا اس نے کسی کا سو روپیہ دینا ہے اور وہ ادا نہیں کرتا تو کوئی اس بات کو صحیح نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیے کہ ایک سرمایہ دار 'معزز اور فیاض آدمی سے اس کا امکان نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جو ذات خالق مالک 'قدیر 'علیم اور کریم و رحیم ہے اس کو ان صفات سے متصف کرنا جو مخلوق کی صفات ہیں اس کی ان تمام صفات کی نفی کے مترادف ہے جن کا ماننا از روئے عقل و فطرت واجب ہے اور جن کی نفی سے انسان ان تمام تاریکیوں میں پھر گھر جاتا ہے جن سے ان صفات کے علم کی روشنی ہی نے اس کو نکالا تھا۔ اگر خدا کو خدا ماننے کے بعد بھی جنات اور فرشتوں کو اس کا شریک قرار دے دیا جائے اور اس کو بیٹوں اور بیٹیوں کا باپ بنا دیا جائے تو پھر وہ خدا کہاں رہا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف لفظ سبحان توجہ دلا رہا ہے

(روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

آیت مبارکہ :

بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ ؕ اَنّٰى يَكُوۡنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمۡ تَكُنۡ لَّهٗ صَاحِبَةٌ‌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَىۡءٍ‌ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ۝١٠١

لغۃ القرآن : بَدِيْعُ : موجد] [السَّمٰوٰتِ : آسمانوں کی] [وَ : اور] [الْاَرْضِ : " جو " زمین میں ہے] [اَنّٰى : کیسے] [يَكُوْنُ : ہوسکتی ہے] [لَهٗ : اس کی] [وَلَدٌ : کوئی اولاد] [وَلَمْ : اور نہیں] [تَكُنْ : ہونا] [لَهٗ : اس کی] [صَاحِبَةٌ : بیوی] [وَخَلَقَ : اور اس نے پیدا کی] [كُلَّ : ہر] [شَيْءٍ : چیز] [وَهُوَ : اور وہ] [بِكُلِّ شَيْءٍ : ہر چیز کو] [عَلِيْمٌ : خوب جاننے والا ہے]

ترجمہ : وہی آسمانوں اور زمینوں کا موجد ہے، بھلا اس کی اولاد کیونکر ہو سکتی ہے حالانکہ اس کی بیوی (ہی) نہیں ہے، اور اسی نے ہر چیز کو پیدا فرمایا ہے اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے

تشریح :

بدیع

بدیع اس پیدا کرنے والے کو کہا جاتا ہے جس نے کوئی نمونہ سامنے رکھے بغیر کسی چیز کو پیدا کیا ہو۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کیونکہ اسی نے آسمان اور زمین کو بغیر کسی سابقہ مثال اور نمونہ کے تخلیق فرمایا۔ وہ ہر چیز کا خالق ہے اور ہر چیز اس کی مخلوق ہے۔ خالق اور مخلوق کے درمیان صرف عبودیت اور بندگی کا ہی رشتہ ہے۔ فرزندی یا قرابت کو کوئی رشتہ نہیں۔ کیونکہ جس نے محض اپنی قدرت سے زمین اور آسمان کو پیدا کر دیا اسے اب بیٹوں اور دوسرے رشتہ داروں اور سہاروں کی ضرورت نہیں۔ اور اگر تم اپنے اجڈ پنے سے اس کی اولاد بنانے پر مصر ہو تو پہلے یہ بتاؤ کہ اس کی بیوی کون ہے جس کے بطن سے اس کی یہ اولاد ہوئی۔ اور جب اس کی بیوی ہی نہیں تو اولاد کہاں سے آ گئی۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

اللہ تعالیٰ ایسا قادر مطلق ہے کہ وہ (بدعت فرمانے والا آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں) یعنی بغیر کسی سابقہ مثال اور نمونہ کے ان کو پیدا فرمانے والا ہے۔ تو اب عیسائیوں کا یہ سوچنا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو بغیر باپ کے پیدا کیا، جس کی پہلے کوئی نظیر اور مثال نہیں تھی، تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کا باپ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دلیل کا رد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام آسمانوں اور زمینوں کو ابتداء بغیر سابقہ مثال اور نمونہ کے پیدا کیا، تو کیا اللہ تعالیٰ تمام آسمانوں اور زمینوں کا باپ ہے۔ اور اگر اس وجہ سے وہ تمام آسمانوں اور زمینوں کا باپ نہیں ہے، تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا اس وجہ سے کیسے باپ ہو سکتا ہے؟۔۔ اور۔۔ اگر عیسائیوں کی مراد یہ ہے کہ جیسے انسانوں میں معروف طریقہ سے اولاد ہوتی ہے، اس طرح سے حضرت عیسیٰ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا کہ ذرا سوچو۔۔۔

(اسکے اولاد کہاں جبکہ اس کی کوئی زوجہ نہیں)۔ یعنی جب اس کی بیوی ہی نہیں، تو اس کا بیٹا کیسے ہوگا؟۔۔ نیز۔۔ معروف طریقہ سے اولاد کے حصول میں وہ شخص محتاج ہوگا، جو علی الفور کسی چیز کو پیدا کرنے پر قادر نہ ہو، تو وہ نو ۹ ماہ کے انتظار کے بعد اولاد کو حاصل کریگا۔ لیکن جس کی شان یہ ہو (اور) جو ایسا قادر ہو کہ (پیدا فرمایا اس نے ہر چیز) صرف لفظ کن کہہ کر۔ ادہر اس نے کن فرمایا، ادہر وہ چیز اسی وقت موجود ہو گئی۔ تو جو ایسا قادر ہو، تو وہ اس معروف دنیاوی طریقے اولاد کو کیوں حاصل کرے گا؟ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ علیم (اور) خبیر ہے (وہ سب کچھ جاننے والا ہے) یعنی اس کی شان یہ ہے کہ وہ مخلوق وغیر مخلوق کو ازلاً ابداً جانتا ہے۔ اس سے کوئی شے مخفی نہیں، جو گزری۔۔ یا۔۔ آئیگی۔ شے کی ذات ہو یا صفات یا احوال، من جملہ ان امور کے جو اللہ تعالیٰ کیلئے ممکن ہیں۔۔ یا۔۔ اس کے لیے وہ اشیاء محال ہیں اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے اولاد ثابت کرنا بھی محالات کے افراد کا ایک فرد ہے۔ (تفسیر اشرفی۔ علامہ محمد مدنی اشرفی جیلانی)

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ابن اللہ ہونے کا دلائل سے رد

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا تھا کہ مشرکین کے عقائد باطل ہیں اور اس آیت میں ان کے باطل ہونے پر دلائل قائم کیے ہیں' ان دلائل کی تقریر امام رازی نے اس طرح فرمائی ہے۔

(۱) بدیع کا معنی ہے کسی چیز کو بغیر کسی سابقہ مثال اور نمونہ کے پیدا کرنا اور اللہ تعالیٰ تمام آسمانوں اور زمینوں کو ابتداء بغیر کسی سابقہ مثال کے پیدا کرنے والا ہے' اور یہی عیسائیوں کے عقیدہ کے باطل ہونے کی دلیل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو بغیر باپ کے پیدا کیا ہے' جس کی پہلے کوئی نظیر اور مثال نہیں تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا باپ ہے' اللہ تعالیٰ نے اس دلیل کا رد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام آسمانوں اور زمینوں کو ابتداء بغیر کسی سابقہ مثال اور نمونہ کے پیدا کیا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ تمام آسمانون اور زمینوں کا باپ ہے اور اگر اس وجہ سے وہ تمام آسمانوں اور زمینوں کا باپ نہیں ہے' تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا اس وجہ سے کیسے باپ ہو سکتا ہے؟

(۲) عیسائی جو کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور اللہ ان کا باپ ہے۔ اگر اس سے ان کی یہ مراد ہے کہ جیسے انسانوں میں معروف طریقہ سے اولاد ہوتی ہے' اس طرح سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا

کہ اللہ تعالیٰ کی تو بیوی ہی نہیں ہے تو اس کا بیٹا کیسے ہو گا؟ نیز معروف طریقہ سے اولاد کے حصول میں وہ شخص محتاج ہو گا جو علی الفور کسی چیز کے پیدا کرنے پر قادر نہ ہو تو وہ نو ماہ کے انتظار کے بعد اولاد کو حاصل کرے گا 'لیکن جس کی شان یہ ہو کہ وہ جس چیز کو پیدا کرنا چاہے تو وہ ایک لفظ "کن" فرماتا ہے اور وہ چیز اسی وقت موجود ہو جاتی ہے۔ وہ اس معروف دنیاوی طریقہ سے اولاد کو کیوں حاصل کرے گا؟ اس دلیل کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔

(۳) اگر اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹا فرض کیا جائے تو وہ قدیم ہو گا یا حادث؟ اس کا قدیم ہونا اس لیے باطل ہے کہ بیٹا باپ سے متاخر ہوتا ہے اور قدیم کسی چیز سے متاخر نہیں ہوتا 'اور اس کا حادث ہونا اس لیے باطل ہے کہ بیٹے کے ہونے سے اللہ تعالیٰ کو کوئی صفت کمال حاصل ہو گی یا صفت نقص۔ نقص کا فرض باطل ہے 'کیونکہ اللہ تعالیٰ محل نقص نہیں اور صفت کمال حاصل ہونا اس لیے باطل ہے کہ وہ قدیما اور ازلا تمام صفات کمال سے متصف ہے۔ پھر بیٹے کو قدیم ہونا چاہیے 'حالانکہ اس کو حادث فرض کیا تھا اور اس دلیل کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ کیا ہے کہ وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے 'کیونکہ اگر اس کے علم میں یہ ہوتا کہ بیٹے کا ہونا اس کے لیے باعث کمال ہے تو بیٹا ازلی اور قدیم ہوتا 'حالانکہ بیٹا باپ سے متاخر ہوتا ہے اور متاخر ہونا قدیم کے منافی ہے۔

(تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

اللہ کی ذات کسی کی شراکت سے مبرا اور اولاد کی حاجت سے بے نیاز ہے۔ کسی کو اللہ تعالیٰ کی اولاد یا شریک ٹھہرانا مشرکوں کی ذہنی پستی اور فکری دیوانگی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کے باطل تصورات اور ہر قسم کی یاوا گوئی سے پاک اور مبرّا ہے کائنات کی تخلیق کے لیے بدیع کا لفظ استعمال فرما کر واضح کیا کہ جس اللہ نے بغیر کسی پہلے سے موجود نقشے اور میٹریل کے اوپر نیچے سات آسمان اور تہ بہ تہ سات زمینیں پیدا کی ہیں۔ اسے اولاد کی کیا حاجت ہے؟

اولاد انسان کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور قلبی سکون کا باعث، اس کی زندگی کا سہارا، معاملات میں اس کی معاون اور اس کے سلسلہ نسب قائم رہنے کا وسیلہ ہے۔

اولاد ہونے کا منطقی نتیجہ ہے کہ اس کی بیوی ہو کیونکہ بیوی کے بغیر اولاد کا تصور محال ہے جبکہ فرشتوں اور جنات کو خدا کی بیٹیاں، بعض انبیاء (علیہ السلام) کو خدا کا بیٹا قرار دینے سے اللہ تعالیٰ کی بیوی ثابت کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ اولاد کسی نہ کسی طرح باپ کے مشابہ اور اس کی ہم جنس اور ہم نسل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان حاجات اور تمثیلات سے پاک ہے۔

مشرک بتائیں کہ زمین و آسمانوں میں کون سی چیز اللہ تعالیٰ کی مشابہ اور ہم جنس ہے؟ پھر کائنات کی ہر چیز کی ابتداء، انتہا اور اس کے لیے فنا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس وقت بھی تھی جب کچھ نہیں تھا اور وہ اس وقت بھی ہو گی جب ہر چیز فنا کے گھاٹ اتر جائے گی۔ کائنات کی ہر چیز پر حالات و واقعات کے منفی یا مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہمیشہ ایک ہی حالت پر قائم و دائم ہے۔ وہ ضعف و کمزوری اور نقص و نقصان سے پاک ہے۔ نہ اس کی ذات سے کوئی چیز پیدا ہوئی اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے وہ ہر چیز کا خالق و مالک اور ذمہ دار ہے۔ وہ زمین کے ذرے ذرّے اور آسمانوں کے چپہ چپہ کو جاننے اور ہر انسان کے خیالات سے واقف ہے اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ مشرک کس بنا پر شرک کرتے ہیں۔

(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ يُؤْذِينِي ابْنُ آدَمَ يَسُبُّ الدَّهْرَ وَأَنَا الدَّهْرُ بِيَدِي الْأَمْرُ أُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ) [رواہ البخاری : کتاب تفسیر القرآن، باب وما یھلکنا الا الدھر]

”حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ابن آدم مجھے تکلیف دیتا ہے اس کا مجھے تکلیف دینا یہ ہے کہ وہ زمانے کو گالیاں دیتا ہے حالانکہ زمانہ میں ہوں۔ میرے ہاتھ میں ہی معاملات ہیں میں ہی رات دن کو پھیرتا ہوں۔“

(عن أَنَس بن مالِكٍ (رض) يَقُولُ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لَنْ يَبْرَحَ النَّاسُ يَتَسَاءَلُونَ حَتّٰى يَقُولُوا هٰذَا اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ) [رواہ البخاری : کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ]

”حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا لوگ باہم ایک دوسرے سے سوال کرتے رہیں گے اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا ہے؟“

(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لَا يَزَالُ النَّاسُ يَتَسَاءَلُونَ حَتّٰى يُقَالَ هٰذَا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ فَمَنْ وَجَدَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَلْيَقُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ ورسله)

[رواہ مسلم : کتاب الایمان، باب بیان الوسوسۃ]

”حضرت ابوہریرہ (رض) نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان بیان کرتے ہیں کہ لوگ ہمیشہ ایک دوسرے سے سوال کرتے رہیں گے یہاں تک کہ کہا جائے گا مخلوق اللہ نے پیدا کی ہے لیکن اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ جو شخص اس قسم کے خیالات پائے اسے یہ کہنا چاہیے میں اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتا ہوں۔“ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

آیت مبارکہ :

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝۱۰۲

لغۃ القرآن: ذٰلِكُمُ : یہ ہے] [اللّٰهُ : اللہ] [رَبُّكُمْ : تمہارا رب] [لَآ : نہیں] [اِلٰهَ : معبود] [اِلَّا : مگر] [هُوَ : وہ] [خَالِقُ : پیدا کرنے والا ہے] [كُلِّ : ہر] [شَيْءٍ :

چیز] [فَاعْبُدُوْهُ : تو تم سب عبادت کرو اسی کی] [وَهُوَ : اور وہ] [عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ : ہر چیز پر] [وَّكِيْلٌ : نگران ہے]

ترجمہ : یہی (االلہ) تمہاراپروردگار ہے، اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، (وہی) ہر چیز کا خالق ہے پس تم اسی کی عبادت کیا کرو اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے

تشریح :

ذٰلِکُمْ : (یہ) عربی میں کسی کی طرف اشارہ کرنے کے لیے اصل لفظ ذا ہے۔ اشارہ قریب چیز کی طرف کرنا ہو تو ذا ہی کافی ہے اور اگر وہ چیز کچھ دور ہو تو اس میں مخاطب کی ضمیروں میں سے کوئی ضمیر لگادیتے ہیں اور یہ ضمیر اس کے مطابق ہوتی ہے جس کو اشارہ کرکے سمجھانا مقصود ہے اگر وہ ایک ہو تو کَ دو ہیں تو کُمَا اور زیادہ ہیں کُمْ اگر جس کی طرف اشارہ ہے وہ بہت دور ہو تو ذاء اور ضمیر کے پہلے ایک لام مکسورہ لگادیتے ہیں جیسے ذٰلِكَ، ذٰلِكُمَا، ذٰلِكُمْ ۔

کائنات سے اللہ کو پہچانو

اللہ عزوجل کی صفتیں بیان کرنے کے بعد یہ سمجھانا ہے کہ اللہ کو پہچانو ظاہر ہے کہ کسی چیز کی خاص نشانیاں اچھی طرح کھول کر بتانے سے اس کی ایک صورت ذہن میں آجاتی ہے اور وہ ایسی صاف ہوتی ہے کہ اس کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔ پہلے رکوع میں جو کام گنوائے ہیں وہ ایسے ہیں کہ انھیں اللہ کے سوا کوئی اور نہیں کرسکتا اس لیے ان سب کاموں پر غور کرکے اللہ کا تصور واضح طور پر ذہن میں آجاتا ہے اسی تصور کی طرف اشارہ کرکے اس آیت کو شروع کیا گیا ہے یہ تصور گو ہمارے دل میں ہے لیکن جس کا تصور ہے وہ بہت بلند اور برتر ہے اور عظمت کے لحاظ سے بہت دور ہے اس لئے اشارہ کی شکل ذٰلکم ہے۔

ارشاد ہے کہ جس میں اوپر کی بیان کی ہوئی سب صفتیں جمع ہیں یہ اللہ ہے اور یہی تمہارا رب ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں اس لیے اس لیے معبود فقط وہی ہے سب چیزیں اسی نے پیدا کی ہیں تم اس کی بندگی میں جھک جاؤ سب کا کام بنانے والا وہی ہے تم اس کی صفتوں اور کاموں پر دھیان جماکے اس کا تصور تو کرسکتے ہو لیکن تمہاری یہ موجودہ آنکھیں اس کو نہیں دیکھ سکتیں وہ آنکھوں کی ساخت اور بناوٹ اور اس کی قوت سے اچھی طرح واقف ہے کیونکہ اس کی صفت خبیر ہے یہ تمہاری موجودہ آنکھ تو ہوا وغیرہ کو بھی نہیں دیکھ سکتی پھر اللہ تو اصلی معنی میں پورے طور پر لطیف ہے۔

اللہ کے پہچاننے کا طریقہ

انسان کی فطری خواہش ہے کہ وہ اللہ کو پہچانے دنیا کے دھندوں میں پھنس کر غافل ہو جائے تو اور بات ہے ورنہ جہاں اسے یہ سوچنے کی فرصت ملی وہیں اسے خیالات نے آ کر گھیرا ہے کہ مجھے کس نے بنایا ہے یہ آسمان کیا ہے یہ چاند سورج ستارے زمین پہاڑ دریا سمندر کہاں سے آئے یہ میری کھانے پینے پہننے برتنے اور استعمال کرنے کی چیزیں مجھے کون دیتا ہے۔ شیطان انسان کو ایسے خیالات سے دور رکھنا چاہتا ہے اس کی کوشش فقط یہ ہے کہ اسے دنیا کے مزوں لذتوں اور دھندوں میں ایسا پھنسا کر رکھا جائے کہ یہ سوالات اس کے دل میں آنے ہی نہ پائیں۔ اس لئے اول تو وہ انسان کو ان سب سوالوں کے سرسری جواب دے کر ان پر غور کرنے ہی سے روکنا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ چیزیں تو ہمیشہ سے یونہی چلی آ رہی ہیں اور یوں ہی چلتی رہیں گی ان سے تو فقط فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے وہ انسان سے کہتا ہے کہ انسان دیکھ دنیا میں تیرے لئے کیا کیا مزے ہیں فضول خیال چھوڑ اور مزے اڑانے کی کوشش کر۔ لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان پر غور کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کے لئے شیطان یہ سوچتا ہے کہ انھیں ایسے چکر میں پھنسانا چاہیے کہ جس میں سے وہ نکل نہ سکیں کیونکہ مقصد تو یہ ہے کہ وہ اللہ تک نہ پہنچیں اس کے سوا وہ چاہے کہیں پہنچیں شیطان کا مطلب حاصل ہے اسے تو انسان کو جس طرح ہو سکے خدا سے روکنا ہے اور اس راستہ سے دور رکھنا ہے جو سیدھا اللہ کی طرف پہنچتا ہے۔

شیطان کے ان ہتھکنڈوں سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید دنیا میں بھیجا جس کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان اللہ کو پہچانے اس لیے وہ انسان کو ان سوالات پر غور کرنے کی ہدایت کرتا ہے جن پر غور کرنے سے شیطان اسے روکتا ہے اور بجائے اس کے دنیا کی زندگی اور اس کی لذتوں میں پھنسا کر رکھنا چاہتا ہے یا پٹی یہ پڑھاتا ہے کیا اللہ کے بغیر بھی فلسفہ اور سائنس کے ذریعے سارا کام چلایا جا سکتا ہے۔ پچھلی آیتوں کو دیکھو ان سے صاف سمجھ میں آتا ہے کہ دنیا کی زندگی کی حقیقت کچھ نہیں اس کے آگے جو آخرت کی زندگی ہے وہی اصل زندگی ہے جو یہ بات پہچان لیں گے وہ ضرور قرآن پر ایمان لا کر رہیں گے اور پھر قرآن انھیں بتائے گا کہ دنیا میں کچھ نہیں رکھا اصل چیز اللہ کی عبادت ہے اور عبادت کی صورت نماز ہے نماز اس کو دنیا میں ہر وقت پھنسے رہنے سے روکے گی اور اللہ کی معرفت کا راستہ کھولے گی نماز پڑھنے والے کو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں جی لگانے سے جان بڑی مشکل سے بچے گی اور بعد میں سختی اور عذاب کے سوا کچھ نصیب نہ ہوگا۔ موت آنے میں کوئی شک نہیں ہر ایک کو مرنا ہے جب مرنا ہی ہے تو اس طرح مرنا چاہیے کہ جان آسانی سے نکلے اور نکلتے ہی ہمیشہ کا چین اور آرام نصیب ہو جو لوگ پچھلے دور کوع کی آیتوں پر غور کریں گے۔ ان کی سمجھ میں ان سوالوں کا جو پہلے بیان ہوئے سیدھا سادہ جواب فوراً آ جائے گا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے آرام کے لئے دنیا کی ساری چیزیں بھی اسی نے بنائیں لیکن انسان کو اس لیے نہیں بنایا کہ دنیا میں پھنس کر رہ جائے بلکہ اسے اس لیے بنایا ہے کہ اللہ کو پہچان کر اس کی عبادت کرے اور اسی میں اپنی دونوں جہان کی بہتری سمجھے ورنہ خیریت نہیں بہت برا انجام ہوگا۔ (درس آسٹریلیا، قرآن بورڈ)

اللہ تعالیٰ کے واحد ہونے پر دلائل

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کا ذکر فرمایا ہے کہ صرف وہی عبادت کا مستحق ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے واحد ہونے پر حسب ذیل دلائل ہیں :

(۱) ہم کہتے ہیں کہ تمام کائنات کی تخلیق کے لیے ایک صانع 'عالم 'قادر اور مدبر کافی ہے۔ اگر ایک سے زیادہ صانع کی ضرورت ہے تو ہم پوچھتے ہیں 'کتنے صانعین کی ضرورت ہے؟ اگر تم کسی عدد کی تخصیص کرو 'مثلاً تین یا چار کی تو یہ ترجیح بلا مرجح ہے 'کیونکہ تمام اعداد مساوی ہیں اور اگر تم کسی عدد میں صانع کا حصر نہ کرو تو غیر متناہی صانعین کا ہونا لازم آئے گا اور یہ براھین ابطال تسلسل سے باطل ہے۔

(۲) ہم کہتے ہیں کہ تمام کائنات کو پیدا کرنے کے لیے ایک صانع کافی ہے 'جو تمام معلومات کا عالم ہو اور تمام ممکنات پر قادر اور مدبر ہو۔ اب اگر دوسرا صانع فرض کیا جائے تو یا تو ان دونوں میں سے ہر ایک اس جہان کے حوادث میں سے کسی چیز کو وجود میں لانے کا مستقل فاعل ہوگا اور دوسرے کو اس میں مداخلت کرنے سے مانع ہوگا۔ ایسی میں کسی چیز کو موجود کرنے کے لیے ان دونوں میں سے صرف ایک کافی ہوگا اور دوسرا عاجز اور معطل ہوگا اور اگر کسی چیز کو موجود کرنے کے لیے وہ دونوں باہم اشتراک اور تعاون کے محتاج ہوں تو یہ باطل ہے 'کیونکہ جو محتاج ہو وہ الوہیت اور خدائی کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

(۳) اگر دو خدا فرض کیے جائیں تو ضروری ہے کہ وہ دونوں صفات کمال کے جامع ہوں اور اس صورت میں تمام صفات کمال ان دونوں میں مشترک ہوں گی 'پھر ان دونوں میں امتیاز کے لیے ایک امر ممیّز ماننا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ تعدد اور اثنینیت بلاامتیاز باطل ہے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ وہ امر ممیّز صفت کمال ہے یا صفت نقص۔ اگر وہ صفت کمال ہے 'تو پھر دونوں تمام صفات کمال کے جامع نہ رہے 'کیونکہ یہ ایک اور صفت کمال ہے اور اگر وہ انہی صفات کمال میں سے ہے 'تو یہ مابہ الاشتراک ہے مابہ الامتیاز نہیں ہے اور اگر یہ ممیّز صفت نقص ہے تو نقص کا حامل الوہیت کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

(۴) اگر دو خدا فرض کیے جائیں تو وجوب وجود اور قدم ان میں مشترک ہوگا اور کیونکہ اثنینیت بلاامتیاز باطل ہے 'اس لیے ان میں ایک اور ممیّز ہوگا اور ہر خدا دو چیزوں سے مرکب ہوگا امر مشترک اور امیر ممیّز اور جو مرکب ہو 'وہ اپنے اجزاء کا محتاج ہوتا ہے اور جو محتاج ہو وہ الوہیت کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

(۵) اگر دو خدا فرض کیے جائیں تو اگر ایک معین وقت میں مثلاً ایک خدا زید کو متحرک کرنے ارادہ کرے اور دوسرا اس کو ساکن کرنے کا ارادہ پورا ہونا محال ہے 'کیونکہ یہ اجتماع ضدین ہے۔ اس صورت میں صرف ایک کا ارادہ پورا ہوگا اور وہی غالب ہوگا اور دوسرا مغلوب ہوگا 'اور مغلوب الوہیت کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ وہ دونوں اتفاق کر لیتے ہیں اور اختلاف نہیں کرتے تو ہم کہتے ہیں کہ ان میں اختلاف کرنا ممکن ہے یا نہیں 'اگر اختلاف کرنا ممکن نہیں تو وہ عاجز ہوں گے اور عاجز الوہیت کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اگر اختلاف کر سکتے ہیں تو پھر وہی پہلی تقریر جاری ہوگی۔ نیز ہم کہتے ہیں کہ اگر وہ اتفاق کرتے ہیں تو ضرور ایک دوسرے کی موافقت کرے گا اور جو موافقت کرے گا 'وہ تابع ہوگا تابع الوہیت کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس دلیل کی طرف اللہ تعالیٰ نے ان آیتوں میں اشارہ فرمایا :

(آیت) "ما اتخذ اللہ من ولد وما کان معہ من الہ اذا لذھب کل الہ بما خلق ولعلا بعضھم علی بعض سبحان اللہ عما یصفون"۔ (المؤمنون : ٩١)

ترجمہ : اللہ نے کوئی اولاد نہیں بنائی اور نہ اس کے ساتھ اور کوئی معبود ہے ' ورنہ ہر معبود اپنی مخلوق کو الگ لے جاتا اور ہر ایک معبود دوسرے پر غلبہ پاتا ' اللہ ان چیزوں سے پاک اور بالاتر ہے جو وہ اس کے متعلق بیان کرتے ہیں۔

(آیت) "لو کان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا"۔ (الانبیاء : ٢٢)

ترجمہ : اگر آسمانوں اور زمینوں میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو ضرور وہ دونوں (آسمان اور زمین) تباہ ہو جاتے۔

(٦) اگر دو خدا ہوں تو یا تو وہ صفات ذاتیہ میں ایک دوسرے کے بالکل مساوی ہوں گے یا ایک اعلی اور دوسرا ادنی ہوگا۔ پہلی صورت اس لیے باطل ہے کہ اثنینیت بلاامتیاز محال ہے اور دوسری صورت اس لیے باطل ہے کہ جو ادنی ہو وہ الوہیت کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

(٧) اگر دو خدا ہوں تو یا تو ان میں سے ہر ایک اپنی مصنوع پر خصوصی دلیل قائم کرنے پر قادر ہوگا ' یا کوئی قادر نہیں ہوگا ' یا صرف ایک قادر ہوگا ؟ موخر الذکر دونوں صورتیں اس لیے باطل ہیں کہ قادر نہ ہونا عجز ہے اور عاجز الوہیت کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اول الذکر صورت اس لیے باطل ہے کہ جب فی الواقع کسی مصنوع کے دو صانع ہوں تو عقل کے نزدیک یہ محال ہے کہ اس کی دلالت کسی ایک صانع پر ہو ' نہ کہ دوسرے پر۔ مثلا ایک درخت ہل رہا ہے اب اس کا ہلنا اس پر دلیل ہے کہ اس کا کوئی ہلانے والا ہے ' لیکن عقل کے نزدیک اس پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ اس کا ہلانے والا فلاں ہے اور فلاں نہیں ہے۔

(٨) اگر دو خدا ہوں تو ہم پوچھتے ہیں کہ ایک خدا اپنی مخلوق کو دوسرے خدا سے چھپانے پر قادر ہے یا نہیں ؟ اگر وہ قادر نہ ہو تو اس کا عجز لازم آئے گا اور اگر وہ اپنی مخلوق کو دوسرے خدا سے چھپانے پر قادر ہو تو دوسرے خدا کا جہل لازم آئے گا اور نہ عاجز خدا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور نہ جاہل۔

(٩) اگر دو خدا ہوں تو ہم پوچھتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک بغیر دوسرے کے تعاون کے مستقلا تمام جہان کو پیدا کرنے پر قادر ہے یا نہیں ؟ اگر وہ اس پر قادر نہیں ہے تو عاجز ہوگا ' اور عاجز الوہیت کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اگر ان میں سے ہر ایک بغیر دوسرے کے تعاون کے مستقلا تمام جہان کو پیدا کرنے پر قادر ہے تو دوسرے کا معطل ہونا لازم آئے گا اور اس کو خدا ماننا عبث ہوگا۔

(١٠) ہم دیکھتے ہیں کہ تمام جہان کا نظام ایک نمط اور طرز واحد پر چل رہا ہے اور کبھی اس میں تغیر نہیں ہوتا۔ مثلا سورج ' چاند اور ستارے ہمیشہ ایک مخصوص جہت سے طلوع ہوتے ہیں اور اس کے مقابل جانب غروب ہوتے ہیں۔ بارش آسمان کی جانب سے ہوتی ہے اور غلہ زمین سے پیدا ہوتا ہے ' کبھی اس کے برعکس نہیں ہوتا۔ انسان کے ہاں ہمیشہ انسان پیدا ہوتا ہے ' بندر یا لنگور پیدا نہیں ہوتا ' اور شیر کے ہاں شیر پیدا ہوتا ہے کبھی لومڑی پیدا نہیں ہوتی۔ سیب کے درخت میں کبھی تربوز نہیں لگتا اور گندم کی بالیوں میں کبھی جوار نہیں لگتا۔ یہ ساری کائنات نظام واحد پر چل رہی ہے ' اور اس کا نظام واحد پر جاری ہونا زبان حال سے بتاتا ہے کہ اس کا ناظم بھی واحد ہے۔ اگر اس کائنات کے خالق متعدد ہوتے تو اس میں متعدد نظام ہوتے اور ان میں یکسانیت اور وحدت نہ ہوتی۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے نمرود کے سامنے اسی دلیل کی طرف اشارہ فرمایا تھا :

(آیت) "قال ابراھیم فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بھا من المغرب"۔ (البقرہ : ٢٥٨)

ترجمہ : ابراہیم نے کہا کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اس کو مغرب سے نکال

(۱۱) ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں ہر کثرت کسی وحدت کے تابع ہوتی ہے اور جو کثرت کسی وحدت کے تابع نہ ہو تو اس کا نظام فاسد ہو جاتا ہے۔ مثلاً کلاس میں طلباء کسی ایک استاد کے تابع ہوتے ہیں 'اور جب اسکول میں متعدد استاد ہوں تو وہ کسی ہیڈ ماسٹر کے تابع ہوتے ہیں۔ صوبہ میں جب کئی وزیر ہوں تو ان کے اوپر وزیر اعلی واحد ہوتا ہے اور متعدد مرکزی وزراء پر وزیر اعظم واحد ہوتا ہے۔ کسی ملک میں دو بادشاہ نہیں ہوتے 'نہ دو صدر ہوتے ہیں 'نہ دو وزیر اعظم ہوتے ہیں 'نہ کسی فوج کے دو کمانڈر انچیف ہوتے ہیں 'نہ کسی ادارہ میں دو مینجنگ ڈائریکٹر ہوتے ہیں۔ ہر شعبہ میں مرکزی اقتدار صرف ایک کے پاس ہوتا ہے اور ہر کثرت کسی وحدت کے تابع ہوتی ہے۔ سو اسی طرح اس کائنات کا کارساز مطلق اور مقتدر اعلی بھی واحد ہے۔ اگر اس کائنات کے صانع اور مدبر بھی دو یا دو سے زائد ہوتے تو اس کا نظام بھی فاسد ہو جاتا۔ اور جس طرح کسی مملکت کے دو صدر نہیں ہو سکتے 'اسی طرح اس کائنات کے بھی دو خدا نہیں ہو سکتے۔

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر جو میں نے دلائل پیش کیے ہیں ان میں سے کچھ دلائل علماء متقدمین سے مستفاد ہیں جن کی میں نے اپنے انداز سے تقریر کی ہے 'اور ان میں سے کچھ دلائل اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں القاء فرمائے ہیں۔ وللہ الحمد علی ذالک حمدا کثیرا۔

(تفسیر تبیان القرآن۔ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝۱۰۳

لغۃ القرآن: لَا : نہیں] [تُدْرِكُهُ : ادراک کرسکتیں اس کا] [الْاَبْصَارُ : نگاہیں] [وَهُوَ : اور وہ] [يُدْرِكُ : ادراک کرلیتا ہے] [الْاَبْصَارَ : نگاہوں کا] [وَهُوَ : اور وہ] [اللَّطِيْفُ : بہت باریک بین] [الْخَبِيْرُ : خوب خبردار ہے]

ترجمہ : نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ سب نگاہوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اور وہ بڑا باریک بین بڑا باخبر ہے

تشریح:

اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات غیر محدود ہیں اس لیے مخلوق کی آنکھیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں، البتہ کسی حد تک اس کا دیدار ممکن ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "قیامت کے دن کئی چہرے شگفتہ ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے"۔ (قرآن: 23:75) اس دنیا میں بھی جب اللہ تعالیٰ کسی کو اپنے دیدار کا شرف عطا کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنے نور کی خصوصی آنکھ عطا فرماتا ہے جس سے وہ دیدار کر سکتا ہے، جیسا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "مومن کی فراست سے بچو وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے۔

" (ترمذی: تفسیر القرآن: سورۃ الحجر)

یہی وہ خصوصی نورانی آنکھ تھی جس کے ساتھ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے معراج کی رات اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا۔ اگر اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار محال ہوتا تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) دیدار کا سوال نہ کرتے کیونکہ نبی کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ ناممکن چیز کا سوال کرے۔ (تفسیر قرطبی) (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

توحید کے بین اور ٹھوس دلائل دینے کے بعد وضاحت فرمائی گئی ہے کہ تم اپنے خالق کو بصیرت کی آنکھوں اور اس کی قدرت کے نشانات کے حوالے سے دیکھ سکتے ہو لیکن ظاہری آنکھ سے ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔

اللہ تعالیٰ کے دیدار کی چاہت رکھنا مومن کے ایمان کی معراج ہے۔

جنت میں سب سے بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کی زیارت اور خوشنودی ہوگی۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے کوہ طور پر اللہ تعالیٰ سے حجاب میں ہم کلامی کرتے ہوئے فرط محبت میں آکر مطالبہ کیا تھا۔ اے رب کریم میرا دل تیری زیارت کے لیے تڑپ رہا ہے اس لیے میری درخواست ہے کہ مجھے اپنی زیارت کے شرف سے سرفراز فرمائیں۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا۔ اے موسیٰ تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا جب موسیٰ محبت الٰہی میں بے قرار ہو کر اصرار کرنے لگے تو حکم ہوا کوہ طور کے فلاں حصہ پر نگاہ اٹھاؤ۔ اگر وہ میرے جلال و جمال کی ایک کرن برداشت کر سکا تو تُو بھی میرے جلال اور جمال کی جھلک برداشت کر سکے گا۔ جونہی اللہ تعالیٰ کے جمال کی ایک کرن کوہ طور پر پڑی تو طور کا وہ حصہ ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر پیٹھ کے بل نیچے گر پڑے۔ جب ہوش آیا تو اس مطالبہ پر اللہ سے معافی طلب کی۔ اس کی تفصیل سورۃ الاعراف آیت ۱۴۳ میں ملاحظہ فرمائیے۔

کفار محبت الٰہی کی بنا پر نہیں بلکہ انبیاء (علیہ السلام) پر بے یقینی اور ان کو لاجواب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے دیدار کا مطالبہ کرتے تھے۔ ان میں یہودی سر فہرست رہے ہیں جنھوں نے موسیٰ (علیہ السلام) سے بارہا مطالبہ کیا کہ ہم تب ایمان لائیں گے جب ہم براہ راست اللہ تعالیٰ کو دیکھ لیں۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) مجبور ہو کر ستر آدمیوں کو ساتھ لے کر کوہ طور پر پہنچے جب یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے اس کے دیدار کا مطالبہ کرنے لگے تو ایک کڑک نے انھیں آلیا۔ وہ سب کے سب ہلاک ہوئے لیکن موسیٰ (علیہ السلام) کی دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے انھیں دوبارہ زندگی عنایت فرمائی۔ (الاعراف: ۱۵۵)

معراج کی رات نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباس (رض) کا موقف ہے آپ نے معراج کی رات اللہ تعالیٰ کی براہ راست زیارت کی ہے وہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے معراج کی رات رؤیت کا شرف پایا۔ حضرت ابن عباس (رض) کی وجہ سے کچھ صحابہ اور بعض ائمہ

کرام کا بھی یہی موقف ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے معراج کی رات اللہ تعالیٰ کی زیارت کی ہے۔اس کے لیے وہ دو آیات کا حوالہ دیتے ہیں۔

(وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ) [التکویر : ۲۳]

"اور اس نے اس کو روشن افق پر دیکھا"

(وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى) [النجم : ۱۳]

"اور ایک مرتبہ اور بھی اس نے اس کو دیکھا" (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

آخرت میں اللہ تعالیٰ کے دیدار سے متعلق اہلسنّت کا عقیدہ

یاد رکھیں کہ اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ مومنوں کو آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔اہل سنت کا یہ عقیدہ قرآن و حدیث، اجماع صحابہ اور اکابر بزرگان دین کے کثیر دلائل سے ثابت ہے۔دیدارِ الٰہی کے قرآن پاک سے تین دلائل :

(1)۔۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

"وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾ "

کچھ چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے، اپنے رب کو دیکھتے ہوں گے۔

(2)۔۔اللہ عَزَّوَجَلَّ نے ارشاد فرمایا :

"لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ"

بھلائی والوں کے لیے بھلائی ہے اور اس سے بھی زائد۔

صحاح ستہ کی بہت حدیثیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ اس آیت میں زیادت سے دیدار الٰہی مراد ہے۔

(3)۔۔حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اللہ عَزَّوَجَلَّ کی بارگاہ میں عرض کی "رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡكَ "اے میرے رب مجھے اپنا دیدار دکھا کہ میں تجھے دیکھوں۔اس پر انھیں جواب ملا "لَنۡ تَرٰىنِیۡ "تو مجھے ہر گز نہ دیکھ سکے گا۔(3) اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ میرا دیدار ناممکن ہے کیونکہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) عارِف باللہ ہیں، اگر دیدار الٰہی ممکن نہ ہوتا تو آپ ہر گز سوال نہ فرماتے، اس سے ثابت ہوا کہ دیدار الٰہی ممکن ہے۔

دیدارِ الٰہی کے احادیث سے 3 دلائل

احادیث بھی اس بارے میں بکثرت ہیں، ان میں سے 3 احادیث درج ذیل ہیں :

(1)۔۔ مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ جنتیوں کے جنت میں داخل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائے گا "کیا تم چاہتے ہو کہ تم پر اور زیادہ عنایت کروں؟ وہ عرض کریں گے: یارب! عَزَّوَجَلَّ کیا تو نے ہمارے چہرے سفید نہیں کئے؟ کیا تو نے ہمیں جنت میں داخل نہیں فرمایا؟ کیا تو نے ہمیں دوزخ سے نجات نہیں دی؟ رسولُ اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "پھر پردہ اٹھادیا جائے گا تو دیدار الٰہی انھیں ہر نعمت سے زیادہ پیارا ہوگا۔

(2)۔۔ حضرت جریر بن عبداللہ (رض) فرماتے ہیں "ہم سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں حاضر تھے کہ رات کے وقت آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے چاند کی طرف دیکھ کر فرمایا: "عنقریب تم اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کو دیکھوگے جیسے اس چاند کو دیکھتے ہو اور اسے دیکھنے میں کوئی دقت محسوس نہ کروگے۔

(3)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، صحابہ کرام (رض) نے عرض کی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، کیا ہم قیامت کے دن اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کو دیکھیں گے؟ ارشاد فرمایا: کیا دوپہر کے وقت جب بادل نہ ہوں تو سورج کو دیکھنے میں تمہیں کوئی تکلیف ہوتی ہے؟ عرض کی: نہیں۔ ارشاد فرمایا: چودھویں رات کو جب بادل نہ ہوں تو کیا تمہیں چاند دیکھنے سے کوئی تکلیف ہوتی ہے؟ صحابہ کرام (رض) نے عرض کی: نہیں، ارشاد فرمایا: اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، تمہیں اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کو دیکھنے میں صرف اتنی تکلیف ہوگی جتنی تکلیف تم کو سورج یا چاند دیکھنے سے ہوتی ہے۔

ان دلائل سے ثابت ہوگیا کہ آخرت میں مومنین کے لیے دیدار الٰہی شرع میں ثابت ہے اور اس کا انکار گمراہی۔ گمراہ لوگ اس آیت کے ذریعے اللہ عَزَّوَجَلَّ کے دیدار کا انکار کرتے ہیں، ہم یہاں آیت کا مفہوم بیان کرتے ہیں اس سے سارا معاملہ واضح ہو جائے گا۔ آیت کے مفہوم کو کافی آسان کیا ہے لیکن پھر بھی اسے مکمل طور پر علماء ہی سمجھ سکتے ہیں لہٰذا عوام کی خدمت میں یہی عرض ہے کہ اوپر تک جو بیان ہوا وہی ان کیلئے کافی ہے اور نیچے کی بحث پر زیادہ دماغ نہ لڑائیں اور اگر ضرور ہی سمجھنا ہے تو کسی صحیح العقیدہ، ماہر سنی عالم سے سمجھیں۔

آیت "لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصٰرُ" کا مفہوم

اِدراک کے معنی ہیں کہ دیکھی جانے والی چیز کی تمام طرفوں اور حدوں پر واقف ہونا کہ یہ چیز فلاں جگہ سے شروع ہو کر فلاں جگہ ختم ہو گئی جیسے انسان کو ہم کہیں کہ سر سے شروع ہو کر پاؤں پر ختم ہوگیا، اسی کو احاطہ (گھیراؤ) کہتے ہیں۔ اِدراک کی یہی تفسیر حضرت سعید بن مُسَیَّبْ اور حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے منقول ہے اور جمہور مفسرین ادراک کی تفسیر احاطہ سے فرماتے ہیں اور احاطہ اسی چیز کا ہو سکتا ہے جس کی حدیں اور جہتیں ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے حد اور جہت محال ہے تو اس کا ادراک واحاطہ بھی ناممکن۔ یہی اہل سنت کا مذہب ہے۔ خارجی اور معتزلہ وغیرہ گمراہ فرقے ادراک اور رویت میں فرق نہیں کرتے، اس لیے وہ اس گمراہی میں مبتلا ہو گئے کہ انھوں نے دیدار الٰہی کو محال عقلی قرار دے دیا، حالانکہ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کو دیکھا نہیں جاسکتا تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کو جانا بھی نہیں جاسکتا اور جیسے کائنات میں موجود تمام چیزوں کے برخلاف کیفیت وجہت کے بغیر اللہ عَزَّوَجَلَّ کو جانا جاسکتا ہے ایسے ہی دیکھا بھی جاسکتا ہے کیونکہ اگر دوسری موجودات بغیر کیفیّت وجہت کے دیکھی نہیں جاسکتیں تو جانی بھی نہیں جاسکتیں۔ اس کلام کی بنیاد یہ ہے کہ دیکھنے کے معنی یہ ہیں کہ بصر

(دیکھنے کی قوت) کسی شے کو جیسی وہ ہو ویسا جانے تو جو شے جہت والی ہوگی، اس کا دیکھا جانا جہت میں ہوگا اور جس کے لیے جہت نہ ہوگی اس کا دیکھا جانا بغیر جہت کے ہوگا۔ (تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری)

صاحب گلدستہ نے بڑی مفصل گفتگو کی ہے ملاحظہ فرمائیں

آخرت میں اللہ تعالیٰ کے دیدار سے متعلق اہلسنّت کا عقیدہ

یاد رکھیں کہ اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ مومنوں کو آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ اہل سنت کا یہ عقیدہ قرآن و حدیث، اجماع صحابہ اور اکابر بزرگان دین کے کثیر دلائل سے ثابت ہے۔ دیدارِ الٰہی کے قرآن پاک سے تین دلائل :

(1)۔۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

"وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾"

کچھ چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے، اپنے رب کو دیکھتے ہوں گے۔

(2)۔۔اللہ عَزَّوَجَلَّ نے ارشاد فرمایا :

"لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ"

بھلائی والوں کے لیے بھلائی ہے اور اس سے بھی زائد۔

صحاح ستہ کی بہت حدیثیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ اس آیت میں زیادت سے دیدار الٰہی مراد ہے۔

(3)۔۔حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اللہ عَزَّوَجَلَّ کی بارگاہ میں عرض کی "رَبِّ اَرِنِيْ اَنْظُرْ اِلَيْكَ" "اے میرے رب مجھے اپنا دیدار دکھا کہ میں تجھے دیکھوں۔ اس پر انھیں جواب ملا "لَنْ تَرٰىنِيْ "تو مجھے ہر گز نہ دیکھ سکے گا۔ (3) اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالی نے یہ نہیں فرمایا کہ میرا دیدار ناممکن ہے کیونکہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) عارِف باللہ ہیں، اگر دیدار الٰہی ممکن نہ ہوتا تو آپ ہر گز سوال نہ فرماتے، اس سے ثابت ہوا کہ دیدار الٰہی ممکن ہے۔

دیدارِ الٰہی کے احادیث سے 3 دلائل

احادیث بھی اس بارے میں بکثرت ہیں، ان میں سے 3 احادیث درج ذیل ہیں :

(1)۔۔مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ جنتیوں کے جنت میں داخل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائے گا "کیا تم چاہتے ہو کہ تم پر اور زیادہ عنایت کروں؟ وہ عرض کریں گے : یارب! عَزَّوَجَلَّ کیا تو نے ہمارے چہرے سفید نہیں کئے؟ کیا تو نے ہمیں جنت میں داخل نہیں فرمایا؟ کیا تو نے ہمیں دوزخ سے نجات نہیں دی؟ رسولُ اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : "پھر پردہ اٹھا دیا جائے گا تو دیدار الٰہی انھیں ہر نعمت سے زیادہ پیارا ہوگا۔

(2)۔۔ حضرت جریر بن عبداللہ (رض) فرماتے ہیں "ہم سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں حاضر تھے کہ رات کے وقت آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے چاند کی طرف دیکھ کر فرمایا: "عنقریب تم اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کو دیکھوگے جیسے اس چاند کو دیکھتے ہو اور اسے دیکھنے میں کوئی دقت محسوس نہ کروگے۔

(3)۔۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، صحابہ کرام (رض) نے عرض کی: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، کیا ہم قیامت کے دن اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کو دیکھیں گے؟ ارشاد فرمایا: کیا دوپہر کے وقت جب بادل نہ ہوں تو سورج کو دیکھنے میں تمہیں کوئی تکلیف ہوتی ہے؟ عرض کی: نہیں۔ ارشاد فرمایا: چودھویں رات کو جب بادل نہ ہوں تو کیا تمہیں چاند دیکھنے سے کوئی تکلیف ہوتی ہے؟ صحابہ کرام (رض) نے عرض کی: نہیں، ارشاد فرمایا: اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، تمہیں اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کو دیکھنے میں صرف اتنی تکلیف ہوگی جتنی تکلیف تم کو سورج یا چاند دیکھنے سے ہوتی ہے۔

ان دلائل سے ثابت ہوگیا کہ آخرت میں مومنین کے لیے دیدار الٰہی شرع میں ثابت ہے اور اس کا انکار گمراہی۔ گمراہ لوگ اس آیت کے ذریعے اللہ عَزَّوَجَلَّ کے دیدار کا انکار کرتے ہیں، ہم یہاں آیت کا مفہوم بیان کرتے ہیں اس سے سارا معاملہ واضح ہو جائے گا۔ آیت کے مفہوم کو کافی آسان کیا ہے لیکن پھر بھی اسے مکمل طور پر علماء ہی سمجھ سکتے ہیں لہٰذا عوام کی خدمت میں یہی عرض ہے کہ اوپر تک جو بیان ہوا وہی ان کیلئے کافی ہے اور نیچے کی بحث پر زیادہ دماغ نہ لڑائیں اور اگر ضرور ہی سمجھنا ہے تو کسی صحیح العقیدہ، ماہر سنی عالم سے سمجھیں۔

آیت "لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ" کا مفہوم

اِدراک کے معنٰی ہیں کہ دیکھی جانے والی چیز کی تمام طرفوں اور حدوں پر واقف ہونا کہ یہ چیز فلاں جگہ سے شروع ہو کر فلاں جگہ ختم ہو گئی جیسے انسان کو ہم کہیں کہ سر سے شروع ہو کر پاؤں پر ختم ہو گیا، اسی کو احاطہ (گھیراؤ) کہتے ہیں۔ اِدراک کی یہی تفسیر حضرت سعید بن مُسَیَّبْ اور حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے منقول ہے اور جمہور مفسرین ادراک کی تفسیر احاطہ سے فرماتے ہیں اور احاطہ اسی چیز کا ہو سکتا ہے جس کی حدیں اور جہتیں ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے حد اور جہت محال ہے تو اس کا ادراک واحاطہ بھی ناممکن۔ یہی اہل سنت کا مذہب ہے۔ خارجی اور معتزلہ وغیرہ گمراہ فرقے ادراک اور رویت میں فرق نہیں کرتے، اس لیے وہ اس گمراہی میں مبتلا ہو گئے کہ انھوں نے دیدار الٰہی کو محال عقلی قرار دے دیا، حالانکہ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کو دیکھا نہیں جاسکتا تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کو جانا بھی نہیں جاسکتا اور جیسے کائنات میں موجود تمام چیزوں کے برخلاف کیفیت وجہت کے بغیر اللہ عَزَّوَجَلَّ کو جانا جاسکتا ہے ایسے ہی دیکھا بھی جاسکتا ہے کیونکہ اگر دوسری موجودات بغیر کیفیّت وجہت کے دیکھی نہیں جاسکتیں تو جانی بھی نہیں جاسکتیں۔ اس کلام کی بنیاد یہ ہے کہ دیکھنے کے معنی یہ ہیں کہ بصر (دیکھنے کی قوت) کسی شے کو جیسی وہ ہو ویسا جانے تو جو شے جہت والی ہوگی، اس کا دیکھا جانا جہت میں ہوگا اور جس کے لیے جہت نہ ہوگی اس کا دیکھا جانا بغیر جہت کے ہوگا۔ (تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی)

صاحب برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب القرآن فرماتے ہیں

اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد ماننے والوں سے کہا جارہا ہے کہ اس کے لئے اولاد کیسے ممکن ہے وہ تو اس قدر لطیف ہے کہ اسے کسی کی ظاہری نظر اور علمی نگاہ نہیں کر سکتی اور وہ اس قدر علیم و خبیر ہے کہ اس نے تمہاری نگاہوں کو گھیر رکھا ہے یعنی تمہاری پلکوں کی حرکات اور دل کے خطرات اس کے علم میں ہیں۔ ایسے عظیم رب کے لیے کوئی شریک یا اولاد کیسے ممکن ہے۔ کیا اس جیسا کوئی ہو سکتا ہے؟

یاد رہے! معتزلہ اللہ کے دیدار کو دنیا و آخرت میں محال بتاتے تھے اور آج اہل تشیع بھی یہی کہتے ہیں وہ اسی آیت تدرکہ الابصار سے استدلال کرتے ہیں۔ جب کہ تمام اہل سنت کے نزدیک اللہ رب العزت کا دیدار دنیا میں حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوا اور آخرت میں سب مسلمان اللہ کو دیکھیں گے، مگر اس دیکھنے کی کیفیت کیا ہوگی۔ وہ اللہ ہی جانتا ہے مگر کفار محروم رہیں گے اور قرینے قیاس یہ ہے کہ معتزلہ اور شیعہ بھی اس سے محروم ہوں گے کیونکہ جو کسی نعمت سے انکار کرے وہ اس سے محروم کر دیا جاتا ہے جیسے جنت کے منکروں کو جنت نہیں ملے گی۔

دیدارِ الٰہی کے امکان پر اہل سنت کے دلائل

1۔ قرآن فرماتا ہے: **وجوہ یومئذ ناضرۃ۔ الی ربہا ناظرۃ**۔ اس دن کچھ تروتازہ چہرے اپنے رب کو دیکھتے ہوں گے۔ " (قیامہ: 23)

2۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **كَلَّآ إِنَّهُمۡ عَن رَّبِّهِمۡ يَوۡمَئِذٖ لَّمَحۡجُوبُونَ**۔ "ہاں کفار اس دن اپنے رب سے حجاب میں ہوں گے۔ "

3۔ پھر موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: رب ارنی انظر الیك "اے اللہ مجھے دکھا میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں۔ "اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَن تَرَىٰنِي۔ " اے موسیٰ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ " (اعراف: 143) اگر دیدار الٰہی ناممکن ہوتا تو موسیٰ (علیہ السلام) اس کا مطالبہ نہ کرتے اور اللہ رب العزت نے بھی صرف یہ فرمایا اے موسیٰ! تم (دنیا میں مجھے نہیں دیکھ سکتے، یہ نہیں فرمایا: لاأریٰ کہ مجھے تو دیکھا ہی نہیں جاسکتا۔

4۔ حضرت جریر (رض) سے مروی ہے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک بار چودھویں کا چاند چمکتے دیکھ کر فرمایا: انکم سترون ربکم کما ترون ھذا القمر لا تضامون فی رویتم۔ "تم اپنے رب کو عنقریب یوں دیکھوگے جیسے اس چاند کو دیکھ رہے ہو تمہیں اس کے دیکھنے میں کوئی شک نہ ہوگا۔ " (بخاری کتاب مواقیت الصلوۃ باب فضیلۃ صلوۃ العصر) اور حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے ہاں (جنت میں) سب سے مکرم وہ ہوگا جو صبح و شام اس کے چہرے کی زیارت کرے گا۔ پھر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ آیت پڑھی: **وجوہ یومئذ ناضرۃ۔ الی ربہا ناظرۃ**۔ اس دن کچھ تروتازہ چہرے اپنے رب کو دیکھتے ہوں گے۔ "

(ترمذی حدیث 2563)

5۔ اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اپنے رب کو شب معراج دیکھنا اپنی جگہ محقق ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) نے فرمایا: رای محمد ربہ مرتین۔ "حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے رب کو دو بار دیکھا۔ " (ترمذی کتاب التفسیر سورۃ النجم)

حضرت ابوذر غفاری (رض) سے پوچھا گیا کیا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے رب کو دیکھا تھا؟ انھوں نے فرمایا ہاں دیکھا تھا اور یہ اس قدر بلند کہا کہ وادی گونج اٹھی۔ (ترمذی کتاب التفسیر سورۃ النجم)

رویت باری تعالیٰ کا ثبوت کتب شیعہ سے

آج اہل تشیع اہلسنت پر اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے رویت مان کر اس کو مجسم قرار دیا ہے، کیونکہ نذر وہ آئے جو مجسم ہو اور اللہ کے لیے جسم ماننا کفر ہے۔ مگر یہ بے جا اعتراض ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ اللہ کی روایت ہو گی مگر اس کی کیفیت کو اللہ ہی جانتا ہے جب کہ کتب اہل تشیع میں بھی اہل جنت کا اللہ کو دیکھنا بکثرت مذکور ہے اس کے باوجود ان کا اس سے انکار عجیب بات ہے۔

ملا باقر مجلسی نے امام باقر کی روایت سے اہل جنت کے احوال ذکر کئے ہیں۔ جن کے آخر میں یہ الفاظ ہیں :

ثم یتجلی لھم تبارك و تعالیٰ سبحانہ حتی ینظروا الی نور وجھه المکنون من عین کل ناظر، ثم یقول الرب سبحانہ تبارك و تعالیٰ لا الہ غیرہ، لکم کل جمعة زورة ما بین الجمعة الی الجمعة سبعة آلاف سنة مما تعدون۔

پھر اللہ تبارک و تعالیٰ ان پر تجلی فرمائے گا حتیٰ کہ وہ اس کے رکن مکنون کو ہر دیکھنے والے کی نظر سے دیکھیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا : تمہارے لیے ہر جمعہ کو یہ زیارت ہو گی اور ہر جمعہ سات ہزار برس کے بعد آیا کرے گا۔

(بحار الانوار جلد 8 صفحہ 217 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

اسی طرح امام جعفر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ فرمایا :

فاذا اجتمعوا تجلی لھم الرب تبارك و تعالیٰ فاذا نظروا الیه خروا سجدا فیقول عبادی ارفعوا رؤوسکم لیس ھذا یوم سجود۔ "جب اہل جنت وہاں جمع ہو جائیں گے تو اللہ رب العزت ان پر تجلی فرمائے گا، جب وہ اس کی طرف نظر کریں گے تو سجدہ میں گر جائیں گے اللہ فرمائے گا اپنا سر اٹھاؤ یہ سجدہ کا دن نہیں ہے۔" (بحار الانوار جلد 8 صفحہ 126)

رہا قرآن کا فرمانا : لا تدرکه الابصار۔ کہاں سے نگاہیں نہیں پا سکتیں تو اس کا معنی یہ ہے کہ اسے یہ دنیا کی عام بشری و جسمانی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شب معراج اللہ کو جب دیکھا تو ان میں عام جسمانی نہیں بلکہ روحانی طاقت تھی اور روز قیامت مومنوں کی آنکھیں یہ دنیوی آنکھیں نہ ہوں گی، بلکہ انسانوں کو وہاں نئی تخلیق میں اٹھایا جائے گا۔

پھر یہاں لا تدرکه الابصار فرمایا گیا۔ لا تراہ الابصار۔ نہیں فرمایا گیا۔ گویا ادراک کی نفی کی گئی ہے رؤیت کی نہیں اور ادراک بمعنی احاطہ ہے اور واقعتاً کوئی آنکھ تجلیات خداوندی کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ البتہ اس کی کوئی تجلی ہی دیکھی جا سکتی ہے اور اہل جنت کو جنت میں دیدار الٰہی کی ایک تجلی ہی حاصل ہو گی جس کی کیفیت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ مزید تحقیق کے لیے سورۃ نجم رکوع اول کے تحت بھی دیکھیں۔ وہاں رؤیت باری تعالیٰ پہ دیگر اعتراضات کا محاسبہ کیا جائے گا۔

معلوم ہوا اللہ تعالیٰ جسم، حدود اور جہات سے پاک ہے۔ کیونکہ لاتدرکہ الابصار سے اللہ کا جسم و جسمانیات سے پاک ہونا معلوم ہوا۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا : لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ۔ اسی لیے اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى۔ متشابہات میں سے ہے۔

(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

حقیقت یہ ہے کہ انسانی نظر 'انسان کے حواس 'اور انسان کا ذہنی ادراک یہ سب قوتیں اسے صرف اس لیے دی گئی ہیں کہ وہ اس کائنات کے ساتھ تعلق کی نسبت سے اپنے معاملات طے کر سکے اور اس کرہ ارض پر منصب خلافت کی ذمہ داریاں ادا کر سکے اور اس مخلوق کائنات کے صفحات میں وجود باری پر دلالت کرنے والے آثار کی تلاش کر سکے۔ رہی ذات باری کی حقیقت تو وہ اس طاقت ہی سے محروم ہیں جس کے ذریعے وہ اس کا ادراک کر سکیں۔ اس لیے کہ ایک حادث اور فانی وجود کے اندر وہ قدرت ہی نہیں ہے کہ وہ ازلی اور ابدی ذات کا ادراک کر سکیں۔ اس لیے کہ ایک حادث اور فانی وجود کے اندر وہ قدرت ہی نہیں ہے کہ وہ ازلی اور ابدی ذات کا ادراک کر سکے۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اس کرہ ارض پر انسان کی جو ذمہ داریاں ہیں ان کی ادائیگی کے لیے اس کے لیے رویت باری کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ جہاں تک یہاں انسانی فرائض کا تعلق ہے ان کی ادائیگی کے لیے انسان کو مناسب طاقت دی گئی ہے۔

انسان کے لیے یہ تو ممکن ہے کہ وہ سابقہ لوگوں کی سادگی کو سمجھ لے مگر وہ آخری دور میں آنے والوں کی قبیح فطرت کو سمجھنے میں غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہے 'یہ لوگ ایٹم اور برق کی بات کرتے ہیں۔ پروٹون اور نیوٹرون کی بات کرتے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے اپنی زندگی کے اندر ایٹم 'کوئی برق 'کوئی نیوٹرون اور کوئی پروٹون نہ دیکھا 'اس لیے کہ زندگی کی ماہیت کو دیکھنے کی دوربین ابھی تک وجود میں نہیں آسکی۔ ان سائنس دانوں کے نزدیک یہ امور بہر حال مسلم ہیں اور وہ ان کے وجود کو فرض کرتے ہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے ان چیزوں کے کچھ آثار متعین کر لیے ہیں۔ جب وہ آثار پائے جاتے ہیں تو ان لوگوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ موجود ہیں اور کائنات بھی موجود ہے حالانکہ یہ صرف احتمال ہے کہ جس طرح انھوں نے فرض کیا ہے کائنات اسی طرح ہو۔ تاہم جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ موجود ہے اس لیے کہ اس کے آثار موجود ہیں اور یہ آثار اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اللہ موجود ہے تو پھر یہ لوگ وجود باری کے بارے میں جدل وجدال اور مناقشہ شروع کر دیتے ہیں بغیر علم 'بغیر ہدایت 'بغیر ادراک اور بغیر کسی کتاب منیر کے۔ اس کے برعکس اللہ کے وجود کے لیے وہ ایسی دلیل طلب کرتے ہیں کہ آنکھیں اللہ کو دیکھ سکیں۔ اس کرہ ارض پر زندگی کے عجائب گویا ان کے لیے کافی نہیں ہیں حالانکہ وہ وجود باری پر کافی ثبوت ہیں۔

دلائل تکوینی جو اس کائنات کی کھلی کتاب کے صفحات میں بکھرے ہوئے ہیں اور انسانی نفوس کے اندر بھی موجود ہیں ان کے بیان کے بعد اور یہ کہنے کے بعد کہ۔

(آیت) "لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (103)

" نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے وہ نہایت باریک بین اور باخبر ہے۔'

اب اس خوبصورت انداز میں صفات الٰہی کے بیان کے بعد بات یوں آگے بڑھتی ہے۔ (فی ظلال القرآن)

"علامہ غلام رسول سعیدیؒ فرماتے ہیں

رویت باری کے متعلق فقہاء اسلام کے نظریات

تقریباً ہر دور کے علماء اسلام کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رویت (اس کا دکھائی دینا) دنیا اور آخرت میں ممکن ہے یا نہیں۔ بعض علماء نے اس کا انکار کیا اور جمہور علماء اسلام کا موقف یہ ہے کہ دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رویت ممکن ہے اور دنیا میں یہ رویت
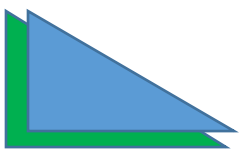
صرف سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے معراج کی شب واقع ہوئی اور آخرت میں تمام انبیاء (علیہم السلام) اور مومنین کے لیے یہ روایت واقع ہوگی ' میدان حشر میں بھی اور جنت میں بھی۔

منکرین رویت کے دلائل اور ان کے جوابات

معتزلہ اور دیگر منکرین رویت کی ایک دلیل یہ ہے کہ جو چیز دکھائی دے ' وہ دیکھنے والے کی مقابل جانب میں ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ دکھائی دے تو اس کے لیے ایک جانب اور جہت کا ہونا لازم آئے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پھر تمہیں چاہیے کہ تم اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کا بھی انکار کردو ' کیونکہ دیکھنے والا بھی دکھائی دینے والی چیز کی جانب مخالف یہ ہوتا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ دیکھنے اور دکھائی دینے کا یہ قاعدہ ممکنات اور مخلوقات کے اعتبار سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں ہے ' اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کے لیے جانب اور مقابلہ کی شرط ہے ' نہ دکھائی دینے کے لیے۔
منکرین رویت کی دوسری دلیل یہ آیت ہے جس کا معنی وہ یہ کرتے ہیں کہ آنکھیں اس کو نہیں دیکھ سکتیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ آنکھیں اس کا احاطہ نہیں کرسکتیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں سلب عموم اور نفی شمول ہے۔ عموم السلب اور شمول النفی نہیں ہے۔ یعنی ہر ہر آنکھ کے دیکھنے کی نفی نہیں ہے ' نہ ہر ہر زمانہ میں دیکھنے کی نفی ہے ' نہ ہر ہر مواقع پر دیکھنے کی نفی ہے ' بلکہ بعض زمانہ میں بعض مواقع پر بعض لوگوں کے دیکھنے کی نفی ہے ' سو دنیا میں دیکھنے کی نفی ہے اور آخرت کے بعض مواقع میں جب اللہ تعالیٰ غضب اور جلال میں ہوگا ' اس وقت اس کی دیکھنے کی نفی ہے اور کفار اور منافقین کے دیکھنے کی نفی ہے۔ ہمارے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شب معراج میں جو اللہ تعالیٰ کو دیکھا اور محشر میں اور جنت میں دیگر انبیاء (علیہم السلام) اور جملہ مومنین کے دیکھنے کی نفی نہیں ہے۔
منکرین رویت کی تیسری دلیل یہ ہے کہ جن بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا مطالبہ کیا تھا ' اللہ تعالیٰ نے ان کے اس مطالبہ کو بہ طور مذمت نقل کیا ہے اور اس مطالبہ پر عذاب نازل کیا :

(آیت) "**واذقلتم یموسی لن نؤمن لك حتی نری اللہ جهرة فاخذتكم الصعقة وانتم تنظرون**"۔ (البقرہ : ۵۵)

ترجمہ : اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ! ہم آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے ' حتی کہ ہم اللہ کو کھلم کھلا دیکھ لیں تو تم کو (بجلی کی) کڑک نے پکڑ لیا اور تم (اس منظر کو) دیکھ رہے تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ان پر عذاب نازل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لانے اور ان کی باتوں پر یقین کرنے کو از راہ عناد اور سرکشی اللہ تعالیٰ کے دیکھنے پر معلق کردیا تھا اس وجہ سے نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور شوق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو دیکھنا چاہتے تھے۔
منکرین رویت کی چوتھی دلیل یہ حدیث ہے۔
امام مسلم بن حجاج قشیری ۲۶۱ ھ روایت کرتے ہیں :
مسروق بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ صدیقہ ام المومنین (رض) کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ حضرت عائشہ (رض) نے فرمایا اے ابو عائشہ ! جس شخص نے تین باتوں میں سے ایک بات بھی کہی ' اس نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا جھوٹ باندھا۔ ؛ میں نے پوچھا وہ کون سی باتیں ہیں ؟

حضرت عائشہ (رض) نے فرمایا جس شخص نے یہ زعم کیا کہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے رب کو دیکھا ہے 'اس نے اللہ پر بہت بڑا جھوٹ باندھا۔ مسروق نے کہا میں ٹیک لگائے ہوئے تھا 'میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا اے ام المومنین ! مجھے مہلت دیں اور جلدی نہ کریں 'کیا اللہ عزوجل نے یہ نہیں فرمایا:

(آیت) "ولقد راہ بالافق المبین"۔ (التکویر: ۲۳)

ترجمہ: اور بیشک انھوں نے اسے روشن کنارے پر دیکھا۔

(آیت) "ولقد راہ نزلۃ اخری"۔ (النجم: ۱۳)

ترجمہ: اور بیشک انھوں نے اسے دوسری بار ضرور دیکھا۔

حضرت عائشہ (رض) نے فرمایا میں اس امت میں وہ سب سے پہلی شخص ہوں جس نے ان آیتوں کے متعلق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا تھا؟ آپ نے فرمایا اس سے مراد حضرت جبرائیل ہیں 'حضرت جبرائیل (علیہ السلام) کو جس صورت پر پیدا کیا گیا 'میں نے اس صورت پر ان کو صرف دوبارہ دیکھا ہے۔ میں نے ان کو آسمان سے اترتے ہوئے دیکھا ان کی عظیم خلقت نے آسمان سے زمین تک کی جگہ کو بھر لیا تھا۔ حضرت عائشہ (رض) نے (مسروق سے) فرمایا کیا تم نے قرآن مجید کی یہ آیتیں نہیں سنیں:

(آیت) "لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار"۔ (الانعام: ۱۰۳)

ترجمہ: آنکھیں اس کو نہیں دیکھ سکتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے۔

(آیت) "وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا اومن ورآی حجاب اویرسل رسولا فیوحی باذنہ مایشآء"۔ (الشوری: ۵۱)

ترجمہ: اور کسی بشر کے لائق نہیں کہ وہ اللہ سے کلام کرے 'مگر وحی سے یا پردے کے پیچھے سے یا وہ کوئی فرشتہ بھیج دے جو اس کے حکم سے جو کچھ اللہ چاہے 'پہنچادے۔

(صحیح مسلم 'ایمان '۲۸۷ '(۱۷۷) ۴۳۲ ' صحیح البخاری 'ج ۵ 'رقم الحدیث: '۴۸۵۵ 'سنن الترمذی 'ج ۵ 'رقم الحدیث: '۳۰۶۸ 'مسند احمد 'ج ۱۰ 'رقم الحدیث: '۲۶۰۹۹ 'السنن الکبری للنسائی 'ج ٦ 'رقم الحدیث: '۱۱۱۴۷)

اس حدیث کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا اس مسئلہ میں اختلاف تھا 'جیسا کہ ہم انشاء اللہ عنقریب بیان کریں گے۔ حضرت عائشہ (رض) اس بات کی قائل نہیں تھیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شب معراج اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے 'لیکن وہ آخرت میں رویت باری کا انکار نہیں کرتی تھیں۔ حضرت ابن عباس (رض) شب معراج میں اللہ تعالیٰ کے دیدار کے قائل تھے اور جمہور علماء اسلام ان کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ حضرت عائشہ (رض) نے سورۃ الانعام کی جس زیر بحث آیت سے استدلال کیا ہے 'اس کا جواب ہم دے چکے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ آنکھیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں نہ یہ کہ آنکھیں اس کا مطلّقا ادراک نہیں کر سکتی۔

اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے کے متعلق قرآن مجید کی آیات

(آیت) "وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرۃ"۔ (القیامہ: ۲۳۔ ۲۲)
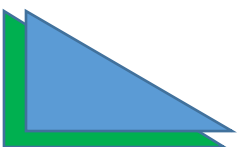
ترجمہ: کتنے ہی چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے اپنے رب کو دیکھتے ہوئے۔
اس آیت میں آخرت میں اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے کی تصریح ہے؛
(آیت) "کلا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون"۔ (التطفیف: ۱۵)
ترجمہ: بیشک وہ اس دن اپنے رب کے دیدار سے ضرور محروم ہوں گے۔
اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ قیامت کے دن کفار اپنے رب کے دیدار سے محروم ہوں گے اور یہ چیز ان کے لیے اسی وقت باعث حرمان و یاس ہو گی جب مسلمان اس دن اپنے رب کا دیدار کر رہے ہوں' کیونکہ اگر ان کو بھی اللہ تعالیٰ کا دیدار حاصل نہ ہو اور نہ کافروں کو' تو پھر یہ چیز ان کے لیے باعث افسوس نہیں ہو گی۔
(آیت) "لا تدرکہ الابصار"۔ (الانعام: ۱۰۳)
ترجمہ: آنکھیں اس کو دیکھ سکتیں۔
یہ آیت اللہ تعالیٰ کی مدح میں ہے' اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کی مدح میں اسی وقت ہو سکتی ہے جب اللہ تعالیٰ کا دکھائی دینا ممکن ہو' کیونکہ اسی چیز کی نفی وجہ کمال ہوتی ہے جس کا ثبوت ممکن ہو۔ مثلا ہوا' خوشبو اور آواز کا دکھائی دینا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ان کی مدح اور تعریف اسی وقت ہو گی جب اللہ تعالیٰ کو دیکھنا ممکن ہو۔ سو یہ آیت بھی اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے کی دلیل ہے:
(آیت) "قال رب ارنی انظر الیك"۔ (الاعراف: ۱۴۳)
ترجمہ: موسیٰ نے عرض کیا' اے میرے رب! مجھے اپنی ذات دکھا میں تجھے دیکھوں۔
اگر دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دکھائی دینا ممکن نہ ہوتا تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ سے یہ سوال نہ کرتے۔
(آیت) "ولکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون"۔ (حم السجدہ: ۳۱)
ترجمہ: اور تمہارے لیے اس جنت میں ہر وہ چیز ہے جس کو تمہارے دل چاہے اور تمہارے لیے اس میں ہر وہ چیز ہے جس کو تم طلب کرو گے۔
نیک اور صاف دل لوگ جنت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار طلب کریں گے اور اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ جنت میں ان کی ہر خواہش پوری فرمائے گا' سو یہ آیت جنت میں اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے کی دلیل ہے۔

آخرت میں اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے کے متعلق احادیث

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ ھ روایت کرتے ہیں:
حضرت جریر (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے' اچانک آپ نے چودھویں رات کے چاند کی طرف دیکھا۔ آپ نے فرمایا تم عنقریب اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح اس چاند کو دیکھ رہے ہو۔ تمہیں اس کو دیکھنے سے

کوئی تکلیف نہیں ہوگی ' پس اگر تم یہ کر سکتے ہو کہ طلوع آفتاب سے پہلے نماز پڑھنے سے مغلوب نہ ہو اور غروب آفتاب سے پہلے نماز پڑھنے سے مغلوب نہ ہو تو اس طرح کرو۔

(صحیح البخاری 'ج ا 'رقم الحدیث : ۵۵۴ 'ج ۸ 'رقم الحدیث : ۷۴۳۶ '۷۴۳۵ 'صحیح مسلم 'المساجد '۲۱۱ '(۶۳۳) ۱۴۰۷) سنن ابوداؤد 'ج ۴ 'رقم الحدیث : ۴۷۲۹ 'سنن الترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث : ۲۵۶۰ 'سنن کبری للنسائی 'ج ا 'رقم الحدیث : ۴۶۰ 'سنن ابن ماجہ 'ج ا 'رقم الحدیث : ۱۷۷ 'مسند احمد 'ج ۷ 'رقم الحدیث : ۱۹۲۱۱ 'طبع جدید 'مسند احمد 'ج ۲ 'ص ۳۶۸ 'طبع قدیم)

امام ابوعیسی محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت صہیب (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا :

(آیت) "للذین احسنوا الحسنی وزیادۃ"۔ (یونس : ۲۶)

ترجمہ : جن لوگوں نے نیک کام کیے ان کے لیے اچھی جزاء ہے اور اس سے بھی زیادہ۔

آپ نے فرمایا جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے تو ایک منادی ندا کرے گے 'کہ اللہ کے پاس تمہارا ایک وعدہ ہے 'وہ کہیں گے : کیا اللہ تعالیٰ نے ہمارے چہرے سفید نہیں کیے اور ہم کو دوزخ سے نجات نہیں دی اور ہم کو جنت میں داخل نہیں کیا؟ وہ کہیں گے 'کیوں نہیں ! آپ نے فرمایا پھر حجاب کھول دیا جائے گا۔ آپ نے فرمایا جنتیوں کے نزدیک اس سے زیادہ محبوب کوئی چیز نہیں ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف دیکھیں۔

(سنن ترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث : ۵۶۱ 'صحیح مسلم 'ایمان '۲۹۷ '(۱۸۱) ۴۴۲ 'السنن الکبری 'للنسائی 'ج ۶ 'رقم الحدیث : ۱۱۲۳۴ 'سنن ابن ماجہ 'ج ا 'رقم الحدیث : ۱۸۷ 'مسند احمد 'ج ۴ 'ص ۳۳۲۔ ۳۳۳ 'طبع قدیم)

حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اہل جنت کا ادنی درجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنی جنتوں 'اپنی بیویوں اور اپنی نعمتوں اور اپنے خادموں اور اپنی باندیوں کی طرف ایک ہزار سال کی مسافت سے دیکھے گا اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مکرم وہ ہوگا جو صبح اور شام اس کے چہرے کی زیارت کرے گا۔ پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ آیت تلاوت کی :

(آیت) "وجوہ یومئذ ناضرۃ، الی ربہا ناظرۃ"۔ (القیامہ : ۲۳۔ ۲۲)

ترجمہ : کتنے ہی چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے اپنے رب کو دیکھتے ہوئے۔

امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن 'صحیح 'غریب ہے۔ (سنن الترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث : ۲۵۶۳)

حضرت ابوبکر بن عبداللہ بن قیس اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دو جنتیں چاندی کی ہیں۔ ان کے برتن اور جو کچھ ان میں ہے چاندی کا ہے 'اور دو جنتیں سونے کی ہیں۔ ان کے برتن اور جو کچھ ان میں ہے 'سونے کا ہے 'اور ان لوگوں اور ان کے رب کے دیدار میں صرف اللہ کی کبریائی کی چادر ہے جو جنت عدن میں اس کے چہرے پر ہے۔

(صحیح مسلم 'ایمان '۲۹۶ '(۱۸۰) ۴۴۱ 'صحیح البخاری 'ج ۵ 'رقم الحدیث : ۴۸۷۸ 'سنن الترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث : ۲۵۳۶ 'السنن الکبری للنسائی 'ج ۴ 'رقم الحدیث : ۷۷۶۵ 'سنن ابن ماجہ 'ج ا 'رقم الحدیث : ۱۸۶ 'صحیح ابن حبان 'ج ۱۰ 'رقم الحدیث : ۴۶۱۱ 'مسند احمد 'ج ۳ "رقم الحدیث : ۸۴۲۷ 'طبع جدید 'مسند احمد 'ج ۲ 'ص ۳۳۹ '۳۳۵ 'طبع قدیم 'المستدرک 'ج ا 'ص ۸۰)

شب معراج اللہ تعالیٰ کے دیدار کے متعلق علماء امت کے نظریات

علامہ ابوالعباس احمد بن عمر بن ابراہیم مالکی قرطبیؒ متوفی ٦٥٦ھ ، صحیح مسلم کی شرح میں لکھتے ہیں :

متقدمین اور متاخرین کا اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے میں اختلاف رہا ہے۔ اکثر مبتدعین دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے کا انکار کرتے ہیں اور اہل السنہ اور اہل السلف دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے کے جواز اور وقوع کے قائل ہیں۔ پھر اس میں بھی متقدمین اور متاخرین کا اختلاف ہے کہ ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے یا نہیں ،

حضرت عائشہ (رض) ، حضرت ابوہریرہ (رض) ، مشہور روایت کے مطابق حضرت ابن مسعود (رض) ، سلف صالحین اور متکلمین اور محدثین کی ایک جماعت نے اس کا انکار کیا ہے ، اور سلف صالحین کی ایک عظیم جماعت نے یہ کہا ہے ، کہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی آنکھوں سے اپنے رب کو دیکھا ہے۔ حضرت ابن عباس (رض) کا یہی مسلک ہے۔ انھوں نے کہا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کلام کے ساتھ خاص کیے گئے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) خلت کے ساتھ اور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رویت کے ساتھ خاص کیے گئے ، حضرت ابوذر (رض) کعب ، حسن بصری اور امام احمد بن حنبل (رح) کا یہی نظریہ ہے اور حضرت ابوہریرہ (رض) اور حضرت ابن مسعود (رض) سے بھی ایک یہی روایت ہے۔ امام ابوالحسن اشعری اور ان کے اصحاب کی ایک جماعت سے بھی یہی منقول ہے ، مشائخ کی ایک جماعت نے توقف کا قول کیا ہے۔ انھوں نے کہا اس کی نفی اور اثبات پر کوئی قطعی دلیل نہیں ہے ، لیکن یہ عقلا جائز ہے اور یہی صحیح ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنا عقلا اور نقلا جائز ہے۔ عقلی دلائل علم کلام میں ہیں اور نقلی دلائل میں سے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا رویت کا سوال کرنا ہے ، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کو دیکھنا محال ہوتا تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اس کا سوال نہ کرتے۔ نیز احادیث متواترہ سے یہ ثابت ہے کہ مومنین آخرت میں اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے۔ (المفہم ، ج ا ص ٤٠٢۔ ٤٠١ ، مطبوعہ دار ابن کثیر ، بیروت ، ١٤١٧ھ)

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبیؒ متوفی ٦٦٨ھ لکھتے ہیں :

عبداللہ بن الحارث نے بیان کیا کہ حضرت ابن عباس (رض) اور حضرت ابی بن کعب (رض) کی ملاقات ہوئی۔ حضرت ابن عباس (رض) نے کہا ہم بنو ہاشم یہ کہتے ہیں کہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے رب کو دو مرتبہ دیکھا ہے۔ پھر حضرت ابن عباس (رض) نے کہا کیا تم اس پر تعجب کرتے ہو کہ خلت حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے ہو اور کلام حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے لیے ہو اور دیدار سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے ہو۔ پھر حضرت ابی بن کعب نے بہت بلند آواز سے کہا اللہ اکبر ! حتیٰ کہ پہاڑ گونج اٹھے۔ پھر حضرت ابن عباس (رض) نے کہا اللہ تعالیٰ نے رویت اور کلام کو سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام کے درمیان تقسیم کردیا ہے۔ اور امام عبدالرزاق نے روایت کیا ہے حسن بصری اللہ کی قسم کھا کر کہتے تھے کہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے رب کو دیکھا ہے اور ابوعمر الطلمنکی نے اس قول کو عکرمہ سے روایت کیا ہے اور بعض متکلمین نے اس قول کو حضرت ابن مسعود (رض) سے بھی روایت کیا ہے اور امام ابن اسحاق نے روایت کیا ہے کہ مروان نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے سوال کیا : کہ کیا سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے رب کو دیکھا ہے ؟ انھوں نے کہا ہاں ! اور نقاش نے امام احمد بن حنبل سے روایت کیا ہے انھوں نے کہا میں حضرت ابن عباس کی حدیث کے مطابق کہتا ہوں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی آنکھوں سے اپنے رب کو دیکھا ہے۔

وہ بار بار کہتے رہے کہ آپ نے اپنی آنکھوں سے اپنے رب کو دیکھا ہے حتی کہ امام احمد کا سانس منقطع ہو گیا۔ شیخ ابو الحسن اشعری اور ان کے اصحاب کا بھی یہی نظریہ ہے کہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ تعالیٰ کو اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ حضرت انس (رض)، حضرت ابن عباس (رض)، عکرمہ (رض)، ربیع (رض) اور حسن بصری کا بھی یہی نظریہ ہے۔ امام ابو العالیہ، قرظی اور ربیع بن انس کا یہ قول ہے کہ آپ نے اپنے رب کو اپنے دل سے دیکھا ہے۔ حضرت ابن عباس (رض) اور عکرمہ (رض) سے بھی قول منقول ہے۔ علامہ ابن عبدالبر نے امام احمد سے بھی اس قول کی حکایت کی ہے۔ امام مالک بن انس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ باقی ہے اور فانی آنکھوں سے باقی کو نہیں دیکھا جاسکتا، اور جب مسلمان آخرت میں پہنچیں گے تو ان کو باقی رہنے والی آنکھیں دی جائیں گی تو پھر باقی آنکھوں سے باقی ذات کو دیکھ لیں گے۔ قاضی عیاض نے کہا یہ عمدہ کلام ہے۔ اس دلیل کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنا محال ہے، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ دیکھنے والوں کی اس دنیا میں قدرت ضعیف ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے، اتنی قدرت عطا فرما دے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیدار کا بوجھ اٹھا سکے تو اس کے حق میں اللہ تعالیٰ کی رویت ممتنع نہیں ہے۔ الجامع لاحکام القرآن جز ۷ ص ۵۲، ۵۱ مطبوعہ دار الفکر، بیروت ۱۴۱۵ھ)

حضرت عائشہؓ کے انکار رؤیت کے جوابات

علامہ یحییٰ بن شرف نووی شافعی متوفی ٦٧٦ ھ لکھتے ہیں:

صاحب تحریر کا مختار یہ ہے کہ ہمارے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے۔ انھوں نے کہا اس مسئلہ میں دلائل ہیں، لیکن ہمارا استدلال اس قوی حدیث سے ہے کہ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا کیا تو اس پر تعجب کرتے ہو کہ خلت حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے ہو اور کلام حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے لیے ہو اور رویت سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے ہو عکرمہ نے حضرت ابن عباس (رض) سے سوال کیا، کیا سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ تو انھوں نے کہا ہاں! ایک معتمد سند کے ساتھ حضرت انس (رض) سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے رب کو دیکھا ہے اور اس مسئلہ میں دلیل حبر الامت حضرت ابن عباس (رض) کی حدیث ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین مشکل مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ حضرت عمر (رض) نے بھی اس مسئلہ میں ان سے رجوع کیا ہے اور ان سے یہ سوال کیا کہ کیا سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے رب کو دیکھا ہے، انھوں نے کہا ہاں دیکھا ہے، اور اس مسئلہ میں حضرت عائشہ (رض) کی مخالفت سے کوئی اثر نہیں پڑے گا، کیونکہ حضرت عائشہ (رض) نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ روایت نہیں کیا کہ آپ نے فرمایا ہے میں نے اپنے رب کو نہیں دیکھا، بلکہ انھوں نے خود قرآن مجید کی دو آیتوں سے اس مسئلہ کا استنباط کیا ہے، اور جب صحابی کا قول کسی دوسرے صحابی کے قول کے خلاف ہو تو اس کا قول حجت نہیں ہوتا اور جب حضرت ابن عباس (رض) سے صحیح سند کے ساتھ رویت ثابت ہے تو اس روایت کو قبول کرنا واجب ہے۔ کیونکہ یہ مسئلہ محض عقل سے نہیں جانا جاسکتا اور اس میں ظنی دلائل کافی ہیں، اور حضرت ابن عباس (رض) کی متعلق یہ گمان کرنا جائز نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے ظن اور اجتہاد سے یہ کہا ہے کہ آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے اور معمر بن راشد نے کہا ہے کہ ہمارے نزدیک حضرت عائشہ

(رض) علم میں حضرت ابن عباس (رض) سے زائد نہیں ہیں اور حضرت ابن عباس (رض) نے ایک چیز کو ثابت کیا ہے جس کی دوسروں نے نفی کی ہے۔ اور مثبت روایت نافی پر مقدم ہوتی ہے۔ (صاحب تحریر کا کلام ختم ہوا)

خلاصہ یہ ہے کہ اکثر علماء کے نزدیک راجح یہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شب معراج سر کی آنکھوں سے اپنے رب کو دیکھا ہے 'کیونکہ اس کو حضرت ابن عباس (رض) نے بیان کیا ہے اور یہ انھوں نے صرف رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سن کر ہی بیان کیا ہے۔ حضرت عائشہ (رض) کا استدلال صرف آیتوں سے ہے 'پس سورۃ الانعام کی آیت ۱۰۳ کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں ادراک بہ طور احاطہ کی نفی ہے 'اور سورۃ شوریٰ کی آیت ۵۱ سے جو انھوں نے استدلال کیا ہے 'اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی بلاحجاب رویت کی نفی نہیں ہے 'بلکہ بلاحجاب کلام کی نفی ہے اور رویت کلام کو مستلزم نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ آپ نے صرف اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا ہو اور دیدار کے وقت کلام نہ کیا ہو۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں عام قاعدہ بیان کیا ہے اور عام مخصوص البعض ہے اور دوسرے دلائل سے ہمارے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس عام قاعدہ سے مخصوص اور مستثنیٰ ہیں۔ (صحیح مسلم مع شرح النووی 'ج ۱ ص ۹۸۳۔ ۹۷۶ 'مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ 'ریاض '۱۴۱۷ ھ) (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝۱۰۴

لغۃ القرآن: قَدْ : یقیناً] [جَآءَكُمْ : آچکی ہے تمہارے پاس] [بَصَآئِرُ :" روشن " دلیلیں] [مِنْ رَّبِّكُمْ : تمہارے رب کی طرف سے] [فَمَنْ : پھر جس نے] [اَبْصَرَ : دیکھ لے] [فَلِنَفْسِهٖ : تو اس نے اپنے نفس کے لیے کیا] [وَمَنْ : اور جو] [عَمِيَ : اندھا بنا رہا] [فَعَلَيْهَا : تو اس پر وبال ہوگا اس کا] [وَمَآ : اور جو] [اَنَا : میں] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [بِحَفِيْظٍ : نگہبان]

ترجمہ : بیشک تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے (ہدایت کی) نشانیاں آچکی ہیں پس جس نے (انہیں نگاہ بصیرت سے) دیکھ لیا تو (یہ) اس کی اپنی ذات کے لیے (فائدہ مند) ہے، اور جو اندھا رہا تو اس کا وبال (بھی) اسی پر ہے، اور میں تم پر نگہبان نہیں ہوں

تشریح:

بصائر بصیرت کی جمع ہے۔ جس طرح جسم کے لیے بصر (بینائی) ہے اسی طرح نفس وروح کے لیے بصیرت ہے۔ **وھی للنفس کالبصر للبدن** (بیضاوی)

اور یہاں اس سے مراد روشن دلیلیں ہیں یعنی بالبصیرۃ الحجۃ البینۃ الظاھرۃ (القرطبی) اس آیت کا مقصد یہ ہوا کہ تمہاری ہدایت اور رہنمائی کے لیے روشن دلیلیں آ گئی ہیں۔ اگر تم ان کی روشنی میں چلوگے تو اس میں تمہارا ذاتی فائدہ ہے۔ کیونکہ اس طرح دین اور دنیا کی عزتوں سے سرفراز کئے جاؤگے۔ اور اگر آنکھیں بند رکھوگے تو خود ہی ہلاکت کے گڑھے میں گروگے کسی کا کیا بگڑے گا۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

اے حبیب! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، آپ لوگوں سے فرمادیں کہ تمہارے پاس تمہارے رب عَزَّوَجَلَّ کی طرف سے توحید، نبوت، مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے اور حساب وجزاء سے متعلق دل کی آنکھیں کھول دینے والی دلیلیں آ گئیں تو جس نے دل کی آنکھ سے حق کو دیکھا اور اس پر ایمان لے آیا تو اس میں اس کا اپنا فائدہ ہے اور جو حق ظاہر ہونے کے باوجود اسے دیکھنے سے اندھا رہا اور اس پر ایمان نہ لایا تو اس میں نقصان بھی اس کا اپنا ہے اور میں تم پر نگہبان نہیں کہ تمہارے اعمال اور افعال کی نگہبانی کرتا پھروں بلکہ میں تمہاری طرف تمہارے رب عَزَّوَجَلَّ کا رسول ہوں تاکہ اس کا پیغام تم تک پہنچادوں جبکہ اللہ تعالیٰ تم پر نگہبان ہے، اس سے تمہارے اعمال اور احوال میں سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے اور وہی تمہیں تمہارے اعمال کی جزاء دے گا۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

یہ جو کچھ اللہ کی طرف سے آ رہا ہے بصیرت کی روشنی ہے۔ بصیرت انسان کو ہدایت دیتی ہے اور راہنمائی کرتی ہے۔ یہ بذات خود عین روشنی ہے۔ اس لیے جو شخص اسے دیکھے گا وہ روشن دیکھے گا اور اگر کوئی آنکھیں بند کرے گا تو وہ اندھا ہوگا۔ ان بصیرتوں اور روشنیوں کے آ جانے کے بعد صرف اندھا ہی محروم رہ سکتا ہے۔ وہ جس کے حواس کام نہ کر رہے ہوں اور جس کے شعور کا دراوزہ بند ہو جس کا ضمیر اندھا ہو۔

اس کے بعد نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اپنی برات کا اعلان یوں کر دیں کہ میں تم پر نگہبان اور پاسبان مقرر نہیں کیا گیا ہوں۔ (آیت) "ما انا علیم بحفیظ"۔ (٦ : ١٠٤) "میں تمہارے لیے پاسبان مقرر نہی ہوا ہوں"۔ یہاں عبارت میں ایک عجیب تناسق ہے۔ اللہ کی صفت بیان کرتے ہوئے کہا گیا تھا۔

(آیت) "لَّا تُدۡرِكُهُ ٱلۡأَبۡصَٰرُ وَهُوَ يُدۡرِكُ ٱلۡأَبۡصَٰرَۖ وَهُوَ ٱللَّطِيفُ ٱلۡخَبِيرُ (103)

" نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے وہ نہایت باریک بین اور باخبر ہے۔'

(آیت) "قَدۡ جَآءَكُم بَصَآئِرُ مِن رَّبِّكُمۡۖ فَمَنۡ أَبۡصَرَ فَلِنَفۡسِهِۦۖ وَمَنۡ عَمِيَ فَعَلَيۡهَاۚ"۔ (٦ : ١٠٤)

" دیکھو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آ گئی ہیں 'اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اٹھائے گا۔"

ایک جگہ ابصار اور مقابل میں بصائر ہے۔ ایک جگہ بصیر ہے اور مقابلے میں عمی ہے 'یہ عربی اسلوب میں الفاظ کا بہترین انتخاب ہے۔

اس کے بعد روئے سخن حضرت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف مڑ جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ قرآن کریم کے اندر جو اسلوب کلام اختیار کیا گیا ہے وہ ایسا نہیں ہے جو کسی امی شخص کی طرف سے بنایا جاسکتا ہو اور جس سے مالکان بصیرت خود بخود یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یہ

یقینا کلام الٰہی ہے۔ لیکن مشرکین انکار اس لیے نہ کرتے تھے کہ ان کے سامنے تشفی بخش دلائل نہ تھے۔ بلکہ وہ بہانہ سازی کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہتے تھے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ عظیم علمی کام اور فصیح وبلیغ کلام بعض اہل کتاب سے سیکھ کر بتارہے ہیں حالانکہ وہ جانتے تھے کہ اس وقت جو اہل کتاب تھے ان کے پاس نہ یہ پیغام تھا اور نہ یہ اعلیٰ کلام۔ چنانچہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہدایت کردی جاتی ہے کہ آپ مشرکین سے اعراض کریں اور اللہ کی ہدایات پر عمل کرتے چلے جائیں۔ (فی ظلال القرآن)

کیا چیز رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذمہ ہے اور کیا چیز آپ کے ذمہ نہیں ہے

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے توحید کا بیان کیا تھا اور اس آیت میں رسالت کا بیان فرمایا ہے کہ کیا چیز رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذمہ ہے اور کیا چیز رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذمہ نہیں ہے۔ دین حق کی دعوت دینا دلائل اور معجزات سے رسالت کو ثابت کرنا اور شبہات کو زائل کرنا اور احکام شرعیہ کو بیان کرنا ' یہ رسولوں کے ذمہ ہے ' اور کسی شخص کا ایمان لانا اور کفر کو ترک کردینا ' یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذمہ نہیں۔ یہ انسان کے اپنے ذمہ ہے ' وہ ایمان اور کفر میں سے جس کو بھی اختیار کرتا ہے ' اللہ تعالیٰ اس کو اس کے لیے پیدا کردیتا ہے۔ سو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تبلیغ سے ایمان لانے میں بندوں کا اپنا نفع ہے اور کفر پر برقرار رہنے میں ان کا اپنا نقصان ہے۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دین حق کے دلائل بیان کردیئے ہیں۔ اب لوگوں کو چاہیے کہ وہ ان سے فائدہ اٹھائیں اور دین حق کو قبول کرلیں ' یہ ان کے اختیار میں ہے۔ ان کو جبرا مسلمان نہیں بنایا جائے گا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نفع کے لیے دین حق پر بصیرت افروز دلائل بیان دیئے ہیں ' ان سے ہمیں فائدہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے اور اگر کوئی شخص ان دلائل میں غور وفکر نہیں کرے گا اسے ہوگا ' اللہ کا اس میں کوئی نقصان نہیں ہے اور یہ کہ دین حق کو قبول کرنا یا نہ کرنا انسان کے اپنے اختیار میں ہے اور اس میں جبریہ کے مذہب کا رد ہے۔

بعض مفسرین نے کہا کہ اس آیت میں ایمان لانے یا نہ لانے کا جو اختیار دیا ہے وہ قتال اور جہاد کی آیتوں سے منسوخ ہوگیا۔ یہ قول صحیح نہیں ہے ' جہاں تک ممکن ہو آیات کو عدم نسخ پر محمول کرنا چاہیے اور جہاد اور قتال کے بعد بھی ایمان کا لانا یا نہ لانا انسان کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۱۰۵

لغۃ القرآن : وَكَذٰلِكَ : اور اسی طرح] [نُصَرِّفُ : ہم پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں] [الْاٰيٰتِ : واضع دلائل] [وَلِيَقُوْلُوْا : اور تاکہ وہ سب کہیں] [دَرَسْتَ : تم نے سیکھ لیا ہے] [وَلِنُبَيِّنَهٗ : اور تاکہ ہم خوب واضح کردیں اسے] [لِقَوْمٍ :" اس " قوم کے لیے] [يَعْلَمُوْنَ : وہ سب علم رکھتے] [

ترجمہ : اور ہم اسی طرح (اپنی) آیتوں کو بار بار (انداز بدل کر) بیان کرتے ہیں اور یہ اس لیے کہ وہ (کافر) بول اٹھیں کہ آپ نے (تو کہیں سے) پڑھ لیا ہے تاکہ ہم اس کو جاننے والے لوگوں کے لیے خوب واضح کر دیں

تشریح :

درس دراستہ سے مشتق ہے۔اس کا معنی ہے کسی کو پڑھ کر سنانا (القراۃعلی الغیر) مقصد یہ ہے کہ اگر ہم اپنی توحید کی دلیلوں کو صرف ایک ہی بار بیان کرتے تو کوئی سنتا کوئی نہ سنتا، کوئی سمجھتا اور کوئی نہ سمجھتا۔اور ایک ہی آیت کا بار بار تکرار ہوتا تو شاید کوئی اکتا جاتا۔اس لیے ہم ان دلائل کو مختلف رنگوں اور متعدد اسلوبوں سے بیان کرتے ہیں تاکہ آپ کے مخاطب یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ واقعی آپ نے پوری طرح دلیلیں ہمیں پڑھ کر سنائی ہیں اور سمجھانے کا حق ادا کر دیا ہے۔آیت کے اور مطالب بھی بیان کئے گئے ہیں للیکن یہ قول سب سے عمدہ ہے۔قال النحاس قول حسن (قرطبیؒ، تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

پہلے خطاب کا تتمّہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے منکرین رسالت کا ایک بہانہ بیان کیا ہے اس کی تمہید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایک آیت کرکے قرآن نازل کرتا اور ایک مضمون کو مختلف اسالیب سے بیان فرماتا ہے تاکہ اہل علم پر اللہ تعالیٰ کی مراد منکشف ہو جائے اور ان کے ذہنوں میں صحیح مفہوم متنقر

ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کے فرمان کا منشا ہے۔ لیکن کفار کو اس سے یہ شبہ ہوا کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہود و نصاریٰ کے علماء سے مذاکرہ اور مباحثہ کرتے ہیں۔ جو اس بحث و تمحیص سے حاصل ہوتا ہے۔ اسے مختلف فقروں اور جملوں میں ڈھال کر ہمارے سامنے پڑھتے ہوئے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ آپ پر وحی نازل ہوئی ہے۔ حالانکہ یہ سب کچھ لوگوں سے پڑھا اور حاصل کیا ہوا ہوتا ہے ورنہ یہ اللہ کا نازل کیا ہوا کلام ہوتا تو اس کا ایک ہی انداز ہوتا اور یک بارگی پوری کتاب نازل ہو جاتی۔ ان کے اس شبہ کا قرآن مجید نے متعدد بار جواب دیا ہے کہ اگر تمہارے زعم میں یہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے کسی انسان کا بنایا اور سکھایا ہوا ہے۔ تو تم اس جیسی کوئی چھوٹی سورۃ بنا کر لے آؤ۔ اس کے جواب میں وہ لوگ نہ ایسا کر سکے اور نہ قیامت تک کوئی شخص یا ادارہ کر سکتا ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی وحی کردہ کتاب ہے۔

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

مزید تفصیل کے لئے ہماری مرتبہ کتاب نور قرآن کا مطالعہ کریں۔

اللہ تعالیٰ اپنی دلیلیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے

یعنی جس طرح ہم نے گزشتہ کئی آیات میں اپنی نشانیاں جو کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں اور جس کا تعلق انسانی زندگی سے ہے۔ جن میں سے بعض کے رشتے خود انسانی ضمیر کے اندر پیوست ہیں اور بعض ایسی نشانیاں جن سے عقل راہنمائی حاصل کرتی اور دل کو جلا ملتی ہے۔ مختلف پہلوؤں سے پوری طرح کھول کر بیان کی ہیں۔ اسی طرح پورے قرآن کریم میں بار بار ان نشانیوں کو مختلف اسالیب سے بیان کیا گیا مقصود اس سے صرف یہ ہے کہ انسانوں کو اس بات کی شکایت نہ رہے کہ ایمان کو قبول کرنے کے لیے ہمیں وہ آسانیاں فراہم نہ کی گئیں جس سے ہمارے دل و دماغ ہموار ہوتے اور ہماری دماغی اور قلبی الجھنیں دور ہوتیں اور ہم آسانی سے ایمان قبول کر لیتے یعنی اتمام حجت اور انسان کی راہنمائی کے لیے جیسے جیسے دلائل ضروری تھے ہم نے یہاں بھی اور پورے قرآن کریم میں بھی جا بجا ان کی چمن آرائی کی ہے ' جو آدمی بھی اس گلستان میں داخل ہوتا ہے اسے یہ شکایت نہیں رہتی کہ میرے مشام جاں کو معطر کرنے کا ساماں نہیں کیا گیا یا یہاں رنگا رنگ پھولوں کی کمی ہے میں نظر افروزی کے اسباب کہاں سے لاؤں۔ چنانچہ دلائل اور نشانیاں اس فراوانی اور زور دار طریقے سے بیان کی گئی ہیں کہ جو لوگ ایمان قبول نہیں بھی کرتے وہ بھی بالعموم پکار اٹھتے ہیں یا دلوں میں اس بات کے قائل ہو جاتے ہیں چاہے اپنے دوسرے مفادات کی وجہ سے ایمان قبول کرنے کا اعلان نہ کریں کہ واقعی پیغمبر نے اللہ کی کتاب کو سنانے اور دعوت دین پیش کرنے میں کوئی کمی نہیں کی اور اس نے پوری طرح ایک ایک بات ہمیں پڑھ کر سنا دی ہے۔ اس لیے اس آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اس طرح مختلف طریقوں سے آیات بیان کی ہیں کہ بالآخر یہ لوگ کہہ اٹھیں دَرَسْتَ کہ واقعی اے پیغمبر تو نے اللہ کی کتاب پڑھ کر ہمیں سنا دی۔ چاہے وہ اس بات کا اعتراف اپنی زبان قال سے کریں اور چاہے زبان حال سے۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

یہ محض قرآن کا دعویٰ نہیں بلکہ امر واقع ہے۔ پہلی امتوں میں بھی لوگ اس اعتراف پر مجبور ہوتے رہے۔ خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے میں جن لوگوں سے آپ کو واسطہ پڑا اور آپ نے جس طرح ان کو اللہ کا دین پہنچایا اور جس طرح کتاب اللہ کی آیتیں بار بار ان کو پڑھ کر سنائیں اور اس کی تعلیمات جس طرح طریقے طریقے سے ان کے گوش گزار کرنے کی کوشش کی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ کا بدترین

دشمن ابو جہل بھی اپنی بے مثل دشمنی کے باوجود اس بات کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا حالانکہ اس کی بے مثل دشمنی کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ اس بات کا اعتراف کبھی نہ کرتا اور کبھی حضور کی صداقت کی بات زبان پر نہ لاتا کیونکہ اس کی دشمنی تاریخ میں ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ ہر پیغمبر کو اپنے مرتبہ اور مقام کے مطابق دشمنوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو بدترین دشمن فرعون سے واسطہ پڑا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی دشمنی میں ثابت قدم نہ رہ سکا۔ جب موت سامنے نظر آئی اور بحر قلزم میں ڈوبنے لگا تو اس کی زبان پر کلمہ جاری ہو گیا لیکن قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ اس کے ایمان کو قبول نہیں کیا گیا بلکہ فرمایا گیا کہ تم اب ایمان لاتے ہو جب کہ اس سے پہلے تم نافرمان رہے ہو اور تم بدترین مفسدین میں سے تھے۔ لیکن ابو جہل جب جنگ بدر میں زخمی ہو کر سکرات الموت میں مبتلا تھا۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود اس کے سر پر پہنچے اسے ملامت کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اب تم نے دیکھ لیا اپنا انجام تو وہ نہایت بے فکری سے کہنے لگا کہ کیوں شیخی بگھارتے ہو ایک آدمی کو اس کی قوم نے مار ڈالا تو اس میں شیخی بگھارنے اور بڑھ ہانکنے والی کیا بات ہے اور جب حضرت عبداللہ ابن مسعود اس کے سینے پر بیٹھ کر اس کی گردن کاٹنے لگے تو کہنے لگا کہ نیچے سے گردن کاٹنا تاکہ لمبی گردن دیکھ کر لوگوں کو اندازہ ہو کہ یہ کسی سردار کی گردن ہے۔ ایسا بدترین دشمن جو مرتے دم تک اپنا رویہ نہ بدلے شاید ہی تاریخ میں کسی نے دیکھا ہو۔ اس لیے آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسے اس امت کا بدترین فرعون قرار دیا۔ لیکن اس کے اعتراف کا حال یہ تھا کہ اپنے ایک ساتھی کے سوال کے جواب میں اس نے ایک دفعہ کہا کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جھوٹا نہیں کہتا وہ ہمارے سامنے پلا بڑھا اور جوان ہوا اور اب اس کے سر میں سفید بال آگئے ہیں لیکن اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اس لیے میں یہ نہیں کہتا کہ وہ نبوت کے بارے میں جھوٹ بولتا ہے میں جو اس پر ایمان نہیں لاتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قبیلہ بنو ہاشم کا آدمی ہے اس کی عزت اور اس کی کامیابی بنو ہاشم کی عزت اور کامیابی ہے ہم قبیلوں میں ہمیشہ چشمک جاری رہتی ہے اور ہر قبیلہ دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہم مسلسل بنو ہاشم سے مقابلہ کرتے رہے اب جبکہ ہم ان کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو گئے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم میں ایک نبی بھی ہے اب اگر ہم اسے بطور نبی قبول کر لیں تو یہ ایک ایسی عزت اور تفوق کی بات ہے جس میں ہم ان کی کبھی ہمسری نہیں کر سکتے۔ اس لحاظ سے بنو ہاشم ہمیشہ کے لیے ہم سے آگے بڑھ جائیں گی۔ اس وجہ سے میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ آپ اندازہ فرمائیے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تبلیغ و دعوت کا یہ اثر ہے کہ بدترین دشمن بھی آپ کی صداقت کا انکار کرنے سے عاجز ہے۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

ان آیات پر جب ہم غور کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنخضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت ایک سخت کشمکش کے دور سے گزر رہی ہے۔ قرآن کریم بارش کی طرح نازل ہو رہا ہے۔ دلائل کی روشنی سورج کی کرنوں کی طرح پھیل رہی ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ اس کی قبولیت کے لیے دل کھلیں ' مخالفت زور پکڑتی جا رہی ہے اور مخالفین مخالفت میں ہر طرح کا حربہ آزمانے پر تل گئے ہیں۔ وہ آنخضرت کو ناکام کرنے کے لیے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اذیتیں بھی پہنچا رہے ہیں اور نئے سے نئے مطالبوں کے ساتھ الجھانے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ فطری بات ہے کہ آنخضرت اور مسلمان اس صورت حال سے متاثر ہو کر پریشان بھی ہوتے ہیں اور بار بار اللہ سے ان کو ایمان دینے کی دعائیں بھی کرتے ہیں۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

آیت مبارکہ :

اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۚ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ○١٠٦

لغۃ القرآن : اِتَّبِعْ : آپ پیروی کریں] [مَآ : نہیں] [أُوْحِيَ : وحی کی گئی ہے] [اِلَيْكَ : آپ کی طرف] [مِنْ رَّبِّكَ : آپکے رب " کی طرف " سے] [لَآ : نہیں] [اِلٰهَ : معبود] [اِلَّا : مگر] [هُوَ : وہ] [وَاَعْرِضْ : اور منہ پھیر لیجے] [عَنِ : کے بارے] [الْمُشْرِكِيْنَ : سب مشرک]

ترجمہ : آپ اس (قرآن) کی پیروی کیجئے جو آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے وحی کیا گیا ہے، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور آپ مشرکوں سے کنارہ کشی کر لیجئے

تشریح :

سلطانِ دو جہاں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے فرمایا گیا کہ "تم اس وحی کی پیروی کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب عَزَّوَجَلَّ کی طرف سے بھیجی گئی ہے اور کفار کی بے ہودہ گوئیوں کی طرف التفات نہ کرو۔ اس میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تسکین خاطر ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کفّار کی یاوہ گوئیوں سے رنجیدہ نہ ہوں۔ یہ ان کی بد نصیبی ہے کہ وہ ایسی واضح دلیلوں سے فائدہ نہ اٹھائیں۔

(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

یعنی آپ کفار کی گمراہی پر ملول اور غم گین نہ ہو۔ آپ ﷺ نے فہمائش کا حق ادا کر دیا۔ آپ زیادہ توجہ احکام الٰہی کی بجاآوری کی طرف دیا کریں۔

ای لا تشغل قلبك وخاطرك بهم بل اشتغل بعبادة الله (قرطبی)

کفار کی دل آزار باتوں پر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دینا

اس سے پہلی آیت میں یہ بتلایا تھا کہ کفار آپ پر یہ بہتان باندھتے ہیں کہ آپ نے کچھ علماء سے کچھ مضامین سیکھ لیے ہیں اور ان کو آپ الفاظ میں ڈھال کر پیش کر دیتے ہیں اور پھر اس کو اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ آپ اپنے رب کی نازل کی ہوئی وحی کی پیروی کیجئے تاکہ ان کی طعن آمیز باتوں سے آپ کی دعوت اور تبلیغ متاثر نہ ہو۔ اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ ان کے اس شک وشبہ اور طعن و تشنیع سے جو آپ کو حزن وملال ہوا ہے 'وہ زائل ہو جائے اور آپ کے دل کو تقویت حاصل ہو۔ پھر فرمایا اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ اس قول میں اس پر متنبہ کیا کہ آپ صرف اس کی اطاعت کیجئے اور جاہلوں کی جہالت کی وجہ سے اپنے مشن کو متاثر نہ ہونے دیں اور فرمایا مشرکین سے اعراض کیجئے۔ علامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے یہ آیت 'آیت قتال سے منسوخ ہے۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے 'اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ ان سے مقابلہ نہ کریں 'بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ ان کی دل آزار باتوں سے اعراض کریں اور ان پر غم اور افسوس نہ کریں 'تاکہ آپ کی دعوت اور تبلیغ کا مشن متاثر نہ ہو۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

اللہ کا رسول ﷺ اسی کی پیروی کرتا ہے جو اس پر نازل ہوتا ہے

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے فرمایا جارہا ہے کہ مشرکین مکہ کا رویہ کچھ بھی ہو مخالفت کی صورت میں اور مطالبات کی شکل میں وہ چاہے کتنا بھی آپ کو الجھانے کی کوشش کریں 'ہراساں کرکے آپ کا راستہ بند کرنے کی کوشش کریں یا ایمان کے وعدوں سے مطالبات کے پورا ہونے کی شکل میں آپ کو امیدیں دلائیں 'آپ کسی بات پر بھی توجہ نہ دیجئے بلکہ آپ اس چیز کی پیروی کیجئے جو آپ کے رب کی طرف سے آپ پر وحی کی جارہی ہے جو عقائد آپ پر نازل کیے جارہے ہیں اور پھر جس طرح دلائل سے مرصع کرکے انھیں آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے آپ انھیں اپنی قوم کے سامنے پیش کریں۔ اخلاقیات کی جو تعلیم دی جارہی ہے آپ اپنے آپ کو اور اپنے اوپر ایمان لانے والوں کو اس سے مزین کریں۔ دعوت دین کو مقصود بنا کر اپنے سفر کو جاری رکھیں۔ پیش نظر صرف یہ بات رہنی چاہیے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں یہ جملہ اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے۔ مشکلات کو دیکھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ آپ سے یہ کہا جارہا ہے کہ بیشک آپ کی مخالفت روز بروز آپ کے کام کو سخت کر رہی ہے اور امیدیں روز بروز ٹوٹتی جارہی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اسلامی تحریک کسی بند گلی میں داخل ہو رہی ہے لیکن آپ کو اس بات کا یقین رکھنا چاہیے کہ ہر کام کا سررشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہے دلوں کا پھیرنے والا بھی وہی ہے تمام قدرتوں اور قوتوں کا مالک بھی وہی ہے اس لیے آپ حالات سے متاثر ہوئے بغیر اپنا کام کرتے رہئے اور انجام کو اللہ کے سپرد کیجئے۔ وہ آپ کو ہر طرح کے خطرے سے محفوظ رکھے گا اور ان لوگوں کو اپنی حدود سے نکلنے نہیں دے گا۔

ہر حال میں حاکم حقیقی صرف اللہ ہی ہے

دوسری بات جو اس سے سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں آپ کی دعوت کا اصل موضوع اور اصل ہدف جو ہمیشہ آپ کے سامنے رہنا چاہیے اور تمام تبلیغی مساعی جس کے گرد جاری رہنی چاہئیں وہ یہ عقیدہ ہے کہ اللہ ہی حاکم حقیقی ہے اس کائنات کا حقیقی مالک وہی ہے۔ ہم اس کے بندے ہیں اس لیے اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہیں کر سکتے۔ وہ ہمارا آقا ہے ' آقائی اسی کو زیب دیتی ہے اور پھر یہ بندگی اور آقائی جزوقتی اور محدود نہیں بلکہ آدمی پیدا ہونے سے لے کر مرتے دم تک اللہ کا بندہ ہے اور اس کی زندگی کے تمام شعبے اللہ کی بندگی کے حامل ہیں۔ زندگی کا کوئی فیصلہ اور کوئی رویہ اللہ کی حاکمیت اور اس کی کبریائی سے باہر نہیں جس طرح ایک مسلمان اللہ کے گھر میں اس کی بندگی بجا لاتا ہے اسی طرح وہ اپنے گھر میں ' بازاروں اور منڈیوں میں کاروبار کرتا ہوا ' عدالتی کرسی پر جج ہو کر بھی 'حکومت کے ایوان میں حاکم وقت کی حیثیت سے داخل ہونے کے بعد بھی ' وہ اللہ ہی کا بندہ ہے۔ اللہ ہی کا قانون مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر غالب ہوتا ہے۔ اسی قانون سے وہ اصول معاشرت 'اصولِ معیشت 'اصول تہذیب 'اصول تعلیم 'اصول سیاست اور اصول حکومت لیتا ہے غرضیکہ اس کی زندگی کا کوئی حصہ بھی اللہ کی حاکمیت سے آزاد نہیں ہوتا۔ وہ اول و آخر اللہ کا بندہ ہے اور ہر حال میں اللہ اس کا آقا اور اس کا معبود ہے۔ یہ وہ بنیادی نقطہ ہے جس کے گرد پوری اسلامی تعلیمات گھومتی ہیں اور یہ وہ بنیاد ہے جس پر پوری اسلامی عمارت استوار ہوتی ہے۔ آج بھی دنیا کی اصلاح کا یہی مجرب نسخہ ہے۔ دنیا نے اپنی بھلائی کے لیے مختلف آئین اور قانون اور مختلف زندگی کے رویے اپنا رکھے ہیں۔ آمریت ہی آمر مطلق اور بادشاہت میں بادشاہ سرچشمہ قانون اور حاکمیت کی علامت ہے اور جمہوریت میں عوام کو سرچشمہ اقتدار کہا جاتا ہے اور اشتراکیت میں پارٹی اقتدار کا سرچشمہ ہوتی ہے اور یہی وہ بنائے فساد ہے جس نے پوری دنیا کو فساد سے بھر دیا ہے۔ اس لیے قرآن کریم اس بنیاد کو ڈھا کر ہمیں اسلامی تعلیم کی نئی بنیاد فراہم کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ کوئی حاکم حقیقی اور کوئی معبود مطلق نہیں۔ کوئی ایسا نہیں جس کی غیر مشروط اطاعت کی جائے اور تم اپنی بندگی اور اپنی اطاعت میں آزاد نہیں ہو۔ یہی وہ آستانہ ہے جس سے وابستگی تمہاری دنیا اور آخرت میں کامیابی کی ضمانت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی آج زبوں حالی کا کوئی سبب اگر ہے تو وہ اسی بنیاد سے کٹ جانا ہے۔ کافر اپنے کفر کے ساتھ قائم ہے کفر اپنے مَالَہٗ وَمَاعَلَیْہِ کے اعتبار سے کتنا بھی غلط ہو لیکن دنیا میں اس کے اور اس سے وابستگی کے بھی کچھ فوائد ہیں کیونکہ دنیا میں غلط سے غلط چیز بھی کوئی نہ کوئی فائدہ رکھتی ہے۔ مٹی بھی منفعت سے خالی نہیں 'زہر بھی بعض دفعہ تریاق ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح کفر بھی اگرچہ انسانیت کا دشمن اور اخلاقیات کے لیے مہلک ہے لیکن دنیوی اسباب کے ساتھ ساتھ اس کے بھی کچھ فوائد ہیں اور اسلام تو سراسر امن و فلاح کا دین اور دنیوی اور اخروی کامیابیوں کا پیغامبر ہے لیکن آج جو مسلمانوں نے رویہ اختیار کر رکھا ہے کہ وہ نام اسلام کا لیتے ہیں لیکن اسلام کے اجتماعی نظام سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔ ان کے اپنے ملکوں کے آئین سراسر اسلام سے بغاوت پر مبنی ہیں۔ ان کی زندگی کا مجموعی رویہ وہی ہے جو کافر قوموں کا ہے ان کی زندگیوں کے کامیابیوں کے پیمانے کافروں ہی سے حاصل کردہ ہیں۔ ان کی تہذیب انہی کی تہذیب ہے ان کی ایک اقلیت مسجدوں میں جا کر سجدہ ریز ہوتی ہے۔ لیکن مسجدوں سے باہر پوری زندگی شیاطین اور طاغوت کے حوالے ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو مسلمان بھی کہلانا چاہتے ہیں اور کفر پر لعنت بھی بھیجتے ہیں۔ لیکن زندگی کا رویہ اسلام سے وابستگی نہیں بلکہ اس سے بغاوت پر مشتمل ہے یہ وہ رویہ ہے جسے منافقت کہا جاتا ہے۔ منافقت دنیا میں کبھی عزت کی ضمانت نہیں دیتی۔ اس سے کبھی اجتماعی زندگی میں ہمواری پیدا نہیں ہوتی یہ

کبھی بھی قومی توانائی کی باعث نہیں ہوتی۔اس سے کبھی بھی اجتماعی سیرت و کردار کی تعمیر نہیں ہوتی نتیجتاً قوم ذلت و رسوائی میں مبتلا ہو کر وقت سے پہلے اپنے انجام سے دوچار ہو جاتی ہے۔آج مسلمان اسی صورت حال سے دوچار ہیں۔اس لیے یہاں فرمایا گیا ہے کہ آپ کے پیش نظر جو آپ کا اصل ہدف ہے وہی رہنا چاہیے۔

مشرکین سے اعراض کا حکم

رہی یہ بات کہ یہ مشرک لوگ کیا کر رہے ہیں آپ ان سے اعراض فرمائیں ؑآپ تبلیغ و دعوت کا حق ادا کر چکے اب بار بار ان کے پیچھے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔بے تابانہ ان کا پیچھا کرنے کی کوئی حاجت نہیں وہ فخر و غرور سے دل کے دروازے اگر بند کر چکے ہیں تو آپ مشتاقانہ ان کے دروازوں پر دستک نہ دیں۔لوگوں کی ہدایت کے لیے دعا کرنا آپ کے رحمت للعالمین ہونے کا تقاضہ سہی ؑلیکن ان کی روش کو دیکھتے ہوئے ان کے توہین آمیز رویے کو بڑھتے ہوئے اور آخرت سے مسلسل انکار کرتے ہوئے دیکھ کر بھی اللہ کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھا کر اصرار سے ان کی ہدایت کی دعا مانگنا کسی طور ضروری نہیں اور اگر وہ جا و بے جا نئی نئی نشانیاں مانگیں اور نئے نئے مطالبات کریں تو ان پر کان دھرنے کی ہرگز کوئی گنجائش نہیں۔ان کے کفر کی وجہ سے ان کے انجام کو دیکھتے ہوئے یقیناً آپ کے دل کو دکھ ہوتا ہے آپ دل گرفتگی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔آپ بہت دفعہ اس کے لیے آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ (روح القرآن۔ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

آیت مبارکہ :

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ؕ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝۱۰۷

لغۃ القرآن: وَلَوْ : اور اگر] [شَآءَ اللّٰهُ : اللہ چاہتا] [مَآ : نہیں] [اَشْرَكُوْا : سب نے شرک کیا] [وَمَا : اور نہ] [جَعَلْنٰكَ : ہم نے بنایا آپکو] [عَلَيْهِمْ : ان پر] [حَفِيْظًا : نگہبان " بنا کر "] [وَمَآ : اور جو] [اَنْتَ : تو] [عَلَيْهِمْ : ان پر] [بِوَكِيْلٍ : کوئی داروغہ

ترجمہ: اور اگر اللہ (ان کو جبراً روکنا) چاہتا تو یہ لوگ (کبھی) شرک نہ کرتے، اور ہم نے آپ کو (بھی) ان پر نگہبان نہیں بنایا اور نہ آپ ان پر پاسبان ہیں

تشریح:

اے پیارے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ مشرکین کے شرک سے کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ کبھی شرک نہ کر سکتے۔ یعنی اگر اللہ چاہے تو سب انسانوں کو ہدایت پر از خود اکٹھا کر دے مگر یہ اس کی حکمت کے خلاف ہے۔ اگر ایسا ہی کرنا ہوتا تو پھر انبیاء کو بھیجنے اور کتابیں اتارنے کی ضرورت کیا تھی۔ بلکہ اللہ چاہتا ہے کہ بعثت انبیاء کے ذریعے سب پر راہ حق واضح کر دی جائے پھر اپنی مرضی سے جو چاہے ایمان لائے جو چاہے کفر کرے لہٰذا ہم نے آپ کو کفار پر نگہبان نہیں بنایا کہ آپ انھیں ہر صورت طوعاً و کرھاً مومن بنائیں ناہی یہ آپ کی ذمہ داری ہے اور نہ آپ سے پوچھا جائے گا کہ فلاں شخص ایمان کیوں نہ لایا۔

معلوم ہوا اللہ کی مشیت اور رضا میں فرق ہے کافروں کا کفر اللہ کی مشیت سے ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **ولو شاء اللہ ما اشرکوا**۔ مگر اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا نہیں اس کی رضا صرف ایمان میں ہے وہ فرماتا ہے۔ **ولا یرضی لعبادہ الکفر**۔ "اللہ اپنے بندوں کے کفر پہ راضی نہیں۔ "(زمر۔ 7)

(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

مشرکین مکہ بھی عجیب تھے، کہ جس کلام سے انھیں ہدایت حاصل کرنی چاہیے، اسکو سن کر وہ برہم ہو جاتے تھے۔۔ چنانچہ۔۔ جب کے سب جہنم کا ایندھن ہیں'۔ یہ سن کر کفار چڑھ گئے اور انھوں نے اسے گالی سمجھ لیا، حالانکہ کسی بھی لفظ کا اس کے صحیح مصداق پر استعمال کرنا، گالی نہیں۔ اسی لیے شیطان، کافر کو کافر، مشرک کو مشرک، مردود کو مردود، منافق کو منافق، مرتد کو مرتد، چور کو چور، شرابی کو شرابی، بدکار کو بدکار، یہود کو یہود عیسائی کو عیسائی وغیرہ وغیرہ کہنا گالی نہیں۔

خود قرآن کریم میں کافر، مشرک، مردود ملعون، منافق، زنیم 'جو بدکاری کا نتیجہ ہو' وغیرہ وغیرہ الفاظ کا اطلاق ان کے صحیح مصادیق پر کیا گیا ہے، المختصر۔۔ کفار گالی کی حقیقت نہ سمجھ سکے اور چیخ پڑے کہ اے محمد '(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)' ہمارے بتوں کو برا بھلا کہنا بند کریں، ورنہ ہم بھی آپ کے خدا کی، جسے تو، صفات کمال سے یاد کرتا ہے ہجو کرینگے۔ (تفسیر اشرفی۔ علامہ محمد مدنی اشرفی جیلانی)

ابن جریر کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے فرمار ہے ہیں ان مشرکین سے اعراض کرو اور ان سے مجادلہ وخصام اور سخت سست کہنا ترک کر دو۔ اگر تیرے رب کو ان کی ہدایت اور گمراہی سے نکلنا منظور ہوتا تو اور اپنے الطاف کریمانہ سے وہ اپنی توفیق ان کے شامل حال کر دیتا اور یہ لوگ شرک نہ کرتے بلکہ تم پر ایمان لا کر تمہاری اتباع کرتے اور اپنے رب کی طرف سے جو تم حق لائے ہو یہ اس کی تصدیق کرتے۔ باقی ہم نے تمھیں ان کا نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔ اور نہ ان کے معاملات کا محافظ بنایا۔ بلکہ تمھیں رسول مبلغ بنا کر بھیجا ہے۔ ان کے معاملات کا شمار ہمارے ذمہ ہے۔ تم ان کے اقوات وارزاق اور ان کی حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہو۔ ان کے معاملے کی حفاظت ہم نے تمہارے ذمہ نہیں لگائی۔

شواہد:

مجھے مثنی نے ابن عباس سے "ولو شاء اللہ ما اشرکوا" کے متعلق نقل کیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اگر میں چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ (طبری)

جبری ایمان نہ مطلوب ہے نہ معتبر

سو اس سے واضح فرما دیا گیا کہ جبری ایمان نہ مطلوب ہے نہ معتبر ورنہ اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ کبھی شرک نہ کرتے کہ ان کو طبعی اور جبری طور پر ایسا بنا دیا جاتا کہ یہ اس کی مشیت کے خلاف کچھ کر ہی نہ سکتے، جیسا کہ کائنات کی ہر چیز اس کی مشیت و تکوین کی پابند ہے۔ مگر ایسا جبری ایمان تو اسے منظور ہی نہیں کہ یہ ابتلاء و آزمائش کے مقتضیٰ کے خلاف ہے۔ اور اس کے یہاں منظور و معتبر وہی ایمان ہے جو اپنی مرضی و اختیار سے ہو کہ ثواب و عقاب اور جزا و سزا کا دار و مدار اسی پر ہے۔ پس جو اپنی مرضی اور سچے دل سے ایمان لائے گا وہی انعام کا مستحق قرار پائے گا۔ اور جو اس سے منہ موڑے گا وہ اس کی سزا پائے گا۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ سو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ دین کے معاملہ میں جبر کو پسند نہیں فرماتا کہ یہ اس کی حکمت اور ابتلاء و آزمائش کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ ورنہ اگر اس کی مشیت ایسے ہوتی تو ان لوگوں کی کیا جان تھی کہ یہ شرک کرتے اور جب مشیت الٰہی نے یہی چاہا ہے تو آپ کو ان کے بارے میں زیادہ فکر مند اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی ذمہ داری تو صرف پیغام حق کو پہنچا دینا ہے اور بس۔

پیغمبر کا کام تبلیغ حق اور انذار و تبشیر ہے اور بس

سو ارشاد فرمایا گیا کہ ہم نے آپ کو ان پر کوئی نگہبان بنا کر نہیں بھیجا اور نہ ہی آپ ان کے ذمہ دار ہیں کہ آپ خواہی نخواہی ان کو منوا کر ہی چھوڑیں۔ پس آپ کو ان کی زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ آپ کی مسؤلیت اور ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ آپ حق کا وہ پیغام بلا کم و کاست ان کو پہنچا دیں جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے رب کی طرف سے بذریعہ وحی آپ کو ملا ہے۔ اس سے بڑھ کر آپ ان کے لیے فکر مند اور پریشان نہ ہوں۔ {فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ} ۔ (فاطر: 8) سو پیغمبر کا اصل کام اور ان کی ذمہ داری تبلیغ و تعلیم حق ہوتا ہے اور انذار و تبشیر کہ ماننے والوں کو سدا بہار کامیابی کی بشارت و خوشخبری سنائیں اور نہ ماننے والوں کو ان کے مآل و انجام سے خبر دار کر دیں اور بس۔ اس سے بڑھ کر حق کو منوا لینا اور اس کو قبول قرار دینا نہ ان کی ذمہ داری ہوتی ہے اور نہ ان کے بس میں۔ (مدنی کبیر)

آیت مبارکہ :

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۪ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ ۱۰۸

لغۃ القرآن: وَلَا : اور نہ] [تَسُبُّوا : تم سب برا کہو " انکو "] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [يَدْعُوْنَ : سب بلاتے ہیں] [مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ : اللہ کے علاوہ کی] [فَيَسُبُّوا : تو " کہیں " وہ سب برا " نہ " کہہ بیٹھیں] [اللّٰهَ : اللہ] [عَدْوًۢا : زیادتی کرتے ہوئے] [بِغَيْرِ : بغیر] [عِلْمٍ : علم] [كَذٰلِكَ : اسی طرح] [زَيَّنَّا : ہم نے مزین کردیا] [لِكُلِّ : کے لیے] [اُمَّةٍ : بہترین امت] [عَمَلَهُمْ : ان کے عمل کو] [ثُمَّ : پھر] [اِلٰى : کی طرف] [رَبِّهِمْ : اپنے رب کو] [مَّرْجِعُهُمْ : ان کا لوٹنا ہے] [فَيُنَبِّئُهُمْ : تو وہ بتائے گا انہیں] [بِمَاكَانُوْا :" اس " کا جو وہ] [يَعْمَلُوْنَ : وہ سب کرتے ہیں]

ترجمہ : اور (اے مسلمانو!) تم ان (جھوٹے معبودوں) کو گالی مت دو جنہیں یہ (مشرک لوگ) اللہ کے سوا پوجتے ہیں پھر وہ لوگ (بھی جواباً) جہالت کے باعث ظلم کرتے ہوئے اللہ کی شان میں دشنام طرازی کرنے لگیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر فرقہ (وجماعت) کے لیے ان کا عمل (ان کی آنکھوں میں) مرغوب کر رکھا ہے (اور وہ اسی کو حق سمجھتے رہتے ہیں)، پھر سب کو اپنے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے اور وہ انھیں ان اعمال کے نتائج سے آگاہ فرما دے گا جو وہ انجام دیتے تھے

تشریح:

رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا عزم و حوصلہ فلک بوس پہاڑوں سے بلند و بالا تھی

رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا عزم و حوصلہ فلک بوس پہاڑوں سے بلند و بالا، آپ کی بردباری اور درگزر سمندر کے پانی کی گہرائی اور پھیلاؤ سے زیادہ تھی۔ آپ مشکل سے مشکل حالات میں صبر کرنے اور حوصلہ رکھنے والے تھے۔ کسی کی سنگین سے سنگین تر گستاخی اور زیادتی کے مقابلہ میں کبھی مشتعل نہ ہوتے۔ مکہ والوں نے آپ کی ذات اقدس پر ہر قسم کے الزام لگائے۔ سجدہ کی حالت میں آپ پر گندگی سے بھری ہوئی اونٹ کی اوجڑی رکھ دی۔ آپ کی ننھی منھی بچی حضرت فاطمہ (رض) کے معصوم چہرہ پر ابو جہل نے طمانچہ مارا۔ طائف کے غنڈوں نے آپ پر پتھر برسائے اور بدکلامی کی انتہا کر دی مدینہ میں منافقوں نے ہر قسم کی ہرزہ سرائی کی یہاں تک کہ آپ کی پاک دامن اور وفا شعار بیوی حضرت عائشہ (رض) پر تہمت لگائی حالانکہ اس وقت اقتدار اور اختیار کے لحاظ سے سرزمین حجاز میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ان مظالم اور زیادتیوں پر آپ کا مشتعل ہونا اور کسی سے بدلہ لینا تو در کنار پوری زندگی آپ کی زبان اطہر سے کسی نے کبھی سطحی لفظ نہیں سنا۔ پچھلی آیات میں آپ کو براہ راست مخاطب کیا گیا ہے۔ یہاں آپ کے بجائے مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے کیونکہ تبلیغ کے میدان میں کئی مراحل ایسے آتے ہیں کہ مبلغ کے لیے نازک صورت حال کو برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے بالخصوص جب مشرکین سچے خالق اور رحیم و کریم رب کے مقابلہ میں اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے لکڑی اور پتھر کے بتوں کو پیش کرتے ہیں تو موحّد کی غیرت ایمانی جوش میں آتی ہے جس کی بنا پر ایک مصلح اور مبلغ کی زبان پر سطحی لفظ کا آنا غیر فطری بات نہیں۔ لیکن تبلیغ کے میدان میں چھوٹی سی لغزش بھی مبلغ کے لیے عار اور اس کے مشن میں رکاوٹ بنتی ہے اس لیے اسے ضابطہ اخلاق کا پابند بناتے ہوئے گالی سے روکا گیا ہے۔ (سورۃ حٰم السجدہ، آیت: ۳۴) میں یہ کہہ کر مبلغ کو اخلاق کا سبق دیا گیا کہ نیکی اور برائی برابر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا کسی سے بحث و تکرار کے وقت بھی حسن اخلاق کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔

مشرک دلائل کے اعتبار سے نہایت ہی کمزور ہوتا ہے اس لیے وہ فطرتاً سفلہ مزاج اور کم ظرف واقع ہوا ہے جس بنا پر باطل معبودوں کی حمایت میں وہ سچے حقیقی معبود کی گستاخی کرنے میں بھی نہیں چونکتا اسے بے علم اور کم حوصلہ قرار دیتے ہوئے مواحد کو سمجھایا گیا ہے کہ ان کے باطل خداؤں کے بارے میں برے الفاظ مت کہو۔ کہیں وہ ذات کبریا کے بارے میں برے الفاظ نہ کہہ دیں۔ اس طرح تمہاری اخلاقی کمزوری کی وجہ سے وہ شرک میں آگے بڑھتے ہوئے تمہیں مشتعل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جس سے فائدے کے بجائے تبلیغ کے مشن کو نقصان ہوگا۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر ہر مبلغ کو تسلی دی ہے کہ مشرکوں اور خدا کے نافرمانوں کی نافرمانیوں اور شرک کی وجہ سے ان کے اعمال ان کے لیے خوبصورت بنا دیے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ شرک اور توحید میں فرق نہیں سمجھتے، گناہ اور خدا کی نافرمانی کو اپنی زندگی کا معمول بنائے ہوئے ہیں۔ دنیا میں جتنا چاہیں دندناتے پھریں آخر وہ وقت آکر رہے گا جب انھیں اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے ان کی ایک ایک حرکت اور عمل کے بارے میں نہ صرف ان کو بتلایا جائے گا بلکہ انھیں اس کے انجام سے دوچار ہونا ہوگا۔

(عَنْ وَاءِلٍ (رض) عَنِ الْمُرْجِءَةِ فَقَالَ حَدَّثَنِي عَبْدُ اللّٰهِ (رض) أَنَّ النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ) [رواہ البخاری : کتاب الایمان، باب خَوْفِ الْمُؤْمِنِ مِنْ أَنْ يَحْبَطَ عَمَلُهُ وَهُوَ لَا يَشْعُرُ]

”حضرت وائل (رض) مرجہ سے بیان کرتے ہیں مجھے عبداللہ (رض) نے بتایا بلاشبہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے لڑنا کفر ہے۔ ” (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران تعلیقاً)

مبلغ اگر صحیح تربیت یافتہ نہ ہو تو اپنے چھوٹ جاتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے نظریات اور عقائد کے متعلق اس کے سامعین کے دلوں میں نفرت اور تعصب پیدا ہو جاتا ہے اور بسا اوقات نوبت گالی گلوچ تک پہنچ جاتی ہے۔ اس آیت سے مبلغین اسلام کی تربیت مقصود ہے تاکہ وہ اسلام کی دعوت کو پوری شائستگی اور متانت سے پہنچانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ انھیں حکم دیا کہ مشرکین کے باطل خداؤں کو برا بھلا نہ کہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مشتعل ہو کر تمہارے معبود برحق کی جناب میں گستاخی کرنے لگیں۔ اس انداز سے انھیں اسلام کا پیغام پہنچاؤ اور ان کے عقائد باطلہ کی تردید کرو کہ انھیں تمہاری دعوت قبول کرنے کے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہ رہے۔ **عدوا ای جھلا و اعتداء** جہالت اور زیادتی سے۔ علماء اصول نے اس آیت سے سد ذرائع کا قاعدہ اخذ کیا ہے جس کا مختصر ا مطلب یہ ہے کہ ہر مباح کام جب کسی معصیت کا سبب بن جائے تو اس کو ترک کر دیا جائے گا۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

حضرت قتادہ (رض) کا قول ہے کہ مسلمان کفار کے بتوں کی برائی کیا کرتے تھے تاکہ کفار کو نصیحت ہو اور وہ بت پرستی کے عیب سے باخبر ہوں مگر ان ناخدا شناس جاہلوں نے بجائے نصیحت حاصل کرنے کے شان الٰہی میں بے ادبی کے ساتھ زبان کھولنی شروع کی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی (1) کہ اگرچہ بتوں کو برا کہنا اور ان کی حقیقت کا اظہار طاعت و ثواب ہے لیکن اللہ عَزَّوَجَلَّ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شان میں کفار کی بدگوئیوں کو روکنے کے لیے اس کو منع فرمایا گیا۔ ابن انباری کا قول ہے کہ یہ حکم اول زمانہ میں تھا جب مسلمانوں میں طاقت آ گئی کہ کفار کو ربعَزَّوَجَلَّکی شان میں گستاخی سے روک سکیں تو انھیں اس کی اجازت مل گئی۔ (1) ورنہ تو خود قرآن کریم میں شیطان اور بتوں اور سرداران قریش کی برائیاں بکثرت بیان کی گئی ہیں۔

آیت ”وَلَا تَسُبُّوا“ سے معلوم ہونے والے مسائل

مفتی احمد یار خاں نعیمی (رح) فرماتے ہیں کہ اس آیت سے چند مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ اگر غیر ضروری عبادت ایسے فساد کا ذریعہ بن جائے جو ہم سے مٹ نہ سکے تو اس کو چھوڑ دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ واعظ و عالم اس طریقے سے وعظ نہ کرے جس سے لوگوں میں ضد پیدا ہو جائے اور فساد اور مار پیٹ تک نوبت پہنچے۔ تیسرے یہ کہ اگر کسی کے متعلق یہ قوی اندیشہ ہو کہ اسے نصیحت کرنا اور زیادہ خرابی کا باعث ہو گا تو نہ کرے۔ چوتھے یہ کہ کبھی ضد سے انسان اپنا دین بھی کھو بیٹھتا ہے کیونکہ کفار مکہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کو مانتے تھے پھر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ضد میں اللہ عَزَّوَجَلَّ کی شان میں بھی بے ادبی کرتے تھے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ معاملہ کرنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہے

اس آیت کا بھی اس سابق آیت کے ساتھ ربط ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے کفار کا یہ شبہ بیان فرمایا تھا کہ انھوں نے اہل علم کی باتیں سن سن فقرے بنا لیے ہیں اور یہ قرآن جمع کر لیا ہے اور اس وقت یہ بعید نہیں تھا کہ مسلمان اس بات کو سن کر مشتعل ہوتے اور بطور معارضہ کے ' کفار کے بتوں کو برا کہتے۔ اس لیے پیش بندی کے طور پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کفار کے بتوں کو برا کہنے سے منع فرمایا ' تاکہ کفار اس کے جواب میں اپنی جہالت سے مسلمانوں کے خدا کو برا نہ کہنے لگیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کسی جاہل سے سابقہ ہو تو انسان اس کو کوئی سخت بات نہ کہے ' ورنہ وہ اس سے بھی زیادہ سخت بات کہے گا۔

جب مسلمان بتوں کو برا کہتے تھے تو دراصل کفار اس کے جواب میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو برا کہتے تھے ' تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو برا کہنا ' اللہ تعالیٰ کو برا کہنا قرار دیا ' کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے نائب مطلق ہیں اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ کوئی معاملہ کرنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ کرنا ہے ' جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

(آیت) " ان الذین یبایعونك انما یبایعون اللہ "۔ (الفتح: ١٠)

ترجمہ: بیشک جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ دراصل اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔

اسی طرح جب ستر انصار نے عقبہ ثانیہ کے موقعہ پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا جب ہم اپنی جانوں اور مالوں کو آپ کی اطاعت میں خرچ کریں تو ہمیں اس کے عوض کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا جنت تو یہ آیت نازل ہوئی:

(آیت) " ان اللہ اشتری من المؤمنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ "۔ (التوبہ: ١١١)

ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلہ میں خرید لیا۔

(آیت) " ان الذین یؤذون اللہ ورسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا والاخرۃ واعدلھم عذابا مھینا "۔ (الاحزاب: ٥٧)

ترجمہ: بیشک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذاء پہنچاتے ہیں ' اللہ نے ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت فرمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ایذا پہنچانا متصور نہیں ہے ' دراصل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ایذا دینا ہی اللہ تعالیٰ کو ایذا دینا ہے۔

(آیت) " یخدعون اللہ والذین امنوا "۔ (البقرہ: ٩)

ترجمہ: وہ اللہ کو اور مسلمانوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔

وہ اللہ تعالیٰ کو مانتے تھے ' ان کا اختلاف صرف رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے تھا۔ ان کے نزدیک بھی اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینا ممکن نہ تھا ' وہ اپنے زعم میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دھوکا دیتے تھے ' لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر فرمایا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دھوکا دینا اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینا ہے:

(آیت) "من یطع الرسول فقد اطاع اللہ"۔ (النساء : ۸۰)

ترجمہ : جس نے رسول کی اطاعت کی 'اس نے اللہ کی اطاعت کرلی۔

ان آیات سے واضح ہو گیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیعت کرنا اللہ تعالیٰ سے بیعت کرنا ہے۔ آپ کا خریدنا 'اللہ کا خریدنا ہے 'آپ کو ایذاء دینا اللہ کو ایذا دینا ہے 'آپ کو دھوکا دینا ہے اور آپ کو اطاعت کرنا اللہ کو اطاعت کرنا ہے اور جب آپ کے ساتھ کوئی معاملہ اللہ کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے 'تو آپ کو برا کہنا اللہ کو برا کہنا ہے۔ اس لیے بتوں کو برا کہنے کے جواب میں کفار رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو برا کہتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے فرمایا تم ان کے بتوں کو برا نہ کہو ورنہ وہ اللہ کو برا کہیں گے۔

امام ابن جریر متوفی ۳۱۰ ھ اور دیگر مفسرین نے اس آیت کے شان نزول میں اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے۔

جب ابوطالب کی موت کا وقت آیا تو قریش نے کہا ان کے پاس چلو اور ان سے کہو کہ وہ اپنے بھتیجے کو منع کریں 'کیونکہ ہم کو اس سے حیا آتی ہے کہ ان کی موت کے بعد ہم ان کے بھتیجے کو قتل کریں۔ لوگ کہیں گے کہ وہ اپنے بھتیجے کا دفاع کرتے تھے اور ان کے مرنے کے بعد انھوں نے ان کے بھتیجے کو قتل کردیا۔ تب ابوسفیان 'ابوجہل 'نضر بن الحارث 'امیہ بن خلف 'عقبہ بن ابی معیط 'عمرو بن العاص اور الاسود بن البختری نے ایک آدمی بھیج کر ابوطالب سے ملاقات کی اجازت طلب کی۔ جب اجازت مل گئی تو انھوں نے کہا اے ابوطالب ! تم ہمارے بڑے اور ہمارے سردار ہو اور (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمیں اور ہمارے خداؤں کو اذیت پہنچاتے ہیں 'ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم بلا کر ان سے کہو کہ وہ ہمارے خداؤں کا ذکر نہ کیا کریں 'ابوطالب نے آپ سے کہا آپ کی قوم نے انصاف کی بات کی ہے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان لوگوں سے فرمایا یہ بتاؤ اگر میں ایسا کرلوں تو کیا تم مجھے ایک ایسا کلمہ دو گے کہ اگر تم وہ کلمہ پڑھ لو تو تم عرب کے مالک ہو جاؤ گے اور عجم کے لوگ تمہارے باجگزار ہو جائیں گے۔ ابوجہل نے کہا ہاں ! تمہارے باپ کی قسم ہم تم کو ضرور وہ کلمہ دیں گے 'بلکہ اس کا دس گنا دیں گے۔ بتاؤ وہ کلمہ کیا ہے ؟ آپ نے فرمایا تم کہو "لا الہ الا اللہ "انھوں نے اس کو پڑھنے سے انکار کردیا۔ ابوطالب نے کہا اے بھتیجے ! کوئی اور بات کہو 'تمہاری قوم اس کلمہ سے بدکتی ہے 'آپ نے فرمایا اے میرے چچا میں اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کہوں گا۔ حتی کہ یہ سورج کو لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیں اور اگر انھوں نے سورج کو لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا 'تب بھی میں اس کلمہ کے سوا اور کچھ نہیں کہوں گا۔ تب وہ غضبناک ہوگئے اور کہنے لگے آپ ہمارے بتوں کو برا کہنے سے باز آجائیں 'ورنہ ہم آپ کو بھی برا کہیں گے اور جو آپ کو حکم دیتا ہے اس کو بھی برا کہیں گے۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (جامع البیان 'جز ۷ 'ص ۴۰۴ 'تفسیر امام ابن ابی حاتم 'ج ۴ 'ص ۱۳۶۷ 'تفسیر ابن کثیر 'ج ۳ 'ص ۷۹۔ ۷۸)

سد ذرائع کی بناء پر بتوں کو برا کہنے کی ممانعت

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ ھ لکھتے ہیں :

اس آیت میں کفار کے خداؤں کو برا کہنے سے منع فرمایا ہے۔ علماء نے کہا ہے کہ یہ حکم اس امت میں ہر حال میں باقی ہے 'لہٰذا جب تک کافر اپنی حفاظت میں ہو اور یہ خدشہ ہو کہ وہ اسلام کو یا نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یا اللہ عزوجل کو برا کہے گا 'تو کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں

ہے کہ وہ ان کی صلیب کو یا ان کے دین کو یا ان کی عبادت گاہوں کو برا کہے 'اور نہ کسی ایسے کام کے درپے ہو جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو برا کہیں 'کیونکہ یہ معصیت پر ابھارنے کے قائم مقام ہے۔

اس آیت میں یہ دلیل بھی ہے کہ جو کام کسی برائی کا ذریعہ بنے 'اس کو روکنا اور اس کا نہ کرنا واجب ہے اور اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ بعض اوقات کسی حقدار کو اس کا حق وصول کرنے سے اس لیے روک دیا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے دین میں کسی ضرر کے پہنچنے کا خطرہ ہوتا ہے۔

علامہ ابن العربی نے کہا ہے کہ اگر حق واجب ہو تو اس کو ہر حال میں وصول کرے اور اگر جائز ہو تو پھر اس میں یہ قول ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے اسی قوم کے لیے اس کا عمل مزین کر دیا ہے۔ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے اطاعت گزاروں کے لیے اطاعت کو مزین کر دیا ہے اور کافروں کے لیے مزین کر دیا ہے۔ (تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

اس آیت میں غور و فکر کرنے سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں

1۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے غیر مسلموں کے معبودوں کو گالیاں دینے سے منع فرمایا ہے۔ علامہ قرطبی لکھتے ہیں : "علماء نے کہا ہے کہ اس آیت کا حکم اس امت پر حال میں باقی ہے۔ جب بھی غیر مسلموں سے خدشہ ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یا اسلام کو گالیاں دیں گے تو کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس کی صلیب، ان کے دین یا ان کی عبادت گاہوں کو گالیاں دے اور کسی ایسے کام کے درپے ہو جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ، نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یا اسلام کو گالیاں دیں، کیونکہ یہ گناہ اور نافرمانی پر ابھارنے کے مترادف ہے۔ " (تفسیر قرطبیؒ)

2۔ اہل علم نے اس آیت سے سد ذرائع کا اصول بھی اخذ کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو کام کسی برائی اور گناہ کا سبب بنے اس کو روکنا اور ترک کرنا واجب ہے۔ (تفسیر قرطبیؒ)

چونکہ کسی کے معبود اور مذہب کو گالیاں دینا ایک برائی اور گناہ کا سبب بنتا ہے، لہٰذا اس کا ترک کرنا واجب ہے۔

3۔ اس آیت میں مبلغین اسلام کی تربیت کی جارہی ہے کہ وہ غیر مسلموں سے بحث کرتے وقت اخلاق کے دائرہ میں رہتے ہوئے علمی گفتگو کریں اور حد سے تجاوز نہ کریں کیونکہ اگر بد اخلاقی کا مظاہرہ کیا گیا اور بات گالم گلوچ تک پہنچ گئ تو غیر مسلموں کے دل میں اسلام سے نفرت پیدا ہو جائے گی اور وہ اللہ تعالیٰ کو گالیاں دیں گے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی کئ آیات میں بتوں پر سخت تنقید کی گئ ہے اور انھیں جہنم کا ایندھن کہا گیا ہے۔ کیا یہ قرآن کے اس حکم کے خلاف نہیں ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں انسانی ہمدردی کے پیش نظر بطور مناظرہ بتوں کی حقیقت بیان کی گئ ہے کہ وہ عبادت کے لائق نہیں ہیں۔ اس سے بتوں کی تذلیل اور مشرکین کی توہین مقصود نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے عدالت میں کسی گواہ پر جرح کی جائے تو اس سے مقصود گواہ کی تذلیل نہیں ہوتی بلکہ مقدمہ کی حقیقت کو سمجھنا اور سچ اور جھوٹ واضح کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس طرح پارلیمنٹ میں جب کسی بل کے نقائص

بیان کئے جاتے ہیں تو اس کا مقصد پیش کرنے والے توہین نہیں ہوتا بلکہ بل کے نقصانات سے آگاہ کرنا اور قوم اور معاشرے کو اس بل کے ضرر رساں اثرات سے بچانا مقصود ہوتا ہے۔ اسی لیے اہل علم نے تصریح کی ہے کہ جن آیات میں بتوں پر تنقید کی گئی ہے ان کو مشرکین کی تذلیل اور ان کو چڑرانے کے ارادے سے پڑھنا جائز نہیں ہے۔

(تفسیر روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی المعانی)

مندرجہ ذیل حدیث اس آیت کی تفسیر ہے:

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "یقیناً بڑے گناہوں میں سے ایک یہ ہے کہ انسان اپنے والدین کو لعنت کرے۔ عرض کی گئی: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ایک انسان اپنے والدین کو کیسے لعنت کر سکتا ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ایک انسان کسی دوسرے کے باپ کو گالی دے اور دوسرا واپس پہلے شخص کے والدین کو گالیاں دے۔" (بخاری: کتاب الادب: باب 4)

یعنی اگر پہلا شخص گالیوں کی ابتدا نہ کرتا تو دوسرا پہلے کے والدین کو گالیاں نہ دیتا، لہٰذا یہ ایسا ہی ہے جیسے پہلے شخص نے خود ہی اپنے والدین کا گالیاں دی ہیں کیونکہ وہی اس کا سبب بنا ہے۔ اسی طرح جو مسلمان کسی کے معبود کو گالیاں دے اور وہ بدلے میں مسلمان کے خدا کو گالیاں دے تو ایسا ہی ہے جیسے مسلمان نے خود اپنے خدا کو گالی دی ہے۔ (العیاذ باللہ) (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

آیت مبارکہ:

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ

۝١٠٩

لغۃ القرآن: وَاَقْسَمُوْا : اور ان سب نے قسمیں کھائیں] [بِاللّٰهِ : اللہ کا] [جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ : اپنی پکی قسمیں] [لَئِنْ : البتہ اگر] [جَآءَتْهُمْ : آئے ان کے پاس] [اٰيَةٌ : کوئی نہیں] [لَّيُؤْمِنُنَّ : ضرور بالضرور وہ ایمان لے آئیں گے] [بِهَا : اس کے] [قُلْ : آپ کہہ دیں] [نَّمَا : حقیقت میں] [الْاٰيٰتُ : نشانیاں] [عِنْدَ اللّٰهِ : اللہ کے نزدیک]

[وَمَا : اور نہ] [یُشْعِرُکُمْ : معلوم کرواتی ہے تمہیں] [اَنَّهَآ : کہ بیشک وہ] [اِذَا : جب] [جَآءَتْ : آجائیں] [لَا : نہیں] [یُؤْمِنُوْنَ : وہ سب ایمان لاتے ہیں]

ترجمہ : وہ بڑے تاکیدی حلف کے ساتھ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی (کھلی) نشانی آجائے تو وہ اس پر ضرور ایمان لے آئیں گے۔ (ان سے) کہہ دو کہ نشانیاں تو صرف اللہ ہی کے پاس ہیں، اور (اے مسلمانو!) تمہیں کیا خبر کہ جب وہ نشانی آجائے گی (تو) وہ (پھر بھی) ایمان نہیں لائیں گے

تشریح :"

وہ دل جو اس کائنات میں بکھرے ہوئے شواہد و دلائل کو تسلیم نہیں کرتا 'خصوصا اس تبلیغ و بیان کے بعد جو اس کتاب نے بے مثال پیرائے میں پیش کیا اور اس کائنات اور خود انسان کے نفس کے اندر موجود آیات الٰہیہ اسے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتیں اور وہ اپنے رب کی طرف دوڑ کر نہیں آتا تو ایسا دل یقینا لاعلاج دل ہے۔ (فی ظلال القرآن)

جہد کا معنی انتہائی کوشش اور بھرپور جد و جہد کے ہیں اور یہاں اس لفظ کا استعمال چونکہ قسم کے ساتھ ہوا ہے اس لیے اس کا مفہوم ہوگا پکی قسمیں کھانا۔ گزشتہ آیات کے تفصیلی مطالب اور بھرپور دعوت کو دیکھتے ہوئے مشرکین مکہ کا یہ نیا مطالبہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ان کے بگاڑ کی انتہا ہے کہ وہ کسی بڑی سے بڑی بات سے بھی اثر پذیر ہونے کے لیے تیار نہیں ان کے پہلوؤں میں دل نہیں پتھر معلوم ہوتے ہیں۔ پتھر بھی بعض دفعہ قرآن کریم کے بیان کے مطابق اللہ کے خوف سے پھٹ جاتے اور ان سے چشمے رواں ہو جاتے ہیں اور بعض دفعہ اللہ کی خشیت سے بلندیوں سے لڑھک جاتے ہیں 'لیکن انسانی دلوں کی سنگینی کا عالم یہ ہے کہ داعی اللہ کا نبی ہے جس کی شخصیت پتھروں کو موم کر دیتی ہے اور جس زبان میں وہ دعوت دے رہا ہے وہ قرآن کریم کی زبان ہے یعنی خالق ومالک کا کلام اور پھر اس دعوت کے پیچھے جو ذات داعی کی حیثیت سے کھڑی ہے اس سے بڑھ کر اپنے مخالفین کا غمگسار اور ہمدرد یقینا اس دھرتی نے اور کوئی نہیں دیکھا۔ وہ خون جگر پی پی کر انھیں راہ ہدایت دکھا رہا ہے۔ ان کی گالیاں سن کر دعاؤں سے نواز رہا ہے ان کے دکھ اٹھا کر ان کو برے انجام سے بچانا چاہتا ہے لیکن یہ اس کی دعوت کو قبول کرنے کی بجائے نئے نئے پینترے بدل کر نئے نئے مطالبات اس کے سامنے رکھ رہے ہیں ایک سے ایک بڑی نشانی دیکھ چکے ہیں پھر کائنات کا چپہ چپہ اللہ کی نشانیوں سے بھرپور ہے اور یہ نشانیاں ان کے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی ہیں۔ مزید یہ کہ اللہ کے رسول کی ذات بجائے خود سب سے بڑی نشانی ہے قرآن کریم اپنی معجزانہ شان میں اللہ کا نشان ہے پھر حضور کے معجزات ایک بڑی تعداد میں اب تک یہ لوگ دیکھ چکے ہیں۔ بایں ہمہ ! ان کا پھر نشانیوں کے لیے مطالبہ کرنا صاف بتا رہا ہے کہ وہ ہدایت اختیار کرنا نہیں چاہتے بلکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت کو بے اثر کرنے کے لیے نئے نئے حربے ایجاد کر رہے ہیں۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

یہود و نصاریٰ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو لاجواب کرنے اور مسلمانوں کو ورغلانے کے لیے یہ ہتھکنڈا بھی استعمال کیا کرتے تھے کہ جب مسلمانوں کی مجالس میں بیٹھتے تو اپنا اعتماد اور اخلاق ظاہر کرنے کے لیے قسمیں اٹھایا کرتے تھے کہ اگر یہ نشانیاں اور معجزات ہمارے سامنے پیش کیے جائیں تو ہم حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں گے۔ ان کے ساتھ اہل مکہ کا یہ مطالبہ بھی تھا کہ صفا پہاڑ کو سونے کا بنا دیا جائے تاکہ ہماری معاشی

مشکلات حل ہو سکیں اور ہم کامل یک سوئی کے ساتھ اسلام کی خدمت کر سکیں۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی جس کے جواب میں جبرائیل امین (علیہ السلام) تشریف لائے اور آپ سے کہا کہ آپ کی دعا کے بدلے یہ پہاڑ سونے میں تبدیل ہو جائے گا اگر یہ لوگ پھر بھی ایمان نہ لائے تو انھیں فی الفور صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے گا اگر آپ چاہیں تو انھیں مزید مہلت دی جائے تاکہ ان میں سلیم الفطرت لوگ ایمان لے آئیں۔ آپ نے اسی بات کو پسند کرتے ہوئے ان لوگوں سے فرمایا کہ معجزہ ظاہر کرنا میرے بس کی بات نہیں یہ تو اللہ تعالیٰ کی عنایت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ جب چاہتا ہے اپنے رسول کو عطا فرماتا ہے۔ اے رسول معجزات تو ان کے پاس پے در پے آچکے تھے لیکن جب کسی کی سوچ الٹی ہو جائے اور اس کی آنکھیں کسی چیز کو غلط زاویے سے دیکھنے لگیں تو اسے ہدایت کس طرح نصیب ہو سکتی ہے۔ اس وجہ سے ہم نے انھیں ان کی نافرمانیوں کے حوالے کر دیا ہے جس میں وہ سرگرداں رہتے ہیں۔ بعض مفسرین نے **"ونقلب افئدتھم وابصارھم "** کا مفہوم یہ لیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انھیں جہنم کی طرف پھیر دے گا۔ نبی گرامی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ دل رحمٰن کے اختیار میں ہیں۔

(عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ تُحَدِّثُ أَنَّ رَسُولَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یُکْثِرُ فِی دُعَاءِہِ أَنْ یَقُولَ اللّٰھُمَّ مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِی عَلٰی دِینِكَ قَالَتْ قُلْتُ یَا رَسُولَ اللّٰہِ أَوَإِنَّ الْقُلُوبَ لَتَتَقَلَّبُ قَالَ نَعَمْ مَا مِنْ خَلْقِ اللّٰہِ مِنْ بَنِی آدَمَ مِنْ بَشَرٍ إِلَّا أَنَّ قَلْبَہُ بَیْنَ أَصْبَعَیْنِ مِنْ أَصَابِعِ اللّٰہِ فَإِنْ شَاءَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ أَقَامَہُ وَإِنْ شَاءَ اللّٰہُ أَزَاغَہُ ..) [رواہ احمد]

"حضرت ام سلمہ (رض) بیان کرتی ہیں بلاشبہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اکثر اپنی دعاؤں میں کہا کرتے تھے اے اللہ دلوں کو پھیرنے والے ! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھنا۔ وہ بیان کرتی ہیں میں نے پوچھا اے اللہ کے رسول ! آیا دل بھی پھیرے جاتے ہیں ؟ رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہاں ! بنی آدم کے ہر فرد کا دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو اس کو قائم رکھتا ہے۔ اور اگر اللہ چاہے تو اس کو پھیر دے۔۔"

(رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ ھَدَیْتَنَا وَھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَھَّابُ)

[آل عمران : ٨]

"اے ہمارے رب ! ہمارے دلوں کو ہدایت دینے کے بعد پھیر نہ دینا۔ اور ہمیں اپنی طرف سے رحمت عنایت کر بلاشبہ تو ہی دینے والا ہے۔"

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

معجزات کی اصل طاقت اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اس کی اجازت اور عطا سے ہی انبیائے کرام (علیہم السلام) معجزات دکھاتے ہیں۔ اس وقت بعض مسلمانوں کے دل میں خیال آیا کہ کیا اچھا ہو کہ آج کوئی معجزہ دیکھا دیا جائے تاکہ شاید یہ ایمان لے آئیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خبر دی کہ تم ان کی قسموں کی طرف نہ جاؤ۔ یہ پہلے شق قمر کا مطالبہ کر چکے ہیں اور جب چاند توڑ کر دکھا دیا گیا تو انکار کر دیا، لہٰذا ان کا انکار کسی غلط فہمی کی وجہ سے نہیں بلکہ تعصب اور ضد سے ہے اور اب بھی اگر ہم مزید معجزات دکھادیں تو پھر بھی یہ ایمان لانے والے نہیں۔

(امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

آیت مبارکہ :

وَنُقَلِّبُ اَفۡـِٕدَتَهُمۡ وَاَبۡصَارَهُمۡ كَمَا لَمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ۝١١٠

لغۃ القرآن: وَنُقَلِّبُ : اور ہم پھیر دیں گے] [اَفْـِٕدَتَهُمْ : ان کے دلوں کو] [وَاَبْصَارَهُمْ : اور ان کی آنکھوں کو] [كَمَا : جیسا کہ] [لَمْ : نہیں] [يُؤْمِنُوْا : وہ سب ایمان لے آئیں] [بِهٖٓ : اس کو] [اَوَّلَ : پہلی] [مَرَّةٍ : مرتبہ] [وَّنَذَرُهُمْ : اور ہم چھوڑدیں گے انہیں] [فِي : میں] [طُغْيَانِهِمْ : یہ اپنی سرکشی] [يَعْمَهُوْنَ : وہ سب بھٹکتے رہیں]

ترجمہ : اور ہم ان کے دلوں کو اور ان کی آنکھوں کو (ان کی اپنی بدنیتی کے باعث قبول حق) سے (اسی طرح) پھیر دیں گے جس طرح وہ اس (نبی) پر پہلی بار ایمان نہیں لائے (سو وہ نشانی دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے) اور ہم انھیں ان کی سرکشی میں (ہی) چھوڑ دیں گے کہ وہ بھٹکتے پھریں

تشریح :

اس آیت میں کفار مکہ کے دل ونگاہ کو حق سے پھیرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے اور اسی طرح کئی اور مقامات پر بھی ان کی دل ونگاہ کی صلاحیتوں کو ناکارہ کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔ یہاں بعض لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے دل ودماغ کو ناکارہ بنادیا ہے اور ان کے سمع وبصر پر پردے ڈال دیئے ہیں تو پھر ان کا قصور کیا ہے اور انھیں سزا کیوں دی جائے گی۔ اس کا تفصیلی جواب تو سورۃ بقرہ کی آیت نمبر 7 میں گزر چکا ہے۔ یہاں مختصراً عرض ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کفار کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے کہ میں نے ان کے دلوں پر مہریں لگادی ہیں اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اسی طرح اہل ایمان کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے کہ میں نے ان کے لیے ہدایت کی راہیں کھول دی ہیں اور ان کے دل ودماغ کو ایمان کے نور سے منور کر دیا ہے۔ اب یہاں بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ اہل ایمان کو جب ہدایت اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے اور نور ایمان سے اس نے نوازا ہے تو انھیں جنت کیوں عطا کی جائے گی اور وہ انعامات کے مستحق کیوں ٹھہریں گے، اس طرح تو جزا اور سزا کا تصور ہی ختم ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اہل ایمان نے اپنے ارادہ سے اور اہل کفر نے اپنے ارادہ سے ایمان اور کفر کی راہیں اختیار کی ہیں اور اس یا رادہ پر وہ جزاو سزا کے مستحق ٹھہریں گے، لیکن فاعل حقیقی کیونکہ اللہ تعالیٰ ہے اور یہ سب کچھ اس کی مشیت کے تابع ہے اس لیے اس کی نسبت اس نے اپنی طرف کر دی ہے۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

جب اللہ نے کفار کے دلوں کو پھیر دیا تو ان کا کفر میں کیا قصور ہے؟

یہ آیت بھی ان آیات میں سے ایک ہے جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ کفر اور ایمان کا تعلق اللہ تعالیٰ کی قضاء قدر سے ہے۔ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جب کفار کے طلب کردہ معجزات پیش کر دیئے گئے اور کفار کو پتا چل گیا کہ یہ معجزات سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دعوی نبوت کے صدق پر دلالت کرتے ہیں 'لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور آنکھوں کو اس صحیح دلالت سے پھیر دیا 'تو وہ اپنے کفر پر قائم رہے اور ان معجزات کی دلالت سے فائدہ نہیں اٹھا سکے :

اس جگہ یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہی ان کے دلوں اور آنکھون کو سچائی 'ہدایت اور اسلام کی راہ سے پھیر دیا 'تو پھر ان کے ایمان نہ لانے میں ان کا کیا قصور ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ پہلی بار جب ان کا فرمائشی معجزہ دکھایا گیا اور چاند کو شق کر دیا گیا اور وہ پھر بھی ایمان نہیں لائے تو دوسری بار اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ سزا دی کہ جب معجزہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صدق پر دلالت کرتا 'تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں اور آنکھوں کو پھیر دیتا اور وہ اپنے کفر پر برقرار رہتے۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

پہلی ضد انھیں اب بھی روکے گی

دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ نے پختہ قاعدے مقرر کر دیئے ہیں اور وہ انہی قاعدوں کے مطابق چل رہی ہے۔ کوئی چیز ان قاعدوں سے باہر نہیں جا سکتی۔ یہ قاعدے اللہ ہی کے مقرر کیے ہوئے ہیں اس لیے اس کے مطابق جو کام بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے یعنی قرآن میں اسے اس طرح کہا جاتا ہے کہ اللہ نے یہ کیا۔ مثلاً انسان کے دل پر بہت سی چیزوں کا اثر پڑتا ہے اور ایک دفعہ جس چیز کا گہرا اثر پڑ جائے تو پھر وہ مشکل سے جاتا ہے۔ انسان کوئی کام کرے تو اس کا اثر دل قبول کرے گا لیکن پہلے وہ ہلکا ہوگا۔ اب اگر اس کام کو چھوڑ دیا تو وہ اثر جاتا رہے گا۔ لیکن اگر پھر کیا تو اس کا اثر پہلے کے اثر کے ساتھ مل کر اور گہرا ہو جائے گا اور اگر کرتا ہی رہا تو اثر گہرے سے گہرا ہوتا چلا جائے گا۔ اب اگر یہ کام اچھا ہے تو اس کا اثر بار بار کرنے سے جتنا بھی گہرا ہوگا اتنا ہی مفید ہوگا اور اگر برا ہے اور اس کو نہ چھوڑا تو اس کا اثر بھی ہر دفعہ گہرا ہوتا چلا جائے گا۔ اور جتنا گہرا ہوگا اتنا ہی مضر ہوگا مکہ کے مشرکوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو شروع ہی سے رسول اللہ نہ مانا اور آپ کا کہنا ماننے سے انکار کر دیا۔ اور قرآن آیا تو اس کی آیتوں کا انکار کر دیا۔ اس انکار کا اثر جو ان کے دل پر ہوا، اس کا نام کفر ہے۔ انکار روز بروز بڑھتا گیا۔ نشانیوں پر نشانیاں آئیں۔ آیتوں پر آیتیں نازل ہوئیں لیکن ان کا انکار بڑھتا گیا۔ اس لیے ان کا کفر گہرا ہوتا گیا یہاں تک کہ سارے دل کو ڈھانک لیا۔ گویا مہر لگ گئی۔ اور یہ سب اسی قاعدے کے مطابق ہوا کہ ایک چیز کے بار بار کرنے سے اس کا اثر دل پر گہرا ہوتا چلا جاتا ہے یہ قاعدہ اللہ کا مقرر کیا ہوا ہے اس لیے قرآن میں اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ ہم ان کے دل

پھیر دیں گے اور آنکھیں الٹ دیں گے کیونکہ انھوں نے شروع میں انکار کر دیا اور پھر برابر انکار کرتے چلے گئے۔ ارشاد ہے کہ ان کی پہلی ضد اور ہٹ دھرمی کے برابر جاری رہنے کا اور ایمان کے برابر انکار کرتے رہنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اب جو بھی آیت یا نشانی آئے گی اس کا انکار ہی کریں گے۔ اور چونکہ انکار کا اثر بار بار کرتے کرتے گہرا ہو چکا ہے۔ اس لیے ہم آئندہ نشانی آنے پر بھی ان کے دل اور آنکھیں الٹ دیں گے۔ کیونکہ انھوں نے شروع میں انکار کر دیا اور پھر برابر انکار کرتے چلے گئے۔ ارشاد ہے کہ ان کی پہلی ضد اور ہٹ دھرمی کے برابر جاری رہنے کا اور ایمان کے برابر انکار کرتے رہنے کا نتیجہ یہ ہگا کہ اب جو بھی آیت یا نشانی آئے گا اس کا انکار ہی کریں گے۔ اور چونکہ انکار کا اثر بار بار کرتے کرتے گہرا ہو چکا ہے۔ اس لیے ہم آئندہ نشانی آنے پر بھی ان کے دل اور آنکھیں الٹ دیں گے اور وہ نہ کچھ سمجھ سکیں گے نہ دیکھ سکیں گے۔ اب ان کا یہ حال ہوگا کہ سرکشی اور ضد بڑھتی جائے گی۔ اس کے اثر سے دل سیاہ ہوتا چلا جائے گا اور وہ اس کے اندر بھٹکتے پھریں گے۔ (درس آسٹریلیا)

سرکشوں پر دعوت و تبلیغ کوئی اثر نہیں کرتی

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان نہ لانے کا حقیقی سبب بیان کیا ہے اور ساتھ ہی اپنی سنت اور قانون کو بھی بیان فرمایا ہے۔ حقیقی سبب کا ذکر اس آیت کے آخری جملے میں ہے اور سنت اللہ کا بیان آیت کے شروع میں۔ ہم پہلے اس حقیقی سبب کا ذکر کرتے ہیں ان کے ایمان نہ لانے کا حقیقی سبب ان کا نشانی نہ دیکھنا نہیں ہے بلکہ ان کا وہ طغیان اور سرکشی ہے جس کی وجہ سے وہ اللہ کی نعمتوں کو اپنی قوت و قابلیت کا کرشمہ سمجھتے ہیں اور پیغمبر کی دعوت ان کے غرور نفس اور ان کے پندار سیادت پر شاق گزرتی ہے جب بھی کوئی قوم اس مرض میں مبتلا ہوتی ہے تو وہ عموماً ہدایت قبول کرنے سے محروم رہتی ہے اس کا پندار نفس اسے کوئی بات سننے اس پر غور کرنے پھر اسے قبول کرنے سے رکاوٹ بن جاتا ہے اور جب اس کی یہ عادت طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے اور وہ کسی طرح بھی اسے بدلنے کے لیے تیار نہیں ہوتی اور وہ اپنی ذات کے گنبد سے باہر نکلنے پر بالکل آمادہ نہیں ہوتی اور اپنے علم و دانش کے خول میں اس طرح اپنے آپ کو بند کر لیتی ہے کہ کوئی بھی سوجھ بوجھ کی بات اور عقل و دانش کا کوئی حصہ کبھی اس کے دل و دماغ میں اترنے نہیں پاتا تو پھر اللہ کا وہ قانون حرکت میں آتا ہے جس کے نتیجے میں ایسا فرد یا ایسی قوم ہدایت سے محروم کر دی جاتی ہے۔ اللہ کے اس قانون کی وضاحت ایک سے زیادہ دفعہ ہم کر چکے ہیں۔ سلسلہ کلام کی وضاحت کے لیے مختصراً عرض کیے دیتے ہیں کہ اس کائنات میں بھی اور انسان کے اپنے وجود کے اندر بھی خالق کائنات نے اپنی جو ان گنت نشانیاں پھیلا دی ہیں جو لوگ ان پر غور کرتے اور اس غور و فکر سے جو بدیہی نتائج ان کے سامنے آتے ہیں ان کو حرز جان بناتے ہیں ان کو ایمان کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ یہ تمام نشانیاں دیکھنے کے باوجود اندھے بہرے بنے اپنے طغیان اور سرکشی میں مگن رہتے ہیں اور قرآن اور پیغمبر کی بار بار تذکیر کے بعد بھی اپنی آنکھیں نہیں کھولتے اللہ تعالیٰ ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو الٹ دیا کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح فکر و نظر کی صلاحیت سے محروم ہو جایا کرتے ہیں پھر بڑی سے بڑی نشانی اور بڑے سے بڑا معجزہ بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ یہاں دلوں اور نگاہوں کو الٹنے کا یہی مفہوم ہے کہ وہ سیدھے دیکھنے کی بجائے الٹے دیکھتے اور سیدھی راہ اختیار کرنے کی بجائے الٹی راہ چلتے ہیں ان کی فکر بھی کج روی کا شکار ہو جاتی ہے پھر وہ احول کی طرح ہر چیز کو بس اپنے مخصوص زاویئے ہی سے دیکھتے ہیں۔ ہم اپنی عام زندگی میں بھی بہت دفعہ اس صورت حال کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی جب تک کسی کی محبت کا اسیر رہتا ہے تو وہ محبت اس کی آنکھوں اور دل پر

ایسافریب طاری کردیتی ہے کہ وہ اس کی برائیوں کو بھی نیکیاں سمجھتا ہے اور اس کی کمزوریاں بھی اسے خوبیاں معلوم ہوتی ہیں لیکن جب کسی حادثے یا واقعہ کی وجہ سے محبت کی جگہ نفرت لے لیتی ہے تو اس شخص کی نگاہوں کا زاویہ اور دل کا سانچہ اس طرح تبدیل ہوتا ہے کہ اب اس کی اچھی باتیں بھی اس کو بری لگنے لگتی ہیں جس کا ایک نظر دیکھ لینا کبھی اس کے لیے راحت بخش ہوتا تھا اب اس کا نام لینا بھی اسے گوارا نہیں ہوتا۔ بقول شاعر

وہی کافر کہ جس کا نام تسکین دل و جاں تھا
ستم ہے اب اسی کے نام سے تکلیف ہوتی ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی صحیح یا غلط راستے کو اختیار کرنے کے لیے بنیادی کردار جو چیز ادا کرتی ہے وہ دل اور نگاہوں کا صحیح سمت میں کام کرنا ہے جب ان کی سمت بدل جاتی ہے اور زاویہ ٹیڑھا ہو جاتا ہے تو پھر ہزار کوشش کرو صحیح بات بھی سمجھ میں آنا مشکل ہو جاتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کسی کا منہ کا ذائقہ بگڑ جائے تو اسے شہد بھی کڑوا معلوم ہوتا ہے تو اللہ کے دین اور پیغمبر کی دعوت کے بارے میں جب کوئی قوم طغیانی اور سرکشی میں مبتلا ہو کر اور مسلسل اس کی اسیر رہ کر اپنی دماغی قوتوں ، قلبی توانائیوں اور بصیرتوں کو زنگ آلود کر لیتی ہے تو اللہ کا قانون حرکت میں آتا ہے۔ اور اسے ایمان سے محروم کر دیا جاتا ہے اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ غیر مسلموں کے ایمان لانے کی خواہش جو مسلسل آپکے دلوں میں چٹکیاں لے رہی ہے اس کا وجود مبارک سہی لیکن جن لوگوں کے لیے آپ اس کی خواہش رکھتے ہیں انھوں نے اپنے طرز عمل سے اللہ کے قانون کو دعوت دی اور آخر کار وہ اس کے قانون کی گرفت میں ایسے آئے کہ ایمان سے محروم کر دیئے گئے اس لیے اب اگر انھیں ہزاروں نشانیاں بھی دکھادی جائیں تب بھی ان کے ایمان لانے کی امید نہیں کی جا سکتی۔

(روح القرآن۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

آیت مبارکہ :

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ○۱۱۱

لغۃ القرآن: وَلَوْ : اور اگر] [اَنَّنَا : یقینا ہم] [نَزَّلْنَآ : نازل کرتے] [اِلَيْهِمُ : ان کی طرف] [الْمَلٰٓئِكَةَ : فرشتوں] [وَكَلَّمَهُمُ : اور کلام کرتے ان سے] [الْمَوْتٰى : مردوں کو

] [وَحَشَرْنَا : اور ہم اکٹھا کردیتے] [عَلَيْهِمْ : ان پر] [كُلَّ : ہر] [شَيْءٍ : چیز] [قُبُلًا : سامنے] [مَا : نہیں] [كَانُوْا : تھے سب] [لِيُؤْمِنُوْٓا : سب ایمان لاتے] [اِلَّآ : مگر] [اَنْ : کہ] [يَّشَاۗءَ : چاہتا] [اللّٰهُ : اللہ] [وَلٰكِنَّ : اور لیکن] [اَكْثَرَهُمْ : ان میں سے اکثر] [يَجْهَلُوْنَ : سب جہالت سے کام لیتے ہیں]

ترجمہ : اور اگر ہم ان کی طرف فرشتے اتار دیتے اور ان سے مردے باتیں کرنے لگتے اور ہم ان پر ہر چیز (آنکھوں کے سامنے) گروہ در گروہ جمع کردیتے وہ تب بھی ایمان نہ لاتے سوائے اس کے جو اللہ چاہتا اور ان میں سے اکثر لوگ جہالت سے کام لیتے ہیں

تشریح:

پچھلی آیت میں اجمالی طور پر بیان ہوا تھا کہ نشانیاں طلب کرنے والے کفار کے مطالبات پورے کردیئے جائیں تو بھی وہ ایمان نہ لائیں گے اور اس آیت مبارکہ میں اس اجمال کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔

شان نزول

کفار مکہ تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے مذاق کے طور پر کہا کرتے کہ اگر آپ سچے ہیں تو ہمارے مردوں کو زندہ کردیجئے تاکہ ہم ان سے پوچھیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو فرماتے ہیں وہ حق ہے یا نہیں اور آپ ہمیں فرشتے دکھایئے جو ہمارے سامنے آپ کے رسول ہونے کی گواہی دیں یا اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لایئے۔ ان کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

اور فرمایا گیا کہ "اے محبوب ! اگر ہم کفار کے مطالبے کے مطابق ان کی طرف فرشتے اتار دیں جنہیں وہ ان کی اصلی شکل میں دیکھ لیں اور وہ ان سے آپ کی رسالت کی گواہی سن لیں۔ یونہی اگر ہم ان کے مطلوبہ یا عام مردے زندہ کرکے ان کے سامنے کھڑے کردیں تاکہ یہ ان سے معلوم کرلیں کہ آپ جو پیغام لائے ہیں وہ حق ہے یا نہیں تب بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے، بلکہ اگر ہم ان کے مطالبات سے زائد مخلوقات میں سے ہر خشک و تر، شجر و حجر، نباتات و حیوانات ان کے سامنے جمع کردیں تب بھی یہ لوگ ایمان لائیں گے اور نہ آپ کی تصدیق کریں گے اور نہ ہی آپ کی پیروی کریں گے البتہ جن کی قسمت میں ایمان لکھا ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی مرضی جن کے ایمان کے متعلق ہوگی وہ ایمان لائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت سے متعلق دو اہم مسائل

اس مقام پر دو اہم مسائل ذہن نشین رکھیں :

(1)-- اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو پیدا فرمایا اور جیسا ہونے والا تھا اور جیسا کوئی کرنے والا تھا وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں تھا اور اس نے وہی لکھ دیا، تو یہ نہیں کہ جیسا اس نے لکھ دیا ویسا ہم کو کرنا پڑتا ہے بلکہ جیسا ہم کرنے والے تھے ویسا اس نے لکھ دیا، زید کے ذمے برائی لکھی اس لیے کہ زید برائی کرنے والا تھا اگر زید بھلائی کرنے والا ہوتا تو وہ اس کے لیے بھلائی لکھتا تو اللہ تعالیٰ کے علم یا اس کے لکھ دینے نے کسی کو مجبور نہیں کر دیا۔

(2)-- یہ درست ہے کہ بندوں کے تمام افعال اللہ تعالیٰ کے ارادہ، اس کی مشیت اور اس کی قضاء سے وجود پذیر ہوتے ہیں لیکن قادر و قدیر رب عَزَّوَجَلَّ نے انسان کو پتھر اور دیگر جمادات کی طرح بے بس، مجبور اور بالکل بے اختیار نہیں بنایا بلکہ اسے ایک قسم کا اختیار دیا ہے کہ کوئی کام چاہے تو کرے، چاہے نہ کرے اور اس کے ساتھ عقل بھی دی ہے کہ اپنا برا بھلا، نفع و نقصان پہچان سکے، پھر نیکی یا بدی، اچھائی یا برائی میں سے جس کام کو اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی قوت اس انسان میں پیدا فرما دیتا ہے اور اسی اختیار کے اعتبار سے وہ جزا و سزا کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اگر انسان نیکی یا بدی، اچھائی یا برائی پر کوئی اختیار ہی نہیں رکھتا تو انبیاء کرام (علیہ السلام) کو ہدایت کے لیے مبعوث فرمانا، انسان کو احکام کا مُکَلَّف کرنا اور اسے اس کے اعمال کی جزاء و سزا دینا سب بے معنی اور عبث ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کا کوئی کام عبث نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایمان وہی لائیں گے جن کے ایمان کا اللہ تعالیٰ ارادہ فرمائے گا اور کفر وہی کریں گے جن کے کفر کا اللہ تعالیٰ ارادہ فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ ان کے کفر کا اس لیے ارادہ فرماتا ہے کہ وہ کفر کو اختیار کرتے ہیں۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

ایمان کے لیے قبولیت کی جس استعداد کی ضرورت ہے یہ اس سے محروم کیے جا چکے۔ ہاں اب اگر یہ ایمان لا سکتے ہیں تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ اللہ یہ چاہے کہ یہ لوگ ایمان لے آئیں لیکن اللہ کا چاہنا اور اس کی مشیت اس کی حکمت سے الگ نہیں۔ جس بات کو اس کی حکمت چاہتی ہے اسی بات کا تقاضا اس کی مشیت کرتی ہے اور اس کی حکمت نے رد و قبول کے جو پیمانے بنا دیئے ہیں اور مشیت کے جو ضابطے مقرر کر دیئے ہیں ظاہر ہے مشیت اس کے خلاف کبھی کام نہیں کرتی ہم بار بار یہ بات پڑھ چکے ہیں کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ ایمان اسے نصیب ہوتا ہے جس کے دل میں ایمان لانے کی خواہش ہوتی ہے پھر وہ اس خواہش کو بروئے کار لانے کے لیے محنت کرتا ہے اور اللہ سے توفیق مانگتا ہے لیکن جو آدمی ان بنیادی صفات سے عاری ہو جاتا ہے اللہ کی مشیت کبھی اس کے حسب حال نہیں ہوتی۔ اس کو بالکل اسی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ نے انسانی اعضاء میں کام کرنے کی صلاحیت پیدا فرمائی ہے۔ ہاتھ میں پکڑنے کی طاقت ہے 'آنکھ میں دیکھنے کی 'کان میں سننے کی 'ناک میں سونگھنے کی اور دل میں دھڑکنے کی۔ لیکن یہ طاقت اس وقت تک کام کرتی ہے جب تک ان اعضاء کو کام کرنے کا موقع دیا جائے اور آمادہ حرکت رکھا جائے اور اگر ان میں سے کوئی سا عضو بھی معطل کر کے رکھ دیا جائے۔ مثلاً ہاتھ باندھ دیا جائے تو ایک عرصہ گزرنے کے بعد آپ دیکھیں گے کہ ہاتھ مفلوج ہو گیا ہے کیونکہ اس کے کام کرنے کی صلاحیت کا دار و مدار اس بات پر تھا کہ اسے نہ صرف کام کرنے دیا جاتا بلکہ صحیح طریقے سے اور حدود میں رہ کر اس سے کام لیا جاتا۔ یہی حال انسان کے دل و دماغ کی قوتوں کا ہے جب تک ان سے صحیح طریقے سے اور فطری حدود میں رہ کر کام لیا جاتا ہے تو وہ اللہ کو 'اللہ کے رسولوں کو اور صراط مستقیم کو پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کرتا لیکن جب سرکشی اور طغیان سے ان کا زاویہ بدل دیا جاتا ہے اور ان کی نہج تبدیل کر دی جاتی ہے تو پھر اللہ کا قانون حرکت میں آتا ہے تو اللہ کی مشیت ان کی ایمان سے محرومی کا فیصلہ کر دیتی ہے اب ان لوگوں کی محرومی کا چونکہ فیصلہ ہو چکا اب یہ اپنے طور پر تو کبھی ایمان نہیں لے سکتے اب ایک ہی راستہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا قانون واپس لے کر زبردستی ان کو ایمان سے نواز دے اور یہ ظاہر ہے اللہ کی مشیت کے خلاف ہے وہ جس طرح کسی کو زبردستی

کافر نہیں بناتا اسی طرح وہ کسی کو زبردستی ایمان بھی نہیں دیتا لیکن لوگ چونکہ ان حقائق سے بے خبر ہیں اس لے وہ اپنی جہالت سے قسم قسم کی باتیں کہتے اور سنتے ہیں لیکن اگر یہ حقیقت پیش نظر رہے تو پھر وہ ہر چیز کو اس کے محمل میں رکھنے کا ہنر سیکھ جائیں۔

(روح القرآن۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

قرآن مجید جو دین پیش کرتا ہے کوئی گھڑا ہوا زبردستی کا دین نہیں۔ یہ وہ راستہ ہے جس کی بات کو انسان کی عقل ذرا سی توجہ سے سمجھ سکتی ہے کہ واقعی انسان کی بہتری کے لیے یہی راستہ درست ہے جب تک انسان کا علم اس کی عقل کی راہ نمائی کے لیے نہ تھا۔ ان کو معجزے دکھا کر صحیح دین کی طرف بلایا جاتا تھا لیکن اب جب کہ انسان کا علم کافی ترقی کر گیا ہے اور آگے اور بھی ترقی کی امید ہے۔ انسان کی عقل اس کی روشنی میں انسان کے بھلے برے میں اچھی طرح تمیز کر سکتی ہے۔ اس لیے لوگوں سے کہا گیا کہ قرآن مجید کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق غور کرو۔ وہ تمہیں سچائی کے پہچاننے کی کافی نشانیاں بتادے گا۔ اب دین کو سمجھنے کے لیے کسی عجیب و غریب کرشمے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن کریم ہی تاحیات معجزہ ہے۔

(درس آسٹریلیا)

آیت مبارکہ :

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

لغۃ القرآن: وَكَذٰلِكَ : اور اسی طرح] [جَعَلْنَا : ہم نے مقرر کیا] [لِكُلِّ : کے لیے] [نَبِيٍّ : نبی] [عَدُوًّا : دشمن] [شَيٰطِيْنَ : شیطانوں کو] [الْاِنْسِ : آدمیوں] [وَالْجِنِّ : اور جنوں] [يُوْحِيْ : دل میں ڈالتے ہیں] [بَعْضُهُمْ : ان میں سے بعض] [اِلٰی : کی طرف] [بَعْضٍ : بعض کے] [زُخْرُفَ : ملمع کی ہوئی] [الْقَوْلِ : بات] [غُرُوْرًا : فریب کاری کا] [وَلَوْ : اور اگر] [شَآءَ : وہ چاہے] [رَبُّكَ : تمہارے رب نے] [مَا : نہیں] [فَعَلُوْهُ : وہ سب کرتے اسے] [فَذَرْهُمْ : پس چھوڑ دو انہیں] [وَمَا : اور جو] [يَفْتَرُوْنَ : وہ سب گھڑتے رہتے]

ترجمہ : اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسانوں اور جنّوں میں سے شیطانوں کو دشمن بنادیا جو ایک دوسرے کے دل میں ملمع کی ہوئی (چکنی چپڑی) باتیں (وسوسہ کے طور پر) دھوکہ دینے کے لیے ڈالتے رہتے ہیں، اور اگر آپ کا رب (انہیں جبراً روکنا) چاہتا (تو) وہ ایسا نہ کر پاتے، سو آپ انھیں (بھی) چھوڑ دیں اور جو کچھ وہ بہتان باندھ رہے ہیں (اسے بھی)

تشریح:

کفار مکہ کی مخالفت اور ایذارسانیوں کی وجہ سے سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بہت رنجیدہ تھے، اس پر اللہ تعالیٰ اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دیتے ہوئے فرمارہا ہے کہ اے حبیب! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، جس طرح یہ کفار آپ کی مخالفت اور دشمنی میں سرگرم ہیں اسی طرح آپ سے پہلے جتنے انبیاء اور رُسُل (علیہ السلام) گزرے ہیں سب کی قوم کے کافر چاہے انسان ہوں یا جن ان کے دشمن تھے۔ کفار کی انبیاء ورسل (علیہ السلام) سے عداوت اور مخالفت ہماری طرف سے ایک آزمائش ہے تاکہ انبیاء و مرسلین (علیہ السلام) اس پر صبر کرکے اجر عظیم حاصل کریں لہٰذا آپ اپنی قوم کی مخالفت اور عداوت سے رنجیدہ خاطر نہ ہوں، یہ ایک دوسرے کو دھوکے میں رکھنے کیلئے نت نئی باتیں گھڑتے ہیں، چالیں چلتے ہیں، فریب کاریاں کرتے ہیں اور وسوسے ڈالتے ہیں تاکہ دوسروں کو گمراہ کریں اور جو گمراہ ہیں وہ گمراہی سے نکل نہ سکیں۔ نیز یہاں بھی ملحوظ خاطر رہے کہ اگر اللہ عَزَّوَجَلَّ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے لیکن اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے نظام کائنات چلارہا ہے اور کفر وایمان، خیر وشر دونوں کے مدِّمقابل رہنے میں اس کی حکمتیں ہیں لہٰذا آپ انھیں اور ان کی دھوکے اور فریب کی خوشنما باتوں کو چھوڑ دیں اور صبر کریں، اللہ عَزَّوَجَلَّ انھیں بدلہ دے گا، رسوا کرے گا اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مدد فرمائے گا۔ آیت مبارکہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تمام نبیوں کے دشمن ضرور ہوئے ہیں ایسے ہی علماء اور اولیاء کے دشمن بھی ضرور ہی ہوتے ہیں۔

{شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ: انسانوں اور جنوں کے شیطان۔} اس کی تفسیر میں علماء کے دو قول ہیں (1) جنوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں اور انسانوں میں بھی کیونکہ شیطان ہر سرکش و نافرمان کو کہتے ہیں چاہے وہ انسان ہو یا جن۔ (2) جنوں اور انسانوں کے شیطان سے مراد ابلیس کی اولاد ہے۔ ابلیس نے اپنی اولاد کو دو حصوں میں تقسیم کردیا ایک گروہ انسانوں کو وسوسہ ڈالتا ہے اور ایک گروہ جنوں کو وسوسہ ڈالتا ہے۔ (1) خفیہ بات سے مراد وسوسے اور فریب کی باتیں ہیں۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ انسانی شیطانوں سے بچیں

اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوا کہ جو گمراہ کن شخص کسی کو شریعت کے خلاف کام کی ترغیب دے وہ انسانی شیطان ہے اگرچہ وہ اپنے عزیزوں میں سے ہو یا عالم کے لباس میں ہو، نیز اس میں وہ تمام لوگ داخل ہیں جو آزاد خیالی یا روشن خیالی کے نام پر شرعی کاموں کے خلاف پلاننگ کرتے اور منصوبے بناتے اور اس کیلئے تنظیمیں بناتے ہیں۔ سب مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ایسے انسانی شیطانوں سے خود بھی بچیں اور دوسروں کو بھی بچائیں۔ یہاں ایک نہایت اہم چیز کے بارے میں عرض کرنی ہے کہ ہمارے دور میں یہ وبا عام ہوتی جارہی ہے کہ بھائی ہر ایک کی سنو اور تحقیق کرو خواہ کہنے والا قرآن کے خلاف کہے یا حدیث کے یا اسلام کے۔ گویا معاذاللہ، تحقیق، مطالعہ کے نام پر ہر گمراہی سننے، پڑھنے کی

ترغیب دی جارہی ہے اور اس چیز کو باہمی رواداری، ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش، ایک دوسرے کے نکتہ نظر پر مطلع ہونا، اپنے اپنے خیالات دوسروں سے شیئر کرنا وغیرہ وغیرہ کے بڑے دلچسپ نام دیئے جاتے ہیں لیکن کیا قرآن، حدیث، دین، ایمان، اسلام میں بھی اس چیز کی گنجائش ہے یا نہیں، اس کی طرف کوئی نہیں دیکھتا۔ لہٰذا یہاں پر ہم قرآن و حدیث کی روشنی میں ایسی باطل تحقیق و مطالعہ کا حکم شرعی بیان کرتے ہیں اور ہمیں ان جاہلوں کی کوئی پرواہ نہیں جو قرآن و حدیث کے ان احکام کو اپنی جہالت و کوتاہ نظر سے تنگ نظری اور نجانے کیا کیا نام دیں گے۔ چنانچہ کفار و اسلام دشمن لوگوں کے لیکچرز سننے کے حوالے سے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان (رح) سے سوال ہوا تو آپ نے بڑے احسن انداز میں جواب ارشاد فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "آج کل ہمارے عوام بھائیوں کی سخت جہالت یہ ہے کہ کسی آریہ نے اشتہار دیا کہ اسلام کے فلاں مضمون کے رد میں فلاں وقت لیکچر دیا جائے گا، یہ سننے کیلئے دوڑے جاتے ہیں۔ کسی پادری نے اعلان کیا کہ نصرانیت کے فلاں مضمون کے ثبوت میں فلاں وقت ندا ہوگی، یہ سننے کیلئے دوڑے جاتے ہیں۔ بھائیو! تم اپنے نفع نقصان کو زیادہ جانتے ہو یا تمہارا رب عَزَّوَجَلَّ اور تمہارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ان کا حکم تو یہ ہے کہ شیطان تمہارے پاس وسوسہ ڈالنے آئے تو سیدھا جواب یہ دے دو کہ تو جھوٹا ہے نہ یہ کہ تم آپ دوڑ دوڑ کے ان کے پاس جاؤ اور اپنے رب عَزَّوَجَلَّ، اپنے قرآن اور اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شان میں ملعون کلمات سنو۔ تم قرآن مجید کی اسی آیت کا آخری حصہ اور اس کے مُتّصل کی آیات کریمہ تلاوت کرتے جاؤ اور دیکھو کہ قرآن عظیم تمہاری اس حرکت کی کیسی کیسی شناعتیں بتاتا اور ان ناپاک لکچروں نداؤں کی نسبت تمہیں کیا کیا ہدایت فرماتا ہے، چنانچہ اس آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ"

اور تیرا رب چاہتا تو وہ یہ دھوکے بناوٹ کی باتیں نہ بناتے پھرتے تو تو انھیں اور ان کے بہتانوں کو یک لخت چھوڑ دے۔
دیکھو! اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انھیں اور ان کی باتوں کو چھوڑنے کا حکم فرمایا یا ان کے پاس سننے کے لیے دوڑنے کا۔ اور سنئے، اس کے بعد کی آیت میں فرماتا ہے اپنے قرآن اور اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شان میں ملعون کلمات سنو۔ تم قرآن مجید کی اسی آیت کا آخری حصہ اور اس کے مُتّصل کی آیات کریمہ تلاوت کرتے جاؤ اور دیکھو کہ قرآن عظیم تمہاری اس حرکت کی کیسی کیسی شناعتیں بتاتا اور ان ناپاک لکچروں نداؤں کی نسبت تمہیں کیا کیا ہدایت فرماتا ہے، چنانچہ اس آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ

اور تیرا رب چاہتا تو وہ یہ دھوکے بناوٹ کی باتیں نہ بناتے پھرتے تو تو انھیں اور ان کے بہتانوں کو یک لخت چھوڑ دے۔
دیکھو! اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انھیں اور ان کی باتوں کو چھوڑنے کا حکم فرمایا یا ان کے پاس سننے کے لیے دوڑنے کا۔ اور سنئے، اس کے بعد کی آیت میں فرماتا ہے:

"وَلِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ"

اور اس لیے کہ ایسے لوگوں کے دل اس کی طرف کان لگائیں جنہیں آخرت پر ایمان نہیں اور اسے پسند کریں اور جو کچھ ناپاکیاں وہ کر رہے ہیں یہ بھی کرنے لگیں۔

دیکھو اُن (کفار و نافرمان لوگوں) کی باتوں کی طرف کان لگانا اُن (لوگوں) کا کام بتایا جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اس کا نتیجہ یہ فرمایا کہ وہ ملعون باتیں ان پر اثر کر جائیں اور یہ بھی ان جیسے ہو جائیں۔ لوگ اپنی جہالت سے گمان کرتے ہیں کہ ہم اپنے دل سے مسلمان ہیں ہم پر ان کا کیا اثر ہوگا حالانکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں "جو دجال کی خبر سنے اس پر واجب ہے کہ اس سے دور بھاگے کہ خدا کی قسم آدمی اس کے پاس جائے گا اور یہ خیال کرے گا کہ میں تو مسلمان ہوں یعنی مجھے اس سے کیا نقصان پہنچے گا وہاں اس کے دھوکوں میں پڑ کر اس کا پیرو ہو جائے گا۔

کیا دجال ایک اسی اخبث دجال کو سمجھتے ہو جو آنے والا ہے، ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ تمام گمراہوں کے داعی منادی سب دجال ہیں اور سب سے دور بھاگنے ہی کا حکم فرمایا اور اس میں یہی اندیشہ بتایا ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں "آخر زمانے میں دجال کذاب لوگ ہوں گے کہ وہ باتیں تمہارے پاس لائیں گے جو نہ تم نے سنیں نہ تمہارے باپ دادا نے، تو ان سے دور رہو اور انھیں اپنے سے دور رکھو کہیں وہ تمہیں گمراہ نہ کر دیں کہیں تمہیں فتنہ میں نہ ڈال دیں۔ (4) اور سنئے، اس کے بعد کی آیات میں فرماتا ہے "وَلِتَصۡغٰۤی اِلَیۡهِ اَفۡـِٕدَةُ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ وَلِیَرۡضَوۡهُ وَلِیَقۡتَرِفُوۡا مَا هُمۡ مُّقۡتَرِفُوۡنَ"

اور اس لیے کہ ایسے لوگوں کے دل اس کی طرف کان لگائیں جنہیں آخرت پر ایمان نہیں اور اسے پسند کریں اور جو کچھ ناپاکیاں وہ کر رہے ہیں یہ بھی کرنے لگیں۔

دیکھو اُن (کفار و نافرمان لوگوں) کی باتوں کی طرف کان لگانا اُن (لوگوں) کا کام بتایا جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اس کا نتیجہ یہ فرمایا کہ وہ ملعون باتیں ان پر اثر کر جائیں اور یہ بھی ان جیسے ہو جائیں۔ لوگ اپنی جہالت سے گمان کرتے ہیں کہ ہم اپنے دل سے مسلمان ہیں ہم پر ان کا کیا اثر ہوگا حالانکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں "جو دجال کی خبر سنے اس پر واجب ہے کہ اس سے دور بھاگے کہ خدا کی قسم آدمی اس کے پاس جائے گا اور یہ خیال کرے گا کہ میں تو مسلمان ہوں یعنی مجھے اس سے کیا نقصان پہنچے گا وہاں اس کے دھوکوں میں پڑ کر اس کا پیرو ہو جائے گا۔

کیا دجال ایک اسی اخبث دجال کو سمجھتے ہو جو آنے والا ہے، ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ تمام گمراہوں کے داعی منادی سب دجال ہیں اور سب سے دور بھاگنے ہی کا حکم فرمایا اور اس میں یہی اندیشہ بتایا ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں "آخر زمانے میں دجال کذاب لوگ ہوں گے کہ وہ باتیں تمہارے پاس لائیں گے جو نہ تم نے سنیں نہ تمہارے باپ دادا نے، تو ان سے دور رہو اور انھیں اپنے سے دور رکھو کہیں وہ تمہیں گمراہ نہ کر دیں کہیں تمہیں فتنہ میں نہ ڈال دیں۔ اور سنئے، اس کے بعد کی آیات میں فرماتا ہے:

"اَفَغَیۡرَ اللّٰهِ اَبۡتَغِیۡ حَکَمًا وَّهُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ اِلَیۡکُمُ الۡکِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَالَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰهُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنۡ رَّبِّکَ بِالۡحَقِّ فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ﴿۱۱۴﴾ وَتَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۱۱۵﴾ وَاِنۡ تُطِعۡ اَکۡثَرَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ یُضِلُّوۡکَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ؕ اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا یَخۡرُصُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعۡلَمُ مَنۡ یَّضِلُّ عَنۡ سَبِیۡلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِیۡنَ ﴿۱۱۷﴾

تو کیا اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا ڈھونڈوں حالانکہ اس نے مفصل کتاب تمہاری طرف اتاری اور اہل کتاب خوب جانتے ہیں کہ وہ تیرے رب کے پاس سے حق کے ساتھ اتری تو خبردار تو شک نہ کرنا اور تیرے رب کی بات سچ اور انصاف میں کامل ہے کوئی اس کی باتوں کا

بدلنے والا نہیں اور وہ شنوا و دانا ہے اور زمین والوں میں زیادہ وہ ہیں کہ تو ان کی پیروی کرے تو وہ تجھے خدا کی راہ سے بہکا دیں وہ تو گمان کے پیرو ہیں اور نری اٹکلیں دوڑاتے ہیں بیشک تیرا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بہکے گا اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو۔"

یہ تمام آیات کریمہ انھیں مطالب کے سلسلہ بیان میں ہیں گویا ارشاد ہوتا ہے تم جو ان شیطان آدمیوں کی باتیں سننے جاؤ کیا تمہیں یہ تلاش ہے کہ دیکھیں اس مذہبی اختلاف میں یہ لکچرار یا یہ منادی کیا فیصلہ کرتا ہے، ارے خدا سے بہتر فیصلہ کس کا ! اس نے مفصل کتاب قرآن عظیم تمہیں عطا فرمادی اس کے بعد تم کو کسی لکچر، ندا کی کیا حاجت ہے لکچر والے جو کسی دینی کتاب کا نام نہیں لیتے کس گنتی شمار میں ہیں ! یہ کتاب والے دل میں خوب جانتے ہیں کہ قرآن حق ہے (مگر) تَعَصُّب کی پٹی (ان کی) آنکھوں پر بندھی ہے کہ ہٹ دھرمی سے مکرے جاتے ہیں تو تجھے کیوں شک پیدا ہو کہ ان کی سننا چاہے، تیرے رب کا کلام صدق وعدل میں بھرپور ہے کل تک جو اس پر تجھے کامل یقین تھا آج کیا اس میں فرق آیا کہ اس پر اعتراض سننا چاہتا ہے کیا خدا کی باتیں کوئی بدل سکتا ہے، یہ نہ سمجھنا کہ میرا کوئی مقال (یعنی قول)، کوئی خیال خدا سے چھپ رہے گا، وہ سنتا جانتا ہے، دیکھ اگر تو نے ان کی سنی تو وہ تجھے خدا کی راہ سے بہکا دیں گے، (اے نادان ! تو) کیا یہ خیال کرتا ہے کہ ان (گمراہ لوگوں) کا علم دیکھوں (کہ) کہاں تک ہے، یہ کیا کہتے ہیں ارے ان کے پاس علم کہاں وہ تو اپنے اوہام کے پیچھے لگے ہوئے اور نری اٹکلیں دوڑاتے ہیں جن کا تھل نہ بیڑا، جب اللہ واحد قہار کی گواہی ہے کہ ان کے پاس نری مہمل اٹکلوں کے سوا کچھ نہیں تو ان کو سننے کے کیا معنی ؟ سننے سے پہلے وہی کہہ دے جو تیرے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تعلیم فرمایا کہ "شیطان تو جھوٹا ہے "اور اس گھمنڈ میں نہ رہنا کہ مجھ کو کیا گمراہ کریں گے میں تو راہ پر ہوں تیرا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بہکے گا اور کون راہ پر ہے، (اگر) تُو پورا راہ پر ہوتا ہے تو بے راہوں کی سننے ہی کیوں جاتا حالانکہ تیرا رب فرما چکا "چھوڑ دے انھیں اور ان کے بہتانوں کو۔ تیرے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرما چکے "ان سے دور رہو اور ان کو اپنے سے دور کرو کہیں وہ تم کو بہکا نہ دیں کہیں وہ تم کو فتنے میں نہ ڈال دیں۔

بھائیو ! ایک سہل بات ہے اس پر غور فرمالو۔ تم اپنے رب عَزَّوَجَلَّ، اپنے قرآن اور اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر سچا ایمان رکھتے ہو یا مَعَاذَاللہ اس میں کچھ شک ہے ! اور جسے شک ہو اسے اسلام سے کیا علاقہ (یعنی تعلق) وہ ناحق اپنے آپ کو مسلمان کہہ کر مسلمانوں کو کیوں بدنام کرے اور اگر سچا ایمان ہے تو اب یہ فرمایئے کہ ان کے لکچروں نداؤں میں آپ کے رب عَزَّوَجَلَّ، قرآن، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ایمان کی تعریف ہوگی یا مذمت۔ ظاہر ہے کہ دوسری ہی صورت ہوگی اور اسی لیے تم کو بلاتے ہیں کہ تمہارے منہ پر تمہارے خدا، نبی، قرآن اور دین کی توہین وتکذیب کریں۔ اب ذرا غور کرلیجئے کہ ایک شریر نے زید کے نام اشتہار دیا کہ فلاں وقت فلاں مقام پر میں بیان کروں گا کہ تیرا باپ حرامی بچہ اور تیری ماں زانیہ تھی، خدا کے لیے انصاف، کیا کوئی غیرت والا، حمیت والا اور انسانیت والا جبکہ اسے اس بیان سے روک دینے، باز رکھنے پر قادر نہ ہو اسے سننے جائے گا۔ خدا کی قسم ! ہرگز نہیں، کسی بھنگی چمار سے بھی یہ نہ ہوسکے گا پھر ایمان کے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھو کہ اللہ، رسول اور قرآن عظیم کی توہین، تکذیب اور مذمت سخت تر ہے یا ماں باپ کی گالی۔ ایمان رکھتے ہو تو اسے اس سے کچھ نسبت نہ جانو گے۔ پھر کون سے کلیجے سے ان جگر شگاف، ناپاک، ملعون بہتانوں، افتراؤں، شیطانی اٹکلوں اور ڈھکوسلوں کو سننے جاتے ہو، بلکہ حقیقت اور ـــ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ وہ جو کچھ بکتے اور اللہ، رسول اور قرآن عظیم کی تحقیر کرتے ہیں ان سب کا باعث یہ سننے والے ہیں، اگر مسلمان اپنا ایمان سنبھالیں، اپنے رب، قرآن اور رسول کی عزت عظمت پیش نظر رکھیں اور ایکا کرلیں کہ وہ خبیث لکچر، گندی ندائیں سننے کوئی نہ جائے گا جو وہاں موجود ہو وہ بھی فوراً وہی مبارک ارشاد کا کلمہ کہہ کر کہ "تو جھوٹا ہے "چلا جائے گا تو کیا وہ دیواروں پتھروں سے اپنا سر

پھوڑیں گے ؟ تو تم سن سن کر کہلواتے ہو ، نہ تم سنو نہ وہ کہیں ، پھر انصاف کیجئے کہ اس کہنے کا وبال کس پر ہوا۔ علماء فرماتے ہیں " ہٹے کٹے جوان تندرست جو بھیک مانگنے کے عادی ہوتے اور اسی کو اپنا پیشہ بنالیتے ہیں انھیں دینا ناجائز ہے کہ اس میں گناہ پر شہ دینی ہے، لوگ نہ دیں تو جھک ماریں اور محنت مزدوری کریں۔ بھائیو ! جب اس میں گناہ کی امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ ہے تو اس میں تو کفر کی مدد ہے۔ قرآن عظیم کی نصِ قطعی نے ایسی جگہ سے فوراً ہٹ جانا فرض کر دیا اور وہاں ٹھہرنا فقط حرام ہی نہ فرمایا بلکہ سنو تو کیا ارشاد کیا۔ رب عَزَّوَجَلَّ فرماتا ہے :

"وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ﴿۱۴۰﴾"

یعنی بیشک اللہ تم پر قرآن میں حکم اتار چکا کہ جب تم سنو کہ خدا کی آیتوں سے انکار ہوتا اور ان کی ہنسی کی جاتی ہے تو ان لوگوں کے پاس نہ بیٹھو جب تک وہ اور باتوں میں مشغول نہ ہوں اور تم نے نہ مانا اور جس وقت وہ اللہ کی آیات پر اعتراض کر رہے ہیں وہاں بیٹھے تو جب تم بھی انھیں جیسے ہو، بیشک اللہ تعالیٰ منافقوں اور کافروں سب کو جہنم میں اکٹھا کرے گا۔
دیکھو قرآن فرماتا ہے، ہاں تمہارا رب رحمٰن فرماتا ہے جو ایسے جلسوں میں جائے ایسی جگہ کھڑا ہو وہ بھی انھیں کافروں آریوں پادریوں کی مثل ہے
آہ آہ حرام تو ہر گناہ ہے یہاں تو اللہ واحد قہار یہ فرمارہا ہے کہ وہاں ٹھہرے تو تم بھی انھیں جیسے ہو۔ مسلمانو ! کیا قرآن عظیم کی یہ آیات تم نے منسوخ کر دیں یا اللہ عَزَّوَجَلَّ کی اس سخت وعید کو سچا نہ سمجھے یا کافروں جیسا ہونا قبول کر لیا۔ اور جب کچھ نہیں تو ان جمگھٹوں کے کیا معنی ہیں جو آریوں پادریوں کے لکچروں نداؤں پر ہوتے ہیں ان جلسوں میں شرکت کیوں ہے جو خدا، رسول اور قرآن پر اعتراضوں کیلئے کئے جاتے ہیں۔
بھائیو ! میں نہیں کہتا قرآن فرماتا ہے کہ "اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ "تم بھی ان ہی جیسے ہو۔ "اُن لکچروں پر جمگھٹ والے ان جلسوں میں شرکت والے سب انھیں کافروں کے مثل ہیں، وہ علانیہ بک کر کافر ہوئے یہ زبان سے کلمہ پڑھیں اور دل میں خدا، رسول اور قرآن کی اتنی عزت نہیں کہ جہاں ان کی توہین ہوتی ہو وہاں سے بچیں تو یہ منافق ہوئے جب تو فرمایا کہ اللہ انھیں اور انھیں سب کو جہنم میں اکٹھا کرے گا کہ یہاں تم لکچر دو اور تم سنو۔
مسلمان اگر قرآن عظیم کی اس نصیحت پر عمل کریں تو ابھی ابھی دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے سب بازار ٹھنڈے ہوئے جاتے ہیں، ملک میں ان کے شور و شر کا نشان نہ رہے گا، جہنم کے کندے شیطان کے بندے آپس ہی میں ٹکرا ٹکرا کر سر پھوڑیں گے، اللہ، رسول اور قرآن عظیم کی توہینوں سے مسلمانوں کا کلیجا پکانا چھوڑیں گے، اور اپنے گھر بیٹھ کر بکے بھی تو مسلمانوں کے کان تو ٹھنڈے رہیں گے۔
(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

انسانوں اور جنوں میں سے شیاطین (سرکشوں) کا ہونا

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جس طرح ہم نے انبیاء سابقین (علیہم السلام) کے لیے سرکش اور شیطان انسانوں اور جنوں کو دشمن بنادیا تھا ' اسی طرح آپ کے لیے بھی سرکش اور شیطان انسانوں اور جنوں کو دشمن بنادیا ہے۔

اس آیت میں "شیاطین الانس والجن "۔ فرمایا ہے۔ اس کی دو تفسیریں ہیں۔ ایک تفسیر یہ ہے کہ شیطان سے مراد سرکش ہے اور انسانوں اور جنوں میں سے بعض سرکش ہوتے ہیں اور یہ دونوں مومنوں کو بہکانے اور گمراہ کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ تمام شیطان ابلیس کی اولاد ہیں 'اور اس نے ان کے دو گروہ کردیئے ہیں۔ ایک گروہ انسانوں کو بہکاتا ہے اور دوسرا گروہ جنوں کو بہکاتا ہے اور ان دونوں گروہوں کو شیاطین الانس والجن کہا جاتا ہے لیکن پہلی تفسیر راجح ہے اور اس کی تائید میں یہ حدیث ہے :

امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت ابوامامہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے 'اور صحابہ کا یہ گمان تھا کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے 'اس لیے وہ آپ کے سامنے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ اتنے میں حضرت ابوذر (رض) آکر آپ کے پاس بیٹھ گئے۔ آپ نے فرمایا اے ابوذر ! کیا تم نے آج نماز پڑھ لی ہے انھوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا اب کھڑے ہو کر نماز پڑھو۔ جب انھوں نے چار رکعات چاشت کی نماز پڑھ لی تو آپ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا جنوں اور انسانوں کے شیطانوں سے پناہ طلب کیا کرو 'انھوں نے کہا یا نبی اللہ ! کیا انسانوں کے لیے بھی شیطان ہوتے ہیں 'آپ نے فرمایا ہاں ! جن اور انس کے شیاطین (لوگوں کو) دھوکے میں ڈالنے کے لیے ایک دوسرے کو خوش نما باتیں القا کرتے ہیں۔ الحدیث بطولہ۔ شیخ احمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند حسن ہے۔

(مسند احمد 'ج ۱۶ 'رقم الحدیث : ۲۲۱۸۹ '۲۱۴۳۸ 'طبع دارالحدیث 'قاہرہ 'مسند احمد 'ج ۵ ص ۲۶۶ '۲۶۵ 'طبع قدیم 'سنن النسائی 'ج ۸ ' رقم الحدیث : ۵۵۲۲ 'المعجم الکبیر 'ج ۸ 'رقم الحدیث : ۷۸۷۱ 'مجمع الزوائد 'ج ۳ 'ص ۱۱۵)

وحی 'زخرف القول اور غرور کے معنی

اس آیت میں فرمایا ہے میں سے بعض 'بعض کی طرف غرور (دھوکے) میں مبتلا کرنے کے لیے زخرف القول کی وحی کرتے ہیں۔

وحی کا معنی ہے اشارہ کرنا 'لکھنا اور کلام خفی۔ جب وحی کی نسبت انبیاء (علیہم السلام) کی طرف ہو تو اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کا وہ کلام جو اللہ تعالیٰ انبیاء (علیہم السلام) پر بلاواسطہ یا فرشتے کی وساطت سے نیند یا بیداری میں نازل فرماتا ہے 'اور جب اس کی نسبت عام مسلمانوں کی طرف ہو تو اس سے مراد الہام ہوتا ہے۔ یعنی کسی خیر اور نیک بات کا دل میں ڈالنا اور جب اس کی نسبت شیطان کی طرف ہو جیسا کہ اس آیت میں ہے تو اس کا معنی ہے وسوسہ 'یعنی کسی بری بات یا برے کام کی طرف انسانوں کے دل کو مائل اور راغب کرنا۔ زخرف اس چیز کو کہتے ہیں جس کا باطن باطل 'برائی اور گناہ ہو اور اس کا ظاہر مزین 'خوش نما اور خوب صورت ہو۔ جیسے چاندی پر سونے کا ملمع کرکے اسے سونا بنا کر پیش کیا جائے۔

غرور کے معنی ہیں دھوکا ' مغرور وہ شخص ہے جو کسی چیز کو مصلحت کے مطابق عمدہ اور نفع آور گمان کرے اور در حقیقت وہ اس طرح نہ ہو۔

شیطان کے وسوسہ اندازی کی تحقیق

شیطان کے وسوسہ سے دھوکہ کھانے کی تحقیق یہ ہے کہ جب تک انسان کسی چیز کے متعلق یہ یقین نہ کرے کہ اس میں خیر غالب ہے اور نفع زیادہ ہے ' وہ اس چیز میں رغبت نہیں کرتا اور اس کے حصول کے درپے نہیں ہوتا۔ پھر اگر اس کا یہ یقین واقع کے مطابق ہو تو یہ حق اور صدق ہے اور اگر یہ یقین کسی فرشتے کے القاء کرنے کی وجہ سے ہے ' تو یہ الہام ہے اور اگر اس کا یہ یقین واقع کے مطابق نہیں ہے اور اس کا ظاہر حسین اور مزین ہے اور اس کا باطن فاسد اور باطل ہے ' تو یہ کلام مزخرف ہے۔ اب یا تو اس نے اپنی لاعلمی کی وجہ سے بری چیز کو اچھا اور پیتل کو سونا سمجھ لیا اور یا ارواح خبیثہ نے اس کے دل میں یہ وسوسہ ڈالا ہے اور اس کے ذہن میں برائی کو خوش نما بنا کر پیش کیا ہے ' اور یہی معنی اس آیت میں مراد ہے۔

در حقیقت روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقیین دو قسم کی ہوتی ہیں ' ایک طیب اور طاہر ہوتی ہیں یہ فرشتے ہیں ' اور دوسری ناپاک اور شریر ہوتی ہیں ' یہ شیاطین ہیں۔ ارواح طیبہ جس طرح لوگوں کو نیکی کا حکم دیتی ہیں ' اسی طرح ایک دوسرے کو بھی نیکی کا حکم دیتی ہیں ' اور ارواح خبیثہ جس طرح لوگوں کو برائی کا حکم دیتی ہیں ' اسی طرح ایک دوسرے کو بھی برائی کا حکم دیتی ہیں۔ پھر انسانوں میں جن کی سرشت نیک ہوتی ہے اور ان پر پاکیزگی اور خیر کا غلبہ ہوتا ہے ' ان کی فرشتوں کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے اور ان پر الہام ہوتا ہے اور جن کی سرشت خبیث ہوتی ہے اور ان پر برائی کا غلبہ ہوتا ہے ' ان کی شیطانوں کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے اور ان کے دلوں میں شیطان وسوسے ڈالتے رہتے ہیں۔ پھر انسانوں میں جو زیادہ خبیث اور سرکش ہوتے ہیں ' وہ دوسرے انسانوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کرتے ہیں اور برائیوں کو خوش نما بنا کر دوسرے لوگوں کو دھوکے میں ڈالتے ہیں اور لوگوں کو برائیوں اور گناہوں پر راغب کرتے ہیں۔ اس آیت میں یہی بتایا ہے کہ شیطان جن اور شیطان انسان لوگوں کو دھوکے میں دالنے کے لیے برائیوں کو خوش نما بنا کر بیان کرتے ہیں ' اور اسی لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شیطان انسانوں اور شیطان جنوں سے پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے۔

اس بحث میں یہ حدیث بھی پیش نظر رہنی چاہیے۔

امام ابوعیسی محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ ابن آدم کے قریب ایک شیطان کا نزول ہوتا ہے اور ایک فرشتہ کا نزول ہوتا ہے (یعنی اس کے دل میں ایک القاء کرنے والا شیطان ہوتا ہے اور ایک فرشتہ) شیطان کی طرف القا کرنے والا اس کو مصائب سے ڈراتا ہے اور حق کی تکذیب کراتا ہے اور فرشتہ کی طرف سے القاء کرنے والا خیر کی بشارت دیتا ہے۔ جو شخص اس کو اپنے دل میں پائے وہ اللہ کا شکر بجالائے اور جو شخص اپنے دل میں دوسری بات پائے وہ " اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم "۔ پڑھے ' پھر آپ نے یہ آیت پڑھی :

(آیت) " الشیطن یعدکم الفقر ویامرکم بالفحشاء "۔ (البقرہ : ۲۶۸)

ترجمہ : شیطان تم کو مفلسی سے ڈراتا ہے اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔
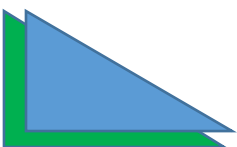
امام ابو عیسیٰ نے کہا یہ حدیث حسن غریب ہے۔
(سنن الترمذی ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ۲۹۹۹ ' صحیح ابن حبان ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ۹۹۷ ' السنن الکبری ' ج ٦ ' رقم الحدیث : ۱۱۰۵۱)
امام مسلم بن حجاج قشیری ۲٦۱ھ روایت کرتے ہیں :
حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم میں سے ہر شخص کے ساتھ ایک جن پیدا ہوتا ہے۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کے ساتھ بھی پیدا کیا گیا ہے ؟ آپ نے فرمایا ہاں ! میرے ساتھ بھی پیدا کیا گیا ہے ' لیکن اللہ تعالیٰ نے میری اعانت فرمائی ' وہ مسلمان ہوگیا۔ وہ مجھے نیکی کے سوا اور کوئی مشورہ نہیں دیتا۔
(صحیح مسلم ' منافقین ' ٦۹ ' (۲۸۱۴) ٦۹۷۵ ' مسند احمد ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۳٦۴۸)
قاضی عیاض نے کہا ہے کہ امت کا اس پر اجماع ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا جسم ' آپ کا دل اور آپ کی زبان شیطان کے آثار سے محفوظ ہے اور اس حدیث میں یہ اشارہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا قرین جن (ہم زاد) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی برکت اور آپ کی مبارک صحبت سے مسلمان ہوگیا اور برائی کا حکم دینے والا نیکی کا حکم دینے والا بن گیا ' اور ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے آپ کو شیطان کے اغواء اور اس کے وسوسوں سے بچانے کی کوشش کریں۔
شیطان کی طرف القاء وسوسہ ہوتا ہے اور فرشتہ کی طرف سے القاء الہام ہوتا ہے۔ شیطان کفر ' فسق اور ظلم کے وسوسے ڈالتا ہے اور توحید ' رسالت ' مرنے کے بعد اٹھنے ' قیامت اور جنت اور دوزخ کے انکار کی تلقین کرتا ہے اور فرشتہ ' اللہ اور رسول اور قرآن مجید کی تصدیق کی تلقین کرتا ہے اور نماز ' روزہ اور دیگر نیکی کے کاموں کی ترغیب دیتا ہے۔ جب اس کے دل میں اس قسم کی باتیں آئیں تو اللہ کا شکر ادا کرے اور جب اس کے خلاف باتیں آئیں ' تو شیطان کے شر سے پناہ مانگے۔ ہرچند کہ احکام شرعیہ میں الہام معتبر نہیں ہے ' لیکن وساوس شیطان سے اجتناب میں وہ معتبر ہے ' عارفین نے کہا ہے کہ جو شخص حرام کھاتا ہو وہ الہام اور وسوسہ میں تمیز نہیں کرسکتا۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : اور اگر آپ کا رب چاہتا تو وہ یہ نہ کرتے، سو آپ انھیں اور ان کی افتراء پردازیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔
(الانعام : ۱۱۲)

شیاطین کو پیدا کرنے کی حکمت

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو انسانوں اور جنوں میں سرکش اور شیاطین سابقہ انبیاء (علیہم السلام) اور ان کے امتیوں کو اپنے وسوسوں اور سازشوں سے نقصان نہ پہنچاتے اور اسی طرح وہ آپ کو اور آپ کی امت کو بھی ضرر پہنچانے سے باز رہتے ' لیکن یہ چیز اللہ تعالیٰ کی مشیت میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہے کہ بعض نیک لوگ ان شیاطین کی سازشوں اور وسوسوں کی وجہ سے ضرر میں مبتلا ہوں ' پھر اللہ تعالیٰ ان شیاطین کو آخرت میں سزا دے اور نیک لوگوں کو ان کے امتحان میں کامیاب ہونے اور مصائب پر صبر کرنے کی وجہ سے جزا دے ' تو آپ ابلیس اور اس کے پیروکاروں کو اور ان کی مزخرف باتوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے۔ یہ آیت کفر پر عذاب کی وعید اور اسلام پر

ثابت قدم رہنے والوں کی بشارت کو متضمن ہے۔ اور اس میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دینا ہے اور آپ کے قلب مبارک سے غم کو زائل کرنا ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن۔ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

وَلِتَصۡغٰۤى اِلَيۡهِ اَفۡـِٕدَةُ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ وَلِيَرۡضَوۡهُ وَلِيَقۡتَرِفُوۡا مَا هُمۡ مُّقۡتَرِفُوۡنَ ۝١١٣

لغۃ القرآن: وَلِتَصْغٰٓى : اور تاکہ مائل ہوجائیں] [اِلَيْهِ : اپنی طرف] [اَفْـِٕدَةُ : دل] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [لَا : نہیں] [يُؤْمِنُوْنَ : وہ سب ایمان لاتے ہیں] [بِالْاٰخِرَةِ : آخرت کے بدلے] [وَلِيَرْضَوْهُ : اور تاکہ وہ سب خوش ہوں اس سے] [وَلِيَقْتَرِفُوْا : اور تاکہ وہ سب کرتے رہیں] [مَا : نہیں] [هُمْ : وہ] [مُّقْتَرِفُوْنَ : سب کرنے والے]

ترجمہ : اور (یہ) اس لیے کہ ان لوگوں کے دل اس (فریب) کی طرف مائل ہو جائیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور (یہ) کہ وہ اسے پسند کرنے لگیں اور (یہ بھی) کہ وہ (انہی اعمال بد کا) ارتکاب کرنے لگیں جن کے وہ خود (مرتکب) ہو رہے ہیں

تشریح :

شیطان صفت لوگ اپنی سازش اور باطل پرستی کو بڑے دل کش انداز میں پیش کرتے ہیں تاکہ وہ لوگ جو آخرت اور اعمال کی جزاوسزا پر یقین نہیں رکھتے ان کے دل اس باطل پرستی کی طرف مائل ہو جائیں اور انکار آخرت کا جو غلط راستہ انھوں نے اپنے لیے پسند کر رکھا ہے اسی پر گامزن رہیں اور اسلام قبول نہ کریں۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

دل اپنے ہم جنس کی طرف جھکتا ہے

اس سے معلوم ہوا کہ ہر ایک کا دل اپنے ہم جنس کی طرف جھکتا ہے، لہٰذا اگر کسی آدمی کا دل گناہ گاروں، گمراہوں کی طرف زیادہ جھکتا ہے تو اسے غور کرنا چاہیے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کے دل میں بھی گمراہی اور برائی کی محبت بیٹھی ہوئی ہے۔

(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

اِفترا پردازوں کی فکر نہ کرنے کی ہدایت

سو ارشاد فرمایا گیا کہ چھوڑ دو ان کو اور ان کی ان افترا پردازیوں کو جو یہ لوگ کرتے ہیں کہ یہ اپنے کئے کا بھگتان خود بھگتیں گے۔ سو آپ ان کی فکر نہ کیجئے۔ اللہ تعالیٰ حق اور اہل حق کی مدد فرمائے گا۔ سو اس میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے واسطے سے ہر داعی حق کیلئے تسکین و تسلیہ کا سامان ہے۔ بہر کیف اس ارشاد سے واضح فرمادیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی حکمت نے یہی پسند فرمایا کہ وہ اس معاملہ میں جبر کی بجائے اختیار اور آزادی سے نواز کر لوگوں کا امتحان کرے کہ کون اپنی مرضی اور ارادہ سے خدا کی راہ اختیار کرتا ہے اور کون شیطان کی۔ یہی ابتلاء و آزمائش کا تقاضا ہے اور اسی پر ثواب و عقاب کا دار و مدار ہے اور اسی پر آگے فیصلہ ہونا ہے جس کے مطابق ہر کوئی اپنے کیے کرائے کے انجام کو پہنچ کر رہے گا۔ وباللہ التوفیق لما یحب ویرید وعلی ما یحب ویرید۔

اِیمان و یقین کی قوت امن و سلامتی کی ضامن و کفیل

اس سے معلوم ہوا کہ شیاطین جن وانس کا داؤ انہی لوگوں پر چلتا ہے جو کہ ایمان کی دولت سے محروم ہوتے ہیں۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ جیسا کہ دوسرے کئی مقامات پر بھی اس حقیقت کو واضح فرمایا گیا ہے مثلاً سورۃ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے۔ {اِنَّا جَعَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ}۔ (الاعراف: 27) جبکہ ایمان والے اس سے محفوظ رہتے ہیں۔ {فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْ لَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ}۔ سو ایمان و یقین کی قوت امن و سلامتی کی ضامن و کفیل ہے۔ وباللہ التوفیق۔ بہر کیف اس ارشاد میں فرمایا گیا کہ ہم نے شیطان جن وانس کو انبیاء و صالحین کی مخالفت اور بدعات و خرافات کے القاء کی یہ مہلت جو اس دنیا میں دی ہے یہ اس لیے دی ہے کہ ایک طرف تو اس سے حق پرستوں کی حق پرستی کا امتحان ہوتا ہے اور دوسری طرف باطل پرستوں کو ڈھیل ملتی ہے اور وہ شیاطین و اشرار کے ہاتھوں اپنا من بھاتا کھاجا پا کر اس کی طرف راغب ہوتے ہیں اور اس کو پسند کرتے ہیں۔ اور اس دنیا میں جو کمائی ان کو کرنا ہوتی ہے وہ کر لیتے ہیں۔ اور یہ ڈھیل اس اختیار کا لازمی نتیجہ ہے جو انسان کو بخشا گیا ہے۔ اس لیے یہ سنت الٰہی کے تحت ہے۔

تا کہ یہ کما لیں جو کچھ کہ انھوں نے کمانا ہے

تا کہ اس طرح یہ اپنے ارمان پورے کر لیں اور اپنے پیمانہ ہائے جرم کو لبریز کر کے اپنے خالق ومالک کے حضور پہنچیں۔ اور اس طرح یہ لوگ وہاں پر اپنے کئے کرائے کا بھرپور صلہ و بدلہ پائیں۔ والعیاذ باللہ۔ کیونکہ آخرت کی بازپرس اور وہاں کی جوابدہی کا احساس واعتقاد ہی انسان کو برائی سے روکتا ہے۔ سو جو کوئی اس کی حمایت سے محروم ہو جائے اس کو پھر کوئی چیز روکنے والی نہیں رہتی، جس سے وہ برائیوں کے کمانے اور جمع کرنے میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، اور اللہ پاک اپنے حلم بے پایاں اور کرم بے نہایت کے تقاضوں کے مطابق اس کی رسی دراز کرتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آخری نتیجے اور انتہائی برے انجام کو پہنچ کر رہتا ہے۔ سو ایمان بالآخرۃ سے محرومی کا نتیجہ وانجام انتہائی اور نہایت ہی ہولناک ہے۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ بہر کیف اس سے واضح فرما دیا گیا کہ ایسے لوگوں کو ڈھیل ملی ہوئی ہے تا کہ یہ اپنے ارمان پورے کر لیں اور یہ ڈھیل اس اختیار کا لازمی نتیجہ ہے جو انسان کو اس دنیا میں بخشا گیا ہے۔ سو اس اعتبار سے یہ سب کچھ سنت الٰہی کے تحت ہے اور { الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ } کی صفت وقید سے واضح فرما دیا گیا کہ شیاطین واَشرار کی یہ دعوت انہی لوگوں کو اپیل کرتی ہے جو آخرت کے اعتقاد سے خالی اور محروم ہوتے ہیں اور ان کا منتہائے مقصود یہ دنیا اور اس کا عیش ہی ہوتا ہے۔ والعیاذ باللہ۔ سو ایمان و یقین کی دولت وسیلہ حفاظت وسرفرازی ہے۔ (مدنی کبیر)

المختصر

ابن جریر نے حضرت ابوذر سے نقل کیا ہے کہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مجلس میں شریک ہوا۔ یہ ایک لمبی مجلس تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے ابوذر، کیا تم نے نماز پڑھ لی۔ میں نے کہا نہیں اے خدا کے رسول ﷺ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اٹھو اور دو رکعت نماز پڑھو۔ وہ نماز پڑھ کر دوبارہ مجلس میں آکر بیٹھے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابوذر کیا تم نے جن وانس کے شیطانوں کے مقابلہ میں اللہ سے پناہ مانگی۔ میں نے کہا نہیں اے خدا کے رسول، کیا انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں، وہ شیاطین جن سے بھی زیادہ برے ہیں (**نعم هم شر من شياطين الجن**، تفسیر ابن کثیر)

یہاں شیاطین انس سے مراد وہ لوگ ہیں جو دعوت حق کو بے اعتبار ثابت کرنے کے لیے قائدانہ کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خود ساختہ مذہب کی بنیاد پر عزت ومقبولیت کا مقام حاصل کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب حق کی دعوت اپنی بے آمیز شکل میں اٹھتی ہے تو ان کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان کو برہنہ کر رہی ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے سیدھا راستہ تو یہ تھا کہ وہ حق کی وضاحت کے بعد اس کو مان لیں مگر حق کے مقابلہ میں اپنا مقام ان کو زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ اپنی حیثیت کو بچانے کے لیے وہ خود داعی اور اس کی دعوت کو مشتبہ ثابت کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ خوش نما الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ داعی اور اس کی دعوت میں ایسے شوشے نکالتے ہیں جو اگرچہ بذات خود بے حقیقت ہوتے ہیں مگر بہت سے لوگ اس سے متاثر ہو کر اس کے بارے میں شبہ میں پڑ جاتے ہیں۔

موجودہ دنیا میں جو امتحانی حالات پیدا کیے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہاں صحیح بات کہنے والے کو بھی الفاظ مل جاتے ہیں اور غلط بات کہنے والے کو بھی۔ حق کا داعی اگر حق کو دلائل کی زبان میں بیان کر سکتا ہے تو اسی کے ساتھ باطل پرستوں کو بھی یہ موقع حاصل ہے کہ وہ حق کے خلاف کچھ ایسے خوش نما الفاظ بول سکیں جو لوگ کو دلیل معلوم ہوں اور وہ اس سے متاثر ہو کر حق کا ساتھ دینا چھوڑ دیں۔ یہ صورت

حال امتحان کی غرض سے ہے اس لیے وہ لازماً قیامت تک باقی رہے گی۔ اس دنیا میں بہر حال آدمی کو اس امتحان میں کھڑا ہونا ہے کہ وہ سچے دلائل اور بے بنیاد باتوں کے درمیان فرق کرے اور بے بنیاد باتوں کو رد کرکے سچے دلائل کو قبول کرلے۔

شیاطین انس اپنی ذہانت سے حق کے خلاف جو پر فریب شوشے نکالتے ہیں وہ انھیں لوگوں کو متاثر کرتے ہیں جو آخرت کے فکر سے خالی ہوں۔ آخرت کا اندیشہ آدمی کو انتہائی سنجیدہ بنا دیتا ہے اور جو شخص سنجیدہ نہیں ہوتے، اسی لیے وہ شوشہ اور دلیل کا فرق بھی سمجھ نہیں پاتے۔

(تذکیر القرآن)

آیت مبارکہ :

اَفَغَيۡرَ اللّٰهِ اَبۡتَغِىۡ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ اِلَيۡكُمُ الۡكِتٰبَ مُفَصَّلًا ‌ؕ وَالَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يَعۡلَمُوۡنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنۡ رَّبِّكَ بِالۡحَـقِّ‌ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ ○۱۱۴

لغۃ القرآن: اَفَغَيْرَ : تو کیا علاوہ] [اللّٰهِ : الله] [اَبْتَغِيْ : میں تلاش کروں] [حَكَمًا : ایک منصف] [وَهُوَ : اور وہ] [الَّذِيْٓ :" وہ ہے " جو] [اَنْزَلَ : اسنے نازل کی] [اِلَيْكُمُ : تمہاری طرف] [الْكِتٰبَ : کتاب] [مُفَصَّلًا : تفصیل کے ساتھ] [وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ جو] [اٰتَيْنٰهُمُ : ہم نے دی انہیں] [الْكِتٰبَ : کتاب] [يَعْلَمُوْنَ : وہ سب علم رکھتے] [اَنَّهٗ : یہ یقینی بات ہے] [مُنَزَّلٌ : نازہ شدہ ہے] [مِنْ رَّبِّكَ : آپکے رب " کی طرف " سے] [بِالْحَقِّ : حق کے ساتھ] [فَلَا : پس نہیں] [تَكُوْنَنَّ : تم ہرگز ہونا] [مِنَ : سے] [الْمُمْتَرِيْنَ : شک کرنے والوں میں]

ترجمہ : (فرما دیجئے :) کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو حاکم (و فیصل) تلاش کروں حالانکہ وہ (اللہ) ہی ہے جس نے تمہاری طرف مفصّل (یعنی واضح لائحہ عمل پر مشتمل) کتاب نازل فرمائی ہے، اور وہ لوگ جن کو ہم نے (پہلے) کتاب دی تھی (دل سے) جانتے ہیں کہ یہ (قرآن) آپ

کے رب کی طرف سے (مبنی) برحق اتارا ہوا ہے پس آپ (ان اہل کتاب کی نسبت) شک کرنے والوں میں نہ ہوں (کہ یہ لوگ قرآن کا وحی ہونا جانتے ہیں یا نہیں)

تشریح:

کفار مطالبہ کرتے تھے کہ ہمیں ایسی نشانیاں دکھاؤ جس سے ہم فیصلہ کر سکیں کہ آپ سچے نبی ہیں۔ حضور کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم ہوتا ہے کہ آپ ان سے پوچھیئے کہ کیا اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر بھی کوئی سچا فیصلہ کرنے والا ہے جس کی طرف رجوع کیا جائے اور اگر اللہ کا فیصلہ صحیح تسلیم کرتے ہو تو اس نے تو قرآن جیسی معجز نما کتاب نازل کرکے میری صداقت کا فیصلہ فرمادیا ہے۔ مزید اطمینان کی ضرورت ہو تو یہود و نصاریٰ سے دریافت کرلو۔ ان کے پاس جو آسمانی کتابیں ہیں ان میں جگہ جگہ میری نبوت اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی شہادتیں موجود ہیں حکم اور حاکم کا ایک ہی معنی ہے فیصلہ کرنے والا۔ لیکن فرق یہ ہے کہ حاکم ہر فیصلہ کرنے والے کو کہتے ہیں صحیح کرے یا غلط۔ لیکن حکم صرف صحیح فیصلہ کرنے والے کو کہتے ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

انسان پر شیطان کا تسلط قائم ہو جائے تو وہ اللہ کا بندہ بننے کے بجائے اپنے نفس اور شیطان کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں ایسا شخص اپنے نفس کا بندہ بن جاتا ہے اور وہ آخرت سے بے پرواہو کر اپنے نظریات کو شریعت کا متبادل سمجھتے ہوئے اس کی پیروی کرتا ہے اس سوچ اور طرز عمل کی مذمت کرتے ہوئے رسول محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ کیا میں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا حاکم تصور کرلوں حالانکہ فیصلہ کرنے والا تو صرف وہی ہے اور اس نے انسانوں کو شیطان اور نفس کی پیروی سے منع کیا ہے اور لوگوں کی ہدایت کے لیے جامع اور مفصل کتاب نازل فرمائی ہے۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

نبوت کی دو دلیلیں

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ کفار نے پکی قسمیں کھا کر کہا کہ اگر ان کے مطلوبہ معجزات دکھادیئے جائیں تو وہ ضرور ایمان لے آئیں گے ' اللہ تعالیٰ ن کے اس کا رد فرمایا کہ ان معجزات کے دکھانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا ' کیونکہ وہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے اور اس آیت میں بیان فرمایا ہے کہ آپ کی نبوت پر دلیل قائم ہو چکی ہے ' اور وہ قرآن مجید ہے۔ وہ کتاب مفصل ہے جس میں علوم کثیرہ ہیں اور وہ انتہائی فصیح اور بلیغ کلام پر مشتمل ہے جس کے معارضہ سے تمام مخلوق عاجز ہو چکی ہے ' اور اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے توراۃ اور انجیل نازل کی جن میں آپ کی نبوت پر دلائل اور پیشین گوئیاں ہیں اور توراۃ اور انجیل کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ آپ سچے اور برحق نبی ہیں ' سو ان دو دلیلوں کے بعد اب اور کون سی دلیل کی ضرورت ہے ؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا (آپ کہئے) کیا میں اللہ کے سوا اور کوئی حکم تلاش کروں ؟ یعنی آپ کہئے کہ تم مجھ سے فرمائشی معجزات طلب کرتے ہو ' کیا اللہ تعالیٰ کی شہادت کے بعد اور کسی کی شہادت کے بعد اور کسی کی شہادت کی ضرورت ہے جس نے میری نبوت کی تصدیق کے لیے قرآن مجید

کو نازل کیا ' جو کتاب معجز ہے اور جو اس کتاب سے پہلے توراۃ اور انجیل کو نازل کرچکا ہے ' جس میں میرے نبی ہونے کی پیش گوئی ہے ' اور میری علامتیں اور نشانیاں بیان کردی گئی ہیں اور جن لوگوں نے توراۃ اور انجیل کو پڑھا ہے جیسے حضرت سلمان فارسی ' حضرت صہیب رومی ' حضرت عدی بن حاتم اور حضرت عبداللہ بن سلام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین وہ آپ کے نبی ہونے کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔
پھر فرمایا نبوت کی ان دو دلیلوں کے آنے کے بعد تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جانا۔ اس میں بظاہر آپ کو خطاب ہے ' لیکن مراد اس سے آپ کی امت ہے ' یا اس میں ہر پڑھنے والے کو خطاب ہے۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

اس میں بظاہر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات مخاطب ہے مگر حقیقتاً پوری بنی نوع انسان شامل ہے۔ ان دو آیات میں قرآن مجید کے سات اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے۔
۱۔ قرآن مجید اللہ کا نازل کردہ ہے۔
۲۔ احکام و مسائل میں جامع اور مفصل کتاب ہے۔
۳۔ اس کی رہنمائی اور ہدایت میں کسی قسم کا نقصان اور شک کی گنجائش نہیں۔
۴۔ قرآن اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔
۵۔ قرآن مجید کے احکام عدل وانصاف پر مبنی ہیں۔
۶۔ قرآن مجید کے ارشادات اور اس کی پیش گوئیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے برحق ہیں۔
۷۔ قرآن مجید ہر اعتبار سے تغیر و تبدل سے پاک ہے اور قیامت تک اس کے محفوظ رہنے کی ضمانت دی گئی ہے۔
(وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ) [الحجر: ۶]
"اللہ رب العزت فرماتے ہیں جسے قرآن پاک کی تلاوت اور میرے ذکر نے مجھ سے مانگنے سے مشغول رکھا میں اسے مانگنے والوں سے زیادہ عطا کروں گا۔"

قرآن مجید کی تلاوت کا ثواب

(يَقُوْلُ الرَّبُّ عَزَّ وَجَلَّ مَنْ شَغَلَهُ الْقُرْآنُ وَذِكْرِيْ عَنْ مَسْأَلَتِيْ اَعْطَيْتُهُ اَفْضَلَ مَآ اُعْطِي السَّآئِلِيْنَ)
[رواہ الترمذی: کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء کیف کانت قراءۃ النبی]
"اللہ رب العزت فرماتے ہیں جسے قرآن پاک کی تلاوت اور میرے ذکر نے مجھ سے مانگنے سے مشغول رکھا میں اسے مانگنے والوں سے زیادہ عطا کروں گا۔"

جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات بڑائی وکبریائی اور خیر وبرکت کے لحاظ سے یکتا اور تنہا ہے یہی مقام ذکر واذکار میں تلاوت قرآن مجید کو حاصل ہے۔ قرآن مجید کو زندگی کا رہنما بنانے سے دنیا وآخرت کے مسائل ومصائب کا مداوا ہونے کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس کتاب مقدس سے انحراف اور بے اعتنائی کرنا پریشانیوں اور ناکامیوں کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

(إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَّيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ) [رواہ مسلم: کتاب صلوۃ المسافرین وقصرھا]

"یقیناً اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے قوموں کو بلند فرماتا ہے اور اسی کے سبب لوگوں کو ذلیل کرتا ہے۔"

(عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ (رض) يَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَنْ قَرَأَ حَرْفًا مِّنْ كِتَابِ اللّٰهِ فَلَهٗ بِهٖ حَسَنَةٌ وَالْحَسَنَةُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا لَا أَقُوْلُ الم حَرْفٌ وَلٰكِنْ أَلِفٌ حَرْفٌ وَلَامٌ حَرْفٌ وَمِيْمٌ حَرْفٌ)

[ترمذی: کتاب فضائل القرآن]

"حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس نے اللہ کی کتاب کا ایک حرف پڑھا اسے اس کے بدلے ایک نیکی ملے گی اور ایک نیکی دس نیکیوں کے برابر ہے میں یہ نہیں کہتا کہ "الم" ایک حرف ہے بلکہ "الف" ایک حرف ہے اور "لام" ایک حرف ہے "اور "میم" ایک حرف ہے۔" (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

فوائد

١۔ معلوم ہوا کہ شرعی احکام میں نہ کسی کا مشورہ لیا جائے نہ کسی کو پنچ بنایا جائے۔ مشورہ اور پنچایت کی ضرورت ان چیزوں میں ہے جن میں شریعت کا فیصلہ وارد نہ ہو۔ اولاد کی شادی کے لیے مشورہ کرو مگر نماز وروزہ کے لیے کسی مشورہ کی ضرورت نہیں۔

٢۔ شان نزول: کفار مکہ نے عرض کیا تھا کہ یہود ونصاری کے پوپ پادریوں کو ہم آپ اپنا پنچ بنالیں جو یہ فیصلہ کریں کہ ہم حق پر ہیں یا آپ۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ انھیں کچھ رشوت دے کر اپنے حق میں فیصلہ کرالیں گے۔ تب یہ آیت اتری۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ کہنا درست ہے کہ اے کافرو قرآن تمہاری طرف بھی آیا کیوکہ ان کی ہدایت کے لیے بھی آیات ہے۔

٣: یعنی آسمانی کتاب کی سچی سمجھ نصیب کی جیسے عبداللہ ابن سلام وغیرہ یا یہ مطلب ہے کہ عام علماء اہل کتاب آپ کو حق جانتے ہیں اگرچہ اقرار نہ کریں کسی دنیاوی وجہ سے۔

٤۔ یعنی حقیقت یہ ہے کہ جن پوپ پادریوں کو یہ کفار اپنا حکم بنانا چاہتے ہیں وہ بھی دل سے آپ کو حق مانتے ہیں۔ اگرچہ زبان سے آپ کی مخالفت کر رہے ہیں۔ یا آئندہ کریں۔ (تفسیر نور العرفان۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی)

آیت مبارکہ :

وَتَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ○۱۱۵

لغۃالقرآن : وَتَمَّتْ : اور مکمل ہوئی] [كَلِمَتُ : بات] [رَبِّكَ : تیرے رب] [صِدْقًا : سچائی] [وَّعَدْلًا : اور عدل میں] [لَا : نہیں] [مُبَدِّلَ : کوئی بدلنے والا] [لِكَلِمٰتِهٖ : اس کی باتوں کو] [وَهُوَ : اور وہ] [السَّمِيْعُ : خوب سننے والا ہے] [الْعَلِيْمُ : خوب جاننے والا ہے]

ترجمہ : اور آپ کے رب کی بات سچائی اور عدل کی رو سے پوری ہو چکی، اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں، اور وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے

تشریح :

رب کی بات سے مراد وہ فیصلہ الٰہی ہے جو کفار و مومن کے متعلق ہو چکا یا اس سے تمام آسمانی کتابیں مراد ہیں یا قرآن شریف، الغرض جو کچھ بھی مراد ہو مقصود بالکل ظاہر ہے۔

قرآنِ مجید کی 4 شانیں

اس آیت کریمہ میں قرآن پاک کی چار شانیں بیان کی گئی ہیں :

(1)۔۔ قرآن پاک مکمل ہے اس کا کوئی پہلو نا تمام نہیں۔

(2)۔۔ قرآن پاک میں بتائی گئی تمام باتیں حق اور سچائی پر مبنی ہیں۔

(3)۔۔ جو شرعی احکام قرآن پاک میں ہیں وہ ہر اعتبار سے عدل و انصاف پر مشتمل ہیں۔

(4)۔۔ قرآن پاک ہمیشہ کیلئے ہر طرح کی تبدیلی اور تحریف سے محفوظ ہے ۔(تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری)

کلمات رب کے صادق اور عادل ہونے کے معانی

اس سے پہلی آیت میں یہ بیان کیا تھا کہ قرآن مجید معجزہ ہے اور اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ آپ کے رب کا کلمہ صدق اور عدل کے اعتبار سے پورا ہو گیا۔ یعنی قرآن مجید جو معجز کلام ہے 'وہ پورا ہو گیا' جو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صدق پر دلالت کرتا ہے۔ اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ مکلفین کو قیامت تک علم اور عمل کے اعتبار سے جن چیزوں کی ضرورت ہے 'وہ سب قرآن مجید میں بتمامہ موجود ہیں اور اس کا تیسرا معنی یہ ہے کہ ازل میں اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیئے وہ سب تمام اور مکمل ہیں 'ان میں نہ کوئی تغیر ہو سکتا ہے اور نہ کوئی اضافہ ہو سکتا ہے '

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قلم اٹھا لیے گئے ہیں اور صحیفے خشک ہو گئے ہیں۔ (سنن ترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث : ۲۵۲۴ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت)

حضرت عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے علم پر قلم خشک ہو چکا ہے۔ (سنن ترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث : ۲۶۵۱)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : تم جن چیزوں سے ملاقات کرنے والے ہو 'ان کے متعلق قلم (لکھ کر) خشک ہو چکا ہے۔ (صحیح البخاری 'کتاب القدر 'باب ۲)

حضرت عبادہ بن الصامت (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا اور اس سے فرمایا لکھ 'اس نے کہا اے میرے رب ! میں کیا لکھوں ؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا قیامت تک ہر چیز کی تقدیر لکھ۔ (الحدیث)

(سنن ابوداؤد 'ج ۴ 'رقم الحدیث : '۴۷۰۰ 'مسند احمد 'ج ۵ 'ص ۳۱۷ 'المعجم الکبیر 'ج ۱۱ 'رقم الحدیث : '۱۲۲۲۷ '۱۱۲۴۳ 'السنن الکبری للبیہقی 'ج ۱۰ 'ص ۲۰۴ 'مختصر اتحاف السادۃ المھرۃ 'ج ۱ 'رقم الحدیث : '۲۳۲)

علامہ ابوبکر بن اسماعیل بوصیری متوفی ۸۴۰ ھ لکھتے ہیں :

اس حدیث کو امام احمد بن منیع نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور امام ابوداؤد الطیالسی اور امام ابوداؤد سجستانی نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے اس کو اختصار کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے 'اور اس کی سند میں احمد بن سلیم ضعیف ہے۔ (اتحاف السادۃ المھرۃ بزوائد المسانید العشرہ 'ج ۱ 'ص ۱۲۳ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت '۱۴۱۷ ھ)

اس آیت میں اللہ کے کلمہ کو جو صدق اور عدل فرمایا ہے 'اس کا چوتھا معنی یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات دو قسم کی ہیں۔ ایک قسم میں خبریں ہیں اور دوسری قسم میں عقائد اور احکام شرعیہ ہیں۔ صدق کا تعلق قرآن مجید کی دی ہوئی خبروں کے ساتھ ہے اور عدل کا تعلق عقائد اور احکام شرعیہ کے ساتھ ہے 'یعنی اس کی دی ہوئی تمام خبریں صادق ہیں اور اس کے بیان کردہ عقائد اور احکام شرعیہ سب عادل ہیں 'یعنی متوسط ہیں اور صحیح ہیں۔ کیونکہ عدل کا معنی متوسط ہے جو افراط اور تفریط کی درمیانی کیفیت کا نام ہے۔

اللہ تعالیٰ کا کلام میں کذب محال ہے

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ ھ لکھتے ہیں :
اللہ کا کلمہ صادق ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ کذب نقص ہے اور نقص اللہ تعالیٰ پر محال ہے اور اللہ تعالیٰ کے وعد اور وعید دونوں میں خلف محال ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۵ ص ۱۳۵ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۴۱۵ھ) (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

تکمیل دین اور ختم نبوت کا اشارہ

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔ میں اشارہ ہے کہ قرآن مکمل ضابطہ حیات ہے اور لا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ میں یہ بتایا گیا ہے کیا قرآن اللہ کی آخری کتاب ہے اور یہ ختم نبوت کا بھی بیان ہے کیوں کہ اللہ کی نازل کردہ کتاب میں کوئی تبدیلی کسی نبی ہی کے ذریعے ممکن ہے اور چونکہ صاحب قرآن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد دروازہ نبوت بند کر دیا گیا ہے اس لئے قرآن میں کوئی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔
گویا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد نبوت کے دروازہ کھولنا دوسرے لفظوں میں قرآن میں تبدیلیوں کا دروازہ کھولنا ہے۔ کیونکہ نبی پر وحی الٰہی آتی ہے اور وہ وحی کے ذریعے کتاب اللہ میں تبدیلی کر دیتا ہے یعنی اللہ اپنے پیغمبر کے ذریعے اپنے کلام میں تبدیلی فرماتا ہے جیسے عیسیٰ (علیہ السلام) توراۃ پر عامل تھے مگر آپ نے بذریعہ وحی توراۃ میں تبدیلیاں کیں اور فرمایا **وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ** "میں تم پہ بعض وہ چیزیں حلال کرتا ہوں جو تم پہ حرام کی گئی تھیں۔" (آل عمران : 50)۔ اسی لیے مرزا قادیانی کو دعویٰ نبوت کے بعد یہ جرات ہوئی کہ اس نے حرمت جہاد کا فتوی دے دیا۔ العیاذ باللہ (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

آج دنیا کی ہر حکومت یا قانون ساز اسمبلی اپنے ملک کے لیے قانون بناتی ہے لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد جب اس قانون کے نقائص ظاہر ہوتے ہیں تو اس کو بدلنا پڑتا ہے یا جونہی حالات بدلتے ہیں تو نئے تقاضوں کے مطابق نئے قانون کی ضرورت پڑتی ہے مگر قرآن مجید نے جس ضابطہ حیات کا اعلان چودہ سو سال پہلے کیا تھا وہ قیامت تک دنیا کی ہر قوم، ہر ملک، ہر حال اور ہر زمانہ کے تقاضوں کو کامل طریقہ سے پورا کرتا ہے اور اس میں کسی ترمیم کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ قرآن مجید کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا ہے جو اس کائنات کا خالق و مالک اور اس کی حقیقتوں سے خوب آشنا ہے۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)
قرآن کتاب برحق ہے اسے قیامت تک کوئی بدل نہیں سکتا۔ اس آیت کو نسخ سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ نسخ میں کوئی بندہ آیت نہیں بدلتا بلکہ خود رب تعالیٰ اگلے حکم کی مدت ختم فرما دیتا ہے۔ جیسے قابل طبیب مریض کے حال میں تبدیلی ملاحظہ کرکے خود اپنا نسخہ بدلتا رہتا ہے۔ اگر مریض خود نسخے میں تبدیلی کرے تو مجرم ہے۔ (تفسیر نور العرفان۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی)

نہ کوئی اس کی قضا کا تبدیل کرنے والا، نہ حکم کا رد کرنے والا، نہ اس کا وعدہ خلاف ہوسکے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ کلام جب تامّ ہے تو وہ قابل نقص و تغییر نہیں اور وہ قیامت تک تحریف و تغییر سے محفوظ ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں معنی یہ ہیں کہ کسی کی قدرت نہیں کہ قرآن پاک کی تحریف کرسکے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کا ضامن ہے۔ (تفسیر ابوالسعود) (خزائن)

عدل : (انصاف) اس کے معنی برابری کے ہیں۔ یعنی ایسی بات یا حکم جس میں نہ کسی کا نقصان ہو اور نہ کسی پر کوئی زیادتی ہو۔

قرآن مجید کے احکام اٹل ہیں

پچھلی آیت میں کہا گیا کہ یہ قرآن مجید دنیا میں بالکل ٹھیک باتیں لے کر آیا ہے اس میں شک و شبہ نہ کرو یہ ہر طرح سے قابل اعتماد کتاب ہے اور ہمیشہ کے لئے اس کی حفاظت اللہ کے ذمہ ہے۔ کوئی شخص اس میں سے ایک لفظ بھی ادھر سے ادھر نہیں کرسکتا ہے لہٰذا تغیر و تبدل کا اس میں خیال بھی نہیں کیا جاسکتا ہمیشہ جیسی ہے ویسی ہی رہے گی اس آیت میں قرآن مجید کے ہمیشہ اور ہر وقت قابل اعتماد ہونے کے کچھ دلائل بیان کیے گئے ہیں مثلاً :

(1) یہ اس کا کلام ہے جو سب کا رب ہے اسی لئے انسان کا بھی رب ہے اور اس کی تربیت اسی کے ذمہ ہے تربیت کے معنٰی ہیں ایک چیز کی ساری ضرورتیں پوری کرکے اسے رفتہ رفتہ کمال کو پہنچانا انسان کی تربیت کے لیے ضروری تھا کہ اس کی عقل کو روشن کرنے کے لئے ہدایت کی صاف صاف روشنی مہیا کی جائے۔ یہ قرآن مجید ہو ہی روشنی ہے جیسے ظاہری آنکھوں کے لیے سورج روشنی کا ذریعہ ہے ایسے ہی قرآن مجید باطنی آنکھوں کے لیے روشنی کا ذریعہ ہے (2) اس میں ہر چیز واقعہ کے مطابق ہے (3) اس پر عمل کرنے سے ہر شخص ظلم اور زیادتی سے محفوظ رہے گا (4) اس میں کوئی کچھ ردوبدل نہیں کرسکتا (5) اس کا بھیجنے والا ہر ایک کی بات سننے والا اور ہر ایک حکم کے موقع و محل کا اور ہر ایک کے دل کی بات کا جاننے والا ہے۔ اب آیت پر غور کیجئے۔

ارشاد ہے کہ یہ کلام تیرے رب کا ہے جو تمام جہان کا بھی رب ہے۔ اس میں سچائی کوٹ کوٹ کر بھری ہے نیز اس میں ہر ایک نقصان سے بچانے کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے کسی کی کیا مجال جو اس میں کچھ تغیر و تبدل کرسکے تمہیں کچھ ضرورت نہیں کہ کسی کی بات سنو اور اس کے ورغلانے میں آجاؤ۔ جو کچھ کہنا ہے اپنے رب سے کہو وہ سب کی سننے والا ہے یہ تمہارے ارد گرد جو تمہارے بہکانے والے جمع ہیں ان کو واقعات کا کچھ علم نہیں اور جس نے یہ قرآن تمہاری ہدایت کے لیے بھیجا ہے اس کو ذرہ ذرہ کا علم ہے یہ لوگ تمہیں تمہارے نفع کی بات نہیں بتا سکتے کیونکہ انھیں معلوم ہی نہیں کہ انسان کے لیے کونسی چیز نفع مند ہے اور کونسی چیز نقصان پہنچانے والی ہے ان کی جہالت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ عارضی لذتوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور دنیا ہی کو سب کچھ سمجھے ہوئے ہیں۔ (درس آسٹریلیا)

صدق، امانت اور عدل

یہ بات تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہوجاتی ہے کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت تک جتنی بھی شریعتیں آئیں، سب میں صدق اور عدل ساتھ ساتھ تھے لیکن یہ علاقائی، وقتی اور قومی مصلحتوں کی رعایت رکھتے ہوئے تھا۔ اب صدق، اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ ذرا غور

فرمایئے ! کمال علم صدق ہوتا ہے اگر اسی صدق پہ مکمل طور پر عمل کیا جائے تو اس کو امانت کہتے ہیں لیکن اگر خود اپنے شوق سے عمل نہ کرے بلکہ اس کو کوئی عدالتی یا معاشرتی نظام ایسے کرنے پر مجبور کر دے تو اسے عدل کہا جاتا ہے۔ یوں عدل اجتماعی طور پر صدق پر عمل کا نام ہے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت سے ہم پر جو شریعت نافذ ہے، وہ صدق اور عدل کی معراج ہے۔ اب اس کو کوئی بدل نہیں سکے گا اور نہ کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کر سکے گا جیسا کہ پہلی امتوں نے صحف ابراہیم، صحف توراۃ یا پھر صحف زبور کو اپنی مرضی سے بدل ڈالا۔ تاریخ نے ثابت کر دکھایا ہے کہ اللہ کے کلام میں اب تک کوئی تبدیلی نہیں آسکی ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اللہ کے کلام سے جو چیز بھی متعلق ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کی بھی حفاظت فرماتے ہیں۔ (انوار التنزیل)

مخلوق کے شر سے بچنے کے لیے 3 وظائف

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے مکمل کلمات کا ذکر ہوا، اس کی مناسبت سے ہم یہاں مخلوق کے شر سے بچنے کے تین وہ وظائف ذکر کرتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے مکمل کلمات کا ذکر ہے۔

(1)۔۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں: تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت حسن اور حضرت حسین (رض) پر چند کلمات پڑھ کر پھونکا کرتے اور فرماتے "تمہارے جدِ امجد بھی حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق (علیہ السلام) پر انھیں پڑھ کر دم کیا کرتے تھے۔ (وہ کلمات یہ ہیں) "اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّةِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَهَامَّةٍ، وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَامَّةٍ"۔

شیطان کے شر اور نظر بد سے محفوظ رہنے کے لیے یہ وظیفہ انتہائی مفید ہے۔

(2)۔۔ حضرت خولہ بنت حکیم (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جو شخص (سفر کے دوران) کسی جگہ اترے اور یہ کلمات کہے "اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ"، تو اس مقام سے کوچ کرنے تک اسے کوئی چیز نقصان نہیں پہنچائے گی۔

(3)۔۔ حضرت علی المرتضیٰ (رض) فرماتے ہیں: رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سونے سے پہلے یہ کہا کرتے تھے "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِوَجْهِكَ الْكَرِيْمِ وَكَلِمَاتِكَ التَّامَّةِ مِنْ شَرِّ مَا اَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهٖ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ تَكْشِفُ الْمَغْرَمَ وَالْمَاْثَمَ اَللّٰهُمَّ لَا يُهْزَمُ جُنْدُكَ وَلَا يُخْلَفُ وَعْدُكَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ "اے اللہ ! عَزَّوَجَلَّ، میں تیری بزرگ ذات اور تیرے مکمل کلمات کی پناہ پکڑتا ہوں اس کے شر سے جسے تو پیشانی سے پکڑنے والا ہے۔ اے اللہ ! عَزَّوَجَلَّ، تو ہی قرض ادا کرواتا اور گناہوں کو معاف کرتا ہے۔ اے اللہ ! عَزَّوَجَلَّ، تیرے لشکر کو شکست نہیں ہو گی اور تیرا وعدہ غلط نہیں ہوگا، تیرے سامنے کسی زور آور کا زور نہیں چلتا۔ تو پاک ہے اور سب تعریفیں تیرے لیے ہیں۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

آیت مبارکہ :

وَاِنۡ تُطِعۡ اَكۡثَرَ مَنۡ فِى الۡاَرۡضِ يُضِلُّوۡكَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ؕ اِنۡ يَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا يَخۡرُصُوۡنَ ۝۱۱۶

لغۃ القرآن : وَاِنْ : اور اگر] [تُطِعْ : آپ اطاعت کریں] [اَكْثَرَ : اکثر] [مَنْ : جس پر] [فِي الْاَرْضِ : زمین میں ہے] [يُضِلُّوْكَ : وہ سب آپ کو بہکا دیں] [عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ : اللہ کی راہ سے] [اِنْ : اگر] [يَّتَّبِعُوْنَ : وہ سب پیروی کرتے] [اِلَّا : مگر] [الظَّنَّ : گمان] [وَاِنْ : اور اگر] [هُمْ : وہ] [اِلَّا : مگر] [يَخْرُصُوْنَ : سب اٹکل دوڑاتے]

ترجمہ : اور اگر تو زمین میں (موجود) لوگوں کی اکثریت کا کہنا مان لے تو وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے۔ وہ (حق و یقین کی بجائے) صرف وہم و گمان کی پیروی کرتے ہیں اور محض غلط قیاس آرائی (اور دروغ گوئی) کرتے رہتے ہیں

تشریح :

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے شبہات کا جواب دیا پھر اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کے درست ہونے کو دلائل کے ساتھ بیان کیا اور اب بیان فرمایا جا رہا ہے کہ جب شبہات زائل ہو گئے اور دلائل بھی واضح ہو چکے تو اب کسی عقلمند کے لیے جائز نہیں کہ وہ جاہلوں کی گفتگو کی طرف توجہ کرے اور نہ ہی ان کے فاسد کلمات کی وجہ سے تشویش میں مبتلا ہو، للہذا اے سننے والے ! اگر تو زمین میں موجود اکثر لوگوں یعنی کافروں کی غلط باتوں یعنی حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھنے میں ان کی پیروی کرے گا تو یہ تجھے اللہ عَزَّوَجَلَّ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔

ایک قول یہ ہے کہ اس سے جاہل اور نفسانی خواہشات کے پیچھے چلنے والے لوگوں کی پیروی مراد ہے۔

اسلامی لبادے میں ملبوس اسلام دشمنوں سے بچا جائے

اس آیت میں یہ پہلو بھی داخل ہے کہ عوام ایسے لوگوں سے بھی محتاط رہیں جو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر، اسلامی تعلیمات کی اشاعت کو اپنی ڈھال بنا کر اسلام ہی کی بنیادیں کھوکھلی کرنے میں مصروف ہیں ان کے بارے میں علمائے حق سے معلومات حاصل کرکے ان سے بچنے کی کوشش کریں ، دین کے مُسَلّمہ امور میں ان کی قیاس آرائیاں، حق کو باطل اور باطل کو حق ظاہر کرنے میں ان کی صرف کی ہوئی توانائیاں کسی کام کی نہیں، ان کی پیروی دنیاوآخرت کے عظیم خسارے کا سبب بن سکتی ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ دینی امور میں صرف اللہ عَزَّوَجَلَّ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیروی کریں، ان کے مقابلے میں کسی کی بھی پیروی نہ کریں۔ اہل حق علماء اور مجتہدین کی پیروی در حقیقت اللہ عَزَّوَجَلَّ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ہی پیروی ہے کہ یہ حضرات ان ہی کے احکام سناتے ہیں۔

{اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ : یہ صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں۔} یعنی یہ کفار جو آپ سے آپ کے دین اور مذہب کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں انھیں تو اپنے مذہب کے درست ہونے کا بھی یقین نہیں۔ اپنے مذہب کو درست ثابت کرنے کیلئے ان کے پاس دلیل صرف اپنے جاہل اور گمراہ باپ دادا کی تقلید کرنا ہے، یہ لوگ بصیرت و حق شناسی سے محروم ہیں اور دین کے بارے میں غلط اندازے لگا رہے ہیں کہ یہ حلال ہے یہ حرام۔ اٹکل سے کوئی چیز حلال یا حرام نہیں ہوتی جسے اللہ عَزَّوَجَلَّ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حلال کیا وہ حلال ہے اور جسے حرام کیا وہ حرام ہے۔ اکثر مفسرین کے نزدیک اس آیت میں "ظن" سے مراد کفار کا اپنے مذہب کو ثابت کرنے میں اپنے اسلاف کی تقلید کرنا ہے، مجتہد کے قیاس سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

قرآن و حدیث کے مقابلے میں آباؤ اجداد کی پیروی مشرکوں کا طریقہ ہے

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث کے مقابل اپنے باپ دادوں کی پیروی کرنا مشرکوں کا طریقہ ہے۔ فی زمانہ حالت بھی کچھ ایسی ہی ہے کہ اگر کوئی کسی غلط بات پر عمل پیرا ہو اور اسے سمجھایا جائے تو جواب یہی ملتا ہے کہ ہم تو عرصہ دراز سے یونہی کرتے چلے آرہے ہیں، ہم نے تو آج تک کسی کو اس بارے میں کوئی کلام کرتے نہیں سنا، ہمارے بڑے بوڑھے بھی تو یہی کرتے آئے ہیں تم نے دو لفظ کیا پڑھ لیے اب ہمیں بھی سمجھانے لگ گئے۔ ایسے حضرات کو چاہیے کہ اس آیت کریمہ کو سامنے رکھ کر خود غور کرلیں کہ وہ کن کی رَوِش اختیار کئے ہوئے ہیں حق وانصاف، ہدایت اور رہنمائی کا فیصلہ لوگوں کی اکثریت پر نہیں ہوا کرتا۔ اکثریت کے پیچھے چلنے والا گمراہ ہی ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ لوگوں کی اکثریت گمراہ ہوتی ہے۔

رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں منکرین حق اپنی گمراہی کی تائید میں یہ دلیل بھی دیا کرتے تھے کہ اگر آپ سچے ہیں تو آپ کی پیروی کرنے والے تعداد کے لحاظ سے تھوڑے اور وسائل کے اعتبار سے کمزور کیوں ہیں؟ اس کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ لوگوں کی اکثریت ہمیشہ گمراہی پر قائم رہی ہے لہٰذا حق و صداقت کا معیار ٹھوس دلائل ہیں لوگوں کی اکثریت نہیں۔ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کا پابند کیا گیا ہے نہ کہ جمہوریت کا؟ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ دنیا میں گمراہ لیڈر لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے جمہوریت کا بہانہ بنائیں گے اس لیے اس
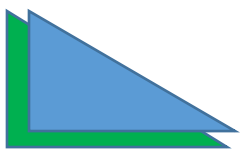
نے جمہوریت کے بت کو پاش پاش کرنے کے لیے اپنے نبی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر آپ بھی عدل وانصاف کے اصول اور قرآن مجید کی ہدایات کو چھوڑ کر محض اکثریت کی اتباع کریں گے تو یہ لوگ آپ کو صراط مستقیم سے ہٹادیں گے۔ اکثریت تو خود ساختہ اصولوں اور اپنے تصورات کی اتباع کرنے کے سوا کسی حقیقت پر قائم نہیں ہوتی۔ قربان جائیں قرآن کے فرمان پر ! دنیا میں جہاں، جہاں بھی جمہوریت کو حق و باطل کا معیار بنایا گیا ہے وہاں یہی اصول ہے کہ جمہوریت کا فیصلہ ہی حق کا معیار ہے اس لیے انتخاب جیتنے والا ہر لیڈر نعرہ لگاتا ہے کہ جمہوریت کا فیصلہ غلط نہیں ہو سکتا لیکن جب الیکشن ہار جاتا ہے تو کہتا ہے کہ میر امد مقابل عوام کو گمراہ کر رہا ہے۔ قرآن مجید جمہوریت کو حق و باطل کا معیار قرار دینے کے اصول اور نظریہ کی نفی کرتا ہے۔ لہٰذا نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم ہوا کہ آپ پورے اخلاص اور دلجمعی کے ساتھ اللہ کی نازل کردہ ہدایت کی طرف بلائیں اور اس پر جمے رہیں اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کون اس کے راستے سے گمراہ ہوا کون خوش نصیب ہدایت یافتہ ہے۔ اس فرمان میں ایک اعتبار سے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دی گئی کہ آپ کا کام سمجھانا ہے منوانا نہیں (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

عقیدہ اور عمل کی گمراہیوں کی تفصیل

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت پر کفار کے شبہات بیان کیے اور ان کے جوابات دیئے۔ اس کے بعد فرمایا جب حق واضح ہو گیا ' پھر بھی اگر کوئی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا انکار کرے اور آپ کے پیغام کو نہ مانے ' تو وہ محض اپنے گمان کی پیروی کرنے والا ہوگا اور گمراہ ہوگا۔

اس آیت میں فرمایا ہے کہ زمین کے اکثر لوگ تمہیں گمراہ کردیں گے اور گمراہ کرنا گمراہ ہونے کی فرع ہے ' اور گمراہی تین چیزوں میں متصور ہو سکتی ہے۔ الوہیت کے اعتقاد میں ' نبوت کے اعتقاد میں اور احکام شرعیہ کے اعتقاد میں۔

الوہیت کے اعتقاد میں گمراہی یہ ہے کہ کوئی شخص خدا کے وجود کو نہ مانے۔ جیسے دہریے ہیں ' یا متعدد خدا مانے ' جیسے مشرکین اور بت پرست ہیں ' یا وہ لوگ جو خدا کے بیٹے مانتے ہیں۔ جیسے عیسائی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اور یہودی حضرت عزیر (علیہ السلام) کو۔

نبوت کے اعتقاد میں گمراہی یہ ہے کہ مطلقاً نبی کو نہ مانے۔ جیسے ہندو ' سکھ اور بدھ مذہب والے یا سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آنے اور ختم نبوت کے بعد کسی اور نبی کی بعثت کا اعتقاد رکھے۔ جیسے مرزائی ' بہائی اور دیندار جو صدیق چن بشو شور کو مانتے ہیں ' یا سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب کو لعنت اور تبرا کرنے والے جیسے رافضی ہیں ' یا آپ کی آل اطہار کو برا کہنے والے جیسے ناصبی ہیں ' یا دونوں کو برا کہنے والے جیسے خارجی ہیں ' یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تنقیص اور بےادبی کرے ' آپ کی زیارت کے لیے سفر کو حرام کہے اور بتوں کے حق میں نازل شدہ آیات کو آپ پر منطبق کرے ' آپ کے فضائل اور کمالات کو کم کرنے اور چھپانے میں کوشاں رہے ' یا جو دوسری جانب غلو کرے ' آپ کے بشر ہونے کا انکار کرے ' یا آپ کے لیے ذاتی علم غیب اور ذاتی قدرت مانے یا آپ کے کمالات اللہ تعالیٰ کے مساوی یا زائد قرار دے۔

اتباع ظن کی مذمت کی وضاحت

اس آیت میں اتباع ظن کی مذمت کی گئی ہے۔اس پر یہ اعتراض ہوگا کہ اخبار آحاد اور قیاس پر جو عمل کیا جاتا ہے وہ بھی تو ظن کے درجہ میں ہے ؟اس کا جواب یہ ہے کہ مشرکین جو ظن کی اتباع کرتے تھے تو اس کا استناد کسی قطعی دلیل پر نہیں تھا۔اس کے برخلاف اخبار آحاد اور قیاس کا استناد 'دلیل قطعی پر ہے جو قرآن مجید ہے۔ (تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعۡلَمُ مَنۡ يَّضِلُّ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ‌ۚ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ ۝١١٧

لغۃ القرآن: اِنَّ : بیشک] [رَبَّكَ : اپنے رب سے] [هُوَ : وہ] [اَعْلَمُ : خوب جاننے والا ہے] [مَنْ : جس پر] [يَّضِلُّ : بھٹکتا ہے] [عَنْ : سے] [سَبِيْلِهٖ : اس کے راستے] [وَهُوَ : اور وہ] [اَعْلَمُ : خوب جاننے والا ہے] [بِالْمُهْتَدِيْنَ : ہدایت پانے والوں کو]

ترجمہ : بیشک آپ کا رب ہی اسے خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بہکا ہے اور وہی ہدایت یافتہ لوگوں سے (بھی) خوب واقف ہے

تشریح:

اس آیت کی تفسیر میں دو قول ہیں۔ایک قول یہ ہے کہ جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے 'تو پھر آپ ان مخالفین کے درپے نہ ہوں 'بلکہ ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں۔اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ کون ہدایت یافتہ ہے اور کون گمراہ ہے ؟ وہ ہر شخص کو اس کے عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے جزادے گا۔دوسرا قول یہ ہے کہ یہ کافر اگرچہ بہت یقین کے ساتھ یہ دعوی کرتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں لیکن وہ جھوٹے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کے احوال پر مطلع ہے 'اس کو معلوم ہے کہ یہ گمراہی کے راستہ میں بھٹک رہے ہیں اور جہالت کی وادیوں میں سرگرداں ہیں۔ (تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ روئے زمین پر بسنے والوں کی اکثریت اہل باطل کی ہے اور اہل باطل کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، صرف ظن و تخمین اور خود ساختہ اندازے ہیں، جن کے پیچھے وہ چل رہے ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ انہیں اپنی اس بے راہ روی اور غلط روش کا کوئی علم بھی نہیں ہے، یہ علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے یا ان لوگوں کے پاس ہے، جنہیں وہ عطا کردے۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

ہدایت کا راستہ محض اقلیت یا اکثریت کو دیکھ کر متعین نہیں کیا جاسکتا۔ رہا جو حدیث میں آیا ہے: اتبعوا السواد الاعظم بڑے گروہ کی پیروی کرو اور لا تجتمع امتی علی الضلالۃ میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔ اس سے مراد امت اجابت ہے یعنی اہل ایمان کبھی گمراہی پر اکٹھے نہ ہوں گے اس میں اجماع امت کی حجیت بتائی گئی ہے۔ (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

سیدنا ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: " میری مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی، جب اس کے گرد روشنی ہوئی تو اس میں کیڑے اور یہ جانور جو آگ میں ہیں گرنے لگے اور وہ شخص ان کو روکنے لگا، لیکن وہ نہ رکے اور اس میں گرنے لگے، یہ مثال ہے میری اور تمھاری، میں تمھیں تمہاری کمر سے پکڑ کر جہنم سے روکنے والا ہوں اور کہتا ہوں کہ جہنم کے پاس سے چلے آؤ، جہنم کے پاس سے چلے آؤ، لیکن تم نہیں مانتے، اسی میں گھسے جاتے ہیں۔
" [مسلم، کتاب الفضائل، باب شفقتہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) علی اِمتہ۔۔ الخ: ۱۸، ۲۲۸۴] (دعوۃ القرآن)

گمراہ اور ہدایت یافتہ

قرآن مجید جس وقت نازل ہوا اس وقت دنیا کے تقریباً تمام لوگ اللہ کے راستے سے ہٹ چکے تھے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب قرآن مجید سنا کر لوگوں کو اصلی باتیں بتانے شروع کیں تو ان پر اپنے غلط راستوں کا چھوڑ نا شاق گزرا کیونکہ وہ ان کے عادی ہو چکے تھے اور نئی تنظیم میں انھیں اپنی موت نظر آتی تھی حالانکہ اصل زندگی کا راز اسی میں پوشیدہ تھا۔

قرآن مجید کے طریق پر مکہ کے لوگ اعتراض کرتے تھے بجائے اس کے کہ اصل بات کے سمجھنے کی کوشش کریں انھیں فقط اعتراض کرنے سے کام تھا مفسرین نے لکھا ہے کہ قرآن مجید نے جب موت سے مرے ہوئے مردہ جانور کا گوشت کھانے سے منع کیا اور اس کو حرام قرار دیا تو اس پر مکہ کے کافروں نے اپنی عادت کے مطابق ناک بھوں چڑھائی اور جو ان میں زیادہ سمجھدار بنتے تھے انھوں نے کہا عجیب بات ہے کہ جس کو اللہ مارے وہ تو حرام اور جس کو انسان خود ذبح کرکے مارے وہ حلال۔ اس کا جواب سمجھانے کے لئے پچھلی آیتوں میں تمہید کے طور پر بیان کیا گیا کہ اللہ کے راستے سے ہٹانے والے ظاہر بات کو بنا سنوار کر کہتے ہیں لیکن ان کی باتوں میں دھوکے بازی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اصل بات یہ ہے کہ حلال و حرام اللہ کے حکم پر موقوف ہے اعتراض کی اصل جڑ یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کے اللہ کو بھی ہماری خواہشوں کا پابند ہونا چاہیے اور جیسے ہمارے بت ہمیں کچھ نہیں کہتے ہم جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اسی طرح اللہ کو بھی ہم پر حکم نہ چلانا چاہیے۔ پچھلی آیتوں میں ان کے خیالات کی غلط بنیاد کی قلعی کھولی اس آیت میں صاف کہہ دیا گیا ہے کہ حکم دینا اللہ کا کام ہے اور اس کا ماننا انسان کا کام ہے۔

ارشاد ہے کہ اللہ کے راستے سے بھٹکنے والوں اور اس کے مقرر کیے ہوئے اور سیدھے راستہ پر چلنے والوں کو سب سے زیادہ اللہ ہی جانتا ہے۔ ان کے واہی تباہی خیالات سے غلط راستہ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ غلط ہمیشہ ہی غلط رہے گا اس لیے تم ان نادانوں کے کہنے سننے کی پرواہ نہ کرو یہ بات غلط

ہے کہ جو جانور خود مر جائے اسے اللہ مارتا ہے اور جو ذبح کیا جائے اسے انسان مارتا ہے سب کو اللہ ہی مارتا ہے لیکن ذبح کے وقت چونکہ اللہ کا نام لیا جاتا ہے اس لیے اس کے نام کی برکت سے اس کا کھانا حلال اور جائز ہو جاتا ہے چنانچہ کوئی چیز اگر اللہ کے نام کے سوا کسی اور کا نام لے کر ذبح کی جائے تو وہ بھی حرام ہے خواہ اسے ذبح کیا گیا ہو لہٰذا حلال ہونا فقط اللہ کے نام اور اس کے حکم سے ہے۔ (درس آسٹریلیا)

آیت مبارکہ :

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ۝۱۱۸

لغۃ القرآن: فَكُلُوْا : تو تم سب کھاؤ] [مِمَّا : "اس "سے جو] [ذُكِرَ : ذکر کیا گیا] [اسْمُ : نام] [اللّٰهِ : اللہ] [عَلَيْهِ : اس پر] [اِنْ : اگر] [كُنْتُمْ : ہو تم] [بِاٰيٰتِهٖ : اس کی آیتوں کو] [مُؤْمِنِيْنَ : سب ایمان رکھنے والے]

ترجمہ : سو تم اس (ذبیحہ) سے کھایا کرو جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیا گیا ہو اگر تم اس کی آیتوں پر ایمان رکھنے والے ہو

تشریح:

جس طرح گمراہ اکثریت کی اتباع جائز نہیں اسی طرح اس جانور کو بھی کھانا جائز نہیں جس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ بیشک حرام کھانے والوں کی اکثریت ہی کیوں نہ ہوں۔

سرزمین حجاز اور مکہ میں ایسے قبائل بھی تھے جو جانور ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لینا مناسب نہیں سمجھتے تھے جس طرح کہ سکھ مذہب کے لوگ جانور حلال کرتے ہوئے اس کا جھٹکا کرتے ہیں پھر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو مردہ جانور کھاتے تھے جب انھیں اس سے روکا جاتا تو وہ کہتے کہ مسلمانوں کی عجب حالت ہے کہ اللہ کے مارے ہوئے کو نہیں کھاتے لیکن اپنے ہاتھ سے مارے ہوئے کو کھا لیتے ہیں۔ اس پر یہ فرمان نازل ہوا کہ مسلمانوں ! تمہارے ایمان کا تقاضا ہے کہ صرف وہی ذبیحہ کھاؤ جس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہو، پھر ان لوگوں کو مخاطب کیا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کا حلال کردہ ذبیحہ نہیں کھاتے جس کو ذبح کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا مبارک نام لیا گیا ہے۔ حرام کھانا تمہارے لیے اس وقت ہی جائز ہو گا جب تمہیں حلال چیز میسر نہ ہو اور تم اسے کھانے کے لیے بے حد اضطرار کی حالت میں ہو۔ اس حکم کی وضاحت کرتے ہوئے فقہاء نے لکھا ہے کہ حرام کھانا اس وقت جائز ہو گا جب آدمی کو یقین ہو کہ واقعی مجھے اس وقت حلال میسّر نہیں ہو سکتا۔ اگر میں کچھ نہ کھاؤں گا تو میری موت واقع ہو جائے گی ایسا شخص اپنے آپ کو مضطر تصور کرتے ہوئے اتنا ہی حرام کھا سکتا ہے جس سے اس کی زندگی بچ سکے۔ اس فرمان سے پہلے گمراہ قسم کی اکثریت کی اتباع سے روکا گیا ہے اب حرام خوری سے منع کرنے کے لیے پھر گمراہ اکثریت کی اتباع سے روکا گیا ہے

کیونکہ لوگوں کی اکثریت کا عالم یہ ہے کہ وہ کسی علمی بنیاد کے بغیر محض اپنے تصورات کی بناء پر حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیتے ہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے حلال و حرام میں تجاوز کرنے والوں کو اللہ خوب جانتا ہے۔

(عن عُمَرَ بن أَبِي سَلَمَةَ (رض) يَقُولُ كُنْتُ غُلَامًا فِي حَجْرِ رَسُولِ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وَكَانَتْ يَدِي تَطِيشُ فِي الصَّحْفَةِ فَقَالَ لِي رَسُولُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يَا غُلَامُ سَمِّ اللّٰهَ وَكُلْ بِيَمِينِكَ وَكُلْ مِمَّا يَلِيكَ فَمَا زَالَتْ تِلْكَ طِعْمَتِي بَعْدُ) [رواہ البخاری : کتاب الأطعمۃ، باب التسمیۃ علی الأکل والأکل بالیمین]

"عمر بن ابی سلمہ (رض) فرماتے ہیں میں بچپن میں رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس تھا اور کھانا کھاتے وقت میرا ہاتھ پیالے میں ارد گرد گھوم رہا تھا مجھے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اے بچے کھانا اللہ کے نام سے شروع کیا کرو دائیں ہاتھ اور اپنے آگے سے کھایا کرو۔ اس کے بعد ہمیشہ کے لیے میرا کھانے کا انداز یہی رہا۔"

(عَنْ جَابِرٍ (رض) عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ لَا تَأْكُلُوا بِالشِّمَالِ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَأْكُلُ بِالشِّمَالِ)

[رواہ مسلم : کتاب الأشربۃ باب اداب الطعام]

"حضرت جابر (رض) رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان نقل کرتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم بائیں ہاتھ سے نہ کھایا کرو بلاشبہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے۔" (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

یعنی جو جانور اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح کیا گیا اسے کھاؤ اور جو اپنی موت مرا یا بتوں کے نام پر ذبح کیا گیا وہ حرام ہے۔ جانور کے حلال ہونے کا تعلق اللہ عَزَّوَجَلَّ کے نام پر ذبح ہونے سے ہے۔

شان نزول

مشرکین مسلمانوں پر اعتراض کرتے تھے کہ تم اپنا قتل کیا ہوا تو کھاتے ہو اور اللہ عَزَّوَجَلَّ کا مارا ہوا یعنی جو اپنی موت مرے اس کو حرام جانتے ہو۔ اس کے جواب میں یہ آیت اتری (1) جس میں فرمایا گیا کہ جو اللہ عَزَّوَجَلَّ کے نام پر ذبح کیا گیا وہ حلال ہے اور جو اس کے نام پر ذبح نہ ہوا وہ حرام ہے۔ اور کافروں کا اعتراض کہ ذبیحہ کو ہم مارتے ہیں اور جو خود مرے اسے اللہ عَزَّوَجَلَّ مارتا ہے تو جو اللہ عَزَّوَجَلَّ کا مارا ہوا ہو وہ حرام کیوں ؟ اس اعتراض کی بنیاد ہی غلط ہے کیونکہ جس جانور کو کوئی شخص مارے اور جو جانور خود مرے بہر حال دونوں کو موت دینے والا اللہ عَزَّوَجَلَّ ہی ہے لہٰذا دونوں صورتوں میں یوں فرق کرنا ہی باطل ہے کہ ایک کو ہم نے مارا اور دوسرے کو اللہ عَزَّوَجَلَّ نے۔ اب رہا یہ کہ ایک حلال اور دوسرا حرام کیوں تو یہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کا حکم ہے اور وہ خالق و مالک ہے جو چاہے حکم فرمائے اور یہ اس کے نام کی تعظیم کی ایک صورت ہے کہ اس کے نام پر ذبح کردہ جانور حلال ہے اور اس کے علاوہ حرام ہے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس کچھ لوگوں نے آکر کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا ہم اس کو کھالیں جس کو ہم نے قتل کیا ہے اور اس کو نہ کھائیں جس کو اللہ نے قتل کیا ہے؟ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اگر تم اللہ کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو تو اس ذبیحہ سے کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

(سنن ترمذی ' ج ۵ ' رقم الحدیث : '۳۰۸۰ 'سنن ابوداؤد ' ج ۳ ' رقم الحدیث : '۲۸۱۹ 'سنن النسائی ' ج ۷ ' رقم الحدیث : '۴۴۴۹ 'السنن الکبری للنسائی ' ج ٦ ' رقم الحدیث : '۱۱۱۷۱)

بعض علماء نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ اگر مسلمان کسی جانور کو ذبح کرے اور اس پر بھول کر بسم اللہ نہ پڑھے تو اس کا کھانا بھی جائز نہیں ہے 'اور فقہاء احناف یہ کہتے ہیں کہ اگر مسلمان بھول کر بسم اللہ نہ پڑھے تو اس ذبیحہ کا کھانا جائز ہے۔ البتہ اگر وہ عمدا بسم اللہ پڑھنے کو ترک کردے 'تو پھر اس ذبیحہ کو کھانا جائز نہیں ہے۔ اس کی تفصیلی بحث سورۃ الانعام : ۱۲۱ 'میں انشاء اللہ آئے گی۔

مشرکین یہ کہتے تھے کہ مسلمان خدا کے مارے ہوئے جانور کو حرام کہتے ہیں اور اپنے مارے ہوئے جانور کو حلال کہتے ہیں 'ان کا یہ قول حماقت پر مبنی تھا۔ کیونکہ دونوں جانوروں کو مارنے والا اللہ ہے۔ البتہ جو طبعی موت مرا ہے اس کی جان خدا کے نام پر نہیں نکلی اور جس جانور کو مسلمانوں نے اللہ کے نام پر ذبح کیا ہے 'اس کی جان خدا کے نام پر نکلی ہے۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

قرآنِ مجید پر ایمان لانے کا تقاضا

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی آیات پر ایمان لانا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جسے اللہ تعالٰی نے حلال فرمایا اسے حلال سمجھا جائے اور اس پر عمل کیا جائے اور جسے حرام فرمایا اسے حرام مانا جائے اور اس سے بچا جائے اور اللہ تعالٰی کے حلال کئے ہوئے کو حرام قرار دینا یا حرام کئے ہوئے کو حلال سمجھنا دونوں قرآن پر ایمان کے منافی ہیں۔ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "قرآن کریم (اجمالی طور پر کلام کی) پانچ قسموں پر اترا : حلال، حرام، مُحکم، مُتَشابہ اور مثالیں للذا حلال کو حلال جانو، حرام کو حرام مانو، محکم پر عمل کرو، متشابہ پر ایمان لاؤ اور مثالوں سے عبرت پکڑو۔

حضرت صہیب (رض) سے روایت ہے، حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "اس شخص کا قرآن پر ایمان نہیں جو اس کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال سمجھے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

آیت مبارکہ :

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ۝۱۱۹

لغۃ القرآن: وَمَا : اور جو] [لَكُمْ : تمہارے لیے] [اَلَّا : کہ نہ] [تَاْكُلُوا : تم سب کھاؤ] [مِمَّا : "اس "سے جو] [ذُكِرَ : ذکر کیا گیا] [اسْمُ : نام] [اللهِ : اللہ] [عَلَيْهِ : اس پر] [وَقَدْ : حالانکہ تحقیق] [فَصَّلَ : اس نے تفصیل سے بیان کردیا ہے] [لَكُمْ : تمہارے لیے] [مَا : نہیں] [حَرَّمَ : حرام کردے گا] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [اِلَّا مَا : مگر جو] [اضْطُرِرْتُمْ : تم مجبور کردیے جاؤ] [اِلَيْهِ : اپنی طرف] [وَ اِنَّ : اور بیشک] [كَثِيْرًا : کثرت سے] [يُضِلُّوْنَ : یقینا وہ سب گمراہ کرتے ہیں] [بِاَهْوَآئِهِمْ : اپنی خواہشات سے] [بِغَيْرِ : بغیر] [عِلْمٍ : علم] [اِنَّ : بیشک] [رَبَّكَ : اپنے رب سے] [هُوَ : وہ] [اَعْلَمُ : خوب جاننے والا ہے] [بِالْمُعْتَدِيْنَ : سب حد سے بڑھنے والوں کو]

ترجمہ :

اور تمہیں کیا ہے کہ تم اس (ذبیحہ) سے نہیں کھاتے جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیا گیا ہے (تم ان حلال جانوروں کو بلاوجہ حرام ٹھہراتے ہو)؟ حالانکہ اس نے تمہارے لیے ان (تمام) چیزوں کو تفصیلاً بیان کر دیا ہے جو اس نے تم پر حرام کی ہیں، سوائے اس (صورت) کے کہ تم (محض جان بچانے کے لئے) ان (کے بقدر حاجت کھانے) کی طرف انتہائی مجبور ہو جاؤ (سو اب تم اپنی طرف سے اور چیزوں کو مزید حرام نہ ٹھہرایا کرو)۔ بیشک بہت سے لوگ بغیر (پختہ) علم کے اپنی خواہشات (اور من گھڑت تصورات) کے ذریعے (لوگوں کو) بہکاتے رہتے ہیں، اور یقیناً آپ کا رب حد سے تجاوز کرنے والوں کو خوب جانتا ہے

تشریح:

جب ایک جانور کے ذبح پر اللہ کا نام لیا گیا ہے تو کسی انسان کو اس کے کھانے سے کیا عذر ہو سکتا ہے اور کیوں ہو سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ جانور کن صورتوں میں حرام (مردار) ہو جاتا ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ مجبوری میں مردار کا کھانا کس صورت میں جائز ہے۔ یہ اس آیت کی طرف اشارہ ہے:

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ "آپ فرماتے جو وحی مجھ پر کی گئی ہے اس میں میں کسی کھانے والے پر کوئی چیز حرام نہیں پاتا مگر یہ کہ جانور مردار ہو یا بہتا خون یا خنزیر کا گوشت کے وہ سراپا ناپاک ہے، سراپا گناہ جانور جس کے ذبح پر پر غیر خدا کا نام پکارا گیا پھر جو ایسا گوشت کھانے پر مجبور ہو جائے نہ اس کی خواہش ہو نہ حد سے بڑھے تو تمہارا رب بخشنے والا مہربان ہے۔

" (الانعام: 145)

اس آیت میں واضح کر دیا گیا ہے کہ کوئی حلال جانور تب حرام ہوتا ہے جب وہ مردار ہو یعنی بغیر ذبح مر جائے یا اسے اللہ کا نام لئے بغیر ذبح کر دیا جائے گا غیر خدا کے نام پر ذبح کیا جائے اس کے علاوہ اس کے حرام ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے مگر جب ایک جانور کو اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا گیا کہ اے مشرکو! پھر تم اس کو کیوں نہیں کھاتے۔

ختم شریف کے کھانے کی حلت

اس آیت میں وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ سے ختم شریف کے کھانے کی حلت معلوم ہوئی۔ یعنی اس آیت میں ان لوگوں کے لیے عبرت ہے جو رقیق دلائل کے سہارے میلاد النبی گیارہویں عرس بزرگان دین اور ختم قرآن شریف کی محافل کے لیے ذبح کردہ جانور کو حرام کہتے ہیں بلکہ ختم شریف کے لیے رکھے جانے والے ہر قسم کے طعام کو حرام جانتے ہیں حالانکہ اس پر نہ صرف اللہ کا نام لیا جاتا ہے بلکہ قرآن کا کثیر حصہ تلاوت کیا جاتا ہے۔ قرآن ان لوگوں سے پوچھتا ہے: وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ۔ یعنی تمہیں کیا عذر ہے کہ تم اس چیز کو نہیں کھاتے ہو جس پہ اللہ کا نام لیا گیا ہے جبکہ اللہ نے تمہیں تفصیلاً بتا دیا ہے کہ اس نے تم پہ کیا حرام کیا ہے۔

اب ختم شریف گیارہویں اور میلاد النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے پکائے جانے والے کھانے کو حرام کہنے والے علماء (بلکہ جہلاء) بول اٹھے کہ اللہ نے وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فرمایا ہے اس سے ان چیزوں کی حرمت ثابت ہے کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ ہر وہ چیز حرام ہے جو از راہ قربتوں غیر خدا کی طرف منسوب کی جائے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہی سے ہر گمراہی شروع ہوتی ہے کہ کسی آیت کا من مانا ترجمہ کیا جائے اور وہ مفہوم چھوڑ دیا جائے جو صحابہ کرام تابعین اور اجلہ مفسرین نے بیان کیا ہو۔ پیچھے سورۃ بقرہ آیت 172 میں وما اھل بہ لغیر اللہ کے الفاظ گزرے ہیں۔ وہاں ہم نے حضرت عبداللہ بن عباس

(رض) کا قول نقل کیا ہے کہ انھوں نے اس کا معنی بتایا: ماذبح الانصاب والاصنام، یعنی وہ جانور جو کعبہ کے گرد نصب شدہ بتوں اور دوسرے جھوٹے خداؤں کے نام پر ذبح کیا جائے پھر مجاہد تابعی کا بھی ایسا ہی قول ہے اور امام قرطبیؒ نے فرمایا اس پر سب مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اس سے مراد وہ جانور ہے جو غیر خدا کے نام پر ذبح کیا جائے تو اس اجماعی موقف سے ہٹ کر قرآن کی تفسیر کرنا قرآن کی معنوی تحریف ہے اور اس کی بنیاد پر اللہ کے حلال کردہ رزق کو حرام کہنا عذاب خداوندی کو دعوت دینے کے مترادف اور مشرکین عرب کی پیروی ہے مسلمانوں کو شرک کا فتوی دینے والے مشرکین کے پیروکار ہیں، اللہ اکبر۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں مشرکین نے کہا یہ کیا بات ہے جو جانور ہم ذبح کریں وہ حلال ہے اور جسے اللہ ہمارے یعنی بغیر ذبح از خود مر جائے وہ حرام ہے یہ کیوں؟ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مردار جانور کو حرام کہنے والے لوگ دوسروں کو کسی علم یعنی پختہ دلیل کے بغیر محض اپنی خواہشات کے ذریعہ گمراہ کرتے ہیں۔

جبکہ مردار کی حرمت مضبوط علم و حکمت کی بنیاد پر ہے کیوں کہ جو جانور بغیر ذبح مر گیا اس کا خون اس کی رگوں اور خون میں سرایت کر گیا ایسا گوشت کھانا گویا خون کا کھانا پینا ہے اور ایسا گوشت صحت کے لیے زہر ناک ہے پھر جانور کا نام خدا پہ ذبح کیا جانا آسمانوں میں ہے کہ اس میں جان پیدا کرنے والا اللہ ہے لہٰذا اسی کے نام پر اس کی جان نکالی جائے اس مفہوم کو لوگوں کے دلوں میں گہرا کرنے کے لیے بوقت ذبح نام خدا کا پکارنا لازم قرار دیا گیا اور اس کے برخلاف نظریہ رکھنے والے حد سے تجاوز کرتے ہیں جنہیں اللہ خوب جانتا ہے۔

(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

یعنی اس جانور کو کھانے سے کیا چیز تمہیں روک رہی ہے جسے اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح کیا گیا ہے حالانکہ جو چیزیں حرام تھیں وہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں تفصیل سے بیان فرمادی ہیں اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں فرمایا اسے حرام سمجھنا کیسی حماقت ہے۔

حرام چیزوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ ہوتا ہے:

اس سے معلوم ہوا کہ قانون یہ ہے کہ حرام چیزوں کا مفصل ذکر ہوتا ہے اور جس چیز کو حرام نہ فرمایا گیا ہو وہ حلال ہے۔ حرام چیزوں کا تفصیلی بیان متعدد سورتوں میں اور سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فرامین میں موجود ہے۔ یونہی مجبوری کی حالت میں حرام چیز کھانے کا بیان قرآن پاک میں کئی جگہ موجود ہے۔

{ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ : اور بیشک بہت سے لوگ گمراہ کرتے ہیں۔ } کفار بحیرہ اور سائبہ بتوں پر چھوٹے ہوئے جانوروں کو تو حرام جانتے ہیں اور جو جانور غیر خدا کے نام پر ذبح ہوں یا خود مر جائیں انھیں حلال جانتے ہیں حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے لہٰذا ان جاہلوں کی بات نہ مانو۔

حلال چیزیں حرام قرار دینے والوں کو نصیحت

اس آیت کریمہ کو پڑھ کر وہ لوگ غور کریں جو اپنی نفسانی خواہشات کی وجہ سے چیزوں کو حرام یا حلال قرار دے کر گمراہ کرتے ہیں، شریعت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اسی طرح ان حضرات کو بھی غور کرنے کی حاجت ہے جو اس جانور کو حرام کی صف میں داخل کر دیتے ہیں کہ جسے ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ذبح کیا گیا اور اس سے مقصود کسی ولی یا بزرگ کو ثواب پہنچانا تھا۔

{اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِیْنَ: بیشک تیرا رب حد سے بڑھنے والوں کو خوب جانتا ہے۔} یعنی اے حبیب! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، آپ کا رب عَزَّوَجَلَّ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جنہوں نے اس چیز کو حرام قرار دے دیا جسے اللہ عَزَّوَجَلَّ نے حلال کیا اور جسے اس نے حرام کیا اسے حلال کہہ دیا، اللہ تعالیٰ انھیں ان کی حرکتوں کی سزا دے گا۔ (1)

اس آیت مبارکہ سے ان لوگوں کو بھی ڈرنا چاہیے جو بغیر علم محض اپنی رائے سے حرام و حلال کا غلط فتویٰ دیتے ہیں۔

(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

لفظی تحقیق: اضطررتم: تم مجبور ہو جاؤ۔ یہ "اضطرار" سے ہے جو کہ "ضر" سے بنا ہے، "ضر" کے معنی تنگی، سختی، لاچارگی کے ہیں، "اضطرار" کے معنی ہیں تنگی میں پھنسانا جس میں کوئی چارہ ہی نہ رہے۔

اس آیت میں پچھلی آیت کی مزید وضاحت ہے، یعنی: یہ کہا گیا ہے کہ یہ ذبح کیے ہوئے جانور وہ ہونے چاہئیں جن کو تم پر حرام نہیں کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے کہ تمہیں اس سے پہلے واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ کون کون سی چیز تم پر حرام ہیں ان چیزوں کو سوائے اس حالت کے تمہاری جان ہی نکلنے لگے مت کھاؤ، اس مقصد کے لئے جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اس کا معنٰی یہ ہے کہ "سوائے اس کے جس کے لئے تم مجبور ہو جاؤ" اس کے سوا جو حلال جانور اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ذبح کیا جائے اسے شوق سے کھاؤ جس جانور کی موت کے وقت کوئی انسان اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اس کو ذبح کر دے اس کا گوشت بھی حلال ہے، ان باتوں کو وہی سمجھتے ہیں جن کو حقیقت کا علم ہے مگر یہ لوگ سرکش ہیں اللہ تعالیٰ انہیں خوب جانتے ہیں۔

ومالکم الا تأکلوا مما ذکر اسم اللہ علیہ: اور تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم وہ چیز نہیں کھاتے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے ایسی چیز تو حلال طیب ہے، حلال و حرام کی تمیز کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آنی چاہیے، کیونکہ تمہارے سامنے ان چیزوں کی تفصیل بیان ہو چکی ہے جو تم پر حرام ہیں، "سورۃ بقرہ اور سورۃ نحل" میں اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہوئی چیزوں کی تفصیل بیان کر دی ہے، لہٰذا اس کی روشنی میں شعری طریقہ (رگ کاٹنے) سے ذبح کیے ہوئے حلال جانور کا گوشت شوق سے کھا سکتے ہو اسی طرح تمہارے لئے حرام چیزوں سے پرہیز بھی لازمی ہے سوائے اس کے کہ جس کی طرف تم مجبور کر دیے گئے ہو، مجبوری کی حالت میں حرام چیز کھانے کی بھی اجازت ہوتی ہے جب جان جانے کا خطرہ ہو تو اس وقت خنزیر اور مردار وغیرہ بھی کھایا جا سکتا ہے اور ایسی حالت میں استعمال کرنے پر کوئی گناہ عائد نہیں ہوتا، البتہ اگر وہ مجبوری کی حالت میں کھائے بغیر مر جائے تو اللہ تعالیٰ کی پکڑ میں آ جائے گا کیونکہ اس کے لیے جان کی حفاظت لازم تھی جب کہ مجبوری کی حالت میں حرام چیز حرام نہیں رہتی بلکہ اس کا استعمال جائز ہو جاتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جن جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے ان کا گوشت انسانی صحت کے لیے نقصان دہ ہے، بعض حرام کی ہوئی چیزوں سے جسمانی صحت خراب ہوتی ہے اور بعض چیزوں سے روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقیانیت پر برا اثر پڑتا ہے، حرام چیزوں کی حرمت میں یہی حکمت ہے کہ وہ کسی نہ کسی صورت میں انسان کے لیے نقصان دہ ہیں اسی طرح جن جانوروں کا گوشت انسانی جسم کے لیے فائدہ مند ہے ان کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے، چنانچہ آگے اسی سورۃ میں ان حلال مویشیوں کی تفصیل آرہی ہے جو گھاس کھاتے ہیں، پالتو ہونے کی وجہ سے لوگوں کے قریب رہتے ہیں اور انسانوں سے مانوس ہوتے ہیں، لوگ ان کا دودھ پیتے ہیں، اون استعمال کرتے ہیں اور گوشت بھی کھاتے ہیں، یہی جانور کھیتی پہاڑی اور سامان اٹھانے کے کام بھی آتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو حلال قرار دیا ہے، البتہ گوشت استعمال کرنے کے لئے ضروری شرط یہ ہے کہ جانور کو گلے پر چھری چلاتے وقت اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو۔

مجبوری کی حالت میں جب کہ آدمی جانور تک پہنچنے کی قدرت نہیں رکھتا ہو تو اس صورت میں اس جانور کو شکار کے جانور کی طرح ذبح مقررہ طریقے کے خلاف کیا جاسکتا ہے، مثلا: اونٹ بھاگ گیا ہے اور کسی طرح قابو میں نہیں آرہا ہے کوئی جانور کنویں میں گر گیا ہے اور مر جانے کا خطرہ ہے تو ایسی صورت میں اگر جسم کے کسی حصے پر بھی زخم لگا کر خون بہا دیا گیا تو جانور حلال ہوگا ایسی صورت میں گلا کاٹنا ضروری نہیں ہوتا، اس کے متعلق "ترمذی شریف" میں روایت موجود ہے کہ پوچھنے والے نے پوچھا کہ اس قسم کی مجبوری کی حالت میں ذبح کا کیا حکم ہے تو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اگر نیزہ یا کسی دوسرے تیز دہار آلہ سے زخم لگا دیا جائے جس سے خون نکل جائے تو جانور حلال ہو جائے گا خواہ زخم جسم کے کسی بھی حصے پر لگے، پرندوں کے شکار کا بھی یہی حکم ہے ان کو پکڑ کر ذبح کرنا مشکل ہوتا ہے، لہٰذا اگر تیر نیزہ چلاتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لے لیا گیا تو جانور حلال ہو جائے گا کبھی شکار کے پیچھے کتا باز یا شکرا وغیرہ چھوڑنا پڑتا ہے اسے چھوڑتے وقت بھی اللہ تعالیٰ کا نام لینا ضروری ہے۔ یہ حکم اس صورت میں ہے کہ زخم لگنے سے جانور یا پرندہ کی جان نکل گئی ہو اور اگر جانور یا پرندہ کی جان نہ نکلی ہو اور آدمی اس جانور یا پرندہ پر پہنچ جائے تو اس صورت میں ان کے گلے پر چھری چلاتے وقت اللہ کا نام لے کر قاعدے کے موافق ذبح کرنا ضروری ہے۔

وان کثیرا لیضلون باھوآئھم بغیر علم: بے شک بہت سے لوگ صرف اپنی خواہشوں کی وجہ سے بغیر علم کے گمراہ کرتے ہیں، مشرکوں کا یہ پراپگینڈہ کہ مسلمان اپنا مارا ہوا کھاتے ہیں اور خدا کا مارا ہوا نہیں کھاتے اسی سلسلہ کی کڑی ہے وہ ایسے اعتراض کرکے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بے شک آپ کا رب زیادتی کرنے والوں کو خوب جانتا ہے جو اس قسم کی بے ہودہ باتیں کرتے ہیں ان کی پکڑ ضرور ہوگی۔

احکام و مسائل

مسئلہ (1)۔ خشکی کے جانوروں کے ذبح کے لئے دو شرطوں کا پایا جانا لازمی ہے ایک جانور کے گلے پر اس طرح چھری چلانا کہ جس سے اس کی شہ رگیں، سانس کی نالی، اور نرخرہ کٹ جائے اور دوسرا اللہ تعالیٰ کا نام لینا جب تک یہ دو شرطیں پوری نہ ہوں ذبح درست نہیں ہوگا اور جب ان شرطوں کے ساتھ ذبح کر دیا جائے تو کھانا حلال ہو جائے گا۔

مسئلہ (2)۔ اگر ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام جان بوجھ کر چھوڑ دیا تو جانور حرام ہوگا، البتہ اگر بسم اللہ، اللہ اکبر کہنا بھول گیا تو معاف ہے کیونکہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان ہے کہ، ہر مومن کے دل میں اللہ تعالیٰ کا نام ہوتا ہے "۔

مسئلہ (3)۔ ذبح کرتے وقت جانور سے جو خون نکلتا ہے وہ حرام بھی ہے اور نہ پاک بھی۔

مسئلہ (4)۔ شکار کے جانور کے حلال ہونے کے لئے گلے پر چھری پھیرنا ضروری نہیں جیسا کہ ابھی اشارہ گزرا بلکہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اس طرح نیزہ وغیرہ مارا جائے جس سے خون بہہ جائے تو اس کا کھانا حلال ہوگا بشر طیکہ شکاری کے پہنچنے سے پہلے جانور مر جائے لیکن اگر جانور زندہ ہو تو پھر پہلے اس کے گلے پر چھری چلا کر ذبح کرنا ضروری ہے۔

مسئلہ (5)۔ پانی کے جانور بغیر ذبح کیے حلال ہیں، مثلا: زندہ مچھلی پکڑ کر کنارہ پر پھینک دی اور وہ مر گئی تو وہ حلال ہے، اور اسی طرح اگر کسی غیر مسلم نے مچھلی پکڑ کر کنارہ پر پھینک دی اور وہ مر گئی تو وہ بھی حلال ہے، اس لئے کہ یہ پانی کے جانور بغیر ذبح کے حلال ہیں۔ (تفسیر ربانی)

آیت مبارکہ:

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ ۱۲۰

لغۃ القرآن: وَذَرُوْا : اور سب چھوڑ دو] [ظَاهِرَ : ظاہر] [الْاِثْمِ : گناہ] [وَبَاطِنَهٗ : اور اس کے چھپے ہوئے کو] [اِنَّ : بیشک] [الَّذِیْنَ : وہ لوگ جو] [یَكْسِبُوْنَ : وہ سب کماتے ہیں] [الْاِثْمَ : گناہ کی] [سَیُجْزَوْنَ : عنقریب وہ سب بدلہ دیے جائیں گے] [بِمَا : اس وجہ سے جو] [كَانُوْا : تھے] [یَقْتَرِفُوْنَ : وہ سب کرتے]

ترجمہ: اور تم ظاہری اور باطنی (یعنی آشکار و پنہاں دونوں قسم کے) گناہ چھوڑ دو۔ بیشک جو لوگ گناہ کما رہے ہیں انھیں عنقریب سزا دی جائے گی ان (اَعمالِ بد) کے باعث جن کا وہ ارتکاب کرتے تھے

تشریح:

ہر قسم کے گناہوں سے باز آنے کا حکم دیا جا رہا ہے خواہ ان کا تعلق اعضا جسمانی سے ہو یا دل سے، خواہ ان کا ارتکاب مجمع عام میں کیا جائے یا لوگوں سے چھپ کر۔ کیونکہ گناہ اپنی ذات یا سوسائٹی کے حقوق کو پامال کرنے کا نام ہے۔ اور اسلام کسی صورت میں بھی نہ اس کی اجازت دے سکتا ہے اور نہ اسے برداشت کر سکتا ہے۔ ایک پاک معاشرہ ہے۔ تب ہی معرض وجود میں آ سکتا ہے جب اس کے افراد کے ظاہری اعضا بھی کسی پر زیادتی نہ کریں اور ان کے دل بھی برے خیالات سے پاک ہوں۔ ان کی جلوت اور خلوت دونوں یکساں طور پر پاکیزہ ہوں۔ زمانہ جاہلیت کے عرب چھپ کر

زنا کرنے کو حلال سمجھتے تھے۔ آج بھی یورپ کا جاہلی تمدن گناہ کی اس تفریق کا قانونی طور پر معترف ہے۔ اسلام جس معاشرہ کی تشکیل کے لیے کوشاں ہے وہاں گناہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ جلوت وخلوت یکساں طاہر، ظاہر و باطن دونوں پاک۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

ظاہری اور باطنی گناہ کی تفسیر میں دو قول ہیں : (1) ظاہری گناہ سے مراد وہ گناہ ہیں کہ جن کا ارتکاب اعلانیہ اور مجمع عام میں ہو اور باطنی گناہ سے مراد وہ گناہ ہیں جو چھپ کر کئے جائیں۔ (2) ظاہری گناہ سے مراد وہ گناہ ہیں جو ظاہری اعضاء سے کئے جائیں اور باطنی گناہ سے مراد وہ گناہ ہیں جو دل سے کئے جائیں جیسے حسد، تکبر، ریاکاری، بغض وکینہ، بدگمانی اور برے کاموں کو پسند کرنا وغیرہ۔ (1) اس کے علاوہ بھی کئی اقوال ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت مبارکہ میں ہر طرح کے گناہوں سے باز رہنے کا حکم دیا گیا ہے چاہے گناہ کا تعلق جسم سے ہو یا دل سے یا نیت وارادہ سے، علانیہ گناہ ہو یا چھپ کر۔ (2)

{اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡسِبُوۡنَ الۡاِثۡمَ : بیشک جو لوگ گناہ کماتے ہیں۔} یعنی وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے منع کئے ہوئے کام کرتے ہیں اور ان گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حرام کئے ہیں تو انھیں عنقریب آخرت میں دنیا میں کئے ہوئے گناہوں کی سزا دی جائے گی۔

(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان جمادات کی طرح بے اختیار و بے ارادہ نہیں۔ بلکہ اس کے افعال اس کے اختیار وارادہ سے صادر ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس کے اعمال کے متعلق اس سے باز پرس ہوگی۔ لیکن اس کا یہ اختیار اور ارادہ اسے اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت سے باہر نہیں کر دیتا۔ یہ ارادہ اسی کا عطا فرمودہ ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

ظاہر اور پوشید گناہوں کی ممانعت

قرآن مجید کی ایک اور آیت میں ظاہر اور خفی گناہوں سے منع فرمایا ہے :

(آیت) "ولا تقربوا الفواحش ماظهر منها ومابطن"۔ (الانعام : ۱۵۱)

ترجمہ : اور بے حیائی کے کاموں کے قریب نہ جاؤ 'جو ان میں سے ظاہر ہوں اور جو پوشیدہ۔

ضحاک نے بیان کیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جو لوگ چھپ کر زنا کرتے تھے 'اس کو وہ حلال کہتے تھے اور عدی نے بیان کیا ہے کہ جو لوگ بدکار عورتوں کی دکانوں پر جاکر زنا کرتے تھے اس کو برا جانتے تھے اور سعید بن جبیر نے کہا ظاہری گناہ ماؤں بیٹیوں اور بہنوں سے نکاح کرنا تھا اور باطنی گناہ زنا کرنا تھا 'اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کے گناہوں کی ممانعت کردی۔ (جامع البیان 'جز ۸ 'ص ۲۰ مطبوعہ دارالفکر 'بیروت)

اثم کا معنی

علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ ھ نے لکھا ہے کہ اثم ان افعال کو کہتے ہیں جو ثواب کو ساقط کرنے موجب ہوتے ہیں۔ نیز انھوں نے لکھا ہے ! ثم عدوان سے عام ہے۔ (المفردات 'ص ۱۰ 'مطبوعہ ایران '۱۳۶۴ھ)

علامہ فیروز آبادی متوفی ۸۱۷ھ نے لکھا ہے اثم کا معنی ہے ذنب (گناہ) خمر اور قمار اور ہر ناجائز کام کرنے کو اثم کہتے ہیں' اور اثیم کا معنی ہے کذاب۔ (القاموس المحیط 'ج ۴ 'ص ۹۹ 'مطبوعہ داراحیاء التراث العربی 'بیروت)

اثم کی تعریف اور مصادیق کے متعلق احادیث

حضرت نواس بن سمعان انصاری (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بر (نیکی) اور اثم (گناہ) کے متعلق سوال کیا؟ آپ نے فرمایا بر اچھے اخلاق ہیں اور اثم وہ کام ہیں جو تمہارے دل میں اضطراب پیدا کریں اور جس کام پر تم لوگوں کے مطلع ہونے کو ناپسند کرو۔
(صحیح مسلم البر '۱۴ '(۲۵۵۳) ۶۳۹۶ 'سنن الترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث : '۲۳۹۶ 'صحیح ابن حبان 'رقم الحدیث : '۳۹۷ 'الادب المفرد 'رقم الحدیث : '۳۰۲ '۲۹۵ 'مسند احمد 'ج ۶ 'رقم الحدیث : '۱۷۶۵ 'طبع دارالفکر)
حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کونسا اثم سب سے بڑا ہے؟ آپ نے یہ کہ تم اللہ کے لیے شریک قرار دو 'حالانکہ اس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ میں نے عرض کیا 'یارسول اللہ ! پھر کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ کہ تم اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرو۔ (شیخ احمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے)
(مسند احمد 'ج ۴ 'رقم الحدیث : '۴۴۱۱ 'طبع دارالحدیث قاہرہ 'مسند احمد 'ج ۱ 'ص ۴۶۲ 'طبع قدیم 'بیروت)
اس حدیث کو امام بخاری نے بھی روایت کیا ہے 'مگر اس میں اثم کی جگہ ذنب کا لفظ ہے۔
(دیکھئے صحیح البخاری 'رقم الحدیث : '۴۷۶۱ '۶۰۰۱ '۶۸۱۱ '۶۸۶۱ '۷۵۲۰ '۷۵۳۲ 'نیز دیکھئے صحیح مسلم 'رقم الحدیث : '۱۴۱ 'سنن ابوداؤد 'رقم الحدیث : '۲۳۱۰ 'سنن الترمذی 'رقم الحدیث : '۳۱۹۳ 'السنن الکبری للنسائی 'رقم الحدیث : '۱۰۹۸۷ 'مسند احمد 'ج ۱ 'ص ۳۸۰ 'طبع قدیم 'ان تمام احادیث میں اثم کی جگہ ذنب کا لفظ ہے)
خیثمہ بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے 'اتنے میں ان کا قہرمان (کار مختار 'آمدنی اور مصارف کا ذمہ دار) آیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) نے اس سے پوچھا کیا تم نے غلاموں کو کھانا کھلا دیا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) نے کہا جاؤ ان کو کھانا کھلاؤ۔ پھر کہا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کسی شخص کے اثم (گناہ) کے لیے یہ کافی ہے یہ وہ ان لوگوں کا کھانا روک لے جن کو کھلانے کا وہ ذمہ دار ہے۔
صحیح مسلم 'زکوۃ '۴۰ '(۹۹۶) ۲۲۷۵ 'سنن ابوداؤد 'رقم الحدیث : ۱۶۹۲)
حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تمہارے اثم (گناہ) کے لیے یہ کافی ہے کہ تم ہمیشہ لڑتے جھگڑتے رہو۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث غریب ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ (سنن الترمذی 'ج ۳ 'رقم الحدیث : '۲۰۰۱ 'المعجم الکبیر 'ج ۱۱ 'رقم الحدیث : '۱۱۰۳۲)

دل کے افعال پر مواخذہ کے دلائل

ظاہر گناہ سے مراد وہ گناہ ہیں جو علانیہ اور کھلم کھلا کیے جائیں اور پوشیدہ گناہ سے مراد وہ گناہ ہیں جو چھپ کر کیے ہیں۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ ظاہری گناہ سے مراد وہ گناہ ہیں جو گناہ ہیں جو ظاہری اعضاء سے کیے جائیں اور پوشیدہ گناہ سے مراد وہ گناہ ہیں جو دل سے کیے جائیں۔ مثلا تکبر 'حسد 'خود پسندی 'مسلمانوں کا برا چاہنا 'حرام کاموں کا ارادہ کرنا 'بدگمانی کرنا 'بے حیائی کے کاموں سے محبت کرنا۔ بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ صرف اعضاء کی معصیت پر مواخذہ ہوتا ہے اور دل کے برے کاموں پر مواخذہ نہیں ہوتا 'یہ قول صحیح نہیں ہے اور قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے مردود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(آیت) "ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشة فی الذین امنوا لھم عذاب الیم فی الدنیا والاخرة"۔ (النور: ١٩)

ترجمہ: بیشک جو لوگ مسلمانوں میں بے حیائی پھیلانا پسند کرتے ہیں ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔

اس آیت میں مسلمانوں کے اندر بے حیائی کی بات پھیلنے کے پسند کرنے پر عذاب کی وعید فرمائی ہے اور یہ پسند کرنا دل کا فعل ہے۔

احنف بن قیس بیان کرتے ہیں کہ میں اس شخص (حضرت علی (رض) کی مدد کرنے کے لیے جانے لگا 'تو میری ملاقات حضرت ابوبکرہ (رض) سے ہوئی۔ انھوں نے پوچھا تم کہاں جا رہے ہو؟ میں نے کہا میں اس شخص کی مدد کروں گا 'انھوں نے کہا لوٹ جاؤ۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب دو مسلمانوں تلواروں سے لڑتے ہیں تو قاتل اور مقتول دونوں دوزخی ہیں 'میں نے عرض کیا یارسول اللہ! یہ تو قاتل ہے 'مقتول کا کیا قصور ہے؟ آپ نے فرمایا وہ بھی اپنے مقابل کو قتل کرنے پر حریص تھا۔

(صحیح البخاری 'ج ١ 'رقم الحدیث: '٣١ 'ج ٧ "رقم الحدیث: '٦٨٧٥ 'ج ٨ 'رقم الحدیث: '٧٠٨٣ 'صحیح مسلم 'فتن '١٤' (٢٨٨٨) ٧١١٩ ' سنن ابوداؤد 'ج ٤ 'رقم الحدیث: '٤٢٦٨' ٤٢٦٩ 'سنن النسائی 'ج ٧ 'رقم الحدیث: '٤١٢٠' ٤١١٦ 'سنن ابن ماجہ 'ج ٢ 'رقم الحدیث: ' ٣٩٦٥ 'سنن کبری 'ج ٨ 'ص ١٩٠ 'حلیہ الاولیاء 'ج ٣ 'ص ٣٠٣ 'ج ٦ 'ص ٢٦٤ 'الکامل لابن عدی 'ج ٧ 'ص ٢٦٥٠ 'مشکوۃ رقم الحدیث: ٣٥٣٨)

اس حدیث میں کسی مسلمان کو قتل کرنے کی حرص پر عذاب کی وعید ہے اور یہ حرص دل کا فعل ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص کے دل میں ایک ذرہ کے برابر بھی تکبر ہو 'وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ ایک شخص نے کہا ایک آدمی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں 'اس کی جوتی اچھی ہو 'آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ تکبر حق کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔

(صحیح مسلم 'ایمان ١٤٧ '(٩١) ٢٥٩ 'سنن الترمذی 'ج ٣ 'رقم الحدیث: '٢٠٠٦ 'صحیح البخاری 'ج ٧ 'رقم الحدیث: '٦٦٥٧ 'سنن ابوداؤد 'ج ٤ 'رقم الحدیث: '٤٠٩١ 'سنن ابن ماجہ 'ج ١ 'رقم الحدیث: '٥٩ 'ج ٢ 'رقم الحدیث: '٤١١٦ 'صحیح ابن حبان 'ج ١٢ 'رقم الحدیث: '٥٦٨٠ ' مسند احمد 'ج ٢ 'رقم الحدیث: '٣٩١٣ 'سنن کبری للبیہقی ج ١٠ 'ص ١٩٤)

حضرت انس (رض) بیان کرتے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ایک دوسرے سے قطع تعلق نہ کرو 'دشمنی نہ رکھو 'بغض نہ رکھو 'حسد نہ کرو 'اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن جاؤ اور کسی مسلمان کے لیے تین دن سے زیادہ اپنے بھائی کو چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ امام ابوعیسیٰ نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

سنن الترمذی 'ج ۳ 'رقم الحدیث : '۱۹۴۲ 'صحیح البخاری 'ج ۷ 'رقم الحدیث : '۶۰۷۶ 'صحیح البخاری 'ج ۷ 'رقم الحدیث : '۶۰۷۶ 'صحیح مسلم ' رقم الحدیث : '۲۵۵۹ 'سنن ابوداؤد 'ج ۴ 'رقم الحدیث : '۴۹۱۰ 'صحیح ابن حبان 'ج ۱۲ 'رقم الحدیث : '۵۶۶۰ 'مصنف عبدالرزاق 'ج ۱۱ 'رقم الحدیث : '۲۰۲۲۲ 'مسند احمد 'ج ۴ 'رقم الحدیث : '۱۲۰۷۴ 'موطا امام مالک 'رقم الحدیث : '۱۶۸۳ 'مسند الطیالسی 'رقم الحدیث : '۲۰۹۱ 'سنن کبریٰ للبیقی 'ج ۷ ص ۳۰۳)

اس حدیث میں ایک دوسرے سے دشمنی رکھنے 'بغض رکھنے اور حسد کرنے سے منع فرمایا ہے 'اور یہ سب دل کے افعال ہیں۔

(تفسیر تبیان القرآن۔غلام رسول سعیدی)

گناہ ہر صورت میں گناہ ہے چاہے چھپ کر کیا جائے یا اعلانیہ۔اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کے گناہوں کو ترک کرنے کا حکم دیا ہے۔بعض معاشروں میں چھپ کر گناہ کرنا عیب نہیں سمجھا جاتا اور جب وہ منظر عام پر آجائے تو بدنامی (Scandal) بن جاتا ہے،مگر اسلام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس نے پوشیدہ اور اعلانیہ ہر قسم کے گناہوں کو جرم قرار دیا ہے اور جو لوگ ان میں سے کسی کا ارتکاب کرتے ہیں انھیں اس کی سزا دی جائے گی۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

صرف حرام کھانا ہی نہیں چھوڑنا بلکہ خفیہ اور اعلانیہ گناہ بھی چھوڑ دینے چاہئیں

اس سے پہلے حکم میں مجبور انسان کو حرام کھانے کی اجازت دی گئی تھی جس سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھا سکتا تھا کیونکہ کسی دوسرے کو کیا معلوم کہ حرام کھانے والا کس حد تک مجبور ہے۔یعنی حالت کا صرف متعلقہ آدمی کو ہی معلوم ہوتا ہے۔اس لیے واضح کر دیا گیا کہ مومن وہ ہے جو پوشیدہ اور کھلے گناہوں کو چھوڑ دیتا ہے۔لہٰذا انتباہ فرمایا کہ جو لوگ خفیہ یا اعلانیہ گناہ کریں گے بہت جلد سزا سے دوچار ہوں گے۔ جلد سے مراد دنیا میں اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی شکل میں گرفت ہو سکتی ہے پھر آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی نہایت مختصر ہے۔اس لحاظ سے آخرت کی سزا بھی بہت جلد ملنے والی ہے اللہ سے ڈرنے والا شخص ہمیشہ آخرت کو قریب ہی سمجھا کرتا ہے۔آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان ہے کہ موت انسان کی جوتی کے تسمے سے بھی قریب ہے۔

(عَنْ عَبْدِ اللَّهِ(رض) قَالَ قَالَ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) الْجَنَّةُ أَقْرَبُ إِلَى أَحَدِكُمْ مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهِ وَالنَّارُ مِثْلُ ذَلِكَ)

[رواہ البخاری:باب الْجَنَّةُ أَقْرَبُ إِلَى أَحَدِكُمْ مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهِ وَالنَّارُ]

”حضرت عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جنت اور دوزخ تم میں سے ہر کسی کے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہے۔“

ظاہری اور باطنی گناہ چھوڑ دینے کے حکم کے ساتھ ہی یہ حکم ہوا کہ یہ بھی گناہ ہے کہ تم وہ جانور کھاؤ جس کو ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ ایسے جانور کا گوشت کھانا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو گی۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

توبہ کرنے کی اہمیت اور اس کی ترغیب

یاد رہے کہ جس مسلمان نے مرنے سے پہلے پہلے اپنے گناہوں سے سچی توبہ کرلی تو اسے آخرت میں سزا نہ ہو گی البتہ جس مسلمان نے اپنے گناہوں سے توبہ نہ کی تو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے، وہ چاہے تو اسے اس کے گناہوں کی سزا دے دے اور چاہے تو اپنے فضل و کرم سے اس کے گناہ معاف کر دے لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہونے کی امید باندھ کر گناہوں میں مصروف رہنا انتہائی نادانی ہے کیونکہ گناہ گاروں کی ایک تعداد ضرور جہنم میں جائے گی اور کوئی گناہ گار یہ نہیں جانتا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو یقینی طور پر معاف کر دے گا۔ علامہ اسماعیل حقی (رح) فرماتے ہیں " بیشک سب گناہ گار مشیت کے خطرے میں ہیں بلکہ اطاعت گزار بھی نہیں جانتے کہ ان کا خاتمہ کیسا ہو گا تو اے گناہگارو! تم دھوکے میں مت رہنا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہر گناہ گار کو حاصل نہ ہو گی اور نہ ہی تمہیں یہ معلوم ہے کہ تم ان لوگوں میں سے ہو جنہیں معاف کرنے کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے۔

امام محمد غزالی (رح) فرماتے ہیں "جو انسان یہ آس لگائے بیٹھا ہے کہ میں مومن ہوں اور اللہ تعالیٰ مومنوں کے گناہ معاف کر دے گا تو اسے یہ تصور کرنا چاہیے کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف نہ کرے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جب انسان اطاعت نہ کرے تو اس کا ایمانی درخت کمزور و ناتواں ہو جائے اور نزع کے وقت موت کی سختیوں کے تند جھونکوں سے اکھڑ جائے کیونکہ ایمان ایک ایسا درخت ہے جس کی پرورش عبادت کے پانی سے ہوتی ہے اور جب اسے یہ پانی نہ ملا اور اس نے قوت نہ پکڑی تو اس کے اکھڑ جانے کے خطرات ہر وقت اس پر منڈلاتے رہیں گے۔ اگر وہ اپنا ایمان سلامت لے گیا تو یہ بھی امکان ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے بخش دے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے عذاب میں مبتلاء کر دے، لہٰذا اس آسرے میں بیٹھے رہنا کہ اللہ تعالیٰ مجھے بخش دے گا بہت بڑی حماقت ہے اور اس شخص کی مثال اس آدمی کی طرح ہے جو اپنے مال و اسباب کو تباہ کر کے اور بال بچوں کو بھوکا چھوڑ کر یہ خیال کرے کہ شاید ویرانے میں خزانہ مل جائے یا اس شخص کی مثال اس آدمی کی طرح ہے جو کسی ایسے شہر میں رہ رہا ہو جسے لوٹا جا رہا ہو اور وہ اپنے خزانے اس امید پر نہ چھپائے کہ ہو سکتا ہے جب لوٹنے والا ہمارے گھر میں آئے تو وہ آتے ہی مر جائے گا یا اندھا ہو جائے گا یا وہ میرے گھر کو دیکھ نہ سکے گا، یہ سب باتیں اگرچہ ممکن ہیں لیکن ان پر اعتماد کرنا اور احتیاط سے ہاتھ اٹھا لینا حماقت ہے۔

آپ (رح) احیاء العلوم میں فرماتے ہیں "گناہ ایمان کے لیے اس طرح (نقصان دہ) ہیں جیسے مضر صحت کھانے جسم کو نقصان پہنچاتے ہیں، وہ معدے میں جمع ہوتے رہتے ہیں حتّٰی کہ اخلاط (یعنی صفراء، بلغم وغیرہ) مزاج کو بدل دیتے ہیں اور اس کو پتہ بھی نہیں چلتا یہاں تک کہ اس کا مزاج بگڑ جاتا ہے اور وہ اچانک بیمار ہو جاتا ہے اور پھر اچانک مر جاتا ہے تو گناہوں کا معاملہ بھی یہی ہے، چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ جب اس فانی دنیا میں ہلاکت کے خوف سے وہ زہر سے بچتا ہے اور ان کھانوں سے فوری طور پر بھی اور ہر حال میں بچتا ہے جو نقصان دہ ہوتے ہیں تو ابدی ہلاکت سے ڈرنے والے پر بدرجہ اولی گناہوں سے اجتناب ضروری ہے اور جب زہر کھانے والے پر لازم ہے کہ جوں ہی نادم ہو تے کرے اور اس کھانے

سے رجوع کرے اور اسے معدے سے نکال دے اور یہ عمل فوری طور پر کرے تاکہ اس کا جسم ہلاکت سے بچ جائے حالانکہ اس کا نقصان صرف دنیوی ہے جبکہ دین کے معاملے میں گناہوں کی صورت میں زہر کھانا بدرجہ اولیٰ نقصان دہ ہے تو اسے اس سے رجوع کرنا چاہیے اور جس قدر ممکن ہو تدارک کرے جب تک اس کے لیے مہلت ہے اور وہ اس کی زندگی ہے کیونکہ جس کو اس زہر کا خوف اس لیے ہے کہ باقی رہنے والی آخرت سے محروم ہو جائے گا جس میں ہمیشہ کی نعمتیں اور بہت بڑی سلطنت ہے اور اس کے فوت ہونے سے جہنم کی آگ اور ہمیشہ کے عذاب کا سامنا ہوگا اور دنیوی زندگی اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں کیونکہ اس کی کوئی انتہا نہیں تو اس کے لیے گناہوں سے توبہ کرنے میں جلدی کرنا ضروری ہے تاکہ گناہوں کا زہر روح القران۔ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی ایمان پر اثر انداز نہ ہو اور (اگر یہ روح القران۔ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی ایمان پر اثر انداز ہو گیا تو) یہ ایسا اثر ہوگا جس کا ڈاکٹروں کے پاس بھی کوئی علاج نہیں اور نہ ہی اس کے بعد کوئی پرہیز اثر کرے گی، اس کے بعد نصیحت کرنے والوں کی نصیحت اور واعظین کا وعظ بھی فائدہ نہیں دے گا اور اس پر یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ وہ ہلاک ہونے والوں میں سے ہے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری)

آیت مبارکہ :

وَلَا تَأْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ۝۱۲۱

لغۃ القرآن: وَلَا : اور نہ] [تَاْكُلُوا : تم سب کھاؤ] [مِمَّا : "اس "سے جو] [لَمْ : نہیں] [يُذْكَرِاسْمُ : لیا گیا ہو نام] [اللّٰهِ : اللہ] [عَلَيْهِ : اس پر] [وَاِنَّهٗ : اور بیشک وہ] [لَفِسْقٌ : یقینا نافرمانی ہے] [وَ اِنَّ : اور بیشک] [الشَّيٰطِيْنَ : شیطان] [لَيُوْحُوْنَ : یقینا وہ سب ڈالتے ہیں] [اِلٰٓي : کی طرف] [اَوْلِيٰٓـئِهِمْ : اپنے دوستوں] [لِيُجَادِلُوْكُمْ : تاکہ وہ سب جھگڑا کریں تم سے] [وَاِنْ : اور اگر] [اَطَعْتُمُوْهُمْ : تم نے اطاعت کرلی ان کی " تو "] [اِنَّكُمْ : بیشک تم] [لَمُشْرِكُوْنَ : یقینا سب مشرک ہو گے]

ترجمہ : اور تم اس (جانور کے گوشت) سے نہ کھایا کرو جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اور بیشک وہ (گوشت کھانا) گناہ ہے، اور بیشک شیاطین اپنے دوستوں کے دلوں میں (وسوسے) ڈالتے رہتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں اور اگر تم ان کے کہنے پر چل پڑے (تو) تم بھی مشرک ہو جاؤ گے

تشریح:

مردار اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور کھانے، سے آدمی کا ضمیر اور ایمان مردہ ہو جاتا ہے۔ یہاں ان دونوں کا تقابل کیا گیا ہے۔
بنیادی طور پر انسان کی زندگی دو عناصر پر مشتمل ہے جسم کو قائم رکھنے کے لیے بہتر فضا اور اچھی غذا کی ضرورت ہے۔ روح کو بیدار اور صحت مند رکھنے کے لیے گناہوں سے اجتناب اور کفر و شرک سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔ خوراک اور آب و ہوا مناسب نہ ہو تو جسمانی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ روح کی خوراک، اچھے اعمال اور عقیدہ توحید ہے۔ جس قدر آدمی کے اعمال اور اس کا عقیدہ کمزور ہوگا اتنی ہی اس کی روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی کمزور ہوتی چلی جائے گی۔ یہاں تک کہ زندہ ہونے کے باوجود انسان روحانی طور پر مردہ ہو جاتا ہے۔

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

روشنی کا منبع اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب اور اس پر چلنے کی توفیق ہے۔ جسے سورۃ ابراہیم کی دوسری آیت میں یوں بیان فرمایا ہے اس کتاب کو ہم نے اپنے رسول پر نازل کیا تاکہ اللہ کے حکم کے مطابق لوگوں کو ہر قسم کی تاریکیوں سے نکال کر واضح اور شاندار روشنی میں لا کھڑا کریں۔

(البقرۃ، آیت : ۲۵۷)

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڛ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــــُٔھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَـھُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (257)

اللہ مسلمانوں کا والی ہے انہیں اندھیروں سے نور کی طرف نکالتا ہے اور جو کافر ہیں ان کے حمایتی شیطان ہیں وہ انہیں نور سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں۔ یہی لوگ دوزخ والے ہیں، یہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔
یہاں اسی بات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اللہ کی عطا کردہ روشنی میں زندگی بسر کرنے والا ایسے شخص کی مانند نہیں ہو سکتا جو کفر و شرک کی تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہو۔ اسے اندھیروں سے کوئی نکالنے والا نہیں گویا کہ جو علماء لوگوں کو گمراہی کی دعوت دیتے ہیں وہ لوگوں کو ایمان کی روشنی سے نکال کر بدعت و شرک کے اندھیروں میں گھسیٹتے ہیں۔
گمراہ علماء کے پیروکار اس لیے اندھیروں سے نکل کر ایمان کی روشنی کی طرف نہیں آتے کیونکہ باطل عقیدہ اور برے اعمال ان کے لیے خوبصورت بنا دیے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ توحید کے دلائل سننے اور ماننے میں گرانی محسوس کرتے ہیں اور برے اعمال اختیار کرنے کو فیشن اور دین سمجھتے ہیں۔
جو جانور نام خدا کو چھوڑ کر کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا جیسے کفار عرب اپنے بتوں کے نام پر جانوروں کو ذبح کرتے اور ان کا خون ان کے قدموں میں بہاتے تھے اور یوں سمجھتے تھے کہ اس طرح ان کے جھوٹے خدا ان سے راضی ہوتے ہیں ایسا جانور سراپا گناہ ہے اسے مت کھایا

جائے۔اسے سراپا گناہ کہنا اس لئے ہے کہ یہ جانور روزِ قیامت مکمل اٹھا کر گناہوں والے پلڑے میں رکھ دیا جائے گا. اسی طرح جو جانور از خود مر جائے اور اس کو اللہ کے نام پر ذبح نہ کیا جائے اسے مت کھایا جائے کیونکہ وہ بھی ممالم یذ کر اسم اللہ علیہ میں داخل ہے۔

جس جانور کے ذبح پہ بسم اللہ کا پڑھنا بھول جائے وہ حلال ہے

لیکن یاد رہے جس جانور کے ذبح پر اللہ کا نام لینا سہواًرہ گیا وہ حلال ہے اس کا کھانا جائز ہے اور وہ لاتاکلوامما لم یذ کر اسم اللہ علیہ میں داخل نہیں ہے اور اس سے کثیر احادیث دال ہیں، مثلاً:

وَأَخْبَرَنَا أَبُو الْحُسَيْنِ بْنُ الْفَضْلِ الْقَطَّانُ بِبَغْدَادَ أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ جَعْفَرٍ حَدَّثَنَا يَعْقُوبُ بْنُ سُفْيَانَ حَدَّثَنَا أَبُو بَكْرٍ الْحُمَيْدِيُّ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ حَدَّثَنَا عَمْرٌو عَنْ أَبِي الشَّعْثَاءِ وَهُوَ جَابِرُ بْنُ زَيْدٍ قَالَ أَخْبَرَنِي عَيْنٌ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: إِذَا ذَبَحَ الْمُسْلِمُ وَنَسِيَ أَنْ يَذْكُرَ اسْمَ اللَّهِ فَلْيَأْكُلْ فَإِنَّ الْمُسْلِمَ فِيهِ اسْمٌ مِنْ أَسْمَاءِ اللَّهِ يَعْنِي بِعَيْنٍ عِكْرِمَةَ (سنن بیہقی جلد 9 صفحہ 240 مطبوعہ دار المعرفہ بیروت)

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے نقل فرماتے ہیں کہ جب مسلمان شخص ذبح کرے اور بسم اللہ اور اللہ اکبر کہنا بھول جائے تو ذبح شدہ جانور کھالے، کیونکہ مسلم میں بھی اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہوتا ہے۔

وَأَخْبَرَنَا أَبُو نَصْرِ بْنُ قَتَادَةَ أَخْبَرَنَا أَبُو مَنْصُورٍ النَّضْرُوِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ نَجْدَةَ حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ مَنْصُورٍ حَدَّثَنَا الْعَبَّاسُ بْنُ الْفَضْلِ حَدَّثَنَا خَالِدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ يَزِيدَ بْنِ أَبِي زِيَادٍ عَنْ عَطَاءٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: مَنْ ذَبَحَ فَنَسِيَ أَنْ يُسَمِّيَ فَلْيَذْكُرِ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ وَلْيَأْكُلْ وَلاَ يَدَعْهُ لِلشَّيْطَانِ إِذَا ذَبَحَ عَلَى الْفِطْرَةِ (سنن بیہقی جلد 9 صفحہ 239)

سنن کبری للبیہقی: جلد نہم: حدیث نمبر 5049 مکررات 0 متفق علیہ 0

(۱۸۸۹۳) عطاء حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے نقل فرماتے ہیں کہ جو شخص ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا بھول گیا تو وہ کھاتے وقت بسم اللہ پڑھ کر کھالے اور شیطان کے لیے اس کو نہ چھوڑے، جبکہ اس نے فطرتِ اسلام پر اس کو ذبح کیا ہے۔

حضرت راشد بن سعد سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

ذبیحۃ المسلم حلال سمی اولم یسم مالم یتعمد والصید کذلک۔ مسلمان کا ذبیحہ حلال ہے تھا اللہ کا نام لے یا نہ لے جب تک کہ جان بوجھ کر اللہ کا نام نہ چھوڑے اور شکار بھی اسی طرح ہے (یعنی اگر ذبح پر یا شکار پر جان بوجھ کا اللہ کا نام چھوڑ دیا جائے تو وہ جانور بہر حال حرام ہے اور لاتاکلوامما لم یذ کر اسم اللہ علیہ میں شامل ہے) (در منثور بروایت عبد بن حمید جلد 3 صفحہ 349 مطبوعہ دار الفکر بیروت)

غیر خدا کی تعظیم کے لیے ذبح کیا جانے والا جانور بہر حال حرام ہے

کفار مکہ جانوروں کو بتوں کی تعظیم کے لئے ان کے چرنوں میں ذبح کرتے اور ان کا خون ان کے قدموں میں ڈالتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ایسے جانوروں کو حرام قرار دیا۔ اسی سے فقہاء نہیں یہ استنباط کیا کہ جو جانور کسی بادشاہ یا امیر کے آنے پر اس کی تعظیم کے لئے ذبح کیا جائے اور ذبح کا مقصد اسے کھانا نہ ہو بلکہ صرف ادھار تعظیم ہو تو وہ جانور حرام ہے خواہ اسے اللہ کے نام سے دفاع کیا جائے کیونکہ اس کی بتوں کی تعظیم کے لیے ذبح کیے جانے والے جانور سے مشابہت ہے۔ (در مختار جلد 5 صفحہ 197 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

وَمَا أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا معنی

وَلَا تَأْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ۔ میں وہی مفہوم بیان کیا گیا ہے جو اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ (انعام 145) میں مذکور ہے یعنی وہ جانور جو غیر خدا کے نام پر ذبح کیا جائے کیوں کہ دونوں آیات میں اسے فسق کہا گیا ہے اور ان جانوروں کو حرام کہا گیا ہے جو اللہ کے نام پر ذبح نہیں کیے گئے۔ لہٰذا ما اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰہ کے اردو تراجم میں جو تحریف کی گئی ہے اور اس کا معنی یہ کیا گیا ہے کہ کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو (تفہیم القرآن جلد اول صفحہ 135، سورۃ بقرہ، 173) اور وہ چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کے سوا دوسروں کا نام پکارا گیا ہو (ترجمہ مولوی فتح محمد جالندھری صفحہ 41، مطبوعہ سعودیہ بحکم حکومت سعودیہ) یہ سراسر غلط ترجمہ ہے۔

سورۃ بقرہ آیت 172 میں مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے الفاظ گزرے ہیں وہاں حضرت عبداللہ بن عباس (رض) مجاہد تابعی سعید بن جبیر اور دیگر تابعین اور ادلہ مفسرین کے اقوال کی روشنی میں ان الفاظ کا معنیٰ بتا چکے ہیں کہ وہ جانور جو غیر خدا کے نام پر ذبح کیا جائے۔

یعنی شیاطین الانس اور شیاطین و جن لوگوں کے دلوں میں بری باتیں ڈالتے ہیں تاکہ اے مومنو! وہ تم سے ان کے پڑھائے ہوئے سبق کے ذریعے جھگڑے اور اگر تم ان کی بات مانوگے تو شرک میں مبتلا ہو جاؤگے جیسے شیطان نے مردار جانور کے حلال ہونے اور بحیرہ وسائبہ وغیرہ جانوروں کے حرام ہونے کا وسوسہ مشرکوں کے دلوں میں ڈالا اور انھوں نے لوگوں کو گمراہ کرنا شروع کیا اب ان کی بات ماننے والا ان کی طرح شرکیہ عقائد میں گر جائے گا۔ (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

آیت مبارکہ :

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○۱۲۲

لغۃ القرآن : اَوَمَنْ : اور کیا جو] [كَانَ : ہے] [مَيْتًا : مردہ] [فَاَحْيَيْنٰهُ : پھر ہم نے زندہ کیا اسے] [وَ : اور] [جَعَلْنَا : ہم نے کردیا] [لَهٗ : اس کی] [نُوْرًا : نور] [يَّمْشِيْ :" کہ " وہ چلتا ہے] [بِهٖ : اس کو] [فِي : میں] [النَّاسِ : لوگوں] [كَمَنْ : اس کی طرح جو] [مَّثَلُهٗ : اس کی مثال] [فِي : میں] [الظُّلُمٰتِ : تاریکیوں] [لَيْسَ : "کہ "نہ ہو] [بِخَارِجٍ :" وہ " نکلنے والا] [مِنْهَا : اس سے] [كَذٰلِكَ : اسی طرح] [زُيِّنَ : خوشنما بنادی گئی] [لِلْكٰفِرِيْنَ : سب کافروں کیلیئے] [مَا : جو] [كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ : ہیں وہ سب کرتے]

ترجمہ : بھلاوہ شخص جو مردہ (یعنی ایمان سے محروم) تھا پھر ہم نے اسے (ہدایت کی بدولت) زندہ کیا اور ہم نے اس کے لیے (ایمان و معرفت کا) نور پیدا فرمادیا (اب) وہ اس کے ذریعے (بقیہ) لوگوں میں (بھی روشنی پھیلانے کے لئے) چلتا ہے اس شخص کی مانند ہو سکتا ہے جس کا حال یہ ہو کہ (وہ جہالت اور گمراہی کے) اندھیروں میں (اس طرح گھرا) پڑا ہے کہ اس سے نکل ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح کافروں کے لیے ان کے وہ اعمال (ان کی نظروں میں) خوش نما دکھائے جاتے ہیں جو وہ انجام دیتے رہتے ہیں

تشریح :

اہل حق کو کافر نہیں بہکا سکتے

پہلے فرمایا کہ شیاطین اپنے رفقاء کے دل میں ڈالتے ہیں کہ وہ مسلمانوں سے جھگڑا کریں یعنی بحث وجدل، تلبیس و تلمیع اور وسوسہ اندازی کر کے ان کو طریق حق سے ہٹا دیں۔ لیکن ان کو یہ ہوس خام اپنے دلوں سے نکال دینا چاہیے۔ وہ گروہ یا وہ شخص جو جہل وضلال کی موت سے مرچکا تھا۔ پھر اس کو حق تعالیٰ نے ایمان و عرفان کی روح سے زندہ کیا اور قرآن کی روشنی عطا فرمائی جسے لے کر وہ لوگوں کے ہجوم میں بے تکلف راہ راست پر چل رہا ہے کیا اس کا حال اغواء شیطانی کے قبول کرنے میں ان اولیاء الشیطان جیسا ہو سکتا ہے جو جہالت وضلالت کی اندھیروں میں پڑے ٹھوکریں کھا رہے ہیں جس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں پاتے کیونکہ اسی ظلمت کو نور اور برائی کو بھلائی سمجھتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

مومن زندہ ہے اور کافر مردہ ہونے کی وجہ

اس تمثیل میں مومن کو زندہ اور کافر کو مردہ بتلایا گیا ہے، وجہ یہ ہے کہ انسان اور حیوانات اور نباتات وغیرہ میں اگرچہ حیات اور زندگی کی قسمیں اور شکلیں مختلف ہیں، لیکن اتنی بات سے کوئی سمجھدار انسان انکار نہیں کر سکتا کہ ان میں سے ہر ایک کی زندگی کسی خاص مقصد کے لیے ہے، اور قدرت نے اس میں اس مقصد کو حاصل کرنے کی پوری اہلیت اور صلاحیت رکھی ہے، ارشاد قرآنی (آیت) اعطی کل شیء خلقہ ثم ھدی۔ میں اسی کا بیان ہے کہ اللہ جل شانہ نے کائنات عالم کی ہر چیز کو پیدا فرمایا اور اس کو جس مقصد کے لیے پیدا فرمایا تھا اس تک پہنچنے کی اس کو پوری ہدایت دیدی، جن کے ماتحت ہر مخلوق اپنے اپنے وظیفہ زندگی اور اپنی اپنی ڈیوٹی کا حق ادا کر رہی ہے، اس عالم میں زمین، پانی اور ہوا اور آگ، اسی طرح آسمانی مخلوقات اور چاند، سورج اور کل ستارے اپنی اپنی ڈیوٹی پوری طرح پہچان کر اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں، اور یہی اداء فرائض ان میں سے ہر چیز کی زندگی کا ثبوت ہے، اور جس وقت جس حال میں ان میں سے کوئی چیز اپنی ڈیوٹی ادا کرنا چھوڑ دے تو وہ زندہ نہیں بلکہ مردہ ہے، پانی اگر اپنا کام پیاس بجھا دینا اور میل کچیل دور کرنا وغیرہ چھوڑ دے تو وہ پانی نہیں کہلائے گا، آگ جلنا اور جلانا چھوڑ دے تو وہ آگ نہیں رہے گی، درخت اور گھاس اگنا اور بڑھنا پھر پھل پھول لانا چھوڑ دے تو وہ درخت اور نبات نہیں رہے گی، کیونکہ اس نے اپنے مقصد زندگی کو چھوڑ دیا، تو وہ ایک بے جان مردہ کی طرح ہو گئی۔

معلوم ہوا کہ انسان کا مقصد زندگی پورے عالم کی ابتداء وانتہاء کو سامنے رکھ کر سب کے نتائج اور عواقب پر نظر ڈالنا اور یہ متعین کرنا کہ مجموعی اعتبار سے کیا چیز نافع اور مفید ہے، اور کون سی چیز مضر اور تکلیف دہ ہے، پھر اس بصیرت کے ساتھ خود اپنے لیے بھی مفید چیزوں کو حاصل کرنا اور مضر چیزوں سے بچنا اور دوسروں کو بھی ان مفید چیزوں کی طرف دعوت دینا اور بری چیزوں سے بچانے کا اہتمام کرنا ہے، تاکہ دائمی راحت وسکون اور اطمینان کی زندگی حاصل ہو سکے، اور جب انسان کا مقصد زندگی اور کمال انسانی کا یہ معیاری فائدہ خود حاصل کرنا اور دوسروں کو پہنچانا ہے، تو اب قرآن کی یہ تمثیل حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہے کہ زندہ صرف وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے، اور عالم کی ابتداء وانتہاء اور اس میں مجموعی اعتبار سے نفع و نقصان کو وحی آہی کی روشنی میں پہچانے، کیونکہ نری عقل

انسانی نے نہ کبھی اس میدان کو سر کیا ہے نہ کر سکتی ہے،۔بڑے بڑے عقلاء و حکماء اور فیلسوفان عالم نے انجام کار اس کا اقرار کیا ہے، مولانا رومی (رح) نے خوب فرمایا ہے

زیرکان موشگافان دہی
کردہ ہر خرطوم خطِّ ابلہی

اور جب مقصد زندگی کے اعتبار سے زندہ صرف وہ شخص ہے جو وحی آہی کا تابع اور مومن ہو تو یہ بھی متعین ہو گیا جو ایسا نہیں وہ مردہ کہلانے کا مستحق ہے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمایا ہے

زندگی از بہر اطاعت و بندگی است، بے عبادت زندگی شرمندگی ست
آدمیت لحم و شحم دپوست نیست، آدمیت جز رضائے دوست نیست

(تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی)

یہاں موت سے مراد روحانی موت اور زندگی سے مراد روحانی زندگی ہے اور ان دونوں کا تعلق ایمان، علم اور عمل صالح سے ہے، یعنی جو ان سے محروم رہا وہ چلتا پھرتا مردہ ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ : "آپ مردہ دلوں کو نہیں سنا سکتے "(قرآن : 27:80) اور جسے یہ (ایمان، علم اور عمل صالح) نصیب ہو جائیں ان کے تن مردہ میں نئی زندگی آ جاتی ہے۔ ایسی زندگی جسے ظاہر موت بھی ختم نہیں کر سکتی۔ مثال کے طور پر وہ آیات پیش کی جا سکتی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے شہداء اور صالحین کی روحانی زندگیوں کا ذکر فرمایا ہے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس زندگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :

"جاہلوں کے درمیان ایک طالب علم کی مثال ایسی ہے جیسے مردوں کے درمیان زندہ۔"

(جامع صغیر : حرف طائ)

اب اس آیت کا مفہوم سمجھیے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے : وہ شخص جو جہالت کے اندھیروں میں بھٹک رہا تھا اور مردوں کی طرح حق و باطل میں تمیز کر سکتا تھا اسے ہم نے ایمان، علم اور عمل صالح کے ذریعے نئی زندگی عطا فرمائی۔ اب وہ خود بھی راہ ہدایت پر گامزن ہے اور دوسروں کی بھی رہنمائی کر رہا ہے۔ کیا یہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو جہالت کی تاریکیوں میں ایسا گم ہے کہ وہاں سے نکل ہی نہیں پاتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

"تعلیم یافتہ اور ان پڑھ برابر نہیں ہو سکتے۔ "(قرآن : 9:39)

لہٰذا ماں باپ کو چاہیے کہ اپنے بچوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دیں تاکہ وہ جہالت کی تاریکیوں میں سرگرداں نہ رہیں بلکہ علم کی روشنی میں اپنی قوم کا نام روشن کریں۔

قوم ابھرتی ہے نظام عقل کی تنظیم سے
عقل ہوتی ہے منور مشعل تعلیم سے

جس طرح علم و عمل اور نور ہدایت سے عاری شخص اپنی جہالت کے اندھیروں میں سر گرداں رہتا ہے اور اسے اپنی گمراہی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ زعم باطل میں اپنے انہی اعمال پر نازاں ہوتا ہے کفار کو بھی اپنے ہی اعمال خوش نما نظر آتے ہیں اور وہ انہی پر ڈٹے رہتے ہیں۔

شان نزول

اس کا یہ ہے کہ حضرت ابن عباس (رض) فرماتے ہیں کہ ایک روز ابو جہل نے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر کوئی نجس چیز پھینکی تھی۔اس دن حضرت حمزہ (رض) شکار کو گئے ہوئے تھے جس وقت وہ ہاتھ میں کمان لیے ہوئے شکار سے واپس آئے تو انھیں اس واقعہ کی خبر ملی۔اگرچہ ابھی آپ مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے مگر اس خبر سے انھیں طیش آگیا اور سیدھے ابو جہل پر چڑھ گئے اور کمان سے مارنا شروع کیا۔ابو جہل نے عاجزانہ طرز میں کہا اے ابو یعلی (یہ حضرت حمزہ (رض) کی کنیت تھی) کیا آپ کو معلوم نہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیسا دین لائے اور انھوں نے ہمارے معبودوں کو کس طرح برا کہنا شروع کردیا۔گویا ہمارے باپ دادا کی مخالفت بھی کرتے ہیں اور ہمیں بیوقوف اور بے عقل بھی کہتے ہیں۔حضرت حمزہ (رض) نے فرمایا تمہارے برابر بد عقل کون ہے کہ ایک وحدہٗ لا شریک کو چھوڑ کر پتھروں کی پوجا کرتے ہو۔میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔اسی وقت حضرت حمزہ (رض) اسلام لے آئے اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔گویا یہ بتایا کہ حضرت حمزہ اس سے پہلے مردہ دل تھے۔روح ایمان سے محروم تھے اللہ تبارک و تعالیٰ نے انھیں نور باطن عطا فرما کر راہ ہدایت دکھا دی اور ابو جہل ان مردوں میں سے ہے جو کفر کی ظلمتوں میں متحیر اور اندھا ٹکرا رہا ہے اور اسے راہ ہدایت نہیں ملتی اور وہ ان ظلمتوں سے نکل ہی نہیں سکتا۔(انتہی ترجمہ تفسیر نسفی) (تفسیر الحسنات۔علامہ ابو الحسنات سید محمد احمد قادری)

علم اور جہل کے مراتب

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ٦٠٦ ھ نے کہا ہے کہ ارواح بشریہ کی معرفت میں چار مراتب ہیں۔پہلے مرتبہ میں اس کو بالفعل کوئی علم حاصل نہیں ہوتا۔لیکن وہ علوم اور معارف کی استعداد رکھتا ہے' بسا اوقات یہ استعداد کامل ہوتی ہے اور بعض اوقات یہ استعداد کم اور ضعیف ہوتی ہے۔اس مرتبہ کو اس آیت میں موت کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ انسان کو علوم کلیہ اولیہ حاصل ہوتے ہیں' اس کو عقل کہتے ہیں۔اس مرتبہ کی طرف اس آیت میں (آیت) "فاحییناہ "(ہم نے اس کو زندہ کیا) سے اشارہ فرمایا ہے۔تیسرا مرتبہ میں انسان معلومات بدیہیہ سے مجہولات نظریہ کو حاصل کرتا ہے' اس کی طرف اس آیت میں (آیت) 'وجعلنالہ نورا "۔(اور ہم نے اس کے لیے ایک نور بنایا) سے اشارہ فرمایا اور چوتھا مرتبہ یہ ہے کہ تمام معارف قدسیہ اس کے سامنے حاضر بالفعل ہوں' اور وہ روح ان معارف کے ساتھ منور اور کامل ہو جائے۔اس کی طرف اس آیت میں (آیت) "یمشی بہ فی الناس"۔(جس کی وجہ سے وہ لوگوں کے درمیان چلتا ہے) سے اشارہ فرمایا ہے' اور اس مرتبہ کے حصول کے بعد نفس انسان کی سعادت کے درجات مکمل ہو جاتے ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ دیکھنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ آنکھ سلامت ہو اور کوئی خارجی روشنی بھی ہو ' اسی طرح بصیرت کے لیے بھی دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ عقل سلیم ہو اور نور وحی اور نور کتاب دستیاب ہو۔ اس لیے مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں نور سے مراد قرآن ہے۔ بعض نے کہا اس سے مراد دین ہے اور بعض نے کہا اس سے مراد حکمت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ بصر اور بصیرت کے لیے آنکھ اور عقل کا سالم ہونا اور خارجی روشنی اور نور قرآن کا میسر ہونا ضروری ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ نے مومن کو عطا کی ہیں اور رہا کافر تو وہ ہمیشہ جہل ' برے اخلاق اور بداعمالیوں کی تاریکیوں اور کفر اور گمراہی کے اندھیروں میں ڈوبا رہتا ہے ' اور خوف ' دہشت اور عجز کے اندھیروں میں ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۵ ص ۱۳۴۔ ۱۳۳ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۴۱۵ ھ) (تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِىْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۲۳

لغۃ القرآن : وَكَذٰلِكَ : اور اسی طرح] [جَعَلْنَا : ہم نے مقرر کیا] [فِي : میں] [كُلِّ : ہر طرح] [قَرْيَةٍ : ایک بستی] [اَكٰبِرَ : بڑے " لوگوں " کو] [مُجْرِمِيْهَا : جرائم کرنے والے اس " بستی " کے] [لِيَمْكُرُوْا : تاکہ وہ سب مکروفریب کریں] [فِيْهَا : اس میں] [وَمَا : اور نہ] [يَمْكُرُوْنَ : وہ سب مکرو فریب کرتے] [اِلَّا : مگر] [بِاَنْفُسِهِمْ : اَنْفُسِهِمْ : ان کے دلوں کی] [ ] [وَمَا : اور نہ] [يَشْعُرُوْنَ : وہ سب شعور رکھتے]

ترجمہ : اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں وڈیروں (اور رئیسوں) کو وہاں کے جرائم کا سرغنہ بنایا تاکہ وہ اس (بستی) میں مکاریاں کریں، اور وہ (حقیقت میں) اپنی جانوں کے سوا کسی (اور) سے فریب نہیں کر رہے اور وہ (اس کے انجام بد کا) شعور نہیں رکھتے

تشریح :

مکہ کے سردار حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دی ہے کہ آپ ان کی مخالفت سے دل گیر نہ ہوں ہمیشہ سرداروں اور وڈیروں یعنی نمرود اور فرعون وغیرہ نے ہی انبیائے کرام

(علیہم السلام) کی مخالفت کی ہے کیونکہ انھیں اپنی سرداری خطرے میں نظر آتی تھی تو وہ غریب عوام کو انبیائے کرام (علیہم السلام) کے خلاف اکساتے تھے۔ درحقیقت وہ اپنے آپ کو ہی دھوکا دیتے ہیں مگر سمجھتے نہیں کہ وہ اپنی آخرت کو اپنے ہاتھوں خود ہی برباد کر رہے ہیں۔

(امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

یہ اللہ کی سنت ہے کہ وہ ہر بستی 'شہر یا دارالخلافہ میں بڑے بڑے مجرمین میں کچھ لوگوں کو مقتدر بنا دیتا ہے۔ یہ جرائم پیشہ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دین کے دشمن ہوتے ہیں اور یہ دین کے دشمن اس لیے ہوتے ہیں کہ بستیوں کے اوپر اقتدار حاصل کر کے اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ دین ان سے اس اقتدار کو چھین کر اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یوں دین ان سے ربوبیت اور حاکمیت کی حیثیت چھین لیتا ہے اور لوگوں کو آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ یوں دین تمام لوگوں کو اللہ کی غلامی میں دے دیتا ہے اور اللہ ہی رب الناس اور ملک الناس قرار پاتا ہے۔

یہ سنت الٰہیہ ہے کہ اللہ سچائی کے ساتھ رسولوں کو بھیجے اور یہ سچائی تمام مدعیان ربوبیت سے ان کی ربوبیت چھین لے اور تمام مدعیان حاکمیت سے ان کا حق اقتدار چھین لے۔ چنانچہ سچائی کے باوجود یہ اکابر مجرمین رسولوں اور سچائی کے دشمن ہو جاتے ہیں اور بستیوں اور دارالحکومتوں میں اپنی مکاری کے جال پھیلاتے ہیں۔ تمام لوگ اپنے اپنے دارالخلافوں سے ایک دوسرے کو ہدایت اور رپورٹیں دیتے ہیں جو فریب پر مبنی ہوتی ہیں اور یہ لوگ معرکہ حق و باطل میں شیاطین کے معاون بنتے ہیں۔ باطل اور گمراہی کو پھیلانے کی سعی کرتے رہتے ہیں اور اپنی اس ظاہری اور خفیہ سازش کی وجہ سے لوگوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔

یہ سنت جاریہ اور ہمہ گیر معرکہ ہے۔ اس لیے کہ دونوں قوتوں کے درمیان اصل اول ہی کی بنا پر تضاد و وجود میں آگیا ہے۔ اصل اول یہ ہے کہ حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ صرف اللہ جل شانہ کے ساتھ مخصوص ہے جبکہ کسی بھی بستی کے مجرمین کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس بستی میں ان کی بات کی چلت ہو اس کے علاوہ اہل حق اور ان اکابر مجرمین کے درمیان ذاتی تضاد بھی ہوتا ہے۔

ہر نبی کو اس معرکے سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کوئی نبی اس سے بچ نہیں سکتا۔ نبی اور اہل ایمان کے لیے لازمی ہے کہ وہ اس معرکے میں کود یں اور آخر کار میں اس میں سے سرخروئی کے ساتھ نکلیں۔ اللہ اپنے دوستوں کو اطمینان دلاتے ہیں کہ ان مجرمین کا مکر و فریب کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو اور ان کا حال طویل سے طویل ترکیوں نہ ہو؟ آخر کار یہ مکر خود ان پر آ کر پڑے گا۔ اس لیے کہ اہل ایمان صرف تنہا اس معرکے میں نہیں کودتے اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ ان کے لیے کافی مددگار ہے۔ وہ کافرین کی سازش کو خود ان پر لوٹاتا ہے۔ "دراصل وہ خود اپنے فریب کے جال میں پھنستے ہیں مگر انھیں اس کا شعور نہیں۔

(آیت) "وَمَا يَمْكُرُونَ إِلَّا بِأَنفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُونَ(123)

" لہٰذا اہل ایمان کو پوری طرح مطمئن رہنا چاہیے۔"

اب قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ اللہ کے رسولوں اور اللہ کے دین کے دشمنوں کے مزاج میں کبر و غرور کا مادہ بھرا ہوتا ہے۔ اور یہی کبر اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ اسلام سے دور رہیں اور یہ اس لیے اس نظریہ سے دور بھاگتے ہیں کہ اس میں جس طرح یہ اکابر اللہ کے بندے ہوتے ہیں اس طرح تمام عوام بھی اللہ کے بندے ہوتے ہیں 'کوئی طبقاتی فرق باقی نہیں رہتا۔ چونکہ یہ لوگ اپنے اس طبقاتی فرق و امتیاز کو قائم رکھنا چاہتے ہیں اس لیے ایسے لوگوں کے لیے یہ ایک بڑا کڑوا گھونٹ ہے کہ یہ ایمان لے آئیں اور نبی کے سامنے اطاعت کریں حالانکہ وہ اس بات کے

عادی ہیں کہ وہ خود مطاع بنیں اور الوہیت اور ربوبیت کے مقام پر فائز ہوں ' قانون سازی کریں اور ان کے قوانین کو تسلیم کیا جائے۔ وہ احکام دیں اور لوگ ان کے احکام کی اطاعت کریں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسی باتیں کرتے ہیں جو کرنے کی نہیں ہیں۔ نہایت ہی بے بنیاد بات کرتے ہیں ۔ کہ ہم اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک ہمیں وہ تعلیم نہ دی جائے جو نبیوں کو دی گئ :

(آیت) "وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَن نُّؤْمِنَ حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ "(٦ : ١٢٤)

جب ان کے سامنے کوئی آیت آتی ہے تو وہ کہتے ہی ہم نہ مانیں گے جب تک کہ وہ چیز خود ہم کو نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئ ہے۔" ولید ابن مغیرہ نے ایک بار کہا : "کہ اگر نبوت حق بات ہوتی تو میں زیادہ مستحق تھا کہ میں نبی ہوتا ' کیونکہ میں عمر میں 'اے محمد ' تم سے بڑا ہو۔ مال میں تم سے زیادہ ہوں۔ "اور ابو جہل نے کہا 'خدا کی قسم ہم اس تحریک پر راضی نہ ہوں گے اور نہ ہی اس کی اطاعت کریں گے الا یہ کہ ہم پر بھی اسی طرح جبرائیل وحی لے کر آئیں جس طرح اس پر لاتے ہیں۔

یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ کبر نفس اور اس قسم کے لوگ جس طرح کے عادی ہوتے ہیں کہ یہ احکام صادر کرتے ہیں اور دوسرے لوگ اطاعت کرتے ہیں ایسے امور ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کے لیے ضلالت کو مزین کر دیا جاتا ہے اور یوں یہ لوگ دین اور داعیان دین (رسل) کے مقابلے میں دشمنی پر اتر آتے ہیں۔

چنانچہ اللہ ایسے لوگوں کے ان اقوال کی تردید فرماتے ہیں۔ اول یہ کہ کسی کو رسول مقرر کرنا یہ اللہ کے علم محیط پر موقوف ہے کہ کون اس لائق ہے کیونکہ نبوت ایک نہایت ہی اہم کائناتی منصب ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ یہاں اللہ تعالیٰ ان کی تردید سختی ' تحقیر اور دھمکی سے کرتے ہیں کہ تمہارا انجام بہت ہی برا ہونے والا ہے۔ (فی ظلال)

پیشواؤں کے بگڑنے کا نقصان اور سنبھلنے کا فائدہ

اس سے معلوم ہوا کہ قوم کے سرداروں کا بگڑنا قوم کو ہلاک کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :

"وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا (١٦) "(2)

ترجمہ کنزالعرفان : اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو ہم اس کے خوشحال لوگوں کو (اپنے رسولوں کے ذریعے اپنی اطاعت کا) حکم دیتے ہیں پھر وہ لوگ اس بستی میں نافرمانی کرتے ہیں تو اس بستی پر (عذابِ الٰہی کی) بات پکی ہو جاتی ہے تو ہم اسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

اسی طرح پیشواؤں کا سنبھل جانا قوم کو سنبھالا دینا ہے۔

{لِيَمْكُرُوا فِيهَا : تاکہ اس میں وہ اپنی سازشیں کریں۔} مکہ مکرمہ آنے والے ہر راستے پر کفار مکہ نے چار چار افراد بٹھا دیئے تاکہ وہ لوگوں کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانے سے روکیں، چنانچہ جو شخص بھی مکہ میں حاضر ہوتا یہ لوگ اس سے کہتے کہ "تم اس شخص سے بچنا یہ کاہن، ساحر اور کذاب ہے۔ ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ درحقیقت یہ صرف اپنے خلاف سازشیں کر رہے ہیں، ان سازشوں کا وبال انہی پر پڑے گا اور انھیں اس کا شعور نہیں۔

اس آیت میں سرورِ کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ سرداران مکہ کی دشمنی سے پریشان نہ ہوں، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلے جو انبیاء کرام (علیہ السلام) گزرے وہ جس شہر میں مبعوث ہوئے وہاں کے سرداروں نے ان کی اسی طرح مخالفت کی تھی۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

کافر ہمیشہ حیلے نکالتے رہے

یعنی کچھ آج رؤسائے مکہ ہی نہیں ہمیشہ کافروں کے سردار حیلے نکالتے رہے ہیں تاکہ عوام الناس پیغمبروں کے مطیع نہ ہو جائیں جیسے فرعون نے معجزہ دیکھا تو حیلہ نکالا کہ سحر کے زور سے سلطنت لیا چاہتا ہے لیکن ان کے یہ حیلے اور داؤ پیچ بحمد اللہ پکے ایمانداروں پر نہیں چلتے۔ حیلہ کرنے والے اپنی عاقبت خراب کرکے خود اپنا ہی نقصان کرتے ہیں جس کا احساس انھیں اس وقت نہیں ہوتا۔

غداروں کے جھنڈے

صحیحین میں ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ ہر باغی اور غدار کے لیے قیامت میں ایک جھنڈا ہوگا اور یہ اس کی سرین سے لگا ہوگا اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں ابن فلاں غدار ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ غدر چونکہ خفی ہوتا ہے لوگ اس سے آگاہ نہیں ہو پاتے اس لیے قیامت کے روز وہ ایک علم اور جھنڈا بن جائے گا جو غدار کی غداری کا اعلان کرتا رہے گا۔ (تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی)

آیت مبارکہ:

وَاِذَا جَآءَتۡهُمۡ اٰيَةٌ قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ حَتّٰى نُؤۡتٰى مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ‌ؕ اَللّٰهُ اَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسَالَتَهٗ‌ؕ سَيُصِيۡبُ الَّذِيۡنَ اَجۡرَمُوۡا صَغَارٌ عِنۡدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيۡدٌۢ بِمَا كَانُوۡا يَمۡكُرُوۡنَ ○۱۲۴

لغۃ القرآن: وَاِذَا : اور جب] [جَآءَتۡهُمۡ : آئے ان کے پاس] [اٰيَةٌ : نشانی] [قَالُوۡا : ان سب نے کہا] [لَنۡ : ہرگز نہیں] [نُّؤۡمِنَ : ہم ایمان لائیں گے] [حَتّٰى : یہاں تک کہ] [نُؤۡتٰى : ہمیں دیا جائے] [مِثۡلَ : مثل] [مَآ : نہیں] [اُوۡتِىَ : دیا گیا] [رُسُلُ :

رسولوں کو] [اللّٰهِ : اللہ] [ہ اَللّٰهُ : اللہ] [اَعْلَمُ : خوب جاننے والا ہے] [حَيْثُ : جہاں " سے "] [يَجْعَلُ : وہ رکھے] [رِسَالَتَهٗ : اس کا پیغام] [سَيُصِيْبُ : عنقریب پہنچے گی] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [اَجْرَمُوْا : سب نے جرم کیے] [صَغَارٌ : ذلت] [عِنْدَ اللّٰهِ : اللہ کے نزدیک] [وَعَذَابٌ : اور عذاب] [شَدِيْدٌ : سخت] [بِمَا : اس وجہ سے جو] [كَانُوْا : تھے سب] [يَمْكُرُوْنَ : وہ سب مکرو فریب کرتے]

ترجمہ : اور جب ان کے پاس کوئی نشانی آتی ہے (تو) کہتے ہیں : ہم ہر گز ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ ہمیں بھی ویسی ہی (نشانی) دی جائے جیسی اللہ کے رسولوں کو دی گئی ہے۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ اسے اپنی رسالت کا محل کسے بنانا ہے۔ عنقریب مجرموں کو اللہ کے حضور ذلت رسید ہو گی اور سخت عذاب بھی (ملے گا) اس وجہ سے کہ وہ مکر (اور دھوکہ دہی) کرتے تھے

تشریح:

سرداران مکہ کے پاس جب کوئی ایسی نشانی آتی جو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صداقت پر دلالت کرتی تو وہ اپنی ہٹ دھرمی کو چھپانے کے لیے بہانہ یہ کرتے ہیں کہ وہ اسی صورت میں ایمان لا سکتے ہیں جب ان کے پاس بھی رسولوں کی طرح وحی آئے اور انھیں بھی نبی بنایا جائے یا کم از کم ان کے پاس فرشتے نازل ہو کر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تصدیق کریں۔ ان کے جواب میں یہ آیات نازل ہوئی کہ کسی کو نبوت عطا کرنا اور اس پر فرشتوں کو نازل کرنا یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کا مستحق ہے؟ مکہ کے جن سرداروں نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا انکار کیا اور براہ راست آپ کو تکلیفیں پہنچائیں، چند ہی سالوں میں ان کی سرداریاں ختم ہو گئیں اور وہ ذلیل و خوار ہو کر ہلاک ہو گئے۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

شان نزول

ولید بن مغیرہ نے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا: "اگر نبوت حق ہے تو میں آپ سے زیادہ اس کا مستحق ہوں کیونکہ میں عمر میں بڑا ہوں اور آپ سے زیادہ مالدار ہوں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت ابو جہل کے بارے میں نازل ہوئی، ابو جہل نے کہا کہ "ہم نے عبد مناف کی اولاد سے سرداری میں مزاحمت کی۔ اور اب وہ کہتے ہیں کہ ہم میں ایک نبی ہے جس کی طرف وحی نازل ہوتی ہے۔ اللہ کی قسم! ہم اس پر ایمان لائیں گے نہ کبھی اس کی پیروی کریں گے یہاں تک کہ ہمارے پاس بھی ویسے ہی وحی آئے جیسے اس کے پاس آتی ہے۔

عقیدہ نبوت کے بارے میں چند اہم باتیں

اس سے معلوم ہوا کہ نبوت کا چناؤ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اعمال، قومیت یا مال کی وجہ سے نبوت نہیں ملتی۔ عقیدہ نبوت سے متعلق چند اہم باتیں یاد رکھنے کی ہیں :

(1)۔۔ نبوت کسبی نہیں کہ آدمی عبادت و ریاضت کے ذریعے کوشش کر کے اسے حاصل کر سکے بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی عطا ہے کہ جسے چاہتا ہے اسے اپنے فضل سے نبوت عطا فرماتا ہے، ہاں دیتا اسی کو ہے جسے اس عظیم منصب کے قابل بناتا ہے، جو نبوت کا منصب ملنے سے پہلے ہر طرح کے برے اور مذموم اخلاق سے پاک اور اچھے اور قابل تعریف تمام اخلاق سے مزین ہو کر ولایت کے جملہ مدارج طے کر چکتا ہے، اور اپنے نسب و جسم، قول و فعل، حرکات و سکنات میں ہر ایسی بات سے پاک و صاف ہوتا ہے جو باعث نفرت ہو، اسے عقل کامل عطا کی جاتی ہے، جو اوروں کی عقل سے بدرجہا زائد ہے، کسی حکیم اور کسی فلسفی کی عقل اس کے لاکھویں حصہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ اور جو اسے کسبی مانے کہ آدمی اپنے کسب و ریاضت سے منصب نبوت تک پہنچ سکتا ہے، کافر ہے۔

(2)۔۔ جو شخص نبی سے نبوت کا زوال ممکن مانے وہ کافر ہے۔

(3)۔۔ نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے اور یہ عصمت نبی اور فرشتے کا خاصہ ہے کہ نبی اور فرشتہ کے سوا کوئی معصوم نہیں۔ اماموں کو انبیاء (علیہ السلام) کی طرح معصوم سمجھنا گمراہی و بد دینی ہے۔ عصمت انبیاء کے یہ معنی ہیں کہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت کا وعدہ ہو چکا، جس کے سبب ان سے گناہ کا صادر ہونا شرعاً محال ہے، جبکہ ائمہ و اکابر اولیا کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت کا کوئی وعدہ نہیں، ہاں اللہ عَزَّوَجَلَّ اُنھیں محفوظ رکھتا ہے کہ ان سے گناہ ہوتا نہیں اور اگر ہو تو شرعاً محال بھی نہیں۔

(4) انبیاء (علیہ السلام) شرک و کفر اور ہر ایسے کام سے جو لوگوں کے لیے باعث نفرت ہو، جیسے جھوٹ، خیانت اور جہل وغیرہ مذموم صفات سے، نیز ایسے افعال سے جو وجاہت اور مُروّت کے خلاف ہیں، نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد بالاجماع معصوم ہیں اور کبیرہ گناہوں سے بھی مطلّقاً معصوم ہیں اور حق یہ ہے کہ جان بوجھ کر صغیرہ گناہ کرنے سے بھی نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد معصوم ہیں۔

نوٹ: مزید تفصیل کے لیے بہار شریعت جلد 1 کے پہلے حصے کا مطالعہ کیجئے۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ: اللہ خوب جانتا ہے جہاں اپنی رسالت رکھے۔} یعنی اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ رسالت کا مستحق کون ہے کہ اسے یہ شرف عظیم عطا فرمائے اور اسے بھی خوب جانتا ہے جو اس کا مستحق نہیں، اور اے کفار مکہ ! تم اس لائق ہی نہیں کہ تمہیں نبوت جیسے عظیم مرتبہ سے نوازا جائے اور نہ ہی نبوت مطالبہ کرنے پر ملتی ہے خصوصاً وہ شخص کہ جو حسد، دھوکا، بدعہدی وغیرہ برے افعال اور گھٹیا اوصاف میں مبتلا ہو، نبوت جیسے منصب عالی کے لائق کیسے ہو سکتا ہے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

نبوت محض عطا الٰہی ہے، یہ محنت سے حاصل نہیں ہو سکتی

اَللّٰهُ اَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسَالَتَه۔ سے معلوم ہوا نبوت وھبی صفت ہے اس کا کاسب سے کوئی تعلق نہیں یعنی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اپنی محنت و کوشش سے درجہ نبوت رسالت حاصل کر لیا ہے بلکہ کسی کی نبوت کا اعلان صرف اللہ ہی فرماتا ہے۔

اس کے برعکس مرزا قادیانی نے دعویٰ کیا کہ اس نے فنافی الرسول ہو کر درجہ نبوت پالیا ہے۔ وہ لکھتا ہے "نبوت کی تمام کھڑکیاں بند کی گئیں مگر ایک کھڑکی سیرت صدیقی والی کھلی ہے۔ یعنی فنافی الرسول کی۔ پس جو شخص اس کھڑکی سے خدا کے پاس آتا ہے اسے ظلی طور پر وہی نبوت کی چادر پہنائی جاتی ہے جو نبوت محمدی کی چادر ہے۔ (ایک غلطی کا ازالہ صفحہ 4 مندرجہ روحانی خزائن جلد 18 صفحہ 208 مطبوعہ لندن)

مگر یہ سب مرزائی ہذیانات ہیں۔ نبوت فنافی الرسول ہونے سے نہیں، بلکہ حکم خدا سے ملتی ہے اور حکم خدا یہ ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد باب نبوت بند کر دیا گیا ہے۔ اب دعویٰ نبوت کرنے والا فنافی الرسول نہیں مکذب رسول ہے اور اس کی کھڑکی سیرت صدیقی والی نہیں، سیرت مسیلمی والی ہے۔

اللہ یصطفی من الملئکۃ رسُلاً وّمن الناس۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں اور انسانوں میں سے رسول چنتا ہے۔ (حج۔ 75) اس میں بھی یہی بیان ہے کہ رسول صرف اللہ کے انتخاب سے بنتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جو چاہے وہ بعض اعمال کے ذریعہ درجہ رسالت تک پہنچ جائے اور اللہ نے اعلان کر دیا ہے کہ اس نے رسالت کا انتخاب ختم کر دیا ہے: وَخَاتَمَ النبیین۔ (احزاب: 40)

ابو جہل نے اپنے قبیلہ میں وحی اور نبوت کے اترنے کا مطالبہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ایسے مجرموں کو عنقریب ذلت ملنے والی ہے۔ چنانچہ چند ہی برس بعد وہ میدان بدر میں اس ذلت سے دوچار ہو گئے اور ایسے مجرموں کے نصیب میں ذلت ہی آتی ہے۔

(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

عظمتِ مصطفیٰ اور عظمت صحابہ

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دلوں میں نظر فرمائی تو سب کے دلوں سے بہتر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دل کو پایا تو انھیں اپنے لیے چن لیا اور اپنی رسالت کے ساتھ انھیں مبعوث فرمایا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دل کے بعد بندوں کے دلوں میں نظر فرمائی تو ان کے صحابہ (رض) کے دلوں کو دیگر لوگوں کے دلوں سے بہتر پایا تو انھیں اپنے نبی کا وزیر بنا دیا، یہ لوگ ان کے دین کی حمایت میں جنگ کرتے ہیں۔ پس جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں تو وہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے نزدیک بھی اچھی ہے اور جسے مسلمان برا سمجھیں تو وہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے نزدیک بھی بری ہے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

آیت مبارکہ :

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ۭ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۲۵

لغۃ القرآن: فَمَنْ : پھر جو] [يُّرِدِ اللّٰهُ : ارادہ کرلے اللہ] [اَنْ : کہ] [يَّهْدِيَهٗ : وہ ہدایت دے اسے] [يَشْرَحْ : وہ کھول دیتا ہے] [صَدْرَهٗ : اس کے سینے کو] [لِلْاِسْلَامِ : اسلام کے لیے] [وَمَنْ : اور جو] [يُّرِدْ : چاہے] [اَنْ : کہ] [يُّضِلَّهٗ : وہ گمراہ کردے اسے] [يَجْعَلْ : اس نے کردیا] [صَدْرَهٗ : اس کے سینے کو] [ضَيِّقًا : تنگ] [حَرَجًا : بہت گھٹا ہوا] [كَاَنَّمَا : گویا کہ] [يَصَّعَّدُ : وہ چڑھ رہا ہے] [فِي : میں] [السَّمَآءِ : آسمان] [كَذٰلِكَ : اسی طرح] [يَجْعَلُ : وہ رکھے] [اللّٰهُ : اللہ] [الرِّجْسَ : گندگی کو] [عَلَي : پر] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [لَا : نہیں] [يُؤْمِنُوْنَ : وہ سب ایمان لاتے ہیں]

ترجمہ : پس اللہ جس کسی کو (فضلًا) ہدایت دینے کا ارادہ فرماتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کشادہ فرما دیتا ہے اور جس کسی کو (عدلًا اس کی اپنی خرید کردہ) گمراہی پر ہی رکھنے کا ارادہ فرماتا ہے اس کا سینہ (ایسی) شدید گھٹن کے ساتھ تنگ کر دیتا ہے گویا وہ بمشکل آسمان (یعنی بلندی) پر چڑھ رہا ہو، اسی طرح اللہ ان لوگوں پر عذاب (ذلت) واقع فرماتا ہے جو ایمان نہیں لاتے

تشریح:

قرآن مجید نے ہدایت پانے اور بات کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے یہ اصول بیان کیا ہے کہ سننے والا پوری توجہ، دل کی حاضری اور ہدایت پانے کے لیے بات سنے یقیناً اللہ تعالیٰ اسے ہدایت سے بہرہ مند کر دیتا ہے۔ (ق : ۳۷)

لیکن منکرین حق کی شروع سے ہی یہ بری عادت ہے کہ وہ سچی بات قبول کرنا تو در کنار اس کی سماعت بھی ان کے لیے گرانی کا باعث ہوا کرتی ہے۔ حضرت نوح (علیہ السلام) کے ساتھ کفار نے یہاں تک معاندانہ رویہ اختیار کیا کہ جب حضرت نوح (علیہ السلام) توحید کی دعوت دیتے تو کفار اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال کر اپنے چہرے چھپاتے ہوئے ان سے دور بھاگ جاتے تھے۔

(قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا ۔ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَاءِي إِلَّا فِرَارًا وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۔) [نوح: ۵تا۷]

"نوح (علیہ السلام) نے عرض کیا اے میرے رب میں نے اپنی قوم کو رات دن دعوت دی مگر میری دعوت سے ان کے فرار میں اضافہ ہوا اور میں نے جب بھی انھیں بلایا تاکہ تو انھیں معاف کر دے تو انھوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں اور اپنے کپڑے اوڑھ لیے۔ اور اپنی روش پر اڑ گئے اور تکبر کی انتہا کر دی۔"

یہی رویہ منکرین حق نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ اختیار کیا۔ جب انھیں قرآن مجید غور کے ساتھ سننے کی طرف توجہ دلائی جاتی تو وہ بظاہر غور کے ساتھ سنتے لیکن حقیقت میں عدم توجہ اختیار کیے رکھتے اور آخر میں کہتے یہ باتیں ہمارے فہم وادراک سے باہر اور قوت سماعت کے لیے بوجھ کے سوا کچھ بھی نہیں اس طرح جو حکم بھی ان کے پاس آتا وہ اس کا مسلسل انکار کر دیتے اور اس پر پروپیگنڈے کے ذریعے غالب آنے کی کوشش کرتے جو شخص حق بات سننے سے احتراز کرے اسے کس طرح ہدایت نصیب ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ہدایت اسے نصیب ہوتی جو اسے پانے کی خواہش اور کوشش کرتا ہے۔ جب انسان خلوص نیت کے ساتھ چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا سینہ کھول دیتا ہے لیکن جو اس سے مسلسل اعراض کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا سینہ بند کر دیتا ہے۔ اس کے لیے ہدایت پانا ایسے ہی مشکل ہوتا ہے جیسا کہ انسان کا آسمان پر چڑھنا ناممکنات میں سے ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ گمراہ انسان نے اپنے لیے خود گمراہی کو پسند کیا ہوا ہے۔ لہٰذا یہ کج فکری اس کے لیے گندے اعمال کا سبب ہوتی ہے اور یہ گندگی اس کے برے عقیدہ کی وجہ سے ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ گندگی اس پر ہمیشہ کے لیے مسلط کر دی جاتی ہے

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

اللہ تعالیٰ نے ازل سے ہی اپنی مخلوق کی دو قسمیں بنائیں (1) شقی (2) سعید، اور ہر ایک کیلئے نشانی بنائی کہ جس سے اس کی پہچان ہو۔ سعادت کی نشانی اسلام کے لیے سینہ کھلنا اور ایمان قبول کرنا جبکہ شقاوت کی نشانی سینہ کی تنگی اور اسلام قبول نہ کرنا ہے۔ اور ہر گروہ کے لیے آخرت میں ایک گھر بنایا جس میں وہ لوگ رہیں گے۔ سعادت مند جنت اور اس کی نعمتوں میں رہیں گے اور شقاوت والوں کو جہنم کی آگ میں رہنا اور اس کا عذاب سہنا پڑے گا۔ حدیث میں ہے "اللہ تعالیٰ نے ایک مخلوق کو پیدا فرمایا اور ارشاد فرمایا: یہ جنت کے لیے ہیں اور مجھے کوئی پروا نہیں، اور ایک مخلوق کو پیدا فرمایا اور فرمایا: یہ جہنم کے لیے ہیں اور مجھے کچھ پروا نہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی مخلوق کی نشانی بیان فرمائی ہے، لہٰذا جب اللہ تعالیٰ بندے کو شرح صدر کی توفیق دے اور اسے حلاوت ایمان سے بھر دے تو وہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے عظیم نعمت عطا فرمائی ہے۔

امام محمد غزالی (رح) فرماتے ہیں "جسے جنت کے لیے پیدا کیا گیا اس کے لیے عبادت کے اسباب آسان کر دیئے جاتے ہیں اور جسے جہنم کے لیے پیدا کیا گیا اس کے لیے گناہ کے اسباب آسان کر دیئے جاتے ہیں اور اس کے دل میں شیطان کا حکم مُسلّط کیا جاتا ہے کیونکہ وہ طرح طرح کی باتوں

سے بیوقوف لوگوں کو دھوکا دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رحمت والا ہے لہٰذا تمہیں کوئی پروا نہیں کرنی چاہیے، تمام لوگ اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے لہٰذا تم ان کی مخالفت نہ کرو، زندگی بہت طویل ہے لہٰذا انتظار کرو کل توبہ کرلینا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :

"يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا (١٢٠) "

شیطان انھیں وعدے دیتا ہے اور آرزوئیں دلاتا ہے اور شیطان انھیں صرف فریب کے وعدے دیتا ہے۔

یعنی وہ ان کو توبہ کا وعدہ دیتا اور مغفرت کی تمنا دلاتا ہے اور ان حیلوں سے اِذنِ خداوندی سے ان کو ہلاک کردیتا ہے، اس کے دل کو دھوکے کی قبولیت کے لیے کشادہ اور قبول حق سے تنگ کردیتا ہے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قضا اور تقدیر سے ہوتا ہے۔ ہدایت و گمراہی کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے، وہ جو چاہے کرتا ہے اور جو ارادہ فرمائے حکم دیتا ہے اس کے حکم کو کوئی رد نہیں کرسکتا اور نہ کوئی اس کے فیصلے کو مؤخر کرسکتا ہے اس نے جنت اور اہل جنت کو پیدا کیا اور ان کو عبادت پر لگایا نیز جہنم اور اہل جہنم کو پیدا کیا اور ان کو گناہوں پر لگادیا۔

سینہ کھلنے سے کیا مراد ہے؟

شرح کا اصلی معنی ہے "وسیع کرنا" جبکہ یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کے دل میں روشنی پیدا فرماتا ہے یہاں تک کہ اس کا ہر عمل اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہوجاتا ہے۔

جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) فرماتے ہیں "تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ آیت تلاوت فرمائی تو صحابہ کرام (رض) نے عرض کی: اس کھولنے سے کیا مراد ہے؟ ارشاد فرمایا: "اس سے مراد وہ نور ہے جو مومن کے دل میں ڈالا جاتا ہے جس سے اس کا دل کھل جاتا ہے۔ عرض کی گئی: کیا اس کی کوئی نشانی ہے جس سے اس کی پہچان ہوسکے؟ ارشاد فرمایا: "ہاں، (اس کی تین علامتیں ہیں) آخرت کی طرف رغبت (2) دنیا سے نفرت، اور (3) موت سے پہلے اس کی تیاری۔

{ وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ: اور جسے گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ } جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کرنا چاہتا ہے تو اس کا سینہ تنگ، بہت ہی تنگ کردیتا ہے کہ اس میں علم اور دلائل توحید وایمان کی گنجائش نہ رہے، تو اس کی ایسی حالت ہوتی ہے کہ جب اس کو ایمان کی دعوت دی جاتی ہے اور اسلام کی طرف بلایا جاتا ہے تو وہ اس پر نہایت شاق ہوتا ہے اور اس کو بہت دشوار معلوم ہوتا ہیگویا کہ وہ زبردستی آسمان پر چڑھ رہا ہے۔

(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

اسلام کے لیے شرح صدر کی علامت

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جنت کے راستہ کی طرف ہدایت دینے کا ارادہ فرمائے گا 'اس کا سینہ دنیا میں اسلام کے لیے کھول دے گا 'حتی کہ وہ اسلام پر ثابت قدم رہے گا 'اور اسلام کو ترک نہیں کرے گا 'یہ حالت ایمان لانے کے بعد ہوگی 'جیسا کہ ان آیتوں میں ہے :

(آیت) "ومن یؤمن باللہ یھد قلبہ"۔ (التغابن : ١١)

ترجمہ : اور جو شخص اللہ پر ایمان لائے گا ' اللہ اس کے دل کو ہدایت فرمائے گا۔

(آیت) "والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا"۔ (العنکبوت : ٦٩)

ترجمہ : اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جہاد کیا ' ہم ضرور انھیں اپنی راہیں دکھائیں گے۔

اس کی تائید ان احادیث سے بھی ہوتی ہے۔

حضرت معاویہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس شخص کے ساتھ اللہ خیر کا ارادہ فرماتا ہے ' اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔

(صحیح البخاری ' ج ١ ' رقم الحدیث : ٧١ ' ٣١١٦ ' ٣٦٤١ ' ٣١٢٧ ' ٤٦٠٧ ' صحیح مسلم ' الامارہ ' ١٠٣٧ ' سنن الترمذی ج ٤ ' رقم الحدیث : ' ٣٦٤٧)

امام ابن جریر متوفی ٣١٠ ھ ابو جعفر سے روایت کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی (آیت) "فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ اللاسلام"۔ تو صحابہ نے پوچھا اس کا شرح صدر کیسے ہوگا ؟ آپ نے فرمایا جب اس کے دل میں نور نازل ہوگا تو اس کا سینہ کھل جائے گا ' صحابہ نے پوچھا کیا اس کو پہچاننے کی کوئی علامت ہے ؟ آپ نے فرمایا ہاں اس کا دل آخرت کی طرف راغب ہوگا اور دنیا سے وہ پہلو بچائے گا اور موت کے آنے سے پہلے وہ موت کے لیے تیار رہے گا۔ (جامع البیان ' جز ٨ ص ٣٦ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت ١٤١٥ ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ ان آیات میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تسلی دی گئی ہے کہ مشرکین جو دعوت اسلام کو مسترد کر رہے ہیں ' آپ ان سے رنجیدہ نہ ہوں ' جو شخص اللہ کے ارادہ اور اس کی تقدیر میں ایمان لانے کا اہل ہوگا ' اللہ اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دے گا ' جیسا کہ ان آیات میں ہے :

(آیت) "افمن شرح اللہ صدرہ اللاسلام فھو علی نور من ربہ"۔ (الزمر : ٢٢)

ترجمہ : تو جس شخص کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا وہ اپنے رب کی طرف سے (عظیم) نور پر ہے۔

(آیت) "ولکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم و کرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان اولئک ھم الرشدون"۔ (الحجرات : ٧)

ترجمہ : لیکن اللہ نے تمہیں ایمان کی محبت عطا کی اور اس کو تمہارے دلوں میں مزین کردیا اور کفر اور فسق اور معصیت سے تمہیں متنفر کردیا ' یہی لوگ کامل ہدایت یافتہ ہیں۔

اور جس شخص نے شرک سے اپنی فطرت کو فاسد کردیا اور فسق اور معصیت سے اپنے دل کو میلا کردیا ' وہ اسلام کو قبول کرنے سے اپنے دل میں شدید تنگی اور گھٹن محسوس کرتا ہے اور کسی بھی نیکی کے لیے اس کے دل کے دروازے نہیں کھلتے۔ جیسے کوئی شخص اپنے میلان طبعی کے خلاف آسمان کی جانب چڑھ رہا ہو تو اس کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کے اوپر اللہ شیطان کو مسلط کر دے گا اور اسی طرح ان لوگوں پر بھی جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے سے انکار کرتے ہیں ' پھر شیطان اس کو گمراہ کردے گا اور سیدھے راستہ سے بھٹکا دے گا۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

حضرت فاروق اعظم رضی الہ عنہ نے لفظ "حرج" کی تحقیق کے لیے بنی کنانہ کے ایک شخص کو بلایا اور اس سے پوچھا اے جوان حرجۃ کس کو کہتے ہیں۔ قال الحرجۃ فینا الشجرۃ تکون بین الاشجار التی لا تصل الیھا رعیۃ ولا وحشیۃ ولا شیء۔ اس نے کہا حرجۃ ہمارے ہاں اس درخت کو کہتے ہیں جو گھنے درختوں کے جھنڈ میں ہوتا ہے۔ جہاں کوئی چیز نہیں پہنچ سکتی۔ یہ سن کر حضرت فاروق (رض) نے فرمایا۔ کذالك قلب المنافق لا یصل الیہ شیء من الخیر۔ منافق کا دل بھی ایسا ہوتا ہے وہاں کوئی بھلائی نہیں پہنچ سکتی (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی) "(رض) حرجا "کا معنی ہے بہت تنگ قال الزجاج اضیق الضیق۔ مقصد یہ ہے کہ جب کسی کی پیہم سرکشیوں کے باعث اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت اس کی طرف سے پھر جاتی ہے تو قبول حق سے اس کا دل بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ حق کو تسلیم کرنے کا تصور کرتے ہیں اس کی حالت ایسی ناگفتہ بہ ہو جاتی ہے جیسے کسی انسان کو آسمان کی طرف چڑھنے پر مجبور کیا جائے۔ جس طرح اس کا سانس پھول جاتا ہے۔ اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور ایک بے بسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اسی طرح اس بدنصیب کا حال ہوتا ہے۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

سینے کی تنگی کی علامت

اس سے معلوم ہوا کہ دینی کام بھاری معلوم ہونا اور دنیاوی کام آسان محسوس ہونا، سینے کی تنگی کی علامت ہے اور سینے کی تنگی یہ ہے کہ اسباب کفر جمع ہو جائیں اور اسلام کے اسباب نہ مہیا ہو سکیں۔ اللہ عَزَّوَجَلَّ اس سے محفوظ فرمائے۔ بعض پر ایمان بھاری ہوتا ہے، بعض پر نیک اعمال بھاری اور بعض پر عشق اور وجدان بھاری ہے۔ خیال رہے کہ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بندہ کفر کرنے پر مجبور ہے بلکہ وہ جو کفر و سرکشی کرتا ہے وہ اپنے اختیار سے کرتا ہے اور آدمی کی بد کرداریونے دل میں یہ حال پیدا ہوتا ہے جیسے لوہا زنگ لگ کر بیکار ہو جاتا ہے اسی طرح گناہوں کی وجہ سے دل زنگ آلود ہو کر حق قبول کرنے سے محروم ہو جاتا ہے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

یاد رہے جس طرح زیادہ چربی والی چیزیں کھانے سے دل کی جسمانی شریانیں بند ہو جاتی ہیں اور آخرکار موت واقع ہو جاتی ہے اسی طرح کفر و شرک کی خوراک کھانے سے دل کی ایمانی شریانیں بند ہو جاتی ہے اور آخر دل پر مہر لگا دی جاتی ہے۔

(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

ہدایت کا ایک معنی ہے راستہ دکھانا ' رہنمائی کرنا ' بات کو آسان کر دینا ' قبولیت کے لیے آمادگی پیدا کرنا اور دوسرا اس کا معنی ہے ' قلبی نور و بصیرت۔ یعنی طبیعت میں اس طرح کی کیفیت پیدا کر دینا جس سے بات قبول کرنے میں کوئی دقت باقی نہ رہے۔ اس کے بعد ذکر آیا ہے شرح صدر کا۔ شرح صدر اصل میں اسی ہدایت کا ثمر اور اس کا نتیجہ ہے۔ البتہ ہدایت کے دونوں معنوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا چاہیے کہ شرح صدر کی کیفیت دونوں معنوں میں الگ الگ ہوگی ' جس کا آگے وضاحت میں ذکر آئے گا۔

" حَرَجَ " کا معنی ہوتا ہے " جھاڑیوں سے بھری ہوئی تنگ جگہ "۔ یعنی ایک جگہ یا ایک راستہ جو پہلے ہی تنگ ہے ' اس کو جھاڑیاں اگ آنے کے باعث مزید تنگ کر دیا گیا ہے۔ یہاں یہ لفظ "ضَیِّقًا " کی تاکید کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ یَصَّعَّدُ اس کا مصدر تصعد ہے۔ اس کا معنی " بہ تکلف اور بہ مشقت کسی بلندی پر چڑھنا ہے "۔ یعنی آدمی کسی ایسی بلندی پر چڑھے جس میں اس کی سانس پھول جائے ' پھیپھڑے جواب دینے لگیں اور

پسینہ پسینہ ہو جائے۔ "السَّمَآئِ "یہ آسمان اور بادل پر بھی بولا جاتا ہے اور فضا پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، یہاں یہ فضا ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس آیت کریمہ میں 'ان کے انکار کی اصل علت کو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن انکار کی کیفیت پیش نظر رہنی چاہیے۔ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ تمام مشرکین عرب 'شاید ایک طرح کی کیفیت میں مبتلا تھے۔ یعنی تمام کا حال یہ تھا کہ وہ کسی طرح بھی اسلام کا نام سننے کے روادار نہیں تھے۔ وہ اسلامی دعوت اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات کو کسی طرح بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ یقینا عام مشرکین کا یہی طرز عمل تھا۔ لیکن اگر یہ بات کہی جائے تو یہ انسانی فطرت کی شاید صحیح ترجمانی ہو کہ انکار کرنے والوں میں انکار کی کیفیت یکساں نہیں ہوتی۔ اکثریت تو ایسے ہی لوگوں کی ہوتی ہے 'جن کا ابھی ذکر ہوا۔ لیکن ایک قابل ذکر تعداد 'ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے 'جو اسلامی دعوت کو سنتے اور بعد میں اس پر غور بھی کرتے ہیں 'لیکن اس دعوت کی بعض باتیں ان کے فکری سانچے میں اترنے میں نہیں آتیں۔ انھوں نے اپنے ذہن اور دماغ کو جس طرح کے سانچے میں ڈھال لیا ہوتا ہے۔ اس میں صرف وہی بات داخل ہو سکتی ہے جو اس سانچے سے میل کھاتی ہو۔ رہی اس سے مختلف بات تو وہ کبھی اس میں داخل نہیں ہونے پاتی۔ اس لیے کہ وہ اپنے سانچے کو کبھی ٹوٹنے نہیں دیتے اور اپنی سوچ میں کسی تبدیلی کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتے 'بلکہ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ کے کواڑ اس طرح قوت سے بند کریں کہ بہار کا موسم آکر گزر جائے 'لیکن اس کی کوئی خوشبو اور اس کی خوشگوار ہوا کا کوئی جھونکا کبھی ان کے کواڑوں سے گزر نہ سکے۔

کفار کا فکری جمود

اس صورت حال پر اگر آپ غور کریں تو صاف نظر آتا ہے کہ مرض دو طرح کا ہے۔ ایک جامد انکار کا اور دوسرا فکری جمود کا۔ اگرچہ انجام دونوں کا ایک ہے کہ دونوں ہی اسلام کی دولت کو قبول کرنے سے محروم رہتے ہیں 'لیکن یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس نے اپنی بلاغت لسانی سے دونوں باتوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور اس کی طرف راہنمائی آیت کے دوسرے حصے سے ہو رہی ہے۔ اس میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے 'اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کفر اور شرک کی اس گندگی کو 'جو ایمان نہیں لاتے ' ان پر مسلط کر دیتا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ محرومی کی دو سزائیں ہیں 'جو دو الگ الگ مجرموں کے لیے تجویز کی گئی ہیں 'جن میں سے پہلا مجرم وہ ہے 'جو اسلامی دعوت پر کان تو دھرتا ہے 'لیکن اس کا فکری جمود اس کے دل و دماغ تک اسے پہنچنے نہیں دیتا چونکہ وہ اپنے دماغ کا کوئی دریچہ اور اپنے دل کا کوئی دروازہ 'اس کے لیے کھولنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ یوں محسوس کرتا ہے کہ اس دعوت اسلامی کے نتیجے میں 'اسے ایک بلند چڑھائی چڑھنے کے لیے کہا جا رہا ہے 'جس کا تصور ہی اس کو پسینہ پسینہ کر دینے کے لیے کافی ہے۔ وہ اس کے لیے سوچتا ضرور ہے 'لیکن اس کے دل و دماغ کی تنگی اس کے احساس میں مزید شدت پیدا کر دیتی ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ یقینا یہ دعوت قابل توجہ تو ہے 'لیکن میرے دل و دماغ میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں اور میری زندگی کے سفر میں چونکہ مفادات کے بندھن بہت مضبوط ہیں اور یہ دعوت ایثار و قربانی کا تقاضہ کرتی ہے 'میں اسے کسی طور قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے دماغ اور نفس کے تقاضوں کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہوں اور یہاں مجھے اللہ کے احکام کے سامنے سپر انداز ہونے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس لیے وہ جیسے جیسے اپنی

سوچ میں آگے بڑھتا جاتا ہے ' اس کے دل کی گھٹن میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ وہ جب اس دعوت اور اپنی زندگی میں کوئی مطابقت نہیں دیکھتا تو محسوس کرتا ہے کہ یہ ایک ایسا بوجھ ہے ' جو مجھ سے کبھی اٹھایا نہ جائے گا۔ اس لیے وہ عافیت اسی میں سمجھتا ہے کہ وہ راہ فرار اختیار کرے۔
دوسرا وہ شخص ہے ' جو سرے سے دعوت اسلامی اور دین اسلام کے نام سے بھی چڑتا ہے۔ اسے اس کی ہر بات بری محسوس ہوتی ہے۔ وہ اپنے اعتقادات باطلہ میں اس حد تک راسخ ہے کہ اسلامی دعوت کی ایک ایک بات پر وہ لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے اس رویے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے کفر و شرک کے ڈھیروں تلے دب کے رہ جاتا ہے اور اسلام کی صحت مند ہوا کا کوئی جھونکا کبھی اس کے قریب بھی نہیں بھٹک سکتا۔ اس طرح یہ دونوں گروہ اپنے اپنے احوال کے مطابق محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اب سوال صرف یہ ہے کہ پروردگار نے یہاں اس محرومی کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی ہے۔ اس سے یہ غلط تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیلی پیدا ہو سکتی ہے کہ قدرت نے ان کی گمراہی کا سامان تو خود کیا ہے تو اس میں آخر ان کا قصور کیا ہے لیکن اگر گزشتہ مختلف آیات کی تفسیر کے ضمن میں ہماری وضاحتیں ذہن میں رہیں تو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ ان وضاحتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ آدمی کا دل ایک آئینہ کی مانند ہے جب آدمی گناہ کرتا ہے تو اس آئینہ پر ایک داغ پڑ جاتا ہے اگر یہ شخص توبہ کے آنسوؤں سے اس داغ کو دھو دیتا ہے تو آئینے کی اصل شکل وصورت اور حیثیت بحال ہو جاتی ہے لیکن اگر یہ گناہ پر گناہ جاری رکھتا ہے تو داغ پہ داغ بڑھتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ ایک وقت آتا ہے کہ یہ آئینہ داغ داغ ہو کر اپنی آب و تاب کھو دیتا ہے اور بالکل بے نور ہو جاتا ہے ' یہی وہ وقت ہے جب قبولیت حق سے اس کی محرومی کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اس کو مزید سمجھنے کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم اور اس کے دل و دماغ کی صلاحیتوں میں یہ قانون رکھا ہے کہ جب تک ان صلاحیتوں سے صحیح طریقے سے کام لیا جاتا رہے تو یہ صلاحیتیں زندہ رہتی ہیں لیکن جب ان کو ان کے اصل کام سے روک دیا جائے یا ان سے وہ کام لینا شروع کر دیا جائے جس کام کے لیے ان کے خالق سے ان کو نہیں بنایا تو یہ صلاحیتیں دم توڑ جاتی ہیں مثلاً ہاتھ کو اللہ نے پکڑنے اور چھونے کے لیے پیدا کیا اس میں قوت لامسہ رکھی ہے۔ آدمی اس سے زندگی کے بہت سے کام لے سکتا ہے لیکن اگر آپ اس ہاتھ کو کسی چیز سے باندھ دیں اور اس کو عضو معطل بنا کے رکھ دیں تو ایک عرصہ گزرنے کے بعد آپ دیکھیں گے کہ ہاتھ مفلوج ہو گیا ہے ' یہی حال باقی اعضاء جسم اور ان کی صلاحیتوں کا ہے اور یہی کیفیت آدمی کے دل و دماغ کی بھی ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت اور دنیا اور زندگی کے حقائق کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے پیدا کیا۔ لیکن جب اسے شرک ' کفر اور ناشکری میں استعمال کیا جانے لگے تو آہستہ آہستہ وہ اپنی اصل خصوصیات سے محروم ہو جاتا ہے۔
اس محرومی کا اصل سبب تو وہ شخص ہے جس نے اس کو اصل کام نہیں کرنے دیا اور اس کو معطل رکھ کر مفلوج کر دیا لیکن یہ قوانین چونکہ اللہ کے بنائے ہوئے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ اسے اپنی طرف منسوب فرما کر یہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ایسا کیا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہی فرمایا جارہا ہے کہ ہم نے عہد الست کی صورت میں ہر آدمی کی فطرت میں اپنی معرفت اور قبولیت حق کا مادہ رکھا ہے اور پھر اس عہد الست کی یاددہانی کے لیے ہم نے اس پوری کائنات کو اپنی نشانیوں سے بھر دیا اور ان نشانیوں کو سمجھنے کے لیے ہم نے انسانوں کو جوہر عقل سے نوازا لیکن ہم نے اسی پر اکتفا نہیں کیا ہم نے ان کی آسانی کے لیے اپنے رسول بھیجے ' اپنی کتابیں اتاریں۔ پھر ہر رسول سے معجزات کا ظہور کیا تاکہ لوگوں کو یہ بات سمجھنے میں آسانی ہو کہ یہ لوگ دنیا میں اللہ کے نمائندے ہیں۔ پھر اللہ نے اپنے آخری رسول کو بھیجا تو اس پر جو کتاب اتاری اس کو بجائے خود معجزہ بنا دیا کہ دنیا اس کی مثال لانے سے عاجز ہو گئی اور خود پیغمبر کی اپنی ذات ' اپنی جاذب نظر شخصیت ' اپنے مکارم اخلاق ' اپنے پاکیزہ طور

اطوار اور غیر معمولی صلاحیتوں کے باعث خود ایک عظیم معجزہ ٹھہری یہ سب کچھ اس لیے کیا تاکہ لوگ اس پیغمبر کی دعوت کو قبول کرنے میں دشواری محسوس نہ کریں۔ لیکن معدودے چند لوگوں کے سواجب ایک بڑی تعداد نے اس دعوت پر کان دھرنے سے انکار کر دیا یا اپنے دل و دماغ کے دروازے اس پر بند کر لیے تو اللہ کا وہ فطری قانون حرکت میں آیا جس کا پہلے ذکر ہو چکا جس کے نتیجے میں وہ قبولیت حق سے اس طرح محروم کیے گئے کہ کچھ لوگ تو سینہ کی انتہائی گھٹن اور تنگی کا شکار ہوئے اور کچھ پر کفر اور شرک کی گندگی اس طرح مسلط کر دی گئی کہ وہ اسی کے نیچے دب کے رہ گئے۔ لیکن جن لوگوں نے اس دعوت کی قبولیت کے لیے کوشش کی 'اسے سمجھنا چاہا' اگرچہ اسے قبول کرنے میں ہزار دشواریاں تھیں اور جسم و جان کے ساتھ ساتھ گھر اور مال کی قربانیاں بھی تھیں 'لیکن انھوں نے پھر بھی ہمت دکھائی تو اللہ نے ان کے لیے اس راستے کو اس طرح آسان فرمایا کہ ان کو دو طرح کی ہدایت سے نوازا۔ کسی کے لیے تو قبولیت آسان کر دی گئی اور وہ اسلام کی آغوش میں آ گیا اور کسی کے لیے دل اور ضمیر کی بصیرت کا راستہ کھولا اور اس کے شک و شبہ کے ایک ایک کانٹے کو اس طرح چن دیا کہ اس کے دل و دماغ ہر طرح کے شک و شبہات سے نجات پا گئے اور ان کے دل کو ایسی کشادگی ملی کہ عالم غیب کی مشکل سے مشکل باتیں عالم الٰہیات کے مشکل مراحل اور ان دیکھی حقیقتوں کا سفر ان کے لیے انتہائی آسان ہو گیا اور شاید یہی وہ چیز ہے جس کی طرف ہمیں ایک حدیث سے بھی راہنمائی ملتی ہے۔ حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں بروایت حضرت عبداللہ ابن مسعود نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے شرح صدر یعنی سینہ اسلام کے لیے کھول دینے کی تفسیر دریافت کی آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مومن کے دل میں ایک روشنی ڈال دیتے ہیں جس سے اس کا دل حق بات کو دیکھنے سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے کھل جاتا ہے (یعنی حق بات کو آسانی سے قبول کرنے لگتا ہے اور خلاف حق سے نفرت اور وحشت ہونے لگتی ہے)۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ کیا اس کی کوئی علامت بھی ہے جس سے وہ شخص پہچانا جائے کہ اس کو شرح صدر حاصل ہو گیا ہے فرمایا علامت یہ ہے کہ اس شخص کی ساری رغبت آخرت اور اس کی نعمتوں کی طرف ہو جاتی ہے۔ دنیا کی بے جا خواہشات اور فانی لذتوں سے گھبراتا ہے اور موت کے آنے سے پہلے موت کی تیاری کرنے لگتا ہے۔

صحابہ کرام کو جب ہم دیکھتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایک صحابی کو شرح صدر سے نوازا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خود قرآن کریم کہتا ہے کہ جب ان پر قرآن کریم کے احکام پڑھے جاتے ہیں تو ان کے دل کانپ جاتے اور جھک جاتے ہیں اور یہ بات ذہن میں رہے کہ قرآن پاک کے بعض احکام اس دور میں اپنے اندر شدید آزمائش بھی رکھتے تھے۔ مثلاً جب مسلمانوں کو راہ حق میں ایک سے ایک بڑی آزمائش درپیش تھی اور قرآن انھیں صبر کی تعلیم دے رہا تھا۔ مسلمان اکثریت کی مخالفت کے حصار کے باعث آئے دن مالی دشواریوں میں انتہاء درجہ پھنستے چلے جا رہے تھے لیکن قرآن کریم ان کو انفاق کا حکم دے رہا تھا اور پھر مدنی زندگی میں جہاد و قتال کا حکم اس مختصر سے گروہ کے لیے پوری دنیا سے لڑ جانے کے مترادف تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہر اترنے والے حکم پر ان کے دلوں میں بجائے تنگی آنے کے انشراح میں اضافہ ہوتا تھا وہ ایک ایک حکم پر اللہ کا شکر بجالاتے تھے اس صورت حال کو جب آدمی دیکھتا ہے تو ان کے طبعی اطمینان اور ہر حکم کی تعمیل کو شرح صدر کے سوا اور کسی نام سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا اور یہ اللہ کی وہ توفیق اور کرم ہے جو سراسر اسی کی عنایت سے نصیب ہوتا ہے اور اس کی بعض مثالیں تو خود دور صحابہ میں بھی حیران کن تھیں۔

حدیث کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عام الوفود میں جب پورے جزیرہ عرب سے اسلام قبول کرنے یا دین کا علم حاصل کرنے کے لیے وفد پر وفد آرہے تھے اور ملک کے کونے کونے سے لوگ مدینے کی طرف امڈے چلے آرہے تھے انہی وفود میں سے ایک وفد یمن سے بھی آیا جو چند افراد پر مشتمل تھا۔ آنحضرت کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی وفد آتا تو آپ چند روز اسے ٹھہرنے کا حکم دیتے تاکہ وہ دین کی ضروری باتیں سیکھے اور مدینے کے اسلامی معاشرے میں رہ کر اسلامی معاشرتی زندگی سے پوری طرح آگاہی حاصل کرے۔ چنانچہ یمن کے اس وفد کو بھی چند دن مدینے میں ٹھہرایا گیا اور دوسرے وفود کی طرح جب یہ لوگ روانہ ہونے لگے تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو تحائف اور ہدایا دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ جب سب لوگ اپنا اپنا تحفہ لے چکے تو آپ نے ان سے پوچھا کہ تم میں سے کوئی شخص رہ تو نہیں گیا جس کو یہ تحفہ نہ ملے ہوں۔ انھوں نے عرض کی کہ حضور ایک نوجوان ہے جس کو ہم پیچھے سامان کی حفاظت کے لیے چھوڑ آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جاؤ اور اسے بھی بھیجو۔ چنانچہ وہ نوجوان آیا جس کی ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں اٹھتی جوانی تھی بالکل نوخیز اور الھڑ عمر آنحضرت سے آکر ملا۔ حضور نے اس کو تحائف دینے کا حکم دیا اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا حضور میں اس مقصد کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا۔ آپ نے نہایت شفقت سے پوچھا کہ اچھا جوان تم بتاؤ تم کیا مقصد لے کر آئے ہو؟ اس نے کہا حضور میری خواہش یہ ہے کہ آپ میرے لیے تین باتوں کی دعا فرما دیں۔ ایک یہ کہ اللہ مجھ پر اپنا رحم فرمائے اور دوسری یہ بات کہ اللہ مجھے بخش دے اور تیسری یہ بات کہ اللہ تعالیٰ میرے دل کو مستغنی کر دے۔ چنانچہ حضور نے ہاتھ اٹھائے اور بارگاہ خداوندی میں عرض کی۔ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ یا اللہ اس پر رحم فرما وَاغْفِرْ لَهٗ اور اس کی مغفرت فرما وَاجْعَلْ غِنَاهُ فِي قَلْبِهٖ اور اس کے دل کو مستغنی کر دے۔ چنانچہ یہ وفد واپس چلا گیا۔ چند مہینوں کے بعد حضور حج پر تشریف لے گئے وہاں اسی وفد کے چند افراد آپ سے ملے لیکن وہ نوجوان ان میں نہیں تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس نوجوان کی ادائیں اب تک یاد تھیں۔ چنانچہ آپ نے اس نوجوان کے بارے میں پوچھا کہ اس کا کیا حال ہے؟ انھوں نے کہا حضور اس کا آپ کیا پوچھتے ہیں اس جیسا کوئی نوجوان ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ دنیا میں رہ کر آخرت کا مسافر ہے ہر وقت اس پر آخرت کا احساس مسلط رہتا ہے۔ وہ دنیا کی نعمتوں سے مستفید ہوتا ہے لیکن ان سے جی نہیں لگاتا وہ اللہ کے احکام کی تعمیل میں شب و روز اس طرح کوشاں رہتا ہے کہ وہ ہر دن کو آخری دن سمجھتا ہے اور ہر رات کو آخری رات۔ آپ نے ان کی باتیں سن کر فرمایا:

اِنِّي لَاَرْجُوْ اَنْ يَّمُوْتَ جَمِيْعًا

(میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ اسے دل جمعی کی موت دے گا)

انھوں نے پوچھا حضور کیا ہر آدمی دل جمعی کی موت نہیں مرتا آپ نے فرمایا دل جمعی ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی مرنے والا دنیا سے جاتا ہوا بھی دنیا ہی کی محبت میں چیختا ہوا جاتا ہے اسے آخری وقت بھی فکر اگلی دنیا کی نہیں بلکہ پیچھے کی ہوتی ہے کہ میری اولاد کا کیا بنے گا میں جو کام شروع کر چکا تھا وہ تکمیل پذیر کیسے ہوگا۔ میں نے اتنی دولت جمع کی اب اس کا کیا بنے گا یعنی دنیا کی ایک ایک بات اس کی فکر مندی کا سبب ہوگی اسے وہ یکسوئی اور دلجمعی نصیب نہیں ہوگی جو منزل کی طرف بڑھنے والوں کی نصیب ہوتی ہے۔

اپنا اپنا جائزہ

اس آیت کریمہ کی اس پوری تفسیر کو سامنے رکھیں تو ہمارے لیے اس میں غور و فکر کا بہت سا سامان ہے کیونکہ اس میں بعض علامتیں ایسی بیان کر دی گئی ہیں جو آدمی کو تفکر اور تدبر کی دعوت دیتی ہیں اور جس کی روشنی میں آدمی کو اپنا جائزہ لینا آسان ہو جاتا ہے۔ ہم اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں پڑھ چکے ہیں کہ اللہ جب کسی کے سینے کو کھولتا ہے تو اس کی علامت یہ ہے کہ اس کے دل میں ایک نور پیدا کرتا ہے جس سے اس کا دل حق بات کو دیکھنے سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے کھل جاتا ہے اور جب کسی کے بارے اللہ محرومی کا فیصلہ کرتا ہے تو حق کی قبولیت اور نیکی کی طرف میلان اس کے لیے ایک مشکل مسئلہ بن جاتا ہے یعنی جب وہ اللہ کا ذکر سنتا ہے تو اس کو وحشت ہونے لگتی ہے اور جب کفر و شرک کی باتیں سنتا ہے تو ان میں دل لگتا ہے اس علامت کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو اپنا احتساب اور اپنے اصل مقام کی پہچان آدمی کے لیے کس قدر آسان ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے دل و دماغ کا جائزہ لے کر اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہے کہ میرے دماغی رجحانات اور قلبی میلانات کا رخ کس طرف ہے کیا مجھے نیکی اچھی لگتی ہے یا برائی؟ کیا میں نیک لوگوں کی صحبت پسند کرتا ہوں یا برے لوگوں کی؟ کیا قرآن کی تلاوت میں میرا دل لگتا ہے یا افسانے پڑھنے اور ڈرامے دیکھنے میں؟ کیا اسلامی قوتوں اور مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں میرے اندر فکر مندی پیدا ہوتی ہے یا محض اپنی ذات اور اپنی ضروریات کے حوالے سے میں فکر مند ہوتا ہوں۔ کیا مسلمانوں کی اجتماعی حالت میرے غور و فکر اور میری فکر مندی کا موضوع ہے یا صرف اپنی اور اپنے متعلقات کی فکر ہی میری سوچ کا اصل میدان ہے؟ اس سے بڑی آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ میں اللہ کی عنایات کا مورد ہوں یا اللہ کی التفات مجھ سے ہٹ چکی ہے۔ لیکن یہ سوچ یہ احتساب اور یہ جائزے کی خواہش یہ بھی تو اللہ کی دین ہے یہ اسی دل میں پیدا ہوتی ہے جس پر اللہ کا کرم ہوتا ہے اور جس میں کبھی ان باتوں کا گزر نہیں ہوتا اسے سمجھ لینا چاہیے کہ میں اللہ کی رحمت سے بہت دور ہوں۔

اسلام کی قبولیت کے راستے میں جو چیز سب سے بڑی رکاوٹ تھی اور جو مشرکین مکہ کے اسلام نہ قبول کرنے کی اصل علت تھی اس کو منکشف کرنے اور مشرکین مکہ کی حالت نفسی کو پوری طرح کھول دینے کے بعد پھر ہمارے تدبر کو دعوت دی گئی ہے کہ غور کرو اسلام کی دعوت کو قبول کرنا کس قدر آسان اور سہل ہے البتہ یہ ضروری ہے کہ اس راستے کی مشکلات جو مشرکین نے خود پیدا کی ہیں اور جس کے نتیجے میں اللہ کا قانون حرکت میں آتا ہے اس کو وہ سمجھیں اور اس سے تائب ہو کر اسلام کی طرف بڑھیں اور پھر وہ دیکھیں گے کہ اس کو سمجھنے اور اس کو قبول کرنے میں کوئی دشواری نہیں۔ چنانچہ اگلی آیت کریمہ میں اسی بات کو بیان کیا جا رہا ہے۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

آیت مبارکہ :

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝١٢٦

لغۃ القرآن: وَهٰذَا : اور یہ] [صراط: راستہ ہے] [رَبِّكَ : تیرے رب] [مُسْتَقِيْمًا : سیدھا] [قَدْ : تحقیق] [فَصَّلْنَا : ہم نے کھول کر بیان کردی ہیں] [الْاٰيٰتِ : واضع دلائل] [لِقَوْمٍ :" اس " قوم کے لیے] [يَّذَّكَّرُوْنَ : سب نصیحت حاصل کرتے ہیں]

ترجمہ : اور یہ (اسلام ہی) آپ کے رب کا سیدھا راستہ ہے، بیشک ہم نے نصیحت قبول کرنے والے لوگوں کے لیے آیتیں تفصیل سے بیان کردی ہیں

تشریح:

اس آیت کا معنی ہے ' یہ اسلام جس کے لیے اللہ تعالیٰ مومنوں کا سینہ کھول دیتا ہے ' یہی آپ کے رب کا وہ طریقہ ہے جس کو اس نے لوگوں کے لیے پسند کرلیا ہے اور یہی طریق مستقیم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا بیان کیا ہوا راستہ مستقیم ہی ہوتا ہے ' جیسا کہ اس حدیث میں قرآن مجید کے متعلق ہے :

حضرت علی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے اور یہ ذکر حکیم ہے اور یہ صراط مستقیم ہے۔ (سنن الترمذی ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ۲۹۱۵ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت ' ۱۴۱۴ ھ)

ہم نے نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے تفصیل سے آیتوں کو بیان کردیا ہے ' اور جو لوگ اسلام پر صحیح عمل کرتے ہیں ' ان کے لیے جنت ہے جو سلامتی کا گھر ہے۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

یعنی قرآن کریم یا حضور سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعلیم وہ راستہ ہے جو بلاتکلُّف رب عَزَّوَجَلَّ تک پہنچادیتا ہے جیسے سیدھا راستہ منزل مقصود تک پہنچاتا ہے اس لیے اسے ”شریعت “ کہتے ہیں یعنی وسیع اور سیدھا راستہ جس پر ہر شخص آسانی سے چل سکے۔ طریقت بھی رب عَزَّوَجَلَّ کا راستہ ہے مگر وہ ایسا تنگ اور پیچ دار ہے جس پر صرف واقف آدمی ہی چل سکتا ہے ۔

(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)
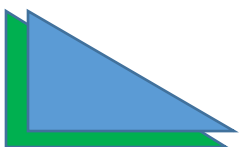
جس کا سینہ اسلام کے لیے کھل جائے اسے صراط مستقیم کی ہدایت ملتی ہے اور اسلام ہی صراط مستقیم اور دنیا وآخرت کی سلامتی کا ضامن ہے۔
پچھلی آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے یہاں "ھٰذا "اسم اشارہ لا کر اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے اسلام ہی صراط مستقیم ہے۔آخری نبی اور ان پر نازل ہونے والا یہی "الاسلام "آخری دین قرار پایا ہے۔
سورۃ المائدۃ، آیت : ۳ میں یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ دین کامل اور مکمل ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ میں نے تمہارے لیے اسلام ہی کو دین کے طور پر پسند کیا ہے۔
سورۃ آل عمران، آیت : ۸۵ میں دوٹوک انداز میں صراحت کی ہے کہ جو شخص دین اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین اختیار کرے گا اسے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا وہ شخص اور قوم آخرت میں نقصان پائے گی۔اسی سورۃ کی آیت ۸۴ میں وضاحت کی گئی ہے کہ کیا تم اللہ کے اس دین کو چھوڑ کر کوئی اور دین اختیار کرو گے جبکہ زمین وآسمان کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان ہے۔ یہاں اسلام کو اللہ تعالیٰ کی تابعداری کے مفہوم میں بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا دین اسلام ہی افراد اور اقوام کے لیے دنیا وآخرت کی سلامتی کی ضمانت دیتا ہے اس لیے جنت کو "دار السلام "قرار دیتے ہوئے دین اسلام ماننے والوں کو اس کی خوشخبری دی کہ ان کے لیے ان کے رب کے ہاں دار السلام ہے۔ اللہ تعالیٰ اسلام پہ چلنے والوں کا والی اور دوست ہے۔ ولی کا لفظ استعمال فرما کر اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اپنی قربت کا احساس دلا کر یہ وضاحت کی ہے کہ اگر تم میری قربت و محبت اور جنت کے طلب گار ہو تو تمہیں صراط مستقیم پر چلنا ہوگا جو اسلام کے بغیر کسی دوسرے دین میں نہیں مل سکتا۔ انفرادی زندگی میں اسلام پر عمل پیرا ہونے اور اجتماعی زندگی میں نافذ کرنے سے دنیا میں بھی سلامتی نصیب ہوتی ہے اس طرح دنیا دار الفساد بننے کے بجائے دار السلام بن جاتی ہے۔
"حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں ہم نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس تھے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک سیدھا خط کھینچا پھر اس کے دائیں اور بائیں مختلف خطوط کھینچے پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنا دست مبارک درمیان والے سیدھے خط پر رکھتے ہوئے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے، پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی : "اور یہ میرا سیدھا راستہ ہے اس کی پیروی کرو اس کے سوا دوسری راہوں پر نہ چلو دوسری راہیں تمہیں صراط مستقیم سے جدا کر دیں گی۔ " [رواہ ابن ماجۃ : باب اتباع سنۃ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)] (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

آیت مبارکہ :

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝١٢٧

لغۃ القرآن: لَهُمْ : ان کے لیے] [دَارُ : گھر ہے] [السَّلٰمِ : سلامتی کا] [عِنْدَ : پاس] [رَبِّهِمْ : ان کے رب کے] [وَهُوَ : اور وہ] [وَلِيُّهُمْ : انکا دوست ہے] [بِمَا : اس وجہ سے جو] [كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ : ہیں وہ سب کرتے]

ترجمہ : انہی کے لیے ان کے رب کے حضور سلامتی کا گھر ہے اور وہی ان کا مولیٰ ہے ان اعمال (صالحہ) کے باعث جو وہ انجام دیا کرتے تھے

تشریح:

دارُ السلام کے دو معنی ہیں (1) سلام اللہ تعالیٰ کا نام ہے، تو "دار السلام "کا معنی ہوا وہ گھر جس کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور یہ اضافت تشریف اور عزت افزائی کے لیے ہے جیسے بَیْتُ اللہ اور نَاقَۃُاللہ میں ہے۔ (2) اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ "سلام " دار کی صفت ہے یعنی یہ سلامتی کا گھر ہے اور جنت کو "دارُالسلام "اس لیے فرمایا ہے کہ جنت میں ہر قسم کے عیوب، تکلیفوں اور مشقتوں سے سلامتی ہے۔ (1) جنت کو دار السلام کہنے کی تیسری وجہ یہ ہے کہ جنتیوں کو جنت میں دخول کے وقت سلام کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے، فرشتوں کی طرف سے اور اہل اعراف کی طرف سے ان کو سلام پیش کیا جائے گا اور جنتی بھی ایک دوسرے کو سلام کریں گے۔

(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

دارالسلام کا مطلب

اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو ان کے اعمال کے صلہ میں جو انعام عطا فرمائیں گے اس کو اس آیت کریمہ میں دار السلام کہا گیا ہے۔ اصحاب علم نے دار السلام کے مختلف معانی بیان کیے ہیں۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ کے قرینہ سے بعض اہل تأویل نے اس کا ترجمہ جنت کیا ہے یقیناً جنت کا ایک نام دار السلام بھی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے راستے پر چلنے والے لوگوں کو قیامت کے دن جنت عطا فرمائے گا اور وہ ایسا سلامتی کا گھر ہے جس میں نہ کوئی خوف ہوگا نہ پریشانی ہوگی کوئی غم اہل جنت کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گا کوئی ناخوشگوار بات ظہور میں نہیں آئے گی۔ ہر طرف

سلامتی کے چرچے ہوں گے سلام سلام کی آوازیں ہوں گی اور آدمی ہر وقت خوشیوں اور مسرتوں کے جھولے میں جھولے گا۔ یقیناً ایک شخص کے لیے جنت سے بڑھ کر کسی انعام کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔ اس لیے جب وہ وہاں کی نعمتوں کو دیکھے گا اور اپنے اجر و ثواب کو ملاحظہ کرے گا تو اس دنیا میں اٹھائے ہوئے صدمے اور راہ حق میں برداشت کی ہوئی مشکلات اس کو نہایت ہیچ نظر آئیں گی کیونکہ ان مشکلات اور اذیتوں کو اس معاوضے اور اجر و ثواب سے کوئی نسبت نہیں ہوگی۔ چنانچہ اس صلے کو دیکھ کر آنحضرت کے ارشاد کے مصداق جنتی تمنا کریں گے کہ کاش ہم کو اس سے بڑھ کر اذیتیں دی جاتیں بلکہ ہماری کھالوں کو قینچیوں سے کاٹا جاتا تاکہ ہم یہاں بیش از بیش نعمتوں سے نوازے جاتے اور پھر یہ نعمتیں ایسی ہوں گی جن کو اس سے پہلے کسی آنکھ نے دیکھا نہیں ہوگا اور ان کی دلنوازی کا حال یہ ہوگا کہ کبھی ایسی دلنواز صدا کسی کان میں کبھی پڑی نہیں ہوگی اور انسانی حدود سے ماورا ہونے کا یہ حال ہوگا کہ کبھی ان نعمتوں کا تصور بھی انسانی دلوں میں نہیں گزرا ہوگا۔ ظاہر ہے اس سے بڑھ کر اور کونسا صلہ ہوسکتا ہے جس کی تمنا کی جاسکے۔ ع

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

بعض دوسرے اہل تاویل نے دارالسلام کو جنت تک محدود نہیں رکھا وہ عِنْدَ رَبِّهِمْ کو اس کا قرینہ نہیں سمجھتے۔ اس لیے کہ دنیا اور آخرت اور ان کی تمام نعمتیں اللہ ہی کی جانب سے عطا ہوتی ہیں اور اللہ ہی ان کا مالک اور عطا کرنے والا ہے اس لحاظ سے صرف جنت کا اسے قرینہ قرار دینا کسی طرح بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دارالسلام جس طرح جنت ہے اسی طرح دنیا بھی ہے کیونکہ دارالسلام کا ایک معنی اللہ کا گھر بھی ہے کیونکہ سلام اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے تو اللہ کا گھر جس طرح جنت اور آخرت ہے اسی طرح دنیا بھی ہے دونوں پر اس کی تجلیات برستی ہیں ' دونوں اس کی تحویل میں ہیں ' دونوں کی نگرانی وہی فرماتا ہے اور دونوں کے امکانات اور دونوں کی نعمتوں کا وہی خالق ہے۔ اس لیے دارالسلام سے دونوں کو مراد لینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور مزید یہ بھی کہ آخرت میں جس طرح جنت ہے اسی طرح جہنم بھی ہے۔ جنت اگر دارالسلام ہے تو جہنم دارالعذاب ہے۔ اسی طرح دنیا بھی دو حصوں پر مشتمل ہے اللہ کے اطاعت گزاروں کے لیے یہ دارالسلام ہے اور اللہ کے نافرمانوں کے لیے یہ دارالمحن اور دارالابتلاء ہے۔ جو لوگ اللہ کے راستے کے مسافر بن جاتے اور ایمان کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارتے اور شریعت کے احکام کی پابندی کرتے ہیں ' نفسانیت کو کبھی اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیتے ' ہر کام کرنے سے پہلے شریعت اسلامی کے احکام کو یاد کرتے ہیں اور اللہ کی رضا کی طلب ان کا مقصود اور منتہا بن جاتی ہے ان کے لیے یہ دنیا یقیناً دارالسلام ہے ایک تو اس وجہ سے کہ اللہ کا وعدہ ہے کہ جو میری ہدایت کی پیروی کرتا ہے اس کے لیے اس دنیا میں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی حزن۔ ظاہر ہے کہ جسے خوف و حزن سے بچا لیا جائے اس کے لیے یہ دنیا یقیناً دارالسلام ہے۔ ممکن ہے آپ کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو کہ اسلامی شریعت پر چلنے والے بھی تو ہمیشہ پریشانیوں سے محفوظ نہیں رہتے کبھی ذاتی پریشانیاں ' کبھی اولاد کی پریشانیاں ' کبھی معاشرتی اور معاشی پریشانیاں ' کبھی استبدادی قوتوں کی جانب سے دار و گیر ' سو طرح کی پریشانیاں ہیں جن میں صاحب ایمان بھی مبتلا ہوتے ہیں تو پھر ان کے لیے یہ دنیا دارالسلام کیسے ہوئی؟ بات یہ ہے کہ یہ سوچ غلط فہمی یا کم علمی کا نتیجہ ہے اگر دو باتوں کو سمجھ لیا جائے تو یہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ جن پریشانیوں کا ہم نے تذکرہ کیا ہے جو صاحب ایمان لوگوں کو بھی پیش آتی ہیں ان کے بارے میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہ پریشانیاں کچھ تو فطری ہیں جنھیں اصل میں پریشانیاں نہیں کہنا چاہیے وہ اس زندگی کے لازمی تقاضے ہیں۔ جو کاروبار کرتا ہے اسے کبھی نقصان بھی ہوتا ہے جو پیدا ہوتا ہے وہ کبھی نہ کبھی موت کی اذیت سے بھی دوچار ہوتا ہے ' جو صحت مند ہے وہ کبھی نہ کبھی بیمار بھی ہوتا ہے اور جو خوش ہے وہ

کبھی نہ کبھی غم گین بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ چیزیں چونکہ زندگی کا لازمی تقاضہ ہیں اس لیے سلامتی کی ضد نہیں ہیں۔ بلکہ یہی تو وہ چیزیں ہیں جن سے زندگی کی قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے اور خوشی کا تصور ابھرتا ہے۔ غالب نے اسی کی وضاحت کرتے ہوئے شاید کہا تھا

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

جو بیمار نہیں ہوتا اسے صحت کی قدر و قیمت کا احساس نہیں ہوتا ' جسے بھوک نہیں لگتی وہ کھانے پینے کی لذت سے بھی آشنا نہیں ہوتا جسے مسلسل کام سے تھکاوٹ نہیں ہوتی اسے آرام و راحت کی قدر بھی نہیں ہوتی جسے دھوپ پریشان نہیں کرتی وہ سائے کی آسودگی کو کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ چیزوں کا صحیح احساس ہمیشہ تضادات سے پیدا ہوتا ہے ایک منفی چیز مثبت کا تصور ابھارتی ہے اس لیے جن چیزوں کو ہم خوف و حزن یا پریشانیوں کا نام دیتے ہیں اصلاً وہ اس کی متضاد چیزوں کا احساس دلانے کے لیے ضروری ہیں اور یا یوں کہنا چاہیے کہ خوشی اور مسرت کا احساس ان کے بغیر کبھی وجود میں نہیں آتا تو جو چیز کسی خوشگوار چیز کا باعث بنتی ہے وہ چیز ناگوار بھی ہو تو اسے ناگوار نہیں کہا جاسکتا اس لیے اس دنیا کو دارالسلام کہنا غلط نہیں اور دوسری یہ بات کہ یہاں کی مشکلات جو اچھے لوگوں کو پیش آتی ہیں وہ انھیں بطور سزا کے پیش نہیں آتیں بلکہ اس لیے پیش آتی ہیں کہ ان کے اندر جو مخفی صلاحیتیں اور جو مضمر اچھائیاں ہیں ان کو ابھارا اور نمایاں کیا جائے۔ جو شخص پانی میں کود کر غوطے نہیں کھاتا اور ڈبکیاں برداشت نہیں کرتا اس کے اندر چھپی ہوئی تیراکی کی قوت کبھی وجود میں نہیں آتی۔ جس شخص میں کوئی ہنر چھپا ہوا ہے یا کوئی خوبی پوشیدہ ہے 'اس کو نمایاں کرنے اور بروئے کار لانے کے لیے اس کو بعض مراحل سے گزارا جاتا ہے۔ کچھ ایکسر سائزز کرائی جاتی ہیں 'کسی محنت کے عمل سے متعلق کیا جاتا ہے تب وہ ایک اچھا کھلاڑی بنتا ہے 'ایک اچھا خطیب بنتا ہے 'ایک اچھا ادیب بنتا ہے 'ایک اچھا مصور بنتا ہے 'ایک اچھا معلم بنتا ہے حتی کہ ایک اچھا کاشتکار بنتا ہے۔ اگر اسے اس محنت کے پراسس سے نہ گزارا جاتا تو اس کی یہ مخفی صلاحیتیں کبھی بروئے کار نہ آتیں اسی طرح ایک مسلمان کو چونکہ ایک سچا انسان 'ایک مخلص مسلمان 'ایک ایثار پیشہ شخص دوسروں کے کام آنے والا کارکن اپنی خودی کی حفاظت کرنے والا اور خطرات سے کھیلنے والا اور محض اللہ کی رضا کا طالب اور آخرت کا مسافر بنانا مقصود ہے تو ان خوبیوں کو بروئے کار لانے کے لیے جن جن مراحل سے گزرنا ضروری ہے اور جن مشقتوں کو اٹھانا واجب ہے اور جن امتحانات سے سابقہ ضروری ہے ان سب سے ایک مومن کو گزارا جاتا ہے تاکہ ان صفات کا حامل ایک مومن تیار ہوسکے تو یہ چونکہ تیاری کے لیے لازمی مشقیں ہیں اس لیے ان سے گزرتے ہوئے ان کو سزائیں سمجھنا یہ کوتاہ فہمی کی دلیل ہے یا ان کو پریشانیاں خیال کرکے ان سے پریشان ہونا یہ کم ہمتی پر دلالت کرتا ہے

حقیقت تو یہ ہے کہ بعض اللہ والوں نے ایسے ایسے گوشوں کو واشگاف کیا ہے جن کی طرف عموماً دھیان نہیں جاتا۔ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی نے ایک دفعہ ایک نشست میں ارشاد فرمایا کہ صحت بھی اللہ کی نعمت ہے اور بیماری بھی اللہ کی نعمت ہے بلکہ بیماری صحت سے بڑی نعمت ہے حالانکہ ہم بیماری کو ہمیشہ ایک پریشانی بلکہ مصیبت جانتے ہیں لیکن حاجی صاحب نے دلیل دیتے ہوئے فرمایا کہ بڑی نعمت وہ ہوتی ہے جو آدمی کو اپنے محبوب کے قریب کردے اس کا مطلوب اس کے لیے آسان کردے۔ صحت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے احساسات آدمی کو دوسری مصروفیات میں گم کرکے اللہ کی طرف سے غافل کردیتے ہیں اور آدمی بجائے اللہ کی محبت کا حق ادا کرنے کے دوسری محبتوں میں کھو جاتا ہے۔ اس لیے وہ نعمت ہونے کے باوجود آدمی کے اپنے غلط اعمال کے باعث بعض دفعہ مصیبت بن جاتی ہے۔ لیکن بیماری اس لیے اللہ کی بڑی نعمت ہے کہ جیسے جیسے بیماری کی شدت بڑھتی جاتی ہے ویسے ویسے آدمی اللہ کی طرف متوجہ ہوتا جاتا ہے۔ ہر کسک اور ہر ٹیس پر مریض اللہ

کو یاد کرتا ہے اور جب بیماری کی شدت بے قابو ہونے لگتی ہے تو آدمی بے چین ہو کر اللہ سے دعا کرنے لگتا ہے اس وقت وہ سب سے زیادہ اللہ کے قریب ہوتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ فرما لیجئے کہ جن چیزوں کو ہم پریشانیاں سمجھتے ہیں وہ ہمیشہ پریشانیاں نہیں ہوتیں بلکہ اگر انھیں صحیح تناظر میں دیکھا جائے تو وہ آسانیوں 'راحتوں اور بعض دفعہ کامرانیوں کا پیش خیمہ ہوتی ہیں اور مزید یہ بات بھی کہ ایک مومن کو اسلام کی طرف سے جو سوچ نصیب ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جب اس کو کوئی خوشی میسر آتی ہے تو وہ اللہ کا شکر بجالاتا ہے کہ اس خوشی کو حاصل کرنے والا میں نہیں ہوں یعنی یہ میری کسی ذاتی خوبی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کا عطا کرنے والا میرا رب ہے اور جب اسے کوئی ناخوشی کی بات پیش آتی ہے تو وہ اسے بھی انہونی نہیں سمجھتا وہ جانتا ہے کہ کوئی بات بھی اللہ کے علم کے بغیر اور بدوں اس کی اجازت کے وقوع پذیر نہیں ہوتی تو یہ بظاہر جو پریشانی مجھے پیش آرہی ہے یہ یقیناً اللہ کی جانب سے ہے تو جب اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے تو پھر اس کی دور رس نظر اس پریشانی میں نہیں الجھتی بلکہ وہ اس سرچشمہ فیض کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ جو ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہ چونکہ ہر مسلمان کا محبوب ہے اس لیے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ میرے محبوب نے ایک پریشانی پیدا کر کے مجھے یاد فرمایا ہے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔ کیونکہ وصال کے لمحے اس سے پہلے پیش آنے والی ناخوشگواریوں کو بھی لطف و لذت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ وہ تو محبوب کی لاگ کو بھی بقول غالب لگاؤ سمجھتا ہے اللہ کی ذات کے ساتھ تو کسی لاگ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہاں سے جو کچھ عطا ہوتا ہے چاہے کسی صورت میں ہو وہ تو لگاؤ ہی لگاؤ ہے۔ بلکہ محبت کے شن اور تو محبوب کی دشمنی کو بھی خوشی کا باعث سمجھتے ہیں۔ نجانے کس کا شعر ہے۔

گو دشمنی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں
ہم خوش ہیں کہ ہیں کسی کی نگاہ میں

دشمنی کا تصور اللہ کے ساتھ تو ویسے ہی بے ادبی ہے اس لیے وہ جس طرح بھی اپنے کسی بندے کو یاد کرتا ہے اس میں بندے کی عزت افزائی اور اس کی تربیت کا سامان ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں ایک مومن کو پیش آمدہ حالات کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو پھر اس دنیا کو کوئی وجہ نہیں ہے کہ دارالسلام نہ سمجھا جائے۔ علاوہ ازیں ایک اور حقیقت بھی ہے جس کا نگاہوں میں رہنا بہت ضروری ہے وہ یہ کہ اسلامی نظام زندگی ایک نہایت مربوط 'متوازن اور ایک اکائی کی شکل رکھتا ہے۔ یہ اپنے ماننے والوں کو اس صورت میں اپنی خیر و فلاح سے نوازتا ہے جب اس کو بلا کم وکاست مکمل طور پر مسلمانوں پر نافذ کیا جائے اور مسلمان پوری طرح اپنی زندگیاں اس نظام کی تحویل میں دے دیں اس کے بعد اللہ کی طرف سے کامرانیوں کے فیصلے ہوتے ہیں اور پھر کوئی حزن و ملال مسلمان معاشرے کو پریشان نہیں کرتا۔ جس گھر میں میاں بیوی ایک دوسرے کے حق آشنا اور ماں باپ اور اولاد شفقت اور احترام میں اپنا اپنا فرض انجام دینے والے ہوں وہ گھر جنت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور جس معاشرے میں حق ہمسائیگی ادا ہو رہا ہو اور اس معاشرے کے رہنے والے اللہ کی جانب سے معاشرتی فرائض کے ادا کرنے والے ہوں اور ایثار اور غمگساری ان کی معاشرت کا سب سے اہم حصہ ہو تو ایسا معاشرہ اولاً تو ناخوشگواریوں کا شکار نہیں ہوتا اور اگر کوئی ایک فرد یا کوئی ایک گھر کسی ناگہانی آفت کا شکار ہو بھی جائے تو اس کی مصیبت میں شریک ہونے والے اور اس کے غم کا بوجھ اٹھانے والے اتنی بڑی تعداد میں لوگ ہوتے ہیں کہ غم میں مبتلا ہونے والا شخص اپنے غم کو بھول جاتا ہے اور پھر جب معاشرہ ایک ریاست میں تبدیل ہوتا ہے اور ریاست کے چلانے والے خلافت راشدہ کی روایات کے امین ثابت ہوں تو پوری ریاست دور خلافت راشدہ کی طرح ایک جنت کا نمونہ بن جاتی ہے جس

میں سوائے سلامتی کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس وجہ سے دارالسلام سے دنیا اور آخرت دونوں کو مراد لینا زیادہ قرین صواب (درست) معلوم ہوتا ہے۔

مومنوں کا اللہ ولی ہو گا

مسلمانوں کے اجر و ثواب اور صلے کے سلسلے میں دوسری بات جو ارشاد فرمائی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ صرف ان کی دنیا اور آخرت دارالسلام ہی نہیں بنے گی بلکہ ان کا پروردگار ان کا ولی بھی ہو گا۔ ولی آپ جانتے ہیں ہمدرد و غمگسار کارساز اور دوست کو کہتے ہیں ایمان کے راستے پر چلنے والے لوگوں کے لیے سب سے بڑا انعام یہ ہو گا کہ اللہ انھیں اپنی ولایت سے نوازے گا۔ یعنی انھیں اپنے دوستوں میں شامل فرمالے گا۔ اپنی دوستی اور رحمت کی چادر ان پر ڈال دے گا۔ دنیا میں ان کی ہر موقع پر مدد فرمائے گا اور آخرت میں اپنی رضا اور خوشنودی کا اعلان کر کے انھیں اپنی محبت میں مخمور کر دے گا اور یہ ایک ایسا انعام ہے کہ دنیا میں صحیح طور پر اس کے لطف و لذت کا اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ اللہ اور بندے میں محبت اور خُلّت کے لحاظ سے کوئی نسبت نہیں۔ کہاں خالق کائنات اور کہاں زمین کے چھوٹے سے کرّے کا باسی حضرت انسان۔ اسے کیا نسبت ہے خالق کائنات سے لیکن اللہ کے کرم کی کیا انتہاء ہے کہ وہ محض اس کے ایمان و عمل کے نتیجے میں اپنی دوستی سے اسے نواز دیتا ہے۔ آخر میں فرمایا کہ یہ اتنے بڑے بڑے انعامات یاد رکھو اس وجہ سے نہیں ملیں گے کہ تم اس امت کے افراد ہو یا تم کسی خاص نسب سے تعلق رکھتے ہو یا تم کسی خاص علاقے میں پیدا ہوئے ہو بلکہ یہ سب کچھ اس لیے تمہیں عطا ہو گا کہ تم نے اعمال وہ کیے ہیں جو تمہارے اللہ کو پسند ہیں۔ اس لیے تمہارے اعمال کے باعث اور تمہاری قربانیوں کے صلے میں اللہ تعالیٰ تم پر اپنی عنایات فرمائیں گے۔
مسلمانوں پر عطا و بخشش اور انعامات کے تذکرے کے بعد روئے سخن انہی مشرکین اور ان کے اکابر مجرمین کی طرف پھر گیا ہے جو اس سے پہلے مخاطب تھے۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

المختصر اس سے چند مسئلے معلوم ہوئے۔ ایک یہ کہ جنتی لوگ اپنی اپنی جنت کے مالک ہیں نہ کہ صرف مہمان جیسا کہ لھم کے لام سے معلوم ہوا۔ دوسرے یہ کہ ان کی یہ ملکیت آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی جیسا کہ جملہ اسمیہ سے معلوم ہوا تیسرے یہ کہ جنت میں ہر قسم کی سلامتی ہو گی۔ مرض، موت کسی کی مخالفت کا خطرہ نہ ہوگ اس لیے اسے دارالسلام کہتے ہیں چوتھے یہ کہ جنت حاصل ہونے کا سبب نیک اعمال ہیں جیسا کہ بھا کی ب سے معلوم ہوا لیکن یہ اکثر یہ قاعدہ ہے۔ دیوانہ اور بچے اور وہ نو مسلم جو ایمان لاتے ہی فوت ہو گیا۔ بغیر اعمال کے جنتی ہے۔ بلکہ حضور کے اعمال طیبہ طاہرہ میں ہم جیسے گنہگاروں کا حصہ ہے۔ سخی کے مال میں فقیروں کا حصہ ہوتا ہے۔ رب فرماتا ہے۔ رب فرماتا ہے۔ **وفی اموالھم حق معلوم للسائل ولمحروم** قیامت میں اولاً سب اکٹھے ہوں گے اس لیے اسے حشر کہتے ہیں بعد میں اچھے بروں کی چھانٹ ہو جاوے گی اس لیے اسے یوم الفصل کہا جاتا ہے۔ سب کو اٹھانے سے مراد یا یہ ہے کہ مومن و کافر کو اکٹھا اٹھائے یا انسان و جن کو اکٹھا یا سعید و شقی کو اکٹھا۔
(تفسیر نور العرفان۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی)

آیت مبارکہ :

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ۭ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭاِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ○۱۲۸

لغۃ القرآن : وَيَوْمَ : اور وہ دن] [يَحْشُرُهُمْ : وہ اکٹھا کرے گا انہیں] [جَمِيْعًا : سب کو] [يٰمَعْشَرَالْجِنِّ : اے جنوں کے گروہ !] [قَدِ : یقینا] [اسْتَكْثَرْتُمْ : تم نے بہت زیادہ " گمراہ " کرنا چاہا] [مِّنَ : سے] [الْاِنْسِ : آدمیوں] [وَ : اور] [قَالَ : فرمایا] [اَوْلِيٰٓؤُهُمْ : ان کے دوست] [مِّنَ : سے] [الْاِنْسِ : آدمیوں] [رَبَّنَا : اے ہمارے رب] [اسْتَمْتَعَ : فائدہ حاصل کیا] [بَعْضُنَا : ہم میں سے بعض] [بِبَعْضٍ : بعض کو] [وَّبَلَغْنَآ : اور ہم پہنچ گئے] [اَجَلَنَا : اپنے " اس " وقت کو] [الَّذِيْٓ : جو تو نے] [اَجَّلْتَ : مقرر کیا تھا] [لَنَا : ہمارے لیے] [قَالَ : فرمایا] [النَّارُ : آگ] [مَثْوٰىكُمْ : تمہارا ٹھکانا ہے] [خٰلِدِيْنَ : سب ہمیشہ رہنے والے ہیں] [فِيْهَآ : اس میں] [اِلَّا مَا : مگر جو] [شَاۗءَ اللّٰهُ : اللہ چاہتا] [اِنَّ : بیشک] [رَبَّكَ : اپنے رب سے] [حَكِيْمٌ : حکمت والا] [عَلِيْمٌ : خوب جاننے والا ہے]

ترجمہ : اور جس دن وہ ان سب کو جمع فرمائے گا (تو ارشاد ہوگا :) اے گروہ جنات (یعنی شیاطین !) بیشک تم نے بہت سے انسانوں کو (گمراہ) کر لیا، اور انسانوں میں سے ان کے دوست کہیں گے : اے ہمارے رب ! ہم نے ایک دوسرے سے (خوب) فائدے حاصل کئے اور (اسی غفلت اور

مفاد پرستی کے عالم میں) ہم اپنی اس میعاد کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لیے مقرر فرمائی تھی (مگر ہم اس کے لیے کچھ تیاری نہ کر سکے) ۔ اللہ فرمائے گا کہ (اب) دوزخ ہی تمہارا ٹھکانا ہے ہمیشہ اسی میں رہوگے مگر جو اللہ چاہے۔ بیشک آپ کا رب بڑی حکمت والا خوب جاننے والا ہے

تشریح:

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ساری مخلوق کو جمع کرے گا تو شیاطین جنوں کو فرمائے گا : تم نے بہت سے انسانوں کو گمراہ کیا اور وہ گمراہ انسان بھی اقرار کریں گے کہ واقعی وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہوئے ایک دوسرے سے ناجائز فائدے اٹھاتے رہے حتیٰ کہ ان کی زندگی کی میعاد ختم ہو گئی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائے گا : اب تمہارا ٹھکانا آگ ہے تم ہمیشہ اس میں رہوگے اور صرف وہی لوگ آگ سے بچ سکیں گے جنہیں اللہ تعالیٰ بچانا چاہے گا۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

موت کا فرشتہ نظر آ جانے کے بعد انسان پر توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے پھر ایمان لانا فائدہ نہیں دیتا نہ ہی روز قیامت ایمان لانا فائدہ دے گا۔ کیونکہ روز قیامت دار جزا ہے دار عمل نہیں ہے۔ دار عمل دنیا ہے یہاں انسان جو عمل کرتا ہے خواہ کفر کرا ایمان لائے اچھا عمل کرے یا برے کام اختیار کرے روز قیامت اس کی جزا دی جائے گی اس دن عمل کی اجازت نہیں ملے گی۔ (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

اس سے پہلے سبق میں یہ بات گزری ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے دلوں کو اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ ایسے لوگوں کے دل بیدار ہوتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ دارالسلام میں داخل ہوتے ہیں اور اپنے رب کی ولایت اور کفالت میں رہتے بستے ہیں۔ اب یہاں ایسے لوگوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو ان کے نقیض ہیں۔ قیامت کے مناظر بیان کرتے ہوئے قرآن کریم کا یہی انداز ہوتا ہے کہ وہ تصویر کے دونوں رخ انسان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اب یہاں انسانوں اور جنوں میں سے جو لوگ شیطانی کام کرتے ہیں ان کے شب و روز کا ذکر کیا جاتا ہے ' یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں ایسی زندگی گزاری ہے کہ یہ ایک دوسرے کو کھوٹی باتیں بتاتے رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے رہے ہیں اور یہ کام وہ اس لیے کرتے رہے ہیں کہ لوگ گمراہ ہوں۔ ان لوگوں کا رویہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ یہ لوگ نبیوں کے مقابلے میں ایک دوسرے کے پشتیبان بنیں اور یہ لوگ ایک دوسرے کو مشورے دیتے رہے ہیں تاکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ان معاملات میں بحث و مباحثہ کریں جن میں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے حلال و حرام کا تعین کیا ہے۔ ان لوگوں کو قرآن کریم نے اس طرح پیش کیا ہے جس طرح ایک زندہ اور متحرک منظر میں کوئی چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ یہ لوگ اس منظر میں ایک دوسرے پر الزام لگاتے ہوئے نہایت ہی منائف نظر آئے۔ غرض اس آیت میں وہ مناظر بھرپور انداز میں آ گئے جس طرح کہ قرآن کریم ہر جگہ مناظر قیامت کے بیان کے وقت یہ انداز عموماً اختیار کرتا ہے۔

(آیت) "نمبر ۱۲۸تا ۱۳۰۔

یہ منظر براہ راست مستقبل کے واقعات سے شروع ہوتا ہے 'جب اللہ تعالیٰ سب کو گھیر کر میدان حشر میں جمع کرے گا 'لیکن سننے والے کے لیے یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے اور وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو اور یہ تخیل اور تصور صرف ایک لفظ (اور کہے گا) کے حذف سے سامنے آتا ہے یعنی "اور جس روز ان سب کو گھیر کر جمع کرلے گا (اور یہ کہے گا) اے گروہ جن "۔ صرف لفظ کہے گا کے حذف سے مفہوم ایک منظر کی شکل میں نظروں کے سامنے آ کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ منظر جو مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والا تھا فی الواقع سامنے آ جاتا ہے اور یہ انداز بیان قرآن کریم کے ساتھ مخصوص ہے۔ اب ذرا اس منظر کی تفصیلات ملاحظہ فرمائیں۔

(آیت) "یَامَعۡشَرَ الۡجِنِّ قَدِاسۡتَكۡثَرۡتُم مِّنَ الۡإِنسِ "(٦ : ١٢٨)

" اے گروہ جن ! تم نے نوع انسانی پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ "یعنی تم نے انسانوں کی اکثریت کو اپنا تابع بنالیا۔ وہ تمہاری ہدایات واشارات پر چلتے رہے اور تمہاری وسوسہ اندازیوں پر خوب یقین کرتے رہے۔ تمہارے منصوبوں پر چلتے رہے۔ یہ صورت واقعہ کا ایسا بیان ہے کہ جس سے مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ صرف واقعہ بیان کرنا مطلوب ہے اس لیے کہ جن اس بات کو خوب جانتے تھے کہ انھوں نے انسانوں کی ایک بڑی اکثریت کو گمراہ کر دیا ہے بلکہ اس واقعی صورت حال کے بیان سے مقصد یہ ہے کہ یہ تمہارا بہت ہی بڑا جرم ہے کہ تم نے انسانوں کی اتنی بڑی اکثریت کو گمراہ کر دیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے اس جرم کو دیکھ کر پشیمان ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں جنات کی جانب سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ البتہ وہ لوگ جواب دیتے ہیں جنہیں دھوکہ دیا گیا اور جو بسہولت ان شیاطین کے وسوسوں کا شکار ہو جاتے تھے۔ یہ لوگ یوں جواب دیتے ہیں۔

(آیت) "وَقَالَ أَوۡلِيَآؤُهُم مِّنَ الۡإِنسِ رَبَّنَا اسۡتَمۡتَعَ بَعۡضُنَا بِبَعۡضٍ وَبَلَغۡنَا أَجَلَنَا الَّذِيَ أَجَّلۡتَ لَنَا "(٦ : ١٢٨)

" انسانوں میں سے جو ان کے رفیق تھے وہ عرض کریں گے پروردگار ! ہم میں سے ہر ایک نے دوسرے کو خوب استعمال کیا ہے 'اور اب ہم اس وقت آپہنچے ہیں جو تو نے ہمارے لیے مقرر کر دیا ہے۔"

اس جواب سے ان غافلوں کی غفلت اور ان کے ہلکے پن کا اندازہ ہوتا ہے اور اس دنیا میں شیطان انسانوں کو جس راہ پر گمراہ کرتا ہے اس کا اندازہ بھی خوب ہو جاتا ہے۔ یعنی جب جنات ان لوگوں کو دھوکہ دے رہے تھے تو یہ دھوکہ کھانے والے بھی انھیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ یوں یہ جنات ان افکار و تصورات کو ان لوگوں کے لیے خوشنما بناتے تھے۔ اس طرح یہ لوگ ظاہر اور باطنی بدکاریوں میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ گویا شیطان عیاشیوں کے راستے سے انسان کو گمراہ کرتا ہے۔ اس طرح اس دھوکے اور گمراہ سازی کے ذریعے یہ شیاطین بھی خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔ یوں شیطان ان کو اپنی ہوس کا شکار بناتا اور ان سے کھیلتا اور ان کو اس جہان میں ابلیسی مقاصد کے لیے استعمال کرتا۔ جبکہ یہ دھوکہ کھانے والے یہ سمجھتے کہ ہم نے شیطان کو گمراہ کر دیا ہے۔ اس طرح یہ خود بھی اس کھیل میں مشغول ہوتے 'دلچسپی لیتے اور لطف اندوز ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہتے تھے۔

(آیت) "استمتع بعضنا ببعض "۔ (ہم ایک دوسرے سے خوب لطف اندوز ہوتے۔) چنانچہ مرنے تک ہماری یہی عیاشی جاری رہی اور پھر اچانک موت آ گئی۔ اور اب وہ جان رہے ہیں کہ یہ مہلت تو اللہ تعالیٰ نے دی تھی اور یہ جو عیاشیاں کرتے تھے 'اس وقت بھی دراصل وہ پوری طرح اللہ کے قبضہ قدرت میں تھے۔ (اور اب ہم اس وقت پر آ پہنچے ہیں جو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا ہے) اب اس مقام پر اللہ کی جانب سے فیصلہ کن جواب آتا ہے :

(آیت) "قَالَ النَّارُ مَثۡوَاكُمۡ خَالِدِينَ فِيهَا إِلاَّ مَا شَاءَ اللّهُ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ (128)

" اللہ فرمائے گا "اچھا اب آگ تمہارا ٹھکانا ہے 'اس میں تم ہمیشہ رہو گے۔ "اس سے بچیں گے صرف وہی جنہیں اللہ بچانا چاہے گا 'بیشک تمہارا رب دانا اور علیم ہے۔"

یعنی تمہارا ٹھکانا جہنم ہے۔ یہاں تمہارا قیام ہو گا اور یہ قیام دائمی ہو گا '(الا ماشاء اللہ (٦ : ١٢٨) اور یہ لفظ (الا ماشاء اللہ (٦ : ١٢٨) یہاں اس لیے استعمال ہوا ہے کہ اللہ کی مشیت مطلق ہے 'بے قید ہے۔ اسلامی تصورات و عقائد میں اللہ مشیت کا بے قید ہونا ایک اساسی اصول ہے۔ نہ اس پر

کوئی چیک ہے اور نہ اس میں کوئی نقص ہے کیونکہ اللہ دانا اور علیم ہے اور وہ اپنی مشیت اور تقدیر کو پورے علم کے ساتھ چلاتا ہے۔اس کے علم کے ساتھ حکمت بھی موجود ہے۔اس منظر کے خاتمے سے پہلے اس منظر پر ایک تبصرہ سامنے آتا ہے اور یوں ایک حکمت ہمارے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے۔ (فی ظلال القرآن)

استثناء کی دو توجیہیں ہیں۔

(۱) وہ ہمیشہ دوزخ کی آگ میں رہیں گے مگر اس سے دو وقت مستثنیٰ ہیں۔ایک قبر سے حشر تک کا زمانہ او دوسرا میدان حشر میں ان کے محاسبہ تک کا وقت۔اس کے بعد ان کو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا 'اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

(۲) جب دوزخی دوزخ کی آگ کی شدت سے فریاد کریں گے 'تو ان کو دوزخ کی آگ سے نکال کر زمہریر (سخت ٹھنڈا اور برفانی طبقہ) میں ڈال دیا جائے گا اور جب زمہریر کی ٹھنڈک سے گھبرا کر فریاد کریں گے 'تو ان کو پھر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔الغرض! وہ ہر حال میں ایک عذاب سے دوسرے عذاب کی طرف منتقل ہوں گے۔

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ حکم لگائے کہ وہ اپنی کسی مخلوق کو جنت میں نہیں داخل کرے گا 'یا دوزخ میں نہیں داخل کرے گا۔ (جامع البیان 'جز ۸ ص ۴۶ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت ۱۴۱۵ھ) (تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

اس آیت کریمہ کا سب سے پہلا لفظ "یوم" نہایت قابل توجہ ہے اس میں جنوں اور انسانوں کو خطاب کرکے یہ فرمایا جارہا ہے کہ آج تمہیں اسلامی دعوت اپنی ساری اثر انگیزی اور اثر آفرینی کے باوجود اپیل نہیں کر رہی۔تم نہ صرف اسے قبول کرنے سے انکاری ہو بلکہ اس کی مخالفت میں پوری طرح تلے ہوئے ہو۔لیکن تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ تم ہمیشہ یہاں نہیں رہو گے موت کا شکار بنو گے 'پھر ایک وقت آئے گا جب تمہیں زندہ کیا جائے گا اور اللہ کے حضور تمہاری پیشی ہوگی اور اس دن تم پر کیا گزرے گی۔کیا اس دن کی ہول ناکی کے بارے میں تم نے کبھی سوچا ہے یہ زندگی کا سفر کوئی بہت طویل نہیں اس کے بعد عالم برزخ میں تم قیامت کا انتظار کرو گے لحاظ سے عملی طور پر قیامت کے آنے میں اور تم میں تمہاری چند سالہ دنیوی زندگی ہی تو حائل ہے چند سالوں کے بعد تم جن مراحل میں مبتلا ہونے والے ہو اور تمہارا انجام جن ہول ناکیوں سے دوچار ہونے والا ہے کیا تم نے کبھی اس کا بھی خیال کیا ہے تم سے ایک ایک بات کی بازپرس ہوگی۔تمہاری ایک ایک حرکت تمہارے سامنے کھول دی جائے گی تمہارے کرتوت خود بولیں گے۔جہنم تمہارے سامنے دھک رہا ہوگا۔اللہ تعالیٰ پورے جلال میں ہوں گے۔بتاؤ اس دن کیا کرو گے؟ اور آج تم اسلام کی مخالفت میں جس طرح ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہو اور تم سمجھتے ہو کہ تمہاری اس اجتماعی قوت کو کوئی نہیں توڑ سکتا لیکن تمہیں اس بات کا خیال نہیں آتا کہ تم سب کے سب اجتماعی طور پر اللہ کے سامنے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے کیے جانے والے ہو۔وہاں تم ایک دوسرے کی کوئی مدد نہیں کر سکو گے اور تم سب کو ایک ایسے ہمہ گیر عذاب کا شکار ہونا ہوگا جس سے تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔کسی کی سفارش کام نہیں آئے گی تمہاری مدد کو کوئی نہیں پہنچے گا۔اس دن اللہ کی مشیت کے سوا کسی چیز کی حکمرانی نہیں ہوگی۔اس طرح تم سب اللہ کے حضور جمع کیے جاؤ گے۔اب بجائے اس کے کہ تم آج اس کے ازالے اور تدارک کے لیے سوچو اور اس سے بچ نکلنے کی

تدبیر کرو لیکن تمہاری بے بصیرتی اور کوتاہ فہمی کا حال یہ ہے کہ جو طوفان تمہارے سر پر تلا کھڑا ہے اس کے بارے میں تمہیں سوچنا بھی نصیب نہیں ہو رہا۔

جنوں اور انسانوں نے ایک دوسرے سے کیا فائدہ حاصل کیا؟ اس کے دو مفہوم بیان کئے گئے ہیں۔ جنوں کا انسانوں سے فائدہ اٹھانا ان کو اپنا پیرو کار بنا کر تلذذ حاصل کرنا اور انسانوں کا جنوں سے فائدہ اٹھانا یہ ہے کہ شیطان نے گناہوں کو ان کے لیے خوبصورت بنا دیا جسے انھوں نے قبول کیا اور گناہوں کی لذت میں پھنسے رہے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کی انسان ان غیبی خبروں کی تصدیق کرتے رہے جو شیاطین و جنات کی طرف سے کہانت کے طور پر پھیلائی جاتی تھیں ا۔ یہ گویا جنات نے انسانوں کو بیوقوف بنا کر فائدہ اٹھایا یہ ہی انسان جنات کا بیان کردہ جھوٹی اٹکل پچو باتوں سے لطف اندوز ہوتے اور کاہن قسم کے لوگ ان سے دنیاوی مفادات حاصل کرتے۔ (تفسیر مکہ)

حساب، جنوں اور انسانوں دونوں سے لیا جائے گا

اس آیت میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ خطاب جنوں اور انسانوں دونوں سے ہو رہا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ جس طرح تکلیف شرعی کے مکلّف یعنی احکام شریعت کی بجاآوری کے پابند انسان ہیں اس طرح جنات بھی ہیں جس طرح اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب انسانوں کو دینا ہے اس طرح جنوں کو بھی ان تمام مراحل سے گزرنا ہے۔ اس لیے اس دن کی یاد دہانی کے بعد دونوں سے خطاب فرمایا جارہا ہے لیکن جن چونکہ ایک بالادست قوت ہے اور پھر جنات کے بارے میں مشرکین مکہ مشرکانہ تصورات بھی رکھتے تھے اس لیے سب سے پہلے انہی کو خطاب کیا جارہا ہے تاکہ مشرکین مکہ کو اندازہ ہو کہ کل کو جس طرح ہم پکڑے جائیں گے اسی طرح جن جنات کو ہم اپنی مدد کے لیے پکارتے ہیں وہ بھی پکڑے جانے والے ہیں اور دوسری وجہ دونوں سے خطاب کی یہ بھی ہے کہ عرب جاہلیت میں جنوں کو عربوں کی مذہبی اور سماجی زندگی میں بڑا دخل ہو گیا تھا۔ کہانت اور ساحری کی گرم بازاری تو ان کے دم قدم سے تھی ہی شاعری تک کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ یہ جنات الہام کرتے ہیں اور ہر بڑے شاعر کے ساتھ کوئی نہ کوئی جن ضرور ہوتا ہے۔ اسی بناء پر وہ آنحضرت کے متعلق بھی یہ کہتے تھے کہ ان کے ساتھ بھی کوئی جن ہے ہر وادی کے الگ الگ جن مانے جاتے تھے اور سفر و حضر 'جنگ و صلح اور فتح کے معاملات میں ان کے تصرفات کا بڑا دخل سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے دونوں سے بیک وقت خطاب فرمایا جارہا ہے اور جنوں کے بارے میں جیسا کہ میں نے عرض کیا عرب مشرکانہ خیالات رکھتے تھے اور ان کی ایک طرح سے پوجا پاٹ بھی کرتے تھے اور ان سے مدد کے طالب بھی ہوتے تھے اس لحاظ سے سب سے پہلے انہی سے خطاب فرمایا اور بجائے اس کے کہ ان کے ذاتی ایمان و عمل کو حوالہ بنایا جاتا اصل مخاطب چونکہ انسان ہیں اس لیے ان کے اس جرم کا ذکر کیا جارہا ہے جو انھوں نے انسانوں کے حوالے سے کیا ہے۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

مسلمانوں کو تنبیہ

جہاں ان آیات میں کفار کو نہایت واضح طور پر تنبیہ ہے کہ کفر و شرک کو چھوڑ دو ورنہ قیامت میں دائمی مصیبت و پشیمانی حاصل ہو گی وہیں مسلمانوں کو بھی نہایت لطیف ترین پیرایہ میں نصیحت ہے کہ قیامت کی ملامت ایک سخت عذاب ہو گی جس سے اس دنیا ہی کی زندگی میں بچنے کی فکر لازمی ہے اور نہ مرنے کے بعد قیامت میں آنکھ کھلی تو سوائے پچھتانے کے اور کیا بنے گا۔

دعا کیجئے: اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں سے غفلت کو دور کر دیں۔ اور ہم کو آخرت کی تیاری کی فکر عطا فرمائیں۔ اس دنیا میں اور اس زندگی میں اپنا اور اپنے رسول پاک (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا تابعدار اور مطیع ہم کو بنالیں تاکہ قیامت میں ذلت و رسوائی نہ ہو۔ یا اللہ اپنے مومن اور مخلص بندوں کے ساتھ ہمارا حشر فرمایئے اور دوزخ کے عذاب سے ہم سب کو اپنی پناہ میں رکھیئے گا۔ آمین۔ **واخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین**۔ (درس اسحاق)

فوائد

1 : یہ ان سرکش جنات سے خطاب ہے جنہوں نے انسانوں کو بہکایا۔ مومن جنات تو اللہ کی رحمت میں ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جنات انسانوں کے دلوں میں برے خطرے پیدا کرتے ہیں۔ گمراہی کی راہ دکھاتے ہیں۔ خصوصاً شیطان اور اس کی ذریت۔

۲ : یعنی انسانوں نے جنات سے فائدہ اٹھایا کہ جنات نے انھیں برے راہ دکھائے اور بد عملیوں کو ان کے لیے آسان کیا اور جنات نے انسانوں سے فائدہ اٹھایا۔ اس طرح کہ انسانوں نے ان کی پوجا کی۔ لہٰذا فائدے سے مراد دنیاوی فائدہ ہے جو در حقیقت نقصان ہی ہے۔

۳ : یعنی موت یا قیامت۔ موت ہر شخص کا علیحدہ وقت ہے اور قیامت سب کا وقت لہٰذا النار فرمانا بالکل درست ہے۔

۴ : یعنی وہ کفار جن کا ایمان مشیت الٰہی میں آ چکا وہ جہنم میں نہ جائیں گے کیونکہ وہ مومن ہو کر مریں گے۔ یہ مطلب نہیں کہ بعض کفار دوزخ میں جا کر نکالے جائیں گے۔ (تفسیر نور العرفان۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی)

آیت مبارکہ :

وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۱۲۹

لغۃ القرآن : وَكَذٰلِكَ : اور اسی طرح] [نُوَلِّيْ : ہم مسلط کردیتے ہیں] [بَعْضَ : بعض] [الظّٰلِمِيْنَ : سب ظالموں کا] [بَعْضًۢا : بعض پر] [بِمَا : اس وجہ سے جو] [كَانُوْا : تھے سب] [يَكْسِبُوْنَ : وہ سب کماتے ہیں]

ترجمہ : اسی طرح ہم ظالموں میں سے بعض کو بعض پر مسلط کرتے رہتے ہیں ان اعمال (بد) کے باعث جو وہ کمایا کرتے ہیں

تشریح:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : اور ہم اسی طرح بعض ظالموں پر بعض کو مسلط کر دیتے ہیں، کیونکہ وہ (معصیت کے) کام کرتے تھے۔ (الانعام : ۱۲۹)
قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بہت سے ظالموں کو اشتراک عمل کی وجہ سے بعض دوسرے ظالموں کے ساتھ ملا دیں گے جیسا کہ قیامت کے دن نسل، وطن یا زبان وغیرہ کے اشتراک کی بناء پر نہیں بلکہ عقیدہ اور عمل کی بنیاد پر حشر ہوگا۔ بعض مفسرین کی رائے کے مطابق یہ آیت دنیا کے معاملات کے متعلق ہے کہ بعض ظالموں کے ظلم کی وجہ سے ،ان پر دوسرے بڑے ظالموں کو مسلط کر دیا جاتا ہے ،اس صورت میں "نُوَلّی "کا معنی "ساتھی بنادیں گے "کی بجائے ، مسلط کر دیتے ہیں ہوگا۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

ظلم کرنے والوں کو عبرت انگیز نصیحت

اس آیت مبارکہ میں ظلم کرنے والوں کے لیے بڑی نصیحت ہے، چنانچہ حضرت ابو عبداللہ محمد بن احمد قرطبیؒ (رح) فرماتے ہیں "اس آیت میں ظلم کرنے والوں کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ اگر وہ اپنے ظلم سے باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ ان پر دوسرا ظالم مسلط کر دے گا جو انھیں ذلیل و خوار اور تباہ و برباد کر دے گا۔ اس آیت میں ہر قسم کے ظالم داخل ہیں، وہ شخص جو گناہ کر کے اپنی جان پر ظلم کرتا ہے، جو حاکم یا افسر اپنی رعایا اور ماتحت لوگوں پر ظلم کرتا ہے، جو تاجر جعلی اشیاء اور ملاوٹ والی چیزیں فروخت کر کے خریداروں پر ظلم کرتا ہے، اسی طرح جو چور اور ڈاکو مسافروں اور شہریوں سے لوٹ مار کر کے ان پر ظلم کرتے ہیں یہ سب ظالم کی صف میں شامل ہیں، ان تمام پر اللہ تعالیٰ کوئی ان سے بڑا ظالم مسلط کر دیتا ہے۔

(1)۔۔ حضرت ابو سعید خدری (رض) سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا : "اے لوگو ! اللہ عَزَّوَجَلَّ سے ڈرو، خدا کی قسم ! جو مومن دوسرے مومن پر ظلم کرے گا تو قیامت کے دن اللہ عَزَّوَجَلَّ اس ظالم سے انتقام لے گا۔
(2)۔۔ حضرت انس (رض) سے روایت، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا : "جس نے کسی ظالم کی اس کے ظلم پر مدد کی وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کی پیشانی پر لکھا ہوگا یہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کی رحمت سے مایوس ہے۔
(3)۔۔ حضرت علی المرتضیٰ (رض) سے روایت ہے، سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا : "مظلوم کی بد دعا سے بچو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنا حق مانگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی حقدار کو اس کے حق سے منع نہیں کرتا۔
(4)۔۔ حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) سے روایت ہے، سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا : جو ظالم کی مدد کرے گا اللہ تعالیٰ اسی ظالم کو اس پر مسلط کر دے گا۔

(5)۔۔حضرت فضیل بن عیاض (رض) فرماتے ہیں "جب تو ایک ظالم کو دوسرے ظالم سے انتقام لیتا ہوا دیکھے تو پھر ٹھہر جا اور تعجب سے یہ تماشا دیکھ۔ (تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری)

ظالم حکومت کا سبب عوام کا ظلم ہے

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا تھا کہ بعض جن اور انسان ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں اور ان کا یہ باہمی استفادہ اللہ تعالیٰ کے سابق علم اور قضاء وقدر کے موافق تھا 'اور وہ جس چیز کا ارادہ کرتے تھے 'اللہ تعالیٰ ان میں وہی چیز پیدا کر دیتا تھا۔اسی طرح اللہ تعالیٰ بعض ظالموں کو بعض کا ولی 'کارساز اور مددگار بنا دیتا ہے۔جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

(آیت) "والمؤمنون والمؤمنات بعضهم اولیآء بعض"۔(التوبہ : ۷۱)

ترجمہ : مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔

(آیت) "والذین کفروا بعضهم اولیآء بعض"۔(الانفال : ۷۳)

ترجمہ : بعض کافر بعض کے مددگار ہیں۔

اور جس طرح بعض انسان اور جن ایک دوسرے کے کام آتے تھے 'اسی طرح کافر کفر اور معصیت میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

ابن زید نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض ظالموں کو بعض پر مسلط کر دے گا اور اس آیت میں ہر قسم کے ظالم داخل ہیں۔وہ شخص جو معصیت کرکے اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اور جو حاکم اور افسر اپنے ماتحت لوگوں پر ظلم کرتا ہے اور جو تاجر جعلی اشیاء اور ملاوٹ والی چیزیں فروخت کرکے صارفین پر ظلم کرتا ہے 'اسی طرح جو چور اور ڈاکو مسافروں اور شہریوں پر ظلم کرتے ہیں اور سیاسی عہدہ دار اور وزراء عوام کے ٹیکسوں سے اللے تللے کرتے ہیں اور ٹیکس پر ٹیکس لگا کر عوام کی رگوں سے خون نچوڑتے رہتے ہیں ان سب ظالموں پر اللہ تعالیٰ کوئی ان سے بڑا ظالم مسلط کر دیتا ہے۔

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں :

حسن بیان کرتے ہیں کہ بنواسرائیل نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے کہا : آپ ہمارے لیے اپنے رب سے سوال کیجئے کہ وہ ہمیں یہ بتائے کہ اس کے راضی ہونے کی علامت کیا ہے اور اس کے ناراض ہونے کی علامت کیا ہے ؟ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ ! انھیں یہ بتاؤ کہ جب میں ان کے اچھے لوگوں کو ان پر حاکم بناؤں تو میں ان سے راضی ہوں اور جب میں ان کے برے لوگوں کو ان پر حاکم بناؤں تو میں ان سے ناراض ہوں۔

(شعب الایمان 'ج ٦ 'رقم الحدیث : ۷۳۸۸ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ 'بیروت '۱۴۱۰ ھ)

کعب احبار بیان کرتے ہیں کہ ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں کے مطابق بادشاہ مقرر کر دیتا ہے۔جب اللہ تعالیٰ ان کی بہتری کا ارادہ کرے تو نیک بادشاہ کرتا ہے اور جب ان کی ہلاکت کا ارادہ کرے تو عیش پرست بادشاہ مقرر کرتا ہے۔(شعب الایمان 'ج ٦ 'رقم الحدیث : '۷۳۸۹)

ابراہیم بن حمش بیان کرتے ہیں کہ میرے والد یہ کہتے تھے 'اے اللہ تو نے ہمارے اعمال کے مطابق ہم پر حکام مسلط کر دیئے 'جو ہم کو پہچانتے ہیں نہ ہم پر رحم کرتے ہیں (شعب الایمان 'ج ٦ 'رقم الحدیث : '٧٣٩٠)
یونس بن اسحاق اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جیسے تم ہوگے ویسے تم پر حاکم بنائے جائیں گے۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔ (شعب الایمان 'ج ٦ 'رقم الحدیث : '٧٣٩١)
حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ جس شخص نے ظلم پر مدد کی وہ تادم مرگ اللہ کی ناراضگی میں رہے گا۔ (سنن ابوداؤد 'ج ٣ 'رقم الحدیث : ٣٥٩٨ 'سنن ابن ماجہ 'ج ١ 'رقم الحدیث : ٢٣٢٠)
حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو سزا دینے کا ارادہ فرماتا ہے تو اس پر بدترین لوگوں کو حاکم بنا دیتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے :
(آیت) "وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم ویعفوا عن کثیر"۔ (الشوری : ٣٠)
ترجمہ : اور جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے تو وہ تمہاری ہی شامت اعمال کا نتیجہ ہے اور تمہاری بہت سی خطاؤں کو وہ معاف کر دیتا ہے۔
(تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

ہم مزاج ہی دوست ہوتے ہیں

لوگوں کی دوستیاں اعمال پر ہوتی ہیں مومن کا دل مومن سے ہی لگتا ہے گو وہ کہیں کا ہو اور کیسا ہی ہو اور کافر کافر بھی ایک ہی ہیں گو وہ مختلف ممالک اور مختلف ذات پات کے ہوں۔ ایمان تمناؤں اور ظاہر داریوں کا نام نہیں۔ اس مطلب کے علاوہ اس آیت کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اسی طرح یکے بعد دیگرے تمام کفار جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے۔ مالک بن دینار کہتے ہیں میں نے زبور میں پڑھا ہے اللہ فرماتا ہے میں منافقوں سے انتقام منافقوں کے ساتھ ہی لوں گا پھر سب سے ہی انتقام لوں گا۔ اس کی تصدیق قرآن کی مندرجہ بالا آیت سے بھی ہوتی ہے کہ ہم ولی بنائیں گے بعض ظالموں کا یعنی ظالم جن اور ظالم انس۔ پھر آپ نے آیت (وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ) 43۔الزخرف : 36) کی تلاوت کی اور فرمایا کہ ہم سرکش جنوں کو سرکش انسانوں پر مسلط کر دیں گے۔ ایک مرفوع حدیث میں ہے جو ظالم کی مدد کرے گا اللہ اسی کو اس پر مسلط کر دے گا۔ کسی شاعر کا قول ہے۔
وما من ید الا ید اللہ فوقھا وما ظالم الا سیبلی بظالم
یعنی ہر ہاتھ ہر طاقت پر اللہ کا ہاتھ اور اللہ کی طاقت بالا ہے اور ہر ظالم دوسرے ظالم کے پنجے میں پھنسنے والا ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ ہم نے جس طرح ان نقصان یافتہ انسانوں کے دوست ان بہکانے والے جنوں کو بنا دیا اسی طرح ظالموں کو بعض کو بعض کا ولی بنا دیتے ہیں اور بعض بعض سے ہلاک ہوتے ہیں اور ہم ان کے ظلم و سرکشی اور بغاوت کا بدلہ بعض سے بعض کو دلا دیتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

محشر میں لوگوں کی جماعتیں اعمال و اخلاق کی بنیاد پر ہوں گی، دنیوی تعلقات کی بنیاد پر نہیں

حضرت سعید بن جبیر (رح) اور قتادہ (رح) وغیرہ نے پہلا ترجمہ اختیار کرکے آیت کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے یہاں اجتماعی وحدتیں یعنی لوگوں کی جماعتیں اور پارٹیاں نسلی یا وطنی یا رنگ و زبان کی بناء پر نہیں بلکہ اعمال و اخلاق کے اعتبار سے ہوں گی، اللہ تعالیٰ کا فرمان بردار مسلمان جہاں کہیں ہوگا وہ مسلمانوں کا ساتھی ہوگا، اور نافرمان کافر جہاں کہیں ہوگا وہ کافروں کا ساتھی ہوگا، خواہ ان کی نسل اور نسب میں، وطن اور زبان میں، رنگ اور معاشرت میں کتنا ہی بعد اور اختلاف ہو۔

پھر مسلمانوں میں بھی نیک، دیندار، دینداروں کے ساتھ ہوگا، اور گناہگار، بدکردار، بدکرداروں کے ساتھ لگا دیا جائے گا۔ سورۃ کورت میں جو ارشاد ہے (آیت) واذاالنفوس زوجت، یعنی لوگوں کے جوڑ اور جماعتیں بنادی جائیں گی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اعمال و اخلاق کے اعتبار سے اہل محشر مختلف جماعتوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔

حضرت فاروق اعظم (رض) نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ "ایک قسم کے اعمال نیک یا بد کرنے والے ایک ساتھ کر دیئے جائیں گے، نیک آدمی نیکوں کے ساتھ جنت میں، اور بدکردار کو دوسرے بدکرداروں کے ساتھ جہنم میں پہنچا دیا جائے گا"۔ اور اس مضمون کی توثیق کے لیے فاروق اعظم (رض) نے قرآن کریم کی (آیت) احشرواالذین ظلمواوازواجھم سے استدلال فرمایا، جس کا مضمون یہی ہے کہ قیامت کے دن حکم ہوگا کہ ظالموں کو اور ان کے مناسب عمل کرنے والوں کو جہنم میں لے جاؤ۔

خلاصہ مضمون آیت مذکورہ کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض ظالموں کو دوسرے ظالموں کا ساتھی بنا کر ایک جماعت کر دیں گے، اگرچہ نسلی اور وطنی اعتبار سے ان میں کتنی بھی دوری ہو۔

اور ایک دوسری آیت میں یہ بات بھی واضح طور پر بیان فرمادی ہے کہ محشر میں یہ دنیوی اور رسمی تضاد جو آج لوگوں میں نسل، وطن، رنگ، زبان وغیرہ کی بنیادوں پر قائم ہیں، یہ سب یکسر ٹوٹ جائیں گے، (آیت) ویوم تقوم الشاعۃ، یعنی جب قیامت قائم ہوگی تو جو لوگ آپس میں متحد اور متفق ہیں وہ متفرق ہو جائیں گے۔

دنیا میں بھی اعمال و اخلاق کا اجتماعی معاملات میں اثر

اور یہ موجودہ رشتوں، ناطوں اور رسمی تنظیموں کا کٹ جانا روز قیامت میں تو واضح اور مکمل طور پر سب کے سامنے آ ہی جائے گا، مگر دنیا میں بھی اس کا ایک ادنی سا نمونہ ہر جگہ پایا جاتا ہے کہ نیک آدمی کو نیکوں سے مناسبت ہوتی ہے، انہی کی جماعت اور سوسائٹی سے وابستہ ہوتا ہے، اور اس طرح نیک کاموں میں اس کے لیے راستے کھلتے نظر آتے ہیں، اور ارادہ مضبوط ہوتا جاتا ہے، اسی طرح بدکردار کو اپنے ہی جیسے بدکرداروں

سے تعلق اور انس ہوتا ہے وہ انھیں میں اٹھتا بیٹھتا ہے، اور ان کی صحبت سے اس کی بد عملی و بد خلقی میں روز نیا اضافہ ہوتا رہتا ہے اور نیکی کے راستے اس کے سامنے سے بند ہوتے جاتے ہیں، یہ اس کے برے عمل کی نقد سزا اسی دنیا میں ملتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نیک و بد اعمال کی ایک جزاء سزاء تو آخرت میں ملے گی اور ایک جزاء سزا نقد اسی دنیا میں اس طرح مل جاتی ہے کہ نیک آدمی کو رفقاء کار بھی نیک اور دیانتدار نصیب ہو جاتے ہیں جو اس کے کام کو چار چاند لگا دیتے ہیں، اور برے اور بدنیت آدمی کو اعضاء و جوارح اور رفقاء کار بھی اسی جیسے ملتے ہیں جو اس کو اور بھی زیادہ گہرے غار میں دھکیل دیتے ہیں۔

رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بادشاہ اور حاکم سے راضی ہوتے ہیں تو اس کو اچھے وزیر اور اچھا عملہ دیدیتے ہیں جس سے اس کی حکومت کے سب کاروبار درست اور ترقی پذیر ہو جاتے ہیں، اور جب کسی سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں تو اس کو عملہ اور رفقاء کار برے ملتے ہیں، برے افسروں سے پالا پڑتا ہے، وہ اگر کوئی اچھا کام کرنے کا ارادہ بھی کرتا ہے تو اس پر قابو نہیں پاتا۔

ایک ظالم کو دوسرے ظالم کے ہاتھ سے سزا ملتی ہے

آیت مذکورہ کا یہ مفہوم ترجمہ کے اعتبار سے ہے، اور حضرت عبداللہ ابن عباس (رض)، عبداللہ بن زبیر (رض)، ابن زید (رض) مالک بن دینار وغیرہ سے اس آیت کی تفسیر دوسرے ترجمہ کے اعتبار سے یہ منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض ظالموں کو دوسرے ظالموں پر مسلط کر دیتا ہے، اور اس طرح ایک ظالم کو دوسرے ظالم کے ہاتھ سے سزا دلوا دیتا ہے۔

یہ مضمون بھی اپنی جگہ صحیح و درست اور قرآن و حدیث کے دوسرے ارشادات کے مطابق ہے، ایک حدیث میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کما تکونون کذلک یؤمر علیکم، یعنی جیسے تم ہوگے ویسے ہی حکام تم پر مسلط ہوں گے، تم ظالم و بدکار ہوگے تو تمہارے حاکم بھی ظالم و بدکار ہی ہوں گے اور تم نیک عمل و نیک کردار ہوگے تو اللہ تعالیٰ تمہارے حکام نیک اور رحم دل منصف مزاج لوگوں کو بنادیں گے۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کا بھلا چاہتے ہیں تو ان پر بہترین حکام و امرا کا تسلط فرماتے ہیں، اور جب کسی قوم کا برا چاہتے ہیں تو ان پر بدترین حکام و سلاطین کو مسلط کر دیتے ہیں۔ (تفسیر بحر محیط)۔

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ فقہاء نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ جب رعیت اور عوام اللہ تعالیٰ سے منحرف ہو کر ظلم و جور میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر ظالم حکام مسلط کر کے ان کے ہاتھوں ان کو سزا دلواتے ہیں۔

اور ابن کثیر رحمۃ اللہ نے بروایت عبداللہ بن مسعود (رض) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ **من اعان ظالما سلطه الله علیه**، "یعنی جو شخص کسی ظالم کے ظلم میں اس کی مدد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسی ظالم کو اس کے ستانے کے لیے اس پر مسلط کر دیتے ہیں، اور اسی کے ہاتھ سے اس کو سزا دلواتے ہیں"۔ (معارف)

آج کے دور میں ایک طویل عرصے سے ہم اس بات کا مشاہد کر رہے ہیں کہ انسانی شیطان مثلا صیلبی 'صہیونی' بت پرست اور اشتراکی 'مختلف مفادات اور مختلف بلاکوں کے ممبر ہوتے ہوئے بھی باہم دوست ہیں اور باہم معاون و مددگار ہیں۔ ان کا یہ اتحاد و اتفاق اسلام اور اسلامی تحریکات کے دستوں کے خلاف ہے اور یہ پوری دنیا پر موجود ہے۔

عملاً یہ ایک خوفناک گٹھ جوڑ ہے۔ یہ گٹھ جوڑ کرنے والے وہ لوگ ہیں جن کو صدیوں تک اسلام کے مقابلے میں محاربت کا تجربہ ہے۔ یہ لوگ مادی اور علمی معاشرتی قوتوں اور تمام دوسرے ساز و سامان کے ساتھ اسلام کے مقابلے میں معرکہ آراء ہیں اور اپنی مکارانہ شیطانی چالوں کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔ اس گٹھ جوڑ پر اللہ کا یہ فرمان آج اچھی طرح چسپاں ہوتا ہے۔ "اور ہم ظالموں کو اسی طرح ایک دوسرے کا ولی بناتے ہیں اس کمائی کی وجہ سے جو وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کرتے ہیں۔ "اس گٹھ جوڑ پر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تسلی کے لیے آنے والی یہ آیت صادق آتی ہے۔

(آیت) "ولو شاء اللہ مافعلوہ فذرھم وما یفترون"۔ "اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے پس آپ ان کو چھوڑ دیجئے جو چاہیں افراء باندھیں) لیکن اس تسلی کے تقاضے تب ہی پورے ہوں گے کہ دنیا میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نقش قدم پر چلنے والا ایک گروہ موجود ہو اور یہ معلوم ہو کہ یہ گروہ حضور کے ساتھیوں کا قائم مقام ہے۔ دین پر دشمنوں کے حملوں کی راہ میں کھڑا ہے۔ اب ذرا دوبارہ آیات قرآنیہ کی طرف آیئے۔ (فی ظلال القرآن)

آیت مبارکہ :

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِیْ وَیُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰۤى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَشَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِیْنَ ۝۱۳۰

لغۃ القرآن: یٰمَعْشَرَ : اے گروہ !] [الْجِنِّ : جنوں کے] [وَالْاِنْسِ : اور انسانوں کے] [اَلَمْ : کیا نہیں] [یَاْتِكُمْ : آئے تم پر] [رُسُلٌ : کئی رسول] [مِّنْكُمْ : تم میں سے] [یَقُصُّوْنَ : وہ سب بیان کرتے تھے] [عَلَیْكُمْ : تم پر] [اٰیٰتِیْ : میری آیتیں] [وَیُنْذِرُوْنَكُمْ : اور وہ سب ڈراتے تھے تمہیں] [لِقَآءَ : ملاقات " سے "] [یَوْمِكُمْ : تمہارے دن] [هٰذَا : یہ] [قَالُوْا : ان سب نے کہا] [شَهِدْنَا : ہم گواہی دیتے ہیں]

[عَلٰي : پر] [اَنْفُسِنَا : اپنے آپ] [وَغَرَّتْهُمُ : اور دھوکہ دیا انہیں] [الْحَيٰوةُ : زندگی] [الدُّنْيَا : دنیوی] [وَشَهِدُوْا : اور وہ سب گواہی دیں گے] [عَلٰي :" اس بات " پر] [اَنْفُسِهِمْ : ان کے دلوں کی] [اَنَّهُمْ : بیشک وہ] [كَانُوْا : تھے سب] [كٰفِرِيْنَ : سب کو کفر کی حالت میں]

ترجمہ : اے گروہ جن وانس ! کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول نہیں آئے تھے جو تم پر میری آیتیں بیان کرتے تھے اور تمہاری اس دن کی پیشی سے تمہیں ڈراتے تھے ؟ (تو) وہ کہیں گے : ہم اپنی جانوں کے خلاف گواہی دیتے ہیں، اور انھیں دنیا کی زندگی نے دھوکہ میں ڈال رکھا تھا اور وہ اپنی جانوں کے خلاف اس (بات) کی گواہی دیں گے کہ وہ (دنیا میں) کافر (یعنی حق کے انکاری) تھے

تشریح:

اس آیت مبارکہ میں جنات اور انسان دونوں سے خطاب ہوا کہ اے جنوں اور آدمیوں کے گروہ ! کیا تمہارے پاس تمہیں میں سے وہ رسول نہ آئے تھے جو تمہیں میری آیتیں پڑھ پڑھ کے سناتے تھے اور تمہیں اس دن یعنی روز قیامت کی حاضری اور عذاب الٰہی سے ڈراتے تھے ؟کافر جن اور انسان اقرار کریں گے کہ رسول ان کے پاس تشریف لائے اور انھوں نے ربانی پیام پہنچایا اور اس دن کے پیش آنے والے حالات کا خوف دلایا لیکن کافروں نے ان کی تکذیب کی اور ان پر ایمان نہ لائے۔انھیں دراصل دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا۔ کفار کا یہ اقرار اس وقت ہوگا جب کہ ان کے اعضاء وجوارح ان کے شرک و کفر کی گواہی دیں گے۔

قیامت کا دن بہت طویل ہوگا اور اس میں مختلف حالات پیش آئیں گے۔ جب کفار مومنین کے انعام واکرام اور عزت ومنزلت دیکھیں گے تو اپنے کفرو شرک سے منکر ہوجائیں گے۔ اور اس خیال سے کہ شاید مکر جانے سے کچھ کام بنے یہ کہیں گے واللہ ربنا ما کنا مشرکین یعنی خدا کی قسم ہم مشرک نہ تھے۔ اس وقت ان کے مونہوں پر مہریں لگادی جائیں گی اور ان کے اعضا ان کے کفر و شرک کی گواہی دیں گے۔ اسی کی نسبت اس آیت میں ارشاد ہوا **وشھدوا علی انفسھم انھم کانوا کافرین** (خزائن العرفان) (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

پیغمبروں کو بھیجنے کی حکمت

ان آیات میں بھی اللہ تعالیٰ پیغمبروں کے بھیجنے کی علت ووجہ بیان فرماتے ہیں اور بتلایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت نہیں کہ بدوں آگاہ و خبردار کئے کسی کو اس کے ظلم و عصیان پر دنیا یا آخرت میں پکڑ کر ہلاک کردے اسی لیے رسول و نذیر بھیجے کہ وہ خوب کھول کر تمام جن وانس کو ان کے بھلے برے اور آغاز وانجام سے خبردار کردیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو بھیج کر پہلے اس بات کو واضح کردیتے ہیں کہ تمہارے لیے چلنے کا یہ راستہ ہے۔ اس راستہ سے ذرا بھی ہٹنا ظلم ہے اور اس کا نتیجہ تباہی وبربادی ہے خواہ وہ دنیا میں ہو یا آخرت میں یا دونوں میں۔ اسی کے واضح کرنے کے لیے دنیا میں رسول آئے جو زبان سے اس رات کو اچھی طرح واضح کردیتے ہیں اور خود اس پر عمل کرکے اور اس راستہ پر چل

کر دکھا دیتے ہیں۔ جب یہ سب کچھ ہو چکتا ہے تو انسان کو موقع دیا جاتا ہے کہ اس کے مطابق چلے پھر اس کے اعمال دیکھے جاتے ہیں اور جس درجہ کا کسی کا عمل ہو گا حق تعالیٰ اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں رسول بھیج کر اپنی حجت تمام کر دی۔

اللہ تعالیٰ غنی ہے اسے کسی کی اطاعت کی ضرورت نہیں ہے

اب اگر کوئی نہ مانے اور سیدھے راستہ پر نہ چلے تو اللہ تعالیٰ غنی ہے اسے کسی کی کچھ پروا نہیں۔ یہ نہ سمجھنا کہ اگر اس کا کہنا نہ مانوگے تو اس کے کام رک جائیں گے۔ جیسے اس دنیا میں ہوتا ہے کہ اگر لوگ بادشاہ یا حاکم کی بات نہ مانیں اور اس سے بغاوت کر دیں تو وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ کو نہ کسی کی تابعداری کی ضرورت نہ پروا۔ اس نے جو احکام انسانوں کی طرف بھیجے ہیں یہ اس کی رحمت ہے اور اس کے ماننے میں سراسر انسانوں ہی کا بھلا ہے۔ اس کی سلطنت کا کارخانہ کسی کے برتے پر قائم نہیں ہے۔ وہ چاہے تو نافرمان قوم کو ایک دم میں اٹھالیوے اور اپنی رحمت سے دوسری قوم کو اس کی جگہ کھڑا کر دے جو خدا کی مطیع اور فرمان بردار ہو اور کسی قوم کو لے جا کر دوسری قوم کا لے آنا خدا کے لیے کیا مشکل ہے۔

آج تم اپنے جن آباؤاجداد کے جانشین بنے بیٹھے ہو آخر ان کو اٹھا کر تم کو دنیا میں اسی خدا نے جگہ دی ہے۔ بہر حال خدا کا کام رک نہیں سکتا تم نہیں کروگے دوسرے کھڑے کئے جائیں گے۔ ہاں یہ سوچ رکھو کہ یہی بغاوت و شرارت رہی تو خدا کا عذاب اٹل ہے۔ کوئی اگر سمجھے کہ بھاگ کر یا کسی کی پناہ لے کر سزا سے بچ جائے گا تو یہ محض حماقت ہے۔ خدا کو ساری مخلوق مل کر بھی اس کی مشیت کے نفاذ سے عاجز نہیں کر سکتی۔

قریش مکہ کو چیلنج

آگے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ارشاد ہوتا ہے کہ اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ اپنی قوم یعنی قریش مکہ سے کہہ دیں کہ مجھے جو اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا وہ میں تمہیں بتا چکا اگر تم اب بھی اپنے ہی طریقہ پر جمے رہنا چاہتے ہو تو تم جانو مگر تمہارا طریقہ غلط ہے۔ میں اس پر نہیں چل سکتا۔ میں تو وہی کروں گا جو اللہ نے مجھے بتایا ہے۔ تمہاری ہٹ دھرمی کی وجہ سے اب یہی کہنا پڑتا ہے کہ اب میرا تمہارا راستہ ایک نہیں رہا۔ تم اپنے طریقہ پر عمل کئے جاؤ اور میں اپنے طریقہ پر عمل کرتا ہوں آگے چل کر معلوم ہو جائے گا کہ انجام کس کا اچھا ہوتا ہے۔ میرا یا تمہارا اتنی بات البتہ ضرور سچ ہے کہ ظالم کبھی نہیں پھلتے پھولتے۔ آخر میں انھیں سر پکڑ کر رونا ہی پڑتا ہے۔ جن لوگوں سے یہ کہا گیا ہے وہ مکہ کے کافر ہیں اور اس وقت کوئی آثار نہ تھے کہ یہ کھاتے پیتے طاقتور لوگ کبھی نیچا دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ ذات جس کا شروع میں بچہ بچہ مخالفت تھا جس کا نام لینا دوبھر تھا جس کے حامی اور مددگاروں کو طرح طرح سے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا جس کی دشمنی ہر ایک کرتا تھا جس کو وطن سے نکلنے پر مجبور کیا گیا۔ خدا نے اسے غلبہ دیا۔ لاکھوں دلوں پر اس کی سلطنت ہو گئی اپنی زندگی ہی میں وہ تمام جزیرہ نما عرب کا مالک ہو گیا اور منکرین کا جو انجام ہوا وہ بھی سب نے دیکھ لیا کہ سرزمین عرب سے ان کا نام و نشان مٹ گیا۔ یہ تو دنیا میں ان کے کرتوتوں کا پھل تھا۔ ابھی اس دنیا کے ختم ہونے کے بعد آخرت میں ان کا جو حشر ہو گا وہ الگ رہا، اس آیت کا کہنا دنیا میں تو سچ ہی ہو چکا۔ یقیناً آخرت میں بھی سچ ہو گا۔ (درس قرآن)

رسولوں (علیہ السلام) سے متعلق اہم مسئلہ

رسول صرف انسانوں میں سے ہوتے ہیں جنات سے نہیں۔ چونکہ یہاں جن وانس دونوں سے خطاب ہے اس لیے تَغْلِيْبًا یعنی جنوں کو انسانوں کے ماتحت شمار کرتے ہوئے مِنْكُمْ فرمایا گیا۔ بہر حال اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جنات میں نبی آئے، ہاں جنات کے لیے نبی آئے مگر وہ انسان تھے۔

مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرمایا کرتے تھے جتنے رسول دنیا میں مبعوث کیے گئے وہ سب کے سب انسان ہی تھے مگر ان کا پیغام جنوں اور انسانوں کے لیے مشترکہ ہوا کرتا تھا اس لیے نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے طائف سے واپسی پر جنوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انھیں توحید ورسالت کی دعوت دی تھی۔ اس کی تفصیل جاننے کے لیے سورۃ الاحقاف اور سورۃ الجن کی تلاوت کرنی چاہیے۔ اسی بنیاد پر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے۔

(عَنْ أَبِي ذَرٍّ (رض) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) أُعْطِيتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي بُعِثْتُ إِلَى الْأَحْمَرِ وَالْأَسْوَدِ وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ طَهُورًا وَمَسْجِدًا وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ وَلَمْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ قَبْلِي وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ فَيُرْعَبُ الْعَدُوُّ وَهُوَ مِنِّي مَسِيرَةَ شَهْرٍ وَقِيلَ لِي سَلْ تُعْطَهْ وَاخْتَبَأْتُ دَعْوَتِي شَفَاعَةً لِأُمَّتِي فَهِيَ نَائِلَةٌ مِنْكُمْ إِنْ شَاءَ اللَّهُ تَعَالَى مَنْ لَمْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ شَيْئًا قَالَ الْأَعْمَشُ فَكَانَ مُجَاهِدٌ يَرَى أَنَّ الْأَحْمَرَ الْإِنْسُ وَالْأَسْوَدَ الْجِنُّ) [مسند احمد]

”حضرت ابوذر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی محترم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ مجھے پانچ ایسی چیزیں عنایت کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں ہوئیں۔

۱۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے ہر کالے اور گورے کے لیے رسول بنایا ہے۔

۲۔ میرے لیے ساری زمین پاک اور مسجد بنادی گئی ہے۔

۳۔ میرے لیے مال غنیمت حلال کیا گیا ہے جبکہ مجھ سے پہلے کسی رسول کے لیے حلال نہیں تھا۔

۴۔ میری رعب سے مدد فرمائی گئی ہے کیونکہ ایک مہینہ کی مسافت پر ہونے کے باوجود دشمن مجھ سے لرزاں رہتا ہے۔

۵۔ مجھے (قیامت کے دن) کہا جائے گا مانگ عطا کیا جائے گا اور تیری امت کے حق میں تیری شفاعت قبول کی جائے گی اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک نہ کیا ہو گا اس کو میری شفاعت پہنچے گی۔“

اعمش کہتے ہیں مجاہد کا خیال ہے کہ احمر سے مراد انسان اور اسود سے مراد جن ہیں

جہاں تک قیامت کے دن مجرموں کا اپنے خلاف شہادت دینے کا تعلق ہے مجرم پہلے اپنے شرک وکفر اور برے اعمال سے انکار کریں گے۔ جب ان کے خلاف ان کے ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء گواہی دیں گے تو پھر مجبور ہو کر اس کا اعتراف کریں گے۔ اس اعتراف کا قرآن مجید نے کئی مقامات پر ذکر کیا ہے۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔)

سوچنے کی ضرورت

قرآن مجید کی ہر آیت میں ہمارے لیے ایک پیغام ہے جب تک ہم اس پیغام کو اچھی طرح نہ سمجھ لیں۔ اس آیت کا پورا حق ادا نہیں ہوتا اور نہ ہماری دنیا بھی زندگی سنورنے کی امید ہو سکتی ہے نہ آخرت کی۔ دنیا کی زندگی کا ہر گز یہ مقصد نہیں کہ ہر شخص یہیں کے ساز و سامان اکٹھا کرنے میں لگ جائے ہر وقت اس پر یہی دھن سوار ہو کے ساری اچھی اچھی چیزیں میرے ہی قبضہ میں آ جائیں اور سب سے کہہ دو کہ خبر دار میری طرف نہ دیکھنا بر نامی نے اپنے پاس اتنی قوت اور طاقت اکٹھی کر لی ہے کہ تمہاری آنکھیں نکال لوں گا۔

قرآن مجید کہتا ہے کہ دیکھو! دنیا کے پھندوں میں پھنس کر آخرت کو نہ بھول جانا یہاں کی عزت اور مرتبہ عیش و آرام دولت و حکومت سب آنی جانی چیزیں ہیں اس کے بعد اور زندگی شروع ہو گی اور اس زندگی میں اسی کو آرام اور چین ملے گا جو یہاں کی دولت عزت اور مرتبہ نہیں چاہتا اور اپنی ہٹ دھرمی اور ضد سے فتنہ و فساد اور لڑائی جھگڑا نہیں پھیلاتا ,قرآن مجید برملا کہہ رہا ہے کہ یہاں کی زندگی کا کچھ ایسا انتظام کرو کہ مل جل کر سب کے گزارے کا بند و بست ہو جائے اور سب کو کھانا کپڑا گھر بار اور ضرورت کی تمام چیزیں آسانی کے ساتھ میسر آ جائیں کوئی ضرورت سے زیادہ سب کے کام آنے والی چیزیں اپنے پاس اکٹھی نہ کرے جو ایسا کر رہا ہے یا ایسا کرنے والوں کو ہمت دلا رہا ہے اس کو قرآن مجید کی ہوا بھی نہیں لگی ہے اگر اس بات کو ماننے والے دنیا کا مال و دولت اکٹھا کرنے اور دنیا کا جاہ و جلال حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں تو انھیں سمجھ لینا چاہیے کہ انھیں قرآن مجید کے سمجھنے کا سلیقہ نہیں ہے اور اوروں کی طرح انھیں بھی دنیا نے اپنے دھوکے میں پھنسا رکھا ہے انھیں چاہیے کہ اس آیت پر غور کریں اور سمجھیں گے انھیں خود کیا کرنا چاہیے اور لوگوں کو زندگی بسر کرنے کا کیا طریقہ سکھانا چاہیے۔

اس آیت میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن سارے بھید کھل جائیں گے اور جن اور انسان بے ساختہ اعتراف کریں گے کہ ہم دنیا میں کام کی باتوں کو چھوڑ کر بیکار باتوں میں پھنسے ہوئے تھے اس وقت ان کو ملامت کی جائے گی اور اس ملامت سے ان کے دل کو جو کوفت ہو گی وہ ان کی جان کے لیے ایک بڑا سخت عذاب ہو گا اس عذاب سے بچنے کا یہ طریقہ ہے کہ (1) اللہ اور اس کے رسول کا اقرار کرو (2) آیات قرآنیہ کو اپنا دستور العمل بناو (3) قیامت کو برحق سمجھو اور اس کی مصیبتوں سے بچنے کی اسی دنیا میں تیاری کرو (4) دنیا کے اندر ظاہری ٹیپ ٹاپ بیکار شور و غل اور تھوڑی دیر کے دھوم دھڑکے میں کچھ نہیں رکھا اس سے دھوکا مت کھاؤ (5) ہر وقت اپنا امتحان لیتے رہو کہ کہیں ہم کفر کی آفت میں تو مبتلا نہیں ہیں۔

یہ باتیں آج ہی اس دنیا کی زندگی میں کرنے کی ہیں ورنہ مرنے کے بعد قیامت میں آنکھ کھلی تو سوائے دکھ اور تکلیف کے اور کچھ نصیب نہ ہو گا۔ (درس آسٹریلیا)

دعا کیجئے: اللہ تعالیٰ ہم سب کو انجام کی خیر خوبی نصیب فرماویں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اپنے عذاب سے محفوظ فرماویں۔ اعمال صالحہ کی ہم سب کو ہدایت فرماویں۔ اور اپنی رحمت سے ہم سے وہ کام لے لیں جن سے یا اللہ آپ راضی ہوں اور ان کاموں سے ہمیں بچا لیں جن سے آپ ناراض ہوں۔ یا اللہ بیشک آپ کے انبیاء اور رسل نے دنیا والوں کو آپ کے احکام سے پوری طرح آگاہ کر دیا اور کسی کے لیے آپ کے احکام سے بیخبر رہنے کا عذر باقی نہیں رہا۔ اب جو بھی آپ کے احکام سے روگردانی کرے گا وہ اس کی سزا بھگتے گا۔ یا اللہ جب آپ نے اپنے کرم سے ہم کو اسلام جیسا دین اور قرآن جیسی کتاب اور خاتم الانبیاء جیسے نبی عطا فرمائے تو ہم کو اپنے ان انعامات کی سچی قدر دانی کی توفیق بھی عطا

فرمایئے۔ اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا پکا اور سچا مطیع اور فرمان بردار امتی ہو کر زندہ رہنے اور اس پر مرنے کی سعادت نصیب فرمایئے۔ آمین۔

واخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین

آیت مبارکہ :

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾

لغۃ القرآن: ذٰلِكَ : وہ] [اَنْ : کہ] [لَّمْ : نہیں] [يَكُنْ : ہو] [رَبُّكَ : تمہارے رب نے] [مُهْلِكَ : ہلاک کرنے والا] [الْقُرٰي : بستیوں کو] [بِظُلْمٍ : ظلم کے ساتھ] [وَّاَهْلُهَا : اس حال میں کہ اس کے پاشندے] [غٰفِلُوْنَ : سب بے خبر ہوں]

ترجمہ : یہ (رسولوں کا بھیجنا) اس لیے تھا کہ آپ کا رب بستیوں کو ظلم کے باعث ایسی حالت میں تباہ کرنے والا نہیں ہے کہ وہاں کے رہنے والے (حق کی تعلیمات سے بالکل) بے خبر ہوں (یعنی انھیں کسی نے حق سے آگاہ ہی نہ کیا ہو)

تشریح:

اللہ تعالیٰ بغیر اپنی ہدایت پہنچائے کسی بستی والوں کو ہلاک نہیں کرتا

اللہ تعالیٰ نے جتنی مخلوقات بھی پیدا فرمائی ہیں محض اپنے فضل و کرم سے اپنے اوپر یہ پابندی عائد کی ہے کہ ان تمام کو زندگی گزارنے کا طریقہ میں سکھاؤں گا۔ چنانچہ آپ تمام حیوانات حتیٰ کہ حشرات الارض تک کو دیکھ لیجئے ان میں سے ہر ذی روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی اچھی طرح جانتا ہے کہ مجھے جس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس کے مطابق مجھے زندگی کس طرح گزارنی ہے ؟ پرندے کو سکھایا گیا ہے کہ ہوا میں کس طرح اڑنا ہے ' مچھلی کو بتایا گیا ہے کہ پانی میں کس طرح تیرنا ہے ' جنگل کے جانور پوری طرح اپنی جبلت اور احساسات کے تحت اپنے زندگی کے فرائض ادا کرنے اور زندگی کے وسائل حاصل کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ گندگی میں پلنے والا کیڑا بھی خوب جانتا ہے کہ اسے کس طرح زندگی گزارنی ہے کیونکہ یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اس کا فیضان جس طرح تخلیقی عمل کی صورت میں جاری ہے اسی طرح ہدایت یعنی زندگی کی

رہنمائی کی شکل میں بھی رواں دواں ہے۔ انسان حیوانی مخلوقات کی ایک برتر شکل ہے اس کو حواس کے ساتھ ساتھ جوہر عقل سے بھی نوازا گیا اور پھر چونکہ اسے ایک مکلّف مخلوق بنایا گیا اور اس بات کا پابند ٹھہرایا گیا کہ تمہاری زندگی کے مقاصد صرف اس زندگی تک محدود نہیں بلکہ اس کا رشتہ اگلی زندگی سے جڑا ہوا ہے اس لیے تم نے یہ زندگی اس طرح گزارنی ہے جس سے آخرت کی زندگی سدھر جائے۔ آخرت کی زندگی کا سدھار اور کامیابی چونکہ صرف انسانی حواس اور عقل سے ممکن نہیں تھی اس لیے اللہ نے وحی الٰہی کے ذریعے انسانوں کی رہنمائی فرمائی اور جہاں کہیں بھی انسانوں کو پیدا فرمایا وہیں اپنے رسول بھیجے ' اپنی کتابیں اتاریں اور پوری طرح انسانوں اور جنوں پر اتمام حجت کردیا تاکہ کل کو وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم سے جن باتوں کا سوال کیا جارہا ہے ہمیں ان کے بارے میں کوئی راہنمائی نہیں دی گئی تھی کیونکہ اگر انسانوں کو یہ نہ بتایا جاتا کہ تمہاری زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ کیا ہے اور کن باتوں میں تمہارا پروردگار راضی ہے اور پھر قیامت کے دن ان سے انھی باتوں کا سوال ہوتا اور انھی پر ان کو سزا بھی ملتی تو یقینا یہ ان پر بڑا ظلم ہوتا۔ جس نوکر کو یہ نہ بتایا جائے کہ تمہاری ڈیوٹی کیا ہے لیکن اسے پکڑ کر سزا دے دی جائے تو ہر کوئی یہی کہے گا کہ اس نوکر کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے کہ جب وہ جانتا ہی نہیں کہ مجھے کرنا کیا ہے تو آخر اسے سزا کس بات پر دی جارہی ہے۔ چنانچہ یہاں اللہ تعالیٰ یہی بیان فرما رہے ہیں کہ ہم نے جو انسانوں اور جنوں میں رسول بھیجے اور راہنمائی عطا فرمائی اس کی وجہ یہی ہے کہ تیرا رب رحیم و کریم ہے وہ کسی بستی والوں کو اس طرح سزا نہیں دیتا کہ پہلے ان کو یہ نہ بتایا جائے کہ تمہارا خالق و مالک تم سے کیا چاہتا ہے اگر یہ بعثت انبیاء کا سلسلہ نہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ کسی کو بھی دنیا میں اس بات کی خبر نہ ہو سکتی تھی کہ ہم وہ زندگی کس طرح گزاریں جس سے ہمارا اللہ راضی ہو؟ چنانچہ بعثت انبیاء کا حقیقی مقصد یہی اتمام حجت رہا ہے تاکہ کل کو جن وانس میں سے کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہمیں تو کوئی سمجھانے والا نہیں آیا آخر ہمیں سزا کس بات کی دی جارہی ہے؟ حیرانی کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنی رحمت کی وجہ سے اپنی اس خود عائد کردہ ذمہ داری کو جس طرح پورا فرمایا ہے اس سے زیادہ کا تو کیا اس سے برابر کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ انسانی ہدایت اور اس کی راہنمائی کے لیے یہ بات کافی تھی کہ کسی طرح سے بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کا کوئی مجموعہ انسانوں کی ہر بستی میں بھیج دیا جاتا اور انھیں حکم دے دیا جاتا کہ اس کی پابندی کرو اور جو اس سے انکار کرتا اسے تباہ کر دیا جاتا لیکن جو طریقہ پروردگار نے اختیار فرمایا کہ اپنے رسول بھیجے کتابیں اتاریں اور پھر اپنے انبیاء اور رسولوں کو زندگی بھر اس کام پر لگائے رکھا ان کی قوموں نے ہر چند اذیتیں پہنچائیں ' رکاوٹیں کھڑی کیں لیکن ان کی سرکشی کے باوجود بھی اس کام کو روکنے کی کبھی اجازت نہ فرمائی۔ بعض انبیاء شہید ہوئے دنیا کا ہر دکھ رسولوں نے اٹھایا لیکن یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا۔ کبھی کبھی قوموں پر عذاب بھی آئے۔ لیکن عموماً صدیوں تک قوموں کی ہر طرح کی سرکشی کو برداشت کیا لیکن یہ سلسلہ ہدایت کبھی رکنے نہ پایا ' اسی سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کفر اور شرک پر ابدی عذاب کیوں رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تبلیغ و دعوت کے عمل میں انتہا سے بڑھ کر کوشش فرمائی گئی ہے اور انسانی قافلے کے گلہائے سرسبد اس کے لیے کوشاں رہے ہیں اور اس کوشش کی ہر قیمت ادا بھی کرتے رہے اور انسانوں کے کسی گروہ نے اگر پھر بھی اپنی سرکشی اور بغاوت کا رویہ نہیں چھوڑا اور وہ بھی کسی معمولی حاکم کے مقابلے میں نہیں بلکہ کائنات کے حاکم اعلیٰ کے مقابلے میں تو معمولی عقل کا آدمی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایسے شدید جرم کی سزا ایسی ہی ہونی چاہیے اور مزید یہ بات کہ اللہ حاکم الحاکمین ہے ' شہنشاہِ کائنات ہے۔ بادشاہ جو بھی کرے اسے قانون کی حیثیت حاصل ہوتی ہے لیکن وہ شہنشاہ کائنات یہ فرما رہا ہے کہ اگر کسی بستی والوں کو ہم بغیر راہنمائی کا حق ادا کیے سزا میں ہلاک کر دیتے تو یہ ان پر ظلم ہوتا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی صفت رحمت کا سب سے بڑا تقاضہ اس کی صفت عدل ہے اور یہی وہ صفت ہے جس نے کائنات کے نظام کو ثبات و قرار بخشا ہے اور اسی کے نتیجے میں بعثت انبیاء اور

ہدایت کا سلسلہ وجود میں آیا اور یہی وہ صفت ہے جنت اور جہنم کا وجود جس کا اظہار ہے اس لیے اس صفت کے بروئے کار لانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس حد تک ہم پر احسان فرمایا ہے کہ کسی بڑے سے بڑے مجرم کو اس کے جرم سے بڑھ کر سزا نہیں دی گئی اور کسی چھوٹے مجرم کو بڑے مجرم کے برابر عذاب نہیں دیا گیا اور ہر چھوٹی بڑی نیکی کا الگ الگ پیمانہ رکھا ہے تاکہ کسی کو اپنی اپنی حیثیت کے مطابق شکایت پیدا نہ ہو سکے۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

اللہ تعالیٰ انبیاء کرام (علیہ السلام) کو لوگوں کی طرف اس لیے بھیجتا رہا تاکہ لوگوں پر حجت تمام ہو جائے

اس سے پہلے فرمان میں "رُسُلٌ مِّنۡكُمۡ" کے الفاظ استعمال فرمائے۔ ذٰلک کا اشارہ انھی الفاظ کی ترجمانی کر رہا ہے کہ لوگوں میں انہی سے رسول بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام پڑھ کر سنائیں اور ان پر من و عن عمل کرکے دکھلائیں تاکہ کسی کے لیے یہ بہانہ نہ رہے کہ ہمارے پاس کوئی بتلانے اور سمجھانے والا نہیں آیا تھا۔ جس کی وجہ سے ہم غفلت میں پڑے رہے اور آج ہمیں بدترین انجام سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ اس بات کے ازالہ کے لیے فرمایا اے پیغمبر ! تیرے رب کا یہ وطیرہ نہیں کہ وہ کسی بستی اور اہل علاقہ کو ان کے اچھے برے انجام سے آگاہ کیے بغیر اسے فنا کے گھاٹ اتار دے بلکہ پہلے وہ رسول بھیج کر لوگوں کی اصلاح اور فلاح کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن لوگ انبیاء کی مخلصانہ اور بے مثال محنت کے باوجود غفلت اور مجرمانہ زندگی کو ترجیح دیتے رہے اور جرائم میں اتنے آگے بڑھے کہ اللہ کی مخلوق ان سے پناہ مانگنے لگی اور زمین کا نظام درہم برہم ہونے لگا تو اللہ تعالیٰ نے ظالموں کو نیست و نابود کر دیا۔

اس گرفت میں بھی انھیں اتنی ہی سزا دی گئی جتنے ان کے اعمال برے تھے۔ ان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کیا گیا۔ جس طرح دنیا میں ان کے کردار کے مطابق گرفت کی گئی بالکل اسی طرح قیامت کے دن نیک لوگوں کو ان کے اعمال کی جزا ملے گی اور برے لوگوں کو ان کے جرائم کے مطابق سزا ہوگی۔ لوگوں کے اعمال جاننے، پرکھنے اور ان کو جزا اور سزا دینے میں اللہ تعالیٰ کسی چیز سے غافل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کو بار بار نصیحت اور انتباہ اس لیے نہیں کرتا ہے کہ لوگوں کے نیک اعمال سے اللہ تعالیٰ کو فائدہ اور برے کردار سے اسے نقصان پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو کسی کی نیکی اور برائی کا کوئی فائدہ اور نقصان نہیں ہوتا۔ وہ ذات کبریا مفادات، خدشات اور نقصانات سے بے نیاز ہے۔

اس کی ذات بے نیاز ہونے کے باوجود سراپا رحمت ہے۔ وہ نیکوں کو ان کی نیکی سے بڑھ کر عنایات و رحمت سے نوازتا ہے۔ دنیا میں ظالموں کی گرفت میں اس کی یہ رحمت ہوتی ہے کہ اس کی مخلوق ان کے ظلم سے نجات پائے۔

اگر وہ چاہے تو ساری انسانیت کی صف لپیٹ کر ایک طرف رکھ دے اور ان کی جگہ اتنے ہی اور لوگوں کو لے آئے۔ جس طرح کہ پہلی اقوام میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ اس سچائی کو جاننے کے لیے دنیا کے ہر علاقے کی تاریخ اس حقیقت کی ترجمان ہے۔

عرب کی سرزمین کے بارے میں قرآن مجید تفصیل کے ساتھ ایک کے بعد دوسری قوم کے آنے کے واقعات بیان کرتا ہے۔ کبھی اس سرزمین پر قوم نوح کے کفر و شرک کا غلبہ تھا جنھیں اللہ تعالیٰ نے پانی کے سیلاب میں ڈبکیاں دے دے کر مارا۔ زمین کو شرک کی غلاظت سے پاک کر دیا۔

ان کے بعد قوم عاد نے سرکشی اور تمرد کا مظاہرہ کیا جس کی وجہ سے ان پر سات دن مسلسل زور دار آندھیاں چلیں جس سے ان کو زمین پر پٹخ پٹخ کر مارا اور صفحہ ہستی سے ان کا وجود ختم کر دیا۔ قوم ثمود کو زور دار آسمانی دھماکے نے آلیا۔ جس سے ان کے کلیجے پھٹ گئے اور اللہ کی مخلوق نے ان سے سکھ پایا۔ ان کے بعد قوم لوط نے بے حیائی کا وطیرہ اپنایا۔ جس کی پاداش میں انھیں زمین سے اٹھا کر آسمان کے قریب لے جا کر الٹ دیا اور ان پر پتھروں کی بارش برسائی پھر اس دھرتی پر کبھی ایرانی دندنائے اور کبھی رومیوں کا غلبہ ہوا۔ ان کے بعد یہودی اور عیسائی ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارتے رہے۔ عربوں کے بعد ترکوں کا دور آیا۔ ترکوں کے بعد تاتاری بادو باراں کی طرح زمین پر پھیل گئے گویا کہ ایک کے بعد دوسری قوم اور دوسری کے بعد تیسری قوم نے اس کی جگہ لی یہاں نہ دارا و سکندر کا اقتدار باقی رہا اور نہ ہی نمرود، فرعون اور ہامان کا تسلط قائم رہ سکا۔ پھر خاندانی نظام کو دیکھیں کس طرح نسل در نسل سلسلہ چل رہا ہے۔ آج ہمیں اپنے ہی آباؤاجداد کی تیسری نسل سے اوپر کا کچھ علم نہیں۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی اس سنت کا نتیجہ تھا اور ہے جس کے بارے میں یہاں ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اور جسے چاہے لوگوں کو ایک دوسرے کی جگہ پر لا کھڑا کرے۔ اے اہل مکہ اور دنیا جہان کے انسانوں! اللہ تعالیٰ کی اس سنت اور قوت اختیار پر سوچو اور غور کرو کہ تم نے پہلوں کی طرح ہمیشہ نہیں بیٹھا رہنا۔ جب اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کی نشانی ظاہر کرے گا تو تم اس کی قدرت و سطوت کے سامنے دم نہیں مار سکو گے۔ یاد رکھو قیامت ضرور برپا ہونے والی ہے اور تم اس کے برپا ہونے پر اللہ تعالیٰ کو بے بس اور عاجز نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ہوش کے ناخن لو اور اپنے رب کے تابعدار بن جاؤ۔

(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) أَوَّلُ زُمْرَةٍ تَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ أُمَّتِي عَلٰى صُورَةِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ عَلٰى أَشَدِّ نَجْمٍ فِي السَّمَاءِ إِضَاءَةً ثُمَّ هُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ مَنَازِلُ لَا يَتَغَوَّطُونَ وَلَا يَبُولُونَ وَلَا يَمْتَخِطُونَ وَلَا يَبْزُقُونَ أَمْشَاطُهُمُ الذَّهَبُ وَمَجَامِرُهُمُ الْأَلُوَّةُ وَرَشْحُهُمُ الْمِسْكُ أَخْلَاقُهُمْ عَلٰى خُلُقِ رَجُلٍ وَاحِدٍ عَلٰى طُولِ أَبِيهِمْ آدَمَ سِتُّونَ ذِرَاعًا) [رواہ مسلم: کتاب الجنۃ ونعیمہا، باب أَوَّلُ زُمْرَةٍ تَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَلٰى صُورَةِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ وَصِفَاتُهُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ]

”حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میری امت کا جنت میں داخل ہونے والا گروہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتے چہروں کے ساتھ ہوگا پھر ان کے بعد آسمان پر روشن ستاروں کی طرح پھر درجہ بدرجہ ہوں گے جنتی نہ پیشاب کریں گے نہ قضائے حاجت کی ضرورت ہوگی وہ تھوکیں گے بھی نہیں ان کی کنگھیاں سونے کی ہوں گی۔ ان کی انگیٹھیاں عود کی اور ان کے پسینے مشک عنبر کی طرح ہوں گے۔ ان سب کا ایک ہی طرح کا اخلاق ہوگا اور قد و قامت آدم (علیہ السلام) کے برابر یعنی ساٹھ ہاتھ ہوگی۔“

(عَنْ قَتَادَةَ (رض) حَدَّثَنَا أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ أَنَّ رَجُلًا قَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْشَرُ الْكَافِرُ عَلٰى وَجْهِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ قَالَ أَلَيْسَ الَّذِي أَمْشَاهُ عَلٰى رِجْلَيْهِ فِي الدُّنْيَا قَادِرًا عَلٰى أَنْ يُمْشِيَهُ عَلٰى وَجْهِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ قَالَ قَتَادَةُ بَلٰى وَعِزَّةِ رَبِّنَا)

[رواہ مسلم، کتاب القیامۃ والجنۃ والنار، باب یحشر الکافر علی وجہہ]

”حضرت قتادہ (رض) سے روایت ہے کہ حضرت انس بن مالک (رض) نے بیان کیا ایک شخص نے استفسار کیا اے اللہ کے رسول! کافروں کو قیامت کے دن چہرے کے بل کس طرح اکٹھا کیا جائے گا۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کیا وہ ذات جو سب کو دنیا میں پاؤں کے بل چلانے پر قادر ہے وہ قیامت کے دن منہ کے بل چلانے پر قادر نہیں؟ حضرت قتادہ کہتے ہیں ہمیں اپنے رب کی عزت کی قسم کیوں نہیں“

(عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ (رض) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يُؤْتَى بِأَنْعَمِ أَهْلِ الدُّنْيَا مِنْ أَهْلِ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُصْبَغُ فِي النَّارِ صَبْغَةً ثُمَّ يُقَالُ يَا ابْنَ آدَمَ هَلْ رَأَيْتَ خَيْرًا قَطُّ هَلْ مَرَّ بِكَ نَعِيمٌ قَطُّ فَيَقُولُ لَا وَاللَّهِ يَا رَبِّ وَيُؤْتَى بِأَشَدِّ النَّاسِ بُؤْسًا فِي الدُّنْيَا مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيُصْبَغُ صَبْغَةً فِي الْجَنَّةِ فَيُقَالُ لَهُ يَا ابْنَ آدَمَ هَلْ رَأَيْتَ بُؤْسًا قَطُّ هَلْ مَرَّ بِكَ شِدَّةٌ قَطُّ فَيَقُولُ لَا وَاللَّهِ يَا رَبِّ مَا مَرَّ بِي بُؤْسٌ قَطُّ وَلَا رَأَيْتُ شِدَّةً قَطُّ)

[رواہ مسلم: کتاب صفۃ القیامۃ والجنتہ والنار، باب الکافر الغداء لملء الأرض ذھبا]

"حضرت انس بن مالک (رض) کہتے ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن دنیا میں سب سے زیادہ نعمتوں میں پلنے والے شخص کو لایا جائے گا تو اسے جہنم میں صرف ایک غوطہ دیا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا اے ابن آدم! تم نے کبھی کوئی بھلائی دیکھی تو وہ کہے گا اللہ کی قسم! کبھی نہیں، پھر دنیا میں مصائب میں زندگی گزارنے والے کو لایا جائے گا اسے جنت کا ایک جھونکا دیا جائے گا تو اس سے پوچھا جائے گا اے انسان کیا تم نے کبھی کوئی تنگدستی دیکھی؟ تو وہ کہے گا اللہ کی قسم میں نے کبھی کوئی مشکل نہیں دیکھی۔

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

جن علاقوں میں اسلام کا پیغام نہیں پہنچا 'وہاں کے باشندوں کا حکم

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو رسولوں کو بھیجا ہے 'اور انھوں نے لوگوں کو کفر اور شرک پر عذاب الٰہی سے ڈرایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے کتابیں اور صحائف نازل کیے ہیں 'اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ یہ ہے کہ جب تک کسی قوم کے پاس اللہ کی طرف سے ایمان لانے کی دعوت نہ پہنچے اللہ تعالیٰ اس قوم کو ملیامیٹ کرنے کے لیے عذاب نہیں بھیجتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(آیت) "وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر" (فاطر: ۲۴)

ترجمہ: اور ہر قوم میں ایک ڈرانے والا گزر چکا ہے۔:

(آیت) "ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت"۔ (النحل: ۳۶)

ترجمہ: اور بیشک ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجا 'کہ اللہ کی عبادت کرو اور شیطان سے بچو۔

(آیت) "وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا"۔ (بنو اسرائیل: ۱۵)

ترجمہ: ہم اس وقت تک عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ ہم رسول نہ بھیج دیں۔

ان آیتوں سے یہ استدلال بھی کیا جاتا ہے کہ جن علاقوں میں بالفرض اسلام کا پیغام نہیں پہنچا ان کے لیے صرف اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے واحد ہونے کو مان لینا کافی ہے ان کی نجات ہو جائے گی۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

ایمان والدین مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

یہاں سے حضور سید کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے والدین کا اہل جنت میں سے ہونا معلوم ہوا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ذلک ان لم یکن ربک مھلک القریٰ الخ۔ اللہ کسی قوم میں نبی بھیجے بغیر انھیں عذاب نہیں فرماتا۔ اسی لیے زمانہ فترت میں جب لوگوں میں کسی رسول کی تعلیمات زندہ نہ ہوں تو اس وقت لوگوں پر صرف توحید خداوندی کا ماننا لازم ہوتا ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے والدین بھی زمانہ فترت میں تھے۔ ان پر صرف توحید کا اقرار لازم تھا سو وہ کرتے تھے کیونکہ ان کا شرک کہیں ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا لم یکن ربك مھلك القری بظلم و اھلھا غفلون۔ کے مطابق ان کا اہل عذاب ہونا ممکن نہیں۔ (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

آیت مبارکہ:

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ○ ۱۳۲

لغۃ القرآن: وَ : اور] [لِكُلٍّ : ہر ایک کے لیے] [دَرَجٰتٌ : درجات ہیں] [مِمَّا : " اس "سے جو] [عَمِلُوْا : ان سب نے عمل کیے] [وَمَا : اور نہ] [رَبُّكَ : تمہارے رب نے] [بِغَافِلٍ عَمَّا : غافل اس سے جو] [يَعْمَلُوْنَ : وہ سب کرتے ہیں]

ترجمہ: اور ہر ایک کے لیے ان کے اعمال کے لحاظ سے درجات (مقرر) ہیں، اور آپ کا رب ان کاموں سے بے خبر نہیں جو وہ انجام دیتے ہیں

تشریح:

ہر ایک کے لیے چاہے وہ نیک ہو یا گناہ گار اس کے اچھے اور برے اعمال کے اعتبار سے درجے ہیں اور انہی کے مطابق ثواب اور عذاب ہوگا۔
جنتیوں کو جنت میں ان کے نیک اعمال کے مطابق درجے دیئے جائیں گے، ایسے ہی جہنمیوں کو جہنم میں ان کے برے اعمال کے مطابق مختلف درجوں میں سزا دی جائے گی یا یہ مطلب ہے کہ نیک اعمال کے درجے مختلف ہیں۔ ایک ہی عمل ایک شخص کے لیے زیادہ ثواب کا باعث ہے اور دوسرے کے لیے کم ثواب کا۔ حدیث شریف میں ہے کہ "قیامت میں اعمال کا بدلہ عقل کے بقدر ملے گا۔
لہٰذا اس آیت سے ہزارہا مسائل مُسْتَنْبَط ہو سکتے ہیں۔ عمل کا صلہ جگہ، وقت، موقعہ اور ضرورت کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے، جیسے جہاں مسجدیں بہت زیادہ ہوں اور کنوئیں کم ہوں وہاں مسجد کی بجائے کنواں بنوانا زیادہ اچھا ہے۔ اس آیت سے علماء نے یہ بھی استدلال کیا ہے کہ

جنات بھی جنت میں جائیں گے کیونکہ یہاں سب کیلئے "دَرَجٰتٌ "فرمایا گیا ہے اور "کُل "میں جنات بھی داخل ہیں
(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

اللہ تعالیٰ کفار کو ان کے جرم کی نوعیت کے مطابق درجہ بدرجہ سزا دے گا

عدل وانصاف میں انسان انتہائی کوشش بھی کرے تو زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ جس آدمی نے جو جرم کیا ہے اور اس سے جو نقصان پہنچا ہے اسے سامنے رکھ کر سزا تجویز کرے کہ ایک سزا چوری کی ہو اور ایک ڈاکے کی 'ایک قتل کی ہو اور ایک مارپیٹ کی 'ایک عزت لوٹنے کی ہو اور ایک مال لوٹنے کی 'ایک کسی ایک انسان کی جان لینے کی ہو اور ایک کسی بستی اجاڑ دینے کی۔ یہ الگ الگ سزائیں مقرر کرنا یقینا عدل و انصاف کا تقاضہ ہے اور انسان اس پر قدرت بھی رکھتا ہے۔ لیکن اگر انسانوں کا ایک گروہ مل کر کہیں ڈاکہ ڈالتا ہے اس میں عزتیں بھی لٹتی ہیں اور کچھ لوگ مارے بھی جاتے ہیں اگر ڈاکوؤں کا یہ گینگ پکڑا جاتا ہے تو سب کو ایک ہی سزا ملتی ہے یہ متعین کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ صرف مال کس نے لوٹا ہے 'عزت کس نے پامال کی اور قتل کس نے کیا اور پھر اس بات کا تعین کہ ان جرائم میں تمام شریک لوگ جرم کے احساس اور شدت میں سب برابر تھے یا ان میں فرق تھا اس کا جاننا تو انسانوں کے لیے ہرگز ممکن نہیں۔ اسی طرح جو آدمی اللہ کے ساتھ شریک کرتا ہے 'اس کے دین کی توہین کرتا ہے 'اس کے پیغمبر کی بے ادبی کرتا ہے 'مسلمانوں کی تحقیر کرتا ہے 'اس کے احساسات کو جاننا اور اس طرح کے تمام جرائم کرنے والوں کو الگ الگ حیثیتوں میں تقسیم کرنا یہ کسی بھی انسان کے بس کی بات نہیں کیونکہ اس کے لیے صرف ظاہری نگاہ کافی نہیں بلکہ ایسی نگاہ کی ضرورت ہے جو دلوں کے احساسات کا جائزہ لے سکے 'جو جرم کے پس منظر میں جھانک سکے 'جو ہر گناہ کی شدت کو ترازو میں تول سکے۔ لیکن پروردگار کے عدل وانصاف پر قربان جایئے اس آیت کریمہ میں بتایا جارہا ہے کہ قیامت کے دن جب ہم ان کافروں اور مشرکوں کو سزا دیں گے تو سب کی سزا یکساں نہیں ہوگی۔ جس طرح کافر اور منافق کی سزا میں فرق ہوگا اسی طرح ایک عام کافر اور ایک معاند کافر میں بھی فرق ہوگا۔ ایسے لوگ بھی ہوں گے جنھوں نے صرف اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرایا ہوگا یا اس کا انکار کیا ہوگا لیکن وہ لوگ بھی ہوں گے جنھوں نے اللہ کے دین کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی ہوں گی اللہ کے پیغمبر اور مسلمانوں کو ستایا ہوگا پھر اس بہیمیت اور درندگی میں بھی احساس اور شدت کے مدارج ہوں گے ان تمام کا لحاظ رکھتے ہوئے سب کو یکساں عذاب نہیں دیا جائے گا بلکہ ہر طرح کے کافروں کی الگ الگ کیٹیگریز ہوں گی اور ان کے مطابق انہیں جہنم کی مختلف وادیوں میں بھیجا جائے گا اور اس لیے شاید جہنم کو ایک وادی نہیں رکھا گیا بلکہ اس کو مختلف وادیوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر وادی عذاب دہی کی شدت میں دوسری وادی سے مختلف ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جہنم کی بعض وادیاں ایسی ہیں کہ باقی جہنم اس سے پناہ مانگتا ہے۔ ہم مشرکین مکہ کا جب تفصیلی مطالعہ کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابو جہل تو ایک ہی تھا دوسرا کوئی لعین اس کا ہم پلہ نہ تھا اگرچہ مکہ اس وقت مخالفین سے بھرا ہوا تھا لیکن مخالفت میں سب یکساں نہ تھا۔ بعض ایسے لوگ بھی جو بعد میں مسلمان ہوئے 'کفر کی حالت میں بھی مسلمانوں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ شعب ابی طالب میں بعض کفار درپردہ کچھ نہ کچھ اشیائے خوردو نوش بھیجتے رہتے تھے۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمام مجرموں کا جرم ایک سطح کا نہیں ہوتا لیکن انسانی قانون ہمیشہ ان سے ایک طرح کا سلوک کرتا ہے لیکن اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے ہر ایک کے لیے درجات رکھے ہیں یعنی ہر جرم کا ارتکاب کرنے والوں میں درجے ہیں اور اس کا دارومدار

ان کے اعمال کی نوعیت اور حیثیت پر ہے۔ لیکن ان باتوں کا تعین چونکہ انسانی عقل اور انسانی علم سے ماورا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ تمہارا رب چونکہ ہر ایک کے عمل سے اور اس کے تہہ منظر سے بھی واقف ہے اس لیے اس کے لیے کوئی دشواری نہیں کہ وہ ان کے اعمال سے اعتبار سے ان میں درجہ بندی کرے اور پھر اس کے مطابق انھیں سزا دے۔ خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اللہ کے دیئے ہوئے علم کے مطابق فتح مکہ کے موقعہ پر بعض لوگوں کو قتل کرنے کا حکم دیا حالانکہ ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو اپنے جرائم کے اعتبار سے قتل کا مستحق نہ ہو لیکن ان میں سے چند ایک کا انتخاب یقیناً اس وجہ سے تھا کہ ان کے کفر اور دشمنی کی شدت دوسروں سے کہیں بڑھ کر تھی اور انصاف کا یہی تقاضہ تھا کہ ان کے ساتھ یہی سلوک ہوتا۔ اسی سے اشارۃً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح عذاب میں درجہ بندی ہوگی اس طرح عطاو بخشش میں بھی درجہ بندی ہوگی۔ اللہ کی بندگی اور اس کی اطاعت انسانی بخشش و نجات کا ذریعہ ہے اور یہی دولت انسان کو جنت میں لے جائے گی۔ لیکن جنت بھی ایک درجے کا نام نہیں وہاں اللہ کی بندگی اور اطاعت کرنے والے 'اطاعت و بندگی میں اپنے مدارج کے اعتبار سے جنت میں مختلف درجات میں رکھے جائیں گے۔ شہداء جنت کے اس درجے میں ہوں گے جو ان کے لیے مخصوص ہوگا لیکن درجات کا تفاوت ان میں بھی ہوگا کیونکہ شہادت میں جان تو سارے دیتے ہیں لیکن احساسات میں یقیناً فرق ہوتا ہے اور اس کا جاننے والا صرف پروردگار ہے۔ وہی جانتا ہے اور وہی اپنے علم کے مطابق درجہ بندی کرے گا۔ یہی حال باقی نیکیوں کا بھی ہے اس میں اللہ تعالیٰ کا علم اپنے انصاف کے مطابق عطاو بخشش کے فیصلے کرے گا اور لوگ اس سے بہرہ ور ہوں گے۔

انسانی سرشت عجیب واقع ہوئی ہے یہ بعض دفعہ خیر سے شر کا مفہوم نکالتی اور بعض دفعہ شر سے خیر کا پہلو اخذ کرتی ہے۔ دناءت پسند طبیعتیں بالعموم احسانات سے متاثر ہونے کی بجائے اور زیادہ اکڑتی اور بگاڑ کا شکار ہوتی ہیں۔ بجائے اپنے محسن کے سامنے جھکنے اور اس کے احسانات کا شکریہ ادا کرنے کے اسی کے خلاف معاندانہ رویہ اپنا لیتی ہیں کفر اور شرک تمام برائیوں کی جڑ ہے جس طبیعت میں یہ دونوں چیزیں جگہ بنا لیتی ہیں وہاں کسی بھی اچھائی اور خوبی کا باقی رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مشرکینِ مکہ اور دیگر کفار کا یہی حال تھا کہ وہ بجائے اس کے کہ اللہ کے آخری نبی ﷺ کی کاوشوں اور تبلیغ دین کی محنتوں کو اللہ کا احسان جان کر اس کا شکریہ ادا کرتے اور آگے بڑھ کر اسلام کی آغوش میں آ جاتے۔ انھوں نے اسے بھی اپنی خست طبع کے باعث غلط معنوں میں لیا اور بجائے اس سے فائدہ اٹھانے کے اسے تمسخر کا نشانہ بنایا اور اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ گویا اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت قبول کرنے کے محتاج ہیں کہ اگر یہ لوگ ہدایت قبول نہیں کریں گے تو خدا کی خدائی میں شاید کوئی کمی آ جائے گی اور پیغمبر کی پیغمبری شاید ان کے بغیر چل نہ سکے گی۔ چنانچہ ان کی اس غلط سوچ اور خست طبع کو نمایاں کرنے اور حقیقت حال کو واضح کرنے کے لیے اگلی آیت کریمہ میں نہایت قیمتی باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں جس سے صرف انہی کو راہنمائی دینا مقصود نہیں بلکہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے ایک مشعل جلانا ہے جس سے وہ ہمیشہ ہدایت و ضلالت کے امور میں آسانی سے فیصلہ کرنے کے قابل ہو سکیں۔

(روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

آیا مومن جن جنت میں داخل ہوں گے یا نہیں؟

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جن اور انس میں سے ہر شخص کو اس کے عمل کے مطابق جزا ملے گی اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مومن جن بھی جنت میں داخل ہوں گے۔ حسب ذیل آیتوں میں بھی اللہ تعالیٰ نے اسی طرح فرمایا ہے:

(آیت) "اولئك الذين حق عليهم القول في امم قد خلت من قبلهم من الجن والانس انهم كانوا خسرين، ولكل درجت مما عملوا وليوفيهم اعمالهم وهم لا يظلمون"۔ (الاحقاف: ۱۹۔۱۸)

ترجمہ: یہ گزری ہوئی قوموں میں سے جن اور انس کے وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی بات پوری ہو کر رہی' یہ یقینا نقصان اٹھانے والوں میں سے تھے اور ہر ایک کے لیے ان کے کاموں کے مطابق درجات ہیں' تاکہ اللہ انھیں ان کے کاموں کو پورا پورا اجر دے اور ان پر بالکل ظلم نہیں کیا جائے گا۔

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے انسانوں کی طرح جنات میں سے بھی جو اطاعت گزار اور نیکوکار ہوگا' وہ جنت میں جائے گا اور جو نافرمان اور بدکار کافر ہوگا' وہ دوزخ میں جائے گا۔ اس مسئلہ میں زیادہ صحیح قول یہی ہے' اس کے برخلاف بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ جنات جنت میں نہیں جائیں گے۔ (جامع البیان' جز ۷ ص ۸۰' مطبوعہ دارالفکر' بیروت ۱۴۱۵ھ)

جنات کے دخول جنت کے متعلق علماء کی آراء

علامہ احمد شہاب الدین بن الحجر الھیتمی المکی المتوفی ۹۷۴ھ لکھتے ہیں:

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ جنات میں سے کافروں کو آخرت میں عذاب دیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ' ابوالزناد' لیث بن ابی سلیم سے یہ روایت ہے کہ جنات میں سے مومنین کو آخرت میں کوئی ثواب نہیں ہوگا' سوا اس کے کہ ان کو دوزخ سے نجات ہو جائے گی۔ پھر حیوانوں کی طرح ان سے بھی کہا جائے گا کہ تم مٹی ہو جاؤ اور صحیح قول وہ ہے جس کو ابن ابی لیلیٰ' اوزاعی' امام مالک' امام شافعی' امام احمد اور ان کے اصحاب نے کہا ہے کہ ان کو ان کی عبادات پر ثواب دیا جائے گا اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے یہ منقول ہے کہ جنات میں سے مومنین جنت میں داخل ہوں گے۔ یہ قول ابن حزم نے جمہور سے نقل کیا ہے اور اس پر سورۃ الانعام کی اس آیت سے استدلال کیا ہے (آیت) "ولكل درجات مما عملوا"۔ (۱۳۲) کیونکہ اس آیت کو جن اور انس کے ذکر کے بعد کیا گیا ہے اور امام ابوالشیخ نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ کل ملائکہ جنت میں ہوں گے اور کل شیاطین دوزخ میں ہوں گے اور جنت اور دوزخ میں دونوں میں انسان اور جن ہوں گے۔ (فتاوی حدیثیہ ص ۶۱' مطبوعہ مطبعہ مصطفیٰ البابی حلبی واولادہ بمصر' ۱۳۵۶ھ)

مسلمانوں جنوں کے جنت میں داخل نہ ہونے کے دلائل

امام عبدالرحمٰن بن محمد بن ادریس رازی ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ روایت کرتے ہیں :

مجاہد بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا مومن جن جنت میں داخل نہیں ہوں گے ' کیونکہ وہ ابلیس کی اولاد ہیں اور ابلیس کی اولاد جنت میں داخل نہیں ہوگی۔ (تفسیر امام ابن حاتم ' ج ۱۰ ' ص ۳۲۹۷)

امام ابوالشیخ عبداللہ بن محمد اصفہانی متوفی ۳۹۶ھ روایت کرتے ہیں :

سلمہ نے کہا کہ جن جنت میں داخل ہوں گے نہ نار میں ' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے باپ کو جنت سے نکال دیا۔ اب وہ ان کے باپ کو جنت میں لوٹائے گا نہ ان کو (کتاب العظمتہ ' رقم الحدیث : ۱۱۶۴ ' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ ' بیروت ' ۱۴۱۴ھ)

مسلمانوں جنوں کے جنت میں داخل ہونے کے دلائل

امام عبدالرحمٰن بن محمد بن ادریس رازی ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ روایت کرتے ہیں :

یعقوب بیان کرتے ہیں کہ ابن ابی لیلیٰ نے کہا کہ جنوں کو ثواب ملے گا اور اس کی تصدیق قرآن مجید کی اس آیت میں ہے :

(آیت) "ولکل درجات مما عملوا"۔ (۱۳۲)

ترجمہ : اور (جن وانس میں سے) ہر ایک کے لیے ان کے عمل کے مطابق درجات ہیں۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ' ج ۴ ' ص ۱۳۸۹ھ)

امام ابوالشیخ عبداللہ بن محمد اصفہانی متوفی ۳۹۶ھ روایت کرتے ہیں :

ضحاک بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا مخلوق کی چار قسمیں ہیں۔ ایک مکمل جنت میں جائے گی ' وہ فرشتے ہیں اور دوسری قسم کل دوزخ میں جائے گی وہ شیاطین ہیں ' اور مخلوق کی دو قسمیں جنت اور دوزخ میں جائیں گی۔ وہ جن اور انسان ہیں ' ان کو ثواب بھی ہوگا اور عذاب بھی ہوگا۔ (کتاب العظمتہ ' رقم الحدیث : ۱۱۶۰ ' مطبوعہ بیروت)

ضحاک نے کہا جن جنت میں داخل ہوں گے اور کھائیں اور پئیں گے۔ (کتاب العظمتہ ' رقم الحدیث : ۱۱۶۰ ' مطبوعہ بیروت)

ارطاۃ بن المنذر نے ضمرۃ بن حبیب سے پوچھا کیا جن جنت میں داخل ہوں گے ؟ انھوں نے کہا ہاں ! اور اس کی تصدیق اللہ عزوجل کی کتاب میں ہے :

(آیت) "لم یطمثھن انس قبلھم ولا جآن"۔ (الرحمٰن : ۵۶)

ترجمہ ؛ ان حوروں کو اس سے پہلے نہ انسان نے چھوا ہے نہ جنوں نے۔

انہوں نے کہا جنوں کے لیے جنت میں جنیات ہیں اور انسانوں کے لیے انسیات ہیں۔ (کتاب العظمتہ ' رقم الحدیث : ۱۱۶۲ ' مطبوعہ بیروت)

حرملہ بیان کرتے ہیں کہ ابن وہب سے سوال کیا گیا کہ آیا جنوں کے لیے ثواب اور عذاب ہوگا ؟ ابن وہب نے کہا اللہ تعالیٰ نے فرماتا ہے :

(آیت) "وحق علیھم القول فی امم قد خلت من قبلھم من الجن والانس انھم کانوا خسرین، ولکل درجت مما عملوا ولیوفیھم اعمالھم وھم لا یظلمون"۔ (الحقاف : ۱۹۔ ۱۸)

ترجمہ : یہ گزری ہوئی قوموں میں سے جن اور انس کے وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی بات پوری ہو کر رہی، یہ یقینا نقصان اٹھانے والوں میں سے ہیں، اور ہر ایک کے لیے ان کے کاموں کے مطابق درجات ہیں 'تاکہ اللہ انھیں ان کے کاموں کا پورا پورا اجر دے اور ان پر بالکل ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (کتاب العظمتہ 'رقم الحدیث : ۱۱۶۳ 'مطبوعہ بیروت)

قرآن مجید کے ان واضح دلائل کے اعتبار سے انہی علماء کا نظریہ درست ہے 'جو کہتے ہیں کہ مسلمان جن جنت میں جائیں گے اور کافر جن دوزخ میں۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ۝١٣٣

لغۃ القرآن : وَرَبُّكَ : اور آپ کا رب "ہی "] [الْغَنِيُّ : بے پروا] [ذُو : والا] [الرَّحْمَةِ : رحمت] [اِنْ : اگر] [يَّشَاْ : وہ چاہے] [يُذْهِبْكُمْ :" تو " لے جائے " فنا کردے " تمہیں] [وَيَسْتَخْلِفْ : اور وہ جانشین بنادے] [مِنْۢ : سے] [بَعْدِكُمْ : تمہارے بعد] [مَا : جو] [يَشَاۗءُ : وہ چاہتا ہے] [كَمَآ : جیسا کہ] [اَنْشَاَكُمْ : اس نے پیدا کی تمہیں] [مِّنْ : سے] [ذُرِّيَّةِ : اولاد] [قَوْمٍ : کسی قوم کی] [اٰخَرِيْنَ : دوسری]

ترجمہ : اور آپ کا رب بے نیاز ہے، (بڑی) رحمت والا ہے، اگر چاہے تو تمہیں نابود کردے اور تمہارے بعد جسے چاہے (تمہارا) جانشین بنادے جیسا کہ اس نے دوسرے لوگوں کی اولاد سے تم کو پیدا فرمایا ہے

تشریح :

اللہ غنی اور رحیم ہے

آیت کی تشریح سے پہلے آیت کے پہلے جملے کو دیکھیے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے "تیرا رب غنی رحمت والا ہے "اس میں رب کی دو صفات بیان ہوئی ہیں "غنی "اور "رحمت والا "قاعدے کے اعتبار سے غنی کے بعد 'واو 'یعنی حرف عطف آنا چاہیے تھا لیکن یہاں حرف عطف ساقط کر دیا گیا اس میں ایک اہم بات کی طرف اشارہ ہے وہ یہ کہ ایک موصوف میں کئی صفات ہو سکتی ہیں اور اللہ تعالیٰ تو بیشمار صفات سے متصف ہیں مثلاً ایک آدمی خطیب بھی ہو سکتا ہے ادیب بھی 'شاعر بھی ہو سکتا ہے نثر نگار بھی 'فلسفی بھی ہو سکتا ہے سائنسدان بھی 'لیکن ہر صفت اپنے اپنے وقت میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ لیکن جب کسی موصوف کے حوالے سے صرف اس کی صفات کا تذکرہ مقصود ہو یعنی یہ بتلانا مقصود ہو کہ اس میں یہ یہ صفات پائی جاتی ہیں تو ہر صفت کے بعد دوسری صفت کے ساتھ حرف عطف لایا جائے گا۔ لیکن جب کہیں ایک سے زیادہ صفات بغیر حرف عطف کے لائی جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ صفات بیک وقت موصوف میں پائی جاتی ہیں ان کا ظہور موصوف سے ایک ہی وقت میں ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی بتلانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہی وقت میں بے نیاز بھی ہیں اور رحمت والے بھی ہیں۔ ان سے بے نیازی کا ظہور بھی ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ رحمت بھی اپنا عمل جاری رکھتی ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غنی اور بے نیاز ہے یعنی اس کی کوئی غرض کسی سے اٹکی ہوئی نہیں ہے اس کا کوئی مفاد کسی سے وابستہ نہیں وہ اپنی کسی بات میں کسی کا محتاج نہیں اس کی شان اور عظمت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے کہ کسی مثبت یا منفی بات سے اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ ساری دنیا اس کی حمد و ثناء کے ترانے گانے لگے اور دن رات اس کی عبادت اور بندگی میں جتی رہے تو اس کی شان میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا اور اگر دنیا کا ایک ایک فرد اس کی بندگی سے انکار کر دے تو اس کی شان اور عظمت میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔
(روح القرآن۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

اللہ تعالیٰ کے مستغنی ہونے کا معنی

اس آیت کا معنی یہ ہے اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کے رب نے اپنے بندوں کو بعض کام کرنے کا حکم دیا ہے اور بعض کاموں سے منع کیا ہے 'اس کا یہ حکم دینا اپنے کسی فائدہ 'کسی غرض یا کسی عوض کے لیے نہیں ہے 'بلکہ ان کو اپنی عبادت کرنے اور احکام بجالانے کا حکم اس لیے دیا ہے کہ ان کی زندگی اور ان کی موت 'ان کا رزق اور ان کی روزی اور ان کا نفع اور ان کا نقصان اس کے ہاتھ میں ہے 'وہ اس کے مکمل طور پر محتاج ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ عبادت کرکے اپنی احتیاج اس کے سامنے ظاہر کریں 'تاکہ وہ ان پر اپنا لطف و کرم اور اپنا فضل واحسان کرے۔ نیز گناہوں کی آلودگی اور معصیت کے زنگ سے ان کی روحیں مکدر اور ظلمانی ہوں گے۔ اس لیے ارواح بشریہ اور نفوس انسانیہ کو مفلحین اور ابرار کے درجہ میں پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ ان کو اطاعات و عبادات کی ترغیب دی جائے اور ممنوعات اور گناہوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔ سو اس لیے فرمایا کہ آپ کا رب مستغنی ہے 'یعنی اس کو بندوں کی اطاعت اور عبادت کی احتیاج نہیں ہے۔ وہ رحمت والا ہے 'اس لیے یہ احکام اس کی رحمت کا تقاضا ہیں 'تاکہ اس کے بندے دائمی فوز و فلاح حاصل کر سکیں۔

استغناء اور رحمت کا اللہ تعالیٰ میں منحصر ہونا

اللہ تعالیٰ کے مستغنی ہونے پر یہ دلیل ہے کہ وہ مستغنی نہ ہو تو وہ اپنے کمال کے حصول میں غیر محتاج ہوگا اور جو محتاج ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا ' اور یہ کلام مفید حصر ہے 'یعنی اس کے سوا اور کوئی مستغنی نہیں ہے 'کیونکہ واجب لذاتہ واحد ہی ہوتا ہے اور اس کے ماسوا سب ممکن ہیں اور سب اس کے محتاج ہیں۔ اسی طرح رحم فرمانے والا بھی وہی ہے 'اس کے سوا اور کوئی رحم کرنے والا نہیں ہے۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں 'بھوکے کو کھانا کھلاتے ہیں 'پیاسے کو پانی پلاتے ہیں تو ہم کہیں گے کہ اگر اللہ تعالیٰ کھانے پینے کی چیزیں پیدا نہ کرتا تو وہ کیسے کھلاتے اور پلاتے اور اگر یہ چیزیں پیدا کر دی تھیں پھر بھی اگر رحم کرنے والے میں اتنی قدرت نہ ہوتی کہ وہ ان چیزوں کو حاصل کر سکتا تو وہ کیسے ان کو کھلاتا اور پلاتا ؟ اور اگر قدرت بھی ہوتی لیکن اس کے دل میں اللہ تعالیٰ رحم کا جذبہ پیدا نہ کرتا تو وہ کیسے کھلاتا اور پلاتا ؟ اور اگر یہ سب کچھ ہوتا لیکن جس کو کھلانا پلانا ہے 'اس میں کھانے پینے کی قدرت نہ ہوتی 'مثلا اس کے منہ میں ناسور ہوتا یا اس کا اوپر کا جبڑا نچلے جبڑے پر بیٹھ جاتا اور اس کا منہ بند ہو جاتا تو وہ کیسے کھاتا پیتا ؟ اور یہ کیسے اس کو کھلاتا اور پلاتا ؟ پس غور کیجئے کھانے پینے کی چیزیں اللہ نے پیدا کیں 'ان کے حصول کی قدرت بھی اس نے دی تو وہی رحم کرنے والا ہے۔ بندے نے کیا کیا ہے، پھر بندہ کا رحم کرنا کسی غرض اور کسی غرض اور کسی عوض کے لیے ہوتا ہے 'کبھی سابق احسان کو اتارنے کے لیے رحم کرتا ہے 'کبھی دنیا میں تعریف 'کبھی آخرت میں اجر کے لیے رحم کرتا ہے 'کبھی اس لیے رحم کرتا ہے کہ وقت پڑنے پر اس پر بھی رحم کیا جائے اور کبھی اس لیے کہ کسی ضرورت مند کو دیکھ کر اس کے دل میں جو رقت پیدا ہوتی ہے 'اس کو زائل کرنے کے لیے رحم کرتا ہے۔ سو بندہ جو رحم کرتا ہے 'اس میں کسی غرض یا کسی عوض کی احتیاج ہوتی ہے اور ان اسباب کی احتیاج ہوتی ہے جن کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔ اور جو ہر سبب 'ہر عوض اور ہر غرض سے مستغنی ہو کر رحم کرتا ہے 'وہ صرف عزوجل ہے۔ اسی لیے فرمایا آپ کا رب ہی مستغنی ہے اور ہی رحمت والا ہے۔

اس آیت میں چونکہ رحمت کا ذکر فرمایا ہے 'اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص یہ گمان کرتا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اسی جہان کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر اس جہان کے لوگوں نے اس کی اطاعت نہیں کی تو وہ اس جہان کے لوگوں کو فنا کر کے ایک اور قوم کو پیدا کر دے گا 'جیسا کہ وہ ان لوگوں کو ایک اور نسل سے پیدا کر چکا ہے اور اس سے واضح ہو گیا کہ اس کے رحیم ہونے کا یہ معنی نہیں ہے کہ اس کی رحمت کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص ہے 'بلکہ وہ ہر قوم سے مستغنی ہے۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

اِنَّ مَا تُوۡعَدُوۡنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِيۡنَ ○۱۳۴

لغۃ القرآن: اِنَّ : بیشک] [مَا : نہیں] [تُوْعَدُوْنَ : تم سب سے وعدہ کیا جارہا ہے] [لَاٰتٍ : ضرور آنے والی ہے] [وَمَآ : اور جو] [اَنْتُمْ : تم] [بِمُعْجِزِيْنَ : سب عاجز کردینے والے]

ترجمہ : بیشک جس (عذاب) کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے وہ ضرور آنے والا ہے اور تم (االلہ کو) عاجز نہیں کر سکتے

تشریح:

ارشاد فرمایا کہ وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے چاہے وہ قیامت ہو یا مرنے کے بعد اٹھنا یا حساب یا ثواب و عذاب۔ یہ سب چیزیں ضرور آئیں گی مگر اپنے وقت پر، تم دیر سے دھوکا مت کھاؤ بلکہ اس سے بچنے کے اسباب جمع کرو کیونکہ نہ ہم مجبور ہیں نہ جھوٹی خبر دینے والے اور نہ تم طاقتور کہ ہم سے مقابلہ کرکے بچ سکو لہٰذا مقابلہ نہ کرو بلکہ خوف کرو۔ (تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اہل مکہ کے سامنے اپنی دعوت پیش کرتے ہوئے جہاں دعوت کی افادیت ' اہمیت اور اس کی ضرورت پر گفتگو فرماتے وہاں دو باتوں کا تذکرہ بھی ہوتا۔ ایک تو یہ بات کہ تمہارے گردوپیش میں ان قوموں کے کھنڈرات موجود ہیں اور تم اپنے تجارتی اسفار میں ان کھنڈرات سے گزرتے بھی ہو جنھوں نے اللہ کے رسولوں کی دعوت کو قبول نہ کیا اور بالآخر عذاب کا شکار ہوگئیں۔ تم نے بھی اگر آج اس دعوت کو قبول نہ کیا اور اپنے رویے کو نہ بدلا تو ایسا ہی عذاب تم پر بھی آسکتا ہے اور دوسری یہ بات کہ تمہیں یہاں ہمیشہ تو زندہ نہیں رہنا ہر مرنے والے کی طرح تمہیں بھی مرنا ہے اور تم یہ غلط سمجھتے ہو کہ موت کے ساتھ تم ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاؤ گے تمہیں یقین رکھنا چاہیے کہ ایک دن جسے قیامت کہتے ہیں سب انسانوں کو زندہ کرکے اٹھایا جائے گا باقی انسانوں کے ساتھ تم بھی محشر میں جمع کیے جاؤ گے۔ اللہ کے سامنے حاضری ہوگی وہاں تمہیں اس بات کا جواب دینا پڑے گا کہ تم نے اسلام کو قبول کرنے سے کیوں انکار کیا؟ کہا یہ دونوں باتیں ہو کے رہیں گی۔

اگر تم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو اللہ کا عذاب بھی آسکتا ہے اور قیامت تو بہر صورت اپنے وقت پر آئے گی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی یاد رکھو کہ اگر اس کا عذاب آگیا تو تمہیں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ تم اس عذاب کی گرفت سے بچ نکلو گے یا قیامت کے دن تمہارے شریک تمہیں اللہ کے عذاب سے بچالیں گے۔ اس کی پکڑ سے کوئی نہیں بچاسکتا۔ معجزین کا ایک معنی تو یہ ہے کہ تم اس کو پکڑنے سے اور عذاب دینے سے عاجز کرنے والے نہیں ہو اور دوسرا معنی اس کا یہ ہوتا ہے کہ تم ایسے نہیں ہو کہ اللہ تمہیں پکڑے اور تم اس کے قبضے سے نکل جاؤ اور وہ تم پر قابو نہ پا

سکے۔ تم جواب تک اس کی گرفت سے بچے ہوئے ہو تو یہ محض اس کی رحمت کا ظہور ہے کہ اس نے تمہیں ڈھیل دے رکھی ہے لیکن جب وہ گرفت کرنا چاہے گا تو پھر اس کی گرفت سے تم نہیں بچ سکتے۔ مصر کے فراعنہ `عراق کے نمارده اور اسی طرح اور بڑے بڑے طاقت و جبروت کے پیکروں کی تاریخ تمہارے سامنے ہے وہ جب اللہ کی گرفت میں آئے تو پھر ان کی طاقت و حشمت انھیں نہ بچا سکی وہ تاریخ میں آج عبرت کے طور پر یاد کیے جا رہے ہیں۔ تم ان کے مقابلے میں کسی بھی حیثیت کے مالک نہیں ہو اس لیے جب پروردگار تمہیں پکڑنا چاہے گا تو تم اس کی پکڑ سے کس طرح بچ سکو گے۔

ان آیات پر غور کیجئے تبلیغ و دعوت کے حوالے سے اور افہام و تفہیم کی رو سے کوئی پہلو ایسا باقی نہیں رہ گیا جس کے حوالے سے مشرکین مکہ کو سمجھانے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ ترغیب اور ترہیب کا کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں رہ گیا جسے چھیڑا نہ گیا ہو استدلال کا کوئی پہلو ایسا نہیں بچا جس سے دماغوں کو ہموار کرنے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

موت سے غافل رہنے والوں کو نصیحت

اس آیت کریمہ میں موت سے غافل رہنے والوں کے لیے بھی بہت عبرت ہے کیونکہ ہر انسان سے موت کا وعدہ بھی کیا گیا ہے اور یہ بہر صورت آکر ہی رہے گی۔ تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، صحابہ کرام (رض) اور دیگر بزرگان دین (رح) موت کو بکثرت یاد کیا کرتے اور لوگوں کو اس کی یاد دلایا کرتے تھے، چنانچہ

حضرت ابو سعید خدری (رض) سے روایت ہے، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جب میں اپنی آنکھیں جھپکتا ہوں تو مجھے یہ گمان ہوتا ہے کہ میری پلکیں ملنے سے پہلے میری روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی قبض کرلی جائے گی۔ میں جب نظر اٹھاتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ نظر نیچی کرنے سے پہلے میرا وصال ہو جائے گا، میں جب کوئی لقمہ منہ میں ڈالتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ لقمہ گلے سے اترتے وقت میرے لیے موت کا سبب بن جائے گا۔ اے آدم کی اولاد! اگر تم عقل رکھتے ہو تو اپنے آپ کو مردوں میں شمار کرو۔ اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے "اِنَّ مَا تُوۡعَدُوۡنَ لَاٰتٍ‌ۙ وَّمَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِيۡنَ " بیشک جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ ضرور آنے والی ہے اور تم (اللہ عَزَّوَجَلَّ) کو عاجز نہیں کرسکتے۔

حضرت ابوبکر صدیق (رض) اپنے خطبہ میں ارشاد فرماتے تھے "کہاں گئے وہ لوگ جن کے چہرے خوبصورت تھے اور چمکتے تھے اور وہ اپنی جوانیوں پر فخر کرتے تھے؟ کہاں ہیں وہ بادشاہ جنہوں نے شہر تعمیر کئے اور ان کے گرد دیواریں بنا کر ان کو محفوظ کیا؟ کہاں ہیں وہ جو لڑائی کے میدان میں غالب آتے تھے؟ زمانے نے انھیں کمزور اور ذلیل کردیا اور وہ قبروں کی تاریکیوں میں چلے گئے، جلدی جلدی کرو اور نجات تلاش کرو، نجات تلاش کرو۔

حضرت سمیط (رح) فرماتے ہیں "اے اپنی طویل صحت پر دھوکے میں مبتلا شخص! کیا تو نے کسی کو بیماری کے بغیر مرتے ہوئے نہیں دیکھا؟ اے وہ شخص! جو طویل مہلت کی وجہ سے دھوکے میں ہے! کیا تو نے کسی کو سامان کے بغیر گرفتار نہیں دیکھا؟ اگر تو اپنی عمر کی طوالت کے بارے میں سوچے تو سابقہ لذتیں بھول جائے، تم لوگ صحت کے دھوکے میں ہو یا عافیت کے دھوکے میں، زیادہ دن گزارنے پر اکڑتے ہو یا

موت سے بے خوف ہو یا موت کے فرشتے پر تمہیں جرأت ہے، بیشک جب موت کا فرشتہ آئے گا تو تمہاری مالی ثروت اور تمہاری جماعت تمہیں نہیں بچاسکے گی، کیا تم نہیں جانتے کہ موت کی گھڑی سختیوں اور ندامت کی گھڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم فرمائے جو موت کے بعد کے لیے عمل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم فرمائے جو موت کے آنے سے پہلے اپنے نفس کو ترس کی نگاہ سے دیکھے۔

اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو یہ توفیق عطا فرمائے کہ وہ اپنی موت کو یاد رکھے اور موت کے بعد کے لیے تیاری کرتا رہے۔ آمین

(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

آیت مبارکہ :

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ○ ۱۳۵

لغۃ القرآن: قُلْ : کہہ دیں] [يٰقَوْمِ : اے میری قوم] [اعْمَلُوْا : تم سب عمل کرو] [عَلٰي : پر] [مَكَانَتِكُمْ : اپنی جگہ] [اِنِّیْ : بیشک میں] [عَامِلٌ : عمل کرنے والا ہوں] [فَسَوْفَ : تو عنقریب] [تَعْلَمُوْنَ : تم سب جانتے ہو] [مَنْ : جس پر] [تَكُوْنُ : وہ ہوجائے] [لَهٗ : اس کی] [عَاقِبَةُ : انجام] [الدَّارِ : گھر کا] [اِنَّهٗ : بیشک یہ حقیقت ہے] [لَا : نہیں] [يُفْلِحُ : فلاح پاتے] [الظّٰلِمُوْنَ : سب ظالم ہیں]

ترجمہ : فرمادیجئے: اے (میری) قوم! تم اپنی جگہ پر عمل کرتے رہو بیشک میں (اپنی جگہ) عمل کئے جارہا ہوں۔ پھر تم عنقریب جان لو گے کہ آخرت کا انجام کس کے لیے (بہتر ہے)۔ بیشک ظالم لوگ نجات نہیں پائیں گے

تشریح:

آپ فرمایئے اے کفار! اگر تم دین اسلام قبول نہیں کرتے اور اپنے شرک و کفر سے چمٹے رہنے پر بضد ہو تو تمہاری مرضی۔ تم اپنا کام کرتے رہو میں اپنا فرض ادا کرتا رہوں گا اور موت کے تلخ گھونٹ سے جب تمہارا یہ خمار اترے گا تو تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ کس کی دینوی زندگی کا اچھا نتیجہ برآمد ہوا اور کس کا برا۔ "عاقبۃ الدار" کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ زمخشری لکھتے ہیں کہ تقدیر کلام یوں ہے العاقبۃ الحسنی التی خلق اللہ

تعالیٰ ھذہ الدار لھا ۔ (کشاف) اور لفظ دار سے مراد دار دنیا ہے نہ دار آخرت۔ **والمراد بالدار الدنیا لا دار السلام۔**
(روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی ، تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)
یہاں ظالم سے مراد کافر و مشرک ہے۔ آگے اس رسم جاہلیت کا تذکرہ ہے جس کی مذمت کرکے تنبیہ فرمائی گئی یہاں ظالم سے مراد کافر و مشرک ہے۔ آگے اس رسم جاہلیت کا تذکرہ ہے جس کی مذمت کرکے تنبیہ فرمائی گئی اس لیے کہ کفار و مشرکین عرب میں یہ دستور تھا کہ وہ اپنی کھیتوں باغوں کے پھلوں اور چوپایوں کے بچوں اور تمام مالوں میں سے ایک حصہ اللہ عزوجل کا مقرر کرتے اور ایک حصہ بتوں کا تو جو حصہ اللہ عزوجل کے لیے مقرر کرتے وہ تو مہمانوں اور مسکینوں اور غریبوں پر خرچ کردیتے اور جو حصہ بتوں کے لیے مقرر کرتے وہ خاص ان پر اور ان کے خدا پر صرف کرتے۔ اور جو اللہ عزوجل کیلئے مقرر کرتے اس میں سے اگر کچھ بتوں والے حصہ میں مل جاتا تو اسے اسی طرح چھوڑ دیتے اور کہتے کہ خدا محتاج نہیں اس کو اس کی حاجت نہیں۔ اور جو حصہ عزوجل کے لیے مقرر کرتے اس میں سے اگر کچھ بتوں والے حصہ میں مل جاتا تو اسے اسی طرح چھوڑ دیتے اور کہتے تھے کہ خدا محتاج نہیں اس کو اس کی حاجت نہیں۔ لیکن اگر بتوں کے حصے سے کچھ اس حصہ میں مل جاتا جو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے تھا تو اسے نکال کر بتوں ہی کے حصہ میں شامل کرتے اس آیت کریمہ میں ان کی جہالت اور بے عقلی کا ذکر فرما کر انھیں تنبیہ کی گئی (تفسیر الحسنات۔ علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، تفسیر اشرفی۔ علامہ محمد مدنی اشرفی جیلانی)

عموماً بعض دفعہ ظالم کامیاب ہو جاتے ہیں

تو یاد رہے کہ دنیا میں تو بعض دفعہ ظالم کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن آخرت کے بارے میں دوٹوک انداز میں واضح کیا گیا ہے کہ ظالم کامیاب نہیں ہوں گے۔ بلکہ انھیں ان کے گناہوں اور جرائم کی ٹھیک ٹھیک سزا ملے گی۔ قرآن مجید میں یہ اصول کئی بار بیان ہوا ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ قیامت کے دن کوئی کسی کا بوجھ اٹھائے گا اور نہ کسی کے عمل کے بدلے پکڑا جائے گا۔ ہر کسی نے اپنے اعمال اور عقیدہ کے مطابق جزا یا سزا پائے گا۔
(أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۔ وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۔ وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ ۔ ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَىٰ ۔ وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنتَهَىٰ)[النجم: ۳۸تا۴۲]
"کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور انسان کے لیے وہی کچھ ہے جو اس نے کوشش کی۔ اور اس کی کوشش جلد دیکھی جائے گی۔ پھر اس کا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اور بیشک سب کو آپ کے رب کے پاس ہی پہنچنا ہے۔" (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران۔ میاں محمد جمیل)
بہر حال یہ حقیقت ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پاسکتے۔ اب یہ جو بات فرمائی اے میری قوم **اعملوا علی مکانتکم** ۔ کہ جو تم کام کر رہے ہو۔ جو عمل تم کر رہے ہو۔ کرتے رہو۔ اپنے معاشرے میں انبیاء اجنبی ہوا کرتے تھے۔ میجورٹی اکثریت ایک طرف ہوتی تھی۔ ان کا عمل الگ ہوتا تھا۔ نبی کا اور رسول کا اور ان کے مبارک ساتھیوں کا عمل فرق ہوتا تھا۔ ان کو بہت زیادہ۔۔۔ کا معاشرتی دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اکثریت اپنا زور ان پر ڈال رہی ہوتی تھی۔ تعداد کا ان پر زور ہوتا تھا۔ کہ تم ہم جیسا عمل کرو۔ اور معیار ان کا یہ ہوتا تھا کہ چونکہ میجورٹی یہ کر رہی ہے۔

چونکہ اکثریت یہ کر رہی ہے تو تم نے اکثریت کو چھوڑ کر الگ راستہ کیوں شروع کر دیا۔ سارا معاشرہ سارا خاندان شرک کر رہا ہے تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم نے یہ توحید کی بات کہاں سے شروع کر دی۔ کوئی نماز نہیں پڑھتا۔ یہ تم نے کیا نماز پڑھنی شروع کر دی۔ تو معاشرہ پریشر ڈالتا تھا رسولوں پر کہ ہم جیسا عمل کرو۔ اور پریشر کس چیز کا ہوتا تھا۔ تعداد کا جب بھی دین مغلوب ہوتا ہے۔ کمزور ہو جاتا ہے تو پھر یہی ہوتا ہے کہ دین پر چلنے والے تعداد میں تھوڑے رہ جاتے ہیں۔ ایک خاندان میں کوئی ایک یا بہت سے بہت تین چار لوگ ہیں۔ اکثریت بہرحال دین کو follow نہیں کر رہی ہوتی۔ اب خاندان میں کوئی ایک ہے اس کو دین کی بات سمجھ آ گئی۔ اس نے صحیح عمل شروع کر دیا۔ اکثیرت کیا کہتی ہے کہ ہم جیسا عمل کرو۔ وہی قصہ دہرایا جاتا ہے جو رسولوں کے ساتھ ہوا۔ اس میں ہمیں دیکھنا ہے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ ہمارا معاملہ انی عامل والا رہتا ہے یا نہیں رہتا۔ یہ ہمیں فیصلہ کرنا ہے۔

یا تھوڑے دن تو ہم stand لے کر کھڑے رہتے ہیں۔ جب نیا نیا جوش آتا ہے دین کا تو ہم کہتے ہیں کہ ہم تو یہی کریں گے جو اللہ نے پسند کیا جس کا جو دل چاہتا ہے کرے۔ ہم شرک نہیں کریں گے ہم غیر اسلام رسومات میں حصہ نہیں لیں گے۔ تھوڑے دن تو ہم جمے رہتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ سٹینڈ ختم ہونے لگتا ہے۔ تھکنے لگتے ہیں۔ پھر بیٹھنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ چلو رہنے دو۔ اتنا بھی کیا۔۔۔ ہونا۔ اور آہستہ آہستہ اکثریت اپنا دباؤ ڈال کر ہمیں اپنا ہی جیسا کر لیتی ہے۔ یہ فرق ہوتا ہے رسولوں میں اور لوگوں میں اور یہی فرق ہوتا ہے نجات یافتہ لوگوں میں اور ہلاک ہونے والے لوگوں میں۔ نجات کس کو ملے گی۔ انی عامل والوں کو۔no matter what۔ جس کا جو چاہے کہتا رہے۔ کوئی کتنا بھی دباؤ ڈالے۔ لوگوں کے پریشر میں آ کر عمل نہیں بدلنا۔ ہوتا کیا ہے قرآن کے پڑھنے والے پہلے تو جوش وخروش سے دوسروں کو تبلیغ کرتے ہیں۔ اس امید پر کہ یہ میرے راستے پر آ جائیں تو میری زندگی آسان ہو جائے۔ دین پر چلنا آسان ہو جائے۔ کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لوگ نہیں مانتے۔ لوگ بھی جمے رہتے ہیں۔ وہ بھی تو صبر کر رہے ہیں۔ (تفسیر تنویر۔ زاہدہ تنویر)

آیت مبارکہ:

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝١٣٦

لغۃ القرآن: وَجَعَلُوْا : اور ان سب نے مقرر کیا ہے] [لِلّٰهِ : اللہ کے لیے] [مِمَّا : "اس سے جو"] [ذَرَاَ : اس نے پیدا کیا ہے] [مِنَ : سے] [الْحَرْثِ : کھیتی] [وَالْاَنْعَامِ : اور

چوپاؤں] [نَصِيْبًا : کچھ حصہ] [فَقَالُوْا : تو سب کہیں گے] [هٰذَا : یہ] [لِلّٰهِ : اللہ کے لیے] [بِزَعْمِهِمْ : ان کے خیال سے] [وَهٰذَا : اور یہ] [لِشُرَكَآئِنَا : ہمارے شریکوں کے لیے ہے] [فَمَا : تو نہ] [كَانَ : ہے] [لِشُرَكَآئِهِمْ : ان کے شریکوں کا] [فَلَا : پس نہیں] [يَصِلُ : وہ پہنچتا] [اِلَى اللّٰهِ : اللہ ہی کی طرف] [وَمَا : اور نہ] [كَانَ : ہے] [لِلّٰهِ : اللہ کے لیے] [فَهُوَ : تو وہ] [يَصِلُ : وہ پہنچتا] [اِلٰي : تک] [شُرَكَآئِهِمْ : ان کے شریکوں] [سَآءَ : برا ہے] [مَا : نہیں] [يَحْكُمُوْنَ : وہ سب فیصلہ کرتے ہیں]

ترجمہ : انھوں نے اللہ کے لیے انہی (چیزوں) میں سے ایک حصہ مقرر کرلیا ہے جنہیں اس نے کھیتی اور مویشیوں میں سے پیدا فرمایا ہے پھر اپنے گمان (باطل) سے کہتے ہیں کہ یہ (حصہ) اللہ کے لیے ہے اور یہ ہمارے (خودساختہ) شریکوں کے لیے ہے، پھر جو (حصہ) ان کے شریکوں کے لیے ہے سو وہ تو اللہ تک نہیں پہنچتا اور جو (حصہ) اللہ کے لیے ہے تو وہ ان کے شریکوں تک پہنچ جاتا ہے، (وہ) کیا ہی برا فیصلہ کر رہے ہیں

تشریح:

مشرکین عرب کے خود ساختہ عقائد میں سے ایک یہ بھی تھا کہ زمینی پیداوار اور مویشیوں کے بچوں میں سے جتنا وہ خیرات کرنا چاہتے اس میں سے ایک حصہ اللہ تعالیٰ کے لیے اور دوسرا حصہ اپنے معبودوں کے لیے مقرر کردیتے۔ اللہ تعالیٰ کے حصہ کو مہمانوں اور غریبوں پر خرچ کرتے اور بتوں کے حصہ کو بت خانوں کی تعمیر اور بتوں کی آرائش اور خدمت وغیرہ پر خرچ کرتے، پھر اگر اللہ تعالیٰ کے حصہ میں موٹا اور بہتر جانور آجاتا تو اسے بتوں کے حصہ میں منتقل کردیتے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حصہ سے کچھ فصل اتفاقاً بتوں کی طرف چلی جاتی تو اسے واپس نہ کرتے جبکہ بتوں کا کچھ حصہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف چلا جاتا تو واپس کردیتے اور بہانہ یہ کرتے کہ اللہ تعالیٰ غنی ہے اس کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن مجید نے مشرکین کے اس عقیدے کی تکذیب کی ہے۔ پہلے تو بتوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنانا ہی غلط ہے اور پھر یہ کتنی بڑی ناانصافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ناقص اور معمولی چیزوں کو وقت کیا جائے اور بتوں کے لیے عمدہ اور زیادہ مقدار کا انتظام کیا جائے جبکہ ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔

یہ آیت ان مسلمانوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے جو اپنی ذات اور اپنے احباب کے لیے عمدہ چیزوں کا انتخاب کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی راہ میں دینے کے لیے ناقص اور معمولی چیزوں کو تلاش کرتے ہیں، مثلاً ذہین اور خوبصورت بیٹے کو ڈاکٹر بننے کے لیے اور نابینے یا کند ذہن بیٹے کو قرآن مجید کی تعلیم کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ اس ضمن میں حضرت پیر اعظم شاہ آف بھیرہ شریف کا ایک واقعہ غور طلب ہے :

ایک دفعہ آپ اپنے حلقہ احباب میں بیٹھے تھے۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک سائل آیا اور اس نے کپڑوں کا سوال کیا۔ پیر اعظم شاہ نے اپنے ایک خادم کو گھر بھیجا کہ اس سائل کو میرے گھر سے کپڑے لا کردو۔ کافی دیر تک جب خادم واپس نہ آیا تو خود گھر گئے اور بیوی سے پوچھا : سائل بے چارہ انتظار کر رہا ہے تونے کپڑے کیوں نہیں بھجوائے۔ وہ کہنے لگی : گھر میں کوئی ایسا معمولی کپڑا نہیں ہے جو سائل کو دیا جائے۔ آپ

نے فرمایا: سارے کپڑے لے آؤ میں تجھے سائل کو دینے والے کپڑے تلاش کر کے دیتا ہوں، چنانچہ سارے کپڑے گھر کے صحن میں رکھے اور سب سے قیمتی اور اچھا کپڑا سائل کے لیے علیحدہ کر کے باقی کو آگ لگا دی اور فرمایا: بیگم! جو کپڑا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جانے کے قابل نہیں وہ اعظم شاہ کے گھر میں نہیں رہ سکتا۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

اللہ تعالیٰ اور بتوں کے لیے پھلوں اور مویشیوں کی تقسیم کے محامل

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کفار کی اس لیے مذمت کی تھی کہ وہ قیامت کا اور مرنے کے بعد زندہ کیے جانے کا انکار کرتے ہیں اور ان کے دیگر جاہلانہ اقوال کی مذمت کی تھی اور ان کی عقل اور سوچ کا ضعف اور فساد بیان فرمایا تھا۔ ان کی ان ہی جہالات میں سے ایک یہ جہالت تھی کہ وہ اپنی زرعی پیداوار اور مویشیوں میں سے کچھ حصہ اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص کر دیتے اور کچھ حصہ اپنے بتوں کے لیے اور اپنے زعم فاسد کے مطابق کہتے 'کہ یہ حصہ اللہ کا ہے اور یہ بتوں کا ہے! اور یہ ان کا محض جھوٹ تھا اور یہ جھوٹ اس لیے تھا کہ انھوں نے اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے دو حصے کیے۔ ایک اللہ کا اور ایک بتوں کا 'حالانکہ سب کچھ اللہ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے اور سب اسی کی ملکیت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا سو جو حصہ ان کے شرکاء کے لیے ہے وہ اللہ کی طرف نہیں پہنچتا اور جو حصہ اللہ کے لیے ہے وہ ان کے شرکاء کی طرف پہنچ جاتا ہے۔ اس کی تفسیر میں حسب ذیل اقوال ہیں:

(۱) حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا جن پھلوں کو انھوں نے اللہ کا حصہ قرار دیا تھا 'اگر ان میں سے کچھ پھل شیطان کے حصہ میں گر جاتے تو ان کو چھوڑ دیتے اور اگر شیطان کے حصہ کے پھلوں میں سے کچھ پھل اللہ کے حصہ میں گر جاتے تو ان کو چن کر ان کی حفاظت کرتے اور ان کو شیطان کے حصہ کے پھلوں میں سے کچھ پھل اللہ کے حصہ میں گر جاتے تو ان کو چن کر ان کی حفاظت کرتے اور ان کو شیطان کے حصہ میں ڈال دیتے۔ اسی طرح اللہ کے حصہ کی کھیتی میں پانی دیتے ہوئے اگر کچھ پانی کھیت سے نکل جاتا تو اس کو نکلنے دیتے اور شیطان کے حصہ کی کھیتی میں سے پانی نکلنے لگتا تو اس کو روک لیتے۔

(۲) حسن نے کہا اگر بتوں کے لیے رکھے ہوئے حصہ میں سے کوئی چیز خراب ہو جاتی تو اس کے بدلہ میں اللہ کے حصہ میں اتنی چیز اٹھا کر بتوں کے حصہ میں رکھ دیتے اور اگر اللہ رکھے ہوئے حصہ میں سے کوئی چیز خراب ہو جاتی تو اس کے بدلہ میں بتوں کے حصہ میں سے کوئی چیز نہ اٹھاتے۔

(۳) قتادہ نے کہا اگر قحط آ جاتا تو اللہ کے حصہ میں رکھی ہوئی چیزوں کو کھانے پینے کے کام میں لاتے 'لیکن بتوں کے حصہ میں رکھی ہوئی چیزوں کو اسی طرح محفوظ رکھتے۔ (جامع البیان 'جز ۸ ص ۵۶۔ ۵۳ 'مطبوعہ دار الفکر 'بیروت ۱۴۱۵ھ)

اس تقسیم کی مذمت:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یہ لوگ کیسا برا فیصلہ کرتے ہیں؟ اس فیصلہ کے برے ہونے کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

(۱) پھلوں اور غلہ کی حفاظت میں انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حصہ پر بتوں اور شیطان کے حصہ کو ترجیح دی۔

(۲) انھوں نے از خود کچھ حصہ بتوں کے لیے مخصوص کیا 'اور کچھ اللہ کے لیے 'حالانکہ سب اللہ تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا تھا 'یہ ان کی جہالت ہے۔

(۳) حصوں کی یہ تقسیم انھوں نے بغیر کسی عقلی اور شرعی دلیل کے کی اور یہ ان کی جہالت ہے۔

(۴) پھلوں اور مویشیوں کی پیدائش میں بتوں کا کوئی دخل نہیں ہے نہ وہ ان پھلوں اور مویشیوں سے کوئی نفع حاصل کر سکتے ہیں تو پھر بتوں کے لیے پھلوں اور مویشیوں میں سے حصہ رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا محض ان کی جہالت ہے۔

ان وجوہ سے ظاہر ہو گیا کہ مشرکین کا یہ بہت برا فیصلہ تھا۔ (تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

(عَنْ ثَابِتِ بْنِ الضَّحَّاكِ قَالَ نَذَرَ رَجُلٌ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) أَنْ يَنْحَرَ إِبِلًا بِبُوَانَةَ فَأَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ إِنِّي نَذَرْتُ أَنْ أَنْحَرَ إِبِلًا بِبُوَانَةَ فَقَالَ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) هَلْ كَانَ فِيهَا وَثَنٌ مِنْ أَوْثَانِ الْجَاهِلِيَّةِ يُعْبَدُ قَالُوا لَا قَالَ هَلْ كَانَ فِيهَا عِيدٌ مِنْ أَعْيَادِهِمْ قَالُوا لَا قَالَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) أَوْفِ بِنَذْرِكَ فَإِنَّهُ لَا وَفَاءَ لِنَذْرٍ فِي مَعْصِيَةِ اللهِ وَلَا فِيمَا لَا يَمْلِكُ ابْنُ آدَمَ)

[رواہ ابوداؤد: باب مایومر بہ من الوفاء بالنذر]

”حضرت ضحاک بن ثابت (رض) بیان کرتے ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے میں ایک شخص نے نذر مانی کہ وہ ’بوانہ‘ مقام پر اونٹ ذبح کرے گا۔ سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دریافت فرمایا کیا وہاں جاہلیت کے بتوں میں سے کوئی بت تھا جس کی پوجا ہوتی تھی؟ اس نے نفی میں جواب دیا۔ سرور کائنات نے استفسار فرمایا بھلا وہاں جاہلیت کے میلوں میں سے کوئی میلہ لگتا تھا؟ عرض کی کہ نہیں۔ حبیب کبریا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا پھر تجھے نذر پوری کرنا چاہیے۔ اس نذر کو پورا نہ کیا جائے جس میں اللہ کی نافرمانی ہو اور نہ اسے جس کو انسان پورا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔“ (تفسیر فہم القرآن۔میاں محمد جمیل القران)

زندہ لڑکیوں کے گاڑنے کا ذکر

ان آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ قیس بن عاصم تمیمی صحابی (رض) کے اسلام لانے سے پہلے ان کے دشمن نے ان پر حملہ کیا اور ان کی بیٹی کو چھین کر لے گیا۔ اس دن سے انھوں نے قسم کھالی کہ آئندہ جو لڑکی ان کے گھر میں پیدا ہو گی وہ اس کو زندہ گاڑ دیا کریں گے۔ یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے رسم عرب میں نکالی، پھر رفتہ رفتہ اکثر عرب میں پھیل گئی۔ یہ رسم ایک نادانی کی بات تھی اس لیے مذمت کے طور پر اس کا ذکر اس آیت میں فرمایا: اذالشّمس کورت میں آوے گا کہ قیامت کے دن اس جرم کی سزا دی جاوے گی۔ جس طرح شیاطین نے ان لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈال دیا ہے کہ اگر یہ لوگ اپنے مال میں بتوں کا حصہ ٹھہراویں گے تو بت اللہ سے سفارش کریں گے۔ اسی طرح یہ بھی وسوسہ ڈال دیا ہے کہ لڑکیوں کے زندہ چھوڑ دینے میں طرح طرح کی ذلت کا اندیشہ ہے۔ یہ کام شیاطین نے اس واسطے کیا کہ لوگ ملت ابراہیمی سے بہک کر اس گناہ کی سزا دوزخ میں بھگتیں جس سے شیطانی جماعت بڑھ جاوے۔ پھر فرمایا اگر اللہ چاہے تو یہ لوگ ایسے کام چھوڑ دیں۔ لیکن دنیا کو اللہ تعالیٰ نے نیک وبد کے امتحان کے لیے پیدا کیا ہے، اس لیے کسی برے کام سے مجبور ہو کر کے کسی کو باز رکھنا انتظام الٰہی کے خلاف ہے۔ اس لیے اے رسول اللہ کے! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جاوے۔ آگے مطلب یہ ہے کہ

لوگ ان نافرمانی کی باتوں کو ملت ابراہیمی کے مسئلے اور اللہ تعالیٰ کا حکم بتاتے تھے۔ حضور نے فرمایا کہ تم پر جیتی لڑکیوں کے گاڑ دینے کا جرم ہے۔ (تفسیر مظہر القرآن)

آیت مبارکہ :

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ○ ١٣٧

لغۃ القرآن: وَكَذٰلِكَ : اور اسی طرح] [زَيَّنَ : مزین بنادیا] [لِكَثِيْرٍ مِّنَ : بہت سے] [الْمُشْرِكِيْنَ : سب مشرک] [قَتْلَ : قتل کرنا] [اَوْلَادِهِمْ : اپنی اولاد کو] [شُرَكَآؤُهُمْ : ان کے شریکوں نے] [لِيُرْدُوْهُمْ : تاکہ وہ سب ہلاک کردیں انہیں] [وَلِيَلْبِسُوْا : اور تاکہ وہ سب خلط ملط کردیں] [عَلَيْهِمْ : ان پر] [دِيْنَهُمْ : اپنے دین کو] [وَلَوْ : اور اگر] [شَآءَ اللّٰهُ : اللہ چاہتا] [مَا : نہیں] [فَعَلُوْهُ : وہ سب کرتے اسے] [فَذَرْهُمْ : پس چھوڑ دو انہیں] [وَمَا : اور جو] [يَفْتَرُوْنَ : وہ سب گھڑتے رہتے]

ترجمہ : اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کو مار ڈالنا (ان کی نگاہ میں) خوش نما کر دکھایا ہے تاکہ وہ انھیں برباد کر ڈالیں اور ان کے (بچے کھچے) دین کو (بھی) ان پر مشتبہ کر دیں، اور اگر اللہ (انہیں جبراً روکنا) چاہتا تو وہ ایسا نہ کر پاتے پس آپ انھیں اور جو افترا پردازی وہ کر رہے ہیں (اسے نظر انداز کرتے ہوئے) چھوڑ دیجئے

تشریح:

آیات سابقہ سے ارتباط

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اور بتوں کے لیے پھلوں اور مویشیوں کی تقسیم کرنا 'اپنے خالق اور منعم کی معرفت سے نہایت جہالت تھی 'اسی طرح شیطان کے ورغلانے سے اپنی اولاد کو قتل کرنا بھی ان کی نہایت جہالت اور گمراہی ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے احکام اور افعال لغو اور باطل ہونے میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔

مجاہد نے بیان کیا ہے کہ ان کے شیاطین نے ان کو یہ حکم دیا کہ یہ اپنی اولاد کو قتل کردیں 'تاکہ رزق میں کمی کی وجہ سے ان کو اولاد کی پرورش کرنے کوئی پریشانی نہ ہو۔اور بعض نے یہ کہا کہ شیطان نے ان کو حکم دیا کہ وہ اپنی بیٹیوں کو قتل کردیں 'تاکہ بیٹی کے باپ کو جس عار اور ذلت کا سامنا ہوتا ہے 'اس سے یہ بچ جائیں۔(جامع البیان 'جز ۸ ص ۵۷ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت ۱۴۱۵ ھ)

(تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

اس آیت میں کفار کی دوسری جہالت بیان ہوئی چنانچہ فرمایا کہ یوں ہی بہت سے مشرکوں کی نگاہ میں ان کے شریکوں نے اولاد کا قتل عمدہ کر دکھایا ہے۔یہاں شریکوں سے مراد وہ شیاطین ہیں جن کی اطاعت کے شوق میں مشرکین اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کی معصیت گوارا کرتے تھے اور ایسے قبیح اور جاہلانہ افعال کے مرتکب ہوتے تھے کہ جن کو عقل صحیح کبھی گوارا نہ کرسکے اور جن کی قباحت میں ادنیٰ سمجھ کے آدمی کو بھی تَرَدُّد نہ ہو۔بت پرستی کی شامت سے وہ ایسے فساد عقل میں مبتلا ہوئے کہ حیوانوں سے بدتر ہوگئے اور اولاد جس کے ساتھ ہر جاندار کو فطرۃً محبت ہوتی ہے شیاطین کے اتباع میں اس کا بےگناہ خون کرنا انھوں نے گوارا کیا اور اس کو اچھا سمجھنے لگے۔خلاصہ یہ کہ انھوں نے اولاد میں بھی ایسی ہی تقسیم کر رکھی تھی کہ لڑکے کو زندہ رکھتے اور لڑکی کو قتل کردیتے۔شیطانوں نے یہ سب اس لیے کیا تاکہ وہ انھیں ہلاک کریں اور ان کا دین ان پر مشتبہ کردیں۔حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں کہ یہ لوگ پہلے حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کے دین پر تھے شیاطین نے ان کو اغوا کرکے ان گمراہیوں میں ڈالا تاکہ انھیں دین اسماعیلی سے مُنْحَرِف کرے۔اہل عرب میں شرک و بت پرستی کی ابتداء کب ہوئی ؟

علامہ برہان الدین حلبی (رح) فرماتے ہیں "اہل عرب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے زمانہ سے لے کر عمرو بن لُحَیّ کے زمانہ تک آپ (علیہ السلام) کے عقائد پر ہی ثابت قدم رہے، یہ وہ پہلا شخص ہے جس نے دین ابراہیمی کو تبدیل کیا اور اہل عرب کے لیے طرح طرح کی گمراہیاں شروع کیں۔

شرک کے بانی عمرو بن لُحَیّ نے اہل عرب میں شرک اس طرح پھیلایا کہ مقام بلقاء سے بت لا کر مکہ میں نصب کئے اور لوگوں کو ان کی پوجا اور تعظیم کرنے کی دعوت دی۔قبیلہ ثقیف کا ایک شخص "لات "جب مرگیا تو عمرو نے اس کے قبیلے والوں سے کہا: یہ مرا نہیں بلکہ اس پتھر میں چلا گیا ہے پھر انھیں اس پتھر کی پوجا کرنے کی دعوت دی۔

اسی عمرو نے سائبہ اور بحیرہ کی بدعت ایجاد کی اور تلْبِیَہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بتوں کو بھی شریک کیا۔

یہ شخص دین میں جس نئی بات کا آغاز کرتا لوگ اسے دین سمجھ لیتے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ موسم حج میں لوگوں کو کھانا کھلایا کرتا اور انھیں لباس پہنایا کرتا تھا اور بسا اوقات وہ موسم حج میں دس ہزار اونٹ ذبح کرتا اور دس ہزار ناداروں کو لباس پہناتا۔

مرنے کے بعد اس کا انجام بہت دردناک ہوا، حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: میں نے عمرو بن عامر بن لحہّ خزاعی کو دیکھا کہ وہ جہنم میں اپنی آنتیں کھینچ رہا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں۔ یہاں شرکا ئھم سے مراد بتوں کے مجاور اور پروہت ہیں۔ جب کوئی پوجاری ان کے پاس آتا تو وہ اسے کہتے تم اپنا بچا اپنے بت کے نام پر قربان کرو تو تمہارا کام ہو جائے گا (قرطبیؒ)

یعنی وہ اس سے کہتے کہ تمہارا دیوتا تم سے بچے کی قربانی مانگتا ہے تو وہ دیوتاؤں کی خوشنودی اور حکم کی اطاعت میں اپنے بچے قربان کر دیتے تھے۔ اس لیے اللہ عزوجل نے فرمایا کہ مشرکین کے شرکاء یعنی جھوٹے خداؤں نے قتل اولاد جیسا سنگین جرم ان کے لیے اچھا بنا دیا۔ یوں انھیں دنیا و آخرت میں تباہ کر ڈالا اور ان کا دین ان پر مشتبہ کر دیا یعنی جرم کو نیکی بنا کر دکھا دیا۔

اسلام سے قبل اہل عرب درندوں سے بدتر تھے درندے بھی اپنی اولاد کو نہیں مارتے مگر انسان اپنی اولاد کو قتل کرکے خوش ہوتا تھا۔ اسلام نے آکر انسان کو انسانیت سکھائی اس کے باوجود اسلام کو دہشت گردی کا مذہب کہنا اہل مغرب کی کس قدر ناانصافی اور افتراء پردازی ہے۔

(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

لِيُرْدُوْهُمْ کا معنی ہے تاکہ وہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کر دیں۔ اس سے مراد اخلاقی ہلاکت بھی ہے کہ جو انسان سنگدلی اور شقاوت کی اس حد کو پہنچ جائے کہ اپنی اولاد کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنے لگے۔ اس میں جوہر انسانیت تو درکنار جوہر حیوانیت تک باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح اس سے مراد بچوں کا تنگدستی کے خوف سے یا آبادی کے بڑھ جانے کے خوف سے ہلاک کرنا بھی ہے جس کے نتیجے میں ایک وقت آتا ہے کہ پوری قوم ہلاکت کے دہانے پر پہنچ جاتی ہے کیونکہ جو قوم اپنے حامیوں اور اپنے تمدن کے کارکنوں اور اپنے میراث کے وارثوں کو پیدا نہیں ہونے دیتی یا پیدا ہوتے ہی خود اپنے ہاتھوں انھیں ختم کر ڈالتی ہے وہ بالآخر تباہی کا شکار ہو جاتی ہے۔ میں محض بات سمجھانے کے لیے کہتا ہوں کہ آج ہماری آبادی چوبیس کروڑ کے لگ بھگ ہے اور جس مکار دشمن سے ہمیں واسطہ ہے اس کی آبادی ایک ارب سے سے متجاوز ہے اور یہ بات کہنے کے لیے کسی بڑی عقل کی ضرورت نہیں کہ اگر ہمیں آبرومندانہ زندگی گزارنی ہے تو ایک نہ ایک دن اس دشمن سے ہمیں فیصلہ کن جنگ لڑنا پڑے گی کیونکہ ایک فوجی شکست ہی ہندوستان کو راہ راست دکھا سکتی ہے وہ ایک بھیڑیا ہے جسے بکریوں جیسی منطق سے مرعوب نہیں کیا جاسکتا۔ اسے اپنی رائے بدلنے کے لیے شیر کا فولادی پنجہ دکھانے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو کیا یہ بات قرین عقل ہوگی کہ چوبیسکروڑ آبادی رکھنے والا ملک ایک ارب کے مقابلے میں اپنی آبادی کو کم رکھنے یا کم کرنے کے بارے میں سوچے۔ اسے آسان سے آسان لفظوں میں خودکشی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ رہی یہ بات کہ ہمارے وسائل کم ہیں تو اس کے لیے صرف یہ گزارش ہے کہ بھٹو صاحب کے زمانے کی ڈرلنگ رپورٹ اگر دیکھ لی جائے تو اس کا جواب آسانی سے مل جائے گا۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی تعلیقاً)

{ **وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ**: اور اگر اللہ چاہتا۔ } یہاں چاہنا، بمعنی ارادہ کرنا ہے نہ کہ بمعنی پسند کرنا۔ پسند کرنے کو رضا کہا جاتا ہے۔ خیال رہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اللہ کے ارادے سے ہو رہا ہے یعنی جو کچھ بندہ اپنے اختیار سے کرنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس فعل کو پیدا فرما دیتا ہے تو یوں فعل آدمی کے اختیار سے ہوتا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ صرف نیکیوں سے راضی ہوتا ہے نہ کہ برائیوں سے لہٰذا آیت پر کوئی اعتراض نہیں۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

یعنی اگر اللہ چاہتا تو کفار کو قتل اولاد سے زبردستی روک دیتا مگر وہ کسی کو برائیوں سے زبردستی نہیں رکھتا بلکہ انبیاء کے ذریعے اس نے انسانوں کو نیکی و بدی میں فرق بتادیا اب جو چاہے نے کی اختیار کرے یا بدی چنے۔ لہٰذا اے حبیب کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! آپ کفار کو جو کرتے ہیں کرنے دیں۔ اس پہ مغموم نہ ہوں۔ (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

صاحب تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی القرآن نے بڑی ادق تحقیق پیش کی ہے اس کو یہاں بیان کیا جاتا ہے :

خاندانی منصوبہ بندی کی ترغیب اور تشہیر کا شرعی حکم

شیطان نے جو ان کے لیے قتل اولاد کو مزین کیا تھا ' اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ شیاطین نے ان کے دلوں میں یہ خوف ڈالا کہ اگر بچے زیادہ ہو گئے تو ان کی پرورش مشکل ہو گی ' سو وہ تنگی رزق کے ڈر سے اپنے بچوں کو قتل کر دیتے تھے ' جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

(آیت) "**ولا تقتلوا اولادکم خشیة املاق نحن نرزقھم وایاکم**"۔ (الاسراء : ۳۱)

ترجمہ : اور اپنی اولاد کو فاقہ کے ڈر سے قتل نہ کرو ہم انھیں روزی دیتے ہیں اور تمہیں بھی۔

آج کل حکومتی ذرائع نشرواشاعت سے ضبط تولید اور خاندانی منصوبہ بندی کا بہت زبردست پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ کم بچے اور خوش حال گھرانا اور یہ کہا جاتا ہے کہ قیام پاکستا سے اب تک (۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۴ء) پچاس سال میں ملک کی آبادی تقریبا چار گنی ہو چکی ہے ' اور ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے اس سیلاب کے آگے بند باندھنا ضروری ہے۔ ملک کے وسائل آبادی کے اس سیلاب کے متحمل نہیں ہیں ' اس لیے بچے دو ہی اچھے۔ لیکن خاندانی منصوبہ بندی اور ضبط تولید کی بنیاد تنگی رزق کا خوف ہے اور یہی زمانہ جہالت میں کافروں اور مشرکوں کا نظرہ تھا۔ جس کا قرآن مجید نے سختی کے ساتھ رد کیا ہے ' اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس پر زور دیا ہے کہ بچے زیادہ پیدا کیے جائیں۔

امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ ھ روایت کرتے ہیں :

حضرت معقل بن یسار (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا ' مجھے ایک عورت ملی جو بہت خوبصورت اور عمدہ خاندان کی ہے ' لیکن اس سے بچے نہیں ہوتے (وہ بانجھ) ہے کیا میں اس سے نکاح کرلوں ؟ آپ نے فرمایا نہیں وہ دوبارہ آیا اور پھر اجازت طلب کی ' آپ نے پھر منع فرمایا : اس نے تیسری مرتبہ آکر اجازت طلب کی تب آپ نے فرمایا محبت کرنے والی اور بچہ پیدا کرنے والی عورتوں سے نکاح کرو ' کیونکہ بیشک میں تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔

(سنن ابوداؤد ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۲۰۵۰ ' سنن النسائی ' ج ٦ ' رقم الحدیث : ۳۲۲۷ ' صحیح ابن حبان ' ج ۹ ' رقم الحدیث : ۴۰۵۷ ' ۴۰۵٦ ' ۴۰۲۸ ' سنن سعید بن منصور ' رقم الحدیث : ۴۹۰ ' مسند احمد ' ج ۳ ' ص ۲۴۵ ' ۱۹۸ ' سنن کبری للبیہقی ' ج ۷ ' ص ۸۲۔ ۸۱ ' مجمع الزوائد ' ج ۴ ' ص ۲۵۸۔ ۲۵۲ ' المعجم الاوسط ' ج ٦ ' رقم الحدیث : ۵۷۴۲)

قرآن مجید کی اس صریح آیت اور اس حدیث صحیح کا صاف اور صریح منشاء اولاد کی کثرت ہے ' نہ کہ اولاد کی قلّت ' اس لیے خاندانی منصوبہ بندی اور ضبط تولید کا وسائل پیداوار میں کمی کی بنیاد پر پروپیگنڈہ کرنا اسلام کے خلاف ہے ' اور اس کی کسی جبری قانون کے ذریعہ عوام پر لاگو کرنا شرعا جائز نہیں ہے ' البتہ کسی صحیح شرعی عذر کی بناء پر جدید طبّی طریقہ سے ضبط ولادت کو روکا جائے تو وہ جائز ہے

ضبط تولید کے بارے میں مصنف کی تحقیق

خاندانی منصوبہ بندی کو کسی عام قانون کے ذریعہ جبرا تمام مسلمانوں پر لاگو کر دینا جائز نہیں ہے 'کیونکہ اول تو اس کی اباحت تمام مکاتب فقہ کے نزدیک متفق علیہ نہیں ہے۔ شیخ ابن حزم اور علامہ رویانی عزل کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور بعض فقہاء کراہت کے ساتھ اس کی اجازت دیتے ہیں اور جو فقہاء اس کی بلا کراہت اجازت دیتے ہیں 'وہ اس کو بیوی کی اجازت کے ساتھ مشروط کرتے ہیں۔اس لیے خاندانی منصوبہ بندی کو کسی عام قانون کے ذریعہ ہر شخص پر لازم کر دینا شرعا جائز نہیں ہے اور انفرادی طور پر بھی دو صورتوں میں خاندانی منصوبہ اصلا جائز نہیں ہے۔

(الف) کوئی شخص تنگی رزق (خشیۃ املاق) کے خوف کی وجہ سے ضبط تولید کرے 'یہ اس لیے ناجائز ہے کہ اس کا حرمت کی علت ہونا قرآن مجید میں منصوص ہے (آیت) "لا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق"۔ (اسراء : ۳۰)

(ب) کوئی شخص لڑکیوں کی پیدائش سے احتراز کے لیے ضبط تولید کرے 'کیونکہ ان کی تزویج میں مشقت اور عار کا سامنا کرنا پڑتا ہے 'اور یہ نیت زمانہ جاہلیت کے مشرکین عرب کی ہے۔قرآن اور حدیث میں اس کی بہت زیادہ مذمت کی گئی ہے۔

جن صورتوں میں مخصوص حالات کے تحت انفرادی طور پر ضبط تولید جائز ہے 'وہ حسب ذیل ہیں

(الف) لونڈیوں سے ضبط تولید کرنا 'تاکہ اولاد مزید لونڈی اور غلام بننے سے محفوظ رہے 'ہر چند کہ اب لونڈی غلاموں کا رواج نہیں ہے 'لیکن اسلام کے احکام دائمی اور کلی ہیں۔اگر کسی زمانہ میں یہ رواج ہو جائے تو لونڈیوں کے ساتھ ضبط تولید کا عمل جائز ہوگا۔

(ب) اگر سلسلہ تولید کو قائم رکھنے سے عورت کے شدید بیمار ہونے کا خدشہ ہو تو ضبط تولید جائز ہے۔

(ج) اگر مسلسل پیدائش سے بچوں کی تربیت اور نگہداشت میں حرج کا خدشہ ہو تو وقفے سے پیدائش کے لیے ضبط تولید جائز ہے 'کیونکہ جب گھر میں صرف ایک عورت ہو اور نو دس ماہ بعد دوسرا بچہ آجائے تو اس کے لیے دونوں بچوں کو سنبھالنا مشکل ہوتا ہے۔

(د) حمل اور وضع حمل کے وقفوں کے دوران بعض صورتوں میں انسان اپنی خواہش پوری نہیں کر سکتا 'اس لیے زیادہ عرصہ تک بیوی سے جنسی خواہش پوری کرنے کی نیت سے ضبط تولید کرنا جائز ہے۔

(ہ) بعض عورتوں کو آپریشن سے بچہ ہوتا ہے 'بیوی کو آپریشن کی تکلیف اور جان کے خطرہ سے بچانے کے لیے یہ عمل جائز ہے۔

(و) جب پیٹ میں مزید آپریشن کی گنجائش نہ رہے تو ایسا طریقہ اختیار کرنا واجب ہے 'جس سے سلسلہ تولید بالکلیہ بند ہو جائے۔

(ز) اگر ماہر ڈاکٹر یہ کہے کہ مزید بچہ پیدا ہونے سے عورت کی جان خطرہ میں پڑ جائے گی 'تب بھی سلسلہ تولید کو بند کرنا واجب ہے۔

عزل کے علاوہ ضبط تولید کے حسب ذیل مروج طریقے بھی شرعاً جائز ہیں

(الف) کھانے والی گولیاں اور انجکشن۔

(ب) کیمیاوی اشیاء (ChemicAl Methods) مثلاً فوم جیلی اور کریم وغیرہ کا بیرونی استعمال،

(ج) ساتھی (Condom)

(د) ڈایافرام۔

(ہ) چھلہ (loop)

(و) نل بندی (TubAl LigAtion)

آخر الذکر عمل ' یعنی نل بندی میں عورت کی بیضہ دان کی نالی کو (FAllopion Tube) کاٹ کر باندھ دیا جاتا ہے ' اس عمل کے بعد عورت کبھی بھی بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی ' یہ عمل صرف دو صورتوں میں جائز ہے۔ ایک اس صورت میں جب عورت کا آپریشن سے بچہ پیدا ہوتا ہو اور مزید آپریشن کی گنجائش نہ رہے ' اور دوسری اس صورت میں جب کوئی ماہر ڈاکٹر یہ کہے کہ بچہ پیدا ہونے سے یا مزید بچے پیدا ہونے سے عورت کی ہلاکت کا خطرہ ہے۔ ان صورتوں میں نل بندی صرف جائز ہی نہیں ' بلکہ واجب ہے۔

ضبط تولید کا ایک طریقہ شرعاً ممنوع ہے ' اور وہ ہے نس بندی (VAsec Tomy) اس عمل میں مرد کی جن نالیوں سے تولیدی جرثومے (Sperm) گزرتے ہیں ' ان نالیوں کو کاٹ کر باندھ دیا جاتا ہے۔ اس عمل کے بعد مرد میں بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے۔

نس بندی سے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے مرد بانجھ ہو جاتا ہے اور مرد کا اپنے آپ کو بانجھ کرا لینا جائز نہیں ہے ' کیونکہ انسان اپنے جسم کا خود مالک نہیں ہے ' انسان خود کو بیچ سکتا ہے نہ خود کشی کرکے خود کو ختم کر سکتا ہے ' نہ اپنا کوئی عضو کاٹ کر کسی کو دے سکتا ہے ' اسی لیے اسلام میں اعضاء کی پیوند کاری بھی جائز نہیں ہے۔ بنابریں نس بندی بھی جائز نہیں ہے۔ صحیح مسلم کی یہ حدیث گزر چکی ہے کہ بعض صحابہ نے عسرت کی بناء پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے خصی ہونے کی اجازت طلب کی تو آپ نے ان کو اجازت نہیں دی اور شہوت کم کرنے کے لیے روزے رکھنے کا حکم دیا۔ (صحیح مسلم ' ج ۱ ' ص ۴۴۹ ' مطبوعہ کراچی)

استقرار حمل کو روکنے کے لیے گولیاں کھائی جائیں ' کیمیائی اشیاء لگائی جائیں یا خارجی حائل (ساتھی اور چھلہ وغیرہ) کا استعمال کیا جائے ان میں سے کوئی چیز بھی حمل سے رکاوٹ کا یقینی سبب نہیں ہے۔ بسا اوقات دوائیں اور کیمیاوی اشیاء اثر نہیں کرتیں ' بعض مرتبہ ڈایافرام کے استعمال کے باوجود قطرات رحم میں چلے جاتے ہیں اور حمل ہو جاتا ہے اور بعض اوقات جڑواں بچے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں ان تمام چیزوں کے مضر اثرات بہت زیادہ ہیں۔ چھلہ اور ڈایافرام کے استعمال سے الرجی اور انفیکشن کی شکایات عام ہیں ' اور کھانے والی دواؤں سے سنا ہے کہ چھاتی کا کینسر ہو جاتا ہے۔ انسان جب بھی اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے فطری اور طبعی نظام سے ہٹ کر کوئی کام کرے گا ' مشکلات میں گرفتار ہوگا۔ اس لیے ناگزیر حالات کے علاوہ ضبط تولید سے احتراز کرنا چاہیے۔

امام غزالی نے اپنے زمانے ' حالات 'ضروریات اور وسائل کے اعتبار سے عزل کی پانچ صورتیں بیان کی ہیں۔ایک صورت حرام 'ایک بدعت 'اور تین صورتیں جائز قرار دی ہیں۔اب چونکہ ترقی یافتہ دور ہے بہت سے نئے اسباب اور وسائل وجود میں آچکے ہیں 'اور ضروریات اور تقاضے بھی بڑھ گئے ہیں مسائل بھی زیادہ ہیں۔اس اعتبار سے ہم نے ضبط تولید کی نو صورتیں بیان کی ہیں 'جن میں پانچ مباح (جائز ہیں) دو ناجائز ہیں۔اور دو صورتوں میں سلسلہ تولید ختم کرنا واجب ہے۔ان میں عورت کی نسوانی انڈوں والی نس (FAllopiAn Tube) کو کاٹ کا باندھ دیا جاتا ہے 'تاکہ یہ نسوانی انڈے رحم میں نہ داخل ہو سکیں۔اس عمل کو نل بندی (TubAl LigAtion) کہتے ہیں۔

بعض لوگوں کو یہ پریشانی ہوتی ہے کہ قرآن مجید میں ہے (آیت) "ومامن دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا"۔(ھود:٦) زمین پر چلنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اس لیے خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کرنا اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر توکل کے خلاف ہے؟ایسے لوگوں سے میں یہ کہتا ہوں کہ جب اللہ تعالیٰ نے رزق کا ذمہ لے لیا ہے تو وہ حصول رزق کے لیے نوکریاں اور کاروبار کیوں کرتے ہیں؟مستقبل کے لیے رقم پس انداز کیوں کرتے ہیں؟کیا ان کے یہ اعمال اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر توکل کے خلاف نہیں؟پس جس طرح رزق کے ذرائع اور اسباب کو اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر توکل کے خلاف نہیں ہے 'اسی طرح بار معیشت کو کم کرنے کے لیے ضبط تولید کرنا بھی اللہ تعالیٰ کی رزاقیت 'ایمان اور توکل کے خلاف نہیں ہے اور بعض لوگوں کو یہ الجھن ہوتی ہے کہ ضبط تولید کرنا تقدیر پر ایمان کے خلاف ہے؟اس کا جواب یہ ہے کہ پھر آپ مصائب اور پریشانیوں میں اللہ تعالیٰ سے دعا کیوں کرتے ہیں؟جب تقدیر کا ہونا اٹل ہے اور تقدیر بدل نہیں سکتی تو آپ دعا کریں یا نہ کریں جو ہونا ہے 'وہ ہو کر رہے گا۔اسی طرح آپ بیمار پڑ جانے پر علاج کیوں کراتے ہیں؟اگر تقدیر میں بیمار رہنا ہے تو آپ لاکھ علاج کریں 'صحت مند نہیں ہو سکتے۔لیکن اس موقع پر آپ یہی کہتے ہیں کہ اسباب کو اختیار کرنا بھی جائز ہے 'اسباب کو اگر اس نیت سے اختیار کیا جائے کہ یہ اسباب اللہ تعالیٰ کے علم اور تقدیر مبرم کو بدل دیں گے تو یہ یقینا ناجائز اور کھلا ہوا کفر ہے۔لیکن اگر اسباب کو اس نیت سے بروئے کار لایا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں نتائج کے حصول کے لیے اسباب کو پیدا کیا ہے اور اسباب کے حصول کے بعد جو نتیجہ سامنے آتا ہے 'وہی دراصل تقدیر ہوتی ہے۔ہم دعا اور علاج تقدیر بدلنے اور نظام قدرت میں مداخلت کے لیے نہیں کرتے 'بلکہ اس لیے دعا اور علاج کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو راحت اور شفاء ہمارے لیے مقدر کی ہے اس کو وجود میں لا سکیں۔اسی طرح ضبط تولید کا عمل تقدیر کو بدلنے یا اللہ تعالیٰ کے نظام خلق میں مداخلت کے لیے نہیں ہے (اور اگر کوئی اس نیت سے کرے تو اس کے کفر میں کوئی شک نہیں) بلکہ ضبط تولید کا یہ عمل اس رکاوٹ اور پیدائش میں اس وقفہ کو وجود میں لانے کے لیے ہے 'جس کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے مقدر کیا ہے۔

صحابہ کرام رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں عزل کرتے تھے اور بچہ کی پیدائش سے احتراز ہی کے لیے کرتے تھے۔کیا کوئی شخص یہ گمان کر سکتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر توکل نہیں تھا 'اس لیے عزل کرتے تھے 'یا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا تقدیر پر ایمان نہیں تھا 'اس لیے عزل کرتے تھے 'یا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اللہ تعالیٰ کے نظام خلق میں مداخلت کے لیے عزل کرتے تھے۔پس جان لیجئے کہ جس طرح صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا عزل کرنا ان خرابیوں کی نیت سے نہیں تھا 'بلکہ نیت صحیحہ کی بناء پر تھا 'اسی طرح دوسرے مسلمانوں کے اس عمل کو بھی نیت صحیحہ پر محمول کرنا چاہیے۔

یاد رکھئے ! اسباب و علل کو اختیار کرنا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعلیم اور آپ کی سیرت ہے۔ آپ کئی کئی دنوں کے لیے کھانا لے کر غار حرا میں جاتے تھے ' ازواج کو ایک سال کے لیے خرچ دیتے تھے ؟ زرہ میں ملبوس ہو کر میدان جنگ میں جاتے رہے ہیں ' بیماری میں مختلف انواع سے آپ نے علاج کیا ہے اور صحابہ کرام اور عام مسلمانوں کو علاج کرانے کی ہدایت دی ہے ' اس لیے کسی ضرورت کے وقت ضبط تولید کرنا تعلیمات اسلام کے خلاف نہیں ' بلکہ عین مطابق ہے۔

ہم نے ضبط تولید کے مسئلہ پر جو بحث کی ہے اور اس کی اباحت کی جو صورتیں بیان کی ہیں ' یہ خالص علمی اور فقہی نوعیت کی بحث ہے۔ اور اس کو اسی تناظر میں پڑھنا اور سمجھنا چاہیے اور یہ بحث اسلام کے اس عمومی فلسفے پر مبنی ہے کہ اسلام دین یسر ہے ' اور اس کے مبادیات اور اصولوں میں اتنی جامعیت اور ہمہ گیری ہے جو ہر دور کے پیش آمدہ مسائل اور پیچیدگیوں کا مثبت حل پیش کر سکتے ہیں۔ اس سے خالص مادہ پرستانہ اور سیکولر فلسفے پر مبنی خاندانی منصوبہ بندی کی اس بین الاقوامی تحریک کی تائید و حمایت یا حوصلہ افزائی ہرگز مقصود نہیں ہے ' جو موجودہ دور میں پراپیگنڈے کے سحر اور ترغیب و تحریص کے مختلف طریقوں کو بروئے کار لا کر چلائی جا رہی ہے ' بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ کسی اضطراری صورت حال ' کسی فرد کی ایسی خالص شخصی وجوہ جو معقولیت پر مبنی ہوں یا واقعی ضرورت کے پیش نظر اسلام کی دی ہوئی رخصتوں کو بیان کر دیا جائے۔ جہاں تک دور جدید کے مادہ پرستانہ نظریہ خاندانی منصوبی بندی کا تعلق ہے تو یہ خالص الحاد پر مبنی ہے اور اسلام میں اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس نظریہ کا مرکزی نقطہ اور محور یہ ہے کہ انسانی آبادی کے پھیلاؤ کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت محدود کر دیا جائے ' تاکہ وسائل معاش اور اسباب معیشت کی تنگی کا سامنا نہ کرنا پڑے ' یہ خالص خود غرضی پر مبنی فلسفہ ہے۔ جس کی اساس یہ ہے کہ ہم اپنی آسائش کے لیے دوسرے انسانوں کو وجود برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ تاریخ انسانیت کا مطالعہ اور دور حاضر کے انسانوں کا مشاہدہ اور تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ہر نئے دور میں نسل انسانی کی افزائش کے باوجود بحیثیت مجموعی انسان نے اپنے گزشتہ ادوار کے مقابلہ میں زیادہ سہل اور پر آسائش زندگی بسر کی ہے اور وہ وسائل رزق کے اعتبار سے بھی مرفہ الحال رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قانون قدرت ہے اور وسائل واسباب سے برتر اور بالاتر رزق مخلوق کی حقیقی منصوبہ بندی قادر مطلق نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہوئی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جب وہ جہاں ظاہری طور پر جغرافیائی ' موسمی یا سائنسی اور علمی وفنی وجوہ کی بنا پر وسائل رزق انسانوں کے کسی گروہ یا کسی ملک یا قوم کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ مجتمع ہوئے تو بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ انھوں نے اس سے مخلوق خدا کو فیض یاب کرنے کی بجائے لاکھوں ٹن غلہ سمندر میں بہا دینا ' یا اسے ضائع کر دینا (DAmping) زیادہ مناسب سمجھا ' درحقیقت یہی وہ اقوام ہیں جو فلاح انسان اور انسان دوستی کے پرکشش نام پر زر کثیر صرف کرکے خاندانہ منصوبہ بندی کی مہم کو پس ماندہ اقوام اور تیسری دنیا کے ممالک میں پھیلا رہی ہیں ' حالانکہ آج بھی ایک سادہ لوح دیہاتی سے پوچھا جائے تو وہ یہی کہتا ہے کہ انسان کھانے کے لیے ایک منہ اور کمانے کے لیے دو ہاتھ لے کر پیدا ہوا ہے۔ گویا قدرت الہی اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اگر تم محنت اور مشقت کروگے تو روزی کے دروازے کبھی تم پر تنگ نہیں ہوں گے ' بلکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ (آیت) "ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لایحتسب"۔ (طلاق : ۲) جس شخص کے دل میں خوف خدا ہو ' تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے (عالم غیب سے) راہیں کھول دے گا اور وہاں سے رزق عطا فرمائے گا ' جہاں اس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

(تفسیر تبیان القرآن۔ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝١٣٨

لغۃ القرآن: وَقَالُوْا : اور ان سب نے کہا] [هٰذِهٖٓ : یہ] [اَنْعَامٌ : چوپائے] [وَّحَرْثٌ : اور کھیتی] [حِجْرٌ : ممنوع ہے] [لَا : نہیں] [يَطْعَمُهَآ : کھاسکتا اسے کوئی] [اِلَّا : مگر] [مَنْ : جس پر] [نَّشَآءُ : ہم چاہیں گے] [بِزَعْمِهِمْ : اپنے خیال سے] [وَاَنْعَامٌ : اور کچھ چوپائے] [حُرِّمَتْ : حرام کردیا گیا] [ظُهُوْرُهَا : ان کی پیٹھیں] [وَاَنْعَامٌ : اور کچھ چوپائے ہیں "کہ"] [لَا : نہیں] [يَذْكُرُوْنَ : وہ سب ذکر کرتے] [اسْمَ اللّٰهِ : اللہ کا نام] [عَلَيْهَا : ان پر] [افْتِرَآءً : جھوٹ باندھتے ہوئے] [عَلَيْهِ : اس پر] [سَيَجْزِيْهِمْ : عنقریب وہ سزا دے گا انہیں] [بِمَا : اس وجہ سے جو] [كَانُوْا : تھے سب] [يَفْتَرُوْنَ : وہ سب گھڑتے رہتے]

ترجمہ : اور اپنے خیال (باطل) سے (یہ بھی) کہتے ہیں کہ یہ (مخصوص) مویشی اور کھیتی ممنوع ہے، اسے کوئی نہیں کھاسکتا سوائے اس کے جسے ہم چاہیں اور (یہ کہ بعض) چوپائے ایسے ہیں جن کی پیٹھ (پر سواری) کو حرام کیا گیا ہے اور (بعض) مویشی ایسے ہیں کہ جن پر (ذبح کے وقت) یہ لوگ اللہ کا نام نہیں لیتے (یہ سب) اللہ پر بہتان باندھنا ہے، عنقریب وہ انھیں (اس بات کی) سزا دے گا جو وہ بہتان باندھتے تھے

تشریح:

اس آیت میں کفار کی چند بد عملیوں کا ذکر ہے۔ ایک تو اپنے بعض کھیتوں کو بتوں کے نام پر یوں وقف کرنا کہ اس کی پیداوار صرف مرد کھائیں عورتیں نہ کھائیں اور وہ آمدنی صرف وہ کھائیں جو ان بتوں کے خدام ہیں۔ دوسری یہ کہ بتوں کے نام پر جانور چھوڑ دینا جیسے بحیرہ، سائبہ وغیرہ جن سے کوئی کام نہ لیا جائے نہ کسی کھیت سے انھیں ہٹایا جائے یہ دونوں کام تو شرک ہیں مگر ان چیزوں کا کھانا حرام نہیں۔ اس لیے جہاد میں صحابہ کرام

(رض) ان تمام چیزوں پر قبضہ کرکے استعمال فرماتے تھے۔ تیسری یہ کہ بتوں کے نام پر ذبح کرنا۔ یہ کام بھی شرک ہے اور اس کا کھانا بھی حرام ہے اور یہ "وَمَآ اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ "میں داخل ہے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

مشرکین کے خود ساختہ احکام کا رد اور ابطال

کفار اور مشرکین نے زمانہ جاہلیت میں اپنے مویشیوں اور اپنے کھیتوں کی تین قسمیں کردی تھیں۔

(۱) وہ مویشی اور کھیت جن کے متعلق وہ کہتے تھے 'ان سے نفع اٹھانا کسی شخص کے لیے بھی جائز نہیں ہے 'یہ ان کے باطل معبودوں اور بتوں کے لیے مخصوص ہیں وہ کہتے تھے ان کو وہی شخص کھا سکتا ہے جس کو ہم کھلانا چاہیں اور ان کو صرف بتوں کے مرد خادم کھا سکتے ہیں 'عورتیں نہیں کھا سکتیں اور ان کے اس ساختہ قول پر کوئی دلیل نہیں تھی 'عقلی نہ نقلی۔

(۲) وہ مویشی جن کی پشت حرام کردی گئی تھی 'ان پر کوئی سواری کرسکتا تھا اور نہ ان پر سامان لاد سکتا تھا 'ان جانوروں کو وہ البحائر 'السوائب اور الحوامی کہتے تھے۔ ان کی تفصیل المائدہ : ۱۰۳ میں گزر چکی ہے۔

(۳) وہ جانور جن پر ذبح کے وقت وہ اللہ کا نام نہیں لیتے تھے 'وہ ان پر ذبح کے وقت صرف بتوں کا نام لیتے تھے اور ان سے کوئی نفع نہیں اٹھاتے تھے 'حتی کہ حج میں بھی اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے تھے۔

انہوں نے جو یہ تقسیم کی تھی یہ محض اللہ تعالیٰ پر افترا تھی اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اس کو مشروع نہیں تھا اور ان کے لیے یہ جائز نہیں تھا کہ وہ از خود اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کسی چیز کو حلال یا حرام کریں 'جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے :

(آیت) "قل ارءیتم ما انزل اللہ لکم من رزق فجعلتم منہ حراما وحلال قل آللہ اذن لکم ام علی اللہ تفترون (یونس : ۵۹)

ترجمہ : آپ کہئے کہ بتاؤ کہ اللہ نے تمہارے لیے جو رزق اتارا تو تم نے کچھ اس میں حرام کرلیا اور کچھ حلال 'آپ کہیے کہ آیا اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دی تھی یا تم اللہ پر بہتان باندھتے ہو۔

پھر اللہ تعالیٰ نے وعید سنائی کہ عنقریب اللہ ان کو ان کی افتراء پردازیوں کی سزا دے گا۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

مالی عبادات میں مشرکوں کے شرک و رسومات کی تفصیل کے ضمن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ شرک میں اس قدر آگے بڑھ چکے تھے کہ جو جانور غیر اللہ کے نام پر وقف کرتے انھیں ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لینا خود ساختہ شریعت کے خلاف سمجھتے تھے۔ اور غیر اللہ کے نام وقف کیے ہوئے جانور اور کھیتوں کو مجاورین کا اپنے نام مخصوص کرلینا، ایسے جانوروں پر سواری نہ کرنا، زندہ پیدا ہونے والے بچے پر مردوں کی ملکیت سمجھنا اگر مردہ پیدا ہو تو اس میں مرد وزن کی شرکت جائز قرار دینا، یہ ان کے من گھڑت دین کی نمایاں علامات تھیں۔ دراصل یہ دین کے نام پر مذہبی پیشواؤں کی مالی کرپشن تھی جس کے نام پر انھوں نے بڑی بڑی جائیدادیں بنائیں اور مذہب کے نام پر عوام کا استحصال کیا۔ جس کی مثالیں مسلمانوں سمیت ہر مذہب کے نام نہاد دینی رہنماؤں میں پائی جاتی ہیں۔ اسی لیے پہلی آیت کے آخر میں انھیں وارننگ دی گئی کہ عنقریب انھیں اس مکر و فریب اور گھناؤنے دھندے کی سزا دی جائے گی، آیت : ۱۳۸ کے آخر میں فرمایا یہ لوگ اپنے مفادات کے

تحفظ کے لیے لوگوں کے سامنے من گھڑت شریعت پیش کرتے ہیں انھیں اسی پر چھوڑ دیجیے۔ بہت جلد انھیں اس جرم کی سزا مل جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ان کے عزائم اور کردار کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اس نے اپنی حکمت کے تحت انھیں مہلت دے رکھی ہے۔ ان لوگوں کا بغیر کسی جواز کے محض حماقت کی بنا پر اپنی اولاد کو قتل کرنا اور اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو اللہ ہی کے ذمہ لگا کر حرام قرار دینا انتہا درجے کی گمراہی ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں وہ ہدایت نہیں پایا کرتے۔

(عَنْ أَبِي الطُّفَيْلِ قَالَ سُئِلَ عَلِيٌّ (رض) أَخَصَّكُمْ رَسُولُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بِشَيْءٍ فَقَالَ مَا خَصَّنَا رَسُولُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بِشَيْءٍ لَمْ يَعُمَّ بِهِ النَّاسَ كَافَّةً إِلَّا مَا كَانَ فِي قِرَابِ سَيْفِي هٰذَا قَالَ فَأَخْرَجَ صَحِيفَةً مَكْتُوبٌ فِيهَا لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللّٰهِ وَلَعَنَ اللّٰهُ مَنْ سَرَقَ مَنَارَ الْأَرْضِ وَلَعَنَ اللّٰهُ مَنْ لَعَنَ وَالِدَهُ وَلَعَنَ اللّٰهُ مَنْ آوٰى مُحْدِثًا) [رواہ مسلم: کتاب الأضاحی، باب تحریم الذبح لغیر اللہ]

”حضرت ابو طفیل فرماتے ہیں حضرت علی (رض) سے پوچھا گیا کیا رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے آپ کو کسی بات کے ساتھ خاص کیا تھا حضرت علی (رض) نے فرمایا رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے عام لوگوں سے ہٹ کر کوئی خاص بات نہیں کہی مگر یہ میری تلوار کی میان میں جو ہے پھر انھوں نے میان میں سے کاغذ نکالا جس میں لکھا ہوا تھا اللہ تعالیٰ اس شخص پر لعنت کرے جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر بھی لعنت کرے جو چوری کرتا ہے اور اللہ اس پر لعنت کرے جو اپنے والد کو لعن طعن کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس شخص پر بھی لعنت کرے جو کسی مجرم (بدعتی) کو پناہ دیتا ہے۔“ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران تعلیقا)

یہاں سے دو فوائد حاصل ہوئے

1۔ ذوالجناح گھوڑے کا رد۔

اس جگہ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا سے اہل تشیع کے ذوالجناح گھوڑے پر سواری کو ممنوع سمجھنے کا رد ہوا اہل تشیع کے ذوالجناح گھوڑے کی حالت مشرکین کی طرف سے بتوں کے لیے چھوڑے ہوئے جانوروں جیسی ہے جیسے وہ بتوں کے نام پر چھوڑے ہوئے جانوروں پر سواری حرام جانتے تھے اسی طرح اہل تشیع ذوالجناح پر سواریاں عملاً حرام جانتے ہیں۔ کیونکہ وہ اس کی غایت درجہ تعظیم بجالاتے ہیں اس کو ہاتھ لگا لگا کر برکت حاصل کرتے ہیں تو اس پر سواری کی گستاخی کیسے کرسکتے ہیں۔ مگر یہ جاہلانہ ومشرکانہ عمل ہے۔

2۔ مَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا معنی:

وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا سے معلوم ہوا کہ مَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا بھی یہی معنی ہے کہ جس جانور کے ذبح پر غیر خدا کا نام لیا جائے وہ حرام ہے۔ گویا سورۃ انعام کی متعدد آیات خوب وضاحت کر رہی ہیں کہ ارشاد خداوندی مَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کا یہ معنی ہے کہ وہ جانور حرام ہے جس کے ذبح کے وقت اس پہ اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا جائے۔

مگر یہ کس قدر ظلم ہے کہ اپنی مرضی اختیار کرتے ہوئے قرآن کریم کا من مانا ترجمہ کیا جائے اور وہ معنی چھوڑ دیا جائے جو خود قرآن کریم اپنے معنی متعین کرتا ہے القرآن یفسر بعض القرآن کے مطابق قرآن کی بہترین تفسیر وہ ہے جو خود قرآن کی زبان سے ہو اس کو چھوڑ کر اپنی طرف

سے قرآن کی من مانی تفسیر کرنا الحاد فی آیات اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ان الذین یلحدون فی ایتنا لا یخفون علینا۔ (فصلت: 40)۔ (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

یہاں ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ جاہلیت کے وہ خدوخال کون سے ہیں۔ جو اکثر جاہلیتوں میں یہ بات مشترک ہوتی ہے کہ بعض لوگ دیدہ دلیری سے کام لے کر اس دنیا کو محض مادہ قرار دیتے ہیں اور بعض اگرچہ بے حیائی میں اس حد تک آگے نہیں جاتے اور خدا کا سرے سے انکار نہیں کرتے مگر وہ کہتے ہیں کہ دین تو صرف عقیدے کا نام ہے۔ یہ کوئی نظام زندگی یا اجتماعی ڈھانچہ ' یا سیاسی اور اقتصادی نظام نہیں ہے جو پوری زندگی کو اپنے دائرہ اختیار میں لے سکتا ہو۔

جاہلیت کی دوسری خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ہر جاہلیت ایک مخصوص دنیاوی نظام قائم کرتی ہے جس میں حاکمیت اور اقتدار اعلی اللہ کے سوا کسی اور کے لیے ہوتا ہے۔ البتہ ہر جاہلیت یہ دعوی کرتی ہے کہ وہ مذہب کا احترام کرتی ہے اور وہ اپنے خدوخال دین ہی سے لیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی جاہلیت کا یہ انداز نہایت ہی خطرناک اور گہری عیاری اور چالاکی پر مبنی ہوتا ہے۔ عالمی عیسائیت اور عالمی صہیونیت نے اس علاقے میں جو کبھی دارالاسلام تھا ' اور جہاں شریعت الہی قانون کی حیثیت رکھتی تھی ' یہی پالیسی اپنا رکھی ہے۔ یہ پالیسی انھوں نے ترکی میں عظیم لیڈر کے تجربے کی ناکامی کے بعد اپنائی ہے۔ یاد رہے کہ ترکی کا یہ عظیم لیڈر خود انھوں نے مصنوعی طور پر پیدا کیا تھا ' اس نے انہی کی ہدایت پر ترکی سے خلافت اسلامیہ کو ختم کیا۔ اس لیے کہ ترکی کی خلافت اسلامیہ اس کرہ ارض پر عظمت اسلام کی آخری نشانی تھی ' لیکن ترکی میں ان کی اعلانیہ ملحدانہ پالیسی بری طرح ناکام رہی اور اس نے اس علاقے میں کوئی اہم کردار ادا نہ کیا۔ اس ملحدانہ پالیسی نے اعلانیہ دین سے علیحدگی اختیار کرلی۔ چنانچہ یہ پالیسی وہاں کے اجتماعی نظام سے بالکل نامانوس رہی کیونکہ اہالیان ترکیہ کے دلوں میں ابھی تک محبت اسلام کی آگ سلگ رہی تھی۔ چنانچہ اس تجربہ کے بعد عالمی صلیبیت اور صہیونیت نے نئے تجربے شروع کیے ' جن کے مقاصد تو وہی ہیں البتہ ان نئے تجربات میں کمالی غلطیوں کو نہیں دہرایا جاتا۔ چنانچہ وہ اب جو سازشیں کرتے ہیں وہ دین کے پردے میں رہ کر کرتے ہیں۔ وہ دینی تنظیمیں قائم کرتے ہیں جو یا تو اعلانیہ ان مقاصد کے لیے کام کرتی ہیں اور یا ان کا مقصد یہ ہوتا ہے۔ وہ ان تنظیموں کے بعض جزوی مسائل کو لے کر بیٹھ جاتی ہیں اور یہ تاثر دیتی ہیں کہ ان جزوی خرابیوں کے علاوہ جو کچھ ہے وہ درست ہے۔ میں سمجھتا ہوں اسلام کے خلاف یہ نہایت ہی گہری سازش ہے جو دین اسلام کے خلاف شیاطین جن وانس نے تیار کی ہے۔

صلیبی اور صہیونی اس عرصے میں پوری طرح اپنے مقاصد کے لیے کام کرتے رہے۔ باوجود مذہبی اختلافات کے وہ باہم دگر متحد و متفق رہے اور باہم تجربات اور مہارتوں کا تبادلہ کرتے رہے۔ بظاہر وہ اس ترکی تجربے کے بھی خلاف رہے اور یہ تاثر دیتے رہے کہ ترکوں کی تحریک بھی دراصل احیائے اسلام کی تحریک ہے اور یہ کہ ترکی حکومت محض زبانی طور پر اپنے آپ کو لادینی حکومت ظاہر کر رہی ہے۔

مستشرقین صلیبی اور صہیونی استعمار کو فکری غذا مہیا کرتے ہیں۔ انھوں نے اس بات پر بڑی محنت کی ہے کہ ترکی تجربہ فی الواقعہ ملحدانہ تجربہ نہ تھا اور نہ محنت وہ اس لیے کرتے ہیں کہ ترکی تجربے کے ملحدانہ خوخال کی وجہ سے اس کے اثر ورسوخ اور فعالیت میں میں کمی واقع ہو گئی تھی۔ مستشرقین کی جانب سے اسلامی تحریک کے خلاف یہ تباہ کن حملہ تھا لیکن ترکی کی تحریک الحاد اب اس قابل نہ رہی تھی کہ وہ دوبارہ فعال ہوسکے۔ دور جدید میں مستشرقین کی جانب سے اسلام کے خلاف کارروائی خود اسلام کے عنوان سے کی جارہی ہے۔ یہ لوگ اسلامی نظریات کے مفہوم بدل رہے ہیں۔ اسلام کے لیے لوگوں کے جوش وخروش کو کم کر رہے ہیں اور اس کو جاہلی رنگ دے رہے ہیں۔ دین کے نام سے دینی نظریات

کو بدلنے کی سعی کرتے ہیں۔ اسلامی اخلاق اور انسان کی نہایت ہی فطری عادات کو دین کے نام سے دینی نظریات کو بدلنے کی سعی کرتے ہیں۔ اسلامی اخلاق اور انسانی کی نہایت ہی فطری عادات کو دین کے نام سے بے راہ روی پر ڈال رہے ہیں۔ پھر وہ جاہلیت کے ہر نشان کو ایسا ثابت کر رہے ہیں کہ یہ عین اسلام ہے اور اس کو ان ممالک میں رواج دے رہے ہیں۔ جہاں اسلام کے بارے میں لوگوں کے جذبات حساس نہیں۔ یوں وہ عالم اسلام کو صلیبیت اور صہیونیت کے دام تذدیر میں پھنساتے ہیں اور ان کی یہ تحریک ان صلیبی اور صہیونی جنگوں سے زیادہ کامیاب ہے جو وہ اسلام کے خلاف گزشتہ تیرہ سو سال سے لڑ رہے ہیں 'لیکن حقیقت یہ ہے۔

آیت "سَيَجْزِيهِم بِمَا كَانُوا۟ يَفْتَرُونَ (138)

" عنقریب اللہ انھیں ان کی افتراء پردازیوں کا بدلہ دے گا"۔ (فی ظلال القرآن)

فوائد

ا۔ معلوم ہوا کہ کفار کے ایسے کہہ دینے سے وہ کھیتیاں حرام نہ ہو گئیں بلکہ جو بتوں کے نام پر کی گئیں وہ بھی حلال ہی رہیں ورنہ اس آیت میں ان پر اس وجہ سے عتاب نہ ہوتا۔

۲۔ چنانچہ وہ بتوں کے نام پر چھوڑی ہوئی پیداوار میں سے بت خانوں کے پجاریوں اور بتوں کے خدام کو دیتے تھے۔

۳۔ جنہیں وہ لوگ بحیرہ، سائبہ، حامی کہتے تھے کہ ان جانوروں کو وہ بتوں کے نام پر ایسا چھوڑ دیتے تھے جیسے آج ہندو سانڈ بجار کو بعض موجودہ روافض گھوڑے کو کہ اس پر سواری وغیرہ نہ کرتے تھے، کچھ کام نہ لیتے تھے آج کل ضلع گجرات میں یہ بیماری پھیل رہی ہے کہ بعض جہلا نے امام حسین کے نام پر گھوڑا چھوڑ دیا ہے جو صرف محرم میں جلوس نکالنے اور ساتھ میں سینہ کوٹنے کے وقت استعمال کیا جاتا ہے۔

۴۔ اس میں کفار کی چند بد عملیوں کا ذکر ہے۔ ایک تو اپنے بعض کھیتوں کو بتوں کے نام پر وقف کرنا کہ اس کی پیداوار صرف مرد کھائیں جو ان بتوں کے خدام ہیں دوسرے جانور چھوڑ دینا بتوں کے نام پر جیسے بحیرہ سائبہ وغیرہ جن سے کوئی کام نہ لیا جاوے نہ کسی کھیت سے انھیں ہٹایا جائے یہ دونوں کام تو شرک ہیں۔ مگر ان چیزوں کا کھانا حرام نہیں۔ اس لیے جہاد میں صحابہ کرام ان تمام چیزوں پر قبضہ کرکے استعمال فرماتے تھے۔ تیسرے بتوں کے نام پر ذبح کرنا۔ یہ کام بھی شرک ہے اور اس کا کھانا بھی حرام کیونکہ **ما اهل به لغير الله** میں داخل ہے۔

(تفسیر نور العرفان۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی)

آیت مبارکہ :

وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ۭ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝۱۳۹

لغۃ القرآن : وَقَالُوْا : اور ان سب نے کہا] [مَا : نہیں] [فِي : میں] [بُطُوْنِ : پیٹوں] [هٰذِهِ : ان] [الْاَنْعَامِ : جانوروں کے] [خَالِصَةً : خاص طور پر] [لِّذُكُوْرِنَا : ہمارے مردوں کے لیے] [وَمُحَرَّمٌ : اور حرام کیا ہوا ہے] [عَلٰٓي :" اس بات " پر] [اَزْوَاجِنَا : ہماری بیویوں] [وَاِنْ : اور اگر] [يَكُنْ : ہو] [مَّيْتَةً : مردہ] [فَهُمْ : پس وہ سب] [فِيْهِ : اس میں] [شُرَكَآءُ : شریک ہوں گے] [سَيَجْزِيْهِمْ : عنقریب وہ سزا دے گا انہیں] [وَصْفَهُمْ : ان کے " اس " بیان کی] [اِنَّهٗ : بیشک یہ حقیقت ہے] [حَكِيْمٌ : حکمت والا] [عَلِيْمٌ : خوب جاننے والا ہے]

ترجمہ : اور (یہ بھی) کہتے ہیں کہ جو (بچہ) ان چوپایوں کے پیٹ میں ہے وہ ہمارے مردوں کے لیے مخصوص ہے اور ہماری عورتوں پر حرام کر دیا گیا ہے، اور اگر وہ (بچہ) مرا ہوا (پیدا) ہو تو وہ (مرد اور عورتیں) سب اس میں شریک ہوتے ہیں، عنقریب وہ انھیں ان کی (من گھڑت) باتوں کی سزا دے گا، بیشک وہ بڑی حکمت والا خوب جاننے والا ہے

تشریح :

کفار کی منجملہ جہالتوں میں سے ایک مروجہ جہالت یہ بھی تھی کہ بعض جانوروں (سائبہ اور بحیرہ) کے متعلق ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ان کے پیٹ میں (دودھ یا بچہ) جو کچھ ہے اس کا استعمال مردوں کے لیے حلال ہے اور عورتوں کے لیے حرام۔ اور اگر اسی جانور کے شکم سے مردہ بچہ پیدا ہو تو وہ مردوں اور عورتوں سب کے لیے حلال ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ عنقریب انھیں ان خرافات کی سزا دی جائے گی۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

جو کچھ ان مویشیوں کے پیٹیوں میں ہے اس سے کیا مراد ہے؟ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا اس سے مراد دودھ ہے۔
عامر نے کہا بحیرہ کا دودھ صرف مرد پیتے تھے اور اگر بحیرہ مر جائے تو اس کا گوشت مرد اور عورتیں دونوں کھاتے تھے۔ نیز حضرت ابن عباس (رض) سے ایک روایت ہے کہ جو کچھ ان کے پیٹوں میں ہے 'اس سے مراد دودھ ہے۔ وہ اس دودھ کو عورتوں پر حرام قرار دیتے تھے اور اس دودھ کو صرف مرد پیتے تھے اور بکری جب نر کو جنتی تو اس کو صرف مرد کھاتے اور عورتیں نہیں کھاتی تھیں اور اگر وہ مادہ کو جنتی تو اس کو ذبح نہیں کرتے تھے اور اگر وہ مردہ جنتی تو اس میں مرد اور عورتیں سب شریک ہوئے تو اللہ تعالی نے اس سے منع فرما دیا۔ (جامع البیان 'جز ۸ ص ۶۴'۔ ۶۳ مطبوعہ دارالفکر 'بیروت ۱۴۱۵ھ)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا اللہ تعالیٰ عنقریب ان کو ان کے اس جھوٹ کی سزا دے گا جیسا کہ اس آیت میں فرمایا ہے:

(آیت) "ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھذا حلال وھذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب ان الذین یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون"۔ (النحل: ۱۱۶)

ترجمہ: اور جن چیزوں کے متعلق تمہاری زبانیں جھوٹ بولتی ہیں 'ان کے بارے میں یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے 'تاکہ تم اللہ پر جھوٹ باندھو 'بیشک جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں 'وہ فلاح نہیں پائیں گے۔

خود ساختہ شریعت سازی کا رد اور ابطال

ان آیات میں یہ دلیل ہے کہ اپنی طرف سے بغیر شرعی دلیل کے کسی چیز کو فرض یا واجب قرار دینا 'یا بغیر شرعی دلیل کے کسی چیز کو ناجائز اور حرام کہنا 'اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھنے کے مترادف ہے۔
مثلا یہ کہنا کہ امام جعفر صادق کی نیاز کی کھیر پوریوں کو اسی جگہ بیٹھ کر کھایا جائے اور اس کو وہاں سے منتقل کرنا جائز نہیں ہے 'یا جیسے لوگ بغیر کسی شرعی دلیل کے قبضہ بھر داڑھی کو واجب کہتے ہیں 'یا جیسے بعض لوگ میلاد شریف 'سوئم اور چہلم وغیرہ کو ناجائز اور حرام کہتے ہیں اور بعض لوگ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہنے کو حرام کہتے ہیں اور بعض لوگ ائمہ کی تقلید کو ناجائز اور حرام بلکہ شرک کہتے ہیں 'اور بعض لوگ یارسول اللہ! کہنے کو بھی شرک کہتے ہیں۔ حالانکہ حدیث میں اس پر وعید ہے۔ حضرت حذیفہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جن چیزوں کا مجھے تم پر سب سے زیادہ خوف ہے 'ان میں سے یہ ہے کہ ایک شخص قرآن پڑھے گا حتی کہ جب تم اس پر قرآن کا نور دیکھو گے اور وہ اسلام کی پشت پناہ ہوگا 'تو قرآن اس سے جاتا رہے گا اور وہ اس کو پس پشت پھینک دے گا اور اپنے پڑوسی پر تلوار سے حملہ کرے گا اور اس پر شرک کی تہمت لگائے گا۔ میں نے پوچھا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان میں سے کوئی شرک کا مصداق ہوگا 'جس پر شرک کی تہمت لگائی گئی ہے 'یا شرک کی تہمت لگانے والا۔ آپ نے فرمایا بلکہ شرک کی تہمت لگانے والا۔ اس حدیث کو امام ابو یعلی موصلی نے روایت کیا ہے۔ (مختصر اتحاف السادۃ المھرۃ بزوائد العشرہ 'ج ۸ 'رقم الحدیث: ۶۶۹۶ 'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت '۱۴۱۷ھ) (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

شان نزول

حضرت عکرمہ (رض) فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں قبیلہ ربیعہ اور مضر کا یہ دستور تھا کہ اگر کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہوتی تو وہ اپنی بیوی سے کہتا کہ اگر تو اسے زندہ دفن نہ کرے تو مجھ پر حرام ہے یہ عورت نفاس سے فارغ ہو کر جنگل جاتی اور اپنے اعزہ کی مدد سے اس بچی کو دفن کر دیتی تاکہ کوئی داماد نہ بن سکے۔

قتادہ فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں مشرکین مکہ اپنی لڑکیوں کو سنگ دلی اور بے رحمی سے زندہ در گور کر دیا کرتے تھے۔ ربیعہ اور مضر وغیرہ قبائل میں اس کا خاص رواج تھا اور بعض لڑکوں کو بھی ذبح کر ڈالتے فاقہ اور مفلسی کے خوف سے اس قدر بے رحم تھے کہ کتوں کو پرورش کرتے اور اولاد کو ذبح کے لیے آگے رکھتے اس کی مذمت میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

(تفسیر الحسنات۔ علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)

جب انسان کلام الٰہی کو پڑھتے ہوئے ان گمراہیوں پر نظر ڈالتا ہے اور ان گمراہیوں کے حاملین جن خساروں ' نقصانات اور مشکلات میں مبتلا ہوتے ہیں ان پر غور کرتا ہے تو وہ یہ دیکھ کر نہایت ہی تعجب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ لوگ اسلامی شریعت اور اسلامی نظام سے انحراف کرکے کس قدر نقصانات اٹھا رہے ہیں اور کن ناقابل برداشت ذمہ داریوں میں گھر گئے ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو لے کر وہ کس قدر فضول اور مجمل ناقابل فہم امور میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ کہ ناقابل برداشت ہیں۔ ان کی زندگی پیچیدہ اور اضطراب انگیز ہے۔ زندگی کا کوئی اصول نہیں ہے۔ ہر طرف وہم وخرافات اور تقلید اور نقل ہے۔ ان سب حالات کے مقابلے میں اسلام کا عقیدہ توحید ہے جو بالکل صاف ستھرا اور واضح ہے۔ عقیدہ انسانی ذہن سے ادہام اور خرافات کو کھرچ کر رکھ دیتا ہے اور انسانی عقل کو اندھی پیروی اور جکڑی بندیوں سے آزاد کر دیتا ہے۔ یہ عقیدہ انسانیت کو جاہلیت اور اس کی رسومات سے رہائی دلاتا ہے۔ پھر یہ عقیدہ بندوں کو بندوں کی غلامی سے آزاد کرتا ہے ' چاہے یہ غلامی قانون سازی کے معاملے میں ہو ' یا رسومات اور طرز عمل میں ہو یا حسن وقبح کے پیمانوں کے میدان میں ہوں۔ اس جنگل سے نکال کر عقیدہ توحید انسان کو ایک واضح نظریہ دیتا ہے۔ ایک واضح معنی دیتا ہے۔ اس کے تصورات واضح اور آسان ہیں۔ ان تصورات کی روشنی میں انسان کو ہمہ گیر آزادی نصیب ہو جاتی ہے اور انسان صرف اللہ کی بندگی اور غلامی کے اعلیٰ ارفع مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ لوگ نبی کی اتباع سے وہاں پہنچ سکتے ہیں۔

آہ ! یہ ایک عظیم خسارہ ہے اور یہ خسارہ دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی ' بلکہ آخرت کا خسارہ تو بہت ہی زیادہ ہے اور یہ اس لیے ہے کہ انسانیت نے اللہ کی سیدھی راہ سے انحراف کر لیا ہے اور جاہلیت کی گندگی میں ڈوب گئی ہے۔ اس نے انسانوں کی غلامی میں اپنے آپ کو دے دیا ہے۔ (فی ظلال القرآن)

آیت مبارکہ :

قَدۡ خَسِرَ الَّذِیۡنَ قَتَلُوۡۤا اَوۡلَادَهُمۡ سَفَهًۢا بِغَیۡرِ عِلۡمٍ وَّحَرَّمُوۡا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افۡتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ‌ؕ قَدۡ ضَلُّوۡا وَمَا كَانُوۡا مُهۡتَدِيۡنَ ۝۱۴۰

لغۃ القرآن : قَدْ : یقیناً] [خَسِرَ : نقصان اٹھایا اس نے] [الَّذِیْنَ : وہ لوگ جو] [قَتَلُوْٓا : سب نے قتل کیا] [اَوْلَادَھُمْ : اپنی اولاد کو] [سَفَهًۢا : بےوقوفی سے] [بِغَیْرِ : بغیر] [عِلْمٍ : علم] [وَّحَرَّمُوْا : اور ان سب نے حرام ٹھہرایا] [مَا : نہیں] [رَزَقَھُمُ : رزق دیا انہیں] [اللّٰهُ : اللہ] [افْتِرَآءً : جھوٹ باندھتے ہوئے] [عَلَي اللّٰهِ : اللہ تعالیٰ پر] [قَدْ : تحقیق] [ضَلُّوْا : وہ سب گمراہ ہوگئے] [وَمَا : اور نہ] [كَانُوْا : تھے سب] [مُهْتَدِیْنَ : سب ہدایت پانے والے]

ترجمہ : واقعی ایسے لوگ برباد ہوگئے جنہوں نے اپنی اولاد کو بغیر علم (صحیح) کے (محض) بیوقوفی سے قتل کر ڈالا اور ان (چیزوں) کو جو اللہ نے انھیں (روزی کے طور پر) بخشی تھیں اللہ پر بہتان باندھتے ہوئے حرام کر ڈالا، بیشک وہ گمراہ ہوگئے اور ہدایت یافتہ نہ ہوسکے

تشریح :

شان نزول

یہ آیت زمانہ جاہلیت کے ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو اپنی لڑکیوں کو نہایت سنگ دلی اور بے رحمی کے ساتھ زندہ در گور کر دیا کرتے تھے۔ قبیلہ ربیعہ اور مُضَر وغیرہ قبائل میں اس کا بہت رواج تھا اور جاہلیت کے بعض لوگ لڑکوں کو بھی قتل کرتے تھے اور بے رحمی کا یہ عالم تھا کہ کتّوں کی پرورش کرتے اور اولاد کو قتل کرتے تھے۔ ان کی نسبت یہ ارشاد ہوا کہ "وہ تباہ ہوئے "اس میں شک نہیں کہ اولاد اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور اس کی ہلاکت سے اپنی تعداد کم ہوتی ہے، اپنی نسل مٹتی ہے، یہ دنیا کا خسارہ ہے، گھر کی تباہی ہے اور آخرت میں اس پر عذاب عظیم ہے، تو یہ عمل دنیا اور آخرت میں تباہی کا باعث ہوا اور اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو تباہ کرلینا اور اولاد جیسی عزیز اور پیاری چیز کے

ساتھ اس قسم کی سفاکی اور بے دردی گوارا کرنا انتہا درجہ کی حماقت اور جہالت ہے۔

(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

علامہ قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ ھ نے بیان کیا ہے کہ روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب میں سے ایک شخص ہمیشہ مغموم رہتا تھا آپ نے اس سے پوچھا کیا بات ہے؟ تم کیوں مغموم رہتے؟ اس نے کہا یا رسول اللہ! میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بہت بڑا گناہ کیا تھا اور میں ڈرتا ہوں کہ اللہ میرے اس گناہ کو نہیں بخشے گا 'خواہ میں مسلمان ہو چکا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے بتاؤ! تمہارا گناہ کیا تھا؟ اس نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! میں ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ میرے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی 'اس کی ماں نے مجھ سے سفارش کی کہ میں اس کو چھوڑ دوں حتی کہ وہ بڑی ہو گئی 'حتی کہ وہ عورتوں میں حسین ترین لڑکی تھی۔ لوگوں نے اس سے نکاح کرنے کا پیغام دیا 'مجھے اس پر عار آیا اور میرے دل نے یہ برداشت نہیں کیا کہ میں اس کا نکاح کر دوں 'یا اس کو بغیر نکاح کے رہنے دوں۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا میں اس کو فلاں فلاں قبیلہ میں اپنے رشتہ داروں سے ملانے کے لیے لے جا رہا ہوں 'وہ یہ سن کر خوش ہوئی۔ اس نے اس کو اچھے کپڑے اور زیور پہنائے 'میں اس کو لے گیا حتی کہ میں ایک کنوئیں پر پہنچا اور میں نے کنوئیں میں جھانک کر دیکھا 'وہ لڑکی سمجھ گئی کہ میں اس کو کنوئیں میں ڈالنا چاہتا ہوں 'وہ مجھے چمٹ گئی اور رونے لگی اور کہنے لگی 'اے میرے باپ! تمہارا کیا ارادہ ہے؟ تم میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟ مجھے اس پر رحم آیا 'پھر میں نے کنوئیں کی طرف دیکھا اور مجھ پر پھر عار غالب آگیا۔ وہ لڑکی پھر مجھ سے چمٹ گئی اور کہنے لگی 'اے میرے باپ! میری ماں کی امانت کو ضائع نہ کر۔ میں نے پھر دوسری مرتبہ کنوئیں کی طرف دیکھا اور پھر اس کی طرف دیکھا۔ مجھے اس پر رحم آیا لیکن مجھ پر شیطان غالب آگیا 'میں نے پھر دوسری مرتبہ کنوئیں کی طرف دیکھا اور پھر اس کی طرف دیکھا مجھے اس پر رحم آیا لیکن مجھ پر شیطان غالب آگیا 'میں نے اس کو پکڑا اور اس کو اوندھے منہ کنوئیں میں ڈال دیا اور وہ کنوئیں میں چلا رہی تھی 'اے میرے باپ! تو نے مجھے مار ڈالا؟ میں اس کنوئیں پر ٹھہرا رہا حتی کہ آواز آنی بند ہو گئی 'پھر میں واپس آگیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے اصحاب یہ سن کر رونے لگے۔ اور آپ نے فرمایا اگر میں کسی شخص کو زمانہ جاہلیت کے فعل پر سزا دیتا تو تمہیں دیتا۔

(الجامع لاحکام القرآن جز ۷ ص ۸۸ 'مطبوعہ دار الفکر 'بیروت ۱۴۱۵ھ) (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

اولاد کے قاتلوں کو نصیحت

دورِ جاہلیت میں اولاد کو قتل کرنے کے بنیادی اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ انھیں تنگدستی کا خوف لاحق ہوتا اور وہ اس ڈر سے اپنی اولاد کو قتل کر دیتے تھے کہ انھیں کھلائیں پلائیں گے کہاں سے اور ان کے لباس اور دیگر ضروریات کا انتظام کیسے کریں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اس حرکت سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"وَلَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا (۳۱)" (1)

اور غربت کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، ہم انھیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی، بیشک انھیں قتل کرنا کبیرہ گناہ ہے۔

افسوس ! فی زمانہ بہت سے مسلمان بھی دورِ جاہلیت کے کفار کا طریقہ اختیار کئے ہوئے ہیں اور وہ بھی اس ڈر سے دنیا میں آتے ہی یا ماں کے پیٹ میں ہی بچے کو قتل کروا دیتے ہیں کہ ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے اخراجات کہاں سے پورے کریں گے اور یہ عمل خاص طور پر اس وقت کرتے ہیں جب انھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ماں کے پیٹ میں پلنے والی جان بچی ہے۔ افسوس کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کو رازق ماننے والے بھی اس فعل قبیح کا اِرتکاب کر رہے ہیں۔

یہاں ایک مسئلہ یاد رہے کہ "جب حمل میں جان پڑ جائے جس کی مدت علماء نے چار مہینے بیان کی ہے تو حمل گرانا حرام ہے کہ یہ بھی اولاد کا قتل ہے اور اس سے پہلے اگر شرعی ضرورت ہو تو اسقاط حمل جائز ہے۔

{ **وَحَرَّمُوا** : حرام قرار دیتے ہیں۔ } یعنی مشرکین عرب بحیرہ، سائبہ اور حامی وغیرہ جن جانوروں کا اوپر ذکر ہوا انھیں اللہ عَزَّوَجَلَّ پر جھوٹ باندھتے ہوئے حرام قرار دیتے ہیں کیونکہ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ ایسے مذموم افعال کا اللہ عَزَّوَجَلَّ نے حکم دیا ہے ان کا یہ خیال اللہ عَزَّوَجَلَّ پر افتراء ہے۔

ہر چیز میں اصل اباحت ہے

اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں اصل اباحت ہے، کیونکہ اللہ عَزَّوَجَلَّ نے ہر چیز ہمارے رزق کے لیے پیدا فرمائی، ان میں سے جسے حرام فرما دیا وہ حرام ہے اور جسے حلال فرمایا یا جس سے سکوت فرمایا وہ حلال ہے۔ قرآن پاک میں ہے :

" هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا "

اس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لیے بنایا۔

حضرت سلمان (رض) سے روایت ہے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "حلال وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام کیا اور جس سے خاموشی فرمائی تو وہ اس میں سے ہے جس سے معافی دی۔

حضرت علامہ ملا علی قاری (رح) فرماتے ہیں ’’اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے۔ (یعنی جس چیز کی حلت و حرمت سے متعلق قرآن و حدیث میں خاموشی ہو وہ حلال ہے۔) (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

آیت مبارکہ :

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ڮ وَلَا تُسْرِفُوْا ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ○ ۱۴۱

لغۃ القرآن: وَهُوَ : اور وہ] [الَّذِيْٓ :" وہ ہے " جو] [اَنْشَاَ : پیدا کیے] [جَنّٰتٍ : باغات میں] [مَّعْرُوْشٰتٍ : چڑھائے ہوئے] [وَّغَيْرَ : اور نہ] [مَعْرُوْشٰتٍ : چڑھائے ہوئے] [وَّالنَّخْلَ : اور کھجور " کے درخت "] [وَالزَّرْعَ : اور کھیتی] [مُخْتَلِفًا : مختلف ہیں] [اُكُلُهٗ : اس کے پھل] [وَالزَّيْتُوْنَ : اور زیتون] [وَالرُّمَّانَ : اور انار " بھی پیدا کیے "] [مُتَشَابِهًا :" بالکل " ملتا جلتا] [وَّغَيْرَ : اور نہ] [مُتَشَابِهٍ : مشابہت رکھنے والے] [كُلُوْا : تم سب کھاؤ] [مِنْ : سے] [ثَمَرِهٖٓ : اس کے پھل] [اِذَآ : جب " کہ "] [اَثْمَرَ : وہ پھل دے] [وَاٰتُوْا : اور تم سب ادا کرو] [حَقَّهٗ : اس کا حق] [يَوْمَ : وہ دن] [حَصَادِهٖ : اس کی کٹائی] [وَلَا : اور نہ] [تُسْرِفُوْا : تم سب اسراف کرو] [اِنَّهٗ : بیشک یہ حقیقت ہے] [لَا : نہیں] [يُحِبُّ : پسند کرتا ہے] [الْمُسْرِفِيْنَ : اسراف کرنے والوں کو]

ترجمہ : اور وہی ہے جس نے برداشتہ اور غیر برداشتہ (یعنی بیلوں کے ذریعے اوپر چڑھائے گئے اور بغیر اوپر چڑھائے گئے) باغات پیدا فرمائے اور کھجور (کے درخت) اور زراعت جس کے پھل گوناگوں ہیں اور زیتون اور انار (جو شکل میں) ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور (ذائقہ میں)

جداگانہ ہیں (بھی پیدا کئے)۔جب (یہ درخت) پھل لائیں تو تم ان کے پھل کھایا (بھی) کرو اور اس (کھیتی اور پھل) کے کٹنے کے دن اس کا (اللہ کی طرف سے مقرر کردہ) حق (بھی) ادا کر دیا کرو اور فضول خرچی نہ کیا کرو، بیشک وہ بے جا خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا

تشریح:

اللہ کی حکمت بالغہ پر غور

فاللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور قدرت کاملہ کا اندازہ لگانا چاہو تو عالم نباتات میں ہی غور کرو۔ یہ مختلف قسم کے لذیذ پھل، یہ اونچے اونچے کھجور کے درخت، یہ لہلہاتے ہوئے کھیت جن کی اقسام کا شمار نہیں ہو سکتا جو کہیں رنگ اور شکل میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں تو بو اور ذائقہ میں الگ الگ ہیں۔ ایک انار کو لیجئے۔ غلاف کے اندر متعدد خانے ہیں جنہیں ابریشم سے بھی نرم پردوں سے الگ الگ کر دیا گیا ہے۔ ہر خانہ میں عقیق سے بھی زیادہ چمک دار دانے بڑی احتیاط سے لپیٹ کر رکھ دیئے گئے ہیں۔ ہر دانہ اپنے رنگ، ذائقہ میں ایک مکمل وحدت ہے۔ یہ سب کچھ غیر مبہم انداز میں بیان کر رہا ہے کہ ان کو رنگ و بو اور ذائقہ اور لذت عطا فرمانے والا بہت بڑا حکیم اور قادر مطلق ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

مشکل الفاظ کے معانی

معروشات: یہ لفظ عرش سے بنا ہے ‘عرش کا معنی ہے چھت۔ جس چیز پر بادشاہ بیٹھتا ہے ‘اس کو بھی بلندی کی وجہ سے عرش (تخت) کہتے ہیں۔ عرب کہتے ہیں عرشت الکرم میں نے انگور کی چھت بنادی ‘یعنی انگور کی بیلیں اس طرح پھیلا دیں کہ ان سے چھت بن گئی۔ اس آیت میں "جنات معروشات "سے مراد وہ باغ ہیں جن میں پھلوں کی بیلیں ہوں ‘مثلا انگور کی یا خربوزہ اور تربوز کی۔

غیر معروشات: جن پھلوں کے درختوں کو زمین پر چھوڑ دیا گیا ہو ‘جو اپنے تنے اور شاخوں کی وجہ سے کسی چھت پر ڈالے جانے سے مستغنی ہوں۔

حصاد: یہ لفظ حصد سے بنا ہے ‘اس کا معنی ہے فصل کاٹنا۔ درختوں سے پھلوں کے توڑنے کو بھی حصاد کہتے ہیں۔

(تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

یعنی اللہ تعالیٰ نے کچھ باغات ایسے پیدا فرمائے جو زمین پر پھیلے ہوئے ہیں جیسے خربوزہ، تربوز اور دیگر بیل بوٹے وغیرہ اور کچھ ایسے پیدا فرمائے جو زمین پر پھیلے ہوئے نہیں بلکہ تنے والے ہیں جیسے آم، امرود اور مالٹا وغیرہ کے باغات، اسی طرح کھجور اور کھیتی، انار اور زیتون کو پیدا فرمایا اور اس میں اللہ عَزَّوَجَلَّ کی عجیب قدرت ہے کہ ان پھلوں میں تاثیر اور ذائقے کے اعتبار سے تو فرق ہوتا ہے لیکن رنگ اور پتوں کے اعتبار سے بہت مشابہت ہوتی ہے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

وجود باری اور توحید پر دلیل

قرآن مجید کا موضوع توحید ' رسالت ' احکام شرعیہ ' معاد اور جزاء و سزا کو بیان کرنا ہے۔ اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کفار کو سرزنش کی تھی جو شرک کرتے تھے اور از خود احکام بنا لیتے تھے ' اس کے بعد اب پھر اصل مقصود کی طرف متوجہ ہوا اور وجود باری اور توحید پر دلائل دیئے۔

اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیلوں اور درختوں والے باغات پیدا کیے اور کھجور کے درخت اور کھیت پیدا کیے۔ ان پھلوں کی شکل و صورت ' ان کا رنگ ' ان کی خوشبو اور ان کا ذائقہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اسی طرح کھیتوں سے جو غلہ پیدا ہوتا ہے ان کی ہیئت ان کا ذائقہ ان کے فوائد ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ چیزیں از خود تو پیدا نہیں ہوئیں ' اور نہ یہ چیزیں سورج ' چاند اور ستاروں نے پیدا کی ہیں۔ کیونکہ جب وہ غروب ہو جاتے ہیں تب بھی یہ چیزیں اسی طرح برقرار رہتی ہیں۔ پھر دنیا بھر کے لوگ جو اللہ کے سوا اور چیزوں کی خدائی کے قائل ہیں ' ان چیزوں میں سے کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ ان باغوں اور کھیتوں کے پیدا کرنے والے ہیں۔ بلکہ اللہ کے سوا کوئی بھی ان کے پیدا کرنے کا دعوی دار نہیں ہے تو پھر ہم کیوں نہ مانیں کہ اللہ ہی دنیا بھر کے باغوں ' کھیتوں اور ہرے بھرے جنگلوں کا خالق ہے اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ وہ نباتات کا خالق ہے تو جمادات ' حیوانات ' انسانوں ' جنوں اور فرشتوں اور ساری کائنات کا بھی وہی خالق ہے اور وہی عبادت کا مستحق ہے۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

اللہ کا حق ادا کرو اور فضول خرچی نہ کرو

یعنی جو غلے اور پھل حق تعالیٰ نے پیدا فرمائے ہیں ان کے کھانے سے بدون سند کے مت رکو ہاں دو باتوں کا خیال رکھو، ایک یہ کہ کاٹنے اور اتارنے کے ساتھ ہی جو اللہ کا حق اس میں ہے وہ ادا کر دو۔ دوسرے فضول اور بے موقع خرچ مت کرو۔ اللہ کے حق سے یہاں کیا مراد ہے اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، ابن کثیر کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابتداء مکہ معظّمہ میں کھیتی اور باغ کی پیداوار میں سے کچھ حصہ نکالنا واجب تھا جو مساکین و فقراء پر صرف کیا جائے۔ مدینہ طیبہ پہنچ کر ۳ ھجری میں اس کی مقدار وغیرہ کی تعیین و تفصیل کر دی گئی۔ یعنی بارانی زمین کی پیداوار میں (بشرطیکہ خراجی نہ ہو) دسواں حصہ اور جس میں پانی دیا جائے بیسواں حصہ واجب ہے۔

حضرت ثابت بن قیس کا خرچ کرنا

ثابت ابن قیس نے اپنے درخت خرما کے پھل اتارے اور کہہ دیا کہ آج جو بھی میرے پاس لینے آئے گا اس کو دوں گا، حتیٰ کہ اتنے لوگ آ کر لے گئے کہ ایک بھی پھل ان کے لیے باقی نہ رہا۔ چنانچہ یہ آیت اتری کہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا

صحیحین میں حضرت طلحہ بن عبداللہ کی روایت سے آیا ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام کے متعلق دریافت کرنے لگا۔ حضور ﷺ نے پانچ نمازوں کا ماہ رمضان کے روزوں کا اور زکوٰۃ کا ذکر فرمایا اس شخص نے عرض کیا کیا مجھ پر اس کے علاوہ بھی کچھ (لازم) ہوگا فرمایا نہیں۔ ہاں اگر تو اپنی خوشی سے (کچھ اور کار خیر اور نفل عبادت وغیرہ) کرے تو خیر۔

نفلی صدقہ کرنے میں کیا چیز اسراف ہے اور کیا نہیں

نیز اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے اور بے جا خرچ نہ کرو بیشک بے جا خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔
اہل لغت کے اسراف میں دو قول ہیں۔ ابن الاعرابی نے کہا حد سے تجاوز کرنا اسراف ہے اور شمر نے کہا مال کو لغو اور بے فائدہ کاموں میں خرچ کرنا اسراف ہے۔ (لسان العرب ' ج ۹ ' ص ۱۴۸ ' مطبوعہ ایران)
انسان جب اپنا مال صدقہ کر دے اور اپنے اہل و عیال کے لیے کچھ نہ چھوڑے تو یہ بھی اسراف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
(آیت) "ولا تبسطها كل البسط فتقعد ملوما محسورا"۔ (الاسراء: ۲۹)

ترجمہ: اور نہ اپنا ہاتھ پوری طرح کھول دے کہ بیٹھا رہے ملامت کیا ہوا تھکا ہارا۔
ابن جریج نے کہا یہ آیت ثابت بن قیس بن شماس کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ انھوں نے اپنے درخت سے کھجوریں توڑیں اور کہا آج جو شخص بھی آئے گا میں اس کو کھلاؤں گا پھر وہ لوگوں کو کھجوریں کھلاتے رہے حتی کہ شام ہو گئی اور ان کے پاس ایک کھجور بھی باقی نہیں بچی۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی کہ بے جا خرچ نہ کرو ' بیشک اللہ بے جا خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا
(جامع البیان ' جز ۸ ص ۸۱ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت ۱۴۱۵ھ)
حضرت حکیم بن حزام (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بہترین صدقہ وہ ہے جو خوشحالی کی حالت میں دیا جائے اور اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے اور صدقہ کی ابتداء اپنے عیال سے کرو۔
(صحیح مسلم ' الزکوٰۃ ۹۵ ' (۱۰۳۴) ۲۳۴۸ ' سنن النسائی ' ج ۵ ' رقم الحدیث : ۲۵۴۳ ' صحیح البخاری ' ج ۶ ' رقم الحدیث : ۵۳۵۶)
حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: افضل صدقہ وہ ہے جو خوشحال چھوڑے ' اوپر والا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہے۔ صدقہ کی ابتداء اپنے عیال سے کرو ' بیوی کہے گی مجھے کھلاؤ یا مجھے طلاق دو ' نوکر کہے گا مجھے کھلاؤ اور مجھ سے کام لو ' بیٹا کہے گا مجھے کھلاؤ مجھے کس پر چھوڑتے ہو؟
(صحیح البخاری ج ۶ ' رقم الحدیث : ۵۳۵۵ ' مسند احمد ج ۲ ' ص ۲۴۵ ' المنتقی ' رقم الحدیث : ۷۵۱ ' مسند القضاعی ' رقم الحدیث : ۱۲۳۲)
حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے اصحاب سے فرمایا صدقہ کرو ' ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرے پاس ایک دینار ہے آپ نے فرمایا اس کو اپنے نفس پر خرچ کرو۔ اس نے کہا میرے پاس ایک اور دینار ہے آپ نے فرمایا اس کو اپنی بیوی پر خرچ کرو اس نے کہا میرے پاس ایک اور دینار ہے۔ آپ نے فرمایا اس کو اپنی اولاد پر خرچ

کرو۔اس نے کہا میرے پاس ایک اور دینار ہے۔آپ نے فرمایا تم کو زیادہ معلوم ہے یعنی تم کو زیادہ معلوم ہے تمہارے رشتہ داروں میں کون زیادہ ضرورت مند ہے؟اس کو دو۔

(سنن ابو داؤد ٗ ج ۲ ٗ رقم الحدیث : ۱۶۹۱ ٗ سنن النسائی ج ۵ ٗ رقم الحدیث : ۲۵۳۴ ٗ مسند الشافعی ٗ ج ۲ ٗ ص ۶۴۔۶۳ ٗ مسند احمد ٗ ج ۲ ٗ ص ۴۷۱ ٗ ۲۵۱ ٗ صحیح ابن حبان ٗ ج ۸ ٗ رقم الحدیث : ۳۳۳۸ ٗ المستدرک ٗ ج ا ص ۴۱۵ ٗ سنن کبری للبیہقی ٗ ج ۷ ص ۴۶۶)

حضرت طارق محاربی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کھڑے ہو کر لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا دینے والے کا ہاتھ بلند ہوتا ہے اور صدقہ کی ابتداء اپنے عیال سے کرو۔اپنی ماں ٗ اپنے باپ ٗ اپنی بہن اور اپنی بھائی کو دو۔پھر جو تمہارے زیادہ قریب ہوں اور جو ان سے قریب ہوں۔

(سنن النسائی ٗ ج ۵ ٗ رقم الحدیث : ۲۵۳۱ ٗ صحیح ابن حبان ٗ ج ۸ ٗ رقم الحدیث : ۳۳۴۱ ٗ سنن دار قطنی ٗ ج ۳ ٗ رقم الحدیث : ۲۹۵۷ ٗ مصنف ابن ابی شیبہ ٗ ج ۳ ص ۲۱۲ ٗ المعجم الکبیر ٗ ج ۸ ٗ رقم الحدیث : ۸۱۷۵ ٗ سنن کبری للبیہقی ٗ ج ۸ ص ۳۴۵ ٗ مسند احمد ٗ ج ۳ ص ۶۴)

ان احادیث میں ماں باپ اور بیوی بچوں پر جو صدقہ کی ابتداء کرنے کا حکم ہے اس سے مراد صدقہ نفلیہ ہے ٗ کیونکہ صدقہ واجبہ کو ان پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔جس شخص کا دل مضبوط ہو اور اس کا نفس مستغنی ہو ٗ اور وہ اللہ تعالیٰ پر متوکل ہو اور وہ اکیلا ہو ٗ اس پر ماں باپ ٗ بیوی ٗ بچوں اور بہن بھائیوں کی ذمہ داری اور ان کی پرورش کا بار نہ ہو اور وہ مالی حقوق سے متعلق اللہ تعالیٰ کے تمام فرائض ادا کرچکا ہو تو وہ اگر اللہ کی راہ میں اپنا سارا مال خرچ کردے تو یہ جائز ہے اور اسراف نہیں ہے۔

امام عبدالرحمٰن بن محمد بن ادریس رازی ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں :

مجاہد نے کہا اگر تم ابو قبیس (ایک پہاڑ) کے برابر سونا بھی اللہ کی اطاعت میں خیرات کردو تو یہ اسراف نہیں ہے اور اگر تم ایک صاع (چار کلو) بھی اللہ کی معصیت میں خرچ کرو تو یہ اسراف ہے۔(رقم الحدیث : ۷۹۶۴)

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ٗ ج ۵ ٗ ص ۱۳۹۹ ٗ مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الریاض ٗ ۱۴۱۷ ھ)

امام ابوالشیخ نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ ابو بشر نے بیان کیا کہ لوگوں نے ایاس بن معاویہ سے پوچھا اسراف کیا ہے؟انھوں نے کہا جب تم اللہ کے حکم سے تجاوز کرو تو یہ اسراف ہے۔سفیان بن حسین نے کہا جب تم اللہ کے حکم میں کمی کرو تو یہ اسراف ہے۔(در منثور ٗ ج ۳ ٗ ص ۳۶۹ ٗ مطبوعہ دارالفکر بیروت ٗ ۱۴۱۴ ھ) (تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

پھلوں اور کھیتوں کا عشر

حضرت معاذ بن جبل اور ابن عمر اور جابر بن عبداللہ (رض) کی روایت سے تمام کتب حدیث میں منقول ہے ماسقت السماء ففیہ العشر وماسقی بالسانیۃ فنصف العشر، یعنی بارانی زمینوں میں جہاں آبپاشی کا کوئی سامان نہیں صرف بارش پر پیداوار کا مدار ہے، ان زمینوں کی پیداوار کا دسواں حصہ بطور زکوۃ نکالنا واجب ہے، اور جو زمین کنوؤں سے سیراب کی جاتی ہیں ان کی پیداوار کا انیسواں حصہ واجب ہے۔

قانون زکوٰۃ

قانون زکوۃ میں شریعت اسلام نے ہر قسم کی زکوۃ میں اس بات کو بنیادی اصول کے طور پر استعمال کیا ہے، کہ جس پیداوار میں محنت اور خرچ کسی پیداوار پر بڑھتا جاتا ہے اتنی ہی زکوۃ کی مقدار کم ہوتی جاتی ہے، مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اگر کسی کو کوئی قدیم خزانہ مل جائے، یا سونے چاندی وغیرہ کی کان نکل آئے تو اس کا پانچواں حصہ بطور زکوۃ کے اس کے ذمہ لازم ہے، کیونکہ محنت اور خرچ کم اور پیداوار زیادہ ہے، اس کے بعد بارانی زمین کا نمبر ہے، جس میں محنت اور خرچ کم سے کم ہے اس کی زکوۃ پانچویں حصہ سے آدھی یعنی دسواں حصہ کر دیا گیا، اس کے بعد وہ زمین ہے جس کو کنویں سے یا نہری پانی خرید کر اس سے سیراب کیا جاتا ہے، اس میں محنت اور خرچ بڑھ گیا تو زکوۃ اس سے بھی آدھی کر دی گئی، یعنی بیسواں حصہ، اس کے بعد عام نقد سونا یا چاندی اور مال تجارت ہے، جن کے حاصل کرنے اور بڑھانے پر خرچ بھی کافی ہوتا ہے اور محنت بھی زیادہ، اس لیے اس کی زکوۃ اس کی آدھی یعنی چالیسواں حصہ کر دیا گیا۔
تجارتی اموال اور مویشی کے لیے تو رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نصاب بیان فرمادیا، کہ ساڑھے باون تولہ چاندی سے کم میں زکوۃ نہیں، چالیس بکریوں، پانچ اونٹوں سے کم میں زکوۃ نہیں، لیکن پیداوار زمین کے متعلق جو بیان اوپر کی حدیث میں آیا ہے اس میں کوئی نصاب نہیں بتلایا گیا، اس لیے ہر قلیل و کثیر سے زمین کی زکوۃ یعنی دسواں یا بیسواں حصہ نکالنا واجب ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

آخر آیت میں فرمایا (آیت) وَلَا تُسْرِفُوْا ۭاِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ، یعنی حد سے زائد خرچ نہ کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ فضول خرچ لوگوں کو پسند نہیں کرتے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں اگر کوئی شخص اپنا سارا مال بلکہ جان بھی خرچ کر دے تو اس کو اسراف نہیں کہا جاسکتا، بلکہ حق کی ادائیگی کہنا بھی مشکل ہے، پھر اس جگہ اسراف سے منع کرنے کا کیا مطلب ہے؟ جواب یہ ہے کہ کسی خاص شعبہ میں اسراف کا نتیجہ عادۃً دوسرے شعبوں میں قصور و کوتاہی ہوا کرتا ہے، جو شخص اپنی خواہشات میں بے دریغ حد سے زائد خرچ کرتا ہے وہ عموماً دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کیا کرتا ہے، یہاں اسی کوتاہی سے روکا گیا ہے، یعنی ایک طرف کوئی آدمی اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں لٹا کر خالی ہو بیٹھے تو اہل و اولاد اور رشتہ داروں بلکہ خود اپنے نفس کے حقوق کیسے ادا کرے گا، اس لیے ہدایت یہ کی گئی کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے میں بھی اعتدال سے کام لے تاکہ سب حقوق ادا ہو سکیں۔
میں کہتا ہوں سارا مال دینا اس وقت ممنوع اور اسراف قرار پائے گا جب اپنے متعلقین اور بال بچوں کی حق تلفی کی ہو اور حق داروں کے حقوق نہ دیئے ہوں مستحقین کے حقوق ادا کرنے کے بعد اگر بقیہ سارا مال اللہ کی راہ میں دے دے تو یہ اسراف نہیں بلکہ افضل ہے کذا قال الزجاج۔
رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا اگر میرے پاس (کوہ) احد کے برابر سونا ہو تو مجھے اس سے خوشی ہوگی کہ تین رات بھی اس میں سے میرے پاس سوائے اتنی مقدار کے جس کو میں قرض کی ادائیگی کے لیے روک لوں اور کچھ باقی نہ رہے۔ رواہ البخاری۔

پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرنا

ایک بار حضرت ابوذر (رض) نے حضرت عثمان (رض) سے داخلہ کی اجازت چاہی حضرت عثمان (رض) نے اجازت دے دی حضرت ابوذر (رض) لاٹھی ہاتھ میں لیے اندر پہنچ گئے۔ حضرت عثمان (رض) نے فرمایا عبدالرحمٰن (رض) بن عوف نے اپنے بعد کچھ مال ترکہ میں چھوڑا ہے کعب بتاؤ اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے حضرت کعب (رض) نے کہا اگر اس میں اللہ کا حق پہنچتا ہے تو کوئی ہرج نہیں۔ یہ سنتے ہی ابو ذر (رض) نے لاٹھی اٹھا کر کعب (رض) کے ماری اور بولے میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا تھا آپ فرمارہے تھے اگر میرے پاس اس پہاڑ کے برابر سونا ہو اور میں اللہ کی راہ میں اس کو خرچ کردوں اور اللہ قبول فرمالے تو مجھے پسند نہیں کہ اس میں سے چھ اوقیہ بھی اپنے بعد چھوڑ کر جاؤں عثمان (رض) میں تم کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم نے بھی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ حدیث سنی ہے۔ حضرت ابوذر (رض) نے یہ سوال تین بار کیا۔ حضرت عثمان (رض) نے فرمایا۔ ہاں۔ رواہ احمد۔

خرچ کرو اور اللہ سے کمی کا اندیشہ نہ کرو

حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت بلال (رض) کے پاس تشریف لے گئے بلال کے پاس اس وقت چھواروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پوچھا بلال (رض) یہ کیا ہے۔ بلال نے عرض کیا میں نے کل کے لیے رکھ چھوڑا ہے فرمایا کیا تم کو ڈر نہیں لگتا کہ اس (ذخیرہ) کی بھاپ (گھٹن) دوزخ کے اندر کل تم کو محسوس ہو گی۔ بلال (رض) خرچ کر اور عرش والے کی طرف سے کمی کرنے کا اندیشہ نہ کر۔ (بیہقی فی شعب الایمان۔)

افضل صدقہ

حضرت ابوہریرہ (رض) نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کون سا صدقہ (خیرا) سب سے اعلیٰ ہے فرمایا تنگدست کی محنت کی کمائی سے بقدر طاقت (خیرات کرنی سب سے) افضل ہے اور دینا شروع اپنے عیال سے کرو۔ رواہ ابو داؤد۔ (تفسیر گلدستہ)

زیتون

Olive (انگریزی، فرانسیسی، جرمن)

Oliva (روسی، لاطینی)

زیتون (عربی، فارسی، ہندی، اردو، پنجابی)

zayit , Zaith (عبرانی)

نباتاتی نام: Ole ae uropae a Linn.

قرآنی آیات بسلسلہ زیتون:

۱۔ سورۃ الانعام آیت: 100 ۲۔ سورۃ الانعام آیت: 142 ۳۔ سورۃ النحل آیت: 11 ۴۔ سورۃ المومنون آیت: 20 ۴۔ سورۃ التین آیت: 2

زیتون کا ذکر قرآن پاک میں اس کے نام سے چھ بار آیا ہے اور ایک مرتبہ سورۃ المومنون، آیت: ۲۰ اس کی جانب یہ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے طور سینا کے اطراف ایک ایسا درخت پیدا کیا ہے جس میں ایسا تیل ہوتا ہے جو سالن کے کام آتا ہے۔

زیتون کا نباتاتی نام (Oleaeuropaea) ہے۔ یہ ایک چھوٹا درخت ہے جس کی اونچائی اوسطاً ۲۵ فٹ ہوتی ہے۔ اس کی پیداوار قلم لگا کر ہوتی ہے کیونکہ بغیر قلم لگائے ہوئے پودے اچھے پھل نہیں دیتے ہیں۔ اس کے کچے پھل چٹنی اور اچار کے کام میں لائے جاتے ہیں، جبکہ پکے ہوئے پھل انتہائی شیریں اور لذیذ ہوتے ہیں۔ یہ بیضاوی شکل کے ۲ سے ۳ سنٹی میٹر لمبے ہوتے ہیں ان کے گودے میں پندرہ سے چالیس فیصد تک تیل ہوتا ہے جو اپنی خصوصیات اور صاف و شفاف ہونے میں بے مثال مانا جاتا ہے۔ دل کے امراض میں زیتون کا تیل سود مند ثابت ہوتا ہے۔

زیتون کا اصل وطن فلسطین اور شام کا وہ علاقہ ہے جو فینی شیا (Phoenicia) کہلاتا ہے۔ یہیں اس کی کاشت تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح شروع کی گئی اور اسی خطہ سے یہ پودہ مغرب اور مشرق کے ممالک میں لے جایا گیا۔ زیتون کی وطنیت (Nativity) کا حوالہ قرآن کریم کی سورۃ النور کی آیت ۳۵ میں دیا گیا ہے جس میں ارشاد ہوا ہے

"ایک مفید درخت زیتون ہے جو نہ پورب کا ہے نہ پچھم کا۔"

زیتون کے باغات جنوبی یورپ، شمالی افریقہ اور عرب کے کئی ممالک میں ملتے ہیں، لیکن اسپین اور اٹلی زیتون کے پھل اور تیل پیدا کرنے میں سرفہرست ہیں۔ روغن زیتون کی عالمی پیداوار تین ملین میٹرک ٹن سے بھی زیادہ بتائی جاتی ہے۔ روغن زیتون چراغ کی روشنی کے لیے زمانہ قدیم سے بڑا مشہور اور بڑا اہم رہا ہے۔ عمدہ قسم کا تیل نہایت شفاف ہوتا ہے۔ اسے اگر کسی صاف برتن یا گلاس یا گلاس کی قندیل میں رکھ دیا جائے تو ایسا محسوس ہوگا کہ کوئی شے ہے جو خود ہی روشن ہے اور اگر اس سے چراغ جلایا جائے تو ایسا لگے گا کہ گویا نور سے نور نکل رہا ہے۔ اسی حقیقت کی منظر کشی سورۃ النور آیت ۳۵ میں کی گئی ہے اور روغن زیتون سے روشن قندیل کی روشنی کو "نور علی نور" کہا گیا ہے۔

انار

قرآنی نام: رُمَّانٌ

دیگر نام:

Pomegranate (انگریزی)

Granade (فرانسیسی)

Granat (روسی)

Granatapfel (جرمن)

Punicum (لاطینی)

Me lagrana (اطالوی)

Rimmon (عبرانی)

Granada (ہسپانوی)

Roa (یونانی)

(سنسکرت) تیلگو

داون (کشمیری)

رمان (عربی)

انار (فارسی، اردو، ہندی، پنجابی)

نباتاتی نام :

Punica granatum linn. (Family: punicaceae)

قرآنی آیات بسلسلہ انار :

(ا) سورۃ الانعام آیت : 100 (۲) سورۃ الانعام آیت : 142 (۳) سورۃ الرحمٰن آیت : 69,68

انار کا ذکر 'رمان' کے نام سے قرآن حکیم میں تین بار آیا ہے اور تینوں بار انسان کو اہم نصیحتیں کی گئی ہیں۔ مثلاً سورۃ الانعام کی آیت : 142 میں حکم ہوا کہ کھجور، زیتون اور انار وغیرہ کی جب فصلیں کاٹی جائیں تو فوراً اس میں سے ایک حصہ حقدار کو دے دیا جائے اس طرح اشارہ کیا گیا قدرت کی نعمتیں عام انسانوں کے لیے بھی ہیں جو لوگ باغ کے پھلوں کو اور کھیت کی پیداوار کو اپنے لیے مخصوص رکھنا چاہتے ہیں اور دوسروں کی حق تلفی کرتے ہیں وہ اللہ کی نظر میں ناپسندیدہ انسان ہیں۔ قرآن کا یہ ارشاد سماج میں اجارہ داری اور سرمایہ داری کو نامناسب قرار دیتا ہے۔ نباتاتی سائنس کی رو سے انار کا نام Pumigranatum ہے۔ انار کے دانوں کا رس ایک ہلکی اور فرحت انگیز غذا ہے جو دل کے امراض میں بہت سود مند ہے میٹھا انار قبض کشا ہوتا ہے جبکہ تھوڑی سی کھٹاس والے انار کے دانے معدہ کے ورم اور دل کے لیے لاجواب دوا اور ٹانک ہیں ان دانوں سے تیار کیا گیا شربت Dyspepsia جیسے معدہ کی روگوں کو فائدہ دیتا ہے۔ اسہال یا پیچش میں مبتلا مریضوں کے لیے پچاس گرام انار کا رس ایک بہترین علاج بھی ہے اور کمزوری رفع کرنے کا طریقہ بھی۔ قلّت خون، یرقان، بلڈ پریشر، بواسیر اور ہڈیوں وجوڑوں کے درد میں انار کے طبّی فوائد طب یونانی آیورویدک اور ایلوپیتھی میں بھی تسلیم کیے گئے ہیں۔ شہد کے ساتھ انار رس Biliousness میں کمی لاتا ہے۔

انار کا پھل دل و دماغ کو فرحت اور تازگی بخشتا ہے۔ انار کی جڑ کی چھال ایک ایسی بے مثال دوا ہے جسے پانی میں ابال کر مریض کو پلانے سے Tape worm سمیت پیٹ کے کیڑے ختم ہو جاتے ہیں۔ بعض تحقیقات سے معلوم ہوا ہے اس کا ابلا ہوا پانی ٹی بی اور پرانے بخار کو ختم کرنے

میں موثر ثابت ہوا ہے۔ مزید براں ملیریا کے بعد کی کمزوری کو بھی دور کرتا ہے۔ بعض نسوانی امراض میں انار کی جڑ کی چھال کا استعمال ایک حتمی علاج سمجھا جاتا ہے۔

انار کے پھولوں سے ایک لال رنگ حاصل کیا جاتا ہے جو غذائی اشیاء میں استعمال ہو سکتا ہے انار کے پھول اسقاط حمل کو روکنے کی بھی دوا ہیں۔ انار کے پھل کا چھلکا بھی طبّی اہمیت کا حامل ہے۔ دودھ میں چھلکا ابال کر پلانے سے پرانی پیچش کے مریض کو فوراً افاقہ ہوتا ہے۔ یہ چھلکا تجارتی طور پر بھی بڑے کام کی چیز ہے کیونکہ اس میں بیس فیصد سے زیادہ (رض) annin ہوتا ہے اس لیے کچے چمڑے کو پکانے کے لیے ان چھلکوں کا استعمال بڑے پیمانے پر افریقہ کے کچھ ملکوں میں کیا جاتا ہے۔ مراکش اور اسپین کا جو چمڑا کسی زمانے میں بہت مشہور تھا اس کی (رض) anning انار کے چھلکوں سے کی جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت کردہ نعمتوں میں انار بھی ایک بڑی نعمت ہے جس کی بابت خدائے برتر فرماتا ہے:

(فِیْہِمَا فَاکِہَۃٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ فَبِاَیِّ آلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ) [الرحمٰن: ٦٨]

”ان دونوں میں میوے ہوں گے اور کھجور اور انار۔ تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔“

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

آیت مبارکہ:

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ۭ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ١٤٢

لغۃ القرآن: وَمِنَ: اور میں سے] [الْاَنْعَامِ: جانوروں کے] [حَمُوْلَةً: بوجھ اٹھانے والے] [وَّفَرْشًا: اور زمین سے لگے ہوئے] [كُلُوْا: تم سب کھاؤ] [مِمَّا: "اس" سے جو] [رَزَقَكُمُ: رزق دیا تم کو] [اللّٰهُ: اللہ] [وَلَا: اور نہ] [تَتَّبِعُوْا: تم سب پیری کرو] [خُطُوٰتِ: قدم] [الشَّيْطٰنِ: شیطان] [اِنَّهٗ: بیشک یہ حقیقت ہے] [لَكُمْ: تمہارے لیے] [عَدُوٌّ: دشمن ہے] [مُّبِيْنٌ: کھلا]

ترجمہ : اور (اس نے) بار برداری کرنے والے (بلند قامت) چوپائے اور زمین پر (ذبح کے لیے یا چھوٹے قد کے باعث) بچھنے والے (مویشی پیدا فرمائے)، تم اس (رزق) میں سے (بھی بطریق ذبح) کھایا کرو جو اللہ نے تمہیں بخشا ہے اور شیطان کے راستوں پر نہ چلا کرو، بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے

تشریح:

عالم نباتات میں اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کی آیات بینات کا ملاحظہ کرانے کے بعد اب حق کے متلاشی کی توجہ مختلف حیوانات کی طرف مبذول کرائی جارہی ہے۔ حمولۃ سے مراد وہ بڑے بڑے جانور ہیں جو سواری اور بوجھ لادنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ہاتھی، گھوڑے، اونٹ وغیرہ اور فرش سے مراد وہ جانور ہیں جنہیں فرش پر لٹا کر ذبح کیا جاتا ہے اور ان کا گوشت کھایا جاتا ہے یا دودھ دوہا جاتا ہے۔**وقال ابن زید الحمولۃ ما یر کب والفرش ما یؤ کل لحمہ ویحلب** (قرطبی) ہر جانور کی شکل و صورت، قد و قامت، خوراک اور عادات بالکل جدا جدا ہیں۔ اپنی بے پناہ قوت اور اجڈ پن کے باوجود انھیں انسان کا مطیع بنادیا گیا ہے تاکہ وہ اس کا سامان اٹھا کر دور دراز کی مسافتوں تک لے جائیں۔ اور اس کی ہر طرح کی خدمت بجالائیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

مویشیوں کے وجود میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی مزید رحمتوں اور برکتوں کا بیان فرمایا ہے کہ اس نے سواری اور بوجھ لادنے کے لیے بڑے بڑے اور قد آور جانور پیدا کیے جیسے گھوڑے 'اونٹ 'بیل اور بھین سے وغیرہ 'اور چھوٹے جانور پیدا کیے جن پر زمین پر بچا کر ذبح کیا جاسکتا ہے 'جیسے بھیڑ 'بکری 'اور دنبے وغیرہ 'ان جانوروں سے دودھ حاصل کیا جاتا ہے جو ہماری غذائی ضرورت پورا کرتے ہیں اور ان سے اون بھی حاصل کیا جاتا ہے جو ہماری لباس کی ضرورت پورا کرتے ہیں 'جیسا کہ ان آیات میں فرمایا ہے :

(آیت) "**اولم یروا انا خلقنا لھم مما عملت ایدینا انعاما فھم لھا مالکون، وذللنھا لھم فمنھا رکوبھم ومنھا یاکلون، ولھم فیھا منافع ومشارب افلا یشکرون**"۔ (یسین : ۷۳۔۷۱)

ترجمہ : کیا انھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے اپنے دست قدرت سے ان کے لیے مویشی پیدا کیے جن کے وہ مالک ہیں 'اور ہم نے ان مویشیوں کو ان کے تابع کر دیا 'سو وہ بعض پر سواری کرتے ہیں اور بعض کو وہ کھاتے ہیں 'اور ان کے لیے ان مویشیوں میں بہت فائدے ہیں اور پینے کی چیزیں ہیں تو کیا وہ شکر نہیں کرتے۔

(آیت) "**وان لکم فی الانعام لعبرۃ نسقیکم مما فی بطونہ من بین فرث ودم لبنا خالصا سآئغا للشربین**"۔ (النحل : ۱۶)

ترجمہ : اور بیشک مویشیوں میں تمہارے لیے مقام غور ہے 'ہم تمہیں اس چیز سے پلاتے ہیں جو ان کے پیٹوں میں ہے 'گوبر اور خون کے درمیان سے پینے والوں کے لیے خالص خوشگوار دودھ۔

پھر اللہ تعالیٰ نے جس طرح غلہ جات اور پھلوں سے کھانے کا حکم دیا تھا اسی طرح اب ان مویشیوں سے کھانے اور ان کا دودھ پینے کا حکم دیا۔
خلاصہ یہ ہے کہ درخت اور کھیت ہوں یا مویشی 'سب کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے منافع اور فوائد کے لیے پیدا فرمایا ہے 'سو اس کو چاہیے کہ ان سے نفع حاصل کرے اور شیطان کے قدموں پر نہ چلے 'کیونکہ شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے 'جیسا کہ ان آیتوں میں ارشاد ہے :

(آیت) "ان الشیطان لکم عدو فا تخذوہ عدوا انما یدعوا حزبہ لیکونوا من اصحب السعیر"۔ (فاطر : ٦)

ترجمہ : بیشک شیطان تمہارا دشمن ہے سو تم بھی اس کو دشمن ہی بنائے رکھو 'وہ اپنے گروہ کو اس لیے بلاتا ہے کہ وہ دوزخ والے ہو جائیں۔

(آیت) "انما یامرکم بالسواء والفحشآء وان تقولوا علی اللہ مالا تعلمون"۔ (البقرہ : ١٦٩)

ترجمہ : شیطان تم کو صرف برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور اللہ کے متعلق ایسی بات کہنے کا جس کو تم نہیں جانتے۔

(تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی)

خلاصہ مفہوم یہ ہے کہ چوپائے دو قسم کے ہیں کچھ بڑے جو بوجھ اٹھانے کے کام آتے ہیں کچھ چھوٹے مثل بکری وغیرہ کے جو اس قابل نہیں کہ بوجھ اٹھا سکیں ان میں سے جو اللہ تعالیٰ نے حلال کئے وہ کھائے جاتے ہیں اور اہل جاہلیت کی طرح اللہ عزوجل کی حلال کی ہوئی حرام نہیں ٹھہرائی جاتیں۔ پھر اسے مزید واضح کرنے کو مثال میں بھیڑ بکری کا ذکر فرمایا کہ ان کے نر اور مادہ اللہ تعالیٰ نے حلال کئے اور ان کی اولادیں بھی حلال کیں تم نے کبھی نر حرام ٹھہرایا۔ کبھی مادہ کبھی ان کے بچے یہ سب تمہاری اختراع وافتراء ہے اور خواہش نفسانیہ کی اتباع۔ یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی حلال چیز کسی کے حرام کرنے سے حرام نہیں ہو جاتی اور حرام چیز کسی کے حلال بنانے سے حلال نہیں ہو سکتی۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل جاہلیت کو توبیخ کی گئی جو اپنی رائے سے حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھہرا لیتے تھے جب ہادی رحمت نے احکام بیان فرمائے تو مشرکین کفار کا سردار وخطیب مالک بن عوف جشمی حضور انور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ عالی میں حاضر آیا اور کہنے لگا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ ان چیزوں کو حرام کرتے ہیں جو ہمارے باپ دادا حلال بتا گئے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ تم لوگوں نے چند قسمیں چوپایوں کی حرام کر رکھی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے آٹھ نر مادہ۔ اپنے بندوں کے لیے حلال فرما دیئے ہیں۔ تم بتاؤ تم نے انھیں کھانے سے حرام کیا ان میں حرمت نر کی طرف سے آئی یا مادہ کی طرف سے۔ مالک بن عوف یہ جواب سن کر متحیر ہی رہ گیا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بول اور جلدی بتا۔ اس نے کہا آپ فرمائیں میں سنوں گا اور کچھ جواب نہ دے سکا۔ اور ظاہر ہے کہ وہ جواب دیتا بھی کیا اگر کہتا نر کی طرف سے حرمت آئی تو لازم آتا کہ تمام نر حرام ہوں اور اگر کہتا کہ مادہ کی طرف سے یہ حرمت آئی تو لازم آتا کہ تمام مادہ حرام ہوں اور اگر کہتا کہ جو پیٹ میں ہے وہ حرام ہے تو پھر سب ہی حرام ہو جاتے۔

غرضیکہ یہ الزامات ان کی انکار نبوت کی وجہ میں ان پر پڑے اوا اگر شرکاء کی تبلیغ تسلیم کر لیتے تو ہر حکم بواسطہ نبی (علیہ السلام) ہونے کی بناء پر ہوتا۔ تو اس میں آئندہ آنے والی آیات کا جواب بھی واضح ہو گیا۔ آگے ارشاد ہے۔ آپ فرمائی کیا اس نے دونوں نر حرام کئے یا دونوں مادہ یا وہ جسے دونوں مادہ پیٹ میں لیے ہیں یہ استفہام انکاری ہے۔ (تفسیر الحسنات۔علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)

امام ابو بکر جصاص (رح) فرماتے ہیں کہ ان کو "فرشا" اس لئے کہا گیا ہے کہ ان کے چمڑے اور بالوں سے مصلی وغیرہ بنا کر زمین پر بچھایا جاتا ہے، بالوں سے کپڑا بنا کر کمبل کے طور پر لیا جاتا ہے اور پہننے کے کام بھی آتا ہے کھال کو رنگ کرنے کے بعد فرش پر بچھایا جاتا ہے، اس کے علاوہ چونکہ یہ جانور ذبح کے وقت زمین پر لٹا دیے جاتے ہیں، لہٰذا "فرشا" کہنے کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے، دنیا میں ہر روز لاکھوں، کروڑوں بھیڑ بکریاں ذبح کر دی جاتی ہیں جو کہ انسانوں کے لئے نہایت طاقتور غذا کا کام دیتی ہیں یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔

کلوا مما رزقکم اللہ: جو رزق تمہیں اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اسے کھاؤ یہ رزق خواہ کھیتی کی شکل میں ہو یا پھلوں کی صورت میں یا جانوروں کی شکل میں اسے استعمال کرو، کیونکہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے پیدا فرمائی ہیں، البتہ ان کے کھانے میں اور دوسری ضرورتوں میں فضول خرچی نہ کرو۔

ان انعاموں کے جائز استعمال پر کوئی پابندی نہیں، البتہ شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، شیطان کے نقش قدم پر چلنا اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابندی کو چھوڑ دینا ہے، جو شخص شریعت پر عمل کرنے کے بجائے اپنی خواہشوں کی پیروی کرتا ہے رسم ورواج کے پیچھے چلتا ہے وہ حقیقت میں شیطان کی پیروی کرتا ہے، شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے وہ انسان کو مرتے دم تک بہکانے کی کوشش کرتا ہے وہ تمہیں ایمان سے دور کر کے گمراہی کے گڑھے میں دھکیلنا چاہتا ہے، لہٰذا تمھارا کام یہ ہے کہ اس سے ہمیشہ بچ کر رہو۔

جانوروں کے نر مادہ مل کر آٹھ جانور، یعنی: چار جوڑے ہیں، دو بھیڑوں کے اور دو بکریوں کے، اور دو جوڑوں کا ذکر آگے آئے گا، اب یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے نر کو حرام کیا یا مادہ کو یا ان کے بچوں کو اگر اس نے نہیں کیا تو تمہیں کیا حق ہے کہ ان میں سے کسی کو حرام یا حلال کرو۔

جانوروں کی دو باقی قسمیں

ارشاد ہے کہ مجھے بتاؤ ان جانوروں کے حرام ہونے کا علم تمہیں کیسے ہوا؟ کیونکہ علم کے لیے ثبوت کی ہے ضرورت ہے اگر تم سچے ہو تو بتاؤ تم سے اللہ تعالیٰ کے کس پیغمبر نے یہ کہا؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اونٹ کے نر مادہ اور گائے کے نر مادہ کے دو جوڑے بنائے ان کے بارے میں پوچھیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے نر حرام کئے یا ان کی مادہ یا ان کے پیٹ کے بچے، اگر کسی پیغمبر نے کہا ہو تو اس کا ثبوت لاؤ اور نہیں تو یہ بتلاؤ کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں حرام کیا تھا کیا تم خود اس وقت حاضر تھے اور تم نے اپنے جب ان میں سے سنا جب بات ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تو بتاؤ کہ اس آدمی سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھے اور جس کو اس نے حرام نہیں کیا اس کے بارے میں کہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حرام کیا ہے؟ آگے ارشاد ہے کہ جب ان کے کرتوتوں سے ثابت ہو گیا کہ یہ ہر طرح ظالم ہے اور انہیں سچی بات اور سیدھی راہ پر چلنے کی صلاحیت ہی نہیں، پھر ان کو ہدایت کیسے ہو؟ اللہ تعالیٰ نے تو یہ قاعدہ مقرر کر دیا ہے کہ وہ ان لوگوں کو جن میں ٹھیک کام کرنے کی صلاحیت نہیں انہیں ہدایت نہیں کرتے۔

اس آیت میں بہت وضاحت کے ساتھ ان لوگوں کی تردید کی گئی ہے جو اپنے گھڑے ہوئے حیلے بہانوں سے بغیر ثبوت کے چیزوں کو اپنے اوپر حلال یا حرام کر لیتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یقینی علم کے حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں کوئی معتبر آدمی بتائے یا خود سنے یا دیکھے اس لیے

قرآن مجید میں جو باتیں ہیں وہ یقینی ہیں کیونکہ اس کتاب کو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں سچا کہہ کر دیا ہے۔ (تفسیر ربانی)

آیت مبارکہ:

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝١٤٣

لغۃ القرآن: ثَمٰنِيَةَ :" پیدا کیں " آٹھ] [اَزْوَاجٍ : قسمیں] [مِنَ : سے] [الضَّاْنِ : بھیڑ] [اثْنَيْنِ : دو] [وَمِنَ : اور میں سے] [الْمَعْزِ : بکری] [اثْنَيْنِ : دو] [قُلْ : آپ کہہ دیں] [ءٰٓالذَّكَرَيْنِ : دونوں نر] [حَرَّمَ : حرام کردے گا] [اَمِ : یا] [الْاُنْثَيَيْنِ : دو عورتوں کے] [اَمَّا : رہا وہ] [اشْتَمَلَتْ : وہ مشتمل ہیں] [عَلَيْهِ : اس پر] [اَرْحَامُ : رحم] [الْاُنْثَيَيْنِ : دو عورتوں کے] [نَبِّـُٔوْنِيْ : خبر دو مجھے] [بِعِلْمٍ : کسی علم کے ساتھ] [اِنْ : اگر] [كُنْتُمْ : ہو تم] [صٰدِقِيْنَ : سب سچے]

ترجمہ: (اللہ نے) آٹھ جوڑے پیدا کئے دو (نر و مادہ) بھیڑ سے اور دو (نر و مادہ) بکری سے۔ (آپ ان سے) فرما دیجئے: کیا اس نے دونوں نر حرام کئے ہیں یا دونوں مادہ یا وہ (بچہ) جو دونوں ماداؤں کے رحموں میں موجود ہے؟ مجھے علم و دانش کے ساتھ بتاؤ اگر تم سچے ہو

تشریح:

ان دو آیات میں آٹھ مویشیوں کا ذکر ہے، چار نر یعنی مینڈھا، بکرا، اونٹ اور بیل اور چار مادہ یعنی بھیڑ، بکری، اونٹنی اور گائے۔ ان چاروں قسم کے نر اور مادہ مویشیوں کا گوشت کھانا حلال ہے۔ مشرکین عرب ان چار قسم کے مویشیوں میں سے بعض نر اور بعض مادہ بتوں کے نام وقف کر دیتے اور پھر عام لوگوں کے لیے ان پر سواری کرنا، بوجھ لادنا، ان کا گوشت کھانا اور دودھ پینا حرام ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پیارے نبی! آپ ان سے پوچھئے: اگر اللہ تعالیٰ نے نر مویشی حرام کئے ہیں تو تمہیں صرف مادہ کا گوشت کھانا چاہیے اور اگر مادہ مویشی حرام کئے ہیں تو صرف

نر کا گوشت کھانا چاہیے اور اگر مادہ کے پیٹ والا بچہ حرام کیا ہے تو نر اور مادہ دونوں مادہ کے پیٹ سے آتے ہیں، لہٰذا تمہیں ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں کھانا چاہیے۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے ان مویشیوں میں سے کسی کو حرام نہیں کیا اور ان کے حرام ہونے کی تمہارے پاس نہ تو کوئی علمی دلیل ہے اور نہ ہی تم اس وقت اللہ تعالیٰ کے پاس حاضر تھے جب اللہ تعالیٰ نے ان مویشیوں کے حرام ہونے کا کوئی حکم صادر فرمایا تو پھر بغیر کسی دلیل کے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان لگانا بہت بڑا ظلم ہے۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

ضان۔ ضائن کی جمع ہے۔ اون والی بھیڑ کو ضان کہتے ہیں۔ معز بالوں والی بکری یا بکرا۔ اول الذکرین سے مینڈھا یا بکرا مراد ہے۔ ما اشتملت علیہ ارحام الانثیین۔ سے بھیڑ بکری کے پیٹ کے بچے خواہ نر ہو یا مادہ اسی طرح الابل اور البقرہ دونوں کا اطلاق نر مادہ پر ہے۔ خلاصہ مفہوم یہ ہے کہ چوپائے دو قسم کے ہیں کچھ بڑے جو بوجھ اٹھانے کے کام آتے ہیں کچھ چھوٹے مثل بکری وغیرہ کے جو اس قابل نہیں کہ بوجھ اٹھا سکیں ان میں سے جو اللہ تعالیٰ نے حلال کئے وہ کھائے جاتے ہیں اور اہل جاہلیت کی طرح اللہ عزوجل کی حلال کی ہوئی حرام نہیں ٹھہرائی جاتیں۔ پھر اسے مزید واضح کرنے کو مثال میں بھیڑ بکری کا ذکر فرمایا کہ ان کے نر اور مادہ اللہ تعالیٰ نے حلال کئے اور ان کی اولادیں بھی حلال کیں تم نے کبھی نر حرام ٹھہرایا۔ کبھی مادہ کبھی ان کے بچے یہ سب تمہاری اختراع و افتراء ہے اور خواہش نفسانیہ کی اتباع۔ یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی حلال چیز کسی کے حرام کرنے سے حرام نہیں ہو جاتی اور حرام چیز کسی کے حلال بنانے سے حلال نہیں ہو سکتی۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل جاہلیت کو توبیخ کی گئی جو اپنی رائے سے حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھہرا لیتے تھے جب ہادی رحمت نے احکام بیان فرمائے تو مشرکین کفار کا سردار و خطیب مالک بن عوف جشمی حضور انور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ عالی میں حاضر آیا اور کہنے لگا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ ان چیزوں کو حرام کرتے ہیں جو ہمارے باپ دادا حلال بتا گئے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ السلام نے فرمایا کہ تم لوگوں نے چند قسمیں چوپایوں کی حرام کر رکھی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے آٹھ نر مادہ۔ اپنے بندوں کے لیے حلال فرمادیئے ہیں۔ تم بتاؤ تم نے انھیں کھانے سے حرام کیا ان میں حرمت نر کی طرف سے آئی یا مادہ کی طرف سے۔ مالک بن عوف یہ جواب سن کر متحیر ہی رہ گیا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بول اور جلدی بتا۔ اس نے کہا آپ فرمائیں میں سنوں گا اور کچھ جواب نہ دے سکا۔ اور ظاہر ہے کہ وہ جواب دیتا بھی کیا اگر کہتا نر کی طرف سے حرمت آئی تو لازم آتا کہ تمام نر حرام ہوں اور اگر کہتا کہ مادہ کی طرف سے یہ حرمت آئی تو لازم آتا کہ تمام مادہ حرام ہوں اور اگر کہتا کہ جو پیٹ میں ہے وہ حرام ہے تو پھر سب ہی حرام ہو جاتے۔ غرضیکہ یہ الزامات ان کی انکار نبوت کی وجہ میں ان پر پڑے اور اگر شرکاء کی تبلیغ تسلیم کر لیتے تو ہر حکم بواسطہ نبی (علیہ السلام) ہونے کی بناء پر ہوتا۔ تو اس میں آئندہ آنے والی آیات کا جواب بھی واضح ہو گیا۔ آگے ارشاد ہے۔ آپ فرمائیں کیا اس نے دونوں نر حرام کئے یا دونوں مادہ یا وہ جسے دونوں مادہ پیٹ میں لیے ہیں یہ استفہام انکاری ہے۔ (تفسیر الحسنات۔ علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)

دلیل دینا حرمت کا دعویٰ کرنے والے پر لازم ہے

اس سے معلوم ہوا کہ حلت کا دعویٰ کرنے والے سے دلیل نہ مانگی جائے گی بلکہ حرمت کا دعویٰ کرنے والے پر دلیل لانا لازم ہے۔ آج کل بدمذہب ہم سے ہر چیز کی حلت پر دلیل مانگتے ہیں اور خود حرمت کی دلیل نہیں پیش کرتے۔ یہ اصول قرآن کے صریح خلاف ہے۔ خود غور

کر لیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کے حرام ماننے والوں سے دلیل مانگی ہے یا حلال سمجھنے والوں سے۔

(تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری،نور)

ایک بات یہاں یہ سمجھ لی جائے کہ یہاں آیت میں مطلّقا جانوروں کی حلت و حرمت کا بیان نہیں ہے کہ جو یہ شبہ ہو کہ کیاان چار چیزوں کے علاوہ اور سب چیزیں حلال ہیں حالانکہ بعض اور جانور بھی حرام ہیں بلکہ یہاں ان چیزوں کے متعلق گفتگو ہے جن میں مسلمانوں اور مشرکین میں نزاع تھا اور جن میں پہلے کلام ہو رہا ہے یعنی وہ حرام تھیں اور مشرکین ان کو حلال جانتے تھے یا وہ حلال تھیں اور مشرکین ان کو حرام بتلاتے تھے تو اس آیت میں مذکورہ چار چیزوں کے علاوہ دوسری چیزوں کی حرمت دوسری آیات سے ثابت ہے یا حدیث سے دوسری چیزوں کا حرام ہونا ثابت ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اشیاء کی تحلیل و تحریم انسانی دماغ کا کام نہیں کسی کے اختراعی فیصلہ سے کوئی چیز حلال نہیں ہو جاتی نہ حرام بلکہ تحلیل و تحریم اشیاء کے لیے وحی ربانی اور فیصلہ الٰہی کا ہونا ضروری ہے،اس آیت میں اس طرف بھی لطیف اشارہ ہے کہ احکام الٰہی بغیر علت و مصلحت و فوائد کے نہیں ہوتے اور نہ کوئی حکم شرعی خلاف عقل و قیاس و مصلحت ہے۔ یہاں ان آیات میں ان چیزوں کو یان کیا گیا جن کی حرمت اصلی ہے آگے ان چیزوں کا بیان کیا گیا ہے جن کی حرمت اصلی نہیں بلکہ عارضی اور وقتی تھی یعنی بعض چیزیں وقتی مصلحت کی بناپر عارضی طور پر بعض قوموں پر حرام کی گئیں۔ دعا کیجئے ! اللہ تعالیٰ ہمیں اسلام اور ایمان کے راستہ پر قائم رکھیں اور استقامت نصیب فرماویں شریعت اسلامیہ اور قرآنی احکام کے مطابق ہمارے عقائد و اعمال رکھیں ،حلال کو حلال اور حرام کو حرام ہم جانیں۔ یا اللہ دین کے معاملے میں ہم سے جو ظلم وزیادتی گزشتہ میں ہو چکی اسے معاف فرمادیجئے اور آئندہ ہم کو راہ راست پر چلنے کی توفیق کاملہ نصیب فرمائیے،اور شریعت مطہرہ کی ظاہر میں و باطن میں کامل پابندی نصیب فرمائیے۔ یا اللہ آپ نے جن چیزوں کو حرام فرمایاان کے کھانے اور استعمال کرنے سے ہم کو کامل طور پر بچنا نصیب ہو اور جن اشیاء کو آپ نے حلال فرمایا ہے ان کو کھا کر اور استعمال کرکے آپ کی شکر گزاری نصیب ہو۔ یا اللہ آپ کے سارے احکام فوائد و مصلحت کے ہوتے ہیں ہر حال میں اپنے احکام کی ہم کو پابندی اور تابعداری نصیب فرمائیے اور اکل حلال ہم کو نصیب فرمائیے اور اکل حرام سے کامل طور پر بچنا نصیب فرمائیے۔آمین۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ (درس قرآن)

آیت مبارکہ :

وَمِنَ الۡاِبِلِ اثۡنَيۡنِ وَمِنَ الۡبَقَرِ اثۡنَيۡنِ‌ؕ قُلۡ ءٰٓالذَّكَرَيۡنِ حَرَّمَ اَمِ الۡاُنۡثَيَيۡنِ اَمَّا اشۡتَمَلَتۡ عَلَيۡهِ اَرۡحَامُ الۡاُنۡثَيَيۡنِ‌ؕ اَمۡ كُنۡتُمۡ شُهَدَآءَ اِذۡ وَصّٰٮكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا‌ ۚ فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ۝١٤٤

لغۃ القرآن : وَمِنَ : اور میں سے] [الْاِبِلِ : اونٹوں] [اثْنَيْنِ : دو] [وَمِنَ : اور میں سے] [الْبَقَرِ : گائیوں] [اثْنَيْنِ : دو] [قُلْ : آپ کہہ دیں] [ءٰ: کیا] [الذَّكَرَيْنِ : دونوں نر] [حَرَّمَ : حرام کردے گا] [اَمِ : یا] [الْاُنْثَيَيْنِ : دو عورتوں کے] [اَمَّا : رہا وہ] [اشْتَمَلَتْ : وہ مشتمل ہیں] [عَلَيْهِ : اس پر] [اَرْحَامُ : رحم] [الْاُنْثَيَيْنِ : دو عورتوں کے] [اَمْ : کیا] [كُنْتُمْ : ہو تم] [شُهَدَآءَ : گواہی دینے والے] [اِذْ : جب] [وَصّٰكُمُ : وصیت کی تھی تمہیں] [اللّٰهُ : اللہ] [بِهٰذَا : اس کی] [فَمَنْ : پھر جس نے] [اَظْلَمُ : بڑا ظالم] [مِمَّنِ : اس سے جو] [افْتَرٰي : باندھے] [عَلَي اللّٰهِ : اللہ تعالیٰ پر] [كَذِبًا : جھوٹ] [لِّيُضِلَّ : تاکہ وہ گمراہ کردے] [النَّاسَ : لوگوں سے] [بِغَيْرِ : بغیر] [عِلْمٍ : علم] [نَّ اللّٰهَ : بیشک اللہ تعالیٰ] [لَا : نہیں] [يَهْدِي : ہدایت دیتا] [الْقَوْمَ : قوم] [الظّٰلِمِيْنَ : سب ظالموں کا]

ترجمہ : اور دو (نر و مادہ) اونٹ سے اور دو (نر و مادہ) گائے سے۔ (آپ ان سے) فرما دیجئے: کیا اس نے دونوں نر حرام کئے ہیں یا دونوں مادہ یا وہ (بچہ) جو دونوں ماداؤں کے رحموں میں موجود ہے؟ کیا تم اس وقت موجود تھے جب اللہ نے تمہیں اس (حرمت) کا حکم دیا تھا؟ پھر اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹا بہتان باندھتا ہے تاکہ لوگوں کو بغیر جانے گمراہ کرتا پھرے۔ بیشک اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں فرماتا

تشریح:

اس آیت کریمہ میں دور جاہلیت کے ان لوگوں کا رد ہے جو اپنی طرف سے حلال چیزوں کو حرام ٹھہرالیا کرتے تھے جن کا ذکر اوپر کی آیات میں آچکا ہے۔ شان نزول جب اسلام میں احکام کا بیان ہوا تو انھوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جھگڑا کیا اور ان کا خطیب مالک بن عوف حشمی سیّدِ دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ ”یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم نے سنا ہے آپ ان چیزوں کو حرام کرتے ہیں جو ہمارے باپ دادا کرتے چلے آئے ہیں۔ تاجدارِ رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ”تم نے بغیر کسی اصل کے چوپایوں کی چند قسمیں حرام کرلیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے آٹھ نر و مادہ اپنے بندوں کے کھانے اور ان کے نفع اٹھانے کے لیے پیدا کئے۔ تم نے کہاں سے انھیں حرام کیا؟ ان میں حرمت نر کی طرف سے آئی یا مادہ کی طرف سے۔ مالک بن عوف یہ سن کر ساکت اور مُتَحیر رہ گیا اور کچھ نہ بول سکا۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ”بولتے کیوں نہیں؟ کہنے لگا: آپ فرمایئے میں سنوں گا۔ سُبْحَانَ اللہ، قرآن پاک کی دلیل کی قوت اور زور نے اہل جاہلیت کے خطیب کو ساکت و حیران کر دیا اور وہ بول ہی کیا سکتا تھا؟ اگر کہتا کہ نر کی طرف سے حرمت آئی تو لازم ہوتا کہ تمام نر حرام ہوں، اگر کہتا کہ مادہ کی طرف سے تو ضروری ہوتا کہ ہر ایک مادہ حرام ہو اور اگر کہتا جو پیٹ میں ہے وہ حرام ہے تو پھر سب ہی حرام ہو جاتے کیونکہ جو پیٹ میں رہتا ہے وہ نر ہوتا ہے یا مادہ۔ وہ جو تخصیص قائم کرتے تھے اور بعض کو حلال اور بعض کو حرام قرار دیتے تھے اس حجت نے ان کے اس دعوئ تحریم کو باطل کر دیا۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

یاد رہے اللہ عزوجل پہ افترا صرف یہی نہیں کہ بعض حلال جانوروں کو حرام قرار دیا جائے، بلکہ اس کی کئی صورتیں متصور ہیں۔ چنانچہ نبوت کا جھوٹا دعوی کرنے والے بھی اللہ عزوجل پر عظیم افتراء کرنے والے ہیں۔ اسی طرح اپنی طرف سے جھوٹی حدیثیں گھڑ کر انھیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف منسوب کر دینا بھی اللہ رب العزت پر افتراء کی بدترین صورت ہے کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف کوئی قول منسوب کرنا حقیقت میں اللہ عزوجل کی طرف جھوٹ منسوب کرنا ہے کیونکہ **وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی** (سورۃ نجم: 3) (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

{ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ : کیا تم موجود تھے۔ } یعنی اللہ تعالیٰ نے تم سے براہ راست تو بیان فرمایا نہیں اور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذریعے ان جانوروں کی حرمت آئی نہیں تو اب ان جانوروں کے حرام ہونے کی کیا صورت باقی رہی۔ لہٰذا جب یہ بات نہیں ہے تو حرمت کے ان احکام کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا جھوٹ، باطل اور خالص بہتان ہے اور جو اللہ عَزَّوَجَلَّ پر بہتان باندھے وہ سب سے بڑا ظالم ہے، لوگوں

کو گمراہ کرتا ہے اور بیشک اللہ تعالیٰ ظالموں کو جب تک وہ اپنے ظلم پر قائم رہیں ہدایت نہیں دیتا۔

(تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری)

آیت مبارکہ :

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝١٤٥

لغۃ القرآن : قُلْ : کہہ دیں] [لَآ : نہیں] [اَجِدُ : میں پاتا] [فِي : میں] [مَآ : نہیں] [اُوْحِيَ : وحی کی گئی ہے] [اِلَيَّ : میری طرف] [مُحَرَّمًا : کوئی حرام کیا ہوا] [عَلٰي : پر] [طَاعِمٍ : کسی کھانے والے] [يَّطْعَمُهٗٓ : "کہ " وہ کھائے اسے] [اِلَّآ : مگر] [اَنْ يَكُوْنَ : کہ ہو] [مَيْتَةً : مردار] [اَوْ : یا] [دَمًا : خون] [مَّسْفُوْحًا : بہایا ہوا] [اَوْ : یا] [لَحْمَ : گوشت] [خِنْزِيْرٍ : سور کا] [فَاِنَّهٗ : تو بیشک وہ] [رِجْسٌ : ناپاک] [اَوْ : یا] [فِسْقًا : نافرمانی کا باعث] [اُهِلَّ : نام لیا گیا ہو] [لِغَيْرِ اللّٰهِ : غیر اللہ کا] [بِهٖ : اس کو] [فَمَنِ : پھر جو] [اضْطُرَّ : جو مجبور ہوجائے] [غَيْرَ : نہ] [بَاغٍ : سرکشی کرنے والا ہو] [وَّلَا : اور نہ] [عَادٍ : حد سے تجاوز کرنے والا] [فَاِنَّ : تو بیشک] [رَبَّكَ : اپنے رب سے] [غَفُوْرٌ : بہت بخشنے والا] [رَّحِيْمٌ : بہت مہربان ہے]

ترجمہ : آپ فرمادیں کہ میری طرف جو وحی بھیجی گئی ہے اس میں تو میں کسی (بھی) کھانے والے پر (ایسی چیز کو) جسے وہ کھاتا ہو حرام نہیں پاتا سوائے اس کے کہ وہ مردار ہو یا بہتا ہوا خون ہو یا سؤر کا گوشت ہو کیونکہ یہ ناپاک ہے یا نافرمانی کا جانور جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام بلند کیا گیا ہو۔ پھر جو شخص (بھوک کے باعث) سخت لاچار ہو جائے نہ تو نافرمانی کر رہا ہو اور نہ حد سے تجاوز کر رہا ہو تو بیشک آپ کا رب بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے

تشریح:

قُلْ لَّاۤ اَجِدُ: تم فرماؤ میں نہیں پاتا۔} یعنی اے حبیب! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، آپ ان جاہل مشرکوں سے جو حلال چیزوں کو اپنی من مرضی سے حرام کر لیتے ہیں فرمادو کہ "جو میری طرف وحی کی جاتی ہے میں اس میں کسی کھانے والے پر کوئی کھانا حرام نہیں پاتا سوائے ان چار کے (1) مردار۔ (2) رگوں میں بہنے والا خون۔ (3) سور کا گوشت اور (4) نافرمانی کا جانور یعنی جس کو اللہ عَزَّوَجَلَّ کے علاوہ کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ لہٰذا تمہارا ان دیگر چیزوں کو حرام کہنا باطل ہے جن کی حرمت اللہ کی طرف سے نہ آئی۔

{فَمَنِ اضْطُرَّ: تو جو مجبور ہو جائے۔} یعنی مذکورہ بالا چیزیں کھانا حرام ہے لیکن اگر کوئی مجبور ہو اور ضرورت اسے ان چیزوں میں سے کسی کے کھانے پر مجبور کر دے اور وہ اس حال میں کھائے کہ نہ خواہش سے کھانے والا ہو اور نہ ضرورت سے بڑھنے والا تو بیشک رب کریم عزَّوَجَلَّ بخشنے والا، مہربان ہے اور وہ اس پر کوئی مواخذہ نہ فرمائے گا۔

حرام جانوروں کے بیان پر مشتمل آیت سے متعلق چند احکام

مجموعی طور اس آیت کے متعلق چند احکام ہیں:

(1)۔۔ حرمت شریعت کی جانب سے ثابت ہوتی ہے نہ کہ ہوائے نفس سے۔

(2)۔۔ جما ہوا خون یعنی تلی کلیجی حلال ہے کیونکہ یہ بہتا ہوا خون نہیں لیکن بہتا ہوا خون نکل کر جم جائے وہ بھی حرام ہے کہ وہ بہتا ہوا ہی ہے اگرچہ عارضی طور پر جم گیا۔

(3)۔۔ ہر نجس چیز حرام ہے مگر ہر حرام چیز نجس نہیں۔

(4)۔۔ سور کی ہر چیز کھال وغیرہ سب حرام ہے کیونکہ وہ نجس العین ہے۔

(5)۔۔ سور کی کوئی چیز ذبح کرنے یا پکانے سے پاک نہیں ہو سکتی۔

(6)۔۔ جانور کی زندگی میں اس پر کسی کے نام پکارنے کا اعتبار نہیں، ذبح کے وقت کا اعتبار ہے۔

(7)۔۔ بتوں کے نام پر جانور ذبح کرنا فسق اعتقادی یعنی کفر ہے اس لیے یہاں فِسْقًا ارشاد ہوا۔

(8)۔۔مجبوری کی حالت میں مردار وغیرہ چیزیں بقدر ضرورت حلال ہوں گی اور مجبوری سے مراد جان جانے یا عُضْو ضائع ہو جانے کا ظنِ غالب ہونا ہے۔

(9)۔۔اگر اندازے میں غلطی کرکے ضرورت سے زیادہ ایک آدھ لقمہ کھالیا تو پکڑ نہ ہوگی۔

(تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری)

یہ سورت مکی ہے 'اس لیے اس میں صرف ان چار چیزوں کا ذکر فرمایا ہے بعد میں نازل ہونے والی سورتوں میں اور بھی کئ چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی کئی جانوروں کو حرام فرمایا ہے 'بعض دیگر جانوروں اور شراب کی حرمت کا بیان المائدہ میں ہے:

(آیت) "**حرمت علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر وما اھل لغیر اللہ بہ والمنخنقۃ والموقوذۃ والمتردیۃ والنطیحۃ وما اکل السبع الا ما ذکیتم وما ذبح علی النصب وان تستقسموا بالازلام ذلکم فسق**"۔(المائدہ:۳)

ترجمہ: تم پر یہ حرام کیے گئے ہیں۔مردار 'خون 'خنزیر کا گوشت 'جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو 'جس کا گلا گھونٹا گیا ہو 'جو کسی ضرب سے دب کر مرا ہوا 'اوپر سے گرا ہو 'سینگ مارا ہوا ہو اور جس کو درندہ نے کھایا ہو 'البتہ! ان میں سے جس کو تم نے ذبح کر لیا اور جو بتوں کے تھان پر ذبح کیا گیا ہو اور جوئے کے تیروں سے اپنی قسمت معلوم کرنا بھی تم پر حرام کیا گیا ہے۔یہ سب کام گناہ ہیں۔

(آیت) "**یایھا الذین امنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطن فاجتنوہ لعلکم تفلحون**۔(المائدہ:۹۰)

ترجمہ: اے ایمان والو! خمر (شراب) جوا 'بتوں کے چڑھاووں کی جگہ اور بتوں کے پاس فال نکالنے کے تیر محض ناپاک ہیں 'ان سے اجتناب کرو تاکہ کامیاب ہو جاؤ۔

اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی کئی جانوروں کو حرام فرمایا ہے۔

حضرت ابو ثعلبہ خشنی (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہر کچلیوں والے درندے کو کھانے سے منع فرمایا ہے۔(صحیح البخاری 'ج ۷ 'رقم الحدیث: ۵۷۸۰ '۵۷۸۱ 'صحیح مسلم 'الصید والذبائح '۱۲ '(۱۹۳۲) '۴۹۰۳)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے ہر کچلیوں والے درندے اور ہر ناخن والے پرندے سے منع فرمایا۔

(صحیح مسلم 'الصید والذبائح '۱۶ '(۱۹۳۴) ۴۹۰۸ 'سنن ابوداؤد 'ج ۳ 'رقم الحدیث: '۳۸۰۳ ۳۸۰۳ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث: '۳۲۳۳ 'موطا امام مالک 'رقم الحدیث: ۱۰۷۵)

حضرت ابو ثعلبہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پالتو گدھوں کے گوشت کو حرام فرمادیا۔

(صحیح البخاری 'ج ٦ 'رقم الحدیث: '۵۵۲۷۔صحیح مسلم 'الصید والذبائح '۲۳ '(۱۹۳٦) ۴۹۲۰ 'سنن النسائی 'ج ۷ 'رقم الحدیث: '۴۳۴۴)

حضرت عبدالرحمٰن بن شبل (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے گوہ کا گوشت کھانے سے منع فرمادیا۔(سنن ابوداؤد 'ج ۳ 'رقم الحدیث: '۳۷۹٦)

حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تمہارے لیے دو مردار اور دو خون حلال کیے گئے ہیں۔ دو مردار مچھلی اور ٹڈی ہیں اور دو خون کلیجی اور تلی ہیں۔

(سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۳۳۱۴ 'مسند احمد 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۵۷۲۷)

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جن جانوروں کو سمندر پھینک دے 'یا جن سے پیچھے ہٹ جائے ان کو کھالو اور جو جانور سمندر میں مر جائیں اور مر کر اوپر آجائیں ان کو نہ کھاؤ۔

(سنن ابوداؤد ج ۳ 'رقم الحدیث : ۳۸۱۵ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۳۲۴۷)

کاٹنے والے کتے 'سانپ 'بچھو 'چیل اور کوے کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حرم اور غیر حرم میں قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔ (صحیح البخاری ج ۲ 'رقم الحدیث : ۱۲۸۲) اس لیے ان کو کھانا بھی حرام ہے۔

حشرات الارض اور بول و براز اور دیگر ہر قسم کی نجاست کے حرام ہونے پر تمام امت مسلمہ کا اجماع ہے۔

مچھلی کو کھانا بالاتفاق حلال ہے اور مچھلی کے علاوہ باقی دریائی جانوروں میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک وہ حرام ہیں 'کیونکہ وہ سب خبیث ہیں 'یعنی طبع سلیم ان سے متنفر ہوتی ہے اور خبیث چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کردیا ہے۔ (ھدایہ اخیرین 'ص ۴۴۲)

(آیت) "ویحل لھم الطیبت ویحرم علیھم الخبئث"۔ (الاعراف : ۱۵۷)

ترجمہ : اور وہ ان کے لیے پاک اور مرغوب چیزوں کو حلال کرتے ہیں اور ناپاک اور نفرت انگیز چیزوں کو ان پر حرام کرتے ہیں۔

امام مالک کے نزدیک تمام سمندری جانور حلال ہیں 'ماسوا ان کے جن کی مثل خشکی میں حرام ہیں۔ مثلا خنزیر (حاشیہ الدسوقی 'ج ۲ 'ص ۱۱۵) امام احمد کے نزدیک بھی مچھلی سمیت تمام جانور حلال ہیں۔ البتہ ان کے نزدیک مینڈک کو کھانا جائز نہیں ہے 'کیونکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (سنن النسائی) اور یہ اس کی تحریم کی دلیل ہے اور مگرمچھ اور کوسج (ایک قسم کی مچھلی جس کی سونڈ پر آرا ہوتا ہے) کو کھانا بھی جائز نہیں ہے 'کیونکہ یہ دونوں آدمیوں کو کھاجاتا ہے۔ (مغنی ابن قدامہ 'ج ۹ 'ص ۳۳۸ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت) امام شافعی کے نزدیک مینڈک کے سوا تمام سمندری جانوروں کو کھانا جائز ہے اور بعض ائمہ شافعیہ نے مینڈک کے کھانے کو بھی جائز کہا ہے۔ (المہذب 'ج ۲ 'ص ۲۵۰)

ائمہ ثلاثہ کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے

(آیت) "احل لکم صید البحر وطعامہ متاعا لکم وللسیارۃ"۔ (المائدہ : ۹۶)

ترجمہ : تمہارے اور مسافروں کے فائدہ کے لیے سمندر کا شکار اور اس کا طعام حلال کردیا گیا ہے۔

اور اس حدیث سے بھی ان کا استدلال ہے :

حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا کہ ہم سمندر میں سفر کرتے ہیں اور ہمارے پاس پانی کم ہوتا ہے۔ اگر ہم اس پانی سے وضو کرلیں تو پیاسے رہ جائیں گے 'کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کرلیں ؟ آپ نے فرمایا سمندر کا پانی پاک کرنے والا ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔

(سنن الترمذی ج ا ' رقم الحدیث : ٦٩ ' سنن ابوداؤد ' ج ا ' رقم الحدیث : ٨٣ ' سنن النسائی ' ج ا ' رقم الحدیث : ٥٠ ' سنن ابن ماجہ ' ج ا ' رقم الحدیث : ٣٨٦ ' موطا امام مالک ' رقم الحدیث : ٤٣ ' المستدرک ' ج ا ' ص ١٤٠ ' صحیح ابن حبان ' رقم الحدیث : ١٢٤٣ ' المنتقی ' رقم الحدیث : ٤٣ ' مسند احمد ' ج ٣ ' رقم الحدیث : ٧٢٣٧ ' طبع جدید ' مسند احمد ' ج ٢ ' ص ٢٣٧ ' طبع قدیم)

علامہ ابن قدامہ نے کہا ہے کہ عطاء اور عمرو اور عمرو بن دینار سے روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کے لیے سمندر میں ہر چیز کو ذبح کر دیا ہے۔ (المغنی ' ج ٩ ' ص ٣٣٨ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت ' ١٤٠٥ھ)

(تفسیر تبیان القرآن۔ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۭ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ڮ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ○ ١٤٦

لغۃ القرآن : وَعَلَي : اور پر] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [هَادُوْا : سب یہودی ہوئے] [حَرَّمْنَا : ہم نے حرام کردیں] [كُلَّ : ہر] [ذِيْ : والا] [ظُفُرٍ : ناخن] [وَمِنَ : اور میں سے] [الْبَقَرِ : گائیوں] [وَالْغَنَمِ : اور بکریوں " میں سے "] [حَرَّمْنَا : ہم نے حرام کردیں] [عَلَيْهِمْ : ان پر] [شُحُوْمَهُمَآ : ان دونوں کی چربیاں] [اِلَّا مَا : مگر جو] [حَمَلَتْ : اٹھایا ہو] [ظُهُوْرُهُمَآ : ان دونوں کی پیٹھوں نے] [اَوِ : یا] [الْحَوَايَآ : انتڑیوں نے] [اَوْ : یا] [مَا : نہیں] [اخْتَلَطَ : ملی ہو] [بِعَظْمٍ : ہڈی کے ساتھ] [ذٰلِكَ : وہ] [جَزَيْنٰهُمْ : ہم نے سزا دی انہیں] [بِبَغْيِهِمْ : ان کی سرکشی کی وجہ سے] [وَاِنَّا : اور بیشک ہم] [لَصٰدِقُوْنَ : یقینا سب سچے ہیں]

ترجمہ : اور یہودیوں پر ہم نے ہر ناخن والا (جانور) حرام کر دیا تھا اور گائے اور بکری میں سے ہم نے ان پر دونوں کی چربی حرام کر دی تھی سوائے اس (چربی) کے جو دونوں کی پیٹھ میں ہو یا او جھڑی میں لگی ہو یا جو ہڈی کے ساتھ ملی ہو۔ یہ ہم نے ان کی سرکشی کے باعث انھیں سزا دی تھی اور یقینا ہم سچے ہیں

تشریح:

کسی چیز کو حرام کرنے کی دو وجہیں ہوتی ہیں۔ یا تو یہ کہ وہ چیز جسمانی یا روحانی طور پر مضر ہوتی ہے اور لوگوں کو اس کے اثرات بد سے بچانے کے لیے اس کا استعمال ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے جس طرح وہ چیزیں جن کا ذکر پہلی آیت میں گزرا
یا بطور سزا کسی شخص یا قوم کو ایک چیز کے استعمال سے روک دیا جاتا ہے یہاں اسی قسم کی چیزوں کا ذکر ہو رہا ہے جو یہود پر بطور سزا حرام کر دی گئی تھیں۔ چنانچہ آیت کے یہ کلمات "ذٰلک جزینٰھم ببغیھم" صراحۃً بتا رہے ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

یہودی اپنی سرکشی کے باعث ان چیزوں سے محروم کئے گئے

(1)۔۔ہر ناخن والا جانور۔ یہاں ناخن سے مراد انگلی ہے خواہ انگلیاں بیچ سے پھٹی ہوں جیسے کتا اور درندے یا نہ پھٹی ہوں بلکہ کھر کی صورت میں ہوں جیسے اونٹ، شتر مرغ اور بطخ وغیرہ۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ یہاں بطور خاص شتر مرغ، بطخ اور اونٹ مراد ہیں۔
(2)۔۔گائے اور بکری کی چربی۔ یہودیوں پر گائے، بکری کا گوشت وغیرہ حلال تھا لیکن ان کی چربی حرام تھی البتہ جو چربی گائے بکری کی پیٹھ میں لگی ہو یا آنت یا ہڈی سے ملی ہو وہ ان کے لیے حلال تھی۔ یہودی چونکہ اپنی سرکشی کے باعث ان چیزوں سے محروم کئے گئے تھے لہٰذا یہ چیزیں ان پر حرام رہیں اور ہماری شریعت میں گائے بکری کی چربی اور اونٹ، بطخ اور شتر مرغ حلال ہیں، اسی پر صحابہ کرام اور تابعین (رض) کا اجماع ہے۔

سابقہ شریعتوں کے سخت احکام ہم پر جاری نہیں

اس سے معلوم ہوا کہ گزشتہ شریعتوں کے وہ احکام جو بطور سزا جاری کئے گئے تھے وہ ہمارے لیے لائق عمل نہیں اگرچہ نص میں مذکور ہو جائیں کیونکہ یہ امت مرحومہ ہے، پچھلی امتوں کے سخت احکام ہم پر جاری نہیں۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)
بعض الفاظ کے معنی :
ذی ظفر : ناخن والے 'اس سے مراد ایسے جانور ہیں 'جن کے ناخن ان کی انگلیوں سے الگ نہ ہوں، جیسے اونٹ اور دیگر مویشی 'اس کے برخلاف پھاڑنے والے درندوں کے ناخن ان کی انگلیوں سے الگ ہو جاتے ہیں 'جن سے وہ شکار کرتے ہیں۔ شحم کا معنی ہے چربی اور "الحوایا" الحاویہ کی جمع ہے 'اس کا معنی ہے آنت 'انتڑی۔

سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت پر ایک دلیل

امام ابن جریر متوفی ۳۱۰ھ نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ ناخن والے جانوروں سے مراد اونٹ شتر مرغ اور اس قسم کے دیگر چوپائے ہیں۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا اس سے مراد ایسے جانور ہیں جن کی انگلیاں کھلی ہوئی نہ ہوں۔ قتادہ نے کہا اس سے مراد اونٹ ' شتر مرغ اور پرندے ہیں۔ (جامع البیان ' جز ۸ ص ۹۷۔ ۹۶ ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت ۱۴۱۵ھ)

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے ان پر گائے اور بکری کی چربی حرام کردی تھی۔ اس سلسلہ میں یہ حدیث ہے :

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر (رض) کو یہ خبر پہنچی کہ فلاں شخص نے خمر (شراب) فروخت کی ہے۔ حضرت عمر (رض) نے کہا اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو قتل کرے ' وہ نہیں جانتا تھا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تھا اللہ تعالیٰ یہود کو ہلاک کرے ان پر چربی حرام کی گئی تھی ' انھوں نے اس کو پگھلایا اور پھر فروخت کردیا۔ (صحیح البخاری ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ۲۲۲۳ ' صحیح مسلم ' المساقاۃ ' ۷۲ ' مسند احمد ' ج ۱ ' رقم الحدیث : ۱۷۰)

شراب، مردار اور خنزیر کی چربی

حضرت جابر (رض) بن عبداللہ کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے سال جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مکہ میں تھے میں نے خود سنا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرمارہے تھے اللہ نے شراب ' مردار ' خنزیر اور بتوں کی تجارت کو حرام کردیا ہے۔ عرض کیا گیا مردار کی چربی کا کیا حکم ہے اس سے تو کشتیوں پر پالش اور چمڑے پر روغن کیا جاتا ہے اور اس کو چراغ میں جلایا جاتا ہے ' فرمایا نہیں مردار کی چربی حرام ہے پھر فرمایا یہودیوں پر اللہ کی لعنت جب اللہ نے ان پر مردار کی چربی حرام کردی تو انھوں نے چربی کو پکا کر اور ٹھیک بنا کر فروخت کیا اور اس کی قیمت کھائی۔ رواہ البخاری وغیرہ ' واللہ اعلم۔ (تفسیر مظہری اردو جلد 4) (تفسیر گلدستہ۔ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی)

اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو بنو اسرائیل پر ان کی سرکشی کی وجہ سے بطور سزا حرام کیا۔ کیونکہ وہ انبیاء (علیہم السلام) کو ناحق قتل کرتے تھے اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے تھے اور سود کھاتے تھے اور دیگر ناجائز طریقوں سے لوگوں کا مال کھاتے تھے ' اور یہ اس لیے ذکر فرمایا ہے کہ یہود یہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر کسی چیز کو حرام نہیں کیا ماسوا اس کے جس کو حضرت یعقوب نے خود اپنے نفس پر حرام کیا تھا ' اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ ماضی کی خبر دی تھی جس کا کسی کو علم نہیں تھا ' اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا بیشک ہم اس خبر میں ضرور سچے ہیں اور یہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کی دلیل ہے کہ آپ نے یہود کو ماضی کی ایسی بات کی خبر دی جس کا کسی کو علم نہیں تھا اور جس کو جاننے کے لیے وحی کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

ممکن تھا کفار عرب کہتے کہ ہر قوم کو اپنے مزاج کے مطابق بعض چیزیں خود پر حرام ٹھہرانے کی اجازت ہے جیسے یہود کئی چیزیں نہیں کھاتے، اگر ہم بھی سائبہ، بحیرہ وغیرہ جانور نہ کھائیں تو اس میں کیا قباحت ہے۔ اللہ عزوجل نے یہ شبہ دور کرتے ہوئے فرمایا یہود پر جو چیزیں حرام ہیں وہ

انھوں نے خود اپنے اوپر حرام نہیں ٹھہرائیں بلکہ ان بعض نافرمانیوں کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان پر حرام کی تھیں جب انھوں نے بچھڑے کی پوجا کی اور اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا دیکھنے کا مطالبہ کیا تو اس کے بعد جب انھیں توراۃ ملی تو ان پر اس میں ہر وہ جانور حرام لکھا ہوا تھا جو پنجے والا ہو۔ جیسے اونٹ درندے اور تمام پرندے ہیں یعنی جو جانور پنجے والا نہ ہو بلکہ کھر والا ہو وہ حلال ہے جیسے گھوڑا گدھا بیل گائے بکری وغیرہ۔ اسی طرح گائے اور بکری کی چربی ان پر حرام کی گئی۔ البتہ پوشت اور انتڑیوں اور ہڈیوں سے لگی ہوئی چربی حلال رکھی گئی۔

(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

یہود پر ان کی سرکشی کی وجہ سے بعض جانور حرام کر دیئے گئے

توراۃ کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہود کی قوم تاریخ کے مختلف ادوار اور مختلف انبیاء و رسل کی بعثت کے زمانے میں مختلف حالات سے گزری ہے اور اس نے زمانے کے تلخ اور شیریں گھونٹ برابر پیئے ہیں اور ان کی تاریخ عروج وزوال کی ایک عبرت خیز اور دلچسپ داستان ہے۔ لیکن ایک بات جو برابر ان کی زندگی کے حالات سے سامنے آتی ہے وہ اللہ کے احکام کے سلسلے میں ان کی سرکشی ہے۔ وہ اللہ کے نبیوں پر ایمان بھی لاتے رہے لیکن جب بھی ان کو موقع ملا بار بار ان سے سرکشی کا اظہار ہوا اس لیے قدرت کی طرف سے وہ متعدد دفعہ جزوی عذابوں کا شکار ہوئے۔ کئی دفع اللہ کا عتاب ان پر برسا اور ان کو راہ راست پر چلانے کے لیے بعض دفعہ انھیں سخت احکام بھی دیئے گئے۔ انہی احکام کے سلسلے میں اس آیت میں ان محرمات کا ذکر کیا جارہا ہے جو بطور خاص یہود پر حرام تھے۔ لیکن آیت کے آخری حصے میں صاف بتلا دیا گیا ہے کہ یہ احکام ان کی اصل شریعت کا حصہ نہیں تھے بلکہ ان کی اصل شریعت تو شریعت محمدی ہی کا عکس تھی۔ البتہ ! یہ جو سخت احکام ان میں آئے یہ ان کی سرکشی کو کنٹرول کرنے کے لیے تھے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں ان پر حرام کی گئیں۔ وہ اس وجہ سے نہیں تھیں کہ فی نفسہ ان چیزوں کے اندر حرمت کی کوئی علت موجود تھی بلکہ ان کی حرمت میں اصل دخل بنی اسرائیل کے فسادمزاج کو تھا جس طرح ایک طبیب بسا اوقات کسی مریض کو ایک جائز وطیب چیز کے استعمال سے بھی روک دیتا ہے کہ اس سے اس کی صحت جسمانی کو ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اخلاقی فساد کے سبب سے سزا کے طور پر بہت سی جائز چیزیں بھی ان پر حرام ٹھہرادی تھیں۔ اس اخلاقی فساد کو قرآن کریم نے اس آیت میں بغی کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی سرکشی کے ہیں بنی اسرائیل کی اس سرکشی کا ذکر توراۃ اور انبیاء کے صحیفوں میں اس کثرت سے آیا ہے کہ آدمی پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا ہے۔ شریعت کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جس کو انھوں نے بخوشی قبول کیا ہو جو حکم بھی ان کو دیا گیا اول تو انھوں نے اپنے سوال در سوال کی کثرت ہی سے اس کو نہایت بوجھل بنا دیا جس کی ایک مثال سورۃ البقرہ میں گائے کی قصے میں گزر چکی ہے۔ پھر اس کو مانا بھی تو اس سے گریز و فرار کی اتنی راہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کے نکال لیں کہ عملاً وہ حکم ان کے لیے بالکل بے اثر ہو کر رہ گیا۔ ان کے اس فرار پسندانہ اور باغیانہ مزاج کا اثر قدرتی طور پر ان کی شریعت پر بھی پڑا جس طرح کسی سرکش جانور کا مالک اس کو سخت بندھنوں کے اندر رکھنے پر مجبور ہوتا ہے یا سرکش رعایا کا حکمران سخت قوانین نافذ کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان سرکشوں کو نہایت سخت قوانین میں باندھا۔ جن کو قرآن میں اصر واغلال یعنی بندھن اور طوق سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ توراۃ میں اسرائیلی شریعت کے احکام پڑھیئے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ دوسری چیزوں سے قطع نظر صرف طہارت ہی کے احکام پڑھیئے اور دیکھیے کہ حیض 'نفاس' جنابت اور بعض بیماریاں مثلاً جریان اور برص وغیرہ لاحق ہو جانے کی صورت میں ان کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے۔ تو آدمی کارواں رواں اس رب کا شکر گزار ہوتا ہے جس نے ہمیں ملت اسلام کی ہدایت بخشی جو ان تمام غیر فطری بندشوں اور پابندیوں سے

پاک ہے۔ کھانے پینے کے باب میں بھی صرف وہی بندشیں نہیں تھیں جو بیان ہوئیں یہ بندشیں تو صرف چوپایوں کی حلت و حرمت کے متعلق بیان ہوئی ہیں اس سے زیادہ پابندی ان پر دریائی جانوروں کے معاملے میں تھی۔ احبار ' باب ۱۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ دریائی جانوروں میں سے جن کے پر اور چھلکے ہیں وہ ان کے ہاں جائز تھے باقی سب حرام تھے۔ اسی طرح پرندوں میں سے صرف شکاری پرندے ہی حرام نہیں تھے بلکہ قازیں ' بط اور بگلے وغیرہ بھی حرام تھے۔

اس آیت کریمہ میں چند ان محرمات کا ذکر کیا گیا ہے جو یہود پر بطور خاص حرام کی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک تو ایسے جانور ہیں جو ناخن رکھتے ہیں اور دوسری چیز جانوروں کی چربی۔ جہاں تک تعلق ہے ناخن والے جانوروں کا اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے تورات کی تصریحات کو دیکھنا ضروری ہے۔ انھیں سامنے رکھیں تو اس کا مفہوم متعین کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے ہاں چوپایوں میں سے صرف وہ چوپائے حلال تھے جن کے پاؤں چرے ہوئے ہوں اور وہ جگالی بھی کرتے ہوں۔ اس روشنی میں ذِیْ ظُفُرٍ یعنی ناخن والے جانور کا مفہوم متعین کیا جائے تو اس سے مراد وہ جانور ہوں گے جن کے پاؤں چرے ہوئے نہیں ہیں بلکہ سُم کی شکل میں بالکل بند البتہ ان کے سامنے کے حصے پر ناخن ہیں۔ یہود پر اس طرح کے تمام جانور جیسا کہ کُل کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے علی الاطلاق حرام تھے۔ اس وجہ سے ان پر بعض وہ جانور بھی حرام ہو گئے جو ملت ابراہیمی میں جائز تھے مثلاً اونٹ اور خرگوش وغیرہ۔ دوسری چیز جو ان پر حرام کی گئی وہ ناخن والے جانوروں کی چربی تھی تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ہر قسم کی چربی مراد ہے لیکن تھوڑا سا بھی غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو چربی گوشت کے جز کی حیثیت رکھتی ہو۔ کمر ' آنتوں یا ہڈیوں میں اس طرح شامل ہو کہ اس کو باآسانی الگ نہ کیا جاسکے اس کا کھانے والوں پر حرام کرنا یقیناً ایک ایسی سختی ہے جس کا انسانوں کے لیے تحمل بہت مشکل ہے اور عقل سے بھی بعید ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے احکام نہیں دیئے ہوں گے یہ تشدد یہود کے کاہنوں اور فقیہوں نے اپنی طرف سے بڑھایا ہوگا اور یہ اس تشدد پر ایک مزید اضافہ ہے 'جو ان کی شریعت میں پہلے بھی کچھ کم نہ تھا۔ اس لیے قرآن کریم نے اس کی اصلاح کرتے ہوئے اور اصل حکم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان پر ہم نے جو چربی حرام کی تھی وہ 'وہ نہیں تھی جو کمر 'آنتوں یا ہڈیوں میں اس طرح لگی ہوئی ہو کہ باآسانی ان کو الگ نہ کیا جاسکے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "ہم بالکل سچے ہیں"

آخر میں فرمایا کہ ہم نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ اس لیے کہ ہم نہایت راست باز اور سچے ہیں۔ یہ اپنے آپ کو سچے کہنا اور اس پر زور دینا بظاہر عجیب سا معلوم ہوتا ہے لیکن جب اس کے پس منظر کو دیکھا جائے تو پھر اس کی بلاغت اور حقیقت سمجھ میں آتی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ حلت و حرمت کے باب میں مشرکین عرب نے جو زیادتیاں کیں اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی اس خاص صفت میں اپنے شرکاء کو انھوں نے شریک کیا اور ان کے مذہبی رہنما جس طرح بار بار اس حرم کی تقدیس کو پامال کرتے رہے وہ تاریخ مذہب کا نہایت اندوہناک باب ہے پھر انہی کی طرح اہل کتاب نے تاریخ کے مختلف ادوار میں جس طرح اللہ کی نازل کردہ کتابوں میں تحریف اور ترمیم کی اور جس طرح حرام کو حلال اور حلال کو حرام میں تبدیل کیا اور جس طرح بعض ایسی چیزیں محرمات میں شامل کردی گئیں جو اللہ کی جانب سے نازل نہیں ہوئیں ان تمام باتوں کی تردید اور اس کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ اصلاح کرنے والا پوری طرح اپنی حیثیت کا اظہار کرے تاکہ حدود سے تجاوز کے نتیجے میں غلط بیانی اور دروغ گوئی کی جو خاک اڑائی گئی ہے اور جس طرح حقیقت کا چہرہ بگاڑ دیا گیا ہے اس کی اصلاح ممکن ہوسکے اور کہنے والا چیلنج کے انداز میں نہایت تحکم سے یہ بات کہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ میں نہیں کہہ رہا بلکہ میرا پروردگار کہہ رہا ہے اور میرے پروردگار کی کہی ہوئی باتوں اور اس کے احکام میں کبھی جھوٹ یا شک کا تصور بھی ممکن نہیں۔ اس لیے قرآن کریم میں اور بھی کئی جگہ پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ اللہ سے بڑھ کر سچا کون ہے ؟

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں بسنے والے انسانوں میں مفادات کے زیر اثر یا دباؤ کے تحت سچ کی پوری پاسداری کرنا بعض دفعہ بہت مشکل ہو جاتا ہے ' لیکن اللہ تعالیٰ کو ایسی کوئی مشکل یا ایسی کوئی مصلحت درپیش نہیں 'اس لیے وہاں سے جو بھی بات آتی اور جو حکم نازل ہوتا ہے اس کی صداقت اور قطعیت میں کوئی کلام نہیں ہوتا۔ اس لیے اب اس حلت و حرمت کے حوالے سے بھی جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اس میں سچ کے سوا کسی اور بات کو ہرگز دخل نہیں کیونکہ ہم سب سے بڑھ کر سچے ہیں۔

اب ذرا پلٹ کر ایک نگاہ ان چند آیات پر پھر ڈال لیجئے کہ جس میں سب سے پہلے حلت و حرمت کے حوالے سے مشرکین عرب اور ضمنی طور پر اہل کتاب کی گمراہیوں اور حدود سے تجاوزات کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد عقلی اور فطری دلائل دیتے ہوئے ان کی غلطی کو واضح کیا اور یہ بات سمجھائی کہ کسی چیز کو حلال یا حرام کہنا جائز یا ناجائز قرار دینا اس ذات کی صفت ہے جو خالق 'مالک اور حاکم حقیقی ہے۔ اس کی مخلوقات میں سے کسی کو ہرگز یہ حق نہیں دیا جاسکتا۔ اس بنیاد پر دلیل کی عمارت اٹھاتے ہوئے اللہ کی پیدا کردہ مختلف نعمتوں کا ذکر فرمایا اور بطور خاص وہ نعمتیں ذکر فرمائی گئیں جن پر انسانی زندگی کی گزر بسر کا دار و مدار ہے اور پھر ان جانوروں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے لیے انسان شدید قسم کی احتیاج رکھتا ہے۔ چونکہ حلت و حرمت کی گمراہی کا زیادہ تر تعلق جانوروں سے رہا ہے اس لیے ایک ایک جانور کا نام لے لے کر جو عرب میں معروف بھی تھے اور ان کی ضرورتوں میں مستعمل بھی۔ سوال کیا گیا کہ بتاؤ آخر ان جانوروں میں سے مذکر اور مونث سمیت کونسا حلال ہے اور کونسا حرام اور اگر یہ مذکر اور مونث حلال ہیں تو پھر ان کا پھل یعنی ان کی اولاد یقیناً وہ بھی حلال ہوگی۔ یہی عقل اور فطرت کا فتویٰ ہے 'لیکن اگر تم اس سے مختلف رائے رکھتے ہوئے حلت و حرمت کا کوئی الگ فیصلہ کرتے ہو "بتاؤ اس کی سند کیا ہے؟ کسی صحیفہ آسمانی کی گواہی پیش کرو یا اور کوئی دلیل لاؤ جس کو اہل علم اور اہل عقل قبول کر سکیں؟ اس کے بعد نہایت تحقیقی انداز اور ہمدردی کے لب و لہجہ میں فرمایا کہ تم حلال و حرام کردہ جانوروں کے بارے میں ہمیشہ ملت ابراہیمی کا حوالہ دیتے ہو ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ ملت ابراہیمی میں کون سے جانور حرام تھے۔ اس کے بعد ایک ضمنی سوال جو ممکن ہے مشرکین کی طرف سے اٹھایا گیا ہو اس کا جواب دیا۔ سوال یہ تھا کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ اللہ نے ملت ابراہیمی میں جو جانور حلال کیے تھے وہ صرف یہی چار ہیں ' جبکہ یہود پر تو اور چیزیں بھی حرام کی گئیں چنانچہ اس بات کی حقیقت واضح کی گئی اور بتلایا کہ ان پر جو بعض چیزیں حرام ہوئیں یا تو ان کی اپنی حرام کردہ چیزیں تھیں اور یا ان کی سرکشی کے باعث یہ سخت احکام ان پر نازل ہوئے ان تمام باتوں کی وضاحت ہو جانے کے بعد بحث کا کوئی گوشہ تشنہ باقی نہیں رہتا جو آدمی کفر کی محبت یا عصبیت جاہلی میں بالکل اندھا نہ ہو گیا ہو اس کے لیے یہ ممکن نہیں کہ اس قدر وضاحت کے بعد بھی وہ بات کو نہ سمجھے۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

آیت مبارکہ :

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ○ ۱۴۷

لغۃ القرآن: فَاِنْ : پھر اگر] [كَذَّبُوْكَ : وہ سب جھٹلادیں آپ کو] [فَقُلْ : تو آپ کہہ دیں] [رَبُّكُمْ : تمہارا رب] [ذُو : والا] [رَحْمَةٍ : رحمت] [وَّاسِعَةٍ : وسیع] [وَلَا : اور نہ] [يُرَدُّ : ہٹایا جاتا] [بَاْسُهٗ : اس کا عذاب] [عَنِ : کے بارے] [الْقَوْمِ : قوم] [الْمُجْرِمِيْنَ : مجرموں کا]

ترجمہ : پھر اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو فرمادیجئے کہ تمہارا رب وسیع رحمت والا ہے اور اس کا عذاب مجرم قوم سے نہیں ٹالا جائے گا

تشریح:

جب نبی برحق (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور متعدد معجزات اور آیات بینات سے اپنی صداقت کو روز روشن کی طرح ان پر عیاں کر دیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس کے بعد جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے محبوب پر ایمان نہ لاتا اسے فوراً ہلاک کر دیا جاتا لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت بے پایاں کے طفیل یہ اب تک محفوظ چلے آتے ہیں اگر انھوں نے ان مہلت کے لمحوں سے بھی فائدہ نہ اٹھایا اور کجروی سے باز نہ آئے تو انجام کار اللہ تعالیٰ کی گرفت ان کو ہلاک کرکے رکھ دے گی۔ اس وقت کوئی ان کو عذب خداوندی سے بچانہ سکے گا۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

مشرکین اور بنی اسرائیل کو دھمکی

اس آیت کریمہ میں مشرکین اور بنی اسرائیل کو صاف صاف دھمکی دی گئی ہے کہ اگر تم اس بحث کے تمام گوشوں کے واضح ہو جانے کے بعد بھی راہ راست اختیار نہیں کرتے ہو اور تم برابر اللہ کے آخری رسول کو جھٹلاتے ہو تو پھر یاد رکھو تمہارا انجام اچھا نہیں ہوگا تمہیں غلط فہمی یہ ہے کہ تم نے اب تک جو کچھ کیا اس پر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تم پر زمین پھٹ جاتی یا آسمان سے تم پر پتھر برستے 'لیکن جب تمہاری کسی طرح

بھی گرفت نہیں ہوئی تو تم یہ سمجھ بیٹھے کہ تمہیں شاید کوئی پکڑ نہیں سکتا اور یا جو کچھ تمہیں اللہ کا رسول کہہ رہا ہے اس کی شاید کوئی حقیقت نہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تمہارا معاملہ اگر کسی عام بادشاہ سے ہوتا تو تم بہت پہلے تباہ کر دیئے جاتے ' تمہارا سابقہ اس خداوند ذوالجلال سے ہے جو صاحب جلال ہوتے ہوئے بھی پکڑنے میں کبھی جلدی نہیں کرتا وہ جس قوم کی طرف اپنے رسول کو بھیجتا ہے اسے آخری حد تک مہلت دیتا ہے اور اس بات کا انھیں موقع بہم پہنچاتا ہے کہ اگر وہ اپنے آپ کو بدلنا چاہیں تو انھیں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ وہ ہزار اذیتیں پہنچاتے ہیں لیکن پیغمبر اللہ کے حکم سے برابر ان کی ایک ایک بات کا جواب دیتا اور ایک ایک شبے کو دور کرتا ہے اور پھر گاہے گاہے پیغمبر سے معجزات کا صدور بھی ہوتا ہے تاکہ ان کو یہ یقین لانے میں آسانی رہے کہ یہ شخص عام انسانوں جیسا نہیں بلکہ یہ اللہ کا نمائندہ اور رسول ہے ' اس کا انکار کرنے والے روز بروز انکار میں شدت پیدا کرتے چلے جاتے ہیں ' لیکن وہ پھر بھی انھیں مہلت پہ مہلت دیتا چلا جاتا ہے کیونکہ وہ کمزور حکمران نہیں کہ اسے پکڑنے کی جلدی ہو اور یہ اندیشہ ہو کہ ہو سکتا ہے میرے یہ دشمن طاقتور ہو کر میری طاقت کی حدود سے نکل جائیں ' لیکن اے قریش اور اے اہل کتاب تمہیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ مہلت بہر حال مہلت ہے یہ ایک نہ ایک دن ختم ہو جائے گی اس سے اللہ کی پکڑ میں کچھ تاخیر تو ہو سکتی ہے لیکن اس سے اس کی وہ سنت باطل نہیں ہو جاتی ہے جو مجرموں کی پکڑ کے لیے اس نے ٹھہرا رکھی ہے۔ اس لیے جب اس کی سنت کے ظہور کا وقت آئے گا تو وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹلے گا۔ اس لیے عقل کی بات یہ ہے کہ اللہ نے محض اپنی رحمت سے تمہیں ڈھیل دے کر جو سنبھلنے کا موقع دیا ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ اور اللہ کے عذاب کو دعوت نہ دو کیونکہ

نہ جا اس کے تحمل پر کہ بے ڈھب ہے گرفت اس کی
ڈر اس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اس کا

(روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی القرآن)

اس کا دامن رحمت بہت وسیع ہے اور یہ رحمت ہمارے لیے بھی وسیع ہے اور اس سے پہلے کے مومنین کے لیے بھی وسیع تھی اور مومنین کے علاوہ تمام مخلوقات کے لیے بھی اس میں وسعت ہے کیونکہ وہ تو محسن ہے۔ دوست کے لیے بھی رحیم ہے اور دشمن کے لیے بھی رحیم ہے۔ اگر مجرم عذاب کے مستحق ہوں تو بھی وہ نفاذ عذاب میں جلدی نہیں کرتا اور یہ اس کی شان کریمی ہے اور اس ڈھیل کے عرصہ میں کئی لوگ توبہ کر لیتے ہیں اور اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں لیکن ان کا عذاب نہایت ہی سخت ہے۔ صرف اس کا حلم ہی اسے اہل ایمان سے رد کر سکتا ہے۔ اللہ کے نظام قضا و قدر میں جو وقت متعین ہے اس وقت تک ہی وہ موئخر ہو سکتا ہے۔

اس آیت میں اگرچہ شمع امید کو بھی روشن رکھا گیا ہے اور انسان کو مایوس نہیں کیا گیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں بھی تنبیہ بھی موجود ہے کہ وہ حد سے نہ گزرے اور اللہ وہ ذات ہے جس نے لوگوں کے دل و دماغ کو پیدا کیا ہے اور وہ جانتا ہے کہ ان کے لیے یہ دونوں باتیں ضروری ہیں تاکہ وہ ڈر جائیں ' اپنے رویے پر غور کریں اور دعوت اسلامی کو قبول کر لیں۔

جب بات یہاں تک پہنچتی ہے اور اہل ضلالت کے لیے کوئی مفر نہیں رہتا۔ جب ان کے پاس کوئی استدلال نہیں رہتا اور تمام بھاگنے کے راستے بند ہو جاتے ہیں تو قرآن کریم ان کے فرار کے آخری راستے کو بھی بند کر دیتا ہے۔ ان کے گمراہانہ تصورات ' شرکیہ عقائد اور بے معنی اعمال کے لیے ایک راہ موجود تھی۔ وہ کہتے تھے کہ وہ اپنا کوئی اختیار نہیں رکھتے ' وہ تو مجبور ہیں۔ اگر اللہ چاہتا تو وہ نہ ایسے تصورات رکھتے ' نہ غلط عقائد ان کے ہوتے اور نہ وہ بد اعمالیوں میں مبتلا ہوتے۔ اگر اللہ چاہتا تو وہ ہمیں ان باتوں سے روک دیتا۔ وہ تو قادر مطلق ہے اور اس کی قدرت پر کوئی قید نہیں ہے۔ (فی ظلال القرآن)

آیت مبارکہ :

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝١٤٨

لغۃ القرآن: سَيَقُوْلُ : عنقریب کہیں گے] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [اَشْرَكُوْا : سب نے شرک کیا] [لَوْ : کاش کہ] [شَآءَ اللّٰهُ : اللہ چاہتا] [مَآ : نہیں] [اَشْرَكْنَا : ہم شریک بناتے] [وَلَآ : اور نہ " ان لوگوں کی جو "] [اٰبَآؤُنَا : ہمارے باپ دادا] [وَلَا : اور نہ] [حَرَّمْنَا : ہم نے حرام کردیں] [مِّنْ : سے] [شَيْءٍ : چیز کو] [كَذٰلِكَ : اسی طرح] [كَذَّبَ : جھٹلایا] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [نْ قَبْلِهِمْ : ان سے پہلے تھے] [حَتّٰي : یہاں تک کہ] [ذَاقُوْا : ان سب نے چکھ لیا] [بَاْسَنَا : ہمارا عذاب] [قُلْ : آپ کہہ دیں] [هَلْ : کیا] [عِنْدَكُمْ : تمہارے پاس ہے] [مِّنْ : سے] [عِلْمٍ : علم] [فَتُخْرِجُوْهُ : تو تم سب نکالو اسے] [لَنَا : ہمارے لیے] [اِنْ : اگر] [تَتَّبِعُوْنَ : تم سب پیروی

کرتے] [اِلَّا : مگر] [الظَنَّ : گمان] [وَاِنْ : اور اگر] [اَنْتُمْ : تم] [اِلَّا : مگر] [تَخْرُصُوْنَ : تم سب اٹکل دوڑاتے ہو]

ترجمہ : جلد ہی مشرک لوگ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ (ہی) ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے آباء واجداد اور نہ کسی چیز کو (بلا سند) حرام قرار دیتے۔ اسی طرح ان لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے تھے حتیٰ کہ انھوں نے ہمارا عذاب چکھ لیا۔ فرمادیجئے : کیا تمہارے پاس کوئی (قابل حجت) علم ہے کہ تم اسے ہمارے لیے نکال لاؤ (تو اسے پیش کرو)، تم (علم یقینی کو چھوڑ کر) صرف گمان ہی کی پیروی کرتے ہو اور تم محض (تخمینہ کی بنیاد پر) دروغ گوئی کرتے ہو

تشریح :

سابقہ آیات میں کفار کے عقائد باطلہ کی تردید کی گئی۔ نیز اشیاء کی حلت و حرمت کے متعلق ان کی جاہلانہ رسموں کی خرابیوں کو ظاہر فرمایا گیا۔ اب ان آیات میں ان کے شبہ کا ازالہ کیا جارہاہے۔ وہ شبہ یہ تھا کہ ہم اور ہمارے آباؤاجداد مدت ہائے دراز سے شرک کرتے چلے آئے ہیں۔ اور جانوروں کی حلت و حرمت کے متعلق اس قانون کے پابند رہے ہیں۔ اگر یہ باتیں اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہوتیں تو وہ کبھی ایسا نہ کرسکتے۔ ان کا یوں کرتے رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ شرک وغیرہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ چنانچہ دوسری آیت میں ان کا یہ شبہ بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے **واذا فعلوا فاحشۃ قالوا وجدنا علیہ اباءنا واللہ امرنا بھا قل ان اللہ لا یامر بالفحشاء تقولون علی اللہ مالا تعلمون** (7 : 27) اللہ تعالیٰ شبہ کا ازالہ برہان فعل سے کرتے ہیں کہ اگر تمہاری یہ بات درست ہوتی کہ تمہارے شرک اور تحلیل و تحریم کے اس رواج کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کی سند حاصل ہے تو چاہیے یہ تھا کہ ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا پیہم لطف و کرم ہوتا۔ حالانکہ تم سے پہلے جنہوں نے اس گمراہی کو اپنایا ان پر غضب الٰہی ہوا اور صفحہ ہستی سے ان کا نام مٹادیا گیا۔ تم خود غور کرو۔ ایسی سنگین سزا مجرموں اور نافرمانوں کو دی جاتی ہے یا اطاعت شعاروں اور فرمان برداروں کو۔ بعض علماء نے کفار کے اس شبہ کی تقریر دوسری طرح کی ہے۔ یعنی کفار کہیں گے کہ ہم تو بے اختیار اور مجبور تھے۔ اللہ کی مشیت ہی یہی تھی کہ ہم کفر و شرک کے مرتکب ہوں۔ ہماری کیا مجال تھی کہ اس کی مشیت کی خلاف ورزی کرتے۔ چنانچہ سورۃ النحل میں انھوں نے اپنے مجبور محض ہونے کا صراحتاً اعتراف بھی کیا ہے۔ **وقال الذین اشرکوا لو شاء اللہ ما عبدنا من دونہ من شیء** (16 : 35) اور سورۃ الزخرف میں ہے **وقالوا لو شاء الرحمن ما عبدناھم۔**

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ)

مشرکین کے شبہات کا جواب

مجاہد نے کہا کہ کفار قریش نے کہا کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے دادا شرک نہ کرتے اور نہ وہ بحیرہ ٗ سائبہ اور وصیلہ وغیرہ کو حرام قرار دیتے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہمارے آباء واجداد کی طرف رسول بھیجتا ٗ جو ان کو شرک سے منع کرتا اور ان جانوروں کو حرام قرار دینے

سے منع کرتا اور وہ ان کاموں سے رک جاتے ' پھر ہم بھی ان کی اتباع کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کیا اور فرمایا تمہارے پاس کیا دلیل ہے کہ جس طرح تم کہہ رہے ہو ماضی میں ایسا ہی ہوا تھا اگر تمہارے پاس کوئی دلیل ہے تو اس کو پیش کرو۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس شبہ کو رد فرمایا 'اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی تکذیب کی تھی 'حتی کہ انھوں نے ہمارا عذاب چکھا۔ یعنی جس طرح کفار مکہ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اللہ تعالیٰ کی توحید پر دیئے ہوئے دلائل کی تکذیب کی ہے 'اسی طرح پہلے بھی مشرکین نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی تھی اور اس کی بنیاد بھی کوئی علم اور عقل کی دلیل نہیں تھی۔ وہ بھی محض ظن اور اٹکل پچو سے اپنے رسولوں کی تکذیب کرتے تھے اور اگر ان کا یہ قول صحیح ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان پر اپنا عذاب کیوں نازل فرماتا اور ان کو صفحہ ہستی سے کیوں مٹا دیتا ' یعنی جب انھوں نے رسولوں کی تکذیب کی تو ان پر عذاب آیا اور یہ اس کی دلیل ہے کہ اللہ نے ان کی طرف رسول بھیجے تھے، جنھوں نے ان کو شرک اور خود ساختہ تحریم سے منع فرمایا تھا۔ (تفسیر تبیان القران۔ غلام رسول سعیدی)

مجرمانہ ذہنیت کے لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ گناہ کو چھوڑنے کے بجائے اس کا جواز اور بہانہ تلاش کرتے ہیں۔ جس کے لیے یہ لوگ جھوٹے دلائل دینے کے ساتھ اپنے آباؤاجداد کی رسومات کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہ عادت ہر دور کے مشرک اور نافرمانوں کی رہی ہے۔ اسی بنا پر فرمایا گیا ہے کہ حرام وحلال کے متعلق عقلی اور نقلی دلائل نہ رکھنے والے لوگ عنقریب یہ دلیل دیں گے کہ اگر واقعی اللہ تعالیٰ شرک اور حرام خوری کو ناپسند کرتا تو پھر ہم اور ہمارے آباؤاجداد شرک کرنے اور کسی چیز کو حرام قرار دینے کی کس طرح جرات کر سکتے تھے ؟ اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلایا یہاں تک کہ انھیں اللہ کے عذاب نے آلیا۔ قرآن مجید میں یہ بات کئی مقامات پر سمجھائی گئی ہے کہ کسی کو جبراًہدایت کے راستے پر چلانا اللہ تعالیٰ کی حکمت کے منافی ہے۔ اس لیے یہاں ایسے لوگوں کو تفصیلی جواب دینے کے بجائے فقط اتنا ہی جواب دینا مناسب سمجھا گیا ہے کہ اسی طرح کے بہانے بنا کر تم سے پہلے لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب اور انبیاء کرام (علیہ السلام) کو جھٹلایا کرتے تھے، یہاں تک کہ انھیں اللہ کے عذاب نے آلیا۔ اگر تمہارے پاس علم کی بنیاد پر کوئی دلیل ہے تو اسے ہمارے سامنے پیش کرو۔ لیکن تمہاری حالت تو یہ ہے کہ تم محض اپنے خیالات کی پیروی کرتے ہوئے بےبنیاد باتیں بناتے ہو۔ یہ کوئی ٹھوس دلیل پیش نہیں کر سکتے لہٰذا انھیں فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کی دلیل تمہیں پہنچ چکی ہے جو عقل و فکر اور ہر اعتبار سے کامل اور اکمل ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ جبراًچاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت پر اکٹھا کر سکتا تھا لیکن ہدایت واضح کرنے کے بعد اس نے انسان کو فیصلہ کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جبراًہدایت قبول کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کرتا۔

اب پھر اتمام حجت کے لیے انہی سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ اگر تمہارے پاس علم کی کوئی سند نہیں تو تم ایسے گواہ پیش کرو۔ جو علمی اور فکری دلائل سے ثابت کریں کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے تمہاری حرام کردہ چیزوں کو حرام کیا اور شرک کا کوئی جواز پیش کیا ہے۔ یہاں گواہوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق اور سچ کی گواہی دینے والے ہوں۔ ظاہر ہے جس طرح ان کے پاس شرک اور حرام خوری کے لیے علمی اور شرعی دلائل نہیں اسی طرح ایسے گواہوں کا ملنا مشکل ہے جو توراۃ اور انجیل سے ان کی حرام خوری اور شرک کا ثبوت پیش کر سکیں۔ اسی بنا پر فرمایا کہ اگر علم و عقل سے عاری لوگ شہادت دینے کے لیے کھڑے ہو جائیں تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان کے ساتھ ہرگز گواہی نہیں دینا چاہیے۔ اور ایسے لوگوں کے جذبات و خیالات کا ہرگز خیال نہیں کرنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب، آخرت کا انکار اور اپنے خالق ومالک کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتے ہیں۔

شرک اور حرام خوری کا انجام

(عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ (رض) قَالَ قَالَ رَسُول اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَنْ مَّاتَ یُشْرِكُ بِاللّٰہِ شَیْءًا دَخَلَ النَّارَ وَقُلْتُ أَنَا مَنْ مَّاتَ لَا یُشْرِكُ بِاللّٰہِ شَیْءًا دَخَلَ الْجَنَّةَ) [رواہ البخاری: کتاب الجنائز، باب ماجاء فی الجنائز]

”حضرت عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو کوئی اس حال میں مرا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا وہ جہنم میں جائے گا اور میں بھی یہ کہتا ہوں جس شخص نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا اور وہ اسی حال میں فوت ہوا وہ جنت میں جائے گا۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

رب العالمین جانتا تھا کہ جب کفار عرب پر ان کے شرک وکفر اور حلال جانوروں کو حرام ٹھہرانے کے بارہ میں اتمام حجت کر دی جائے گی اور روشن دلائل کے مقابلہ میں ان سے کوئی بات نہ بن پائے گی تو وہ عنقریب یہ ڈھکوسلہ چھوڑیں گے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ گویا ہم جو کچھ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کی یہی مرضی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ منکر لوگ حق کے مقابلہ میں ہمیشہ سے ایسے ہی ڈھکوسلے چھوڑتے اور عذاب الٰہی کا شکار ہوتے رہے ہیں (بھلا یہ بھی کوئی دلیل جواز ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہتا تو ہم یہ کام کیسے کر سکتے تھے؟

اگر کوئی شخص تمہارے منہ پر تھپڑ مارے، تمہارے گھر میں چوری کرے، یا تمہاری بیٹی کی عزت لوٹ لے اور ساتھ یہ کہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہتا تو میں ایسا نہیں کر سکتا تھا تو کیا تم اس دلیل سے مطمئن ہو جاؤ گے؟ پھر کیا تم نے عظمت الوہیت کا معاملہ اتنا آسان سمجھ لیا ہے کہ اس بارہ میں جو چاہو کہتے پھرو؟) اگر تمہارے پاس کوئی علم ہے تو وہ ہمارے سامنے لاؤ اگر تم سچے ہو؟ مگر تم محض گمان لڑاتے اور قیاس آرائی کرتے ہو۔ ایک شخص کسی کے باغ میں داخل ہو کر سینہ زوری سے پھل کھا رہا تھا، باغ والے نے کہا یہ کیا ظلم ہے؟ اس نے کہا میں اللہ تعالیٰ کا بندہ اور یہ اللہ تعالیٰ کا رزق، اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہتا تو اپنے بندے کو اس رزق تک کیوں پہنچاتا، باغ والے نے ڈنڈا لے کر اسے مارنا شروع کر دیا۔ اس نے دہائی دی کہ خدا کے نام پہ چھوڑ دو۔ اس نے کہا نہیں خدا کا بندہ اور خدا کا ڈنڈا، اب خدا کہے گا تو میں چھوڑوں گا۔

اللہ کی مشیت اور رضا میں فرق

کفار کا کفر وشرک اللہ عزوجل کی مشیت سے ہے بلکہ ہر چیز اسی کی مشیت سے ہے۔ قرآن فرماتا ہے: **ولوشاء اللہ ما اشرکوا**۔ ”اگر اللہ چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے“۔ (انعام، 107) مگر برے کاموں میں اس کی رضا نہیں۔ وہ فرماتا ہے:

ولا یرضی لعبادہ الکفر۔ وہ اپنے بندوں کے کفر کرنے پہ راضی نہیں ہے (زمر۔ 40) وغیرہ۔

انہ لا یحب الظلمین ”بیشک اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا“۔ (شوری۔ 40) وغیرہ۔

یعنی مشیت صرف یہ ہے کہ اس نے ہر انسان کو نیکی و بدی دونوں کی طاقت دے دی ہے ہر کوئی اسی کی دی ہوئی طاقت سے برائی کرتا ہے جب انسان برائی کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ عزوجل اسے گناہ کی طاقت و اختیار دے دیتا ہے یہی اس کی مشیت ہے مگر اس کی رضا یہی ہے کہ انسان نیکی کرے بدی نہ کرے۔

گمراہ فرقے ہمیشہ سے ایک جیسی دلیلیں لاتے آئے ہیں

مشرکین نے کہا اگر اللہ عزوجل نہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے آج مرزائی کہتے ہیں اگر اللہ عزوجل نا چاہتا تو ہمیں کیوں دنیا میں پھلنے پھولنے دیتا ؟انھیں کون سمجھائے کہ یہ صرف مشیت خدا ہے رضائے خدا نہیں۔ کیا عیسائی یہودی اور ہندو پھل پھول نہیں رہے ؟اسی طرح بعض لوگ حرمین شریفین پر اپنے اقتدار کو اپنے لئے دلیل صداقت بناتے ہیں مگر یہ بھی ویسی ہی بات ہے حرمین کعبہ پر مشرکین کبھی اقتدار رہا تو کیا وہ سچے تھے ؟

اے میرے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! آپ ان سے پوچھئے کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو اس کے متعلق اگر تمہارے پاس کوئی علمی دلیل یا قابل اعتماد سند ہے تو پیش کرو۔ باری تعالیٰ خود ہی فرماتے ہیں کہ ان کے پاس کوئی دلیل اور سند نہیں جو ان کے خرافات کی اساس ہو۔ ان کے عقائد کا یہ ڈھانچہ صرف وہم و گمان اور ظن و تخمین کی پیداوار ہے۔ (برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب)

آیت مبارکہ :

قُلۡ فَلِلّٰهِ الۡحُجَّةُ الۡبَالِغَةُ‌ۚ فَلَوۡ شَآءَ لَهَدٰٮكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ۝۱۴۹

لغۃ القرآن: قُلْ : کہہ دیں] [فَلِلّٰهِ : پھر اللہ ہی کے لیے] [الْحُجَّةُ : دلیل] [الْبَالِغَةُ : کامل] [فَلَوْ : پس اگر] [شَآءَ : وہ چاہے] [لَهَدٰىكُمْ :" تو " ضرور ہدایت دیتا تمہیں] [اَجْمَعِيْنَ : سب کو]

ترجمہ : فرما دیجئے کہ دلیل محکم تو اللہ ہی کی ہے، پس اگر وہ (تمہیں مجبور کرنا) چاہتا تو یقیناً تم سب کو (پابندِ) ہدایت فرما دیتا☆

تشریح:

قُلۡ فَلِلّٰهِ الۡحُجَّةُ الۡبٰلِغَةُ

تم فرماؤتواللہ ہی کی حجت پوری ہے۔} اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ایسی دلیل جو تمام تر شکوک و شبہات کو جڑ سے اکھاڑ دے وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے،اس آیت میں یہ تنبیہ ہے کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ واحد ہےاس نے رسولوں کو دلائل اور معجزات دے کر بھیجااور ہر مُکَلَّف پر اپنے احکام کولازم کیا ہےاور ان کو مکلّف کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کام کرنے یا نہ کرنے کااختیار دیا ہے یعنی انھیں بااختیار بنایا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کی حکمت یہی ہے کہ بندے اپنے اختیار سے ایمان لائیں اور اس کے احکام کی تعمیل کریں ورنہ اگر وہ چاہتا تو جبراًسب انسانوں کو مومن بنادیتا لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت میں نہیں ہےاس لیے ان کا یہ کہنا بالکل لَغْو ہے کہ اگراللہ عَزَّوَجَلَّ چاہتا تو ہم شرک کرتے نہ ہمارے باپ دادا، نہ وہ بحیرہ وغیرہ کو حرام قرار دیتے کیونکہ اس قسم کا جبری ایمان اللہ تعالیٰ کا مطلوب نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنی عقل سے کام لیں، حق اور باطل کو جانچیں، کھرے کھوٹے کو پرکھیں،انبیاءِ کرام (علیہ السلام) کی تعلیمات اور شیطان کے وسوسوں میں فرق محسوس کریں اور اپنے اختیار سے۔برے کاموں اور۔بری باتوں کو ترک کریں اور شیطان کاانکار کرکے اللہ عَزَّوَجَلَّ پر ایمان لانے کواختیار کریں، وہ جس چیز کواختیار کریں گے اللہ عَزَّوَجَلَّ اسی چیز کو پیدا کردے گا،ان آیتوں میں یہ دلیل بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبور محض نہیں بنایا، مختار بنایا ہےاور اس میں جبریہ کا بھی رد ہے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری)

جبریہ کارد اور ابطال

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ایسی دلیل جو تمام شکوک و شبہات کو بیخ وبن سے اکھاڑ دے 'صرف اللہ ہی کے پاس ہے۔اس آیت میں یہ تنبیہ ہے کہ اللہ واحد ہے 'اس نے رسولوں کو دلائل اور معجزات دے کر بھیجااور ہر مکلّف پر اپنے احکام کولازم کیا ہےاور ان کو مکلّف کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کام کرنے یا نہ کرنے کااختیار دیا ہےاور اللہ تعالیٰ کی حکمت یہی ہے کہ بندے اپنے اختیار سے اس پر ایمان لائیں اور اس کے احکام کی تعمیل کریں 'ورنہ اگر وہ چاہتا تو جبراسب انسانوں کو مومن بنادیتا 'لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت میں نہیں ہے۔اس لیے ان کا یہ کہنا بالکل لغو ہے کہ اگر چاہتا تو ہم شرک کرتے 'نہ مومن بنادیتا 'لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت میں نہیں ہے۔اس لیے ان کا یہ کہنا بالکل لغو کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم شرک کرتے 'نہ ہمارے باپ دادا 'نہ وہ بحائر وغیرہ کو حرام قرار دیتے 'کیونکہ اس قسم کا ایمان اللہ تعالیٰ کا مطلوب نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنی عقل سے کام لیں 'حق اور باطل کو جانچیں 'کھرے اور کھوٹے کو پرکھیں۔انبیاء (علیہم السلام) کی تعلیمات اور شیطان کے وسوسوں میں فرق محسوس کریں اور اپنے اختیار سے۔برے کاموں اور بری باتوں کو ترک کریں اور شیطان کاانکار کرکے اللہ پر ایمان لانے کواختیار کریں 'وہ جس چیز کواختیار کریں گے 'اللہ اسی چیز کو پیدا کردے گا۔ان آیتوں میں یہ دلیل بھی ہے کہ اللہ نے انسان کو مجبور محض نہیں بنایا 'مختار بنایا ہےاور ان میں جبریہ کے مذہب کارد ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن۔ مولاناغلام رسول سعیدی)
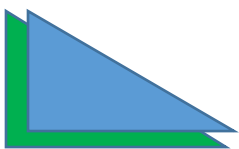
آیت مبارکہ :

قُلۡ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيۡنَ يَشۡهَدُوۡنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا‌ ۚ فَاِنۡ شَهِدُوۡا فَلَا تَشۡهَدۡ مَعَهُمۡ‌ ۚ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ وَهُمۡ بِرَبِّهِمۡ يَعۡدِلُوۡنَ ۝۱۵۰

لغۃالقرآن : قُلْ : کہہ دیں] [هَلُمَّ : لاؤ] [شُهَدَآءَكُمُ : اپنے گواہوں کو] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [يَشْهَدُوْنَ : وہ سب گواہی دیتے ہیں] [اَنَّ اللّٰهَ : بیشک اللہ] [حَرَّمَ : حرام کردے گا] [هٰذَا : یہ] [فَاِنْ : پھر اگر] [شَهِدُوْا : وہ سب گواہی دے دیں] [فَلَا : پس نہیں] [تَشْهَدْ : آپ گواہی دیں] [مَعَهُمْ : ان کے ساتھ] [وَلَا : اور نہ] [تَتَّبِعْ : پیروی کرو] [اَهْوَآءَ : خواہشات] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [كَذَّبُوْا : انھوں نے جھٹلایا] [بِاٰيٰتِنَا : ہماری آیات کو] [وَالَّذِيْنَ : اور وہ لوگ جو] [لَا : نہیں] [يُؤْمِنُوْنَ : وہ سب ایمان لاتے ہیں] [بِالْاٰخِرَةِ : آخرت کے بدلے] [وَهُمْ : اور وہ] [بِرَبِّهِمْ : اپنے رب کے ساتھ] [يَعْدِلُوْنَ : وہ سب برابر قرار دیتے ہیں]

ترجمہ : (ان مشرکوں سے) فرمادیجئے کہ تم اپنے ان گواہوں کو پیش کرو جو (آکر) اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ نے اسے حرام کیا ہے، پھر اگر وہ (جھوٹی) گواہی دے ہی دیں تو ان کی گواہی کو تسلیم نہ کرنا (بلکہ ان کا جھوٹا ہونا ان پر آشکار کر دینا)، اور نہ ایسے لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرنا جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ (معبودان باطلہ کو) اپنے رب کے برابر ٹھہراتے ہیں

تشریح:

پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ان مشرکین سے فرمائیے کہ اگر تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی حلال چیزوں کو حرام کرنے کا کوئی گواہ یعنی کسی آسمانی کتاب کی آیت یا کسی نبی کا کوئی قول ہے تو اسے پیش کریں، کیونکہ کسی چیز کو حلال یا حرام کرنے کا اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ دراصل ان کے پاس کوئی عقلی یا نقلی دلیل اور گواہی نہیں ہے لیکن اگر وہ کوئی جھوٹی گواہی دینے کی کوشش کریں تو کسی بھی سننے والے کے لیے جائز نہیں ہے کہ ان کی جھوٹی گواہی کی تصدیق کرے یا ان کی خواہشات کی پیروی کرے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات اور آخرت کے منکر ہیں اور مخلوق کو اللہ تعالیٰ کا ہمسر قرار دیتے ہیں۔ (امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ الکرم)

جب اللہ تعالیٰ نے کفار کی تمام حجتیں باطل فرمادیں تو اب بیان فرمایا کہ ان کے پاس اپنی بات پر کوئی گواہ بھی نہیں چنانچہ فرمایا: اے محبوب! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، آپ ان سے فرمادیجئے کہ اپنے وہ گواہ لے آؤ جو اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ نے اسے حرام کیا جسے تم اپنے لیے حرام قرار دیتے ہو اور کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ یہ گواہی اس لیے طلب کی گئی کہ ظاہر ہو جائے کہ کفار کے پاس کوئی شاہد نہیں ہے اور جو وہ کہتے ہیں وہ ان کی اپنی تراشیدہ باتیں ہے۔

فَاِنْ شَهِدُوا : پھر اگر وہ گواہی دے بیٹھیں۔} یعنی مشرکین اگر اپنی جھوٹی بات پر کوئی گواہ لے ہی آئیں تو اے سننے والے! تو ان کے ساتھ گواہی نہ دینا اور ان لوگوں کی خواہشوں کے پیچھے نہ چلنا جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور وہ بتوں کو اپنے رب عَزَّوَجَلَّ کے برابر ٹھہراتے ہیں یعنی بتوں کو معبود مانتے ہیں اور شرک میں گرفتار ہیں۔ اس میں تنبیہ ہے کہ اگر کوئی ایسی شہادت دے بھی دے تو وہ محض خواہش کی اتباع اور کذب و باطل ہوگی۔

جھوٹی گواہی اور اس کی تصدیق حرام ہے

اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹی گواہی بھی حرام ہے اور اس کی تصدیق و تائید بھی اور جھوٹے آدمی کی وکالت بھی کیونکہ گناہ کے کام میں مدد کرنا بھی گناہ ہے اور احادیث میں اس کی سخت وعیدیں بھی بیان ہوئی ہیں، چنانچہ

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ”جس نے کسی ظالم کے باطل کام پر اس کی مدد کی تاکہ وہ اس کے باطل کام کے اِرتِکاب کی وجہ سے حق کو باطل کر دے تو وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذمہ سے بری ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جس نے کسی جھگڑے پر ناحق مدد کی تو وہ تب تک اللہ تعالیٰ کے شدید غضب میں رہے گا جب تک (اس مدد کو) چھوڑ نہیں دیتا۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

مشرکین مکہ آخرت کے منکر تھے اس لیے برائی کرنے سے نہیں ڈرتے تھے

ان کی ایک خو جو بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ آخرت پر یقین نہیں رکھتے حقیقت یہ ہے کہ جو آدمی اس بات پر یقین نہیں رکھتا کہ مجھے مر کر فنا نہیں ہو جانا بلکہ ایک دن دوبارہ زندہ بھی ہونا ہے اور پھر قیامت کے دن اللہ کے سامنے حاضری ہوگی۔ وہاں زندگی اور زندگی کے ایک ایک عمل کے بارے میں جواب دہی کرنی پڑے گی اور اگر میں اس میں سرخرو نہ ہو سکا تو ہمیشہ کا عذاب میرے انتظار میں ہوگا۔ وہ کبھی بھی اپنے رویے پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ کبھی اس کی زندگی میں سنجیدگی نہیں آسکتی ' وہ کبھی اپنے مقصد زندگی میں یکسو نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے ذہن میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آخر میں اپنی خواہشات نفس کی بجائے کسی اور کی پیروی کیوں کروں۔ یہ مشرکین عرب اسی لیے سنجیدگی سے دعوت اسلامی کو نہیں لیتے تھے اور کسی برائی کرنے سے نہیں چوکتے تھے کیونکہ انھیں آخرت کا یقین نہیں تھا۔ ایسے لوگ اگر غلط شہادت دینے کے لیے تیار ہو جائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

وہ شرک کرتے تھے

دوسری خُو، ان کی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنے رب کے ہمسر ٹھہراتے ہیں کسی بھی شخص کی گمراہی کی یہ انتہاء ہے کہ اللہ جو خالق ' رازق اور مالک ہے اور جس کی وحدانیت پر کائنات کا ایک ایک ذرہ گواہ ہے۔ آدمی اس کا رزق بھی کھائے اور پھر اس کا ہمسر بھی ٹھہرائے اور یہ خیال کرے کہ اس کائنات میں اللہ جیسی اور قوتیں بھی ہیں۔ ایسی حرکت وہی شخص کر سکتا ہے جو شرافت کی آخری حد سے بھی گر گیا ہو اور جس میں انسانیت کا نام تک باقی نہ رہا ہو تو یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ یہ چونکہ اس طرح کے عقائد رکھتے ہیں اور اس معاملے میں اس حد تک آگے بڑھ چکے ہیں۔ اس لیے ان سے کسی بھی برائی کی توقع رکھنا بعید از قیاس نہیں اس لیے اگر یہ اتنی واضح ہدایات اور اتنے مضبوط دلائل کے بعد بھی یہ بات سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تو اے پیغمبر آپ کو ہرگز پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

سلسلہ کلام جہاں تک پہنچ چکا ہے اور مشرکین مکہ کی تین صفات بیان کر کے جس طرح ان پر فرد جرم عائد کر دی گئی ہے اس کے بعد تو یوں لگتا ہے کہ اب ان پر عذاب بھیجنے کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہجرت کا حکم دے دیا جائے گا۔ لیکن اللہ کے کرم کا کیا کہنا کہ بجائے ان پر عذاب بھیجنے اور ان کی محرومی کا فیصلہ کرنے کے سلسلہ کلام کو مزید آگے بڑھایا جا رہا ہے اور ان سے یہ فرمایا جا رہا ہے کہ تم اپنی نادانی سے چند طیبات کو محرمات میں تبدیل کر کے اور اللہ کے حلت و حرمت کے حق کو اپنے اور اپنے نام نہاد شرکاء کے لیے مباح کر کے یہ سمجھ رہے ہو کہ یہ ملت ابراہیمی ہے حالانکہ اس کا ملت ابراہیمی سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم اس سے پہلے یہ بات بتا چکے ہیں کہ ملت ابراہیمی میں جو چیزیں حرام کی گئی تھیں وہ صرف چار تھیں۔ مردار ' دم مسفوح ' خنزیر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور۔ لیکن عجیب بات ہے کہ تم ان سب کو اپنے لیے حلال سمجھتے ہو۔ مزید برآں اللہ اور بندوں کے حقوق و معاملات سے متعلق بہت سی چیزیں اللہ نے حرام کی تھیں تم نے ان کو اختیار کر رکھا ہے۔ آؤ ہم تمہیں اب بتاتے ہیں کہ وہ کیا کیا چیزیں تھیں جو تمہارے رب نے حرام کی تھیں چنانچہ اب اس رکوع میں انہی چیزوں کو بیان کیا جا رہا ہے۔ (روح القرآن تعلیقا۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی القرآن)

اہم نکات

1 : معلوم ہوا کہ جس چیز کی حرمت نہ دکھائی جاسکے وہ حلال ہے اور یہاں شہداء سے مراد کتاب اللہ کی آیات یا ان کے پیغمبروں کے اقوال ہیں کہ خود ان کی بکواس۔ جیسا کہ اگلی آیت میں ہے۔

2 : اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹے کی تصدیق کرنا، اس کی وکالت کرنا۔ اس کے کام پر بیشک کہنا یا خوشی کا اظہار کرنا یا تصدیق کے لیے سر ہلانا سب حرام ہے کہ یہ ان کے ساتھ گواہی دینا ہے۔ گناہ کی امداد کرنا بھی گناہ ہے۔

3 : اس سے معلوم ہوا کہ کفار کو اپنا سردار و پیشوا بنانا، ان کی اطاعت کرنا حرام الا بالضرورۃ جو ایسے ہی ان کے برے قانون پر عمل کرنا منع ہے الا بالعذر اور جو قانون خلاف اسلام ہوں، انھیں درست سمجھنا کفر ہے اسلام قانون ہے چور کے ہاتھ کاٹنا۔ کفار کا قانون ہے چور کو قید کرنا۔ جو قید کو اچھا سمجھے، ہاتھ کاٹنے کو برا وہ کافر ہے۔

4 : اس سے معلوم ہوا کہ کفار کی خواہشات نفسانی میں ان کی پیروی حرام ہے۔ نبی کی خواہش رحمانی ہے اس کی پیروی جائز کبھی مسحب کبھی واجب ہوتی ہے اور اسے اھواء نہیں کہہ سکتے۔ رب فرماتا ہے۔ **وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی۔** (تفسیر نور العرفان)

آیت مبارکہ :

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝١٥١

لغۃ القرآن: قُلْ : کہہ دیں] [تَعَالَوْا : تم سب آؤ] [اَتْلُ : میں پڑھتا ہوں] [مَا : نہیں] [حَرَّمَ : حرام کردے گا] [رَبُّكُمْ : تمہارا رب] [عَلَيْكُمْ : تم پر] [اَلَّا : کہ نہ] [تُشْرِكُوْا : تم سب شریک بناؤ] [بِهٖ : اس کو] [شَيْـًٔا : کچھ بھی] [وَبِالْوَالِدَيْنِ : اور والدین کے ساتھ] [اِحْسَانًا : احسان کرنا] [وَلَا : اور نہ] [تَقْتُلُوْٓا : تم سب قتل کرو] [اَوْلَادَكُمْ : اپنی اولاد کو] [مِّنْ : سے] [اِمْلَاقٍ : مفلسی " کے ڈر سے "] [نَحْنُ : ہم] [نَرْزُقُكُمْ : رزق دیتے ہیں تمہیں] [وَاِيَّاهُمْ : اور ان کو " بھی "] [وَلَا : اور نہ] [تَقْرَبُوا : تم سب قریب جاؤ] [الْفَوَاحِشَ : بےحیائی کے] [مَا : جو] [ظَهَرَ : ظاہر ہیں] [مِنْهَا : اس سے] [وَمَا : اور نہ] [بَطَنَ : چھپی ہیں] [وَلَا : اور نہ] [تَقْتُلُوا : تم سب مار ڈالو] [النَّفْسَ : جان] [الَّتِيْ : جسے] [حَرَّمَ : حرام کردے گا] [اللّٰهُ : اللہ] [اِلَّا : مگر] [بِالْحَقِّ : حق کے ساتھ] [ذٰلِكُمْ : یہ " سب "] [وَصّٰىكُمْ : اس نے وصیت کی ہے تمہیں] [بِهٖ : اس کو] [لَعَلَّكُمْ : تاکہ تم] [تَعْقِلُوْنَ : تم سب سمجھ جاؤ]

ترجمہ : فرمادیجئے: آؤمیں وہ چیزیں پڑھ کر سنادوں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کی ہیں (وہ) یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤاور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اور مفلسی کے باعث اپنی اولاد کو قتل مت کرو۔ ہم ہی تمہیں رزق دیتے ہیں اور انھیں بھی (دیں گے) ، اور بے حیائی کے کاموں کے قریب نہ جاؤ (خواہ) وہ ظاہر ہوں اور (خواہ) وہ پوشیدہ ہوں، اور اس جان کو قتل نہ کرو جسے (قتل کرنا) اللہ نے حرام کیا ہے بجز حقِ (شرعی) کے، یہی وہ (امور) ہیں جن کا اس نے تمہیں تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو

تشریح:

حقیقی حلت و حرمت کے متعدد احکام

یہاں سے اللہ عَزَّوَجَلَّ نے وہ حقیقی حلت و حرمت کے متعدد احکام بیان فرمائے ہیں جو خود اس خالق کائنات نے عطا فرمائے ہیں۔اس آیت اور اس سے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے 9 چیزوں کی حرمت بیان فرمائی ہے (1) اللہ عَزَّوَجَلَّ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا۔ (2) ماں باپ کے ساتھ بھلائی نہ کرنا۔ (3) مفلسی کے باعث اپنی اولاد قتل کرنا۔ (4) بے حیائی کے کام کرنا چاہے ظاہری ہوں یا باطنی۔ (5) ناحق قتل کرنا۔ (6) یتیم کے مال میں بے جاتَصَرُّف کرنا۔ (7) ناپ تول میں کمی کرنا۔ (8) ناحق بات کہنا۔ (9) اللہ عَزَّوَجَلَّ سے کئے ہوئے عہد کو پورا نہ کرنا۔اس کا بیان یہ ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ کیونکہ یہ کائنات کا بدترین جھوٹ اور صریح ناشکری واحسان فراموشی ہے۔
ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو کیونکہ تم پر ان کے بہت سے حقوق ہیں، انہوں نے تمہاری پرورش کی، تمہارے ساتھ شفقت اور مہربانی کا سلوک کیا، تمہاری ہر خطرے سے نگہبانی کی، ان کے حقوق کا لحاظ نہ کرنا اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا ترک کرنا حرام ہے۔ معلوم ہوا کہ ماں باپ اگرچہ کافر ہوں ان کے ماں باپ ہونے کی حیثیت سے جو حقوق ہیں انھیں ادا کرنا ضروری ہے۔اس احسان میں والدین کے ساتھ تمام قسم کے اچھے سلوک داخل ہیں۔ان کا ادب، لحاظ، ان پر ضرورت کے وقت مال خرچ کرنا، بعدِ وفات ان کیلئے ایصال ثواب سب داخل ہیں۔
{ وَلَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُم : اپنی اولاد قتل نہ کرو۔} اس میں اولاد کو زندہ درگور کرنے اور مار ڈالنے کی حرمت بیان فرمائی گئی جس کا اہل جاہلیت میں دستور تھا کہ وہ بارہا فقر و تنگدستی کے اندیشے سے اولاد کو مار ڈالتے تھے، انھیں بتایا گیا کہ روزی دینے والا تو اللہ عَزَّوَجَلَّ ہے جو تمہیں اور انھیں سب کو روزی دے گا تو پھر تم کیوں قتل جیسے شدید جُرم کا ارتکاب کرتے ہو۔

عورتوں کے حقوق سے متعلق اسلام کی حسین تعلیمات

اس آیت میں ان لوگوں سے خطاب ہے جو غریبی کی وجہ سے لڑکے لڑکیوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور جو مالدار شرم و عار کی وجہ سے اپنی لڑکیوں کو قتل کرتے تھے ان کا ذکر دوسری آیات میں ہے۔ان کے مقابلے میں اسلام کی تعلیمات کس قدر حسین ہیں اور اسلام نے بچیوں اور عورتوں کو کیسے حقوق عطا فرمائے اس کیلئے صرف درج ذیل 3 حدیثوں کا مطالعہ فرمالیں۔

(1)۔۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت ہے، سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ”جس شخص کی بیٹی ہو تو وہ اسے زندہ در گور نہ کرے، اسے ذلیل نہ سمجھے اور اپنے بیٹے کو اس پر ترجیح نہ دے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا۔

(2)۔۔ حضرت ابو سعید خدری (رض) سے روایت ہے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ”جس کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں ہوں، یا دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں اور وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور ان کے معاملے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرے تو اس کے لیے جنت ہے۔

(3)۔۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ”جو شخص تین بیٹیوں یا بہنوں کی اس طرح پرورش کرے کہ ان کو ادب سکھائے اور ان سے مہربانی کا برتاؤ کرے یہاں تک کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ انھیں بے نیاز کردے (مثلاً ان کا نکاح ہو جائے) تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت واجب فرما دیتا ہے۔ یہ ارشاد نبوی سن کر ایک صحابی (رض) نے عرض کی: ”اگر کوئی شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے؟ تو ارشاد فرمایا: اس کے لیے بھی یہی اجر و ثواب ہے۔ ” (راوی فرماتے ہیں) یہاں تک کہ اگر لوگ ایک کا ذکر کرتے تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے بارے میں بھی یہی فرماتے۔

{ **وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوٰحِشَ**: اور بے حیائیوں کے پاس نہ جاؤ۔ } اس آیت میں ظاہری و باطنی بے حیائیوں کے پاس جانے سے منع کیا گیا کیونکہ انسان جب کھلے اور ظاہری گناہوں سے بچے اور پوشیدہ گناہوں سے پرہیز نہ کرے تو اس کا ظاہری گناہوں سے بچنا بھی لِلّٰہیت سے نہیں بلکہ لوگوں کے دکھانے اور ان کی بدگوئی سے بچنے کے لیے ہے جبکہ گناہوں سے بچنے کا اصل سبب اللہ عَزَّوَجَلَّ کی ناراضگی کا ڈر ہونا چاہیے نیز اللہ عَزَّوَجَلَّ کی رضا و ثواب کا مستحق ہوتا بھی وہی ہے جو اس کے خوف سے گناہ ترک کرے۔

بظاہر نیک رہنا اور چھپ کر گناہ کرنا تقویٰ نہیں

اس سے معلوم ہوا کہ ظاہر میں نیک رہنا اور چھپ کر گناہ کرنا تقویٰ نہیں بلکہ ریاکاری ہے۔ تقویٰ یہ ہے کہ ظاہر و باطن ہر حال میں اللہ عَزَّوَجَلَّ کا خوف دامن گیر ہو۔ لوگوں کے سامنے نیک اعمال کرتے نظر آنے والوں اور تنہائی میں گناہوں پر بیباک ہونے والوں کا حشر میں بہت برا حال ہوگا، چنانچہ حضرت عدی بن حاتم (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ”قیامت کے دن کچھ لوگوں کو جنت کی طرف لے جانے کا حکم ہوگا، یہاں تک کہ جب وہ جنت کے قریب پہنچ کر اس کی خوشبو سونگھیں گے، اس کے محلات اور اس میں اہل جنت کے لیے اللہ تعالیٰ کی تیار کردہ نعمتیں دیکھ لیں گے، تو ندا دی جائے گی: انھیں جنت سے لوٹا دو کیونکہ ان کا جنت میں کوئی حصہ نہیں۔ (یہ ندا سن کر) وہ ایسی حسرت کے ساتھ لوٹیں گے کہ اس جیسی حسرت کے ساتھ ان سے پہلے لوگ نہ لوٹیں ہوں گے، پھر وہ عرض کریں گے: ”یا رب! عَزَّوَجَلَّ، اگر تو اپنا ثواب اور اپنے اولیاء کے لیے تیار کردہ نعمتیں دکھانے سے پہلے ہی ہمیں جہنم میں داخل کر دیتا تو یہ ہم پر زیادہ آسان ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا ”میں نے ارادۃً تمہارے ساتھ ایسا کیا ہے (اور اس کی وجہ یہ ہے کہ) جب تم تنہائی میں ہوتے تو بڑے بڑے گناہ کر کے میرے ساتھ اعلان جنگ کرتے اور جب لوگوں سے ملتے تو عاجزی و انکساری کے ساتھ ملتے تھے، تم لوگوں کو اپنی وہ حالت دکھاتے تھے جو تمہارے دلوں میں میرے لیے نہیں ہوتی تھی، تم لوگوں سے ڈرتے اور مجھ سے نہیں ڈرتے تھے، تم لوگوں کی عزت

کرتے اور میری عزت نہ کرتے تھے، تم لوگوں کی وجہ سے۔ براکام کرنا چھوڑ دیتے لیکن میری وجہ سے۔ برائی نہ چھوڑتے تھے، آج میں تمہیں اپنے ثواب سے محروم کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے عذاب کا مزہ بھی چکھاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ کے خوف سے گناہ چھوڑنے کے 3 فضائل؛

(1)۔۔ حضرت قتادہ (رض) سے روایت ہے، سرکار عالی وقار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "جو شخص کسی حرام کام پر قادر ہو پھر اسے صرف اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ آخرت سے پہلے دنیا ہی میں جلد اس کا ایسا بدل عطا فرماتا ہے جو اس حرام کام سے بہتر ہو۔

(2)۔۔ حضرت ابو امامہ (رض) سے مروی ہے، حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جس شخص کو کسی عورت نے برائی کی دعوت دی اور وہ محض اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے اس سے باز رہا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے عرش کے سائے میں جگہ عطا فرمائے گا۔)

(3)۔۔ حضرت علی المرتضیٰ (رض) سے مروی ہے "جس نے اللہ تعالیٰ کے خوف سے اور اس کی رضا حاصل کرنے کی خاطر گناہ چھوڑ دیا تو اللہ تعالیٰ اسے راضی فرمائے گا۔

ظاہری و باطنی گناہوں سے محفوظ رہنے کی دعا

حدیث پاک میں ظاہری و باطنی گناہوں سے بچنے کے لیے ایک بہترین دعا تعلیم فرمائی گئی ہے، ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ اس دعا کو اپنے معمولات میں شامل کرلے اور بکثرت یہ دعا مانگا کرے، چنانچہ حضرت عمر (رض) فرماتے ہیں مجھے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ دعا سکھائی، ارشاد فرمایا: "کہو "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ سَرِیْرَتِیْ خَیْرًا مِنْ عَلَانِیَتِیْ، وَاجْعَلْ عَلَانِیَتِیْ صَالِحَۃً، اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ مِنْ صَالِحِ مَا تُؤْتِی النَّاسَ مِنَ الْمَالِ وَالْاَھْلِ، وَالْوَلَدِ غَیْرِ الضَّالِّ وَلَا الْمُضِلِّ "اے اللہ! میرا باطن میرے ظاہر سے اچھا کر دے اور میرے ظاہر کو نیک و صالح بنادے، اے اللہ! میں تجھ سے لوگوں کو عطا کی جانے والی بہترین چیزیں یعنی مال، اچھا گھر بار اور وہ اولاد مانگتا ہوں جو نہ گمراہ ہو اور نہ گمراہ گر ہو وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ: اور جس جان کی اللہ نے حرمت رکھی اسے ناحق نہ مارو۔} اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کسی کو ناحق قتل کرنے کی حرمت بیان فرمائی ہے۔

ناحق قتل کرنے یا قتل کا حکم دینے کی 3 وعیدیں

ناحق قتل کرنے والے یا قتل کا حکم دینے والے کے بارے میں احادیث میں سخت وعیدیں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے 3 وعیدیں درج ذیل ہیں:

(1)۔۔حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت ہے، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "قیامت کے دن مقتول قاتل کو لے کر اس حال میں آئے گا کہ اس کی پیشانی اور سر اس کے ہاتھ میں ہوں گے اور گردن کی رگوں سے خون بہہ رہا ہوگا۔ عرض کرے گا: اے میرے رب! اس نے مجھے قتل کیا تھا، حتّٰی کہ قاتل کو عرش کے قریب کھڑا کر دے گا۔

(2)۔۔نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: آگ کو ستر حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے 69 حصے قتل کا حکم دینے والے کیلئے اور ایک حصہ قاتل کیلئے ہے۔

(3)۔۔حضرت ابو درداء (رض) فرماتے ہیں "قیامت کے دن مقتول بیٹھا ہوگا، جب اس کا قاتل گزرے گا تو وہ اسے پکڑ کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرے گا: "اے میرے رب! عَزَّوَجَلَّ، تو اس سے پوچھ کہ اس نے مجھے کیوں قتل کیا؟ اللہ تعالیٰ قاتل سے فرمائے گا: "تو نے اسے کیوں قتل کیا: قاتل عرض کرے گا: مجھے فلاں شخص نے حکم دیا تھا، چنانچہ قاتل اور قتل کا حکم دینے والے دونوں کو عذاب دیا جائے گا۔

قتلِ برحق کی صورتیں اور ایک اہم تنبیہ

چند صورتیں ایسی ہیں کہ جن میں حاکم اسلام کیلئے مجرم کو قتل کرنے کی اجازت ہے جیسے قاتل کو قصاص میں، شادی شدہ زانی کو رجم میں اور مرتد کو سزا کے طور پر قتل کرنا البتہ یہ یاد رہے کہ قتل برحق کی جو صورتیں بیان ہوئیں ان پر عام لوگ عمل نہیں کر سکتے بلکہ اس کی اجازت صرف حاکم اسلام کو ہے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری الجنان)

اللہ تعالیٰ کے حرام کیے ہوئے کاموں کی تفصیل

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ مشرکین نے بعض کاموں چیزوں کو از خود حرام قرار دے دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حرام نہیں فرمایا اور اب اللہ تعالیٰ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے فرما رہا ہے کہ آپ ان کو بتائیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیا کیا چیزیں حرام فرمائی ہیں؟ ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے نو چیزوں کی حرمت بیان فرمائی ہے اور ان کی ضد کو فرض اور واجب قرار دیا ہے۔ وہ نو چیزیں یہ ہیں:

(۱) اللہ کا شریک قرار دینا۔

(۲) ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک نہ کرنا۔

(۳) اولاد کو قتل کرنا۔

(۴) بے حیائی کے کام کرنا۔

(۵) ناحق قتل کرنا۔

(۶) یتیم کے مال میں بے جا تصرف کرنا۔

(۷) ناپ تول میں کمی کرنا۔

(۸) ناحق بات کہنا۔

(۹) اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا نہ کرنا۔
ان نو کاموں کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے اور ان کی ضد اور ان کے خلاف کرنے کو فرض اور واجب فرمایا ہے۔ ہم ان میں سے ہر ایک کی قدرے تفصیل بیان کر رہے ہیں۔

شرک کا حرام ہونا

بعض مشرکین بتوں کو اللہ کا شریک قرار دیتے تھے' جیساکہ اس آیت میں اشارہ ہے:
(آیت) "واذقال ابراھیم لابیہ ازر اتتخذ اصناما الھة"۔ (الانعام: ۷۴)
ترجمہ: اور جب ابراہیم نے اپنے (عرفی) باپ آزر سے کہا' کیا تو بتوں کو معبود بناتا ہے۔
اور بعض مشرکین ستاروں کی پرستش کرتے تھے' اس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:
" (آیت) "فلما افل قال لا احب الافلین"۔ (الانعام: ۷۶)
ترجمہ: پھر جب وہ ستارہ ڈوب گیا تو ابراہیم نے کہا میں ڈوب جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔
بعض مشرکین جنات کو اللہ تعالیٰ کا شریک کہتے تھے' جیساکہ اس آیت میں ہے:
(آیت) "وجعلوا للہ شرکآء الجن''۔ (الانعام: ۱۰۰)
ترجمہ: اور انھوں نے جنات کو اللہ کا شریک قرار دیا۔
بعض مشرکین اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹے اور بیٹیاں مانتے تھے۔ جیساکہ اس آیت میں ہے:
(آیت) "وخرقوا لہ بنین وبنات بغیر علم"۔ (الانعام: ۱۰۰)
ترجمہ: اور انھوں نے بغیر علم کے اللہ کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لیں۔
اللہ تعالیٰ کے لیے ہر قسم کا شریک ماننا حرام ہے۔ اور یہ ایسا گناہ ہے جس کی آخرت میں معافی نہیں ہوگی۔
حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا' اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ کہ تم اللہ کے لیے شریک قرار دو' حالانکہ اس نے تمھیں پیدا کیا ہے۔ میں نے کہا بیشک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ پھر کونسا بڑا گناہ ہے؟ آپ نے فرمایا پھر یہ ہے کہ تم اپنی اولاد کو اس خوف سے قتل کرو کہ وہ تمہارے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ میں نے پوچھا' پھر کونسا گناہ بڑا ہے؟ فرمایا پھر یہ کہ تم اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرو۔
(صحیح البخاری' ج ۵' رقم الحدیث: ۴۷۷۴' صحیح مسلم' ایمان' ۱۴۱ (۸۶) ۲۵۱' سنن ابوداؤد' ج ۲' رقم الحدیث: ۲۳۱۰' سنن الترمذی' ج ۵' رقم الحدیث: ۳۱۹۳' سنن نسائی' ج ۷' رقم الحدیث: ۴۰۱۳' سنن کبری للنسائی' ج ٦' رقم الحدیث: ۱۰۹۸۷)

والدین کے ساتھ بدسلوکی کا حرام ہونا

اس کے بعد ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم ہے ' کیونکہ انسان پر سب سے بڑا احسان اللہ تعالیٰ کا ہے کہ اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اس کے بعد انسان کے اوپر ماں باپ کا احسان ہے ' کیونکہ انھوں نے اس کی پرورش کی اور جب وہ بہت چھوٹا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا ' اس وقت اس کو ضائع ہونے سے بچایا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی انتہائی تعظیم اور توقیر کا حکم دیا ہے ' اور اپنا شکرادا کرنے کے بعد ماں باپ کا شکرادا کرنے کی تلقین فرمائی ہے :

(آیت) "وبالوالدین احسانا. اما یبلغن عندك الکبر احدھما او کلھما فلا تقل لھما اف ولا تنھرھما وقل لھما قولا کریما، واخفض لھما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمھما کما ربینی صغیرا "۔ (بنواسرائیل : ۲۴۔ ۲۳)

ترجمہ : اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو اگر تمہارے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو انھوں اف (تک) نہ کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان کے ساتھ ادب سے بات کرنا، اور نرم ولی کے ساتھ ان کے سامنے عاجزی سے جھکے رہنا اور کہنا کہ اے میرے ان دونوں پر رحم فرمانا جیسا کہ ان دونوں نے بچپن میں مجھے پالا۔

(آیت) "ووصینا الانسان بوالدیه، حملته امه وھنا علی وھن وفصاله فی عامین ان ش کرلی ولوالدیك الی المصیر "۔ (لقمان : ۱۴)

ترجمہ : ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم دیا ہے ' اس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری برداشت کرتے ہوئے اس کو پیٹ میں اٹھایا اور اس کا دودھ چھوٹنا دو برس میں ہے (اور ہم نے یہ حکم دیا کہ) میرا اور اپنے والدین کا شکرادا کرو میری طرف لوٹنا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں آکر عرض کیا ' میں آپ سے ہجرت اور جہاد پر بیعت کرتا ہوں اور اللہ سے اجر چاہتا ہوں۔ آپ نے پوچھا کیا تمہارے ماں باپ میں سے کوئی زندہ ہے ؟ اس نے کہا ہاں بلکہ دونوں زندہ ہیں۔ آپ نے پوچھا تم اللہ سے اجر چاہتے ہو ؟ اس میں نے کہا ہاں ! آپ نے فرمایا اپنے ماں باپ کے پاس جاؤ اور ان سے نیک سلوک کرو۔ (صحیح مسلم ' البر والصلہ ' ٦ ' (۲۵۴۹) ٦٣٨٧)

والدین کے ساتھ نیکی یہ ہے کہ ان کی فرمان برداری اور اطاعت کی جائے ' ان کا ادب اور احترام کیا جائے۔ ان کی ضروریات پوری کی جائیں اور ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھا جائے۔ اگر وہ ظلم کریں ' پھر بھی ان کی اطاعت کی جائے۔ البتہ غیر شرعی احکام میں ان کی اطاعت نہ کی جائے ' پھر بھی ان کے ساتھ نرمی رکھی جائے اور اگر وہ فوت ہو جائیں تو ان کی قبر کی زیارت کی جائے اور ان کے لیے استغفار کیا جائے۔

قتل اولاد کا حرام ہونا

زمانہ جاہلیت میں بعض مشرکین رزق میں کمی کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل کر دیتے تھے اور بعض عار کی وجہ سے اپنی بیٹیوں کو قتل کر دیتے تھے اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام فرمادیا ' اور بعض لوگ عمل تتزویج کے وقت عزل کرتے تھے۔ (یعنی انزال کے وقت اندام نہانی سے آلہ باہر نکال لینا)

بعض مسلمان بھی عزل کرتے تھے ' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عزل کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ غزوہ بنو مصطلق میں گئے۔ ہم نے عرب کی خوبصورت عورتوں کو قید کرلیا ' ہمیں اپنی بیویوں سے الگ ہوئے کافی دن گزر چکے تھے ' ہم نے چاہا کہ مشرکین سے فدیہ لے کر ان عورتوں کو چھوڑ دیں اور ہم نے یہ بھی چاہا کہ ان عورتوں سے جسمانی فائدہ بھی حاصل کریں اور عزل کرلیں (یعنی انزال کے وقت آلہ باہر نکال لیں ' تاکہ حمل قائم نہ ہو) پھر ہم نے سوچا کہ ہم عزل کر رہے ہیں اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے درمیان موجود ہیں تو کیوں نہ ہم آپ سے اس کا حکم معلوم کرلیں۔ ہم نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا تو آپ نے فرمایا تم پر کوئی حرج نہیں ہے۔ کہ تم ایسا نہ کرو ' کیونکہ قیامت تک اللہ تعالیٰ نے جس روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی کے پیدا ہونے کے متعلق لکھ دیا ہے ' وہ پیدا ہو کر رہے گی۔

(صحیح البخاری ' ج ۵ ' رقم الحدیث : ۵۲۱۰ ' صحیح مسلم ' نکاح ۱۲۵ ' (۱۴۳۸) ۳۴۸۰ ' سنن ابوداؤد ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۲۱۷۲ ' سنن کبری للنسائی ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ۵۰۴۴)

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ میری ایک باندی ہے ' وہ ہماری خادمہ ہے اور ہمارے لیے پانی لاتی ہے۔ میں اس سے اپنی خواہش پوری کرتا ہوں اور اس کے حاملہ ہونے کو ناپسند کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا اگر تم چاہو تو اس سے عزل کرلو ' بیشک جو کچھ مقدر کیا گیا ہے وہ عنقریب ہوجائے گا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ شخص آیا اور اس نے کہا وہ باندی حاملہ ہوگئی ہے۔ آپ نے فرمایا میں نے تمہیں بتایا تھا کہ جو کچھ مقدر میں ہوگیا ہے ' وہ ہو کر رہے گا۔ (صحیح مسلم ' نکاح ' ۱۳۴ ' (۱۴۳۹) ۳۴۹۲ ' سنن ابوداؤد ج ۲ ' رقم الحدیث : ۲۱۷۳)

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم عزل کرتے تھے اور قرآن نازل ہو رہا تھا۔ سفیان نے کہا اگر یہ کوئی ممنوع چیز ہوتی تو قرآن ہمیں اس سے منع کردیتا۔

(صحیح البخاری ' ج ۵ ' رقم الحدیث : ۵۸۰۲ ' صحیح مسلم ' نکاح ' ۱۳۶ ' (۱۴۴۰) ۳۴۹۵ ' سنن الترمذی ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۱۱۴۰ ' سنن کبری للنسائی ' ج ۵ ' رقم الحدیث : ۹۰۹۳ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۱۹۲۷)

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد میں عزل کرتے تھے ' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس کی خبر پہنچی تو آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا۔ (صحیح مسلم ' نکاح ' ۱۳۸ ' (۱۴۴۰) ۳۴۹۵)

عزل کیا جائے یا کسی اور جدید طبّی طریقہ سے ضبط تولید کا عمل کیا جائے تو بلاضرورت شرعی وہ مکروہ ہے ' اور اگر تنگی رزق کے خوف کی وجہ سے یا لڑکیوں سے عار کی بنا پر عزل کیا جائے ' تو حرام ہے اور اگر کوئی نیک مسلمان ڈاکٹر یہ کہے کہ اگر ضبط تولید پر عمل نہ کیا گیا تو عورت کی جان کو خطرہ ہے ' تو پھر یہ عمل واجب ہے اور اگر اس کے بیمار ہونے کا خدشہ ہو تو عزل کرنا جائز ہے۔ اس کی پوری تفصیل ہم (الانعام : ۱۳۶) کی تفسیر میں لکھ چکے ہیں۔

بے حیائی کے کاموں کا حرام ہونا

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جس وقت کوئی زانی زنا کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا اور جس وقت کوئی چور چوری کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا اور جس وقت کوئی شرابی شراب پیتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا۔
(صحیح البخاری ' ج ٦ ' رقم الحدیث : ٥٥٧٨ ' صحیح مسلم ' ایمان ' ١٠٠ ' (٥٧) ١٩٩)
حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس شخص پر لعنت کرے جو کسی جانور کے ساتھ بدکاری کرے اور تین بار فرمایا اللہ اس شخص پر لعنت کرے جو قوم لوط کا عمل کرے۔ (شعب الایمان ج ٤ ' رقم الحدیث : ٥٣٧٣ ' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ ' بیروت ١٤١٠ ھ)
حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا فاعل اور مفعول بہ کو قتل کردو اور اس کو جو کسی جانور کے ساتھ بدکاری کرے۔ (شعب الایمان ج ٤ ' رقم الحدیث : ٥٣٧٤ ' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ ' بیروت ١٤١٠ ھ)
حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : تین شخصوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بات نہیں کرے گا اور نہ ان کا تزکیہ کرے گا ' اور نہ ان کی طرف نظر (رحمت) کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ بوڑھا زانی اور جھوٹا حکمران اور متکبر فقیر۔
(صحیح مسلم ' ایمان ' ١٧٢ ' السنن الکبری ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ١٣٨٧ ' شعب الایمان ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ٥٤٠٥ ')
حضرت ابوسعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دنیا سرسبز میٹھی ہے اور بیشک اللہ تمہیں اس میں خلیفہ بنانے والا پھر دیکھنے والا ہے کہ تم اس میں کیسا عمل کرتے ہو ؟ سنو ! دنیا کے فتنہ سے بچو اور عورتوں کے فتنہ سے بچو۔ (سنن ترمذی ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ٢١٩٨ ' سنن ابن ماجہ ' ج ٢ ' رقم الحدیث : ٤٠٠٠ ' صحیح ابن حبان ' ج ٨ ' رقم الحدیث ٣٢٢١ ' مسند احمد ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ١١١٦٩ ')
حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : اللہ نے ابن آدم پر اس کے زنا کا حصہ لکھ دیا ہے جس کو وہ لامحالہ پائے گا ' آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے اور زبان کا زنا بولنا ہے ' اور نفس تمنا کرتا اور اشتہاء کرتا ہے اور شرمگاہ اس سب کی تصدیق اور تکذیب کرتی ہے۔
(صحیح البخاری ' ج ٧ ' رقم الحدیث : ٦٢٤٣ ' صحیح مسلم ' قدر ' ٢٠ (٢٦٥٧) ٦٦٢٩ ' سنن ابوداؤد ' ج ٢ ' رقم الحدیث : ٢١٥٢ ')

حضرت ابوامامہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ جو مسلمان کسی عورت کے محاسن کو دیکھے اور پھر اپنی نظر پھیرے تو اللہ اس کے دل میں عبادت کی حلاوت پیدا کردیتا ہے۔ (شعب الایمان 'ج ۴ 'رقم الحدیث : ۵۴۳۱')
حسن بن ذکوان کہتے تھے کہ خوبصورت بے ریش لڑکے حسین دوشیزاؤں سے زیادہ فتنہ انگیز ہیں۔ (شعب الایمان 'ج ۴ 'رقم الحدیث : '۵۳۹۷)

قتل ناحق کا حرام ہونا اور قتل برحق کی اقسام

قتل ناحق کو سمجھنا اس پر موقوف ہے کہ یہ جان لیا جائے کہ قتل برحق کون کون سے ہیں۔ جو شخص نماز پڑھنے یا زکوۃ دینے سے انکار کرے 'اس کو قتل کردیا جائے گا۔ اسی لیے حضرت ابوبکر صدیق (رض) نے مانعین زکوۃ سے قتال کیا تھا۔
حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مجھے لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے حتیٰ کہ وہ یہ شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں 'اگر انھوں نے یہ کرلیا تو انھوں نے مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو بچالیا 'ماسوا ان کے حقوق کے اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔ (صحیح البخاری 'ج ۱ 'رقم الحدیث : ۲۵ 'صحیح مسلم 'ایمان '۳۶ '(۲۲) ۱۲۸)
اور مرتد 'شادی شدہ زانی اور مسلمان کے قاتل کو بھی قتل کرنا برحق ہے۔
حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کسی مسلمان شخص کو جو اس بات کی شہادت دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے 'اور میں اللہ کا رسول ہوں (اس کو) قتل کرنا صرف تین میں سے ایک وجہ سے جائز ہے شدہ زانی ہو 'کسی مسلمان کا قاتل ہو اور دین اسلام کو ترک کرکے مسلمانوں کی جماعت سے نکلنے والا ہو۔ (صحیح 'ج ۷ "رقم الحدیث : '۶۸۷۸ 'صحیح مسلم 'حدود '۲۵ '(۱۶۷۶) ۴۲۹۶ 'سنن ابوداؤد 'ج ۴ 'رقم الحدیث : '۴۳۵۲ 'سنن الترمذی 'ج ۳ 'رقم الحدیث : '۱۴۰۷ 'سنن النسائی 'ج ۷ 'رقم الحدیث : '۴۰۱۶ 'سنن ابن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث : '۲۵۳۴)
ایک خلیفہ کے انعقاد کے بعد اگر دوسرے خلیفہ کے لیے بیعت کی جائے تو اس کو قتل کردیا جائے۔
حضرت ابوسعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب دو خلیفوں کے لیے بیعت کی جائے تو دوسرے کو قتل کردو۔ (صحیح مسلم 'الامارۃ '۶۱ '(۱۸۵۳) ۴۷۱۷)
جو شخص قوم لوط کا عمل کرے اس کو بھی قتل کردیا جائے۔
حضرت عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم جس کو قوم لوط کا عمل کرتے دیکھو تو فاعل اور مفعول بہ کو قتل کردو۔
(سنن ابوداؤد 'ج ۴ 'رقم الحدیث : '۴۴۶۲ 'سنن الترمذی 'ج ۳ 'رقم الحدیث : '۱۴۶۱ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث : '۲۵۶۱)
جو شخص جانور کے ساتھ بدفعلی کرے 'اس کو بھی قتل کردیا جائے۔

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ جو شخص جانور کے ساتھ بدفعلی کرے 'اس شخص کو قتل کردو اور اس جانور کو بھی قتل کردو۔

(سنن ابوداؤد ج ۴ 'رقم الحدیث : ۴۴۶۴ 'سنن الترمذی ج ۳ 'رقم الحدیث : ۱۴۶۰ ')

اس حدیث کی سند قوی نہیں ہے۔

ڈاکو کو قتل کردیا جائے۔قرآن مجید میں ہے :

(آیت) "انما جزآء الذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا اویصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف اوینفوا من الارض"۔(المائدہ : ۳۳)

ترجمہ : جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں 'ان کی یہی سزا ہے کہ ان کو قتل کیا جائے یا ان کو سولی دی جائے 'یا ان کے ہاتھ اور پیر مخالف جانبوں سے کاٹ دیئے جائیں یا ان کو شہر بدر کردیا جائے۔

اگر ڈاکوؤں نے مال بھی لوٹا ہو اور قتل بھی کیا ہو تو ان کو قتل کردیا جائے اور اگر انھوں نے صرف مال لوٹا ہو تو ان کے ہاتھ اور پیر مخالف جانبوں سے (یعنی سیدھا ہاتھ اور الٹا پیر) کاٹ دیئے جائیں اور اگر انھوں نے صرف دھمکایا ہو تو ان کو شہر بدر کردیا جائے جو لوگ مسلمان حاکم کے خلاف بغاوت کریں ان کو بھی قتل کردیا جائے۔قرآن مجید میں ہے :

(آیت) "افان بغت احداھما علی الاخری فقاتلوا التی تبغی حتی تفئی الی امر اللہ"۔(الحجرات : ۹)

ترجمہ : اگر ایک جماعت دوسری پر زیادتی کرے تو اس جماعت سے جنگ کرو جو زیادتی کرے حتی کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔

جو شخص چوتھی بار شراب پیئے اس کو بھی قتل کردیا جائے۔

حضرت معاویہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص خمر (شراب) پیئے اس کو کوڑے لگاؤ اور اگر وہ چوتھی بار شراب پیئے تو اس کو قتل کردو۔

(سنن الترمذی ج ۳ 'رقم الحدیث : ۱۴۴۹ 'مصنف عبدالرزاق 'ج ۹ 'رقم الحدیث : ۱۷۰۸۷ 'مسند احمد 'ج ۶ 'رقم الحدیث : ۱۶۸۵۹ ' سنن ابوداؤد 'ج ۴ 'رقم الحدیث : ۴۴۸۲ 'صحیح ابن حبان 'ج ۱۰ 'رقم الحدیث : ۴۴۴۶ 'سنن کبری للنسائی 'ج ۳ 'رقم الحدیث : ' ۵۲۹۷ 'سنن کبری للبیہقی ج ۸ '۳۱۳ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث : ۲۵۷۳ ')

ذمی کو قتل کرنا جائز ہے اور ذمی کے قاتل کو قتل کردیا جائے گا۔

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تمام مسلمان (وجوب قصاص میں) ایک دوسرے کی مثل ہیں۔ان میں سے ادنی اپنے حق کی سعی کرے گا (یعنی کسی کو پناہ دے گا) اور ان میں سے بعید بھی کسی کو پناہ دے سکے گا 'اور وہ ایک دوسرے کی معاونت کریں گے۔ان کے قوی کو ان کے ضعیف کے پاس لوٹایا جائے گا 'اور لشکری کو بیٹھنے والے پر لوٹایا جائے گا اور کسی مومن کو کافر (حربی) کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا 'اور نہ ذمی کو اس کے عہد میں قتل کیا جائے گا۔(سنن ابوداؤد ' ج ۲ 'رقم الحدیث : ۲۷۵۱ 'مطبوعہ دارالفکر 'بیروت)

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک مسلمان کو ایک ذمی کے بدلہ میں قتل کردیا اور فرمایا جو لوگ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں میں ان میں سب سے زیادہ کریم ہوں۔

(سنن دار قطنی ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ۳۲۳۲ ' سنن کبری للبیقی ج ۸ ' ص ۳۰)

قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں ہم نے قتل برحق کی یہ صورتیں بیان کی ہیں :

(۱) نماز پڑھنے سے انکار کرنے والے کو قتل کرنا۔

(۲) زکوۃ دینے سے انکار کرنے والے کو قتل کرنا۔

(۳) مرتد کو قتل کرنا۔

(۴) شادی شدہ زانی کو سنگسار کرکے قتل کرنا۔

(۵) مسلمان کے قاتل کو قتل کرنا۔

(۶) ایک خلیفہ منعقد ہونے کے بعد دوسرے مدعی خلافت کو قتل کرنا۔

(۷) قوم لوط کے عمل کرنے والے کو قتل کرنا۔

(۸) جانور کے ساتھ بدفعلی کرنے والے کو قتل کرنا۔

(۹) ڈاکو کو قتل کرنا '

(۱۰) چوتھی بار شراب پینے والے کو قتل کرنا۔

(۱۱) ذمی کے قاتل کو قتل کرنا۔

مسلمان اور ذمی کے قاتل کو قصاص میں قتل کیا جائے گا اور باقی (۹) کو تعزیرا قتل کیا جائے گا ' اور ان کو قتل کرنا حکومت کا منصب ہے۔ عوام میں سے کسی شخص کو انھیں قتل کرنے کا اختیار نہیں ہے ' مسلمان کے قاتل پر قرآن مجید اور احادیث میں سخت وعیدیں ہیں ' ہم ان میں سے بعض کا ذکر رہے ہیں :

قتل مومن پر وعید

(آیت) ’من یقتل مؤمنا متعمدا فجزآءہ جھنم خالدا فیھا وغضب اللہ علیہ ولعنہ واعدلہ عذابا عظیما“۔ (النساء : ۹۳)

ترجمہ : جو شخص کسی مومن کو عمدا قتل کرے تو اس کو سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اللہ اس پر غضبناک ہوگا اور اس پر لعنت فرمائے گا اور نے اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

امام ترمذی نے سند حسن کے ساتھ حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن مقتول قاتل کو پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر لائے گا ' درآنحالیکہ اس کی رگوں سے خون بہہ رہا ہوگا ' وہ کہے گا کہ اے میرے رب ! اس نے مجھے قتل کیا تھا ' حتی کہ اس کو عرش کے قریب کھڑا کرے گا۔ حضرت ابن عباس (رض) کے سامنے لوگوں نے توبہ کا ذکر کیا تو انھوں نے اس آیت کی تلاوت کی اور فرمایا کہ یہ آیت منسوخ ہوئی ہے ' نہ تبدیل ہوئی ہے ' اس کی توبہ کہاں سے ہوگی !

امام احمد ' امام نسائی اور امام ابن المنذر نے حضرت معاویہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قریب ہے کہ ہر گناہ کو اللہ معاف فرمادے گا سوا اس شخص کے جو کفر پر مرے اور سوا اس شخص کے جو کسی مومن کو عمدا قتل کرے۔
امام ابن المنذر نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ جو شخص کسی ایک بات سے بھی مومن کے قتل میں تعاون کرے گا ' قیامت کے دن جب وہ اللہ سے ملاقات کرے گا تو اس کی پیشانی پر لکھا ہو گا کہ یہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہے۔
امام سعید بن منصور ' امام ابن جریر ' امام ابن المنذر اور امام بیہقی نے روایت کیا ہے کہ ابو مجلز نے کہا اس آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ جہنم کی سزا کا مستحق ہے ' اگر اللہ چاہے گا تو اس کی سزا سے درگزر فرمائے گا۔ (درمنثور ' ج ۲ ' ص ٦٢٨ ' ٦٢٤ ' ملخصا ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت)

یتیم کے مال میں بے جا تصرف کا حرام ہونا

اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا ہے اور اچھے طریقہ کے بغیر مال یتیم کے قریب نہ جاؤ حتی کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے اور سورۃ نساء میں فرمایا ہے اور یتیموں کو جانچتے رہو ' حتی کہ جب وہ نکاح (کی عمر) کو پہنچ جائیں اور اگر تم ان میں عقل مندی (کے آثار) دیکھو تو ان کے مال ان کے حوالے کردو ' اور ان کے اموال کو فضول خرچی اور جلد بازی سے نہ کھاؤ اس ڈر سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے۔ (النساء : ٦)
سورۃ نساء کی اس آیت میں ان کی بدنی قوت کا بھی اعتبار کیا ہے جیسا کہ بلوغت کی عمر کو پہنچنے کے ذکر سے ظاہر ہوتا ہے اور ان کی ذہنی صلاحیت اور قوت کا بھی اعتبار کیا ہے جیسا کہ اس قید سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم ان میں عقلمندی کے آثار دیکھو ' کیونکہ اگر جوان ہونے کے بعد یتیم کا مال اس کے حوالہ کردیا جائے اور وہ ذہین اور عقل مند نہ ہو تو اس بات کا خدشہ ہے کہ وہ اپنی خواہشوں اور شوق کو پورا کرنے میں سارا مال ضائع کردے گا اور اس کے پاس کچھ نہیں رہے گا ' اس لیے جب تک وہ سمجھ دار نہ ہو جائے ' مال اس کے حوالے نہ کیا جائے۔ اس عمر کے تعین میں علماء کا اختلاف ہے۔ ابن زید نے کہا وہ بالغ ہو جائے۔ اہل مدینہ نے کہا ' وہ بالغ بھی ہو اور اس میں سمجھ داری کے آثار بھی ظاہر ہوں۔ امام ابو حنیفہ (رح) کے نزدیک یہ عمر پچیس سال ہے۔

یتیم کا مال ناجائز طور پر کھانے کے متعلق بہت سخت وعید ہے

(آیت) "ان الذین یاکلون اموال الیتمی ظلما انما یاکلون فی بطونھم نارا وسیصلون سعیرا "۔ (النساء : ١٠)
ترجمہ : بیشک جو لوگ ناجائز طور پر یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں محض آگ بھر رہے ہیں ' اور وہ عنقریب بھڑکتی ہوئی آگ میں پہنچیں گے "۔
امام ابن ابی شیبہ ' امام ابویعلی ' امام طبرانی ' امام ابن حبان اور امام ابن ابی حاتم نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن کچھ لوگ اپنی قبروں سے اٹھیں گے درآنحالیکہ ان کے مونہوں سے آگ کے شعلے نکل

رہے ہوں گے۔ عرض کیا گیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں' وہ اپنے پیٹوں میں محض آگ بھر رہے ہیں۔

امام ابن جریر اور امام ابن ابی حاتم نے حضرت ابو سعید خدری (رض) سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں شب معراج کے واقعات میں بیان فرمایا میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا ان کے ہونٹ اونٹوں کے ہونٹوں کی طرح تھے اور ان پر ایک شخص مقرر تھا جو ان کے ہونٹوں کو پکڑتا اور ان کے منہ میں آگ کے بڑے بڑے پتھر ڈال دیتا' پھر وہ پتھر ان کے نچلے دھڑ سے نکل جاتے اور وہ زور زور سے چلاتے تھے۔ میں نے پوچھا اے جبرائیل! یہ کون لوگ ہیں؟ انھوں نے کہا یہ وہ لوگ ہیں؟ جو ناحق یتیموں کا مال کھاتے تھے۔

امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: چار ایسے شخص ہیں کہ اللہ پر حق ہے کہ ان کو جنت میں داخل نہ کرے اور نہ ان کو کوئی نعمت چکھائے۔ دائم الخمر' سود خور' یتیم کا مال ناحق کھانے والا اور ماں باپ کا نافرمان۔ (درمنثور' ج ۴ ص ۴۴۴' مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۴۱۴ھ)

ناپ تول میں کمی کا حرام ہونا

(آیت) "ولا تنقصوا المکیال والمیزان"۔ (ھود: ۸۴)

ترجمہ: اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو۔

(آیت) "ویقوم اوفوا المکیال والمیزان بالقسط ولا تبخسوا الناس اشیآءھم"۔ (ھود: ۸۵)

ترجمہ: اے میری قوم ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو اور لوگوں کی چیزیں کم کرکے انھیں نقصان نہ پہنچاؤ۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ جس قوم میں خیانت ظاہر ہوگی ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا جائے گا' اور جس قوم میں بہ کثرت زنا ہوگا ان میں بکثرت موت ہوگی' اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرے گی ان کا رزق کاٹ دیا جائے گا' اور جو قوم ناحق فیصلے کرے گی ان میں بہت خون ریزی ہوگی' اور جو قوم عہد شکنی کرے گی اللہ تعالیٰ ان پر دشمن کو مسلط کردے گا۔

(موطا امام مالک' رقم الحدیث: ۹۹۸)

ناحق بات کا حرام ہونا

(آیت) "یایھا الذین امنوا کونوا قوامین بالقسط شھدآء للہ ولو علی انفسکم او الوالدین والاقربین ان یکن غنیا او فقیرا فاللہ اولی بھما فلا تتبعوا الھوی ان تعدلوا"۔ (النساء: ۱۳۵)

ترجمہ: اے ایمان والو! انصاف پر اچھی طرح قائم رہنے والے ہو جاؤ' درآنحالیکہ اللہ کے لیے گواہی دینے والے ہو 'خواہ (وہ گواہی) خود تمہارے خلاف ہو یا والدین کے یا رشتہ داروں کے (جس کے متعلق گواہی دی ہے) خواہ وہ مالدار ہو یا فقیر 'اللہ ان دونوں کا تم سے زیادہ خیر خواہ ہے 'لہٰذا تم اپنی خواہش کی پیروی کر کے عدل سے گریز نہ کرو۔

(آیت) "فلا تخشوا الناس واخشونی"۔ (المائدہ: ۴۴)

ترجمہ: پس تم لوگوں سے نہ ڈرو اور مجھ سے ہی ڈرو۔

حضرت طارق بن شہاب (رض) بیان کرتے ہیں 'ایک شخص نے رکاب میں پیر رکھتے ہوئے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا ' کونسا جہاد افضل ہے؟ آپ نے فرمایا ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہنا۔ (سنن النسائی 'ج ۷ 'رقم الحدیث: ۴۲۲۰ 'مطبوعہ دار المعرفہ ' بیروت '۱۴۱۲ھ)

حضرت ابو سعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنا افضل جہاد ہے۔

(سنن ابوداؤد 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ۴۳۴۴ 'سنن الترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث: ۲۱۸۱ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث: ۴۰۱۱ 'مسند احمد ' ج ۳ 'ص ۱۹ 'ج ۴ 'ص ۳۱۵ '۳۱۴ 'ج ۵ 'ص ۲۵۱ طبع قدیم)

حضرت ابو سعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خطبہ میں جو باتیں فرمائیں 'ان میں یہ بھی فرمایا کہ جب کسی شخص کو کسی حق بات کا علم ہو تو وہ لوگوں کے دباؤ کی وجہ سے اس کو بیان کرنے سے باز نہ رہے۔

(سنن الترمذی 'ج ۴ 'رقم الحدیث: '۲۱۹۸ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث: '۴۰۰۷ 'صحیح ابن حبان 'ج ۸ 'رقم الحدیث: '۳۲۲۱ ' مسند احمد 'ج ۳ 'ص ۹۲ '۸۷ '۸۴ '۷۱ '۶۱ '۵۲ '۵۰ '۴۷ '۴۴ '۱۹ 'طبع قدیم 'مسند احمد 'ج ۴ 'رقم الحدیث: '۱۱۱۶۹ 'طبع جدید دار الفکر ' المعجم الاوسط 'ج ۳ 'رقم الحدیث: '۲۸۲۵)

اللہ تعالیٰ سے بدعہدی کرنے کا حرام ہونا:

(آیت) "واوفوا بعهد الله اذا عاهدتم ولا تنقضوا الایمان بعد توکیدها"۔ (النحل: ۹۱)

ترجمہ: اور جب تم عہد کرو تو اللہ کے عہد کو پورا کرو اور قسموں کو پکا کرنے کے بعد نہ توڑو۔

(آیت) "فاعقبهم نفاقا فی قلوبهم الی یوم یلقونه بما اخلفوا الله ما وعدوه وبما کانوا یکذبون"۔ (التوبہ: ۷۷)

ترجمہ: سو اللہ سے ملاقات کے دن تک ان کے دلوں میں نفاق رکھ دیا 'کیونکہ انھوں نے اللہ سے کیے ہوئے وعدہ کی خلاف ورزی کی تھی اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن جب اللہ اولین وآخرین کو جمع فرمائے گا تو ہر عہد شکن کے لیے ایک جھنڈا بلند کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں بن فلاں کی عہد شکنی کا جھنڈا ہے۔

(صحیح البخاری 'ج ۷ 'رقم الحدیث: '۶۱۷۷ 'صحیح مسلم 'جہاد '۹ '(۱۷۳۵) ۴۴۴۸ 'سنن الترمذی 'ج ۳ 'رقم الحدیث: '۱۵۸۷ 'سنن ابوداؤد 'ج ۲ 'رقم الحدیث: '۲۷۵۶ 'صحیح ابن حبان 'ج ۱۶ 'رقم الحدیث: '۷۳۴۳ 'مسند احمد 'ج ۲ 'رقم الحدیث: '۴۶۴۸ 'مسند احمد '

ج ۱ ،ص ۴۱۱، ۴۱۷، ۴۴۱، ۴۴۴، ج ۲ ،ص ۵۶، ۴۹، ۴۸، ۲۹، ۱۶،طبع قدیم ،مسند احمد ،ج ۲ ،رقم الحدیث : ۴۶۶۸، ۴۶۴۸ ،طبع جدید ،سنن کبری ، للبیہقی ،ج ۸ ،ص ۱۶۰۔۱۵۹)

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خطبہ میں فرمایا سنو ! جو امانت دار نہ ہو اس کا ایمان نہیں اور جو عہد پورا نہ کرے وہ دین دار نہیں۔ (شعب الایمان ،ج ۴ ،رقم الحدیث : ۴۳۵۴) (تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی القرآن)

صاحب تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل فرماتے ہیں :

یہودیوں کے رہنماؤں نے اپنی طرف سے حلال وحرام کے قواعد بنا کر لوگوں کو یہ تاثر دیا ہوا تھا۔ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرام کی گئی ہیں۔ پہلی آیات میں ان کے جھوٹ کی قلعی کھول کر اس فہرست کو عقل و نقل کے خلاف ثابت کیا ہے پھر اس پر ان سے گواہی طلب کی گئی جب وہ ان چیزوں کی حرمت وحلت کے بارے میں گواہی دینے سے انکاری اور ان کے جواز کی دلیل دینے میں ناکام ہوئے تو آپ کو حکم ہوا کہ انھیں بلائیں اور ارشاد فرمائیں کہ وہ چیزیں حرام نہیں جنھیں تم حرام کہتے ہو بلکہ اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں میرے دین اور پہلی شریعتوں میں حرام قرار دی ہیں۔

۱۔ شرک : اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات میں غیروں کو شریک سمجھنا اور شرک کرنا ہے۔

شرک کے بارے میں قرآن مجید نے فرمایا ہے اس کی کوئی دلیل نہیں اتاری گئی۔ اس لیے اسے ظلم عظیم قرار دیا گیا جو شخص شرک کے حق میں دلیل دیتا ہے گویا کہ وہ خاکم بدہن، اللہ تعالیٰ کو جھوٹا قرار دے کر اس کی ذات اور صفات میں شریک ثابت کرنے کی گھٹیا ترین کوشش کرتا ہے۔ تمام انبیاء کرام (علیہ السلام) نے شرک کی تردید کے لیے اپنی زندگیاں صرف کردیں۔ لیکن اس کے باوجود مشرک اس کے جواز کی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے شدید ترین الفاظ میں اسے ظلم اور ناجائز ثابت کرکے ناقابل معافی جرم قرار دیا ہے۔

(عَنْ أَنَسٍ (رض) قَالَ سُءِلَ النَّبِيّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عَنِ الْکَبَاءِرِ قَالَ الْإِشْرَاكُ باللّٰہِ وَعُقُوقُ الْوَالِدَیْنِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَشَھَادَۃُ الزُّورِ) [رواہ البخاری : کتاب الشھادات، باب ما قیل فی شھادۃ الزور]

”حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے استفسار کیا گیا کہ گناہ کبیرہ کون سے ہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، بےگناہ کو قتل کرنا اور جھوٹی گواہی دینا۔“

۲۔ والدین کی نافرمانی : قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کا اثبات اور شرک کی نفی کرتے ہوئے والدین کے احترام و مقام اور ان کے ساتھ احسان کے ساتھ پیش آنے کا حکم دیا ہے۔ ہر مرتبہ والدین کی اطاعت کا حکم دے کر لفظ احسان استعمال فرمایا ہے۔ حدیث میں احسان کا لفظ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بارے میں استعمال ہوا ہے کہ عبادت گزار کے ذہن میں یہ تصور پیدا ہو جیسا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو براہ راست دیکھ رہا ہے۔ اگر احسان کا یہ درجہ حاصل نہیں ہوتا تو کم از کم یہ تو ضرور ہونا چاہیے کہ وہ یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے۔ (مسلم : باب بیان الایمان والاسلام والاحسان) ”احسان “کا دوسرا معنٰی یہ ہے کہ کوئی نیکی نہ بھی کرے پھر بھی اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ تمام شریعتوں میں اخلاق کے اس درجہ کو احسان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں والدین کے بارے میں یہ لفظ 5 مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ جس کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ اولاد کو والدین کی کمزوریوں پر نظر رکھنے کے بجائے ان کے مرتبہ و مقام اور احسانات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقام و

مرتبہ کے ساتھ والدین کے مقام کا اس لیے ذکر کیا ہے کہ والدین کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بعد انسان کی تخلیق اور پرورش کا واحد ذریعہ قرار دیا ہے اور اسی تصور کو تازہ کرنے اور یاد رکھنے کے لیے یہ دعا کرنے کا حکم دیا۔

(عن عَبْدِاللّٰہِ(رض) قَالَ سَأَلْتُ النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) أَيُّ الْعَمَلِ أَحَبُّ إِلَى اللّٰہِ قَالَ الصَّلَاۃُ عَلٰی وَقْتِہَا قَالَ ثُمَّ أَيٌّ قَالَ بِرُّ الْوَالِدَيْنِ قَالَ ثُمَّ أَيٌّ قَالَ الْجِہَادُ فِي سَبِيلِ اللّٰہِ قَالَ حَدَّثَنِي بِہِنَّ وَلَوِ اسْتَزَدْتُہُ لَزَادَنِي)

[رواہ البخاری : کتاب الأدب، باب قول اللہ تعالیٰ ووصینا الانسان بوالدین احسانا]

”حضرت عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے استفسار کیا کونسا عمل اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے ؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا نماز کو اس کے وقت پر ادا کرنا۔ میں نے پوچھا پھر کونسا ہے ؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا والدین کے ساتھ نیکی کرنا۔ میں نے پوچھا پھر کونسا عمل ہے ؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔ حضرت عبداللہ (رض) فرماتے ہیں یہ باتیں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بتائیں اگر میں مزید پوچھتا تو آپ مجھے اور بھی بتاتے۔“

۳۔ قتل اولاد : سورۃ الانعام کی آیت ۱۳۷ کے تفسیر کرتے ہوئے عرض کیا گیا ہے کہ ہمیشہ سے دنیا میں قتل اولاد چار صورتوں میں سے کوئی ایک صورت رہی ہے۔

۱۔ رزق کی تنگی کی وجہ سے اولاد قتل کرنا۔

۲۔ غیر اللہ کے نام پر بچوں کو قتل کرنا۔

۳۔ رشتہ داماد کی عار سے بچنے کے لیے بیٹیوں کو قتل کرنا۔

۴۔ جنگ وجدال میں بچیوں کی گرفتاری کے خوف سے قتل کرنا۔

قتل اولاد کے جرم کے بارے میں سورۃ الانعام آیت ۱۳۷ کی تشریح ملاحظہ فرمائیں۔

”زمانہ جاہلیت کا یہ فعل قبیح آج کل ضبط ولادت یا خاندانی منصوبہ بندی کے نام سے پوری دنیا میں زور و شور سے جاری ہے اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔“

کھلی اور پوشیدہ بے حیائی سے اجتناب کا حکم

دین اسلام اپنے ماننے والے کو صرف بے حیائی کرنے سے ہی نہیں روکتا بلکہ دین ایسے ذرائع اور مقامات کے قریب جانے سے بھی منع کرتا ہے جس سے اس کی آنکھوں میں بے حیائی، دماغ میں بری سوچ اور اس کا وجود برائی کی طرف مائل ہو جائے۔ اس کے لیے سورۃ بنی اسرائیل آیت ۳۲ میں فرمایا کہ زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ یہ بے حیائی کے ساتھ بدترین راستہ ہے۔ سورۃ الانعام، آیت ۱۲۰ میں حکم دیا گیا کہ گناہ کھلا ہو یا پوشیدہ اسے چھوڑ دینا چاہیے۔ سورۃ النحل، آیت : ۹۰ میں کھلی بے حیائی، برے کام اور سرکشی سے منع کیا گیا ہے۔

یہاں بھی یہی حکم ہوا کہ بے حیائی کھلی ہو یا پوشیدہ اس کے قریب بھی نہ پھٹکنا۔ کیونکہ جو شخص بے حیائی کی طرف توجہ کرتا ہے اس کے بارے میں خطرہ ہے کہ وہ کسی وقت بھی اس میں ملوث ہو جائے گا۔ اسی خطرے کے پیش نظر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے :

(عن أبي هُرَيْرَةَ (رض) عَنِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَى ابْنِ آدَمَ حَظَّهُ مِنَ الزِّنَا أَدْرَكَ ذٰلِكَ لَا مَحَالَةَ فَزِنَا الْعَيْنِ النَّظَرُ وَزِنَا اللِّسَانِ الْمَنْطِقُ وَالنَّفْسُ تَمَنَّى وَتَشْتَهِي وَالْفَرْجُ يُصَدِّقُ ذٰلِكَ كُلَّهُ وَيُكَذِّبُهُ)

[رواہ البخاری : کتاب الاستئذان، باب زنا الجوارح دون الفرج]

”حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آدم کی اولاد پر اس کا حصہ زنا کا مقرر کردیا ہے وہ اس سے بچ نہیں سکتا وہ اس کو پالے گا آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے اور زبان کا زنا فحش باتیں کرنا ہے۔ انسان کا نفس اس کی خواہش کرتا ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے۔“

(عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ (رض) قَالَ كَانَ الْفَضْلُ بْنُ عَبَّاسٍ رَدِيفَ رَسُولِ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فَجَاءَتْهُ امْرَأَةٌ مِنْ خَثْعَمٍ تَسْتَفْتِيهِ فَجَعَلَ الْفَضْلُ يَنْظُرُ إِلَيْهَا وَتَنْظُرُ إِلَيْهِ فَجَعَلَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصْرِفُ وَجْهَ الْفَضْلِ إِلَى الشِّقِّ الْآخَرِ)

[رواہ ابوداؤد : کتاب المناسک، باب الرجل یحج عن غیرہ]

”حضرت عبداللہ بن عباس (رض) بیان کرتے ہیں فضل بن عباس (رض) نبی معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے سواری پر سوار تھے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک عورت خثعم قبیلہ کی آئی اور کوئی مسئلہ پوچھنے لگی۔ فضل بن عباس اس کی طرف دیکھنے لگے اور عورت اس کی طرف دیکھنے لگی رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فضل بن عباس (رض) کا چہرہ دوسری جانب پھیر دیا۔“

۵۔ قتل نفس :

سورۃ المائدۃ، آیت ۳۱ اور ۳۲ میں دنیا میں انسانی قتل کے پہلے واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اسی وقت سے بنی اسرائیل پر یہ بات لاگو کردی تھی کہ جس نے کسی شخص کو ناجائز قتل کیا یا زمین میں دنگا فساد اور تخریب کاری کی تو گویا اس نے سب انسانوں کو تہہ تیغ کردیا ہے اور جس نے ایک شخص کی جان بچالی اس نے پوری انسانیت کا تحفظ کیا اسلام میں کسی کو قتل کرنے کی بنیادی طور پر چار صورتیں ہیں۔

۱۔ جو شخص دین اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہوجائے اسے قتل کردیا جائے۔

۲۔ قتل کے بدلے قتل۔

۳۔ شادی شدہ زانی کو پتھر مار مار کر ختم کیا جائے۔

۴۔ خلیفہ برحق کے ہوتے ہوئے جو شخص اس کی خلافت میں دوسری خلافت قائم کرے یا بغاوت کرے اسے قتل کردیا جائے۔

قیامت کے دن حقوق اللہ کے بارے میں پہلا فیصلہ نماز کے بارے میں اور حقوق العباد کے بارے میں پہلا مقدمہ انسانی قتل کے بارے ہوگا۔

(عَنْ جَرِيرٍ (رض) أَنَّ النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ لَهُ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ اسْتَنْصِتِ النَّاسَ فَقَالَ لَا تَرْجِعُوا بَعْدِي كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ) [رواہ البخاری : کتاب العلم، باب الانصات للعلماء]

"حضرت جریر (رض) بیان کرتے ہیں بلاشبہ نبی معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسے حجۃالوداع کے موقع پر فرمایا لوگوں کو خاموش کراؤ پھر فرمایا اے لوگو! میرے بعد تم کفر کی طرف نہ لوٹ جانا کہ تم باہم ایک دوسرے کو قتل کرنا شروع کردو۔"

اس آیت میں شرک سے منع کرنا، قتل اولاد سے روکنا، کھلی اور پوشیدہ برائی سے دور رہنا اور ناجائز قتل کرنے سے روکنے کے ساتھ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے شرک سے پوری طرح بچ کر اللہ تعالیٰ کی توحید کا عقیدہ اپنایا جائے اور اولاد کو رزق کی تنگی کی بناپر قتل کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی رزاقی پر بھروسہ کرتے ہوئے ان کی پرورش اور تربیت کی جائے۔ ہر قسم کی بے حیائی کے قریب جانے کے بجائے عفت و عصمت کی حفاظت کی جائے اور دوسرے کو ناحق قتل کرنے کے بجائے اس کے مال وجان، عزت وآبرو کی حفاظت کی جائے اور والدین کی نافرمانی کی بجائے ان کے ساتھ حسن سلوک برتا جائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دانشمندوں کے لیے وصیت ہے۔

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

خاندانی منصوبہ بندی کا حکم

اس آیت سے معلوم ہوا کہ غربت کے باعث خاندانی منصوبہ بندی جائز نہیں۔آجکل کہا جاتا ہے کہ بچے کم پیدا کرو آبادی پر کنٹرول رکھو ورنہ ان کے رزق کا مسئلہ بن جائے گا یہ دور جاہلیت کے غیر اسلامی فکر ہے اور اس فکر کے تحت خاندانی منصوبہ بندی (برتھ کنٹرول) کرنا حرام ہے۔ کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفت رزاقیت پر عدم توکل بلکہ عدم ایمان کا اظہار ہے گویا برتھ کنٹرول کی یہ صورت کفر تک جاسکتی ہے جبکہ اللہ فرماتا ہے: ومامن دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا۔ زمین میں جو بھی جانور ہے اس کا رزق بہرحال اللہ کے ذمے ہے (ہود۔ 6) بلکہ اللہ نے قرآن کریم کا آغاز ہی ان الفاظ سے فرمایا: "الحمد للہ رب العالمین۔ اللہ کے لیے سب تعریفیں ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔ وہ تمام جہانوں کا ایسا پالنے والا ہے کہ گوشت خور درندوں کو جنگلوں بیابانوں میں، مچھلیوں کو سمندر کی تہہ میں اور چیونٹیوں اور کیڑوں مکوڑوں کو زمین اور پتھروں کے سوراخوں میں ان کا رزق پہنچاتا ہے، تو بھلا وہ سب سے افضل مخلوق انسان کو کیوں بھوکا مارے گا؟ جبکہ اس نے انسان کو عقل و شعور کی بے پناہ دولت سے مالا مال فرمایا ہے۔

البتہ عورت کی صحت کے پیش نظر خاندانی منصوبہ بندی کی کسی صورت کا اپنانا جائز ہے۔ یعنی اگر عورت کی صحت اچھی نہ ہو یا بچے آپریشن سے پیدا ہوتے ہوں اور ڈر ہو کہ مزید بچے کا پیدا ہونا عورت کی زندگی کو خطرات لاحق کرسکتا ہے تو خاندانی منصوبہ بندی کی جاسکتی ہے بلکہ کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح اگر یہ ڈر ہو کہ زیادہ بچے پیدا کرنے سے عورت کی صحت اور اس کا حسن و جمال تیزی سے زائل ہوجائے گا اور اس میں شوہر کی رغبت کم ہوجائے گی یا وہ بیماریوں کا شکار ہوجائے گی اور اپنے بچوں کی بہتر تربیت نہیں کرسکے گی تو ان پریشانیوں سے بچنے کے لیے بھی فیملی پلاننگ یعنی خاندانی منصوبہ بندی جائز ہے۔

صحابہ کرام (رض) بھی ایسی ہی ضرورتوں کی وجہ سے عزل کرلیا کرتے تھے یعنی مباشرت کے وقت مادہ منویہ کا باہر ضائع کردینا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو اس سے منع نہ فرمایا۔ چنانچہ حضرت ابو سعید خدری (رض) کہتے ہیں: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم) کے پاس عزل کا ذکر کیا گیا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ جس جان کو اللہ نے پیدا کرنا ہے وہ اسے ضرور پیدا کر دے گا، مگر آپ نے یہ نہ فرمایا کہ ایسا مت کرو۔ (ابوداؤد۔ کتاب النکاح باب 48)

حضرت جابر (رض) کہتے ہیں: **کنا نعزل والقرآن ینزل**۔ جس دور میں ہم عزل کرتے تھے تب قرآن اترتا تھا (یعنی اگر عزل ممنوع ہوتا تو قرآن اس سے منع کر دیتا) (بخاری کتاب النکاح باب 98)

جبکہ حاصل کرنے میں اور جدید دور کی مانع حمل احتیاطی تدابیر خاندانی منصوبہ بندی میں کوئی فرق نہیں ہے دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ لہٰذا دونوں کا حکم بھی ایک ہی ہے کہ اگر کسی مجبوری کے تحت ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں اگر اس ڈر سے ہو کہ بچوں کو کھلایا پلایا کہاں سے جائے گا تو حرام ہے اور اگر عورت کی جان جانے کا خطرہ ہو تو یہ واجب ہے۔

یہاں فواحش سے زنا اور اس کے دواعی مراد ہے یعنی وہ کام جو زنہ تک پہنچاتے ہیں جیسے عورتوں کا ننگے سر ننگے بازو اور چست کپڑوں میں پھرنا مردوں کا انھیں بد نگاہی سے دیکھنا نا محرم عورتوں کے ساتھ بے حیائی کی باتیں کرنا۔ ان کے ساتھ تنہائی میں بیٹھنا یا سفر کرنا۔ اسی طرح بے حیائی پر مشتمل فلمیں ڈرامے دیکھنا اور گانے سننا۔ یہ سب زنا کا راستہ ہموار کرنے والے کام ہیں اللہ تعالیٰ نے انھیں فواحش کہہ کر ان سے دور رہنے کا حکم فرمایا ہے کہ نہ خفیہ طور پر ایسا کوئی طریقہ اپناؤ نہ اعلانیہ طور پر۔ اسلام سے قبل عرب میں زنا اور بے حیائی کے کام عام تھے۔ اہل عرب کی وہی حالت تھی جو اہل یورپ وامریکہ کی آج ہے گویا اسلام کو چھوڑ کر اہل مغرب دور جاہلیت کی تاریکی میں بھٹک رہے ہیں۔ وہ حیا شرم اور عصمت جیسی پاکیزہ انسانی صفات سے نا آشنا ہو چکے ہیں۔ آج یورپ وامریکا میں 30 سے 40 فیصد تک حرامی بچے پیدا ہوتے ہیں جنہیں معلوم نہیں کہ ان کا باپ کون ہے۔

عرب میں اسلام سے قبل قتل وغارت عام تھی معمولی جھگڑوں میں سینکڑوں انسان مار دیے جاتے تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ناحق قتل کو حرام قرار دے کر قتل کی گرم بازاری ختم فرمائی۔ الا بالحق:۔ سے مراد یہ ہے کہ قتل کے بدلے میں قاتل کو قتل کرنا اور ڈاکوؤں اور مرتدوں کو قتل کرنا اللہ کا حکم اور حکومت کی ذمہ داری ہے اس کے سوا کسی مومن کا قتل جائز نہیں اسی طرح جس کافر قوم سے مسلمانوں کا معاہدہ امن ہو ان کے کسی فرد کا قتل بھی حرام ہے۔ معلوم ہوا اسلام دہشت گردی سے روکتا ہے۔

(برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب القرآن)

فوائد

1: توراۃ وانجیل میں، اس سے معلوم ہوا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رب کی تعلیم سے پچھلی کتابیں جانتے ہیں۔ یا قرآن میں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کفار عقائد کے اور بعض اعمال کے مکلّف ہیں لہٰذا انھیں بچوں کو قتل کرنے عورت کو ستی ہونے، زنا جوئے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

2: معلوم ہوا کہ ماں باپ اگرچہ کافر ہوں ان کا حق مادری پدری ادا کرنا ضروری ہے۔ اس احسان میں تمام قسم کے اچھے سلوک داخل ہیں۔ ان کا ادب لحاظ، ان پر ضرورت کے وقت مال خرچ کرنا بعد وفات ان کی فاتحہ وختم سب ہی داخل ہیں۔

3: اس میں ان لوگوں سے خطاب ہے جو غریبی کی وجہ سے لڑکے لڑکیوں کو قتل کر ڈالتے تھے۔ جو مالدار صرف لڑکیوں کو قتل کرتے تھے ان کا ذکر دوسری آیات میں ہے لہٰذا من املاق کی قید بیان واقعہ کے لیے ہے احترازی نہیں۔

4 : یعنی تم اور تمہاری اولاد ہمارے بندے ہیں ان کا رزق ہمارے ذمہ کرم پر ہے تم کیوں انھیں قتل کرتے ہو۔

5 : اس سے معلوم ہوا کہ ظاہر میں نیک رہنا، چھپ کر گناہ کرنا تقوی نہیں بلکہ ریاکاری ہے تقوی یہ ہے کہ ہر حال میں رب سے خوف کرے۔ ریاکار کھلے فاسق سے زیادہ خطرناک ہے۔ شعر

تن اجلا من کالا بگلے کے سے بھیک
اس سے تو کانگہ بھلا کہ اوپر نیچے ایک

رب تعالیٰ صحیح تقوی نصیب فرمادے۔ آمین۔

6 : جو مسلمان قتل کا مستحق ہو جاوے۔ جیسے مرتد زانی قاتل اسے قتل کرنا حق ہے مگر یہ حق حاکم کو پہنچتا ہے۔ ہر مسلمان قتل نہیں کرسکتا۔
(تفسیر نور العرفان)

آیت مبارکہ :

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝١٥٢

لغۃ القرآن : وَلَا : اور نہ] [تَقْرَبُوا : تم سب قریب جاؤ] [مَالَ : مال] [الْيَتِيْمِ : يتيم کے] [اِلَّا : مگر] [بِالَّتِيْ :" اس طریقے " سے جو] [هِيَ : وہ] [اَحْسَنُ : زیادہ بہتر] [حَتّٰي : یہاں تک کہ] [يَبْلُغَ : پہنچ جائے] [اَشُدَّهٗ : اپنی پختگی کو] [وَاَوْفُوا : اور تم سب پورا کرو] [الْكَيْلَ : ماپ] [وَالْمِيْزَانَ : اور تول] [بِالْقِسْطِ : انصاف کی] [لَا : نہیں] [نُكَلِّفُ : ہم تکلیف دیتے] [نَفْسًا : کسی شخص کو] [اِلَّا : مگر] [وُسْعَهَا : اس کی گنجائش کے مطابق] [وَاِذَا : اور جب] [قُلْتُمْ : تم نے کہا] [فَاعْدِلُوْا : تو تم سب انصاف کرو] [وَلَوْ : اور اگر] [كَانَ : ہے] [ذَا : وہ] [قُرْبٰي : قرابت] [وَبِعَهْدِ : اور عہد کو] [اللّٰهِ : اللہ] [اَوْفُوْا : سب پورا کرو] [ذٰلِكُمْ : یہ " سب "] [وَصّٰىكُمْ : اس نے وصیت کی ہے تمہیں] [بِهٖ : اس کو] [لَعَلَّكُمْ : تاکہ تم] [تَذَكَّرُوْنَ : سب نصیحت حاصل کرو]

ترجمہ : اور یتیم کے مال کے قریب مت جانا مگر ایسے طریق سے جو بہت ہی پسندیدہ ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے، اور پیمانے اور ترازو (یعنی ناپ اور تول) کو انصاف کے ساتھ پورا کیا کرو۔ ہم کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے، اور جب تم (کسی کی نسبت کچھ) کہو تو عدل کرو اگرچہ وہ (تمہارا) قرابت دار ہی ہو، اور اللہ کے عہد کو پورا کیا کرو، یہی (باتیں) ہیں جن کا اس نے تمہیں تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو

تشریح:

پہلی آیت میں ایک کام کو کرنے اور چار کاموں سے منع کیا گیا ہے۔ اب معاشرے کے نہایت ہی پسماندہ طبقے یتیموں کے مالی حقوق کے تحفظ کا حکم دیا ہے کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ سن بلوغت کو پہنچ جائے۔ شریعت کے مطابق یتیم وہ ہوتا ہے جس کا بلوغت سے پہلے باپ فوت ہو جائے۔ نابالغ بچے میں کاروبار کرنے اور مال کے تحفظ کے سلسلے میں وہ شعور اور پختگی نہیں ہوتی جو جوان اور بالغ بچے میں ہوتی ہے۔ اس لیے حکم دیا کہ یتیم کے مال کے قریب بھی نہیں جانا۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ یتیم کے مال کو ناجائز طریقے سے کھانا سخت منع ہے۔

قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں یتیم کی پرورش اس کے مال کا تحفظ کرنا اس کے سرپرست کی ذمہ داری قرار پائی ہے۔ یہاں یتیم کے سرپرست کو دو ہدایات دی گئی ہیں اگر اس کا کوئی اور کاروبار نہ ہو تو وہ نہایت عدل و انصاف کے ساتھ یتیم کے مال سے اپنے مناسب اخراجات پورے کر سکتا ہے جب یتیم عمر اور شعور کے اعتبار سے اپنے معاملات چلانے کا اہل ہو جائے تو اس کا مال گواہوں کی موجودگی میں اس کے حوالے کر دینا چاہیے۔ یتیم کے مال کا تحفظ کرنے کے ساتھ سب لوگوں کے مال کو تحفظ دیا گیا ہے کہ ماپ تول میں کمی بیشی کرنے سے بچنا چاہیے کوئی چیز دیتے ہوئے طے شدہ اصول اور پیمانے سے کم نہیں ہونی چاہیے اور جب کسی سے کوئی چیز لی جائے تو پھر بھی عدل و انصاف کے پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے طے شدہ اصول اور پیمانے سے زیادہ نہیں لینی چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی یہ وضاحت فرمائی کہ کاروبار اور معاشرتی زندگی میں جو تمہیں اصول دیے جا رہے ہیں یہ کوئی ایسی پابندی اور بوجھ نہیں جس پر کوئی شخص عمل نہیں کر سکتا۔ شریعت کے تمام اصول اور قانون ایسے ہیں جو انسان کی طاقت و ہمت کے مطابق ہیں۔ آٹھویں نصیحت یہ کی جاتی ہے کہ جب بھی بات کرو تو وہ اخلاق کے مطابق اور منصفانہ ہونی چاہیے۔ بیشک حق گواہی کسی عزیز کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں تک فرمایا کہ اگرچہ یہ تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو تمہیں ہر حال میں سچ اور حق کہنا چاہیے۔ عدالت میں گواہی کے ساتھ اس میں مبلغ کی حق گوئی، جج کا انصاف اور ہر قسم کی گفتگو شامل ہے۔ یہاں نویں اور آخری نصیحت یہ کی جا رہی ہے کہ ہر حال میں اپنے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کیا کرو۔ اللہ تعالیٰ سے عہد کرنے کی تین صورتیں مفسرین نے بیان کی ہیں۔

۱۔ عہد سے مراد وہ ازلی عہد ہے جب اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو پیدا فرمایا تو اس کی پشت پر اپنا دست مبارک رکھتے ہوئے "کن" کا حکم صادر فرمایا جس کا معنی ہے کہ ہو جا۔ قیامت تک کے لیے جتنے انسان پیدا ہونے ہیں وہ سب کے سب آدم (علیہ السلام) کے سامنے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان سے یہ استفسار فرما کر عہد لیا کہ کیا میں تمہارا رب ہوں؟ جس کا سب نے اقرار کیا تو ہی ہمارا رب ہے۔ اس کی تفصیل سورۃ آل عمران : ۸۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ عہد سے مراد وہ عہد بھی ہے جو انسان کسی مشکل یا عام حالات میں اپنی زبان یا دل ہی دل میں اپنے رب کے ساتھ کرتا ہے وہ گناہوں سے توبہ کی شکل میں ہو یا اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت کے بدلہ میں اس کا شکریہ ادا کرنے کی صورت میں۔ اس عہد کی پاسداری بھی آدمی پر لازم قرار دی گئی ہے۔

۳۔ عہد کی تیسری شکل یہ ہے کہ جب فرد یا قوم کا ایک دوسرے سے عہد و پیماں ہو تو اس کی پاسداری کرنا فرض ہے۔ اس عہد کو پورا کرنا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ لہٰذا یہ بھی بالواسطہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد کرنے کے مترادف ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وصیتیں کی گئی ہیں جس کا تمہیں ہر صورت خیال رکھنا ہوگا۔

(عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ (رض) قَالَ مَا خَطَبَنَا نَبِيُّ اللهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) إِلَّا قَالَ لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ وَلَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ) [رواہ احمد]

"حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں نبی معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب بھی ہمیں خطبہ دیا فرمایا جو بندہ امانت دار نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں اور جو شخص وعدہ پورا نہیں کرتا اس کا کوئی دین نہیں۔"

(عَنِ ابْنِ عُمَرَ (رض) قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) يَقُولُ لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ يُنْصَبُ بِغَدْرَتِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ) [رواہ البخاری: کتاب الجزیۃ، باب اثم الغادر للبر والفاجر]

"حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں میں نے نبی معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہر بد عہد کے لیے ایک جھنڈا ہوگا جو اس کی بد عہدی کی وجہ سے قیامت کے دن نصب کیا جائے گا۔"

(عَنْ سَهْلٍ (رض) قَالَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) أَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيمِ فِي الْجَنَّةِ هَكَذَا وَأَشَارَ بِالسَّبَّابَةِ وَالْوُسْطَى، وَفَرَّجَ بَيْنَهُمَا شَيْئًا) [رواہ البخاری: باب فضل من یعول یتیما]

"حضرت سہل (رض) بیان کرتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سبابہ اور درمیانی انگلی سے اشارہ فرمایا اور ان کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا۔"

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

یتیم کے مال کے پاس اس طریقے سے جاؤ جس سے اس کا فائدہ ہو اور جب وہ اپنی جوانی کی عمر کو پہنچ جائے اس وقت اس کا مال اس کے سپرد کردو۔ اس حکم کی تفصیل اور یتیموں سے متعلق مزید احکام سورۃ نساء کی ابتدائی چند آیات میں گزر چکے ہیں۔

{وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ: اور ناپ اور تول انصاف کے ساتھ پورا کرو۔} یعنی ناپ تول میں کمی نہ کرو کیونکہ یہ حرام ہے۔

ناپ تول میں کمی کرنے کی 2 وعیدیں

ناپ تول میں کمی کرنے پر احادیث میں سخت وعیدیں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے 2 وعیدیں درج ذیل ہیں:

(1)۔۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت ہے، سرکارِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "اے تاجروں کے گروہ! دو ایسے کام تمہارے سپرد کئے گئے ہیں کہ جن کی وجہ سے تم سے پہلے لوگ ہلاک ہوئے، یہ ناپنا اور تولنا ہے۔

(2)۔۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے روایت ہے، رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "اے مہاجرین کے گروہ! جب تم پانچ باتوں میں مبتلا کر دیئے جاؤ (تو اس وقت تمہاری کیا حالت ہو گی) اور میں اللہ عَزَّوَجَلَّ سے پناہ طلب کرتا ہوں کہ تم انھیں پاؤ۔

(۱)۔۔ جب کسی قوم میں اعلانیہ فحاشی عام ہو جائے گی تو ان میں طاعون اور ایسی بیماریاں ظاہر ہو جائیں گی جو ان سے پہلوں میں کبھی ظاہر نہ ہوئی تھیں (جیسے آجکل ایڈز، Aids وغیرہ)

(۲)۔۔ جب لوگ ناپ تول میں کمی کرنے لگ جائیں گے تو قحط سالی، شدید تنگی اور بادشاہ کے ظلم کا شکار ہو جائیں گے۔

(۳)۔۔جب زکوۃ کی ادائیگی چھوڑ دیں گے تو آسمان سے بارش روک دی جائے گی اور اگر چوپائے نہ ہوتے تو ان پر کبھی بارش نہ برستی۔
(۴)۔۔جب لوگ اللہ اور اس کے رسول کا عہد توڑنے لگیں گے تو اللہ عَزَّوَجَلَّ ان پر دشمن مسلّط کر دے گا جو ان کا مال وغیرہ سب کچھ چھین لے گا
۔
(۵)۔۔جب حکمران اللہ عَزَّوَجَلَّ کے قانون کو چھوڑ کر دوسرا قانون اور اللہ تعالیٰ کے احکام میں سے کچھ لینے اور کچھ چھوڑنے لگ جائیں گے تو اللہ عَزَّوَجَلَّ ان کے درمیان لڑائی جھگڑا ڈال دے گا۔ ‘‘

اس روایت کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے موجودہ حالات پر غور کریں کہ آج ہم میں خطرناک اور جان لیوا بیماریوں کا پھیلاؤ، قحط سالی، شدید تنگی اور حکمرانوں کے ظلم کا سامنا، دشمن کا تَسَلُّط اور مال و اسباب کا لٹ جانا، تَعَصُّب اور ہمارے لسانی، قومی اختلافات یہ سب ہمارے کن اعمال کا نتیجہ ہیں۔

دیکھے ہیں یہ دن اپنی ہی غفلت کی بدولت شکوہ ہے زمانے کا نہ قسمت سے گلا ہے
جو کچھ بھی ہے سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت سچ ہے کہ برے کام کا انجام برا ہے

اللہ تعالیٰ کے خوف سے حرام کام چھوڑنے کی فضیلت

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے روایت ہے، حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ’’جو شخص حرام پر قادر ہو پھر اسے اللہ تعالیٰ کے خوف سے چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ آخرت سے پہلے دنیا میں ہی بہت جلد اس کا ایسا بدل عطا فرماتا ہے جو حرام سے کہیں بہتر ہو۔ (1)

{ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا : اور جب بات کہو تو انصاف کی کہو۔ } یعنی خواہ گواہی دو یا فتویٰ دو یا حاکم بن کر فیصلہ کرو کچھ بھی ہو انصاف سے ہو اس میں قرابت یا وجاہت کا لحاظ نہ ہو کیونکہ اس سے مقصود شرعی حکم کی پیروی اور اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرنا ہوتا ہے اور اس میں اجنبی اور قرابت دار کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

{ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا : اور اللہ ہی کا عہد پورا کرو۔ } یعنی صرف اللہ عَزَّوَجَلَّ کے عہد پورے کرو اور اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کسی کے عہد پورے نہ کرو، اگر تم نے غلطی سے کسی سے ناجائز عہد کر لیا تو فوراً توڑ دو، مثلاً اگر کسی سے وعدہ کیا بلکہ قسم کھائی کہ اس کے ساتھ شراب پئیں گے یا چوری کریں گے تو یہ وعدہ توڑ دو اور قسم کا کفارہ دے دو۔ آیت میں ’’عَہدُ اللہ ‘‘ سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ عَزَّوَجَلَّ نے اپنے بندوں پر لازم فرمایا یعنی وہ احکام جو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذریعے ملے یا وہ عہد مراد ہے جو انسان اپنے اوپر لازم کرلے جیسے منت وغیرہ، ان سب کو پورا کرنے کا حکم ہے۔

عہد شکنی پر وعید

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے روایت ہے، حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ اَوّلین وآخِرین کو جمع فرمائے گا تو عہد توڑنے والے ہر شخص کے لیے ایک جھنڈا بلند کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں بن فلاں کی عہد شکنی کا جھنڈا ہے۔ (4)
بندوں کے ساتھ کئے گئے جائز عہدوں کو پورا کرنے کا بھی اللہ عَزَّوَجَلَّ نے حکم دیا ہے لہٰذا ان کا پورا کرنا بھی عہدِ الٰہی کو پورا کرنے میں داخل ہوگا۔ (تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری الجنان)

یتیموں کے حقوق

یتیم اکیلے اور منفرد کو کہتے ہیں جس سیپ میں ایک ہی موتی ہوا سے دُر یتیم کہتے ہیں۔اس لحاظ سے یتیم وہ ہے جو بچپن یا لڑکپن میں یعنی بلوغ سے پہلے باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے سے اکیلا اور تنہا رہ جائے۔قریبی عزیزوں کے رحم و کرم پر ہو یا معاشرہ کی ہمدردی اور خیر خواہی کا محتاج ہو کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے۔قرآن پاک نے یتیموں اور مسکینوں کے حقوق اور خاندان اور معاشرے کے لیے ان کی اہمیت ،ضرورت اور افادیت واضح کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں۔سب سے پہلے مختلف اسالیب اور متعدد تاریخی حوالوں سے ایک نہایت اہم حقیقت کا انکشاف کیا ہے وہ یہ کہ تاریخ میں کتنی عظیم قومیں منصہ شہود پر آئیں کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود آج تک ان کے حیرت انگیز تاریخی آثار ان کی عظمت اور قوت کی گواہی دیتے ہیں جن میں قوم عاد ،قوم ثمود اور مصر کے آل فرعون وہ مشہور قومیں ہیں جن کی تاریخ سے عرب واقف تھے اور قوت اور شان و شوکت کے اعتبار سے کوئی قوم اس وقت دنیا میں ان کے ہم پلہ نہ تھی۔لیکن اپنے تمام تر قوت و شوکت کے باوجود یہ قومیں اللہ کے عذاب کا شکار ہوئیں۔عذاب کا کوڑا اس بری طرح سے ان پر برسا کہ وہ تاریخ میں عبرت کا نشان بن گئیں۔قرآن کریم ان قوموں اور ان کی وجاہتوں کا ذکر کرنے کے بعد بتاتا ہے کہ ان کی تباہی اور بربادی کا سبب اپنے خالق ومالک سے انحراف اور طغیان و معصیت کے ساتھ ساتھ معاشرے کے بے کس و بے بس اور سرافگندہ و درماندہ طبقات کی طرف سے لاپرواہی بلکہ ظلم تھا اور ان طبقات میں بطور خاص یتیم اور مسکین کا وہ ذکر کرتا ہے کیونکہ جو معاشرہ یتیموں کا خیال نہیں کرتا۔اس سے باقی پسماندہ اور مظلوم طبقات کی دادرسی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ارشاد خداوندی ہے:

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۔ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ۔

(الفجر: ۱۷۔۱۸)

(ہرگز نہیں (تباہی کا سبب اور کچھ نہیں) بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور مسکین کو کھانا دینے (ضروریات زندگی) کی فراہمی پر زور نہیں دیتے)

یتیم اور مسکین کے حقوق کی عدم ادائیگی کا ذکر بطور خاص اس لیے بھی ہے کہ خاندان کسی بھی معاشرے کی اساس ہے۔ خاندان کی شکست و ریخت معاشرے کی اور آخر کار پوری قوم کی تباہی پر منتج ہوتی ہے۔ خاندان کے ارکان اربعہ والدین اولاد زوجین اور اہل قرابت ہیں اور یتیم اگر خاندان ہی کا حصہ ہے یعنی بیٹا مر جانے کے صورت میں یتیم بچہ دادا کا پوتا ہے اور بھائی کی موت کی شکل میں یہ یتیم مرحوم کے بھائی کا بھتیجا ہے۔ اب اگر ایسے یتیم کے ساتھ بدسلوکی ہوتی ہے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خاندان میں کتنی دراڑیں پڑ سکتی ہیں۔ جب تک یہ یتیم بچہ ظلم کی تصویر بن کر زندگی گزارتا ہے تو دوسرے اہل قرابت چاہے لفظی ہمدردی کے سوا کچھ نہ کریں۔ لیکن اس یتیم کے ساتھ ہونے والے سلوک کو نہ صرف محسوس کریں گے بلکہ خاندانی تقریبات میں موضوع سخن بھی بنائیں گے اور کبھی کبھی زیب داستاں کے طور پر بھی ذکر کریں گے۔ ایسی صورت میں خاندانی روابط اور روابط کے استحکام پر جو اثرات مرتب ہوں گے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ یہ تو وہ اثرات ہیں جو شعوری اور غیر شعوری طور پر خاندان پر اثر انداز ہوں گے۔ لیکن اس کا ایک پہلو اور بھی ہے کہ یتیم بچہ اگر بے مروتی اور بدسلوکی کے سائے میں پروان چڑھتا ہے وہ دادا کی بے مروتی کو دیکھتا ہے تو خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے کہ یہی میرے وہ دادا ہیں کہ میرے باپ کی زندگی میں سراپا محبت و شفقت تھے۔ وہ اپنے چچا اور تایا کے بدلے ہوئے رویہ کو دیکھتا ہے تو نہ جانے کیسے کیسے تاریک رجحانات اس کے رگ و پے میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ بچپنے کی وہ عمر جسے پیار اور محبت کی ٹھنڈک میں بسر ہونا چاہیے جب بے التفاتی بدسلوکی اور بے نیازی کی تیز دھوپ میں جلنے لگتی ہے تو اس نوخیز بچے کی محرومیاں خاندان سے نفرت۔بزرگوں سے بدگمانی اور انسانی جذبات سے مایوسی میں ڈھلنے لگتی ہیں۔ عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ یہ محرومیاں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح دھکنے لگتی ہیں۔ جو آخر کار بغاوت اور انتقام کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور معاشرہ ان سے بالوسطہ متاثر ہوتا ہے اور اگر اس یتیم بچے کی کفالت کرنے والے اپنے نہیں پرائے ہیں تو پھر یہ بچہ۔بڑا ہو کر۔براہ راست معاشرے سے اپنی محرومیوں کا انتقام لیتا ہے۔ یہی یتیم بچے۔بڑے ہو کر مسکین کہلاتے ہیں۔ کیونکہ بعد از بلوغ یتیم یتیم نہیں رہتا۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے تو معاشرہ کا کارآمد اور معزز فرد بن جاتا ہے اور اگر خاندان یا معاشرہ کی لاپرواہی سے ضائع ہو جائے تو معاشرے کے لیے ناسور بن جاتا ہے۔ غالباً اسی بات کی طرف قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ۔ (الماعون: ۱)

(تو نے اس شخص کو دیکھا 'جو روز جزاء کو یا جزاء کے قانون کو جھٹلاتا ہے)

یعنی اسے اس بات سے انکار ہے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب اعمال کی جزا و سزا سے گزرنا پڑے گا اور وہ اس بات سے انکار کرتا ہے کہ دنیا میں جزا و سزا کا قانون جاری ہے۔ جیسا کروگے ویسا بھروگے 'یہاں کی ریت ہے۔

فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۔ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ۔ (الماعون: ۳۔۲)

(اس شخص کے ایسے ہی خیالات کا نتیجہ ہے) کہ یہ یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا دینے پر آمادہ نہیں کرتا۔

اسی صورت حال کا نتیجہ ہے کہ محبت و مروت اور ایثار و ہمدردی سے محروم یہ طبقہ (یعنی یتیم و مسکین) وقت آنے پر معاشرے سے انتقام لیتا ہے۔ جب یتیم کو چچا کے مظالم اور چچازاد بھائیوں کی بے اعتنائیاں یاد آتی ہیں تو وہ۔بڑا ہو کر چچازاد بھائیوں بلکہ تمام اہل قرابت سے اپنے زخموں کا حساب لیتا ہے اور اگر خاندان سے باہر معاشرہ بھی اس کی محرومیوں کا سبب بنتا رہا ہے تو وہ معاشرے کے افراد کو بھی زیادتیوں کا نشانہ بنا کر سکون حاصل کرتا ہے۔ یہ جو ہم نوجوانوں کو بینک لوٹتے 'ڈاکے ڈالتے 'عفتوں کے فانوس توڑتے اور عظمتوں کے چراغ بجھاتے دیکھتے ہیں۔ یہ

دراصل اپنی محرومیوں کا انتقام ہے اور پھر اس میں صرف یتامیٰ اور مساکین ہی شریک نہیں بلکہ بڑے اور خوشحال لیکن تہذیب خوردہ اور مغرب زدہ خاندانوں کے چشم وچراغ بھی ہیں جنھیں ان کی ماؤں نے اپنی سوشل مصروفیات اور بیگمات کی تفریحات کے باعث پیار نہیں دیا۔ بچے ان کے پیار کو ترستے رہے۔ لیکن وہ صنف نازک کے حقوق حاصل کرنے اور عورت کا مقام بلند کرنے کے لیے دن بھر مختلف تقریبات میں شرکت اور اس کے لیے دن میں کئی کئی دفعہ لباس بدلنے کی مصروفیت کے باعث بچوں کے لیے وقت نہ نکال سکیں اور باپ جلب زر کی دوڑ اور کلبوں کی مصروفیت کی وجہ سے بچوں کو وقت نہ دے سکے۔ آج یہ بچے انسانی احساسات سے تہی دامن انسانی معاشرے کو ادھیڑنے کھدیڑنے میں لگ گئے۔ تاریخ یہ سبق دیتی ہے کہ جو قومیں اپنے خاندان کے اجزا کو نہیں سمیٹتیں ان کے شیرازہ کو بکھرنے سے کوئی نہیں روک سکتا اور جو قومیں اپنے مساکین یعنی معاشرہ کے گرے ہوئے اور پسماندہ افراد کو سہارا نہیں دیتیں یہی افراد معاشرے کے خلاف بغاوت کر دیتے ہیں۔ نتیجۃً معاشرہ خانہ جنگی کا شکار ہو کر قومی استحکام سے محروم ہو جاتا ہے۔ اب اس کو گرانے کے لیے چند حوادث ہی کافی ہوتے ہیں۔ مزید برآں قرآن کریم ہمیں یہ بھی آگاہی دیتا ہے کہ ایسی قومیں اور ایسے معاشرے جو یتامیٰ و مساکین کے حقوق کی پروا نہیں کرتے ان کی صرف دنیا ہی تباہ نہیں ہوتی ان کی آخرت بھی برباد ہو جاتی ہے وہ انجام کار جہنم کا ایندھن بن جاتے ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے:

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ۔ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۔ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۔

(اہل جہنم سے پوچھا جائے گا) کس چیز نے تمھیں جہنم میں پہنچایا؟ وہ کہیں گے ہم نمازی نہیں تھے اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ (المدثر: ۴۲۔۴۴)

دوسری بات یہ کہ ترقی یافتہ اور شان و شوکت کی حامل اقوام و ملل کے برے انجام سے استدلال کرتے ہوئے یتامیٰ اور مساکین کی طرف سے تغافل اور بدسلوکی کے نتائج سے ڈرانے کے بعد مثبت طرز استدلال کے ذریعہ قرآن نے چند ایسے تاریخی واقعات کا ذکر کیا جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض دفعہ اسباب عادیہ سے ہٹ کر بھی پروردگار کی نظر کرم یتامیٰ اور مساکین کے شامل حال رہتی ہے۔ حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کے واقعہ میں قرآن کریم نے بیان کیا ہے کہ حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام دریا عبور کرنے کے لیے ایک کشتی پر سوار ہوئے کشتی والوں نے دونوں کا احترام کرتے ہوئے کرایہ لینے سے انکار کر دیا۔ لیکن حضرت خضر نے اس احسان کا بدلہ یہ دیا کہ عین دریا میں کشتی کا تختہ توڑ ڈالا اور اس طرح کشتی کو بیکار کر دیا۔ پھر ایک گاؤں میں پہنچے تو گاؤں والوں نے مہمان نوازی کرنے کی بجائے کھانا تک کھلانے سے انکار کر دیا لیکن اہل دیہہ کی بدسلوکی کے باوجود حضرت خضر حضرت موسیٰ کے ساتھ دن بھر ایک دیوار مرمت کرتے رہے جو گرا چاہتی تھی۔ دونوں واقعات میں حضرت خضر کے عمل کو عام طرز زندگی اور اسلوب زندگی سے ہٹا ہوا محسوس کر کے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے تعجب واستنکار کا اظہار کیا۔ اس پر حضرت خضر نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے جو جواب دیا قرآن کریم نے اسے اس طرح بیان کیا ہے:

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ۔

(الکہف: ۷۹)

(جہاں تک کشتی کا تعلق ہے ' وہ چند مسکینوں کی تھی ' جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ میں نے چاہا کہ اس کشتی کو بیکار کر دوں کیونکہ ان کے پیچھے ایک بادشاہ آرہا تھا ' جو ہر کشتی پر زبردستی قبضہ کر رہا تھا)

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ج فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ق صلے رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ج (الکہف : ۸۲)

(رہا دیوار کا قصہ۔ وہ دو یتیم لڑکوں کی تھی 'جو اس شہر میں رہتے تھے۔ اس دیوار کے نیچے ان بچوں کے لیے ایک خزانہ مدفون تھا اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا 'اس لیے تمہارے رب نے چاہا کہ جب یہ دونوں بچے بالغ ہوں تو اپنا خزانہ نکالیں۔ یہ تمہارے رب کی رحمت ہے)

ان دونوں واقعات پر غور کیجئے کس طرح اللہ تعالیٰ کی رحمت یتیموں اور مسکینوں کی دستگیری کرتی ہے اور ایسے طریقے سے کرتی ہے جو ہمارے فہم و فراست سے بالا ہے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ وہ پروردگار جو ایسے غیر معمولی طریقوں سے ان بے کسوں کی دستگیری فرماتا ہے اس کی رحمت ایسے معاشرے پر کیوں نہ برسے گی جو معاشرہ یتیموں اور مسکینوں کی جائے پناہ 'محبتوں اور حمایت و اعانت کا سرچشمہ ہو گا۔

یتیموں کے بارے میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشادات

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی قرآن کریم کی طرح اپنے ارشادات عالیہ میں یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب دی اور اسے مسلمان معاشرے کی اخلاقی ذمہ داری قرار دیا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے:

انا و کافل الیتیم لہ اولغیرہ فی الجنۃ ھکذا واشار بالسبابۃ والوسطی وفرج بینھما شیئا

(میں اور اپنے یا پرائے یتیم کی کفالت کرنے والا آدمی جنت میں اس طرح (قریب قریب) ہوں گے اور آپ نے اپنی انگشت شہادت اور بیچ والی انگلی سے اشارہ کر کے بتلایا اور ان کے درمیان تھوڑی سی کشادگی رکھی)

مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی کلمہ والی انگلی اور اس کے برابر کی بیچ والی انگلی اس طرح اٹھائی کہ ان کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا 'بتلایا کہ جتنا تھوڑا سا فاصلہ اور فرق تم میری ان دو انگلیوں کے درمیان دیکھے ہو بس اتنا ہی فاصلہ اور فرق جنت میں میرے اور اس مرد مومن کے مقام میں ہو گا جو اللہ کے لیے اس دنیا میں کسی یتیم کی کفالت اور پرورش کا بوجھ اٹھائے۔ خواہ وہ یتیم اس کا اپنا ہو جیسے پوتا یا بھتیجا وغیرہ یا پرایا ہو یعنی جس کے ساتھ رشتہ داری وغیرہ کا کوئی خاص تعلق نہ ہو۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ایک اور ارشاد دیکھیے:

من قبض یتیما من بین المسلمین الی طعامہ وشرابہ ادخلہ الجنۃ البتۃ الا ان یکون قد عمل ذنبا لا یغفر

" اللہ کے جس بندے نے مسلمانوں میں سے کسی یتیم بچے کو لے لیا اور اپنے کھانے پینے میں شریک کر لیا تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور بالضرور جنت میں داخل کرے گا الا یہ کہ اس نے کوئی ایسا جرم کیا ہو جو نا قابل معافی ہو "۔

ایک اور حدیث میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:

من مسح راس یتیم لم یمسحہ الا للہ کان لہ بکل شعرۃ یمر علیھا یدہ ومن احسن الی یتیمۃ و یتیم عندہ کنت انا وھو فی الجنۃ کھاتین و قرن بین اصبعیۃ

" جس شخص نے کسی یتیم کے سر پر صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے ہاتھ پھیرا تو سر کے جتنے بالوں پر اس کا ہاتھ پھرا تو ہر ہر بال کے حساب سے اس کو نیکیاں ملیں گی اور جس نے اپنے زیر کفالت کسی یتیم بچی یا یتیم بچے کے ساتھ بہتر سلوک کیا تو میں اور وہ آدمی جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب قریب ہوں گے اور آپ نے اپنی دونوں انگلیوں کو ملا کر دکھایا یعنی ان دو انگلیوں کی طرح بالکل پاس پاس ہوں گے "

اندازہ فرمائیے کہ محض اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرنا کسی بڑی سعادت اور لاکھوں نیکیوں کے حصول کا سبب ہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک پیار اور محبت آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قرب کا ذریعہ ہے وہ بھی جنت میں۔ یعنی جنت میں داخلہ بجائے خود کتنی بڑی خوش بختی ہے اور پھر اس کے ساتھ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا قرب یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے۔

مزید فرمایا:

خیر بیت فی المسلمین بیت فیہ یتیم یحسن الیہ و شر بیت فی المسلمین بیت فیہ یتیم یساء الیہ

" مسلمانوں کے گھرانوں میں بہترین وہ گھرانہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جاتا ہے اور مسلمانوں کے گھروں میں بدترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ برا سلوک کیا جائے "

یعنی یتیم کے ساتھ حسن سلوک کسی گھر کو اللہ کی نگاہ میں عزت و وجاہت کا حامل بنا دیتا ہے اور یتیم کے ساتھ بدسلوکی کسی گھر کو قابل نفرت بنا دیتی ہے۔ لوگ عزت و ذلت کے اسباب اور ذرائع نہ جانے کیا کیا گمان کرتے ہیں۔ لیکن اللہ کی نگاہ میں بالکل دوسرے معیارات ہیں اور پھر یہ بھی یاد رہے کہ جو گھر اللہ کے یہاں بہتر ہے اس پر اس جہاں کی رحمتوں کی بارش ہوتی ہے۔ وہیں رزق میں برکت ہوتی ہے اور گھر کے مکینوں کو نیکیوں کی توفیق ملتی ہے اور جو گھر اس کے یہاں برا ہے وہ خیر و برکت سے محروم اور توفیق خداوندی سے دور ہے۔

مختصر یہ کہ اسلام نے مختلف اسالیب سے یتامیٰ و مساکین کے حقوق کے تحفظ اور ان کے مقام کے تعین اور بعثت نبوی کے وقت ان مظلوم گروہوں سے متعلق دنیا کی ذہنیت کی تبدیلی کے لیے حیرت انگیز کام کیا جس سے فی الواقع یتامیٰ اور مساکین کو ایک نئی زندگی اور ایک نیا معاشرتی مقام نصیب ہوا۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ محض تذکیر و ترغیب سے لائی ہوئی تبدیلی دیرپا اور مستقل نہیں ہوتی۔ اس لیے اسلام نے اسی پر اکتفا کرنے کی بجائے یتامیٰ اور مساکین کو قانونی تحفظ بھی دیا اور بیکسوں پر ہونے والے مظالم کا قانونی عمل سے انسداد کر کے رکھ دیا۔

یتیموں کی کفالت کے بارے میں قوانین

اب نہایت اختصار سے اس آئینی اور قانونی عمل کی ایک جھلک پیش خدمت ہے جو فی الواقع انسانی معاشرتی زندگی کے لیے بیش بہا نعمت ہے۔

دور جاہلیت میں یتیموں پر جو مظالم کیے جاتے تھے اور جو زیادتیاں ہوتی تھیں ان میں سے پہلی زیادتی یہ تھی کہ مرنے والا باپ اپنے بچوں کے لیے جو مال و اسباب چھوڑ جاتا تھا یا جو حصہ بچوں کو اپنے باپ کی میراث میں سے ملنا چاہیے تھا انھیں دینے سے یکسر انکار کر دیا جاتا تھا۔ جاہلیت میں عربوں کا تصور یہ تھا کہ وراثت کا حقدار صرف وہ ہو سکتا جو اپنے اعزا و اقربا اور خاندان کو کوئی فائدہ پہنچانے کے قابل ہو۔ ان کے اپنے الفاظ میں "کہ میراث میں اس کو حصہ دیا جائے جو گھوڑے پر چڑھ کر دشمن کو قتل کر کے مال غنیمت لانے کی استعداد رکھتا ہو۔ " مقصود ان کا یہ تھا کہ جو خاندان کو نفع پہنچانے کے قابل نہیں وہ خاندان سے کوئی چیز لینے کا بھی حقدار نہیں۔ بچیاں چونکہ پرایا دھن ہیں اور صنف نازک سے

تعلق رکھتی ہیں اور چھوٹے بچے بھی کوئی فائدہ پہنچانے کے قابل نہیں اس لیے ان کو میراث میں حصہ بھی نہیں ملنا چاہیے۔ چنانچہ بالعموم یتیم بچے اور بچیاں میراث سے محروم کر دیئے جاتے تھے۔ اسلام میں جب تک میراث کا حکم نازل نہیں ہوا مسلمانوں میں دور جاہلیت کے اثرات کی وجہ سے کبھی کبھی ایسے واقعات ظہور پذیر ہو جاتے تھے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یتیم بچوں اور بچیوں کے ساتھ کیسی کیسی زیادتیاں ہوتی تھیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ جنگ احد کے بعد حضرت سعد بن ربیع (رض) کی بیوی اپنی دو بچیوں کو لیے ہوئے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور انھوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ سعد کی بچیاں ہیں جو جنگ احد میں شہید ہوئے۔ ان کے چچا نے پوری جائیداد پر قبضہ کر لیا ہے اور ان کے لیے ایک حبہ تک نہیں چھوڑا۔ اب بھلا ان بچیوں سے کون نکاح کرے گا۔

اسی طرح ایک اور واقعہ کا بھی سراغ ملتا ہے کہ حضرت اوس بن ثابت شہید ہو گئے تو ان کے بھتیجوں نے ان کی جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ اوس کی بیوی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور سارا واقعہ عرض کیا۔

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں بچیوں کو بطور خاص اور یتیم بچوں کو بھی بالعموم میراث میں سے حصہ دینے سے انکار کیا جاتا تھا اور آج بھی ہمارے یہاں کم و بیش یہی طریقہ رائج ہے۔ بعض علاقوں میں بڑے بچوں کو میراث دینے کا رواج ہے اور چھوٹے بچوں کو محروم کر دیا جاتا ہے۔ جہاں تک بچیوں کا تعلق ہے بہت کم گھرانے ہوں گے جہاں ان کو ان کا حق دیا جاتا ہے ورنہ مختلف حیلے بہانوں سے ان کو یہ سمجھ کر محروم کر دیا جاتا ہے کہ یہ پرایا دھن ہیں اگر ان کو جائیداد میں سے حصہ دیا گیا تو ہمارا داماد یعنی بچی کا شوہر ہمارا شریک بن جائے گا اس لیے قرآن کریم نے سب سے پہلے میراث میں جس طرح لڑکے کا حصہ رکھا اسی طرح لڑکی کا بھی حصہ مقرر کیا اور پھر یتیموں کو بطور خاص ان کے حصے کے اموال دینے کی تاکید کی۔

اموال دیتے ہوئے بھی یتیموں کے ولی بعض زیادتیاں کرتے تھے کہ ان کے مال میں سے اچھی چیزیں نکال کر کم درجے کی چیزیں رکھ دیتے مثلاً اعلیٰ نسل کے فربہ جانور خود رکھ لیتے اور گنتی پوری کرنے کے لیے ردی نسل کے دبلے اور لاغر جانور یتیم کو دے دیتے۔ اسی طرح زیادتی کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ یتیموں کے اموال کو اپنے اموال میں خلط ملط کر دیتے اور حفاظت کے بہانے سے سب آہستہ آہستہ ہڑپ کر جاتے۔ قرآن کریم نے واضح احکام دے کر ان تمام زیادتیوں کو ختم کر ڈالا اور اسے بہت بڑا گناہ قرار دیا ارشاد فرمایا:

وَاٰتُوا الْیَتٰمٰٓی اَمْوَالَھُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ ص وَلَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَھُمْ اِلٰٓی اَمْوَالِکُمْ اِنَّهٗ کَانَ حُوْبًا کَبِیْرًا۔ (النساء: ۲)

(یتیموں کا مال ان کو واپس دو۔ اچھے مال کو برے مال سے نہ بدل دو اور ان کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھا جاؤ۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے)

یتیم بچیوں کے ساتھ زیادتی کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ یتیم بچیاں جن لوگوں کی سرپرستی میں ہوتی تھیں وہ ان کے مال اور ان کے حسن و جمال کی وجہ سے یا اس خیال سے کہ ان کا کوئی سر دھرا اور ان کا حقیقی محافظ تو کوئی ہے نہیں جس طرح ہم چاہیں گے دبا کر رکھیں گے وہ ان کے ساتھ خود نکاح کر لیتے تھے اور پھر ان پر ظلم کیا کرتے تھے اور نکاح کرتے ہوئے بھی نہ ان کو ان کی حیثیت کے مطابق مہر دیا جاتا اور نہ نکاح کے بعد ان کے حقوق ادا کیے جاتے۔ یہی زیادتی آج بھی مختلف شکلوں میں مسلمانوں میں رائج ہے کہ گھر میں اگر کوئی یتیم بچی موجود ہے تو عام طور پر اس کی مرضی پوچھے بغیر بلکہ اس کی بے بسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بالکل اس کا بے جوڑ رشتہ طے کر دیا جاتا ہے۔ وہ بیچاری بے بسی کی تصویر بنے قبولیت کے سوا کوئی راستہ اپنے سامنے نہیں پاتی۔ پھر گھر میں اس کی حیثیت ایک نوکرانی سے زیادہ نہیں ہوتی کیونکہ کوئی اس کی

طرف سے پوچھنے والا نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ یہ زیادتی کیوں ہورہی ہے؟ اس کے بارے میں بھی ارشاد فرمایا کہ ان یتیم بچیوں سے ہرگز نکاح نہ کرو اگر تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ تم ان سے انصاف نہیں کرسکو گے۔ خود اپنے ضمیر سے فتوی طلب کرو۔ ضمیر صحیح جواب دیتا ہے۔ وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کن جذبات کے تحت اپنا یا اپنے بچوں کا ان سے نکاح کر رہے ہو۔

یتیم بچوں اور بچیوں کے اگر محرمی رشتہ دار اور بزرگ زندہ ہیں تو وہ یتیموں کے ولی ہوں گے۔ ان کی ذاتوں کے حوالے سے اور ان کے مال اور جائیداد کے حوالے سے تمام ذمہ داریاں انھیں پوری کرنا ہوں گی۔ لیکن اگر یتیم کا کوئی بڑا یا قریبی عزیز نہ ہو یا اگر قریبی عزیز ہیں لیکن وہ اس قابل نہیں ہیں کہ دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دے سکیں تو پھر اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ یتیموں کے لیے ولی کا تقرر کرے اور وقتاً فوقتاً اس بات کا جائزہ لیتی رہے کہ یتیموں کے حقوق کی پاسداری صحیح طریقے سے ہو رہی ہے۔ یا نہیں کیونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے:

السلطان ولی من لا ولی لہ

(بادشاہ یعنی حکمران اس کا ولی ہے 'جس کا کوئی ولی نہیں)

اسی وجہ سے اسلامی حکومتوں میں قاضیوں کے فرائض میں یہ بات شامل ہوتی تھی کہ وہ شہر میں یتامیٰ کے ولی کی ذمہ داریاں بھی ادا کریں۔ یتیموں کے ان ولیوں کی ذمہ داریوں میں سے سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بالکل اپنے بچوں کی طرح ان یتامیٰ کی پرورش اور تربیت کا اہتمام کریں۔ ان کی تعلیم کے لیے کوشش کریں۔ ان کا کردار بنانے میں امکانی مساعی سے گریز نہ کریں اور اگر اس کے لیے انھیں ایک معقول وقت صرف کرنا پڑے تو قرآن کریم نے اس کے لیے واضح احکام دیئے ہیں۔ ارشاد فرمایا:

وَمَنۡ كَانَ غَنِيًّا فَلۡيَسۡتَعۡفِفۡ ج وَمَنۡ كَانَ فَقِيۡرًا فَلۡيَاۡكُلۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ط (النساء: ٦)

(یتیم کا جو سرپرست مالدار ہے 'وہ پرہیزگاری سے کام لے۔ یعنی کوئی معاوضہ نہ لے اور جو غریب ہے 'وہ معروف طریقے سے کھائے۔ یعنی اپنا حق الخدمت اس حد تک لے کہ ہر غیر جانبدار معقول آدمی اس کو مناسب تسلیم کرے)

نیز یہ کہ جو کچھ بھی حق الخدمت وہ لے وہ چوری چھپے نہ لے بلکہ اعلانیہ متعین کرکے لے اور اس کا حساب رکھے۔ یتیم کی دیکھ بھال میں اس بات کی بھی بڑی اہمیت ہے کہ یتیم کا ولی اسے اس طرح کا احساس نہ ہونے دے جس سے اس کی عزت نفس مجروح ہوتی ہو اور اس کے سامنے اپنے بچوں کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرے کہ واقعی اسے اپنی یتیمی کا غم ستانے لگے۔ کیونکہ شخصیت کی تعمیر میں عزت نفس اور خودداری بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔

یتیم کے ولی کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ یتیم کے اموال اور جائیداد کا تحفظ کرے۔ اسے نہ صرف ضائع ہونے سے بچائے بلکہ اگر اس میں اضافے کی کوئی جائز صورت ممکن ہو تو اس سے بھی دریغ نہ کرے۔ اسی وجہ سے شریعت قاضی کے فرائض میں اسے شامل کرتی ہے اور فقہاء نے قرآن وسنت کی روشنی میں ایک ادارتی نظم قائم کیا ہے۔ جب تک یتیم بلوغ کی عمر کو نہ پہنچ جائے اس کے اموال اور جائیداد میں سے اس کی تربیت اور پرورش پر اٹھنے والے اخراجات لیے جائیں گے۔ لیکن جب وہ بلوغ کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کے یہ اموال اس کے حوالے کرنے سے پہلے قرآن کریم ایک اور شرط بھی لگاتا ہے۔ جس کو قرآن کریم میں رشد کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَلَا تُؤۡتُوا السُّفَهَآءَ اَمۡوَالَكُمُ الَّتِىۡ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمۡ قِيٰمًا وَّارۡزُقُوۡهُمۡ فِيۡهَا وَاكۡسُوۡهُمۡ وَقُوۡلُوۡا لَهُمۡ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ۔ وَابۡتَلُوا الۡيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ‌ ۚ فَاِنۡ اٰنَسۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ رُشۡدًا فَادۡفَعُوۡۤا اِلَيۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ‌ ۚ (النساء : ۵-۶)

(اور اپنے وہ مال جنھیں اللہ نے تمہارے لیے قیام زندگی کا ذریعہ بنایا ہے ' ناداں لوگوں کے حوالے نہ کرو۔ البتہ انھیں کھانے اور پہننے کے لیے دو اور انھیں نیک ہدایت کرو۔ اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو ' یہاں تک کہ وہ نکاح کے قابل عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم ان کے اندر اہلیت پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کردو)

ان آیات میں واضح طور پر چند باتیں کہی گئی ہیں۔ پہلی یہ بات کہ یتیموں کے اموال اس وقت تک ان کے حوالے مت کرو جب تک وہ بلوغ کی عمر کو نہ پہنچیں۔ کمسنی کی عمر سفاہت اور بے وقوفی کی عمر ہے اس میں مال ان کے سپرد کرنا گویا مال کو ضائع کرنے کے مترادف ہے حالانکہ مال قیام زندگی کا ذریعہ ہے۔ اسے ناداں لوگوں کے اختیار اور تصرف میں نہیں دینا چاہیے۔ جو اسے غلط طریقے سے استعمال کرکے نظام تمدن و معیشت اور بالآخر نظام اخلاق کو خراب کردیں۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ یہ یتیم اپنی دیکھ بھال خود نہیں کرسکتے اور اپنی ضرورتیں پوری کرنا بھی ان کے بس میں نہیں تو ان کے ضروری مصارف ان کے مال سے ان کے ولی پورے کریں گے۔ لیکن بالکل اس طرح جیسے فکر مندی اور سمجھداری کے ساتھ اپنا مال اپنے بچوں پر خرچ کرتے ہیں۔

تیسری یہ بات کہی کہ انھیں نیک ہدایت کرو یعنی صرف ان کی ضرورتیں پوری کرنا ہی ولی کی ذمہ داری نہیں بلکہ تعمیر سیرت ' کردار سازی اور تعلیم و تربیت بھی ولی کی ذمہ داری ہے۔

چوتھی بات یہ کہ اگر وہ یتیم بلوغ کی عمر کو پہنچ جائیں تو اب بھی فوراً ان کے اموال ان کے سپرد نہ کردیئے جائیں بلکہ چھوٹی موٹی ذمہ داریاں ان پر ڈال کر یا کوئی ذمہ داری کا کام تفویض کرکے اس کا اندازہ لگایا جائے کہ آیا ان میں ذمہ داریاں سنبھالنے کی سمجھ بھی پیدا ہوئی ہے یا نہیں اور جسم کے ساتھ ساتھ ان کی عقلی نشو و نما کا کیا حال ہے ؟ ان میں اپنے معاملات کو خود اپنی ذمہ داری پر چلانے کی صلاحیت کس حد تک پیدا ہوئی ہے ؟ اگر ان میں سنجیدگی اور عقلمندی پیدا ہوگئی ہے اور وہ واقعی اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے قابل ہوگئے ہیں تو پھر اولیاء کو حکم دیا گیا ہے کہ ان کے مال ان کے حوالے کردو۔ " کورٹ آف وارڈز " کا قانون انہی آیات سے ماخوذ ہے۔

یہ چند قانونی احکام ہیں جن کی ایک مختصر سی تفصیل ہم نے عرض کی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں میں یتیموں کے بارے میں جو اصلاح پیدا کرنا چاہتا ہے وہ کیا ہے ؟ اور پھر کس طرح یتیموں کے حوالے سے عائد شدہ ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے اب تک جو کوتاہیاں ہوتی رہی ہیں ان سے بچنے کے لیے قانونی احکام دیتا ہے تاکہ یتیم ہر صورت میں معاشرے کے دوسرے افراد کی طرح کارآمد اور معزز ارکان معاشرہ بن کر اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دیں۔ تاکہ اسلامی معاشرہ اپنا صحیح کردار ادا کرنے کے قابل ہوسکے۔

ناپ تول میں کمی بیشی نہ کرو

اس آیت کریمہ میں دوسرا حکم اور مجموعی طور پر احکام عشرہ میں سے ساتواں حکم یہ دیا گیا ہے کہ ناپ اور تول میں کمی بیشی نہ کرو بلکہ پورا ناپو اور پورا تولو۔ اس حکم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ قرآن وسنت نے اس حکم کی تعمیل پر نہایت زور دیا ہے اور اس کے خلاف کرنے پر سخت وعید سنائی ہے اور قرآن کریم نے اس حکم کی تاکید کرتے ہوئے یہاں تک بتایا ہے کہ حضرت شعیب (علیہ السلام) کی قوم جن بڑی بڑی گمراہیوں میں مبتلا تھی ان میں سب سے بڑی گمراہی یہ تھی کہ وہ چونکہ تجارت پیشہ لوگ تھے اس لیے ناپ اور تول میں انھوں نے دو طریقے اختیار کر رکھے تھے کہ ان کے لینے کے باٹ اور تھے اور دینے کے باٹ اور جب وہ لیتے تھے تو پورا پورا ناپ تول کے لیتے تھے اور جب دیتے تھے تو ناپ تول میں کمی کرتے اور دوسرے کو نقصان پہنچاتے تھے اور اسی وجہ سے اس قوم پر اللہ کا عذاب نازل ہوا۔ پھر تیسویں پارے میں مستقل ایک سورۃ جس کا نام ہی مطففین ہے جس کی پہلی آیت میں ایسا کرنے والوں کو خرابی اور بربادی کی وعید سنائی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا کہ خرابی اور بربادی ہے تطفیف کرنے والوں کے لیے کہ جب وہ لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب انھیں دیتے ہیں تو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں۔ ایسے لوگ بالآخر بربادی اور ہلاکت کا شکار ہوں گے۔ اسی طرح حدیث میں بھی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت کے مطابق ان لوگوں کو جو تجارت میں ناپ تول کا کام کرتے تھے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ناپ اور تول یہ وہ کام ہیں جن میں بےانصافی کرنے کی وجہ سے تم سے پہلے کئی امتیں عذاب الٰہی کے ذریعے تباہ ہوچکی ہیں۔ (دیکھنا تم ایسا نہ کرنا) ناپ تول میں کمی جسے قرآن میں تطفیف کا نام دیا گیا ہے اس کا تعلق صرف ڈنڈی مارنے اور کم ناپنے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق پوری انسانی زندگی سے ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس کا تعلق پوری کائنات سے ہے تو شاید غلط نہیں ہوگا۔ کیونکہ کائنات کا پورا نظام عدل و قسط پر قائم ہے اور اس کائنات کی ہر چیز شاہد ہے کہ اس کا خالق و مدبر قائم بالقسط ہے۔ اس وجہ سے اس دنیا کی صلاح و فلاح کے لیے بنیادی چیز یہ ہے کہ انسان اپنے دائرہ اختیار میں کانٹے کی تول عدل و قسط کو قائم کرے۔ اگر اس میں ذرا رخنہ پیدا ہوجائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری زندگی اپنے مرکز ثقل سے منحرف ہوگئی اور اب سارے نظام تہذیب و تمدن میں فساد و اختلال رونما ہو کے رہے گا۔ ہم اگر اپنے زندگی کے معاملات پر غور کریں تو حقیقت یہ ہے کہ عدل و قسط کا قیام ہی ہماری زندگی کی کامیابی اور اس میں توازن کا ضامن ہے اور اسی توازن سے پوری زندگی میں استواری پیدا ہوتی اور اعتدال وجود میں آتا ہے۔ ایک گھر جو میاں بیوی سے وجود میں آتا ہے اور ماں باپ اور اولاد کے رشتے سے مکمل ہوتا ہے اسی کو دیکھ لیجئے کہ اگر میاں بیوی اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی اور حقوق کی پاسداری پوری طرح انجام دیتے رہیں تو اس گھر میں کبھی الجھن اور اڑچن پیدا نہیں ہوگی۔ شوہر اپنی قوامیت کا پوری طرح ثبوت دے اور بیوی اطاعت و محبت کا تو یہ گھر دنیا ہی میں جنت کا نمونہ بن جائے گا۔ اسی طرح اگر اولاد ماں باپ کے احترام میں کمی نہ ہونے دے اور والدین شفقت و محبت کے تمام پہلوؤں کو پوری طرح بروئے کار لائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ خاندان کی بنیاد استوار نہ ہوسکے۔ اسی طرح معاشرے میں بسنے والے لوگ اپنے اپنے فرائض میں یکسو ہوں اور حقوق کی شناخت میں کبھی دراڑیں نہ آئیں تو اس سے عدل و قسط کی صورت میں وہ توازن پیدا ہوتا ہے جس سے یہ معاشرہ نہایت کامیابی کے ساتھ زندگی کا سفر جاری رکھتا ہے۔ اس لیے یہاں جو تطفیف سے روکا جا رہا ہے اور ناپ تول میں عدل و قسط کے قائم کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے وہ صرف ناپنے اور تولنے والی چیزوں تک محدود نہیں ہوسکتا یقینا اس کا تعلق پوری زندگی سے ہے اسی لیے امام مالک (رح) نے اپنی مشہور کتاب مؤطا میں حضرت عمر

(رض) کا ایک قول نقل کیا ہے کہ آپ نے ایک شخص کو نماز کے ارکان میں کمی کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ تم نے تطفیف کی ہے یعنی جو حق واجب تھا وہ ادا نہیں کیا اس کو نقل کرنے کے بعد امام مالک فرماتے ہیں لِکُلِّ شَیْءٍ وَفَاءٌ وَ تَطْفِیْفٌ یعنی حق کا پورا دینا اور کمی کرنا ہر چیز میں ہوتا ہے صرف ناپ تول ہی میں نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہم اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں جب کمی کرتے ہیں تو تطفیف کرتے ہیں۔ یعنی ایک ملازم اپنی ڈیوٹی کا معاوضہ پورا لیتا ہے لیکن ڈیوٹی کے مقررہ اوقات میں کمی کرتا ہے یا کام میں کوتاہی کرتا ہے یا معاوضہ سے زائد رشوت یا کسی اور صورت میں پیسہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ تطفیف کا ارتکاب کرتا ہے اور جب یہ برائی کسی معاشرے میں عام ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اس سے نفرت رفتہ رفتہ کم ہونے لگتی ہے تو پھر اس معاشرے میں تباہی اور بربادی میں کوئی دیر نہیں ہوتی۔ آج ہم اپنے ملک میں جس صورت حال سے دوچار ہیں اس میں اگر غور کیا جائے تو یہی وہ تطفیف ہے جس کے ارتکاب نے ہمیں تباہی کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ ہمارا ہر ادارہ اس گناہ میں پوری طرح آلودہ ہے۔ تعلیمی ادارے جو لوگوں کی راہنمائی کا فرض انجام دیتے ہیں ان کی انتظامیہ اور ان کے اساتذہ تک بری طرح اس میں آلودہ ہوچکے ہیں۔ احتسابی اداروں کو اسی خرابی نے کھوکھلا کرکے رکھ دیا ہے۔ خود حکومت کے ایوان اور ہماری پارلیمنٹ کے ارکان اس سے بچے ہوئے نہیں بجز ان لوگوں کے جن پر اللہ خاص رحم فرمائے۔ اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ایک دفعہ مجھ سے ایک صاحب کہنے لگے کہ آپ کہتے ہیں کہ رشوت لینا حرام ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اب تنخواہوں میں گزارا نہیں ہوتا ' رشوت نہ لیں تو زندگی کیسے گزاریں میں نے ان سے کہا کہ آپ نے رشوت لے کر اپنی زندگی گزارنے اور گزارا کرنے کا ایک راستہ نکال لیا ہے۔ لیکن جس سے آپ نے رشوت لی اس سے آپ نے پوچھ لیا تھا کہ اس کا بھی گزارا ہوتا ہے یا نہیں ؟ انتہائی دکھ کی بات تو یہ ہے کہ ارشاد و ہدایت کے وہ ادارے اور اس کی ذمہ دار شخصیات جو کبھی اس امت کے بگاڑ کو روکنے کا آخری ذریعہ سمجھی جاتی ہیں ان کو بھی اس برائی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ دین کے نام پر دولت کمائی جاتی ہے اور ارشاد و ہدایت کی مسندوں پر بیٹھنے والے فتوحات لیے بغیر اپنے مریدوں کو دیدار تک کرانے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور ہر وہ آدمی جو ان کے پاس کچھ سیکھنے کا ارادہ لے کر جاتا ہے جب تک اپنی ہمت سے بڑھ کر نذر پیش نہیں کرتا اس وقت تک دروازہ ان کے لیے نہیں کھلتا کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ علامہ اقبال کے پاس ایسے ہی ایک صاحب بڑی عقیدت لے کر حاضر ہوئے وہ ابھی اقبال سے اظہار عقیدت ہی کر رہے تھے کہ ان کا ایک غریب مرید انھیں ڈھونڈتا ہوا وہاں جا پہنچا۔ ان کے سامنے اس نے ادب سے بیٹھتے ہوئے پہلے اپنی غربت کی کہانی سنائی اور پھر اپنے پلو سے ایک روپیہ نکالا جو نجانے اس نے ایک ایک آنہ کرکے کس طرح مکمل کیا تھا وہ اس نے حضرت صاحب کی خدمت میں پیش کیا اور دعا کی درخواست کی۔ حضرت صاحب نے بجائے خود دعا کرنے کے علامہ سے گزارش کی کہ آپ دعا فرمائیں۔ علامہ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور کہا کہ یا اللہ یہ غریب شخص جو بری طرح قرض میں جکڑا ہوا ہے اس کے حال پر رحم فرما جب کہ اس کے قرضہ میں مزید ایک روپے کا اضافہ ہوگیا ہے۔ جو نجانے وہ کہاں سے لے کر آیا اور اس نے اپنے پیر صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ کہنا یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں اللہ نے توازن قائم کرنے کا ہمیں حکم دیا ہے کہ جب ناپ تول کرو تو پورا پورا ناپو اور تولو۔ اور جب زندگی کے معاملات لوگوں کے ساتھ انجام دو تو اس میں بھی پوری طرح انصاف اور توازن سے کام لو کہیں بھی ڈنڈی مارنے کی کوشش نہ کرو اور ناپ تول کے بارے میں خاص طور پر آنحضرت نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحمت کرے جو بیچنے کے وقت بھی نرم ہو کہ حق سے زیادہ دے اور خریدنے کے وقت بھی نرم ہو کہ حق سے زیادہ نہ لے بلکہ کمی بھی ہو تو راضی ہو جائے اور ایسے ہی موقع پر ایک وزن کرنے والے کو حکم دیا کہ زِن وارجح یعنی تولو اور جھکتا ہوا تولو اور اس حوالے سے خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا معمول یہ تھا کہ جب آپ اپنا قرض
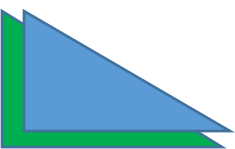
ادا فرماتے تھے تو عموماً جتنا قرض ہوتا تھا اس سے کچھ زیادہ ادا فرمایا کرتے تھے۔ اسی سلسلے کا آنحضرت کا ایک واقعہ ہے وہ جہاں زیر بحث بات پر دلالت کرتا ہے وہاں آپ کی حقانیت کا شاہد بھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ نے ایک یہودی سے کچھ غلہ قرض لیا اور ادائیگی کی ایک تاریخ طے فرما لی وہ تاریخ آنے سے پہلے ہی مطالبہ لے کر حاضر ہوگیا۔ آنحضرت نے صرف اتنا فرمایا کہ ابھی تو ادائیگی کا وقت نہیں آیا تم پہلے ہی آگئے ہو۔ اس نے بجائے اپنے قصور کا اعتراف کرنے کے بدتمیزی اور گستاخی شروع کردی۔ اب وہ جیسے جیسے گفتگو میں تیز ہوتا جارہا تھا حضور کی خاموشی ویسے ویسے بڑھتی جارہی تھی حتیٰ کہ اس نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ تم جو آل عبدالمطلب ہو تم تو ہمیشہ کے نادہند ہو۔ اس پر حضرت عمر فاروق (رض) برداشت نہ کرسکے وہ اٹھے اور اسے گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑا کہ تم یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔ اس پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عمر کو سختی سے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو اور ساتھ ہی کہا کہ تمہیں اس طرح اس سے پیش نہیں آنا چاہیے تھا بلکہ تمہیں یہ چاہیے تھا کہ مجھے سمجھاتے کہ حضور اگر آپ نے قرض لیا تھا تو آپ کو ادائیگی کی فکر بھی کرنی چاہیے تھی اور اسے حسن معاملہ کی تلقین کرتے۔ لیکن تم نے جو اس کے ساتھ سختی کی ہے اب اس کا معاوضہ یہ ہے کہ جتنا میں نے اس سے قرض لیا ہے اسے اس سے کچھ بڑھ کر ادا کرو۔ مثلاً ایک من کے بدلے سوا من۔ چنانچہ جب اسی طرح اضافے کے ساتھ اسے اس کا قرض ادا کردیا گیا تو وہ چلا گیا تھوڑی دیر کے بعد لوٹ کے آیا اور کہا حضور میں ایک یہودی ہوں اور کتاب کا علم رکھتا ہوں میں نے اپنی کتاب یعنی تورات میں نبی آخر الزماں کی علامتیں پڑھی ہیں باقی تمام علامتیں میں آپ میں دیکھ چکا تھا صرف ایک علامت تھی جسے میں جاننا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ ہماری کتاب میں یہ لکھا ہے کہ جو آخر الزماں نبی ہوں گے ان کی علامت یہ ہے کہ لوگوں کی گستاخیاں ان کے تحمل اور بردباری کو شکست نہیں دے سکیں گی۔ وہ سخت سے سخت رویہ اختیار کرنے والوں سے بھی نرمی اور حسن اخلاق سے پیش آئے گا۔ کہا آج میں اس نشانی کو دیکھنے کے لیے آیا تھا چنانچہ آج میں نے پوری طرح اس نشانی کو دیکھ لیا ہے مجھے یقین ہوگیا ہے کہ آپ واقعی وہی نبی ہیں جس کی خبر ہماری کتابوں نے دی تھی۔ اب مجھے کلمہ پڑھایئے اور مسلمان کیجئے۔

اس کے بعد اس آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ہم کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کسی چیز کا حکم نہیں دیتے۔ اس کے تین مطلب اہل علم نے بیان کیے ہیں۔ ایک مطلب تو یہ ہے کہ اللہ نے شریعت میں جتنے احکام دیئے ہیں وہ انسان کی فطرت اور اس کی صلاحیتوں کو تول کر دیئے ہیں۔ ان میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اس کے تحمل سے بڑھ کر ہو اس لیے کل کو کوئی آدمی اللہ کے سامنے یہ عذر نہیں کرسکے گا کہ شریعت میں جو احکام ہمیں دیئے گئے تھے وہ چونکہ بہت سخت تھے ہم کسی طرح اس پر عمل کرسکتے تھے اس لیے یہاں فرمایا کہ ہم چونکہ انسانی فطرت اور انسان کی صلاحیتوں کے پیدا کرنے والے ہیں ہم خوب جانتے ہیں کہ اس کے تحمل اور برداشت کا عالم کیا ہے اس لیے ہم نے جو بھی حکم دیا ہے وہ ٹھیک ٹھیک اندازہ کرکے دیا ہے اگر کوئی حکم کسی کو سخت معلوم ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ حکم میں سختی ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکم پر عمل کرنے والا یا تو فساد نیت کا شکار ہے اور یا قوت ارادی کی کمزوری کا۔ ورنہ اسلامی شریعت کے احکام میں ایسی کوئی سختی نہیں جس کا تحمل انسان کے لیے مشکل ہو۔

دوسرا اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اپنا عمل یہ تھا کہ آپ ہمیشہ اصل قرض سے بڑھ کر ادا فرماتے تھے اور ہر حکم کی تعمیل میں واجب سے بڑھ کر ہمت صرف کرتے تھے جس سے امت کو یہ سبق ملتا تھا کہ اسے بھی مالی معاملات ہوں ' بدنی معاملات ہوں یا لین دین کے معاملات اس میں حق واجب سے بڑھ کر کوشش کرنی چاہیے اور ادائیگی کرنی چاہیے۔ اس لیے یہاں یہ بات کہہ کر یہ تسلی دی گئی ہے کہ اگرچہ آنحضرت کا اپنا اسوہ یہی ہے لیکن اس کی حیثیت تقویٰ اور اخلاق کی ہے قانون کی نہیں۔ کوئی آدمی زیادہ سے
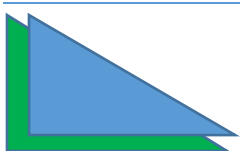
زیادہ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے سرخرو کرنا چاہتا ہے تو اسے ایسا ہی کرنا چاہیے۔ لیکن ہر آدمی چونکہ اس کا تحمل نہیں کر سکتا اس لیے اس کو فرض یا واجب قرار نہیں دیا گیا جس آدمی نے اپنے ذمے حق کو پورا پورا ادا کر دیا ہے لیکن اس نے حق سے زائد کچھ نہیں کیا تو وہ یقیناً اللہ کے سامنے مواخذہ سے بچ جائے گا۔

تیسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ جن طبیعتوں پر نیکی کا غلبہ ہوتا ہے وہ ایسی صورت میں بھی اسلامی احکام پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ ان کی جسمانی صحت ان کا ساتھ نہیں دے رہی ہوتی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ بالآخر وہ اصل احکام کی بجاآوری سے بھی معذور ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک شیخ فانی کو اللہ تعالیٰ نے روزے سے مستثنیٰ قرار دیا ہے وہ اگر چاہے تو اسے اس بات کی اجازت ہے کہ بجائے خود روزہ رکھنے کے دوسرے کو روزہ رکھوادے لیکن بعض نیک لوگ ایسی صورت میں بھی چاہے اس کا نتیجہ ان کی صحت کے لیے کیسا ہی خطرناک نکلے وہ روزہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے بہت بڑی نیکی سمجھتے ہیں۔ ان سے یہاں فرمایا جارہا ہے کہ ہر شخص پوری دیانت و صداقت کے ساتھ شرعی احکام کی تعمیل ظاہراً و باطناً کرے۔ لیکن اگر اس کی جسمانی صحت اس کی اجازت نہیں دیتی تو اسے شرعی احکام سے کشتی لڑنے کی اجازت نہیں اس کا جسم جس حد تک تحمل کر سکتا ہے وہ اسی کا پابند ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس اجازت کو بہانہ نہیں بنالینا چاہیے جس طرح ہمت سے بڑھ کر احکام کی تعمیل کوئی نیکی نہیں اسی طرح ہمت کی کمزوری کا بہانہ بنالینا بہت بڑی برائی ہے۔ دونوں کے درمیان اعتدال اختیار کرنا ہی اصل میں اس کا صحیح مفہوم ہے۔

ہمیشہ حق و انصاف کے مطابق بات کرو

اس آیت کریمہ میں تیسرا مگر مجموعی طور پر آٹھواں حکم یہ دیا گیا ہے کہ جب تم کوئی بات کہو تو عدل اور انصاف کے ترازو میں تول کے کہو۔ اس حکم کا تعلق بھی انسان کی پوری زندگی سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے تمام معاملات میں پاکیزگی اور اس کے سیرت و کردار کی تعمیل میں اکل حلال کے ساتھ ساتھ جو چیز سب سے زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے وہ یہی چیز ہے کہ آدمی اپنے قول میں سچا اور اپنے رویے میں کھرا ہو وہ جب بھی کوئی بات منہ سے نکالے تو اسے حق اور عدل کی کسوٹی پر پوری طرح پرکھ کے دیکھ لے اس میں صداقت و امانت بھی شامل ہو اور حکمت و مروت بھی یعنی نہ تو منہ سے ایسی بات نکلنی چاہیے جو جھوٹ پر مبنی ہو اور نہ زبان سے ایسی بات ادا ہونی چاہیے جو معاملات میں پیچیدگی کا باعث ہو اور دلوں کو زخم پہنچانے والی ہو۔ اس میں ذرا سی بے احتیاطی بہت ساری الجھنوں کا باعث بنتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جس برائی نے بری طرح دراڑیں پیدا کی ہیں وہ یہی ہے کہ ہم قدم قدم پر زبان کا غلط استعمال کرتے ہیں یہ زبان اور یہ قوت گویائی جو اللہ کی بیش بہا نعمت ہے ہم اسے نہایت غلط طریقے اور غلط جگہوں پر استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے بات بات پر جھوٹ بولنا، معمولی سے نفع کی خاطر اور معمولی لالچ میں آکر بات کو کچھ سے کچھ بنادینا اور معمولی سے معمولی خوف کا شکار ہو کر بات سے مکر جانا اور معمولی معمولی فوائد کی خاطر عدل اور انصاف کا خون کر دینا یہ ہمارا روزمرہ بن گیا ہے۔ اسی نے ہماری اجتماعی زندگی میں ایسے کانٹے بکھیرے ہیں جو ہمیں آنکھوں سے چننے پڑ رہے ہیں۔ ہمارا مقتدر طبقہ، ہماری عدالتیں، ہماری انتظامیہ، ہمارے باقی اجتماعی ادارے بھی اس برائی کا بری طرح شکار ہو گئے ہیں۔ ہمیں اس بات کا شاید بالکل احساس نہیں رہا کہ ہماری زبان سے نکلنے والا ایک ایک بول کل کو میزان قیامت

میں تول بن جائے گا۔ جس پر ہماری اخروی زندگی کا دارومدار ہے۔ لیکن یہاں یہ حکم جس سیاق کلام میں وارد ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق دو چیزوں سے ہے ایک تو یہ کہ فرض کرو تمہیں کہیں کسی معاملے میں گواہی دینی پڑے تو تمہیں اپنی گواہی میں عدل اور قسط کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھنا ہے۔ فرض کیجئے تمہاری گواہی سے ایک فریق کو فائدہ پہنچتا ہے اور دوسرے کو نقصان لیکن دونوں صورتوں میں تم نے اگر انصاف کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا تو کل کو دونوں فریقوں کے بارے میں تم سے پوچھا جائے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ جب تم گواہی دو تو بالکل وہی بات کہو جو حقیقت میں تم جانتے ہو اور جس کو تمہاری آنکھوں نے دیکھا ہے بلکہ بہتر یہ ہے کہ تم اس میں مزید چھان بین کرلو اور اس بات کی بالکل پروانہ کرو کہ تمہاری گواہی سے کسی کو فائدہ پہنچتا ہے یا نقصان بلکہ تمہیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں کیا یہ میرے علم اور واقعے کے مطابق ہے یا نہیں ؟ اور کیا اس بارے میں اللہ کے سامنے جب مجھ سے پوچھا جائے گا تو کیا میں یہ کہہ کر سرخرو ہو سکوں گا کہ میں نے واقعی اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کی تھی۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غلط گواہی کو شرک کے برابر قرار دیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اللہ کے یہاں شرک اتنا بڑا گناہ ہے جسے معاف کرنے سے اللہ نے انکار کر دیا ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جھوٹی گواہی شرک کے برابر ہے اور اس پر قرآن کریم کی ایک آیت سے استدلال بھی فرمایا۔

دوسری چیز جو اس حکم سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا موقع دے کہ تم منصف اور جج کے مسند پر فائز کر دیئے جاؤ تو فرمایا جارہا ہے کہ تم اس مسند پر بیٹھ کر عدل اور قسط کے مطابق ٹھیک ٹھیک فیصلے کرو۔ تمہاری یہ ذمہ داری ہے کہ ہر معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس کی پوری طرح چھان بین کرو۔ گواہیوں کو اچھی طرح جانچو ' پرکھو اور پھر صورت معاملہ کو پوری طرح سمجھنے کے بعد کامل تقویٰ اور شعور کے ساتھ معاملے کا فیصلہ کرو۔ تمہارے فیصلے سے اگر تمہارے کسی اپنے عزیز یا دوست پر ضرب پڑتی ہے تو اس کی بالکل پروانہ کرو اور اگر اس سے کسی دشمن کو فائدہ پہنچتا ہو تو تب بھی تم عدل و قسط کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ اسی کی تاکید کے لیے آنحضرت : نے ارشاد فرمایا قاضی یعنی مقدمات کا فیصلہ کرنے والے تین قسم کے ہیں ان میں سے ایک جنت میں جائے گا اور دو جہنم میں جس نے معاملہ کی تحقیق شریعت کے موافق کرکے حق کو پہچانا پھر حق کے مطابق فیصلہ کیا وہ جنتی ہے اور جس نے تحقیق کرکے حق بات کو جان تو لیا مگر جان بوجھ کر فیصلہ اس کے خلاف کیا وہ دوزخی ہے اور اسی طرح وہ قاضی جس کو علم نہ ہو یا تحقیق اور غور و فکر میں کمی کی اور جہالت سے کوئی فیصلہ دے دیا وہ بھی جہنم میں جائے گا۔ اسی کی مزید تائید اور تاکید کے لیے فرمایا : وَلَوۡ كَانَ ذَا قُرۡبٰى کہ تمہاری گواہی یا تمہارے فیصلے کی زد اگر تمہارے کسی قرابت دار پر پڑتی ہے تو تب بھی تمہیں عدل سے ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے۔

اللہ سے کیے عہد کو پورا کرو

اس آیت کریمہ میں چوتھا حکم اور مجموعی طور پر احکام عشرہ کا نوواں حکم یہ دیا گیا ہے کہ اللہ کے عہد کو پورا کرو اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اس عہد الست کو پورا کرو جو عالم ارواح میں اللہ نے انسانی روحوں سے لیا تھا سب کو جمع کرکے پوچھا تھا اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں "سب نے بالاتفاق کہا تھا کہ ہاں آپ ہی ہمارے رب ہیں اور ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً جتنے اللہ کے پیغمبر آئے اور کتابیں آئیں انھوں نے آکر اسی عہد کی یاددہانی کرائی۔ سعید روحوں نے اس یاددہانی کو قبول کیا اور ایمان لے آئیں۔ لیکن جنھوں نے معصیت اور بگاڑ کی

شدت کے باعث اپنے آپ کو بالکل ناکارہ بنالیا تھا وہ ایمان سے محروم رہیں۔ یہاں اسی کا حکم دیا جارہا ہے کہ اللہ کے اس عہد الست کو پورا کرو جس میں تم نے اللہ کو اپنا رب مان کر یہ تسلیم کیا تھا کہ تم اللہ ہی کی بندگی اور اطاعت کروگے۔ سو آج اسی بندگی کی دعوت لے کر ہمارے آخری رسول تم میں مبعوث ہوئے ہیں ' اپنے اس عہد کی پاسداری کرتے ہوئے ان پر ایمان لاؤ۔

دوسرا مطلب اس کا یہ ہو سکتا ہے کہ جب ایک آدمی کلمہ طیب یا کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہوتا ہے تو وہ اصلاً اللہ سے یہ عہد کرتا ہے کہ یا اللہ میں تجھے ہی الہ یعنی معبود بر حق اور حاکم حقیقی جانتا ہوں میں نہ کسی کے سامنے عبادت کے لیے سر جھکاؤں گا اور نہ میں کسی کی غیر مشروط اطاعت کروں گا صرف تیرے ہی سامنے میرا سر جھکے گا اور تیرے ہی قانون کو میں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نافذ کروں گا اور مسلمان اجتماعی طور پر یہ کلمہ پڑھتے ہوئے اسی عہد کی تجدید کرتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں کوئی قطعہ زمین عطا فرمائے گا جس میں ہماری اپنی حکومت ہوگی تو اس میں ہم اللہ ہی کے قانون کو نافذ کریں گے اور اسی کی غیر مشروط اطاعت کریں گے۔ کوئی ملکی قانون جو اللہ کے قانون سے متصادم ہوگا ہم اسے ماننے سے انکار کردیں گے حکمرانوں کی کوئی ایسی اطاعت جو اللہ کی اطاعت سے ٹکرائے گی ہم ایسی اطاعت کرنے سے انکار کردیں گے۔ اس حوالے سے ہمارے قرن اول کی تاریخ روشن مثالوں سے بھری ہوئی ہے کہ ہم نے اللہ سے کیے ہوئے اس عہد کو ہمیشہ پورا کرنے کی کوشش کی چاہے ہمیں اس کے لیے کیسی ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑی ہو۔

مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ امیر معاویہ (رض) نے اپنے پڑوسی عیسائی ملک سے جنگ بندی کا ایک معاہدہ کیا اور ایک مدت طے پا گئی کہ اس مدت کے دوران جانبین میں سے کوئی بھی ایک دوسرے پر حملہ نہیں کرے گا۔ چنانچہ جب وہ مدت اختتام کے قریب پہنچی تو امیر معاویہ نے سرحد پر فوجیں جمع کرنے کا حکم دے دیا کہ جیسے ہی یہ مدت ختم ہو اسی دن یا اسی رات ہماری فوجیں دشمن کے ملک پر حملہ کردیں۔ چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی۔ امیر معاویہ خود فوجوں کی کمانڈ کرتے ہوئے دشمن کے ملک میں داخل ہوگئے۔ دشمن چونکہ بالکل بے خبر تھا چنانچہ یہ علاقے فتح کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے کہ اچانک انھوں نے ایک دن دیکھا کہ ایک سوار اونٹ پر بگٹٹ بھاگے ہوئے چلا آرہا ہے اس نے ہاتھ اٹھا رکھے ہیں اور بلند آواز سے کچھ کہہ رہا ہے۔ قریب آیا تو لوگوں نے سنا کہ وہ یہ کہہ رہا تھا **وَفَاءً لَا غَدَرًا** کہ معاہدہ پورا کرنا ہے توڑنا نہیں۔ یہ سوار قریب پہنچا تو معلوم ہوا یہ فلاں صحابی ہیں امیر معاویہ خود آگے بڑھے پوچھا کہ میں نے کیا معاہدے کی خلاف ورزی کی ؟ ان صحابی نے بتایا کہ میں نے خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا ہے کہ تم اس وقت تک دشمن کے ملک پر حملہ نہ کرو جب تک کہ معاہدہ ختم ہونے کی اطلاع دشمن کو نہ دے دی جائے۔ اب اگرچہ معاہدہ کی مدت ختم ہوچکی ہے لیکن دشمن اس سے بے خبر ہے آپ کو اس سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے ورنہ یہ معاہدے کی روح کی خلاف ورزی ہوگی۔ امیر معاویہ نے جب یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد سنا اور صحابی کی وضاحت سنی تو آپ نے فوراً سر جھکا لیا اور فوجوں کی واپسی کا حکم دے دیا اور جو علاقے فتح ہوچکے تھے ان کو چھوڑ کر واپس آگئے۔

ان دونوں طرح کے عہدوں کے ساتھ ساتھ وہ تمام معاہدے اور تمام وعدے جو ہم انفرادی طور پر ایک دوسرے سے کرتے ہیں یا مسلمان مملکت دوسری مملکتوں سے کرتی ہے اور مسلمان ریاستیں دوسری ریاستوں سے کرتی ہیں وہ تمام معاہدے بھی اس عہد سے مراد ہیں۔ یعنی مسلمانوں کے ایک دوسرے سے کیے ہوئے وعدے اور مسلمان ریاست کے دوسروں سے کیے ہوئے معاہدے اسی طرح پورے کرنے چاہئیں جس طرح اللہ سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ تمام وعدے اور تمام مواعید اللہ ہی کے نام سے وجود میں آتے ہیں اور اللہ ہی نے ان کی پابندی کرنے کا حکم دیا ہے اور اگر ہم ان کو توڑیں گے تو دنیا میں جو ہوگا سو ہوگا اللہ کے یہاں اس کی ہمیں جواب دہی کرنی پڑے گی۔ کیونکہ

قرآن کریم نے دوسری جگہ اسی حکم کو مطلق رکھا ہے یہاں تو عہد کو عہد اللہ کہا گیا ہے وہاں صرف عہد کا لفظ آیا ہے۔ فرمایا **اَوْفُوْا بِالْعَھْدِ ج اِنَّ الْعَھْدَ کَانَ مَسْئُوْلاً** "عہد کو پورا کرو ' بیشک عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا " (بنی اسرائیل : ۳۴)۔ یہاں عہد سے مراد ہر طرح کا عہد ہے چاہے وہ اللہ کے ساتھ ہو ' چاہے ریاستوں کے مابین ہو اور چاہے انفرادی طور پر باہمی معاملات میں ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح آپس کے وعدوں کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح کوئی شخص اگر انفرادی طور پر اللہ کے ساتھ کوئی نذر مانتا ہے تو اسے پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان بردار بندوں کی جن باتوں میں تعریف فرمائی ہے ان میں ایک بات یہ بھی ہے **یوفون نذورھم** وہ اپنی نذروں کو پورا کیا کرتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ وہ باتیں ہیں جس کی تمہیں اللہ نے وصیت فرمائی ہے تاکہ تم یاد دہانی حاصل کرو۔ پچھلی آیت میں آیت کے اختتام پر یہ فرمایا تھا کہ ان باتوں کی اللہ نے تمہیں وصیت اس لیے کی ہے تاکہ تم ان باتوں میں تعقل سے کام لو اور غور و فکر کرو اور اگلی آیت کریمہ میں اسی طرح کا جملہ لا کر آخر میں فرمایا کہ یہ تمہیں جو وصیت کی جا رہی ہے یہ اس لیے ہے تاکہ تم اپنے اندر تقویٰ پیدا کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو جوہر عقل سے نوازا ہے اور یہ ایک ایسا نور ہے کہ جس پر اگر خواہشات مفادات اور عصبیتوں کا اندھیرا غالب نہ آجائے تو وہ انسان کو ہمیشہ راہ راست کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ لیکن جب اس پر دوسری چیزیں پردہ ڈال دیتی ہیں تو پھر یا تو یہ اپنا کام کرنا چھوڑ دیتا ہے یا خواہشات کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتا ہے اور خواہشات پوری کرنے کے لیے اس کے لیے دلائل گھڑتا اور ضمیر کو سلانے کی کوشش کرتا ہے۔ مشرکین مکہ مسلسل شرک اور کفر کے ارتکاب کی وجہ سے ایک ایسی اندھی عصبیت کا شکار ہو گئے تھے جس کی وجہ سے ان کے عقل و شعور کے چراغ گل ہو گئے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنی جہالت کو ملت ابراہیمی کا نام دے رہے تھے۔ انھیں سب سے پہلے اسی تعقل کو اختیار کرنے کی دعوت دی گئی کہ جہالت کے اندھیروں سے نکلو اور عقل کی روشنی میں خود اپنے رویے کا جائزہ لو اور پھر ملت ابراہیمی کی مزید باتیں اور مزید احکام بتا کر ان سے فرمایا کہ اگر تم نے تعقل کا سفر مکمل کر لیا ہے اور تم نے واقعتاً صحیح سمت میں غور و فکر شروع کر دیا ہے تو اب تمہاری دوسری منزل یہ ہے کہ تم تذکر سے کام لو اور اپنے اصل مقام کو سمجھنے اور مقصد حیات کو جاننے کے لیے فکر مندی پیدا کرو تمہارا اصل مقام اور مقصد تمہارے سامنے مسلسل نمایاں اور واضح کیا جا رہا ہے اگر تم عصبیت کے اندھیروں سے نکل کر ان باتوں پر غور کرو گے تو یہ یاد دہانی تمہارے سامنے تمہارے اصل مقام کو واضح کر دے گی اور جب تم نے اپنی اور کائنات کی حقیقت اور پھر ان دونوں میں باہمی تعلق اور اللہ کے ساتھ اپنے رشتے کی حقیقت کو سمجھ لیا اور اس یاد دہانی کی منزل سے خیریت سے گزر گئے تو پھر یقینا تمہارے اندر تقویٰ یعنی اللہ کا خوف پیدا ہو جائے گا اور اپنے انجام کے بارے میں تمہارے اندر فکر مندی ابھرے گی اور اپنے معمولات کے حوالے سے تمہیں یہ احساس دامن گیر ہو جائے گا کہ جس طرح کی زندگی ہم گزار رہے ہیں اللہ کے سامنے جا کر ہم اس کا کیا جواب دے سکیں گے تو یہی وہ آخری منزل ہے جہاں پہنچ کر آدمی اپنے مقصد حیات کو بھی پا لیتا ہے اور وہ زندگی بھی اختیار کر لیتا ہے جو اسے آخرت میں سرخرو کر سکے گی۔ (روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی القرآن)

آیت مبارکہ :

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۱۵۳

لغۃ القرآن: وَاَنَّ : اور بیشک] [هٰذَا : یہ] [صراطی : میرا راستہ ہے] [مُسْتَقِيْمًا : سیدھا] [فَاتَّبِعُوْهُ : تو تم سب پیروی کرو اس کی] [وَلَا : اور نہ] [تَتَّبِعُوا : تم سب پیروی کرو] [السُّبُلَ :" اور " راستوں کی] [فَتَفَرَّقَ : پس وہ الگ کردیں گے] [بِكُمْ : تم کو] [عَنْ : کے بارے میں] [سَبِيْلِهٖ : اس کے راستے] [ذٰلِكُمْ : یہ " سب "] [وَصّٰىكُمْ : اس نے وصیت کی ہے تمہیں] [بِهٖ : اس کو] [لَعَلَّكُمْ : تاکہ تم] [تَتَّقُوْنَ : تم بچ جاؤ]

ترجمہ : اور یہ کہ یہی (شریعت) میرا سیدھا راستہ ہے سو تم اس کی پیروی کرو، اور (دوسرے) راستوں پر نہ چلو پھر وہ (راستے) تمہیں اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گے، یہی وہ بات ہے جس کا اس نے تمہیں تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ

تشریح:

حضور کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا راستہ ہی اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی فرمان برداری ہی وہ اساس محکم ہے جس پر اتحاد ملت کا ایوان تعمیر ہو سکتا ہے اور جب بھی یہ اساس متزلزل ہو گئی۔ اس کے بعد ملت کے انتشار کو دور کرنے کی کوئی امید باقی نہیں رہے گی۔ ذرا غور فرمایئے ملت کے وہ بہی خواہ اور خیر اندیش جن کی ساری علمی قوتیں اور عملی کاوشیں سنت نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مٹانے پر صرف ہو رہی ہیں وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر ملت کی کتنی بڑی بدخواہی کر رہے ہیں۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر کرم شاہ القرآن)

وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا : اور یہ کہ یہ میرا سیدھا راستہ ہے۔} یعنی یہاں مذکور آیتوں میں جو احکام تمہیں بیان کئے گئے ہیں یہ اللہ عَزَّوَجَلَّ اور اس کے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا سیدھا راستہ ہے تو اس پر چلو۔ احادیث میں ایک مثال کے ذریعے سیدھے راستے کے بارے میں سمجھایا گیا ہے، چنانچہ

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) فرماتے ہیں: ہم حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر تھے، آپ نے ایک خط کھینچا، دو اس کے دائیں اور دو بائیں جانب کھینچے، پھر اپنا ہاتھ درمیانے خط پر رکھ کر فرمایا "یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی "وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ"

اور یہ کہ یہ میرا سیدھا راستہ ہے تو اس پر چلو اور دوسری راہوں پر نہ چلو ورنہ وہ راہیں تمہیں اس کے راستے سے جدا کر دیں گی۔ "

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) فرماتے ہیں: ایک دن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمارے سامنے ایک خط کھینچا، پھر فرمایا "یہ اللہ کا راستہ ہے۔ پھر اس کے دائیں بائیں کچھ لکیریں کھینچیں اور فرمایا "یہ مختلف راستے ہیں جن میں سے ہر راستے پر شیطان ہے جو ادھر بلا رہا ہے۔ پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ"

ترجمہ کنزالعرفان: اور یہ کہ یہ میرا سیدھا راستہ ہے تو اس پر چلو اور دوسری راہوں پر نہ چلو ورنہ وہ راہیں تمہیں اس کے راستے سے جدا کر دیں گی۔ "

سیدھا راستہ

اس سے معلوم ہوا کہ عقائد کی درستی، عبادت کی ادائیگی، معاملات کی صفائی اور حقوق کا ادا کرنا سیدھا راستہ ہے۔ جو ان میں سے کسی میں کوتاہی کرتا ہے وہ سیدھے راستے پر نہیں۔ عقائد، عبادات اور معاملات جسم اور دو بازوؤں کی طرح ہیں جن میں سے ایک کے بغیر اڑنا ناممکن ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ (رض) سے روایت ہے، رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ "دفتر تین قسم کے ہیں۔ ایک دفتر وہ ہے کہ جسے اللہ عَزَّوَجَلَّ نہ بخشے گا۔ وہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کا شریک ٹھہرانا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ " (2)

اللہ نہ بخشے گا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے۔

اور ایک دفتر وہ ہے جسے اللہ عَزَّوَجَلَّ چھوڑے گا نہیں، وہ بندوں کے آپس کے ظلم ہیں حتّٰی کہ ان کے بعض کا بعض سے بدلہ لے گا اور ایک دفتر وہ ہے جس کی اللہ تعالیٰ پروا نہیں کرتا، وہ بندوں کا اپنے اور اللہ عَزَّوَجَلَّ کے درمیان حق تلفی ہے، تو یہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے سپرد ہے، اگر چاہے اسے سزا دے اور اگر چاہے تو اس سے در گزر فرمائے۔

وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ: اور دوسری راہوں پر نہ چلو۔} یہاں دوسرے راستوں سے مراد وہ راستے ہیں جو اسلام کے خلاف ہوں یہودیت ہو یا نصرانیت یا اور کوئی ملت۔ لہٰذا اگر تم اسلام کے خلاف راستے پر چلے تو اللہ عَزَّوَجَلَّ کے راستے سے الگ ہو جاؤ گے۔ صوفیاءِ کرام (رح) فرماتے ہیں کہ معاملات کی خرابی عبادات کی خرابی تک پہنچا دیتی ہے اور عبادات کی خرابی کبھی عقائد کی خرابی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ترکِ مستحب ترکِ سنت کا اور ترکِ سنت ترکِ فرض کا ذریعہ ہے چور کو پہلے دروازے پر ہی روکو۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری الجنان)

بدعات سے اجتناب کا حکم

اس سے پہلی دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے احکام بیان فرمائے تھے کہ شرک نہ کرو ' ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو وغیرہ ' یہ نو تفصیلی اور جزئی احکام تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تفصیلی اور کلی حکم بیان فرمایا ہے جس میں یہ نو احکام اور باقی تمام شرعی احکام داخل ہیں اور وہ یہ ہے کہ یہ میری تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری مستقیم ہے اور یہی دین اسلام اور منہج قدیم ہے ' تم اجمالا اور تفصیلا ' اسی راستہ کو اختیار کرو اور اگر اس راستہ سے ادھر ادھر ہوئے تو گمراہی میں پڑ جاؤ گے ' اس سے معلوم ہوا کہ حق کا راستہ صرف ایک ہے اور باطل کے بہت راستے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک خط کھینچا اور فرمایا یہ اللہ کا راستہ ہے ' پھر آپ نے اس کے دائیں اور بائیں جانب متعدد خطوط کھینچے اور فرمایا یہ مختلف راستے ہیں اور ان میں سے ہر راستے کی طرف شیطان دعوت دے رہا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی ' بیشک یہ میرا سیدھا راستہ ہے ' سو تم اسی راستے کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو۔ (الایہ) (الانعام : ١٥٣)

(سنن دارمی ' ج ١ ' رقم الحدیث : ٢٠٢ ' مسند احمد ' ج ٣ ' رقم الحدیث : ٤١٤٢ ' ٤٤٣٧ ' سنن ابن ماجہ ' ج ١ ' رقم الحدیث : ١١ ')

مجاہد نے اس آیت کی تفسیر میں کہا اس آیت میں دوسرے راستوں سے مراد بدعات ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) نے کہا علم کے اٹھنے سے پہلے علم کو حاصل کرلو اور علم کا اٹھنا یہ ہے کہ اصحاب علم اٹھ جائیں گے۔ علم کو حاصل کرو ' کیونکہ تم میں سے کوئی شخص نہیں جانتا کہ اسے کب علم کی ضرورت پیش آئے گی۔ تم عنقریب کچھ لوگوں کو دیکھو گے جو یہ دعوی کریں گے کہ وہ تمہیں اللہ کی کتاب کی طرف بلا رہے ہیں ' حالانکہ ان لوگوں نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ لہٰذا تم علم حاصل کرو ' اور بدعات سے بچو اور تم مبالغہ آرائی سے اور گہرائی میں جانے سے بچو ' اور قدیم نظریات کے ساتھ وابستہ رہو۔

(سنن دارمی ' ج ١ ' رقم الحدیث : ' مطبوعہ دارالکتاب العربی ' بیروت ' ١٤٠٧ ھ)

حضرت عرباض بن ساریہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن فجر کی نماز کے بعد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں نصیحت کی اور وہ بہت موثر نصیحت تھی جس سے آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور دل خوفزدہ ہوگئے۔ ایک شخص نے کہا یہ تو الوداع ہونے والے شخص کی نصیحت ہے۔ آپ ہم کو کیا وصیت فرماتے ہیں۔ آپ نے فرمایا میں تم کو اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں اور حاکم کا حکم سننے اور اس کی اطاعت کرنے کی وصیت کرتا ہوں ' خواہ وہ حبشی غلام ہو۔ تم میں سے جو شخص بعد میں زندہ رہے گا ' وہ بہت اختلاف دیکھے گا، تم نئی نئی باتوں میں پڑنے سے بچنا ' کیونکہ نئی نئی باتیں گمراہی ہیں۔ تم میں سے جو شخص دین میں نئی نئی باتیں دیکھے ' وہ میری سنت کو لازم کرلے اور خلفاء راشدین مھدیین کی سنت کو لازم کرے اور اس سنت کو دانتوں سے پکڑ لو ' یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(سنن الترمذی ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ٢٦٨٥ ' سنن ابوداؤد ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ٤٦٠٧ ' سنن ابن ماجہ ' ج ١ ' رقم الحدیث : ٤٢ ' سنن دارمی ' ج ١ ' رقم الحدیث : ٩٥ ' مسند احمد ' ج ٦ ' رقم الحدیث : ١٧١٤٥ ' المستدرک ' ج ١ ' ص ٩٧۔ ٩٦)

بدعت کی تعریف اور اس کی اقسام

علامہ مجد الدین ابن الاثیر محمد جزری متوفی ۶۰۶ ھ لکھتے ہیں :
حضرت عمر (رض) نے قیام رمضان کے متعلق فرمایا یہ کیا ہی اچھی بدعت ہے ! (صحیح البخاری ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۲۰۱۰ ')
بدعت کی دو قسمیں ہیں بدعت ھدی اور بدعت ضلال ' جو نیا کام اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم کے خلاف ہو وہ مذموم ہے اور لائق انکار ہے ' اور جو نئے کام اللہ تعالیٰ کے بیان کیے ہوئے عموم استحباب میں داخل ہوں اور جن پر اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے برانگیختہ کیا ہو ' وہ کام لائق مدح ہیں اور جن کاموں کی مثال موجود نہ ہو جیسے جود وسخا کی اقسام اور دیگر نیک کام تو وہ افعال محمودہ سے ہیں اور یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کام احکام شرع کے خلاف ہوں ' کیونکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایسے کاموں کے لیے ثواب کی خبر دی ہے ' سو آپ نے فرمایا جس شخص نے اسلام میں نیک طریقہ کو ایجاد کیا اس کو اس کا اجر ملے گا اور جو اس طریقہ پر عمل کرے گا ' اس کا اجر بھی اس کو ملے گا (صحیح مسلم ' رقم الحدیث : ۱۰۱۷ ') اور اس کی ضد کے متعلق فرمایا جس شخص نے اسلام میں کسی برے طریقہ کو ایجاد کیا اسے اس کا گناہ ہوگا اور اس پر عمل کرنے والوں کا بھی گناہ ہوگا اور یہ اس وقت ہوگا جب وہ نیا کام اللہ اور اس کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے طریقہ کے خلاف ہو۔ حضرت عمر (رض) نے جو یہ فرمایا تھا یہ کیا ہی اچھی بدعت ہے ' یہ پہلی قسم سے ہے اور جب کہ نیک کام لائق مدح ہیں تو حضرت عمر (رض) نے اس تراویح کو بدعت فرمایا اور اس کی تعریف کی۔ تراویح کو حضرت عمر (رض) نے بدعت اس لیے فرمایا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تراویح کو مسلمانوں کے لیے سنت نہیں کیا ' آپ نے چند راتیں تراویح پڑھیں ' پھر اس کو ترک فرمادیا اور اس کی حفاظت کی ' نہ اس کے لیے مسلمانوں کو جمع کیا ' اور نہ یہ حضرت ابوبکر (رض) کے زمانہ میں تھی۔ صرف حضرت عمر (رض) نے اس کی جماعت کرانے کا اہتمام کیا اور اس کی دعوت دی ' اس وجہ سے حضرت عمر (رض) نے اس کو بدعت فرمایا اور یہ درحقیقت سنت ہے ' کیونکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میری سنت کو لازم رکھو اور میرے بعد خلفاء راشدین کی سنت کو لازم رکھو۔ (سنن ابوداؤد ' رقم الحدیث : ۴۶۰۷ ') اور فرمایا میرے بعد ابوبکر اور عمر کی اقتداء کرو اور یہ جو آپ نے فرمایا ہے ہر نیا کام بدعت ہے اس سے مراد دین میں وہ نئے کام ہیں جو شریعت کے قواعد کے خلاف ہوں اور سنت کے موافق نہ ہوں اور بدعت کا زیادہ تر استعمال مذمت میں ہوتا ہے۔ (نہایہ ' ج ۱ ' ص ۱۰۷۔ ۱۰۶ ' مطبوعہ ایران ' ۱۳۶۷ ھ)
علامہ محمد طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ ھ نے بھی بدعت کا معنی بیان کرتے ہوئے یہی لکھا ہے اور مزید یہ لکھا ہے کہ بعض بدعات واجب ہوتی ہیں ' جیسے متکلمین کا اسلام کی حقانیت اور گمراہ فرقوں کے رد پر دلائل قائم کرنا اور بعض بدعات مستحب ہوتی ہیں جیسے علمی کتابوں کی تصنیف کرنا ' دینی مدارس کو بنانا اور تراویح اور بعض بدعات مباح ہوتی ہیں ' جیسے انواع واقسام کے نئے نئے کھانے۔

(مجمع بحار الانوار ' ج ۱ ' ص ۱۶۱۔ ۱۶۰ ' مطبوعہ مکتبہ دارالایمان ' المدینہ المنورہ ' ۱۴۱۵ ھ)

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متوفی ۱۲۵۲ ھ لکھتے ہیں :
بعض بدعات واجب ہوتی ہیں جیسے گمراہ فرقوں کے رد پر دلائل قائم کرنا اور کتاب وسنت کو سمجھنے کے لیے علم نحو کو پڑھنا اور بعض بدعات مستحب ہوتی ہیں ' جیسے سرائے اور مدرسہ بنانا اور ہر وہ نیک کام جو اسلام کے ابتدائی عہد میں نہیں تھا ' اور بعض بدعات مکروہ ہوتی ہیں جیسے

مساجد کو مزین کرنا اور بعض بدعات مباح ہوتی ہیں جیسے کھانے پینے کی لذیذ چیزیں اور عمدہ کپڑے۔ علامہ طحاوی نے شرح جامع صغیر میں ' علامہ نووی نے تہذیب میں اور علامہ برکلی نے الطریقہ المحمدیہ میں اسی طرح لکھا ہے اور علامہ شمنی نے بدعت محرمہ کی یہ تعریف کی ہے ہر وہ نیا عقیدہ یا نیا کام یا نیا حال جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ثابت شدہ امور کے خلاف ہو 'اس کو کسی قسم کے شبہ یا تاویل کی بنا پر دین قدیم اور تصراط مستقیم بنالیا جائے جیسے شیعہ پیروں کو دھونے کی بجائے ان کا مسح کرتے ہیں اور موزوں پر مسح کا انکار کرتے ہیں۔ (رد المختار ج ۳۷۷ 'مطبوعہ داراحیاء التراث العربی 'بیروت ۱۴۰۹ھ) (تفسیر تبیان القران۔غلام رسول سعیدی القرآن)

آیت مبارکہ :

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۵۴

لغۃ القرآن : ثُمَّ : پھر] [اٰتَيْنَا : ہم نے دی] [مُوْسَى الْكِتٰبَ : موسیٰ کو کتاب] [تَمَامًا : پوری کرنے کے لیے] [عَلَي :" ان " پر] [الَّذِيْٓ :" وہ ہے " جو] [اَحْسَنَ : نیکی کی] [وَتَفْصِيْلًا : اور تفصیل " بیان کرنے کے لیے "] [لِّكُلِّ : کے لیے] [شَيْءٍ : چیز کو] [وَ : اور] [هُدًى : ہدایت] [وَّرَحْمَةً : اور رحمت] [لَعَلَّهُمْ : تاکہ وہ] [بِلِقَآءِ : ملاقات کو] [رَبِّهِمْ : اپنے رب کو] [يُؤْمِنُوْنَ : وہ سب ایمان لاتے ہیں]

ترجمہ : پھر ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب عطا کی اس شخص پر (نعمت) پوری کرنے کے لیے جو نیکو کار بنے اور (اسے) ہر چیز کی تفصیل اور ہدایت اور رحمت بنا کر (اتارا) تاکہ وہ (لوگ قیامت کے دن) اپنے رب سے ملاقات پر ایمان لائیں

تشریح :

یہاں کتاب سے مراد توراۃ شریف ہے۔ سب سے پہلے کتاب الٰہی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو ہی عطا ہوئی۔ اس سے پہلے پیغمبروں کو صحیفے ملتے تھے۔ اور یہ جو فرمایا کہ "تاکہ نیک آدمی پر احسان پورا ہو " حضرت حسن بصری (رح) اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں "بنی اسرائیل میں میں محسن (یعنی نیک) اور غیر محسن بھی تھے تو اللہ تعالیٰ نے محسنین یعنی نیک لوگوں پر اپنی نعمت پوری کرنے کے لیے یہ کتاب نازل فرمائی۔

اس کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علم کے مطابق نیک کام کرتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر نعمت پوری کرنے کے لیے ان کو کتاب (یعنی توراۃ) دی۔
پھر اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اس نے توراۃ میں دین کی کیا نعمتیں رکھی ہیں؟ چنانچہ فرمایا کہ "اس میں ہر چیز کی تفصیل ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس میں دین کے تمام احکام عقائد اور مسائل کی تفصیل ہے، لہٰذا اس میں ہمارے نبی سیدنا محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت اور رسالت کا بیان اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کے تمام دلائل ہیں اور یہ ہدایت اور رحمت ہے تاکہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے قیامت کے دن کی ملاقات پر ایمان لے آئیں۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری الجنان)
صراط مستقیم کے نو سنگ میلوں کی نشاندہی کرنے کے بعد اشارہ دیا ہے کہ یہ نصیحتیں توراۃ میں بھی موجود ہیں۔
یہاں لفظ "ثُمَّ" لا کر یہ واضح کیا گیا ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) جس کتاب کی دعوت اور جس راستے کی طرف بلاتے تھے اس کے بنیادی اصول بھی یہی تھے توراۃ میں اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا احکام کی تفصیلات نازل فرمائی تھیں۔ تاکہ اس شخص کے لیے ہدایت اور رحمت کے دروازے کھل جائیں جو اپنے رب کی ملاقات پر ایمان رکھتا ہے۔ اور یہی صفات اس کتاب یعنی قرآن مجید میں ہیں جو ہدایت کا سرچشمہ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا پیش خیمہ ہے جس میں انسان کی ہدایت کے لیے مکمل اور جامع رہنمائی کی گئی ہے تاکہ وہ اپنے رب کی ملاقات پر یقین رکھتے ہوئے کتاب مبین کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارے جس کی سب کو دعوت دی جاتی ہے تاکہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچ کر اس کی شفقت و رحمت کے مستحق قرار پائیں۔ قرآن مجید سے ہدایت پانے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حق دار ہونے کے لیے قیامت کے دن حساب وکتاب کا خوف دلانے کی بجائے رب کی ملاقات کی یاد دلائی گئی ہے مومن کے لیے اللہ تعالیٰ کی ملاقات دنیا اور آخرت کی تمام نعمتوں سے اعلیٰ اور محبوب ترین نعمت ہے۔
(عَنْ جَرِيرٍ (رض) قَالَ كُنَّا جُلُوسًا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذْ نَظَرَ إِلَى الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ قَالَ إِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ كَمَا تَرَوْنَ هَذَا الْقَمَرَ لَا تُضَامُونَ فِي رُؤْيَتِهِ فَإِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ لَا تُغْلَبُوا عَلَى صَلَاةٍ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَصَلَاةٍ قَبْلَ غُرُوبِ الشَّمْسِ فَافْعَلُوا)

[رواہ البخاری: کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ وجوہ یومئذ ناضرۃ]
"حضرت جریر (رض) بیان کرتے ہیں ہم نبی معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اچانک نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے چودھویں رات کے چاند کو دیکھا اور فرمایا عنقریب تم اپنے رب کو ایسے ہی دیکھو گے جس طرح اس چاند کو دیکھ رہے ہو تمہیں چاند دیکھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آرہی؟ اگر تم استطاعت رکھتے ہو کہ تم سست نہ ہو جاؤ فجر اور عصر کی نماز کا خیال رکھو۔"
(تفسیر تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

توراۃ مکمل ہدایت اور رحمت تھی

اس آیت کریمہ میں سب سے پہلا لفظ ثُمَّ ہے اس کا معنی ہے " پھر " یہ ترتیب پر دلالت کر رہا ہے یعنی جس طرح ہم نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو یہ دس احکام دیئے تھے جو ان کی شریعت کی اساس تھے اس طرح ہم نے یہ احکام حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو بھی دیئے جو ان کی شریعت کی اساس بنے۔ آج بھی توراۃ اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ اس میں یہ تمام کے تمام احکام موجود ہیں الفاظ اور ترتیب میں فرق ہو سکتا ہے۔ بنیادی مضمون میں کوئی فرق نہیں۔ موسیٰ (علیہ السلام) چونکہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے بعد سب سے بڑے جلیل القدر رسول ہو کر آئے اور ان کے ماننے والی امت یہود چونکہ حضور کے سامنے تھی۔ اس لیے بطور خاص ان کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ یہ بات معلوم ہو سکے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو شریعت لے کر آئے ہیں اور جس میں یہ تمام احکام شامل ہیں وہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ وہی احکام ہیں جو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو ملت ابراہیمی کے طور پر دیئے گئے تھے۔ پھر یہی احکام حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو الواح پر کندہ کرا کے دیئے گئے اور اب یہی وہ دس احکام ہیں جو قرآن میں نازل کیے گئے ہیں۔ اس لیے لوگوں کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن کریم کسی نئی بات کی دعوت لے کر نہیں آیا بلکہ یہ اس زنجیر کی آخری کڑی ہے جو پہلے رسول سے شروع ہوئی اور آنحضرت (رض) پر آکر مکمل ہو گئی۔ اس کے بعد اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کا ذکر کیا ہے جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو دی گئی اور پھر اس کی چند صفات بیان کی گئیں۔ ایک تو اس کی صفت یہ بیان فرمائی گئی کہ وہ کتاب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو اس لیے دی گئی تاکہ ان پر اور ان کے ماننے والے مسلمانوں پر اللہ کی ہدایت کی نعمت کو مکمل کیا جائے اور ملت ابراہیمی کے بعد پوری وسعت کے ساتھ ان کو وہ احکام دے دیئے جائیں جس کی انھیں اپنے وقت میں ضرورت ہے اور اسی کو یہاں قرآن کریم نے ہر چیز کی تفصیل کا نام دیا ہے یعنی انسانی ہدایت کے لیے جس جس چیز کی ضرورت تھی اور جس جس چیز کے احکام مطلوب تھے وہ سارے توراۃ میں موسیٰ (علیہ السلام) پر نازل کر دیئے گئے۔ مزید فرمایا کہ اس کتاب کی صفات میں سے ایک صفت یہ تھی کہ وہ ہدایت بن کے آئی تھی یعنی وہ کتاب صرف اس لیے نازل نہیں کی گئی تھی کہ لوگ اسے پڑھ کر صرف ثواب حاصل کریں یا اپنے مرحومین کو ایصال ثواب کریں اور یا بیماروں کے لیے اسے پڑھ پڑھ کے پھونکیں یا تعویذ بنا کر گلے میں ڈالیں تاکہ بیماروں کو شفا نصیب ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پہلی آسمانی کتابوں اور آج قرآن مجید سے بھی یہ تینوں فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اسے پڑھنے سے ثواب بھی ملتا ہے اس سے ایصال ثواب بھی کیا جاتا ہے اور اس کی آیات سے شفا بھی حاصل کی جاتی ہے۔ لیکن یہاں کہنا یہ ہے کہ یہ اس کتاب کے ضمنی فوائد ہیں۔ کتابیں آسمانوں سے ان فوائد کے لیے نازل نہیں ہوتیں بلکہ وہ تو ایک انقلاب برپا کرنے کے لیے آتی ہیں جس سے دنیا میں نیا انسان وجود میں آتا ہے اور نئی سوسائٹی جنم لیتی ہے لیکن ہماری کوتاہ فہمی یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کو یہود و نصاریٰ کی طرح صرف انہی مقاصد پر منحصر سمجھتے ہیں۔ توپیں اس لیے نہیں ڈھالی جاتیں کہ اس سے کوؤں کا شکار کیا جائے بلکہ وہ تو قلعوں کے دمدمے اور مورچے اڑانے کے لیے فائر کی جاتی ہیں۔ لیکن اگر ان کے فائر کے راستے میں کوئی بڑا چھوٹا جانور آجائے تو یقیناً مر وہ بھی جائے گا۔ یہاں پر یہ فرمایا جا رہا ہے کہ توراۃ جو موسیٰ (علیہ السلام) کو دی گئی اس کی ایک صفت یہ تھی کہ وہ دنیا میں ہدایت بن کے آئی۔ یعنی وہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے رہنما اور قانون بن کے آئی۔ وہ انسان کی انفرادی زندگی میں آداب زندگی کا درس دیتی ہے اور عدالتوں میں زندگی کے فیصلے کرتی ہے اور حاکمیت کے اداروں سے قانون بن کے بولتی ہے یہ اس کتاب کی اصل حیثیت ہے اور یہ اس کی مخصوص حیثیت نہیں بلکہ جو کتاب بھی اللہ کی طرف

سے نازل ہوئی ہے وہ اپنے ماننے والوں کے لیے اس طرح رہنمائی اور قانون کا فرض انجام دیتی رہی ہے اور اپنے نتیجے کے اعتبار سے ہر کتاب اسی تورات کی طرح رحمت بن کے آئی ہے۔ یعنی اس پر عمل کرنے کے نتیجے میں زندگی کے ہر شعبے میں ایک ہمواری اور استواری پیدا ہوتی ہے۔ گھر جنت کا نمونہ بن جاتے ہیں اور معاشرہ مروت 'خیر خواہی اور ہمدردی کا غماز بن جاتا ہے اور پورے ملک پر اللہ کی رحمتیں اس طرح برستی ہیں کہ ان کے غلوں میں اضافہ ہو جاتا ہے 'ان کی فصلیں لہلہانے لگتی ہیں 'ان کے پھل معمول سے زیادہ رس دینے لگتے ہیں 'ایک عام خوشحالی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کتاب پر ایمان لانے والے شکر کی تصویر بھی بن جاتے ہیں۔ مسلمان اگر قرن اول کی تاریخ پڑھیں تو انھیں اندازہ ہوگا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے خلافت راشدہ اور اس کے بعد بھی مختلف ادوار میں مسلمانوں پر رحمتیں نازل فرمائیں۔ حق و باطل کے ہر معرکے میں ان کو سرخرو فرمایا اور اہل زمین میں ان کو وہ عزت عطا فرمائی کہ سر اور دل ان کے سامنے جھکتے چلے گئے اور مؤرخین بتاتے ہیں کہ اس دور کی کھجور کی گٹھلیاں دیر تک حکومت کے خزانوں میں محفوظ رہیں جس سے بعد کے آنے والوں کو اندازہ ہو سکتا تھا کہ اللہ کی رحمت جب نازل ہوتی ہے تو کس طرح ہر چیز کا حجم بڑھ جاتا ہے 'کس طرح ایک ایک انار سے گلاس بھر جاتے تھے اور تھوڑا کھانا بہت سے لوگوں کے لیے کفایت کر جاتا تھا۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جانوروں تک کی حفاظت فرماتے ہیں۔ مؤرخین بتاتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں ایک دن ایک گڈریے نے چیخ ماری۔ لوگ آواز سن کے دوڑے آئے پوچھا تمہیں کیا ہوا اس نے کہا کہ جب سے حضرت عمر بن عبدالعزیز برسراقتدار آئے اللہ کی حفاظت ہمارے شامل حال رہی کہ کبھی کسی بھیڑیے کو میری بکریوں پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آج ایک بھیڑیا میری بکری اٹھا کر لے گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آج دنیا میں وہ ہمارا پاسبان زندہ نہیں رہا۔ چنانچہ بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ اسی دن حضرت عمر بن عبدالعزیز کا انتقال ہوا تھا۔ اس کے بعد نبوت 'شریعت اور کتاب کے نزول کے اصل مقصد کو بیان کیا گیا ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) کو ہم نے یہ کتاب اس لیے دی تھی تاکہ لوگ اس پر عمل کرکے اپنے رب سے ملاقات کا یقین پیدا کریں اور یہی اصل میں وہ مقصد حقیقی ہے جس کے لیے دنیا میں کتابیں آتی ہیں اور جس کے لیے پیغمبر تشریف لاتے ہیں۔ کیونکہ انسان کے بگاڑ کا سب سے بڑا سبب اللہ سے برگشتہ ہونا ہے اور یہ برگشتگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب اللہ کے سامنے جواب دہی کا یقین ختم ہو جاتا ہے۔ اللہ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ (تفسیر روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی القرآن)

قرآن و سنت پر عمل اور تفرقہ بازی سے اجتناب کا حکم

یعنی اے پیارے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ فرمادیں کہ اس ساری سورۃ انعام میں جو کچھ بیان کیا گیا یہی میرا راستہ ہے لہٰذا اے لوگو میرے راستہ یعنی میری سنت پر عمل کرو اور اس سے ہٹ کر دوسرے راستوں پر مت چلو ورنہ تم اللہ کے راستے سے بھٹک جاؤ گے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) فرماتے ہیں حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے دست مبارک سے زمین پر ایک سیدھا خط کھینچا پھر اس کے دائیں بائیں بہت سے خطوط بنائے۔ پھر آپ نے فرمایا ان چھوٹے راستوں میں سے ہر راستے پر ایک شیطان بیٹھا ہے جو تمہیں اپنی طرف بلاتا ہے۔ (اور اللہ کے راستہ سے ہٹاتا ہے) پھر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہی آیت پڑھی۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ۔ (ابن ماجہ مقدمہ باب 23)

مسلمانوں میں تفرقہ بازی کی مذمت اور اس کی تاریخ

یاد رھے سیدھا راستہ قرآن وسنت والا ہے اسی پر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور صحابہ کرام چلے پھر اہل اسلام کی صفوں میں ایسے گمراہ لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے مسلمانوں کو گمراہی کے راستوں پر ڈالنا شروع کیا اور مسلمان تفرقوں میں پڑ گئے۔ ان سے بچنے کا یہی طریقہ ہے کہ صحابہ کرام (رض) جیسا عقیدہ وعمل اپنایا جائے۔ حضور سید کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹے تھے میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی ان میں سے ایک فرقہ کے سوا باقی سب جہنم میں جائیں گے۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہ فرقہ کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا: ما انا علیہ و اصحابی۔ جس راستہ پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔

(ترمذی کتاب الایمان باب 18)

اب صحابہ کرام (رض) کا طریقہ کیا تھا؟ تو یاد رکھیے! صحابہ کرام حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محبت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ اس چیز کا احترام کرتے تھے جسے آپ سے نسبت ہو وہ تبرک (حصول برکت) کے قائل تھے وہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وضو کا پانی زمین پر گرنے نہ دیتے تھے، آپ کے بال مبارک حاصل کرکے سنبھال لیتے تھے۔ (مسلم شریف)۔

حضرت امیر معاویہ (رض) نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چند ناخن سنبھالے ہوئے تھے جنہیں ان کی وفات کے بعد ان کی آنکھوں پر رکھ دیا گیا۔ (تاریخ الخلفاء)

سیدہ عائشہ صدیقہ (رض) آپ ﷺ کا تہبند شریف پانی میں بھگو کر وہ پانی بیماروں کو پلاتی تھیں جس سے انھیں شفا ملتی تھی۔

(خصائص کبری)

صحابہ کرام (رض) توسل کے قائل تھے۔ حضرت عثمان بن حنیف (رض) نے زمانہ عثمان غنی (رض) میں ایک پریشان آدمی کو وہ دعائے وسیلہ رسول سکھائی جو خود نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک نابینا صحابی کو سکھائی تھی۔

(طبرانی) صغیر صفحہ 183 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

صحابہ کرام (رض) جنگوں میں یا محمد کے نعرے بھی لگاتے تھے جنگ یمامہ (عہد صدیقی) میں صحابہ کا نعرہ ہی **یا محمداہ** تھا۔

(البدایہ جلد نمبر 6 صفحہ 329)

صحابہ نے عہد فاروقی میں قبر رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر بارش کی دعا کی (البدایہ جلد 7 صفحہ 93) الغرض یہ صحابہ کا طریقہ ہے اسی پر اہل سنت وجماعت قائم ہیں۔ اہلسنت کا معنی ہی یہ ہے کہ سنت رسول اور جماعت صحابہ کے پیروکار لوگ۔

صحابہ کرامؓ پر تبرا بازی کیسے شروع ہوئی

مگر صد افسوس کہ عہد عثمان غنی (رض) میں تفرقہ بازی کا پہلا بیج بویا گیا اور یہودی سازش کے تحت ایک یہودی عالم عبداللہ بن سبا لبادہ اسلام اوڑھ کر مسلمانوں میں داخل ہوا اس نے نظریہ امامت ایجاد کیا اور کہا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد حضرت علی امام اور وصی رسول تھے اور امام پر ایمان لانا اسی طرح ضروری ہے جیسے رسول پر۔ (کامل ابن اثیر جلد 3 صفحہ 154۔ البدایہ والنہایہ جلد 7 صفحہ 267)
اس طرح رافضی لوگ وجود میں آئے جو خلفائے راشدین وامہات المومنین اور جملہ صحابہ کرام (رض) کو گالیاں دیتے اور لعنتیں بھیجتے ہیں۔
پھر رافضی امام فرقہ سے مزید کئی فرقے پیدا ہوئے جیسے زیدیہ، اسماعیلیہ اور نظامیہ وغیرہ۔

معتزلہ کیسے وجود میں آئے

پھر دور تابعین میں حضرت حسن بصری کے شاگردوں میں سے واصل بن عطاء ایرانی نے فرقہ معتزلہ کی بنیاد رکھی اور قرآن وسنت کے مقابلہ میں عقل وزن کو استعمال کیا اللہ کی صفات کا معنی بگاڑا اور یہ کہا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب مسلمان نہیں ہے۔ اور انسان اپنے اعمال کا آخرت میں جوابدہ نہیں ہے۔ پھر معتزلہ میں سے قدریہ، جبائیہ، کرامیہ وغیرہ نے جنم لیا۔ اس طرح امت تقسیم در تقسیم ہوتی گئی۔

نجدی مذہب کیسے وجود میں آیا

اسی طرح ساتویں صدی ہجری میں ابن تیمیہ حرانی نے نئے نظریات ایجاد کیے کہ انبیاء واولیاء سے توسل شرک ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر مبارک کی نیت سے سفر گناہ ہے اور ایک مجلس میں تین طلاقیں ایک رجعی طلاق ہے یہ نظریات عقائد اہل سنت سے متصادم ہیں۔ اس لیے مسلمانوں میں اس سے انتشار پیدا ہوا اور آگے چل کر اس سے نیا فرقہ نجدیہ معرض وجود میں آیا جو توسل کو شرک قرار دیتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنے سوا دوسرے مسلمانوں کو مشرک سمجھتے ہیں جس سے امت مسلمہ میں سر پھٹول جاری رہتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ ان نظریات کی پابندی کی جائے جن پر ائمہ اربعہ متفق ہیں اور ان سے ہٹ کر ہر نظریہ کو رد کر دیا جائے۔
قرآن برکت والی کتاب ہے جہاں اس کی تلاوت ہو برکت ہو جاتی ہے بلاؤں سے کفر ومعاصی کی سیاہی اترتی چلی جاتی ہے اور اس کی پیروی میں اللہ کی رحمت شامل حال ہوتی ہے اس سے کھانے پر قرآن کے پڑھنے کی برکت کی طرف بھی اشارہ ہوا جب قرآن برکت والی کتاب ہے تو کھانے پر اس کا پڑھنا کھانے کو متبرک اور پور نور بنا دیتا ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی قرآن کی ایک آیت ہے حدیث کے مطابق اس کے پڑھنے سے شیطان ہمارے کھانے سے پرے ہٹ جاتا ہے جب صرف بسم اللہ میں اتنی برکت ہے تو یقیناً الحمد للہ اور قل ھو اللہ پڑھنے سے مزید برکت ہی آئے گی۔ (تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب القرآن)

آیت مبارکہ :

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ١٥٥

لغۃ القرآن: وَهٰذَا : اور یہ] [كِتٰبٌ : کتاب] [اَنْزَلْنٰهُ : نازل کیا ہے اس کو] [مُبٰرَكٌ : برکت کی گئی ہوئی] [فَاتَّبِعُوْهُ : پس تم سب پیروی کرو اسکی] [وَ : اور] [اتَّقُوا : تم سب ڈر جاؤ] [لَعَلَّكُمْ : تاکہ تم] [تُرْحَمُوْنَ : سب پر رحم کیا جائے]

ترجمہ : اور یہ (قرآن) برکت والی کتاب ہے جسے ہم نے نازل فرمایا ہے سو (اب) تم اس کی پیروی کیا کرو اور (االلہ سے) ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے

تشریح:

یعنی قرآن شریف جو کثیر خیر والا، کثیر نفع والا اور کثیر برکت والا ہے اور قیامت تک رہے گا اور تحریف و تبدیل و نسخ سے محفوظ رہے گا۔ قرآن اس لیے مبارک ہے کہ مبارک فرشتہ اسے لایا، مبارک مہینے رمضان میں لایا، مبارک ذات پر اترا، خالق و مخلوق کے درمیان وسیلہ ہے، جس کام پر اس کی آیات پڑھ دی جائیں اس میں برکت ہو جائے اور سب سے بڑھ کر اس کی تعلیمات اور ہدایت برکت والی ہیں۔
{ فَاتَّبِعُوْهُ : تو تم اس کی پیروی کرو۔ } یعنی قرآن کریم میں مذکور احکامات پر عمل کرو، ممنوعات سے باز آجاؤ اور اس کی مخالفت کرنے سے بچو تاکہ اس اتباع اور عمل کی برکت سے تم پر رحم کیا جائے۔

امت پر قرآن مجید کا حق

اس سے معلوم ہوا کہ امت پر قرآن مجید کا ایک حق یہ ہے کہ وہ اس مبارک کتاب کی پیروی کریں اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنے سے بچیں۔ افسوس! فی زمانہ قرآن کریم پر عمل کے اعتبار سے مسلمانوں کا حال انتہائی ناگفتہ بہ ہے، آج مسلمانوں نے اس کتاب کی روزانہ تلاوت کرنے کی بجائے اسے گھروں میں جزدان وغلاف کی زینت بنا کر اور دکانوں پر کاروبار میں برکت کے لیے رکھا ہوا ہے اور تلاوت کرنے والے

بھی صحیح طریقے سے تلاوت کرتے ہیں اور نہ یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے رب عَزَّوَجَلَّ نے اس کتاب میں ان کے لیے کیا فرمایا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب تک مسلمانوں نے اس مقدس کتاب کو سینے سے لگا کر حرزِ جاں بنائے رکھا اور اس کے دستور و قوانین اور احکامات پر سختی سے عمل پیرا رہے تب تک دنیا بھر میں ان کی شوکت کا ڈنکا بجتا رہا اور غیروں کے دل مسلمانوں کا نام سن کر دہلتے رہے اور جب سے مسلمانوں نے قرآن عظیم کے احکام پر عمل چھوڑ رکھا ہے تب سے وہ دنیا بھر میں ذلیل و خوار ہو رہے اور اغیار کے دست نگر بن کر رہ گئے ہیں۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر اور ہم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

قرآن کریم کے احکام پر عمل نہ کرنے کا دنیوی نقصان تو اپنی جگہ، اخروی نقصان بھی انتہائی شدید ہے، چنانچہ

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) سے روایت ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ”قرآن شفاعت کرنے والا ہے اور اس کی شفاعت مقبول ہے، جس نے (اس کے احکامات پر عمل کرکے) اسے اپنے سامنے رکھا تو یہ اسے پکڑ کر جنت کی طرف لے جائے گا اور جس نے (اس کے احکامات کی خلاف ورزی کرکے) اسے اپنے پیچھے رکھا تو یہ اسے ہانک کر جہنم کی طرف لے جائے گا۔

(تفسیر الجنان ابو صالح محمد قاسم القادری)

مشرکین پر اتمام حجت کے لیے قرآن مجید کو نازل فرمانا

اس آیت کا معنی ہے یہ قرآن مجید جس کو ہم نے اپنی نبی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل کیا ہے ' یہ برکت والی کتاب ہے۔ تم اس کی پیروی کرو ' یعنی اس کتاب کو اپنا امام بنالو اور جو عقائد اس میں مذکور ہیں ان کو مانو ' اور جو احکام میں مذکور ہیں ان پر عمل کرو ' اور ڈرتے رہو ' یعنی اپنے دلوں میں اللہ سے ڈرو اور اس کے خلاف عمل نہ کرو اور اس کی حدود سے تجاوز نہ کرو اور اس کی حرام کردہ چیزوں کو حلال نہ کرو۔

ربیعہ بیان کرتے ہیں کہ قرآن مجید نے احکام بیان کیے اور کئی احکام سنت کے لیے چھوڑ دیئے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سنتیں قائم کیں اور کئی امور رائے اور قیاس کے لیے چھوڑ دیئے۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ' ج ۵ ' ص ۱۴۲۴)

(تفسیر تبیان القران۔ مولانا غلام رسول سعیدی)

اہل کتاب کے بعد اہل مکہ کو خطاب

سابقہ آیات میں اہل کتاب سے خطاب تھا اور اب اہل مکہ کے حوالے سے پوری دنیا کو مخاطب کیا گیا ہے تاکہ اہل مکہ اور باقی لوگوں کے لیے یہ بہانہ نہ رہے کہ یہود و نصاریٰ کی ہدایت کے لیے تو کتاب نازل کی گئی تھی۔ ہمیں کتاب سے کیوں محروم رکھا گیا۔ یہاں ان دو گروہوں کے لیے توراۃ اور انجیل کا الگ الگ ذکر کرنے کے بجائے ”الکتاب “ فرما کر صرف ایک کتاب یعنی توراۃ کا ذکر کیا گیا ہے یہ اس لیے کہ انجیل توراۃ ہی کے احکام کا تتمہ اور تفصیل ہے۔ اس بنا پر عیسائیوں، یہودیوں کے لیے ”الکتاب “ لایا گیا ہے۔ پھر اہل مکہ اور قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کو مخاطب کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید جیسی مفصل اور مبارک کتاب اس لیے نازل فرمائی ہے کہ تمہیں یہ بات کہنے کا جواز نہ مل سکے کہ ہمارے پاس براہ راست کوئی کتاب نہیں آئی۔ جس سے ہم ہدایت حاصل کرتے۔ قرآن مجید اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ تمہیں یہ کہنے کا موقع نہ مل پائے کہ اگر ہم پر اللہ کی

کتاب نازل ہوتی تو ہم یہود و نصاریٰ کی طرح گمراہ ہونے کے بجائے ہدایت یافتہ ثابت ہوتے۔ اس بہانے کو رفع کرنے اور اتمام حجت کے لیے تمہارے پروردگار کی طرف سے واضح کتاب پہنچ چکی ہے۔ جو سراسر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کا سرچشمہ اور اس کی رحمت کا ذریعہ ہے جو شخص اس کتاب کی ہدایت، دلائل اور بینات کو جھٹلاتا اور ان سے منہ پھیرتا ہے اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں ہو سکتا۔ ایسا شخص گمراہی میں پڑ کر اپنے آپ پر ہی ظلم نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی نسل اور لوگوں کے لیے ہدایت کے راستے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلائیں، ان سے انحراف کریں اور ہدایت کے راستہ میں رکاوٹ بنیں انھیں بدترین عذاب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانے سے مراد زبان سے ان کی تکذیب کرنا یا جان بوجھ کر ان سے اعراض کرنا ہے۔ (تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل القران)

ملت ابراہیمی کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر نازل ہونے والی کتاب کا ذکر فرمایا اور اب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل ہونے والی کتاب کا ذکر کیا جا رہا ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو شریعت ابراہیمی یا ملت ابراہیمی کے جو بنیادی احکام دیئے گئے تھے وہی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی شریعت کی بنیاد تھے اور انہی بنیادوں پر اسلامی شریعت کو اٹھایا گیا ہے اور وہی احکام عشرہ ابراہیمی صحیفوں کی طرح توراۃ میں بھی نازل ہوئے اور اب قرآن کریم میں بھی نازل کیے گئے ہیں 'اس لیے اگر تم نے ملت ابراہیمی پر عمل کرنا ہے اور تم اس میں مخلص ہو تو پھر تمہیں اس ہدایت کی طرف رجوع کرنا چاہیے جو ایک تسلسل کے ساتھ نوع انسانی کی طرف آتی رہی ہے اور جس کی تکمیلی اور آخری شکل قرآن پاک کی صورت میں نازل ہو رہی ہے۔ البتہ یہاں ایک اعتراض ہو سکتا ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد اور بھی کتابیں اتریں اور پھر آخر میں بنی اسرائیل ہی کی طرف آنے والے آخری رسول حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر انجیل نازل ہوئی لیکن یہاں اس کا تذکرہ نہیں کیا گیا جواب اس کا یہ ہے کہ عیسیٰ (علیہ السلام) پر جو انجیل نازل ہوئی اس میں شریعت نہیں بلکہ حکمت شریعت کو بیان کیا گیا ہے اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اللہ کے حکم سے اپنی امت کو توراۃ میں نازل کردہ شریعت پر ہی عمل کرنے کا حکم دیا اور اس سے پہلے آنے والے انبیاء کی امتیں بھی توراۃ ہی کی شریعت پر عمل کرنے کی پابند تھیں اس لیے توراۃ اور قرآن کریم کے ذکر کر دینے کے بعد باقی کتابوں کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی چنانچہ پیش نظر آیات میں اب قرآن کریم کے نزول کی خبر دی گئی ہے اور ساتھ ہی مشرکین عرب کو تنبیہ کی گئی ہے کہ یہ کتاب تم پر آخری حجت کے طور پر نازل کی جا رہی ہے جس کے نتیجے میں تمہارے وہ تمام عذر بھی ختم ہو جائیں گے جو اس کتاب کے نازل نہ ہونے کی صورت میں تم اللہ کے سامنے پیش کر سکتے تھے اور وہ حجت بھی تمام ہو جائے گی جس کے بعد تمہاری بے دینی اور تمہارے موجودہ رویے کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔ ارشاد فرمایا جا رہا ہے:

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۔ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۠ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۔ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ۭ سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ۔ (الانعام: ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷)

(اور یہ کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے سراپا خیر و برکت تو اس کی پیروی کرو اور ڈرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔ مبادا تم کہو کہ کتاب بس ان دو گروہوں پر اتاری گئی جو ہم سے پہلے تھے اور ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے بالکل بے خبر رہے۔ یا کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے سو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک واضح حجت اور ہدایت و رحمت آ گئی ہے تو ان سے بڑھ کر ظالم کون

ہو گا جو اللہ کی آیات کو جھٹلائیں اور ان سے دوسروں کو پھیریں جو لوگ ہماری آیات سے اعراض اختیار کر رہے ہیں ہم ان کو اس اعراض کی پاداش میں عنقریب بہت برا عذاب دیں گے)

ان آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے نزول کو تمام نوع انسانی اور خاص طور پر عربوں پر اپنا خاص فضل و کرم قرار دیا ہے اور اس حوالے سے پہلی آیت میں قرآن پاک کے لیے ایک لفظ استعمال کیا گیا ہے جو ہم اپنی زبان میں بھی استعمال کرتے رہتے ہیں وہ لفظ ہے " مبارک "۔ قرآن پاک کی زبان میں مبارک اس بارش کو کہتے ہیں جو زمین کی سیرابی 'روئیدگی اور سرسبزی کا ذریعہ بنتی 'اس کے خزانوں اور اس کی برکتوں کو ابھارتی اور اس کے مردہ اور بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد اس کو از سر نو حیات تازہ بخشتی ہے۔ اس لفظ کے استعمال سے ایک بہت بڑی حقیقت واشگاف ہو رہی ہے وہ یہ کہ اے عرب کے لوگو اور اے باقی نوع انسانی تم اس وقت روئے زمین پر جس طرح کی زندگی گزار رہے ہو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری انسانیت کے چشمے خشک ہو رہے ہیں۔ تمہارے شجر تہذیب کی جڑیں سوکھتی جا رہی ہیں ' تمہاری انفرادی اور اجتماعی زندگی پر جہالت کی ایسی خزاں چھائی ہوئی ہے کہ جس کے نتیجے میں تمہارے اخلاق اور تمہاری اقدار کا ایک ایک پتہ جھڑ گیا ہے اور ایک ایک کونپل سوکھتی جا رہی ہے اگر یہ سلسلہ جاری رہتا ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کا کوئی مستقبل نہیں تم انفرادی اور معاشرتی زندگی میں اس حد تک درندگی کا شکار ہو چکے ہو کہ تمہارے معاشرے میں رہنے والے کسی فرد کی زندگی سلامت ہے نہ مال اور آبرو۔ تمہاری بظاہر انسانوں کی آبادیوں میں جنگل کا قانون جاری ہے جہاں ہر طاقتور کمزور کو ہضم کرتا جا رہا ہے جس کے پاس طاقت ہے اس کے لیے کمزوروں کے حقوق غصب کر لینا ایک معمول کی بات بن چکی ہے اور جہاں تک تمہارے نام نہاد متمدن ملکوں کا تعلق ہے ان کی تمام قوتیں ایک دوسروں کو فتح کرنے اور ادھیڑنے میں لگی ہوئی ہے۔ ایرانی اور رومی طاقتیں یعنی قیصر و کسریٰ کی قوتوں نے ایک دوسرے کو فتح کرنے کے لیے لاکھوں انسانوں کا خون بہایا ہے اور ہزاروں شہر تباہ کر ڈالے ہیں اگر یہ صورتحال جاری رہتی ہے تو خود اندازہ کرو کہ تمہاری بقاء کے کیا امکانات باقی رہ جاتے ہیں۔ اس صورتحال سے تمہیں نجات دینے اور دوبارہ تمہیں انسانیت کے جامے میں لانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی کتاب اتاری ہے جو تمہارے لیے بہار کا پیغام بن کے آئی ہے۔ اگر تم اسے قبول کر لو تو تمہارے خزاں رسیدہ چمن میں پھر سے حیات تازہ کے پھول کھل سکتے ہیں۔ تمہارا معاشرہ اور تمہارا سماج پھر انسانیت کی تصویر بن سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ تم اس میں دیئے ہوئے احکام کی پیروی کرو 'اس کا بتایا ہوا طرز زندگی اختیار کرو اور زندگی کے ان اصولوں کو قبول کر لو جس کی یہ کتاب دعوت دے رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے بادشاہوں اور اپنے سرداروں سے ڈرنے کی بجائے اللہ کا خوف اپنے دل میں پیدا کرو اسی کے نتیجے میں تمہیں ہر خوف سے آزادی ملے گی اور اسی سے انسانوں کو وہ حقوق مل سکیں گے جس سے انسانیت کو حیات نو نصیب ہو سکتی ہے اور جس کے نتیجے میں اللہ کی رحمت تم پر مہربان ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد اگلی آیت کریمہ میں ان کے ایک عذر کو ختم کیا جا رہا ہے جو قیامت کے دن وہ اللہ کے حضور پیش کر سکتے تھے یعنی وہ قیامت کے دن یہ بات کہہ سکتے تھے کہ آپ ہم سے ہماری جس زندگی کے بارے میں سوالات کر رہے ہیں اور ہماری گمراہیوں پر ہمیں جو سزا دینا چاہتے ہیں آخر ہم اس بگڑی ہوئی زندگی سے کیسے نکل سکتے تھے کیونکہ ہمارے ہاتھوں میں کوئی زندگی کی رہنما کتاب نہیں تھی 'کوئی ایسا صحیفہ آسمانی نہیں تھا جس کی روشنی میں ہم زندگی کا سفر خوش اطواری سے طے کر سکتے۔ ہمارے پاس سوائے آباؤاجداد کی چھوڑی ہوئی رسموں کے اور سوائے اپنے جاہلانہ طور اطوار کے اور کچھ بھی نہیں تھا تو ہم آخر اپنی اصلاح کرتے تو کیسے کرتے۔ ہم جس بات کو جانتے ہی نہیں تھے آخر اس پر عمل کیسے

کرتے۔آپ نے ہمارے ہمسائے میں اگرچہ یہودیوں اور عیسائیوں پر کتابیں اتاری تھیں لیکن ہم ان پڑھ لوگ اس کا علم کیسے حاصل کر سکتے تھے اور پھر انھوں نے یہ سمجھ کر کہ ان کتابوں کی رہنمائی صرف بنی اسرائیل کے لیے ہے کبھی اس کی ہدایت سے ہمیں روشناس کرنے کی کوشش نہ کی اور ہمیں خود بھی جہالت کی وجہ سے کبھی ان چیزوں کا پاس نہ رہا تو اس عذر کی موجودگی میں ہم آپ سے رحمت کے طلب گار ہیں ' اس لیے آپ ہمیں اس کی سزا نہ دیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے یہ کتاب اس لیے تم پر اتاری ہے کہ کل کو تم اپنی بے علمی اور بے خبری کا بہانہ کر کے اور اس کو جواز بنا کر اللہ سے معافی کے طلبگار نہ بن سکو اور اس کے بعد کی آیت میں ان کی مزید ایک بات کا جواب دیا گیا ہے کہ تم قیامت کے دن یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ آپ نے اہل کتاب پر کتابیں اتاریں لیکن انھوں نے اپنی زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی پیدا نہیں کی اگر آپ ہم پر کتاب اتارتے تو آپ دیکھتے کہ ہم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے اور ہم وہ زندگی گزارتے جس کا آج آپ ہم سے مطالبہ کر رہے ہیں اور آج ہمیں جس صورت حال سے سابقہ ہے ہم کبھی اس سے دوچار نہ ہوتے اس لیے پروردگار فرما رہے ہیں کہ ہم نے یہ کتاب اس لیے تم پر اتاری ہے تاکہ یہ آخری حجت تمام کر دے اور تم قیامت کے دن کوئی بہانہ پیش نہ کر سکو اور ساتھ ہی ساتھ اس میں یہ تنبیہ بھی کی جارہی ہے کہ اگر اس حجت کاملہ کے بعد تم اسے قبول کرنے سے انکار کرتے ہو تو پھر خود سوچ لو تمہارا انجام کیا ہوگا لیکن اس وارننگ کے ساتھ ساتھ جیسا کہ قرآن کریم کا اسلوب ہے اللہ تعالیٰ دلوں کو نرم کرنے کے لیے نہایت مربیانہ طریقے سے اس کتاب کی ان دو صفات کو بھی ذکر فرما رہے ہیں جو اس کی قبولیت کے لیے ترغیب کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ فرمایا جس طرح یہ کتاب تمہارے لیے ایک بینہ ہے کہ اس کے بعد تمہارے تمام عذر ختم ہوگئے اسی طرح یہ کتاب ہدایت اور رحمت بھی ہے یعنی یہ کتاب صرف اتمام حجت کے لیے نہیں اور نہ چند ظاہری باتوں کے لیے ہے بلکہ یہ زندگی کی رہنما کتاب ہے یہ کتاب ہدایت ہے جس میں تمہاری زندگی گزارنے کا پورا نظام دیا گیا ہے اس میں تمہارے گھر سے لے کر ایوان حکومت تک زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے لیے رہنمائی فراہم نہ کی ہو اور پھر ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی کہ اگر تم اس رہنمائی کو قبول کر لیتے ہو اور اپنی زندگی اس راستے پر ڈال دیتے ہو جس کی طرف یہ کتاب رہنمائی کر رہی ہے تو پھر یہ کتاب تمہارے لیے رحمت کا پیغام ثابت ہوگی۔ تم اس کی رہنمائی میں ایک ایسی زندگی سے آشنا ہو جاؤ گے جس سے تمہاری دنیا تمہارے لیے جنت کا نمونہ بن جائے گی تم زندگی کے ہر مرحلے میں کامیابیوں سے ہمکنار کیے جاؤ گے ' تمہاری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں شادمانیوں کے وہ پھول کھلیں گے جن کی خوشبو تمہارے مشام جاں کو ہی معطر نہیں کرے گی بلکہ تمہاری عاقبت بھی اس سے سنور جائے گی۔ تم آخرت میں اللہ کی خوشنودی سے سرفراز کیے جاؤ گے اور ایک ایسی ابدی زندگی تمہارا مقدر بنے گی جس میں تم ہر خوف اور ہر حزن سے نجات پا جاؤ گے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی یاد رکھو کہ اگر تم نے اس آخری حجت کو جس میں تمہیں رہنمائی اور رحمت مہیا کی گئی ہے قبول نہ کیا بلکہ اس کو ماننے سے انکار کیا اور دوسروں کو بھی اس سے روکتے رہے تو پھر یاد رکھو اللہ کی نگاہ میں تم سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں ہوگا اور اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ ظالموں کو کبھی ہدایت نہیں دیتا۔ وہ کبھی راہ یاب نہیں ہوتے اور کبھی منزل کی خبر انھیں نہیں ملتی۔ ان کے لیے دنیا میں سوائے ناکامیوں کے دھکوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ ان کی زندگی تلخیوں سے عبارت ہوتی ہے وہ اللہ کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستوں پر ہمیشہ ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں۔ دنیا ان کے لیے ایک ایسا مذبح بن جاتی ہے جس میں ان کے افراد اور ان کی ملیں ہلاکت سے دوچار ہوتی ہیں۔ قیامت کے دن ان کے اس اعراض کے رویے پر اللہ تعالیٰ ان کو بدترین سزا دے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہاں جو کچھ عربوں کو قرآن کریم کے آخری حجت ہونے کے حوالے سے کہا جارہا ہے وہ صرف ان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اس کا مخاطب ہر دور میں نوع انسانی کا ہر گروہ ہے اور بالخصوص مسلمانوں پر تو اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے جن لوگوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا وہ تو صرف آخرت میں اپنے کفر اور انکار کی سزا بھگتیں گے لیکن دنیا میں انھیں جو مہلت دی جاتی ہے کیونکہ کفر کی پاداش میں بالعموم ان کی گرفت نہیں ہوتی اس کی وجہ سے وہ اسباب دنیا کی کشمکش میں اگر اسباب پیدا کرنے میں دوسروں سے آگے نکل گئے تو دنیا میں ان کو دنیوی کامیابیوں سے ہمکنار کیا جائے گا۔ وہ ایک چکاچوند پیدا کرنے والی ترقی سے ہمکنار ہوں گے اور اپنے سے کم ترقی یافتہ قوموں کے لیے ایک خوف کی علامت بن کر زندہ رہیں گے۔ دنیا بظاہر ان کی حیرت انگیز کامیابیوں کو رشک کی نگاہ سے دیکھے گی بلکہ ان کو دوسرے لوگوں کے لیے ایک عذاب بنادیا جائے گا لیکن امت مسلمہ کا مسئلہ اس سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے انھوں نے بظاہر اس کتاب کی رہنمائی کو قبول کیا لیکن حقیقت میں اس سے انکار کیا وہ برابر اللہ کی اس کتاب کی عظمت کا اقرار کرتے رہے لیکن اس کے دیئے ہوئے قانون اور نظام زندگی کو اپنے ملکوں اور اپنی زندگیوں میں نافذ کرنے سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ جس کی سزا ان کو یہ ملے گی کہ دنیا میں وہ ذلت کا شکار ہوں گے اور آخرت میں عذاب ان کا مقدر بنے گا اس لیے اس آیت کریمہ میں جو یہ فرمایا جارہا ہے کہ اللہ کی طرف سے تم پر آخری حجت آچکی ہے تو اس کے مخاطب مسلمان بھی ہیں۔ انھیں اس پر اچھی طرح غور کرنا چاہیے کہ ہم نے اللہ کی کتاب کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ زبان سے اسے مانا ہے لیکن عمل میں داخل کرنے سے انکار کردیا ہے اور قرآن کریم ہی میں ایک سے زیادہ مرتبہ یہ بات کہی ہے کہ ایسے نام نہاد ماننے والوں کو ہم نہ دنیا دیتے ہیں نہ آخرت دیتے ہیں بلکہ دنیا میں وہ ذلت کا شکار ہوں گے اور آخرت میں سخت ترین سزا سے دوچار کیے جائیں گے۔

قرآن کریم کی صورت میں اس آخری حجت کے آجانے کے بعد دو لحاظ سے حجت تمام کردی گئی ایک تو اس لحاظ سے کہ اللہ کی جانب سے قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے جو رہنمائی آنا تھی وہ آگئی اور اس کی حفاظت کا وعدہ بھی فرمالیا تاکہ زمانے کے نشیب وفراز کے بعد کبھی کوئی قوم یہ نہ کہہ سکے کہ اللہ نے اپنا جو آخری قانون نوع انسانی کے لیے اتارا تھا وہ اب چونکہ محفوظ نہیں رہا اس لیے ہم اس کتاب پر عمل کیسے کرسکتے ہیں اور دوسرا اس لحاظ سے اس کو آخری حجت اور بینہ بنایا گیا ہے کہ قرآن بجائے خود اپنی ذات میں ایک ایسی حجت اور برہان القرآن القران۔ علامہ قاری محمد طیب صاحب ہے جو کسی خارجی دلیل کی محتاج نہیں اور یہ ایک ایسا معجزہ ہے جس کے چیلنج کا جواب کبھی دنیا والے نہ دے سکے اور پھر یہ بات بھی کہ یہ توراۃ کی طرح صرف احکام و ہدایت کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ اپنے ہر دعوے اور ہر تعلیم کے دلائل وبراہین بھی اپنے ساتھ لے کر نازل ہوا ہے اور وہ ایسے مضبوط و مستحکم اور ایسے عقلی اور فطری ہیں کہ انسانوں کے لیے اس کی تردید کرنا کٹ حجتی کے سوا اور کچھ نہیں آدمی کی فطرت یہ ہے کہ اگر وہ اپنے انکار اور اپنے رویے پر اڑ جائے اور کٹ حجتی کرنے لگے تو پھر جیسے کھسیانی بلی کھمبا نوچتی ہے اسی طرح مخالفین بھی عجیب و غریب مطالبات میں اپنی انانیت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ قرآن کریم کی دعوت کے سامنے بے بس ہو کر ان لوگوں نے ایسے ہی کچھ مطالبات شروع کردیئے جس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں آرہا ہے۔ (تفسیر روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

قرآن پر عمل نہ کرنے کی سزاء

(۳) امام ابن ابی شیبہ اور احمد نے زھد میں اور محمد بن نصر، طبرانی نے ابن ابی شیبہ اور ابن ضریس اپنے باپ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے دن قرآن کو ایک آدمی کے مشابہ بنایا جائے گا۔ پھر ایک آدمی کو لایا جائے گا جو حامل قرآن تو ہوگا۔ مگر اس کا عمل احکام کے خلاف ہوگا۔ تو قرآن اس سے جھگڑنے لگے گا اور کہے گا اے میرے رب میں نے اسے اپنے آپ اٹھوائے رکھا۔ (لیکن) اس کا مجھے اٹھانا برا ہے۔ اور اس نے میری حدود سے تجاوز کیا۔ اور اس نے فرائض کو ضائع کیا اور میرے بیان کردہ گناہوں کا ارتکاب کیا۔ اور میری اطاعت کو چھوڑ دیا۔ اور برابر اس پر دلائل قائم کرتا رہے گا یہاں تک کہ کہا جائے گا۔ تو اس نے اپنی مرضی کا معاملہ کر پس وہ اس کو اس کے ہاتھ سے پکڑ کر لے جائے گا۔ یہاں تک کہ اس کو ناک کے بل آگ میں اوندھے منہ گرا دے گا۔ ایک اور نیک آدمی لایا جائے گا اس نے قرآن کو اٹھایا تھا (یعنی قاری حافظ بنا) اور اس کے حکم کی حفاظت کی پھر ایک مثالی شکل میں قرآن اس کے قریب کھڑا ہوگا۔ وہ کہے گا اے میرے رب میں نے اپنا بوجھ اس کے سر پر ڈالے رکھا اس نے میری حدود کی حفاظت کی اور میرے بیان کردہ فرائض پر عمل کیا اور میرے بیان کردہ گناہوں سے بچا رہا اور میری اطاعت کی پیروی کی۔ تو وہ برابر اس کے حق میں دلائل دیتا رہے گا یہاں تک کہ اس سے کہا جائے گا تو اس کے ساتھ اپنی پسند کا معاملہ کر وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر لے جائے گا اور اس کو ریشم کا جبہ پہنائے گا اور اس پر شاہانہ تاج سجائے گا اور اس کو شراب کے گلاس سے پلائے گا۔

(۴) امام ابن ابی شیبہ اور ابن ضریس نے ابو موسیٰ اشعری (رض) سے روایت کیا کہ یہ قرآن تمہارے لیے نصیحت ہے اور تمہارے اوپر بوجھ ہے۔ اس کو سیکھو اور اس کی تابعداری کرو اگر تم قرآن کی تابعداری کروگے تو وہ تم کو جنت کے باغ میں لے جائے گا۔ اور اگر قرآن نے تمہارا پیچھا کیا تو تمہاری پیٹھوں میں نیزے مارے گا یہاں تک کہ تم کو آگ میں ڈال دے گا۔ (تفسیر در منثور۔ جلال الدین سیوطی)

آیت مبارکہ :

اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآىِٕفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا۪ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝۱۵۶

لغۃ القرآن: اَنْ : کہ] [تَقُوْلُوْٓا : تم سب کہو] [اِنَّمَآ : بیشک صرف] [اُنْزِلَ : نازل کیا گیا] [الْكِتٰبُ : کتاب] [عَلٰي : پر] [طَاۗىِٕفَتَيْنِ : دو گروہوں] [مِنْ : سے] [قَبْلِنَا

: ہم پہلے] [وَاِنْ : اور اگر] [كُنَّا : تھے ہم] [عَنْ : کے بارے میں] [دِرَاسَتِهِمْ : ان کے پڑھنے پڑھانے] [لَغٰفِلِيْنَ : يقينا سب بے خبر]

ترجمہ : (قرآن اس لیے نازل کیا ہے) کہ تم کہیں یہ (نہ) کہو کہ بس (آسمانی) کتاب تو ہم سے پہلے صرف دو گروہوں (یہود و نصاری) پر اتاری گئی تھی اور بیشک ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے بے خبر تھے

تشریح:

یہاں خطاب مشرکین عرب سے ہے۔ انھیں فرمایا جارہا ہے کہ تمہاری ہدایت کے لیے یہ بے نظیر کتاب نازل کی گئی ہے تاکہ قیامت کے روز تم اپنی گمراہی اور ضلالت کے لیے یہ عذر نہ پیش کرو کہ ہمارے لیے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی کتاب نازل ہی نہیں کی گئی تھی جسے پڑھ کر ہم شرک و کفر سے تائب ہوتے اور توحید کو قبول کرتے۔ اور یہود و نصاریٰ پر بیشک کتابیں نازل ہوئیں لیکن ہم ان کو پڑھنے سے قاصر تھے اس لیے اگر ہم ایمان نہیں لائے تو ہم معذور تھے۔ طائفتین سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ (تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ)

یعنی عربی میں قرآن اس لیے اتارا تاکہ تمہیں یہ کہنے کی گنجائش نہ ہو کہ ہمارے عرب میں کوئی نبی نہ آیا جو کتابیں توراۃ وانجیل آئیں وہ عبرانی زبان میں تھیں جس کو ہم سمجھ نہ سکتے تھے۔ پھر ہدایت پر کیسے آتے اب تمہیں کوئی عذر باقی نہ رہا۔ تم یہود و نصاری کے محتاج نہ رہے۔
تفسیر نور العرفان۔ احمد یار خاں نعیمی)

اب سب کے عذر ختم کر دیئے گئے

یعنی اس مبارک کتاب (قرآن کریم) کے نزول کے بعد عرب کے امین کے لیے یہ کہنے کا بھی موقع نہیں چھوڑا گیا کہ پیشتر جو آسمانی کتابیں شرائع الٰہیہ کو لے کر اتریں وہ تو ہمارے علم کے موافق انہی دو فرقوں (یہود و نصاریٰ) پر اتریں بیشک وہ لوگ آپس میں اسے پڑھتے پڑھاتے تھے اور بعضے اس کا ترجمہ بھی عربی میں کرتے تھے مثلاً ورقہ بن نوفل وغیرہ اور بہت سے مدت تک اس دھن میں لگے رہے کہ عرب کو یہودی یا نصرانی بنالیں لیکن ہمیں ان کی تعلیم وتدریس سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ اس سے بحث نہیں کہ یہود نصاریٰ جو کچھ پڑھتے پڑھاتے تھے وہ چیز کہاں تک اپنی اصلی سماوی صورت میں محفوظ تھی۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ ان شرائع وکتب کی اصلی مخاطب فقط قوم بنی اسرائیل تھی۔ خواہ اس تعلیم کے بعض اجزاء مثلاً توحید اور اصول دینیہ کی دعوت کو وسعت دے کر بنی اسرائیل کے سوا دوسری اقوام کے حق میں بھی عام کر دیا گیا ہو تاہم جو شریعت اور کتاب سماوی بحیثیت مجموعی کسی خاص قوم پر اسی کے مخصوص فائدہ کے لیے اتری ہو اس کے درس وتدریس سے اگر دوسری اقوام خصوصاً عرب جیسی غیور و خوددار قوم کو دلچسپی اور لگاؤ نہ ہو تو کچھ مستبعد نہیں، بنابریں وہ کہہ سکتے تھے کہ کوئی آسمانی کتاب و شریعت ہماری طرف نہیں آئی اور جو کسی مخصوص قوم کے لیے آئی اس سے ہم نے چنداں واسطہ نہیں رکھا پھر ہم ترک شرائع پر کیوں ماخوذ ہوں گے۔ مگر آج ان کے لیے اس طرح کے حیلے حوالوں کا موقع نہیں رہا۔ خدا کی حجت اس کی روشن کتاب اور ہدایت و رحمت عامہ کی بارش

خاص ان کے گھر میں اتاری گئی۔ تاکہ وہ اولاً اس سے مستفید ہوں، پھر اس امانت الٰہیہ کو تمام احمر و اسود اور مشرق و مغرب کے باشندوں تک حفاظت و احتیاط کے ساتھ پہنچا دیں۔ کیونکہ یہ کتاب کسی خاص قوم و ملک کے لیے نہیں اتاری گئی۔ اس کا مخاطب تو سارا جہان ہے۔ چنانچہ خدا کے فضل و توفیق سے عرب کے ذریعہ سے خدا کا یہ عام اور آخری پیغام آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچ گیا۔ والحمد للّٰہ علیٰ ذٰلک۔

(تفسیر گلدستہ۔ محمد اسحاق)

ابن جریر کہتے ہیں: "اِن" کے عامل اور "اِن تقولوا" کے معنی میں مختلف اقوال ہیں۔

معنی، عامل میں اختلاف

1۔ نحات بصرہ: اس کا معنی یہ ہے کہ پھر ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی جس میں نعمت کی تکمیل تھی ان کی خوبیوں کی وجہ سے اس بات کو ناپسند کرتے ہوئے کہ تم کہنے لگو کہ کتاب تو ہم سے پہلے دو گروہوں پر اتاری گئی۔

2۔ نحات کوفہ: "اِن" یہ فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے اور کلام کا معنی یہ ہے کہ تم اتباع کرو اور تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے اور تم یہ کہنے سے بچو کہ کتاب تو ہم سے پہلے دو گروہوں پر اتاری گئی۔ یہ اسی طرح ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا: (اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُکُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ)، [سورۃ الحجرات: 2] تم اس سے بچو! کہ کہیں تمہارے اعمال ضائع نہ ہو جائیں اور تمہیں پتہ بھی نہ ہو۔

3۔ "اِن" یہ موضع نصب میں ہے اور نصب دو مکانوں کی وجہ سے ہے۔ (1)۔ ہم نے اس کتاب کو اتارا تاکہ وہ یہ نہ کہیں کہ کتاب تو ہم سے پہلے دو گروہوں پر اتری۔ 2۔ "اتقوا"۔ اور یہ "اِن" کے مقام کے لیے مناسب نہیں جیسا کہ اس آیت میں (یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمۡ اَنۡ تَضِلُّوۡا) [سورۃ النساء: 176]۔

ابن جریر کہتے ہیں: سب سے بہتر قول یہ ہے کہ "اِن" کو "انزلنا" سے متعلق کیا جائے کیوں کہ کلام کا مطلب یہ ہے کہ یہ مبارک کتاب ہم نے اس لئے اتاری تاکہ تم یہ نہ کہو کہ کتاب تو ہم سے پہلے دو گروہوں پر اتاری گئی۔

"الطائفتان": ان دو گروہوں سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں کہ جن کے متعلق مشرکین یہ کہہ سکتے تھے کہ ان کو کتاب ملی اس لیے وہ امر و نہی کے ذمہ دار بنے ہم پر وہ کتاب نہیں اتری اگر ہم پر اترتی تو تب ہم پر حجت ہوتی، اب کتاب کو اتار کر ان کا عذر ختم کر دیا گیا۔

(تفسیر طبری۔ ابی جعفر محمد بن جریر طبؔی)

اہل عرب کا ایک ممکنہ عذر

جزیرہ نما عرب میں اسلام سے قبل یعنی ایام جاہلیت میں علاوہ مشرکین عرب کے یہود و نصاریٰ بھی آباد تھے۔ ان کے پاس جو کتابیں انجیل و توراۃ تھیں ان کی اصلی زبان عربی نہ تھی اس لیے عام عرب خصوصاً ان پڑھ اس کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ عیسائیت و یہودیت کچھ تبلیغی مذاہب بھی نہ تھے کہ تمام دنیا کے لوگوں پر ان کا ماننا اور ان پر عمل کرنا واجب ہوتا للذا اگر قرآن پاک نازل نہ ہوتا تو ممکن تھا اہل عرب

بطور عذر کہہ سکتے کہ توراۃ اور انجیل تو یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے نازل ہوئی تھیں اور ہم ان کتابوں کی زبان سے ناواقف تھے اور نہ وہ تبلیغی عمومی مذہب تھے کہ ہم پر ان کی زبان کا پڑھنا سیکھنا واجب تھا اس لیے ہم کو احکام الٰہیہ کا کیا علم ہو سکتا تھا۔ اگر بنی اسرائیل کی طرح ہماری ہدایت کے لیے کوئی کتاب نازل ہوتی تو ہم اس پر پوری طرح عمل کر کے دکھاتے اور یہود و نصاریٰ سے کہیں بڑھ کر کتاب پر عمل کرنے والے ثابت ہوتے اور جب کوئی آسمانی کتاب و شریعت ہماری طرف نہیں آئی اور ہماری زبان میں نہیں اتری اور اس بناء پر ہم خدا کے فرمان سے غافل رہے تو پھر ہمیں سزا کیوں ہو اور ہماری گرفت کیوں ہو؟

اہل عرب کے عذر کا جواب

اہل عرب کے اس موہومہ عذر کے جواب میں ان آیات میں بتلایا جاتا ہے کہ اب تمہیں اس طرح کے عذر اور حیلے حوالوں کا بھی موقع نہیں رہا۔ اب تو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ہدایت و رحمت بھرا قرآن بزبان عربی آچکا جس میں حلال و حرام کا بخوبی بیان ہے اور جس میں دلوں کی ہدایت کے لیے نورانیت ہے اور ایمان والوں کے لیے سراسر رحمت ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ایسی بے مثال روشن کتاب ہدایت و رحمت کا سر چشمہ آنے کے بعد اگر اس کی آیتوں کو کوئی جھٹلائے اور ان سے فائدہ نہ اٹھائے نہ اس پر یقین لائے نہ عمل کرے نہ نیکی کرے نہ بد عملی چھوڑے۔ نہ خود مانے نہ اوروں کو ماننے دے تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا؟ اور اس سے بڑی بد بختی اور شامت کی نشانی اور کیا ہوگی؟ یہ تو خدا کی ایک رحمت ہے جو اس نے نازل فرمائی اب اس سے منہ موڑنا اور اس کو چھوڑ بیٹھنا انتہائی ظلم ہے جو کوئی اپنی جان پر کر سکتا ہے پھر ہو نہیں سکتا کہ اس کا خمیازہ اسے بھگتنا نہ پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے لیے جو اس سے روگردانی کریں خود بھی اس کو نہ مانیں اور دوسروں کو بھی اس کے ماننے سے روکیں برا سخت ترین عذاب تجویز کر رکھا ہے۔ (تفسیر درس قرآن۔ محمد اسحاق)

آفتاب آمد دلیل آفتاب

اللہ تعالیٰ کی اسکیم یہ تھی کہ ہر رسول کو اس کی قوم کی زبان میں پیغام دے کر بھیجا گیا اور جب آخری رسالت دنیا میں آئی تو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تمام اقوام عالم کی طرف بھیجا گیا۔ لہٰذا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) انسانوں کے لیے آخری رسول ہیں۔ کیونکہ ان کو تمام انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا گیا ہے۔

عربوں پر اللہ نے حجت اس طرح تمام کر دی کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اپنی قوموں کی طرف بھیجے گئے اور عرب کہتے تھے کہ ہم ان کی کتابوں کو نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ہم عالم نہ تھے 'نہ ہم تک اس دعوت کو پہنچانے کا کوئی اہتمام کیا گیا۔ اگر ہمارے پاس ہماری زبان میں کوئی کتاب آئی ہوتی تو ہم ضرور ایمان لاتے اور ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔ چنانچہ ان کے پاس یہ کتاب آگئی اور رسول بھی آگئے بلکہ یہ رسول تمام جہان والوں کے لیے آگئے، اس رسول کو ایسی کتاب دی گئی جو خود اپنی سچائی کی دلیل ہے۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ پھر اس کتاب میں جو حقائق بیان ہوئے ان میں کوئی التباس یا پیچیدگی نہیں ہے۔ لوگ جس گمراہی میں ڈوبے
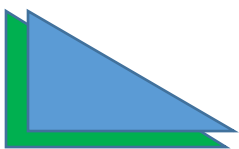
ہوئے ہیں ان کے لیے چراغ روشن ہے اور جن مصیبتوں میں وہ مبتلا ہیں ان کے مقابلے میں رحمت ہے ' دنیا کے لیے بھی اور آخرت کے لیے بھی۔

اگر صورت حال یہ ہے تو پھر اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے جو ایسی کتاب کی آیات کی تکذیب کرتا ہو یا ان سے منہ موڑتا ہو حالانکہ یہ کتاب صحیح راہ ' اصلاح حال اور دنیا و آخرت کی فلاح کی طرف بلاتی ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو اور عوام الناس کو اس کتاب کی برکتوں سے محروم کرتا ہے ' اس سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے۔ وہی شخص ظالم ہے جو جاہلی تصورات اور خلاف اسلام قانون بنا کر اس زمین پر فساد پھیلاتا ہے۔ جو لوگ اس کتاب سے روگردانی کرتے ہیں درحقیقت ان کے مزاج میں فساد پوشیدہ ہے جو انھیں اس چشمہ خیر سے دور رکھتا ہے۔ مثلاً اونٹ کے پاؤں میں جب نقص ہو یا بیماری ہو تو وہ ایک طرف جھکتا ہے اور سیدھا نہیں چلتا۔ (صدف کا یہی مفہوم ہے) یعنی یہ لوگ سچائی سے ایک طرف چلے جاتے ہیں جس طرح ایک بیمار اونٹ ایک طرف جھکا ہوا ہوتا ہے اور سیدھا نہیں چل سکتا۔ اپنے اس میلان کی وجہ سے وہ برے عذاب کے مستحق ہوں گے۔ (تفسیر فی ظلال القرآن۔ سید قطب شاہ)

آیت مبارکہ :

اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ۗ سَنَجْزِى الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ۝١٥٧

لغۃ القرآن : اَوْ : یا] [تَقُوْلُوْا : تم سب کہو] [لَوْ : کاش کہ] [اَنَّآ : بلاشبہ ہم] [اُنْزِلَ : نازل کیا گیا] [عَلَيْنَا : ہم پر] [الْكِتٰبُ : کتاب] [لَكُنَّآ : یقینا ہم ہوتے] [اَهْدٰي : زیادہ ہدایت یافتہ] [مِنْهُمْ : ان سے] [فَقَدْ : تو تحقیق] [جَآءَكُمْ : آچکی ہے تمہارے پاس] [بَيِّنَةٌ : روشن دلیل] [مِنْ رَّبِّكُمْ : تمہارے رب کی طرف سے] [وَ : اور] [هُدًى : ہدایت] [وَرَحْمَةٌ : اور رحمت ہے] [فَمَنْ : پھر جس نے] [اَظْلَمُ : بڑا ظالم] [مِمَّنْ : اس سے جو] [كَذَّبَ : جھٹلایا] [بِاٰيٰتِ اللّٰهِ : اللہ کی آیات کا] [ ]

وَصَدَفَ : اور اعراض کرے] [عَنْهَا : اس سے] [سَنَجْزِي : عنقریب ہم بدلہ دیں گے] [الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو] [يَصْدِفُوْنَ : وہ سب اعراض کرتے ہیں] [عَنْ : کے بارے میں] [اٰيٰتِنَا : ہماری آیتیں] [سُوْٓءَ الْعَذَابِ : برا عذاب] [بِمَا : اس وجہ سے جو] [كَانُوْا : تھے سب] [يَصْدِفُوْنَ : رو گردانی کرتے ہیں]

ترجمہ : یا یہ (نہ) کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم یقیناًان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے، سو اب تمہارے رب کی طرف تمہارے پاس واضح دلیل اور ہدایت اور رحمت آچکی ہے، پھر اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی آیتوں کو جھٹلائے اور ان سے کترائے۔ ہم عنقریب ان لوگوں کو جو ہماری آیتوں سے گریز کرتے ہیں برے عذاب کی سزا دیں گے اس وجہ سے کہ وہ (آیات ربّانی سے) اِعراض کرتے تھے

تشریح:

سابقہ آیات میں اہل کتاب سے خطاب تھا اور اب اہل مکہ کے حوالے سے پوری دنیا کو مخاطب کیا گیا ہے تاکہ اہل مکہ اور باقی لوگوں کے لیے یہ بہانہ نہ رہے کہ یہود و نصاریٰ کی ہدایت کے لیے تو کتاب نازل کی گئی تھی۔ ہمیں کتاب سے کیوں محروم رکھا گیا۔ یہاں ان دو گروہوں کے لیے تورات اور انجیل کا الگ الگ ذکر کرنے کے بجائے "الکتاب "فرما کر صرف ایک کتاب یعنی تورات کا ذکر کیا گیا ہے یہ اس لیے کہ انجیل تورات ہی کے احکام کا تتمہ اور تفصیل ہے۔ اس بنا پر عیسائیوں، یہودیوں کے لیے "الکتاب "لایا گیا ہے۔ پھر اہل مکہ اور قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کو مخاطب کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید جیسی مفصل اور مبارک کتاب اس لیے نازل فرمائی ہے کہ تمہیں یہ بات کہنے کا جواز نہ مل سکے کہ ہمارے پاس براہ راست کوئی کتاب نہیں آئی۔ جس سے ہم ہدایت حاصل کرتے۔ قرآن مجید اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ تمہیں یہ کہنے کا موقع نہ مل پائے کہ اگر ہم پر اللہ کی کتاب نازل ہوتی تو ہم یہود و نصاریٰ کی طرح گمراہ ہونے کے بجائے ہدایت یافتہ ثابت ہوتے۔ اس بہانے کو رفع کرنے اور اتمام حجت کے لیے تمہارے پروردگار کی طرف سے واضح کتاب پہنچ چکی ہے۔ جو سراسر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کا سرچشمہ اور اس کی رحمت کا ذریعہ ہے جو شخص اس کتاب کی ہدایت، دلائل اور بینات کو جھٹلاتا اور ان سے منہ پھیرتا ہے اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں ہو سکتا۔ ایسا شخص گمراہی میں پڑ کر اپنے آپ پر ہی ظلم نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی نسل اور لوگوں کے لیے ہدایت کے راستے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلائیں، ان سے انحراف کریں اور ہدایت کے راستہ میں رکاوٹ بنیں انھیں بدترین عذاب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانے سے مراد زبان سے ان کی تکذیب کرنا یا جان بوجھ کر ان سے اعراض کرنا ہے۔ (فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

صَدَفَ (منہ موڑا) ماضی کا صیغہ ہے۔ صَدْفٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں منہ موڑنا۔ کترانا۔ اعراض کرنا۔ يَصْدِفُوْنَ بھی اسی سے مضارع کا صیغہ ہے۔

قرآن حکیم سے منہ موڑنا

پچھلی آیت میں کہا گیا ہے کہ اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے پاس کوئی کتاب نہیں آئی ہمارے پاس کتاب آتی تو ہم اس پر خوب عمل کر کے دکھاتے تمہارے پاس سب سے بڑھ کر کتاب بھیج دی جو ہدایت کا سرچشمہ ہے اب اگر تم نے اس پر عمل کر کے نہ دکھایا تو بڑا ظلم کیا۔

ارشاد ہے کہ یہ کتاب تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس آ پہنچی ہے اس میں بہت صاف صاف نہایت واضح اور روشن دلیلیں موجود ہیں۔ سیدھے راستے کی طرف راہ نمائی کرتی ہے اور اس میں جو بات ہے وہ سراسر تمہارے فائدے کی ہے یہ خدا کی رحمت ہے جو اس نے تم پر نازل کی ہے جس کتاب میں یہ ساری خوبیاں موجود ہوں اور پھر ایسی کی کبھی ختم ہونے کا نام ہی نہ لیں ہر وقت راہ نمائی کے لیے تیار ہر حالت میں مدد کے لیے موجود آڑے وقتوں میں کام آنے والی اپنے ماننے والوں کو خوشحالی اور عزت کی ضامن اللہ کے ساتھ جوڑنے والی اس سے اگر غفلت برتی جائے اور اس کے حکموں کو اگر پیچھے پھینک کر فضول باتوں میں مشغول رہا جائے تو واقعی بڑی بدبختی اور شامت کی نشانی ہے اب تم بتاؤ کہ اگر کوئی ایسی کارآمد اور مفید کتاب کو بھلا کر بیٹھ جائے اور اس کی طرف سے منہ موڑ لے تو اس سے زیادہ ناکارا اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے والا کون ہو سکتا ہے اس کو چھوڑ بیٹھنا انتہای ظلم ہے جو کوئی اپنی جان پر بلکہ بنی نوع انسان پر کر سکتا ہے ہو نہیں سکتا کہ اس کا خمیازہ اسے نہ بھگتنا پڑے ہم نے ایسے لوگوں کے لئے برا عذاب تجویز کر رکھا ہے وہ اپنی غفلت کی سزا یہاں بھی بھگتیں گے ان سے ساری قومیں عظمت اور عزت چھین لی جائے گی اور مرنے کے بعد بھی انھیں چین نہیں ملے گا۔

مکہ والوں کو یہ آیتیں سنائی گئ تو بہت کم لوگوں نے ان پر یقین کیا باقی سب نے اس کان سے سنا اس کان اڑا دیا تاریخ گواہ ہے کہ ماننے والوں کو کیسی ترقی نصیب ہوئی اور ان کے مرتبے اور درجے کہاں سے کہاں پہنچے۔ اور نہ ماننے والوں کو کیسی ذلت اور خواری سے پالا پڑا۔ انھیں مٹھی بھر ماننے والوں نے ان منکرین کا بھرکس نکال دیا نا ان کی غلط بات پر اتحاد نے کام دیا اور نہ ان کے سامان اور ہتھیاروں نے انھیں کچھ فائدہ پہنچایا۔ پیغام آج بھی اسی طرح باقی ہے سننے والوں کو ہوش سے کام لینا چاہیے۔ (تفسیر درس قرآن۔ آسٹریلیا مسجد مرتب قرآن بورڈ)

قرآنی انداز بیاں

قرآنی انداز بیان کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ عربی زبان کے ایک ایک لفظ کو حسی مفہوم سے بلند کر کے معنوی مدلول کے لیے استعمال کرتا ہے ' لیکن یہ استعمال معنوی مفہوم پر اس طرح منطبق ہوتا ہے کہ اصل حسی مفہوم بھی اپنی جگہ درست نظر آتا ہے۔ اسی طرح (یصدفون) کا استعمال ہوا ہے۔ (صدف) کے معنی یہ ہیں کہ اونٹ اپنے پاؤں کی بیماری کی وجہ سے ایک طرف جھک کر چلے۔ اس کی دوسری مثال ہے (الصعر) صعر عربی زبان میں ایک ایسی بیماری کو کہا جاتا ہے جس میں اونٹ کا منہ ایک طرف ٹیڑھا ہو جاتا ہے اور گردن سیدھی نہیں ہو سکتی۔ یہ بیماری انسانوں کو بھی لاحق ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے اسے بطور تکبر منہ ٹیڑھا کرنے کے لیے استعمال کیا۔ آیت "**ولا تصعر خدك**"۔ (۳۱ : ۱۸) منہ کو ٹیڑھا نہ کرو ' تکبر نہ کرو ' اس کی تیسری مثال خبط کی ہے۔ خبط کے معنی ہیں کسی جانور کا زہریلی گھاس کھا کر پھول جانا۔ خطبت الناقۃ اس

وقت بولتے ہیں جب اونٹنی زہریلی گھاس چر کر پھول جائے۔ قرآن نے یہ لفظ بے مقصد اور بغیر ایمان کے اعمال کے لیے استعمال کیا ہے۔ جس میں بظاہر اعمال بڑے نظر آئیں۔ اس قسم کے استعمال کی بیشمار قرآن میں ہیں۔

اب بات ذرا آگے بڑھتی ہے اور اس کتاب کے آجانے کے بعد اب یہ لوگ مزید خوارق عادت واقعات اور معجزات طلب کرتے ہیں تاکہ وہ اسے تسلیم کرلیں۔ اس قسم کی تہدید سورۃ کے آغاز میں بھی تھی جہاں اسلامی نظریہ توحید اور عقائد کو تسلیم نہ کرنے پر تہدید دی گئی تھی اور یہاں یہ تہدید اسلامی نظام حیات اور اسلامی شریعت کو تسلیم نہ کرنے کی مناسبت سے دوبارہ دہرائی گئی ہے۔ ابتداء میں یہ کہا گیا تھا:

آیت "وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ وَلَوْ أَنزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنظَرُونَ

" کہتے ہیں کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ اگر کہیں ہم نے فرشتہ اتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ' پھر انھیں کوئی مہلت نہ دی جاتی۔ " یہاں اسی مضمون کو دہرایا گیا۔ (تفسیر فی ظلال القرآن۔ سید قطب شہید)

آیت مبارکہ :

هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ ۗ يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِن قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا ۗ قُلِ انتَظِرُوا إِنَّا مُنتَظِرُونَ ○ ۱۵۸

لغۃ القرآن: هَلْ : نہیں] [يَنْظُرُوْنَ : وہ سب انتظار کررہے ہیں] [اِلَّآ : مگر] [اَنْ : کہ] [تَاْتِيَهُمُ : آئیں ان کے پاس] [الْمَلٰٓئِكَةُ : فرشتے] [اَوْ : یا] [يَاْتِيَ : آئے] [رَبُّكَ : تمہارے رب نے] [اَوْ : یا] [يَاْتِيَ : آئے] [بَعْضُ : بعض] [اٰيٰتِ : احکام] [رَبِّكَ : تیرے رب] [يَوْمَ : وہ دن] [يَاْتِيْ : آئیں گی] [بَعْضُ : بعض] [اٰيٰتِ : احکام] [رَبِّكَ : تیرے رب] [لَا : نہیں] [يَنْفَعُ : نفع دیتی ہیں] [نَفْسًا : کسی شخص کو] [اِيْمَانُهَا : اس کا ایمان " لانا "] [لَمْ : نہیں] [تَكُنْ : ہونا] [اٰمَنَتْ : وہ ایمان لائی] [
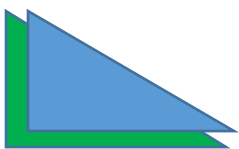
مِنْ قَبْلُ : اس سے قبل] [اَوْ : یا] [كَسَبَتْ : اس نے کمایا] [فِيْٓ : میں] [اِيْمَانِهَا : اپنے ایمان] [خَيْرًا : کوئی بھلائی] [قُلِ : کہ دو "کہ "] [انْتَظِرُوْٓا : تم سب انتظار کرو] [اِنَّا : بیشک ہم] [مُنْتَظِرُوْنَ : سب انتظآر کرنے والے ہیں] [

ترجمہ : وہ فقط اسی انتظار میں ہیں کہ ان کے پاس (عذاب کے) فرشتے آپہنچیں یا آپ کا رب (خود) آجائے یا آپ کے رب کی کچھ (مخصوص) نشانیاں (عیاناً) آجائیں۔ (انہیں بتا دیجئے کہ) جس دن آپ کے رب کی بعض نشانیاں (یوں ظاہراً) آپہنچیں گی (تو اس وقت) کسی (ایسے) شخص کا ایمان اسے فائدہ نہیں پہنچائے گا جو پہلے سے ایمان نہیں لایا تھا یا اس نے اپنے ایمان (کی حالت) میں کوئی نیکی نہیں کمائی تھی، فرما دیجئے: تم انتظار کرو ہم (بھی) منتظر ہیں۔

تشریح:

ان کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے اور گمراہی کے ظلمت کدہ سے باہر نکالنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنا جلیل القدر رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مبعوث فرمایا۔ اس پر قرآن جیسی بے مثل کتاب نازل کی۔ طرح طرح کے معجزات سے اس کی صداقت کو آشکارا کیا۔ اس کے باوجود اگر وہ اسلام نہیں لاتے اور حق کو قبول نہیں کرتے تو کیا وہ اس انتظار میں ہیں کہ موت کا فرشتہ آئے اور ان کی روح قبض کرلے۔ یا قیامت قائم ہو جائے اور خود اللہ تعالیٰ کی کرسی عدالت پر تشریف فرما ہو یا کوئی ایسی نشانی ظاہر ہو جس کے بعد وہ ایمان لانے پر مجبور ہو جائیں۔ اگر واقعی ان چیزوں میں سے کسی کا انتظار کر رہے ہیں تو ان کا یہ انتظار لغو ہے۔ کیونکہ ان چیزوں کے ظہور کے بعد وہ ایمان لے بھی آئے تو وہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ پھر اگر انھوں نے توبہ کی بھی تو وہ منظور نہ ہوگی۔ کیونکہ ایمان تو وہ مقبول ہے جو اللہ تعالیٰ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبان پر یقین کرتے ہوئے لایا جائے۔ جب سب پردے اٹھ جائیں گے اور غیب شہادت میں بدل جائے گا تو اس وقت کا ایمان معتبر نہ ہوگا۔ کیونکہ اس نے اپنی آنکھ اور کان پر تو اعتماد کیا اور اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد نہ مانا۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری)

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب یا ان سے انحراف کرتے ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ اب ان کے پاس اللہ تعالیٰ کے ملائکہ آئیں جو ان کو اپنے زور سے کتاب اللہ کو ماننے پر مجبور کریں یا پھر اللہ کی طرف سے ایسی نشانی یا عذاب نازل ہو کہ یہ مجبور ہو کر پکار اٹھیں کہ واقعی یہ رسول سچا اور اس پر نازل ہونے والی کتاب برحق ہے۔ یاد رہے اہل مکہ برملا یہ اظہار کیا کرتے تھے۔ اس نبی کی تائید کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے فرشتے نازل کیوں نہیں کرتا یا اب تک ایسا عذاب نازل کیوں نہیں ہوا کہ جس کو دیکھ کر ہم قرآن مجید کی تائید اور نبی کی تصدیق کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس صورتحال پر تبصرہ کیا جارہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملائکہ یا کوئی فیصلہ کن نشانی آئے گی تو جو پہلے ایمان نہیں لایا۔ اس کے ایمان لانے کا اس وقت اسے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اور وہ شخص بھی نہیں بچ پائے گا جس نے ایمان لانے کے باوجود نیک کام نہیں کیے۔ اس کی مثالیں پہلی اقوام کے حوالے سے بیشمار ہیں کہ جب ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ کن عذاب آیا تو وہ چیخ چیخ کر

اپنے ایمان کی دہائی دے رہے تھے لیکن ان کا ایمان ان کے لیے فائدہ مند ثابت نہ ہوا۔ لہٰذا اے نبی انھیں فرمائیں اگر تم اس گھڑی کے انتظار میں ہو تو مزید انتظار کرو میں بھی تمہارے انجام کا انتظار کرتا ہوں۔

(عَنْ حُذَيْفَةَ بْنِ أَسِيدٍ الْغِفَارِيِّ (رض) قَالَ كُنَّا قُعُودًا نَتَحَدَّثُ فِي ظِلِّ غُرْفَةٍ لِرَسُولِ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فَذَكَرْنَا السَّاعَةَ فَارْتَفَعَتْ أَصْوَاتُنَا فَقَالَ رَسُولُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لَنْ تَكُونَ أَوْ لَنْ تَقُومَ السَّاعَةُ حَتّٰى يَكُونَ قَبْلَهَا عَشْرُ آيَاتٍ طُلُوعُ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَخُرُوجُ الدَّابَّةِ وَخُرُوجُ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ وَالدَّجَّالُ وَعِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَالدُّخَانُ وَثَلَاثَةُ خُسُوفٍ خَسْفٌ بِالْمَغْرِبِ وَخَسْفٌ بِالْمَشْرِقِ وَخَسْفٌ بِجَزِيرَةِ الْعَرَبِ وَآخِرُ ذٰلِكَ تَخْرُجُ نَارٌ مِنَ الْيَمَنِ مِنْ قَعْرِ عَدَنٍ تَسُوقُ النَّاسَ إِلَى الْمَحْشَرِ)

[رواہ ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب إمارات الساعۃ]

”حضرت حذیفہ بن اسید غفاری (رض) بیان کرتے ہیں ہم نبی معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حجرہ مبارک کے سائے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے دوران گفتگو ہم نے قیامت کا ذکر کیا اس کے ساتھ ہی ہماری آوازیں بھی بلند ہوگئیں۔ رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک اس سے پہلے دس نشانیاں پوری نہ ہوجائیں۔ سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، دابہ جانور کا نکلنا، یاجوج وماجوج کا ظاہر ہونا، دجال کا ظاہر ہونا، عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) کا نزول، دھواں کا ظاہر ہونا اور زمین کا تین مرتبہ دھنسنا ایک مرتبہ مغرب میں، ایک مرتبہ مشرق میں اور ایک مرتبہ جزیرۃ العرب میں اور آخری آگ یمن کے علاقہ سے عدن کی طرف رونما ہوگی جو کہ لوگوں کو محشر کے میدان میں اکٹھا کرے گی۔“

(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَنْ تَابَ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا تَابَ اللّٰہُ عَلَيْهِ) [رواہ مسلم : کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ، باب استحباب الاستغفار]

”حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو بندہ بھی سورج کے مغرب سے طلوع ہونے سے قبل توبہ کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائیں گے۔“

(عَنِ ابْنِ عُمَرَ (رض) عَنِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ إِنَّ اللّٰہَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ)

[رواہ الترمذی : کتاب الدعوات، باب فی فضل التوبۃ]

”حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بلاشبہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ اس کی جان ہنسلی میں اٹکنے سے قبل تک قبول کرتا ہے۔“

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

قیامت سے پہلے دس نشانیوں کا ظہور

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ یہ مشرکین جو بتوں کو اپنے رب کے مساوی قرار دیتے ہیں اور باوجود آپ کی بسیار کوشش اور تبلیغ کے ایمان نہیں لاتے ' وہ صرف اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ موت کے فرشتے آئیں اور ان کی روحوں کو قبض کر لیں ' یا حشر کے دن آپ کا رب مخلوق کے سامنے اپنی شان کے مطابق آئے یا آپ کے رب کی بعض نشانیاں آئیں جن کے بعد قیامت قائم ہو جائے گی، آپ کہئے کہ تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی انتظار کر رہے ہیں۔

حضرت حذیفہ بن اسید غفار (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے پاس تشریف لائے ' ہم اس وقت آپس میں گفتگو کر رہے تھے، آپ نے پوچھا تم کیا باتیں کر رہے ہو ؟ انھوں نے کہا ہم قیامت کا ذکر کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہو گی، جب تک کہ تم اس سے پہلے دس نشانیاں نہ دیکھ لو ' پھر آپ نے دھوئیں کا ذکر کیا اور دجال کا اور دابۃ الارض کا اور مغرب سے سورج کے طلوع ہونے کا اور حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کے نزول کا اور یاجوج اور ماجوج کا ' اور تین بار زمین کے دھنسنے کا، ایک بار مشرق کا دھنسنا، ایک بار مغرب کا دھنسنا اور ایک بار جزیرہ عرب کا دھنسنا اور سب سے آخر میں یمن سے ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو دھکیل کر مشرق کی طرف لے جائے گی۔

(صحیح مسلم ' الفتن ' ٣٩ ' (٢٩٠١) ٧١٥٢ ' سنن ابوداؤد ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ' ٤٣١١ ' سنن الترمذی ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ' ٢١٩٠ ' سنن کبری للنسائی ' ج ٦ ' رقم الحدیث : ' ١١٣٨٠ ' سنن ابن ماجہ ' ج ٢ ' رقم الحدیث : ' ٤٠٤١ ' مسند احمد ' ج ٥ ' رقم الحدیث : ' ١٦١٤٤ ' صحیح ابن حبان ' ج ١٥ ' رقم الحدیث : ' ٦٧٩١ ' المعجم الکبیر ' ج ٣ ' رقم الحدیث : ' ٣٠٢٨ ' مسند احمد ' رقم الحدیث : ' ٨٢٧ ' مصنف ابن ابی شیبہ ج ١٥ ' ص ١٦٣)

اس حدیث میں جس دھوئیں کا ذکر ہے حضرت ابن مسعود (رض) نے اس کی یہ تفسیر کی ہے کہ جب کفار قریش پر قحط مسلط کیا گیا تو انھیں زمین اور آسمان کے درمیان دھوئیں کی شکل کی کوئی چیز دکھائی دی اور حضرت حذیفہ اور حضرت ابن عمر (رض) نے یہ کہا ہے کہ قیامت کے قریب ایک دھواں ظاہر ہوگا ' جس سے کفار کا دم گھٹنے لگے گا اور مومنوں کو صرف زکام ہوگا ' یہ دھواں ابھی تک ظاہر نہیں ہوا ہے ' اور یہ دھواں چالیس روز تک رہے گا۔ قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر ہے۔

(آیت) " فارتقب یوم تاتی السمآء بدخان مبین "۔ (الدخان : ١٠)

ترجمہ ؛ سو آپ اس دن کا انتظار کریں جب آسمان جو اضح دھواں لائے گا۔

(آیت) " واذا وقع القول علیھم اخرجنا لھم دآبۃ من الارض تکلمھم ان الناس کانوا بایتنا لا یوقنون "۔ (النمل : ٨٢)

ترجمہ : اور جب ان پر (عذاب کا) قول واقع ہو جائے گا ' تو ہم ان کے لیے زمین سے ایک جانور (دابۃ الارض) نکالیں گے جو ان سے باتیں کرے گا ' یہ اس لیے کہ لوگ ہماری باتوں پر یقین نہیں کرتے تھے۔

اہل تفسیر نے ذکر کیا ہے کہ یہ ایک بہت بڑی مخلوق ہے جو صفا پہاڑ کو پھاڑ کر نکلے گی ' کوئی شخص اس سے بچ نہیں سکے گا ' مومن پر ایک نشانی لگائے گی تو اس کا چہرہ چمکنے لگے گا اور اس کی آنکھوں کے درمیان مومن لکھ دے گی ' کافر پر نشانی لگائے گی تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جائے گا اور اس کی آنکھوں کے درمیان کافر لکھ دے گی، اس کی شکل و صورت میں اختلاف ہے اور اس میں بھی اختلاف ہے کہ یہ کس جگہ سے نکلے گی۔ ان میں سے کسی چیز کے

متعلق حدیث مرفوع نہیں ہے ،بعض متاخرین نے یہ کہا ہے کہ یہ دابہ انسان کی شکل میں ہوگا اور اہل بدعت اور کفار سے مناظرہ کرے گا اور ان کو دلائل سے ساکت کر دے گا۔ (المفہم ،ج ۷ ،ص ۲۴۰۔۲۳۹ ،مطبوعہ دار ابن کثیر ،بیروت ،۱۴۱۷ھ)

خاص بات

امام ضحاک (رح) فرماتے ہیں "اس نشانی کے ظاہر ہونے سے پہلے جو مومن نیک اعمال کرتا تھا نشانی ظاہر ہونے کے بعد بھی اسی طرح اس کے نیک اعمال اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا البتہ جب یہ نشانی ظاہر ہوئی تو اس وقت نہ کافر کا ایمان مقبول ہے نہ گناہ گار کی توبہ کیونکہ یہ ایسی حالت ہے جس نے انھیں ایمان لانے اور گناہوں سے توبہ کرنے پر مجبور کر دیا للہذا جس طرح عذاب الٰہی دیکھ کر کفار کا ایمان لانا بے فائدہ ہے اسی طرح قرب قیامت کے ہول ناک مناظر دیکھ کر بھی ایمان اور توبہ قبول نہیں۔

توبہ اور نیک اعمال میں سبقت کرنے کی ترغیب

اس آیت میں ہر مسلمان کے لیے نصیحت ہے کہ وہ جلد سے جلد اپنے گناہوں سے سچی توبہ کرکے نیک اعمال میں مصروف ہو جائے۔ نیک اعمال میں سبقت کرنے کی ترغیب حدیث پاک میں بھی دی گئی ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت ہے، تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "چھ چیزوں کے ظاہر ہونے سے پہلے نیک عمل کرنے میں سبقت کرو، سورج کے مغرب سے طلوع ہونے، دھوئیں، دجال، دابۃُالارض، تم میں سے کسی ایک کی موت یا سب کی موت (یعنی قیامت) سے پہلے۔
اور امام محمد غزالی (رح) فرماتے ہیں "توبہ میں تاخیر کرنا سخت نقصان دہ ہے، کیونکہ گناہ سے ابتداءً قَساوتِ قلبی پیدا ہوتی ہے، پھر رفتہ رفتہ گناہ کا انجام یہ ہوتا ہے کہ انسان کفر و گمراہی اور بد بختی میں مبتلا ہو جاتا ہے، کیا تم ابلیس اور بلعم بن باعوراء کا واقعہ بھول گئے، ان سے ابتدا میں ایک ہی گناہ صادر ہوا تھا، آخر نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کفر میں مبتلا ہو گئے اور ہمیشہ کے لیے تباہ حال لوگوں میں شامل ہو گئے۔ ان کے انجام کو مد نظر رکھتے ہوئے تم ڈرتے رہو اور تم پر لازم ہے کہ توبہ کے بارے میں اپنے اندر بیداری اور جانفشانی پیدا کرو، (اگر تم نے جلد توبہ کرلی) تو عنقریب تمہارے دل سے گناہوں کے اصرار کی بیماری کا قلع قمع ہو جائے گا اور گناہوں کے بوجھ سے تمہاری گردن آزاد ہو جائے گی اور گناہوں کی وجہ سے دل میں جو قساوت اور سختی پیدا ہوتی ہے اس سے ہر گز بے خوف نہ ہو بلکہ ہر وقت اپنے حال پر نظر رکھو، اپنے نفس کو گناہوں پر ٹوکتے رہو اور اس کا محاسبہ کرتے رہو اور توبہ و استغفار کی طرف سبقت و جلدی کرو اور اس میں کسی قسم کی سستی اور کوتاہی نہ کرو کیونکہ موت کا وقت کسی کو معلوم نہیں اور دنیا کی زندگی محض دھوکا اور فریب ہے۔
{ قُلِ انْتَظِرُوْٓا : تم فرمادو : تم انتظار کرو۔} یعنی اے کافرو ! تم موت کے فرشتوں کی آمد یا عذاب یا نشانی، ان میں سے کسی ایک کے آنے کا انتظار کرو اور ہم بھی تم پر عذاب آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ کس کا انتظار درست تھا چنانچہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے فضل

سے کافر ہلاک اور مغلوب ہوئے جبکہ مسلمانوں کو غلبہ عطا ہوا اور قیامت کے دن بھی کفار ہلاک ہوں گے اور مومن کامیاب و کامران ہو کر سرخرو ہوں گے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ابو صالح محمد قاسم القادری)

آیت مبارکہ:

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍؕ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝۱۵۹

لغۃ القرآن: اِنَّ : بیشک] [الَّذِیْنَ : وہ لوگ جو] [فَرَّقُوْا : سب نے ٹکڑے ٹکڑے کرلیا] [دِیْنَهُمْ : اپنے دین کو] [وَ : اور] [كَانُوْا : وہ سب تھے] [شِیَعًا : گروہ گروہ کر کے] [لَّسْتَ : نہیں ہیں آپ] [مِنْهُمْ : ان سے] [فِي : میں] [شَيْءٍ : چیز کو] [اِنَّمَآ : بیشک صرف] [اَمْرُهُمْ : ان کا معاملہ] [اِلَى اللّٰهِ : اللہ ہی کی طرف] [ثُمَّ : پھر] [یُنَبِّئُهُمْ : وہ خبر دے گا انہیں] [بِمَا : اس وجہ سے جو] [كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ : تھے وہ سب کرتے]

ترجمہ: بیشک جن لوگوں نے (جدا جدا راہیں نکال کر) اپنے دین کو پارہ پارہ کر دیا اور وہ (مختلف) فرقوں میں بٹ گئے، آپ کسی چیز میں ان کے (تعلق دار اور ذمہ دار) نہیں ہیں، بس ان کا معاملہ اللہ ہی کے حوالے ہے پھر وہ انھیں ان کاموں سے آگاہ فرما دے گا جو وہ کیا کرتے تھے

تشریح:

گزشتہ آیات میں قرآن پر عمل اور تفرقہ بازی سے بچنے کا حکم دیا گیا۔ اب اس پر مزید زور دیا جا رہا ہے اور اس کے انجام بد سے آگاہ کیا جا رہا ہے۔ شِیَعًا شِیْعَۃٌ کی جمع ہے۔ جیسے بیع بیعۃ کی جمع ہے۔ لفظ شیعہ کا معنی ہے ایسا گروہ جو کسی خاص نظریہ کے تحت متحد ہو کر ایک دوسرے کی مدد کریں یا کسی خاص فرد یا قوم کی مدد کے لیے اٹھیں۔ اس آیت سے وہ گمراہ فرقے مراد ہیں جو قرآن وسنت کا واضح راستہ چھوڑ کر دائیں بائیں گمراہی کے راستوں میں پڑ گئے جس کی وضاحت ابھی آیت 153 کے تحت ہو چکی ہے۔ چنانچہ سیدہ عائشہ صدیقہ (رض) فرماتی ہیں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہی آیت پڑھ کر فرمایا: "اس سے میری امت کے اہل بدعت اور اہل ضلالت لوگ مراد ہیں، میں ان سے بری ہوں وہ مجھ سے بری ہیں۔" (ابن ابی حاتم جلد ۵ صفحہ ۱۴۳۰ حدیث ۸۱۱۵ مطبوعہ مکہ)

اسی لیے حدیث میں ہے کہ روز قیامت کچھ لوگ حوض کوثر پر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے لائے جائیں گے۔ آپ فرمائیں گے میری امت کے لوگ آ گئے۔ تب آپ سے کہا جائے گا آپ نہیں جانتے ان لوگوں نے آپ کے بعد دین میں کیا نئی چیزیں (نئے نظریات) ایجاد کر لی تھیں۔ پھر آپ یہ آیت پڑھیں گے: وکنت علیہم شہیدا مادمت فیہم۔ (مائدہ۔ 117) (بخاری کتاب الرقاق، باب 45)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ لفظ شیعہ ہمیشہ اچھے لوگوں کے لیے نہیں بولا جاتا بلکہ گمراہ فرقوں کو بھی شیعہ کہا جاتا ہے۔ للذا اس لفظ پر کسی جماعت کو فخر نہیں کرنا چاہیے اور قرآن کریم میں ایک مقام کے سوا سب جگہ اس لفظ کو برے لوگوں کے لیے ہی بولا گیا ہے، اس کی بجائے اہل سنت و جماعت کا نام بہت با معنی اور حدیث کے مطابق ہے۔ اس کا معنی ہے سنت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور جماعت صحابہ کے پیروکار لوگ۔ (تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب)

فرقہ بندی کی مذمت

اس آیت کی تفسیر میں کئی قول ہیں:

قتادہ اور مجاہد سے مروی ہے کہ اس سے مراد یہود اور نصاری ہیں۔ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت سے پہلے وہ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے تھے اور بعد میں مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا یہ اس امت کے اہل بدعت اور اہل الشبہات ہیں اور اہل الضلالہ ہیں۔ (مجمع الزوائد ' ج ۷ 'ص ۲۳۔ ۲۲ 'مطبوعہ بیروت '۱۴۰۲ھ)

حضرت عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عائشہ (رض) سے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا اے عائشہ! یہ لوگ اصحاب الاھواء اور اصحاب بدعت ہیں اور اہل بدعت کے سوا ہر گناہ گار کی توبہ ہے 'ان کی توبہ مقبول نہیں ہے 'وہ مجھ سے بری ہیں اور میں ان سے بری ہوں۔

حضرت ابن عباس (رض) نے اس آیت کی تفسیر میں کہا اللہ تعالیٰ نے مومنین کو جماعت کے ساتھ وابستہ رہنے کا حکم دیا ہے اور ان کو اختلاف اور فرقہ بندی سے منع فرمایا ہے اور یہ خبر دی ہے کہ اس سے پہلے لوگ اللہ کے دین میں جھگڑنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ' ج ۵ 'ص ۱۴۳۰ 'مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الریاض '۱۴۱۷ھ)

ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد مشرکین کے فرقے ہیں بعض مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے 'بعض مشرکین بتوں کو اللہ کا شریک کہتے تھے 'اور بعض مشرکین ستاروں کو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ بعض لوگ قرآن مجید کی بعض آیتوں کو مانتے تھے اور بعض کا انکار کرتے تھے اور تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد اس امت کے بدعتی اور گمراہ فرقے ہیں۔

خلاصہ: اس آیت سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کو ایک نظریہ پر متفق ہونا چاہیے اور دین میں تفرقہ نہیں کرنا چاہیے اور بدعات کو اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ (تفسیر تبیان القرآن۔ مولانا غلام رسول سعیدی)

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ: بیشک وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔} اپنا دین ٹکڑے ٹکڑے کرنے والوں سے کون لوگ مراد ہیں، اس بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، ان میں سے دو قول درج ذیل ہیں:

(1)۔۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں "ان لوگوں سے مراد یہودی اور عیسائی ہیں۔
رسولُ اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت سے پہلے وہ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے تھے اور بعد میں مختلف فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔
(2)۔۔ حضرت حسن بصری (رح) فرماتے ہیں "ان سے تمام مشرکین مراد ہیں کیونکہ ان میں سے بعض نے بتوں کی پوجا کی اور کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہماری سفارش کریں گے۔ بعض نے فرشتوں کی عبادت کی اور کہا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور بعض نے ستاروں کی پرستش کی، تو یہ ان کی دین میں تفریق ہے۔

فرقہ بندی کا سبب اور حق پر کون؟

حضرت عبداللہ بن عباس (رض) فرماتے ہیں "اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جماعت کے ساتھ وابستہ رہنے کا حکم دیا ہے اور انھیں اختلاف اور فرقہ بندی سے منع فرمایا ہے اور یہ خبر دی ہے کہ ان سے پہلے لوگ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے دین میں جھگڑنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔
خلاصہ یہ کہ اس آیت میں مسلمانوں کو ایک نظریے پر متفق ہونے، دین میں فرقہ بندی اور بدعات اختیار کرنے سے بچنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ فی زمانہ بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ اسلام میں فرقہ بندی کیوں ہے اور ان میں حق پر کون ہے؟ اس سلسلے میں چند باتیں ذہن نشین کر لیجئے، اِنْ شَآءَ اللہ! آپ پر خود ہی واضح ہو جائے گا کہ فرقہ بندی کا اصل سبب کیا ہے اور مختلف فرقوں میں سے حق پر کونسا فرقہ ہے
پہلی بات: یہ امت کبھی گمراہی پر جمع نہ ہو گی۔ حضرت انس (رض) سے روایت ہے، تاجدار رسالت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "اِنَّ اُمَّتِیْ لَا تَجْتَمِعُ عَلٰی ضَلَالَۃٍ فَاِذَا رَاَیْتُمُ اخْتِلَافًا فَعَلَیْکُمْ بِالسَّوَادِ الْاَعْظَمِ" میری امت گمراہی پر جمع نہ ہو گی، جب تم اختلاف دیکھو تو سب سے بڑی جماعت کو لازم پکڑ لو۔ (4)
دوسری بات: حضور انور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صدیوں پہلے ہی اس اختلاف اور فرقہ بندی کے بارے میں پیشین گوئی فرما دی تھی، چنانچہ حضرت عوف بن مالک سے روایت ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَتَفْتَرِقَنَّ اُمَّتِیْ عَلٰی ثَلَاثٍ وَّسَبْعِیْنَ فِرْقَۃً، وَاحِدَۃٌ فِی الْجَنَّۃِ وَثِنْتَانِ وَسَبْعُوْنَ فِی النَّارِ، قِیْلَ یَارَسُوْلَ اللہِ مَنْ ھُمْ قَالَ اَلْجَمَاعَۃُ" اس ذات کی قسم! جس کے دست قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان ہے، میری امت 73 فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی (ان میں سے) ایک جنت میں جائے گا اور 72 جہنم میں جائیں گے۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہ جنتی کون ہوں گے؟ ارشاد فرمایا: وہ جماعت ہے۔
واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اختلاف امت کے بارے میں جو کچھ فرمایا وہ عین حق اور صواب پر مبنی تھا۔
تیسری بات: یہ بات انتہائی قابل غور ہے کہ اس دور اختلاف میں حق پسند اور نجات پانے والے گروہ کا پتا کیسے چلے گا، کس طرح معلوم ہو گا کہ موجودہ فرقوں میں حق پر کون ہے۔ اس کی رہنمائی بھی حدیث پاک میں کر دی گئی ہے کہ "اِذَا رَاَیْتُمُ اخْتِلَافًا فَعَلَیْکُمْ بِالسَّوَادِ الْاَعْظَمِ" جب تم اختلاف دیکھو تو سب سے بڑی جماعت کو لازم پکڑ لو۔

اس روایت میں اختلاف سے مراد اصولی اختلاف ہیں جس میں "کفر و ایمان" اور "ہدایت و ضلالت" کا فرق پایا جائے، فروعی اختلاف ہر گز مراد نہیں کیونکہ وہ تو رحمت ہے جیسا کہ حدیث پاک میں ہے "اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَۃٌ" میری امت کا (فروعی) اختلاف رحمت ہے۔ (3)
اس تفصیل کو ذہن میں رکھ کر موجودہ اسلامی فرقوں میں اس بڑے فرقے کو تلاش کیجئے جو باہم اصولوں میں مختلف نہ ہوں اور جس قدر اسلامی فرقے اس کے ساتھ اصولی اختلاف رکھتے ہوں وہ ان سب میں بڑا ہو۔ آپ کو اہلسنّت و جماعت کے سوا کوئی نہ ملے گا جس میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، قادری، چشتی، سہروردی، نقشبندی، اشعری، ماتریدی سب شامل ہیں یہ سب اہلسنّت ہیں اور ان کے مابین کوئی ایسا اصولی اختلاف نہیں جس میں کفر و ایمان یا ہدایت و ضلال کا فرق پایا جائے لہٰذا اس پر فتن دور میں حدیث مذکور کی رو سے سوادِ اعظم اہلسنّت و جماعت ہے اور اس کا حق پر ہونا بھی ثابت ہوا۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)
انسان کی گمراہی کے اسباب میں ایک کا سبب دین میں اختلاف کرنا ہے۔ باہمی اختلاف کی صورت میں لوگ ٹھوس دلائل کے باوجود انکار کی روش پر قائم رہتے ہیں۔
سورۃ آل عمران میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک دین اسلام ہی دین حق ہے۔ جس کے بنیادی اصول ہمیشہ سے ایک رہے ہیں۔ وہ توحید و رسالت کے بارے میں ہوں یا حلال و حرام اور اخلاق و معاملات کے متعلق۔ لہٰذا جو دین کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں اور اس کو لوگوں کی نظروں میں مختلف فیہ بناتے ہیں۔ اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ کا ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی آپ کے ماننے والوں کا ایسے لوگوں کے ساتھ تعلق ہونا چاہیے۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے وہ ان کو بتائے گا جو وہ کیا کرتے تھے۔ دین میں تفرقہ بازی کا ذکر کرتے ہوئے رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ یہودی اپنے دین میں اختلاف کرنے کی وجہ سے اکہتر فرقے ہوئے، عیسائی اختلاف کی بنا پر بہتر گروہوں میں تقسیم ہو گئے اور میری امت ایک قدم آگے بڑھتی ہوئی تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ (رواہ الترمذی: باب ماجاء فی افتراق ہذہ الامۃ) اختلاف اخلاق و اعمال اور باہمی محبت کے لیے نہایت ہی نقصان دہ ہوتا ہے لیکن اگر یہ اختلاف نیکی اور دین کے نام پر ہو تو اس کے نتائج بڑے ہولناک اور گمراہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ دین انسانوں میں وحدت اور اکائی پیدا کرنے کے لیے آیا ہے اگر اسی کو ہی اختلاف کی بنیاد بنا لیا جائے تو قیامت تک لوگ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے نہ صرف یہود و نصاریٰ الگ الگ امت کی بنیاد پر آپس میں دست و گریباں رہتے ہیں بلکہ ان کے اپنے اپنے گروہ ایک دوسرے کو کافر گمراہ اور جہنمی قرار دیتے ہیں اس صورت حال سے بچنے کے لیے قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کو بلا شرکت غیرے اللہ ماننے اور نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بہترین اسوہ قرار دیتے ہوئے آپ کی اتباع کا حکم دیا ہے۔ تاکہ توحید اور نبی کو ماننے والے متحد و متفق رہیں۔ یہودی تحقیق کے نام پر دین میں غلو کرکے گمراہ ہوئے اور عیسائی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کی والدہ کی عقیدت میں حد سے بڑھے اور صراط مستقیم سے ہٹ گئے۔
آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غلو سے بچنے کے لیے مسائل کی کھال اتارنے اور دین میں قیل و قال سے منع فرمایا اور عقیدت و محبت میں آکر کسی شخصیت کو اس کے مرتبہ و مقام سے بڑھانے سے روکا ہے۔ یہ وہ بنیادی اسباب ہیں جن کی وجہ سے دین دار لوگ گمراہ ہوا کرتے ہیں۔
(عَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَۃَ (رض) قَالَ وَعَظَنَا رَسُولُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یَوْمًا بَعْدَ صَلَاۃِ الْغَدَاۃِ مَوْعِظَۃً بَلِیغَۃً ذَرَفَتْ مِنْہَا الْعُیُونُ وَوَجِلَتْ مِنْہَا الْقُلُوبُ فَقَالَ رَجُلٌ إِنَّ ہٰذِہٖ مَوْعِظَۃُ مُوَدِّعٍ فَمَاذَا تَعْہَدُ إِلَیْنَا یَارَسُولَ اللّٰہِ قَالَ أُوصِیکُمْ
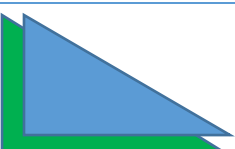
بِتَقْوَى اللّٰہِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَإِنْ عَبْدٌ حَبَشِیٌّ فَإِنَّہُ مَنْ یَعِشْ مِنْکُمْ یَرَی اخْتِلَافًا کَثِیرًا وَإِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ فَإِنَّہَا ضَلَالَۃٌ فَمَنْ أَدْرَکَ ذٰلِکَ مِنْکُمْ فَعَلَیْہِ بِسُنَّتِی وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِینَ الْمَھْدِیِّینَ عَضُّوا عَلَیْہَا بِالنَّوَاجِذِ)

[رواہ الترمذی: کتاب العلم، باب ماجاء فی الأخذ بالسنۃ]

"حضرت عرباض بن ساریہ (رض) بیان کرتے ہیں رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں نماز فجر کے بعد بلیغ وعظ کیا۔ اس سے ہمارے دل کانپ اٹھے اور آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے۔ ایک شخص نے عرض کی یہ تو الوداعی وعظ ونصیحت لگتی ہے اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! آپ ہم سے کیا وعدہ لینا چاہیں گے ؟ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی نصیحت کرتا ہوں اور اس کے ساتھ سمع اور اطاعت کی بھی۔ اگرچہ تم پر ایک حبشی غلام ہی ذمہ دار بنا دیا جائے۔ جو کوئی تم میں سے زندہ رہا میرے بعد وہ بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا۔ تم دین میں نئے نئے کاموں سے بچو۔ بلاشبہ وہ گمراہی ہے جو کوئی تم میں سے ایسی صورت حال پائے تو وہ میرے اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء کے طریقے کو لازم پکڑے اور اسے دانتوں سے مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھے۔"

(عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ (رض) قَالَ سَمِعْتُ رَجُلًا قَرَأَ آیَۃً وَسَمِعْتُ النَّبِیَّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یَقْرَأُ خِلَافَہَا فَجِءْتُ بِہِ النَّبِیَّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فَأَخْبَرْتُہُ فَعَرَفْتُ فِی وَجْہِہِ الْکَرَاہِیَۃَ وَقَالَ کِلَاکُمَا مُحْسِنٌ وَلَا تَخْتَلِفُوا فَإِنَّ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمُ اخْتَلَفُوا فَہَلَکُوا)

[رواہ البخاری: کتاب إحادیث الأنبیاء، باب حدیث الغار]

"حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں میں نے ایک آدمی کو قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے سنا جب کہ میں نے نبی معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو وہی آیت تلاوت کرتے سنا تھا۔ آپ اس سے مختلف انداز سے تلاوت کر رہے تھے۔ میں اس شخص کو لے کر نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو اس کی تلاوت کے بارے میں بتلایا۔ میں نے آپ کے چہرے پر کراہت کے آثار دیکھے آپ نے فرمایا دونوں طریقے ٹھیک ہیں اور تم اس طرح اختلاف نہ کیا کرو بلاشبہ جو لوگ تم سے پہلے تھے انھوں نے اختلاف کیا اور وہ ہلاک ہوگئے۔"

(عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو (رض) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لَیَأْتِیَنَّ عَلٰی أُمَّتِی مَا أَتٰی عَلٰی بَنِی إِسْرَاءِیلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتّٰی إِنْ کَانَ مِنْہُمْ مَنْ أَتٰی أُمَّہُ عَلَانِیَۃً لَکَانَ فِی أُمَّتِی مَنْ یَصْنَعُ ذٰلِکَ وَإِنَّ بَنِی إِسْرَاءِیلَ تَفَرَّقَتْ عَلٰی ثِنْتَیْنِ وَسَبْعِینَ مِلَّۃً وَتَفْتَرِقُ أُمَّتِی عَلٰی ثَلَاثٍ وَسَبْعِینَ مِلَّۃً کُلُّہُمْ فِی النَّارِ إِلَّا مِلَّۃً وَاحِدَۃً قَالُوا وَمَنْ ہِیَ یَا رَسُولَ اللّٰہِ قَالَ مَا أَنَا عَلَیْہِ وَأَصْحَابِی)

[رواہ الترمذی: باب ماجاء فی افتراق ہذہ الامۃ]

"حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) بیان کرتے ہیں رسول مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میری امت میں ایسا وقت ضرور آئے گا کہ وہ بنی اسرائیل کے ساتھ بالکل اس طرح مل جائے گی جس طرح جوتا ایک دوسرے کے ساتھ ملتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان میں سے کسی نے اپنی ماں سے علانیہ زنا کیا ہوگا تو میری امت میں بھی ایسا ضرور ہوگا۔ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئی جبکہ میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ایک گروہ کے علاوہ سارے کے سارے جہنم میں جائیں گئے۔ صحابہ نے استفسار کیا اے رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ! وہ کونسا گروہ ہے ؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو میرے اور میرے صحابہ کرام (رض) کے طریقے پر عمل کرنے والا ہوگا۔

(تفسیر فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝١٦٠

لغۃ القرآن: مَنْ : جو] [جَآءَ : آیا ہو] [بِالْحَسَنَةِ : ایک نیکی کے ساتھ] [فَلَهٗ : تو اس کیلیے] [عَشْرُ "گنا"] [اَمْثَالِهَا : اس کی مثل ہیں] [وَمَنْ : اور جو] [جَآءَ : آیا ہو] [بِالسَّيِّئَةِ : برائی کے ساتھ] [فَلَا : پس نہیں] [يُجْزٰٓى : وہ بدلہ دیا جائے گا] [اِلَّا : مگر] [مِثْلَهَا : اسکی مثل] [وَهُمْ : اور وہ] [لَا : نہیں] [يُظْلَمُوْنَ : سب ظلم کئے جائیں گے]

ترجمہ : جو کوئی ایک نیکی لائے گا تو اس کے لیے (بطور اجر) اس جیسی دس نیکیاں ہیں، اور جو کوئی ایک گناہ لائے گا تو اس کو اس جیسے ایک (گناہ) کے سوا سزا نہیں دی جائے گی اور وہ ظلم نہیں کئے جائیں گے

تشریح:

اس سے پہلی آیت کے آخری الفاظ "بما کانو یفعلون "ہیں۔ یہاں اعمال کی تشریح اور ان کی حیثیت بیان فرمائی کہ اگر لوگ نیکی کریں گے تو اس کا کم از کم دس گنا اجر پائیں گے اگر برائی کریں گے تو صرف اس کے برابر سزا دی جائے گی۔

پارہ تیس کی سورۃ الزلزال میں فرمایا کہ انسان نے ذرہ بھر بھی نیکی کی تو قیامت کے دن اسے اپنی آنکھوں کے سامنے پائے گا۔ اگر اس نے ذرہ برابر برائی کی تو اسے بھی دیکھ لے گا۔ یہاں نیکی یا بدی کے اجر کے بارے میں وضاحت فرمائی کہ ہر حسنہ کا اجر اس کے دس گنا ہوگا۔ تاہم برائی کی سزا دوگنی یا دس گناہ نہیں بلکہ اسی کے برابر ہوگی۔ لیکن قرآن مجید کی دوسری آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو دوگنا عذاب ہوگا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کی گمراہی کا سبب بنے ان کو دوگنا عذاب ہوگا۔ کیونکہ ان کا گناہ ایک کا دوگنا ہوگا۔ لہٰذا ہر کسی کو اس کے گناہ کے بدلے سزا ہوگی۔ البتہ احادیث کی روشنی سے ثابت ہوتا ہے کہ اخلاص اور آدمی کے حالات کے مطابق کی گئ نیکی کے بدلے اللہ تعالیٰ ایک نیکی کا بدلہ دس گنا ہی نہیں بلکہ سات سوگنا سے بھی زیادہ دیں گے جس کی مفسرین نے اس طرح تشریح فرمائی ہے کہ کروڑ پتی آدمی کسی کو کھانا کھلاتا ہے تو اس کے لیے یہ کوئی بھاری اور بڑا کام نہیں اور اگر فاقہ کش آدمی کسی بھوکے کو کھانا کھلاتا ہے تو اس کی یہ نیکی بڑا مقام رکھتی ہے۔ کیونکہ خود بھوکارہ کر دوسرے کا پیٹ بھرتا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں دونوں کی نیکی کے اجر میں فرق ہوگا۔ بعض

لوگوں نے کہا کہ اسباب نہیں اخلاص کی بنا پر فرق ہوگا۔ جتنا نیکی کرنے والے میں اخلاص اور للّٰھیت ہوگی۔ اتنا ہی اس کا اجر بڑھتا جائے گا اس کے مقابلہ میں برائی کی سزا برائی کے برابر ہوگی اور کسی پر ذرہ برابر زیادتی نہ ہوگی۔

(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رض) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مَنْ تَصَدَّقَ بِعَدْلِ تَمْرَةٍ مِنْ كَسْبٍ طَيِّبٍ وَلَا يَقْبَلُ اللّٰهُ إِلَّا الطَّيِّبَ وَإِنَّ اللّٰهَ يَتَقَبَّلُهَا بِيَمِينِهِ ثُمَّ يُرَبِّيهَا لِصَاحِبِهِ كَمَا يُرَبِّي أَحَدُكُمْ فَلُوَّهُ حَتّٰى تَكُونَ مِثْلَ الْجَبَلِ)

[رواہ البخاری: کتاب الزکوۃ، باب الصدقۃ من کسب طیب]

”حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو کوئی اپنی پاکیزہ کمائی سے ایک کھجور کے برابر صدقہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ صرف پاک کمائی ہی قبول کرتا ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے دائیں ہاتھ سے قبول فرماتے ہوئے پھر اسے بڑھائے گا اپنے بندے کے لیے جس طرح تم میں سے کوئی شخص اپنے بچھڑے کی پرورش کرتا ہے اللہ تعالیٰ نیکی کو پہاڑ کی مانند بنادے گا۔“

(عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ (رض) عَنِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فِيمَا يَرْوِي عَنْ رَبِّهِ عَزَّ وَجَلَّ قَالَ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ ثُمَّ بَيَّنَ ذٰلِكَ فَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً فَإِنْ هُوَ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ عِنْدَهُ عَشْرَ حَسَنَاتٍ إِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ إِلٰى أَضْعَافٍ كَثِيرَةٍ وَمَنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً فَإِنْ هُوَ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ سَيِّئَةً وَاحِدَةً)

[رواہ البخاری: کتاب الرقاق، باب من ہم بحسنۃ او سیءۃ]

”حضرت عبداللہ بن عباس (رض) نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں لکھ دی ہیں پھر ان کو واضح کردیا ہے جو کوئی نیکی کرنے کا ارادہ کرے مگر عمل نہ کرسکے اللہ تعالیٰ اپنے ہاں اس کی مکمل نیکی لکھ لیتا ہے اگر وہ ارادے کے ساتھ عمل بھی کرے تو اللہ تعالیٰ اسے دس نیکیوں سے لے کر سات سو گنا سے بڑھا دیتا ہے۔ جو کوئی برائی کا ارادہ کرے مگر اس پر عمل نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے مکمل نیکی لکھ دیتے ہیں اور اگر وہ ارادے کے ساتھ عمل بھی کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک ہی برائی لکھتا ہے۔“

(عَنْ أَبِي عُبَيْدَةَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ
)

[رواہ ابن ماجۃ، کتاب الزہد، باب ذکر التوبۃ]

”حضرت ابوعبیدہ بن عبداللہ اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا گناہوں سے توبہ کرنے والا اسی طرح ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔“

(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رض) أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ يَقُولُ اللّٰهُ إِذَا أَرَادَ عَبْدِي أَنْ يَعْمَلَ سَيِّئَةً فَلَا تَكْتُبُوهَا عَلَيْهِ حَتّٰى يَعْمَلَهَا فَإِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوهَا بِمِثْلِهَا وَإِنْ تَرَكَهَا مِنْ أَجْلِي فَاكْتُبُوهَا لَهُ حَسَنَةً وَإِذَا أَرَادَ أَنْ يَعْمَلَ حَسَنَةً فَلَمْ يَعْمَلْهَا فَاكْتُبُوهَا لَهُ حَسَنَةً فَإِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوهَا لَهُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ)

[رواہ البخاری : کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ یریدون اِن یبدلوا کلام اللہ]

"حضرت ابوہریرہ (رض) رسول معظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے جب میرا بندہ برائی کا ارادہ کرے۔ تم اس کو نہ لکھو یہاں تک کہ وہ اس پر عمل کرے اگر وہ عمل کرتا ہے تو اسے صرف اتنا ہی لکھو اور اگر اسے میری وجہ سے چھوڑتا ہے تو اس کے لیے ایک نیکی لکھ دو۔ اور جب وہ کسی نیکی کا ارادہ کرے اور اس پر عمل نہ بھی کرے تو اس کے لیے ایک نیکی لکھ دو۔ اگر اسے عملی جامہ پہنائے تو اسے دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک بڑھا دو۔"

(فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ) [الزلزال : ۷۔۸]

جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہو گی وہ (بھی) اسے دیکھ لے گا۔

(فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

فعل حسن اور حسنہ کا فرق

اس طرح احسان (فرائض و نوافل کو بہترین طریقے سے سرانجام دینے کا نام) کی بنا پر بھی ایک شخص تعریف کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ حسن کے تحت ہر مباح فعل آتا ہے اس لیے کہ ہر فعل حسن، مباح ہوتا ہے لیکن اس میں ثواب کا استحقاق نہیں ہوتا۔ لیکن اگر لفظ حسن پر حرف تاء داخل ہو جائے اور حسنۃ بن جائے تو یہ لفظ حسن کی اعلیٰ ترین صورتوں یعنی طاعات کے لیے اسم بن جاتا ہے۔ قول باری (**فلہ عشر امثالھا**) کے معنی ہیں آرام و راحت اور لذت کے اعتبار سے دس گنا "اس سے درجے کی بلندی کے لحاظ سے دس گنا مراد نہیں ہے۔ اس لیے کہ درجے کی بلندی اور عظمت طاعت کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ نیکی کا اجر دس گنا دینا یہ محض فضل باری ہے، بندے کا اس پر کوئی استحقاق نہیں ہوتا۔ جس طرح ارشاد باری ہے (**لیوفیھم اجورھم ویزیدھم من فضلہ**۔ تاکہ انھیں ان کا پورا پورا اجر دے اور اپنے فضل سے انھیں مزید بھی دے) عظمت اور بلندی کے لحاظ سے تفضیل یعنی اللہ کے فضل سے ملنے والا مرتبہ ثواب کے مرتبے کے برابر نہیں ہو سکتا اس لیے کہ اگر یہ بات جائز ہوتی تو پھر بندوں کو کسی عمل کے بغیر ابتداء ہی سے جنت کی صورت میں یہ مرتبہ بخش دینا درست ہوتا۔ نیز وہ بندہ جسے اعلیٰ ترین انعامات سے نوازا گیا ہو اس بندے کے برابر ہو جاتا جسے کوئی بھی انعام نہ ملا ہو۔

(تفسیر احکام القرآن للجصاص۔ ابو احمد بن علی الرازی)

ثواب کے درجات

اس آیت سے متعلقعلامہ عبد الرؤوف مناوی (رح) فرماتے ہیں : اس آیت میں جس اضافے کا وعدہ کیا ہے یہ اس کا کم از کم حصہ ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں : آیت سے مراد کہ "جو ایک نیکی لائے" کے مقابلے میں ثواب کے مراتب میں سے اَقل مرتبے کا بیان ہے اور اس کے اکثر مرتبے کی کوئی انتہا نہیں۔
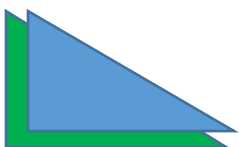
حضرت ملا علی قاری (رح) فرماتے ہیں: ظاہر یہ ہے کہ یہ اقل (یعنی کم از کم) اضافہ ہے۔
ایک اور مقام پر فرمایا "اور وہ زیادتی کا قلیل مرتبہ ہے جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں کیا گیا ہے "مَن جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا "جو ایک نیکی لائے تو اس کے لیے اس جیسی دس ہیں۔
حضرت علامہ عبد الرحمٰن بن شہاب الدین بغدادی (رح) فرماتے ہیں: "نیکی کا دس گنا اضافہ تمام نیکیوں کے لیے لازم ہے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان عالیشان ہے "مَن جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا "جو ایک نیکی لائے تو اس کے لیے اس جیسی دس ہیں۔" علامہ احمد صاوی (رح) فرماتے ہیں "اس آیت میں جو جزا بیان ہوئی یہ اس کے لیے ہے جو نیکی یا گناہ کرے البتہ جس نے نیکی کا ارادہ کیا اور اسے کر نہ سکا تو اس کے لیے ایک نیکی لکھی جائے گی اور جس نے گناہ کا ارادہ کیا لیکن گناہ کیا نہیں، اب اگر اس نے اللہ عَزَّوَجَلَّ کے خوف کی وجہ سے گناہ چھوڑا ہو گا تو اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھی جائے گی ورنہ کچھ نہ لکھا جائے گا۔
یاد رہے کہ ثواب کے اکثر درجات کی کوئی حد نہیں، قرآن پاک میں سات سو گنا کا ذکر فرمانے کے بعد فرمایا کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ جس کیلئے چاہے اس سے بھی زیادہ بڑھا دے اور قرآن پاک میں صبر پر بے حساب اجر کا وعدہ ہے اور حدیث میں مکہ سے پیدل حج کرنے پر ہر قدم پر سات کروڑ نیکیوں کی بشارت ہے۔
{ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ: اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ } ارشاد فرمایا کہ ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا خواہ اس طرح کہ اطاعت گزار اور نیک اعمال کرنے والے کے ثواب میں کمی کر دی جائے اور نافرمان اور گناہ گار کو اس کے جرم سے زیادہ سزا دے دی جائے یا اس طرح کہ انھیں جرم کئے بغیر عذاب دیا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کفار کے چھوٹے بچے جو بچپن میں فوت ہو جائیں وہ دوزخی نہیں کیونکہ انھوں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔

ظلم کے معنی

ظلم کے دو معنی ہیں:
(1)۔۔ کسی غیر کی چیز میں بلا اجازت تصرف کرنا۔
(2)۔۔ بے قصور کو سزا دے دینا یا کام لے کر اس کی اجرت نہ دینا۔
ان جیسی آیات میں ظلم کے دوسرے معنی مراد ہیں اور حدیث پاک کہ اگر خدا تمام دنیا کو دوزخ میں بھیج دے تو ظالم نہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہر چیز اللہ عَزَّوَجَلَّ کی ملکیت ہے اور اللہ عَزَّوَجَلَّ اپنی ملکیت میں جیسے چاہے تصرف فرمائے۔
(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)
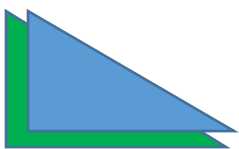
دس گنا اجر ' سات سو گنا اور بے حساب اجر کے محامل

سعید بن جبیر ' عطاء اور ابراہیم وغیرہ سے روایت ہے کہ اس آیت میں الحسنہ سے "لاالہ الا اللہ " کہنا مراد ہے اور السئیہ سے مراد شرک ہے۔ قتادہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ فرماتے تھے کہ اعمال چھ قسم کے ہیں۔ دو عمل (جزاء اور سزا کو) واجب کرتے ہیں اور دو عمل اجر کو بڑھاتے ہیں اور دو عمل برابر برابر کرتے ہیں۔ جو دو عمل واجب کرتے ہیں ' وہ یہ ہیں: جو شخص اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے کہ اس نے اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کیا ہو وہ جنت میں داخل ہوگا ' اور جو شخص اللہ کے ساتھ اس حال میں ملاقات کرے کہ اس نے شرک کیا ہو ' وہ دوزخ میں داخل ہوگا اور جو دو عمل اجر بڑھاتے ہیں ' وہ یہ ہیں جو مسلمان اللہ کی راہ میں خرچ کرے اس کو سات سو گنا اجر ملے گا ' اور جو اپنے گھر والوں پر خرچ کرے اس کو دس گنا اجر ملے گا ' اور جو عمل برابر برابر ہیں ' وہ یہ ہیں ایک بندہ نیکی کا ارادہ کرے اور اس پر عمل نہ کرے ' تو اس کے لیے ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے اور جو بندہ برائی کا ارادہ کرے اور اس برائی کو کرلے تو اس کی ایک برائی لکھی جاتی ہے۔

حضرت ابو سعید خدری (رض) نے اس آیت کی تفسیر میں کہا دس گنا اجر اعراب (دیہاتی ' بادیہ نشین) کے لیے ہے اور مہاجرین کے لیے سات سو گنا اجر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو نے کہا یہ آیت اعراب کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ کسی نے پوچھا اور مہاجرین کے لیے کتنا اجر ہے؟ انھوں نے کہا وہ اس سے بہت زیادہ ہے اور یہ آیت پڑھی:

(آیت) "ان اللہ لایظلم مثقال ذرۃ وان تك حسنة یضعفها ویؤت من لدنه اجرا عظیما"۔ (النساء: ۴۰)

ترجمہ؛ بیشک اللہ کسی پر ایک ذرہ کے برابر بھی ظلم نہیں کرے گا اور اگر کوئی نیکی ہوگی تو اس کو بڑھاتا رہے گا ' اور اپنے پاس سے اجر عظیم عطا فرمائے گا۔

اور جب اللہ کسی شے کو عظیم فرمائے تو وہ بہت بڑی ہوگی۔ (جامع البیان ' جز ۸ ص ۱۴۵۔ ۱۴۲ ملخصا ' مطبوعہ دارالفکر ' بیروت ۱۴۱۵ ھ)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

(آیت) "انما یوفی الصبرون اجرھم بغیر حساب"۔ (الزمر: ۱۰)

ترجمہ: صبر کرنے والوں کا اجر بے حساب ہی ہوگا۔

نیک عمل کرنے والوں کو دس گنا اجر بھی ملتا ہے ' سات سو گنا اجر بھی ملتا ہے اور اللہ اس سات سو گنا کو دگنا بھی فرما دیتا ہے:

(آیت) "ومثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبة انبتت سبع سنابل فی کل سنبلة مائة حبة واللہ یضاعف لمن یشآء واللہ واسع علیم "۔ (البقرہ: ۲۶۱)

ترجمہ: جو لوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ' ان کی مثال اس دانے کی طرح ہے جس نے سات بالیں اگائیں ' ہر بالی میں سو دانے ہیں اور جس کے لیے چاہے اللہ بڑھا دیتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا ' بہت علم والا ہے۔

اور صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ بے حساب اجر عطا فرماتا ہے۔

اور اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب ایک نیکی کا دس گنا اجر ملتا ہے تو اگر انسان ایک دن نماز پڑھ لے اور دس دن نماز نہ پڑھے یا رمضان کے تین دن روزے رکھ لے اور باقی ستائیں دن روزے نہ رکھے تو کیا یہ اس کے لیے جائز ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان اس نماز کا مکلّف ہے جس کا دس گنا اجر ہے اور اس روزے کا مکلّف ہے جس کا دس گنا اجر ہے اور اجر کی یہ کثرت اس عمل کو ساقط نہیں کرتی جس کا اسے مکلف کیا گیا ہے 'اور اجر کی دس مثلوں میں جو ایک مثل ہے اس کو حاصل کرنے کا وہ مکلّف نہیں ہے 'بلکہ اس نیکی کو کرنے کا مکلّف ہے جس کا اجر دس نیکیوں کی مثل ہے۔

ایک اور اعتراض یہ ہے کہ کافر کا کفر تو محدود زمانہ میں ہوتا ہے اور اس کو سزا لامحدود زمانہ کی ہوتی ہے 'تو یہ اس جرم کی برابر سزا نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سزا میں یہ لازم نہیں ہے کہ وہ زمانہ جرم کے برابر ہو 'مثلا اس زمانہ میں ایک شخص کسی کو ایک منٹ میں قتل کر دیتا ہے اور اس کو سزا عمر قید کی دی جاتی ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ سزا اس کی نیت کے اعتبار سے ہے 'کیونکہ کافر کی نیت یہ ہوتی ہے کہ وہ دائما کفر کرے گا اس لیے اس کو دوام کی سزا دی جاتی ہے۔

حضرت ابو ذر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جو شخص ایک نیکی لے کر آئے گا اس کو اس کی مثل دس یا اس سے زائد نیکیوں کا اجر ملے گا اور جو برائی لے کر آئے گا 'اس کو صرف اسی کی مثل برائی کی سزا ملے گی 'یا میں اس کو بخش دوں گا۔ اور جو ایک بالشت میرے قریب ہوتا ہے 'میں اس کے ایک ہاتھ قریب ہوتا ہوں اور جو میرے ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے 'میں اس کے چار ہاتھ قریب ہوتا ہوں 'اور جو میرے پاس چل کر آتا ہے 'میں دوڑتا ہوا اس کے پاس آتا ہوں اور جو شخص روئے زمین کے برابر گناہ لے کر میرے پاس آئے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو 'میں اتنی ہی مغفرت کے ساتھ اس سے ملاقات کروں گا۔

(صحیح مسلم 'الذکر والدعا '۲۲ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۲ 'رقم الحدیث: '۳۸۲۱ 'مسند احمد 'ج ۱۵ 'رقم الحدیث: '۲۱۳۸۰ 'طبع قاہرہ)

حضرت ابو ذر (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا 'یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھے وصیت کیجئے۔ آپ نے فرمایا جب تم کوئی گناہ کرو تو اس کے فورا بعد کوئی نیکی کرو 'وہ نیکی اس گناہ کو مٹا دے گی میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا "لا الہ الا اللہ" بھی نیکیوں میں سے ہے؟ آپ نے فرمایا یہ تو افضل نیکی ہے۔ شیخ احمد شاکر نے کہا اس کی سند ضعیف ہے۔

(مسند احمد 'ج ۱۵ 'رقم الحدیث: '۲۱۳۷۶ 'جامع البیان 'ج ۸ ص ۱۴۵ 'تفسیر امام ابن ابی حاتم 'رقم الحدیث: '۸۱۶۴ 'مجمع الزوائد 'ج ۱۰ 'ص ۸۱)

حضرت ابو ذر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم جہاں کہیں بھی ہو 'اللہ سے ڈرو اور گناہ کے بعد نیک عمل کرو 'اور وہ اس گناہ کو مٹا دے گا 'اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آؤ۔ شیخ احمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

(مسند احمد 'ج ۱۵ 'رقم الحدیث: '۲۱۲۵۱ 'سنن الترمذی ج ۳ 'رقم الحدیث: '۱۹۹۴ 'سنن دارمی 'ج ۲ 'رقم الحدیث: '۲۷۹۱ 'المستدرک 'ج ۱ ص ۵۴ 'امام ذہبی نے اس کی موافقت کی ہے)

اجر میں جو زیادتی کے یہ مختلف مراتب ہیں ان کی توجیہ اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ نیکی کرنے والے کے احوال اور اس کے اخلاص کے مراتب بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مثلا ایک بھوکے کو کھانا کھلانا نیکی ہے 'لیکن اگر ایک کروڑ پتی کسی بھوکے کو کھانا کھلائے تو جیسے اس نے سمندر سے ایک قطرہ خرچ کیا اگر ایک لکھ پتی کھلائے تو وہ اس کے اعتبار سے زیادہ خرچ ہوگا اور اگر ایسا شخص کسی بھوکے کو کھانا کھلائے جس کے پاس صرف وہی کھانا ہو

اور اس شخص کو کھانا کھلا کر وہ خود بھوکا رات گزارے تو یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی کروڑ پتی اپنی ساری دولت راہ خدا میں خرچ کر دے ' کیونکہ اس کی کل دولت تو وہی کھانا تھا۔ اس لیے ان کے اجر کے مراتب بھی مختلف ہوں گے اور کروڑ پتی کو دس گنا اجر ملے گا ' لکھ پتی کو سات سو گنا اور اس تیسرے شخص کو اللہ تعالیٰ بے حساب اجر عطا فرمائے گا۔

(تفسیر تبیان القرآن۔غلام رسول سعیدی)

مجازات کا قانون

ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ میں ان کے افعال شنیعہ کی مجازات پر متنبہ کیا گیا تھا، ساتھ ہی ہر نیک و بد کی مجازات کا عام قانون بتلا دیا کہ بھلائی کا بدلہ کم از کم دس گنا ہے اور برائی کا زائد از زائد اس کے برابر یعنی جس نے ایک نیکی کمائی تو کم از کم ویسی دس نیکیوں کا ثواب ملے گا زائد کی حد نہیں وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ اور جو ایک بدی کا مرتکب ہوا تو ویسی ایک بدی کی جس قدر سزا مقرر ہے اس سے آگے نہ بڑھیں گے، تخفیف کر دیں یا بالکل معاف فرما دیں، یہ اختیار ہے۔ پھر جہاں وفور رحمت کی یہ کیفیت ہو وہاں ظلم کا کیا امکان ہے۔

ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا (یہاں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خدائے تعالیٰ سے روایت کرتے ہوئے فرما رہے ہیں) تمہارا رب عزوجل بڑا رحیم و کریم ہے۔ کسی شخص نے اگر کسی نیک کام کا ارادہ کیا لیکن عمل میں نہ لا سکا تو بھی اس کے لیے ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے اور اگر عمل کر لیا تو دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ یہ اضافہ حسن نیت کا لحاظ کرتے ہوئے سات سو گنا تک بھی جا پہنچتا ہے۔ اور اگر کسی نے ایک گناہ کا ارادہ کیا لیکن اس کو عمل میں نہ لایا تو اس کے لیے بھی ایک نیکی درج ہو جاتی ہے اور اگر وہ گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے تو گناہ دس نہیں بلکہ ایک لکھا جائے گا اور اگر چاہے تو اس کو بھی مٹا دیتا ہے۔ ابوذر سے روایت ہے کہ حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جس نے ایک عمل نیک کیا، اس کو دس حصے زیادہ ثواب ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ اور اگر ایک بدی کی تو اس کی سزا ایک حصہ ہی ہے۔ بلکہ شاید وہ بھی معاف ہو جائے۔ جو مجھ سے ملے اور دنیا بھر کی خطائیں بھی لائے لیکن شرک نہ لائے تو بھی میں اس پر اتنی ہی مغفرت نازل کروں گا۔ جو میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں، اور جو ایک ہاتھ بڑھتا ہے میں دو ہاتھ بڑھتا ہوں، اور جو میری طرف چلتا آتا ہے میں اس کے پاس دوڑتا آتا ہوں۔

حدیث صحیح میں وارد ہے کہ اگر دو مسلمان دو تلواریں لے کر آپس میں لڑنے لگیں تو قاتل اور مقتول دونوں دوزخی ہیں۔ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! قاتل تو ظاہر ہے کہ دوزخی ہو گا لیکن بیچارہ مقتول کیوں دوزخی ہو۔ تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ وہ بھی اپنے ساتھی کو قتل کرنے کے درپے تھا۔ اگر مقتول کا داؤ چل جاتا تو وہی قاتل بن جاتا۔ اب اگر وہ قاتل نہیں بنا ہے تو یہ ایک مجبوری کی بنا پر تھا۔

اسلام کا حسن

حضرت ابوہریرہ (رض) کی روایت کردہ حدیث اسی مفہوم پر دلالت کر رہی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب کوئی اپنے اسلام کو خوب ٹھیک کرلے تو پھر ایک نیکی کرے گا تو اس کے لیے اس جیسی نیکیاں دس گنے سے لے کر سات سوگنا تک لکھی جائیں گی اور اگر کوئی بدی کرے گا تو اتنی ہی بدی لکھی جائے گی یہاں تک کہ وہ اللہ سے جا ملے۔ متفق علیہ۔ اس فرمان میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے چند گنا کرنے کو حسن اسلام سے وابستہ کیا اور حسن اسلام صرف دل کی صفائی اور نفس کے بعد ہی عمل میں اخلاص پیدا ہوتا ہے۔

اس امت کی دوسری امتوں سے نسبت

گزشتہ امتوں کے لیے ایک نیکی کا جتنا ثواب مقرر کیا گیا تھا اس سے دس گنا ثواب اس نیکی کا امت محمدیہ کے لیے مقرر کیا گیا ہے حضرت ابن عمر (رض) کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم لوگوں کی میعاد گزشتہ امتوں کی نسبت سے ایسی ہے جیسے عصر سے مغرب تک کا وقت اور یہود و نصاریٰ کی حالت کے مقابلہ میں تم لوگوں کی حالت ایسی ہے جیسے کسی شخص نے کام کرنے کے لیے کچھ مزدور رکھے اور کہہ دیا کہ جو شخص دوپہر تک کام کرے گا اس کو ایک ایک قیراط ملے گا۔ یہودیوں نے اس قول کے مطابق ایک ایک قیراط مزدوری پر آدھے دن کام کیا پھر اس شخص نے کہا اب جو شخص دوپہر سے عصر کی نماز تک کام کرے گا اس کو ایک ایک قیراط ملے گا اس قول کے مطابق نصاریٰ نے دوپہر سے تک ایک ایک قیراط پر کام کیا پھر اس شخص نے کہا اب جو شخص عصر کی نماز سے سورج غروب ہونے تک کام کرے گا اس کو دو دو قیراط ملیں گے۔ سنو۔ تم ہی وہ لوگ ہو جو عصر سے مغرب تک کام کروگے اور دوہرا اجر پاؤگے۔ یہ فیصلہ سن کر یہودی اور عیسائی ناراض ہوگئے اور بولے کام تو ہمارا زیادہ اور اجرت سب سے کم۔ اللہ نے فرمایا تو کیا میں نے تمہاری کچھ حق تلفی کرلی انھوں نے جواب دیا یہ بات تو نہیں ہوئی اس پر اللہ نے فرمایا پھر یہ مہربانی ہے جس کو چاہتا ہوں دیتا ہوں دیتا ہے۔ رواہ البخاری۔

میں کہتا ہوں اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کے نیک عمل کا گزشتہ امتوں کے نیک اعمال سے دوگنا ثواب ملے گا دس گنا ثواب ملنا اس سے ثابت نہیں ہوتا اس لیے اول الذکر جواب ہی زیادہ صحیح ہے۔ پس ایسا ہوسکتا ہے کہ اس امت کے ادنیٰ نیکوکار کو گزشتہ امتوں کے نیکو کاروں کے مقابلہ میں کم سے کم دوہرا ثواب دیا جائے پھر عمل میں جتنا خلوص بڑھتا جائے اور اللہ کی مہربانی میں جس قدر اضافہ ہوا اتنی ہی مرتبہ میں ترقی ہوتی جائے۔

وھم لا یظلمون۔ اور ان کی حق تلفی نہیں کی جائے گی (ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا)

اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت

حضرت ابوذر (رض) کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ نے ارشاد فرمایا ہے من جآء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا : اور میں اس پر زیادتی کرتا ہوں (کہ اللہ نے وحی غیر متلو میں یہ بھی فرمایا ہے) کہ جو شخص بدی لے کر آئے گا اس کی بدی کی سزا بقدر بدی ہوگی اور میں معاف بھی کردوں گا (جس کو چاہوں گا) جو بالشت بھر میرے قریب آئے گا میں ایک ہاتھ اس کے قریب آجاؤں گا اور جو ایک ہاتھ میرے قریب آئے گا میں ایک گزاس کے قریب ہوجاؤں گا جو میرے پاس معمولی چال سے آئے گا میں اس کے پاس لپک کر آؤں گا اور جو مجھ سے زمین بھر گناہوں کے ساتھ ملے گا بشر طیکہ مشرک نہ ہو۔ میں اس سے اتنی ہی مغفرت کے ساتھ ملوں گا۔ رواہ البغوی۔
اس آخری جملہ کا معنی یہ ہے کہ اگر میں چاہوں گا تو اتنی ہی مغفرت کے ساتھ اس سے ملوں گا (یعنی گناہوں کو بخشنا لازم نہیں بلکہ میری مشیت پر موقوف ہے میں چاہوں گا تو سارے گناہ معاف کردوں گا اور مغفرت کرنی نہ چاہوں گا تو گناہوں کی سزا دوں گا) کیونکہ جزاء سیئۃ بمثلھا : بھی اللہ کا قول ہے (کہ گناہ کے بقدر گناہ کی سزا ہوگی)

صدقات کا ثواب

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عمر (رض) نے فرمایا آیت میں صدقات کے علاوہ دوسری نیکیاں مراد ہیں کیونکہ صدقات کا ثواب تو سات سو گنا تک چند در چند ہوتا جائے گا۔
میں کہتا ہوں کہ حضرت ابن عمر (رض) کی اس تشریح کی علت یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ ماۃ حبۃ واللہ یضاعف لمن یشآء : اور حضرت ابن عمر (رض) کے نزدیک یہ حکم صرف صدقات کے ساتھ مخصوص ہے (یعنی اس آیت میں جو سات سوگنا ثواب ملنے کی صراحت فرمائی ہے وہ صرف مالی خیرات سے تعلق رکھتی ہے) حالانکہ مالی صدقات کے ساتھ اس حکم کی خصوصیت نہیں ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے ہر تسبیح (ایک بار سبحان اللہ پڑھنا) صدقہ ہے ہر تحمید (ایک بار الحمد للہ) کہنا صدقہ ہے ہر تہلیل (ایک بار لا الہ الا اللہ کہنا) صدقہ ہے اور ہر تکبیر (ایک بار اللہ اکبر کہنا) صدقہ ہے۔ رواہ مسلم وابوداؤد وابن ماجۃ من حدیث ابی ذرہ (رض) بلکہ اللہ کے ذکر کا ثواب صدقات سے زائد ہے۔

بہتر اور پاکیزہ تر عمل

حضرت ابوالدرداء کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کیا میں تم کو ایسی چیز بتاؤں جو تمہارے سارے اعمال سے بہتر اور تمہارے مالک کے نزدیک پاکیزہ تر اور تمہارے درجات کو سب اعمال سے زیادہ اونچا کرنے والی ہے اور سونا چاندی خیرات کرنے سے

بھی اعلیٰ ہے اور دشمن کا مقابلہ کر کے ان کی گردنیں کاٹنے اور اپنے گلے کٹوانے سے بھی افضل ہے۔ صحابہ (رض) نے عرض کیا ضرور فرمایئے ارشاد فرمایا اللہ کی یاد۔ رواہ ابن ماجۃ والحاکم والترمذی واحمد۔

افضل صدقہ

طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عباس (رض) کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ کے ذکر سے افضل کوئی صدقہ نہیں۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر مظہری اردو جلد چہارم)

صرف ارادے پر ایک نیکی ہے

صحیح بخاری اور مسلم، نسائی اور مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ تمہارے رب عزوجل رحیم ہے، جو شخص کسی نیک کام کا صرف ارادہ کرے اس کے لیے ایک نیکی لکھ لی جاتی ہے، خواہ وہ عمل کرنے کی نوبت بھی نہ آئے، پھر جب وہ اس نیک کام کو کر لے، تو دس نیکیاں اس کے نامہ اعمال میں لکھ دی جاتی ہیں، اور جو شخص کسی گناہ کا ارادہ کرے، مگر پھر بھی اس پر عمل نہ کرے تو اس کے لیے بھی ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے اور گناہ کا عمل بھی کرے تو ایک گناہ لکھ دیا جاتا ہے یا اس کو بھی مٹا دیا جاتا ہے، اس عفو و کرم کے ہوتے ہوئے اللہ کے دربار میں وہی شخص ہلاک ہو سکتا ہے جس نے ہلاک ہونے ہی کی ٹھان رکھی ہے۔ (ابن کثیر)

عمل باطل کرنے والی چیز

صدقہ کا عمل صالح احسان جتانے یا ایذاء پہنچانے سے باطل اور ضائع ہو جاتا ہے، اسی طرح حدیث میں ہے کہ مسجد میں بیٹھ کر دنیا کی باتیں کرنا نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا لیتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مسجد میں جو اعمال صالحہ نوافل اور تسبیح وغیرہ کے لیے ہیں، وہ دنیا کی باتیں کرنے سے ضائع ہو جاتے ہیں۔ (معارف القرآن جلد سوم) (تفسیر گلدستہ۔ محمد اسحاق)

آیت مبارکہ :

قُلۡ اِنَّنِیۡ هَدٰىنِیۡ رَبِّیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ۚ دِیۡنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبۡرٰهِیۡمَ حَنِیۡفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِیۡنَ ﴿۱۶۱﴾

لغۃ القرآن: قُلْ : کہہ دیں] [اِنَّنِيْ : بیشک میں " ہوں کہ "] [هَدٰىنِيْ : ہدایت دی ہے مجھے] [رَبِّيْٓ : میرے رب نے] [اِلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ : سیدھے راستے کی طرف] [دِيْنًا :" کوئی اور " دین] [قِيَمًا : صحیح] [مِّلَّةَ : دین] [اِبْرٰهِمَ : ابراہیم] [حَنِيْفًا : سیدھی راہ والے] [وَمَا : اور نہ] [كَانَ : ہے] [مِنَ : سے] [الْمُشْرِكِيْنَ : سب مشرک]

ترجمہ : فرما دیجئے: بیشک مجھے میرے رب نے سیدھے راستے کی ہدایت فرما دی ہے، (یہ) مضبوط دین (کی راہ ہے اور یہی) اللہ کی طرف یک سو اور ہر باطل سے جدا ابراہیم (علیہ السلام) کی ملت ہے، اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے

تشریح:

بندگی کا اعلیٰ مقام

بندگی کا اعلیٰ مقام وہ ہوتا ہے جسے رب العزت سے بہانا انبیاء (علیہم السلام) کو عطا کرتا ہے پھر درجہ بدرجہ جتنا کسی کا مقام و مرتبہ ہوگا اسی کے مطابق اس کی بندگی اور انقیاد و تسلیم ہوگی۔ یہاں اور بار بار حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا مقام و مرتبہ اور ان کی خدمات اور ان کی بے مثال قربانیوں کا تذکرہ اسی مقصد کے لئے ہے کہ سارے لوگ ان کو مقتدا تسلیم کریں اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا پختہ عزم کریں مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ سے تعریضاً کہا جارہا ہے کہ تم حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد ہونے کے دعویدار ہو اور اس کی ملت میں ہونے پر فخر کرتے ہو حالانکہ تم سارے کے سارے ان کی ملت اور تعلیمات سے محروم اور خالی دامن ہو حضرت ابراہیم موحد اور موحدوں کے مخططات ہے جبکہ تم مشرک ہو اور وہ حق کے بانی اور محافظ رہے جب کہ تم حق کے دشمن ہو ان کی پوری زندگی حیات موت صرف اللہ تعالیٰ کے دین مبین کی احیاء کے لئے تھی جب کہ تمہاری پوری زندگی دنیا اور متاع دنیا کے حصول کے لیے ہے اور وہ صرف صراط مستقیم کے ساتھ وابستہ رہے جبکہ تم بے مقصد اور

بیشمار باطل فرقوں میں منقسم ہو البتہ اگر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ دینی مذہبی اخلاقی نسبی کوئی تعلق اور رشتہ ہو تو وہ حضرت سید الانبیاء خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہی حاصل ہے جسے کہا جارہا ہے کہ جیسا آپ کا عمل ہے اسی کے مطابق آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اعلان فرمایئے کہ میرے رب نے مجھے ہدایت عطا کی ہے صراط مستقیم پر ڈال دیا ہے جو کہ خالص اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے یہ مضبوط راستہ ہے یہ مستحکم طریق حیات ہے شیطانی راستوں سے الگ اور ممتاز ہے اور یہ میرے جداعلی حضرت ابراہیم کا راستہ اور ان کی ملت ہے وہ موحدوں کے موحد اور موحدوں کے مقتدا تھے جبکہ میں ان کا خلیفہ اور وارث ان کی ملت پر چلنے اور چلانے والا ہوں میری زندگی، نماز، قربانی، طاعات، عبادات، زندگی اور موت سب کچھ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس طرح صاحب ملت میرے مورث اعلی حضرت ابراہیم کے صرف اللہ تعالیٰ کے لئے تھے اور رہا یہ کہ "اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العالمین "مجھے بھی یہی حکم ہو رہا ہے یعنی "وبذلک امرت وانا اول المسلمین اس میں دو باتیں بتائی گئی ہیں اول یہ کہ ہر کام اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہونا چاہیے دوم یہ کہ مومن کی طاعت ہو یا زندگی یہ دونوں قیمتی ہیں اور موت بھی پس وہ کھائے پیئے اٹھے چلے سوئے بھی اللہ تعالیٰ ہی کے لئے اور عبادت وطاعت نماز سے لے کر پوری شریعت پر عمل حتیٰ کہ غیر اختیاری موت بھی اللہ تعالیٰ کے لیے ہو یہ مقام بڑا اونچا ہے جسے بڑے مشائخ نے اور صوفیا کرام نے حاصل کیا کہ پوری زندگی اور زندگی کے اعمال عام اکل و شرب، نشست وبرخاست، شادی، نکاح، آل واولاد شب روز اللہ تعالیٰ کی یاد میں اور اس کی رضا میں قرآن وحدیث کے اتباع میں شریعت مطہرہ کے سایہ میں آخرت کے تصور میں جنت کے مناظر میں گزر جائے اور موت اسی حالت میں آجائے کبھی سجدہ میں رکوع میں یا تلاوت قرآن اور ذکر و اذکار میں یا تصور محبوب کے جلووں میں یہ بہت بڑی سعادت ہوگی بہر حال ایسے لوگ جب بھی مریں گے جس کیفیت میں مریں گے جس رنگ صورت میں مریں گے نظارہ سے محظوظ رہیں گے۔

بچہ ناز رفتہ باز دز جہان نیاز مندے

کہ بوقت جان سپردن بسرش رسیدہ باشی

ایسے لوگوں کی ارواح قبض کرنے پر حضرت ملک الموت مامور نہیں ہوگا بلکہ ان کی ارواح کو قبض کرنے والا اور ساتھ لے کر اپنے حضور پہنچا کر مغفرت کا لباس پہنانے والا حضرت حق تعالیٰ جل شانہ ہی ہوگا فرمائیں گے میرا یہ بندہ سارے جہاں سے میرے لئے خفا تھا آج میں اس کی تمام وحشتوں کی تلافی کروں گا "ارجعی الی ربك راضیة مرضیة ۔ فادخلی فی عبدی وادخلی جنتی "(الفجر)

بر کف جام شریعت بر کف سندان عشق

ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

یہ مقام بہت اونچا مقام ہے اور انسانوں کے لئیے ہے جو نفس و شیطان کے ساتھ جہاد میں مصروف ہوتے ہیں اس کی پہلی شرط ترک دنیا اور ترقیاں 7 ہے اگر یہ شرط نہ ہو تو یہ مقام نصیب نہ ہوگا خواہ کتنی ریاضت وزہد کیوں نہ ہو حضرت حکیم الامت تھانوی (رح) کے ملفوظات میں دیکھا کہ دیوبند اور اس کے اطراف میں تعاون کا مرض پھیل گیا ایک شخص کے گھر سے بیک وقت 11 جنازے اٹھے وہ معمر شخص نہایت ہشاش بشاش نظر آرہا تھا شاید اسی کی نگاہ اسی آیت پر ہو کہ قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔

زندہ کسی عطائے تو سر بکشی فدائے تو

دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

جان ز تن بر دی و در جانی ہنوز

درد ہا دادی و در مانی ہنوز

قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز (امیر خسرو)

حضرت حسن بصری (رح) نے حضرت رابعہ بصری رحمۃاللہ علیہا سے کہاکہ نکاح کرو یہ انبیاء کرام کی سنت ہےاور اس میں بہت بڑی برکت ہے کہنے لگا میرا نکاح کب سے ہو چکا ہے میں اللہ تعالیٰ کی شریعت کے ساتھ نکاح کر چکی ہوں پھر یہ آیت پڑھی۔ (رض)۔

پس چاہیے کہ ہر مومن بندہ اپنی زندگی کو قیمتی سمجھے اور اس کو قیمتی بنائیں تاکہ اس کی موت بھی قیمتی ہو تو اپنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے سپرد فرمائے اور دل میں یہ عہد کریں کہ بالفرض اگر میری زندگی ایک ارب سال کی ہو اور سارا جہاں اور اس کی تمام نعمتیں میرے پاؤں تلے ہوں میں یہ پوری زندگی اطاعت الہی میں گزاروں گا اور دنیا کی لذتوں کی طرف التفات تک نہیں کروں گا دیکھیں سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حضرت جبرئیل (علیہ السلام) نے چھ پہاڑوں کے متعلق پیشکش کی کہ اگر آپ راضی رہو تو یہ سونے جواہرات میں تبدیل ہو جائیں گے اپنے قبول و منظور نہ کیا اب اگر آپ اتباع سنت کرنا چاہیں گے تو باقی سنتوں پر عمل کرنے کے ساتھ اس سنت پر عمل کریں اور تاریخ دنیا بن جائیں مطلب یہ ہے کہ ایک محبوب کی محبت میں دوسرے محبوب کو شریک نہ کرے ہم خدا خواھی و ھم دنیا والا نہ بنو۔

وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ۔ اور مجھے اسی کا حکم ہوا ہے اور میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں۔ یہ اولیت اس عمر کے اعتبار سے ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اول ما خلق اللہ نوری کی طرف اشارہ ہو یعنی امت موجودہ میں دو آخری امت ہے میں سب سے پہلا مسلم ہوں اور یہ بات معلوم ہے کہ اسلام سارے انبیاء (علیہم السلام) کا دین ہے اسی طرح دیگر انبیاء کرام علیہم سلام بھی اپنی امتوں میں سب سے پہلے مسلم اور فرمانبردار تھے۔ روح المعانی کہتی ہے۔ ھذا شان کل نبی بانسبۃ الی امتہ۔ اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ میں صرف دعوت دینے والا نہیں ہوں بلکہ خود بھی عمل کرنے والا ہو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے بارگاہ الہی میں یوں عرض کیا تھا **سبحانك تبت اليك و انا اول المسلمين**۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر نبی ایمان لانے کا اور اپنی لائی ہوئی شریعت پر عمل کرنے کا مکلّف ہوتا تھا۔ سورۃ بقرہ میں فرمایا "امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون "پس امت کی بنسبت نبی کے ایمان کو یقیناً اولیت کا مقام حاصل رہے گا آیت بالا میں چونکہ امت کو دعا کی تعلیم دینا تھی اور قربانی میں وقت کا لحاظ رکھا ہوا تھا اس لئے کبھی اول المسلمین اور کبھی صرف من المسلمین فرمایا گیا۔

(تفسیر منازل العرفان۔ عبد الستار شاہ)

اس سے دو مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بلاواسطہ رب تعالیٰ نے عقائد، اعمال ہر قسم کی ہدایت دی۔، دوسرے یہ کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اول سے ہدایت پر تھے ایک آن کے لیے اس سے دور نہ ہوئے۔ جو ایک آن کے لیے بھی حضور

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہدایت سے علیحدہ مانے وہ اس آیت کا منکر ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) سے روایت ہے، سرکار دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "میرے رب نے مجھے ادب سکھایا اور بہت اچھا ادب سکھایا۔

{وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ: اور (ابراہیم) مشرکوں میں سے نہ تھے۔} اس میں کفار قریش کا رد ہے جو گمان کرتے تھے کہ وہ دین ابراہیمی پر ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام مشرک و بت پرست نہ تھے تو بت پرستی کرنے والے مشرکین کا یہ دعویٰ کہ وہ ابراہیمی ملت پر ہیں باطل ہے۔

عظمتِ انبیاء

اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبروں سے کفار کے الزام اٹھانا سنت الٰہیہ ہے، جو ان کی عزت و عظمت پر اپنی جان و مال، تحریر، تقریر صرف کرتا ہے وہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے نزدیک مقبول ہے۔ رب تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے کفار کا یہ الزام دفع فرمایا کہ آپ (علیہ السلام) مَعَاذَاللہ مشرک تھے۔

(تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

دین اسلام میں کوئی اختلاف نہیں اور نہ ہی یہ دین اس قسم کے اختلافات کو پسند کرتا ہے۔ لہٰذا پیغمبر آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم ہوا کہ آپ ملت ابراہیم کے متبع رہیں۔

سرور دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا تفرقہ بازی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ آپ تو دین قیم اور سیدھی راہ کے راہی اور داعی تھے۔ لہٰذا آپ کی زبان اطہر سے اعلان کروایا گیا کہ اے محبوب۔برحق! آپ وضاحت فرمائیں کہ میرا ادھر ادھر کے راستوں اور متضاد نظریات رکھنے والوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں میں اپنے رب کی بتلائی ہوئی راہ پر اس کی توفیق سے گامزن ہوں۔ یہی دین ہمیشہ سے قائم دائم ہے۔ اور اسی پر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا ملیک سوئیکے ساتھ قائم رہے۔ ان کا مشرکین کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ شرک سے بیزار اور توحید خالص کے پرستار تھے۔ وہ نماز قائم کرنے اور دین حق کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے والے تھے۔ ان کی موت وحیات کا مقصد ہی توحید کا پرچار اور اپنے رب کی فرمان۔برداری تھا۔ یہی میرا نصب العین اور میری زندگی کا مشن ہے۔ اس لیے میری نماز، قربانی اور زندگی کا ہر لمحہ یہاں تک کہ میری موت بھی رب العالمین کے حکم پر ہوگی۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے یہی حکم ہے کہ میں عقیدہ توحید پر قائم رہ کر اس کے دین کی دعوت دیتے ہوئے سب سے پہلے اپنے رب کی فرمان۔برداری کا مظاہرہ کروں گویا کہ جس دعوت کا میں داعی ہوں اس پر سب سے پہلے میں ہی عمل کرنے والا ہوں، اسی بات کا نتیجہ ہے۔ میدان کارزار ہو یا صدقہ وقربانی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے صحابہ (رض) میں سب سے آگے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ مسجد نبوی کی تعمیر کا معاملہ پیش آیا تو اپنے جسم اطہر پر پتھر اٹھائے ہوئے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو امت کے لیے اسوہ حسنہ بنایا تھا اور آپ اول المسلمین ہیں۔ اور یہی دینی قیادت کا وطیرہ ہونا چاہیے کہ وہ عوام الناس کے لیے نمونہ ثابت ہوں۔ اس سے لوگوں کے دلوں میں اخلاص اور جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ (فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

دین اسلام قدیمی ہے

بیو قوف وہی ہے جو دین حنیف سے منہ موڑ لے ورنہ دین اسلام قدیمی ہے سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حکم ہو رہا ہے کہ آپ پر اللہ کی جو نعمت ہے اس کا اعلان کر دیں کہ اس رب نے آپ کو صراط مستقیم دکھا دی ہے جس میں کوئی کجی یا کمی نہیں وہ ثابت اور سالم سیدھی اور ستھری راہ ہے۔ ابراہیم حنیف کی ملت ہے جو مشرکوں میں نہ تھے اس دین سے وہی ہٹ جاتا ہے جو محض بیو قوف ہو اور آیت میں ہے اللہ کی راہ میں پورا جہاد کرو وہی اللہ ہے جس نے تمہیں برگزیدہ کیا اور کشادہ دین عطا فرمایا جو تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے، ابراہیم (علیہ السلام) اللہ کے سچے فرمان بردار تھے مشرک نہ تھے اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار تھے اللہ کے پسندیدہ تھے راہ مستقیم کی ہدایت پائے ہوئے تھے دنیا میں بھی ہم نے انھیں بھلائی دی تھی اور میدان قیامت میں بھی وہ نیک کار لوگوں میں ہوں گے، پھر ہم نے تیری طرف وحی کی کہ ملت ابراہیم حنیف کی پیروی کر کہ وہ مشرکین میں نہ تھا یہ یاد رہے کہ حضور کو آپ کی ملت کی پیروی کا حکم ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ خلیل اللہ آپ سے افضل ہیں اس لیے کہ حضور کا قیام اس پر پورا ہوا اور یہ دین آپ ہی کے ہاتھوں کمال کو پہنچا، اسی لیے حدیث میں ہے کہ میں نبیوں کا ختم کرنے والا ہوں اور تمام اولاد آدم کا علی الاطلاق سردار ہوں اور مقام محمود والا ہوں جس سے ساری مخلوق کو امید ہو گی یہاں تک کہ خلیل اللہ (علیہ السلام) کو بھی۔ ابن مردویہ میں ہے کہ حضور صبح کے وقت فرمایا کرتے تھے حدیث (**اصبحنا علی ملتہ الاسلام وکلمتہ الاخلاص ودین نبینا وملتہ ابراھیم حنیفا وما کان من المشرکین**) یعنی ہم نے ملت اسلامیہ پر کلمہ اخلاص پر ہمارے نبی کے دین پر اور ملت ابراہیم حنیف پر صبح کی ہے جو مشرک نہ تھے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال ہوا کہ سب سے زیادہ محبوب دین اللہ کے نزدیک کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا وہ جو یکسوئی اور آسانی والا ہے، مسند کی حدیث میں ہے کہ جس دن حضرت عائشہ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مونڈھوں پر منہ رکھ کر حبشیوں کے جنگی کرتب ملاحظہ فرمائے تھے اس دن آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ یہ اس لیے کہ یہود یہ جان لیں کہ ہمارے دین میں کشادگی ہے اور میں یکسوئی والا آسانی والا دین دے کر بھیجا گیا ہوں اور حکم ہوتا ہے کہ آپ مشرکوں سے اپنا مخالف ہونا بھی بیان فرما دیں وہ اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت کرتے ہیں دوسروں کے نام پر ذبیحہ کرتے ہیں میں صرف اپنے رب کی عبادت کرتا ہوں اسی کے نام پر ذبح کرتا ہوں چنانچہ بقرہ عید کے دن حضور نے جب دو بھیڑے ذبح کئے تو انی وجھت الخ، کے بعد یہی آیت پڑھی، آپ ہی اس امت میں اول مسلم تھے اس لیے کہ یوں تو ہر نبی اور ان کی ماننے والی امت مسلم ہی تھی، سب کی دعوت اسلام ہی کی تھی سب اللہ کی خالص عبادت کرتے رہے جیسے فرمان ہے آیت (**وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ**) 43۔ النحل:16) یعنی تجھ سے پہلے بھی جتنے رسول ہم نے بھیجے سب کی طرف وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تم سب میری ہی عبادت کرو۔ حضرت نوح (علیہ السلام) کا فرمان قرآن میں موجود ہے کہ آپ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ میں تم سے کوئی اجرت طلب نہیں کرتا میرا اجر تو میرے رب کے ذمہ ہے مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلمانوں میں رہوں اور آیت میں ہے (**وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ**) 43۔ النحل:16) ملت ابراہیمی سے وہی ہٹتا ہے جس کی قسمت پھوٹ گئی ہو، وہ دنیا میں بھی برگزیدہ رب تھا اور آخرت میں بھی صالح لوگوں میں سے ہے اسے جب اس کے رب نے فرمایا تو تابعدار

بن جا اس نے جواب دیا کہ میں رب العالمین کا فرمان بردار ہوں اسی کی وصیت ابراہیم نے اپنے بچوں کو کی تھی اور یعقوب نے اپنی اولاد کو کہ اے میرے بچو اللہ نے تمہارے لیے دین کو پسند فرمالیا ہے۔ پس تم اسلام ہی پر مرنا۔ حضرت یوسف (علیہ السلام) کی آخری دعا میں ہے یا اللہ تو نے مجھے ملک عطا فرمایا خواب کی تعبیر سکھائی آسمان و زمین کا ابتداء میں پیدا کرنے والا تو ہی ہے تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا اولی ہے مجھے اسلام کی حالت میں فوت کرنا اور نیک کاروں میں ملا دینا۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا تھا میرے بھائیو اگر تم ایماندار ہو اگر تم مسلم ہو تو تمہیں اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے سب نے جواب دیا کہ ہم نے اللہ ہی پر توکل رکھا ہے، اللہ ! ہمیں ظالموں کے لیے فتنہ نہ بنا اور ہمیں اپنی رحمت کے ساتھ ان کافروں سے بچالے اور آیت میں فرمان باری ہے (اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ) 5۔ المائدہ : 44) ہم نے توراۃ اتاری جس میں ہدایت و نور ہے جس کے مطابق وہ انبیاء حکم کرتے ہیں جو مسلم ہیں یہودیوں کو بھی اور ربانیوں کو بھی اور احبار کو بھی اور فرمان ہے آیت (وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ) 5۔ المائدہ : 111) میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ سب نے کہا ہم نے ایمان قبول کیا ہمارے مسلمان ہونے پر تم گواہ رہو۔ یہ آیتیں صاف بتلا رہی ہیں کہ اللہ نے اپنے نبیوں کو اسلام کے ساتھ ہی بھیجا ہے ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی اپنی مخصوص شریعتوں کے ساتھ مختص تھے احکام کا ادل بدل ہوتا رہتا تھا یہاں تک کہ حضور کے دین کے ساتھ پہلے کے کل دین منسوخ ہوگئے اور نہ منسوخ ہونے والا نہ بدلنے والا ہمیشہ رہنے والا دین اسلام آپ کو ملا جس پر ایک جماعت قیامت تک قائم رہے گی اور اس پاک دین کا جھنڈا ابدالآباد تک لہراتا رہے گا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان ہے کہ ہم انبیاء کی جماعت علاتی بھائی ہیں ہم سب کا دین ایک ہی ہے، بھائیوں کی ایک قسم تو علاتی ہے جن کا باپ ایک ہو مائیں الگ الگ ہوں ایک قسم اخیافی جن کی ماں ایک ہو اور باپ جداگانہ ہوں اور ایک عینی بھائی ہیں جن کا باپ بھی ایک ہو اور ماں بھی ایک ہو۔ پس کل انبیاء کا دین ایک ہے یعنی اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت اور شریعت مختلف ہیں بہ اعتبار احکام کے۔ اس لیے انھیں علاتی بھائی فرمایا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تکبیر اولیٰ کے بعد نماز میں (انی وجھت) اور یہ آیت پڑھ کر پھر یہ پڑھتے (اللهم انت الملك لا اله الا انت انت ربي وانا عبدك ظلمت نفسي واعترفت بذنبي فاغفر لي ذنوبي جميعا لا يغفر الذنوب الا انت واهدني لا حسن الاخلاق لا يهدي لا حسنها الا انت واصرف عني سيئها لا يصرف عني سيئها الا انت تباركت وتعاليت استغفرك واتوب اليك یہ حدیث لمبی ہے اس کے بعد راوی نے رکوع و سجدہ اور تشہد کی دعاؤں کا ذکر کیا ہے (مسلم)

(تفسیر ابن کثیر۔ حافظ عماد الدین ابوالفداء ابن کثیر)

آیت مبارکہ :

قُلۡ اِنَّ صَلَاتِيۡ وَنُسُكِيۡ وَمَحۡيَايَ وَمَمَاتِيۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝١٦٢

لغۃالقرآن: قُلْ : کہہ دیں] [اِنَّ : بیشک] [صَلَاتِيْ : میری نماز] [وَنُسُكِيْ : اور میری قربانی] [وَمَحْيَايَ : اور میری زندگی] [وَمَمَاتِيْ : اور میری موت] [لِلّٰهِ : اللہ کے لیے] [رَبِّ : رب ہے] [الْعٰلَمِيْنَ : تمام جہانوں کا]

ترجمہ : فرماد یجئے کہ بیشک میری نماز اور میرا حج اور قربانی (سمیت سب بندگی) اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے

تشریح : اس آیت میں مسلمان کی زندگی کا نصب العین بیان کیا جارہا ہے کہ اس کی نماز وقربانی اور زندگی و موت کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضااور خوش نودی حاصل کرنا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لوگوں کو شوق دلانے کے لیے کبھی کبھی اپنے تقویٰ اور اخلاص کا اظہار بھی ضروری ہوتا ہے بشر طیکہ ریاکاری کی نیت نہ ہو۔ (تفسیر امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا حاصل اور توحید کا سب سے اونچا مرتبہ یہ ہے جہاں انسان کھڑا ہو کر یہ اعلان کرتا ہے کہ میری سجدہ ریزیوں کا مقصد اور میری ہر طرح کی نیاز مندیوں اور عبادتوں کا مدعا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ میری زندگی اور میری موت صرف اسی کی رضاجوئی کے لیے ہے۔ میں اس کے ہر حکم کے سامنے سرافگندہ ہوں اور اس کے ہر فیصلہ پر راضی۔ اس کا کوئی شریک نہیں نہ اس کی ذات میں اور نہ اس کی صفات میں۔ النسک فی ھذہ الایۃ جمیع اعمال الطاعات (قرطبیؒ) آیت میں لفظ نسک سے مراد ہر قسم کے نیک اعمال ہیں۔ قربانی بھی اس میں داخل ہے۔
(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری)

نسک کا معنی

صلوۃ سے مراد یا تو تہجد کی نماز ہے یا نماز عید ہے اور نسک نسی کہ کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے ذبیحہ اور اس کا معنی ہے حج اور عمرہ میں مینڈھا ذبح کرنا اور نماز اور ذبیحہ کو اس آیت میں اس طرح جمع کیا ہے جیسے (آیت) "فصل لربك وانحر"۔ (الکوثر : ۲) میں جمع کیا ہے۔ حسن بصری نے کہا نس

کی سے مراد ہے میرا دین۔ زجاج نے کہا اس سے مراد ہے میری عبادت۔ ایک قوم نے کہا اس آیت میں نسک سے مراد تمام نیک کام اور عبادات ہیں۔

محیای: اس سے مراد ہے میں زندگی میں جو عمل کروں گا اور (آیت) "مماتی" اس سے مراد ہے میں وفات کے بعد جن چیزوں کی وصیت کروں گا۔

نماز کا افتتاح (آیت) "انی وجہت" سے واجب ہے یا تکبیر سے

امام شافعی نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ نماز کو اس ذکر سے شروع کرنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس کا حکم دیا ہے اور اس کو اپنی کتاب میں نازل کیا ہے اور اس کی تائید حدیث میں بھی ہے:

حضرت علی بن ابی طالب (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے کھڑے ہوتے تو فرماتے "**وجہت وجهی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین، ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین، لا شریك له وبذالك امرت وانا اول المسلمین** (الحدیث)

(صحیح مسلم، صلوۃ المسافرین ۲۰۱، (۷۷۱) ۱۷۸۱، سنن ابوداؤد، ج ۱، رقم الحدیث: ۷۷۴، سنن نسائی، ج ۲، رقم الحدیث: ۸۹۶)

امام مالک اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس ذکر کے ساتھ نماز کو شروع کرنا واجب نہیں ہے، بلکہ نماز کا افتتاح تکبیر کے ساتھ واجب ہے اور اس کے بعد قرآن مجید کو پڑھنا فرض ہے اور اس کے درمیان اس ذکر کو بھی پڑھنا مستحب ہے اور دیگر اذکار کو بھی۔ مثلا "**سبحانك اللهم وبحمدك**" کیونکہ حضرت عمر (رض) نماز میں "**سبحانك اللهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالی جدك ولا اله غیرك**" پڑھتے تھے۔ (صحیح مسلم، صلوۃ ۵۰، ۳۹۹، ۸۶۵) اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب اعرابی کو نماز کی تعلیم دی تو فرمایا جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو اللہ اکبر کہو، پھر قرآن مجید پڑھو۔ (صحیح البخاری، ج ۱، رقم الحدیث: ۷۹۳) آپ نے "**انی وجہت**" کا ذکر نہیں فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ اس سے افتتاح واجب نہیں ہے، بلکہ تکبیر سے افتتاح واجب اور اس سے افتتاح کرنا مستحب ہے۔

(تفسیر تبیان القرآن۔ مولانا غلام رسول سعیدی)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بحکم الٰہی راہ حق میں جانور قربان کرنے کا طریقہ عبادت میں متعارف کروایا جس کا سلسلہ قربانی اسماعیل (علیہ السلام) اور ان کی جگہ دنبے کے ذبح کیے جانے سے شروع ہوا اور آج تک اسلام میں چلا آرہا ہے۔ یہ سلسلہ قربانی بھی بتاتا ہے کہ اہل اسلام ہی دین ابراہیم السلام کے پیروکار ہیں کسی دوسرے مذہب میں یہ طریقہ قربانی نہیں ہے۔ اس لئے فرمایا گیا کہ اے پیارے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کہہ دیں میری نماز میری قربانی اور میری زندگی و موت سب اللہ کے لیے ہے۔

عید الاضحیٰ والی قربانی کا حکم

یہاں ان صلاتی ونسکی میں قربانی کو نماز کے ساتھ ذکر کرنے سے معلوم ہوا کہ جیسے نماز اپنی شرائط کے ساتھ ساری امت کے لیے یوں ہی قربانی بھی ساری امت کے لیے ہے۔ بعض گمراہ لوگ اسے صرف حج کی قربانی کے ساتھ خاص کرتے ہیں اور عید الاضحیٰ والی قربانی سے انکار کرتے ہیں مگر قرآن کا پیغام اس سے ہٹ کر ہے اور ان صلاتی ونس کی کے الفاظ یہ بھی بتاتے ہیں کہ نماز عید کے بعد قربانی ہونی چاہیے جس نے نماز عید سے پہلے قربانی کی وہ صرف گوشت ہے کیونکہ نماز کو قربانی سے قبل بیان کیا گیا ہے اسی لیے دوسری جگہ ارشاد ہوا فصل لربك وانحر (نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ (سورۃ کوثر۔ 2) اور حدیث میں ہے جس نے نماز عید الاضحیٰ سے قبل جانور کو ذبح کیا وہ صرف گوشت ہے جو اس نے اپنے گھر والوں کے لئے تیار کیا قربانی سے اس کا کوئی تعلق نہیں (بخاری عن براء بن عازب (رض)) (تفسیر برہان القرآن۔ علامہ قاری محمد طیب)

عبادات صرف اللہ کے لیے ہیں

قول باری ہے (قل ان صلاتی ونس کی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین۔ کہو میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے) سعید بن جبیر، قتادہ، ضحاک اور سدی کا قول ہے کہ (نس کی) سے مراد "حج اور عمرہ میں میرا طریقہ " ہے۔ حسن کا قول ہے (نس کی) سے مراد "میرا دین " ہے۔ دوسرے حضرات کا قول ہے اس سے مراد "میری عبادت " ہے۔ تاہم اس لفظ پر اس ذبح اور قربانی کے معنی زیادہ غالب میں جس کے ذریعے اللہ کا تقرب حاصل کیا جاتا ہے۔ عرب کہتے ہیں "فلان ناسك " (فلاں ناسک ہے) یعنی اللہ کے لیے عبادت کرتا ہے۔ عبداللہ بن ابی رافع نے حضرت علی (رض) سے روایت کی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب نماز شروع کرتے تو یہ دعا پڑھتے (انی وجهت وجهي للذی فطر السماوات والارض حنيفا وما انا من المشركين ان صلاتي ونس كي ومحياي ومماتي لله رب العالمين لا شريك له وبذالك امرت وانا اول المسلمين۔ میں نے اپنا چہرہ اس ذات کی طرف پھیر دیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، سب سے یکسو ہو کر، اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں، میری نماز، میری عبادت، میرا جینا، میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے اس کا کوئی شریک نہیں مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں) حضرت ابو سعید خدری (رض) اور حضرت عائشہ (رض) نے روایت کی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب نماز شروع کرتے تو ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگتے (سبحانک اللّٰھم وبحمدک وتبارک اسمک وتعالیٰ جدک ولا الہ غیرک۔ اے میرے اللہ ! تیری ذات پاک ہے اور تمام تعریفوں کے ساتھ متصف ہے اور تیرا نام بہت برکت والا ہے، تیرا مرتبہ بہت بلند ہے اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں)

ہمارے نزدیک حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پہلی دعا قول باری (فسبح بحمد ربك حين تقوم۔ جب تم کھڑے ہو تو اپنے رب کی تعریف کی تسبیح کرو) کے نزول سے قبل پڑھا کرتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہو گئی اور اس میں آپ کو نماز کے لیے کھڑے ہونے کے وقت تسبیح کا حکم دیا گیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پہلی دعا ترک کر دی۔ یہ امام ابو حنیفہ کا اور امام محمد کا قول ہے۔ امام ابو یوسف کے نزدیک دونوں دعائیں پڑھی جائیں گی اس لیے کہ دونوں دعائیں مروی ہیں۔ قول باری (ان صلاتی) سے نماز عید مراد لینے کی گنجائش ہے۔ قول باري
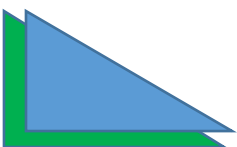
(**ونسکی**) سے اضحیہ یعنی قربانی مراد ہے اس لیے کہ اضحیہ کو نسک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اسی طرح تقرب الٰہی کے طور پر ہر ذبیحہ کو نسک کہا جاتا ہے، قول باری ہے (**ففدیۃ من صیام او صدقۃ او نسك**۔ روزوں یا صدقہ یا قربانی کی صورت میں فدیہ ادا کرے) حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے (**النسك شاۃ** قربانی ایک بکری کی ہے) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یوم النحر یعنی دسویں ذی الحجہ کو فرمایا تھا (**ان اول نسکنا فی یومنا ھذا الصلوٰۃ ثم الذبح**۔ آج کے دن ہماری سب سے پہلی عبادت نماز ہو گی اور پھر ذبح یعنی قربانی) آپ نے نماز اور قربانی دونوں کو نسک کا نام دیا۔ جب آپ نے لفظ نسک کو نماز کے ساتھ مقرون کر دیا تو اس سے یہ دلالت حاصل ہوئی کہ اس سے عید کی نماز اور قربانی دونوں مراد ہیں۔ آیت قربانی کے وجوب پر دلالت کرتی ہے اس لیے کہ قول باری ہے (وبذلک امرت) اور امر کا صیغہ وجوب کا مقتضی ہوتا ہے۔ قول باری (وانا اول المسلمین) کے متعلق حسن اور قتادہ کا قول ہے کہ "میں اس امت میں سب سے پہلا مسلمان ہوں"۔

(تفسیر احکام القرآن للجصاص۔ ابو احمد بن علی رازی)

نماز کے وقت دعاء

حضرت علی سے روایت ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب نماز کی تکبیر کہنے لگے تو یہ کہہ کر شروع کرتے: **وجھت وجھی للذی** (الی آخرہ) پھر نماز سے پلے یا بعد یہ دعا مانگتے **اللھم انت الملك لا الہ الا انت ربی وانا عبدك ظلمت نفسی واعترفت بذنبی فاغفر لی ذنوبی جمیعا لا یغفر الذنوب الا انت واھدنی لاحسن الاخلاق لا یھدی لاحسنھا الا انت واصرف عنی سیئھا لا یصرف عنی سیئھا الا انت تبارکت وتعالیت استغفرك واتوب الیك**

پہلے فرمان بردار

عموماً مفسرین **وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ** کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اس امت محمدیہ کے اعتبار سے آپ اول المسلمین ہیں لیکن جامع ترمذی کی حدیث کنت نبیاً وآدم بین الروح والجسد کے موافق آپ اول الانبیاء ہیں تو اول المسلمین ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کہ یہاں اولیت زمانی مراد نہ ہو بلکہ تقدم رتبی مراد ہو۔ یعنی میں سارے جہان کے فرمان بر داروں کی صف میں نمبر اول اور سب سے آگے ہوں۔ شاید مترجم محقق قدس سرہٗ نے ترجمہ میں سب سے پہلا فرمان بردار ہوں کی جگہ سب سے پہلے فرمان بردار ہوں کہہ کر اسی طرف اشارہ کیا ہو۔ کیونکہ محاورات کے اعتبار سے یہ تعبیر اولیت رتبی کے ادا کرنے میں زیادہ واضح ہے۔ واللہ اعلم۔

مراد یہ ہے کہ اس امت میں سب سے پہلا مسلمان میں ہوں، کیونکہ ہر امت کا پہلا مسلمان خود وہ نبی یا رسول ہوتا ہے جس پر وحی نازل کی جاتی ہے۔

اور پہلا مسلمان ہونے سے اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ مخلوقات میں سب سے پہلے رسول کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نور مبارک پیدا کیا گیا ہے، اس کے بعد تمام آسمان وزمین اور مخلوقات وجود میں آئے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں ارشاد ہے: **اول ما خلق اللہ تعالیٰ نوری** (روح المعانی) (تفسیر گلدستہ۔ محمد اسحاق)

فوائد

1: معلوم ہوا کہ بدنی عبادات نماز وغیرہ مالی عبادت سے افضل ہیں

2: یعنی میری زندگی حیات دنیا نہیں بلکہ حیات دینی ہے۔ حیات دنیا وہ ہے جو رب سے غافل کرے اور دنیاوی کاروبار میں صرف ہو۔ اللہ کے لیے زندگی وہ ہے جو رب کے کاموں کے لیے وقف ہو۔ جیے تو دین کی خدمت اور رب کی یاد میں۔ مرے تو رب کی اطاعت کرتا ہوا۔ اس سے دو مسئلے معلوم ہوئے۔ ایک یہ کہ اپنے تقوی طہارت کو لوگوں پر ظہار کرنا ریا نہیں بلکہ اس کا اعلان ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ حضور کو علم تھا کہ ہماری آئندہ زندگی اور ہماری وفات حق پر ہوگی۔ یہ علوم خمسہ غیبیہ میں سے ہے۔ (تفسیر نور العرفان۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی)

آیت مبارکہ:

لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝١٦٣

لغۃ القرآن: لَا : نہیں] [شَرِيْكَ : کوئی شریک] [لَهٗ : اس کی] [وَبِذٰلِكَ : اور اسی کا] [اُمِرْتُ : میں حکم دیا گیا ہو] [وَاَنَا : اور میں ہی] [اَوَّلُ : پہلا] [الْمُسْلِمِيْنَ : تمام فرماں برداروں]

ترجمہ: اس کا کوئی شریک نہیں اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں (جمیع مخلوقات میں) سب سے پہلا مسلمان ہوں

تشریح:

تمام انبیائے کرام (علیہم السلام) کی بنیادی اور اصولی تعلیمات ہر زمانہ میں ایک جیسی ہی تھیں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ اعلان فرمار ہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔

تمام انبیائے کرام (علیہم السلام) کی بنیادی اور اصولی تعلیمات ہر زمانہ میں ایک جیسی ہی تھیں اور سارے انبیائے کرام (علیہم السلام) اللہ تعالیٰ کے فرمان بردار یعنی مسلمان ہیں، جیسا کہ حضرت نوح (علیہ السلام) نے فرمایا: "اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلمانوں میں رہوں۔" (قرآن: 72:10) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے اپنی اولاد کو وصیت فرمائی: "بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے یہی دین پسند کیا ہے، لہٰذا تم مرتے دم تک مسلمان رہنا۔" (قرآن: 132:2) حضرت یوسف (علیہ السلام) نے دعا مانگی: "اے میرے پروردگار! مجھے اس حال میں وفات دے کہ میں مسلمان ہوں اور مجھے نیک بندوں کے ساتھ ملادے۔" (قرآن: 10:12) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کو کہا: "اگر تم مسلمان ہو تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو۔" (قرآن: 84:10) حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے حواریوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے کہا: "ہم ایمان لائے اور آپ گواہ رہیے کہ ہم مسلمان ہیں۔" (قرآن: 111:5) اسی طرح دیگر انبیائے کرام (علیہم السلام) اور ان کے مخلف پیروکار سب مسلمان تھے اور سب کا بنیادی عقیدہ یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، البتہ مخصوص حالات کے پیش نظر بعض احکام میں اختلاف تھا۔

(تفسیر امداد الکرم۔ محمد امداد حسین پیرزادہ)

وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ

اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔} اوّلیت یا تو اس اعتبار سے ہے کہ انبیاء (علیہ السلام) کا اسلام ان کی امت پر مقدم ہوتا ہے (1) یا اس اعتبار سے کہ سیّدِ عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اوّل مخلوقات ہیں تو ضرور اول المسلمین ہوئے۔

سب سے پہلے مومن:

اس سے معلوم ہوا کہ ساری مخلوق میں سب سے پہلے مومن حضور پر نور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔ حضرت جبرائیل اور میکائیل (علیہ السلام) سے پہلے بھی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عابد بلکہ نبی تھے۔ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (ترجمہ: کیا میں تمہارا رب نہیں؟) کے جواب میں سب سے پہلے حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بَلٰی (ترجمہ: کیوں نہیں) فرمایا تھا، (1) پھر اور انبیاء کرام (علیہ السلام) نے، پھر دوسرے لوگوں نے۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اول المسلمین ہونا

اس آیت میں یہ تصریح ہے کہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سب سے پہلے مسلمان ہیں۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ کیا آپ سے پہلے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور دیگر انبیاء (علیہم السلام) مسلمان نہیں تھے؟ تو اس کے حسب ذیل جوابات ہیں:

(۱) ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) معنی اول الخلق ہیں۔ جیسا کہ اس حدیث میں ہے:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ہم آخر ہیں اور ہم قیامت کے دن سابق ہوں گے۔ (صحیح مسلم ' ۹ ' ۸۵۵ ' صحیح البخاری ' ج ا ' رقم الحدیث: ' ۸۷۶)

(۲) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سب سے پہلے نبی ہیں جیسا کہ ان احادیث میں ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کے لیے نبوت کب واجب ہوئی؟ فرمایا اس وقت آدم روح اور جسد کے درمیان تھے۔ (سنن الترمذی ' ج ۵ ' رقم الحدیث: ' ۳۶۲۹ ' دلائل النبوۃ لابی نعیم ' ج ا ' رقم الحدیث: ' ۸)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میں خلق کے اعتبار سے تمام نبیوں میں اول ہوں اور بعثت کے اعتبار سے آخر ہوں۔ (کنزالعمال ' ج ۱۱ ' رقم الحدیث ' ۳۲۱۲۶ ' کامل ابن عدی ' ج ۳ ' ص ۱۲۰۹)

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں خلق میں سب سے اول ہوں اور بعثت میں سب سے آخر ہوں۔

(کنزالعمال ' ج ۱۱ ' رقم الحدیث ' ۳۱۹۱۶ ' کامل ابن عدی ' ج ۳ ' ص ۹۱۹ ' طبقات ابن سعد ' ج ا ' ص ۱۴۹)

حضرت عرباض بن ساریہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں اللہ کے پاس خاتم النبیین لکھا ہوا تھا اور آدم ہنوز مٹی اور گارے میں تھے۔ (دلائل النبوۃ لابی نعیم ' ج ا ' رقم الحدیث: ۹ ' المستدرک ' ج ۲ ' ص ۶۰۰ ' مسند احمد ' ج ۴ ' ص ۱۲۸۔ ۱۲۸ ' طبقات ابن سعد ' ج ا ' ص ۱۴۹ ' مجمع الزوائد ' ج ۸ ' ص ۲۲۳)

(۳) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی امت میں اول المسلمین ہیں۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ' ج ۵ ' رقم الحدیث: ۸۱۸۴)

(تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

قُلۡ اَغَيۡرَ اللّٰهِ اَبۡغِىۡ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَىۡءٍ‌ ؕ وَلَا تَكۡسِبُ كُلُّ نَفۡسٍ اِلَّا عَلَيۡهَا‌ ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰى‌ ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمۡ مَّرۡجِعُكُمۡ فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ۝۱۶۴

لغۃالقرآن : قُلْ : کہہ دیں] [اَغَيْرَ : کیا اللہ کے علاوہ] [اللّٰهِ : اللہ] [اَبْغِيْ : میں تلاش کروں] [رَبًّا : کوئی " اور " رب] [وَهُوَ : اور وہ] [رَبُّ : رب ہے] [كُلِّ : ہر طرح] [شَيْءٍ : چیز کو] [وَلَا : اور نہ] [تَكْسِبُ : کماتی] [كُلُّ : ہر] [نَفْسٍ : نفس کو] [اِلَّا : مگر] [عَلَيْهَا : ان پر] [وَلَا : اور نہ] [تَزِرُ : اٹھائے گی] [وَازِرَةٌ : کوئی بوجھ اٹھانے والی] [وِّزْرَ : بوجھ] [اُخْرٰي :" کسی " دوسری کا] [ثُمَّ : پھر] [اِلٰي : تک] [رَبِّكُمْ : تمہارے رب] [مَرْجِعُكُمْ : تمہارا لوٹنا ہے] [فَيُنَبِّئُكُمْ : پس وہ خبر دے گا تمہیں] [بِمَا : اس وجہ سے جو] [كُنْتُمْ : ہو تم] [فِيْهِ : اس میں] [تَخْتَلِفُوْنَ : تم سب اختلاف کرتے]

ترجمہ : فرما دیجئے : کیا میں اللہ کے سوا کوئی دوسرا رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر شے کا پروردگار ہے، اور ہر شخص جو بھی (گناہ) کرتا ہے (اس کا وبال) اسی پر ہوتا ہے اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ پھر تمہیں اپنے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے پھر وہ تمہیں ان (باتوں کی حقیقت) سے آگاہ فرما دے گا جن میں تم اختلاف کیا کرتے تھے

تشریح :

شانِ نزول

کفار نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا تھا کہ آپ ہمارے دین میں داخل ہو جائیں اور ہمارے معبودوں کی عبادت کریں۔ حضرت عبداللہ بن عباس (رض) نے فرمایا کہ ولید بن مغیرہ کہتا تھا کہ میرا راستہ اختیار کرو، اس میں اگر کچھ گناہ ہے تو میری گردن پر، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور بتایا گیا کہ وہ راستہ باطل ہے، خدا شناس کس طرح گوارا کر سکتا ہے کہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے سوا کسی اور کو خدا مانے، نیز یہ بات بھی باطل ہے کہ کسی کا گناہ دوسرا اٹھا سکے بلکہ ہر شخص جو عمل کرے گا وہ اسی پر ہے۔

{ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى : اور کوئی بوجھ اٹھانے والی جان دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گی۔ } یعنی مجرم گناہ سے بالکل بری ہو جائے اور کسی دوسرے پر اس کے گناہ ڈال دیئے جائیں یہ نہیں ہو سکتا اور یونہی ایک آدمی کے گناہ دوسرے پر بغیر کسی سبب کے ڈال دیئے جائیں یہ بھی نہیں ہو سکتا البتہ جو آدمی گناہ کا طریقہ ایجاد کرے یا دوسرے کو گمراہ کرے یا گناہ کے راستے پر لگائے تو یہ اپنے ان افعال کی وجہ سے پکڑ میں آئے گا اور یہ اس کے گناہ کی شدت ہو گی کہ اس کی وجہ سے جتنے لوگوں نے جتنے گناہ کئے ان سب کے وہ گناہ اس پہلے آدمی پر ڈال دیئے جائیں۔ حقیقت میں یہ اس آدمی کے اپنے ہی اعمال کا انجام ہے نہ یہ کہ بلاوجہ دوسروں کے گناہ اس پر ڈال دیئے گئے اور یہ بات قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ اللہ عَزَّوَجَلَّ فرماتا ہے:

"وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ "

اور وہ اپنے بوجھ اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور بوجھ اٹھائیں گے۔"

سرکارِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "جس نے ہدایت کی طرف بلایا اور لوگوں نے اس کی پیروی کرتے ہوئے ان باتوں پر عمل کیا تو بلانے والے کو پیروی کرنے والوں کے ثواب کے برابر ثواب ملے گا اور ان کے اجر میں بھی کوئی کمی نہ ہو گی اور جس نے گمراہی کی دعوت دی اور لوگوں نے اس کی پیروی کرتے ہوئے ان باتوں پر عمل کیا تو دعوت دینے والے کو پیروی کرنے والوں کے گناہ کے برابر گناہ ملے گا اور ان کے گناہوں میں بھی کوئی کمی نہ ہو گی۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم)

اعمال کی جوابدہی

قول باری ہے (ولا تکسب کل نفس الا علیھا، ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے) آیت سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ کسی شخص کو دوسرے پر تصرف کرنے کا حق نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کا جواز ہے۔ اِلا یہ کہ کوئی دلالت قائم ہو جائے جو اس تصرف کے جواز کی نشاندہی کرتی ہو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت میں یہ بات بتائی ہے کہ ہر شخص کے افعال کے احکام کا اس کی ذات کے ساتھ تعلق ہوتا ہے کسی اور کے ساتھ نہیں۔

ذاتی ملکیت پر پابندی ناروا ہے

اس حکم کے عموم کے تحت یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ بالغ باکرہ لڑکی کا اس کی اجازت کے بغیر نکاح کرا دینے کا جواز ممتنع ہے، نیز ایک شخص پر اپنی املاک کی فروخت پر لگنے والی پابندی باطل ہے۔ اس طرح ایک عاقل بالغ انسان کا خواہ وہ نادان ہی کیوں نہ ہو اپنی ذات پر تصرف کرنا جائز ہے اس لیے کہ اللہ نے بتادیا ہے کہ ہر شخص اپنی کمائی کا خود ذمہ دار ہے۔ قول باری ہے (ولا تزر وزرۃ وزر اخری، کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا) اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص سے کسی اور کے گناہ اور جرم کی بنیاد پر مواخذہ نہیں کرے گا۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ باپ کے گناہ کی بیٹے کو سزا نہیں دے گا۔

میت پر رونے سے میت کو عذاب نہیں ہوتا

حضرت عائشہ (رض) نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس ارشاد (ان المیت یعذب ببکاء اھلہ علیہ جب میت کے اہل وعیال اس پر آنسو بہاتے ہیں تو اس کی سزا کے طور پر میت کو عذاب دیا جاتا ہے) کے اس مفہوم کو رد کر دیا تھا جو لوگوں نے اس ارشاد سے اخذ کیا تھا۔ حضرت عائشہ نے اس موقع پر درج بالا آیت کی تلاوت کی تھی اور فرمایا تھا کہ حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ایک یہودی خاندان کے پاس سے گزر ہوا جس کی موت پر اس کے اہل خانہ آنسو بہا رہے تھے یہ دیکھ کر فرمایا تھا کہ "اس کے گھر والے اس پر آنسو بہا رہے ہیں اور ادھر وہ عذاب میں مبتلا ہے "ہم نے اس حدیث کی توجیہ کسی اور جگہ بیان کر دی ہے، ایک قول ہے کہ اس لفظ کے اصل معنی بوجھ اور پناہ کی جگہ کے ہیں۔ ارشاد باری ہے (کلالا وزر، ہر گز نہیں، کہیں پناہ کی جگہ نہیں) لیکن گناہ کے معنوں میں اس کا استعمال زیادہ ہے۔ اس میں اس شخص کے ساتھ تشبیہ ہے جو ایسی جگہ جا کر پناہ لے جو دراصل پناہ کی جگہ نہ ہو۔ کہا جاتا ہے "وزر، یزر، ووزر، یوزر، فھو موزور" (فعل "وزر" کے ماضی اور مضارع معروف اور مجہول کی گردان کا ذکر کیا گیا ہے)

ان تمام کے معنی گناہ کے ہیں۔ وزیر کے معنی ملجا کے ہیں اس لیے کہ بادشاہ ملکی امور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔

(تفسیر احکام القرآن للجصاص۔ ابو احمد بن علی الرازی)

فتنہ کے زمانہ میں نیک علماء کا گوشہ نشین ہونا

روایت ہے کہ کفار نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے دین کی طرف آئیں اور ہمارے خداؤں کی عبادت کریں 'اور اپنے دین کو چھوڑ دیں اور ہم دنیا اور آخرت میں آپ کی ہر ضرورت کے کفیل ہوں گے۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

آپ کہیے کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں؟ حالانکہ وہ ہر چیز کا رب ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۸ 'ص ۱۴۱)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور ہر شخص جو کچھ بھی کرتا ہے 'اس کا وہی ذمہ دار ہے۔

ربیع بیان کرتے ہیں کہ عبادت گزار علماء کے لیے اس زمانہ میں صرف دو صورتیں ہیں اور ہر صورت دوسری سے افضل ہے ' وہ لوگوں کو نیکی کا حکم دیں اور حق کی دعوت دیں ' یا فتنہ انگیز لوگوں کو چھوڑ کر گوشہ نشین ہو جائیں اور بدکردار اور بدعنوان لوگوں کے اعمال میں شریک نہ ہوں اور اللہ کے احکام کی پیروی کرتے رہیں اور فرائض بجالائیں اور اللہ کے لیے محبت رکھیں اور اسی کے لیے بغض رکھیں۔ (جامع البیان 'جز ۸ ص ۱۴۹' مطبوعہ دارالفکر 'بیروت ۱۴۱۵ھ)

فضول کے عقد اور وکیل کے تصرفات میں مذاہب فقہاء

فضول کی بیع یہ ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے شخص کے لیے اس کی اجازت کے بغیر کوئی چیز خرید لے۔ اس بیع کا جواز اس مالک کی مرضی پر موقوف ہے۔ اگر وہ اس کو جائز قرار دے تو یہ بیع جائز ہے ' ورنہ نہیں۔ اسی طرح فضول کا کیا ہوا عقد نکاح بھی 'لڑکے یا لڑکی کی بعد میں رضامندی سے جائز ہوتا ہے ' ہمارے دور میں اکثر نکاح ایسے ہی ہوتے ہیں لڑکی سے نکاح کی اجازت وکیل لیتا ہے ' لیکن لڑکے سے ایجاب و قبول وکیل کی بجائے نکاح خوان کرتا ہے۔ یہ بھی فضولی کا عقد ہے ' لیکن جب لڑکی رخصت ہو جاتی ہے تو گویا وہ اس فضولی کے عقد پر راضی ہو جاتی ہے اور یہ نکاح نافذ ہو جاتا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک فضولی کا عقد جائز نہیں ہے۔ وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں اور ہر شخص جو کچھ بھی کرتا ہے ' اس کا وہی ذمہ دار ہے۔ (الانعام : ۱۶۴) یعنی دوسرا اس کا ذمہ دار نہیں ہے ' اور اس آیت کے پیش نظر وہ فضول کے عقد کو ناجائز کہتے ہیں۔ امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک فضولی کی بیع جائز ہے اور ان کی دلیل یہ حدیث ہے :

عروہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو ایک دینار عطا کیا ' تاکہ وہ آپ کے لیے ایک بکری خریدیں۔ انھوں نے اس دینار سے دو بکریاں خریدیں ' پھر ایک بکری کو ایک دینار کے عوض فروخت کر دیا اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک بکری اور ایک دینار لے کر آ گئے ' آپ نے ان کے لیے بیع میں برکت کی دعا کی ' پھر یہ ہوا کہ وہ مٹی بھی خریدتے تو ان کو نفع ہوتا۔

(صحیح البخاری ج ۲ ' رقم الحدیث : ۳۶۴۲ ' سنن ابوداؤد ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ۳۳۸۴ ' سنن الترمذی ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ۱۲۶۲ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ۲۴۰۲ ' مسند احمد ' ج ۷ ' رقم الحدیث : ۱۹۳۸۱ ' ۱۹۳۸۰ ' طبع جدید ' مسند احمد ' ج ۴ ' ص ۳۷۶ ' طبع قدیم)

اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ فضولی کا عقد صحیح ہے اور اصل شخص کی رضامندی کے بعد اس کا عقد نافذ ہو جائے گا ' نیز اس حدیث میں یہ دلیل بھی ہے کہ وکیل کا تصرف صحیح ہے اور اس کے تصرف سے جو منفعت اسے حاصل ہو گی ' وہ اصیل کے لیے ہو گی۔ امام مالک ' امام ابو یوسف ' امام محمد بن حسن کا یہی قول ہے اور امام ابوحنیفہ (رح) یہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص مثلا یہ کہے کہ سو روپے کا ایک کلو بکری کا گوشت خرید کر لاؤ اور وہ سو روپے کا دو کلو بکری کا گوشت لے آئے تو وہ زائد ایک کلو گوشت وکیل کا ہو گا۔ ہو سکتا ہے امام ابوحنیفہ (رح) تک یہ حدیث نہ پہنچی ہو ' کیونکہ اس زمانے میں احادیث کی نشر و اشاعت کے اس قدر وسائل نہیں تھے جتنے اب میسر ہیں اور احادیث کی اشاعت میں تدریجا وسعت ہوئی ہے۔

برائی کے موجد کو اس برائی کے مرتکبین کی سزا میں سے حصہ ملے گا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیتوں اور بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے ؟ کہ بعض لوگوں کے گناہوں کا عذاب بعض دوسروں کو ہو گا اور یہ اس آیت کے خلاف ہے۔

(آیت) "ولیحملن اثقالھم واثقالا مع اثقالھم"۔ (العنکبوت : ۱۳)

ترجمہ : اور وہ ضرور اپنے بوجھ اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور کئی بوجھ اٹھائیں گے۔

(آیت) "لیحملوا اوزارھم کاملۃ یوم القیامۃ ومن اوزار الذین یضلونھم بغیر علم الاسآء مایزرون"۔ (النحل : ٢٥)

ترجمہ : تاکہ وہ (متکبر کافر) قیامت کے دن اپنے (گناہوں کے) پورے بوجھ اٹھائیں اور کچھ بوجھ ان لوگوں کے اٹھائیں جنہیں وہ اپنی جہالت سے گمراہ کرتے تھے ' سنو ! وہ کیسا برا بوجھ ہے جسے وہ اٹھاتے ہیں۔

اسی طرح بعض احادیث میں بھی ہے :

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جس شخص کو بھی ظلما قتل کیا جائے گا اس کے خون کی سزا سے ایک حصہ پہلے ابن آدم (قابیل) کو بھی ملے گا ' کیونکہ وہ پہلا شخص تھا جس نے قتل کرنے کی رسم اور گناہ کو ایجاد کیا۔

(صحیح البخاری ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ٣٣٣٥' ج ٨ ' رقم الحدیث : ٧٣٢١' ج ٧ ' رقم الحدیث : ٦٨٦٧ ' صحیح مسلم ' رقم الحدیث : ١٦٧٧ ' سنن ترمذی ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ٢٦٨١' سنن نسائی ' رقم الحدیث : ٣٩٩٦ ' مسند احمد ' ج ٢ ' رقم الحدیث : ٣٦٣٠' مصنف عبدالرزاق ' رقم الحدیث : ١٩٧١٨' مصنف ابن ابی شیبہ ' ج ٩ ' ص ٣٦٤ ' صحیح ابن حبان ' ج ١٣ ' رقم الحدیث : ٥٩٨٣' سنن کبری للبیہقی ' ج ٨ ص ١٥)

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جن لوگوں نے کسی برائی اور گناہ کو ایجاد کیا تو قیامت تک جتنے لوگ اس برائی پر عمل کریں گے ' تو ان کے گناہوں کی سزا میں اس برائی کے ایجاد کرنے والے کا بھی حصہ ہوگا ' کیونکہ وہ ان سب لوگوں کے لیے اس برائی کے ارتکاب کا سبب بنا تھا ' اور بعد کے لوگوں کی سزا میں کوئی کمی نہیں ہوگی ' جیسا کہ اس حدیث میں ہے :

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : جس شخص نے ہدایت کی دعوت دی تو اس کو ہدایت پر تمام عمل کرنے والوں کے برابر اجر ملے گا اور اس متبعین کے اجروں میں سے کوئی کمی نہیں ہوگی اور جس نے کسی گمراہی کی دعوت دی تو اس کو اس گمراہی پر تمام عمل کرنے والوں کے برابر سزا ملے گی اور ان متبعین کی سزاؤں میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

(سنن ترمذی ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ٢٦٨٣' صحیح مسلم ' رقم الحدیث : ٢٦٧٤' سنن ابوداؤد ' ج ٤ ' رقم الحدیث : ٤٦٠٩' موطا امام مالک ' رقم الحدیث : ٥٠٧' مسند احمد ' ج ٣ ' رقم الحدیث : ٩١٧١)

کوئی شخص دوسرے کے جرم کی سزا نہیں پائے گا ' اس قاعدہ کے بعض مستثنیات

کسی شخص کو دوسرے کے گناہ کی سزا نہیں ملے گی ' یہ قاعدہ اس صورت میں ہے جب وہ شخص دوسروں کو اس گناہ سے منع کرتا رہے ' لیکن اگر کوئی شخص خود نیک ہو اور اس کے سامنے دوسرے گناہ کرتے رہیں اور وہ ان کو منع نہ کرے تو اس نیک شخص کو اس لیے عذاب ہوگا کہ اس نے ان دوسروں کو برائی سے نہیں روکا۔ قرآن مجید میں ہے :

(آیت) "کانوا لایتناھون عن منکر فعلوہ لبئس ما کانوا یفعلون"۔ (المائدہ : ٧٩)

ترجمہ : وہ ایک دوسرے کو ان برے کاموں سے نہیں روکتے تھے جو انھوں نے کیے تھے ' وہ بہت برا کام کرتے تھے۔

حضرت زینب بنت جحش (رض) بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نیند سے یہ فرماتے ہوئے بیدار ہوئے "لاالہ الا اللہ" عرب کے لیے تباہی ہو اس شر سے جو قریب آ پہنچا ' یاجوج ماجوج کی رکاوٹ کے ٹوٹنے سے "آج روم فتح ہوگیا۔ سفیان نے اپنے ہاتھ سے دس کا عقد بنایا ' میں نے عرض کیا ' یارسول اللہ ! کیا ہم ہلاک ہوجائیں گے ' حالانکہ ہم میں نیک لوگ موجود ہوں گے آپ نے فرمایا ہاں جب برائیاں زیادہ ہوجائیں گی۔

(صحیح البخاری ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ' ۳۳۴۶ ' صحیح مسلم ' فتن ' ۱ ' (۲۸۸۰) ۷۱۰۲ ' سنن الترمذی ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ' ۲۱۹۴ ' مصنف عبدالرزاق ' رقم الحدیث : ' ۲۰۷۴۹ ' مسند الحمیدی ' رقم الحدیث : ' ۳۰۸ ' مصنف ابن ابی شیبہ ' رقم الحدیث : ' ۱۹۰۶۱ ' مسند احمد ' ج ۱۰ ' رقم الحدیث : ' ۲۷۴۸۶ ' سنن کبری للبیہقی ' ج ۱۰ ' ص ۹۳)

اسی طرح اس قاعدہ سے بعض احکام بھی مستثنی ہیں ' مثلا اگر کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو خطا قتل کردے یا اس کا قتل شبہ عمد ہو (قتل شبہ عمد یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو سزا دینے کے قصد سے لاٹھی ' کوڑے یا ہاتھ سے ضرب لگائے اور اس کا قصد قتل کرنا نہ ہو) تو اس کی دیت عاقلہ پر لازم آتی ہے ' تاکہ اس کا خون رائیگاں نہ ہو ' اب یہاں جرم تو ایک شخص نے کیا ہے اور اس کا تاوان اس کے عاقلہ ادا کریں گے۔ عاقلہ سے مراد مجرم کے باپ کی طرف سے رشتہ دار ہیں جن کو عصبات کہتے ہیں ' حدیث شریف میں ہے :

حضرت مغیرہ بن شعبہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت نے اپنی سوکن کو خیمہ کی ایک چوب سے مارا درآنحالیکہ وہ مضروبہ حاملہ تھی اور (اس ضرب سے) اس کو ہلاک کردیا۔ ان میں سے ایک عورت بنو لحیان کی تھی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قاتلہ کے عصبات (باپ کی طرف سے رشتہ دار) پر مقتولہ کی دیت لازم کی ' اور اس کے پیٹ کے بچہ کے تاوان میں ایک باندی یا ایک غلام کا دینا لازم کیا۔

(صحیح مسلم ' القسامہ ' ۳۷ ' ۱۶۸۲ ' ۴۳۱۴ ' سنن ابوداؤد ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ' ۴۵۶۸ ' سنن الترمذی ' ج ۳ ' رقم الحدیث : ' ۱۴۱۵ ' سنن النسائی ' ج ۸ " رقم الحدیث : ' ۴۸۲۲ ' ۳۸۳۶ ' ۴۸۴۲ ' سنن ابن ماجہ ' ج ۲ ' رقم الحدیث : ' ۲۶۳۳)

اسی طرح اگر مسلمانوں کے محلّہ میں کوئی مسلمان مقتول پایا جائے اور یہ معلوم نہ ہو کہ اس کا قاتل کون ہے ؟ تو اس محلّہ کے پچاس آدمی یہ قسم کھائیں گے کہ نہ ہم نے اس کو قتل کیا ہے ' نہ ہم اس کے قاتل کو جانتے ہیں اور ان کے قسم کھانے کے بعد اہل محلّہ پر دیت لازم آئے گی ' تاکہ مسلمان کا قتل رائیگاں نہ جائے ' اس کو قسامت کہتے ہیں ' یہاں بھی قتل کسی اور نے کیا ہے اور اس کا تاوان یہ محلّہ والے ادا کریں گے۔ حدیث میں ہے :

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ انصار کا ایک شخص یہود کی رہٹ والی زمین میں مقتول پایا گیا۔ انھوں نے اس کا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ذکر کیا "آپ نے یہود کے پچاس چنے ہوئے لوگوں کو بلایا اور ہر ایک سے یہ قسم لی کہ اللہ کی قسم ! نہ میں نے اس کو قتل کیا ہے اور نہ مجھے اس کے قاتل کا علم ہے پھر ان پر دیت لازم کردی۔ یہود نے کہا بخدا یہ وہی فیصلہ ہے جو موسیٰ (علیہ السلام) کی شریعت میں تھا۔ (سنن دارقطنی ' ج ۴ ' رقم الحدیث : ' ۲۱۹ ' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ ' بیروت ' ۱۴۱۷ ھ) (تفسیر تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی)

آیت مبارکہ :

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۶۵

لغۃ القرآن: وَهُوَ : اور وہ] [الَّذِيْ : جو] [جَعَلَكُمْ : بنایا تمہیں] [خَلٰٓئِفَ : جانشین] [الْاَرْضِ : زمین] [وَرَفَعَ : اور بلند کردیا] [بَعْضَكُمْ : تم میں سے بعض کو] [فَوْقَ : فائق] [بَعْضٍ : بعض کے] [دَرَجٰتٍ : درجات کو] [لِّيَبْلُوَكُمْ : تاکہ وہ آزمائے تمہیں] [فِي مَآ :" ان احکام کے بارے " میں جو] [اٰتٰىكُمْ : اس نے دیے ہیں تمہیں] [اِنَّ : بیشک] [رَبَّكَ : اپنے رب سے] [سَرِيْعُ : جلد لینے والے ہیں] [الْعِقَابِ : عذاب والا ہے] [وَاِنَّهٗ : اور بیشک وہ] [لَغَفُوْرٌ : یقینا بہت بخشنے والا] [رَّحِيْمٌ : بہت مہربان ہے]

ترجمہ : اور وہی ہے جس نے تم کو زمین میں نائب بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجات میں بلند کیا تاکہ وہ ان (چیزوں) میں تمہیں آزمائے جو اس نے تمہیں (امانتاً) عطا کر رکھی ہیں۔ بیشک آپ کا رب (عذاب کے حق داروں کو) جلد سزا دینے والا ہے اور بیشک وہ (مغفرت کے امیدواروں کو) بڑا بخشنے والا اور بیحد رحم فرمانے والا ہے

تشریح:

کائنات کا نظام

اللہ تعالیٰ نے کائنات کا نظام ایسے منضبط اور مربوط طریقہ سے بنایا ہے کہ اس میں کبھی خلل اور خلا پیدا نہیں ہوا۔ رات، دن ایک دوسرے کی جگہ لیتے ہیں روشنی اور اندھیرا ایک دوسرے کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ ایک نسل دوسری نسل کی خلیفہ بنتی ہے۔ ایسے ہی انسانوں کی ایک کھیپ دوسری کھیپ کی جگہ سنبھالتی ہے۔ بیٹا باپ کی اور باپ اپنے باپ کی ذمہ داریاں سنبھالتا ہے۔ آج کا بچہ کل کو باپ بنتا ہے پھر اس کے فوت ہونے کے بعد اس کی اولاد اس کی جائیداد اور معاملات کی وارث بن جاتی ہے۔ اسی طرح ملکوں کی حکمرانی کا معاملہ ہے۔ کل کا حکمران آج نہیں اور آج کے حکمران کی مسند پر ایک مدت کے بعد کوئی اور بیٹھ جائے گا۔ خلافت کے اس نظام میں ایک فرد سے لے کر کسی بڑے سے بڑے، جابر حکمران اور نیک کو مفر نہیں سب کے سب خلافت کی زنجیر میں بندھے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے آنے پر مجبور ہیں۔ کوئی نہیں جو وسائل اور لشکر و سپاہ کی مدد سے یا اپنی نیکی اور ولایت کے بل بوتے پر اپنی جگہ پر ہمیشہ قبضہ جمائے رکھے۔

یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول ترین بندے انبیاء کرام (علیہ السلام) بھی اسی نظام کے تحت ایک دوسرے کے وارث بنے۔ اس نظام کو بنانے اور چلانے والا۔ اللہ اپنے بارے میں فرماتا ہے کہ وہی تو ہے جو تمہیں ایک دوسرے کے پیچھے لاتا یعنی خلیفہ بناتا ہے۔ (سورۃ یونس: آیت۔ ۱۴) میں فرمایا کہ تمہیں ایک دوسرے کا خلیفہ اس لیے بناتا ہے کہ تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم اپنے اپنے دائرہ کار میں رہ کر اپنی اپنی باری میں اپنے رب کی کتنی تابعداری اور کیا کردار ادا کرتے ہو۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس ذمہ داری کے بارے میں یوں فرمایا کرتے تھے۔

دین کے بارے میں پرکھنے، دنیا کا نظام چلانے اور ایک کو دوسرے کے ساتھ آزمانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو مختلف صلاحیتیں اور وسائل دے کر درجہ بدرجہ مراتب پر فائز فرمایا ہے۔ داعی کو رعایا کے ساتھ، امیر کو غریب کے ساتھ باپ کو اولاد اور اولاد کو والدین کے حقوق کے بارے میں، آجر کو اجیر اور چھوٹے بڑے کو ایک دوسرے کے حقوق و فرائض کے ساتھ آزمانے کا انتظام کر رکھا ہے۔ تاکہ دیکھے کہ کون کیا عمل کرتا ہے؟ جو لوگ برے عمل کرتے ہیں۔ انھیں وارننگ دی کہ یاد رکھو دنیا کی مہلت نہایت مختصر ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت جلد تمہارا حساب لینے والا ہے۔ جو لوگ نیک اعمال کی کوشش کرتے رہے لیکن پھر بھی ان سے بتقاضائے بشریت غلطیاں ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ دنیا میں بیماری، تکلیف اور استغفار کے ذریعے گناہ معاف کرتا ہے بالآخر اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے اور نہایت ہی رحم فرمانے والا ہے۔

(عَنِ ابْنِ عُمَرَ (رض) عَنِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قَالَ كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْءُولٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ وَالْأَمِيرُ رَاعٍ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰى أَهْلِ بَيْتِهٖ وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهٖ فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْءُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ)

[رواہ البخاری: کتاب النکاح، باب المرأۃ راعیۃ فی بیت زوجہا]

”حضرت عبداللہ بن عمر (رض) نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان نقل کرتے ہیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور ہر کسی کو اپنی ذمہ داری کے بارے میں جواب دینا ہے، امیر نگران ہے آدمی اپنے گھر کا نگران ہے اور عورت اپنے خاوند کے گھر کی اور اپنے بچوں کی نگران ہے تو تم میں سے ہر کوئی ذمہ دار ہے اور ہر کسی سے اس کی ذمہ داری کے متعلق پوچھا جائے گا“۔

(فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل)

جس رب کے حضور میں سجدہ ریز ہوں وہی وہ مولائے برحق ہے جس نے تمہیں گزری ہوئی امتوں کا قائم مقام بنایا۔ قوت، علم، دولت اور دوسری باتوں میں بعض کو بعض پر فوقیت دی۔ اور ان ساری سرفرازیوں کا مقصد یہ ہے کہ تمہاری آزمائش کی جائے کہ تم اپنے منعم حقیقی کی کس طرح شکر گزاری کرتے ہو۔ اور جو قوت، عزت، دولت اور صحت وجوانی اس نے تمہیں عطافرمائی ہے اس کو کس طرح استعمال کرتے ہو۔ اگر وہ چاہے تو چشم زدن میں تم کو عذاب میں گرفتار کردے لیکن اس کی رحمت اور مغفرت بھی بے انداز ہے۔ اگر تم عمر بھر نافرمانی اور سرکشی کرنے کے بعد پشیمان اور نادم ہو کر اس کے در رحمت پر حاضر ہو جاؤ تو وہ تمہارے عمر بھر کے قصور بخش دے گا اور اپنی رحمت سے تمہیں مالامال کردے گا۔

(تفسیر ضیاء القرآن۔ پیر سید محمد کرم شاہ)

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ: اور وہی ہے جس نے زمین میں تمہیں نائب بنایا۔} کیونکہ سیّدِ عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خاتَمُ النبییّن ہیں آپ کے بعد کوئی نبی نہیں اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اُمت سب امتوں میں آخری امت ہے، اس لیے ان کو زمین میں پہلوں کا خلیفہ کیا کہ اس کے مالک ہوں اور اس میں تصرف کریں۔ اور فرمایا: "اور تم میں ایک کو دوسرے پر درجوں بلندی دی "یعنی شکل و صورت میں، حسن وجمال میں، رزق ومال میں، علم وعقل میں اور قوت و کمال میں ایک کو دوسرے پر بلندی دی اور اس کا مقصد تمہاری آزمائش کرنا ہے کہ کون نعمتوں کے ملنے پر شکرادا کرتا ہے اور کون ظلم وزیادتی کی راہ پر چلتا ہے؟ کون امتحان میں کامیاب ہوتا ہے اور کون ناکام ہوتا ہے؟

قرآن کریم کی اور آیات میں بھی اس چیز کو بیان کیا گیا ہے، چنانچہ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ﴿۲﴾"

ترجمہ کنزالعرفان: کیالوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ انھیں صرف اتنی بات پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ کہتے ہیں ہم "ایمان لائے "اور انھیں آزمایا نہیں جائے گا؟

اور ارشاد فرمایا:

"وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوٰلِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ"

ترجمہ کنزالعرفان: اور ہم ضرور تمہیں کچھ ڈر اور بھوک سے اور کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنادو۔ اور فرمایا:

"كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۵﴾"

ترجمہ کنزالعرفان: ہر جان موت کامزہ چکھنے والی ہے اور ہم برائی اور بھلائی کے ذریعے تمہیں آزماتے ہیں اور ہماری ہی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

ارشاد فرمایا:

"فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسٰنَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ ؕ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۹﴾"

ترجمہ کنزالعرفان: پھر جب آدمی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے پھر جب اسے ہم اپنے پاس سے کوئی نعمت عطا فرمائیں تو کہتا ہے یہ تو مجھے ایک علم کی بدولت ملی ہے (حالانکہ ایسا نہیں ہے) بلکہ وہ تو ایک آزمائش ہے مگر ان میں اکثر لوگ جانتے نہیں۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

"اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴿۷﴾"

ترجمہ کنزالعرفان: بیشک ہم نے زمین پر موجود چیزوں کو اس کیلئے زینت بنایا تاکہ ہم انھیں آزمائیں کہ ان میں عمل کے اعتبار سے کون اچھا ہے ؟

{اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ: بیشک تمہارا رب بہت جلد عذاب دینے والا ہے۔} یعنی اللہ تعالیٰ فاسق و فاجر اور گناہ گار کو بہت جلد سزا دینے والا ہے۔ اس مقام پر ایک اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حلیم ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، وہ اپنے نافرمان کو جلدی سزا نہیں دیتا پھر کس طرح فرمایا کہ "بیشک تمہارا رب بہت جلد عذاب دینے والا ہے۔" اس کا جواب دیتے ہوئے ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی (رح) فرماتے ہیں "ہر وہ کام جو یقیناً ہونے والا ہے وہ قریب ہی ہے۔

تفسیرِ صاوی میں ہے کہ "سَرِيْعُ الْعِقَابِ" کا معنی ہے جب عذاب کا وقت آ جائے تو اس وقت اللہ تعالیٰ عذاب نازل کرنے میں دیر نہیں فرماتا۔ (تفسیر صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری)

مسلمانوں کو خلیفہ بنانے کے محامل

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس نے مسلمانوں کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے، اس خلافت کے حسب ذیل محامل ہیں:

(۱) سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خاتم النبیین ہیں، اس لیے آپ کی امت خاتم الامم ہے اور چونکہ یہ امت پچھلی تمام امتوں کے بعد ہے، اس لیے یہ تمام امتوں کی خلیفہ ہے۔

(۲) اس امت کا ہر قرن دوسرے قرن کے بعد ہے، اس لیے ہر قرن دوسرے قرن کا خلیفہ ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے، تاکہ وہ زمین میں اللہ کے احکام جاری کریں۔ قرآن مجید میں ہے:

(آیت) "وعد الله الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنهم فی الارض کما استخلف الذین من قبلهم ولیمکنن لهم دینهم الذی ارتضی لهم ولیبدلنهم من بعد خوفهم امنا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئا ومن کفر بعد ذالك فاولئك هم الفسقون"۔ (النور: ۵۵)

ترجمہ: تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو زمین میں ضرور بہ ضرور خلیفہ بنائے گا، جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا اور ان کے لیے اس دین کو مضبوط کر دے گا جس کو ان کے لیے پسند فرما لیا ہے اور ان کی حالت خوف کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے اور جس نے اس کے بعد ناشکری کی تو وہی لوگ فاسق ہیں۔

(آیت) "الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ وامروا بالمعروف وانھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور "۔ (الحج: ۴۱)

ترجمہ: جن لوگوں کو ہم زمین میں سلطنت عطا فرمائیں 'تو وہ نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں اور نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

مسلمانوں کی آزمائش

اس کے بعد فرمایا تم میں سے بعض کو بعض پر کئی درجات بلندی عطا فرمائی تاکہ اس نے جو کچھ تمہیں عطا فرمایا ہے 'اس میں تمہاری آزمائش کرے 'یعنی عزت اور شرف 'عقل اور مال 'رزق اور شجاعت اور سخاوت میں اور تم میں یہ فرق مراتب اور تفاوت درجات اس وجہ سے نہیں ہے 'کہ اللہ تعالیٰ تم سب کو برابر کا درجہ دینے سے عاجز تھا 'بلکہ اس نے تمہیں آزمائش میں ڈالنے کے لیے تم کو ان مختلف درجات میں رکھا تاکہ دنیا والوں پر اور قیامت کے دن سب لوگوں کو معلوم ہو کہ مال اور رزق کی فروانی سے کون دولت کے نشہ میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو بھلا بیٹھا اور عیش و عشرت میں پڑ گیا اور نفسانی خواہشوں کی اتباع میں فواحش و منکرات میں مبتلا ہو گیا اور کون ایسا ہے جو روپے پیسے کی ریل پیل کے باوجود خدا سے ڈرتا رہا 'اور اپنے مال کو اللہ کے احکام کی اطاعت اور خلق خدا کی خدمت میں صرف کرتا رہا 'اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتا رہا۔ اسی طرح کس نے اپنی صحت کو عبادت میں خرچ کیا اور کس نے عیاشی میں ضائع کیا اور کون غربت اور افلاس میں اللہ اور بندوں کے حقوق ادا کرتا رہا؟ اور کون اللہ سے شکوہ اور شکایت کرتا رہا؟ اور عبادت سے غافل رہا اسی اسی طرح کون بیماری میں عبادت کرتا رہا؟ اور کون بیماری میں گلے شکوے کرتا رہا؟ اور اللہ کی اطاعت سے گریزاں رہا۔

مسلمانوں کے گناہوں پر مواخذہ اور مغفرت کا بیان

پھر فرمایا "بیشک آپ کا رب بہت جلد سزا دینے والا ہے اور بیشک وہ بہت بخشنے والا بے حد مہربان ہے "۔

یعنی اللہ تعالیٰ فساق وفجار کو بہت جلد سزا دینے والا ہے۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو فاسقوں کو ڈھیل دیتا ہے کہ وہ توبہ کرلیں؟ اور عذاب بھی آخرت میں ہوگا پھر کس طرح فرمایا کہ وہ بہت جلد سزا دینے والا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر وہ کام جو اللہ تعالیٰ کرنے والا ہے 'وہ اس کے اعتبار سے بہت قریب ہے اور بہت جلد ہونے والا ہے 'جیسا کہ قیامت کے متعلق فرمایا۔

(آیت) "وما امر الساعۃ الا کلمح البصر اوھو "۔ (النحل: ۷۷)

ترجمہ: اور قیامت محض پلک جھپکنے میں واقع ہو جائے گی 'بلکہ وہ اس سے بھی قریب تر ہے۔

(آیت) "انھم یرونہ بعیدا، ونرہ قریبا "۔ (المعارج: ۷۔۶)

ترجمہ: بیشک وہ یوم حشر کو بہت دور سمجھ رہے ہیں اور ہم اسے بہت قریب دیکھ رہے ہیں۔

نیز بعض اوقات اللہ تعالیٰ بعض مسلمانوں کی خطاؤں پر جلد ہی دنیا میں ہی گرفت فرمالیتا ہے اور ان کو کسی مصیبت یا بیمار میں مبتلا کردیتا ہے جو ان کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے:

(آیت) "وما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم ویعفوا عن کثیر"۔ (الشوریٰ: ۳۰)

ترجمہ: اور تم کو جو مصیبت پہنی تو وہ تمہارے کرتوتوں کے سبب تھی اور بہت سی خطاؤں کو تو وہ معاف فرمادیتا ہے۔

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مسلمان کو جو بھی تکلیف پہنچتی ہے 'خواہ کانٹا چبھے یا اس سے بھی کم ہو 'اللہ اس تکلیف کے سبب اس کا ایک درجہ بلند کرتا ہے 'یا اس کا ایک گناہ مٹا دیتا ہے۔

(صحیح مسلم 'البر والصلہ '۴۷ '(۲۵۷۲) ۶۴۴۰ 'سنن الترمذی 'ج ۲ 'رقم الحدیث: ۹۶۷)

حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ مسلمان کو جو بھی مصیبت پہنچتی ہے خواہ دائمی ہو 'خواہ تھکاوٹ ہو 'خواہ کوئی اور بیماری ہو 'خواہ غم ہو 'خواہ پریشانی ہو اللہ تعالیٰ اس مصیبت کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔

(صحیح البخاری ج ۲ 'رقم الحدیث: '۹۶۶ 'صحیح مسلم 'البر والصلہ '۵۲' (۲۵۷۳) ۶۴۴۶ 'سنن الترمذی 'ج ۲ 'رقم الحدیث: '۹۶۸)

نیز فرمایا وہ بہت بخشنے والا بے حد مہربان ہے "وہ گناہوں کو بخش دیتا ہے اور اپنے فضل و کرم اور رحمت سے دنیا میں گناہوں پر پردہ رکھتا ہے اور آخرت میں انواع واقسام کی نعمتیں عطا فرماتا ہے۔

حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن مومن کو اس کے رب عزوجل کے قریب کیا جائے گا اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت کے بازو میں چھپالے گا۔ پھر اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کرائے گا اور فرمائے گا 'کیا تم اس (گناہ) کو پہچانتے ہو؟ وہ کہے گا: ہاں میرے رب میں پہچانتا ہوں اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں دنیا میں تم پر پردہ رکھا تھا اور آج میں تمہیں بخش دیتا ہوں۔ پھر اس کو اس کی نیکیوں کا صحیفہ دے دیا جائے گا اور کفار و منافقین کو تمام مخلوقات کے سامنے بلایا جائے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا تھا۔

(صحیح البخاری 'ج ۵ 'رقم الحدیث: '۲۴۴۱ 'صحیح مسلم 'التوبہ '۵۲' (۲۷۶۸) ۶۸۸۲ 'سنن ابن ماجہ 'ج ۱ 'رقم الحدیث: '۱۸۳ 'السنن الکبری للنسائی 'ج ۶ 'رقم الحدیث: '۱۱۲۴۲) (تفسیر تبیان القرآن۔ مولانا غلام رسول سعیدی)

وھو الذی جعلکم خلئف الارض ورفع بعضکم فوق بعض درجت

اور وہ ذات ہے جس نے زمین میں تمہیں نائب کیا اس سے مراد حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خاتم النبیین ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں اور آپ کی امت آخر الامم ہے اس لیے انھیں زمین میں پہلوں کا خلیفہ کیا تاکہ اس کے مالک ہوں اور اس میں تصرف کریں اور تم میں ایک کو دوسرے پر درجات کی بلندی عطا کی شرف اور رزق۔ شکل۔ صورت۔ حسن و جمال علم و عقل قوت اور کمالات وغیرہ کی۔

لیبلوکم فی ما اتکم ان ربک سریع العقاب وانہ لغفور رحیم۔

تاکہ تمہیں آزمائے یعنی آزمائش کرے اس چیز میں جو تمہیں عطا کی نعمت اور جاہ و مال پا کر کیسے شکر گزار رہے اور باہمی سلوک میں کس قسم کا برتاؤ کرتے ہو۔

ان ربك سريع العقاب وانه لغفور رحيم ۔

بے شک تمہارے رب کو عذاب کرتے دیر نہیں لگتی اور بیشک وہ ضرور بخشنے والا ہے یعنی کفران نعمت پر عذاب اور شکر نعمت پر زیادتی نعمت میں وہ تاخیر نہیں فرماتا۔ حدیث میں ہے کہ جو مسلمان صبح کے وقت سورۃ انعام کی تین ابتدائی آیات پڑھے اللہ تعالیٰ اس پر ستر ہزار فرشتے مقرر فرماتا ہے جو اس کی حفاظت کرتے ہیں اور اس کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ (تفسیر مدارک)

حضرت انس (رض) فرماتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جب سورۃ انعام نازل ہوئی تو آپ نے سبحان اللہ پڑھا پھر فرمایا اس سورت کے پیچھے اتنے فرشتے تھے کہ آسمان کے کنارے انھوں نے بند کر دیئے تھے یعنی پورے آسمان پر چھا گئے تھے۔ (رواہ الحاکم فی المستدرک)

(تفسیر الحسنات۔علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)

اَس آیت کریمہ میں غور کرنے سے بیک وقت تین مفہوم ابھرتے ہیں جو سہ گونہ احساس کی ترجمانی کرتے ہیں۔

1 اللہ نے اپنی قدرت کا احساس دلایا ہے کہ اے مشرکین مکہ تم اس لیے سرکشی دکھا رہے ہو کہ تمہیں اللہ کی قدرت کا صحیح ادراک نہیں حالانکہ تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ آج جہاں تم آباد ہو تم پہلی قوم نہیں ہو یقینا تم سے پہلے اور قومیں یہاں آباد رہ چکی ہیں۔ تم آج جن چیزوں پر تصرف رکھتے ہو اور جن کی ملکیت کے دعوے دار ہو وہ یقینا تم سے پہلے دوسروں کے زیر تصرف تھیں۔ تمہاری آبادیوں کا ایک ایک گوشہ اور تمہاری زمین کا ایک ایک ٹکڑا خود گواہی دے رہا ہے کہ یہاں نجانے کتنے قافلے گزر چکے اور آج تمہیں ان کا جانشین بنایا گیا ہے یعنی تم ان کی جگہ آباد کیے گئے ہو اسی طرح تم یہ بھی دیکھ رہے ہو کہ تم میں معاشی اور معاشرتی لحاظ سے سب لوگ برابر نہیں 'مختلف حیثیتوں میں بے پناہ تفاوت پایا جاتا ہے۔ کوئی مفلس ہے اور کوئی مالدار 'کوئی ذلیل اور کوئی عزت دار 'کوئی حاکم ہے اور کوئی محکوم اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر مالداری اور عزت اور حاکمیت خود انسان کے اختیار میں ہوتی تو کوئی بھی مفلسی 'ذلت اور محکومیت قبول نہ کرتا۔ تمہارا اس علاقے میں آج آباد ہونا اور تمہارے درجات کا یہ تفاوت خود اس بات کی خبر دے رہا ہے کہ تم حقیقت میں اختیارات کے مالک نہیں ہو بلکہ یہ اختیار کسی اور کے قبضے میں ہے کہ وہ جب چاہتا ہے کسی کو بساتا ہے اور کسی کو اکھاڑ دیتا ہے جسے چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے جسے چاہتا ہے مار دیتا ہے ' جس کو چاہتا ہے عزت اور دولت سے نوازتا ہے اور جسے چاہتا ہے حالات کا شکار کر دیتا ہے یقینا وہ اللہ کی ذات ہے جو تمام اختیارات کی مالک اور تمام قدرتوں کی حامل ہے اگر تمہیں اس کی قدرت کا یقین پیدا ہو جائے تو پھر یہ تمہارے لیے بات سمجھنا مشکل نہیں کہ تم حالت امتحان میں ہو۔ تمہیں یہاں آزمائش کے طور پر بھیجا گیا ہے اس لیے خیریت اسی میں ہے کہ اپنی حیثیت اور اپنی حالت کو سمجھو اور راہ راست کی طرف آجاؤ۔

2 مشرکین مکہ کو احساس دلایا جا رہا ہے کہ تم حرم کی سرزمین میں خدا کے خلیفہ ہو اس نے اپنی بہت ساری مملوکات اور بہت سی نعمتوں میں تمہیں اختیار دے رکھا ہے لیکن تم ان میں سے کسی کے مالک نہیں ہو 'ان میں سے ہر ایک چیز تمہارے پاس امانت ہے اس لیے تمہیں اس بات کی فکر ہونی چاہیے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب اللہ تعالیٰ تم سے اس امانت کے بارے میں سوال کرے گا۔ اسی طرح تمہیں اس بات کا بھی احساس کرنا چاہیے کہ تم اگرچہ سارے اللہ کے خلیفہ ہو تم میں سے ایک ایک فرد اس خلافت ارضی میں شریک ہے لیکن تمہارے مراتب میں

اس حد تک تفاوت ہے کہ کسی کا دائرہ اختیار محدود ہے اور کسی کا وسیع اور اسی نسبت سے تم میں سے ہر ایک اختیارات اور تصرفات بھی رکھتا ہے اس لیے جس طرح اس امانت کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا اسی طرح تم میں سے ہر ایک ان اختیارات کے بارے میں بھی مسؤل بنایا گیا ہے۔ اس لیے تمہیں اصل فکر مندی یہ ہونی چاہیے کہ کل کو جب یہ جوابدہی کرنی پڑے گی تو ہم اس میں کس طرح سرخرو ہو سکیں گے۔ اس کا راستہ صرف وہی ہے جس کی طرف رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دعوت دے رہے ہیں۔

3 قریش مکہ سے یہ کہا جارہا ہے کہ دنیا کے سٹیج پر نمودار ہونے والی تم پہلی قوم نہیں ہو تم سے پہلے کتنی قومیں سٹیج پر نمودار ہوئیں پھر غائب ہو گئیں۔ یہاں تک کہ اللہ نے ان کی جگہ تم کو دی یہ خلافت خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس دنیا کے مالک نے جس باٹ اور ترازو سے ان کو تولا اسی باٹ اور اسی ترازو سے وہ تم کو بھی تولے گا اور اس کی میزان میں اگر تم پورے نہ اترے تو جس طرح اس نے دوسروں کو پھینک دیا اسی طرح تم کو بھی اٹھا پھینکے گا۔ خدا کی جو سنت دوسروں کے معاملہ میں رہی ہے کوئی وجہ نہیں کہ وہ تمہارے معاملے میں بدل جائے۔ اس لیے تم اگر اپنے آپ دشمن نہیں ہو گئے ہو تو تم اپنے گردو پیش کی قوموں کی تاریخ کو جاننے کی کوشش کرو اور اس کے آئینے میں اپنی حالت پہچانو۔ اس طرح شاید تمہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعوت کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ تم ایک عجیب غلط فہمی کا شکار ہو تم یہ سمجھتے ہو کہ تم میں سے بہت سے لوگ چونکہ مال و دولت رکھتے ہیں ان کا کاروبار دور تک پھیلا ہوا ہے۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جن کے طائف میں باغات ہیں لیکن تمہارے مقابلے میں مسلمانوں میں بیشتر لوگ مالی اور معاشی لحاظ سے تنگ دستی کا شکار ہیں۔ جب تم یہ تفاوت دیکھتے ہو تو تم اسے اللہ کے یہاں قبولیت کی علامت سمجھتے ہو۔ تمہارا گمان یہ ہے کہ جو شخص یہاں اچھے حالوں میں ہے وہ یقیناً آخرت میں بھی بہتر حال میں ہوگا اور جس آدمی کو یہاں زندگی کے کٹھن مسائل درپیش ہیں وہ آخرت میں بھی ایسی ہی صورتحال سے دوچار ہوگا۔ اس بات کو دلیل بنا کر تم اپنے آپ کو اللہ کا مقبول سمجھتے ہو اور اس طرح اپنی سرکشی میں اور زیادہ دلیر ہو جاتے ہو اس لیے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ زندگیوں میں یہ تفاوت اللہ کے یہاں قبولیت کی علامت نہیں بلکہ یہ اس کی طرف سے ایک امتحان ہے اس نے تمہیں یہ سب کچھ عطا کر کے آزمانا چاہا ہے کہ تم اس کے شکر گزار بنتے ہو یا ناشکرے۔ نیکیوں اور بدیوں کی جزاو سزا کا دن آگے آنے والا ہے یہ دنیا دار الجزا نہیں بلکہ دار الامتحان ہے۔ قیامت کے دن جس نے بھی اپنے رب کی ناشکری کی ہوگی وہ اس ناشکری کی سزا بھگتے گا اور جنھوں نے نیکی کا راستہ اختیار کیا ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور رحمت کا سزاوار ہوگا اور یہ مت سمجھو کہ وہ آنے والا دن بہت دور ہے وہ جلد آ کے رہے گا اور یہ بھی گمان نہ کرو کہ اس دن اربوں کھربوں مخلوق کا حساب کون لے سکے گا اور کیسے سب کو سزا دی جا سکے گی۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی قدرت بے پناہ ہے وہ جس کو سزا دینا چاہے گا اس میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی اور جسے وہ نوازنا چاہے گا یقیناً اس کے رحم و کرم میں اس کے لیے جگہ ہوگی کیونکہ وہ سریع العقاب بھی اور غفور رحیم بھی ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ سورۃ انعام مکمل ایک ہی دفعہ نازل ہوئی اور اس شان کے ساتھ نازل ہوئی کہ ستر ہزار فرشتے اس کے جلو میں تسبیح پڑھتے ہوئے آئے۔ بعض روایات میں حضرت علی (رض) سے منقول ہے کہ یہ سورۃ جس مریض پر پڑھی جائے اللہ تعالیٰ اسے شفا عطا فرماتے ہیں۔ (تفسیر روح القرآن۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی)

اللہ کی رحمت اللہ کے غضب پر غالب ہے

اس اللہ نے تمہیں زمین کا آباد کار بنایا ہے، وہ تمہیں یکے بعد دیگرے پیدا کرتا رہتا ہے ایسا نہیں کیا کہ زمین میں خلیفہ بنا کر آزمائے کہ تم کیسے اعمال کرتے ہو؟ اس نے تمہارے درمیان مختلف طبقات بنائے، کوئی غریب ہے، کوئی خوش خو ہے، کوئی بد اخلاق، کوئی خوبصورت ہے، کوئی بدصورت، یہ بھی اس کی حکمت ہے، اسی نے روزیاں تقسیم کی ہیں ایک کو ایک کے ماتحت کر دیا ہے فرمان ہے آیت (اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا 21) 17۔ الإسراء: 21) دیکھ لے کہ ہم نے ان میں سے ایک کو ایک پر کیسے فضیلت دی ہے؟ اس سے منشاء یہ ہے کہ آزمائش وامتحان ہو جائے، امیر آدمیوں کا شکر، فقیروں کا صبر معلوم ہو جائے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں دنیا میٹھی اور سبز رنگ ہے اللہ تمہیں اس میں خلیفہ بنا کر دیکھ رہا ہے کہ تم کیسے اعمال کرتے ہو؟ پس تمہیں دنیا سے ہوشیار رہنا چاہیے اور عورتوں کے بارے میں بہت احتیاط سے رہنا چاہیے، بنی اسرائیل کا پہلا فتنہ عورتیں ہی تھیں۔ اس سورت کی آخری آیت میں اپنے دونوں وصف بیان فرمائے، عذاب کا بھی، ثواب کا بھی، پکڑ کا بھی اور بخشش کا بھی اپنے نافرمانوں پر ناراضگی کا اور اپنے فرمان برداروں پر رضامندی کا، عموماً قرآن کریم میں یہ دونوں صفتیں ایک ساتھ ہی بیان فرمائی جاتی ہیں۔ جیسے فرمان ہے آیت (وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰي ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ 6) 13۔ الرعد) اور آیت میں ہے آیت (نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّىْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ 49) 15۔ الحجر: 49) یعنی ترا رب اپنے بندوں کے گناہ بخشنے والا بھی ہے اور وہ سخت اور دردناک عذاب دینے والا بھی ہے، پس ان آیتوں میں رغبت رہبت دونوں ہیں اپنے فضل کا اور جنت کا لالچ بھی دیتا ہے اور آگ کے عذاب سے دھمکاتا بھی ہے کبھی کبھی ان دونوں وصفوں کو الگ الگ بیان فرماتا ہے تاکہ عذابوں سے بچنے اور نعمتوں کے حاصل کرنے کا خیال پیدا ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے احکام کی پابندی اور اپنی ناراضگی کے کاموں سے نفرت نصیب فرمائے اور ہمیں کامل یقین عطا فرمائے کہ ہم اس کے کلام پر ایمان ویقین رکھیں۔ وہ قریب ومجیب ہے وہ دعاؤں کا سننے والا ہے، وہ جواد، کریم اور وہاب ہے، مسند احمد میں ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں اگر مومن صحیح طور پر اللہ کے عذاب سے واقف ہو جائے تو اپنے گناہوں کی وجہ سے جنت کے حصول کی آس ہی نہ رہے اور اگر کافر اللہ کی رحمت سے کماحقہ واقف ہو جائے تو کسی کو بھی جنت سے مایوسی نہ ہو اللہ نے سو رحمتیں بنائی ہیں جن میں سے صرف ایک بندوں کے درمیان رکھی ہے اسی سے ایک دوسرے پر رحم وکرم کرتے ہیں باقی ننانوے تو صرف اللہ ہی کے پاس ہیں۔ یہ حدیث ترمذی اور مسلم شریف میں بھی ہے ایک اور روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی پیدائش کے وقت ایک کتاب لکھی جو اس کے پاس عرش پر ہے کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ صحیح مسلم شریف میں ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے رحمت کے سو حصے کئے جن میں سے ایک کم ایک سو تو اپنے پاس رکھے اور ایک حصہ زمین پر نازل فرمایا اسی ایک حصے میں مخلوق کو ایک دوسرے پر شفقت وکرم ہے یہاں تک کہ جانور بھی اپنے بچے کے جسم سے اپنا پاؤں رحم کھا کر اٹھا لیتا ہے کہ کہیں اسے تکلیف نہ ہو۔

(تفسیر ابن کثیر۔ حافظ عماد الدین ابوالفداابن کثیر)

بحمد للہ سورۃ الانعام ختم ہوئی۔

حرف آخر :

آج 23 محرم الحرام 1446ھ۔ 30 جولائی 2024ء بروز منگل کو سورۃ الانعام کی تفسیر کو میں اس حدیث پر ختم کر رہا ہوں اور اس حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں کہ وہ میری لغزشوں پر پردہ رکھے گا اور آخرت میں میرے تمام گناہوں کو بخش دے گا۔ ختم ہو گئی "

الہ العالمین ! جس طرح آپ نے مجھے سورۃ الانعام تک تفسیر لکھنے کی سعادت بخشی ہے 'اپنے فضل و کرم سے مجھے باقی قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کی بھی عزت عطافرما 'مجھ پر قرآن مجید کے اسرار و معارف کھول دے اور احادیث میں مجھے وسیع نظر عطافرما 'مجھے اس تفسیر میں خطا اور لغزشوں سے بچا اور باقی ماندہ زندگی میں نیکی عطافرما اور گناہوں سے محفوظ رکھ 'اور محض اپنے فضل و کرم سے مجھے دنیا اور آخرت میں ہر پریشانی 'مصیبت اور عذاب سے محفوظ رکھ اور دارین کی خوشیاں عطافرما۔ اس تفسیر کو موثر اور مفید بنا اور اس کو تاقیام قیامت فیض آفرین اور باقی رکھ 'اس کے مصنف 'مصحح 'کمپوزر 'ناشر 'قارئین 'محبین اور معاونین کو دنیا اور آخرت کی ہر بلا اور ہر عذاب سے بچا اور دارین کا کامیابیاں اور کامرانیاں ان کا مقدر کر دے۔ آمین یارب العالمین۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی سیدنا محمد خاتم النبیین قائد المرسلین شفیع المذنبین وعلی الہ الطیبین الطاھرین واصحابہ الکاملین الراشدین وازواجہ امھات المومنین وعلی اولیاء امتہ وعلماء ملتہ من المفسرین والمحدثین والمجتھدین الراسخین اجمعین الی یوم الدین :

رَبَّنَا اغۡفِرۡ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلۡمُؤۡمِنِينَ يَوۡمَ يَقُومُ ٱلۡحِسَابُ۔

اشاریہ

دروس تفسیر میں ترجمہ شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القاری دام برکاتہم ! اور لفظی ترجمہ جناب میاں محمد جمیل زاد مجد کم ! صاحب کا ہے۔

جبکہ تفاسیر کے حوالہ جات ان کے ابتدائی نام سے دیئے گئے ہیں مثلاً ضیاء مراد ضیاء القرآن، روح مراد روح القرآن وغیرہ

کتابیات

نمبر	ترجمہ/تفسیر:	نام کتاب-	القاب	نام مترجم-
1.	تفسیر:	ابن عباس-	پروفیسر	محمد سعید احمد عاطف صاحب-
2.	تفسیر:	ابن کثیر-	حافظ	عماد الدین ابوالفداء ابن کثیر صاحب-
3.	تفسیر:	ابن مسعود-	مولانا	شمس الدین-
4.	تفسیر:	احکام القرآن للجصاص-		ابو احمد بن علی الرازی-
5.	شان نزول:	اسباب نزول قرآن-		محمد علی نیشاپوری صاحب-
6-	تفسیر:	اشرفی-		سید محمد مدنی اشرفی جیلانی-
7.	تفسیر:	اسرار التنزیل-	مولانا	محمد اکرم اعوان-
8.	تفسیر:	البیان (الغامدی)-		جاوید احمد غامدی-
9.	تفسیر:	الحسنات-	علامہ	ابوالحسنات سید محمد احمد قادری-
10.	تفسیر:	امداد الکرم-		محمد امداد حسین پیرزادہ-
11.	تفسیر:	انوار البیان-	مولانا	عاشق الٰہی-
12.	تفسیر:	انوار الفرقان-		محمد عبدالحکیم شرف قادری صاحب-
13.	تفسیر:	انوار القرآن-	ڈاکٹر	ملک غلام مرتضیٰ-
14.	تفسیر:	آسان قرآن-	مفتی	تقی عثمانی صاحب-

15. تفسیر: بغوی۔ ابو محمد حسین بن مسعود الفراء بغوی۔

17۔ تفسیر: برہان القرآن علامہ قاری محمد طیب نقشبندی

18. تفسیر: تبیان القرآن۔ مولانا غلام رسول سعیدی۔

19. تفسیر: تدبر قرآن۔ مولانا امین احسن اصلاحی۔

20. تفسیر: تفسیرات احمدیہ۔ ملا احمد جیون۔

21. تفسیر: تیسیر القرآن۔ مولانا عبدالرحمٰن کیلانی صاحب۔

22. تفسیر: جلالین۔ مولانا جلال الدین سیوطی۔

23. تفسیر: حقانی۔ ابو محمد عبدالحق حقانی صاحب۔

24. تفسیر: خزائن العرفان۔ علامہ نعیم الدین مرادآبادی۔

25. ترجمہ: در منثور۔ مولانا جلال الدین سیوطی۔

26. تفسیر: در منثور۔ جلال الدین سیوطی۔

27. تفسیر: درس قرآن۔ محمد احمد صاحب۔

28. تفسیر: درس قرآن۔ مرتب محمد اسحاق۔

29. تفسیر: ذخیرۃ الجنان۔ مولانا سرفراز خان صفدر صاحب۔

30. تفسیر: روح القران۔ ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی۔

31. تفسیر: صراط الجنان۔ ابو صالح محمد قاسم القادری۔

32. تفسیر: ضیاء القرآن۔ پیر پیر کرم شاہ صاحب۔

33. ترجمہ: عرفان القرآن۔ ڈاکٹر طاہر القادری صاحب۔

34. تفسیر: عروۃ الوثقی۔ عبدالکریم اثری صاحب۔

35. ترجمہ لفظی: فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل صاحب۔

36. تفسیر: فہم القرآن۔ میاں محمد جمیل۔

37. تفسیر: فی ظلال القرآن۔ سید قطب شہید۔

38. تفسیر: فیوض القرآن۔ ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی۔

39. تفسیر: قرطبیؒ۔ ابو عبداللہ محمد بن احمد قرطبیؒ۔

40. تفسیر: کشف الرحمٰن- مولانا احمد سعید دہلوی-
41. تفسیر: گلدستہ تفاسیر- محمد اسحاق-
42. تفسیر: محمود- مفتی محمود صاحب-
43. تفسیر: مدارک- ابوالبرکات عبداللہ بن احمد محمد بن محمود النسفی-
44. تفسیر: مدنی- مولانا اسحاق مدنی صاحب (آزاد کشمیر)-
45. تفسیر: مدنی کبیر- مولانا اسحاق مدنی صاحب (آزاد کشمیر)-
46. تفسیر: مظہر القرآن- مفتی شاہ محمد مظہر اللہ-
47. تفسیر: مظہری- قاضی ثناء اللہ پانی پتی-
48. تفسیر: معارف القرآن- مولانا ادریس کاندھلوی صاحب-
49. تفسیر: معارف القرآن- مفتی محمد شفیع صاحب-
50. تفسیر: مفردات القرآن- مولانا محمد عبدہٗ فیروز پوری-
51. تفسیر: نور العرفان- مفتی احمد یار خان نعیمی-
52. تفسیر (اہل تشیع): الکوثر (اہل تشیع)- محسن علی نجفی-
53- تفسیر منازل العرفان عبدالستار شاہ

بائیبل مقدس بائیبل سوسائیٹی

The Bible